مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ
www.KitaboSunnat.com
پروفیسر غلام رسول چیمہ

مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ

پروفیسر چودھری غلام رسول چیمہ

ایم۔اے

چوہدری غلام رسول اینڈ سنز پبلشرز

الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور فون: 37233909-37243055
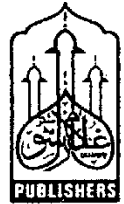
نام کتاب : مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ

مصنف : پروفیسر چودھری غلام رسول چیمہ ایم۔اے

ناشر : چوہدری غلام رسول اینڈ سنز پبلشرز

اشاعت : 2012ء

پریس : اے۔وائی پرنٹرز، آؤٹ فال روڈ لاہور فون:37151047

قیمت : -/340 روپے

نوٹ:

قارئین سے درخواست ہے کہ ہماری تمام تر کوشش (اچھی پروف ریڈنگ معیاری پرنٹنگ) کے باوجود اس بات کا امکان ہے کہ کہیں کوئی لفظی غلطی یا کوئی اور خامی رہ گئی ہو تو ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں اس غلطی یا خامی کو دور کیا جائے۔ شکریہ (ادارہ)

چوہدری غلام رسول اینڈ سنز پبلشرز

الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور فون 37233909-37243055

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ

انتساب!

میجر محمد یونس صاحب مرحوم اور محمود انور بھلی صاحب

کے نام

جن کی معاونت سے حصول تعلیم کی مشکلات دور ہوئیں۔

فہرست

عقائد اوران کا رد۔عقیدہ حلول۔معجزات مسیح کی حقیقت عہد نامہ جدید کی روشنی میں۔کفارہ عقیدہ حیات ثانیہ۔ الوہیت کا تصور۔ ابنیت کا تصور۔نظریہ ارفیزم۔تثلیث۔ رسوم۔ مسیحی رہبانیت۔عیسائیت کی تاریخ۔مسیحی یورپ اور کلیسا کی اخلاقی حالت اور معافی نامے۔تحریک اصلاح مذہب۔ ردعمل اصلاحی تحریک کلیسائے انگلستان۔عیسائیت اورعصر جدید۔یہوواہ وٹنسز تحریک۔اسلام اور مسیحیت)

باب ۸   ۸۹۷-۵۵۶

(جغرافیہ عرب۔عرب میں آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے کی وجوہ۔بعثت نبوی کے وقت دنیا کی حالت۔عہدہ جاہلیت۔ظہور اسلام سے پیشتر عربوں کی مذہبی اخلاقی تمدنی۔اقتصادی اور سیاسی حالت۔مکی زندگی۔خاندان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ولادت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وطلوع آفتاب اسلام۔مدنی زندگی۔وفات۔ازواج مطہرات۔خصائص النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔معجزات۔ قرآن مجید [illegible] خصائص۔سنت اور حدیث۔صحاح ستہ۔مقام حدیث۔فقہ اور اس کے ماخذ۔فقہ اسلامی کا تدریجی ارتقاء۔فقہی مدرسہ ہائے فکر۔اسلامی تعلیمات۔عقائد۔اسلام کا نظام عبادت۔عبادت کا مفہوم۔نماز۔زکوٰۃ۔روزہ۔حج۔جہاد۔اسلام کا نظام اخلاق۔اسلام کا نظام معاشرت۔اسلام کا نظام سیاست۔اسلام کا نظام اقتصاد۔اشاعت اسلام۔اسلامی فرقے۔اسلام اور عصر حاضر۔عصر حاضر کے مسائل۔خصائص اسلام)

تقدیم

مذاہب عالم قدیم موضوع ہے جس پر سب سے زیادہ ادب شائع ہوا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ موضوع دنیا کی ہر جامعہ میں پڑھایا جاتا ہے اور اس پر متواتر لکھا جا رہا ہے۔ مولوی سردار محمد صاحب پروپرائیٹر علمی کتاب خانہ لاہور نے مجھے اس مشکل موضوع پر لکھنے کو کہا۔ مولوی صاحب کا پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ اس قسم کا رویہ ہوتا تھا۔ کہ کوئی بھی انکار نہیں کر پاتا تھا۔ گو یہ موضوع مشکل تھا۔ اردو زبان میں اس کا ادب کم ہے۔ دیگر مذاہب کے متعلق جو بھی ادب ہے وہ مناظرانہ رنگ کا ہے۔ جس میں زیادہ دیگر مذاہب کی خامیوں کو ہی اجاگر کیا گیا ہے۔ گو مذاہب کی کتب میں تحریف وتبدل کیا گیا ہے لیکن پھر بھی ایک حصہ محفوظ چلا آ رہا ہے۔ جس میں لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔ اسی طرح بانیاں کے حالات زندگی بھی پردہ کتمان میں ہیں۔ محققین بڑی عرق ریزی اور محنت سے منصۂ شہود پر لائے ہیں۔ خاکسار نے حضرت مولوی کے حکم پر اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ میں کہاں تک کامیاب ہوا۔ اس کا فیصلہ تو قارئین کرام ہی کر سکتے ہیں۔

کافی عرصہ سے علمی کتب خانہ نے اس کتاب کو شائع نہیں کیا۔ بعض دوستوں خصوصاً پروفیسر عبدالحی صدیقی کے اصرار پر پھر کتاب کو شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ کتاب پہلے ہی سات آٹھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے لیکن پھر بھی نظر ثانی کی گئی ہے۔ مزید ترامیم اور اضافے کیے گئے ہیں۔ اب کی محنت کہاں تک کامیاب رہی ہے اس کا فیصلہ بھی قارئین کرام کریں گے۔

یہ اشاعت علم وعرفان اردو بازار کے تحت کی جا رہی ہے۔ پہلے کی نسبت کتاب ظاہری حسن کے لحاظ سے بہتر ہے۔

غلام رسول

۲۹ دسمبر ۱۹۷۵ء

ترمیم شدہ ایڈیشن ستمبر 2005ء

تقریظ

مذاہب عالم کے تقابلی مطالعے کے چند اصول اور اہمیت اور مسلمان محققین کی خدمات بیان کرنا ضروری ہے تاکہ قاری یہ سمجھ جائے کہ مذاہب کے کن کن پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

مذہبی ادب میں مذہب اور دین مترادفات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔لیکن باریک بینی سے دیکھا جائے تو دونوں الفاظ میں فرق ہے۔لفظ مذہب محدود معنی رکھتا ہے جبکہ دین وسیع معنی، ماہرین علم دین نے بھی فرق کیا ہے۔پروفیسر وائٹ ہیڈ لکھتا ہے کہ''مذہب عقیدہ کی ایک قوت کا نام ہے جس سے انسان کو اندرونی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔''اسی طرح پروفیسر ٹیلر نے ان الفاظ میں تعریف کی ہے کہ''مذہب اعتقاد کی اس قوت کا نام ہے جس میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ انسان اور انسانی کریکٹر میں تبدیلی پیدا کردے بشرطیکہ اس میں خلوص اور بصیرت پائی جاتی ہو۔''

ان ہر دو مغربی ماہرین علم دین کے نزدیک مذہب صرف انسان کی تعمیر شخصیت کے لیے ہے جبکہ قرآن مجید میں لفظ دین اس سے کہیں زیادہ وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے اس سے مراد ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبہ کی راہنمائی کرتا ہے۔

تقابلی مطالعہ سے مراد

مذاہب کے تقابلی مطالعہ سے مراد یہ ہے کہ مذاہب کا حقیقی محور کیا ہے کیا بنیادی تعلیم تمام مذاہب کی مشترک ہے۔آیا مذاہب کی تسلیم شدہ کتب لفظی اور معنوی لحاظ سے محفوظ و مصئون ہیں یا ان میں بعد میں تبدیلی کی گئی ہے۔دوم مذاہب کی کتب انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی راہنمائی کرتی ہیں یا مخصوص شعبوں کی طرف۔سوم بانیاں مذاہب کے حالات زندگی کہاں تک تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔مذکورہ امور کی وضاحت اور مطالعہ سے ہی کسی مذہب کی برتری ثابت ہوسکتی ہے۔جس مذہب کی تسلیم شدہ کتاب لفظی اور معنوی لحاظ سے محفوظ ہو اور جس مذہب کی تعلیم انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی راہنمائی کرتی ہو اور جس مذہب کے بانی کے حالات تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہوں۔وہی مذہب اس لائق ہے کہ اس کو مانا جائے۔وہی انسانیت کی فلاح کا حقیقی مذہب ہے۔

مذاہب عالم کے مطالعہ کے قرآنی اصول

قرآن مجید نے مذاہب عالم کے مطالعہ کے لیے چند اصول مقرر کیے ہیں۔

پہلا اصول

قرآن مجید نے مذاہب عالم سے متعلق پہلا اصول یہ مقرر کیا ہے کہ ہر قوم کی طرف اللہ تعالیٰ نے نبی بھیجے ہیں اور سب ایک ہی چشمہ نبوت سے سیراب ہوئے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (۳۵:۲۴) کوئی ایسی امت نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَسُوْلٌ ہر ایک قوم کے لیے ایک رسول ہے۔

وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ (۲:۲۱۳) اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب اتاری ہے۔

دوسرا اصول

تمام انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتب پر ایمان لانا دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے ضروری ہے۔ ارشاد ہے۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِنْ رُّسُلِهٖ (۲:۲۸۵) رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب سے اس کی طرف اتارا گیا اور مومن بھی سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ ہم اس کے رسولوں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔

اس اصول کے تحت ہر مذہب کے بانی کی پر ایمان لانا ہر مسلمان پر لازم ہو جاتی ہے۔

تیسرا اصول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے وقت تمام مذاہب فساد کا شکار ہو چکے تھے اور ان کے ماننے والے باطل عقائد کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے۔ کتب میں تحریف ہو چکی تھی۔ ارشاد الٰہی ہے۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (۳۰:۴۱) یعنی خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا تھا۔

دوسری جگہ آتا ہے:

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (البقرہ۲: ۷۵) پس کیا تم امید رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے اور ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اللہ کے کلام کو سنتا پھر اس میں بھی تحریف کرتا ہے بعد اس کے اسے سمجھ لیا اور وہ جانتے ہیں۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (البقرہ۲:۷۹) سو ان کے لیے حسرت ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے عوض تھوڑی قیمت لے لیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام مذاہب کے غلط عقائد اور فساد کی اصلاح کی اور ایک ایسی کتاب دی جو حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ

اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ (۱۶:۶۴) ہم نے تجھ پر کتاب صرف اس لیے نازل کی ہے کہ تو ان کے لیے وہ باتیں کھول کر بیان کرے جن میں اختلاف کرتے ہیں۔

چوتھا اصول

قرآن مجید یہ بیان کرتا ہے کہ ہر ایک نبی ایک قوم کی ہدایت واصلاح کے لیے آیا اور جو وہ کتاب لایا ایک خاص قوم اور خاص ملک کے لیے تھی۔ ارشاد ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ (۷:۵۹) ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔

اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا (۷:۶۵) عاد قوم کی طرف ان کا بھائی ہود آیا۔

اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صَالِحًا (۷:۷۳) ثمود کی طرف ان کا بھائی صالح بھیجا۔

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا (۷:۸۵) اور مدین کی طرف ان کا بھائی شعیب آیا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَکَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (۱۴:۵) اور ہم نے موسیٰ کو نشانات کے ساتھ بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالے۔

عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے: رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ (۳:۴۹) کہ وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول تھے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام دنیا کے لیے نبی بنا کر مبعوث کیے گئے۔ جو کتاب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی گئی وہ تمام دنیا کی ہدایت کے لیے تھی۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا (۳۴:۲۸) اور ہم نے تجھے تمام ہی لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا. (۷:۱۵۸) کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

فرمایا: اِنْ هُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ. یعنی یہ قرآن تمام جہانوں کے لیے ہے۔

پانچواں اصول

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (۵:۳) آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور تمہارا دین اسلام ہونے پر میں راضی ہوا۔

قرآن مجید کے کامل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ کتاب انسان کی زندگی کے ہر شعبہ میں موجب

ہدایت ہے۔ ارشاد ہے: هُدًى لِلنَّاسِ یعنی یہ لوگوں کے لیے کامل ہدایت ہے۔
مَافَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (۳۸:۶) یعنی اس کتاب میں ہدایت کی ہر چیز بیان کر دی گئی ہے۔
دوسری جگہ آتا ہے: فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۹۸:۳) اس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں یعنی اس میں (قرآن میں) علوم اوّلین وآخرین درج ہیں۔

تقابل ادیان کا آغاز

مذاہب عالم کے تقابلی مطالعہ کا آغاز قرآن مجید کے نزول سے شروع ہوتا ہے۔ مذاہب عالم کے مطالعہ کے دو پہلو ہیں ایک مثبت اور دوسرا منفی۔ اسلام سے پہلے کسی سماوی کتب میں مذہب کے ہر دو مذکورہ پہلوؤں پر بحث نہیں کی گئی مگر دوسری کتاب میں کسی مذہب کے بانی کے نام تک کا ذکر نہیں۔ چونکہ قرآن مجید عالمگیر کتاب ہے اور تاقیامت لوگوں کی راہنمائی کا سرچشمہ ہے۔ اس لیے ضروری تھا۔ قرآن مجید مذاہب کے ہر دو پہلوؤں عقائد صحیحہ اور باطلہ پر بحث کرتا۔ چنانچہ قرآن میں تمام عقائد باطلہ کی تردید کی۔ ارشاد الٰہی ہے: وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ یعنی ہم نے اس کتاب کو تجھ پر اس لیے نازل کیا تاکہ جو عقائد باطلہ عقول ناقصہ کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔ ان سب کا رد کیا جائے۔ ایمانداروں کے لیے ہدایت اور رحمت کا موجب ہے۔

مذاہب عالم کے تمام عقائد باطلہ کی فہرست تیار کرنا پھر ان کا رد از روئے قرآن بیان کرنا طویل کام ہے اور نہ یہاں گنجائش ہے۔ صرف چند باطل عقائد اور نظریات کا رد اختصار کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔

عقیدہ ثنویت

یہ عقیدہ زرتشت مذہب کا ہے وہ دو خدا اہرمن اور یزداں کے قائل ہیں اس کے رد میں قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ إِنَّمَا هُوَ إِلٰهٌ وَاحِدٌ (۱۶:۵۱) اور اللہ نے کہا دو معبود مت بناؤ وہ صرف اکیلا ہی معبود ہے۔

عقیدہ تثلیث کا رد

یہ عقیدہ عیسائیوں کا ہے اس کے رد میں قرآن مجید آتا ہے۔ فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَلَا تَقُولُوا ثَلٰثَةٌ انْتَهُوا خَيْرًا لَكُمْ إِنَّمَا اللّٰهُ إِلٰهٌ وَاحِدٌ (النساء ۴:۱۷۱) پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ مت کہو تین ہیں اس عقیدہ سے رک جاؤ یہ تمھارے لیے بہتر ہے اللہ صرف ایک ہی معبود ہے۔

عقیدہ کفارہ کا رد

عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ رحم بلا بدل نہیں کر سکتا اس لیے بیٹا (عیسیٰ) انسانوں کے گناہوں

کے معاوضہ کے طور پر صلیب پر چڑھ گئے۔ اب جو بھی کفارہ پر ایمان لے آئے گا وہ نجات کا مستحق ہو جائے گا۔

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت بیان کر کے اس باطل عقیدہ کی تردید کر دی ہے۔ قرآن کی رو سے رحمان وہ ذات ہے جو انسانوں پر رحم بلا بدل کرتی ہے۔ دوسری دلیل یہ دی۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (الزمر ۳۹:۷) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا پھر تمھارے لیے رب کی طرف تمہارا لوٹ کر جانا ہے پس وہ تمھیں اس کی خبر دے گا جو تم کرتے تھے۔ وہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔

عقیدہ ابنیت کا رد

یہ یہود اور عیسائیت کا عقیدہ ہے۔ یہود نے عزیر کو اللہ کا بیٹا بنا لیا تھا اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو۔ اس رد میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ مَا يَنْبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا (مریم ۱۹:۹۲) خدائے رحمان کی یہ شان نہیں کہ وہ بیٹا بنائے۔

عقیدہ تناسخ کا رد

یہ عقیدہ ہندوؤں کا ہے اس عقیدہ کی رو سے خدا گناہ معاف نہیں کر سکتا اس وجہ سے ایک انسان کو اپنے برے اعمال کی سزا بھگتنے کے لیے مختلف جونوں میں تبدیل ہونا پڑتا ہے۔ قرآن مجید نے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (خدا جزا و سزا کے وقت کا مالک) میں اس عقیدہ کا رد کر دیا ہے۔ پھر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفات غَافِرِ الذَّنْبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ (المومن ۴۰:۳) یعنی (اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔) بیان کی ہیں۔

روح و مادہ کی ابدیت کا رد

یہ عقیدہ ہندوازم کا ہے اس عقیدہ کی رو سے خدا کی صفات میں شرک لازم آتا ہے۔ قرآن مجید نے شرک کی ہر قسم کا رد کیا ہے۔

سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کو رب العالمین کہا ہے۔ رب کا لفظ استعمال کر کے یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں کوئی شریک نہیں وہ مادہ اور روح کا بھی رب ہے۔

شرک کا رد

اسلام سے پہلے تمام مذاہب شرک کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے۔ کہیں بتوں کی پوجا ہو رہی تھی۔ کہیں مظاہر قدرت خدائی روپ دھارے ہوئے تھے۔ قرآن مجید نے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ کہہ کر ہر قسم کے شرک کو رد کر دیا۔

رسولوں اور نبیوں کے گندے الزامات کا رد

مختلف مذاہب کی کتب میں رسولوں کے خلاف گندے الزامات لگائے گئے تھے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جھوٹ بولا۔ حضرت لوط علیہ السلام اپنی بیٹیوں سے فعل شنیعہ کے مرتکب ہوئے۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے بچھڑے کا بت بنایا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریا کی بیوی سے زنا کیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیوی کو خوش کرنے کے لیے بتوں کی پوجا کی۔

قرآن مجید نے بَلْ عِبَادٌ مُكْرَمُوْنَ (وہ معزز بندے ہیں) کہہ کر تمام رسولوں کو معصوم عن الخطا قرار دیا۔

وحی کو اپنے لیے ہی مخصوص قرار دینا

ہر مذہب والا اپنی کتاب کو ہی منزل من اللہ سمجھتا ہے۔ دوسری اقوام کو وحی الٰہی سے محروم۔ قرآن مجید نے اس باطل عقیدہ کا رد کیا ہے اور یہ اعلان کیا ہے کہ وحی ایک عالمگیر حقیقت ہے یعنی ہر نبی اپنی قوم کی طرف کتاب لے کر آیا ہے۔ قرآن مجید وَاِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (۲۴:۳۵) ہر قوم کی طرف نبی نذیر بن کر آیا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ہر قوم کی طرف ہادی آئے ہیں۔

قرآن مجید نے مذکورہ باطل نظریات کے علاوہ ملائکہ، دوزخ، جنت اور اس کے دیگر مابعد الطبیعیات سے متعلق غلط نظریات کی بھی اصلاح کی ہے۔

تقابل ادیان سے متعلق اسلامی خدمات

تقابل ادیان، علم کلام کی ایک قسم ہے۔ چنانچہ جہاں متکلمین نے علم کلام کی دیگر شاخوں سے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہاں تقابل ادیان پر بھی بیش بہا قیمتی ادب چھوڑا ہے۔ اس تمام ادب کا سرچشمہ قرآن مجید ہے۔ گو تقابل ادیان کا مطالعہ نزول قرآن سے شروع ہو گیا تھا۔ اور تمام مسلمان ادیان کے غلط نگاہ سے آگاہ تھے۔ لیکن بحث و مناظرہ، مطالعہ اور لکھنے کا رواج خلیفہ مامون الرشید کے دور میں شروع ہوا جب اس کے دربار میں ہر مذہب کے علماء ہوتے تھے۔ ہفتہ میں ایک مجلس منعقد کی جاتی تھی۔ جس میں ہر مذہب کا عالم متنازعہ مسائل پر بحث کرتا۔

ابو الہذیل علاف

مامون کے دربار سے منسلک تھا ماموئی دور کا سب سے بڑا مناظر تھا۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ بہت سے مجوسی ابوالہذیل سے مناظرہ کرنے کے لیے آئے۔ ابوالہذیل نے دلائل قاطعہ سے سب کو خاموش کر دیا۔ ان میں میلاس نام ایک مجوسی تھا۔ وہ اسی وقت دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ ابوالہذیل کی ایک تصنیف "میلاس" اس میلاس کے نام پر ہے۔ شرح ملل و نحل میں ہے کہ تین ہزار اشخاص اس کے ہاتھ پر اسلام

آئے۔ مامون کے دور میں ایک مجلس مناظرہ منعقد ہوئی۔ جس میں ہر مذہب کے علماء کو مدعو کیا گیا۔ مجوسیوں کے پیشوائے اعظم نے بھی شرکت کی۔ ابوالہذیل اور یزدان بن بخت کا مناظرہ ہوا تو ابوالہذیل کو نمایاں فتح ہوئی۔

ابواسحاق ابراہیم بن سیار نظام

مناظر ابوالہذیل کے تلامذہ میں سے تھا۔ نظام کو مذاہب اور سماوی کتب پر بڑا عبور حاصل تھا۔ تورات، انجیل اور زبور اس کو زبانی یاد تھی بلکہ اس کی تفاسیر سے بھی واقف ہے۔

ہشام بن الحکم

یحییٰ برمکی کی علمی مجالس کا افسر اور علوم عقلیہ کا ماہر تھا۔ ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں اس کی بہت سی کتب کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔ الرد علی الزنادقہ الرد علی اصحاب الاثنین الرد علی اصحاب الطبائع (مادہ پرستوں کا رد) کتاب علی ارسطو طالیس فی التوحید۔ گو کتب ناپید ہیں لیکن ناموں سے نفس مضمون کا علم ہو جاتا ہے۔

واثق باللہ کا دربار بھی علماء سے بھرا رہتا تھا۔ مناظرہ کی مجالس منعقد ہوتی تھیں۔ مورخ مسعودی نے ان مجالس کے مناظرات کا ذکر کتاب آخر الزمان میں کیا ہے۔

ابن حزم

ابن حزم نے علم کلام میں دو کتب لکھیں ایک میں تورات اور انجیل کی تحریف کا ذکر ہے۔ ابن خلکان کا یہ دعویٰ ہے کہ اس مضمون پر یہ پہلی تصنیف ہے۔ دوسری کتاب الفصل فی الملل والاہواوالنحل ہے اس میں دہریہ فلاسفہ مجوس، انصاری اور یہود کے اصول عقائد پر بحث کی گئی ہے۔ پھر ان کا رد بیان کیا گیا ہے۔

علامہ محمد بن عبدالکریم شہرستانی

علامہ صاحب نے بے شمار کتب چھوڑی ہیں۔ مذاہب عالم پر دو کتب بہت اہم ہیں۔ تلخیص الاقسام المذاہب الانام اور ملل ونحل ہے۔ لیکن علامہ صاحب ملل ونحل کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوئے۔ ملل ونحل کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ میں تمام اسلامی فرقوں اور دوسرے میں تمام مذاہب کا ذکر ہے۔

ابن تیمیہ

بے شمار کتب کے مصنف ہیں۔ رد نصاریٰ پر چار جلدوں میں کتاب لکھی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

حضرت شاہ صاحب نے کلامی مسائل پر اپنی کتب حجۃ اللہ البالغہ میں بحث کی ہے۔ وہاں مذاہب پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تمام مذاہب کی اصل ایک ہی ہے۔ دیگر مذاہب کے متنازعہ مسائل مثلاً روح

کی حقیقت، جزا و سزا کی حقیقت، عالم مثال، نبوت کی حقیقت، اختلاف شرائع کے اسباب اور ایک ایسے مذاہب کی ضرورت جو تمام مذہب عالم کا ناسخ ہو پر بحث سیر حاصل بحث کی ہے۔

یعقوب کندی

مشہور فلاسفر یعقوب کندی نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے چنانچہ ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں ان دو رسالوں کا ذکر کیا ہے۔ رسالة فی الرد علی المنانیہ یعنی منانیہ کا رد۔ یہ پارسیوں کا ایک فرقہ تھا۔ رسالة فی الرد علی الثنویہ ثنویہ کا رد جو دو خدا کے قائل تھے۔ رسالة فی الاحتراس من خدع السوفسطائیں فرقہ سوفسطایہ کے شکوک وشبہات کا رد۔

جاحظ

جاحظ نے بھی یہود ونصاریٰ کے رد میں کتب لکھی ہیں۔

مذاہب عالم کے رد میں لکھنے والوں میں سے دو شخص خاص طور پر مشہور ہیں۔ عبداللہ ترجمان اور یحییٰ بن حزلہ، یحییٰ بن حزلہ ابتداء میں عیسائی تھا۔ اسلام لایا چونکہ تورات اور انجیل کا ماہر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارہ میں پیشگوئیوں پر جو تورات اور انجیل میں پائی جاتی تھیں، کتاب لکھی۔ اس موضوع پر غالبًا پہلی کتاب ہے۔

ڈاکٹر علی شریعتی۔ ادیان کی پرکھ اور تجزیہ (اردو ترجمہ)

دور قدیم کے متکلمین کا جنھوں نے مذاہب کے عقائد باطلہ کا رد کیا ہے۔ ذکر کر دیا گیا ہے۔ سب کا احاطہ کرنا مشکل ہے اب صرف چند ایک ہندوستانی متکلمین کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب ہندوستان سے اسلامی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اور انگریز قابض ہو گئے۔ تو انگریز کے غلبہ اور تسلط کو قائم رکھنے کے لیے پادریوں کی فوج ہندوستان میں آ گئی۔ اس وقت کے علماء کرام توصیف کے مستحق ہیں۔ انھوں نے پادریوں کا مقابلہ کیا۔ اور ان کے باطل عقائد (تثلیث۔ کفارہ) کو رد کیا۔ اس کے ساتھ اسلام کی برتری ثابت کی۔ جو بھی پادری اسلام پر اعتراضات کرتا تھا ان کا رد کیا۔ ان میں سے دیوبند کے علماء خصوصاً محمد قاسم نانوتوی مشہور ہیں۔ ان کے مناظرے تاریخ کے اوراق میں مشہور ہیں۔ ایک مناظرہ شاہجہاں پور میں ہوا۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے عیسائی لاٹ پادری کو بری طرح زک دی۔ اس طرح رڑکی کے مناظرے میں اہم اسلامی خدمت انجام دی۔ اس سلسلہ میں آپ کی مشہور کتاب ''قبلہنما'' ہے۔

مشہور مناظرین میں سے مولانا محمد ثناء اللہ صاحب امرتسری ہیں۔ جن کی تمام عمر عیسائیوں، آریوں کے ساتھ مناظرہ میں گزری۔ مذاہب کے باطل عقائد پر کئی کتب منصۂ شہود پر آئیں۔

آریہ و ہنود کے رد میں کتب

۱۔ حق پرکاش، سیتارتھ پرکاش کا جواب ہے۔

۲۔ حدوث دنیا ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے۔ مادہ ازلی ابدی ہے لہٰذا دنیا قدیم ہے۔ اس نظریہ کا رد ہے۔
الہامی کتاب اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ الہامی اور محفوظ کتاب قرآن مجید ہے یا انجیل۔

بحث تناسخ

اس میں عقیدہ تناسخ کا رد کیا گیا ہے۔ ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ ایک انسان کی روح اپنے گناہوں کی وجہ سے مختلف روپ دھارتی رہتی ہے۔ کبھی شیر میں آ جاتی ہے کبھی کتے میں کبھی دیگر قالبوں میں ڈھل جاتی ہے۔ ان کے علاوہ جہاد، وید، اصول آریا، نکاح آریا، الہام، ترکِ اسلام اور ثمرات تناسخ مشہور کتب ہیں مولانا نے صرف آریا کے خلاف ہی دینی ادب پیدا نہیں کیا بلکہ بعض ان کے اہم مناظرے ہیں۔ مثلاً مباحثہ جبل پور، مناظرہ نگینہ، مناظرہ آلہ آباد، وغیرہ حضرت مولانا نے اسلام اور مسیحیت، توضیح القرآن مسیحیت کی عالمگیری دین فطرت کے جواب میں رقم فرمائی۔ اس کے علاوہ عیسائیت کے رد میں تقابل ثلاثہ، توحید و تثلیث ہدایت نصاریٰ، تحریفات بائبل مشہور ہیں۔

سرسیّد احمد صاحب نے بھی عیسائیت کے اعتراضات کے رد میں ایک اہم کتاب ''خطبات احمدیہ'' لکھی۔ ''لائف آف محمد'' میں لارڈ میور نے اسلام پر اعتراضات کیے ہیں۔ ان کا جواب دیا گیا ہے۔

چند مشہور تقابل ادیان کی کتب کا ذکر مناسب ہوگا۔

۱۔ اظہار الحق از علامہ رحمت اللہ کیرانوی صاحب
۲۔ رحمۃ للعالمین حصہ سوم از سیّد سلیمان منصور پوری صاحب
۳۔ آئینہ حقیقت نما اکبر شاہ نجیب آبادی صاحب
۴۔ فلسفہ اسلام از مرزا محمد سلطان صاحب
۵۔ یہودیت قرآن مجید کی روشنی میں از سیّد مولانا مودودی صاحب
۶۔ عیسائیت کیا ہے از وحید احمد خان صاحب
۷۔ آئینہ تثلیث از مولانا کوثر نیازی صاحب
۸۔ ادیان عالم اور فرقے ہائے اسلام از سیّد علی حیدر
۹۔ اسلام اور دنیا کے مذاہب از غلام نبی احمد
۱۰۔ ادیان و مذاہب کا تقابلی مطالعہ از پروفیسر ڈاکٹر عبدالرشید
۱۱۔ غیر سامی مذاہب کے بانی از الطاف جاوید

۱۲۔ یہودیت از ڈاکٹر قاضی مجیب الرحمن صاحب

۱۳۔ دنیا کے بڑے مذاہب از عماد الحسن فاروقی

۱۴۔ نصرانیت قرآن کی روشنی میں از سیّد مولانا مودودی صاحب

۱۵۔ عیسائیت کیا ہے از مولانا محمد تقی صاحب

۱۶۔ تاریخ مذاہب از پروفیسر ارشد احمد

بعض وہ کتب ہیں جو اسلام کے متعلق لکھی گئی ہیں لیکن ضمنی طور پر ان میں تقابل ادیان بھی کیا ہے اور غیر مذاہب کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے۔

۱۔ روح اسلام از سید امیر علی صاحب

۲۔ اسلام کا نظریہ حیات از خورشید احمد

۳۔ خطبات مدارس از سیّد سلیمان صاحب ندوی

۴۔ سیرت سیّد البشر از پروفیسر غلام رسول

۵۔ تحقیق الجہاد از مولوی چراغ علی صاحب

۶۔ الجہاد فی الاسلام از سیّد مولانا مودودی صاحب

۷۔ سیرت النبی از مولانا شبلی و سیّد سلمان ندوی

تفاسیر

کوئی بھی ایسی تفسیر نہیں جس میں مذاہب عالم کے باطل عقائد کا رد نہ ہو۔ تفاسیر کا ایک وسیع دفتر ہے اس کا احاطہ کرنا مشکل اور طوالت کا باعث ہے۔ چند کہ عربی اور اردو کی تفاسیر کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔

۱۔ تفسیر ابن جریر از محمد بن جریر بن یزید

۲۔ احکام القرآن از ابوبکر احمد بن علی الرازی ابوالجصاص

۳۔ تفسیر امام غزالی

۴۔ معالم التنزیل شیخ الامام محی السنہ ابومحمد حسین بن مسعود الفراء

۵۔ تفسیر کشاف از علامہ ابوالقاسم جار اللہ محمود بن عمر الزمخشری

۶۔ تفسیر مفاتیح الغیب یا تفسیر کبیر از امام فخر الدین محمد بن عمر رازی

۷۔ مطلع انوار التنزیل و مفاتیح اسرار التاویل از عبدالرزاق بن رزق اللہ بن ابی بکر حنبلی

۸۔ تفسیر انوار التنزیل از قاضی ناصر الدین عبداللہ بن عمر

۹۔ فتح القدیر از احمد بن محمد بن عبدالولی المقدسی

۱۰۔ تفسیر القرآن از ابوالعباس احمد بن تیمیہ

۱۱۔ البحر المحیط از شیخ ابو حیان محمد بن یوسف اندلسی
۱۲۔ تفسیر جلالین از شیخ جلال الدین محمد بن احمد محلی اور امام جلال الدین سیوطی
۱۳۔ تفسیر بقاعی از شیخ برہان الدین ابراہیم بن عمر
۱۴۔ تفسیر مظہری از قاضی ثناء اللہ صاحب
۱۵۔ روح المعانی از علامہ محمود الوسی بغدادی
۱۶۔ فتح البیان از نواب صدیق حسن خان قنوجی بھوپالی
۱۷۔ تفسیر المنار از شیخ محمد رشید رضا المصری
۱۸۔ فی ظلال القرآن از سیّد قطب مصری

اردو کی چند تفاسیر

۱۔ تفسیر سر سیّد احمد
۲۔ بیان القرآن از مولانا اشرف علی تھانوی
۳۔ تفسیر ثنائی از مولوی ثناء اللہ امرتسری
۴۔ ترجمان القرآن از ابوالکلام آزاد
۵۔ تفسیر ماجدی از مولانا عبدالماجد دریا آبادی
۶۔ تفہیم القرآن از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب
۷۔ تدبر القرآن از مولانا امین اصلاحی صاحب

باب ۱

وحی الٰہی

وحی الٰہی

مذہب کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے۔ اس لیے مذہب سے متعلق بحث کرنے سے قبل وحی الٰہی پر بحث کرنا ضروری ہے۔ مابعد الطبیعیات کے مسائل میں سے سب سے ادق اور مشکل مسئلہ یہی ہے۔

وحی کی لغوی بحث

وحی کے معنی لغت میں حسب ذیل ہیں:

الوحی الاشارة الكتابة والرسالة والكلام الخفی وكل ما القية الى غير یعنی وحی کے معنی اشارہ کرنا، لکھنا، پیغام دینا، دل میں ڈالنا، چھپا کر بولنا اور جو کچھ تم کسی دوسرے کے خیال میں ڈالو۔

کسائی عرب کا محاورہ لکھتا ہے۔ **وحيت اليه بالكلام و اوحيه اليه هو ان تكلم بكلام تخفيه من غيره** یعنی کسی سے اس طرح کلام کرو کہ اس کو دوسروں سے چھپاؤ۔ ابو اسحاق لغوی کہتا ہے۔ **اصل الوحی فی اللغة كلّها اعلام فی خفاء** یعنی وحی کا اصل مفہوم تمام لغت میں چھپا کر اطلاع دینا ہے۔

مفردات میں راغب اصفہانی لکھتے ہیں: **اصل الوحی الاشارة السريعة لتضمن السرعة قيل امر وحی ذاک يكون بالكلام علی سبيل الرمز والتعريض و قديكون بصوت مجرد عن التركيب و باشارة ببعض الجوارح و بالكتابة** یعنی وحی کے اصل معنی ہیں۔ اشارہ سریعہ اسے سرعت کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ امر وحی یعنی جلد سے جلد ظاہر ہونے والی بات اور یہ کبھی تو گفتگو سے ہوتی ہے کبھی اشاروں، کنایوں میں محض آواز صوتی ہے جو حروف و الفاظ کی ترکیب و ربط سے خالی ہوتی ہے اور کبھی اعضاء کے اشاروں سے ہوتی ہے اور کبھی تحریر کے ذریعے سے۔

اقرب الموارد میں ہے۔

وحی اليه اشاره (اشارہ کیا)

وحی و اوحی الكتاب كتب (لکھا)

وحی اليه الكلام كلمة خفيا (آہستہ بولا)

وحی الرجل اسرع (تیزی اختیار کی)

وحی الذبیحة ذبحها ذبحا و حیاً (سرعت کے ساتھ ذبح کر دیا)

وحی اللّٰہ فی قلبه الهمه (الہام کیا)

وحی اللّٰہ ارسل اللّٰہ رسولاً (رسول بھیجا)

مذکورہ بالا معانی کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے لفظ کے معنی میں سرعت اشارہ اور اخفا کا مفہوم مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

لفظ وحی کا استعمال قرآن مجید میں

قرآن مجید میں وحی کا استعمال دو طرح پر ہوا ہے۔ اوّل لفظ وحی کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف ہے دوم غیر اللہ کی طرف۔

وہ آیات جن میں خدا تعالیٰ نے اپنی طرف فعل وحی کی نسبت مختلف معنوں میں فرمائی ہے ہر جگہ موحی الیہ کی رعایت سے وحی کے معانی جدا جدا ہیں۔

۱۔ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ وَهِىَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَاۗىِٕعِيْنَ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَاۗءٍ اَمْرَهَا ۭ[1] پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا سو اسے اور زمین کو کہا۔ آ جاؤ خوشی سے یا ناخوشی سے۔ انھوں نے کہا ہم دونوں خوشی سے حاضر ہوتے ہیں۔ پس اس نے سات آسمان دو دن میں بنائے اور ہر آسمان میں اس کا امر وحی ہے۔

۲۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا يَوْمَىِٕذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا۔[2] جب زمین اپنا ہلا نا ہلائی جائے گی اور زمین اپنا بوجھ باہر نکال پھینکے گی اور انسان کہے گا اسے کیا ہوا ہے؟ اس دن وہ اپنی سب خبریں (زبان حال) سے بیان کر دے گی کیونکہ تیرے رب نے اس کے لیے وحی کی ہے۔

پہلی مثال میں خدا کا آسمانوں اور زمین سے کلام کرنا اور آسمانوں کی طرف اپنی وحی بھیجنا ظاہر کرتا ہے کہ ایک قسم کی ایسی وحی بھی ہے جس کے ذریعے قوانین الٰہیہ اس وسیع کائنات میں کام کرتے ہیں۔

دوسری آیت میں اس انقلاب عظیم کو بھی ایک قسم کی وحی قرار دی ہے جو زمین پر لایا جاتا ہے۔

۳۔ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا[3] اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں میں گھر بنا۔

اس آیت کریمہ میں شہد کی مکھی جو عمل اپنی طبعی حس سے کرتی ہے اس کو وحی کا نام دیا ہے:

---

[1] حم سجدہ ۴۱: ۱۱، ۱۲۔ [2] الزلزال ۹۹: ۱۔۵۔ [3] نحل ۱۶: ۶۸۔

۴۔ اِذْ یُوْحِیْ رَبُّکَ اِلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیْ مَعَکُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا [1] جب تیرا رب فرشتوں کو وحی کرتا تھا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں سو جو ایمان لائے ان کو ثابت قدم رکھو اس آیت میں وحی فرشتوں کو کی گئی ہے۔

۵۔ مسیح کے حواریوں کے لیے وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ [2] اور جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔

۶۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف۔ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْہِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْہِ فَاَلْقِیْہِ فِی الْیَمِّ وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ اِنَّا رَآدُّوْہُ اِلَیْکِ وَجَاعِلُوْہُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ [3] اور موسیٰ کی ماں کو ہم نے وحی کی کہ اسے دودھ پلا۔ پھر جب اس کے متعلق تجھے خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور نہ ڈرنا اور نہ غم کرنا۔ ہم اسے تیری طرف واپس لائیں گے اور مرسلوں میں سے بنائیں گے۔

پانچویں اور چھٹی مثال میں وحی غیر نبی کو کی گئی ہے۔ جس سے مراد وحی ولایت اور مبشرات ہیں۔

وہ آیات جن میں غیر اللہ کی طرف وحی کی گئی ہے۔

۱۔ رسول: فَاَوْحٰٓی اِلَیْہِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُکْرَۃً وَّ عَشِیًّا اشارہ سے کہا کہ صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو۔

۲۔ فرشتے: وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ [4] اور کسی بشر کے لیے میسر نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے۔ مگر وحی سے یا پردہ کے پیچھے سے یا رسول بھیجے پس اپنے حکم سے جو چاہے وحی کرے۔

۳۔ شیطان: وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِہِمْ لِیُجَادِلُوْکُمْ [5] یعنی بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں وحی کرتے ہیں کہ وہ تم سے جھگڑتے ہیں۔

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ یُوْحِیْ بَعْضُہُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا [6] اور اسی طرح ہم نے ہر ایک نبی کے لیے انسانوں اور جنوں میں سے شیطانوں کو دشمن بنایا اور دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں طمع کی باتیں ڈالتے رہتے ہیں۔

وحی کی اصطلاحی تعریف

وحی کی انتہائی اعلیٰ صورت کے لحاظ سے اس کے اصطلاحی معنی یہ ہیں: "الکلمۃ الالھیۃ تلقی الی انبیائہ و اولیاء ہ وحی" (راغب) یعنی وحی وہ کلمہ الٰہیہ ہے جو اس کے انبیاء اور اس کے اولیاء پر نازل ہوتا ہے۔

[1] الانفال ۸:۱۲۔ [2] المائدہ ۵:۱۱۱۔ [3] القصص ۲۸:۷
[4] الشوریٰ ۴۲:۵۱۔ [5] الانعام ۶:۱۲۱۔ [6] الانعام ۶:۱۱۲

پس وحی قادر وتوانا خدا کا اپنے برگزیدہ بندہ کے ساتھ یا اس کے ساتھ جس کو برگزیدہ کرنا چاہتا ہے مکالمہ ومخاطبہ کا نام ہے۔

وحی کی اقسام

وحی کی حسب ذیل اقسام ہیں۔

وحی فطری

فطری وحی جیسے شہد کی مکھی اپنی طبعی حس سے چھتہ بنا کر اس میں شہد جمع کرتی ہے۔ اسی طرح دیگر حیوانات کے کارنامے بھی اسی قسم کی وحی حیوانات سے مختص ہیں۔ قرآن مجید میں ہے۔ وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِی مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا [1] اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں میں گھر بنا۔

وحی ایجادی

جب کوئی شخص کسی چیز کی ایجاد پر اپنی تمام توجہ مبذول کر دیتا ہے تو قدرتِ الٰہی اس شخص کے ذہن پر اس چیز کا نقشہ مرتسم کر دیتی ہے تو وہ موجد اپنی مطلوبہ کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ وحی اور الہام عام انسانوں کو ہوتا ہے۔ چاہے وہ مومن ہوں یا غیر مومن۔ ارشاد الٰہی ہے۔ کُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّکَ وَمَا کَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحْظُوْرًا۔ [2] ہم سب کو مدد دیتے ہیں ان کو بھی اور ان کو بھی (مومن اور غیر مومن) تیرے رب کی عطا سے اور تیرے رب کی عطا کبھی رکتی نہیں۔

وحی الابتلاء

وحی الابتلاء بعض اوقات ہلاکت اور تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ وحی الابتلاء ہر شخص کو نہیں ہوتی جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ جسمانی طور پر اندھے، گونگے بہرے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح بعضوں کی روحانی قوتیں کالعدم ہوتی ہیں لیکن بعض لوگ اس قسم کے بھی ہوتے ہیں۔ وہ قدرت کی طرف سے ایسا دماغ اور فطری استعدادیں لے کر پیدا ہوتے ہیں کہ ان کو سچی خوابیں اور سچے الہام ہوتے ہیں لیکن ان کو خدا کے قرب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر تحقیق وتدقیق سے کام لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ایسی خوابوں میں فاسق، فاجر، کافر، ملحد، زانی مرد اور زانیہ عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ وہ اس روشنی اور نور سے بالکل محروم ہوتے ہیں جو مقربین اور اہل اللہ کی تمام دنیاوی الائشوں کو بالکل بھسم اور نیست ونابود کر دیتا ہے۔

دنیا میں بے شمار ایسے آدمی ہو گزرے ہیں جن کو اپنے الہاموں اور خوابوں پر ناز تھا لیکن جب ان کی نجی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا۔ وہ ایسے افعال قبیحہ میں مبتلا تھے۔ جن کی سنگینی خود گناہوں

---

[1] النحل ۱۶:۶۸۔ [2] بنی اسرائیل ۱۷:۲۰۔

کولرزہ براندام کر دیتی ہے۔ اگر ان کے بدافعال کی سیاہی دنیا میں پھیلا دی جائے تو دنیا سے نیکی کا نور بھی دب جائے۔ وہ ہر وقت شیطانی طاقتوں اور حدیث النفس سے مغلوب رہتے تھے۔ ان کی وہ سچی خوابیں اور الہام کسی روحانی وجاہت، بزرگی اور قرب الٰہی پر صاد نہیں۔ ابن سیرینؒ بہت بڑے معبر ہو گزرے ہیں۔ آپ کے پاس ایک شخص نے بیان کیا کہ اس نے خواب میں دیکھا ہے کہ اس کے آستین میں چڑیاں گھستی اور نکل جاتی ہیں۔ آپ نے تعبیر کی کہ یہ شخص قاتل ہے۔ جب اس کے گھر کی تلاشی لی گئی تو بے شمار مقتولوں کی ہڈیاں نکلیں۔ اسی طرح ایک شخص نے دیکھا کہ وہ انڈوں کی زردی چھوڑ دیتا ہے۔ آپ نے تعبیر کی کہ یہ چور ہے۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے ذلیل کردار کے مالکوں کی بھی خوابیں سچی نکل آتی ہیں۔

اس قسم کے لوگوں کو سچی خوابیں آنے کے دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے کے لیے حجت ہیں۔ اگر وہ سچی خوابوں کی حقیقت سے بالکل آشنا نہ ہوں تو وہ خدا کے سامنے یہ عذر کر سکتے ہیں کہ ان کو نبوت کی حقیقت کا علم نہیں تھا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عنایت ازلی نے انسانی فطرت میں قرب الٰہی کے حصول کے لیے تخم ریزی کی ہے۔ بعضوں کو سچی خوابیں اور الہام اس وجہ سے ہو جاتے ہیں تا کہ ان کو معلوم ہو سکے کہ ان کے لیے آگے قدم رکھنے کے لیے ایک کھلا روحانی میدان ہے۔ جس کو طے کر کے قرب الٰہی حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر ان پر سچی خوابوں کا دروازہ بند ہو جائے تو وہ بیج جو خدا نے اپنے ہاتھ سے انسان کی فطرت میں بویا ہے بالکل ضائع ہو جاتا ہے۔

وحی الابتلاء کے ضمن میں ایک اور گروہ بھی ہے جن کو سچی خواب اور الہام ہوتے ہیں۔ ان کا خدا سے کچھ تعلق بھی ہے وہ اپنی اصلاحِ نفس کے لیے کوشش کرتے ہیں اور خدا کے قرب کی طرف قدم مارتے ہیں۔ ایک سطحی قسم کی نیکی کی تاثیر ان میں پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ایک محدود دائرہ تک رویاء صادقہ کے انوار ان میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر ظلمت، تاریکی اور ابتلاء سے خالی نہیں ہوتے۔ وہ تقویٰ کی باریک راہوں سے نابلد ہوتے ہیں۔ راست بازی اور قلبی طہارت سے خالی ہوتے ہیں۔ ان کے دل کے پردوں میں تکبر، نخوت، عجب، دنیا پرستی اور نفس پرستی مضمر ہوتی ہے۔ شیطان ان کے دروازے پر کھڑا ہوتا ہے۔ ذرا سی لغزش کے وقت ان کے گھر کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ ان کو ہلاکت اور بربادی کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔ ہاں اگر خدا کا فضل ان کے شامل حال ہو جائے تو وہ پردے میں ہی اس دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ ان کی مثال اس طرح کی ہے کہ صاف شفاف پانی ہو اس کے نیچے گبر اور گند ہو اگر ہوا کا جھونکا نہ آئے تو گند اپنی جگہ پر ہی ساکن رہتا ہے۔ ذرا تیز ہوا کا جھونکا آ جائے تو پانی کی لہریں ہی گند کو پانی کی سطح کے اوپر لے آتی ہیں اور گند ظاہر ہو جاتا ہے۔

وحی الاصطفاء

وحی الاصطفاء کے دائرہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو خدا کی محبت اور عشق کی آگ میں داخل ہو کر گناہوں کی آلائشوں کو بالکل جلا دیتے ہیں۔ وہ اکمل اور اتم طور پر خدا تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ ان کی اللہ تعالیٰ سے قرب اور تعلق کی یہ نشانی ہوتی ہے۔ وہ خدا کی صفات کے مظہر بن جاتے ہیں۔ اپنے اوپر ایک موت وارد کر لیتے ہیں۔ ایسی روحانی زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں جو بالکل پہلی زندگی سے مغائر ہوتی ہے۔ یہ لوگ روشنی کے اس ارفع مینار پر کھڑے ہوتے ہیں جہاں تاریکیوں اور ظلمتوں کا گزر نہیں ہوتا۔ وہ لوگ شیطان کی گرفت سے آزاد ہوتے ہیں۔ نہ ان پر نفس امارہ غالب آ سکتا ہے۔ نہ حدیث النفس اور نہ شیطان اپنے وساوس ان کے قلوب میں ڈال سکتا ہے۔ وہ بالکل خدا کی آغوش میں ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا [1] اور جو لوگ ہمارے لیے محنت اٹھاتے ہیں ہم یقیناً انھیں اپنے راستوں پر چلائیں گے۔

وحی الاصطفاء کی اقسام

وحی الاصطفاء کی دو قسمیں ہیں۔

ا۔ وحی نبوت یا متلو

یہ وحی، وحی شرعی بھی کہلاتی ہے۔ صرف انبیاء علیہم السلام سے مختص ہے۔ شرعی اصطلاح میں وحی نبوت کی تعریف یہ ہے۔ ”کلام اللہ المنزل علی نبی من انبیائہ.“ [2] اللہ کا وہ کلام جو اس کے کسی نبی پر نازل ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل وحی نبوت ضرورت کے مطابق ایک قوم یا علاقہ کے لیے کسی ایک نبی پر نازل ہوتی تھی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ انسانی عقل نے ترقی کی اور اقوام کے میل جول میں تمام جغرافیائی رکاوٹیں ختم ہو گئیں اور تمام دنیا سمٹ کر ایک کنبہ کی شکل اختیار کر گئی۔ وحدت نسل انسانی کے لیے ایک عالمگیر وحی کی ضرورت تھی۔ وہ وحی قرآن کریم کی شکل میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں بنی آدم کی روحانی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، اخلاقی غرض کہ ہر قسم کی ضروریات کے لیے مجمل اور مفصل تعلیم موجود ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا۔

> ”فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔“ [3]

---

[1] العنکبوت ۲۹:۶۹۔
[2] عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری ص ۱۸ ج ۱ دار الطباعۃ العامرہ استنبول ۱۳۰۸ھ مصنفہ بدر الدین العینی۔
[3] استثناء ۳۳:۲۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا "مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں مگر تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو سچائی کی راہ دکھائے گا۔"[1]

وحی نبوت تدریجاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آ کر قرآن کریم کی شکل میں مکمل ہو چکی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی یہ آیت ظاہر کرتی ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ.[2] یعنی آج میں نے تمھارے لیے دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے۔

۲۔ وحی غیر متلو

وحی نبوت کے علاوہ جو نبی پر وحی نازل ہوتی ہے وہ وحی غیر متلو کہلاتی ہے اور شیطانی تحریکات و اثرات سے بالکل منزہ ہوتی ہے۔ نبی اس وحی کی مدد سے شریعت کے اصول کی تشریح کرتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: انی او تیتُ الکتاب و مثلہ یعنی مجھے کتاب اور اس کی مثل بھی دی گئی ہے۔

کتاب سے مراد وحی متلو یعنی قرآن مجید ہے اور مثل سے مراد وحی غیر متلو یعنی قرآن مجید کے مجملات متشابہات اور فروع کی توضیح وتشریح ہے۔ وحی متلو کا یہ خاصہ ہے۔ اس کے ساتھ تین چیزیں ضروری ہوتی ہیں۔

اوّل: مکاشفات صحیحہ: اس کی مثال رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس دنیا میں کشفی رنگ میں بہشت اور دوزخ کا نظارہ دکھانا ہے۔ قرآن مجید میں جنت اور دوزخ کی خبر ہے۔ کشف نے اس خبر کو معائنہ ومشاہدہ میں بدل دیا اسی طرح آپ کی گذشتہ انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتیں ہوئیں یہ بھی کشفی رنگ میں ہوئیں۔

دوم: رویاء صالحہ: رویاء صالحہ کے ذریعے علم استعارات وحی یاب پر کھل جاتا ہے اور علوم تعبیر میں مہارت پیدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے نبی کمالات اور معارف یقینیہ کی طرف تیزی سے ترقی کرتا ہے۔

سوم: وحی خفی: جو تفہیمات الٰہیہ کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ اس کو وحی غیر متلو بھی کہا جاتا ہے۔ صوفی اس کو وحی خفی اور وحی قلب کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس وحی کی غرض یہ ہوتی ہے کہ وحی متلو کے بعض مجملات اور اشارات نبی پر کھل جائیں۔ مثلاً نماز کا حکم قرآن مجید میں موجود ہے لیکن جس رنگ میں آج مسلمان نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کا ذکر کہیں بھی قرآن مجید میں نہیں ملتا قرآن مجید کے اس مجمل حکم کو وحی خفی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کھول دیا۔

وحی ولایت: جب یہ غیر متلو وحی غیر نبی کو ہوگی تو اس وحی کو وحی ولایت کہیں گے، اولیاء کرام اسی وحی سے مختص ہوتے ہیں۔ ولی کی یہ وحی قانونی حیثیت نہیں رکھتی۔ کتب کلام کا عام مسئلہ ہے۔

---

[1] یوحنا ۱۶:۱۱۔ [2] المائدہ ۵:۳۔

وَالْاَلْهَامُ لَيْسَ بِحُجَّةٍ عِنْدَ الشَّرْعِ ولی کا الہام شرعی قانون نہیں بن سکتا۔

وحی ولایت جاری ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو حواس ظاہری کے مقابل پر حواس باطنی عطا کیے ہیں۔ حواس ظاہری کو کام میں لانے کے لیے قدرت نے خارج میں ہر قسم کا سامان مہیا کیا ہوا ہے تو پھر یہ کیونکر خیال کیا جا سکتا ہے کہ حواس باطنی پہلے تو انسانوں میں موجود تھے۔ اب مفقود ہیں اور ان کی تربیت کا سامان ختم ہو چکا ہے۔ وحی ولایت کے ختم کرنے کے ساتھ یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ انسان میں حواس باطنی مفقود ہو چکے ہیں لیکن یہ خلاف واقعہ چیز ہے۔ انسان کے اندر حواس باطنی جیسے پہلے موجود تھے۔ اب بھی موجود ہیں۔ جب انسان کے اندر حواس باطنی موجود ہیں تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ان کی تربیت اور پرورش کے لیے وحی ولایت کا دروازہ کھلا ہے اور نسل انسانی اللہ تعالیٰ کی اس نعمت سے ہمیشہ متمتع ہوتی رہے گی۔ قرآن مجید اور حدیث دونوں سے اجرائے وحی ولایت کی تصدیق ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ[1] جو ایمان لائے اور تقویٰ کرتے ہیں ان کے لیے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں خوش خبری ہے اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں یہ بڑی بھاری کامیابی ہے۔

البشریٰ جو ایک متقی انسان کو اس زندگی میں دی جاتی ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کی رو سے رویائے صالحہ صادقہ ہیں۔ حدیث صحیح میں اس کی تصریح موجود ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتِ.[2] نبوت میں سوائے مبشرات کے کچھ باقی نہیں رہا۔ صحابہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مبشرات کیا ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا رویا صالحہ۔[3] بخاری میں ابوسعید خدری سے روایت ہے۔ اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَاَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ رویا صالحہ نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔ قرآنی آیت اور احادیث اس بات میں کافی ثبوت بہم پہنچاتی ہیں کہ ولایت وحی اپنی ادنیٰ صورت میں جاری ہے۔ ہاں وحی نبوت جو جبرائیل امین نبی پر لے کر آتا ہے قیامت تک بند ہے۔

قرآن مجید میں خدا تعالیٰ کی بے شمار صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان صفات میں خدا تعالیٰ کا کلام کرنا بھی صفت ہے۔ جس کا ذکر بار بار قرآن مجید میں آتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ.[4] اور کسی بشر کے لیے یہ میسر نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی سے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفات دیکھنا، سننا، مجیب اور باسط وغیرہ ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کی رو

[1] یونس ۱۰:۶۳۔
[2] بخاری ۷:۹۱۔
[3] بخاری ۵:۹۱۔
[4] الشوریٰ ۴۲:۵۱۔

سے کلام کرنا بھی اس کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت بھی معطل نہیں ہو سکتی۔ اس سے نقص لازم آتا ہے اللہ تعالیٰ کی ذات تمام نقائص سے پاک اور منزہ اور تمام خوبیوں کی جامع ہے۔ اگر مبشرات کا دروازہ بند تسلیم کر لیا جائے تو انسان کی پیدائش کی غرض و غایت یہ ہے کہ وہ اپنی روحانی استعدادوں کو زندہ رکھے۔ روحانی زندگی اس وقت تک میسر نہیں آسکتی۔ جب تک وہ مبشرات اور رویاء صالحہ کے پانی سے سیراب نہ ہو۔

اولیاءِ کرام کے تجربات

حضرت عمرؓ ایک دفعہ مسجد نبوی میں خطبہ دے رہے تھے۔ دوران تقریر میں فرمایا:

"یا ساریۃ الجبل" اے ساریہ پہاڑ کی جانب مڑ جاؤ۔ تقریر میں یہ بے ربط جملہ سن کر سامعین حیران تھے۔ کچھ عرصے کے بعد حضرت ساریہ محاذِ جنگ سے واپس آئے تو انھوں نے حضرت عمرؓ سے عرض کی یاامیر المومنین! ہم ایک جگہ کفار کی فوج میں گھر گئے تھے۔ بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ میں نے آپ کی آواز کے مشابہ ایک آواز سنی جو یہ کہہ رہی تھی۔ "اے ساریہ پہاڑ کی جانب مڑ جاؤ" ہم نے اس آواز پر لبیک کہا اور پہاڑ پر چڑھ گئے اور فتح ہوئی آپؓ نے فرمایا ہاں آواز میں نے ہی دی تھی۔

امت محمدیہ کے تمام اولیاء کرام و علماء عظام اس بات کے قائل ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامل اتباع سے انسان اللہ تعالیٰ کے مکالمات و مخاطبات سے مشرف ہو جاتا ہے۔ کتاب فتح ربانی کی ۵۳ ویں مجلس میں لکھا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے کسی نے سوال کیا کہ انبیاء علیہم السلام کی طرف خدا تعالیٰ کا رسول جبرئیل فرشتہ آتا ہے اور اولیاء کی طرف اس کا کون رسول آتا ہے جواب میں فرمایا ان کا بھی بلاواسطہ وہی رسول ہے۔[1]

وحی ولایت کی حقیقت

اولیاء کرام کو ہونے والی وحی ولایت پہلے عالم برزخ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رُوح مبارک پر متجلی ہوتی ہے۔ اس کا عکس اولیاء کے قلوب پر پڑتا ہے۔

وحی نبوت اور وحی ولایت کا شرعی مقام

وحی نبوت کا مقام

وحی نبوت پر ایمان لانا جزو ایمان ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ قَبْلِکَ [2] اور جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا۔

---

[1] فتح ربانی مطبوعہ مصر مجلس ۵۳۔ [2] البقرہ ۲:۴۔

دوسری جگہ آتا ہے: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ [1] رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب کی طرف سے اتارا گیا اور مومن (بھی) سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ وحی نبوت (کتاب) پر ایمان لانا دینی فریضہ ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وحی الٰہی اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان سچا تعلق پیدا کرتے ہیں۔

دوسری حکمت یہ ہے تاکہ بنی آدم میں اتحاد کا رشتہ قائم ہو جائے۔

وحی ولایت کا شرعی مقام

وحی ولایت کسی کے لیے قابل حجت نہیں اور نہ اس کا اتباع فرض ہے۔ کتب کلام کا عام مسئلہ ہے۔ وَالْاِلْهَامُ لَيْسَ بِحُجَّةٍ عِنْدَ الشَّرْعِ ولی کا الہام شرعی قانون نہیں بن سکتا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے مختلف مواقع پر یہ بحث کی ہے کہ اگر کسی مقام پر کسی ولی کا الہام ظاہراً حکم شرعی کے خلاف ہو تو فتویٰ ظاہر شریعت کے مطابق ہوگا۔ علامہ الشاطبی فرماتے ہیں کہ اگر کشف، الہام یا خواب کے ذریعے کوئی ایسی بات معلوم ہو، جو قرآن وسنت کے معروف احکام کے مطابق نہیں ہے تو اس کے تقاضے پر عمل کرنا کسی کے نزدیک جائز نہیں۔ [2]

وحی نبوت ہر ایک شخص پر کیوں نازل نہیں ہوئی

وحی نبوت وہبی امر ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ. [3] اللہ خوب جانتا ہے کہ رسالت (وحی نبوت) کو کہاں رکھنا ہے۔

کفار انکار نبوت میں ایک وجہ یہ بیان کرتے تھے۔ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ. [4] ہم تو ایمان نہیں لائیں گے جب تک وہی وحی نبوت ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی تو اللہ تعالیٰ نے اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ کہہ کر ان کے باطل خیال کی تردید کر دی ہے۔ متذکرہ صدر آیت کے علاوہ وحی نبوت کے وہبی امر ہونے پر یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کا ذکر صفت رحمانیت کے تحت کیا ہے۔ صفت رحمانیت اجر بلا عمل کی متقاضی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس صفت کے ماتحت مادی زندگی کے لیے ہوا، چاند، سورج، ستارے، زمین، پہاڑ، درخت، پانی وغیرہ پیدا کیے ہیں۔ اسی طرح ابدی زندگی کے لیے وحی نبوت کا سلسلہ جاری کیا تھا۔ جس طرح یہ تمام اشیاء موہبت ہیں۔ اسی طرح وحی نبوت بھی وہبی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ. [5] یعنی وہ ہستی رحمان ہی ہے۔

---

[1] البقرہ ۲: ۲۸۵۔ [2] الاعتصام ص ۳۵۱ فما بعد ج ۱ مطبعۃ المنار مصر ۱۳۳۱ھ بحوالہ البلاغ جمادی الاوّل ۱۳۹۳ھ شمارہ ۵۔ [3] الانعام ۶: ۱۲۴۔ [4] الانعام ۶: ۱۲۴۔ [5] الرحمن ۵۵: ۱، ۲۔

جس نے قرآن جیسی کتاب کا علم روحانی زندگی کی تکمیل کے لیے دیا ہے۔

کلام الٰہی تین صورتیں

قرآن کریم کی رو سے اللہ تعالیٰ کی انسان کے ساتھ ہم کلامی کی تین صورتیں ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْمِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَايَشَآءُ[1] اور کسی بشر کے لیے میسر نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے یا پردہ کے پیچھے یا رسول بھیجے اور اپنے حکم سے اس کے ذریعے جو جی چاہے وحی کرے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے کلام کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں۔

۱۔ وَحْيًا ۲۔ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ ۳۔ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ۔

صورت اوّل میں وحی سے مراد مسلمہ طور پر ''القائی الروع'' لیا گیا ہے کیونکہ وحی کے معنی اشارہ سریعہ کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سرعت کے ساتھ ایک خیال بغیر کسی غور وفکر کے اچانک دل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ وہ ایک نیا علم ہوتا ہے جو دل میں بجلی کی سرعت کے ساتھ آتا ہے اور اسرار الہیہ سے پردہ اٹھا دیتا ہے تمام پوشیدہ حقیقتیں سامنے آجاتی ہیں۔ جس طرح تاریک کمرہ میں روشن چراغ آجائے اور کمرہ کی تمام تاریکی کافور ہو جاتی ہے اور ہر ایک نشیب وفراز سامنے نظر آنے لگتا ہے۔ اس کو وحی خفی کہتے ہیں۔ یہ وحی کی ادنیٰ صورت ہے۔ اس میں نبی اور غیر نبی دونوں شامل ہوتے ہیں۔

وحی کی دوسری صورت "مِنْ وراء حجاب" ہے یعنی پس پردہ۔ اس میں رویاء کشف اور الہام شامل ہیں۔ اس صورت میں انسان کو علم حواس باطنی کے ذریعے خارج سے آتا ہے واضح طور پر محسوس تو کرتا ہے۔ مگر متکلم اور نظارہ دکھانے والے کو نہیں دیکھتا۔ اس صورت میں بھی نبی اور غیر نبی دونوں شامل ہیں۔

وحی کی تیسری صورت اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَايَشَآءُ ہے۔ یعنی جبرائیل امین کے ذریعے وحی انسان کو پہنچائی جاتی ہے۔ اس کا نزول بھی خارج سے حواس باطنی پر ہوتا ہے لیکن اس وحی کے لیے حواس سامعہ اور باصرہ مخصوص ہیں۔ یہ وحی انبیاء علیہم السلام پر ہی نازل ہوتی ہے۔ غیر نبی اس میں شامل نہیں ہوتا۔ یہ وحی کی اعلیٰ ترین واضح اور بین اور یقینی صورت ہے۔ قرآن مجید اور دوسری کتب سماوی اس وحی اعلیٰ کی حامل ہیں۔ اس وحی کو وحی متلو بھی کہتے ہیں۔ یعنی وہ وحی جو الفاظ میں پڑھی جاتی ہے۔ اس کو وحی نبوت بھی کہتے ہیں اور قرآنی اصطلاح میں اس کو کتاب کہتے ہیں۔ کتاب اس وجہ سے کہ وہ ایک شاہی فرمان کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے نبی پر نازل کرتا ہے، تاکہ نبی اسے بنی آدم کو پہنچا دے اور لوگ اس فرمان کے مطابق زندگی گزاریں۔

---

[1] الشوریٰ ۴۲: ۵۱۔

نزول وحی کے طریقے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مختلف طریقوں سے وحی نازل کی جاتی تھی۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حارث بن ہشام نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر وحی کس طرح سے آتی ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

اَحْیَانًا یَاتِیْنِیْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَھُوَ اَشَدُّہٗ عَلَیَّ فَیُفْصِمُ عَنِّی وَقَدْ وَعَیْتُ عَنْہُ مَاقَالَ وَاَحْیَانًا یَتَمَثَّلُ لِیَ الْمَلَکُ رَجُلاً فَیُکَلِّمُنِیْ فَاَعِیْ مَایَقُوْلُ[1] یعنی کبھی تو ایسے آتی ہے جیسے گھنٹی کی آواز اور یہ مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے۔ پھر وہ حالت مجھ سے جاتی رہتی ہے اور میں اس سے محفوظ کر لیتا ہوں جو وہ (فرشتہ) کہتا ہے اور کبھی فرشتہ انسان کی شکل میں میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے بات کرتا ہے میں اس کا کہا یاد کر لیتا ہوں۔

اس حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نزول وحی کے دو طریقے بیان کیے ہیں۔

۱۔ صلصلۃ الجرس: پہلا طریقہ یہ ہے آپ کو اس قسم کی آواز سنائی دیتی تھی، جیسی گھنٹیاں بجنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ''صلصلۃ'' دراصل اس آواز کو کہتے ہیں جو لوہے کے ایک ٹکڑے کو دوسرے پر مارنے سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس کا اطلاق ہر اس آواز پر کیا جانے لگا۔ جس میں جھنجھاہٹ ہو چنانچہ شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔

الصلصلة فی الاصل صوت وقوع الحدید علی بعض ثم اطلق علی کل صوت لہ طنین.[2] وحی کی آواز کو ''صلصلۃ الجرس'' سے تشبیہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح گھنٹے کی آواز، صوت محض کی صورت میں سنائی دیتی ہے۔ اور اس کا کوئی مبداء اور مقطع نہیں ہوتا اس طرح وحی کی اس آواز کا جس کو نبی سنتا ہے کوئی مقطع اور مبداء نہیں ہوتا۔ اس بناء پر یہ آواز مرکب نہیں بلکہ بسیط ہوتی ہے۔[3]

صلصلۃ الجرس (گھنٹی کی آواز) سے کیا مراد ہے۔ اس بارے میں مختلف مسلک ہیں۔

۱۔ حضرت امام بخاری فرماتے ہیں کہ یہ خدا کی آواز ہوتی ہے جو تمام فضا میں گونج جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت بیان کرتے ہیں۔ **اذاتکلم اللہ بالوحی** جب اللہ تعالیٰ وحی کے ساتھ کلام کرتا ہے۔

۲۔ ابن حجر عسقلانی کا یہ مسلک ہے کہ یہ آواز فرشتہ وحی کے پروں کی ہوتی تھی۔ حدیث نبویہ سے پتہ چلتا ہے کہ فرشتوں کے پروں سے اس قسم کی آواز آتی ہے۔ چنانچہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

۱۔ صحیح بخاری ص ۲ ج ۱ اصح المطابع کراچی۔ ۲۔ فتح الباری جلد ۱ ص ۱۶، جلد ۸ ص ۴۳۶۔

۳۔ فیض الباری جلد ۱ ص ۱۹۔

نے فرمایا: **إذا قضى الله الامر فى السماء ضربت الملائكة باجنحتها خضعانًا لقوله كانه سلسلة على صفوان فاذا فزع عن قلوبهم قالوا ماذا قال ربكم؟ قالوا للذى قال الحق وهو العلى الكبير**[1] جب اللہ تعالیٰ آسمان میں حکم صادر فرماتے ہیں تو فرشتے خوف کی وجہ سے اپنے پر پھڑ پھڑانے لگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا کلام اس طرح سنائی دیتا ہے۔ جیسے پتھر پر ایک زنجیر کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پس جب ان کے دلوں سے خوف اور گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا حکم صادر فرمایا ہے وہ (مقربین) کہتے ہیں کہ حق بات کا حکم صادر ہوا اور وہ بلند اور بزرگ ہے۔

۳۔ ابن حجر عسقلانی نے ایک اور روایت نقل فرمائی ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں: **اذا تكلم الله بالوحى يسمع اهل السموات صلصلة كصلصلة السلسلة على الصفوان فيفزعون و يرون انه من امر الساعة.**[2] جب اللہ تعالیٰ کوئی وحی فرماتے ہیں تو اہل سماوات اس کو اس طرح سنتے ہیں۔ جس طرح لوہے کی زنجیر ایک صاف پتھر پر پڑنے سے آواز آتی ہے۔ پس وہ (فرشتے) (اللہ تعالیٰ کے جلال کے باعث) ہیبت زدہ ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ قیامت کے متعلق کوئی حکم ہے۔

تیسرا مسلک یہ ہے کہ یہ فرشتہ کی زبان کی آواز ہوتی تھی۔ کئی شارحین بخاری اور جید محدثین اس کے بھی قائل ہیں۔

۴۔ علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ یہاں تشبیہ آواز کے ترنم میں نہیں بلکہ اس کے تسلسل میں ہے، کہ جس طرح گھنٹی کی آواز مسلسل ہوتی ہے اور کسی جگہ ٹوٹتی نہیں اسی طرح وحی کی آواز بھی مسلسل ہوا کرتی تھی۔[3]

۵۔ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی سے نقل کر کے اس تشبیہ کا جو مطلب بیان کیا ہے۔ وہ مذکورہ بالا تمام توجیہات سے زیادہ لطیف ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ یہ تشبیہ صرف دو اعتبار سے دی گئی ہے۔ ایک تو آواز کے تسلسل کے اعتبار سے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے اس اعتبار سے کہ گھنٹی جب مسلسل بج رہی ہو تو عموماً سننے والے کو اس کی آواز کی سمت متعین کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس کی آواز ہر جہت سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور باری تعالیٰ چونکہ جہت اور مکان سے منزہ ہے اس لیے کلام الٰہی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی آواز کسی ایک سمت سے نہیں آتی بلکہ ہر جہت سے آتی ہے۔ اس کیفیت کا صحیح ادراک

---

[1] فیض الباری جلد ا ص ۱۹۱ [2] فتح الباری جلد ۸ ص ۴۳۶۔ [3] فتح الباری مصنفہ حافظ ابن حجر صفحہ ۱۶ ج ا المطبعۃ البہیۃ ۱۳۴۸ھ بحوالہ البلاغ ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ جون ۱۹۷۳ء، جلد ۷ شمارہ ۴۔

تو بغیر مشاہدہ کے ممکن نہیں لیکن اس بات کو عام ذہنوں کے قریب لانے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے گھنٹیوں کی آواز سے تشبیہہ دی ہے۔[1]

عصر جدید میں وحی کی اس صورت میں جو آواز سنائی دیتی تھی۔ اس کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں۔ تار گھر سے جب پیغام کسی دوسرے شہر میں بھیجا جاتا ہے تو الفاظ کو ٹک ٹک کی آواز سے ادا کیا جاتا ہے۔ تار کو وصول کرنے والا کلرک جو اس فن سے واقف ہوتا ہے۔ اس آواز کو سن کر الفاظ میں لکھتا جاتا ہے لیکن ایک عام آدمی کے نزدیک جو اس فن سے نابلد ہوتا ہے۔ وہ ٹک ٹک کی آواز بے معنی ہوتی ہے۔ اسی طرح وحی کی آواز کو جب کوئی دوسرا سن لیتا تھا تو اس کی کیفیت کو اپنے الفاظ میں بیان تو کرسکتا ہے۔ لیکن اس بسیط اور بے جہت آواز کلام الٰہی کو اخذ نہیں کرسکتا تھا۔ یہ کلام صرف نبی سمجھ سکتا تھا۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں۔

وصلصلة الجرس ههنا كنقرات التلقراف لاداء الرسالة۔[2] گھنٹہ کی آواز ٹیلیگراف کی ٹک ٹک کی طرح ہے جو پیغام رسانی کے لیے کی جاتی ہے۔ وحی کی یہ صورت جس کو حدیث میں صلصلة الجرس کے الفاظ میں تعبیر کیا گیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر زیادہ اشد اور اثقل ہوتی تھی۔ حدیث میں آتا ہے۔ اَحْيَانًا يَاتِيْنِي مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ اَشَدُّهُ عَلَيَّ۔[3] کبھی تو وحی ایسے آتی جیسے ایک گھنٹہ کی آواز آتی ہے اور یہ مجھ پر بہت سخت ہوتی۔ قرآن مجید نے اسے قَوْلاً ثَقِيْلاً (وزنی کلام) کہا ہے۔ اس صورت میں وحی اشد اور اثقل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مادیت سے منخلع ہو کر کلی طور پر عالم روحانی کی طرف منتقل ہونا پڑتا تھا تاکہ سامع (آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حامل وحی (جبرئیل علیہ السلام) میں مناسبت سماع پیدا ہو جائے چونکہ اس وقت آپ کی جہت بشری اور جہت ملکوتی میں تصادم ہوتا تھا۔ اس وجہ سے وحی کی یہ صورت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اثقل اور شدید تر ہوتی تھی۔

۲۔ تمثل ملک: وحی کی دوسری صورت جو اس حدیث میں بیان کی گئی ہے یہ ہے کہ فرشتہ انسانی شکل میں آپ کے پاس آ کر پیغام الٰہی پہنچاتا۔ وحی کی اس صورت میں آپ کوئی خاص دشواری اور بوجھ محسوس نہ کرتے۔ چنانچہ صحیح ابو عوانہ کی ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی کی اس صورت کا ذکر کرکے فرمایا: وَهُوَا هونه عَلَيَّ۔[4] اور یہ صورت میرے لیے سب سے زیادہ آسان ہوتی ہے۔

حضرت عائشہؓ کی مذکورہ بالا حدیث میں تو وحی کے صرف دو طریقے بیان کیے گئے ہیں، لیکن دوسری احادیث میں اس کے علاوہ بھی کئی طریقے بیان ہوئے ہیں۔ علامہ حلبیؒ نے لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی چھیالیس مختلف طریقوں سے نازل ہوتی تھی۔[5] لیکن حافظ ابن حجر

---

[1] فیض الباری ص ۱۹، ۲۰ جلد ۱ قاہرہ ۱۳۵۷ھ بحوالہ البلاغ ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ جلد ۷ شمارہ ۴۔

[2] مشکلات القرآن ص ۱۲۴۔

[3] بخاری جلد ۱ ص ۲، ۴۵۷۔

[4] الاتقان ج ۱ ص ۴۶۔

[5] فتح الباری مصنفہ حافظ ابن حجر ج ۱ ص ۱۶۔

لکھتے ہیں کہ انھوں نے کامل وحی (جبرئیل علیہ السلام) کی مختلف صفات کو وحی کے مختلف طریقے شمار کر کے تعداد چھیالیس تک پہنچا دی ہے ورنہ تعداد اتنی نہیں [1]

دوسری احادیث میں نزول وحی کے جو طریقے بیان ہوئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۳۔ فرشتہ کا اصل شکل میں آنا: وحی کا تیسرا طریقہ یہ تھا کہ حضرت جبرئیل امین بغیر کسی انسانی شکل اختیار کئے اپنی اصل صورت میں وحی نبوت لے کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتے تھے۔

۴۔ رویائے صالحہ: وحی کا چوتھا طریقہ رویائے صالحہ تھا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نزول قرآن سے قبل سچے خواب نظر آتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ اول ما بدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الوحی الرویا الصالحۃ فی النوم فکان لا یری رویا الاجاء ت مثل فلق الصبح [2] پہلے جو وحی آنحضرتؐ پر شروع ہوئی وہ حالت خواب میں سچا رویا تھا سو آپ جو خواب دیکھتے تھے صبح کی روشنی کی طرح اس کی سچائی ظاہر ہو جاتی تھی۔

یہ وحی غیر متلو تھی۔ وحی متلو کے نزول کا آغاز آیت اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَا وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ سے ہوا تھا۔

۵۔ کلام الٰہی:۔ اللہ تعالیٰ کسی فرشتہ یا آواز کے توسط کے بغیر براہِ راست نبی کے دل پر وحی نازل فرماتے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے شب معراج میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف وحی فرمائی، ارشاد الٰہی ہے۔ ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی [3] پھر قریب ہوا اور بہت قریب ہوا۔ سو وہ دو کمانوں کے قریب ہوا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قریب ہوا۔ سو اس نے اپنے بندے کی طرف وحی کی جو وحی کی۔

۶۔ نفث فی الروع (بات کا دل میں ڈال دینا):۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی بات کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک میں القا کر دیتا تھا۔ چنانچہ ایک روایت میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ اِنَّ رُوْحَ القدس نفث فی روعی [4] روح القدس (جبرئیل علیہ السلام) نے میرے دل میں بات ڈال دی اور مستدرک کی روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

اِنَّ جِبْرَئِیْلَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَلْقٰی فِیْ رُوْعِیْ اَنَّ اَحَدًا مِنْکُمْ لَنْ یَخْرُجَ مِنَ الدُّنْیَا حَتّٰی یَسْتَکْمِلَ رِزْقَہٗ [5] جبرئیل علیہ السلام نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ ہم میں سے کوئی دنیا سے نہیں جائے گا۔ جب تک اپنا رزق پورا نہ کرے۔ یہ وحی، وحی غیر متلو تھی۔

---

[1] فتح الباری مصنفہ حافظ ابن حجر ج ۱ ص ۱۶۔ [2] صحیح بخاری جلد ۱ ص ۲۔

[3] النجم ۵۳: ۸۔۱۰۔ [4] الاتقان ج ۱ صفحہ ۴۶ [5] مستدرک الحاکم کتاب البیوع ج ۲ ص ۴۔

۷۔ اللہ تعالیٰ کا بلا واسطہ کلام فرمانا: اللہ تعالیٰ کسی فرشتہ کے بغیر نبی سے کلام کرتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا[1]

۸۔ اللہ تعالیٰ کا بغیر حجاب کے کلام کرنا: حضرت ابن القیم اس طریقۂ وحی کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ھی تکلیم اللّٰہ لہ کفاحاً من غیر حجاب یعنی وہ طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نبی سے بغیر حجاب کے کلام فرمائے۔

اس کے ساتھ علامہ صاحب یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ وحی کا یہ طریقہ تمام امت کے نزدیک مسلمہ نہیں بلکہ اس کے قائل وہ علماء ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے رویت باری تعالیٰ کی کیفیت کے بارے میں سلف اور خلف میں اختلاف ہے۔

بعض علماء کا یہ عقیدہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی آنکھ سے خدا کو دیکھا۔ جیسا کہ حضرت کعب فرماتے ہیں کہ:۔

"اللہ تعالیٰ نے اپنی رویئت اور کلام کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور موسیٰ علیہ السلام پر تقسیم فرما دیا۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دو مرتبہ کلام کیا اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو مرتبہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔"[2]

حضرت عبداللہ بن عباس کا مسلک بھی یہی ہے۔

اس کے برعکس بعض علماء کا یہ مسلک ہے آپ نے اللہ تعالیٰ کی رویئت اپنی روحانی بصیرت سے کی تھی اور ان مادی آنکھوں سے نہیں کی تھی۔ جیسا کہ محمد بن کعبؒ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض اصحاب سے نقل کیا ہے کہ ہم نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لم أرہ بعینی و رأیتُہ بفوادی مرتین ثم تلاثم دنا فتدلی. میں نے اس کو (اللہ تعالیٰ) ان آنکھوں سے نہیں لیکن دل کی آنکھوں سے دیکھا ہے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ثم دنا فتدلی (پھر وہ بہت زیادہ قریب ہوا)

علامہ ابن کثیر نے ایک اور روایت نقل فرمائی ہے کہ صحابہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت فرمایا۔ کیا آپؐ نے اپنے رب کو دیکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"رأیتُہ بفوادی مرتین ثم قراء مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاى."[3] میں نے اس کو اپنے دل سے دو مرتبہ دیکھا ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاىٰ (دل نے جو کچھ دیکھا غلط نہیں دیکھا)

---

[1] النساء ۴: ۱۶۴۔ [2] ابن کثیر ج ۴ ص ۲۵۰۔ [3] ابن کثیر ج ۴ ص ۲۵۰۔

اس مسئلہ میں حضرت عائشہؓ کا یہ مسلک ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ وہ قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کرتی ہیں۔ "لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ" آنکھ اس کا احاطہ نہیں کر سکتی اور وہ آنکھ کو پا سکتا ہے۔ حضرت عائشہؓ کے قول کے معنی بھی اسی قدر ہو سکتے ہیں کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو ان آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ قلب سے دیکھنا یا کشف یا رویاء میں دیکھنا اس کے خلاف نہیں۔

پس حق یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کو اپنے قلب سے دیکھا اور بعض حدیثوں میں رویاء میں دیکھنے کا ذکر ہے اور یہ آیت لا تدرکہ الابصار کے خلاف نہیں۔

۹۔ کتابت کے ذریعے وحی: وحی کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لکھی ہوئی چیز موحی الیہ پر کشف کی حالت میں ظاہر کر دیتا ہے۔

۱۰۔ تفہیم غیبی: بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو کسی مشکل ترین عقدہ کے حل کا غیب سے فہم عنایت کر دیتا ہے۔ جس تک دوسرے شخص کی فکر و نظر رسائی نہیں کر سکتی۔ دراصل یہ القاء فی القلب اور نفث فی الروع ہی ایک قسم ہے۔ یہ وہ خاص فہم ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

وَدَاوُدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ○ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا [1] اور داؤد اور سلیمان کو جب وہ کھیتی کے معاملے میں فیصلہ کرنے لگے جب اس میں لوگوں کی بکریاں رات کو چر گئیں اور ہم ان کے فیصلے کے گواہ تھے۔ سو ہم نے وہ (فیصلہ) سلیمان کو سمجھا دیا اور سب کو ہم نے فہم اور علم دیا تھا۔

علامہ الشیخ علاؤ الدین بن محمد بن ابراہیم اپنی تفسیر خازن میں "فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ یعنی یہ فیصلہ ہم نے اس کو سکھایا اور ہم نے اس کو الہام کیا۔[2] ایسا ہی علامہ بغوی نے تفسیر معالم التنزیل میں لکھا ہے۔[3]

علامہ علاؤ الدین بعض اہل علم کا قول نقل کر کے فرماتے ہیں کہ تفہیم غیبی دراصل وحی ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام نے یہ فیصلہ وحی ہی سے کیا تھا۔"[4] یہ وحی، وحی غیر متلو ہے، اس میں غیر نبی بھی شامل ہوتے ہیں۔

وحی الٰہی کے اترنے کی جگہ

قرآن مجید میں یہ امر واضح ہے کہ وحی الٰہی کے اترنے کی جگہ انسانی قلب ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ [5] کہہ جو کوئی جبرئیل کا

۱۔ الانبیاء ۲۱: ۷۸، ۷۹۔ ۲۔ خازن ج ۴ ص ۲۴۶۔
۳۔ بغوی علی ہامش الخازن ج ۴ ص ۲۴۶۔ ۴۔ خازن ج ۴ ص ۲۴۶۔ ۵۔ البقرہ ۲: ۹۷۔

دشمن ہے سو بیشک اس نے اللہ کے حکم سے تیرے دل میں اتارا۔

وحی الٰہی قلب پر کیوں نازل ہوتی ہے؟

انسان کے دو حصے ہیں ایک تو وہ حصہ جو قدرت کی ہدایت کے مطابق بے اختیار اور بغیر قوتِ ارادی کے چل رہا ہے، مثلاً ہمارے جسم کا اندرونی نظام وغیرہ۔ انسان کا دوسرا حصہ قلب ہے جو انسان کو دنیا کی تمام اشیاء سے امتیاز بخشتا ہے جس کے تحت انسان علم حاصل کر کے تمام کائنات کا حاکم بنتا ہے کیونکہ انسانی عقل ادراک اور شعور کا مرکز ہے۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے دل کو حصولِ علم کے لیے حواس ظاہری اور حواس باطنی عطا فرمائے ہیں، ہم حواس ظاہری سے سن کر دیکھ کر، چھو کر، چکھ کر علم حاصل کرتے ہیں۔ پھر اس علم کو قلب میں منتقل کر دیتے ہیں، پھر قلب عقل وشعور کے سامنے پیش کرتا ہے اور عقل صحت اور عدم صحت کا حکم نافذ کرتی ہے۔ اسی طرح حواسِ ظاہری کے مقابل پر حواس باطنی ہیں، حس باصرہ کے بالمقابل باطنی آنکھ، حس سامعہ کے بالمقابل، باطنی کان، حواسِ ذائقہ، شامہ اور لامسہ کے بالمقابل باطنی حواس ذائقہ شامہ اور لامسہ ہیں جب انسان کا دل تمام دنیاوی کدورتوں اور غلاظتوں سے پاک صاف ہوتا ہے۔ بدن کے ساتھ مشغول رہنے کے باوجود خدا تعالیٰ سے متصل ہو جاتا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ اس کے مطہر قلب پر وحی نازل کرتا ہے اور انسان کے باطنی حواس، حواس ظاہری کی طرح نظارے دیکھتے ہیں، ذائقے چکھتے ہیں، خوشبو سونگھتے ہیں، آوازیں سنتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے صرف انسان کے دل کو ہی بااختیار اور بارادہ بنایا ہے وہ صحیح علم حاصل کر کے اس کے مطابق عمل کرے یا نہ کرے اس وجہ سے یہ ضروری تھا کہ خدا تعالیٰ قلب کو اپنی وحی کے لیے جائے نزول بناتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو یہی گرامی نعمت گراں قدر عنایت ہوئی ہے جو دوسری مخلوق کو نہیں ملی۔

انسانی قلب پر وحی کا نزول کس طرح ہوتا ہے

وحی الٰہی ایک علم ہے جو انسان کے مقصد حیات کو پورا کرنے کے لیے اس کی راہنمائی کرتا ہے چونکہ یہ علم باطن سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے براہِ راست قلب کے حواس باطنی پر پڑتا ہے۔ جب اس علم کا نزول قلب کی حس باصرہ پر ہوتا ہے تو وحی ایک نظارہ کی شکل میں ہوتی ہے۔ جسے کشف اور رویاء کہتے ہیں جب قلب کی حس سامعہ پر اس کا نزول ہوتا ہے تو موحی الٰہی کو ایک لطیف، پرشوکت، پرُرعب اور لذیذ کلام سنائی دیتا ہے۔ جب قلب کی حس ذائقہ پر نزول ہوتا ہے تو موحی الٰہی ایک عجیب خوش ذائقہ چیز کی حلاوت اور لذت زبان پر محسوس کرتا ہے۔ جب قلب کی قوت شامہ پر اس کا نزول ہوتا ہے تو ایک عجیب خوشبو کا احساس ہوتا ہے جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کے پیرہن سے خوشبو محسوس کی اور فرمایا: اِنِّی لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُوْنِ[1] یقیناً میں یوسف کی خوشبو پا رہا ہوں اگر مجھے بہکا ہوا نہ سمجھو۔

---

[1] یوسف ۱۲:۹۴۔

یہ قلب کی باطنی قوتِ شامہ کا احساس تھا اس طرح جب قلب کی قوتِ لامسہ پر اس کا نزول ہوتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے، کسی کلام نے آ کر اس کے دل کے پردوں کو چھوا ہے اور وہ الفاظ دل کے باطنی کانوں کو سنائی دیتے ہیں۔ یہ عجیب وغریب احساس ہوتا ہے جس کی لذت اور کیفیت وہی بیان کر سکتے جو صاحب حال اور روحانی کوچہ سے آشنا ہوتے ہیں۔ جن کے حواسِ باطنی گناہوں، دنیاوی الائشوں، تکبر و نخوت کی دبیزوں سے ناکارہ ہو چکے ہوں۔ وہ اس الٰہی سر کو نہیں سمجھ سکتے۔

قلب پر نزولِ وحی کے متعلق تین اہم امور

قلب پر نزول وحی کے متعلق تین اہم امور کا جاننا ضروری ہے۔

۱۔ حواس ظاہری کا تعطل

جب خدا تعالیٰ انسان کے حواس باطنی پر وحی نازل کرتا ہے، تو حواسِ ظاہری اس وقت معطل ہو جاتے ہیں تاکہ عالم ظاہر کے محرکات وتاثرات سے عالم باطن کے محرکات وتاثرات خلط ملط نہ ہو جائیں۔

۲۔ ایک ہی وقت میں متعدد حواس پر وحی کا نزول

بعض اوقات وحی کا نزول ایک ہی وقت میں کئی حواس باطنی پر ہوتا ہے۔ یعنی قلب ایک ہی وقت میں دیکھتا بھی ہے، سنتا بھی ہے، چکھتا بھی ہے۔

۳۔ باطنی وظاہری حواس میں اشتراک

انسان کے حواس باطنی اور ظاہری میں ایک حس مشترک ہے کہ انسان باطن کی ہر ایک حس کو اسی طرح محسوس کرتا ہے۔ جس طرح وہ ظاہر کی حس کو محسوس کرتا ہے مثلاً وحی کے وقت کسی انسان کی باطن کی آنکھ کام کر رہی ہو اور ظاہری آنکھ اس وقت معطل ہو۔ پھر بھی باطن کی آنکھ کے احساس کی کیفیت اسی طرح ہوگی جس طرح ظاہری آنکھ سے دیکھنے کے وقت ہوتی ہے۔ حس مشترک کی وجہ سے موحی الہیہ یوں محسوس کرتا ہے کہ اس کے اندر کوئی آنکھ ہے جس سے وہ دیکھ رہا ہے، اسی طرح دوسرے حواس کا معاملہ ہے غرض کہ یہ حس مشترک باطنی حواس کو بھی ظاہری حواس کے رنگ میں پیش کرتی ہے۔ بعض اوقات موحی الہیہ کو مغالطہ لگ جاتا ہے کہ آیا جو نظارہ اس نے دیکھا ہے عالم ظاہر کا ہے یا عالم باطن کا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب آگ کی روشنی دیکھی تھی وہ باطنی نظارہ تھا۔ لیکن مشترک حس نے اسی قدر غلبہ اختیار کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یوں محسوس کیا کہ وہ ظاہری آنکھ سے آگ کی روشنی دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ باطنی آنکھ سے دیکھ رہے تھے لیکن عالم باطن کی آواز نے اس مغالطہ کو دور کر دیا۔

وحی کی ضرورت

انسان کی عقل کوتاہ اور ناقص ہے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں پر وحی نازل کی تاکہ یہ آسمانی نور انسان کی عقل کی راہبری کرے۔ قرآن مجید میں آدم علیہ السلام کا واقعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کی عقل فطری کمزوری کی وجہ سے شیطانی وسوسہ سے مغلوب ہوگئی اور وہ سکون قلب کی جنت سے محروم ہوگئے۔ تب حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے وحی کے ذریعے کچھ کلمات سیکھے، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی رحمت کے سایہ میں لے لیا۔ جو اس میں نقص تھا۔ دور ہوگیا۔ گویا فطری کمزوری کا علاج وحی الٰہی سے کیا گیا۔ بندہ کی روحانی ربوبیت کا سامان وحی الٰہی میں ہے اگر عقل کے ذریعے ہی انسان کو اپنی تمام مشکلات کی گرہ کشائی کرنا پڑتی تو وہ عقل کی کمزوری کی وجہ سے ٹھوکریں کھا کر ہلاکت کے اتھاہ گڑھے میں گرا پڑا رہتا۔

دنیا کے بڑے بڑے فلاسفہ نے برملا عقل کی کوتاہ بینی اور فکر کی نارسائی کا واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ سقراط کا یہ مقولہ مشہور ہے۔ ''ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے۔''

انگلستان کا مشہور فلسفی ڈیوڈ ہیوم واضح الفاظ میں قرار کرتا ہے کہ ''انسان ذی عقل مخلوق ہے اور اس لحاظ سے علم اس کی خاص دماغی غذا ہے لیکن ساتھ ہی انسانی عقل وفہم کے حدود اتنے تنگ ہیں کہ اس باب میں اس کو وسعت واذعان دونوں حیثیات سے بہت ہی کم اپنے فتوحات سے تشفی نصیب ہوسکتی ہے۔''[1]

دیمقراطیس کا قول ہے۔ ''کوئی بات سچ نہیں اور اگر ہے تو ہم کو معلوم نہیں۔''[2]

جب انسان کی عقل ناقص ہے تو وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ انسان جو اپنی عقل کے ناخن تدبیر سے پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی کرے گا وہ صحیح ہوں گے۔

فلسفہ یونان کے جو بنیادی نظریے تھے وہ صدیوں تک دنیا میں مقبول اور رائج رہے آخر آج موجودہ فلسفہ یورپ نے ان کو بالکل باطل قرار دیا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ آج جو فلاسفہ عقل کے زور سے جن نظریات کی عمارت تعمیر کر رہے ہیں وہ مستقبل میں بھی قائم ودائم رہے گی۔

پس وحی الٰہی زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کی راہنمائی کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ ہر قسم کی لغزشوں اور ٹھوکروں سے محفوظ ومصئون رہ کر جادۂ صواب پر گامزن رہے۔ اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ میں یہ دعا سکھائی ہے جس کو ہر ایک مسلمان پنجگانہ نماز میں دہراتا ہے۔ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ (ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت دے راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام کیا) یہاں انعام سے مراد نور وحی ہے۔ جو لوگ نور وحی سے منور ہوتے تھے وہی جادہ صواب پر گامزن ہوتے ہیں۔ ان کی اقتداء ہی لغزشوں سے محفوظ رکھتی ہے اور منزل مقصود تک پہنچاتی ہے۔

---

[1] ہیومن انڈر اسٹینڈنگ مصنفہ ڈیوڈ ہیوم بحوالہ فہم انسانی ص ۵ مترجم پروفیسر عبدالباری۔

[2] لیوس کی سوانحی تاریخ فلسفہ (بیاگرفکل ہسٹری آف فلاسفی) ص ۱۰۷ بحوالہ فہم انسانی ص ۱۱۔

شاید کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ پھر عقل انسانی کا فائدہ کیا۔ جب زندگی کے تمام شعبوں میں مکمل طور پر راہنمائی نہیں کر سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی عنایت اور نعمت ہے جس طرح خدا کے دوسرے حواس مثلاً قوتِ سامعہ، قوتِ لامسہ، قوتِ ذائقہ، قوتِ باصرہ نعماء عظمیٰ میں سے ہیں اسی طرح انسانی عقل بھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی حواس ایک حد کے اندر محدود ہیں۔ انسان کی آنکھ ایک حد تک دیکھ سکتی ہے جو چیز اس کی حد سے باہر ہوگی اس کو دیکھ نہیں سکے گی اور اگر کوئی فیصلہ صادر کرے گی تو غلطی کا قوی امکان ہے۔ اسی طرح کان ایک حد تک سن سکتے ہیں اگر اس کی حد سے باہر کی آواز کو سننے کی کوشش کریں تو وہاں بھی غلطی کا امکان ہے اسی طرح روحانیت کے بے شمار معاملات ہیں جو انسان کی عقل سے بالاتر ہیں ان کا احاطہ کرنا انسان کی عقل سے بعید تر ہے اور عقل کا ٹھوکر کھا جانے کا احتمال ہے۔ ایسے معاملات میں وحی الٰہی کا عقل کی دست گیری کرنا لازمی اور لابدی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسے امور میں مدد اور دست گیری نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت پر زد پڑتی ہے اور قیامت کے روز انسان اپنی لغزشوں کے بارے میں حق بجانب ٹھہرے گا۔ جب باریک در باریک نہاں در نہاں امور سے متعلق اس کی رسائی ہی نہیں تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی راہنمائی ہی نہیں کی تو پھر اس کا حساب کتاب کیسا؟

جس طرح ایک انسان اپنی قوتِ باصرہ کی مدد کے لیے خوردبین اور دوربین، باریک اور دور کی اشیاء دیکھنے کے لیے استعمال میں لاتا ہے وہ آلے انسان کی قوتِ باصرہ کو اس کی حد سے پرے کی اشیاء کو دیکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اسی طرح وحی الٰہی عقل انسانی کو اس کی حد سے باہر نکال کر ایسے امور کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے جو اس سے بالاتر ہوتے ہیں۔ پس وحی عقل کے خلاف نہیں ہے بلکہ عقل کے لیے ایک روشنی کا مینار ہے تاکہ انسان ان چیزوں کا بھی احاطہ کر سکے جو اس کی عقل سے بالاتر ہیں۔ میں یہاں مناسب سمجھتا ہوں کہ ''خلاف عقل'' اور ''بالا از عقل'' سے متعلق کچھ عرض کروں۔

خلاف عقل اور بالا از عقل میں فرق

آج کل عقلیت پسند اور نیچریوں کی یہ عادت ہے کہ جو امر ان کی محدود عقل میں نہ آئے تو اس کو خلاف عقل قرار دے کر رد کر دیتے ہیں، اوّل تو عقل کے لحاظ سے مختلف لوگ ہوتے ہیں اگر ایک فطین آدمی کوئی مسئلہ بیان کرے تو اس سے فروتر عقل والا آدمی اس وجہ سے انکار کر دے کہ وہ مسئلہ اس کی عقل میں نہیں آتا تو کوئی اس انکار کو معقول نہیں کہہ سکتا۔ عقل کے لحاظ سے لوگوں میں طبعی فرق کی وجہ سے یہ ممکن ہے کہ جو ایک مسئلہ کسی کے نزدیک معقول ہے۔ دوسرے کے نزدیک غیر معقول ہو آج کم علمی کی وجہ سے غیر معقول نظر آ رہا ہو۔ وہ کل علم کی روشنی کی وجہ سے معقول نظر آئے۔ پس کسی امر کا اس وجہ سے انکار کر دینا کہ وہ کسی کی عقل میں نہیں آتا۔ خود کم عقلی پر دلالت ہے۔

جب بے تار کی تار برقی ایجاد ہوئی تو معلوم نہیں کہ کتنے سائنسدانوں نے اس ایجاد کو غیر معقول کہا

ہوگا۔ لیکن تجربے نے اس کی صحت پر مہر ثبت کر دی تو تمام سائنس دان یقین کر گئے۔

مناسب طریقہ یہی ہے کہ جب کوئی کسی کے سامنے بالا ازعقل امر بیان کرے تو فوراً اس کی تردید نہ کر دے بلکہ اس کو حوالہ خدا کرے اس امر کے سمجھنے کی سعی بلیغ کرے۔

ہاں! اگر کوئی امر اصول متعارفہ کے خلاف بیان کیا جائے تو اس کو خلافِ عقل قرار دے کر رد کر دے۔ مثلاً کوئی یہ کہے کہ فلاں زمانہ میں سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہوا۔ یا کوئی یہ کہے کہ دو اور دو چار نہیں بلکہ پانچ ہوتے ہیں تو پھر انکار کرنا ہی عین عقل ہے۔ اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی امر اصول متعارفہ اور مسلماتِ عقلی کے خلاف ہو تو وہ خلافِ عقل قرار دیا جائے گا اگر اصول متعارفہ اور مسلماتِ عقلی کے خلاف تو نہیں لیکن سمجھ میں نہیں آیا تو وہ امر بالا ازعقل کے تحت آئے گا۔

خلافِ عقل اور بالا ازعقل کے درمیان فرق کرنا ہر عقل مند آدمی کا کام ہے ورنہ علمی ترقی ہی رُک جائے گی کہ جو بھی کوئی چیز عقل کے حد کے اندر نہ آئی تو اس کو خلاف عقل قرار دے کر رد کر دیا تو اس طرح محنت اور کوشش کا جذبہ بالکل سرد پڑ جائے گا۔

دوسری ضرورت

انسان کی طبعی فطرت ہے کہ وہ اپنے جیسے بشر کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتا۔ ہاں! انسان اسی کا فرمانبردار بن کر نقش قدم پر چلے گا۔ جس کے متعلق اس کا ایمان ہو کہ وہ ایسی قادر اور توانا ہستی سے تعلق رکھتا ہے اور وہ عظیم ہستی اس کی پشت پر ہے اس کے انکار سے دین اور دنیا میں خسران اور گھاٹا ہے اور ایمان لانے سے فلاح۔ اس امر کو واضح کرنے کے لیے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

شیخ الرئیس بوعلی سینا کا ایک طالب علم خادم تھا۔ جو شیخ الرئیس کے فلسفہ اور علم سے بہت متاثر تھا اور وہ تعجب کیا کرتا تھا کہ ان کا مخدوم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کو کیسے مانتا ہے جبکہ وہ خود ان سے علم وحکمت میں بڑھا ہوا ہے۔ اس خیال کا اظہار وہ کئی دفعہ بوعلی سینا سے بھی کر چکا تھا۔ شیخ اس سے روگردانی کر لیتا اور ڈانٹ دیتا۔ ایک مرتبہ دونوں اصفہان کے شہر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ رات کو سخت سردی تھی اور برف باری ہو رہی تھی۔ شیخ الرئیس نے صبح کے وقت اپنے خادم کو جگایا اور وضو کے لیے پانی طلب کیا۔ اس پر اس نے سخت سردی اور صبح نہ ہونے کا عذر تراشا۔ اس کے بعد بوعلی سینا نے صبح کی اذان کے وقت جگایا اور پانی طلب کیا۔ اس وقت بھی برف باری کا عذر کیا۔ اتنے میں مؤذن نے کہا۔ ''اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ
شیخ نے اپنے خادم سے کہا۔ سنو مؤذن کیا کہتا ہے اس نے کہا وہ کہہ رہا ہے۔ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ
شیخ الرئیس نے اس کی گمراہی کو دور کرنے کا موقع غنیمت جانا اور کہا دیکھو تم مرے خادم ہو۔ پھر تم مجھے سب سے زیادہ پسند کرتے ہو اور سب سے زیادہ میری عزت اور احترام کرتے ہو۔ یہاں تک کہ تم مجھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی افضل گردانتے ہو اور میرا ان کی پیروی کرنا ناپسند کرتے ہو۔ ان تمام باتوں کے

باوجود میرا حکم بجالانے کے سلسلے میں سردی اور برف باری کا بہانہ تراشتے ہو مگر یہ مؤذن علی الصبح برف باری اور سردی کے عالم میں مسجد کی طرف آیا ہے اور مینار پر چڑھا ہے اور محمد عربی کی رسالت کا بلند آواز سے اقرار کیا ہے یہ ایمان اور یقین کا محکم جذبہ ہے جس نے محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی کی مضبوط زنجیروں کو جکڑ دیا ہے اس مثال سے قارئین وحی الٰہی کی حکومت اور علم وحکمت کا فرق سمجھ جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے وحی کے نزول کا سلسلہ اس وجہ سے جاری کیا تھا تاکہ لوگ ایک برتر، علیم وخبیر اور قادر وتوانا ہستی کا کلام سمجھ کر اس پر عمل کریں اور ذہنی اور عملی انتشار سے بچ جائیں۔ موحی الٰہیہ پر ایمان لا کر وحدت اور اتحاد کی لڑی میں منسلک ہو جائیں۔

تیسری صورت

انسان کی فطرت اس قسم کی ہے کہ جس ہستی کی عظمت کا احساس اس کے دل میں پیدا ہو جائے اس کے خلاف دل میں خیالات ہی پیدا نہیں ہوتے اور اس کے ہر حکم کی فرمانبرداری کرنے اور اس کے رنگ میں رنگین ہونے کی سعی بلیغ کرتا ہے۔ وحی الٰہی انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت پیدا کرتی ہے جس کی وجہ سے انسان خدا کی صفات میں رنگین ہونے کی کوشش کرتا ہے حتیٰ کہ وہ اس زمین کی چھاتی پر چلتا پھرتا مظہر خدا بن جاتا ہے۔ اس کی عمدہ مثال رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود باوجود اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرامؓ ہیں جو اس دھرتی پر چلتے پھرتے مظہر خدا تھے یہ قرآنی وحی کا سب سے بڑا معجزہ ہے اس نے صحابہؓ کے دلوں سے گناہوں کی میل کو اس طرح دھو دیا کہ ان سے خدا کی صفات منعکس ہونے لگیں۔

چوتھی ضرورت

سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت رب العالمین بیان ہوئی ہے اس صفت میں ضرورت وحی کی طرف اشارہ ہے۔ رب کے معنی تاج العروس اور لین نے پیدا کرنا، پرورش کرنا، کمال تک پہنچانا، تنظیم و تکمیل دینا لکھے ہیں۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ رب وہ ذات ہے جو تدریجاً ایک چیز کو کمال تک پہنچاتی ہے۔ پس اسم رب کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر مخلوق کو اپنے کمال تک پہنچائے۔ جسمانی ربوبیت کے لیے عالم جسمانی میں ہر قسم کی چیز پیدا کر دی۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمارا وجود، صرف گوشت اور ہڈیوں کا ڈھانچہ ہی نہیں، بلکہ اس میں ایک لطیف چیز روح بھی مقید ہے۔ ان کا کمال صرف جسم کی پرورش تک محدود نہیں، بلکہ وہ اخلاق ہیں پس جس طرح جسمانی ربوبیت کے لیے خارج میں ہر قسم کا سامان مہیا کیا ہے اسی طرح روح کی پرورش کے لیے عالم روحانی میں وحی الٰہی ہے۔ جو انسان کی روح کی صفائی اور کمال کا ذریعہ ہے۔

پانچویں ضرورت

جس طرح انسان کے جسم کے امراض ہیں اور ان کا علاج اللہ تعالیٰ نے خارجی دنیا میں پیدا کیا

ہے، اسی طرح روحانی امراض ہیں جن سے انسان کی روح میں نقص لازم آتا ہے۔ ان روحانی امراض کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے وحی الٰہی کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ یہی بات قصہ آدم علیہ السلام میں بیان ہوئی ہے۔ جب آدم علیہ السلام سے لغزش سرزد ہوئی اور وہ اطمینان قلب سے محروم ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بیماری کو دور کرنے کے لیے چند کلمات سکھائے۔ یہ وحی الٰہی تھی۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ.[1] پھر آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے (کچھ) باتیں سیکھیں۔ پس اس سے اس پر (رحمت سے) توجہ کی بے شک وہ (رحمت) سے توجہ کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

وحی الٰہی نے اس روحانی بیماری کا علاج کر دیا اور وہ دوبارہ اطمینان قلب کی دولت سے متمتع ہو گئے اور اس قصہ آدم میں اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا۔ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ.[2] پھر اگر میری طرف سے تمھارے پاس ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا، نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ ہبوط انسانی کا علاج وحی الٰہی ہے جو نسل انسانی میں وقتاً فوقتاً آتی رہے گی اس کی پیروی سے انسان روحانی امراض سے نجات پا لے گا اور انسان اس ارفع مقام پر پہنچ جائے گا، جہاں سے روحانی ہبوط واقع نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّ عِبَادِىْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ[3] کہ میرے بندوں پر تیرا غلبہ نہیں۔

یہ وہی بندے ہیں جو وحی الٰہی کی اتباع کرتے ہیں۔

---

[1] البقرہ ۲: ۳۷۔ [2] البقرہ ۲: ۳۸۔ [3] الحجر ۱۵: ۴۲۔

مذہب کی تعریف اور ماہیت

انگریزی زبان میں مذہب کے لیے Religion کا لفظ ہے جو لاطینی زبان سے ماخوذ ہے جس کا مفہوم عقیدے اور پوجا پاٹ کا ایک نظام ہے۔

مفکرین نے مختلف الفاظ میں مختلف تعریفات کی ہیں۔ سر۔ای۔ بی ٹیلر (Taylor) نے مذہب کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے۔ "Religion means the belief in spritual beings" یعنی مذہب روحانی مخلوقات پر ایمان لانے کا نام ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا جلد ۱۹ ایڈیشن ۱۳ صفحہ ۱۰۳)

فرید وجدی بک نے لکھا ہے کہ ''مذہب ان معقول خیالات کے مجموعہ کا نام ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ تمام افراد انسانی رشتہ میں منسلک ہو جائیں اور وہ جسمانی فائدوں سے اس طرح بہرہ یاب ہوں جس طرح قوت عقلیہ سے وہ ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ مذہب نوع انسان کے لیے ایک ابدی چیز ہے۔[1]

کانٹ (Kant) کہتا ہے کہ ''ہر فریضہ کو خدائی حکم سمجھنا یہ مذہب ہے۔''

شوپنہار (Schopenhawer) لکھتا ہے کہ ''مذہب موت کے تصور سے وابستہ ہے۔''

پروناٹ ہیڈ لکھتا ہے۔ ''مذہب اعتقاد کی اس قوت کا نام ہے جس سے انسان کا باطن پاک ہو جاتا ہے یعنی مذہب ان صداقتوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ جن میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ انسان اور انسانی کریکٹر Character میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ بشرطیکہ انھیں خلوص کے ساتھ قبول کیا جائے اور بصیرت کے ساتھ سمجھا جائے۔[2] اوسپنسکی Ospanski نے گرجیف کے حوالے سے لکھا ہے۔

''مذہب ایک انسانی تصور ہے جس قسم کی انسان کی اپنی سطح ہوگی اسی قسم کا اس کا مذہب ہوگا اس لیے ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی کا مذہب دوسرے آدمی کے لیے قطعاً موزوں نہ ہو۔[3]

مشہور عالم نفسیات پروفیسر جیمز ایچ لیوبا Jams.H.Leuba نے اپنی ایک تصنیف میں مذہب کی مختلف تعریفات نقل کی ہیں جو مذہب کے کسی نہ کسی ضروری جزو پر حاوی ہیں ان تعریفات میں سے چند تعریفیں نقل کی جاتی ہیں۔

ایک تعریف تو مذہب کی یہ ہے ''مذہب نام ہے اس احساس کا جو کسی مقدس، بالاتر اور ان دیکھی ذات کا وجود انسان کے قلب و دماغ میں پیدا کرتا ہے۔''

---

[1] تطبیق الدیانۃ الاسلامیۃ ص ۲۴۔ [2] بحوالہ امام غزالی کا فلسفہ مذہب و اخلاق مصنفہ ڈاکٹر سید حسین صاحب قادری شور ایم اے عثمانیہ ص ۱۸۱۔ [3] In search of the miraculous P.299

دوسری تعریف یہ ہے ”مذہب نام ہے ایک ازلی اور ابدی حقیقت پر ایمان لانے کا جس کی حیثیت اور ارادہ انسانی منشا اور ارادے سے بالاتر ہے اور جس کا تعلق انسان کی زندگی کے ساتھ بہت گہرا ہے۔“

تیسری تعریف یہ ہے کہ ”مذہب ایک روحانی اور نفسی حاسہ ہے جس کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ انسان اور کائنات میں باہمد گر ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔“

چوتھی تعریف یہ ہے کہ ”مذہب نام ہے ان مافوق الانسانی قوتوں کی رضا جوئی کا جو انسانی زندگی پر حکمران ہیں۔“

پانچویں تعریف یہ ہے کہ ”مذہب نام ہے اس جستجو کا جو انسان زندگی کے حقیقی مقاصد کے ادراک کے لیے کرتا ہے۔“[1]

جب مذکورہ بالا تعریفات پر گہری نظر ڈالی جائے۔ تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ کوئی تعریف بھی دین کے جامع تصور پر حاوی نہیں بلکہ دین کے کسی ایک پہلو کو ظاہر کرتی ہے۔

قرآنی تعریف

”مذہب ان ہدایات اور احکام کا نام ہے جو وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے اپنے بندوں کے لیے بھیجے۔ جن پر گامزن ہو کر انسان اس دنیا اور آخرت کی زندگی کے گیسو سنوار سکتا ہے۔“

گویا مذہب انسان کی روح اور جسم کی تمام اقتضات کو پورا کرنے کا نام ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ[2] اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی عطا کر ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ یہ آیت ظاہر کرتی ہے۔ مذہب کا تعلق جسم اور روح دونوں سے ہے۔ اسلام میں دین اور دنیا کی دوئی کا تصور بالکل باطل ہے۔ الٰہی دین انسانی زندگی کا ایک مکمل دستور حیات ہے اسی وجہ سے اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔

قرآن مجید نے اس مفہوم کو دین، ملت، سبیل، شریعت، ہدایت، صراط اور طریق کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یہ الفاظ راستہ، روش، راہنمائی کے معنوں میں مشترک ہیں۔ اسلام کے تصور مذہب کو سمجھنے کے لیے مذکورہ بالا قرآنی الفاظ کی تشریح کرنا ضروری ہے۔

دین کا مفہوم

اسلام نے مذہب کے لیے ”دین“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ.[3] یعنی اسلام ہی خدا کے نزدیک حقیقی دین ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ.[4] وہی ہے

[1] God or man مطبوعہ لندن ۱۹۳۴ء۔ [2] البقرہ ۲:۲۰۱۔ [3] ال عمران ۳:۱۹۔ [4] الصف ۶۱:۹۔

جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کرے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا[1] آج میں نے تمہارا دین تمھارے لیے کامل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے اور تمہارا دین اسلام ہونے پر راضی ہوں۔

امام راغب نے دین کے لفظ کے معنی اور تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔"الطاعة والجزاء واستعير للشريعة والدين كالملة يقال اعتباراً بالطاعة والانقياد للشريعة (مفردات) دین کے معنی اطاعت اور جزا کے ہیں اس کا اطلاق شریعت پر بھی ہوتا ہے۔ دین اور ملت مترادف ہیں شریعت پر اس کا اطلاق ان معنوں میں ہے کہ شریعت کی اطاعت اور اس کے سامنے اپنی گردن انقیاد خم کرنا لازم ہے۔

بخاری میں ہے۔ اَلدِّيْنُ الْجَزَاءُ فِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ یہاں دین سے مراد نیکی اور بدی کا بدلہ ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی اور اطاعت کا نام دین ہے۔

ملت کا مفہوم

قرآن مجید میں آتا ہے۔ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ.[2] کہہ اللہ نے سچ فرمایا ہے پس راست رو ہو کر ابراہیم کے دین کی پیروی کرو اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

ایک دوسرے موقع پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ.[3] تمھارے باپ ابراہیم کا مذہب اس نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰنِيْ رَبِّيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ.[4] کہہ بے شک مجھ کو میرے رب نے سیدھے راستہ کی طرف ہدایت دی ہے۔ دین صحیح ابراہیم راست رو کے مذہب کی طرف اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

امام راغب زیر لفظ ملت لکھتے ہیں۔ اَلْمِلَّةُ كَالدِّيْنِ وَهُوَ اِسْمٌ لِمَا شَرَعَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِعِبَادِهٖ عَلٰى لِسَانِ الْاَنْبِيَاءِ لِيَتَوَصَّلُوْا بِهٖ اِلٰى جِوَارِ اللّٰهِ. (مفردات) ملت دین کا ہی مترادف ہے اور یہ نام اللہ تعالیٰ کے اس طریق کا جو اس نے اپنے بندوں کے لیے انبیاء علیہم السلام کی زبان سے بیان کیا ہے تاکہ بندے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں۔

---

1. المائدہ ۵:۳۔
2. آل عمران ۳:۹۵۔
3. الحج ۲۲:۷۸۔
4. الانعام ۶:۶۱۔

اس کے بعد دین اور ملت میں فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ملت کی نسبت صرف نبی کی طرف کی جا سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی جا سکتی اور دین کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے گویا ملت سے مراد وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے وضع فرمایا جبکہ دین کا اس پر اطلاق اس کے قائم کرنے والے کی نسبت سے ہے کہ اس کے معنی اطاعت کے ہیں۔"

لفظ سبیل کا مفہوم

قرآن مجید نے مذہب کے مفہوم کو سبیل کے لفظ سے بھی تعبیر کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ[1] اپنے رب کے رستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ اور ان کے ساتھ اس طریق پر بحث کر جو نہایت عمدہ ہو۔

دوسری جگہ آتا ہے وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ[2] اور اس کے راستہ کی پیروی کر جو میری طرف رجوع کرتا ہے۔

حضرت امام راغبؒ نے السبیل کے معنی الطریق یعنی راستہ کے کیے ہیں سبیل السلام کے معنی طریق الجنة کے ہیں یعنی وہ راستہ جو جنت کی طرف لے جاتا ہے۔

لفظ شریعت کا مفہوم

اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ تعلیمات کے لیے شریعت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا۔[3] ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور طریق مقرر کیا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ۔[4] پھر ہم نے تجھے اس معاملہ میں ایک کھلے راستہ پر لگا دیا کہ اس کی پیروی کر اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر جو علم نہیں رکھتے۔

حضرت امام راغب زیر لفظ شرع لکھتے ہیں۔ الشرع ینهج الطریق الواضح یقال شرعت له طریقاً والشرع مصدر ثم جعل اسماً للطریق النهج فقیل له شرعٌ و شَرعٌ و شریعة واستعیر ذالک للطریقة الالٰهیة. شرع کے معنی واضح راستہ کے ہیں۔ شرعٌ، شرعٌ اور شریعہ کے ایک

[1] النحل ۱۶:۱۲۵۔
[2] لقمان ۳۱:۱۵۔
[3] مائدہ ۵:۴۸۔
[4] الجاثیہ ۴۵:۱۸۔

معنی ہیں اور مراد اس سے طریقہ الٰہیہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول حضرت امام راغبؒ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الشرعة ماورد به القران والمنهاج ماورد به السنة کہ شریعت سے مراد قرآن مجید اور منہاج سے مراد سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

لفظ ہدایت کا مفہوم

قرآن مجید میں مذہب کو ہدایت کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ.[1] پھر اگر میری طرف سے تمھارے پاس ہدایت آئے تو جو میری ہدایت پر چلا تو ان کو نہ ڈر ہے اور وہ غمگین ہوں گے۔

حضرت امام راغبؒ نے الھدایۃ کے معنی ان الفاظ میں بیان کیے ہیں۔ ودلالۃ بلطف یعنی مہربانی سے راہنمائی کرنا۔ امام راغب نے ہدایت کو چار طرح پر بیان کیا ہے۔

اوّل: فطری ہدایت جو عام ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدائش کے ساتھ عنایت فرمادی ہے۔ قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ.[2] کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی پیدائش عطا کی پھر اسے (اپنے کمال کی) راہ دکھائی۔ یا فرمایا: وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ.[3] جس نے (حد کا) اندازہ لگایا گیا پھر راہ دکھائی۔

دوسری ہدایت وہ ہے جو انسانوں کو انبیاء علیہم السلام کے ذریعے ملتی ہے یعنی انبیاء علیہم السلام کی دعوت الی الحق وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا.[4] اور ان میں سے ہم نے امام بنائے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے۔ سب انسانوں کے لیے عام ہے جس کے لحاظ سے قرآن شریف کو هُدًى لِّلنَّاسِ.[5] (سب لوگوں کے لیے ہدایت ہے) فرمایا۔ انبیاء علیہم السلام ایک راستہ دکھا دیتے ہیں۔ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا.[6] ہم نے اسے راستہ دکھا دیا ہے۔ چاہے وہ شکر گزار ہے اور چاہے ناشکرا۔

تیسری ہدایت وہ توفیق ہے جو اس شخص سے خاص ہے جو ہدایت پا گیا۔ وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى.[7] اور جو ہدایت اختیار کرتے ہیں وہ انھیں ہدایت میں بڑھاتا ہے۔ وَمَن يُؤْمِن بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ.[8] اور جو اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔

---

1. بقرہ ۲: ۳۸۔
2. طٰہٰ ۲۰: ۵۰۔
3. الاعلیٰ ۸۷: ۳۔
4. السجدہ ۳۲: ۲۴۔
5. البقرہ ۲: ۱۸۵۔
6. الدھر ۷۶: ۳۔
7. محمد ۴۷: ۱۷۔
8. التغابن ۶۴: ۱۱۔

چوتھی ہدایت آخرت میں ملے گی۔ سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ[1] انھیں منزلِ مقصود پر پہنچائے گا اور ان کی حالت کو سنوار دے گا۔

صراط اور طریق کا مفہوم

قرآن مجید میں ''صراط'' اور ''طریق'' کے الفاظ مذہب کے مفہوم میں وارد ہوئے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّکَ لَتَهْدِیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ[2] تو یقیناً سیدھے کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ صراط کے معنی امام راغب نے الطریق المستسہل یعنی آسان راستہ کے کیے ہیں۔

طریق کا لفظ بھی انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔ قَالُوْا یٰقَوْمَنَا اِنَّا سَمِعْنَا کِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یَهْدِیْۤ اِلَی الْحَقِّ وَاِلٰی طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ[3] کہا اے میری قوم! ہم نے ایک کتاب سنی جو موسیٰ کے بعد اتاری گئی اس کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے ہے وہ حق کی طرف اور سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتی ہے۔

امام راغب نے الطریق کے معنی کیے ہیں۔ الطریق الذی یطرق بالارجل...... استعیر کل مسلک یسلکه الانسان فی فعل محموداً کان اومذموما. طریق کے معنی راستے کے ہیں جس کو انسان اپنے پاؤں تلے روندتا ہے پھر ہر مسلک پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے خواہ وہ مسلک اچھا ہو یا بُرا۔

قرآنی تخیل دین

دین کے متعلق قرآنی تصور لفظ ''اسلام'' میں مضمر ہے۔ اسلام کے لغوی معنی صلح کے اندر داخل ہونا ہیں۔ امام راغب فرماتے ہیں اسلام کے معنی سِلم میں داخل ہونا اور سِلم اور سَلم دونوں کے معنی صلح کے ہیں (مفردات) یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں صلح کے معنی میں مستعمل ہوئے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً.[4] اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم سارے کے سارے صلح میں داخل ہو جاؤ۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا.[5] اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کی طرف جھک جاؤ۔ مسلم وہ ہے جو خدا اور خدا کے بندوں سے صلح کرے۔ خدا سے صلح کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کے احکام اور قوانین پر گامزن ہو۔ یہ بات ہمارے تجربہ اور مشاہدہ میں ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز مقررہ

1۔ محمد ۴۷:۵۔ 2۔ الشوریٰ ۴۲:۵۲۔ 3۔ الاحقاف ۴۶:۳۰۔
4۔ البقرہ ۲:۲۰۸۔ 5۔ الانفال ۸:۶۱۔

قوانین کے تابع ہے اور ہر چیز کی فلاح اور کامیابی قوانین مقررہ کی اطاعت سے وابستہ ہے۔ کائنات کی کوئی چیز بھی قوانین مقررہ سے سرمو انحراف نہیں کر سکتی۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ [1] جس نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر پیدا کیا تو رحمان کی پیدائش میں کوئی اختلاف نہ دیکھے گا۔ پھر نظر کو لوٹا کیا تو کوئی بگاڑ دیکھتا ہے پھر نظر کو بار بار لوٹا، نظر تیری طرف تھک کر واپس آ جائے گی۔

جان کلیوی لینڈ پی ایچ ڈی ماہر ریاضی و کیمیا لکھتا ہے ''اور جب سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے اس وقت سے یہ مقررہ قوانین کی پابندی کر رہی ہے۔'' [2]

آج سے ایک سو سال قبل مغربی اہل علم دہریت کی آغوش میں جا رہے تھے لیکن قانون کے وجود نے دہریت کی اس بڑھتی ہوئی رو کو روک دیا ان لوگوں نے دنیا کی ہر چیز کو قانون کے ماتحت پایا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ کوئی مدبر ہستی ہے جو اس کائنات کو ایک ضابطہ اور قانون کے تحت چلا رہی ہے۔

جب علیم و حکیم ہستی نے دنیا کی ہر چیز کو ایک قانون اور ضابطہ کے ماتحت کر دیا ہے تو یہ لازمی امر تھا کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے قوانین بناتی جس پر چل کر انسان فلاح و کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا۔ یہ قوانین اللہ تعالیٰ مختلف ادوار میں مختلف انبیاء علیہم السلام پر نازل کرتا رہا، اور ان قوانین کی آخری اور مکمل شکل قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا. [3] آج میں نے تمہارا دین تمھارے لیے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی ہے اور تمھارے لیے اسلام کو تمہارا دین کیا ہے۔

قرآن مجید جملہ صحف سابقہ کا جامع ہے اور اس میں وہ تمام قوانین بیان کر دیے گئے ہیں جو مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتے رہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ. [4] اس قرآن میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔

بندوں سے صلح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان اپنے دوسرے بھائی سے نیک سلوک کرے۔ ان کو نقصان پہنچانے سے اجتناب کرے۔ ان دونوں امور کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے۔ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. [5] ہاں جس نے اپنے آپ کو اللہ کا فرمانبردار بنایا اور وہ احسان کرنے والا ہے تو اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے

---

1. الملک ۶۷: ۳، ۴۔ 2. خدا موجود ہے، مترجم عبدالحمید صدیقی
3. المائدہ ۵: ۳۔ 4. البینۃ ۹۸: ۳۔ 5. البقرہ ۲: ۱۱۲۔

اور ان کو کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

پس دین کا اساسی تصور اللہ تعالیٰ کے قوانین کی اطاعت اور بندگان خدا سے محبت ہے۔

مذہب فطری چیز ہے

مذہب کے فطری ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ہر قوم اور ہر نسل میں مذہب مشترک امر ہے، جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ مذہب ایک فطری چیز ہے کیونکہ تمام دنیا کا کسی موہوم اور باطل چیز پر جمع ہو جانا عندالعقل ممتنع ہے۔

پلوٹارک (Plutarch) کہتا ہے کہ "کسی انسان نے کوئی ایسی بستی نہیں دیکھی جس میں مذہب نہ ہو۔"[1]

والٹیر (Voltaire) فرانس کا مشہور مفکر کہتا ہے۔

"زوراسٹر (Zoroaster) منو (Manu) سولن (Solon) سقراط (Socrates) سب کے سب ایک ہی کی پرستش کرتے تھے اور یہی فطرت ہے۔"[2]

جرمن کا ایک حکیم لکھتا ہے:

"مذہب ابدی چیز ہے، مذہب جس حاسہ کا نتیجہ ہے وہ کسی زمانہ میں کبھی معدوم نہیں ہو سکتا۔" (بحوالہ الکلام مصنفہ شبلی ص ۲۳)

پروفیسر سبیٹر (Sabater) لکھتا ہے۔

"میں کیوں پابند مذہب ہوں؟ اس لیے کہ اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ پابند مذہب ہونا میری ذاتیات میں ہے۔ لوگ کہیں گے کہ یہ وراثت یا تربیت یا مزاج کا اثر ہے، میں نے خود اپنی رائے پر اعتراض کیا ہے لیکن میں نے دیکھا کہ سوال پھر پیدا ہوتا ہے اور وہ حل نہیں ہوتا۔ مذہب کی ضرورت جس قدر مجھ کو اپنی ذاتی زندگی کے لیے ہے اس سے زیادہ عام سوسائٹی کو ہے۔ مذہب کے شاخ و برگ ہزاروں مرتبہ کاٹ ڈالے ہیں لیکن جڑ ہمیشہ قائم رہی ہے جو کبھی زائل نہیں ہو سکتی۔ مذہب کا چشمہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے اور فلسفیانہ فکر اور زندگی کے دردناک تجربے اس کو اور گہرا کرتے جاتے ہیں۔ انسانیت کی زندگی مذہب ہی سے قائم ہوئی ہے اور اسی سے قوت پائے گی۔"[3]

قرآن مجید کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ مذہب فطری چیز ہے، ارشاد الٰہی ہے:

---

1. Plutarch:Humanity and Deityji.
2. لوتھر (Martin luther) کتاب الفلسفہ (ترجمہ عربی) ص ۱۷۵ مطبوعہ بیروت بحوالہ امام غزالی کا فلسفہ مذہب و خلاق مصنفہ ڈاکٹر سید حسین صاحب قادری شور ایم۔ اے۔ صفحہ ۱۷۷۔
3. الحیوہ سال اوّل ص ۱۵۵ بحوالہ الکلام مصنفہ مولانا شبلی ص ۱۷۰۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ط فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ[1] پس اپنا منہ دین کی طرف سیدھا ہو کر کر۔ یہ وہ خدا کی فطرت ہے جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے اللہ کی پیدا کی ہوئی حالت کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ یہی قائم رکھنے والا یا رہنے والا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اس آیت کریمہ میں دین حنیف کو اللہ کی فطرت قرار دیا ہے اور اسی پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔

دین کی غرض و غایت

ا۔ فطری اقتضاء کی تکمیل

جیسا کہ پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ مذہب فطری چیز ہے، اس لیے دین کی غرض و غایت بھی فطرت کے اقتضاٗت کو پورا کرنا ہے۔ فطرت کے اقتضاٗت دو قسم کے ہیں۔ روحانی اقتضاٗ اور مادی اقتضاٗ۔

۲۔ روحانی اقتضاء (باری تعالیٰ کا شعور اجاگر کرنا)

روحانی اقتضاء اللہ تعالیٰ کی ہستی کے اردگرد گھومتا ہے کیونکہ خدا کی ہستی کا شعور انسان کی فطرت میں رکھا ہوا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ[2] اگر تو ان سے سوال کرے کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے تو ضرور کہیں گے کہ انھیں غالب علم والے نے پیدا کیا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا[3] اور جب تیرے رب نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد پیدا کی اور ان کو اپنے اوپر گواہ ٹھہرایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے جواب دیا ہاں ہم گواہ ہیں۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں خدا کی ہستی کا شعور انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔

مذہب اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلائل اور براہین کے ذریعے محکم ایمان پیدا کرتا ہے، ایمان کے آب زلازل سے ہی روحانی زندگی کا شجر سرسبز اور شاداب رہ سکتا ہے۔

اگر تمام مذاہب عالم کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ خدا کی ہستی کا تصور ہر مذہب میں پایا جاتا ہے۔ جو اس امر کا ثبوت ہے کہ مذہب کی غرض و غایت اللہ کی ہستی پر یقین پیدا کر کے معرفت کاملہ تک پہنچانا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر جتنا زیادہ یقین اور ایمان ہوتا ہے انسان اتنا ہی بدیوں سے دور رہتا ہے اور نیکیوں کی طرف رغبت کرتا ہے کیونکہ حقیقی معرفت ہی انسان کو گناہوں کی آلائشوں سے پاک کر سکتی ہے۔ اس

---

[1] روم ۳۰:۳۰۔ [2] الزخرف ۹:۴۳۔ [3] الاعراف ۱۷۲:۷۔

کی یوں مثال سمجھئے کہ اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو کہ اس بل میں سانپ ہے تو وہ اس میں ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ کہ سانپ اس کو ڈس لے گا۔ اسی طرح کوئی شخص وہ دودھ نہیں پیئے گا جس کے متعلق اس کو یہ یقین ہو کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے۔

پس مذہب کی پہلی غرض اللہ تعالیٰ پر کامل یقین پیدا کرنا ہے۔ تمام مذاہب خصوصاً اسلام نے خدا پر کامل یقین اور معرفت تامہ پیدا کرنے اصول بھی بیان کیے ہیں وہ یہ ہیں عبادت الٰہی، توبہ و استغفار، دعا اور خدمت خلق، جب انسان کو خدا کی معرفت تامہ حاصل ہو جاتی ہے تو وہ ایمان باللہ کے ضمنی عقائد یعنی نبیوں پر ایمان، سماوی کتابوں پر ایمان، ملائکہ پر ایمان اور آخرت پر ایمان لے آتا ہے۔

فلسفہ توحید

ا۔ انسانی عظمت وشرف

توحید کا لازمی نتیجہ انسانی عظمت ہے۔ جب ایک انسان اللہ تعالیٰ کو وحدۂ لاشریک تسلیم کر لیتا ہے تب وہ دنیا کی ہر غلامی سے نجات پا جاتا ہے اور اس کو پوری کائنات پر برتری حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا[1] اور یقیناً ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی ہے اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سواری دی اور ان کو اچھی چیزوں سے رزق دیا اور ہم نے ان کو بہتوں پر جنھیں ہم نے پیدا کیا ہے بڑی فضیلت دی ہے۔

زمین، آسمان، چاند، سورج، دریا، سمندر غرض کہ کائنات کی ہر چیز انسان کی آسائش اور انتفاع کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا[2] وہی ذات ہے جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے تمھارے لیے پیدا کیا۔

ب۔ اتحاد نسل انسانی

عقیدۂ توحید انسانی نسل کے اتحاد کے لیے کونے کا پتھر ہے، یہی وہ بنیاد ہے جس پر اتحاد کی عمارت استوار کی جا سکتی ہے۔ قرآن مجید میں خدا کو رب العالمین کہا گیا ہے یعنی تمام اقوام کا رب، عربی زبان میں رب کے معنی ایک چیز کو تدریجاً ترقی دے کر اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ہے (امام راغب) اللہ تعالیٰ اپنی صفت ربوبیت کے تحت دنیا کی تمام اقوام کی روحانی اور جسمانی پرورش کرتا ہے گویا تمام قومیں خدا تعالیٰ کی عیال ہیں وہ سب کی خبر گیری کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے واضح طور کہا ہے۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً[3] یعنی سب لوگ ایک ہی قوم ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ[4] ساری مخلوق عیال اللہ ہے۔

---

[1] بنی اسرائیل ۱۷:۷۰۔ [2] البقرہ ۲:۲۹۔ [3] البقرہ ۲:۲۱۳۔ [4] بیہقی کتاب الایمان۔

توحید کا عقیدہ یہ سبق دیتا ہے کہ تمام بنی انسان کو اتحاد اور محبت کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہیے۔

ج۔ مساوات

عقیدہ توحید سے مساوات کا سبق ملتا ہے اور تفریق بین الناس اور اونچ نیچ کا مسئلہ پامال ہوتا ہے۔ عقیدہ توحید ہی پامال شدہ لوگوں کو اٹھا کر بڑوں کے دوش بدوش کھڑا کرتا ہے۔ اسلام نے نسلی، قومی، لسانی، لونی امتیازات کو ختم کر کے حسن عمل اور اخلاق حمیدہ کو وجہ تکریم قرار دیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔[1] معزز وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہے۔

انسانی مساوات کا مسئلہ اسلام کی رو سے اس قدر اہم تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو اہم باتیں بیان کی تھیں ان میں یہ مسئلہ بھی بیان فرمایا اس خطبہ کے الفاظ یہ ہیں۔

اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی۔[2] لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے بے شک تمہارا باپ ایک ہے ہاں! عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے سبب سے۔

د۔ رواداری

توحید باری تعالیٰ کا پیغام بنی نوع انسان کے ہر طبقے تک پہنچایا گیا ہے۔ بناء بریں وہ ہر ایک سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہر مذہبی کتاب اور ہر رسول کو تسلیم کیا جائے اور مذہب کے نام پر خون خرابا نہ کیا جائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔[3] دین کے بارے میں کسی کا جبر نہیں۔

لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔[4] اور ان کو گالی نہ دو جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں۔

ر۔ امن عالم

عقیدۂ توحید امن عالم کا ضامن ہے کیونکہ عقیدۂ توحید عالمگیر اخوت، اتحاد، محبت، مساوات جنم دیتا ہے اور نفرت، عداوت اور تعصب کو بالکل ختم کرتا ہے۔ جب دشمنی اور تعصب دنیا کی قوموں سے مٹ جائے تو دنیا میں امن قائم کرنا مشکل نہیں رہتا۔ امن عالم کے خرمن کو صرف اسی وجہ سے آگ لگی ہوئی ہے۔ نسلی، لسانی، لونی تعصبات کی آندھی چل رہی ہے۔

س۔ تزکیہ نفس

انسان کی اخلاقی ترقی کے لیے عقیدۂ توحید بڑی طاقت ہے۔ اسی وجہ سے ہر مذہب نے خدا کو

1۔ الحجرات ۴۹: ۱۳۔ 2۔ مسند احمد۔
3۔ البقرہ ۲: ۲۵۶۔ 4۔ الانعام ۶: ۱۰۸۔

ایک ماننے پر بہت زور دیا ہے۔ انسان کے اندر جو اخلاقی بلندی اور کمال آج نظر آ رہا ہے وہ خدائے واحد پر ایمان لانے کا ہی ثمرہ ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات اور نام بیان ہوئے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى۔[1] اس کے سب نام اچھے ہیں۔ ''حسنیٰ'' کے لفظ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ وہ ذات ہے جو تمام صفات حسنہ کی جامع اور تمام عیوب سے مبرہ ہے۔ ان صفات کے تحت اپنی زندگی بسر کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ''تخلقوا باخلاق اللّٰه'' یعنی اللہ کے اخلاق اختیار کرو۔ یہی وجہ ہے قرآن مجید میں جہاں جہاں ایمان باللہ کا ذکر آیا ہے۔ وہ اعمال صالحہ بجالانے کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ گویا ایمان باللہ عمل صالح کے بغیر بے سود ہے۔

تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ ہر نبی نے اپنے اپنے وقت میں عقیدہ توحید کی بناء پر اپنی اپنی قوم کو قعرِ مذلت سے نکال کر اخلاقِ حسنہ کے لیے بلند مینار پر کھڑا کر دیا جو تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔

ش۔ علوم کی ترقی

عقیدۂ توحید علوم اور سائنس کی ترقی کا ضامن ہے۔ عقیدۂ توحید نے انسان کو یہ سبق دیا کہ وہ اشرف المخلوقات ہے اور کائنات کی ہر چیز انسان کی آسائش اور انتفاع کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اس سبق نے انسان کو کائنات کی ہر چیز کو مسخر کرنے کی طرف توجہ دلائی اور انسان کائنات کے عناصر کے خواص معلوم کرنے میں لگ گیا۔ جس سے مختلف علوم اور سائنس نے ترقی کی۔

اخلاق

روحانی اقتضاء یعنی شعور ہستی باری کا لازمہ اخلاق فاضلہ کو اپنانا ہے انسانی فطرت اچھے اعمال کو پسند کرتی ہے اور برے کاموں سے نفرت۔ اچھے اعمال وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہوں۔ جو اعمال اللہ تعالیٰ کی صفات کے منافی ہوں گے۔ وہ اخلاق سیئہ ہیں۔ اخلاق فاضلہ انسانیت کے آئینہ دار ہیں۔ جتنے بھی مذاہب دنیا میں پائے جاتے ہیں وہ سب اخلاق فاضلہ کی تلقین کرتے ہیں۔ تمام مذاہب میں اخلاق فاضلہ کا مشترکہ پایا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ مذہب کی غرض وغایت اخلاق فاضلہ کی تعلیم دینا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ (مشکوۃ) میں اس لیے بھیجا گیا ہوں تاکہ حسن اخلاق کی تکمیل کرلوں۔

اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ (مسلم) نیکی حسن خلق کا نام ہے۔

مادی اقتضاء

فطرت کی دوسری اقتضاء مادی ہے جس میں خاندان، معاشرت، معیشیت، سیاست اور قانون

[1] بنی اسرائیل ۱۷: ۱۱۰۔

امور شامل ہیں۔ تمام مذاہب مذکورہ امور کی تعلیم دیتے ہیں۔ خصوصاً اسلام نے ان امور سے متعلق کامل ہدایت دی ہے۔

عائلی زندگی

خدا کی ہستی اور اخلاق فاضلہ کی تعلیم کے بعد اہم امر عائلی زندگی ہے کیونکہ عائلی زندگی ہی معاشرہ کی پہلی اکائی ہے اور اسی پر معاشرہ کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ عائلی زندگی انسانی فطرت کی پہلی مادی جھلک ہے اسی لیے عائلی زندگی کو قواعد وضوابط میں ڈھالنے کے لیے مذہب کی غرض و غایت ٹھہرایا گیا ہے۔ انسانی فطرت میں ہی بقائے نسل کا تخم بو دیا گیا ہے۔ ہر شخص کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی نسل ہو۔ اسی خواہش کی تکمیل کے لیے دنیا میں ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے گئے ہیں یعنی نر اور مادہ۔ یہی بقائے نسل کا ضامن ہے۔ مرد اور عورت کی پیدائش اسی حکمت الہیہ سے ہوئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيرًا وَنِسَاءً[1] اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا ہے اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

تمام دنیا کی رونق مرد اور عورت کے باہمی اختلاط کا نتیجہ ہے۔ تمام مذاہب نے باہمی اختلاط کے قواعد بیان کیے ہیں۔ تا کہ مرد وعورت ان ضوابط کی پابندی سے غلط کاریوں میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ غلط کاریاں ہی معاشرتی زندگی کے لیے مہلک ہوتی ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ يَامَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنْ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ الْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفُرُوْجِ وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ وِجَاءٌ. اے جوانوں کے گروہ جو کوئی تم میں سے نکاح کی طاقت رکھتا ہے تو چاہیے کہ وہ نکاح کرے کیونکہ نکاح آنکھوں کے نیچے رکھنے اور شرم گاہوں کی حفاظت کا ذریعہ ہے جو نکاح کی قدرت نہیں رکھتا تو وہ روزہ رکھے اور وہ خصی کر دیتا ہے۔ (جذبہ شہوت کو دبا رکھتا ہے)

ب۔ معاشرت

جب عائلی زندگی میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ انسان گھر سے باہر قدم رکھتا ہے تو معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انسان کے اعمال کا دائرہ بھی وسیع ہو جاتا ہے۔ معاشرتی ادارہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اس وجہ سے حکماء اور فلاسفہ نے انسان کو مدنی الطبع قرار دیا ہے۔ معاشرہ کے بغیر انسانی زندگی دوبھر بن جاتی ہے۔ تمام مذاہب نے خصوصاً اسلام نے معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اصول مقرر کیے ہیں تا کہ معاشرہ قوانین کی حدود میں رہ کر آگے بڑھے اور انسانی زندگی کو خوشگوار بنائے۔ اسلام نے معاشرتی

[1] النساء ۴:۱۔

زندگی کو بہتر بنانے کے چند اصول مقرر کیے ہیں وہ یہ ہیں مساوات، اخوت، اتحاد، انصاف، جان و مال اور عزت کی حفاظت، حریت و آزادی، ملکیت میں، دوسروں کا حق، ذمہ داری کا احساس، تکریم انسانیت، اس کے ساتھ معاشرتی ادارے کے تمام اراکین کے حقوق و فرائض مقرر کر دیے ہیں۔

معیشت

ابتدائے آفرینش سے روٹی کے مسئلہ کو بہت اہمیت حاصل ہے اس مادی مسئلے کو ہر مذہب نے حل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کی تکمیل اسلام نے کی ہے۔ اسلام ایک فطری اور امن کا دین ہے اس نے حصول انتفاع اور رفع نزاع کے لیے پابندیوں کے ساتھ ذاتی ملکیت کو تسلیم کیا ہے۔ حرام کردہ شرعی پابندیاں یہ ہیں۔ سودی کاروبار، جوا، حرام چیزوں کی خرید و فروخت، احتکار، اکتناز، تجخیس، کم ناپ تول، کاروبار میں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا جا سکتا جس سے دوسرے افراد یا سماج کو نقصان پہنچتا ہو۔ کوئی ایسا لین دین نہیں کیا جا سکتا۔ جس میں بیچی جانے والی چیز بیچنے والے کے اپنے قبضہ میں نہ ہو۔ روزی کمانے کے وہ ذرائع اور طریقے ناجائز ہیں جو دوسروں کے مادی نقصان کا باعث بنتے ہوں۔ اسی طرح وہ ذرائع بھی ممنوع ہیں جن سے اخلاق کے بگڑنے کا اندیشہ ہو۔ لین دین کا کوئی ایسا معاملہ طے نہیں کیا جا سکتا جس کے سارے ضروری پہلو واضح نہ ہوں اور فریقین میں جھگڑا پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ مذکورہ پابندیوں کے تحت جو شخص روزی کمائے گا۔ اس میں بھی سائلین اور محرومین کا حق ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فِی اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ [1] ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے۔

اسلام نے اس حق کو دو طریقے سے ادا کرنے کی تعلیم دی ہے لازمی اور طوعی۔

لازمی سے مراد زکوٰۃ ہے جو ہر صاحب نصاب پر فرض ہے اس کے علاوہ طوعی ہے کہ ایک صاحب دولت اپنی مرضی سے غرباء کی کفالت کے لیے جتنا چاہے خرچ کر لے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْو [2] وہ تجھ سے سوال کرتے ہیں۔ کیا خرچ کریں کہہ دے جو ضرورت سے زائد ہے۔

سیاست اور قانون

سیاست انسانی فطری مادی اقتضاء کا ایک اہم جزو ہے۔ سیاست معاشرتی زندگی کی آخری حد ہے۔ جب معاشرتی زندگی میں وسعت پیدا ہوئی۔ اسی معاشرتی وسعت کے بطن سے ریاست کا وجود نکلا۔ عہد قدیم سے ہی ریاست کا موضوع مفکرین کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ مذاہب عالم کے بانیوں نے بھی اس فطری ادارہ کے لیے قوانین مرتب کیے۔ لیکن یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے۔ جس نے ریاست کے لیے ایسے قوانین وضع کیے ہیں۔ جن سے عوام اور ریاست کے باعث بہترین

[1] حٰمٓ السجدہ ۴۱: ۱۰۔ [2] البقرہ ۲: ۲۱۹۔

رشتہ قائم رہ سکتا ہے۔ اسلام نے حکمران کی تقرری عوام کی رائے سے ضروری قرار دی ہے پھر حکمران کے اوصاف بیان کر دیے ہیں۔ اس کے ساتھ شہریوں اور حکمرانوں کے حقوق و فرائض متعین کر دیے ہیں۔ اس سے انسان کی زندگی انفرادی اور اجتماعی طور پر پرسکون اور خوشگوار بن گئی ہے۔[1]

اقتضاءات روحانی و مادی کی تکمیل کا نتیجہ (انسانی فلاح)

اقتضاءات روحانی اور مادی کی تکمیل کا نتیجہ انسانی فلاح ہے جیسا کہ قرآن مجید کے آغاز میں ہی اس کا ذکر ہے۔ هُدیً لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ اُولٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (البقرہ ۲:۲.....۵) متقیوں کے لیے ہدایت ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور اس سے جو ہم نے ان کو دیا خرچ کرتے ہیں اور جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو تری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی اپنے سب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں۔ سورہ مومنون میں بھی فلاح کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ ا۔ نماز میں عاجزی ۔۲۔ لغو باتوں سے اعراض۔ ۳۔ پاکیزگی کے لیے کام کرنا (یا زکوٰۃ دینا) ۴۔ شرم گاہوں کی حفاظت کرنا۔ ۵۔ اپنی امانتوں اور عہد کا پاس رکھنا۔

فلاح کیا ہے:۔ فلاح کے معنی ظفر و ادراک بغیة (امام راغب) یعنی کامیابی اور مطلب کو پا لینا۔ اسلام میں فلاح دنیاوی مال و دولت کا حصول نہیں ہے بلکہ انسانی کے مخفی قویٰ کا ظہور پذیر ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر بے شمار مخفی استعدادیں رکھی ہوئی ہیں۔ اسلام ان مخفی استعدادوں کی آبیاری کرتا ہے اور وہ استعدادیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ مخفی استعدادوں کی ظہور پذیری میں ہی انسانی فلاح ہے۔ اس کی مثال یوں لیجیے۔ ایک درخت کا بیج ہے اس بیج کے اندر ہی اس کی استعدادیں اور جواہر مخفی ہیں جب زمین میں مناسب ماحول پاتا ہے تو اس بیج سے پودا نمودار ہوتا ہے جو ایک وقت پر اپنے تمام جواہر ظاہر کر دیتا ہے۔ یہی حال ایک انسان کا ہے اس کے مخفی جواہر، روحانی اور مادی اقتضاءات کی تکمیل سے ظاہر ہوتے ہیں۔ سورۃ فاتحہ میں بھی فلاح کے حصول کے لیے دعا سکھائی ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ. صراط مستقیم وہ اصول ہیں جن کی وضاحت سورۃ بقرہ کی آیات ۲ تا ۵ اور سورہ مومنون کی آیات ۱ تا ۹ میں ہے۔ سورہ فاتحہ میں صراط مستقیم پر چلنے والوں کو منعم علیہم یعنی انعام یافتہ اور سورہ بقرہ اور سورہ

[1] مذہب کی غرض و غایت کے عنوان کے زیر تحت جن عنوانات (روحانی، اخلاقی، عائلی، معاشرت، معیشت اور سیاست) پر مختصر بحث کی ہے۔ اس پر مفصل بحث ہر مذہب خصوصاً دین اسلام کے تذکرہ کے تحت ہوگی۔ کامل مذہب وہی ہے جس میں مذکورہ عنوانات پر سیر حاصل تفصیل ہو وہ صرف اسلام ہی ہے۔

مومنون میں مفلح یعنی فلاح یافتہ کہا ہے حقیقت میں منعمین وہی مفلحین ہیں۔ جو شخص انعام پاتا ہے وہی کامیاب کہلاتا ہے۔

۳۔ عقل کی راہنمائی

انسان کی عقل کوتاہ اور ناقص ہے۔ دنیا کے حکماء نے عقل کی کوتاہ بینی کا اقرار کیا ہے۔ سقراط کا یہ مشہور مقولہ ہے "ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے" اگر انسان کو اپنی عقل سے زندگی کی تمام گتھیاں سلجھانی پڑتیں اور دنیاوی زندگی بہتر بنانے کے لیے تمام اصول وضع کرنے پڑتے تو عقل کے نقص کی وجہ سے انسان قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا۔

مذہب نے انسان کی عقل کی راہنمائی کے لیے عائلی، عمرانی، سیاسی، اقتصادی اصول وضع کر دیے ہیں تاکہ انسان ان اصولوں کی روشنی میں زندگی کے ہر قسم کے مسائل کو حل کر سکے۔ اگر انسان کے سامنے وہ اصول نہ ہوتے تو وہ ہلاکت اور بربادی کے گڑھے میں گر جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے عقل وفہم سے کام لینے کی بہت تاکید کی ہے اور عقل وفہم کے مختلف گوشوں کو قرآن مجید نے مختلف الفاظ سے واضح کیا ہے کہیں فقط حکمت سے تعبیر کیا ہے کہیں لفظ لب سے اور کہیں شعور سے کہیں بصیرت سے کہیں تفکر سے اور کہیں بصیرت سے کہیں تفکر سے اور کہیں تدبر سے کہیں لفظ توسم سے۔

قرآن مجید نے مختلف پیرایوں میں یہ بیان کیا ہے کہ انسان کو غور وفکر اور عقل وتدبر سے کام لینا چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَمَنْ یُؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا[1] جسے حکمت ودانائی عطا ہوئی اسے بے شمار بھلائیاں مل گئیں۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ[2] تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ وَمَا یَشْعُرُوْنَ[3] یہ شعور سے کام نہیں لیتے۔ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ[4] تم بصیرت سے کام نہیں لیتے۔ وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُوْلُوا الْاَلْبَابِ[5] اہل عقل ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ اِنَّ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ[6] اس میں غور وفکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا[7] یہ قرآن میں غور نہیں کرتے کیا دلوں میں تالے پڑے ہیں۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ[8] اس میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ مذہب اور عقل کا باہمی تعلق کتنا ہے۔ اسی گہرے تعلق کو بیان

[1] البقرہ ۲:۲۶۹۔ [2] البقرہ ۲:۴۴۔ [3] ۲:۹۔
[4] ۲:۲۸۔ [5] البقرہ ۲:۲۶۹۔ [6] الرعد ۱۳:۳۔
[7] محمد ۴۷:۲۴۔ [8] الحجر ۱۵:۷۵۔

کرتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: دِيْنُ الْمَرْءِ عَقْلُهٗ وَمَنْ لَا دِيْنَ لَهٗ لَا عَقْلَ لَهٗ[1] انسان کا دین اس کی عقل ہے اور جس کا کوئی دین نہیں اس کو عقل نہیں۔

۴۔ حیات بعد الموت کی اطلاع

انسان خدا تعالیٰ کی ہستی پر یقین کائنات کے محکم نظام پر نظر دوڑا کر پیدا کر سکتا ہے اور انسان کی فطرت میں خدا کا تصور مرکوز ہے۔ مگر جزا و سزا اور حیات بعد الموت کا علم سوائے مذہب کے کہیں سے حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ انسان کی اپنی عقل اس قدر دور کے نتائج کو بھانپ نہیں سکتی۔ پس خدا تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی معرفت وحی کے ذریعے جزا و سزا کا قانون لوگوں کو بتایا اور جو لوگ اس قانون کی خلاف ورزی کریں گے وہ مستوجب سزا ٹھہریں گے اور جو اس قانون کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالیں گے وہ انعاموں کے وارث ہوں گے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ قَالُوا بَلٰى قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ[2] یعنی جب دوزخ میں لوگوں کو ڈالا جائے گا تو ان سے دوزخ کا دربان پوچھے گا کیا تمھارے پاس ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تھا۔

خدا تعالیٰ کی صفت عدل بھی اس امر کا متقاضی ہے کہ وہ حق و انصاف کا میزان قائم کرنے سے پہلے اپنی برگزیدہ ہستیوں کی معرفت جزا و سزا کا قانون بنائے خدا تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو ایسے قانون کے تحت سزا دے جس کا انھیں علم ہی نہیں۔

حیات بعد الموت کی اطلاع دین کی اغراض میں سے ایک اہم غرض ہے۔ حیات بعد الموت کا تصور انسانی عقل کے دائرہ سے باہر ہے۔ یہ وہی شخص اطلاع دے سکتا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہو، توحید کا بھی یہی تقاضا ہے کہ انسان حیات بعد الموت پر ایمان لائے۔

دین کے اثرات و نتائج

ہدایت و فلاح

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے آغاز میں ہی دین کا یہ اثر اور نتیجہ بیان کیا ہے کہ جو شخص دین کی تعلیم کو مان جاتا ہے تو وہ ہدایت اور فلاح پا جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ.[3] ہدایت ہے

---

[1] کنوز الحقائق حرف دال۔ [2] الملک ۶۷: ۸، ۹۔ [3] البقرہ ۲: ۲، ۳، ۴، ۵۔

متقیوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو ہم نے ان کو جو کچھ دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور تجھ سے پہلے اتارا گیا اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں۔ ان آیات میں ایمان کے دو نتائج و اثرات بیان کیے ہیں۔ ھدیٰ اور فلاح، ہدایت کے معنی ہیں۔ اَلرَّشَادُ وَالدَّلَالَۃُ بِلُطْفٍ اِلٰی مَایُوْصِلُ اِلَی الْمَطْلُوْبِ یعنی لطف کے ساتھ لے جانا اور راہنمائی کرنا اس کی طرف جو منزل مقصود تک پہنچا دے امام راغب نے ہدایت کی چار اقسام بیان کی ہیں۔

اوّل: فطری ہدایت جو عام ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدائش کے ساتھ ہی عنایت فرمائی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی۔[1] کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی پیدائش عطا کی پھر اسے (اپنے کمال کی راہ) دکھائی۔

دوسری ہدایت وہ ہے جو انسان کو نبیوں کے ذریعے ملتی ہے۔ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا۔[2] اور ان میں سے ہم نے امام بنائے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں۔

تیسری ہدایت وہ توفیق ہے جو اس شخص سے خاص ہے جو ہدایت پا جائے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی۔[3] اور جو ہدایت اختیار کرتے ہیں وہ انھیں ہدایت میں بڑھاتا ہے۔

چوتھی ہدایت منزل مقصود تک پہنچا دینا ہے۔ جیسے سَیَهْدِیْهِمْ وَیُصْلِحُ بَالَهُمْ[4] انھیں منزلِ مقصود پر پہنچائے گا اور ان کی حالت سنوار دے گا۔

اس آیت میں ہدیٰ سے مراد وہ راستہ ہے جو چلنے والے کو ابتدائی منزل سے چلا کر آخری منزل تک پہنچا دے۔ دین (مذہب) کو ہدیٰ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ دین انسان کی تمام روحانی مخفی قوتوں اور استعدادوں کی آبیاری کرتی ہے پھر اس کو زمین سے اٹھا کر نقطہ عروج تک پہنچا دیتا ہے پس ایمان کا نتیجہ ہدایت ہے یعنی انسان کو روحانیت کی راہ پر ڈال کر قاب قوسین کے اعلیٰ مقام تک پہنچا دینا ہے۔ اس ارفع مقام سے آگے اور کوئی مقام نہیں ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر انسان ایمان کے سایہ کے نیچے اپنی استعداد کے مطابق ہی ترقی کر سکتا ہے ''قاب قوسین'' کا مقام ارفع بنی نوع انسانوں میں سے صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی حاصل کیا تھا کیونکہ آپ ان تمام روحانی استعدادوں کے مالک تھے جو فرداً فرداً پہلے انبیاء علیہم

---

[1] طٰہٰ ۲۰:۵۰۔ [2] السجدہ ۳۲:۲۴۔

[3] محمد ۴۷:۱۷۔ [4] محمد ۴۷:۵۔

انسلام اپنے اندر رکھتے تھے۔ اسی مقام کا نام مقام محمود ہے۔

دوسرا لفظ جو دین کے لازمی نتیجہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے وہ ''فلاح'' ہے۔ فلاح کے معنی شق یعنی پھاڑنا ہے۔ زمین میں ہل چلانے پر بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے کسان کو ''فلاح'' کہتے ہیں اور فلاح کے معنی ظفر اور ادراک بغیۃ ہیں (راغب) یعنی کامیابی اور مطلوب پالینا۔

جس طرح ہل چلانے سے زمین کی مخفی قوتیں ظہور میں لائی جاتی ہیں اسی طرح ایمان کے ذریعے انسان کی مخفی اور پوشیدہ استعدادیں ظاہر ہو کر اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ جاتی ہیں۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ انسان کی جسمانی اور روحانی پرورش کے سامان خدا کی صفت رحمانیت اور ربوبیت کے تحت آئے ہیں۔ جہاں بھی جسمانی اور روحانی پرورش کے سامان کا ذکر ہوگا۔ وہاں ''رحمن'' اور ''رب'' کے الفاظ استعمال ہوں گے۔ متذکرہ بالا آیات میں بھی لفظ ''رب'' استعمال ہوا ہے۔ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ[1] اس آیت میں لفظ ''رب'' معنی خیز ہے رب کے معنی تاج العروس اور لین انگریز لغت نویس نے پیدا کرنا، پرورش پانا، کمال تک پہنچانا، تنظیم و تکمیل دینا لکھے ہیں۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ رب وہ ذات ہے جو تدریجاً ایک چیز کو کمال تک پہنچاتی ہے۔

اس آیت میں لفظ رب کے تحت دین کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ یعنی رب وہ ہستی ہے جس نے انسان میں بے شمار مخفی استعدادیں رکھ دی ہیں۔ دین کے ذریعے ان تمام راہوں کو تجویز کر دیا۔ جن پر چل کر انسان اپنی مخفی استعدادوں کو تکمیل تک پہنچا سکے۔ یہی ارتقاء کا مسئلہ جسے ڈارون نے ایک غلط طریق سے بیان کیا ہے جس کی اصلاح سپنسر نے کی ہے۔

اس مسئلہ کی حقیقت یہی ہے کہ ایتھر کے ذرات سے لے کر انسان تک جو بھی چیز ہے وہ اپنے اندر بے شمار مخفی استعدادیں رکھتا ہے۔ انسان کی یہ مخفی استعدادیں اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ''رب'' کے تحت دین کے ذریعے نشوونما پاتی ہیں اور نقطہ کمال تک پہنچتی ہیں۔

ان تینوں الفاظ کی بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دین کا مقصد تکمیل انسانیت ہے۔

خدا کی معرفت حاصل کرنا

سورۃ التکاثر میں یقین کے تین مراتب کا ذکر ہے۔ عِلْمُ الیقین ، عَیْنُ الیقین اور حَقُّ الیقین.
پہلا مرتبہ یقین دلائل علمی سے حاصل ہوتا ہے اس لیے اسے علم الیقین کہتے ہیں۔ دوسرا مرتبہ

[1] البقرہ ۲:۵۔

مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جسے عین الیقین کہتے ہیں۔ تیسرا مرتبہ کسی چیز کے اندر داخل ہو جانے سے حاصل ہوتا ہے جسے حق الیقین کا نام دیا جاتا ہے۔

ان مراتب یقین کو ایک مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص دور سے کسی جگہ دھواں دیکھے اور دھوئیں سے ذہن منتقل ہو کر آگ کی طرف چلا جائے چونکہ دھوئیں اور آگ میں تعلق لاینفک ہے۔ پس اس علم کا نام علم الیقین ہے پھر اگر اور آگے جائے تو آگ کو اپنی برہنہ آنکھ سے دیکھ لے۔ یہ علم عین الیقین کے نام سے موسوم ہوتا ہے پھر خود آگ کے حلقہ میں داخل ہو کر آگ کی حرارت محسوس کرے تو یہ مرتبہ حق الیقین کا ہے۔

جب خدا تعالیٰ کی ذات کا علم کاوش کے ذریعے حاصل ہوگا تو وہ علم، علم الیقین کہلائے گا کیونکہ انسان کے اندر ایک روشنی ہے جو اس کو بتاتی ہے کہ سب سے اوپر ایک اعلیٰ اور برتر ہستی ہے یہ انسانی فطرت کی شہادت ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا[1] یعنی خدا کی فطرت جس پر لوگ پیدا کیے گئے ہیں۔ دوسری آیت یہ ہے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ[2] اور ہم اس سے اس کی رگ و جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کی ہستی کا شعور انسان کی فطرت میں ہے لیکن جو علم فطرت سے حاصل ہوگا۔ وہ علم الیقین کے مرتبہ میں داخل ہوگا۔

اس کے بعد دوسرا مرتبہ عین الیقین کا ہے۔ اس مرتبہ کے علم سے وہ علم مراد ہے کہ ہمارے یقین اور اس چیز میں جس پر یقین کیا گیا ہے کوئی درمیانی واسطہ نہ ہو۔ مثلاً خدا کی ہستی کا ثبوت قرآن مجید کو ٹھہرائیں کیونکہ قرآن مجید ہر پہلو سے اعجازی اوصاف رکھتا ہے۔ جس کی مثل کوئی نہیں لا سکتا۔ قرآن مجید کا بے مثل ہونا، خدا تعالیٰ کی ہستی پر ایک ٹھوس دلیل ہے، یہ علم، علم الیقین کے نام سے موسوم ہوتا ہے لیکن خدا تعالیٰ کی معرفت سے متعلق سب سے واضح اور بین شہادت دین الٰہی ہے کیونکہ دین ہی انسان کے اندر معرفت کاملہ و تامہ پیدا کرتا ہے یہ علم حق الیقین کے نام سے یاد ہوتا ہے۔

اگر دنیا میں سلسلہ انبیاء جاری نہ ہوتا اور انبیاء خدا کے احکام پا کر لوگوں کو نہ بتاتے اور خدا کی طرف راہنمائی نہ کرتے تو انسان کے اندر سے خدا کے متعلق معرفت تامہ ختم ہو جاتی اور وہ اندھیروں اور خدا کی ہستی سے متعلق ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا۔ پس دین ہی وہ راستہ ہے جو انسان کو خدا کی کامل معرفت دیتا ہے۔

---

[1] الروم ۳۰:۳۰۔ [2] ق ۵۰:۱۶۔

ذریعہ علم

حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء کے نام اور صفات سے آگاہ کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے پہلی وحی جو نازل ہوئی وہ بھی علم سے تعلق رکھتی ہے۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ.[1] اپنے رب کے نام سے پڑھ، جس نے پیدا کیا انسان کو ایک لوتھڑے سے، پڑھ اور تیرا رب سب سے بڑھ کر بزرگی والا ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے وحی کے ذریعے علم دینے کی بنیاد رکھی ہے کیونکہ علم انسان کے ذہنی قویٰ کو ترقی دیتا ہے۔ علم ہی کسی قوم اور ملک کے عروج کا ذریعہ ہے اس لیے قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَيَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ.[2] اللہ ان لوگوں کے درجات بلند کرے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور وہ جنھیں علم دیا گیا۔ اس آیت کریمہ میں انسان کی بلندی اور سرفرازی کا ذریعہ ایمان اور علم کو قرار دیا ہے۔ انسان کی فطرت میں طلب علم کی تڑپ پیدا کر دی ہے۔ اس وجہ سے اپنے خالق حقیقی سے یہ دعا کرتا ہے۔ رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا.[3] اے میرے رب میرے علم کو بڑھا۔ مذکورہ بالا آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ علم کی دولت انسان کو وحی کے ذریعے ہی میسر آئی۔

انسان کو بلند مقام پر کھڑا کرنا

خدا تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں سے انسان اشرف اور ارفع ہے کیونکہ تمام کائنات کو انسان کے لیے خادم بنایا ہے۔ گویا انسان اور باقی تمام کائنات کا رشتہ خادم اور مخدوم کا ہے اور انسان حقیقی معنوں میں اسی وقت مخدوم ہوگا جب وہ خود تو اپنے مالک حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہو اور دوسری مخلوق کو اپنے فائدہ کے لیے استعمال کرے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ[4] یعنی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ تمھارے تابع ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے شرک کو گناہ عظیم کہا ہے۔ شرک کرنے سے اللہ تعالیٰ کی شان تو نہیں گھٹتی۔ اگر تمام دنیا کے لوگ بھی خدا کا شریک ٹھہرا لیں تب بھی خدا کی عظمت اور بڑائی میں فرق نہیں آئے گا۔ دراصل جو اللہ تعالیٰ نے شرک کو ظلم عظیم قرار دیا ہے۔ وہ اس وجہ سے کہ انسان خود اپنے ارفع مقام سے گر کر نیچے آتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ.[5] یعنی جو اللہ کے ساتھ اور کسی کو شریک بنائے تو گویا وہ بلندی سے گر پڑا پھر اسے پرندے اُچک لیں گے یا ہوا اسے اُلٹ کر دور کے مکان میں پھینک دے گی۔

1۔ العلق ۹۶: ۱۔۵۔   2۔ المجادلہ ۵۸: ۱۱۔   3۔ طٰہٰ ۲۰: ۱۱۴۔
4۔ جاثیہ ۴۵: ۱۳۔   5۔ حج ۲۲: ۳۱۔

شرک کے مقابل پر اللہ تعالیٰ نے وحدانیت کا سبق دیا ہے۔ اس سبق میں انسان کے لیے فوائد مضمر ہیں۔ پس اگر اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے شرک کے نقصان اور وحدانیت کے فیوض نہ بتاتا تو انسان کائنات کی ہر چیز کے سامنے جھکا ہوا نظر آتا۔ آج جو سائنس کی ترقی کے نشان نظر آرہے ہیں وہ کبھی نظر نہ آتے کیونکہ کائنات کی اشیاء نے تو مخدوم ہونا تھا اور انسان نے خادم۔ انسان نے کائنات کی اشیاء کو مقدس اور بلند خیال کر کے ان سے فوائد حاصل کرنے کے لیے تحقیق کا دروازہ بند کر دینا تھا۔

پس اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے ذریعے انسان کو اس کا بلند مقام بتایا، پھر دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کا رشتہ تا کہ اپنے بلند مقام سے نیچے نہ گرے۔

محاسبے کا تصور

دین نے انسان کو محاسبے کا تصور دیا ہے اور یہ بتایا ہے وہ بے کار پیدا نہیں ہوا کہ وہ دنیا میں کھائے پیئے اور چند دن گزار کر اس دنیا سے اُٹھ جائے بلکہ اس کی زندگی کا ایک ارفع مقصد ہے اس کے ماتحت زندگی گزارنی ہے۔ وہ مقصد یہ ہے کہ خدا کے بتائے ہوئے احکام کے متعلق زندگی بسر کرے۔ اسی کو قرآن مجید کی اصطلاح میں عبادت کہا گیا ہے۔ یعنی خدا کے احکام کے سامنے سر جھکا دینا۔ اس کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ جو شخص خدا کے بتائے ہوئے احکام پر عمل نہ کرے گا۔ وہ ناکام و نامراد رہے گا۔ آخرت میں حکم عدولی کا محاسبہ کیا جائے گا اور حکم عدولی کی سزا پائے گا۔

تکمیل شخصیت

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی عقل ناقص ہے۔ جس طرح دیگر انسانی حواس کی قوتیں محدود ہیں مثلاً آنکھ ایک حد تک دیکھ سکتی ہے۔ اسی طرح کان کی سماعت بھی محدود ہے۔ ایک حد تک انسان سن پاتا ہے اسی طرح انسان کی عقل ہے وہ بھی محدود ہے اس کی راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ احکام نازل کر کے اچھائی اور برائی کے تصور کو نمایاں کیا ہے۔ اچھائی اور برائی کا تصور ہی انسان کی شخصیت کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام خصوصاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کیجئے۔ بعثت انبیاء سے قبل لوگ ضلالت کے گڑھے میں گرے ہوئے تھے ان کی شخصیت مسخ ہو چکی تھی۔ باوجود عقل رکھنے کے انسان ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے۔ انبیاء نے خدا سے ہدایت پا کر اچھے برے کی تمیز بتائی عرب کے لوگ زندگی کے ہر شعبے میں گمراہ تھے۔ عقل کے ہوتے ہوئے اچھائی اور برائی کی تمیز مٹ چکی تھی۔ اسلام نے ان کو بتایا کون سے اعمال اچھے ہیں اور کون سے اعمال بُرے ہیں۔ کون سے اعمال شخصیت کو مجروح کرتے ہیں اور کون سے اعمال شخصیت کی تکمیل۔ وہی عرب جو دن رات برائیوں میں مبتلا تھے دین اسلام کی روشنی نے ان کو وہ راستہ دکھایا جس پر وہ چل کر باخدا بن گئے۔

تمدنی اثر

اگر غیر جانب دارانہ طور پر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ تمدن اور معاشرت کی بنیاد انبیاء علیہم السلام نے ہی رکھی تھی۔ انسانی تمدن کے پہلے بانی حضرت آدم علیہ السلام تھے پھر وقتاً فوقتاً انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ خدا سے وحی پا کر معاشرتی اور تمدنی برائیوں سے آگاہ کرتے رہے۔ صالح اور اچھے اصولوں کی طرف راہنمائی کرتے رہے اس طرح تمدن راہ ارتقاء پر گامزن ہو گیا۔ آخر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمدن کی عمارت کو مکمل کر دیا۔ وہ تمام اصول بیان کر دیے جو انسانی تمدن کے لیے ضروری تھے۔ وہ اصول ہیں۔ اخوت، مساوات، رواداری، انصاف، صدق، دیانت و امانت، فرائض کی ادائیگی، ان اصولوں کے ساتھ معاشرے کے تمام عناصر وارا کین کے حقوق و فرائض بیان کر دیے۔ اسلام نے تو اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، پہننے ایک دوسرے ملنے سونے، اور قضائے حاجت کے آداب بھی بیان کر دیے ہیں۔ اس طرح تمدن کی عمارت میں جو خوبصورتی اور رعنائی نظر آتی ہے۔ وہ دین کے بتائے ہوئے اصولوں کی وجہ سے ہے۔

مذہب کا آغاز وارتقاء

مذہب کے آغاز کے بارے میں دو نظریے پائے جاتے ہیں۔ ایک ارتقائی نظریہ، دوسرا مذہبی نظریہ۔[1]

ارتقائی نظریہ

اس نظریہ کی رو سے جب انسان پیدا ہوا تو وہ مذہب کے تصور سے بالکل ناآشنا تھا اور مذہب کی ابتداء مظاہر پرستی سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلے زمین کی پرستش شروع ہوئی۔ سوسائٹی کا اولین نظام امہاتی نظام تھا اور مرد کے مقابلہ میں عورت کو زیادہ فضیلت حاصل تھی اور چونکہ زمین جس پر انسان بود و باش رکھتا تھا۔ ماں ہی کی طرح اس کی پرورش اور ربوبیت کا سامان فراہم کرتی تھی۔ اس لیے سب سے پہلے زمین کی پرستش شروع ہوئی اور اسے دھرتی ماتا کہنے لگے۔ اس کے بعد جب معاشرہ میں مرد کی اہمیت بڑھی تو امہاتی نظام کی جگہ ابوی نظام نے لے لی۔ تو الوہیت کے تصور میں تبدیلی رونما ہوئی اور دھرتی ماتا کے مقابلہ میں ''آسمانی باپ'' کی اہمیت بڑھ گئی تو اس سلسلہ میں سورج اور چاند کی پرستش شروع ہو گی۔

سورج اور چاند

اقوام عالم کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی بیشتر اقوام میں سورج کا شمار معبودان اعلیٰ میں تھا۔ چنانچہ مصر کا دیوتا اوسیرز (Osiris) اور ہورس (Horus) بابل کا شمس، اشوریوں کا

---

[1] بعض مورخین کا یہ خیال ہے کہ مذہب کی ابتداء اسلاف پرستی سے شروع ہوئی اور بعض کا یہ نقطہ نظر ہے کہ مظاہر پرستی سے۔

اشورسب آفتاب ہی تھے۔ یونان، اٹیروریہ، جرمنی، برطانیہ اوراسکنڈی نیویا کے لوگ آفتاب کی پرستش کرتے تھے۔ ہندوستان میں ویدک دور سے لے کر اب تک ''سوریہ پوجا'' ہوتی آئی ہے اور جاپان میں بادشاہ میکاڈو کو بھی سورج کا اوتار مانا جاتا تھا۔ جب انسان نے کاشتکارانہ زندگی کا آغاز کیا۔ سورج کی گردش سے غلہ بونے اور کاٹنے کا زمانہ متعین کیا تو آفتاب پرستی کو عروج ہونے لگا۔

چاند کی پرستش سورج کی نسبت کم ہوئی۔

سیارے

سیاروں کی پرستش مختلف قوموں نے کی ہے۔ بابل میں ستاروں کی پرستش زوروں پر رہی ہے۔ ستارہ پرستی کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ اس سے علم النجوم اور بعد میں فلکیات کی بنیاد پڑی۔ سورج اور چاند کی طرح ہر ستارہ کا ایک دیوتا تھا اور اس میں روح کا پایا جانا تسلیم کیا جاتا تھا لیکن ان میں سب سے زیادہ اہمیت ''قطب ستارے'' کو حاصل تھی کیونکہ وہ آسمان کا مرکزی نقطہ تھا اور تمام ستارے اس کے گرد گھومتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، مصر قدیم کے دیوتا ہورس کا قول ہے کہ ''میں وہ ہوں جو آسمان کے قطب پر صدر نشین ہے اور تمام خداؤں کی طاقتیں میری طاقتیں ہیں۔'' سمیری قوم کا سب سے بڑا معبود ''انو'' بھی قطب ستارے کا دیوتا تھا۔ ہندوؤں کے برہما کا تعلق بھی قطب ستارے سے ہے۔ اسی طرح جاپان میں سب سے بڑا خدا کے نام کے معنی ہیں ''آسمان کا مقدس مرکز مالک دیوتا۔''

پہاڑ

بعض اقوام عالم میں پہاڑوں کی رفعت اور منفعت کی وجہ سے پرستش کی جاتی رہی ہے کیونکہ پہاڑوں کی وجہ سے بارش ہوتی اور پہاڑوں سے دریا نکلتے اور زمین کو زرخیز بناتے ہیں۔ مختلف اقوام عالم میں بعض پہاڑ مقدس سمجھے جاتے تھے۔ مثلاً ہندوؤں میں کیلاش پربت، یہودیوں میں کوہ صیون اور مسلمانوں میں کوہ طور۔

مختلف اقوام کی دیومالاؤں میں ایک ایسے مقدس پہاڑ کا ذکر پایا جاتا ہے جو دیوتاؤں کے مسکن تھے۔ مثلاً ہندوؤں کا میرو، بابل والوں کا کھرساک کرا، چینیوں کا کوئن لوئین، یونانیوں کا اولمپس ایرانیوں کا البرز (یا برہرابرزایتی) وغیرہ وغیرہ۔

درخت

مقدس پہاڑ سے ایک مقدس درخت کا تصور بھی وابستہ ہے۔ مثلاً ہندوؤں کا سوم، ایرانیوں کا ہوسم، نارڈک قوم کا ایش یگ ڈرازل، یہودیوں کا شجرۃ الحیات (یا شجرہ العلم) مسلمانوں کا طوبیٰ وغیرہ۔ اہل بابل ''بہشتی درخت'' کی نقل بنا کر پرستش کرتے جسے اشیرا کہتے تھے۔ نارڈک قوم میں بھی مقدس درخت کی پرستش ہوتی تھی اور یہ رسم عیسائیوں میں ''کرسمس ٹری'' کی شکل میں اب بھی جاری ہے۔

آگ

عناصر اربعہ میں سب سے زیادہ آگ کی پرستش ہوئی ہے۔ اس پرستش کا رواج اس وقت ہوا جب انسان نے آگ کو دریافت کیا چونکہ آگ کے بجھ جانے سے دوبارہ حاصل کرنا مشکل ہوتا۔ لہٰذا جہاں تک ممکن ہوتا لوگ آگ بجھنے نہیں دیتے تھے۔ آگ کو زمین پر سورج کا نمائندہ تصور کیا جاتا تھا۔ سورج یا آگ کی روشنی کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ خدا نور محض ہے بجلی بھی آگ کی ایک صورت تھی۔ جسے ''خدائی تازیانہ'' اور غضب الٰہی کا نشانہ سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح بعض اقوام میں آتش فشاں پہاڑ کی پوجا ہوتی ہے۔

قدیم ہند کے آریہ لوگ اگنی کو سب سے بڑا دیوتا مانتے تھے۔ پارسی زمانہ قدیم سے آتش پرست رہے ہیں۔ یونان کے ہر شہر میں ایک بڑا آتش کدہ ہوا کرتا تھا۔ یہاں دن رات آگ روشن رہا کرتی تھی۔ اٹلی میں بھی یہی رواج تھا وہاں آگ کی دیوی کا نام ویسٹا تھا۔ آگ کے بعد پانی کی سب سے زیادہ پرستش کی گئی ہے۔ قدیم زمانہ کی تمام مشہور تہذیبوں نے دریائی وادیوں میں ہی جنم لیا اور وہیں پھلی پھولیں، مصر میں رود نیل، عراق میں دجلہ و فرات، ہندوستان میں سندھ اور گنگا جمنا، چین میں ہوانگ ہو کی وادیاں زمانہ قدیم میں تہذیب کا خاص مرکز تھیں۔ اس لیے یہ بات قرین قیاس ہے کہ یہاں کے لوگوں نے کسی نہ کسی صورت میں ان دریاؤں کی بھی پرستش کی ہے۔ اہل مصر، نیل ندی کو دیوتا مانتے تھے جس کا نام ''ہاپی'' تھا۔ عراق میں پانی کے دیوتا ایا کی پرستش ہوتی تھی اور ہندوستان میں ہندو گنگا جل کو مقدس سمجھتے تھے اور دریائے سرسوتی کی دیوی علوم و فنون کی مربی تصور کی جاتی ہے۔ دریاؤں کو خوش کرنے کے لیے انسان نے قربانیاں کیں اور بسا اوقات زندہ انسانوں کو ہی دریا کی لہروں کی نذر کر دیا جاتا تھا۔

ہوا

آگ اور پانی کی نسبت ہوا کی پوجا کم ہوئی ہے۔ اگرچہ ہر ملک کی دیومالا میں ہوا کا دیوتا ہونا ضرور پایا جاتا ہے۔ مٹی کو زمین کے ساتھ ہی پوجا گیا، مٹی کا تعلق کاشتکاری اور حب الوطنی سے رہا ہے۔

اعضائے جنسی

جنسی خواہش ایک فطری تقاضا ہے۔ اس کی تسکین کے دو مقاصد تھے۔ اوّل حصول لذت، دوم افزائش نسل اور اسی اہمیت کے پیش نظر اعضائے جنسی کی پرستش، مصر، عراق، ہندوستان، یونان اور روم وغیرہ ہر جگہ ہونے لگی۔

حیوان پرستی

دنیا کے ہر خطے میں حیوان پرستی کا رواج رہا ہے۔ حیوان پرستی کی ابتداء جانوروں کے خوف سے

ہوئی۔ بعد میں یہ عقیدہ رواج پا گیا کہ مُردوں کی روحیں حیوانی قالب میں چکر لگاتی ہیں تو حیوان پرستی کا عام رواج ہو گیا۔ اس سلسلہ میں انسان اور حیوان ملے ہوئے "مرکب دیوتا" (Composite gods) پیدا ہو گئے۔ جیسے ہندوؤں میں گنیش جی، وشنو کے بعض اوتار بھی اسی نوعیت کے ہیں۔

مصر اور ہندوستان میں حیوان پرستی کا بہت زور رہا ہے۔ مصری گبریلے سے لے کر ہاتھی اور شیر تک کی پوجا کرتے رہے ہیں۔ مصر میں حیوان پرستی کا ایک شرمناک پہلو یہ بھی تھا کہ عورتیں اپنے کو مقدس جانوروں کے سامنے پیش کر دیتی تھیں۔ اسی طرح جاپان میں آئنو قوم کے لوگ اپنی عورتوں سے ریچھ کے بچوں کو دودھ پلواتے تھے۔ جب ریچھ بڑا ہو جاتا تو اس کو رسیوں میں باندھ کر میدان میں لایا جاتا اور اس پر تیراندازی کی جاتی۔ بعدازاں اس کا گوشت سب مل کر کھاتے۔ ریچھ ان کا معبود یا "ٹوٹم" تھا۔

ٹوٹم پرستی

(Totemism) بھی حیوان پرستی کی ایک قسم ہے۔ شمالی امریکہ کی اوجبوا (Ojibwa) قوم اپنے مقدس جانوروں کو "ٹوٹم" کہتی تھی۔ اس ٹوٹم پرستی کا رواج شمالی امریکہ کے قدیم باشندوں کے علاوہ افریقہ، آسٹریلیا اور ہندوستان میں رہا ہے اور کسی حد تک اب بھی ہے جانوروں کے علاوہ درخت، پودے یا بعض دوسری اشیاء بھی ٹوٹم ہو سکتی ہیں۔

اکابر پرستی

جب نسل انسانی نے اجتماعی حیثیت سے ترقی کی۔ انسان نے عائلی زندگی سے بڑھ کر قبائلی زندگی اور قبائلی زندگی سے بڑھ کر مملکت کو جنم دیا تو اکابر پرستی اور شاہ پرستی کا رواج شروع ہو گیا۔ دنیا کے ہر خطے میں اکابر پرستی کا رواج رہا ہے۔[1]

مذہبی نظریہ

قرآن اور تورات کا نظریہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو اس کی جسمانی ضروریات کی طرح اس کی روحانی ضروریات کا بھی سامان مہیا کیا۔ انسان کی روحانی ضرورت کا سامان توحید اور عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس روحانی ضرورت کو انبیاء علیہم السلام کے ذریعے پورا کیا۔ ہر قوم کی طرف نبی بھیجے انھوں نے لوگوں کو توحید اور عبادت الٰہی کی تعلیم دی۔ اس وجہ سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آغاز میں ہی انسان کا مذہب توحید تھا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ.[2] کہ میں نے جن وانس کو محض عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ ہر قوم میں عبادت کا تصور انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا۔

[1] مزید معلومات کے لیے علامہ نیاز فتح پوری کی کتب خدا اور تصور خدا اور مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، کا مطالعہ کیجئے۔

[2] الذاریت ۵۱:۵۶۔

ارشاد الٰہی ہے: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ[1] اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور جھوٹے معبودوں سے بچو۔ ہر نبی نے اپنی قوم کو توحید کا سبق دیا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ[2] اور تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف ہم یہی وحی کرتے تھے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں سو میری عبادت کرو۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے، توحید اور عبادتِ الٰہی لازم و ملزوم ہیں۔ بائبل کے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آغاز میں ہی انسان کا مذہب توحید تھا۔ بائبل میں آتا ہے۔ ''خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔''

اب مغربی محققین بھی ارتقائی نقطہ نظر کو ترک کر کے قرآنی نقطہ نظر کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر شمیٹ نے لکھا ہے۔

''علم شعوب وقبائل انسانی کے پورے میدان میں اب پرانا ارتقائی مذہب بالکل بیکار ہو گیا ہے۔ نشوونما کی مرتب کڑیوں کا وہ خوش نما سلسلہ جو اس مذہب نے پوری آمادگی کے ساتھ تیار کیا تھا اب ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور نئے تاریخی رجحانوں نے اسے اٹھا کر پھینک دیا ہے۔''[3]

یہی مصنف ایک اور جگہ رقمطراز ہے۔

''اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انسان کے ابتدائی تصور کی اعلیٰ ترین ہستی فی الحقیقت توحیدی اعتقاد کا خدائے واحد تھا اور انسان کا دینی عقیدہ جو اس سے ظہور پذیر ہوا۔ وہ پوری طرح ایک توحیدی دین تھا۔''[4]

ابتداء آفرینش سے انسان کا اصلی مذہب توحید تھا اور بعد میں جب لوگ عقیدۂ توحید سے منحرف ہوئے اور وہ شرک اور الحاد کی تاریک وادی میں بھٹکنے لگے تو اصلاح کے لیے دنیا میں ہر قوم میں پیغمبر آئے اور لوگوں کو توحید کا درس دیتے رہے۔

---

[1] النحل ۱۶:۳۶۔ [2] الانبیاء ۲۱:۲۵۔

[3] The origion and growth of religion P.262.

[4] The origion and growth of religion.

دوسرے مذاہب کی موجودگی میں دین اسلام کی ضرورت

پہلی ضرورت: تکمیل شریعت

دین اسلام سے پہلے جس قدر مذاہب آئے وہ سب قومی اور محدود ضروریات کے لیے تھے۔ ان کا پیغام اپنے اندر عالمگیر حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ قرآن مجید میں نوح علیہ السلام کے متعلق آتا ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ. (۵۹:۷) ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ حضرت ہود علیہ السلام کے متعلق آتا ہے۔ اِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا (۶۵:۷) قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ حضرت صالح علیہ السلام کے متعلق آتا ہے۔ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صَالِحًا (۷۳:۷) ثمود قوم کی طرف ان کا بھائی صالح نبی بن کر آیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے متعلق آیا: وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا (۸۵:۷) مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَکَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (۵:۱۴) اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول تھے۔ (ال عمران ۳:۴۹)

اگر مذاہب عالم کی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل عیاں ہو جائے گی کہ کسی کتاب نے بھی عالمگیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ویدوں کو لیجیے۔ نہ تو خود وید نے عالمگیر الہام ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور نہ کسی وید بھاسکر نے وید کی تعلیم کو عالمگیر قرار دیا۔ اگر وید کی تعلیم عالمگیر ہوتی تو ضروری تھا کہ اس کی تعلیم کی اشاعت اور تبلیغ ہندوستان کی چار دیواری سے باہر ہوتی، اور وید کے ماننے والے دنیا کی دوسری اقوام تک اس کے پیغام کو پہنچانا ضروری سمجھتے۔ لیکن اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں شودر وید کا کلام سننا تو در کنار وید کی شکل دیکھنے سے محروم رہا۔ منوجی کے قول کے مطابق ایک شودر برہمن کے منہ سے وید کو سن لے تو اس کو قتل کر دینا ضروری ہے۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ وید کی تعلیم عالمگیر نہیں تھی، بلکہ صرف ایک قوم کے لیے تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول تو اب تک انجیل میں لکھا ہوا ہے۔

''میں صرف بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کے لیے آیا ہوں، پس میں بچوں کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈال سکتا۔'' (متی ۱۵ باب)

پہلے انبیاء علیہم السلام کا پیغام ربانی لے کر صرف ایک ہی قوم کی طرف آنا زمانہ اور فطرت انسانی

کے مطابق تھا۔ نزول قرآن مجید سے قبل دنیا کے ممالک ایک دوسرے سے الگ تھلگ تھے، ذرائع رسل و رسائل مفقود تھے، اس وجہ سے قومیں ایک دوسرے سے بالکل بے خبر تھیں۔ دوسرے انسان کا ذہن ایک عالمگیر شریعت کو اٹھانے کے قابل ہی نہیں تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ضرورت کے مطابق مختلف وقتوں میں پیغام بھیجتا رہا۔ جب دنیا رسل و رسائل اور ذرائع آمد و رفت کی وجہ سے ایک کنبہ کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی تو ایک مکمل شریعت کی ضرورت پڑی جو بنی نوع انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرے۔ سو اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دین اسلام کی تعلیم دے کر بھیجا۔ قرآن مجید نے یہ دعویٰ کیا ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدہ ۵:۳) آج میں نے تمہارا دین تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے، دین اسلام تمھارے لیے پسند کیا ہے۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں آتا ہے: فِیْهَا كُتُبٌ قَیِّمَةٌ البَیِّنَة (۹۸:۳) اس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں یعنی قرآن مجید تمام کتب کی تعلیمات کا عطر ہے۔

دوسری ضرورت: مذہبی اختلاف کا فیصلہ

اسلام سے پہلے تمام مذاہب اختلافات اور تنازعات کا شکار بن چکے تھے، اب ضروری تھا کہ تمام مذہبی اختلافات کا فیصلہ ہوتا۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان تمام اختلافات کا فیصلہ کرنے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دین اسلام کی تعلیم نازل فرمائی۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ وَهُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۱۶:۶۴) اور ہم نے تجھ پر کتاب صرف اس لیے نازل کی ہے کہ تو ان کے لیے وہ باتیں کھول کر بیان کرے جن کا وہ اختلاف کرتے ہیں اور وہ ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔

جب ہم مذاہب عالم کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کو اختلافات کے بھنور میں پھنسا ہوا پاتے ہیں۔ یہودی مذہب میں فریسیوں کا یہ اعتقاد تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی راست بازی سے راست باز ٹھہر کر نجات پا جائیں گے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (۲:۸۰-۸۲) اور کہتے ہیں کہ سوائے گنتی کے دنوں کے ہمیں آگ نہیں چھوئے گی کہہ تم نے اللہ سے کوئی اقرار لیا ہے تو اللہ اپنے اقرار کے خلاف نہیں کرتا بلکہ اللہ پر وہ بات بناتے ہو جو تم نہیں جانتے، ہاں جو بدی کماتا ہے اور اس کی برائیاں اسے گھیر لیتی ہیں وہی آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے۔

ان آیات میں ان کے باطل عقیدہ کی تردید کر دی ہے کہ کسی نبی کی راست بازی سے راست باز ٹھہر کر کوئی نجات نہیں پا سکتا بلکہ نجات کا دارومدار عمل ہے۔ بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ

فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ یعنی برے اعمال کی سزا کو کسی نیک آدمی کی راست بازی دور نہیں کر سکتی۔ برے اعمال کی سزا ضرور انسان کو گھیر نہیں لیتی ہے۔

اسی طرح یہود نے عزیر کو خدا کا بیٹا بنا لیا تو اللہ تعالیٰ نے عقیدہ ابنیت کی پُرزور تردید کی۔ ارشاد الٰہی ہے: وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (مریم ۱۹:۸۹......۹۰) اور کہتے ہیں کہ رحمٰن نے بیٹا بنا لیا ہے یقیناً تم ایک خطرناک بات کر گزرے ہو، قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائے اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں کہ وہ رحمٰن کے لیے بیٹے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اگر عیسائیت کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی اختلافات ہی اختلافات نظر آتے ہیں۔ رومن کیتھولک تین خداؤں کے سوا حضرت مریم کو بھی معبودیت کے تخت پر بٹھاتے ہیں اور پوپ کو مصئون عن الخطا گردانتے ہیں۔ پروٹسٹنٹ صرف باپ بیٹا روح القدس تک ہی الوہیت کو جائز سمجھتے ہیں اور پوپ کو مصئون عن الخطاء نہیں مانتے۔ پھر پروٹسٹنٹ فرقہ کے اندر بے شمار اختلافات ہیں۔

عشاء ربانی کے نظریہ کے تحت بعض کے نزدیک شراب اور روٹی حلق کے نیچے اترتے ہی مسیح کا خون اور گوشت بن جاتی ہے۔ اسی طرح عشاء ربانی میں شامل ہو کر مسیح سے توصل پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح کفارہ کے عقیدہ نے مسیحیوں کو گناہ کی زندگی میں دھکیل دیا ہے۔

قرآن مجید نے عقیدہ تثلیث کو باطل قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۴:۱۷۱) پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو کہ خدا تین ہیں اس عقیدہ سے باز آجاؤ ہی تمھارے لیے بہتر ہے اللہ صرف ایک ہی معبود ہے۔

اسی طرح عیسیٰ اور مریم کے خدا ہونے کی تردید کی۔ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۵:۱۱۶) اور جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ بن مریم کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا دو معبود بنا لو۔

کفارہ کی تردید یوں کی، وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام ۶:۱۶۴) یعنی کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔

قرآن مجید نے ہندو مذہب کے مشرکانہ عقیدہ کی کئی جگہ پُرزور الفاظ میں تردید کی، ارشادِ الٰہی ہے: اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران ۳:۶۴) یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

عقیدہ تناسخ کا رد

یہ عقیدہ ہندوؤں کا ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے خدا گناہ معاف نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے ایک

انسان کو اپنے بُرے اعمال کی سزا بھگتنے کے لیے مختلف جونوں میں تبدیل ہونا پڑتا ہے۔ قرآن مجید نے مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (جزا وسزا کے دن کا مالک) میں اس عقیدہ کا رد کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مالک کا لفظ بجائے ملک کے اس لیے اختیار کیا ہے کہ ملک محدود اختیارات کا حاکم ہوتا ہے، وہ کسی مجرم کو چھوڑ نہیں سکتا۔ مالک کے اختیارات وسیع ہیں جسے چاہے معاف کر دے۔ پس خدا تعالیٰ جزا و سزا کے دن جسے چاہے معاف کر سکتا ہے۔ پھر قرآن مجید اللہ تعالیٰ کو غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ (۴۰:۳) کہتا ہے۔ یعنی اللہ گناہوں کو معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔

روح و مادہ کی ابدیت اور ازلیت کا عقیدہ

یہ عقیدہ بھی ہندوازم کا ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے خدا کی صفات میں شرک لازم آتا ہے۔ قرآن مجید نے ایک جگہ نہیں بلکہ بے شمار جگہ پر ہر قسم کے شرک کا رد کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِکَ بِهٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران:۶۴) یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کو رب العالمین کہا ہے۔ رب کا لفظ استعمال کر کے یہ بتایا ہے کہ اللہ کی ذات اور صفات میں کوئی شریک نہیں، وہ مادہ اور روح کا بھی رب ہے اس وجہ سے یہ خدا کی کسی صفت میں شریک نہیں ہو سکتے۔

تیسری صورت: کتب سابقہ کی غلطیوں کی اصلاح

لوگوں نے سابقہ کتب سماوی میں بعض ایسی غلط باتیں شامل کر دی تھیں جو مذہب کی روح کے سراسر منافی تھیں۔ قرآن مجید نے ان غلطیوں کی اصلاح کی۔ مثلاً بائبل میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین جھوٹ بولے تھے، حضرت لوط علیہ السلام اپنی ہی بیٹیوں سے فعل شنیع کے مرتکب ہوئے، حضرت ہارون علیہ السلام نے بچھڑے کا ایک بت بنایا، حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریا کی بیوی سے زنا کیا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لیے بتوں کی پوجا کی۔

قرآن مجید نے فرداً فرداً تمام انبیاء علیہم السلام کا ذکر انتہائی تعریفی الفاظ میں کیا ہے، اور اصولی طور پر عصمت انبیاء علیہم السلام کے متعلق فرمایا:

وما اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ (الانبیاء۲۱: ۲۵-۲۷)

ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف ہم یہی وحی کرتے تھے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں سو میری ہی عبادت کرو اور کہتے ہیں رحمٰن نے بیٹا بنا لیا ہے وہ پاک ہے بلکہ وہ معزز بندے ہیں۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ (۳:۱۶۱) کسی نبی کی شان نہیں کہ وہ خیانت کرے۔

یہ دونوں آیات عصمت انبیاء علیہم السلام پر محکم دلیل ہیں کہ انبیاء علیہم السلام وہی کرتے ہیں اور وہی کہتے ہیں جو اللہ کی طرف سے وحی ہو، ان کی زندگی وحی الٰہی کے مطابق گزرتی ہے۔

چوتھی ضرورت: سابقہ کتب سماوی کے برحق ہونے کی تصدیق اور حفاظت

قرآن مجید کے نزول سے قبل ہر نبی کی بعثت قومی سطح پر ہوتی تھی اس وجہ سے ان پر جو وحی نازل ہوتی تھی وہ بھی اسی قوم کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔

اس طرح ہر قوم صرف اپنے آپ کو ہی وحی کی نعمت عظمیٰ سے مستفیض سمجھتی تھی۔ دوسروں کو محروم۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہر قوم میں تنگ نظری اور تعصب کا مرض پیدا ہو گیا۔

اسلام آیا تو اس نے نہ صرف پہلی وحیوں کو برحق قرار دیا بلکہ ان پر ایمان لانا ضروری قرار دیا اور کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ پہلی کتب پر ایمان نہ لائے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ (بقرہ ۲:۴۱) اور پس اس پر ایمان لاؤ جو میں نے اتارا اس کی تصدیق کرتا ہے جو تمھارے پاس ہے اور تم اس کے پہلے منکر نہ بنو۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (مائدہ ۴۸) اور ہم نے تیری طرف کتاب حق کے ساتھ اتاری اور جو اس سے پہلی کتب کی تصدیق کرتی ہے اور ان پر محافظ ہے اور ان کے درمیان ان کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتارا ہے۔

قرآن مجید پہلی کتب کا مصدق دو لحاظ سے ہے: ایک تو اس لحاظ سے کہ قرآن تمام کتب سماوی کو من جانب اللہ مانتا ہے۔ دوسرا اس لحاظ سے مصدق ہے کہ پہلی کتب میں قرآن مجید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق پیشگوئیاں تھیں، قرآن مجید نے ان پیشگوئیوں کو پورا کر کے ان کتب کو سچا ٹھہرایا ہے۔

پانچویں ضرورت: گم شدہ توحید کو قائم کرنا

قرآن مجید کے نزول سے قبل دنیا سے توحید کا چراغ جو مختلف انبیاء علیہم السلام نے مختلف زمانوں اور مختلف جگہوں میں روشن کیا تھا بجھ چکا تھا۔ ہندو مذہب میں تینتیس کروڑ دیوتا بن چکے تھے۔ بدھ مذہب میں خدا کی ہستی کا تصور خرافات، توہمات اور قیاسات کے نیچے دب کر گم ہو چکا تھا۔ زرتشت مذہب میں خالق خیر و خالق شر دو معبود یزدان اور اہرمن کے نام سے پوجے جاتے تھے۔ یہودیوں نے عیسائیت کے نقش قدم پر

چل کر حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنا دیا تھا۔ عیسائیت تثلیث کے چکر میں پھنسی ہوئی تھی۔ غرض کہ تمام دنیا کسی نہ کسی رنگ میں شرک کے مرض میں مبتلا تھی۔ سو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعے توحید کی بجھی ہوئی شمع کو از سرِ نو جلایا اور تاریک دلوں کو خدا کی توحید سے منور کیا اور شرک کے پودے کو جڑ سے اکھیڑ پھینکا۔

چھٹی ضرورت: تکمیلِ انسانیت

سابقہ مذاہب کی کتبِ سماوی میں انسانی قویٰ کی نشو و نما و تربیت کے لیے افراط اور تفریط پائی جاتی ہے۔ یہودی مذہب انتقامی جذبہ کو زیادہ ابھارتا ہے اور عیسائیت جذبہ رحم کی اس رنگ میں تربیت کرتی ہے کہ غصہ جو انسان کا طبعی جذبہ ہے بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ عیسائیت کی تعلیم کی رُو سے اگر کوئی کسی عیسائی کے ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی اس کی طرف کر دینا چاہیے۔ یہی حال ہندو اور بدھ مذہب وغیرہ کا ہے۔ اس وجہ سے تکمیلِ انسانیت کے لیے ایک ایسے دین کی ضرورت تھی جو انسانی قوتوں کی اعتدال پر نشو و نما کرے، سو اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو نازل کیا۔

اسلام میں افراط اور تفریط کا رنگ نہیں ہے بلکہ اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی گئی ہے۔ قرآن مجید انتقام کی بھی تعلیم دیتا ہے لیکن مناسب موقع پر، قرآن مجید انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیم دیتا ہے لیکن تبذیر سے روکتا ہے۔ قرآن مجید رحم کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن مناسب موقع پر۔ غرض کہ اسلام نے انسانی قویٰ کی نشو و نما اعتدال پر کر کے انسانیت کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔

ساتویں ضرورت: نسلِ انسانی کو وحدت کی لڑی میں منسلک کرنا

اللہ تعالیٰ کی توحید کا یہ تقاضا ہے کہ نسلِ انسانی کو وحدت کی لڑی میں منسلک کر دیا جائے۔ اس تقاضا کو اسلام نے پورا کیا۔ اسلام سے پہلے کسی مذہب نے بھی نسلِ انسانی کی وحدت کا نظریہ پیش نہیں کیا۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰:۱۹) سب لوگ ایک ہی امت ہیں لیکن وہ آپس میں جھگڑتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ. فَذَرْهُمْ فِي غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ. (۲۳:۵۲،۵۳،۵۴) یہ تمہاری قوم ایک ہی قوم ہے اور میں تمہارا رب ہوں، سو مجھ ہی سے ڈرو۔ مگر انھوں نے اپنے معاملہ کو آپس میں قطع کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، ہر گروہ اس پر خوش ہے جو ان کے پاس ہے۔ سو ایک وقت تک انھیں اپنی جہالت کی نیند میں چھوڑ دے۔

اسلام نے وحدتِ نسلِ انسانی کو ختم کرنے والے تمام تعصبات کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے۔

(الف) مذہبی تعصب

مذہبی تعصب کو ختم کرنے کے لیے یہ تعلیم دی کہ تمام کتب اور رسل اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں۔ وہ تمام قابل احترام اور معزز ہستیاں ہیں۔ اسی وجہ سے ایک مسلمان ہونے کے لیے سابقہ کتب سماوی اور تمام رسل پر ایمان لانا فرض قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ. (۲:۲۸۵) ہم کسی رسول کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

دوسری جگہ آتا ہے: كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (۲:۲۸۵) مومن سب اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔

اسلام صرف دوسرے مذاہب کے انبیاء علیہم السلام کو ہی صرف سچا نہیں مانتا بلکہ یہ تعلیم بھی دیتا ہے کہ تمام مذاہب میں نیک آدمی پائے جاتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُوْنَ اٰيَاتِ اللّٰهِ اٰنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصَّالِحِيْنَ (۳:۱۱۲-۱۱۴) یعنی اہل کتاب سب برابر نہیں ہیں، اہل کتاب میں سے ایک جماعت حق پر ہے جو اللہ کی آیات کو رات کی گھڑیوں میں پڑھتے اور سجدے کرتے ہیں۔ وہ اللہ اور آخری دن پر ایمان لاتے ہیں۔ نیکی کے کرنے کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور نیکی کرنے میں جلدی کرتے ہیں۔ وہی لوگ نیکوں میں سے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَمِمَّنْ خَلَقْنَا اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (الاعراف ۷:۱۸۱) اور ان میں سے جنھیں ہم نے پیدا کیا ہے ایک جماعت ہے جو حق کی راہ بتاتے ہیں اور اسی پر انصاف کرتے ہیں۔

مذہبی تعصب کو بالکل ختم کرنے کے لیے قرآن مجید نے تمام مذاہب کو ایک مشترکہ امر یعنی توحید پر جمع ہونے کی دعوت دی ہے کیونکہ تمام مذاہب کی بنیاد توحید پر ہی قائم ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء ۲۱:۲۵) تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف ہم نے یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں سو میری عبادت کرو۔

اگر تمام مذاہب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہر مذہب میں خدا کا تصور موجود ہے۔ یہ ایک الگ امر ہے کہ مرورِ زمانہ سے مذاہب کے اس تصور میں انسانی خیالات کی آمیزش ہوتی چلی گئی ہے۔

قرآن مجید نے اس مرکزی نقطہ کو سامنے رکھ کر یہ دعوت دی: قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران ۳:۶۴) کہہ اے اہل کتاب اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان امر

مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

(ب) قومی، لونی، لسانی تعصبات

وحدت نسل انسانی کے لیے قومی، لونی اور لسانی تعصبات نہایت ہی خطرناک ہیں۔ ان تعصبات نے دنیا کی اقوام میں منافرت اور مخاصمت کی آگ بھڑکا دی ہوئی ہے۔ قرآن نے ان تعصبات کو ختم کرنے کی نہایت ہی اعلیٰ پیرایہ میں تعلیم دی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات ۴۹:۱۳) یہ خطاب تمام دنیا کو ہے۔ اے لوگو! غور کرو تم ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہونے کی وجہ سے ایک ہی نسل کے افراد ہو تمہاری شاخیں اور قبیلے ہیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، خدا کو کسی قوم کا فرد عزیز نہیں ہاں خدا کو صرف وہ عزیز ہے جس کے دل میں خوفِ الٰہی ہو اور نیک عملی زندگی بسر کر کے نوعِ انسانی کی خدمت کرے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا: **لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لابیض علی اسود ولا لاسود علی ابیض الا بالتقوی** (زاد المعاد ص ۳۲ ج ۴) کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت ہے نہ کسی گورے کو کسی کالے پر تفوق ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر فضیلت ہے ہاں اگر فضیلت ہے تو صرف تقویٰ کی وجہ سے۔

دوسری جگہ قرآن مجید میں آتا ہے: **وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ** (روم ۳۰:۲۲) اس کے نشانوں میں سے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں میں اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں علم رکھنے والوں کے لیے نشان ہے۔

یہ تمام آیات قومی، لسانی اور لونی تعصبات کی جڑ پر تبر رکھ کر کاٹ رہی ہیں۔

قرآن مجید نے اس نظریہ کو عملی رنگ میں نماز اور حج کی عبادات میں پیش کیا ہے جہاں تمام انسان بلاتفریق قوم و ملت ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو کر وحدت نسل انسانی کی تصویر پیش کر رہے ہوتے ہیں۔

عصرِ حاضر کا انسان قومی تعصبات کے بدنتائج اور عواقب کو دیکھ کر خود اس نظریہ سے بیزار نظر آتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ہکسلے نے ۱۹۴۷ء میں لکھا تھا:

> ''قومیت پرستی اخلاقی تباہی کا موجب ہے کیونکہ یہ عالمگیریت کے تصور کے منافی اور ایک خدا کے انکار پر مبنی ہے اور انسان کی قیمت بحیثیت انسان کچھ نہیں سمجھتی۔

دوسری طرف یہ تفرقہ انگیزی کا موجب ہے۔ انانیت اور تکبر پیدا کرتی ہے۔ باہمی نفرت بڑھاتی ہے اور جنگ کو نہ صرف ضروری قرار دیتی ہے بلکہ مقدس ٹھہراتی ہے۔"

ڈاکٹر "Gauld" اپنی کتاب "Man nature and time" میں لکھتا ہے: "اب جو چیز بالکل فطری نظر آتی ہے یہ ہے کہ تمام نوع انسانی کی ایک منظم برادری قائم کی جائے۔"

یہ ہے اسلام کے زندہ اور سچا مذہب ہونے کا ثبوت۔ جس نظریہ تک انسان کا ذہن اب پہنچا ہے اس نظریہ کو قرآن نے چودہ سو سال قبل بیان کر دیا تھا۔

آٹھویں ضرورت: اللہ تعالیٰ کے ارادۂ ازلی کی تکمیل کرنا

خدا کا وہ ارادہ جس سے اشیاء پیدا کرتا ہے اس کی تکمیل ایک ضروری امر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے کہ بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے وحی نازل کرے سو وحی وقتاً فوقتاً ضرورت کے مطابق نازل ہوتی رہی۔ اس ارادہ کی تکمیل کے لیے یہ ضروری تھا کہ اسلام اپنی مکمل صورت میں قرآن کی شکل میں نازل ہو۔ اگر قرآن مجید نازل نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کا ارادہ ازلی پایہ تکمیل کو نہ پہنچتا۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات میں نقص لازم آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تمام نقائص سے منزہ اور تمام خوبیوں کی جامع ہے اس وجہ سے اسلام کا مکمل صورت میں آنا ضروری تھا۔

اسلام میں دوسرے مذاہب اور اہل مذاہب کی حیثیت

اس موضوع پر بحث کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس بارے میں اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب اور اہل مذاہب کا عقیدہ اور طرز عمل کیا رہا ہے اس کے بعد ہی اسلام کی رواداری کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

تمام مذاہب کے طرزِ عمل پر بحث تو باعث طوالت ہو جائے گی اس لیے دنیا کے صرف تین بڑے مذہب، یہودیت، عیسائیت اور ہندو دھرم کے عقیدہ اور طرزِ عمل کو زیر بحث لایا جائے گا، یہودیت اور نصرانیت ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں اور ایک دوسرے کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتَابَ[1] اور یہود کہتے ہیں کہ عیسائی کسی سچائی پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں یہود کسی سچائی پر نہیں حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں۔

یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ مفتری سمجھتے ہیں اور عیسائی یہود کو گمراہ اور قابل نفرت تصور کرتے ہیں۔ ان دونوں کی عداوت کی داستان سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں جب عیسائیوں کے ہاتھ میں عنان حکومت آتی تو وہ یہودیوں کو نیست و نابود کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے۔

یہودی عیسائی دنیا میں دشنام کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

عہد عتیق میں انبیاء علیہم السلام پر اس قسم کے گندے اور فحش الزامات لگائے گئے جن کا مطالعہ ذوقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ اس قسم کی اخلاق سوز باتیں پڑھ کر ایک قاری یہود کے عقیدہ اور طرز عمل سے بخوبی آشنا ہو جاتا ہے۔

یہود غیر یہود کو (Gentile) بے دین اور کافر کہتے ہیں اور اپنے آپ کو خدا کی چہیتی اور لاڈلی قوم سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ[2] یعنی ہم خدا کے فرزند اور اس کے چہیتے ہیں۔

ہندو دوسرے مذاہب والوں کو ملیچھ اور چنڈال سمجھتے ہیں البیرونی قدیم ہندوؤں کی مذہبی رواداری کے متعلق لکھتا ہے:

"ہندو دین میں ہم سے کلی مغایرت رکھتے ہیں۔ دوسرے مذاہب والوں کو یہ لوگ

1۔ البقرہ ۲:۱۱۳۔ 2۔ المائدہ ۵:۱۸۔

ملیچھ یعنی ناپاک سمجھتے ہیں اور ان سے ملنا جلنا، شادی بیاہ کرنا، ان کے قریب جانا، ان کے ساتھ بیٹھنا اور کھانا پینا ناجائز سمجھتے ہیں۔ جس چیز میں کسی دوسری قوم کی آگ یا پانی سے کام لیا گیا ہو اس چیز کو ناپاک سمجھتے ہیں اور اس کی اصلاح کی کوئی شکل نہیں ہے، گو نجس چیز پاک چیز سے مل کر پاک ہو سکتی ہے۔ لیکن ہندوؤں میں جو شخص ان میں سے نہیں ہے اور ان میں داخل ہونا یا ان کے مذہب کو قبول کرنا چاہتا ہے اس کو اجازت نہیں ہے اور یہ صورتِ حال انسانیت کے ہر رشتے کو توڑ دیتی ہے۔

یہ لوگ رسم و رواج اور عادات و خصائل میں ہم سے اس درجہ اختلاف رکھتے ہیں کہ اپنے بچوں کو ہم سے اور ہماری وضع و لباس وغیرہ سے ڈراتے ہیں اور ہم لوگوں کو شیطان کی طرف منسوب کرتے ہیں اور شیطان کو خدا کا مخالف اور دشمن قرار دیتے ہیں اگرچہ اس کی نسبت ہم لوگوں (مسلمانوں) کی جانب کی جاتی ہے، لیکن اس سے دوسری قومیں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں وہ سب کو شیطان سمجھتے ہیں۔

ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ملک صرف انہی کا ملک ہے۔ انسان صرف انہی کے قوم کے لوگ ہیں، بادشاہ صرف انہی کا بادشاہ ہے، مذہب صرف انہی کا مذہب ہے، علم صرف وہی ہے جو ان کے پاس ہے، یہ لوگ بہت تعلی کرتے ہیں اور جو کچھ تھوڑا بہت علم ان کے پاس ہے اس کو بہت سمجھتے ہیں اور اپنی خود پسندی کی وجہ سے جاہل رہ جاتے ہیں، ان کے اہل علم نہ صرف دوسروں بلکہ اپنی قوم کے نااہل لوگوں سے بھی علم چھپاتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان کے شہروں کے سوا دوسرے شہر ہی نہیں ہیں اور نہ ان کے شہروں کے علاوہ کہیں انسان بستے ہیں اور نہ ان کے علاوہ کسی کے پاس علم ہے اگر ان سے کہا جائے کہ خراسان اور فارس میں بھی علم ہے تو اس کو غلط سمجھیں گے۔[1]

یہ تو قدیم ہندوؤں کا نقطۂ نگاہ ہے جدید ہندومت کے بانی سوامی دیانند نے اسلام اور عیسائیت پر اپنی مشہور کتاب ستیارتھ پرکاش میں جس قدر ناروا اور دلخراش حملے کیے ہیں وہ ناقابل بیان ہیں۔

اسلام کی تعلیم

اسلام ایک ایسا دین ہے۔ جس کا خدا صرف مسلمانوں کا خدا نہیں بلکہ سب جہانوں کا خدا ہے۔ سب کی ربوبیت اسی کے ذمہ ہے۔ قرآن مجید کی پہلی سورۃ ''فاتحہ'' میں آتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

[1] کتاب الہند ملخصاً۔

یعنی سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو جہانوں کا پالنے والا ہے، یعنی اسلام کا رب صرف اہل عرب کا ہی رب نہیں بلکہ ہندوستان، ایران، شام، انگلستان، امریکہ، روس اور دنیا کے تمام ممالک کے رہنے والوں کا رب ہے جس نے جسمانی ربوبیت کے سامان ہر قوم کو دیے ہیں اسی طرح روحانی ربوبیت کے سامان سے بھی کسی قوم یا بستی کو خالی نہیں رکھا۔ قرآن مجید نے اس بات کو کئی جگہ بیان کیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَاِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ [۱] یعنی ہر امت میں نذیر (ڈرانے والے) آتے رہے ہیں۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ [۲] یعنی ہر قوم کی طرف ہدایت دینے والے آئے ہیں۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے: لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ [۳] یعنی ہر امت کی طرف رسول آئے ہیں۔

پھر فرمایا: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ [۴] یعنی ہم نے تجھ سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھیجے ہیں ان میں سے بعض رسولوں کا ہم نے تجھ پر ذکر کیا ہے اور بعض کا ذکر نہیں کیا۔

پس قرآن مجید کی یہ آیات ہر مسلمان کی نگاہ میں شری مہاراج کرشن، رامچندر، بدھ، زرتشت اور کانفیوشش قابل تکریم اور تعظیم ٹھہراتی ہیں۔ اسی وجہ سے تمام مسلمانوں نے انھیں اپنی اپنی قوم کے ہادیانِ برحق سمجھا ہے۔

مسلمانوں کو تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ. [۵] اور ہر ایک خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا اور ہم خدا کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔ ان سے انکار کرنا کفر اور ضلالت قرار دیا ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا. [۶] اور جو شخص خدا کا اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا انکار کرتا ہے وہ گمراہی میں دور نکل گیا۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیر مسلموں کو مسجد میں ٹھہراتے ان کو ان کے طریقے پر مسجد میں عبادت کرنے کی اجازت دے دیتے۔ ایک مرتبہ نجران کے عیسائیوں کا وفد مدینہ آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مسجد میں حاضر ہوا۔ اس وقت ان کی نماز کا وقت آ گیا تھا۔ اس لیے انھوں نے مسجد میں ہی نماز شروع کر دی۔ بعض مسلمانوں نے روکنا چاہا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو منع کر دیا اور فرمایا نماز پڑھ لینے دو۔ چنانچہ عیسائیوں نے مسجد نبویؐ کے اندر نماز پڑھی۔ [۷]

۱۔ فاطر ۳۵:۲۴۔ ۲۔ رعد ۱۳:۷۔ ۳۔ یونس ۱۰:۴۷۔
۴۔ المومن ۴۰:۷۸۔ ۵۔ ۲:۲۸۵۔ ۶۔ نساء ۴:۱۳۶۔
۷۔ زاد المعاد جلد اول ص ۵۔

دین میں جبر نہیں

اسلام کسی دوسرے مذہب کے آدمی کو جبر سے مسلمان بنانے کا حامی نہیں۔ اس کا یہ واضح اعلان ہے کہ دین میں جبر نہیں۔ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ[1] دین میں زبردستی منوانا نہیں، ہدایت کی راہ گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ.[2] کہہ دو کہ حق (اسلام) تمھارے رب کی طرف سے آ چکا ہے، پس جو چاہے قبول کرے جو چاہے انکار کرے۔

تبلیغ حکمت اور دانائی کے ساتھ کرنی چاہیے، ارشاد الٰہی ہے: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ.[3] اپنے رب کے راستہ کی طرف دانائی اور اچھی باتوں کے ذریعے بلاؤ اور بہت پسندیدہ طریقے سے بحث کرو۔

مذاہب کے باطل معبودوں کو بھی برا کہنے کی مانعت کی ہے: لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ.[4] جو لوگ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کی پرستش کرتے ہیں ان کو گالی گلوچ اور برا بھلا نہ کہو یہ لوگ بھی نادانی سے خدا کو برا کہنے لگیں گے۔

اسلام کا مقام دیگر مذاہب میں

جیسا کہ پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ اسلام نے تمام مذاہب کا سرچشمہ وحی الٰہی کو قرار دیا ہے۔ جہاں تورات کا ذکر کیا ہے تو اس کے متعلق یہ فرمایا ہے: فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ.[5] یعنی اس میں ہدایت اور نور ہے۔ جب تمام مذاہب سچے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرار دیے جائیں تو پھر ہر مذہب والا کہہ سکتا ہے کہ ہمارے پاس ہماری کتاب موجود ہے، اس میں سچائی اور ہدایت کا سامان بھی ہے تو پھر ہم اسلام اور اس کی کتاب کو کیوں مانیں۔

جہاں اسلام نے دوسرے تمام مذاہب کو اللہ تعالیٰ کی جانب قرار دیا ہے تو وہاں اپنا بھی ایک ایسا ارفع مقام بیان کر دیا ہے جس کی وجہ سے دوسرے تمام مذاہب کے لوگوں کو اسلام کا ماننا ضروری ہو جاتا ہے۔ وہ ارفع مقام یہ ہے کہ اسلام تمام نبیوں کا موعود دین ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَا اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَ اَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ.[6] اور جب اللہ نے نبیوں کے ذریعے سے عہد لیا کہ جو کچھ میں نے تمھیں کتاب اور حکمت سے

---

[1] بقرہ ۲:۲۵۶۔ [2] کہف ۱۸:۲۹۔ [3] نحل ۱۶:۱۲۵۔
[4] انعام ۶:۱۰۸۔ [5] مائدہ ۵:۴۴۔ [6] سورۃ آل عمران ۳:۸۱۔

دیا ہے پھر تمھارے پاس وہ رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تم نے ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ کہا کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرے عہد کا بوجھ لیتے ہو۔ انھوں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں۔ کہا پس گواہ رہو اور میں تمھارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔

اس مضمون کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے: وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ [1] اور بے شک یہ پہلوں کی کتابوں میں بھی ہے۔

یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں کہ اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کا موعود دین ہے اور اس کے متعلق ہر مذہب کی کتب میں پیشگوئیاں موجود ہیں۔

یہ مناسب ہوگا کہ مذاہب عالم کی کتب سے وہ پیشگوئیاں اور بشارات درج کی جائیں، جن میں بانی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر موجود ہے۔

بشارات کے متعلق ایک اصولی بحث

۱۔ بشارات کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ خواب کا سا مضمون رکھتی ہیں۔ عام طور پر عوام پر مشتبہ رہتی ہیں اور خواص پر بھی کبھی قرائن سے اور کبھی اس نبی کے ظہور کے وقت جس کی نسبت وہ بشارات ہیں یا اس کے اور دلائل سے ثبوت نبوت کے بعد اور اس مبشر نبی کی تفسیر سے ظہور پاتی ہیں۔ عیسائی نکتہ خیال سے تو جس کی نسبت بشارت ہو کبھی کبھی وہ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ یوحنا خود ایلیا ہونے سے انکار کرتا ہے حالانکہ مسیح علیہ السلام اسے ایلیا قرار دیتے ہیں۔ (دیکھو لوقا ۲۷/امتی ۱۴/۱۱ اور ۱۱/۱۷)

۲۔ بشارات میں بالعموم نام صفاتی ہوتے ہیں ذاتی نہیں۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان کی قیمت اس کی صفات کے لحاظ سے ہوتی ہے نہ کہ اس کے ذاتی نام کے لحاظ سے۔ جیسے حضرت مسیح علیہ السلام کا ذاتی نام یسوع ہے، اس نام کی پیشگوئی کتب سابقہ میں نہیں پائی جاتی، مسیح علیہ السلام کے نام کی پیشگوئیاں موجود ہیں۔

۳۔ بشارات میں مقامات اور ملکوں کے نام بھی صفاتی ہوتے ہیں۔

۴۔ بشارات کی مدت سے انسانوں کی مدت مراد نہیں ہوتی۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ یعنی اللہ کے ہاں ایک دن تمھارے شمار سے ہزار برس ہوتا ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک بھی برہما کا اور انسانوں کا سال گنتی کے لحاظ سے الگ الگ میعاد کا ہوتا ہے۔

۵۔ کسی بشارت کا کوئی حصہ عقل اور علم کے خلاف ہوگا تو وہ ناقابل قبول ہوگا۔

۶۔ بشارت کا افسانوی حصہ واقعات کی تعبیر کے مطابق قبول کیا جائے گا۔

[1] الشعراء ۲۶: ۱۹۶۔

۷۔ کسی نبی کے متعلق دوبارہ دنیا میں مبعوث ہونے کی بشارت سے مراد اس نبی کی صفات پر کسی دوسرے نبی کا مبعوث ہونا ہے۔ لوقا ۱:۱۷ میں مسیح نے ایلیا کے دوبارہ آنے کی تشریح اسی طرح کی اور جناب کرشن فرماتے ہیں کہ ہم کسی اور شکل میں حسب ضرورت اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں۔

۸۔ اگر کسی مقدس کتاب کی بشارت میں ایک ہی ہستی کے متعلق دو جہتیں ہوں گی تو اس کی ایک ہی جہت قابل قبول ہوگی کیونکہ الہامی کتب تحریف کی وجہ سے کم و بیش اپنی اصلیت ضائع کر چکی ہیں۔ نیز یہ امر خود کتاب کی صداقت کے خلاف ہے کہ وہ ایک ہی ہستی کے متعلق دو مخالف و متضاد خیال رکھتی ہو۔

پارسی مذہب میں نوید آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

زرتشتی مذہب جسے عوام پارسی مذہب کے نام سے جانتے ہیں ایران کا قدیم مذہب ہے۔ اب اسی مذہب کو آتش پرست اور مجوسی دین بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی مذہبی کتب ژندی اور پہلوی دو زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ قدیم ایرانیوں کی مذہبی کتاب میں دو دفتر اہم ہیں، ایک کا دساتیر اور دوسرے کا اوستا یا ژنداوستا نام ہے۔ ان کتب کے دو حصے ہیں۔ خورد دساتیر اور کلاں دساتیر۔ ۲۔ خورد اوستا اور کلاں اوستا۔ انہی دو کو ژند اور مہا ژند کہتے ہیں۔

جناب زرتشت کو خدا تعالیٰ نے مخاطب کر کے ژنداوستا کی کتاب ژنداوستا فروردیں۔ یشت ۱۳ میں فرمایا:

اس کا نام فاتح مہربان اور اسی کا نام "استوت ارینا" (تعریف کیا گیا یا محمد) ہوگا۔ وہ رحمت کا مجسمہ ہوگا کیونکہ وہ تمام جہان کے لیے رحمت ہوگا۔ وہ حاشر ہوگا اس لیے کامل انسان اور روحانی انسان ہونے کی وجہ سے وہ تمام لوگوں کی ہلاکت کے برخلاف مبعوث ہوگا۔ وہ مشرک لوگوں اور ایمان دار لوگوں کی اصلاح کرے گا۔ یعنی مشرکین، بت پرست اور زرتشتی مذہب کے پیروؤں کی بدیوں کی اصلاح کرے گا۔"

(جیمس ڈار میٹر مترجم ژنداوستا کا اس آیت پر نوٹ فروردین یشت ۲۸ آیت ۱۲۹)

دنیا میں ایک ہی عظیم الشان رسول آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوئے ہیں جن پر یہ پیش گوئی لفظاً لفظاً صادق آتی ہے۔ وہ تمام صفات جو اس بشارت میں بیان کی گئی ہیں وہ آپ کی ذاتِ مقدس میں پائی جاتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فاتح مہربان ہونا فتح مکہ کے دن ظاہر ہوا۔ اپنے خونخوار دشمنوں کو لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ[1] کہہ کر چھوڑ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رحمۃ للعالمین ہونا، جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل تمام انبیاء صرف اپنی اپنی قوم کے لیے رحمت تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حاشر ہونا یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

[1] یوسف ۱۲:۹۲۔

قدموں پر دنیا کی تمام قوموں کا اکٹھا ہونا، بت پرستوں کی اصلاح کرنا، یہ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیات ہیں۔

مہاتما بدھ کی پیشگوئی

مہاتما بدھ کی ایک پیش گوئی میتیا (Metteyya) کی آمد پر مشتمل ہے چنانچہ "چکاوتی سنگھ ناد" ستنا ۳: ۷۶ میں لکھا ہے۔

ترجمہ: بھائیو! اس وقت دنیا میں ایک اعلیٰ ہستی مبعوث ہوگی۔ اسکا نام برگزیدہ میتیا ہوگا۔ کامل معرفت والا، حکمت، نیکی اور سرور مطلق والا، تمام عالمین کا عالم بے نظیر، ہدایت کے متمنی لوگوں کا ہادی، ملائکہ اور انس کا معلم، ایک بدھ اعظم جیسا میں اس وقت ہوں۔ وہ خود کامل طور پر جانے گا اور دیکھے گا۔ گویا کہ یہ کائنات اس کی روبرو اپنی ساری ارواح عرفا جن وشیاطین برہموں کشتریوں، ویشوں (علماء اہل سیاست اور کاروباری لوگوں) کے ساتھ موجود ہے۔ جیسا کہ میں برای العین اسے دیکھ اور جان رہا ہوں۔ صداقت اپنی اصل پیاری کامل اپنی اٹھتی ہوئی خوبصورتی میں ہوگی اور اعلیٰ زندگی کی معرفت مع اپنے کمال وصفائی اصلی روح اور الفاظ دونوں کی وساطت سے ظاہر کی جائے گی۔ جیسا کہ میں اب ظاہر کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہزاروں صحابہ کی جماعت ہوگی جیسا کہ میرے ساتھ چند سو کی جماعت ہے (بدھ کی کتب مقدسہ جلد ۴ ص ۷۳، ۷۴)

لفظ میتیہ کے معنی سنسکرت اور پالی لغت میں

جس طرح اس نام کا تلفظ مختلف کتابوں میں مختلف ہے اسی طرح اس کے معنی میں بھی خفیف سا اختلاف ہے:

الف: میتر یا کے معنی سنسکرت لغت میں مہربان، دوست یا رؤف الرحیم کے ہیں۔ (سنسکرت انگلش ڈکشنری مولفہ مونیر ولیم صفحہ ۱۸۱)

ب: بودھی ستو کا نام اور آئندہ آنے والے بدھ کا نام جو موجودہ دورِ عالم کا پانچواں بدھ ہوگا۔ (بدھ ازم مذکور ص ۱۸۱)

ج: یہ لفظ میتری سے ہے جس کے معنی دوستی، خیر خواہی کے ہیں۔ (کتاب مذکور ص ۱۲۸)

د: معلم محبت ہے۔ رحمۃ للعالمین۔ (اقرب فی المودۃ)

ہ: پالی لغت میں اس کے معنی دوستی، رحم، رحمت، محبت، شفقت، ہمدردی، مخلوق کی خیر خواہی ہیں۔ (پالی ڈکشنری مصنفہ ولیم سٹیڈ)

اس پیشگوئی میں میتیہ کا لفظ قابل غور ہے جس کے معنی مہربان دوست یا رؤف الرحیم ہیں۔ قرآن مجید نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس صفت کا حامل قرار دیا ہے جس کی شہادت آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح زندگی میں موجود ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

الف: وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ. (۲۱:۱۰۷) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام قوموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

ب: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (۳:۱۵۹) سو اللہ کی رحمت سے تو ان کے لیے نرم ہے اور اگر تو سخت کلام سخت دل ہوتا تو تیرے اردگرد سے بکھر جاتے۔

ج: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۹:۱۲۸) یقیناً تمھارے پاس تمہی میں سے ایک رسول آیا ہے تمہارا تکلیف پانا اس پر شاق گزرتا ہے وہ تمھارے لیے بھلائی کا خواہش مند ہے مومنوں پر مہربان رحم کرنے والا ہے۔

میتیہ کے دوسرے معنی معرفت، حکمت، نیکی و علم، تعلیم و ہدایت میں کمال رکھنے والے کے ہیں۔ یہ تمام صفات رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

قرآن مجید کے متعلق پیشگوئی

مہاتما بدھ کے اصل الفاظ کا ترجمہ کتب مقدسہ جلد ۴ ص ۴۷ پر یوں دیا ہے:

The truth lovely in consummation will be proclaimed both in the spirit and in the letter.

"پیغام حق اپنی دلنواز تکمیل اور روز افزوں خوبصورتی میں حافظہ اور حروف دونوں میں شائع کیا جائے گا۔"

اس ایک جملہ میں قرآن مجید کے اکثر خصائص بیان کر دیے ہیں جو دنیا کی کسی کتاب کو میسر نہیں۔

۱۔ وہ پیغام حق ہے۔

۲۔ قلوب پر اثر انداز ہونے والا ہے۔

۳۔ اس کی صداقت روز بروز کھل کر سامنے آئے گی۔

۴۔ حفاظ کے سینوں میں محفوظ رہے گا۔

۵۔ احاطۂ تحریر میں آ کر اس کا ایک ایک حرف محفوظ ہو جائے گا۔

اہل ہنود کی کتب مقدسہ میں پیشگوئی

مہرشی ویاس ہندوؤں کے ایک بڑے مرتاض اور صفا کیش رشی مانے جاتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی تالیف ۱۸ مجلدات پران ہیں۔ ان پرانوں کے ۱۸ سمندر ہیں۔ ایک بڑے پایہ کی کتاب بھوشیہ

پران ہے جس میں آئندہ کی خبریں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے پرتی سرگ پر ۳ کھنڈ ۳ ادھیاء ۳ شلوک ۵ تا ۸ میں یہ بشارت موجود ہے۔

پیش گوئی کا ترجمہ

ایک ملیچھ یا اجنبی ملک اور زبان کا معلم روحانی اپنے صحابہ کے ساتھ آئے گا اس کا نام محمد ہوگا۔ راجہ بھوج نے اس مہادیو (ملائک سیرت) عرب کے رہنے والے کو آب رودگنگا اور پنج گویہ سے غسل کرا کے (یعنی تمام گناہوں سے پاک ٹھہرا کر) دلی ارادت سے نذرونیاز پیش کر کے اس کی تعظیم کی اور کہا میں تیرے حضور جھکتا ہوں۔ اے فخر نسل انسانی عرب کے رہنے والے! شیطان کے مارنے کے لیے بہت سی طاقت مہیا کرنے والے دشمن ملیچھوں سے محافظت کیے گئے ہو۔ اے پاک ہستی مطلق اور سرور کامل کے مظہر میں تیرا غلام ہوں مجھ کو اپنے قدموں میں آیا ہوا جانیے۔

اس بشارت کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اس بشارت میں حضور کا نام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاف بتا دیا ہے۔

۲۔ ملک عرب کا آپ کو رہنے والا بتایا ہے۔ (لفظی معنی مرد ستھل کے ریگ زار کے ہیں)

۳۔ آپؐ کے صحابہؓ کا ذکر خصوصیت سے کیا۔ شاید ہی دنیا میں کوئی اور نبی آیا ہوگا۔ جس نے اپنے پیروکار کو اپنے رنگ میں اتنا رنگین کیا ہو۔

۴۔ وہ گناہوں سے پاک فرشتہ سیرت ہوگا۔

۵۔ ہندوستان کا راجہ اس سے دلی عقیدت رکھے گا۔

۶۔ آپ کی دشمنوں سے حفاظت ہوگی۔

۷۔ آپ ہر قسم کی بدی کو مٹانے والے ہوں گے۔

۸۔ آپ خدا کے مظہر اتم ہوں گے۔

۹۔ مہرشی اپنے آپ کو آپ کے قدموں میں آیا ہوا قرار دیتا ہے۔

۱۰۔ آپ کو فخر نسل انسانی بتایا ہے۔

یہ بشارت اس قدر صاف اور واضح ہے جس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں۔

اتھر وید میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت

کنتاپ سوکت کا پہلا منتر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسم مبارک۔

ترجمہ: یہ سنو اے لوگو! ایک قابل تعریف تعریف کیا جائے گا۔ اے کورم ہم نے دشمنوں کے بیچ میں ساٹھ ہزار اور نوے ہزار لیے ہیں۔" یہ ترجمہ پنڈت راجہ رام صاحب پروفیسر ڈی اے وی کالج نے کیا ہے۔

''اے لوگو! یہ احترام سے سنو لوگوں میں تعریف والا انسان تعریف کیا جائے گا۔ اے زمین پر خوش خرامی کرنے والے بادشاہ ساٹھ ہزار نوے دشمنوں کو اکھاڑ پھینکنے والے بہادروں میں ہم پاتے ہیں۔''
(تھروید کانڈ ۲۰ سوکت ۱۲۷ منتر) یہ ترجمہ پنڈت کھیم کرن الہ آبادی نے کیا ہے۔

اس بشارت کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ آپ کا نام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوگا۔

۲۔ وہ شہزادہ امن ہوگا۔

۳۔ دشمنوں کی کثرت میں خدا اس کی حفاظت وصیانت کرے گا۔

یہ تینوں امور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔

سام وید میں احمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت

ترجمہ: احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے رب سے پُر حکمت شریعت کو حاصل کیا، میں سورج کی مانند (اس سے) روشن ہو رہا ہوں (پرپاٹھک ۲ کھنڈ ۶ کا منتر ۸)

اس بشارت میں مندرجہ ذیل امور کا ذکر ہے:

الف: حضور کا نام احمد ہے۔

ب: آپ کو شریعت دیے جانے کا ذکر ہے۔

ج: شریعت کے ساتھ حکمت ملنے کا بھی اظہار ہے۔

د: اس بشارت کو دیکھتے وقت رشی آفتاب رسالت کے نور سے منور ہو رہا ہے۔

تورات مقدس میں مثیل موسیٰ کی پیشگوئی

موسیٰ کی پانچویں کتاب استثناء باب ۱۸ آیات ۱۷ تا ۲۲ میں ملاحظہ کریں۔

''میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے کہوں گا وہ سب ان سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو میری باتوں کو جنھیں وہ میرا نام لے کے کہے گا، نہ سنے گا، تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔ لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے گا اور اگر تو کیونکر جانو کہ یہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں تو جان رکھ کر جب نبی کچھ خداوند کے نام سے کہے اور وہ جو اس نے کہا ہے پورا نہ ہو، یا واقع نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی بلکہ نبی نے گستاخی سے کہی تو اس سے مت ڈر۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک کسی نبی نے ایسا دعویٰ

نہیں کیا جیسا کہ بشارت میں مذکور ہے اور یہودی برابر موسیٰ جیسے ایک نبی کی آمد کے منتظر چلے آتے تھے۔

چنانچہ یوحنا ۱۹:۱، ۲۳ میں ہے کہ لوگوں نے یوحنا بپتسمہ دینے والے سے دریافت کیا کہ تو مسیح ہے تو اس نے کہا: نہیں۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ کیا تو الیاس ہے تو اس نے کہا: نہیں۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ کیا تو وہ نبی ہے تو اس نے کہا: نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہود کو ایک مسیح کی آمد کا انتظار تھا اور ایک الیاس کی دوبارہ آمد کا۔ تیسرے کسی ''وہ نبی'' کا جس کی اس قدر شہرت تھی وہاں نام لینے کی بھی ضرورت نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ مسیح اور الیاس کی دوبارہ آمد کے سوائے جو بشارت یہود میں مشہور تھی وہ صرف مثیل ہی کی تھی جو استثناء میں مذکور ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح کے ظہور سے پہلے یہودی انبیاء کے منتظر تھے: ایک مسیح کا ایک الیاس کی دوبارہ آمد کا ایک مثیل موسیٰ نبی کا۔ اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مسیح ہونے کا دعویٰ کیا۔ حضرت یحییٰ الیاس کی دوبارہ آمد کے مصداق قرار پائے مگر ''وہ نبی کے مثیل ہونے کا دعویٰ نہ حضرت مسیح علیہ السلام نے کیا، اور نہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے۔ ان کے بعد بنی اسرائیل میں سلسلہ نبوت ختم ہو جاتا ہے اور بنی اسماعیل میں سے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعویٰ نبوت کیا اور مثیل موسیٰ ہونے کا دعویٰ کیا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا (المزمل ۱۵-۷۳)

یعنی ہم نے تمہاری طرف ایسا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھیجا ہے جیسا کہ فرعون کی طرف بھیجا۔

قرآن مجید نے بار بار یہ دعویٰ کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مثیل موسیٰ ہیں۔

دس ہزار قدوسیوں والی پیش گوئی

''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔'' (استثناء ۳۳:۲)

سینا سے آنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہے جو سینا سے نکلا۔ سعیر سے جس کے پاس بیت لحم اور ناصرہ ہے حضرت مسیح علیہ السلام ظاہر ہوئے۔

وہ کونسا فاران ہے جس میں سے خدا ظاہر ہوا۔ جہاں سے مسیح کے بعد رسول نکلا۔ اس پر روشن شریعت نازل ہوئی۔ وہ کون سا دین ہے جو فاران سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل گیا۔ وہ مکہ کی وادی غیر ذی زرع ہے جہاں ایک امی نبی پر خدا کی آخری مقدس شریعت نازل ہوئی اور تمام دنیا میں پھیل گئی۔

دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آنے والا ایک ہی انسان دنیا کی تاریخ میں ہے یعنی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو دس ہزار مقدس انسانوں کے ساتھ فاتحانہ شان میں مکہ میں داخل ہوئے۔

انجیل مقدس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق نوید احسن

ایک اور تمثیل سنو: ایک گھر کا مالک تھا جس نے انگورستان لگایا اور اسے چاروں طرف سے گھیرا

اور اس میں حوض کھودا اور برج بنایا اور اسے باغبانوں کو ٹھیکہ پر دے کر پردیس چلا گیا اور جب پھل کا موسم قریب آیا تو اس نے اپنے نوکروں کو پکڑ کر کسی کو پیٹا اور کسی کو قتل کر دیا اور کسی کو سنگسار کیا۔ پھر اس نے اور نوکروں کو بھیجا جو پہلوں سے زیادہ تھے اور انھوں نے ان کے ساتھ بھی اسی طرح کیا۔ آخر اس نے اپنے بیٹے کو ان کے پاس یہ کہہ کر بھیجا کہ وہ میرے بیٹے کا لحاظ کریں گے۔ جب باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا تو آپس میں کہا کہ یہی وارث ہے اسے قتل کر کے اس کی میراث پر قبضہ کرلیں اور اسے پکڑ کر باغ سے باہر نکالا اور قتل کر دیا۔ پس جب باغ کا مالک آئے گا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ انھوں نے اس سے کہا: ان بُرے آدمیوں کو بُری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکہ اور باغبانوں کو دے گا جو موسم پر اس کو پھل دیں۔ (متی ۲۱:۳۳)

باغ لگانے والا خداوند بنی اسرائیل ہے۔ (یسعیاہ ۵ باب ۲۔۳)

انگور بنی اسرائیل کی قوم ہے۔ ۸ زبور۔ ۹ تا کستان یروشلم ہے غزل الغزلات ۸ باب ۳ ا یسعیاہ ۵ باب ۳۔۵۔۱۷)

اور موسم پر ایک نوکر باغبانوں کے پاس بھیجا تا کہ وہ اس انگور کے باغ کا پھل اس کو دیں لیکن باغبانوں نے اس کو پیٹ کے خالی ہاتھ پھیرا۔ (تفسیر دیکھو یرمیاہ ۲۷ باب ۲۵، ۲۸)

پھر اس نے دوسرے نوکر کو بھیجا، انھوں نے اس کو پیٹ کر اور بے عزت کر کے خالی ہاتھ پھیرا۔

تفسیر: یہ شخص اوریا تھا۔ یرمیاہ ۲۶ باب ۲۳۔ یہ اس لیے کہ متی ۲۱ باب ۳۵ میں مار ڈالنا لکھا ہے۔

پھر اس لیے تیسرے کو بھیجا انھوں نے اسے گھائل کر کے نکال دیا۔ تفسیر ۲ تاریخ ۲۴ باب ۲۱۔

تب باغ کے مالک نے اپنے بیٹے (یہ مسیح ہیں) کو بھیجا شاید اسے دیکھ کر دب جائیں۔

جب باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا تو آپس میں کہا کہ یہی وارث ہے، اسے قتل کر کے اس کی میراث پر قبضہ کرلیں اور اسے پکڑ کر باغ سے باہر نکالا اور قتل کر دیا۔

یہاں بیٹے سے مراد صلح کار کے ہیں۔ بیٹے کا لفظ کتب مقدسہ میں وسیع معانی میں استعمال ہوا ہے۔ متی ۵ باب ۹ میں لکھا ہے: مبارک دے جو صلح کار ہیں کیونکہ خدا کے فرزند کہلائیں گے اور مسیح صلح کا شاہزادہ ہے۔

مار ڈالا سے مراد سخت ایذائیں ہیں۔

آخر کار باغ کا مالک آئے گا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا کرے گا۔ انھوں نے اس سے کہا ان بُرے آدمیوں کو بُری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکہ اور باغبانوں کو دے گا جو موسم پر اس کو پھل دیں گے۔

مالک خود آئے گا:

بیٹے کے قتل کے بعد باغبانوں کو سزا دینے کے لیے مالک خود آئے گا یعنی خدا خود آئے گا اس

سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اور آمد ہے۔ خدا کے آنے سے مراد وہ شخص کامل ہے جو الوہیت کا مظہر اتم ہے، اس میں تمام صفات الٰہیہ ظلی طور پر بدرجہ اتم پائی جائیں۔

باغ کا ٹھیکہ اور باغبانوں کو دے گا سے مراد یہ ہے کہ نبوت بنی اسرائیل سے چھین کر بنی اسماعیل کو دے دی جائے گی۔ متی ۲۱ باب ۴۳ میں ہے۔ اس لیے میں تمھیں کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور ایک قوم کو جو اس کے پھل لا دے دی جائے گی۔

مذکورہ بالا انگورستان کی تمثیل کے بعد ایک اور تمثیل اس کی تشریح میں بیان کی:

''کیا تم نے یہ نوشتہ نہیں پڑھا کہ وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا وہ کونے کا سرا ہوا۔ یہ خدا کی طرف سے ہوا اور ہماری نظروں میں عجیب ہے۔'' (مرقس ۱۲: ۵، ۱۱)

''جو اس پتھر پر گرے گا چور ہو جائے گا پر جس پر وہ گرے اسے پیس ڈالے گا۔'' (متی ۲۱: ۴۴، ۴۵)

''پھر وہ کیا ہے؟ جو لکھا ہے کہ وہ پتھر جسے راج گیروں نے رد کیا وہی کونے کا سرا ہوا ہر ایک جو اس پتھر پر گرے چور ہوگا اور جس پر وہ گرے اسے پیس ڈالے گا۔'' (لوقا ۲۰: ۱۷، ۱۸)

معماروں سے مراد بنی اسرائیل ہیں جو ہمیشہ اپنے بنی اسماعیل کو رد کرتے رہے۔ آخر کار ان میں سے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے۔ جو کونہ کا پتھر ہے جس سے نبوت کی عمارت کی تکمیل ہوئی۔ تمثیلی زبان میں حضرت مسیح علیہ السلام نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ بیٹے کو صلیب دیے جانے کے بعد خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک اور مامور ظاہر ہوگا جو کونے کا پتھر کہلائے گا۔ عبری میں لفظ پنہ ہے جو کونے کے پتھر کے معنی دیتا ہے لیکن لغت میں اس سے مراد شہر کی عمارت کی زمین کی حفاظت کے برج کا وہ محافظ پتھر ہے جو سب کی حفاظت کرتا ہے۔ چنانچہ سلاطین دوم ۱۴: ۱۳ یرمیاہ ۳۱: ۴۰، سلاطین اوّل ۷: ۴۴، ایوب ۳۸: ۹، تواریخ دوم ۲۸: ۲۴ اور ۲۶: ۱۵ میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے اور صفنیاہ ۳: ۶ میں قوموں کی حفاظت کا پتھر معنی دیتا ہے۔ ان معنوں کے علاوہ یہ سب کے سردار، سب پر حکمران اور سب کے محافظ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ دیکھو یشوع ۲۰: ۲، سموئیل ۱۴: ۳۸، یسعیاہ ۱۹: ۱۳، زکریا ۱۰: ۴)

ان معنوں کی بناء پر کونے کا پتھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ جس نے تمام انبیاء علیہم السلام اور مذاہب کی تصدیق کی اور تمام کو من جانب اللہ قرار دیا۔

اس بشارت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ پتھر جس پر گرے گا وہ بھی چور چور ہو جائے گا اور جو اس پتھر پر گرے گا وہ بھی چور چور ہو جائے گا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بشارت بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات سے پوری ہوئی کہ جنھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مقابلہ کیا وہ بھی ہلاک ہوئے اور جن کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقابلہ کیا وہ ہلاکت کے گڑھے میں گرے۔

احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے متعلق بشارت

حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی جدائی کی خبر دیتے ہوئے اپنے غمگین حواریوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

۱۵۔ اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو میرے حکموں کو مدنظر رکھو۔

۱۶۔ میں باپ سے دعا کروں گا اور وہ تمھیں ایک دوسرا فارقلیط دے گا جو ہمیشہ تمھارے ساتھ رہے گا۔

۱۷۔ روح حق جسے دنیا حاصل نہیں کرسکتی، کیونکہ وہ اسے نہیں دیکھتی اور نہ اسے جانتی ہے (مگر تم اسے پہچانو گے کیونکہ وہ تم میں ہمیشہ رہے گا)

۱۸۔ میں تمھیں یتیم نہ چھوڑوں گا، میں تمھارے پاس آؤں گا۔ (یوحنا باب ۱۴: ۱۵ تا ۱۸) مگر جب مگر فارقلیط آئے گا جسے میں تمھارے پاس باپ کے پاس سے بھیج دوں گا روح حق جو باپ سے آئے گی وہ میری شہادت دے گی۔ (یوحنا باب ۱۵ آیت ۲۶)

۷۔ تاہم میں تمھیں سچ کہتا ہوں میرا جانا ہی تمھارے لیے بہتر ہے۔ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط تمھارے پاس نہ آئے گا۔ اگر میں جاؤں تو میں اسے تمھارے پاس بھیج دوں گا۔

۸۔ جب وہ آئے گا تو وہ دنیا کو گناہ، نیکی اور عدالت سے ملزم گردانے گا۔

۹۔ گناہ سے اس لیے کہ انھوں نے مجھے نہیں مانا۔

۱۰۔ صداقت سے اس لیے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے اب نہ دیکھو گے۔

۱۱۔ عدالت سے اس لیے کہ دنیا کا سردار آزمایا جائے گا۔

۱۲۔ میری اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو میں تمھیں کہنا چاہتا ہوں، مگر تم میں ابھی ان کی برداشت نہیں۔

۱۳۔ البتہ جب وہ روح حق آئے گی تو وہ تمھیں ساری سچائی کی طرف رہنمائی کرے گی کیونکہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گی مگر جو کچھ وہ سنے گی وہی کہے گی اور وہ تمھیں آئندہ کی خبریں دے گی۔

(یوحنا باب ۱۶، آیات ۷۔۱۳)

لفظ فارقلیط پر بحث

فارقلیط کا صحیح ترجمہ پیراکلیطوس ہے۔ یہ یونانی لفظ ہے جس کے معنی احمد ہیں سیل نے قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ عبرانی لفظ فارقلیط کے معنی احمد ہیں۔ مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ مسلمانوں نے انجیل برنباس میں تحریف کر کے پاراکلیٹ کو پری کلیوطاس بنا دیا ہے جس کے معنی ستودہ یعنی احمد ہیں۔

پس عیسائیوں کے اپنے اقرار کے مطابق فارقلیط کے معنی احمد ہیں جس کے متعلق مسیح علیہ السلام نے اپنے بعد آنے کی بشارت دی تھی۔ فارقلیط والی بشارت کو پڑھ کر کئی نیک دل راہب دائرہ اسلام میں

داخل ہوئے۔

قرآن مجید میں بھی آتا ہے: وَاِذْقَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِىْ مِنْ بَعْدِى اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ[1] اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں۔ میں تصدیق کرتا ہوں توراۃ میں سے اس کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت دیتا ہوں ایک رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہے۔ سو جب وہ ان کے پاس کھلے دلائل لے کر آ گیا تو انھوں نے کہا یہ ایک صریح جادو ہے۔

انجیل یوحنا میں فارقلیط (احمد) سے متعلق جتنی نشانیاں بیان ہوتی ہیں وہ سب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود باوجود سے پوری ہوتی ہے اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بشارت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق ہے۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ اسلام دین موعود ہے جس کے متعلق تمام سابقہ انبیاء علیہم السلام نے پیشگوئیاں کی تھیں تو اس سے منطقی طور پر حسب ذیل باتیں مستنبط ہوتی ہیں جن سے تمام مذاہب عالم میں دین اسلام کو ایک ارفع مقام حاصل ہو جاتا ہے۔

۱۔ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔

۲۔ دین اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔

۳۔ دین اسلام کے بعد کوئی نیا دین نہیں آئے گا۔

اسلام کی عالمگیریت

جیسا کہ پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ابتداء میں سب اقوام عالم ایک دوسرے سے الگ پڑی ہوئی تھیں اور ان کی ذہنی اور روحانی استعدادیں بھی اتنی نہیں تھیں کہ وہ ایک مکمل شریعت برداشت کر سکتیں تو اس وجہ سے یہ ضروری تھا کہ ہر ایک قوم میں الگ الگ نبی آتے اور ان کی استعدادوں اور ضرورتوں کے مطابق الگ الگ شریعت لاتے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ شریعت کو نامکمل چھوڑ رہے ہیں۔ انجیل یوحنا باب ۱۶: ۷، ۸، ۱۲، ۱۳ میں لکھتا ہے۔

''لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ تسلی دہندہ تمھارے پاس نہ آئے گا...... مجھے تم سے اور باتیں بھی کہنی ہیں مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔''

---

[1] الصف ۶۱: ۶۔

یہ ضروری تھا کہ انسانی استعدادیں ارتقائی منازل طے کر کے بلوغت کو پہنچ جائیں اور اس قابل ہو جائیں کہ وہ مکمل شریعت کو برداشت کر سکیں اور وقت آ جائے کہ تمام اقوام عالم آپس میں ملنا شروع کر دیں تو یہ ضروری تھا کہ اس وقت ایک ایسا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئے جو عالمگیر شریعت لائے، جو ہر قوم اور ہر زمانہ کے لیے ہوتا کہ اقوام عالم کی باہمی منافرت اور مغائرت دور ہو کر ایک عالمگیر اخوت قائم ہو جائے۔ اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ ہر نبی اپنی قوم سے یہ عہد لیتا کہ جب وہ موعود نبی عالمگیر شریعت لائے تو اس کو ضرور ماننا اور اس موعود نبی کی مدد کرنا۔ اگر ہر نبی اس موعود نبی کی بشارت نہ دیتا تو اس کی امت یہ عذر کر سکتی تھی کہ وہ اپنے قومی مذہب کو ترک نہیں کر سکتی۔

دنیا میں کوئی ایسی کتاب نہیں اور نہ مذہب جس نے عالمگیر ہونے کا دعویٰ کیا ہو، سوائے اسلام کے قرآن مجید میں آتا ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ[1] اور اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم نے تم کو سارے لوگوں کے لیے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے، لیکن اس بات کو اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

ایک دوسری آیت ہے: قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعَا ن الَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ.[2] اے نبی کہہ دیجئے کہ میں تم سب لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ.[3] ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

کان کل نبی یبعث الی قومہ خاصۃ و بعثتُ الی کل احمر و اسود.[4] ہر ایک نبی اپنی خاص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں تمام سرخ اور سیاہ اقوام کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

یہ آیات اور حدیث اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔

دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے

دین اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی مقدس کتاب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے، ارشادِ الٰہی ہے: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا.[5] آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے۔ تمہارا دین اسلام ٹھہرا کر راضی ہوا ہوں۔

---

1. سبا ۳۴: ۲۸۔ 2. اعراف ۷: ۱۵۸۔ 3. انبیاء ۲۱: ۱۰۷۔
4. مسلم باب المساجد۔ 5. مائدہ ۵: ۳۔

اسلام کے مکمل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ انسان کی زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی راہنمائی کرتا ہے۔قرآن مجید میں آتا ہے:مَافَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ. (الانعام:۶:۳۸)

یعنی نوع انسان کی ضرورت کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس میں بیان نہ ہوئی ہو۔دوسری جگہ آتا ہے:فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۹۸:۳)اس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔

یعنی اس قرآن میں تمام کامل صداقتیں اور علوم اوّل و آخرین جمع ہیں۔

دین اسلام کے بعد کوئی نیا دین اور نبی نہیں آئے گا

دین اسلام کا کامل ہو جانا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ سلسلہ نبوت ترقی اور ارتقاء کی تمام منازل طے کر چکا ہے،اب مزید ترقی کی کوئی گنجائش نہیں۔اس طرح اکمال دین خاتم نبوت ہے نبوت کے ختم ہونے کے بارے میں قرآن مجید میں آتا ہے: مَاكَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ[1] محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خاتم النبیین ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاتم النبیین کی تفسیر ذیل کے ارشادات میں فرمائی ہے:

۱۔ انا خاتم النبیین لا نبی بعدی. میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

۲۔ ان النبوۃ والرسالۃ قد انقطعت فلا نبی بعدی ولا رسول. نبوت اور رسالت کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے اب میرے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ کوئی رسول۔

۳۔ مثلی ومثل الانبیاء کمثل رجل بنی بیتاً فاحسنہ و اجملہ الاموضع لبنۃ فجعل الناس یطوفون حولہ و یتعجبون ھلا و ضعت ھذہ اللبنۃ انا ھذہ اللبنۃ وانا خاتم النبیین. یعنی میری اور دوسرے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے مکان بنایا ہو اور اس کو ہر لحاظ سے خوبصورت کیا ہو،ہاں صرف ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی گئی ہو لوگ اس مکان کے گرد گھومنے لگے اور تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے کہ یہ آخری اینٹ کیوں نہیں لگائی وہ آخری اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔

قرآن مجید کے اوّل مفسر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور وہی مہبط وحی ہیں۔جس آیت کی تفسیر آپ کی زبان مبارک سے نکلی ہے وہ صحیح ہے اور اس کو نہ ماننا دائرہ اسلام سے خارج ہونا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاتم النبیین کی تفسیر لا نبی بعدی بیان کی ہے جن کے معنی ہیں میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔لا نفی جنس کا ہے جس نے نبوت کے اجراء کی ہر لحاظ سے نفی کی ہے۔

---

[1] احزاب ۳۳:۴۰۔

یہ کہنا کہ بغیر شریعت کے نبی آ سکتا ہے۔ یہ نبوت کے نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے کیونکہ نبی میں ایک امتیازی خصوصیت پائی جاتی ہے وہ یہ کہ جبرئیل علیہ السلام کا وحی نبوت لے کر اس پر نازل ہونا۔ وحی نبوت کا نازل ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ شریعت ابھی مکمل نہیں ہوئی کیونکہ وحی نبوت احکام الٰہیہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ اسلام کی موجودگی میں نئے احکام الٰہیہ کے نازل ہونے کی گنجائش ہی نہیں کیونکہ قرآن مجید دین اسلام کو اکمل قرار دیتا ہے۔

پس جو شخص نبوت کے جاری ہونے کا قائل ہے وہ دراصل اسلام کو کامل دین نہیں سمجھتا۔ پس دین اسلام کامل ہو چکا ہے۔ اب زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس کی راہنمائی یہ دین نہ کرتا ہو۔ اس دعویٰ اور اعلان کے ہوتے ہوئے اجرائے نبوت کا قائل ہونا، پھر مدعی نبوت کے ماننے کو جزو ایمان قرار دینا اور ایک ارب مسلمانوں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دینا نہایت ہی افسوس ناک اور نقصان دہ امر ہے۔ اجرائے نبوت کے عقیدہ سے صرف امت اسلامیہ کا اتحاد ہی پارہ پارہ نہیں ہوتا بلکہ اسلام کا ہی تختہ الٹتا ہے۔

وحدت الادیان

اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ربوبیت کے تحت جس طرح ہر قوم کو اس کی جسمانی پرورش کے لیے خوراک بہم پہنچائی اسی طرح اس نے ہر ایک قوم میں اس کی روحانی اور اخلاقی نشو ونما اور ترقی کے لیے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ [1] یعنی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔ پھر فرمایا: وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ [2] ہر قوم کے لیے رسول ہے: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا [3] اور یقیناً ہم نے ہر قوم کے لیے ایک رسول بھیجا۔

تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی روحانی چشمہ سے سیراب ہو کر ایک دین کو لے کر آتے رہے ہیں۔ اس اصولی اور بنیادی دین کی آخری اور تکمیلی شکل اسلام ہے۔ وہ اصولی اور بنیادی دین کیا ہے۔ توحید، عبادت اور معاملات۔ یہ وہ تین امور ہیں۔ جن کی انبیاء علیہم السلام زمانہ کے تقاضے کے مطابق اپنی اپنی قوم میں تبلیغ اشاعت کرتے رہے اور یہی وہ امور ہیں جن پر تمام مذاہب حقہ کا اتفاق ہے۔ جزئیات احکام میں ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب اختلاف ہوسکتا ہے۔ لیکن دین کے اصل اصول میں سرمو اختلاف نہیں۔ اس نظریہ کو قرآن مجید میں اس طرح واضح کیا گیا ہے۔ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ط اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ [4] اس نے تمھارے لیے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس کا نوح علیہ السلام کو حکم دیا تھا اور جو ہم نے تیری طرف وحی کی اور جس کا ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ دین کو قائم رکھو، اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ مشرکوں پر وہ دین گراں ہے جس کی طرف تم ان کو بلاتے ہو۔ اللہ اپنے لیے جسے چاہتا ہے، چن لیتا ہے اور اسے اپنی طرف ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے، اس آیت میں بتایا گیا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین وہی ہے جو نوح علیہ السلام کا تھا ابراہیم علیہ السلام کا تھا موسیٰ علیہ السلام کا تھا عیسیٰ علیہ السلام کا تھا۔ اسی وحدت کو قرآن مجید نے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔ [5]

---

[1] فاطر ۳۵: ۲۴ ـ [2] یونس ۱۰: ۴۷ ـ [3] النحل ۱۶: ۳۶ ـ [4] الشوریٰ ۴۲: ۱۳ ـ [5] آل عمران ۳: ۶۴ ـ

کہہ اے اہل کتاب اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان یکساں ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے اور اگر وہ پھر جائیں تو تم کہو گواہ رہو کہ ہم فرماں بردار ہیں۔

اگر تمام مذاہب عالم کا بنظر عمیق مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کا عقیدہ تمام مذاہب میں امر مشترک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امر مشترک کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ[1] اور تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف ہم (یہی) وحی کرتے تھے کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں سو میری ہی عبادت کرو۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ.[2] اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور جھوٹے معبودوں سے بچو۔

مرور زمانہ سے پچھلی نسلوں نے اپنی تحریفات سے اس دین میں تفرقے پیدا کر دیے اور دین کی صحیح شکل بگاڑ دی۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ اِنَّمَا اَمْرُهُمْ اِلَی اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ.[3] وہ لوگ جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے کر دیا اور (کئی) فرقے ہو گئے۔ تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں ان کا معاملہ اللہ کی طرف ہے پھر وہ ان کو بتائے گا جو وہ کرتے تھے۔

سورۃ المومنون میں وحدت دین کا مضمون ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ وَاِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُکُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاتَّقُوْنِ.[4] اور کہ یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس مجھ سے ڈرو اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسولوں کی جماعت ایک ہی جماعت ہے۔ حدیث میں اس نظریہ کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوْلَی النَّاسِ بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَالْاَنْبِیَاءُ اِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ اُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰی وَدِیْنُهُمْ وَاحِدٌ.[5] حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں سب لوگوں سے عیسیٰ ابن مریم سے دنیا اور آخرت میں قریب ہوں اور تمام انبیاء آپس میں علاتی بھائی ہیں کہ ان کی مائیں جدا جدا ہیں اور دین ایک ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی راہ پر چلنے کی ہدایت فرمائی جس پر پہلے انبیاء

---

[1] الانبیاء ۲۱:۲۵۔ [2] النحل ۱۶:۳۶۔ [3] الانعام ۶:۱۵۹۔
[4] المومنون ۲۳:۵۲۔ [5] صحیح بخاری کتاب الانبیاء۔

علیہم السلام گامزن تھے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ [1] یہ وہ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی۔ سو ان کی ہدایت کی پیروی کر۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ [2] اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے لیے کھول کر بیان کر دے اور تم کو ان کی راہیں دکھا دے جو تم سے پہلے تھے۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس راہ پر قدم مارا جس پر پہلے انبیاء علیہم السلام چلے اور وہی راہ ہے جو بنی نوع انسان کی فلاح کی ضامن ہے۔ قرآن مجید میں وہی تعلیم ہے۔ جس کی تبلیغ مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء علیہم السلام نے دی۔ وہی تعلیم اعجازی رنگ میں قرآن میں بیان کر دی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ. [3] تجھے کچھ نہیں کہا جاتا مگر وہی جو تجھ سے پہلے رسولوں کو کہا گیا۔

وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ. [4] اور وہ پہلے پیغمبروں کے صحیفوں میں موجود ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى. [5] یقیناً یہ پہلے صحیفوں میں ہے ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہی تعلیم دی گئی جو پہلے پیغمبروں کو دی گئی۔ ان معنوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی نئی دعوت لے کر اس دنیا میں نہیں آئے بلکہ پرانی تعلیم اور دعوت کا اعادہ اور تکرار ہے۔ جو دنیا سے مٹ چکی تھی یا مختلف مذاہب کے پیروکاروں نے تحریف سے اس دعوت کی حقیقت کو مسخ کر دیا تھا۔ اسلام نے اس مٹی ہوئی تعلیم کو تفصیل اور تکمیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اسی کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا. [6] آج میں نے تمہارا دین تمھارے لیے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور تمہارا دین اسلام ہونے پر راضی ہوا۔

---

1. الانعام ۶:۹۰۔ 2. النساء ۴:۲۶۔ 3. حٰم السجدہ ۴۱:۴۳۔
4. الشعراء ۲۶:۱۹۶۔ 5. الاعلیٰ ۸۷:۱۸۔ 6. مائدہ ۵:۳۔

باب ۲

ہندی مذاہب

ہندو مت
جین مت
بُدھ مت

ہندومت

ہندو قوم کی ابتدائی تاریخ

ہندو قوم کی تاریخ کہیں محفوظ نہیں ہے۔ مورخین کی یہ تحقیق ہے کہ ۱۲۰۰ سے پہلے کی ہندوستان کی تاریخ کے متعلق کوئی قابل ذکر کتاب جس کو تاریخی کتاب کہا جا سکے یا کوئی ایسی تصنیف جس سے اس ملک کے تاریخی حالات معلوم ہو سکیں اس ملک کے باشندوں یعنی ہندوؤں نے نہیں لکھی۔[1]

الفنسٹن سابق گورنر صوبہ بمبئی نے اپنی کتاب تاریخ ہند میں لکھا ہے۔

"جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی کیسی ہی جاہل اور اکھڑ قوم کیوں نہ ہو، اکثر اپنے آبا و اجداد کے حالات کی کوئی نہ کوئی کتاب رکھتی ہے تو اس بات پر کمال تعجب ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے پاس باوجودیکہ ان کی قوم نہایت عمدہ شائستگی اور تربیت کے درجے پر پہنچ گئی تھی کوئی کتاب تاریخ سے ملتی جلتی بھی نہیں ہے۔ ہندوؤں کے حالات کی تحریروں میں سے جو کچھ موجود ہے وہ جھوٹی کہانیوں اور مبالغہ آمیز جھوٹے تاریخی واقعات سے اس طرح خلط ملط ہے کہ ان میں سے کوئی سچی مسلسل تاریخ نکلنے کی توقع نہیں ہو سکتی اور نہ کسی عام واقعے کی تاریخ سکندر کے یورش کرنے سے پہلے کی قائم ہو سکتی ہے اور نہ کوئی مسلسل بیان ہندوؤں کے حالات کا ہندوستان پر مسلمانوں کے تسلط کرنے تک لکھا جا سکتا ہے۔"

مشہور فرانسیسی عالم ڈاکٹر لیبان لکھتا ہے:

ان ہزارہا جلدوں میں جو ہندوؤں نے اپنے تین ہزار سال کے تمدن میں تصنیف کی ہیں ایک تاریخی واقعہ بھی صحت کے ساتھ درج نہیں ہے۔ اس زمانہ میں کسی واقعہ کو پیش کرنے کے لیے ہمیں بالکل بیرونی سہاروں سے کام لینا پڑتا ہے۔ ان کی تاریخی کتابوں میں یہ عجیب خاصیت (یعنی) ہر چیز کو غلط اور غیر فطری صورت میں دیکھنے کی نہایت بیّن طور پر پائی جاتی ہے اور انسان کو اس خیال پر مجبور کرتی ہے کہ ان کا دماغ ہی ٹیڑھا ہے...... قدیم ہندوؤں کی کوئی تاریخ ہی نہیں ہے اور نہ عمارات اور یادگاروں سے اس کی تلافی ہوتی ہے...... ہندوستان کا تاریخی زمانہ فی الواقع مسلمانوں کی فوج کشی کے بعد سے شروع ہوا اور ہندوستان کے پہلے مورخ مسلمان ہیں۔[2]

---

[1] مقدمہ تاریخ ہند قدیم ص ۱۰۵۔ [2] تمدن ہند ص ۱۴۴...... ۱۴۷۔

بھائی پرمانند صاحب لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں عام طور پر جو تاریخی کتابیں رائج ہیں ان کے تین حصے ہیں۔ زمانہ قدیم جو کہ بالکل نامکمل ہے بدقسمتی سے ہمارے بزرگوں کو اپنے حالات درستی سے قلمبند کرنے کا شوق نہ تھا اور جو کچھ حالات لکھے ہوئے ملتے ہیں وہ شاعرانہ مبالغہ سے بھرے ہوئے ہیں، جن کی امداد سے صحیح واقعات پر پہنچنا محال ہے۔ غالباً سوسائٹی کے اندر ایسی تبدیلیاں ہوئی ہی نہ ہوں گی جن کو قلمبند کرنے کا انھیں خیال آتا۔[1]

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب "The discovery of India" میں لکھتے ہیں۔

''اہل چین، اہل یونان اور عربوں کے برعکس قدیم ہندوستان کے لوگ مورخ نہیں تھے۔ یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہے اور اسی نے یہ دشواری پیدا کر دی ہے کہ ہم گزشتہ عہد کے واقعات کا زمانہ یا تاریخ متعین کر سکیں یہ واقعات کچھ اس طرح باہم گتھم گتھا ہو رہے ہیں کہ ان سے عجیب خلفشار پیدا ہو جاتا ہے...... ہمارے ہاں صرف ایک کتاب یعنی (کلھاں کی راج ترنگی) ایسی ہے جسے ہم تاریخی کتاب کہہ سکتے ہیں۔ یہ کتاب کشمیر کی تاریخ ہے اور بارہویں صدی عیسوی میں لکھی گئی تھی۔ باقی واقعات کے لیے ہمیں تصورات کی دنیا میں جانا پڑتا ہے...... یا پھر بیرونی مورخین مثل اہل یونان، اہل چین اور عربوں کی شہادت پر...... مثال کے طور پر بکرمی سمت کو لیجیے، یہ ۵۷ ق۔م سے شروع ہوتا ہے لیکن اس زمانہ کے اِدھر اُدھر ہمیں تاریخ میں کسی بکرماجیت کا اتا پتا نہیں ملتا۔ ایک بکرماجیت چوتھی صدی عیسوی میں گزرا ہے، لیکن یہ چوتھی صدی عیسوی کا بکرماجیت اس سمت کا موجد کیسے ہو سکتا ہے جو ۵۷ ق۔م سے شروع ہوتا ہے۔ اس بکرماجیت کو اس سمت سے متعلق ثابت کرنے کے لیے ہمارے پڑھے لکھے طبقہ نے جس طرح تاریخ سے کھیل کھیلا ہے وہ نہایت تعجب انگیز ہے۔ وہ اس بات پر بھی بڑا زور دیتے ہیں کہ یہی وکرم ہے جس نے باہر سے آنے والوں کے خلاف جنگ آزادی کو برپا کیا اور اس بات کے لیے اپنی پوری کوشش صرف کر دی کہ ہندوستان اکھنڈ رہے اور ایک ہی قومی حکومت کے ماتحت ہو، حالانکہ وکرم کی سلطنت شمالی اور وسطی ہندوستان سے آگے نہیں تھی...... یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی (یعنی ہندو) اپنی قدیم روایات ہی کو تاریخ تسلیم کر لیتے ہیں اور اس پر کسی قسم کی ناقدانہ نگاہ نہیں ڈالتے۔ انھیں اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ طریق فکر اور نہایت آسانی سے نتائج تک پہنچ جانے کے مسلک کو بالآخر چھوڑنا پڑے گا۔''[2]

آریہ کون تھے

آریا آری سے مشتق ہے آری کے معنی ہیں اجنبی نووارد، غیر ملکی بیگانہ، آریا، آری سے بنا ہے یعنی اجنبیوں یا نوواردوں سے متعلق، نوواردوں کا مددگار، میزبان۔[3]

---

[1] رسالہ زمانہ کانپور ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۴ء مضمون تاریخ ہند کا مطالعہ صفحہ ۷۷...... ۷۹۔ [2] ص ۷۷۔۷۹

[3] پاکستان کی قومیتیں یوی گنکوفسکی دارالاشاعت ترقی ماسکو ص ۵۴۔

گویا آریا اپنے تئیں نو واردوں کا مددگار سمجھتے تھے اور مقامی لوگ انھیں نو وارد سمجھتے تھے گویا آریا وہ مختلف قبائل کا نام ہے جو مسلسل مختلف زمانوں میں برصغیر میں داخل ہوتے رہے۔

آریوں کا وطن

آریوں کے وطن کے بارے میں شدید اختلاف ہے بال گنگا دھر تلک منطقہ باردہ ظاہر کرتے ہیں۔ پروفیسر میکس ملر اوسط ایشیا اور مسٹر پینغی روس کا مشرقی حصہ۔ بعض مورخ کہتے ہیں کہ وہ کہیں باہر سے نہیں آئے تھے بلکہ تبت اور کشمیر میں آباد تھے یہاں سے سارے ہندوستان میں پھیل گئے۔

نئی تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہند آریائی قبائل کا اصل وطن خوارزم تھا۔ یہ لوگ خوارزم سے نکل کر براستہ ایران برصغیر میں داخل ہوئے۔ خوارزم وسط ایشیا کا وہ علاقہ ہے جسے اب ازبکستان کہا جاتا ہے اس ریاست کا صدر مقام تاشقند ہے۔

آریوں کی برصغیر میں آمد کا زمانہ

آریوں کا برصغیر میں آمد کا زمانہ بھی متعین نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لوگ مختلف اوقات میں مختلف گروہوں میں برصغیر میں داخل ہوئے جدید تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ ۲۰۰۰ ق م سے لے کر ۱۰۰۰ تک مسلسل ترک وطن کر کے کچھ عرصہ باختر اور شمالی ایران میں رہنے کے بعد ۲۰۰۰ ق م میں کوہ ہندوکش کے دروں سے ہوتے ہوئے برصغیر میں داخل ہوئے۔

ترک وطن کی وجہ

تمام مورخین کا یہی نظریہ ہے کہ جب آریوں کی آبادی بڑھی۔ معاش زندگی تنگ ہوا۔ تو مجبوراً اپنے وطن کو چھوڑ کر مختلف سمتوں میں چلے گئے کچھ لوگ ایران کے رستے برصغیر میں داخل ہوئے کچھ اوپر روسی علاقوں میں پھیل گئے۔ کچھ وادی ڈنیوب اور یورپ کی طرف چلے گئے۔ برصغیر میں داخل ہو کر یہاں کے دراوڑ باشندوں کو جنوب اور مشرق کی طرف دھکیل دیا اور ان کی زمین پر قابض ہو گئے اور شمالی ہندوستان ''آریا ورت'' کے نام سے مشہور ہو گیا۔

برصغیر میں آمد کا بڑا ثبوت ابھی تک رگ وید ہی ہے۔ آثار قدیم سے بھی تمر گرھا، گندھارا، ہڑپہ، منجھڈارو) کی کھدائیوں سے دست یاب ہونے والے تاریخی شواہد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مختلف گروہوں کی شکل میں برصغیر میں داخل ہوئے پہلا مسکن پنجاب ہوتا تھا پھر سندھ۔ یہاں سے برصغیر کے دوسرے علاقوں میں پھیل جاتے تھے۔

آریا قوم کا دھرم

آریا قوم کا دھرم کیا ہے آریا کہتے ہیں کہ ہندو بمعنی غلام یہ سنسکرت کا لفظ نہیں بلکہ فارسی زبان کا

لفظ ہے جس کے معنی چور غلام وغیرہ ہیں۔ یہ نام ہمارے مخالفین اور دشمنوں نے رکھا ہے اس وجہ سے سوامی دیانند جی بانی آریا سماج اور پنڈت لیکھرام نے اپنے اس نام کے خلاف بڑے غصہ کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ ہمیں ہندو نام ترک کر کے آریا کہلانا چاہیے[1]

آریا کا لفظ رگ وید اور شاستر میں موجود ہے لیکن یہ لفظ دھرم کے معنی میں استعمال نہیں ہوا بلکہ ایک قوم کا نام ہے۔

آریا قوم کا ابتدائی دھرم

قرآن مجید کے اصول کے مطابق ہر قوم میں نبی اور ہادی آتے رہے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ[2] یعنی ہر قوم کی طرف رسول آتے رہے ہیں دوسری جگہ آتا ہے: اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ[3] ہر امت میں اللہ کے ڈرانے والے آئے ہیں۔ ایک اور مقام پر آتا ہے۔ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ہر قوم کی طرف ہادی آئے ہیں۔

اس اصول کو مدنظر رکھ کر کہا جائے گا دنیا کے تمام مذاہب کی ابتدا وحی نبوت سے ہوئی ہے اور توحید ان کا بنیادی عقیدہ ہے۔ لہٰذا آریا دھرم کی عمارت بھی توحید پر استوار ہوئی۔ لیکن بعد میں عوام کی جہالت کی وجہ سے توحید کی جگہ شرک نے لے لی اور بعض غلط عقائد اور رسوم راہ پا گئے اور بانیوں کی مقدس تعلیم سے دور چلے گئے۔

ویدوں کے ابتدائی زمانہ میں آریا قوم توحید پر قائم تھی۔ ایک ہی خدا کی عبادت کرتی تھی۔ البیرونی نے اپنی مشہور کتاب میں لکھا ہے کہ "خدا کے متعلق ہندوؤں کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ واحد ہے ازلی ہے جس کی ابتداء ہے نہ انتہا اپنے فعل میں مختار ہے قادر ہے حکیم ہے زندہ ہے زندہ کرنے والا ہے جس کا کوئی مقابل اور مماثل نہیں نہ وہ کسی چیز سے مشابہ ہے اور نہ کوئی چیز اس سے مشابہت رکھتی ہے۔[4]

"ویدوں نے بتوں کا رواج اور پرستش کی چیزوں کے ظاہری نشان اور علامتیں قائم کرنے کا رجحان ثابت نہیں ہوتا۔"[5]

وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ آریا قوم میں بھی شرک کا مرض سرایت کر گیا۔ برصغیر میں جو پہلا گروہ داخل ہوا۔ ان کا دیوتا اندر تھا جو سب دیوتاؤں کا سردار تھا۔ یہ دیوتا ناقابل تسخیر تھا اس کا ہتھیار "وجر" تھا۔ وجر کا لفظی معنی گرز ہے۔ لیکن بعد میں یہ لفظ صاعقہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اندر سوم رس پی کر گھوڑے پر سوار ہو کر شہروں کے شہر منہدم کرتا تھا۔ ویدوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اندر کے علاوہ آریاؤں کے بعد بھی بے شمار دیوتا تھے۔ جن کا ذکر ویدوں کے بیان میں آئے گا۔

---

[1] کلیات آریا مسافر مصنفہ پنڈت لیکھرام۔ [2] یونس ۱۰:۴۷۔ [3] فاطر ۳۵:۲۴۔

[4] ہندو دھرم ہزار برس پہلے صفحہ ۱۴ ناشر نگارشات۔ [5] الفنسٹن کی تاریخ باب توحید۔

جب یہ لوگ برصغیر میں داخل ہوئے۔ تو اس وقت کی مقامی اقوام بھی شرک کی وادی میں بھٹک رہی تھیں۔ سحر وفسوں کا عام چرچا تھا۔ البتہ بحرروم سے آنے والی قوم دراوڑ کے متعلق ہڑپا اور منجھڈارو کے کھدائی سے جو آثار ملے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ درختوں، جانوروں مثلاً بیل، ہاتھی، ہرن، چیتا وغیرہ کی پرستش کرتے تھے۔ وشنو اور شیو دراوڑین دیوتا تھے اور ان کے مجسموں کی پوجا کرتے۔

قدیم اقوام کا آریا پر اثر

جب آریا قوم برصغیر میں داخل ہوئی تو اس کو بت پرست قوم کی ثقافت سے واسطہ پڑا تو آہستہ آہستہ ان لوگوں میں بت پرستی اور مظاہر پرستی کا عام رواج ہوگیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ شیو اور، وشنو، دراوڑین دیوتا تھے۔ آہستہ آہستہ یہ دونوں دیوتا ہندو دھرم میں خاصی اہمیت حاصل کر گئے اور ان دونوں دیوتاؤں کے ساتھ برہما، دیوتا بھی ملا لیا۔ اس طرح ہندوؤں میں تریموری (تثلیث) کا تصور رائج ہوگیا۔

ہندو دھرم کے منابع

ہندو دھرم کے چھ منابع ہیں۔ ۱۔ شروتی۔ ۲۔ سمرتی۔ ۳۔ اتہاس۔ ۴۔ پران۔ ۵۔ اگم۔ ۶۔ درشن۔

۱۔ شرتی کا لفظی مطلب ہے ”جسے سنا جائے۔“ رشی ابدی صداقتوں کو سنتے اور تجربہ کرتے اور لوگوں کی فلاح کے لیے اپنے تجربات احاطہ تحریر میں لے آتے۔ اس سرچشمہ میں چاروں وید شامل ہیں۔

۲۔ سمرتی کا مطلب ہے۔ ”جسے یاد کیا جائے۔ شروتی کے بعد اس کی زیادہ اہمیت ہے۔ سمرتیوں کی بنیاد ویدوں کی تعلیمات پر ہے اس میں اپنشد شامل ہیں۔

۳۔ اتہاس یعنی تواریخ اس میں معروف رزمیہ نظمیں رامائن اور مہابھارت شامل ہیں۔

۴۔ پران۔ ویدوں کی تعلیم کو مقبول بنانے کے لیے لکھا گیا۔ کل اٹھارہ پران میں جن میں بھگوت اور وشنو پران مقبول ترین ہیں۔

۵۔ آگم کی عوامی صحائف کی ایک قسم ہے۔ ان میں دینیاتی مقالے اور پوجا کی عملی ہدایات شامل ہیں۔ شیومت، شکتی مت اور ویشنومت کے تین مرکزی فرقوں کی بنیاد اگموں کے عقائد پر ہے۔

۶۔ درشن، درشن کے معنی روشنی یا دیکھنا ہے درشن چھ ہیں۔

۱۔ نیایہ۔ ۲۔ ویشفک۔ ۳۔ سانکھیہ۔ ۴۔ یوگ۔ ۵۔ تیماسا۔ ۶۔ وید

گو وید۔ اپنشد، بھگوت گیتا اور چھ درشن ہی ہندو دھرم کے بنیادی ماخذ ہیں۔

ہندومت کی کتب

ویدوں کا بیان

ہندو اپنی مذہبی کتب کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ شرتی یعنی کانوں سے سنا، جسے مکاشفہ کہنا چاہیے۔

۲۔ سمرتی یعنی باپ دادوں کی طرف سے پہنچا، جسے حدیث یا روایت کہنا چاہیے۔

حصہ اوّل تو ویدوں پر مشتمل ہے اور دوسرے حصے میں ساری کتب شامل ہیں جو ویدوں کے علاوہ ہیں۔

وید

لفظ وید[1] کا مصدر ود ہے جس کے معنی جاننا، سوچنا، موجود ہونا، غور کرنا اور حاصل کرنا ہیں۔ لفظ وید معروف کتب کے لیے ان کتابوں میں استعمال نہیں کیا گیا۔ یہ وہ لٹریچر ہے جو تقریباً دو ہزار سال کے عرصہ میں ہندیوں نے مختلف علوم و رسوم سے متعلق جمع کیا۔ اس کا نام وید رکھ دیا۔

ڈاکٹر سریندر ناتھ داس گپتا اپنی مشہور کتاب "A History of Indian Philosophy vol.1" میں لکھتے ہیں۔

''ایک مبتدی جسے پہلے پہل سنسکرت لٹریچر سے متعارف کرایا جائے، یہ دیکھ کر پریشانی سی محسوس کرے گا کہ متضاد مطالب اور موضوعات پر مختلف مستند کتابیں ہیں، لیکن ان سب کا نام وید یا شرتی (سنی سنائی باتیں) ہے۔ یہ اس لیے کہ وید اپنے وسیع مفہوم کے اعتبار سے کسی خاص کتاب کا نام نہیں، بلکہ یہ نام ہے قریب دو ہزار سال کے طویل عرصہ پر پھیلے ہوئے لٹریچر کا چونکہ یہ لٹریچر مظہر ہے اس علمی تگ و تاز کے ماحصل کا جو ہندوستان کے رہنے والوں نے مختلف اطراف و جوانب میں اس قدر طویل عرصہ میں جمع کیا، اس لیے اسے لازماً متضاد عناصر کا مجموعہ ہونا چاہیے۔'' (صفحہ ۱۱۔۱۲)

لفظ وید صرف ان معروف کتب کا نام ہی نہیں بلکہ ان کے علاوہ دوسری کئی ایک کتب کو بھی یہ نام دیا گیا ہے جیسے آیور وید (طب) سرپ وید (سانپ کا وید) پشاچ وید (چڑیلوں کا وید) اسر وید (شیطانوں کا وید) دھر وید (تیر کمان کا وید) اتہاس وید (تاریخ) پران وید (قصے کہانیوں کا وید)

وید کا موضوع

نرکت جو وید کی مستند ترین لغت ہے اس میں لکھا ہے کہ جس مقصد کو جس دیوتا کے ذریعہ رشی نے پورا ہوتا ہوا جان کر اس کی تعریف کی ہے۔ وہی دیوتا اس منتر کا ہے۔ اسی طرح گوناگوں مقاصد سے رشیوں نے منتر لکھے ہیں۔ (نرکت ادھیائے کھنڈا) ۳ وید کی انوکرمنیکا میں ہے۔

---

[1] وید کو سمہتا بھی کہا جاتا ہے۔ سمہتا کے معنی ہیں مجموعہ مناجات۔

"ارتھے پشوہ رشیو دیوتاش ابھی دھاون۔"

رشی مقاصد کو لے کر دیوتاؤں کی طرف بھاگے۔ گویا ویدوں کا موضوع اپنے مقاصد اور ضروریات کے لیے دیوتاؤں کی تعریف اور التجائیں کرنا ہے۔

خود وید میں لفظ وید دنیوی مال و منال کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ گویا وید اس کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

ویدوں کی تصنیف کی غرض و غایت

ہر مصنف اپنی کتاب کے آغاز میں اپنی تصنیف کی غرض و غایت بیان کرتا ہے۔ چاروں ویدوں کا آغاز بالترتیب اگنی (آگ) وایو (ہوا) سوریہ (سورج) اور اپہ (پانی) سے ہوتا ہے۔ رگ وید اگنی سے شروع ہوتا ہے، اگنی کی پرستش اسی غرض کے لیے سکھاتا ہے۔ اس کے پہلے سوکت میں اسی کی حمد و ثنا کے بعد منتر ۳ میں لکھا ہے۔ "اگنی کی مہربانی سے پرستش کرنے والے کو دولت ملتی ہے جو دن بدن ترقی کرتی جاتی ہے۔" اگنی کے بعد دوسرے درجہ پر اندر دیوتا کی تعریف کی گئی ہے۔ اندر آریوں کے لیے ان کے مخالفوں سے دولت غصب کر کے لاتا ہے۔ سوریہ ان کی ہری بھری کھیتیوں کو پکاتا ہے اور اپہ (پانی) کھیتوں اور لوگوں کی پیاس کو بجھاتا ہے۔ گویا ویدوں کی تصنیف کی غرض و غایت آگ، ہوا، سورج اور پانی کی پرستش کرنا، پھر ان کے ذریعہ سے دنیوی فوائد حاصل کرنا ہے۔

وید بلحاظ تقسیم چار ہیں۔

ا۔ رگ وید

اس کے دس ہزار منتر ہیں جو ۱۰۱۷ یا ۱۰۲۸ سوکتوں (گیت) اور دس منڈلوں (ابواب) میں تقسیم ہے۔ سارا وید نظم میں ہے۔ اس میں خداؤں کی تعریف اور بزرگی کے گیت ہیں۔ اور دیوی دیوتاؤں کو مخاطب کر کے ان سے دعائیں کی گئی ہیں۔ رگ وید سب ویدوں سے پرانا وید ہے۔ اگرچہ "پرانوں کی رو سے سب سے پہلے یجر وید تھا اس کو توڑ پھوڑ کر چار وید بنائے گئے ہیں۔"[1]

اس پر سائن اچاریہ نے سنسکرت میں بھاشیہ لکھا ولسن اور میکس ملر نے انگریزی ترجمہ کیا ہے۔

رگ وید کا بیشتر حصہ گندھارا پنجاب اور مشرقی پنجاب میں لکھا گیا۔ کچھ حصہ سندھ اور بلوچستان میں لکھا گیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس کا زیادہ تر حصہ اراکوسیا اور بلوچستان کے ایران کے ساتھ متصل سرحدی علاقے میں لکھا گیا۔[2]

۲۔ یجر وید

یہ سارا رگ وید سے ماخوذ ہے۔ قربانیوں کے موقع پر گایا جاتا ہے۔ یگیہ میں استعمال ہونے والی

---

[1] ہندو ازم ص ۹۳ مصنفہ پروفیسر گووند داس۔ [2] History of the Punjab vol I joshi p 142.

اشیاء کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ واجنئی سمہتا (سفید یجر وید) اور تیتریہ سمہتا (کالا یجر وید) تیتریہ سمہتا ۶۰۰ ق۔م یا ان سے کچھ پہلے لکھا گیا۔

۳۔ سام وید

اس وید میں محض راگ اور گیت ہیں۔ رگ وید سے نصف ہے تمام تر منتر رگ وید سے ماخوذ ہیں۔ صرف ۷۵ بھجن اس کے اپنے ہیں۔ تمام وید خالصتاً بھجنوں کی کتاب ہے۔ اس سام وید کو الگ مدون کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس کے بھجن مخصوص لوگوں میں گائے جائیں۔ سوم یگیہ پر گایا جاتا ہے۔ تاریخی لحاظ سے اس وید کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ سائیس آچاریہ نے بھاشیہ لکھا ہے۔

ان تین ویدوں کو ''تری ودیا'' علوم ثلاثہ کا نام دیا جاتا ہے۔

۴۔ اتھر وید

اس میں کل چھ ہزار منتر ہیں جو بیس ادھیاؤں میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ تقریباً ایک ہزار دو سو منتر رگ وید سے ماخوذ ہیں۔ نصف کے قریب نثر میں ہے۔ اس کا زیادہ حصہ جادو سے متعلق ہے۔ یہ وید قدیم آریوں کے تمدن کا آئینہ دار ہے۔ اس میں ہمہ اوست کی تعلیم ہے۔

ہر وید کو مندرجہ ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ سنگھیتہ بھاگ یا منتر بھاگ: جس میں دیوی دیوتاؤں کو مخاطب کر کے ان سے دعائیں مانگی گئی ہیں۔

۲۔ براہمن بھاگ: اس حصہ میں منتروں کی تشریح اور جائے استعمال بیان کیا گیا ہے۔ ہر وید کے ایک یا دو برہمن ہیں۔ غالباً برہمنوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے آٹھویں اور پانچ صدی ق۔م کے درمیان تصنیف کیے گئے۔

۳۔ ارنیک: وہ حصہ جو جنگلوں میں تصنیف کیا گیا یا جنگلوں میں جا کر پڑھا جاتا ہے۔

یاسیک منی مصنف نرکت: ویدوں کی ڈکشنری کے نزدیک ویدوں کے صرف دو ہی حصے ہیں یعنی سنگھیتہ بھاگ اور منتر بھاگ۔ ارنیک صرف برہمنوں کا حصہ ہیں۔

اصل وید گم ہو گیا

مہابھارت شانتی پرو شلوک ۱۳۴۷۵ میں لکھا ہے کہ دو اسر (جن) جنھوں نے برہما جی کو دنیا پیدا کرنے میں مدد دی تھی وید کو چرا کر لے گئے۔ اس پرو کے شلوک ۶:۱۳۵ میں بھی یہی لکھا ہوا ہے۔ وشنو پران ۱۲:۲:۳ میں ہے کہ چار یگوں کے آخر پر ویدوں کا گم ہو جانا کل یگ کا حادثہ ہوا تو سات رشی آسمان سے ظاہر ہوئے اور انھوں نے پھر ان کو جاری کیا۔

مہابھارت شانتی پرو میں ویدوں کے گم ہو جانے پر برہما کے واویلا کا ذکر کیا گیا ہے۔ ''وید میری

قوت اعلیٰ ہے...... ویدوں کے بغیر میں کیا کروں گا۔ وید دنیا میں اعلیٰ وجود ہے۔'' نہ صرف مہا بھارت اور پرانوں میں اس کا ذکر ہے بلکہ رگ وید ادی بھاشیہ بھومکا (دیانند) کی تمہید میں لکھا ہوا ہے کہ جو زمانہ ویدوں کی تعلیم کا مستشرقین بیان کرتے ہیں۔ وہ دراصل ویدوں کا رواج نہ رہنے کا زمانہ ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وید کا تواتر تاریخی مفقود ہے۔

مہابھارت شلیہ پروا (Shalya parva) میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ ملک میں بارہ برس تک بارش نہ ہونے کی وجہ سے سخت قحط پڑا۔ سب رشی معاش کی تلاش میں دیش چھوڑ کر کہیں دوسری جگہ چلے گئے اور ویدان کے ذہنوں سے بالکل محو ہو گیا۔ لیکن دریائے سرسوتی کا بیٹا رشی سرسوت اپنے دیش میں مقیم رہا۔ ایک مچھلی پر گزارہ کرتا رہا۔ جو اس کی ماں (دریائے سرسوتی) اسے روزانہ کھانے کے لیے دیتی تھی۔ سرسوت نے ویدوں کو دوبارہ قائم کیا اور رشیوں کے واپس آنے پر ان کو ویدوں کی تعلیم دی۔[1] بدھ چرتر میں بھی لکھا ہے کہ وید مکمل طور پر بھول گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندو ابتداء میں وید لکھنا جائز نہیں سمجھتے تھے اس لیے بارہ دفعہ وید ضائع ہو چکے ہیں۔ موجودہ وید براشر کے بیٹے بیاس ودیا نے از سر نو اس کی تجدید کی۔

وید کتنے ہیں

جب یہ معلوم ہو گیا کہ ویدوں پر ایک ایسا زمانہ آیا جب وہ اس دنیا سے اُٹھ گئے تھے تو لازمی طور پر ان کی تعداد میں بھی اختلاف ہوگا اور تحریف اور تبدیلی بھی ہوئی ہوگی۔

وشنو پران میں لکھا ہے کہ شروع میں وید صرف ایک ہی تھا جس میں ایک لاکھ منتر تھے۔ اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک عرصہ گزرنے کے بعد یہ حصے آپس میں مل جل گئے اور کئی حصے بھول بھی گئے۔

دواپر یگ کے شروع میں کرشن دوئی پائن Krishan dawai pain یا ویاس نے اس ایک وید کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔[2] اور ویدوں کی تعلیم کو رواج دینے کے لیے اس نے اپنے چار شاگردوں یعنی پیلادہ، وئی شمپائن، جیمنی اور سومنت کو علی الترتیب رگ وید، یجر وید، سام وید اور اتھر وید سکھائے۔ پھر ان تلامذہ نے اپنے شاگردوں کو سکھائے۔

یہ امر تاریخی شواہد سے واضح ہے کہ ویاس کئی ہوئے ہیں اور کئی بار ویدوں کی ترتیب و تدوین ہوئی ہے۔ پہلے ایک وید کو چار حصوں (رگ وید، یجر وید، سام وید اور اتھر وید) میں تقسیم کیا گیا۔ پھر ہر وید کو سنگھیتہ، براہمن اور ارینک میں بانٹا گیا۔ پھر یجر وید کے دو حصے کیے گئے یعنی شُکل یجر وید (Shukal yajer veda) اور کرشن یجر وید (Krishan yajur veda)۔

---

[1] ہندو ازم صفحہ ۸۳۔

[2] عام مذہبی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ منتروں کی ایک کتاب ''اوگم'' پہلے سے موجود تھی جس کو بعد میں رشی ویاس نے ترتیب دے کر چار حصوں رگ، یجر، سام، اتھر میں اس کی درجہ بندی کی (ہندو ازم ص ۸۲)

اس طرح چار سنگھیتاؤں کی بجائے پانچ سنگھیتا ہو گئیں۔ ا۔ رگ وید سنگھیتہ۔ ۲۔ تیتریہ سنگھیتہ (کرشن یجروید) ۳۔ واجنی سنگھیتہ (شکل یجروید) ۴۔ سام وید سنگھیتہ۔ ۵۔ اتھرو وید سنگھیتہ۔

شکل یجروید پھر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ا۔ کنو (Kanva) اور (Mad nyandini)

اتھرو وید کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۲۔ پپلاد (Pippalada) ۳۔ شونک (Shaunak) ہر ایک وید کے ساتھ ایک یا ایک سے زیادہ براہمن الحاق کر دیے گئے ہیں جیسے رگوید کے چار، کرشن یجروید کے چار، شکل کا ایک، سام وید کے آٹھ اور اتھرو وید کا ایک براہمن ہے۔

اپنشدوں کو بھی وید کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔ کم وبیش ۱۰۸ اپنشد بتائے جاتے ہیں۔ مگر سناتن دھرم کے عالم پنڈت جواہر پرشاد نے ۱۸ تسلیم کیے ہیں اور شنکراچاریہ نے سولہ۔

بانی آریا دیانند صاحب سرسوتی، ہر وید کے ساتھ صرف سنگھیتہ (منتر) بھاگ کو ہی تسلیم کرتے ہیں، براہمن اپنشد وید وغیرہ کو وید کا حصہ قرار نہیں دیتے۔ مگر سناتن دھرم والے براہمن اور اپنشدوں کو وید کا لازمی حصہ قرار دیتے ہیں۔

ایک ایسا وقت بھی تھا جب وید صرف تین شمار ہوتے تھے چوتھے وید کو بعد کی تصنیف خیال کیا جاتا تھا۔

ایک یہ بھی خیال ہے کہ وید تعداد کے لحاظ سے ۱۱۳۱ ہیں۔ (مہابھاشیہ پاتنجلی)

پس ویدوں کی تعداد کے بارہ میں شدید اختلاف ہے۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ وید ایک ہی تھا دوسرا نظریہ یہ ہے کہ وید تین ہیں۔[1] تیسرا نظریہ یہ ہے کہ وید چار ہیں۔ ایک خیال یہ ہے وید پانچ ہیں۔[2] ایک خیال یہ ہے کہ ویدوں کی تعداد ۱۱۳۱ ہے۔

مہابھاشیہ جو دیانند جی کے نزدیک بھی ایک مستند کتاب ہے۔ اس میں اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے۔

۱۰۱ شاخیں یجروید کی ہیں، ہزار طرح کا سام وید، ۲۱ طرح کا رگ وید اور ۹ طرح کا اتھروید ہے۔ ان کی مجموعی تعداد ۱۱۳۱ ہوتی ہے۔

سوامی دیانند جی نے اس حوالہ کو صحیح مانا ہے مگر اس میں سے چار کو چار وید اور باقی کو وید کی شرح بتاتے ہیں۔ یہ توجیہہ غلط ہے کیونکہ وید کی ۱۱۲۷ شرحیں ہونے کا کوئی ثبوت کسی مستند کتاب میں نہیں پایا جاتا بلکہ

---

[1] تین ویدوں کا نظریہ لفظ ترئی (Trayi) سے قائم ہوا ہے یعنی ترئی ودیا سے مراد تین وید ہیں۔ (رگ وید، یجر وید، سام وید) اس کا ثبوت ویدک اور غیر ویدک لٹریچر سے ملتا ہے۔ اس نظریہ کے قائلین کا یہ کہنا ہے کہ ابتداء میں تین وید تھے، اتھروید بہت بعد میں شامل کیا گیا ہے۔ شت پتھ برہمن میں وید تین ہی بیان کیے گئے ہیں۔ گیتا میں تین ویدوں کا ذکر ہے۔

[2] یداپی (اگرچہ وید چار ہیں پر کسی کسی نے پانچ بھی مانے ہیں) رگوید، کرشن یجروید، شکل یجروید، سام وید، اتھرووید، بھارت درشن کا دھارمک اتہاس ص ۳۵)

یہ چاروں وید جن کو آریہ اصل بتاتے ہیں۔ کئی شاخوں میں شامل ہیں۔

مہابھاشیہ کے مذکورہ حوالہ کے علاوہ شٹر گورشش نے بھی لکھا ہے کہ وید کی ۱۱۳۷ شاخیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ وید ابتداء میں ایک تھا۔ اس کے بعد وید تین ہوئے۔ پھر ان میں اضافہ در اضافہ ہو کر چار بنے۔ اس کے بعد برہمنوں کی ذاتوں کے مطابق تیرہ ہو کر ۱۱۳۱ وید بنے۔ اور بالآخر وید بیشمار ہوگئے۔ جیسا کہ تیتریہ برہمن ۳:۱۰:۱۱:۲۴ میں لکھا ہے: ''وید بے شمار ہیں۔''

ویدوں میں تحریف کا ثبوت

ویدوں پر غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ تحریف و تبدیل سے پاک نہیں ہیں۔

اتھر وید میں تحریف کے ثبوت

سوامی دیانند نے رگ وید آدی بھاشیہ بھومکا ہندی کے ص ۸۶۰ پر لکھا ہے کہ اتھر وید کا پہلا منتر ''اوم شنو دیوی'' ہے۔ لیکھرام نے کلیات آریہ مسافر میں لکھا ہے کہ پہلا منتر ''اوم شنو دیوی'' ہے۔ مہابھاشیہ کے مصنف کا نظریہ ہے کہ پہلا منتر ''اوم شنو دیوی'' ہے۔

لیکن موجودہ وید کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منتر چھبیسواں ہے۔ معلوم ہوا کہ پہلے پچیس منتر بعد میں ملائے گئے ہیں۔

اتھر و میں منتروں کی تعداد میں اختلاف

سائیں بھاشیہ ۵۹۷۷، سیوک لال ۵۰۴۷، ساتولیک ۷۰۰، ویدک سدھانت ۶۰۰۔

یجر وید میں تحریف

یجر وید بمبئی والے میں ۲۵ ادھیائے کے ۴۷ منتر ہیں لیکن دیانند نے جو اجمیر سے چھپوایا ہے اس میں ۴۸ ہیں۔

یجر وید کے ۴۰ ادھیائے میں ''اوم کھم برہم'' بمبئی والے میں منتر کا جز نہیں ہے، لیکن دیانند نے اس کو منتر میں شامل کر دیا ہے۔

یجر وید بھاشا بھاشیہ دیانند ادھیاء ۹ منتر ۲۰ میں ایک لفظ ''گمیات'' ملایا گیا ہے۔

یجر وید بھاشا بھاشیہ دیانند ادھیاء ۲۵ منتر ۴۸ میں پورا منتر زیادہ کیا گیا ہے کسی سناتنی نسخہ میں نہیں ہے۔

یجر وید بھاشا بھاشیہ دیانند ادھیاء ۲۶ منتر ۲۱ منتر میں لفظ اگناوہ کو گراوا بنا دیا گیا ہے۔

یجر وید بھاشا بھاشیہ دیانند ادھیاء ۲۶ منتر میں لفظ ایو ہتے کو اپو ہتے بنا دیا گیا ہے۔

یجر وید بھاشا بھاشیہ دیانند ادھیاء ۱۶ منتر ۳۸ میں لفظ میدھیاء کو ناموزوں سمجھ کر میگھیاء بنا دیا گیا ہے۔

یجر وید بھاشیہ دیانند ادھیاء ۳۸ منتر ۱۴ میں لفظ گھرم کو نامناسب سمجھ کر دھرم بنا دیا گیا ہے۔

یجر وید بھاشا بھاشیہ دیانند ادھیاء ۳۸ منتر ۱۴ میں لفظ سکھرم کو نامناسب سمجھ کر سندھرم بنا دیا گیا ہے۔

تعداد منتروں میں اختلاف

۱۔ یجر وید کے کل منتر دیانند کے نزدیک ۱۹۷۵۔

۲۔ یجر وید کے کل منتر سات ولیکر کے نزدیک ۱۴۰۰۔

۳۔ یجر وید کے کل منتر شوشنکر کے نزدیک ۹۸۷۔

۴۔ یجر وید کے کل منتر سوامی ہری پرشاد کے نزدیک ۱۰۰۰ ہیں۔

سام وید میں تحریف

سام وید میں سب ویدوں سے زیادہ تحریف ہوئی۔ اس وید میں ۷۰ منتر چھوڑ کر سارا رگوید سے ماخوذ ہے یعنی ۱۸۰۰ منتر اس میں رگ وید کے ہیں۔

یہ وید جونا گڑھ کے مطبع ست دھرم سوریہ پرکاش، کلکتہ بنارس لاہور اور اجمیر میں بھی چھاپا گیا ہے۔ اجمیر میں یہ نسخہ آریوں نے شائع کیا ہے جو سب نسخوں سے مختلف ہے، ان کے مطبوعہ سام وید میں مہانا منی سوکت کے ۱۰ منتر اور ارنیک ادھیاء کے ۵۵ منتر جو علماء سلف کے نزدیک وید کا جز نہیں اسے بھی وید میں ملا دیا گیا ہے۔ سائن آچاریہ نے ان منتروں کو الگ رکھا ہے۔ جیوانند والوں نے اسے چھاپا ہی نہیں۔

ہر مطبع کے مطبوعہ سام وید کے منتروں کی تعداد میں اختلاف ہے۔

۱۔ اجمیر میں آریاؤں کے مطبوعہ سام وید میں منتروں کی تعداد ۱۸۲۴ ہے۔

۲۔ جیوانند ودیا ساگر کے مطبوعہ سام وید میں تعداد ۱۸۰۸ ہے۔

۳۔ پنڈت شوشنکر آریا پنڈت کے حساب سے تعداد ۱۵۴۹ ہے۔

۴۔ پنڈت سات ولیکر کے نزدیک منتروں کی تعداد صرف ۷۰ ہے۔

۵۔ سوامی ہری پرشاد جی نے ۶۵ منتر کا نیا سام وید شائع کیا ہے۔

منتروں کے علاوہ قدیم نسخوں میں اختلاف کثرت سے ہے۔ اس کے لیے پنڈت جے دیو شرما کا سام وید بھاشیہ مطبوعہ اجمیر کے حواشی ملاحظہ کیے جائیں۔

رگ وید میں تحریف

رگ وید کے مختلف نسخوں میں منتروں کی تعداد میں کافی اختلاف ہے، ذیل میں اختلاف کا نقشہ دکھایا جاتا ہے۔

۱۔ انوواک انوکرمنی کی رو سے ۱۰۵۸۰۔

۲۔ گائیتری وغیرہ اوزان شعری کی رو سے ۱۰۱۴۲۔

۳۔ سائن اچاریہ کی گنتی تقریباً ۱۰۰۰۰۔

۴۔ پنڈت دیانند بانی سماج ۱۰۵۸۹۔

۵۔ پنڈت شوشنکر آریہ ۱۰۴۰۲۔

۶۔ پنڈت جگن ناتھ ۱۰۴۵۲۔

۷۔ مہی داس شارع چرن ویوہ ۱۰۴۷۲۔

۸۔ ستیہ ورت شاستری ۱۰۴۴۲۔

۹۔ ہری پرشاد ویدک منی ۱۰۰۰۰۔

ہندو علماء بھی ویدوں میں تحریف وتبدل کے معترف ہیں۔

۱۔ پنڈت ویدک منی صاحب اپنی کتاب وید سروسو کے صفحہ ۹۷ پر رقمطراز ہیں۔

''حقیقت میں جس قدر بری حالت اس اتھر وید کی ہوئی ہے اتنی اور کسی وید کی نہیں ہوئی۔ سائن آچاریہ کے بعد بھی کئی سوکت اس میں ملا دیے گئے ہیں۔ ملانے کا ڈھنگ بہت اچھا سوچا گیا، وہ یہ کہ پہلے اس کے شروع اور آخر میں ''اتھ'' (شروع) اور ''اتی'' (ختم) لکھا دیا جاتا تھا۔ جب دیکھا کہ کسی نے پوچھا تک نہیں تب شروع اور آخر میں اتھ، اتی لکھنا بند کر دیا۔ پس صرف اتنے سے وہ (یعنی اضافہ) سنہتا (ویدک مجموعہ) میں مل جاتا ہے۔ جیسے رگ وید سنہتا میں بالکھلیۃ سوکت ملائے جا رہے ہیں۔ ویسے ہی اتھر وید کے آخر میں آج کل کنتاپ سوکت ملائے جا رہے ہیں۔ اگر پوچھا جائے کہ پانچویں انو واک سے لے کر کنتاپ سوکتوں سمیت جتنے سوکت اتھر وید میں ملائے جا رہے ہیں وہ کہاں سے آئے تو کوئی جواب نہیں ملتا۔ جہالت کا اتنا دور دورہ ہے کہ آخر میں اتھر وید سنہتا سماپتا لکھا ہوا دیکھ کر ہی یہ یقین کر لیا جاتا ہے کہ بس جو کچھ اس خاتمہ تک چھپا ہوا یا لکھا ہوا ہے وہ سب اتھر وید سنہتا ہے۔ یہ خیال نہیں کیا جاتا کہ چھاپنے والا یا لکھنے والا کون اور کتنی قابلیت رکھتا ہے۔''

۲۔ پنڈت مہیش چند پرشاد بی اے سنسکرت ساہتیہ کا اتہاس جلد دوم کے صفحہ ۱۶۰ پر لکھتے ہیں۔

''واجسنئی شکل یجروید سہتا بالکل نئی طرز پر ہے۔ اس میں وید اور برہمن بھاگ (حصے) الگ الگ پائے جاتے ہیں۔ اس میں چالیس ادھیائے ہیں مگر لوگوں کو وشواش ہے کہ ان میں ۱۸ اصل ہیں اور باقی بعد میں ملائے گئے ہیں۔ ادھیائے

اسے ۱۸ تک بھاگ تینتری سنہتا و کرشن یجروید کے نظم و نثر سے مطابقت رکھتا ہے۔
ان ۱۸ ادھیاؤں کے ہر ایک لفظ کی تشریح اس کے برہمن سے ملتی ہے مگر باقی ۱۷ ادھیاؤں کے صرف تھوڑے تھوڑے منتروں پر ہی اس میں پنچی (حواشی) پائی جاتی ہے۔ کاتیائن نے ادھیائے ۲۶ سے ۳۵ تک کو کھل (ملاوٹ) کے نام سے لکھا ہے۔ ادھیائے ۱۹ سے ۲۵ میں بھی یگیہ کے طریقوں کا ذکر ہے یہ تینتری سنہتا سے نہیں ملتے۔ ۲۶ سے لے کر ۲۹ ادھیاؤں تک کچھ خاص پر انہی یگیوں کے متعلق منتروں کا ذکر ہے جس کے بارہ میں پہلے ادھیاؤں میں بیان ہے اور اس سے خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ضرور بعد میں دیے گئے ہیں۔"

۳۔ پنڈت شانتی دیو شاستری رسالہ گنگا فروری ۱۹۳۱ء صفحہ ۲۳۲ پر لکھتا ہے۔
"پہلے تو آج تک یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ وید چار ہیں یا تین۔ منوسمرتی اور شت پتھ براہمن کی رو سے رگ وید، یجروید اور سام وید یہ تین وید ہیں اور واجنئی اپنشد، ہریمنو اپنشد اور منڈک اپنشد کی رو سے چار وید ہیں۔"

۴۔ پنڈت ہروے نرائن ایم۔ ایس۔ سی رسالہ گنگا بابت ماہ جنوری ۱۹۳۱ء صفحہ ۲۴۳ پر لکھتا ہے۔
"شونک رشی کے دیوہ وغیرہ تصانیف میں وید منتروں اور ان کے لفظوں اور حرفوں تک کی جو گنتی دی ہوئی ہے وہ موجودہ ویدوں میں نہیں ملتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ویدوں میں کئی منتر ملائے گئے ہیں اور کئی نکالے گئے ہیں۔"

۵۔ پنڈت شانتی دیو شاستری رسالہ گنگا بابت ماہ فروری ۱۹۳۱ء صفحہ ۲۳۱ پر لکھتا ہے۔
"جس وقت شونک رشی کا چرن دیوہ تصنیف ہوا اس وقت شاکل سنہتا (رگوید) کے ایک لاکھ ۵۳ ہزار آٹھ سو چھبیس الفاظ، چار لاکھ ۳۲ ہزار حروف اور دس ہزار چھ سو بائیس منتر تھے۔ مگر آج کل گنتی کرنے پر یہ تعداد نہیں ملتی۔"

۶۔ ڈاکٹر تاراپد چودھری ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر پٹنہ کالج رسالہ گنگا کے وید نمبر بابت ماہ جنوری ۱۹۳۲ء کے صفحہ ۴۷ پر لکھتا ہے۔
"ان کے علاوہ (ویدوں میں ایسے الفاظ بھی ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشدھ پاٹھ (غلط متن) معلوم ہوتا ہے کہ بولنے والوں اور لکھنے والوں کی خامیوں کے باعث کئی قسم کی غلطیاں واقع ہوگئی ہیں۔"

۷۔ پنڈت ویدک منی جی اپنی کتاب وید سروسو کے صفحہ ۱۰۵، ۱۰۶ پر لکھتا ہے۔
"گوپتھ براہمن کا زمانہ تصنیف میں وہ زمانہ ہے جبکہ یگیوں کا عروج تھا۔ اس زمانہ

میں رگ ویدی، یجروید ی، سام ویدی اور اتھر وید ی ایک دوسرے سے اینٹھے ہوئے تھے اور مختلف قسم کے فرائض اور من گھڑت طریقوں سے یگ وغیرہ کرنے میں محو تھے اور ان میں سے جس جس کو رگوید کے جس قدر منتر مطلوب تھے وہ اس اس نے اپنے اپنے وید میں شامل کر لیے تھے اور ہر ایک اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتا تھا اور دوسروں سے نفرت کرتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ شاکھا بھید (نسخوں کے اختلاف کے باعث) رگویدی رگویدی سے یجرویدی یجرویدی سے سام ویدی سام ویدی سے اور اتھرویدی اتھرویدی سے الگ ہو گیا تھا۔ واشک سنہتا والا شاکل سنہتا (یہ رگ وید کے دو مختلف نسخوں کے نام ہیں) مادھیندن سنہتا والا کانو سنہتا (یہ یجروید کے دو مختلف نسخوں کے نام ہیں) کوتھم سنہتا والا پپلا دسنہتا (یہ اتھروید کے دو مختلف نسخوں کے نام ہیں) کے پاٹھ (متن) کو سب سے اعلیٰ اور خالص اور دوسری شاکھا (نسخے) کے متن کو قطعی برا اور غلط کہتا ہے۔ آج وید کے مختلف نسخوں میں طرح طرح کے اختلافات نظر آتے ہیں۔ یہ اکثر اسی برے زمانہ میں جنم پائے ہوئے ہیں۔"

۸۔ اسی کتاب کے صفحہ ۱۰۹ پر لکھا ہے: "یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اس وقت اتھروید کی صرف دو شاکھا سنہتا (مختلف نسخے) ملتے ہیں۔ ایک پپلا دسنہتا اور دوسری شونک سنہتا، دونوں میں پپلا د زیادہ لائق تسلیم ہے لیکن وہ چھپی نہیں اور نہ ہی اس پر سائن آچاریہ نے تفسیر کی ہے۔ دوسری شونک سنہتا چھپی ہوئی ملتی ہے۔ جس کے تین ایڈیشن مختلف پریسوں میں چھپے ہوئے ملتے ہیں، جن میں دو مول (صرف متن) اور ایک سائن آچاریہ کی تفسیر کے ساتھ چھپی ہے۔ دونوں مول میں سے ایک ویدک پریس اجمیر کی اور دوسری بمبئی پریس کی چھپی ہوئی ہے۔ اس کا چھاپنے والا سیوک لال ہے۔ تینوں میں سوکتوں (بابوں) اور منتروں میں اختلاف ہے۔

مسٹر کوونداس لکھتے ہیں "ہم نہایت آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ کتابیں جو آج ہمارے پاس موجود ہیں ویاس کے مرتب کردہ نسخہ کے مطابق نہیں ہیں۔ اس لیے کہ روایات کی رو سے ویاس بھی کئی ہو گزرے ہیں اور اس کے علاوہ ویدوں کے کئی اور ترتیب دہندگان، سنہتا لٹریچر جو آج ہمارے پاس ہے وہ تو اس مجموعہ کا پانچواں حصہ بھی نہیں جو آج کے قریب ۲۲۰۰ سال پیشتر مہابھارت کے زمانہ میں موجود تھا۔ (ہندوازم ص ۸۴)

کیا موجودہ وید الہامی ہیں؟

موجودہ وید الہامی نہیں ہیں۔ وید کے الہامی نہ ہونے کا اقرار ہندو علماء کو بھی ہے۔

سروانو کرمنی جو وید سے متعلق ایک اہم کتاب ہے اس میں لکھا ہے جس کا کلام ہے وہ رشی ہے،

یعنی کلام الہامی نہیں بلکہ رشیوں کا ہے۔" (۲:۴) تیتر یہ ارنیک اپنشد جو مستند ہے، اس میں ہے "سہ دیوتا جس کا کلام ہے وہ رشی ہے۔" نرکت میں یاسک آچار یہ کہتا ہے۔ ایک رشی کتس بھی ہے منتروں کے بنانے والا"

پنڈت ستیہ ورت شری اپنی تصنیف وید ترئی پریچے کے صفحہ ۴۷ پر لکھتے ہیں: ایسا ہی یہ امر ثقہ ہے کہ ہمارے بزرگ رشیوں نے ہی ویدوں کو تصنیف کیا۔"

پنڈت نرویو شاستری لکھتے ہیں کہ اپنی کتاب رگوید آلوچن بھومکا (تمہید) میں مسٹر تلک کے متعلق لکھتے ہیں۔ "تلک بھی برہم وادی پکش (ویدوں کے الہامی ہونے کا عقیدہ کا کھنڈن (تردید) کرتے ہیں" (رگوید الوچن کی بھومکا)

سوامی ہری پرشاد، لالہ لاجپت رائے، بھائی پرمانند ایم اے وغیرہ بھی ویدوں کو الہامی نہیں مانتے صرف اپنے بزرگوں کی یادگار سمجھ کر اس کی حفاظت کرنا ضروری سمجھتے تھے۔[1]

پنڈت رادھا کرشن مشہور پروفیسر ہندو فلاسفی بنارس یونیورسٹی اپنی کتاب "فلاسفی آف دی اپنشدز" میں رقمطراز ہیں۔

We find in the upnishads an advance on the samhita mythology.

یعنی ہم اپنشدوں میں ویدک افسانوں سے زیادہ ترقی یافتہ خیال پاتے ہیں۔

"So numerous are suggestions of truth, so various are their guesses as God that almost any body may seek in them what he wants and finds what he seeks."

یعنی صداقت کے بارہ میں ان کے قیاسات اس قدر گوناگوں اور خدا کے متعلق ان کے ظنون اس قدر مختلف ہیں کہ ہر شخص کو یقیناً ان میں جو چاہتا ہے اور ہر قسم کا خیال جو تلاش کرتا ہے ان میں مل جاتا ہے۔[2]

پنڈت ستیہ ورت سام شری اپنی کتاب ترئی پریچے ص ۴۷ پر لکھتے ہیں کہ ایسے ہی بلاشک وشبہ یہ بات صحیح ہے کہ ہمارے بزرگ رشیوں ہی نے ویدوں کو تصنیف کیا۔" یہی پنڈت جی اپنے گرو پنڈت سام شری سے متعلق لکھتے ہیں۔

"سام شری پکش ورتمان (موجودہ) ویدوں کو بھارتیوں (ہندوستانیوں) کے لیے ہی مانتے ہیں۔ ویدوں کو ایشوری گیان (علم خداوندی) نہیں مانتے۔ ان کو آریہ ورتی آریوں کی سبھیتا (تہذیب) کا اتہاس (تاریخ) مانتے ہیں۔"

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب "The discovery of India" میں رقمطراز ہیں:

"بہت سے ہندو ویدوں کو الہامی کتاب سمجھتے ہیں۔ یہ میرے نزدیک ہماری بڑی بدقسمتی ہے کیونکہ اس طرح ان کی حقیقت ہم سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ وید صرف اس زمانہ کی معلومات کا مجموعہ ہیں۔ وہ بہت سی چیزوں کا غیر مرتب شدہ ذخیرہ ہیں۔

[1] ہندو سنگھٹن مؤلفہ بھائی پرمانند ایم اے۔ [2] فلاسفی آف دی اپنشدز: ص ۱۶۔

دعائیں، قربانی کی رسومات، جادو، نیچرل شاعری وغیرہ" (ص ۷۷)

گوروکل کانگڑی کے پروفیسر وید پنڈت چندرمنی ودیا النکار اپنے ترجمہ نرکت حصہ اوّل صفحہ ۹۶ پر وید کی ناقص زبان ہونے کی وجہ سے یہ کہتا ہے کہ وید پرماتما کے دیے ہوئے نہیں۔

"پرماتما پورن (مکمل) ہے یدی (اگر) وید پرماتما کے دیے ہوئے ہیں تو اس کی بھاشا (زبان) میں اتنا اپورنتا (نقص یا ادھورا پن کا) مہادوش (عظیم الشان غلطی) نہیں ہونی چاہیے...... یہ اشنکار (اعتراض) ہمیں بہت ڈگمگاتا ہے۔ ویدک بھاشا میں اتنی بھاری ترٹی (کمزوری، خرابی) کا ہونا بڑا کھٹکتا ہے۔"

ویدوں کے رشی یا مصنف

ویدوں کے شاعر رشی کہلاتے ہیں۔ لفظ رشی کے معنی منتر دیکھنے والا ہیں۔ منتر دیکھنے سے مراد دل سے منتروں کا دیکھنا، ان کا بنانا ہے۔ اس لیے ویدک تعلیمات میں رشی کی تعریف یہ ہے۔ "جس کا کلام ہے وہ رشی ہے۔"

دانا رشی منتروں کے بنانے والے ہیں (تیتریہ برہمن ۲، ۸، ۸، ۵) ایک رشی کے مکمل کلام کو سوکت کہا جاتا ہے۔ (۱:۱۳) جس دیوتا سے کوئی تمنا پوری ہونے کی آرزو کر کے رشی نے اس کی تعریف کی وہ اس منتر کا دیوتا کہلاتا ہے۔ (نرکت: ۷:۱)

گویا ویدوں کے منتر رشیوں کی دیوتاؤں سے التجائیں ہیں۔

کیا رشی رسول یا نبی تھے؟

لفظ رشی رسول یا نبی کا مترادف نہیں۔ سینکڑوں رشی گزرے ہیں جو رشی کہلائے مگر ان کا دعویٰ الہام نہیں منتروں کو سمجھنے اور سمجھانے والے بھی رشی کہلاتے ہیں۔ شاعر پنڈت بھی ویدوں میں رشی کہلائے۔ رشیوں کی اولاد اور شاگرد بھی رشی کہلائے (رگوید منڈل ۱۰ سوگت ۶۲ منتر ۵) منتر بنانے والوں کو رشی کے علاوہ برہمن، عالم اور شاعر بھی کہا گیا ہے۔

ویدوں کے رشیوں کے بارہ میں علماء ہنود کا اختلاف

ویدوں کے مصنفین کے متعلق ہندو علماء کا شدید اختلاف ہے۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ برہما دیوتاؤں میں سب سے پہلے ہوا۔ تمام عالم کا خالق اور رازق، اس برہما کے چار منہ تھے۔ ایک ایک منہ سے ایک ایک وید پیدا ہوا۔

برہما کے کس کس منہ سے کون کون وید نکلا۔

اس کے مشرقی منہ سے رگ وید وغیرہ، جنوبی منہ سے یجروید وغیرہ، مغربی منہ سے سام وید اور شمالی منہ سے اتھرووید نکلا۔

دوسرا نظریہ

دوسرا نظریہ ہے کہ وہ چار رشیوں (اگنی، وایو، انگرا اور ادنیہ پر الہام کیے گئے۔ شتپتھ برہمن سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ اگنی سے رگوید، وایو سے یجروید اور ادینہ سے سام وید ظاہر ہوا۔ مگر اتھروید کے نہ تو رشی کا اس میں ذکر ہے نہ اس وید کا نام اور نہ انگرا رشی اس میں کہیں مذکور ہے۔ البتہ گوپتھ برہمن میں جو اتھروودیا کا خاص برہمن ہے اتھرووید کا دیوتا چاند لکھا ہے۔

آریہ سماج کے ان فرضی رشیوں کے حالات زندگی کہیں نہیں ملتے۔

تیسرا نظریہ

وید ۴۱۴ رشیوں کا کلام ہے جن کے نام ویدوں کے اندر درج ہیں۔ تمام علماء یورپ، روشن خیال علماء ہند وسوامی وویکانند، پنڈت ناتھ دت، ابناش چندر دت، ستیہ درت، سام شری، سائن اچاریہ، سوامی ہری پرشاد، یاسک اچاریہ مؤلف نرکت کا بھی یہی نظریہ ہے۔ اس کی تصدیق خود ویدوں کے اندر موجود ہے۔ ہر ایک سوکت یا غزل پر اس رشی کا نام موجود ہے جس کا وہ کلام ہے۔

وید کے صدہا منتر ایسے ہیں جن میں رشیوں کا یہ دعویٰ موجود ہے کہ یہ ان کے بنائے ہوئے ہیں۔ نمونہ کے طور پر چند ایک درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ ہم قابل تعریف اگنی کے لیے اپنی عقل سے اس منتر کو بناتے ہیں جیسے بڑھئی رتھ بناتا ہے (رگ وید منڈل ۱ سوکت ۹۵ منتر ۱)

۲۔ اے اگنی تو اس منتر سے ترقی کر جو ہم نے اپنی لیاقت اور واقفیت سے بنایا۔ (رگ وید ۱:۲:۳:۱۸)

۳۔ یہ منتر اے دشونی کمار وہم نے تمھارے لیے گھڑا ہے جیسے بھر گو بڑھئی رتھ گھڑتے ہیں۔ (رگ وید منڈل ۴ سوکت ۱۶ منتر ۲۰)

۴۔ اسی طرح یم یمی سوکت میں دو توام بہن بھائیوں کا مکالمہ ہے۔ اس سوکت کے اوپر بعض منتروں پر رشی یم بتایا گیا ہے اور بعض کی رشیہ یمی ہے۔ سوکت میں بھی یم کا کلام مذکر صیغے میں اور یمی کا جواب مونث صیغہ میں ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہے کہ یم یمی اس کو سمجھنے والے نہیں بلکہ باہم کلام کرنے والے ہیں۔ اسی مکالمہ کا نام یم یمی سوکت ہے۔ چنانچہ اس سوکت کے منتر ۷، ۹، ۱۳، ۱۴ میں بھی یم یمی نام موجود ہے۔

منتر صرف دیوتاؤں کی تعریف ہی میں نہیں لکھے گئے بلکہ راجاؤں کی مدح میں بھی گھڑے گئے۔ وہ بھی ان رشیوں کی خوب قدر کرتے تھے۔ یہ منتر وید کی اصطلاح میں دان ستتیاں یا خیرات کی تعریف کے منتر کہلاتے تھے۔ مثلاً رگ وید منڈل ۸ سوکت ۱ پر لکھا ہے کہ کنو خاندان کا رشی

میدھاتھی اور میدھیاتتھی ہیں۔

۵۔ ۱۱منتر ۳۰ سے ۳۳ تک کا رشی اسنگ چھتری رشی ہے اور منتر ۳۴ کا رشی اسنگ کی بیوی انگرا کی بیٹی شاشوتی ہے۔ راجہ اسنگ نے رشی کو دان دیا، اس نے اس کی تعریف یوں کی۔ ''اے اگنی پریوگ کا بیٹا اسنگ دان دینے میں دوسروں سے دس گنا بڑھا گیا ہے۔ اس کے دیے ہوئے دھولے دھولے بیل میرے پاس ایسے ہیں جیسے پانی میں کنول کی ڈنڈیاں نکلی ہوں۔'' (رگ وید منڈل ۸ سوکت ا منتر ۳۳)

۶۔ اس منتر سے پہلے اسنگ خود میدھیاتتھی کو اپنی تعریف کے لیے کہتا ہے۔

''میدھیاتتھی بار بار میری تعریف کرو۔ میری مدح کرو۔ دولت مندوں میں ہم سب سے زیادہ دولت والے ہیں۔ میرے نطفہ سے دوسروں کے گھوڑے بنائے گئے۔ میرا طریق اعلیٰ ہے۔ میرا ہتھیار بلند ہے۔ کھانے کے بعد ارادت سے میں نے تمھارے رتھ کو جوتا تھا۔ میں دل لبھانے والا دان کرنا جانتا ہوں۔ میں یادو خاندان کا اور مویشیوں والا ہوں۔'' (رگوید منڈل ۸ سوکت ا منتر ۳۰، ۳۱)

۷۔ راجہ چتر کے دان کی تعریف میں سوبھری رشی یوں تعریف کرتا ہے۔

''چتر ہی راجہ ہے دوسرے سب رانیاں ہیں۔ جیسے بادل بارش سے زمین کو خوش کرتا ہے۔ ویسے ہی سرسوتی ندی کے کنارے رہنے والے نے ہزار جگہ مجھے دس ہزار دان دیے (رگوید ۸:۱:۲:۱۸)

ان حوالہ جات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وید مختلف رشیوں کی تصنیف ہیں، چنانچہ ڈاکٹر داس گپتا لکھتے ہیں:

> ''رگ وید کے منتر نہ تو کسی ایک شخص کی تصنیف ہیں نہ کسی ایک زمانہ کی۔ یہ منتر غالباً مختلف زمانوں میں مختلف رشیوں نے تصنیف کیے اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ ان میں سے بعض منتر آریوں نے ہندوستان میں آنے سے پیشتر تصنیف کیے ہوں۔ یہ منتر تمام سینہ بسینہ چلے آتے تھے اور ہر زمانہ کے شاعران میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ غالباً جب یہ مجموعہ بہت ضخیم ہوگیا تو اسے موجودہ شکل میں مدون کیا گیا۔ اس لیے ان میں دراصل آریوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے اور بعد کے زمانہ کی ترقی کے مختلف ادوار کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور عہد قدیم کی اس سوسائٹی کے انداز واطوار کا پتہ چلتا ہے جس نے انھیں تصنیف کیا۔''

ویدوں کی تالیف کا زمانہ

ویدوں کے زمانہ تدوین وتالیف میں شدید اختلاف ہے۔ سناتن دھرمی اور آریہ سماجی اس امر پر

متفق ہیں کہ وید شروع دنیا سے ہیں۔ پنڈت دیانند کے نزدیک ابتداء دنیا پر ایک ارب نو کروڑ برس گزر چکے ہیں۔ گویا پنڈت صاحب کے نزدیک ویدوں کے نزول پر بھی اتنا ہی عرصہ گزر چکا ہے۔ اس دعویٰ کی تردید مستشرقین اور ہندو علماء کی جدید تحقیقات اور اندرونی شہادت کر رہی ہیں۔

ڈاکٹر ہاگ (Haug) تیریہ برہمن کے انگریزی ترجمہ کے دیباچہ ص ۴۷ پر منتروں کا زمانہ ۱۴۰۰ سے ۲۰۰۰ برس قبل مسیح بتاتے ہیں۔ پروفیسر اناباش چندورت ۸۰۰۰ سے ۱۰۰۰۰ تک کا زمانہ قرار دیتے ہیں (رگ وید انڈیا) مہاتما تلک کی رائے میں ۴۰۰۰ سے ۵۰۰۰ برس قبل مسیح اور پروفیسر میکس ملر کی تحقیقات ۸۰۰ سے ۱۰۰۰ قبل مسیح (قدیم سنسکرت لٹریچر ص ۵۷۲ اور ترجمہ رگوید جلد ۴ ہیبرٹ لیکچرز ص ۲۴۰)

پروفیسر ملر ویدوں کے عہد کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

۱۔	سوتر لٹریچر	۲۰۰ سے ۶۰۰ ق۔م تک
۲۔	براہمن	۶۰۰ سے ۸۰۰ ق۔م تک
۳۔	منتر	۸۰۰ سے ۱۰۰۰ ق۔م تک
۴۔	چھندر گوید کے آخری حصہ سمیت ۱۰۰۰ سے ۱۲۰۰ ق۔م تک	

(Cambridge history of India part 1, P.112)

پروفیسر مونیر ولیم (Monier wiliam) ہندوازم میں لکھتے ہیں:

"In this manner we may be justified in assuming that hymns of in veda were probably composed by a succession of poets at different dates between 1500 and 1000 years before christ" (Hinduism P.19)

چنانچہ ہم یہ فرض کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ویدوں کے حمیدہ گیت غالباً ۱۵۰۰ اور ۱۰۰۰ قبل مسیح کے درمیان مختلف شاعروں نے مختلف تاریخوں میں لکھے۔ (ہندومت صفحہ ۱۹)

اناباش چندر کہتے ہیں۔

"The hymns themseleves are of different periods some being older and some recent"

حمدیہ گیت بذاتِ خود مختلف زمانوں سے متعلق ہیں کیونکہ کچھ پرانے معلوم ہوتے ہیں اور کچھ نئے۔

اناباش چندر رگویدک انڈیا میں لکھتے ہیں۔

"But the language of the Rigvedic Hymns being undoubtedly more archaic excepting some hymns of the Xth mandals than that of the Atharva Veda their composition is rightly regarded as beloaging to an earlier period. The Yajur Veda and the Atharva Veda contain in them distinct Geographical referances and other internal evidence which go to show that they were

composed in a much later period the Rigveda, The two periods having probably been separated from each other by thousands of years, during which many physical and climatic changes had taken place (Regvedic India P.VIII)

رگ وید کے حمیدہ گیتوں کی زبان دسویں منڈل کے چند گیتوں کو چھوڑ کر اتھروید کی زبان سے قدیم ہے اور اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ رگ وید کا زمانہ تالیف بہت پہلے ہو گزرا ہے۔ یجروید اور اتھروید میں ایسے واضح جغرافیائی حوالے اور اندرونی شہادتیں موجود ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ رگ وید کی نسبت بعد کے زمانہ میں مدون کیے گئے اور دونوں زمانوں میں ہزاروں سال کا وقفہ حائل ہے اور اس زمانے میں بہت سی طبعی اور موسمی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔

مہاتما تلک نے ''ارکٹک ہوم ان دی ویداز'' میں صرف ستاروں کی گردش کے حساب سے جو سالانہ موسموں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ویدوں کی عمر ۴۰۰۰ برس قرار دی ہے۔

جیمس ہسٹنگز (James Hasting) نے اپنی انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ ویدوں کا زمانہ ۱۳۰۰ ق۔م سے ۲۰۰۰ ق۔م تک سمجھا جاتا ہے۔

اندرونی شہادت

وید میں بعض فنون، قصاب کے اوزاروں، بڑھئی کے ہتھیاروں اور برتنوں کا ذکر ہے۔ موجودہ تحقیقات کی رو سے وہ اوزار دس ہزار برس پہلے موجود نہ تھے۔

ویدوں میں بعض کتابوں کا ذکر ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ کتب ویدوں سے پہلے موجود تھیں۔ مثلاً اتہاس (تاریخ) پران، گاتھا، نارا شنسی، یہ سب کتب کے نام ہیں جو وید منتر میں موجود ہیں (اتھروید ۱۵۔۶۔ ۷ تا ۱۱)

ویدوں کا وطن

ویدوں کے وطن کے متعلق ہندو علماء میں شدید اختلاف ہے۔ سناتن دھرم کے نظریہ کے مطابق ویدوں کا وطن شمالی ہندوستان یا آریہ ورت ہے۔ جس کی حدود اربعہ ایک طرف سندھ ہے تو دوسری طرف دریا جمنا، تیسری جانب کشمیر ہے تو چوتھی حد راجپوتانہ، بندھیاچل سے نیچے کا ملک آریہ ورت سے خارج ہے۔

آریہ سماج کا خیال ہے کہ وید ملک تبت میں نازل ہوئے تھے حالانکہ فزیالوجیکل تحقیقات میں ہمالیہ اور تبت کے پہاڑ بندھیاچل کی نسبت بہت نئے ہیں۔ وید میں کسی جگہ تبت کا ذکر نہیں۔ دیانند نے لفظ تروشٹپ سے تبت مراد لی ہے۔ یہ لفظ گوپتھ برہمن اور مہابھارت میں بھی استعمال ہوا ہے اور کسی جگہ اس سے مراد تبت نہیں ہے۔

ان دو نظریوں کے علاوہ مستشرقین کا یہ دعویٰ ہے کہ آریہ وسط ایشیا سے ہندوستان میں آئے۔ وید

وسط ایشیا میں رہائش کے زمانہ میں بننے شروع ہوئے اور پنجاب میں آ کر مکمل ہوئے۔ پروفیسر اناباش چندر داس اس نظریہ کا مخالف ہے۔ وہ فزیالوجیکل تحقیقات سے ثابت کرتا ہے کہ وسط ایشیا اس وقت زیر آب تھا اور ہمالیہ کا نام ونشان اس وقت نہ تھا۔ راجپوتانہ اس وقت سمندر تھا (رگویدک انڈیا) پس ویدوں کا وطن پنجاب ہے۔

چوتھا نظریہ مہاتما تلک کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وید قطب شمالی پر بننے شروع ہوئے (ارکٹک ہوم ان دی ویداز)

پانچواں نظریہ پروفیسر پران ناتھ ہندو یونیورسٹی بنارس کا ہے جنھوں نے السٹریٹڈ ویکلی بمبئی کے کئی نمبروں میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ ہندوستان کی کتاب نہیں۔ رگوید مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جن شہروں اور قوموں اور راجاؤں کا ذکر ہے ان کا تعلق شام اور دوسرے مغربی ممالک کے ساتھ ہے۔ اس نے اپنے اس مضمون میں یہ ثابت کیا ہے کہ موجودہ رگوید کا ۵/۱ حصہ بابل اور شام کے علاقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ گویا وید بابل سے بننا شروع ہوا اور ہندوستان میں آ کر مکمل ہوا۔

تعلیماتِ وید

ویدوں میں ظالمانہ احکام

وید مخالف کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کی تعلیم دیتے ہیں۔ یجروید کی تعلیم کا خلاصہ سوامی دیانند کے الفاظ میں یہ ہے۔

۱۔ ''دھرم کے مخالفوں کو زندہ آگ میں جلا دو۔'' (یجروید ادھیاء ۱۳ منتر ۱۲ دیانند بھاش)

۲۔ ''دشمنوں کے کھیتوں کو اجاڑو یعنی گائے بیل بکری اور لوگوں کو بھوکا مار کر ہلاک کرو۔'' (حوالہ مذکور منتر ۱۳)

۳۔ ''اپنے مخالفوں کو درندوں سے پھڑوا ڈالو۔'' (یجروید ۱۵، ۱۷، ۱۹)

۴۔ ''ان کو سمندر میں غرق کرو۔'' (۱۸:۱۵)

۵۔ ''جس طرح بلی چوہے کو تڑپا تڑپا کر مارتی ہے اس طرح ان کو تڑپ تڑپ کر مارو۔'' (۶۵:۱۶)

۶۔ ''ان کی گردنیں کاٹ دو۔'' (۲۲:۵)

۷۔ ''جائز اور ناجائز طریق سے ہلاک کر دو۔'' (۲۸:۱)

۸۔ ''مخالفوں کا جوڑ جوڑ اور بند بند کاٹ دیا جائے۔'' (۳۸:۱۳)

۹۔ ''ان کو پاؤں کے نیچے کچل دو اور ان پر رحم نہ کرو۔'' (۱۷۔۳۹)

سام وید کی تعلیم

''اے مخالف تم سر کٹے ہوئے سانپوں کی طرح بے سر اور اندھے ہو جاؤ۔ اس کے بعد پھر جو تم

میں چیدہ چیدہ ہوں ان کو اندر اور آگ دیوتا تباہ کریں۔" (سام وید اُتر آرچک پر پھاٹک گیارہ منتر)

۲۔ "اے اندر دیوتا! ہمارا دیا ہوا سوم رس تجھے خوش اور متوالا کرے، تو ہمیں دھن و دولت دے اور وید کے دشمنوں کو تباہ اور ہلاک کر۔" (سام وید اُتر آرچک آدھیائے ۱۱ منتر ۱)

۳۔ "اے اندر دیوتا! تو غیر ویدک دھرمیوں کو کب یوں کچل کر تباہ کرے گا جیسے چھتری وار پھول کو پاؤں سے کچل کر تباہ کر دیا جاتا ہے۔ اے اندر تو کب ہماری ان دعاؤں کو سنے گا۔" (سام وید اُتر آرچک ادھیائے ۱۰ منتر ۳)

اتھر وید کی تعلیم

"اے ویدک دھرمی راجاؤ اور دوسرے ویدک دھرمیو تم شیر جیسے بن کر رعیتوں کو کھا جاؤ اور چیتے جیسے بن کر اپنے دشمنوں کو باندھ کر جکڑ لو اس کے بعد اپنی مخالفت کرنے والوں کے کھانے تک اٹھا لو۔" (اتھر وید کانڈ ۴ سوکت ۲۲ منتر)

۲۔ "اے دبھ تو ہمارے دشمنوں کے دلوں کو توڑ دے۔ جیسے تو اگتے وقت زمین کی کھال کو چیرتی ہوئی اوپر کو نکل آتی ہے۔ ویسے ہی ان ہمارے دشمنوں کے سروں کو چیر کر اوپر کو نکل کر ان کو گرا کر تباہ کر دے۔" (اتھر وید کانڈ ۱۹ سوکت ۲۸ منتر ۴ تا ۱۰)

۳۔ "اے دبھ تو میرے دشمنوں اور مقابلہ کرنے والوں کو چبھ اور میرے دوسرے ہر قسم کے مخالفین کو بھی چبھ جا اے دبھ تو میرے دشمنوں اور مقابلہ کرنے والوں کو تباہ کر اور ہمارے مخالفین کو بھی تباہ و برباد کر وغیرہ وغیرہ۔" (اتھر وید کانڈ سوکت ۲۹ منتر ۱ تا ۹) منوسمرتی جو تمام ہندوؤں کے نزدیک ویدوں کی تفسیر ہے۔

"ویدوں پر اعتراض کرنے والوں کو ملک سے باہر نکال۔" (ادھیائے اشلوک ۱۱)

دوسروں کے مال و دولت پر نظر رکھنے کی تعلیم

ا۔ اے اندر پر ماتما کیکٹوں (غیر آریوں) میں گایاں تیرا کیا بناتی ہیں۔ سوم (بھنگ) میں ملانے کے لیے دودھ دہاتی ہیں اور نہ یگیہ کا برتن (اپنے دودھ) سے گرم کرتی ہیں۔"

۲۔ "پرم گند کی دولت ہمارے لیے لوٹ لا۔" (گوید منڈل ۳ سوکت ۵۳ منتر ۱۴)

عورتوں کے متعلق تعلیم

عورت معاشرہ کا ایک اہم ترین رکن ہے، لیکن ویدک دھرم نے ان کو قعر مذلت میں گرا کر ان کے ہر قسم کے معاشرتی حقوق کو چھین لیا ہے۔

رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۹۵ منتر ۱۵ میں لکھتا ہے۔

''عورتوں کے ساتھ محبت نہیں ہو سکتی۔ عورتوں کے دل فی الحقیقت بھیڑیوں کی بھٹ ہیں۔''

دوسری جگہ آتا ہے۔

''اندر (آریوں کے ایشور) نے خود یہ کہا ہے کہ عورت کا دل استقلال سے خالی ہے اور وہ عقل کی رو سے ایک نہایت ہلکی چیز ہے۔'' (رگوید منڈل سوکت ۳۳ منتر ۱۷)

ان دو منتروں سے چار حکم مستنبط ہوتے ہیں۔

۱۔ کسی عورت سے مستقل محبت نہیں کی جا سکتی۔

۲۔ عورت دھوکے باز ہے۔

۳۔ ہر عورت کی عصمت مشتبہ ہے۔

۴۔ عورت کم عقل ہے۔

عورت کی معاشرتی حیثیت

مندرجہ بالا چار وجوہات کی بناء پر برہمن گرنتھیوں اور شاستر کاروں نے حسب ذیل قوانین مرتب کیے ہیں۔

۱۔ عورت اور شودر دونوں کو نردھن (مال سے محروم) کہا گیا ہے (یجروید ادھیاء ۸ منتر ۵ منو ادھیاء ۸ شلوک ۴۱۶ ادھیاء ۹ شلوک ۱۹۹)

۲۔ لڑکی باپ کی جائیداد کی وارث نہیں (اتھروویدکانڈا سوکت ۱۷ منتر ا یجروید ۸:۵ نرکت ۳:۴، منو ۹:۱۹۹)

۳۔ کسی عورت کو خاوند سے حکومت نہیں مل سکتی۔ (اتھروویدکانڈا سوکت ۱۷ منتر ۱)

۴۔ اگر کسی بیوہ کو اپنے خاوند کی طرف سے جائیداد ملتی ہے تو اسے جائیداد کی بیع و فروخت کا کوئی اختیار نہیں۔ (اتھروویدکانڈا سوکت ۱۷ منتر ۱)

۵۔ اولاد ذکر کے نہ ہوتے ہوئے بھی بیٹی وارث نہیں بلکہ متبنّٰی جو غیر کا بیٹا ہوتا ہے۔ وارث ہوتا ہے۔ (منو ادھیاء ۹)

۶۔ نکاح ثانی کی ممانعت ہے کیونکہ ایک جائیداد بلاوجہ دوسرے کے قبضہ میں نہیں جا سکتی۔ (منو ۱۵:۱۵۱)

۷۔ خلع کی ممانعت یعنی خاوند خواہ کیسا ہی بے رحم اور ظالم ہو، دائم المریض ہو مگر عورت کو اس سے علیحدہ ہونے کی اجازت نہیں۔ (منو ۵:۱۵۴)

۸۔ عورت کا وجود صرف اس لیے ہے کہ بچے دیں، ان کی پرورش کریں اور ہر روز خانہ داری کے کام میں مصروف رہیں۔ (منو نواں باب ۲۷)

۹۔ کسی لڑکی یا نوجوان عورت یا بڈھی عورت کو کبھی گھر میں بھی کام اپنے اختیار سے نہیں کرنا چاہیے۔ طفولیت میں عورت کو باپ کا تابع رہنا چاہیے اور جوانی میں شوہر یا بیٹوں کا اگر وہ انھیں چھوڑ کر چلی جائے تو اپنے اور اپنے شوہر دونوں کے خاندان پر بدنامی کا دھبہ ڈالے گی۔ منو شاستر پانچواں باب ۱۴۷، ۱۴۸)

۱۰۔ عورت کو جوئے میں ہارنے اور فروخت کا جواز۔ (نرکت ۳:۴)

۱۱۔ جن لڑکیوں کے بھائی نہ ہوں ان کی شادی نہیں ہو سکتی۔ (اتھروویدا:۱۷:۱)

۱۲۔ لڑکیوں کی موجودگی میں لڑکے پیدا کرنے کے لیے نیوگ کا حکم (ستیارتھ پرکاش باب ۴ مضمون نیوگ)

ہندو وکیل کی رائے

''جس طرح درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح قوموں کے تمدن اور تہذیب پر ان کے رسم و رواج کا اثر ہے۔ ہندو دھرم میں مردوں کے حقوق نہایت احتیاط کے ساتھ تمام معاملات میں محفوظ کر دیے گئے ہیں۔ مگر یہ ایک افسوس ناک امر ہے کہ عورتوں کے حقوق کی حفاظت نہیں کی گئی۔ نہایت رنجیدہ بات ہے کہ قدیم ہندو دھرم کی بناء پر عورت کو جائیداد سمجھا گیا ہے یا ایک ایسی ہستی جو مرد سے عقل اور اخلاق کی بناء پر نہایت کم تر درجہ پر ہے۔ اس لیے ہندو شاستروں کا زور عورت کے فرائض پر ہے حقوق پر نہیں۔ اس لیے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہندو سوسائٹی کے بنانے میں عورت کا کوئی حصہ نہیں۔ عورت کے پیدائش سے لے کر وفات تک تمام افعال زندگی، مشکلات اور مصائب بلکہ زندگی کے معمولی مقتضیات کھانے پینے، جاگنے سونے، غسل کرنے، باہر کے معمولی کاروبار میں مرد کے رحم پر چھوڑ دیا گیا ہے اور اسے عورت کے لیے نمبر ۲ خدا بنا دیا گیا ہے۔'' (بھگت رام سیکرٹری انجمن ہمدرد حیوانات فیروز پور چھاؤنی)

ویدک دھرم میں عورت کی روحانی حیثیت

۱۔ عورت کے لیے مذہبی تعلیم کی ممانعت ہے۔ (منو ۹:۱۸)

۲۔ مرد اور عورت دونوں کے لیے نجات کے الگ الگ راستے ہیں۔ مرد اپنے زورِ بازو سے مکتی مارگ (طریقہ نجات) پکڑ سکتا ہے مگر عورت کی نجات خاوند پر مر مٹنے سے ہی ہو سکتی ہے، وہ براہِ راست خدا سے نجات حاصل نہیں کر سکتی۔ (منو ۲:۶۶۔ ۹:۱۸ اور ۵:۱۵۵)

۳۔ گیتا میں نیز عورت اور شودر کو پاپ یونی (گناہ کے قالب) قرار دیا گیا ہے۔ (گیتا ادھیاء ۹ شلوک ۳۲)

۴۔ عورت کی عصمت و پاکیزگی کے خلاف منو ادھیا اور شپتھ برہمن، رگوید، یجروید، اتھرووید کا مطالعہ ضروری ہے، بعد کے لٹریچر میں بھرتری ہر کا دیراگ شتک، یوگ دششٹ میں عورت کو بدترین

خلائق قرار دیا ہے۔

۵۔ اتھروید ۵، ۱۷، ۸، ۹ میں لکھا ہے۔ ''اگر کسی عورت کے دس خاوند ہوں، مگر اس کے بعد برہمن اس کا ہاتھ پکڑ لے تو وہ برہمن کی ہو جاتی ہے، برہمن ہی خاوند ہے نہ کشتری اور نہ دیش تمام لوگوں میں اس امر کا اعلان کرتا ہوا سورج ہر روز چلتا ہے۔''

وید میں ناقص توحید

ویدوں میں خالص توحید نہیں پائی جاتی ہے اور پرمیشور کا تصور جو ویدوں نے پیش کیا وہ انسانی ذہن کا تراشیدہ ہے۔ وید کے سوکتوں کے اوپر ایک تو دیوتا کا نام ہے اور دوسرے کسی رشی کا۔ دیوتا وہ ہے جس کی تعریف یا پرستش کا ذکر اس سوکت میں موجود ہے۔ رشی اس کا مصنف ہے۔

ویدوں میں دیوتاؤں کی تعداد مختلف ہے۔ یجروید میں لکھا ہے کہ دیوتا کل ۳۳ ہیں۔ ۱۱ زمین پر ۱۱ آسمان میں اور ۱۱ اوپر جنت میں۔

رگوید منڈل (۳ سوکت ۹ منتر ۹ میں لکھا ہے کہ کل دیوتا ۳۳۴۰ ہیں۔ رگوید کے بیان کے مطابق ۳۳۳۹ دیوتاؤں نے مل کر آگ دیوتا کو گھی سے سینچا اور اس کے پاس گئے۔ پس ۳۳۳۹ میں ایک کا اضافہ ہوا تو ۳۳۴۰ دیوتا بن گئے۔ چنانچہ رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۵۲ منتر ۶ میں واضح الفاظ میں یہ لکھا ہے کہ کل دیوتا ۳۳۴۰ ہیں۔

بلحاظ جائے رہائش دیوتاؤں کی تین اقسام ہیں، پرتھوی ستھانی (زمین میں رہائش والے) مدھیہ ستھانی (جو فضا میں مقیم ہیں) دیو ستھانی آسمان میں رہنے والے دیوتا) مثلاً اگنی، اندر، سوریہ اتھرووید ۱۰:۹:۱۲، واتھرو ۱۹:۲۷:۱۱......۱۳) رگوید ۱:۳۹:۱۱، یجروید ۷:۱۹ نرکت ۷:۵ شپتھ ۱۱:۶:۲:۴) اس کے علاوہ درختوں، جانوروں وغیرہ میں رہنے والے دیوتاؤں کا ذکر اتھرووید ۱:۳۰:۳ میں ہے۔

دیوتاؤں کی یہ کثرت شرک فی ذات الٰہی ہے۔ ہندو روح مادہ، آکاش اور زمانہ کو خدا کے برابر ازلی ابدی گردانتے ہیں۔ یہ شرک فی صفات الٰہی ہے۔ اسی طرح آگ، ہوا، پانی، دریا پہاڑ، زمین، سورج اور چاند کی عبادت کرنا شرک فی عبادات الٰہی ہے۔

ویدوں کی رو سے ایشو کا تصور

۱۔ یجروید: وہ اگنی ہے وہ وایو ہے، وہ چندرما ہے، وہ روشنی ہے، وہ آپہ ہے، وہ پرجاپتی ہے (۱/۳۲)

۲۔ ''کیا میں اس روح برترین کو جان سکتا ہوں جو سب کچھ ہے اور تاریکی سے پرے ہے۔ صرف اسی کو جان کر کوئی موت عظیم پر فتح پا سکتا ہے۔ نجات کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔'' (۱۸/۳۱)

۳۔ ''خدا ایک ہے۔ وہ غیر متحرک ہے۔ تاہم دماغ سے زیادہ سریع السیر ہے حواس اس تک نہیں پہنچ

سکتے اگر چہ وہ ان میں ہے۔"

۴۔ رگوید: "ہزاروں سروں والا پرش (ایشور) ہزاروں آنکھوں والا، ہزاروں پاؤں والا، وہ ترلوکی (کائنات) کو سب طرف سے گھیر کر ٹھہرا ہوا ہے۔" (۱۰۔۹۱۔۱۱)

۵۔ سام وید: "اے خدا تو ہمارا باپ ہے۔ ہمارا بھائی ہے۔ ہمارا دوست ہے۔ (۱۸:۴۱)

۶۔ اتھروید "تو مرد ہے، تو عورت ہے، تو کنواری لڑکی ہے، تو بوڑھا آدمی ہے، جو لاٹھی لیے لڑکھڑا رہا ہو تو ہر طرف موجود ہے۔" (۱۰۔۸۔۲۷)

۷۔ "وہ ایک ہے تنہا ایک۔ اس میں تمام معبود ایک ہو جاتے ہیں۔" (۱۳)

۸۔ "صحیح علم دین کے جاننے والے ۳۳ دیوتاؤں کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ صرف ایک ہی میں موجود ہیں اور اس کے ذریعے سے اپنے صحیح اور فطری فرائض انجام دیتے ہیں۔ (۱۰۔۴۔۲۷)

۹۔ "اے حیوانات کے مالک پرماتما تیرے منہ کو تعظیم ہو۔ اے سب کے خدا تیری آنکھ کو تعظیم تیری کھال کو تعظیم، تیرے قابل زیارت جسم کے آگے پیچھے کو تعظیم ہو۔ پیٹ کے لیے، زبان کے لیے، تیرے منہ کے لیے، دانتوں کے لیے، تیرے دانتوں کی بدبو کے لیے تعظیم ہو۔" (۱۱۔۲۔۵،۶)

تمام دیوتاؤں میں ورن کا مقام بہت بلند ہے۔ اتھروید کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

۱۰۔ "ورن، آقائے اعلیٰ دیکھتا ہے گویا وہ نزدیک ہو جب کوئی شخص کھڑا ہوتا یا چلتا ہے یا چھپتا ہے اگر وہ لیٹے جاتا یا اٹھتا ہے جب دو آدمی پاس بیٹھ کر کانا پھوسی کرتے ہیں تو بھی شاہ ورن کو اس کا علم ہوتا ہے وہاں مثل ثالث کے موجود ہوتا ہے۔

"یہ زمین بھی شاہ ورن کی ہے اور یہ آسمان بھی جس کے کنارے بہت بعید ہیں[1] دونوں سمندر ورن کی کمر ہیں۔ وہ پانی کے اس قطرے میں بھی موجود ہے۔" "اگر کوئی آسمان سے پرے بھاگ کر جانا چاہے تو بھی وہ شاہ ورن سے نہیں بچ سکتا۔[2] اس کے جاسوس دنیا کی طرف بڑھتے ہیں اور ہزار آنکھوں سے اس زمین کی نگرانی کرتے ہیں۔"

"شاہ ورن سب کچھ دیکھتا ہے جو زمین و آسمان کے درمیان اور اس کے پرے ہے اس نے انسانوں کے پلک جھپکانے تک کا شمار کیا ہے جیسے ایک کھلاڑی پانسہ پھینکتا ہے ویسے ہی وہ سب چیزوں کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ (۴۔۱۶۔۱،۵)

مندرجہ بالا اقتباسات میں ورن سے چند اوصاف منسوب کر دیے گئے ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ویدوں میں ناقص توحید (Henotheism) موجود ہے۔

---

[1] اس کا مقابلہ زبور ۲۴ آیت ا سے کیجئے۔ [2] اس کا مقابلہ زبور ۱۳۹ کی آیات ۷ تا ۱۲ سے کیجئے۔ دونوں میں اس قدر مشابہت ہے کہ بجائے توارد کے زبور کی آیتیں سرقہ معلوم ہوتی ہیں۔

ہمہ اوست کا عقیدہ:۔ آریوں نے ہر معبود یا مظاہرہ فطرت کو ایک خدا کا ہی مظہر تسلیم کر لیا۔ رگوید میں ہے۔ ''ایک آگنی وراگ ہے جو بہت سی جگہوں پر روشن ہوتی ہے۔ ایک سوریہ (سورج) ہے جو سب پر چمکتا ہے۔ ایک اُشا (شفق صبح) ہے جو اس سب کو منور کرتی ہے وہ جو ایک ہے یہ سب کچھ ہو گیا۔ (رگوید منڈل ۸ سوکت ۵۸۔

ویدوں میں بہشت ایک گھوڑے کی صرف ہزاروں کی مسافت پر ہے۔ وہ اس قدر تنگ ہے کہ بقول سوامی دیانند جی اس میں زیادہ ارواح کے آ جانے سے بھیڑ بھاڑ کا خطرہ ہے۔[1]

یہ برہمنوں کو کھلانے پلانے اور خیرات کرنے سے حاصل ہوتی ہے اس میں گھی کے تال، شہد کی نہریں، بہتی ہوئی شراب، دودھ کی نہریں، دہی کے تالاب، نیلوفر کے حوض، لونڈے اور عورتوں کے جھنڈ بہشتیوں کو ملیں گے۔[2]

اس میں ایشور جی کے بیٹھنے کی ایک پالکی، سونے کے لیے پلنگ[3] اور شری اور لکشمی دو بیویاں ہیں جن میں ویدک ایشور ہمیشہ غلطاں رہتا ہے۔[4]

تخلیق کا گیت:۔ رگوید کی دسویں کتاب، سوکت ۱۲۹ میں تخلیق کائنات سے قبل کی حالت بیان کی گئی ہے۔

۱۔ ''اس وقت عدم تھا اور نہ وجود نہ عالم باد اور نہ آسمان جو اس سے پرے ہے۔ کیا چیز سب کو محیط تھی اور وہ سب کچھ کہاں قائم تھا۔ کیا وہ پانی اور عمق بے پایاں تھا؟

۲۔ ''اس وقت فنا و بقا کا کوئی وجود نہ تھا اور نہ دن رات کا کوئی فرق نہ تھا۔ وہ ''ایک'' اپنے آپ میں بغیر سانس (یا ہوا) کے سانس لے رہا تھا اور اس کے سوا کوئی دوسری شے نہ تھی۔''

۳۔ ابتداء میں تاریکی پر تاریکی چڑھی ہوئی تھی۔ سب کچھ (کائنات) غیر متمیز صورت میں پانی ہی پانی تھا۔ وہ ''ایک'' جو خلا میں جائمہ عدم پہنے ہوئے تھا۔ حرارت نے اس کو اپنی طاقت سے پیدا کیا۔''

۴۔ ''اس میں ابتداء خواہش نمودار ہوئی۔ یہ خواہش عقل یا روح کا ابتدائی تخم تھی۔ جس کو رشیوں نے اپنے دل و دماغ کی کاوش سے معلوم کیا کہ وہ (تخم) عدم و وجود میں واسطہ اتصال ہے۔''

۵۔ وہ شعاع نور جو عالموں میں پھیلی۔ کیا وہ عالم پستی سے نمودار ہوئی یا عالم بالا سے؟ پھر بیج بوئے گئے اور قوتیں پیدا ہوئیں۔ کارخانہ قدرت عالم پستی میں اور اقتدار و ارادہ عالم بالا میں۔''

۶۔ حقیقت کی کس کو خبر ہے؟ یہاں اس کا اعلان کون کر سکتا ہے۔ کائنات (یا عالم مخلوقات) کی پیدائش کہاں سے یا کس سے ہوئی؟ کیا دیوتا بھی اس کے ظہور میں آئے؟ (یا دیوتا بھی بعد کی

[1] ستیارتھ پرکاش۔ میعادی مکتی کا مضمون۔
[2] اتھروید ۱۰: ۳۰: ۳۱۔
[3] اتھروید کانڈ ۴ سوکت ۳۴۔
[4] یجروید ۳۱: ۲۲۔

پیدائش ہیں تو پھر کون جانتا ہے کہ وہ (کائنات) کہاں سے نمودار ہوئی ہے۔"

۷۔ یہ عالم مخلوقات کہاں سے نمودار ہوا۔ یہ کہ وہ خلق بھی ہوا ہے یا نہیں؟ وہ جو بالاترین آسمان سے سب کچھ دیکھتا ہے۔ اس حقیقت کا علم صرف اسی کو ہے یا شاید وہ بھی نہیں جانتا۔"

برہمن اس (ایشور) کا منہ ہے۔ ایشور کے بازوؤں سے کھشتری، رانوں سے ویش، پاؤں سے زمین اور کان سے طرفین پیدا ہوئیں۔ چاند من (دل) سے پیدا ہوا۔ آنکھ سے سورج پیدا ہوا۔ منہ سے اندر اور آگ اور سانس سے ہوا پیدا ہوئی۔ (رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۹۱ منتر ۱۲-۱۴)

زمین اور آسمان کی کیفیت

رگوید منڈل ۳ سوکت ۵۵ منتر ۲۰ میں لکھا ہے کہ "اس نے ان دونوں (زمین اور آسمان) کو دو کٹوروں کی طرح باہم بھر دیا ہے۔"

اتھروکانڈ ۱۱ سوکت ۳ منتر ۱۱ میں ہے۔ "یہ زمین پکتے ہوئے چاولوں کی ہنڈیا (کی مانند) اور آسمان ڈھکنا ہے۔"

آسمان کے ستون

جس طرح زمین کے لیے پہاڑ میخوں کا کام دیتے ہیں۔ اسی طرح آسمان کے لیے ستونوں کا کام دیتے ہیں۔ چنانچہ اتھروید کانڈ ۱۳ سوکت ۱ منتر ۴۸ میں لکھا ہے۔ "سردی اور گرمی کو قائم کیا اور پہاڑوں کو ستون بنایا۔"

ویدوں کی رو سے تخلیق کائنات اور کیفیت زمین و آسمان موجودہ علمی تحقیقات کے سراسر خلاف اور خلاف عقل ہے۔ اس سے ویدوں کی علمی معیار کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

برہمنا یا برہمنیت

رگوید کے بعد برہمنا دوسری اہم ترین کتاب ہے۔ شت پتھ برہمن کے دو نسخے ہیں۔ ایک کانو اور دوسرا مدھیم دن۔ یجروید سے متعلقہ گوپتھ برہمن ہے جو زیادہ اہم نہیں سمجھا جاتا برہمن ویدوں کی تفاسیر ہیں۔ لیکن یہ عقیدہ ہے کہ یہ تفاسیر بھی الہامی ہیں۔

ویدوں کے زمانہ کے بعد برہمنوں کو مذہبی قیادت حاصل ہو گئی تھی۔ انھوں نے اپنی مذہبی قیادت کے جواز میں جو کتب تالیف کیں۔ انھیں برہمنا کہا جاتا ہے۔ ان کتب کا مقابلہ اگر بدھ مت اور جین مت کی مذہبی کتب سے کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں حالات اور واقعات کو غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے جس سے برہمنوں کی مذہبی سیادت ثابت ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ کتب ہندومت کی صحیح نمائندگی نہیں کر سکتیں کیونکہ ان کتب کا تعلق صرف ایک ہی طبقہ کے ساتھ مخصوص ہے، وہ بھی ذاتی اغراض اور مذہبی پیشوائی حاصل کرنے

کے لیے۔ ان کتب کے مطالعہ سے یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ برہمنوں کو قدیم زمانہ سے ہی مذہبی تفوق حاصل ہے۔ ہندومت میں جین مت اور بدھ مت کی اصلاحی اور انقلابی تحریکیں جاری ہوئیں۔ برہمنا میں ان کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ہندومت کی تاریخ میں کوئی خلا پیدا نہیں ہوا۔ شروع سے آخر تک اس میں تسلسل قائم رہا۔

برہمنا میں یونانیوں اور ہنوں کے ہندوستان پر حملوں کا کوئی ذکر موجود نہیں۔

برہمنا کا عہد

آریاؤں کے گنگا اور جمنا میں آباد ہونے کا زمانہ برہمنا کا زمانہ کہلاتا ہے۔ برہمنا دراصل ویدوں کے ضمیمہ یا تتمہ کی حیثیت رکھتے ہیں، جنھیں ہم رسوم اور دینیات کی کتب کہہ سکتے ہیں۔ برہمنا کا عہد ۸۰۰ ق۔م سے شروع ہو کر ۵۰۰ ق۔م پر ختم ہوتا ہے۔

برہمنا میں اچھی قسم کے خیالات بھی ملتے ہیں، لیکن ان میں نہایت ہی گھٹیا درجہ کی رسوم تصوف اور ضعیف الاعتقادی کی بھی آمیزش ہے۔ اس کی وجہ بقول ٹیلی یہ ہوگی کہ جاہ و اقتدار کے حریص پروہتوں کو غیر محدود روحانی اقتدار سپرد کر دیا گیا تھا۔[1]

ویدوں کا زمانہ امید و رجائیت اور مسرت کا زمانہ تھا لیکن برہمنا کے عہد کے آغاز میں ہندو ذہن پر مایوسی اور قنوطیت غالب آ گئی۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ تبدیل آب و ہوا ہو، کیونکہ ہندو آریا پنجاب کو چھوڑ کر گنگا اور جمنا کے علاقے میں مقیم ہو چکے تھے، جس کی آب و ہوا نم آلود ہونے کی وجہ سے انسان کاہل اور سست بنا دیتی ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہندو آریاؤں کی مرکزیت ختم ہوتی جا رہی تھی اور ان کی سلطنت چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستوں میں بٹتی جا رہی تھی جو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی تھیں۔

برہمنا کے عہد میں ہندو مذہب میں انحطاط نے راہ پائی تھی۔ اس وجہ سے اس میں کسی قسم کی نہ کشش باقی رہی تھی اور نہ لوگوں میں مذہبی لگن رہی تھی۔ ظاہری مذہبیت کا غلبہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ایک پیشہ ور مذہبی طبقے نے جنم لے لیا۔ تمام مذہبی رسوم اور عبادات کی پیشوائی انہی کے ہاتھ میں تھی۔ مذہبی رسوم اور پرستش کے طریقے بھی پیچیدہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اس عہد میں قدیم آریائی دیوتاؤں کا وقار بہت حد تک کم ہو چکا تھا۔ ان سے تعلق قائم کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ قربانی کا طریقہ بھی پیچیدہ ہو گیا۔ قربانیوں کی حیثیت محض سحر و فسوں کی ہو گئی اور یہ عقیدہ عام ہو گیا کہ اگر قربانی صحیح طور پر کی جائے تو حاجت روائی اور مطلب براری میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔ قربانی سے شگون لینے کا رواج عام ہو گیا۔ عوام قربانی کے طور طریقوں کو بھول گئے۔ نتیجۃً ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا۔ جس کو مذہبی پیشوائی حاصل ہو گئی۔ سحر و فسوں کی مقبولیت کی وجہ سے اس طبقہ کے اقتدار میں اضافہ ہو گیا اور جس نے خود کو انسانی دیوتا ہونے کا دعویٰ کر دیا

[1] ٹیلی تاریخ مذہب ص ۱۲۳۔

اسی کی ذات کو قربانی کا مرکز بنادیا گیا اور وہ کائنات کی قوت اعلیٰ بن گیا۔

برہمنا میں حیات بعد الممات کا عقیدہ زیادہ واضح تھا۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس زندگی کو کیسے عمدہ بنایا جا سکتا ہے۔ ویدک عہد میں قربانی کا مقصد صرف دنیاوی مصائب سے نجات حاصل کرنا تھا، لیکن اس عہد میں قربانی کی افادیت اس دنیا کی جگہ دوسری دنیا تک وسیع ہوگئی۔ یہ نظریہ قائم ہوگیا کہ قربانی کے ذریعہ آنے والی زندگی کو خوشگوار اور عمدہ بنایا جا سکتا ہے۔

ذات پات کی تقسیم اور برہمنوں کا تفوق

ہندوؤں میں انسانیت سوز ذات پات کا امتیاز ہے۔ جس ہندو مصلح نے اس امتیاز کو مٹانے کی سعی کی ہیں وہ ناکام و نامراد ہوا ہے کیونکہ ذات پات کا امتیاز ہندوؤں کی گھٹی میں رچا ہوا ہے۔ اس انسانیت سوز تعلیم کا سرچشمہ ان کی مذہبی کتب ہیں۔

وید میں لکھا ہے۔ برہمن پر ماتما کے منہ سے، کشتری بازوؤں سے، ویش رانوں سے اور شودر پاؤں سے پیدا ہوا۔ (رگ وید دسواں باب بھجن نمبر ۹۰ ص ۳۸ یجر وید۔ اتھر وید)

وید کے لیے برہمن، حکومت کے لیے چھتری، کاروبار کے لیے ویش اور دکھ اٹھانے کے لیے شودر پیدا کیا ہے۔ (یجر وید ۳۰:۵)

منوشاستر ہندوؤں کی قانون کی کتاب ہے۔ اب ہم اس کتاب سے حوالہ جات درج کرتے ہیں۔ جن میں مختلف ذاتوں کے فرائض اور شادی بیاہ کے مسائل درج ہیں۔

''قادر مطلق نے دنیا کی بہبودی کے لیے اپنے منہ سے اور اپنے بازوؤں سے اور اپنی رانوں سے اور اپنے پیروں سے برہمن، چھتری، ویش اور شودر کو پیدا کیا۔'' (باب اوّل :۳۱)

''اس دنیا کی حفاظت کے لیے اس نے ان میں سے ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ فرائض قرار دیے۔'' (باب اوّل ۸۷)

''برہمنوں کے لیے وید کی تعلیم اور خود اپنے اور دوسروں کے لیے دیوتاؤں کو چڑھاوے دینا اور دان لینے دینے کا فرض قرار دیا۔'' (باب اوّل ۸۸)

''چھتری کو اس نے حکم دیا کہ خلقت کی حفاظت کرے، دان دے، چڑھاوے چڑھائے، وید پڑھے اور شہوات نفسانی میں نہ پڑے۔'' (باب اوّل ۸۹)

''ویش کو اس نے یہ حکم دیا کہ مویشی کی سیوا کرے، دان دے، چڑھاوے چڑھائے تجارت، لین دین اور زراعت کرے۔'' (باب اوّل ۹۰)

''شودر کے لیے قادر مطلق نے صرف ایک ہی فرض بنایا ہے، وہ ان تینوں کی خدمت کرنا ہے۔''

(باب اوّل ۹۱)

''شاستر کا فیصلہ یہ ہے کہ جس شخص کا باپ آریہ ہو اور ماں آریہ نہ ہو وہ اپنی خصائص سے آریہ بن سکتا ہے، لیکن جس کی ماں آریہ ہو اور باپ غیر آریہ وہ کبھی آریہ بن نہیں سکتا۔'' (باب دہم ۶۷)

''جس طرح شودر اور برہمن عورت سے ایسی اولاد پیدا ہوتی ہے جو ذات سے باہر ہے، اسی طرح اگر ذات سے باہر اشخاص چاروں ذاتوں کی عورتوں سے ہم بستر ہوں تو ان کی اولاد بھی ذات سے خارج ہوگی۔'' (باب دہم ۳۰)

''جو برہمن شودر عورت کو ہم بستر کرتا ہے وہ مرنے کے بعد دوزخ میں جائے گا، اور اگر اس سے کوئی اولاد پیدا ہو تو برہمن اپنی ذات سے خارج ہو جاتا ہے۔'' (باب سوم ۱۷) [1]

برہمنوں کی عمر کے حصے

انسان کی اوسط عمر ۱۰۰ سال مان کر زندگی کو پچیس پچیس سال کے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جنھیں اشرم کہتے تھے۔ برہمن اسی طریقہ سے اپنی زندگی بسر کرتے۔

۱۔ برہمچریہ آشرم:۔ پچیس سال کی عمر تک ضبط نفس کرتے ہوئے گرو سے مذہبی تعلیم کرتے ہیں جس میں ویدوں کو حفظ کرنا اور معنی سمجھنا خاص تھا اور خاص استادوں سے مذہب کے اسرار سیکھتے ہیں۔

۲۔ گرہستھ آشرم:۔ پچاس سال کی عمر تک برہمن شادی کرتا اور خانہ داری کے فرائض ادا کرتا ہے۔ دیگر فرائض میں ویدوں کی تلاوت، دیوتاؤں کے لیے قربانیاں، آباؤ اجداد کی نذر و نیاز، مہمان نوازی، صدقہ وخیرات اور پرندوں کو کھلانا شامل تھا۔

۳۔ وَن پرستھ آشرم:۔ پچھتر سال تک وہ تارک الدنیا ہو جاتا کسی جنگل میں جا کر عبادت میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اسی دور میں ارنیک نامی مذہبی کتب کا مطالعہ کیا جاتا۔

۴۔ سنیاس آشرم:۔ بقیہ زندگی بھکشو بن کر بغیر کسی جگہ قیام کیے زندگی گزارتا ہے۔ اس دور میں بھی مذہبی غور وفکر جاری رہتا۔ دوسروں کو مذہب کی تعلیم دیتا۔ مراقبہ میں موت کی تیاری کرتا ہے۔

برہمن کا گزر اوقات

تمام ذاتوں میں برہمن طبقہ کو تفوق اور فضیلت حاصل ہے۔ ان کی گزر اوقات دوسری ذاتوں کے دان پر ہے۔ برہمن کو دان دینا ہندو کا اعلیٰ ترین فرض ہے۔ منو لکھتے ہیں۔

''کسی ایسے شخص کو دان دینا جو برہمن نہیں ہے ثواب کا موجب ہے، لیکن جو شخص اپنے کو برہمن کہے اسے دینا دونا ثواب ہے۔ پڑھے ہوئے برہمن کو دان دینے کا لاکھ مرتبہ ثواب ہوتا ہے، اور وید پڑھے

[1] ماخوذ تمدن ہند مصنفہ ڈاکٹر گستاولی بان مترجم سید علی بلگرامی ناشر مقبول اکیڈمی ص ۲۳۱، ۲۳۲۔

ہوئے برہمن کا ثواب لاانتہا ہی ہے۔"[1]

برہمنوں کے خاص حقوق

منو لکھتا ہے۔"برہمن کی پیدائش گویا شاستر کا جنم لینا ہے کیونکہ وہ شاستر پھیلانے کے لیے آیا ہے اور برہما کی نشانی ہے۔" (باب اوّل ۹۸)

"جب کوئی برہمن پیدا ہوتا ہے تو وہ دنیا میں سب سے اعلیٰ مخلوق ہے۔ وہ بادشاہ ہے کل مخلوقات کا۔ اور اس کا کام ہے شاستر کی حفاظت۔" (باب اوّل ۹۹)

"جو کچھ اس دنیا میں ہے برہمن کا مال ہے چونکہ وہ خلقت میں سب سے بڑا ہے کل چیزیں اسی کی ہیں۔" (باب اوّل ۱۰۰)

"برہمن کو اگر ضرورت ہو تو وہ کسی گناہ کے اپنے غلام شودر کا مال بہ جبر لے سکتا ہے۔ اس غصب سے اس پر کوئی جرم عائد نہیں ہوتا کیونکہ غلام صاحب جائیداد نہیں ہو سکتا۔ اس کی کل املاک مالک کا مال ہے۔" (باب ہشتم ۴۱۷)

"جس برہمن کو رگ وید یاد ہو وہ بالکل گناہ سے پاک ہے اگرچہ وہ تینوں عالم کو ناس کر دے یا کسی کا بھی کھانا کیوں نہ کھائے۔" (باب نہم ۲۶۲)

"بادشاہ کو کیسی سخت ضرورت ہو اور وہ مرتا بھی ہو، تو بھی اسے برہمنوں سے محصول نہیں لینا چاہیے اور نہ اپنے ملک کے کسی برہمن کو بھوک سے مرنے دینا چاہیے۔" (باب ہفتم ۱۳۳)

"سزائے موت کے عوض میں برہمن کا صرف سر مونڈا جائے گا لیکن اور ذات کے لوگوں کو سزائے موت دی جائے گی۔" (باب ہشتم ۳۷۹)

"راجہ کو نہیں چاہیے کہ برہمن کو کسی حالت میں بھی قتل کرے اگرچہ اس نے کتنا ہی جرم کیوں نہ کیا ہو۔ ایسے مجرم کو مال اور جان کے ساتھ ملک بدر کر دینا چاہیے۔"[2] (باب ہشتم ۳۸۰)

چھتری:۔ اس طبقہ کا کام ملک کا دفاع تھا۔ یہ طبقہ ہندو معاشرہ میں دوسرے درجہ پر تھا۔

ویش:۔ اس طبقہ کا کام زراعت، تجارت اور صنعت کو فروغ دینا تھا۔ ان کا درجہ تیسرا تھا اور ان کی زنار بندی چھتریوں کے بعد ہوتی تھی۔

ویشوں کے متعلق منو لکھتا ہے۔

"ویش کو چاہیے کہ زنار بندی اور اپنی ذات میں شادی کرنے کے بعد کاروبار میں مصروف ہو جائے اور مویشی کی نگہداشت کرے۔" (باب نہم ۳۲۶)

"اسے چاہیے کہ بیج بونے کے طریقے سے واقف ہو، اچھی بری زمین کو پہچانے اور اوزان اور

---

[1] ماخوذ از تمدن ہند ص ۲۳۳۔ [2] تمدن ہند ص ۲۳۳۔

پیمانوں کو بخوبی جانے۔" (باب نہم ۳۳۱)

"اسے مزدوروں کے نرخ سے واقف ہونا چاہیے اور مختلف زبانیں جاننا چاہیے اور مختلف قسم کے مال کی حفاظت اور اس کی خرید و فروخت سے واقف ہونا چاہیے۔" (باب نہم ۳۳۲) [1]

شودر

شودر ہندو معاشرہ کا ذلیل ترین طبقہ تھا۔ ان کے لیے مندر، سکول، کنویں اور چشمے الگ اور مخصوص ہو گئے۔ وہ اس راہ پر نہیں چل سکتے تھے جس پر کسی اعلیٰ ذات کا ہندو جا رہا ہو اور نہ اسے وہ خوراک کھانے کا حق تھا جو اعلیٰ ذات کے ہندو کھاتے تھے وہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے لیے گندے اور ادنیٰ کام کرتے تھے۔ عملاً وہ قدرت کی ہر اس نعمت سے محروم تھے جن پر اعلیٰ ذات کا ہندو اپنا پیدائشی حق جتائے۔ اس پر زندگی کے تمام دروازے بند تھے۔ نہانا دھونا ان کے لیے ناممکن ہو گیا کیونکہ کنوؤں، چشموں پر اعلیٰ ذات کا ہندو قابض تھا۔

شودر کے فرائض

منو لکھتا ہے۔ "لیکن شودر کا اعلیٰ ترین فرض یہ ہے کہ وہ وید کے ماہر گرہست برہمنوں کی، جو تقویٰ میں مشہور ہیں۔ خدمت کرے اور یہی اس کی نجات کا ذریعہ ہے۔ (باب نہم ۳۳۴)

"برہمن کی خدمت کرنا شودر کے لیے نہایت قابل تعریف بات ہے اور اس کے سوا کسی اور چیز سے اسے اور کوئی اجر نہیں مل سکتا۔" (باب دہم ۱۲۳)

"شودر کو اگر موقع ملے تو اسے نہیں چاہیے کہ مال و دولت جمع کرے کیونکہ شودر دولت جمع کر کے برہمنوں کو دکھ دیتا ہے۔" (باب دہم ۱۲۹)

شودروں پر مظالم

شودر جس عضو سے برہمن کی ہتک کرے وہی عضو اس کا کاٹ دیا جائے۔ اگر برہمن کے برابر بیٹھ جائے تو کمر پر داغ لگا کر چوتڑ کٹوا کر ملک سے باہر نکال دینا چاہیے۔" (منو ۲:۳۸۱، اتھر ۲۲:۱۹، ۲۱، ۵:۱۱:۶)

"وید سننے پر دونوں کانوں میں سیسہ ڈال دو، پڑھنے میں زبان کاٹ دو۔ یاد کرنے پر اس کے دل کو چیر دو۔" امیمانسا کی شرح میں شنکر راما مارنج اور مادھو آچاریہ نے لکھا ہے)

"شودر کو نیک صلاح نہ دینی چاہیے۔" (منو ۴:۹۷، رگوید ۸:۷۰، ۱۱:۲، ۱۲:۳ وغیرہ)

ہندو دھرم میں ذات پات ایک ایسا آہنی بندھن ہے کہ ہر ذات کا آدمی جس ذات میں جنم لیتا ہے مرتے دم تک اسی میں رہتا ہے۔ منو لکھتا ہے نیچی ذات والا اونچی ذات والے کا پیشہ اختیار کرے تو راجہ اس کی دولت چھین کر اسے ملک سے نکال دے۔" (منو ۱۰:۹۶، رگ وید ۳:۵۳)

---

[1] ماخوذ از تمدن ہند ص ۲۳۴۔۲۳۵۔

اپنی ذات میں شادی جائز ہے۔" صحیح شادیوں سے بے نقص اولاد پیدا ہوتی ہے۔ جبکہ ناقص شادیوں سے ناقص (اولاد) اس لیے چاہیے کہ (شادی کے) ناقص طریقوں سے پرہیز کیا جائے۔" (منو ۴۲:۳:۳:۱۲ا رگ وید ۱۰:۱۷:۳ نرکت ۱۳:۴)

سوامی دیانند بانی آریہ سماج لکھتے ہیں: "مسلمان و غیر مذاہب ویدک دھرم میں آئیں تو وہ جس ذات کے لائق ہوں اسی میں رہیں اور کھان پان وغیرہ معاملات بھی اپنی ذات والوں کے ساتھ کریں آریہ لوگ ان کے ساتھ یہ کام نہ کریں۔ اس میں کسی طرح کا نقصان نہیں ہوگا۔" (دستخط دیانند سرسوتی ۱۴ اپریل ۱۸۸۱ء)

مسئلہ ذات پات کے بارہ میں ہندو راہنماؤں کی رائیں

ملک کی ترقی میں صرف ذات پات ہی رکاوٹ ہے جب تک اسے جڑ سے نہیں اکھاڑا جاتا ہمارے ملک کی نجات نہیں ہوسکتی۔" (ایم۔ سی راجا ممبر اسمبلی)

"ذات پات کی تفریق ہی ہمیشہ ہندوؤں کی تباہی کا باعث رہی ہے۔" (نرائن سوامی دہلی)

"سوسائٹی کے جسم میں ذات پات گھن کے کیڑے ہیں۔" (سر ہری سنگھ ممبر اسمبلی)

"اگر ہم ہندو قوم کو دنیا میں زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے ذات پات کو دور کرنا چاہیے۔" (جنار دھن بھٹ ایم اے)

"اچھوت کہلانے والوں کی گراوٹ ہندوؤں کے لیے کلنک ہے۔" (ہر دیال سنگھ ایم اے)

"ہندو قوم کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ذات پات کا مسئلہ یقیناً تباہی کا رستہ ہے۔" (لالہ لاجپت رائے ایم اے)

"جنم سے پیدا ہوئی اونچ نیچ جھوٹی اور غلط ہے، انسان سب برابر ہیں۔" (بھائی پرمانند ایم اے)

"میرے دل کا زخم اسی دن دور ہوگا کہ جب ذات پات کی تفریق دور ہوگی۔" (رام دیو بی اے پرنسپل گورو کل کانگڑی ہردوار)

نواکھالی میں گاندھی جی نے کہا۔ "اگر ہندو دھرم نے زندہ رہنا تھا تو وہ ذات پات کے بغیر ہوتا۔" (مہاتما گاندھی)

قربانی

یجن (قربانی) ویدوں کی روح ہے۔ یہ منتروں سے بھی زیادہ قدیم ہے کیونکہ منتر ان کی بجا آوری کے لیے بنائے گئے۔ "وشنو اور اندر نے یہ وسیع جہان قربانی کے لیے بنایا۔[1] اور مخلوقات کے خداوند (پرجاپتی) نے شروع میں قربانی کو داخل کیا۔ جس کے وسیلے اس نے جہان کو بنایا۔ منو نے طوفان کے بعد کشتی سے اتر کر پہلا یہی کام کیا کہ قربانی چڑھائی۔" "قربانی جہان کے پہیے کی دُھری ہے اور ساری چیزوں کے خلق کرنے کی قوت ہے۔[2] یہ ازلی، ابدی اور عالمگیر ہے۔ دیوتا اور انسان دونوں قربانی چڑھاتے ہیں۔"[3]

---

[1] رگوید ہفتم ۴:۹۹۔ [2] رگوید اول ۳۴:۱۶۴۔ [3] رگوید دہم ۱۳۰:۹۰:۸۳۔

قربانی کی اقسام

ا۔ پھلوں وغیرہ کی قربانی۔ ۲۔ حیوانوں کی قربانی۔ ۳۔ سوم کی قربانی۔ چنانچہ بیج ومسا برہما میں یہ ذکر ہے کہ پھلوں کی قربانی سے دینداروں نے اس جہان کو فتح کیا۔ حیوانوں کی قربانی کے ذریعہ وسطی جہان کو سوم کی قربانی کے ذریعہ اعلیٰ جہان کو۔

ایک چوتھی قسم کی قربانی بھی تھی جس میں کچھ پھل پھلواری اور کچھ گوشت ہوتا تھا، یہ خانگی قربانی کہلاتی تھی۔ کہتے ہیں کہ منو نے یہ چوتھی قسم کی قربانی یعنی پاک یجن چڑھائی [1]

قربانی کے ذبح کرنے والوں کو یہ ہدایت ہوتی تھی کہ وہ جانوروں کو حتی الامکان کم تکلیف دیں۔

انسانی قربانی کا ذکر وید کے قدیم منتروں میں آیا ہے لیکن یہ انسانی قربانی عام نہیں تھی۔ رگوید کے دسویں منڈل کے نوے منتر میں پرش کا ذکر ہے، جس کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور دیوتاؤں کے آگے اس کی قربانی چڑھائی گئی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کی قربانی قدیم آریاؤں کو معلوم تھی۔

برہمنا میں انسانی قربانی کا ذکر بار بار آتا ہے۔ ''سب کچھ انسانی قربانی ہے، سب کچھ حاصل کرنے کے لیے، سب کچھ پانے کے لیے۔'' اس قربانی کے ذریعہ قربانی چڑھانے والا سب کچھ حاصل کرتا ہے۔ ''پرش نارائن ساری چیزوں پر سبقت لے گیا اور پرش میدھ کی قربانی کے ذریعہ سب کچھ ہو گیا۔ اس لیے کچھ تعجب نہیں کہ یہ کہا گیا'' بے شک انسان قربانی کے جانوروں میں سے پہلا ہے۔'' [2] ستھ پتھ برہمنا کے مطابق کیا پرن سانکانیا وہ آخری شخص تھا جس نے انسانی قربانی کے لیے مذبح کھڑا کیا۔

قربانی کے مقاصد

ا۔ دیوتاؤں کو خوش کرنا

''کاش کہ یہ قربانیاں اسے خوش کریں۔'' [3] ''کاش کہ ہم اپنی قربانی کے ذریعہ تجھے خوش کریں۔'' [4]

جس دیوتا کے لیے جانور ذبح کیا جاتا وہ دیوتا خوش ہو جاتا۔ (ستھ پتھ برہمنا اول ۹:۱:۳)

۲۔ قربانی چڑھانے والے کی خوشحالی

''کاش کہ سخی مرد ہمیشہ اقبال مند رہے جو قربانیوں اور تعریفوں کے ذریعہ ہمیشہ تجھے خوش کرتا رہتا ہے۔ کاش کہ اس کی سرگرم زندگی کے سارے دن اقبال مندی سے کٹیں اور اس کی یہ قربانی اجر پیدا کرتے۔'' [5]

۳۔ خطاؤں کا دور ہونا

---

[1] ستھ پتھ برہمنا اول ۸:۱:۷۔ [2] ستھ پتھ ہفتم ۲:۱:۱۸۔
[3] رگوید اول۔ [4] رگوید ہشتم ۱۹:۲۰۔ [5] رگ وید چہارم ۴:۱۷۔

جب قربانی کے جانور کو آگ کے لیے تیار کیا جاتا تو اس کو ان الفاظ سے مخاطب کیا جاتا: ”جو خطائیں دیوتاؤں سے سرزد ہوئیں تو ان کو دور کرتا ہے۔ جو خطائیں تیروں سے سرزد ہوئیں تو ان کو دور کرتا ہے۔ جو خطائیں ہم سے ہوئیں تو ان کو دور کرتا ہے۔ جو خطائیں ہم سے دن کو یا رات کو سرزد ہوئیں تو ان کو دور کرتا ہے جو خطائیں سوتے یا جاگتے سرزد ہوئیں تو ان کو دور کرتا ہے جو خطائیں ہم سے دانستہ یا نادانستہ سرزد ہوئیں تو ان کو دور کرتا ہے تو گناہ کا دور کرنے والا ہے۔“[1]

۴۔ مشکلات اور مصائب سے بچنا

”گناہ آلودہ نہیں کرتا، مشکلات حملہ نہیں کرتیں، نہ مصیبتیں اس شخص کو دکھ دیتی ہیں جس کی قربانی پر اندر اور وُرن حاضر ہوتے ہیں۔“[2]

قربانی کی اقسام

ویدوں کی قربانیاں دو قسم کی تھیں۔

۱۔ نتیا یعنی دائمی قربانیاں۔ یہ لازمی ہوتی تھیں۔ خاص اوقات اور موقع پر ان کو چڑھانا فرض تھا۔

۲۔ انتیا یعنی اختیاری قربانیاں۔ چڑھانے والے کی مرضی پر موقوف تھیں۔ کسی منت کے لیے یا کسی خواہش کے پورا ہونے پر۔

رگوید میں ذکر ہے کہ دن میں تین دفعہ دعائیں اور قربانیاں ادا کی جاتی تھیں۔ صبح، دوپہر اور تیسرے پہر کو۔ (رگوید سوئم ۲۸)

اسلام میں قربانی کا تصور

اسلام نے انسانی قربانی کو بالکل موقوف کر دیا اور صرف جانور کی قربانی کو جائز قرار دیا۔

قربانی قربان سے مشتق ہے۔ لغت میں قربانی کے یہ معنی ہیں۔ **قرب الشی قربانا** یہ چیز خوب قریب ہوئی۔

القربان بالضم ما قرب الی اللہ۔ قربان ضمہ (پیش) کے ساتھ جو اللہ کی طرف نزدیک کرے۔ **وما تقرب** بہ اور قربانی وہ ہے جس کے ذریعہ اللہ کے نزدیک ہو۔ **القربان جلیس الملک و خاصۃ** قربان بادشاہ کا جلیس اور اس کا خاص۔ **ومنہ الصلوۃ قربان کل تقی** اسی محاورہ پر ہے کہ نماز ہر ایک متقی کے لیے قربان ہے۔

لغوی تشریح سے قربانی کا فلسفہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی قربانی وہ عمل ہے جس کے ذریعہ انسان اللہ کا قرب حاصل کرتا ہے۔

---

[1] تانڈیا برہمنا۔ [2] رگ وید ہفتم ۸۲:۷۔

اسلامی نقطہ نگاہ سے قربانی صرف کسی جانور کو ذبح کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ خواہشات نفسانی کی سرکش اونٹنی کو ذبح کرنے کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں قربانی کے فلسفہ کو اس آیت کریمہ میں بیان کیا ہے۔ لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوٰى مِنكُمْ (الحج ۲۲:۳۷) یعنی اللہ تعالیٰ کو جانور کا گوشت اور اس کا خون نہیں پہنچتا بلکہ اللہ تعالیٰ کو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے اور تقویٰ احکام الٰہی کے تابع زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔

پس اسلام میں قربانی کا یہ تصور ہے کہ جس طرح جانور انسان کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ دیتا ہے اور اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں رہتا۔ اسی طرح انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع اپنی زندگی بسر کرے اور انسان اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع بنا لے۔

دعا یا تعریف

دنیا کے ہر مذہب میں دعا کا سراغ ملتا ہے۔ چنانچہ ویدوں میں بھی دیوتاؤں سے دعائیں مانگی گئی ہیں۔

"ان کے ذریعہ وہ اپنے سارے زبردست دشمن پر غالب آتا ہے۔"[۱]

"دعا اور تعریف کے ذریعہ دیوتا خوش ہو جاتے ہیں اور ان کی قوت بڑھ جاتی ہے۔"[۲]

"قابل پرستش اگنی کی بڑائی اپنے پرستاروں کے گیتوں، دعاؤں اور تعریفوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔"[۳]

ایک رشی نے ورن کو مخاطب کر کے یوں کہا: "اے ورن تجھے خوش کرنے کے لیے ہم تیرے من کو منتروں سے باندھتے ہیں، جیسے گاڑی والا تھکے ہوئے گھوڑے کو۔" پھر ایک اور رشی نے یہ کہا کہ "دعا سب سے زیادہ سلاح ہے۔"[۴]

دعا کے مقاصد

ا۔ گناہوں کی معافی

گناہوں کی معافی کے لیے دیوتاؤں سے دعائیں کی گئیں: "اے ورن اگر ہم نے اپنے کسی مربی یا دوست یا رفیق یا بھائی کی یا ہمسایہ یا گونگے شخص کا قصور کیا ہے تو تو اے ورن اس کو ہم سے دور کر دے۔ اگر قمار بازوں کی طرح جو کھیل میں دھوکا دیتے ہیں ہم نے دانستہ یا نادانستہ قصور کیا تو تو اے ورن ان سے ہم کو مخلصی دے جیسے کسی بندھوے کو آزاد کر دیتے ہیں تاکہ اے ورن ہم تجھے عزیز ٹھہریں۔"[۵]

۱۔ گوید دوہم ۷:۴۷ ہفتم ۳۱:۱۲۔
۲۔ رگوید ہشتم ۱۲:۱۹،۲۲۔
۳۔ رگوید سوم ۵:۲۔
۴۔ رگوید ششم ۷۵:۱۹۔
۵۔ رگوید پنجم ۸۵:۷،۸۔

۲۔ مادی ضروریات کے لیے

ویدوں میں اور بھی دعائیں ہیں جو فصلوں کی عمدگی، مویشیوں کی بہتات، گوؤں کو دودھیل ہونا، دشمنوں کے ہاتھ سے فصلوں کو بچانا، بارشوں کا بروقت ہونا سے متعلق ہیں۔

قرآن میں دُعا کی تعلیم

اسلام کی روح ہی دُعا ہے کیونکہ دعا کے ذریعہ ہی انسان اللہ تعالیٰ کی ہستی پر کامل بصیرت حاصل کرتا ہے اور حق الیقین کے مقام تک پہنچتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

اُدْعُوْنِی اَسْتَجِبْ لَکُمْ یعنی مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔

قرآن مجید نے ویدوں کی تعلیم کے خلاف صرف اللہ تعالیٰ سے ہی دعا مانگنے کی تعلیم دی ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلَالٍ (الرعد ۱۴) یعنی دعا کرنے کے لائق وہی سچا خدا ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور جو لوگ اس کے سوا غیر کو پکارتے ہیں وہ کچھ بھی ان کو جواب نہیں دے سکتے۔ ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کوئی پانی کی طرف ہاتھ پھیلا دے تا کہ اس کے منہ تک پہنچ جائے لیکن وہ پانی اس کے منہ تک نہیں پہنچ سکے گا جو لوگ اللہ کے سوا اوروں سے دعا کرنے والے ہیں۔ وہ اللہ سے بالکل بے خبر ہیں، ان کی تمام دعائیں باطل ہیں۔

قرآن مجید نے دعا کے قبول ہونے کے لیے تین شرطیں بیان کی ہیں۔

۱۔ دعا صرف خدا سے کی جائے۔ — اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ

۲۔ خدائی احکام پر عمل کیا جائے۔ — فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ

۳۔ خدا پر صحیح ایمان ہو۔ — وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ (البقرہ ۲:۱۸۶)

دو رزمیہ نظمیں

ہندو حماسہ سرائی کی دو مشہور و معروف نظمیں مہابھارت اور رامائن ہیں۔ یہ دونوں نظمیں اس دور کی آریائی تہذیب کی تاریخ ہیں۔

اس بات میں شدید اختلاف ہے کہ ان میں سے کون سی کتاب قدیم ہے۔ اکثر فضلاء کا یہ خیال ہے کہ مہابھارت رامائن سے ایک صدی پہلے تصنیف ہوئی۔

مہابھارت

زمانہ تالیف: ہندو لٹریچر میں مہابھارت سب سے طویل تالیف ہے ان میں دو لاکھ پندرہ ہزار

اشعار ہیں۔ اگر جلدوں میں اس کو تقسیم کیا جائے تو پانچ پانچ سو صفحات پر مشتمل پندرہ جلدیں ہوں گی۔ ان کے مصنف مختلف زمانوں میں مختلف ہوئے ہیں، اس کا ایک مؤلف نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس کا زمانہ تالیف معین کرنا مشکل ہے۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں آخری الحاق اور اضافہ تیسری صدی عیسوی کے بعد کا ہے۔

مہابھارت کی کہانی

لفظ مہابھارت کے معنی خاندان بھارت کی تاریخ کے ہیں۔ اس تالیف میں کوروؤں اور پانڈوں کی باہمی جنگ کا ذکر ہے۔ ہستناپور جو دہلی کے قریب تھا اس میں چندر بنسی خاندان کے دو گھرانے کورو اور پانڈو بستے تھے۔ کورو سو بھائی تھے جن کا رئیس دریودھن تھا۔ یہ سب دھرت راشٹر کے بیٹے تھے۔ پانڈو کے پانچ بیٹے تھے۔ یودھشٹر، بھیم، ارجن، نکل اور سہدیو (جو پانڈو کہلائے) پانڈو ہستناپور کا راجہ تھا، لیکن وہ جلد ہی راہی ملک بقا ہوا اور بڑے بیٹے نابینا یودھشٹر کے ہاتھ میں عنان حکومت آئی۔ کوروؤں اور پانڈوؤں میں پرانی رقابت چلی آ رہی تھی۔ پانڈو کو دارالحکومت سے نکال دیا گیا۔ تمام ملک میں پھرتے رہے اور مختلف قبائل سے استمداد کرتے رہے۔ ایک بھائی نے پنچال کے راجہ کی لڑکی دروپدی کو بہت سے رتھوں کے بیچ میں سے کمان کو ختم کر کے جیت لیا اور وہ پانچوں بھائیوں کی مشترک بیوی بن گئی۔

جلاوطنی سے لوٹ کر پانڈوؤں نے ایک الگ شہر آباد کیا۔ دریودھن کی آتش رقابت بھڑک اٹھی اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے لیے جوا کھیلنے کی سکیم سوچی۔ جوئے کی بازی میں پانڈو اپنی سلطنت، مال و دولت وغیرہ ہار گئے۔ حتیٰ کہ دروپدی کو بھی ہار گئے۔ پھر ان کو اپنے شہر سے نکلنا پڑا چونکہ جوئے کی بازی میں ان سے دھوکا ہوا تھا اور ان کی بیوی دروپدی کو بھرے مجمع میں ذلیل و خوار کیا گیا تھا۔ سب بھائی مفلسی کی حالت میں دروپدی کو لے کر صحراؤں میں پھرنے گھومنے لگے۔ بھیم نے یہ عہد کیا کہ وہ کورو شاہزادوں کا خون پی کر اپنی آتش غضب کو بجھائے گا۔ فریقین اپنے اپنے حلیف اور مددگار تلاش کرتے ہیں۔ آخر کار دہلی کے قریب کورکشیتر کے میدان میں اٹھارہ دن کی خون ریز لڑائی میں تمام کورو شہزادے مارے گئے۔ یودھشٹر نے کورو دیش کا تخت حاصل کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس جنگ میں ہندوستان کے تمام راجے شریک ہوئے تھے اور اس نے ہند قدیم کے تمدن کو تباہ کر دیا۔ دراصل یہ بھارت اور پنچالہ قوموں کے درمیان ایک جنگ تھی۔ جن کا زمانہ ۵۰۰ اور ۱۰۰۰ کے درمیان مانا جاتا ہے۔

مہابھارت کا مذہبی مقام

ہندو لٹریچر میں مہابھارت کا بہت بلند مقام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دیوتاؤں کے سامنے چاروں ویدوں کو ایک پلو میں اور مہابھارت کو دوسرے پلو میں رکھا گیا اور فیصلہ یہ ہوا کہ مہابھارت کا پلہ بھاری ہے۔ ہندوؤں کا یہ نظریہ ہے کہ جو کوئی اس کتاب کا ایک حصہ بھی پڑھ لے تو اس کے تمام گناہ دُھل جاتے ہیں۔ یہ

بھی کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب آسمان پر تالیف ہوئی اور اس کو انسانی ضابطہ حیات کے طور پر زمین پر بھیجا گیا۔

رامائن

رامائن کئی صدی قبل مسیح تالیف ہوئی۔ اس میں چوبیس ہزار اشعار ہیں جو سات حصوں میں منقسم ہیں۔ دوسرے حصے سے لے کر چھٹے حصہ تک راجہ چندر جی کو ایک بہادر انسان کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق رامائن کے مصنف وشنو ہیں۔ تمام مورخین کے مطابق یہ حصے والمیکی کے تصنیف کردہ ہیں۔ جن کا زمانہ کم از کم چھٹی صدی ق۔م تھا۔ پہلے اور ساتویں حصے میں رام چندر جی کو خدا (وشنو) کا اوتار مانا ہے۔ انھیں غالباً بعض دوسرے مصنفین نے دوسری صدی ق۔م میں اضافہ کیا۔ رامائن مغربی بنگال اور بہار کی مذہبی روایات کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس کے دوسرے حصہ کی روایات جنوبی ہند میں برہمنیت کی توسیع اور اشاعت کے متعلق ہیں۔

ہندوؤں میں اس کتاب کا پڑھنا ثواب کا موجب ہے۔ جو لوگ سنسکرت سے نابلد ہیں وہ ہندی میں رامائن پڑھتے ہیں۔ جسے گوشائیں تلسی داس جی نے اکبر کے دور میں لکھا گیا۔ اس کا پورا نام رام چرتر مانس ہے۔

رامائن کی کہانی

رامائن میں سری رام چندر جی کی ان لڑائیوں کا ذکر ہے جو انھوں نے لنکا کے راکشس بادشاہ راوَن سے اپنی بیوی سیتا جی کو چھڑانے کے لیے لڑی تھیں۔

اجودھیا کے راجہ دسرتھ کی تین بیویاں تھیں۔ کوشلیا، کیکئی اور سمترا، کوشلیا سے رام چندر جی، کیکئی سے بھرت اور سمترا سے لکشمن اور شترو گھن پیدا ہوئے۔ رام چندر جی کی شادی متھلا کے راجہ جنک کی لڑکی سیتا جی سے ہوئی چونکہ رام چندر جی سب سے بڑے اور ذہین اور رموز سلطنت سے واقف شہزادے تھے۔ اس لیے راجہ دسرتھ نے اسے اپنا ولی عہد بنالیا گیا۔ رام چندر جی کو اپنی سوتیلی ماں کیکئی کی سازشوں کی بنا پر جلاوطن ہونا پڑا اور کیکئی نے اپنے خاوند دسرتھ سے اپنے بیٹے بھرت کے لیے تخت حاصل کر لیا۔ رام چندر جی اپنے بھائی لکشمن اور اپنی بیوی سیتا کو لے کر جنگل میں چلے گئے۔ وہاں راون کی بہن روپ نکھا تھی، وہ رام چندر جی پر عاشق ہوگئی اور سیتا جی کو تباہ و برباد کرنے کا ارادہ کیا لیکن رام چندر جی اور لکشمن نے اسے دور کیا اور اس کی ناک اور کان کاٹ لیے۔ آتش انتقام کو بجھانے کے لیے چالیس ہزار راکشسوں کی فوج رام چندر جی پر لے آئی لیکن رام چندر جی کے مقابل پر ناکام و نامراد رہی۔ تب وہ اپنے بھائی راون کے پاس گئی اور سیتا کو اٹھا لے جانے کی خواہش کی۔ راون سیتا کو اٹھا لے گیا۔ رام نے ہنومان کی مدد سے اسے آزاد کرایا اور راون کو شکست دی۔ آج بھی اس واقعہ کی یاد میں دسہرے کا تہوار منایا جاتا ہے۔

رامائن کی اہمیت

رامائن کی اہمیت کے کئی پہلو ہیں۔ رامائن اور مہابھارت رزمیہ دور کا کہلاتا ہے۔ یہ دور ۵۰۰ ق۔م کے لگ بھگ سے لے کر ۲۰۰ عیسوی تک کا ہے۔ حقیقت میں یہ دور برہمنی مت کی نشاۃ ثانیہ کا دور ہے۔ یہ دور مذہبی، معاشرتی اور سیاسی خصوصیات کے لحاظ سے ویدک دور سے مختلف نظر آتا ہے۔

مذہبی اہمیت (نئے دیوتاؤں کا ابھرنا)

رامائن میں ہندومت کے اہم مسلک مثلاً وشنومت، شیومت اور شکتی مت نیز ہندومت کی مشہور دیوی دیوتاؤں کا تذکرہ ملتا ہے۔ گو یہ مذہبی رجحانات پہلے سے ہی ہندوستان میں موجود تھے لیکن ویدک ادب میں اس انداز اور شکل میں نہیں ملتے جس طرح رامائن میں سامنے آتے ہیں۔ ویدک دھرم میں اندر (بجلی اور طوفان کا دیوتا) اگنی (آگ) سوریہ (سورج) سوم (سوم کا پودا) وایو (ہوا) وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں لیکن رامائن میں کچھ نئے دیوی دیوتا مذہبی زندگی پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان نئے دیوی دیوتاؤں میں برہما، شیو، وشنو اور ایک دیوی ماں بہت اہمیت رکھتے ہیں (برہما وشنو اور شیو کو تری مورتی (تثلیث) کا نام دیا جاتا ہے۔

گو برہما اور وشنو اور شیو ویدوں، میں مذکور ہیں۔ لیکن ان کو نمایاں حیثیت نہیں دی گئی۔ رامائن میں ان کی حیثیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ برہما کائنات کی تخلیق کا ذمہ دار ہے اور وشنو کائنات کی بقا اور پرورش کا ذمہ دار ہے۔ شیو تباہی اور بربادی کا دیوتا ہے۔ انہی تینوں دیوتاؤں کے نام پر ہندو دھرم میں تین مسلک قائم ہو گئے ہیں۔ برہما مسلک، وشنو مسلک اور شیو مسلک۔ اسی طرح ایک دیوی ماں کی حیثیت سے بھی نمایاں ہے۔ اس کو مذہبی تصور کا درجہ حاصل ہو گیا۔ دیوی ماں کے مظاہر میں شیو کی بیوی پاربتی شیو کی شکتی کالی اور تانترک فرقہ کی دیوی بھراویں کی حیثیت کافی اہم ہیں۔

رامائن میں نئے ابھرنے والے دیوتا سے اپنے ماننے والوں کے لیے خدائے واحد کا درجہ رکھتے ہیں۔ اگرچہ کسی ایک دیوتا کے ماننے والے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ دوسرے دیوتاؤں کا انکار کرے لیکن یہ ضروری ہے اس کی مذہبی عقیدت کا مرکز اس کا اپنا ہی دیوتا ہو اور دوسروں کو اپنے دیوتا کے ماتحت تسلیم کرے یا ان کو اپنے دیوتا کا مختلف مظاہر مانے اور مکتی کی تمام امیدیں اپنے دیوتا سے وابستہ رکھے۔ یہی ہلکا سا موحدانہ رجحان بعد کے ادوار میں کبھی کبھی زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ دور حاضر کے ہندو مذہب کی بنیاد درحقیقت انہی مذہبی رجحانات اور رسوم پر ہے جو رزمیہ نظموں کے زمانے میں ابھرے تھے۔

ب۔ یگیہ (قربانی) کا خاتمہ

ویدک دھرم میں یگیہ (قربانی) کو خاص اہمیت حاصل تھی لیکن رزمیہ نظموں سے نئے ابھرنے والے مذہبی تصور میں بالکل ختم ہو گئی بلکہ وشنومت میں مذہبی رسم قربانی کی مخالفت پائی جاتی بلکہ اس کی جگہ

پوجا کو مذہبی رسم کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔[1]

ج۔ نئے دیوتاؤں کا نمایاں ہونا

ویدوں کا بڑا حصہ دیوتاؤں کی حمد و ثنا کے گیتوں پر مشتمل ہے لیکن باوجودیکہ ویدک دور کے دیوتاؤں کی شخصیتیں اوران کے کردار کی تصویریں مدھم نظر آتی ہیں۔ اس کے برخلاف رامائن میں اُبھرتے ہوئے دیوتا واضح اور مکمل شخصیتوں کے مالک ہیں اوران کے کردار کے نقوش گہرے ہیں۔

رامائن میں نئے ابھرتے ہوئے دیوتاؤں کے نام پر مختلف فرقے وجود میں آ گئے جن سے نئے خیالات اعتقادات اورنئی سوچ سامنے آئی۔

معاشرتی اہمیت

جب دسرتھ نے اپنے بیٹے شری رام چندر کو ولی عہد بنانے کا ارادہ کرلیا اور ولی عہد کی نامزدگی کے اظہار کے لیے جشن کی تیاری ہونے لگی تو بادشاہ کے وزراء نے بھرت کی والدہ کیکئی کو رام چندر کی نامزدگی رکوانے کے لیے استعمال کیا۔ اس کی وجہ رام چندر کی عوام میں مقبولیت تھی۔ جب ایک منصف عادل رحم دل عوام دوست حکمران تخت نشین ہوتا ہے تو وزراء کا عوام پر دبدبہ ختم ہو جاتا ہے۔ وزراء نے اپنے وقار اور رعب کا خاتمہ محسوس کرتے ہوئے بھرت کی والدہ کو یہ بات بھائی کہ اگر شری رام چندر جی بادشاہ بن گئے تو ان کا بیٹا حکمرانی سے بالکل محروم ہو جائے گا۔ اپنے بیٹے کی جانشینی کی راہ ہموار کرنے کے لیے رام چندر جی کی ولی عہدی کی نامزدگی کو رکوائیں۔ اس وجہ سے کیکئی وزراء کی سازش کا شکار ہوگئی۔ وزراء کو علم تھا کہ کیکئی نے بادشاہ سے وعدہ لیا ہوا ہے کہ وہ جو کچھ کہے گی وہ اسے مان لے گا۔ چنانچہ اس سازش کے تحت بادشاہ سے کیکئی نے رام چندر جی کی بن باسی اوراپنے بیٹے بھرت کی ولی عہدی کا وعدہ لے لیا۔ یہ واقعہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ بادشاہوں کے درباروں اوران کے حرم سراؤں میں کس قسم کی سازشیں ہوتی رہتی ہیں۔

ب۔ بچے کی فرمانبرداری

جب بادل نخواستہ بادشاہ دسرتھ نے کیکئی سے بھرت کو ولی عہد بنانے اور رام چندر جی کو بن باس کرنے کا وعدہ کرلیا تو بادشاہ غم سے بار بار بے ہوش ہوتا جارہا تھا۔ رام نے اپنے باپ کو اس دکھ اور الم میں دیکھ کر کہا اے والد! میں آپ کے فیصلہ کے مطابق چودہ سال جنگل میں بن باس لینے کے لیے تیار ہوں اور آپ کے فیصلہ کے سامنے کسی قسم کے اقتدار کو ہیچ سمجھتا ہوں۔ میں اپنے باپ کو دکھ اور تکلیف میں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ رام چندر لکشمن اور سیتا جی خوشی سے جنگل میں بن باس لینے کے لیے نکل پڑتے ہیں۔

---

[1] دی ہندو ریلیجس ٹریڈیشن مصنفہ تھامس جے ہاپکنس صفحہ ۱۱۰۔

ج۔ بھائی کا بھائی سے سلوک

رام چندر جی کی جنگل کی طرف روانگی سے پہلے بھرت اور شتروگھن بہت دور اپنے ماموں کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں ہی بادشاہ دسرتھ انتقال پا گیا تھا۔ اخری رسوم ادا کرنے کے لیے بھرت اور شتروگھن کو راجدھانی میں بلانے کے لیے آدمی بھیجے گئے وہ آئے تو معلوم ہوا کہ دسرتھ وفات پا چکا ہے اور اس کی والدہ کیکئی کے اصرار پر اس کو ولی عہد بنالیا گیا ہے اور رام جی کو چودہ سال کے لیے بن باس دیا گیا ہے۔ بھرت کو اس سازش کا علم ہوا تو وہ غم زدہ ہوا۔ والدہ نے حوصلہ دیا اور سمجھایا بجھایا لیکن بھرت نے اپنی والدہ کے اس فعل کو ناپسند کرتے ہوئے اخری رسوم کی ادائیگی کے بعد جنگل میں جانے کا اور رام کو واپس لانے کا ارادہ کر لیا ہے بھرت کا یہ عمل یہ معاشرتی سبق دیتا ہے کہ بھائیوں کو آپس میں کس طرح رہنا چاہیے آخر کار بادشاہ کی آخری رسوم کی ادائیگی کے بعد بھرت اپنی تاج پوشی سے انکار کرتے ہوئے اور فوجی دستہ لے کر رام کی تلاش میں نکل پڑا اور چیتر کوٹ میں دونوں بھائیوں کی ملاقات ہوئی۔ بھرت نے اپنے بھائی رام کو بتایا کہ وہ ان کو لینے کے لیے آیا ہے۔ رام نے کہا کہ وہ اپنے وعدہ کے مطابق چودہ سال بن باسی میں گزارے گا۔ آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ بھرت رام کے نائب کی حیثیت سے حکمرانی کرے گا۔

د۔ مظلوموں کی مدد

رامائن کے عہد میں ہندو ریاضت کے لیے جنگلوں اور ویرانوں میں چلے جاتے تھے۔ وہیں چلے کاٹتے اور عبادت الٰہی میں مصروف رہتے۔ ڈنڈک ایک جنگل تھا۔ جہاں رشیوں نے اشرم بنا رکھے تھے۔ اس علاقے میں راکشس (لٹیرے بدمعاش) بھی تھے جو رشیوں کو تنگ کرتے تھے۔ رام نے ان سے یہ وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اور ان کا بھائی لکشمن ان کی حفاظت کرے گا۔ رام عارضی طور پر ایک رشی آستیہ سے اشیرباد حاصل کرنے گئے۔ آگستیہ نے رام کو وہیں رہائش اختیار کرنے کو کہا لیکن رام نے کہا کہ انھوں نے ڈنڈک کے رشیوں سے ان کی حفاظت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اس لیے وہ ڈنڈک کے جنگل میں ضرور جائے گا۔ چنانچہ رام واپس ڈنڈک کے جنگل میں آ گئے سیتا نے رام سے کہا کہ اس نے رشیوں کی حفاظت کی ذمہ لے کر غلطی کی ہے کیونکہ سنیاس لینے کے بعد کسی کا خون بہانا سنیاسی کے اصول کے منافی ہے چاہے یہ راکشسوں کا کیوں نہ ہو۔ رام نے کہا کہ کھشتر کا یہ فرض ہے کہ وہ مظلوم کی مدد کرے۔ آپ نے سیتا کو مخاطب ہو کر کہا کہ دیکھو جنگل میں ہڈیوں کے ڈھیر ہیں اور بکھری پڑی ہیں۔ یہ راکشسوں نے رشیوں کو مارا ہے یہ ان کے جسموں کی ہڈیاں ہیں۔ ان عبادت گزاروں کی حفاظت کرنا ایک مذہبی فرض ہے۔ وہ ان رشیوں کو راکشسوں کے قتل و غارت سے ضرور بچائے گا۔

اسی طرح رامائن میں ایک اور مظلوم کردار سا گریو ہے وہ اپنے بھائی بالی سے جان بچا کر رشد

سوک پہاڑی پر (دکن میں دریائے پمپا کے کنارے ایک پہاڑی ہے) رہائش اختیار کر لی۔ رام سیتا کی معلومات حاصل کرنے کے لیے اس پہاڑی پر گیا۔ ساگریو کا وزیر اس ساتھ رہائش پذیر تھا۔ چنانچہ رام اور لکشمن دونوں بھائی ساگریو کے پاس پہنچے اور تبادلہ خیالات ہوا۔ ساگریو نے سیتا کی نشان دہی کی۔ رام نے ساگریو سے وعدہ کیا وہ بالی کو ختم کر کے اسے کش کندھویہ کے تخت پر بٹھائے گا۔ چنانچہ ساگریو کو رام نے کہا کہ جا کر اپنے بھائی بالی سے مبارزت کرے۔ وہ اس کی مدد میں آ کر بالی کو قتل کر دیں گے۔ چنانچہ ساگریو نے بالی سے مبارزت کی۔ جب بالی ساگریو پر غلبہ حاصل کرنے والا ہی تھا۔ رام نے بالی کے سینے میں تیر مارا جس سے وہ زخمی ہو کر زمین پر گر پڑا اور جان دے دی۔ چنانچہ رام کی مدد سے ساگریو سلطنت کا ملک بن گیا۔ اسی ساگریو نے ہنومان کے ساتھ رام کی مدد کرتے ہوئے لنکا پر حملہ کیا۔

تاریخی اہمیت

راماَئن ہندو دیو مالا (میتھ) ہونے کے ساتھ ایک تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ راماَئن ہی شری رام کے بچپن ایودھیا کے بادشاہ دسرتھ کے واقعات اور شری رام کی جلاوطنی، شری رام اور ستیا کے اغوا، شری رام کے اپنے اتحادیوں اور حلیفوں کے ہمراہ لنکا پہنچنا راون اور رام کے درمیان جنگ اور راون کی شکست اس کے بعد جلاوطنی کاٹ کر رام کا ایودھیا دوبارہ آنا اور سیتا کی دوبارہ ملاپ کی کہانی اس کے ساتھ ہندوستان کے بعض حکمرانوں مثلاً متھلا کا بادشاہ جنک (اسی بادشاہ کی بیٹی سیتا کی شادی رام کے ساتھ ہوگئی تھی) بھرت اور شتروگھن کے ماموں بادشاہ کیکہ اور اس کے بیٹے بدھ اجیت، شکاری بادشاہ گوتا، کش کندھویہ کے حکمران بالی اور اس کے بھائی سوگریو، لنکا حکمران راون کے حالات پر روشنی ڈالتی ہے۔ اسی طرح راماَئن میں تاریخی شہروں، جنگلوں، دریاؤں، پہاڑوں کے اکثر نام آتے ہیں۔

سیاسی اہمیت

راماَئن اپنے دور کے سیاسی پہلو کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ ہندوستان چھوٹی چھوٹی مختلف ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ شاہی دور تھا۔ بعض حکمران خدا ترس اور منصف مزاج تھے مثلاً متھلا کا بادشاہ جنک بادشاہ کیکہ (موجودہ پنجاب کے مغرب میں کہیں واقع تھا) شکاری بادشاہ گوتا (جس نے اپنے تمام شکوک دور کر کے بھرت کو رام سے ملاقات کرنے کی اجازت دی) اور بعض حکمران ظالم اور غاصب تھے۔ مثلاً کش کندھویہ کا حکمران بالی اور لنکا کے حکمران راون کی تباہی کی حالت پر روشنی ڈالتی ہے۔ اسی طرح یہ کتاب آریائی معاشرہ کی حالت کو بیان کرتی ہے۔

ڈاکٹر مہتا کے الفاظ میں رام چندر کی تصویر زندگی کے لافانی نقوش کی انوکھی ترتیب ہے جسے راماَئن کہا جاتا ہے جو درحقیقت تمام آریائی معاشرہ کے متعلق تاریخ کی ایک بے مثال روشنی ہے۔ جس سے

رزمیہ کی عمرانی، سیاسی اور مذہبی کیفیات وقت کے اندھیروں میں روپوش ہونے کے بجائے صاف طور پر عیاں ہوتی نظر آتی ہیں نیز اس سے دراوڑ تہذیب کی امتیازی خصوصیات کا پتہ چلتا ہے۔

پروفیسر کے۔ایل نرائن رامائن کی تاریخ اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔"رامائن آریا لوگوں کی دکن تک بڑھتے ہوئے چلے جانے کی حقیقت کا اولین ریکارڈ ہے۔"

دفاعی نظام کے لحاظ سے اہمیت

شری رام چندر اور راون کے مابین لڑائی اس دور کے حربی اسلحہ اور دفاعی نظام پر روشنی ڈالتی ہے۔ راون نے اپنے ملک لنکا کو کس طرح قلعوں اور حربی اسلحہ سے محفوظ کیا ہوا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ حکمران لڑائی کے دوران اپنے وزراء اور مشیروں کے ساتھ صلح مشورے کرتے تھے۔ راون نے رام کے حملے کے وقت اپنے بیٹے بھائی اور وزراء مشیروں سے باقاعدہ مشورے کیے۔ بعض نے یہ مشورہ دیا کہ لڑائی نہ کی جائے بلکہ سیتا کو واپس دے دیا جائے اور بعض نے جنگ کرنے کا مشورہ دیا۔ آخرکار راون لڑائی کی ٹھانی اور ذلت آمیز شکست کھائی۔

رامائن کا فلسفہ

دور بعید میں جو بھی دیومالائی ادب ہو یا لوک داستانیں جو منصۂ شہود پر آئیں۔ ان میں عوام کے لیے ایک سبق اور فلسفہ ہوتا تھا۔ رامائن میں یہ فلسفہ ہے کہ نیکی اور برائی ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار چلی آ رہی ہیں اور انجام کار نیکی غالب آتی ہے۔ رام اور اس کے ساتھی نیکی کی علامت ہے اور راون اور اس کے ساتھی برائی کی۔ نیکی کے رستہ پر چلنے والوں کو یہ سبق دیا گیا ہے وہ اس راستہ پر پُرعزم ہو کر چلتے چلے جائیں۔ مصائب مشکلات پیش آئیں گی اور بعض لمحات ایسے بھی آئیں گے۔ یوں معلوم ہوگا کہ نیکی شکست کھا رہی ہے اور برائی غلبہ حاصل کر رہی ہے لیکن استقلال اور ثابت قدمی سے راہ حق پر گامزن رہنے سے نیکی غالب آ جائے گی اور برائی مٹ جائے گی۔

ہندوؤں کے نزدیک رام چندر جی نیکی شرافت اور فرزندانہ اطاعت میں ایک مثالی انسان ہیں اور رام راج ایک مثالی حکومت کا نمونہ ہے۔ سیتا اطاعت شوہر کی بناء پر ایک مثالی بیوی، لکشمن وفادار بھائی، بھرت ہوس اقتدار سے بے نیازی اور ہنومان اطاعت گزاری کی علامت ہیں۔

اپنشد

موضوع

اپنشد کا موضوع روح (اتمن) خدا (برہمن) اور نیچر ہے۔

مقام

ویدوں کے بعد دوسرے درجہ کی کتابیں اپنشد ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک ان کا درجہ ویدوں سے بڑھا ہوا ہے۔[1] خود اپنشدوں کو بھی ویدوں پر فضیلت کا ادعا ہے۔[2] اپنشد کے معنی ہیں قریب بیٹھنا، ذہین شاگرد معلم کے نزدیک بیٹھتے تھے۔ وہ ان کے سامنے فلسفہ اور راز داری کے خطبات بیان کرتے تھے۔ یہ وہ فلسفیانہ خطبات ہیں جو گروؤں نے اپنے ہونہار ذہین وفطین شاگردوں کو دیے تھے۔ یہ خطبات ۸۰۰ ق۔م اور ۵۰۰ ق۔م کے مابین مرتب ہوئے۔ ان میں ۱۱۲ خطبے ہیں لیکن ان میں سے زیادہ بعد کے زمانہ میں الحاقی ہیں اصل غیر متنازعہ قدیم اپنشد ۱۲ ہیں۔ ڈاکٹر ایس این داس گپتا نے ۱۳ کو قدیم مانا ہے (تاریخ ہندی فلسفہ جلد اوّل ص ۴۲ (انگریزی اردو ترجمہ رائے شیو موہن لعل ماتھر) غیر متنازعہ اپنشد یہ ہیں۔ ۱۔ ایش ۲۔ کین ۳۔ کٹھ ۔ ۴۔ پرش ۔ ۵۔ منڈک ۔ ۶۔ مانڈوکیہ۔ ۷۔ تیتریہ۔ ۸۔ انیتر یہ۔ ۹۔ چھاندوگیہ۔ ۱۰۔ برہدارنیک ۔ ۱۱۔ شویتا شوتر۔ ۱۲۔ کاوشتکی ۔ جو مختلف استادوں کے بیان کردہ ہیں۔ سب سے بڑا یجنوالکی (Yajnavalkya) مردوں میں اور گرگی (Gargi) عورتوں میں ہوئے ہیں۔

یجنوالکی نے دنیا کے مصائب سے گھبرا کر گھربار چھوڑ دیا۔ اس کا فلسفہ جرمنی کے فلاسفہ شوپنہار (Schopenhaur) کی قنوطیت سے بھی زیادہ بڑھ کر ہے۔[3]

اپنشدوں کا خدا

اپنشدوں کا خدا شخصی (سگُن) بھی ہے اور غیر شخصی (نرگن) بھی۔ پہلی صورت میں وہ کائنات کا خالق، مالک، رب، حاکم اور تباہ کرنے والا ہے۔ دنیا والوں کی قسمت اسی کے اختیار میں ہے وہ نیکوکاروں کو جزا اور بدکاروں کو سزا دیتا ہے۔

ایک نقطہ نگاہ یہ بھی ہے کہ چونکہ خدا ہر چیز پر سمایا ہوا (انتریامی) ہے اس لیے اس کا جسم تمام اجسام کا مجموعہ ہے اس کا دماغ تمام دماغوں کا مجموعہ ہے سب کے ہاتھوں سے وہ کام کرتا ہے سب کے پیروں سے وہ چلتا ہے۔ سب کی آنکھوں سے وہ دیکھتا ہے اور سب کے کانوں سے وہ سنتا ہے۔ دوسری صورت یعنی خدا کا غیر شخصی ہونے کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔ ''نہ وہ کثیر ہے، نہ دقیق، نہ وہ خفیف ہے نہ طویل، نہ وہ آگ کی طرح سرخ ہے نہ پانی کی طرح سیال، اس کا سایہ نہیں ہے اس میں تاریکی نہیں ہے۔ وہ بغیر ہوا، بغیر تعلق کے، بغیر ذائقہ کے، بغیر بو کے، بغیر آنکھوں کے، بغیر گویائی کے، بغیر دماغ کے، بغیر سانس کے، بغیر دہانہ کے، بغیر تاپ کے اور بغیر ظاہر و باطن کے ہے۔'' (بر یہد ۳۔۳۔۸) اس طرح آریائی فلاسفہ نے خدا کو تمام صفات سے معرا کر دیا بظاہر دونوں صورتوں میں تضاد نظر آتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو

---

[1] اجہ موہن رائے کے لیکچرز۔ [2] منڈک اپنشد منڈک اول کھنڈا منتر ۶:۴ چھاندوگیہ اپنشد پر پاٹھک، کھنڈا، ۲ پشتتھ برہمن کانڈ ۱۰ ادھیا ۳ برہمن، ۵ کھنڈ ۱۲۔

[3] R.B.Hume: The thirteen principals Opanishads Oxford U.P.

مجسم اور محدود سمجھتے ہیں۔ اس وقت خدا تشخصی ہے اور جب ہم ریاضت اور مجاہدات سے دنیاوی الائشوں سے پاک ہو جاتے ہیں اور خدا کی صفات میں رنگین ہو جاتے ہیں تو اس طرح اپنی شخصیت کے حدود سے باہر نکل جاتے ہیں تو تشخصی خدا اور مادی دنیا ہمارے لیے غائب ہو جاتی ہے تو ہم اور خدا ایک ہو جاتے ہیں۔ دوئی کے پردے چاک ہو جاتے ہیں۔ روح اور خدا ایک ہو جاتے ہیں۔

پیدائش عالم: تخلیق کائنات کے بارے میں اپنشد ایک خاص نظریہ رکھتے ہیں۔ اپنشدوں کا خالق کسی خارجی مادے سے دنیا کو نہیں پیدا کرتا بلکہ خود اپنے اندر سے پیدا کرتا ہے۔

''جس طرح مکڑی جالا بنتی ہے جس طرح کہ پودے زمین سے اُگتے ہیں۔ اسی طرح یہ سب کچھ جو یہاں ہے اس غیر فانی سے نکلا ہے۔'' (منڈک ا۔ا۔۷)

''جیسے چھوٹی چھوٹی چنگاریاں آگ سے اڑتی ہیں اسی طرح آتمن سے تمام عالمین، دیوتا، ارواح حیوانی اور کل زندہ مخلوقات برآمد ہوئی ہیں۔'' (بریہد ۲۔ا۔۲)

اپنشد کا پہلا سبق یہ ہے کہ انسان کا ذہن محدود ہے۔ اس کی مدد سے حق تک رسائی نہیں ہو سکتی کمزور دماغ جس میں ذرا سی ہوا اور خوراک کی تبدیلی سے درد پیدا ہو جاتا ہے کس طرح حقیقت لامحدود تک جس کا یہ ایک بہت ہی چھوٹا حصہ ہے معلوم کر سکتا ہے۔ دوسری شے جس کی مدد سے وہ حقیقت پا سکتا ہے وہ آتما ہے۔ آتما تمام روحوں کی روح ہے۔ وہ مراقبہ سے ملتی ہے۔ اس کے لیے انساں کو اپنے علم اور ظاہری حواس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ پندرہ دن تک برت رکھے۔ صرف پانی پر گزارہ کرے اور کچھ نہ کھائے۔ اس طرح دماغ کو امن ہوگا اور خاموش رہنے کی عادت پیدا ہو جائے گی۔ اس میں طہارت پیدا ہو جائے گی اور جذبات نفسانی کی سرکش اونٹنی ذبح ہو جائے گی۔ اس مراقبہ کی حالت میں روح اپنے تئیں محسوس کرتی ہے اور اس بڑی روح کو سمجھتی ہے جس کا یہ خود ایک جزو ہے۔ آخر کار انسان کی شخصیت فنا ہو جاتی ہے اور وحدانیت اور حقیقت اس کے سامنے آشکار ہو جاتی ہے[1]

ہندو فلاسفی کا دوسرا قدم براہمہ ہے۔ یہ تمام کائنات کی روح اعظم ہے جو ساری کائنات پر مستولی ہے۔ نہ مذکر ہے نہ مونث، بغیر جسم و شخصیت کے سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ تمام کائنات کی ہستی یہی ہے۔ یہی پوشیدہ حقیقت ہے۔ نہ پیدا ہوئی نہ مرے گی اور نہ کبھی کمزور ہوگی۔ یہ وہ قوت عظیم ہے جو تمام طاقتوں اور خداؤں پر غالب ہے۔

اس فلسفہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ براہمہ تمام کائنات کی روح تو ہے لیکن نہ وہ کسی کو بخش سکتی ہے نہ کسی کو سزا دے سکتی ہے۔ تمام انسان اپنے گناہوں کی پاداش میں اس دنیا میں بار بار جنم لیتے ہیں۔

اس فلسفہ کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ آتما اور براہمہ ایک ہی ہیں۔ جو ہمارے اندر قوت ہے، جس کو ہم نے روح الارواح کہا ہے وہ وہی ہے جو روح کائنات ہے۔ گویا خدا اور انسانیت کی ماہیت اور حقیقت ایک

1. Katha upanishad IV. 1-11-24:Chandogya VI.7. Radaha krishnan Indian philosophy vol. I..PP. 145---151

ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ''جو (اپنے سوا) دوسرے معبود کی پرستش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ایک ہے اور میں دوسرا ہوں وہ شخص عقل مند نہیں۔'' (بریہدا ۴۔۱۰) جو کہتا ہے کہ ''خدا ہے'' اس کے سامنے پردہ ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ میں ''خدا ہوں'' اس نے خدا کی معرفت حاصل کر لی۔ اس لیے انسان کو اپنی ذات کے بارے میں سوچنا چاہیے ''دراصل جس نے اپنے نفس کو دیکھ لیا، سن لیا، سمجھ لیا اور جان لیا اس نے سارے عالم کو جان لیا۔''

قرآن مجید کے نزدیک خالق مخلوق، عابد معبود کی ماہیت ایک نہیں ہو سکتی۔ اپنشد روح اور مادے میں تفریق نہیں کرتے۔ ان کے مطابق علت اولی روح ہی ہے۔ ''یہ سب روح پر مبنی ہے روح کائنات کی بنیاد ہے روح برہمن ہے۔''

اپنشدوں میں روحانی منازل

دنیا کے جتنے مذاہب ہیں وہ سالک کے سلوک کے مختلف مدارج اور منازل بیان کرتے ہیں۔ مثلاً اسلام روحانی ترقی کے تین منازل بیان کرتا ہے۔ پھر ہر روحانی منزل طے کرنے والے کا ایک الگ نام دیتا ہے۔ اسلام کے رو سے روحانی تین منازل ہیں۔ علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین جو عارف علم الیقین کے مقام پر پہنچتا ہے وہ صالح کہلاتا ہے جو عین الیقین کے مرتبہ پر پہنچتا ہے وہ شہید کا لقب پاتا ہے۔ جب وہ حق الیقین کے مقام پر پہنچتا ہے تو وہ صدیق کہلاتا ہے۔ صدیق خدائی صفات کا مظہر بن جاتا ہے۔ صوفیاء کرام نے اپنی کتب میں اس کی مثال یوں دی ہے۔ جب ایک شخص دور سے دھواں دیکھے تو وہ یہ سمجھے گا کہ وہاں آگ ہے۔ اس سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔ ممکن ہے وہ آگ کا دھواں نہ ہو وہ گرد وغبار ہو دیکھنے والے نے گرد وغبار کو دھواں سمجھ لیا۔ اس منزل پر سالک ابھی حجاب میں ہوتا ہے۔ اس منزل پر پہنچنے والا صالح کہلائے گا۔ جب دھواں دیکھنے والا آگے چلتا ہے اور آگ کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے تو وہ علم الیقین کی حد سے نکل کر عین الیقین تک پہنچ جاتا ہے۔ اب پہلے کے شکوک وشبہات دور ہو جاتے ہیں۔ اس منزل پر سالک خدا کی تجلی کو پا لیتا ہے۔ اس کے بعد جب عارف آگ کے مزید قریب ہوتا ہے۔ آگ کی تپش محسوس کرتا ہے تو اس درجہ پر پہنچ کر سالک حق الیقین پر پہنچ جاتا ہے۔ ذات حق کے متعلق ذرا بھر بھی دل کے کسی گوشے میں شک وشبہ نہیں رہتا۔ اس منزل پر پہنچنے والا صدیق کہلاتا ہے۔ صدیق مظہر حق ہوتا ہے۔

پروفیسر ار ڈی ریناڈے کے قول کے مطابق اپنشدوں میں روحانی ترقی کے پانچ مدارج ہیں۔

۱۔ بریہدارنیک اپنشد کے مطابق پہلی منزل میں متلاشی حق خود کو دوسروں سے الگ سمجھتا ہے اور عارفانہ وجدان کے ذریعہ اسے اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔

۲۔ دوسرے مرحلے میں متلاشی محسوس کرتا ہے کہ وہ حقیقتاً عین ذات ہے۔ وہ اپنی لازمی فطرت میں ہو بہو خاص ذات جیسا ہے بریہدارنیک۔ کے مطابق ہمارے اندر خود کو ''میں'' کہنے والی ہستی ذات سے متشابہہ ہوتی ہے۔

۳۔ تیسرے مرحلے میں وہ جان لیتا ہے کہ اس نے جو ذات محسوس کی ہے وہ برہمہ کے ساتھ عینیت

رکھتی ہے۔

۴۔ چوتھے مرحلے میں اسے آگہی ہوتی ہے وہ بطور ذات مطلق ہے اور نتیجتاً اس نکتے پر پہنچتا ہے کہ وہ قادر مطلق ہے کہا گیا ہے کہ ہمیں اپنی "میں" کو قادر مطلق کے ساتھ متشابہ بنانا چاہیے۔

۵۔ پانچویں مرحلے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں ہمیں نظر آنے والی ہر چیز، انسان اور فطرت، ذات اور لاذات، یکساں طور پر برہمہ یا حقیقت مطلق پر مبنی ہے اس حقیقت کو پانا محض عقلی نہیں بلکہ عارفانہ ہے[1]

اپنشدوں کی بیان کردہ روحانی منازل کو جب ایک سنیاسی طے کرتا جاتا ہے۔ تو اس کی نفسانی خواہشات ختم ہوتی جاتی ہیں۔ خدا کی ذات کے بارے میں شکوک وشبہات دور ہو جاتے ہیں۔ دل کی گرہیں کھل جاتی ہیں۔ خود آگہی ہو جاتی ہے۔

روح عالم کے ساتھ اتحاد کی وجہ سے روحانی مسرت نصیب ہوتی ہے۔ خود آگہی کے نتیجہ میں ذات حق کو پالیتا ہے۔ چانڈوگیہ اپنشد کے الفاظ میں "جو اپنی تلاش کے بعد ذات کو پالیتا ہے وہ تمام کائنات کو پاتا ہے اور اس کی تمام خواہشات پوری ہو جاتی ہیں۔" اپنشدوں کے نزدیک خدا کی ذات میں حلول کر جانا ہی نجات ہے۔ بادشاہ جنک نے یجنولکی سے پوچھا کہ بار بار پیدائش سے انسان کس طرح نجات حاصل کر سکتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ ریاضت اور مجاہدات سے تمام خواہشات نفسانیہ کو کچل کر اپنے تئیں روح کائنات کے اندر مدغم کر کے۔ صوفیا کی اصطلاح میں یہ فنافی اللہ کا مقام ہے۔ اسلام میں صوفیاء کرام نے مقام فنافی اللہ کے بعد بقاباللہ کا مقام بیان کیا ہے جب ایک عارف صفات الٰہی کا لباس زیب تن کر لیتا ہے تو اس کو پھر حیات نو کا لباس پہنایا جاتا ہے وہ ایک نئی زندگی پاتا ہے۔ یہی روحانی زندگی ایک سالک کی مطلوب ومقصود ہوتی ہے۔ حدیث میں بھی اس مقام کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ میں اس عارف کے ہاتھ، منہ، پاؤں بن جاتا ہوں۔

نجات تمام مذاہب کا مشترکہ موضوع ہے۔ اسلام میں نجات کا کیا مفہوم ہے اور کیوں کر حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسلام کے باب میں اس پر تفصیلاً بحث کی جائے گی۔

پران

پران کے معنی قدیم کے ہیں۔ ہندوؤں میں مستند اور سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابیں ہیں۔ وید جس قدر نایاب اور عسیر الفہم ہیں۔ پران اسی قدر زیادہ دست یاب اور سہل الفہم ہیں۔ پران تعداد میں اٹھارہ ہیں، ان میں آٹھ لاکھ سے زیادہ اشعار ہیں۔

پرانوں کی قدامت

ویدوں کے مطالعہ سے یہ علم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں ویدوں سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ چنانچہ اتھروید

[1] فلسفہ مذاہب مصنفہ امولیہ رنجن مہاپاترا مترجم یاسر جواد ص ۱۲۰، ۱۲۱۔

کانڈ ۱۱ سوکت ۷ منتر ۲۴ میں لکھا ہے: ''باقی بچے ہوئے (خدا یا قربانی) سے رگ، سام، اتھرو اور پران مع یجروید ظاہر ہوئے۔'' اسی طرح اتھروید کانڈ ۱۵ سوکت ۶ منتر ۱۲ میں لکھا ہے: ''اس کے (طالب علم کے) پیچھے تاریخ، پران، گاتھا اور نار اشنسی چلے۔ رگوید میں بھی یگیہ پڑھے جانے والے پران کا ذکر کیا ہے، منڈل ۱۰ سوکت ۳۰ منتر ۶ میں لکھا ہے: ''پران یگیہ کے ذریعہ ہمارے بزرگ رشی بنائے گئے۔'' چھاندوگیہ اپنشد پر پاٹھک ۷ کھنڈ ۱، ۲ میں بھی پرانوں کا ذکر ہے۔ ان حوالہ جات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پران ویدوں سے زیادہ قدیم ہیں۔

جہاں پرانوں کی قدامت ویدوں سے ثابت ہے وہاں یہ بھی واضح ہے کہ مختلف اوقات میں متفرق لوگوں نے اس میں اضافے کئے۔ چنانچہ پرانوں میں سولہویں صدی عیسوی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔[1] گپت سامراج کے زوال کے بعد بھی ان کی اصلاح کی گئی ہے اور ان میں مزید مضامین شامل کرنے کا فیصلہ ہوا۔

نفس مضمون

پرانوں میں آریا نسل کے ابتدائی قبائل، کائنات کی ابتداء اس کا درجہ بدرجہ ترقی کرنا پھر پردہ فنا میں جانا، ہندوؤں کی قبائل پرستش ہستیوں کے واقعات زندگی اور افسانے، حکومتی خاندانوں کی تاریخیں بیان ہوئی ہیں۔ اس میں فرقہ وارانہ مباحث بھی موجود ہیں، ہر فرقہ اپنے دیوتا کی فضیلت اور برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

سنسکرت کے مشہور عالم بُہلر کے مطابق یہ فرقہ وارانہ دیو مالا، فلسفہ، تاریخ اور مذہبی قوانین کے مجموعے ہیں اور یہ جاہل عوام کے لئے اور شودروں کے لئے اعلیٰ طبقات کے لئے لکھی گئی تھیں۔[2]

تخلیق کائنات

کائنات کی تخلیق کے متعلق پران یہ بتاتے ہیں کہ براہمہ نے ایک انڈا دیا۔ پھر اس پر خود بیٹھا اور مرغی کی طرح بیٹھ کر بچہ نکالا، وہ کائنات ہے۔ دنیا کے کئی دور ہیں۔ ہر ایک دور ایک ہزار مہا جگ یا مہایوگ کا ہوتا ہے اور ہر ایک مہا جگ ۴,۳۲۰,۰۰۰ سال کا ہوتا ہے گویا دنیا کا ایک دور ۴,۳۲۰,۰۰۰,۰۰۰ سال یعنی ۴ ارب ۳۲ کروڑ سالوں کا ہوا۔ دنیا کے ایسے کئی دور گزر چکے ہیں۔ دنیا بالکل پردہ عدم میں نہیں جائے گی۔ ہر ایک مہایوگ میں چار یوگ یا چار جگ ہوتے ہیں جن میں بنی نوع انسان درجہ بدرجہ تنزل کی طرف جاتی رہی ہے۔ موجودہ مہایوگ میں تین یوگ گزر چکے ہیں۔ جن کے ۳,۸۸۸,۸۸۸ سال ہوئے۔ ہم چوتھے جگ میں گزر رہے ہیں اور ۴۲۶۹۶۵ سال مزید باقی ہیں۔

---

1. بنی پرشاد باب ہفتم اور اے جی راؤسن اینشینٹ انڈیا باب پنجم
2. لاز آف منو منقولہ وی اے اسمتھ اکسفورڈ ہسٹری ص ۳۳۔

پرائوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ تخلیق کائنات کا کوئی خاص مقصد نہیں۔ ایک مہایوگ کا فنا ہو جانا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک چوہے کا مر جانا، اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں۔

قانون کی کتابیں

ہندوؤں کے مجموعہ قوانین کو دھرم سوتر اور دھرم شاستر کہتے ہیں، سوتر کا لفظی مطلب دھاگہ اور سوت ہے لیکن ہندو دھرم میں ان سے مراد وہ کتابیں ہیں، جنھیں ویدانگ کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے ویدوں کے بازو اور ٹانگیں۔ ان کتب میں مختلف علوم وفنون کے قواعد وضوابط بیان کیے گئے ہیں۔ ابتدائی سوتروں میں گھریلو رسومات قربانی کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ انھیں دھرم سوتر کہتے ہیں۔ مرور وقت کے ساتھ ساتھ نئے نئے سوتر تخلیق ہونے لگے۔ ان میں آخری منو کا دھرم شاستر یا منوسمرتی ہے جو پہلی صدی قبل مسیح کی تخلیق ہے۔ مختلف علوم وفنون سے متعلق ابتدائی چھ سوتروں کے نام یہ ہیں۔ ا۔ ششکشا (صوتیات) ۲۔ کلپ (مذہبی رسومات) ۳۔ دیا کرن (گرامر) ۴۔ نروکت (تاریخ لفظی) ۵۔ چھند (عروض) اور ۶۔ جیوتش (جوتش) علو نجوم۔ ان سوتروں کا زمانہ ۵۰۰ ق۔م تا ۱۵۰ ق سمجھنا چاہیے۔ ان میں سے منوسمرتی نے ہندو معاشرے پر نہایت ہی گہرا اثر ڈالا۔

لفظ دھرم جس کا ترجمہ قانون کیا جاتا ہے اصل میں اس سے زیادہ وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ مثال کے طور پر سُتروں میں خاندانی فرائض خصوصاً مذہبی اور اخلاقی قوانین درج ہیں۔ ''دھرم سترا انفرادی اور اجتماعی زندگی کا تذکرہ ساتھ ساتھ کرتے ہیں۔ وہ خاندانی رسوم کی اہمیت جتاتے ہیں لیکن فوراً ہی سماجی رسم ورواج، قانون اور حکومت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔''[1]

اس کے برعکس دھرم شاستر میں صرف قانون ہی موضوع ہے۔

منو کا مجموعہ قوانین جدید ہندو قانون کی اساس ہے۔ سُترا سن عیسوی سے پہلے تصنیف ہوئے اور شاستر سن عیسوی کی پہلی صدی میں مرتب ہوئے۔

منو کا قانون

منو، کوشل خاندان سے بادشاہ تھا۔ اس نے ہندو قوم کے لیے ۸۸۰ قبل مسیح میں قانون وضع کیا، اسے منوسمرتی کہتے ہیں۔

منو کے قانون پر بحث کرنے سے پہلے اچھے قانون کی خصوصیات بیان کرنا ضروری ہے تاکہ یہ آسانی سے معلوم کیا جا سکے کہ آیا منو کے قانون میں ایک اچھے قانون کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

۱۔ اچھا قانون انسانی فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔

۲۔ اس کی بنیاد انصاف، مساوات اور انسانی عظمت پر ہوتی ہے۔

۳۔ عقل کے معیار پر پورا اترتا ہے۔

---

[1] بنی پرشاد تھیوری آف گورنمنٹ ان انیشینٹ انڈیا ص ۱۵۸۔

۴۔ معاشرہ کے ہر طبقہ کے انسانوں کے حقوق کی نگہداشت ہوتی ہے۔

۵۔ اس میں لچک ہوتی ہے تاکہ اس کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالا جا سکے۔

معاشرہ کی درجہ بندی

منو نے تمام معاشرے کو درجہ بندی کے ساتھ چار ذاتوں میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے افضل برہمن، پھر کشتری، اس کے بعد ویش اور پھر شودر کا درجہ ہے۔ پھر ہر ذات کے لیے الگ الگ فرائض مقرر کیے ہیں۔ ان چار ذاتوں میں شودر بہت ہی ذلیل ورن ہے۔

دنیا کی نشوونما کے لیے برہمہ نے برہمن کشتریہ (جنگجو) ویش (تاجر) اور شودر (کم درجہ کے خادموں) کو بالترتیب اپنے چہرے، بازوؤں، رانوں اور پیروں سے پیدا کیا۔ (منو کا ضابطہ قانون ۱:۳۱)

فرائض: ویش کا کام کھیتی کرنا، سود لینا، چار پایہ کی پرورش کرنا، یہ سب کام ویش سے کرائے جائیں۔ برہمن، کشتری اور ویش کی سیوا شودروں سے کرائی جائے۔ (۱:۹۰)

مالک نے شودروں کے لیے صرف ایک پیشہ لکھا کہ وہ (باقی) تین ذاتوں کی خدمت نہایت عاجزی وانکساری سے کریں۔ (۱:۹۱)

برہمنوں کے لیے وید کی تعلیم اور خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے دیوتاؤں کو چڑھاوے دینا اور دان لینے دینے کا فرض قرار دیا ہے۔ (۱:۸۸)

چھتری کو اس نے حکم دیا ہے کہ خلقت کی حفاظت کرے، دان دے، چڑھاوے چڑھائے، وید پڑھے اور شہوات نفسانی میں نہ پڑے۔ (باب اول ۸۹)

شودروں پر مظالم

شودر جس عضو سے برہمن کی ہتک کرے وہی عضو اس کا کاٹ دیا جائے۔ اگر برہمن کے برابر بیٹھ جائے تو کمر پر داغ لگا کر، چوتڑ ا کٹوا کر ملک سے باہر نکال دینا چاہیے۔ (منو۲:۲۸۱)

شودر کو نیک صلاح نہ دینی چاہیے۔ (منو۴:۸۰)

شادی میں تفریق

نچلی قوم کی عورت اوپر کی قوم کے مرد سے اوپر کی قوم کی عورت نچلی قوم کے مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔

اپنی ذات سے اونچی ذات کو چاہنے والی کنیا (دختر) تھوڑا ڈنڈ بھی نہیں پا سکتی اور اپنی ذات سے نیچی ذات کو چاہنے والی کنیا کو گھر میں نہیں رکھنا چاہیے۔ (۸:۳۶۵)

اونچی ذات کی کنیا، خواہ خواہش کرنے والی ہے یا نہ کرنے والی ہے۔ رذیل آدمی سے جماع وغیرہ کرے تو ذات کے تفاوت کی وجہ سے اس آدمی کا عضو تناسل قطع کر دینا چاہیے۔ مگر خواہش کرنے والی ہم قوم سے جماع کرنے والا شخص سزا کے لائق نہیں ہوتا اور اگر اس کنیا کا باپ راضی ہو تو اس کو کچھ معاوضہ دے

کر شادی کر لے۔ (۸:۳۶۶)

غلامی

منو کے قانون میں غلاموں کی آٹھ قسمیں ہیں۔

ا۔لڑائی میں فتح کیا ہوا۔ ۲۔خوراک پر غلامی منظور کرنے والا۔ ۳۔کسی جرم کے عوض غلامی قبول کرنے والا۔ ۴۔گھر کی داسی سے پیدا ہوا۔ ۵۔خرید کیا ہوا۔ ۶۔ان میں سے ملا ہوا۔ ۷۔بزرگ سے وراثت میں ملا ہوا۔ ۸۔بھگت یہ سب داس ہیں۔

برہمن داسی شودر سے دولت لے لے، اس میں کچھ بچپانہ کرے کیونکہ وہ دولت کچھ اس کی ملکیت نہیں ہے، وہ بے زر ہے، جو دولت فراہم کرے اس دولت کا مالک اس کا سوامی ہے۔ (۸:۴۱۷)

قرآن مجید پہلی وہ آسمانی کتاب ہے جس نے ہر قسم کی غلامی سے آزادی کا اعلان فرمایا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا أَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ. (البلد ۹۰:۱۱:۱۳) سو وہ اونچی گھاٹی پر چڑھنے کی ہمت نہیں کرتا اور تجھے کیا خبر کہ اونچی گھاٹی کیا ہے۔ کسی گردن کا آزاد کرنا۔

اس آیت کریمہ میں اونچی گھاٹی سے مراد گردنوں کا آزاد کرنا ہے۔ گویا قرآن مجید انسانوں کو آزادی کی بلند گھاٹی پر چڑھانے آیا ہے جس پر وہ اب تک نہیں چڑھا تھا تا کہ وہ آزادی کے ارفع مقام پر چڑھ کر شرف انسانیت کو حاصل کرلے۔

حدیث میں آتا ہے۔ براء بن عازب سے روایت ہے کہ ایک اعرابی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! مجھے آپ کوئی ایسا عمل بتائیں کہ بس میں اس سے سیدھا جنت میں چلا جاؤں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے لفظ تو مختصر کہے ہیں مگر بات بہت بڑی پوچھی ہے تم ایسا کرو کہ غلام آزاد کرو اور اگر خود اکیلے آزاد نہ کر سکو تو دوسروں کے ساتھ مل کر آزاد کرو۔''

قرآن مجید نے جنگی قیدیوں کے متعلق یہ تعلیم دی۔ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَآءً. (محمد ۴۷:۴) جنگی قیدیوں کو احسان کے طور پر چھوڑ دو یا مناسب فدیہ لے کر۔

مصر کے متعصب عیسائی مصنف جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ اسلام غلاموں کے حق میں رحمت ہو کر آیا[1]

عورت کی غلامی

عورت خواہ نوجوان لڑکی ایک بالغ دوشیزہ یا ایک بوڑھی عورت ہو۔ وہ خود مختاری سے گھر کے اندر بھی کام نہیں کر سکتی۔ نوجوانی میں اسے اپنے باپ کے اختیار میں اور جوانی میں اپنے خاوند کے اختیار میں رہنا چاہیے۔ جب خاوند مر جائے تو اسے اپنے بیٹوں کی حفاظت میں ہونا چاہیے اسے خود مختاری کو پسند نہیں کرنا چاہیے۔

---

[1] علی ان الاسلام جاء رحمۃ للارقاء (التمدن الاسلامی جلد ۲ ص ۴)

اسے اپنے باپ، شوہر یا بچوں سے علیحدگی کی خواہش نہیں کرنی چاہیے۔ان سے علیحدہ ہو کر وہ دونوں خاندانوں کے لیے بدنامی کا باعث بنتی ہے۔(۵:۱۴۷۔۱۴۹)

وراثت

وراثت کے متعلق بھی منو کا قانون عقل، فطرت اور عدل کے خلاف ہے۔منوسمرتی میں لکھا ہے۔ ماں باپ کی تمام دولت بڑا بیٹا لے، چھوٹا اور منجھلا بھائی سب بڑے بھائی سے اوقات گزاری کریں۔جس طرح والدین سے پرورش پاتے تھے۔(۹:۱۰۲)

قرآن مجید میں آتا ہے۔ یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِیٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ (نساء۴:۱۱) اللہ تم کو تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ ہر مرد کا دو عورتوں کے برابر حصہ ہے۔یعنی ہر بیٹا دو حصے اور بیٹی ایک حصہ لے۔

باپ اور بھائی دولت کو نہیں پاتے بیٹا ہی دولت پاتا ہے بیٹا نہ ہو تو باپ اور بھائی دولت کو پاتے ہیں۔(۹:۱۸۳)

اگر بیٹا لاولد مر گیا ہے تو اس کی ماں اس کی دولت لے۔(۹:۲۱۵)

اسلامی قانون میں بیٹا پوتا خواہ کتنا ہی نیچے درجہ میں ہوں اگر ان میں سے کوئی موجود ہے تو باپ کا ۱/۴ حصہ ہے اور ماں کا بھی ۱/۴ حصہ ہے بیٹا یا پوتا اسے محروم نہیں کرتے۔

وَلِاَبَوَیْهِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَکَ اِنْ کَانَ لَهٗ وَلَدٌ (النساء۴:۱۱) اگر اولاد ہے تو ماں باپ میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔

جو شخص بیٹا نہیں رکھتا اس کی تمام دولت نانی پائے اور دو نیڈ دے ایک باپ کو ایک نانا کو۔(۹:۱۳۰)

اسلامی قانون میں لاولد مرد یا عورت کے ترکے میں اس کا بھائی اور بہن ۱/۶ اور ۱/۳ حصہ کے وارث ہیں۔ان کا درجہ قرابت میں نانی سے بہتر ہے۔قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَاِنْ کَانَ رَجُلٌ یُّوْرَثُ کَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَاِنْ کَانُوْٓا اَکْثَرَ مِنْ ذٰلِکَ فَهُمْ شُرَکَآءُ فِی الثُّلُثِ (النساء۴:۱۲) اگر کوئی مرد یا عورت جس کی میراث لی جاتی ہے کلالہ ہو اور اس کا بھائی یا بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا ہے، اور اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو تہائی میں شریک ہیں۔

لاوارث برہمن کی دولت راجہ ہرگز نہ لے دوسرے دونوں کی دولت وارثوں کے نہ ہونے کی حالت میں راجہ حق ہے۔(۹:۱۸۷)

اسلامی قانون میں کوئی بھی لاوارث مر جائے تو اس کا مال بیت المال میں داخل ہوگا۔

منوسمرتی کا قانون وراثت بھی مساوات اور عدل پر مبنی نہیں ہے۔اس طریقہ تقسیم سے ایک طبقہ امیر اور ایک طبقہ غریب ہوتا چلا جاتا ہے اور معاشرہ دو طبقوں امراء اور غرباء میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

جرائم کی سزائیں

منو کے قانون میں جرائم کی سزاؤں میں بھی نہ تو عدل وانصاف کو پیش نظر رکھا گیا اور نہ فطرت انسانی کو۔ سزائیں وحشیانہ ہیں اور بعض خفیف جرائم کی سزائیں سنگین ہیں اور بعض سنگین جرائم کی سزا ہیں خفیف ہیں اور طبقاتی تقسیم کے اصول کو بھی سزاؤں میں مدنظر رکھا گیا ہے۔

ادھیائے ۸ اشلوک ۱۲۵ میں سزا کے مقام حسب ذیل ہیں۔

عضو تناسل، شکم، زبان، دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں، دونوں کان، دونوں آنکھ، ناک، جائیداد، جسم یہ دس ڈنڈ (سزا) کے مقام ہیں۔

اسلامی قانون میں جسمانی سزاؤں کے چار اقسام ہیں۔ ا۔ قتل۔ ۲۔ صلیب۔ ۳۔ ہاتھ پاؤں مخالف طرفوں سے کاٹ دینا۔ ۴۔ نفی من الارض یعنی قید وحراست اور جلاوطنی...... یہ سب سزائیں متبادل ہیں۔

قاضی کو اختیار ہے کہ مجرم اور جرم کے حالات کو مدنظر رکھ کر ان چار سزاؤں میں سے جو سزا چاہے دے۔

قرآن مجید میں چوری، زنا، قذف کی سزائیں الگ الگ آیتوں میں لکھی ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (مائدہ ۵:۳۳) ان کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں صرف یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا صلیب پر مارے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف اطراف سے کاٹے جائیں یا ان کو قید کیا جائے۔ یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (المائدہ ۵:۳۴) سوائے ان کے جو توبہ کرلیں اس سے پہلے کہ تم ان پر قابو پالو۔ سو جان لو کہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

قتل کی سزا میں فرق

برہمن مجرم قتل کی سزا سے مستثنیٰ ہے، اس کی موتراشی یا اسے ملک سے باہر نکال دینا کافی ہے۔

اگر برہمن یا عالم شخص بہت گناہوں کا مجرم ہے تو بھی اسے قتل نہ کیا جائے۔ جسمانی سزا نہ دے کر اسے ملک سے باہر کر دیا جائے۔ (۸:۲۸۰)

دنیا میں ودوان یعنی برہمن کے قتل سے زیادہ کوئی گناہ نہیں ہے کیونکہ اس سے مسئلہ تعلیم کو نقصان پہنچتا ہے۔اس لیے راجہ برہمن کو قتل کرنے کا خیال بھی نہ لائے۔(۸:۸۱)

اسلامی قانون میں قاتل خواہ کسی قوم یا خاندان کا ہو یا کسی اعلیٰ منصب کا ہو، سب کی قتل یا دیت ہے۔قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے۔وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل آیت ۳۳)اس آیت میں لفظ نفس سے مراد نوع انسانی کا ہر فرد ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے غلام کو قتل کردے یا اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دے ہم اس شخص کو قتل کردیں گے اور اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیں گے۔(ترمذی)

زنا کی سزا میں فرق

کسی اونچی (ذات) کے مرد کی طرف راغب ہونے والی عورت پر کوئی جرمانہ نہ ہوگا۔لیکن جو نچلی ذات کے مرد کی طرف مائل ہوتی ہے اسے گھر میں پابند کردیا جائے گا۔(۸:۲۵۷)

برہمن، کشتری، ویش کی عورت شوہر سے محفوظ ہو یا نہ ہو۔اس سے زنا کرنے والا شودر کا عضو تناسل قطع کرنا، تمام دولت چھین لینا اور قتل کی سزا دینی چاہیے۔(۸:۳۶۶)

کھشتری یا ویش کسی ایسی برہمنی سے مباشرت کرتے ہیں جو حفاظت میں نہیں تو وہ ویش کو پانچ سو (پن) اور کھشتری کو ایک ہزار جرمانہ کریں۔(۸:۳۶۸)

کوئی ویش کی غیر محفوظ کھشتری عورت سے مباشرت کرتا ہے تو اسے ۵۰۰ (پن کا جرمانہ ہوگا) لیکن (اس جرم میں) کھشتری کا سر (گدھے) کے پیشاب سے مونڈ دیا جائے گا یا اسے اتنا ہی جرمانہ (ادا کرنا ہوگا)(۸:۳۷۶)

محفوظ عورت کی طرف اس کی مرضی کے خلاف رجوع کرنے والے برہمن کو ایک ہزار (پن) کا جرمانہ ہوگا) لیکن اگر عورت کی رضامندی شامل ہو تو جرمانہ ۵۰۰ پن ہوگا۔(۸:۳۷۰)

برہمن، کھشتری، ویش کی عورت شوہر وغیرہ سے محفوظ ہو یا نہ ہو اس سے زنا کرنے والے شودر کا عضو تناسل قطع کرنا، تمام دولت چھین لینا اور قتل کی سزا دینی چاہیے۔

اگر وہ غیر محفوظ عورت سے جماع کرے تو اسے دونوں متذکرہ صدر سزائیں اور قتل کی سزا دینا چاہیے۔(۸:۳۷۴)

قرآن مجید نے زنا کی سزا سو کوڑے مقرر کی ہے۔اس سزا میں منو کے قانون کی طرح قومی، قبائلی یا نسلی تفریق نہیں کی۔مجرم خواہ کسی نسل یا قبیلے سے ہو اسے سزا ندکور دی جائے گی۔قرآن مجید میں آتا ہے۔اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِي دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (النور ۲۴:۲)
زانی عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان پر مہربانی تمھیں اللہ کے حکم کی تعمیل

سے نہ روکے اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہو اور چاہیے کہ ان کی سزا کے وقت مومنوں کی ایک جماعت موجود ہو۔

چوری کی سزا میں فرق

منو کے قانون میں چوری کی سزائیں پانچ قسم کی ہیں۔ پہلی دفعہ زبانی سزا دے یعنی تم نے اچھا کام نہیں کیا، پھر ایسا کام نہ کرنا، دوبارہ جھڑ کے اور لعنت کر کے اس کام سے ہٹا دے اور سہ بارہ کرے تو جرمانے کی سزا دے۔ اگر اس پر بھی نہ مانے تو قید اور جسم کے انگ کاٹنے کی سزا ہے۔ (۸:۱۲۹)

جس عضو سے دوسرے کی چیز چرائے اسی عضو کو قطع کرنا چاہیے، تاکہ پھر ایسا کام نہ کرے۔ (۸:۳۲۷)

اگر جسم کا عضو کاٹنے سے مجرم جرم سے باز نہ آئے تو اس کو چار قسم کی سزا ایک ساتھ دینی چاہیے۔ (۸:۳۰)

چار قسم کی سزا سے وہ سزائیں مراد ہیں جو اوپر اشلوک ۸:۱۲۹ میں مذکور ہیں۔

اسلامی قانون میں چوری کے عادی مجرم کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ یہ آخری حد ہے قاضی حالات کے مطابق کم بھی سزا دے سکتا ہے۔ مثلاً قید کر دینا فاقطعوا ایدیھما میں وہ تمام ذرائع اختیار کرنا مراد ہیں جن سے وہ اس جرم سے باز آ جائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (مائدہ ۵:۳۸) اور چوری کرنے والا مرد ہو یا عورت ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو یہ ان کے لیے ہوئے جرم کا بدلہ ہے اور خدا کی طرف سے عبرت ناک سزا اور خدا غالب و حکمت والا ہے۔

اس آیت میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نکال کے طور پر لکھی ہے۔ ''نکال'' کے طور سزا عادی مجرم کو دی جاتی ہے۔ اور یہ آخری حد ہے۔

تھوڑے مذموم امر کے لیے لفظ نکال استعمال نہیں کیا جاتا، اگر وہ بڑا اور مشہور ہو جائے تو اسے نکال کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے ایسے چور کے لیے جو چوری پر اصرار کرے ہاتھ کاٹنے کی سزا نکال کے طور پر مقرر کی ہے۔

شہادت

منو کے قانون میں مجرم کو جھوٹی شہادت دے کر سزا سے بری کرانا سچی شہادت دینے سے بہتر ہے۔ یہ جھوٹ کی تعلیم ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔

جہاں سچ بولنے سے برہمن، کشتری، ویش، شودر، قتل ہوتا ہو وہاں جھوٹ بولنا سچ سے بھی زیادہ اچھا ہے۔ (۷:۱۰۴)

دیدہ و دانستہ رحم کی نظر سے جھوٹ بولنے سے سورگ سے نہیں گرتا اور اس کی بانی وغیرہ دیوتا کی بانی کے برابر سمجھتے ہیں۔ (۷:۱۰۳)

قرآن مجید یہ تعلیم دیتا ہے کہ شہادت دینے والا ہر حالت میں سچی گواہی دے خواہ وہ کسی بڑے خاندان کے فرد کے خلاف ہو، خواہ اس کے اپنے کسی عزیز کے خلاف ہو۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ (البقرہ ۲:۱۴۰) اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جس نے اپنی گواہی کو اللہ کے پاس سے چھپایا۔

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ (بقرہ ۲:۲۸۳) تم شہادت کو نہ چھپاؤ جو اسے چھپائے اس کا دل گناہ گار ہے۔

منوسمرتی میں لکھا ہے: عورتوں کی گواہ عورتیں اور دوج یعنی برہمن، کشتری اور ویش کے گواہ دوج شودروں کے گواہ شودر، چنڈال کے گواہ چنڈال۔ (۶۸:۸)

گواہی میں تخصیص قائم کرنا عقل، عدل اور انصاف کے صریحاً منافی ہے۔ اسلام کی رو سے ہر وہ شخص گواہی دینے کا حق رکھتا ہے جس نے کوئی خلاف قانون بات ہوتے ہوئے دیکھی۔

سر ولیم جونز کا تبصرہ

سر ولیم جونز نے منو کے قانون پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب "Institutes of Manu" کے دیباچہ میں رقمطراز ہے:

It is a system of despotism and priestcraft both indeed limited by law, but artfully conspiring to give mutual support, though with mutual checks, it is filled with strange conceits in metaphysics and natural philosophy, with idle soperstions and with a scheme of theology most obscurely figurative and consequently liable to dangerous misconceptions, it abounds with minute and childish formalities with ceremonies generally absured and of ten ridiculous; the punishments are partial and fanciful for some crimes, dreadfully cruel, and for others reprehensibly slight and the very morals, thongh rigid enough. On the whole are in one or two instances unaccountably relaxed nevertheless a spirit of subline devotion, of benevolence to mankind and of amiable tenderness to all sentient creatures pervodes the whole work.[1]

سر ولیم جونز کا یہ تبصرہ واضح کرتا ہے کہ منو کا قانون استبداد اور رہبانیت کا مجموعہ ہے۔ اخلاق نیچرل، فلاسفی اور تاریک مذہبی نظام متکبرانہ اصولوں سے پُر ہے۔ اس خطرناک بدگمانیوں کا ذمہ دار ہے یہ قانون احمقانہ رسوم و تکلفات سے لبریز ہے بعض جرائم کی سزائیں سخت ظلم پر مبنی ہیں اور بعض جرائم کی بہت کم ہیں۔

جدید ہندو مذہب

۳۰۰ء سے ۷۰۰ء تک کا زمانہ تاریخ ہند میں پرانوں کا دور کہلاتا ہے کیونکہ اسی زمانے میں ۱۸ پران

[1] دیباچہ ۱۹۔

تصنیف ہوئے یہی وہ زمانہ تھا جب ہندو مذہب کی بنیاد پڑی۔ بدھ اور جین مت کو نیچا دکھانے کے لیے برہمنوں نے اپنے مذہب اور سنسکرت زبان کی پُرزور تبلیغ اور بت پرستی کو رواج دیا۔

پہلی صدی عیسوی میں کاندھارا کے فن کاروں نے گوتم بدھ کا مجسمہ تیار کیا۔ کینشک کے عہد تک مجسمہ سازی کا فن متھرا تک پہنچ گیا اور ایک صدی میں بنارس، اندھرا اور امراوتی میں گوتم بدھ کے مجسمے بننے لگے۔ بدھ مت کے تتبع میں جین مت کے لوگوں نے بھی اپنے بزرگوں کے مجسمے بنانے شروع کر دیے۔ ان کی دیکھا دیکھی ہندوؤں نے بھی اپنے معبودوں کو مرئی صورت میں دیکھنے کے لیے ان کے مجسمے بنانے شروع کر دیے۔

اس مجسمہ سازی اور بت پرستی کے دور میں اپنشدوں کی تعلیمات اور ویدوں کے معبود پس پشت ڈال دیے گئے اور جو دیوتا ویدی عہد میں ثانوی حیثیت رکھتے تھے وہ اوّل درجہ کے معبود قرار دیے گئے۔ بتوں کی حفاظت کے لیے مندر تعمیر کیے گئے۔ بتوں کے پجاری غسل کرواتے، کپڑے پہناتے، زیورات اور پھولوں سے سجاتے، کھانا کھلاتے اور رات کو خوبصورت کپڑوں میں لپیٹ کر سلاتے۔

اہنسا: ہندوؤں نے بدھ مت اور جین مت سے متاثر ہو کر اہنسا کا اصول اپنا لیا۔ اہنسا کے معنی ہیں کسی کو "نہ مارنا" اس اصول کو اپنانے کے بعد ہندوؤں نے جانوروں کی قربانیاں کرنا شروع کر دیں۔ آہستہ آہستہ قربانیوں کا رواج بالکل ختم ہو گیا۔ یہاں تک کہ ہندو گوشت خوری سے بھی پرہیز کرنے لگے۔ اس اصول کو فلسفہ ویدانت نے بھی تقویت دی کیونکہ فلسفہ ویدانت کی رو سے ہر چیز میں خدا کا ظہور ہے۔

عقیدۂ تثلیث (تری مورتی)

جیسا کہ ویدوں کی تعلیمات کے باب میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ ہندوؤں میں بے شمار دیوتا اور دیویاں ہیں۔ دراصل معبودوں کی کثرت کا تصور ہمہ اوستی نظریہ سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق مظاہر فطرت کی عبادت خدا کی عبادت ہے۔

ویدک دھرم کی غیر مقبولیت کے پیش نظر برہمنوں نے یہ محسوس کیا کہ ویدک دیوتاؤں میں بنیادی تبدیلی کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس احساس کے نتیجہ میں ہندو دھرم میں تین بڑے خدا متقرر کیے گئے۔ براہمہ، شیوا، وشنو، ان کو ہی تری مورتی یعنی تین شکلیں کہتے ہیں۔ ان کے تحت بے شمار دیوتا اور دیویاں مقرر کی گئیں۔

براہمہ

یہ دیوتا عالم کا خالق اور کائنات کا نقطہ آغاز تصور کیا جاتا ہے۔ ہندو تثلیث (تری مورتی) میں برہما کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ اس دیوتا کی پرستش بہت ہی کم ہوتی ہے۔ تمام ہند میں صرف چند ایک ہی ایسے مندر ہیں جو برہما کے نام پر بنے ہیں۔

برہما کے متعلق ہندوؤں کا یہ نظریہ ہے کہ وہ ایک روح مطلق ہے جو قائم بالذات ہے۔ تمام عالم

میں سائر و دائر ہے۔ ہر ہندو کی یہ تمنا ہے کہ وہ ایک روز اس روح مطلق میں جذب ہو جائے اسی میں اپنا نروان اور نجات خیال کرتے ہیں۔

اس کے مجسمہ میں چار سر اور چار ہاتھ دکھائے جاتے ہیں جن میں سے ایک ہاتھ میں چمچہ، دوسرے میں لوٹا، قربانی کا سامان، تیسرے میں تسبیح اور چوتھے میں وید ہوتا ہے۔ اس کی سواری ہنس ہے۔ یہ میرو پربت پر اپنے بیوی سرسوتی سمیت رہتا ہے جو فنون لطیفہ کی دیوی ہے اور مور پر سوار ہوتی ہے۔

وشنو

ہندوؤں کا دوسرا دیوتا وشنو ہے۔ یہ ویدی معبود ہے۔ منتروں میں اسے معبود شمس ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کی اہمیت دیوتا شیوا کی نسبت زیادہ ہے۔ یہ اشیاء کی حفاظت اور بقاء کا ذمہ دار ہے۔ یہ رحم کا بھی دیوتا ہے۔ وشنو کی پرستش کرنے والوں کی یہ علامت ہے کہ وہ ہر صبح سرخ گیرو سے اپنی پیشانی پر وشنو کی مثلث نما علامت لگا لیتے ہیں۔

ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ وشنو کو عبادتوں، منتوں، قربانیوں اور دعاؤں کے ذریعہ اس عالم مادی میں نزول کے لیے آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ وشنو کسی بڑے انسان کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور معجزانہ کام سرانجام دیتا ہے۔ ہندوؤں کے جتنے بڑے بڑے ہیرو ہو گزرے ہیں وہ وشنو کا ہی مظہر قرار دیتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ وشنو کی روح ان میں حلول کر گئی تھی۔ وشنو کی روح صرف انسانوں کے اندر ہی حلول نہیں کرتی۔ جانوروں اور پودوں میں حلول کر جاتی ہے۔

اوتار

وشنو کے حسب ذیل ترتیب وار مشہور مظہر اور اوتار تھے۔

ا۔ متسیہ اوتار مچھلی کی صورت میں۔ ۲۔ کورم اوتار کچھوے کی صورت میں۔ ۳۔ ورہا اوتار سور کی صورت میں۔ ۴۔ نرسنگھ اوتار، انسان اور شیر کی مرکب صورت میں۔ ۵۔ دامن اوتار بونے کی صورت میں۔ ۶۔ پرش رام کی صورت میں۔ ۷۔ رام اوتار۔ ۸۔ کرشن اوتار۔ ۹۔ بدھ اوتار میں ابھی دسواں یعنی کالکی اوتار باقی ہے جو ۴۲۵۰۰۰ سال میں ظاہر ہوگا۔

ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ دنیا کو تباہی سے بچانے کے لیے وشنو نے نو اوتار لیے۔ جب دنیا کی اخلاقی حالت خراب ہو جاتی ہے تو خدا اس کو اصلاح کے لیے حیوان یا انسان کی صورت میں زمین پر جلوہ گر کرتا ہے۔ اس نظریے کی بنا پر بعض دیگر مذاہب ہندو مذہب میں ضم ہو گئے مثلاً بدھ مت اور بھاگوت مذہب۔

۲۰۰ ق۔م اور ۲۰۰ء کے درمیان فلسفہ ویدانت کا بہت زور تھا۔ اس فلسفہ کی وجہ سے وشنو پرستی پر زوال آ گیا۔ جنوبی ہند کے شہر سری نگم کے مندر کے ناظم رامانوج نامی ایک شخص نے وشنو پرستی کا احیاء کیا۔

وشنو کے چار ہاتھ دکھائے جاتے ہیں جن میں سے ایک میں سنکھ، دوسرے میں گدا (گرز)

تیسرے میں چکر (چرخ) چوتھے میں پدم (کنول) وشنو کی سواری گرسٹر ہے جو انسان اور پرند کی مرکب صورت ہے اس کی بیوی لکشمی حسن و دولت کی دیوی ہے۔

وشنومت کے فرقے

وشنو مذہب میں انسان اور خدا کے تعلق پر بحث کی جاتی ہے۔ اس بحث اور تشریح میں وشنومت کے دو فرقے پیدا ہو گئے۔ ایک فرقہ یہ کہتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع ہے۔ اس کی مثال وہ بلی کے بچے سے دیتا ہے کہ جس کو اس کی ماں اپنے منہ میں پکڑ کر لے جاتی ہے اور بچے کو اپنی طرف سے کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ دوسرا فرقہ یہ کہتا ہے کہ خدا خود انسان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ انسان خود اپنا قدم خدا کی طرف بڑھاتا ہے تب خدا اس کی طرف آتا ہے۔ وہ اس کی مثال بندر کے بچے سے دیتے ہیں جو اپنی ماں کے سینے سے چمٹ جاتا ہے اور ماں اس کو لے جاتی ہے۔

رام نوج کے فرقے کے بالمقابل بنگال میں کٹیانیا (۱۴۸۵ء تا ۱۵۳۳ء نے ایک نئے فرقہ کی بنیاد ڈالی بنگال کے لوگ رقص و سرود کے بہت دلدادہ اور شائق تھے۔ اس لیے اس نے غور و خوض اور مراقبہ کی جگہ عشقیہ بھجنوں کو دے دی۔ یہ بھجن وشنو کی تعریف میں گائے جاتے تھے۔ کٹیانیا کو کرشن کا مظہر قرار دے دیا گیا، مندروں میں کرشن اور رادھا کی مورتیوں کے ساتھ اس کی بھی مورتی رکھ دی گئی۔

ایک فرقہ ولابھا (۱۴۷۹ء تا ۱۵۳۱ء) نے قائم کیا۔ اس فرقہ کے نظریہ کے مطابق پروہت اور گرو صرف چند خاندانوں سے ہو سکتے ہیں اور انہی کو صرف مندر بنانے کے اختیارات ہیں۔ اس فرقہ کے ہر فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ ان مندروں کی زیارت کرے۔ اس وجہ سے پروہتوں کا مذہبی مقام بہت بلند ہو گیا۔ جس سے بے شمار قباحتیں پیدا ہو گئیں۔

وشنومت کی خدمات

اس فرقہ کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ذات پات کی تمیز کے خلاف آواز بلند کی۔ آج ہندوستان میں ذات پات کے خلاف جو تحریکیں اٹھتی ہیں وہ سب اسی کی صدائے بازگشت ہیں۔

انھوں نے مذہب کی تبلیغ کے لیے دیسی زبان کو استعمال کیا اور اس سے قبل سنسکرت کے علاوہ کسی اور زبان میں مذہب کو بیان کرنا گناہ عظیم خیال کیا جاتا تھا۔ اس طرح سنسکرت کے تقدس اور اجارہ داری کو ختم کر دیا۔

وشنوؤں نے اپنے فرقہ کی بنیاد محبت اور ہمدردی پر رکھی، جس کے باعث باہمی اتحاد کو بہت تقویت ملی۔

شیو

شیو برباد کرنے والا دیوتا ہے۔ اس کی پیشانی پر ایک تیسری آنکھ...... (تری لوچن) ہے جب وہ اسے کھولتا ہے تو آگ اس طرح نکلنا شروع ہو جاتی ہے گویا ایک آتش فشاں پھٹ پڑا ہے۔ ہر چیز جل کر

راکھ ہو جاتی ہے۔ کام دیو (عشق کا دیوتا) اس کی نگاہ غضب کا شکار ہو کر اپنے جسم سے محروم ہو گیا۔

یہ رگ وید کے دیوتا رڈر یعنی ہوا پانی کے دیوتا سے مشابہ ہے۔ بعد میں یہی دیوتا اگنی کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ ویدک زمانہ میں یہ دیوتا تباہی و بربادی کے متصور ہوتے تھے۔

شیو جی کے مقلدین کی علامت لنگم تھی۔ اس نشان سے ان کے مندر بھرے ہوئے تھے۔ اسی علامت پر فرقہ لنگاتیوں کا قائم ہوا۔ پجاری مندر میں جاتے، لنگم کو بوسہ دیتے اور ان سے دعائیں مانگتے۔ میسور (دکن) کی دراوڑی اقوام میں لنگم کی پرستش جاری ہے۔

موہنجوڈارو سے دریافت شدہ اثرات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیو جی کی پرستش وہاں عام تھی۔ اس جگہ شیو جی کی مورتاں تین سروں والی ملی ہیں۔ گول لمبے پتھر بھی ملے ہیں جو مرد کے عضو تناسل کے مشابہ بنائے گئے ہیں۔ شیو جی کی اس پرستش کو شکتی پوجا کہا جاتا ہے۔ شکتی کے معنی طاقت اور قوت جماع ہیں۔ اس پرستش سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو یہ سمجھتے تھے کہ یہ دیوتا پیدا کرنے اور نیست و نابود کرنے کی طاقتوں کا مالک ہے۔ شیو جی کا تعلق رقص و غنا سے بھی رہتا ہے۔ اس کو بعض مجسموں میں ایک دلکش انداز میں رقص کرتے ہوئے بھی دکھایا گیا ہے یہ اس کا نٹ راج روپ ہے۔

لنگم کے مقابل پر یونی (زنانہ عضو) کی بھی پرستش ہوتی تھی۔ شیو کی بیوی کا نام کالی دیوی ہے جن کے مختلف مقامات پر مختلف نام ہیں، کالی، پربتی اوما، درگا، یہ مختلف نام مختلف اوصاف کی وجہ سے ہیں۔

کالی دیوی موت اور زندگی کی دیوی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے متعلق ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ ایک دن تمام عالم کو فنا کر دے گی۔ اس دیوی کی شکل بہت ہی ڈراؤنی بنائی گئی ہے۔ سیاہ رنگ ہے، منہ کھلا ہوا ہے گویا کھانے کو انسان مانگتی ہے۔ زبان باہر نکلی ہوئی ہے۔ گلے میں سانپوں اور کھوپریوں کے ہار پڑے ہوئے ہیں۔ انسانوں کی لاشوں پر ناچتی ہوئی نظر آتی ہے۔ چہرہ اور چھاتیاں خون سے لتھڑے ہوئے ہیں۔ پربتی اوما کی حیثیت سے ایک حسین اور رحم دل ماں دکھائی گئی ہے۔ اس کی مورتی اس طرح بنائی گئی ہے کہ اس کے دونوں ہاتھ آگے کو بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ اس امر کی علامت ہے کہ وہ تمام مخلوق کی مدد کے لیے تیار ہے۔

درگا کی حیثیت سے ایک غضب ناک حسین عورت کی شکل میں شیر پر بٹھایا ہے۔

شیومت کے فرقے

شیومت کے متعدد فرقے ہیں۔ ایک فرقہ پسوتپار ہے یعنی گھریلو جانوروں کے آقا کا پجاری، شیو کی ایک اہم صفت گھریلو جانوروں کا آقا ہے۔ اس فرقہ کا طریقہ عبادت یہ ہے کہ وہ جسم پر راکھ مل لیتے ہیں اور رقص و سرود کی محفلیں قائم کرتے ہیں۔ بیل کی طرح آوازیں نکالتے ہیں۔ اس فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا کرما کی بندھن میں جکڑا ہوا نہیں بلکہ اس شیو کے پجاری مرنے کے بعد خدا قرب حاصل کر لیتے ہیں۔

دوسرا فرقہ شیو سدھانت ہے۔ اس فرقہ میں خدا کا تصور پایا جاتا ہے ان کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کرما کی بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے اور روح ازلی ابدی ہے۔

تیسرا فرقہ لنگاتیوں کا ہے۔ یہ جنوبی ہند میں گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی میں تھا۔ ان لوگوں کے پاس سونے چاندی کے لنگم ہوتے تھے۔ یہ فرقہ ذات پات کا شدید مخالف تھا۔ پروہتوں کا زبردست احترام کرتے تھے۔ یہ لوگ مردوں کو دفن کرتے تھے اور بیواؤں کی دوسری شادی کو جائز قرار دیتے تھے۔

چوتھا فرقہ نتارا کہلاتا ہے جس کا مرکز بنگال ہے۔ یہ شکتی کے نظریہ کا سخت حامی ہے۔ یہ فرقہ راہبانہ زندگی کا شدید مخالف ہے۔ جنسی تعلقات، گوشت، مچھلی، منشیات کے استعمال کو عبادت کی حیثیت دیتا ہے۔ یہ لوگ خدا کو بحیثیت ماں کے مانتے ہیں اور خدا کو اوما دیوی کی شکل میں ظاہر کیا گیا۔ اس وجہ سے دیوتا کی نسبت دیوی کی زیادہ اہمیت ہے اور عورتیں بھی پروہت اور گرو بن سکتی ہے۔

شیو کی اولاد

شیو کا ایک بیٹا کارتیکے ہے جو دیوتاؤں کی فوج کا قائد ہے۔ دوسرا بیٹا گنیش ہے، یہ عقل و فن کا دیوتا ہے۔ اس کی مورت اس طرح بنائی جاتی ہے کہ جسم تو انسان کا ہوتا ہے، سر ہاتھی کا۔ وہ ایک چوہے پر سوار ہوتا ہے۔ اس کی بیوی لکشمی ہے گنیش اور لکشمی ہندوؤں میں محبوب ترین دیوتاؤں میں سے ہیں۔

شیو جی کی بیوی پاربتی

پاربتی کی متعدد صورتیں ہیں جن میں سے خاص یہ ہیں۔

۱۔ پاربتی اور اوما کی حیثیت سے وہ ایک حسین عورت اور رحمدل ماں ہے۔

۲۔ درگا کی حیثیت سے وہ انتہائی غضب ناک ہے۔ جسے خوش کرنے کے لیے بنگالی اپنا سب سے بڑا تہوار یعنی درگا پوجا مناتے ہیں۔

۳۔ کالی کی حیثیت سے وہ وباؤں، زلزلوں، طوفانوں اور سیلابوں کی دیوی ہے۔

شکتی پوجا

بشنو اور شیومت کے ماننے والوں کے بعد سب سے زیادہ شکتی کے بھگت ہیں جو خدا کو بہ حیثیت ماں کے مانتے ہیں اس فرقہ کا بنگال میں سب سے زیادہ زور ہے ہندوؤں کے بعض مشہور و معروف علماء اور درویش شنکر آچاریہ، رام کرشن پرم ہنس سوامی دویکانند وغیرہ "مادر الٰہی" کے ماننے والے ہیں۔[1]

شکتی کے ماننے والے فلاسفہ روح کو مذکر اور مادے کو مونث مانتے ہیں جنھیں پرش اور پراکرتی کہتے ہیں۔ انھیں کے ملنے سے سارے عالم کی تخلیق ہوئی ہے۔ ہندوؤں کا مشہور بت "اردھا زاری ایشوری" بھی اسی چیز کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ بت گویا برہما کا ہے۔[2]

ثانوی حیثیت کے دیوتا

۱۔ اپسرائیں یا جنت کی رقاصائیں جو راہبوں کو سبھاتی ہیں۔ ۲۔ کنر سماوی موسیقار جن کا اوپر کا

۱۔ نگار خدا نمبر ص ۶۶۔ ۲۔ نگار خدا نمبر ص ۶۶۔

حصہ جسم انسان کا اور نیچے کا پرندکا ہے۔ ۳۔ ناگا یعنی سانپ۔ ۴۔ ورکش دیوتا جو درختوں کے محافظ ہیں۔ ۵۔ یکشنی (عورت) اور یکش (مرد) جو دولت کے دیوتا کبیر کے ماننے والے ہیں۔ ۶۔ راکشش یا دیو جن میں سے مشہور راوں ہوا ہے جس کے دس سر تھے۔

مذکورہ بالا دیوی دیوتاؤں کے علاوہ ذاتی، خانگی اور گاؤں کے الگ الگ دیوتا ہیں خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوؤں کے کل دیوی دیوتاؤں کی کل تعداد ۳۳ کروڑ ہے۔[1]

گائے کی پوجا

حیوانات کی پرستش وحشی قوموں کی یادگار ہے۔ وہ حیوانات کو انسانوں، دیوی اور دیوتاؤں سے برتر خیال کرتے ہیں۔ ہندو کلچر کی بنیاد بھی گائے بیل کی عظمت اور پرستش پر ہے۔ ہندوؤں میں ویدوں سے لے کر پرانوں، سمرتیوں اور مذہبی قصص تک میں اس کی پرستش اور عظمت کا ذکر ہے۔ وید کے چند منتر درج کیے جاتے ہیں۔

''پرجاپتی دیوتا (خالق کائنات) اور پرمیشٹھی دیوتا اس کے دو سینگ ہیں۔ اندر کا سر ہے۔ اگنی دیوتا اس کی پیشانی ہے۔ یم دیوتا اس کے گلے کی گھنڈی ہے۔ سوم دیوتا اس کا مغز ہے۔ آسمان اوپر کا جبڑا ہے اور زمین نیچے کا جبڑا۔''

پھر فرمایا: ''سارا جہان اور کل دیوتا گویا گائے کا ہی سراپا ہے۔'' (اتھروید کانڈ ۹ سوکت ۷)

ایک جگہ یوں فرمایا: ''تجھ پیدا ہوتی ہوئی اور پیدا ہو چکی ہوئی کہ سلام اور سجدہ، تیرے بالوں کے لیے، تیرے کھروں کے لیے اے اگنی دیوتا کے مجسمہ تجھے سلام اور سجدہ ہے۔'' (اتھروید کانڈ ۱۰ ا۔ سوکت ۱۰)

رگ وید میں ہے: ''بیل نے اٹھایا ہوا ہے زمین کو آسمان کو۔'' (رگ وید ۱۰: ۳۱: ۱۰)

اتھروید میں ہے۔ ''بیل نے زمین اور آسمان کو اٹھایا ہوا ہے۔'' (اتھروید ۴: ۱۱: ۱۰)

گائے پرستی کا اثر

اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ قدیم ہندوستان میں دھرماتما لوگ گائے کے گوبر میں سے دانے چن چن کر کھاتے، اس کا پانی نچوڑ کر پیتے (مہابھارت) تمام دھرم شاستروں میں اس کا گوہ اور پیشاب پینا گناہوں کی معافی کا ذریعہ خیال کیا گیا ہے۔ (منوسمرتی)

برہما جی کی مدح میں لکھا ہے کہ وہ منوں گوبر روزانہ نچوڑ کر اس سے غسل کرتے (مہابھارت) کرشن جی بیل پر سوار ہونے سے قبل اس کی پیٹھ کو چھو کر اسے تعظیم دیتے تھے۔ (مہابھارت)

مہاتما گاندھی نے کہا کہ جب تک ہندوستان میں ایک گائے بھی ذبح ہوگی اس وقت تک اس

[1] نگار خدا نمبر ص ۶۶۔

ملک کو حقیقی معنوں میں آزاد تصور نہیں کیا جائے گا۔

"Freedom is no freedom at all if cow slaughter is not prohibited"

مہاتما گاندھی کے نزدیک گائے اور آدمی کے ذبح کرنے میں کوئی فرق نہیں، کہتے ہیں۔

"That he makes no distinctions between the slanghter of man and that of cows.

سوامی دیانند کہتے ہیں کہ وید کی رُو سے ذبح گاؤ کے جرم میں ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کو ذبح کر کے گائے کو خوش کرنا چاہیے۔ (سوامی دیانند کا رگوید بھاشن منڈل ۱ سوکت ۱۲۱ منتر ۱۰۔ یجروید بھاشن ادھیاء ۳۳ منتر ۱۴ وغیرہ وغیرہ)

ویدوں میں یہ صریح حکم ہے کہ اگر شودروں کے پاس گائیں ہوں تو ان سے چھین لینی چاہئیں۔ صوبہ بہار میں ایک اچھوت قوم کیکٹ نام بستی میں رہتی تھی۔ ان کے پاس گائیں اور دولت تھی۔ ان کے اس جرم کی وجہ سے آریوں نے ان کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور اپنے سپہ سالار فوج اندر کو کہا۔

"اے اندر! کیکٹوں میں گائیں تیرا کیا بناتی ہیں۔ نہ تیری نذر نیاز کے لیے دودھ دوہاتی ہیں اور نہ یگیہ کا برتن گرم کرتی ہیں۔ اے طاقت ور اندر! تم ان گایوں کو ہمارے پاس لاؤ اور پرمکند (اچھوتوں کے راجا) کی دولت بھی ہمیں دے دو۔" (رگوید منڈل ۳ سوکت ۵۳ منتر ۱۴)

منوسمرتی ادھیاء ۹ شلوک ۴۱۶ اور ۴۱۷ کی وضاحت اور تفسیر کی رُو سے شودر کو دولت اور گائے وغیرہ رکھنے کی اجازت نہیں۔ برہمن کو ہر وقت یہ اختیار ہے کہ وہ ان سے جبراً چھین لے۔

انسانیت کی توہین

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ انسان اپنی ذہنی قابلیت اور اخلاقی قوتوں کے لحاظ سے دنیا کی سب چیزوں سے نہ صرف افضل ہے بلکہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ہی بنائی ہیں۔ گائے کو انسان سے افضل کر دینا یا برابر قرار دینا نہ صرف علم و عقل کے خلاف ہے بلکہ انسانیت کی توہین ہے۔ قرآن مجید نے انسان کے وقار کو بلند کیا اور اعلان کیا۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (بنی اسرائیل آیت ۷۰) اور ہم نے نوع انسان کو قابلِ تعظیم بنایا۔

دوسری جگہ یہ اعلان کیا کہ دنیا و مافیہا کی تمام چیزیں بنی نوع انسان کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ ارشاد ہے: هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (بقرہ آیت ۲۹) اللہ کی ذات ہے جس نے تمہارے لیے پیدا کیا وہ سب کچھ جو زمین میں ہے۔

ہندومت کے عظیم ہادی اوران کے حالات زندگی

شری رام چندر جی (ایک اوتار)

ہندوؤں کا اوتار کے متعلق عقیدہ

ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ وشنو جی کئی بار مختلف شکلوں میں آئے اور دنیا کی پرورش اور ربوبیت کی۔لیکن اس کے بارہ میں اختلاف ہے کہ وشنو جی دنیا میں کتنی بار اوتار بن کر آئے۔اکثریت کا عقیدہ یہ ہے کہ وشنو دس بار مختلف شکلوں میں اوتار بن کر آیا جن میں سے اب تک نو اوتار آ چکے ہیں۔دسواں اوتار باقی ہے۔۱۔مچھ اوتار۔۲۔کورم اوتار۔۳۔براہ اوتار۔۴۔نرسنگھ اوتار۔۵۔وامنہ اوتار۔۶۔پرسرام اوتار۔۷۔رام اوتار۔۸۔کرشن اوتار۔۹۔بودھ اوتار۔۱۰۔کلجگ کے آخری دور میں ملیچھ لوگوں یعنی ہندوؤں کے دشمنوں کو مارنے کے لیے بھادوں کی تیسری تاریخ کو شکل پچھ میں شہر سنبھل جسا نامی برہمن کے گھر میں کلکی اوتار ظاہر ہوگا۔وہ ایک برہمن ہوگا اور دنیا میں فتنہ وفساد کو ختم کر دے گی اور ملیچوں یعنی مسلمان عیسائی اور یہود وغیرہ کا غلبہ باقی نہ رہے گا۔اس کے بعد جگ (عہد زریں) شروع ہوگا[1]

رام چندر جی

ہندوؤں کے نظریہ کی رو سے رام ساتویں اوتار ہیں۔ان کا ذکر مشہور رزمیہ نظم رامائن میں کیا گیا ہے۔ایودھیا کا حکمران راجہ دسرتھ تھا۔ان کی تین بیویاں تھیں۔کوشلیہ جس سے رام چندر پیدا ہوئے۔دوسری سوترا جس سے جڑواں لکشمن اور شتروگھن پیدا ہوئے۔تیسری بیوی کیکئی سے بھرت پیدا ہوا۔

رام اور لکشمن کا آپس میں پیار تھا۔اسی طرح بھرت اور شتروگھن ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔دسرتھ کے چاروں بیٹے طاقت ور لائق اور شاہانہ خصوصیات کے حامل تھے لیکن رام سب سے عقل فہم طاقت اور نیکی میں بڑھے ہوئے تھے۔اس وجہ سے دسرتھ اپنے بڑے بیٹے رام کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا۔لوگ بھی رام سے محبت کرتے تھے۔اس وجہ سے عوام کی دلی خواہش تھی کہ رام اپنے باپ کے بعد جانشین بنے۔

جب بادشاہ کے ارادہ کے متعلق وزراء کو علم ہوا تو رام کی عوام میں ہردلعزیزی کی وجہ سے ان کو یہ خوف لاحق ہوا کہ ان کا رعب داب عوام سے اٹھ جائے گا۔انھوں نے ساز باز کر کے کیکئی کے ذریعہ رام کو تخت سلطنت سے محروم کروا کر چودہ سال کے لیے بن باس دلوا دیا اور اس کی جگہ بھرت کو ولی عہد نامزد کروا دیا۔دسرتھ نے کیکئی سے کسی خوشی کے لمحہ میں وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ جو کچھ کہے گی وہ اسے مان لے گا۔

1۔ تلخیص دبستان مذاہب مصنفہ کیخسرو اسفند یار ص ۱۴۹ تا ۱۵۱۔

بادشاہ رام کے ظاہری اور باطنی اوصاف سے واقف تھا اور قلبی لگاؤ بھی زیادہ تھا۔ کیکئی کی اس فرمائش سے بہت رنجیدہ ہوا۔ کیکئی سے کیے ہوئے وعدہ کو پورا بھی کرنا تھا۔ بادشاہ نے غصہ کا اظہار کرتے ہوئے کیکئی سے کہا کہ میں نے تمھارے چہرے سے دھوکا کھا کر تمھیں بیوی بنایا تھا۔ مگر تم تو ناگن نکلی۔ بادشاہ غم کے مارے زمین پر گر پڑا۔ رام اپنے باپ کے اس دکھ کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ چودہ برس کے لیے جنگل میں بن باس لینے کے لیے تیار ہو گیا۔ شری چندر جی کی شادی اودھ کی راجکماری سیتا سے ہو چکی تھی چنانچہ جان نثار بھائی لکشمن اور وفادار بیوی سیتا بھی ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ چودہ سال جلاوطنی کی زندگی میں رام جی مختلف مقامات پر رہے۔ اس دور کے مختلف رشیوں کی صحبت سے بھی فیض یاب ہوتے رہے۔ راکشسوں سے مقابلہ کر کے رشیوں کی حفاظت بھی کی۔

جلاوطنی کے زمانہ میں سب سے اہم واقعہ راون کا سیتا کو اغوا کرنا پھر سیتا کی بازیابی کے لیے راون سے لڑائی ہے یہ لڑائی متھ (دیو ملائی) کے رنگ میں بیان کی گئی۔ یہ اس دور کے ادب کا ایک خوبصورت انداز تھا۔ ہندو ذہنیت نے ہنومان، وانر اور فوج کو بندر ریچھ بنا دیا اور بتایا کہ رام نے ان کی مدد سے رام کا مقابلہ کیا اور لنکا کو فتح کیا۔

وانر ایک قبیلہ کا نام تھا۔ جس کا سردار سوگریو اور اس کا بھائی تھا۔ ہنومان وزیر تھا۔ سوگریو نے اردگرد کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے جو بعض حیوانات اور پرندوں کے نام پر تھیں[1] فوج اکٹھی کی جن میں اکثریت وانر قبیلہ کے سپاہیوں کی تھی۔

رام اپنی اتحادی فوج کے ساتھ لنکا پر حملہ آور ہوا۔ راون کے دفاعی نظام کو توڑا۔ ساگریو ایک دستہ کے ساتھ لنکا شہر میں داخل ہو کر راون کے محل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وانر فوج نے لنکا کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہوا تھا۔ رام نے انگلا (ایک سپہ سالار) کو بلایا اور کہا کہ میرا یہ پیغام راون کو پہنچا دو کہ "تمہارا وقت قریب آن پہنچا ہے۔ رام تمھارے دروازے پر کھڑا ہے۔ مال و دولت اور اقتدار نے تم کو مغرور بنا دیا ہے تو نے دنیا کو بہت ستایا اگر تو کھلے میدان میں آ کر کھڑے رہے تو تیرے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ بہادر انگلا نے ایسا ہی کہا یہ پیغام سن کر راون نے غضب سے للکارا اور چھپٹا۔ انگلا کے واپس آتے ہی رام نے فوج کو چڑھائی کا حکم دے دیا۔

راون نے بھی اپنے جاسوسوں کے ذریعہ رام کی فوجی طاقت کا اندازہ لگا لیا۔ راون نے ایک بڑا فوجی دستہ وانر فوج کے مقابل بھیجا اور گھمسان کا رن پڑا۔ اس لڑائی میں راون کے بیٹے اندر جیت بھی شامل

1۔ قوموں کی تاریخ سے یہ ظاہر ہے کہ پرندوں اور جانوروں کے ناموں پر نام رکھے جاتے تھے۔ آج بھی یورپین اقوام بھی فاکس (لومڑ) ولف (بھیڑیا) بش (جھاڑی) اپنے نام رکھتی ہیں۔ مسلمانوں میں شیر خان، شیر باز اور ہندوؤں میں طوطا رام عام نام ہیں۔

تھا۔ دونوں طرف سے بہادری کے جوہر دکھائے گئے۔ لڑائی میں زیروبم آتے رہے کبھی راون کا پلا بھاری دکھائی دیتا تھا اور کبھی رام کا۔ رام کی فوج راون کے محل کے قریب پہنچ گئی۔ راون نے اپنے محل میں وانر فوج کے نعروں کی آواز سنی اسے معلوم ہوا کہ سوگریو کی قیادت میں وانر فوج نے قلعہ پر حملہ کر دیا ہے۔ راون نے دھرم راکشس سے کہا کہ وہ خود میدان میں آئے دھرم راکشس نے ہنومان کے دستہ پر حملہ کیا مگر مارا گیا وجر دہشتر ایک طاقت ور فوج لے کر انگلا کے مقابلہ پر نکلا۔ بہت سے وانر مارے گئے۔ بالآخر انگلا نے دست بدست لڑائی میں وجر کو ختم کر دیا۔ راون کے حکم پر پربست نے اکمپن فوج سے حملہ کیا اور زبردست جنگ ہوئی۔ ونر بھاگنے والے ہی تھے۔ ہنومان نے انھیں حوصلہ دیا۔ ہنومان نے اکمپن پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔ راکشس فوج بھاگ نکلی۔ راون نے اپنے دفاعی انتظامات کا جائزہ لیا۔ اندر جیت کے ماتحت ایک فوج کا دستہ قلعہ سے باہر مقابلہ کے لیے بھیجا گھمسان کا رن پڑا۔ راون کی فوج کے بڑے بڑے سپہ سالار کھیت ہوئے۔ راون کی فوج بھاگ نکلی۔ اب راون خود رام کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلا۔ اس حملہ میں لکشمن زخمی ہوا۔ ہنومان لکشمن کو اٹھا کر رام کے پاس لے گیا۔ رام نے راون پر شدید حملہ کیا۔ جس سے راون زخمی ہو کر گر پڑا۔ بے بس تصویر بن کر راون رام کے سامنے کھڑا تھا۔ رام نے اسے کہا کہ اب تم جاؤ اور آرام کر و کل تازہ دم ہو کر ہتھیاروں کے ساتھ مقابلہ کے لیے آنا۔

اگلے دن راون کا بھائی کمبھ کرن مقابلہ کے لیے نکلا۔ انگلا بھی لڑائی میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ سوگریو بھی شدید زخمی ہوا۔ کمبھ کرن بے ہوش سوگریو کو اٹھا کر لنکا کی جانب چل دیا۔ راکشس فوج نے فتح کے نعرے بلند کیے۔ اب کمبھ کرن نے وانروں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ بالآخر رام نے تیر سے اس کی ٹانگوں کو بے کار کر دیا لیکن کہنیوں کے بل آگے بڑھتا گیا۔ بالآخر رام نے اس کا سر کاٹ دیا۔ جب کمبھ کرن کے مرنے کی خبر راون کو پہنچی تو بہت دل برداشتہ ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ رام کی فوج قلعہ اور اشوک باغ میں داخل نہ ہو، اسی گہری سوچ میں محل میں آیا۔ راون کے بیٹے اندر جیت نے باپ کو حوصلہ دیا اور منتشر فوج کو اکٹھا کر کے حملہ کر دیا۔ اس نے ہزاروں وانروں کو قتل کر دیا۔ اس حملہ میں رام اور لکشمن دونوں بھائی بے ہوش ہو گئے اور اندر جیت اس خوشی میں باپ کو خوش خبری دینے گیا۔ رام اور لکشمن کا علاج کیا گیا، دونوں ہوش میں آ گئے۔ زخم بھر گئے۔ جنگ دوبارہ شروع ہوئی۔ اب سوگریو نے رام سے مشورہ کر کے وانروں کی فوج کا دستہ شہر میں داخل کر دیا اور حکم دیا کہ شہر کو آگ لگا دیں۔ چنانچہ بہادر وانروں نے لنکا کو آگ لگا دی۔ ہر طرف سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ آخر کار راون نے کمبھ کرن کے بیٹوں کمبھ اور نکھمہ کو راکشس سورماؤں کے ساتھ آخری لڑائی لڑنے کے لیے بھیجا ایک خوفناک جنگ کے بعد سوگریو نے دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور بہت سے سورما مارے گئے۔ آخر میں پھر راون نے اپنے بیٹے اندر جیت کو رام کی فوج پر حملہ کرنے کو کہا۔ رام نے ہنومان اور دوسرے سالاروں کو اندر جیت کے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ ایک زبردست لڑائی ہوئی۔ لکشمن نے

ایک زبردست تیر مار کر اندر جیت کو ختم کر دیا۔ لکشمن بھی زخمی ہوا۔

راون نے سیتا کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا لیکن اس کے ایک وزیر ''سپارسوہم نے راون کو اس کام سے باز رہنے کا مشورہ دیا کہ عورت کو قتل کرنا بزدلی ہے۔ رام کو قتل کرو۔ اب بچی کھچی فوج پورے حربی ساز و سامان کے ساتھ مقابلہ کے لیے نکلی۔ رام نے تیروں کی بوچھاڑ سے فوج تباہ کر دی۔ اس آخری حملہ کی ناکامی کی وجہ سے لنکا کے ہر گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ راون لنکا سے باہر نکلا تو لکشمن نے اس کی راہ روکی۔ رام اور راون کا مقابلہ ہوا۔ آخر کار راون اپنے انجام کو پہنچا۔ وبھیشن (راون کا بھائی جو پہلے ہی رام کے اتحادیوں میں شامل ہو چکا تھا) کو ایک شاندار تقریب میں لنکا کو بادشاہ بنا دیا گیا۔ سیتا بناؤ سنگار کے ساتھ رام کے پاس آئی۔ رام اور سیتا پشک (اڑن کھٹولا) پر بیٹھ کر ایودھیا آئے۔ عوام نے رام کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ رام نے اقتدار سنبھالا۔ بھرت کی دلی خواہش پوری ہوئی۔ سیتا نے خوشی سے موتیوں کی مالا ہنومان کے گلے ڈالی۔ رام نے بحیثیت ایک اوتار ایک ایسی حکومت کی۔ جو انصاف اور خوش حالی کے لیے ضرب المثل تھی [1]۔

بھگوت گیتا

فلسفہ کرشن مہاراج

کرشن مہاراج کے وقت ہندوؤں کی مذہبی حالت

کرشن مہاراج کی بعثت کے وقت ہندو خواہ وہ راجا تھا یا رعایا فسق و فجور میں مبتلا تھے۔ ہر طرف جہالت و گمراہی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ حجر، شجر، سورج، چاند غرض کہ کائنات کی ہر شے معبود بنی ہوئی تھی۔ ظلم و ستم کا بازار گرم تھا۔ وقت تقاضا کرتا تھا کہ ہندو دھرم کی اصلاح کے لیے کوئی مرد اٹھے۔ اس ظلمت کے وقت کرشن جی مہاراج نے ہندوؤں کی اصلاح کا بوجھ اپنے کندھوں پر لیا۔

اخبار تیج کے کرشن نمبر بابت ۷ ستمبر ۱۹۳۹ء میں پنڈت گنگا پرشاد اپادھیائے نے اس وقت کے ہندو دھرم کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

''ویدک دھرم مٹ چکا تھا۔ اس کا صرف نام باقی تھا...... ایسے وقت میں شری کرشن نے ویدک تہذیب کو نیست و نابود ہونے سے بچانے کے لیے جو جدوجہد کی اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں دوسری نہیں

---

[1] رامائن میں متھ کے رنگ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ راجدھانی میں سیتا کے متعلق یہ چہ میگوئیاں شروع ہوئیں کہ سیتا راون کے پاس اتنا عرصہ رہنے کی وجہ سے عصمت سے محروم ہو چکی ہوں گی۔ پاک دامنی ثابت کرنے کے لیے سیتا کو امتحان کے طور پر آگ میں سے گزرنا پڑے گا چنانچہ وہ گزر گئیں اور امتحان میں کامیاب ہو گئیں۔ شری رام کے اس طرز عمل سے ایسی دل برداشتہ ہوئیں کہ انھوں نے دعا کی زمین پھٹ گئی اور زمین میں سما گئی۔ رام نے اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر اس کے ہاتھ صرف چٹیا آئی جو ہندو چوٹیا چھوڑتے ہیں۔ وہ اس واقعہ کی یاد میں ہے۔

ملتی۔ یہ سچ ہے کہ کرشن جی کو دھرم کے محفوظ رکھنے میں وہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی جو ان کی کوششوں سے مطابقت رکھ سکے۔ جو گراوٹ شری کرشن جی کی زندگی سے پہلے شروع ہوئی وہ اب تک جاری ہے۔"

فیضی نے کرشن جی مہاراج کے خیالات کا اظہار اس شعر میں کیا ہے۔

چو بنیاد دین ست گردو بسے
نمائیم خود را بہ شکل کسے

یعنی جب دین کی بنیاد کھوکھلی ہو جاتی ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے آپ کو کسی کی شکل میں نمایاں کرتا ہے اور دین کی عمارت کو از سرِ نو مستحکم بنیاد پر کھڑا کرتا ہے۔

کرشن جی مہاراج کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہندو مذہب کی بنیاد کھوکھلی ہو چکی تھی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ ان کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یعنی کرشن جی مہاراج اپنے تئیں اللہ تعالیٰ کا مظہر قرار دیتے ہیں۔

تین قسم کے فلسفے

جس دور میں آپ نے پرورش پائی اس وقت تین قسم کے فلسفے رائج تھے۔ ا۔ فلسفہ سانکھیہ۔ ۲۔ فلسفہ جوگ مارگ۔ ۳۔ فلسفہ ویدانت۔

فلسفہ سانکھیہ والے فلسفی کہتے تھے: "مصائب انسانی کی اصلیت دریافت کر کے ان سے نجات پانا علم الیقین کا درجہ ہے۔"

فلسفہ جوگ مارگ کا نظریہ تھا: "ریاضتہائے جوگ سے خدا شناسی کا مرتبہ حاصل کرنا علم الیقین ہے۔" اور ویدانتی کہتے تھے۔ اپنی ذات اور خدا کو ایک جاننا یعنی مقام شہود علم الیقین ہے۔"

علم الیقین کے حصول کے لیے وسائل اور ذرائع کی ضرورت تھی۔ ان وسائل اور ذرائع میں اس وقت شدید اختلاف تھا۔ کرشن جی مہاراج نے وہ عمل بتا دیا جس کے ذریعہ انسان سچے علم کو حاصل کر سکتا تھا۔ گیتا میں انہی وسائل اور ذرائع کا علم پایا جاتا ہے اور سنکھیہ، جوگا اور ویدانت کے فلسفوں کی گمشدہ کڑیوں کو بیان کیا ہے۔

بھگوت گیتا

گیتا کا اصلی نام بھگتو گیتا اپنشد ہے یعنی بھگوان کے راز سربستہ کا اظہار۔ یہ کتاب مہا بھارت کے باب ۲۵ تا ۴۲ پر مشتمل ہے۔ اس میں اٹھارہ ادھیاء (Chapter) اور سات سو شلوک (Text) ہیں۔ جو کرشن اور ارجن کے درمیان مکالمہ ومخاطبہ کی صورت میں ہیں۔

مصنفین اور محققین کا اس بارہ میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے کہ بھگوت گیتا کرشن جی مہاراج کی تصنیف ہے یا بعد میں کسی اور شخص نے لکھ کر شری کرشن جی مہاراج کی طرف منسوب کر دی ہے۔

داس گپتا کی تحقیق کے مطابق گوئی تصنیف نہیں بلکہ اس میں بہت کچھ اُپنشدوں سے مستعار لیا گیا ہے۔[1]

اسی طرح مصنفین یہ بھی طے نہیں کر سکے کہ یہ کس زمانہ کی تصنیف ہے۔ داس گپتا کا بیان ہے کہ بھگوت گیتا میں برہم سوتر کا حوالہ موجود ہے اور برہم سوتر دوسری صدی قبل مسیح کے بعد کی تصنیف قرار دی جا سکتی ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ بھگوت گیتا دراصل (Ekanti viaisnaras) کی تصنیف ہے۔[2]

حقیقت یہ ہے کہ بھگوت گیتا کرشن جی مہاراج کی ہی کتاب ہے لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں تحریف وتبدل ہوتا رہا۔ یہ ظلم صرف بھگوت گیتا کے ساتھ ہی نہیں ہوا، بلکہ دنیا کی اکثر مذہبی کتب کے ساتھ ہوا ہے۔

جیسا کہ پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے۔ بھگوت گیتا کرشن جی مہاراج اور ارجن کے مابین مکالمہ ومخاطبہ ہے جو مہا بھارت کے میدان میں واقع ہوا۔ اس لیے جنگ مہا بھارت کے اسباب وقوع معلوم کرنے ضروری ہیں۔

ہستناپور کی ریاست میں دو رشتہ دار خاندان کورو اور پانڈو رہتے تھے۔ دونوں خاندانوں میں رقابت چلی آ رہی تھی۔ کورووں نے پانڈووں کو قتل کرنے کی سازش کی۔ پانڈو جو پانچ بھائی تھے (یدھشٹر، بھیم سین ارجن، نکل، سہدیو) وہ لباس تبدیل کر کے ہستناپور سے فرار ہو گئے۔ دوسرے ملکوں کے بادشاہوں کی مدد حاصل کرنے کے لیے کوشش کر رہے تھے تاکہ ان کی معاونت سے اپنی غصب شدہ املاک حاصل کریں۔

سفر کرتے کرتے پانچال کی سلطنت میں پہنچے۔ وہاں راجہ اپنی لڑکی کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ شرط یہ قرار پائی تھی کہ جو کوئی بہادر شہزادہ طلائی مچھلی کی آنکھ میں، جو جرِ ثقیل کے قاعدہ سے ایک ستون پر نصب کی گئی تھی، تیر لگائے اس سے شہزادی کی شادی کر دی جائے گی۔ اس سوئمبر میں مختلف ملکوں کے شہزادے آئے ہوئے تھے۔ یہ پانچوں بھائی بھی برہمنوں کے لباس میں وہاں پہنچ گئے۔ سب شہزادے مچھلی کی آنکھ میں نشانہ میں ناکام رہے۔ ارجن نے اٹھ کر ایسا تیر مارا کہ وہ عین نشانہ پر جا لگا اور سوئمبر میں شور وغل مچ گیا اور ناکام شہزادوں نے ارجن پر حملہ کرنا چاہا لیکن سری کرشن مہاراج بھی وہیں تھے۔ انھوں نے یہ کہہ دیا کہ برہمن نے شہزادی کو واجبی طور پر جیت لیا ہے۔ چنانچہ ارجن کے ساتھ شادی کر دی گئی۔

اس شادی کے بعد سری کرشن جی مہاراج نے پانڈووں کے حقوق واپس دلانے کے لیے دھرت راشٹر کے پاس ایک ایلچی بھیجا۔ شاہ کورو نے ان کو اندر پرست میں آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ پانڈووں نے نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔

کورووں نے جب اپنے چچیرے بھائیوں کو آرام کی زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھا تو ان کے حسد کی آگ جلنے لگی اور ان کو تباہ وبرباد کرنے کی سازشیں شروع کر دیں۔ چنانچہ مجلس شوریٰ منعقد ہوئی جس

---

[1] داس گپتا جلد دوم صفحہ ۲۷۸۔ [2] داس گپتا جلد اول ص ۴۲۱، ۴۳۲۔

میں کوروؤں کے چچا سکتی نے یہ مشورہ دیا کہ پانڈوؤں کو جوئے بازی کی دعوت دی جائے اور اس بازی میں ان سے سب کچھ جیت لیا جائے اور پھر ان کو جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جائے۔ چنانچہ کوروؤں نے پانڈوؤں کو جوئے بازی کی دعوت دی اور وہ کھیلنے پر رضامند ہو گئے۔ یدھشٹر جو پانڈوؤں میں سب سے بڑا بھائی اور شہزادی درو پدی کا سب سے بڑا خاوند، جوا کھیلنے لگا اور سب کچھ ہار گیا۔ یہاں تک کہ شہزادی درو پدی کو بھی ہار گئے۔ آخر کار مہا بھارت کی لڑائی کا یہی سبب بنا۔ ایک فریق پانڈو تھے اور دوسرا فریق کورو۔ کرشن جی مہاراج پانڈوؤں کی طرف سے شریک ہوئے۔ ارجن نے لڑائی کے وقت کرشن جی سے کہا کہ فریق مخالف ہمارے رشتہ دار ہیں۔ ان پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے۔ کرشن جی نے بحث کر کے اس کو لڑائی لڑنے پر آمادہ کیا۔ ان دونوں کا مکالمہ ومخاطبہ بھگوت گیتا کہلاتا ہے۔

گیتا کا موضوع

گیتا کا مرکزی موضوع ''کرم یوگ'' ہے۔ کرم کے معنی عمل اور یوگ کے لغوی معنی اتحاد کے ہیں۔ یعنی ایسا عمل جس کی مدد سے ایک فرد ایشور کی ذات سے وصل حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن گیتا کی اصطلاح میں کرم یوگ کا مفہوم یہ ہے۔ سماجی فرائض کو بے غرضانہ سرانجام دینا کرم یوگ کے لیے ضروری ہے کہ انسان کا عمل اس کی اپنی ذات کے لیے نہ ہو۔ نہ اس کے سامنے کوئی ذاتی مفاد بلکہ اپنی ذات سے بلند ہو کر محض خدا کی رضا اور عوام کی بھلائی کے لیے ہو جو کام خود غرضی سے کیا جائے گا۔ وہ انسان کے لیے پریشانیوں اور ہموم وآلام کا باعث بنے گا۔ شری رام چندر کے اس پرمغز وعظ (جو بعد میں بھگوت گیتا کے نام سے مشہور ہوا) سے پہلے آستک حلقہ میں زندگی سے متعلق دو نصب العین رائج تھے۔ پہلا نوورتی مارگ یعنی ترک دنیا کا سلبی نصب العین دوسرا پرورتی مارگ یعنی سماج میں رہ کر معاشرتی فرائض کو ادا کرنے کا ایجابی نصب العین۔ دوسرا نصب العین خود غرضی کے عنصر کو خارج نہیں کرتا۔ گیتا کا مقصد نوورتی اور پرورتی یعنی راہ دھیان اور راہ عمل کے کمال کو برقرار رکھتے ہوئے ان دو نصب العین کے درمیان ایک متوسط راہ دریافت کرنا ہے جو خیر الامور ہو۔ یعنی رہبانیت اور ترک دنیا سے قلب کی پاکیزگی کرنے کی بجائے معاشرہ میں ہی ایسا لائحہ عمل اختیار کیا جائے جو تزکیہ نفس کا موجب ہو۔ اسی طرح سماج میں فرائض کی ادائیگی بے غرضانہ ہو۔ گیتا نے زندگی کے ان دو نصب العین کو اکٹھا ملا کر یہ تعلیم دی ہے۔ تزکیہ نفس معاشرہ میں رہ کر کیا جائے اور معاشرتی فرائض کی ادائیگی ذاتی مفاد کے تحت نہ ہو۔ لیکن معاشرتی بھلائی اور خدا کی رضا ہو۔

فلسفہ بھگوت گیتا

شری کرشن جی مہاراج کے وقت ہندوؤں کے تمام فلسفے صرف ایک ہی محور کے اردگرد گھومتے تھے کہ مصائب اور تکالیف سے کس طرح نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ سری کرشن مہاراج نے بھی مصائب سے

نجات پانے کا راستہ بتایا۔ سب سے پہلے انھوں نے مصائب اور تکالیف کے سرچشمہ کی نشان دہی کی۔ آپ نے کہا کہ مصائب اور تکالیف مایا یا مغالطہ سے آتی ہے۔

مغالطہ کیا ہے؟

مغالطہ یہ ہے کہ انسان عالم مثال کی جھوٹی چیزوں کو حقیقی جانتا ہے اور انہی کی محبت میں حیران سرگرداں پھرتا ہے۔ اس سے تکلیف اور مصیبت کا صدور ہوتا ہے۔ شری کرشن جی مہاراج کے فلسفہ کی رو سے عالم مثال غیر حقیقی ناپائیدار متغیر ہے۔ اس کے مقابل پر ایک اور عالم ہے جس کو وہ عالم برزخ کہتے ہیں۔ وہی عالم حقیقی، غیر مبدل اور خوبصورت ہے۔

مغالطہ کیسے دور کیا جائے؟

فلسفہ بھگوت گیتا کی رو سے مغالطہ کے دور کرنے کے چار طریقے بیان کیے ہیں۔

۱۔ مراقبہ یعنی دھیان۔

۲۔ ریاضتہائے جوگ۔

۳۔ استقلال عشق الٰہی۔

۴۔ ادائے فرائض بلا اغراض و خواہش۔

جب ایک انسان مغالطہ سے باہر نکل آئے گا تو اس کے لیے نجات کا حصول ہو جائے گا۔ نجات کے حصول کے لیے پھر تین طریقے بیان کیے ہیں۔

۱۔ قدرت کاملہ اور قدرتی اشیاء کا عشق۔

۲۔ فرائض جاننے کے لیے تحصیل علم۔

۳۔ افعال یعنی ادائے فرائض بلا خواہشات نفسانی۔

علم یہ بتائے گا کہ کن فرائض کا ادا کرنا ضروری ہے اور عشق الٰہی، خدا کی ذات پر کامل بھروسہ پیدا ہوگا اور یہ اعتقاد ہی انسان کو ادائے فرائض بلا خواہش نفسانی کی ترغیب دیتا ہے۔ جب انسان سے تمام فرائض بلا خواہشات نفسانی صادر ہوں گے تو وہ نجات کے دروازے میں داخل ہو جائے گا۔

بھگوت گیتا میں نروان کے حصول کے لیے ذات پات کی قید سے بالاتر ہونا بھی نہایت ضروری قرار دیا ہے۔

گیتا میں خدا کا تصور

گیتا خدا کے بارے میں کہتی ہے کہ اس کا نہ کوئی شروع ہے نہ آخر وہ سب میں بسا ہوا ہے اور سب سے الگ ہے اور وہ سب کے دلوں میں ہے۔ پر وہ خیال کی پہنچ سے بھی پرے ہے، نہ آدمی کا دماغ اس کا تصور نہیں کر سکتا اور نہ اس کی زبان اسے بیان کر سکتی ہے۔

تخلیق کائنات

پیدائش عالم کے بارے میں گیتا نے ایک خاص نظریہ بیان کیا ہے۔ دنیا بار بار پیدا ہوتی ہے اور بار بار مٹتی ہے۔ اس دنیا سے پہلے نہ معلوم کتنی دنیائیں پیدا ہو چکی ہیں اور نہ معلوم کتنی اور پیدا ہوں گی۔

اس نظریہ کو یوں بیان کیا ہے۔ ''ہر ایک کلپ کے خاتمے پر سب چیزیں میری طرف پلٹتی ہیں اور (دوسرے) کلپ کے آنے پر میں انھیں پھر نکالتا ہوں۔'' (آٹھوں ادھیائے شلوک ۷)

روح اور مادہ

گیتا روح اور مادے کی ابدیت کو تسلیم کرتی ہے لیکن مادہ آزاد نہیں بلکہ روح کا تابع ہے۔ (۷:۴۔۷)

خدا مادے میں تخم رکھتا ہے جس سے تکوین شروع ہوتی ہے اس لیے وہ تمام مخلوقات کا باپ ہے۔ جب کہ مادے کا مقابلہ ماں کے رحم سے کیا جا سکتا ہے۔ (۱۴:۳۔۴)

گیتا کی رو سے روح غیر متغیر ہے اور مادہ تغیر پذیر۔

جبر و اختیار

گیتا کا رجحان جبر کی طرف ہے۔ کرشن جی مہاراج فرماتے ہیں۔

''ارے ارجن، مالک سب کے دلوں میں رہتا ہے اور انھیں اپنے مایا کے چکر پر نچاتا ہے۔ (ادھیائے ۱۸ شلوک ۶۱)

وحدانیت

گیتا پُر زور الفاظ میں ایک خدا کی پرستش کی تعلیم دیتی ہے اور ایک خاص طریقہ عمل پیش کرتی ہے یعنی انسان کو نتیجہ سے بے نیاز ہو کر اپنے فرائض سرانجام دینے چاہئیں۔

گیتا کی تعلیم کے متعلق پنڈت جواہر لعل نہرو لکھتے ہیں۔

''آج ہر فلسفہ اور فکر مدعی گیتا ہی کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے ہوئے ہیں اور ہر ایک اپنے اپنے مطلب کے مطابق تفسیر کر رہا ہے (حتیٰ کہ) گاندھی جی (اگر) اپنے عقیدہ اہمسا کی بنیاد گیتا پر رکھتے ہیں تو ایسے لوگ بھی ہیں جو ہما (تشدد) اور جنگ کا جواز بھی اسی سے ثابت کرتے ہیں۔

(The discovery of India P 83)

گیتا کے تراجم

ہندوستانی روایت اور عقیدہ کے مطابق گیتا ویدوں کی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ گیتا کا اثر اب تک ہندو معاشرہ پر ہے۔ اسی کتاب نے ہندو معاشرے کو رہبانیت سے نکال کر راہ عمل پر ڈالا اس وجہ سے یہ کتاب خصوصاً ہندو دانشوروں اور عموماً دیگر صاحب علم حضرات کی توجہ کا مرکز بنی رہی ہے۔ اس کی بے شمار شروح لکھی گئیں۔ شنکر اچاریہ نے توحید کے تصور وحدت الوجود کے ماتحت اور رامانوج نے توحید الٰہی کے

عقیدے پر شروح لکھیں۔ دور حاضر میں سر رادھا کرشن، مہاتما گاندھی اور اروبندے بھی شرحیں لکھیں۔ گیتا کا انگریزی ترجمہ چارلس وکنز نے ۱۷۸۳ء میں کیا۔ سر ایڈون ارنلڈ نے بھی ترجمہ کیا۔
اب تک گیتا ۳۰ زبانوں سے زائد میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ گیتا کا شعر میں ترجمہ خواجہ دل محمد نے اردو زبان میں کیا ہے جسے گیتا مشن نے سند دی۔ اسی طرح ڈاکٹر عبدالحکیم نے بھی ترجمہ کیا ہے۔

فلسفیانہ ہندومت

مکتی کے تین طریقے

ہندومت کے تمام فرقوں کا مرکزی مسئلہ نجات ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک نجات کے حصول کے تین طریقے ہیں۔

۱۔ راہ عمل (Karama Marga)

۲۔ راہ علم (Janana Marga)

۳۔ راہ ریاضت (Baakti Marga)

یہ تینوں راستے ایک دوسرے سے الگ نہیں۔ تمام ہندو فرقے ان طریقوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ ابتداء زمانہ میں راہ علم پر بہت زور دیا گیا۔ پھر راہِ عمل کی اہمیت بڑھی۔ آخری زمانہ میں راہ ریاضت پر زیادہ زور دیا جانے لگا اور اس کی اہمیت سب راہوں پر غالب آ گئی۔

راہِ عمل

عمل کا راستہ ویدوں نے بتایا۔ برہمن، کلپ سوتر اور میماسا میں اس کی تشریح و تدوین ہوئی۔ دھرم شاستر، مہابھارت اور پرانوں نے اسے عام مقبولیت بخشی۔

راہِ عمل کی فلسفیانہ بنیاد

ویدک تصورات کی بنیاد ایک مدلل فلسفیانہ نظام پر ہے۔ یہ نظام ایک اعلیٰ ترین ہستی پر مبنی ہے جو حقیقت کامل ہے۔ یہ ہستی واحد (ایکم) مشخص (پرس) خالق (وشوکرما) پر جاپتی (تا) ہے وہ اعلیٰ ہستی (برہمن) محیط کل عالم کل، قانون اخلاق کو قائم رکھنے والی اور نظام کائنات کی نگران ہے۔ وہ باپ ہے، دنیا کی رکھوالی ہے اور خواہشات کو پورا کرنے والی ہے۔ دنیا میں جو رنگا رنگ متحرک و غیر متحرک چلنے اور اڑنے والی ہستیاں ہیں ان سب کا آقا یہی واحد ہستی ہے۔[1]

اس قادر مطلق ہستی نے اس کائنات کو کس طرح پیدا کیا، ویدک لٹریچر میں اس کو کئی طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک تصور یہ ہے کہ کائنات کا وجود از خود پیدا ہو گیا۔[2] کہیں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ کائنات قربانی کا نتیجہ ہے۔ خود پرس نے قربانی دی اور اس کے مختلف اعضاء سے کائنات کے مختلف حصے معرض وجود

[1] اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر۔ از ڈاکٹر تاراچند مترجمہ ص ۲۴۔ [2] رگ وید باب ۱۰ نمبر ۱۲۔

میں آئے۔[1] فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے تخلیق کائنات عدم وجود سے وجود کا ارتقائی عمل ہے۔[2] ابتداء میں دونوں معدوم تھے ایک تاریک خلا تھا جس میں ذات واحد ساکن اور ساکت تھی پھر اس میں خواہش پیدا ہوئی۔ یہی وجود اور عدم کی علت العلل بن گئی۔ لیکن جس نظریہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ ازلی ہستی نے پہلے پانی پیدا کیا جس پر ایک سنہرا انڈا تیر رہا تھا۔ پھر وہ اس انڈے میں داخل ہوا اور برہما بن کر ظاہر ہوا۔ یہی سب سے پہلی مخلوق ہے۔ پھر برہما نے دیوتا آسمان، زمین، چاند، سورج، دنیا اور انسان پیدا کیے۔ یہ سب نظریات وحدت الوجودی عقیدہ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس لیے کہ تخلیق یا تو اس طرح ہوئی کہ علت العلل خود کائنات میں منتقل ہو گیا یا ماوراء ہستی سب پر حاوی ہو گئی یا جو چیز غیر مشہود تھی مشہود ہو گئی۔

طریق عمل کے عقیدہ کے لحاظ سے یہ تصور سب سے اہم اور ضروری ہے کہ اس کائنات میں ہر وجود خواہ وہ ذی حیات ہے یا غیر ذی حیات سب ایک ابدی قانون کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں بلکہ انسانی قربانی بھی ایک آفاقی اور عالمگیر قانون کے تابع ہے۔

اس آفاقی اور ہمہ گیر نظام کا نشان قربانی ہے۔ اس لیے کہ جب پرجاپتی (الک کل) کی طاقت عمل تخلیق سے کمزور پڑ جاتی ہے تو دیوتا قربانی سے اس کمزوری کو دور کر دیتے ہیں۔ قربانی ہی وہ ذریعہ ہے جس سے خوش ہو کر دیوتا بارش، طوفان، طلوع آفتاب وغیرہ کی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس طرح قربانی ہی ایک ایسا وسیلہ ہے جس سے خدا کی مرضی پوری ہوتی ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور اسی کی خوشنودی اور رضا کا تابع ہے۔ وہ اس رضا کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور طبعی طور پر اپنے اعمال کو دیوتاؤں کے اعمال کے مطابق ڈھالنے میں مصروف رہتا ہے۔ اس طرح قربانی ہی وہ فعل ہے جس سے دنیا اور آخرت کی برکات میسر آتی ہیں۔

پس پرخلوص قربانی کے ذریعہ ہی ابدی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ قربانیاں کئی قسم کی ہیں۔ ایک تو فرض اور مقررہ (نتیہ Nitya) دوسرے فرض اور غیر مقررہ (نی متیکا Niamittika) تیسرے اختیاری (کامیا Kamya) پھر گھریلو قربانیاں بھی ہیں (گرہیا Grhya) جن کا تعلق افراد سے ہے۔ ویدک عہد میں جو قربانیاں دی جاتی تھیں وہ جانوروں، پھلوں، دودھ اور روٹیوں پر مشتمل ہوتی تھیں لیکن جانوروں کی قربانی مذہبی رسوم سے متروک ہو گئی اور سمرتی کے ماننے والے صرف وہی قربانی کرتے تھے جن میں خون بہایا نہیں جاتا تھا۔ عمل کے تعین کے لیے سماج کو چار قسموں (ورن) میں تقسیم کیا گیا۔ پھر ہر قسم (ورن) کے لیے علیحدہ علیحدہ عمل مقرر کیے گئے۔ برہمن کی مکتی کے لیے اعمال اور ہیں، چھتری کے اور، ویش کے اور، شودر کے اور، عورت کے اور، برہمن کی مکتی حصول علم سے ہے، چھتری کی نجات برہموں کو خیرات دینے اور جنگ میں بہادری کے جوہر دکھانے سے، ویش کی عبادت زراعت اور مال مویشی پالنے سے اور شودر کی نجات مندرجہ بالا

[1] رگ وید باب دہم ۹۔ [2] رگ وید باب دہم ۱۳۹۔

تینوں ورنوں کی صرف خدمت گزاری سے ہوگی۔ چنانچہ وید میں لکھا ہے۔ وید کے لیے برہمن، حکومت کے لیے چھتری، مال مویشی پالنے کے لیے ویش دکھ اٹھانے اور خدمت کرنے کے لیے شودر کو پیدا کیا گیا ہے۔[1]

منو کہتا ہے۔ وید پڑھنے والے برہمنوں کی خدمت ہی شودروں کے لیے نجات دلانے والا عمل ہے۔ شودر کے لیے برہمنوں کی خدمت ہی نیکی کا کام ہے۔ یہ شاستروں کے بتانے والے فاضلوں نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی وہ اور کرتا ہے وہ اس کے لیے بے سود ہے۔[2]

گیتا میں جناب کرشن چھتری کا دھرم بتلاتے ہوئے ارجن کو کہتے ہیں کہ اگر اپنے دھرم کے خیال سے دیکھا جائے تو بھی تجھ کو غم نہیں کرنا چاہیے کیونکہ دھرم کی رو سے چھتری کا جنگ سے بڑھ کر اور کوئی دھرم نہیں ہے۔

اور گیتا کے آخری ادھیاء میں فرماتے ہیں کہ اپنا اپنا عمل کرنے والے لوگ عمل کے ذریعہ سے پرمیشور کو پالیتے ہیں جو کہ سب کا مدعا ہے۔ اپنا دھرم کیسا ہی خوبیوں سے خالی ہو نجات کا ذریعہ ہے اور دوسرے کا دھرم خواہ کیسا ہی خوبیوں سے پُر کیوں نہ ہو نجات کا ذریعہ نہیں۔[3]

گیتا عمل کے لیے ایک ضروری شرط یہ عائد کرتی ہے کہ نتائج سے بے پروا ہو کر فرائض ادا کیے جائیں۔

پس راہِ عمل کا عام اور سادہ مفہوم یہ ہے کہ نتائج سے بے پروا ہو کر دیوتاؤں کی قربانیاں دی جائیں اور ہندوؤں کی چاروں ذاتیں اپنے اپنے فرائض سرانجام دیں۔

راہِ علم (گیان مارگ)

ویدوں اور برہمنوں نے راہ عمل پر بہت زور دیا ہے۔ جب اواگون اور عمل کے نظریات پیدا ہوئے تو ہندو مفکروں کے ذہن نے یہ محسوس کیا کہ صرف راہِ عمل پر ہی گامزن ہونے سے حقیقی نجات نہیں مل سکتی۔ اس لیے یہ امر ضروری ہے کہ علت و معلول کی سخت زنجیر کو توڑنے اور عمل اوّل کی لامتناہی حرکت کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے کوئی اور ذریعہ تلاش کیا جائے۔ چنانچہ یہ معلوم کرنا ضروری ہو گیا کہ خود عمل اور اس کی ماہیت کیا ہے۔ وہ قانون کیا ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے آدمی عمل اور ردِّ عمل کے چکر سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ شروع میں تارک الدنیا درویشوں نے اس سلسلہ میں بہت غور و فکر کیا۔ ان کے افکار اپنشدوں میں محفوظ ہیں۔ یہ افکار اور نظریات ان علاقوں میں زیادہ مقبول ہوئے جو آریا ورت سے باہر تھے۔ نیز کھشتریوں اور دوسرے غیر برہمنوں میں ان نظریات کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان نظریات اور افکار کو ان وسطی علاقوں کے جنوب مغرب اور مشرق میں رہنے والی اقوام نے زندہ رکھا۔ جن پر ویدک آریوں، کھشتریوں اور غیر برہمنوں کا غلبہ تھا۔

1۔ یجر وید ۳:۵۔   ۲۔ ادھیاء ۹ شلوک ۲۳۴۔۲۳۵ اور ادھیاء ۱۰ شلوک ۱۲۲۔۱۲۳

3۔ گیتا ادھیاء ۱۸ شلوک۔

مبدء کائنات، تقدیر انسانی، حقیقت اولیٰ کی ماہیت اور اس سے انسان کا تعلق، مسئلہ خیر و شر، انسانی اعمال کی نفسیات اور وسائل نجات سے متعلق بحث و مباحث ہوئے اس طرح کئی فلسفیانہ مکتب ہائے فکر کی بنیاد پڑ گئی۔ جیسے سانکھیہ، یوگیہ، ویدانت، بدھ، جین، شوی، ویشوی، تانتر، لوکانیہ وغیرہ۔

ہر نظام نے زندگی کے مختلف مسائل کا الگ الگ حل پیش کیا۔ مگر ان سب میں کچھ مشترک عناصر ہیں۔ پہلا مشترک عنصر یہ ہے کہ یہ تمام نظام ایک ہی مرکز سے وابستہ ہیں یعنی قانون کا ویدک تصورِ قانون کا یہ تصور کرما کے تصرر سے وابستہ ہے۔ عمل نام ہے علت و معلول کے باہمی رشتے اور تعلق کا اور اس سے وہ لامحدود تسلسل وجود میں آتا ہے۔ جس میں کائنات اور انسان جکڑے ہوئے ہیں۔ جب اس تصورِ عمل سے کائنات کو دیکھا جائے تو آفرینش اور توالد و تناسل کا سلسلہ پیدا ہوتا ہے اگر اسی تصورِ عمل سے انسان کو دیکھا جائے تو آواگون کا نظریہ سامنے آتا ہے۔

کرما یا عمل کی روح محکومی سے عبارت ہے اور محکومی عبارت ہے ابتلاؤں اور آزمائشوں سے انسانی سعی بلیغ کا یہ مقصد ہے کہ محکومی کی زنجیروں کو توڑا جائے اور زمان و مکان اور علت و معلول کے مفروضات سے باہر نکلا جائے۔

تصورات علیت میں علت مواد اور نتیجے کا باہمی ربط شامل ہے۔ جس کی تعبیر مختلف حالات میں مختلف کی گئی ہے لیکن ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے۔ کبھی اس مفہوم وسیلے سے تخلیق کا تعین ہوتا ہے۔ کبھی محض واقعات کا تسلسل اور کبھی علت و معلول کی یکسانیت کا اظہار علت و معلول کا تصور مختلف افکار میں مختلف ہے۔ اس کا ایک مفہوم خدا اور کائنات کا تعلق ہے۔ علت و معلول کے نظریہ کی چار خاص تعبیریں یہ ہیں۔

۱۔ خدا پرستی کا نظریہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے کائنات کو عدم سے پیدا کیا لیکن کائنات حقیقت ہے۔

۲۔ حقیقت پرستانہ نقطہ نظریہ: یعنی یہ کہ فطرت اور خدا دونوں قدیم اور ایک دوسرے سے بے نیاز ہیں، خدا محض خالق عالم ہے۔

۳۔ وحدت وجودی نقطہ نظر: جو کائنات کو مظہر خدا سمجھتا ہے اور خدا اور کائنات کو ایک قرار دیتا ہے۔[۳]

مابعد الطبیعیاتی مفروضات سے قطع نظر ہندوستان کے مذہبی فلسفیانہ نظاموں کا طریق استدلال ایک ہی ہے۔ پہلا مفروضہ یہ ہے کہ صداقت اور حقیقت محض استدلال یا ایمان کے ذریعہ ہی پہچانی نہیں جاتی بلکہ حقیقی تجربہ کے ذریعہ سے بھی حقیقت تک پہنچا جا سکتا ہے اور یہ کہ ان وجدانی صداقتوں کے بارے میں غور و فکر کرنا چاہئے اور پھر فلسفہ کا کام یہ ہے کہ انھیں دلائل اور براہین سے ثابت کرے۔

۱۔ گیتا ادھیاء ۱۸ اشلوک ۴۷۔ ۲۔ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر از ڈاکٹر تاراچند ص ۳۹۔

۳۔ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر از ڈاکٹر تاراچند بار اول ص ۳۸۔

فلسفہ کے نظام علم و معرفت میں حقیقتوں کا علم اور پھر ان پر غور و فکر متواتر مراقبہ شامل ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کا دل صداقت کے نور سے منور ہو جائے۔ فلسفیانہ حقیقت کا اظہار فرد کے تعصبات، مزاج اور ذہانت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ مختلف نقطہ ہائے نظر اور افراد کے اپنے طبعی تقاضے غور و فکر کے متقاضی ہوں اور ان کو کسی طرح بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔

ان امور کے پیش نظر اگر غور کیا جائے تو ہندو فلسفہ کے چھ مختلف نظام ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ڈاکٹر تاراچند نے اس کی وضاحت یوں کی ہے۔

''پوروا میمانس میں مذہب کے عملی پہلو کا بیان ہے اور ویدک رسوم و فرائض کی تشریح ہے۔ نیائے میں استدلال کا طریقہ بنایا گیا ہے۔ ویسسکا میں مابعد الطبیعیاتی عقائد کی اوّلین تشریح ہے اور کائنات کو بنیادی عناصر یا از خود زندہ رہنے والی ہستیوں کو نو اقسام میں محدود کر دیا گیا ہے۔ سانکیہ میں اس تشریح کو ایک درجہ اور آگے بڑھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ساری کائنات صرف دو بنیادی اصول پرس اور پرکرتی یعنی روح اور مادہ سے ماخوذ ہے۔ یوگ میں سانکیہ کی تشریح مان کر ایسا عملی طریقہ دریافت کرنے پر غور کیا گیا جس سے ان عقائد کی صداقت براہ راست تجربہ سے ثابت ہو جائے۔ آخر میں ویدانت، سانکیہ اور یوگ کی دو حقیقتوں کو صرف ایک حقیقت مطلق قرار دیتا ہے جو مختلف شکلوں اور ناموں سے غیر محدود اقسام کے کائناتی مظاہرہ میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔''[1]

راہ ریاضت (بھگتی مارگ)

مکتی کے حصول کا تیسرا راستہ ریاضت (بھگتی مارگ) ہے۔ بھگتی کی تعریف یہ ہے۔ ''محبت کے جذبے کے ساتھ ایک شخصی دیوتا کی پوجا کی جائے۔ یعنی ایک شخص خدا پر ذاتی ایمان اور عقیدہ اور اس سے محبت جیسی انسان سے ہوتی ہے ہر چیز کو اس کی خدمت کے لیے وقف کر دینا اور اس ذریعہ سے ''موکش'' حاصل کرنا نہ کہ علم یا قربانی یا اعمال سے۔''[2] ایسی محبت جو آقا کی صفات کا علم حاصل کرنے کے بعد اس قابل پرستش ہستی پر مرکوز ہو جائے۔[3]

بھگتی کا تعلق جذبات سے ہے اور اس کی جڑیں شعور انسانی کے احساساتی پہلو میں موجود ہیں۔ جیسا کہ علم یا گیان کی جڑیں ذہنی حصہ میں اور عمل یا کرم کی جڑیں قوت ارادی کے حصے میں ہیں۔

بھگتی کا سرچشمہ وید ہی ہیں۔ شروع میں طریق ریاضت پر زیادہ زور نہیں دیا گیا۔ بعد میں طریق ریاضت نے دوسرے دو طرق عمل اور علم پر نمایاں غلبہ حاصل کر لیا۔

1۔ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر از ڈاکٹر تاراچند ص ۳۹۔

2۔ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر از ڈاکٹر تاراچند ص ۴۸۔

3۔ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۴۸۔

فلسفیانہ فکر کی پہلی دستاویز

اس فلسفیانہ فکر کی قدیم ترین دستاویز بھگوت گیتا ہے۔ اس کتاب میں کرشن جی مہاراج فرماتے ہیں کہ ہمہ تن عقیدت ہی سے خدا کو پا سکتے ہیں۔[1]

خدا اتنا کریم ہے کہ جو کچھ بھی عقیدت سے اسے نذر کیا جائے پتایا پھول یا پھل یا پانی اسے بخوشی قبول کرتا ہے۔[2] عقیدت کا مطلب تمام اعمال کو اسی سے منسوب کرنا ہے۔[3] اس لیے عقیدت مند خدا ہی کی ہستی میں رہتے اور جیتے ہیں۔[4] خدا اپنے عقیدتمندوں پر ناقابل بیان نوازش کرتا ہے۔ اس لیے کہ گناہ گار پجاریوں سے بھی وعدہ ہے کہ اگر انھوں نے یکسوئی قلب سے عبادت کی تو ان کا شمار نیکوں میں ہوگا۔[5] اور وہ کبھی فنا نہ ہوں گے۔[6] خدا کی نظر میں سارے عقیدت مند برابر ہیں۔ خواہ وہ گناہ میں پیدا ہوئے ہیں یا ثواب میں۔ اور چاہے وہ کسی ذات یا فرقے کے ہوں۔[7] عقیدت ہی سے خدا کو دیکھا اور پہچانا جا سکتا ہے اور اس سے یکجائی ہو سکتی ہے۔[8] عقیدت ہی عارفانہ رویت اور حالت وحدت کے حصول کا وسیلہ ہے۔ عقیدت مند خدا کا پیارا ہے۔[9] حیرت انگیز طور پر پیارا[10] اس لیے کہ خدا باپ ہے،[11] شوہر ہے،[12] ماں ہے[13] اور دوست ہے۔[14]

فلسفہ راہ ریاضت جن عناصر سے مرکب ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ ایک شخصی خدا۔

---

1. بھگوت گیتا ہشتم ۲۲ (ترجمہ از بھگوان داس) بحوالہ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۴۹۔
2. بھگوت گیتا نہم ۲۶ (ترجمہ از بھگوان داس) بحوالہ ایضاً ص ۴۹۔
3. بھگوت گیتا ہشتم ۲۲ (ترجمہ از بھگوان داس) بحوالہ ایضاً ص ۴۹۔
4. بھگوت گیتا نہم ۲۹ (ترجمہ از بھگوان داس) بحوالہ ایضاً ص ۴۹۔
5. بھگوت گیتا نہم ۳۰ (ترجمہ از بھگوان داس) بحوالہ ایضاً ص ۴۹۔
6. بھگوت گیتا نہم ۳۱ (ترجمہ از بھگوان داس) بحوالہ ایضاً ص ۴۹۔
7. بھگوت گیتا نہم ۳۲ (ترجمہ از بھگوان داس) بحوالہ ایضاً ص ۴۹۔
8. بھگوت گیتا یازدہم ۵۴ بحوالہ ایضاً ص ۴۹۔۵۰۔
9. بھگوت گیتا دوازدہم ۱۴ بحوالہ ایضاً ص ۵۰۔
10. بھگوت گیتا دوازدہم ۲۰ ترجمہ بھگوان داس بحوالہ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۵۰۔
11. بھگوت گیتا نہم ۱۷ بحوالہ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۵۰۔
12. بھگوت گیتا نہم ۱۸ بحوالہ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۵۰۔
13. بھگوت گیتا نہم ۱۷ بحوالہ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۵۰۔
14. بھگوت گیتا نہم ۱۸ بحوالہ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۵۰۔

۲۔ اکرام الٰہی۔

۳۔ خدا کی رضا کے سامنے آپ کو کلیتہً سپرد کر دینا۔

۴۔ سب انسانوں کی نجات کا وعدہ بلا لحاظ ذات فرقہ۔

۵۔ محبت۔

۶۔ اتصال باطنی۔

۷۔ اس میں سوتیا سواتار اپنشد نے خدا کی طرح گرو سے عقیدت کا بھی اضافہ کیا ہے۔[1]

دوسری دستاویز

اس فلسفیانہ فکر کی دوسری دستاویز مہا بھارت کے شانتی پران (Santi parran) کا حصہ نارانیا ہے۔ اس میں اکانتین مذہب کی تشریح ہے اور مراقبہ، ذکر خفی، بخورات جلانا، دماغ زمان اور افعال سے عبادت کرنا اس کے مذہبی ارکان ہیں۔ ان پر پابندی سے عمل کرنے کے نتیجہ میں دیدار الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ راہ ریاضت (بھگتی مذہب) راہ علم اور ویدک مذہبی رسوم سے افضل ہے۔ اس میں نرائن یا اس کے کسی مظہر کی پرستش کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

نرائینا کے تصورات نیچر اتر سمہیتا میں زیادہ تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں جس میں پوجا اور مراقبہ سے حاصل کیے ہوئے علم کے علاوہ بھگتی کو بھی ذریعہ نجات قرار دیا ہے۔ سمہیتا کی رو سے بھگتی کا مطلب یہ ہے کہ دل سے یہ دعا کر کے پناہ مانگی جائے کہ "میں سراپا گناہ ہوں، ناچیز و بے یار و مددگار، تو ہی میرا مداوا (اپائے) بن جا۔ پناہ مانگنے سے مراد یہ ہے کہ زہد یا ترا، قربانی، خیرات اور ایثار کیا جائے۔ ان سے بہتر اور برتر کوئی اور شے نہیں۔"[2]

ہنود کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت مقبولیت راہ عمل کی تھی۔ مذہبی غیر مذہبی آثار قدیمہ کے انکشافات، غیر ملکی سیاحوں کے مشاہدات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں۔

راہِ علم صرف تعلیم یافتہ طبقہ، فلاسفہ، سیناسیوں اور راہبوں میں محدود رہی اور راہ ریاضت سب سے کم مقبول اور اہمیت کی حامل رہی۔ بھگوت گیتا اور مہا بھارت کے نارینا حصے کے علاوہ شمالی ہند کے ہندو مذہبی لٹریچر میں اس کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔

تقلید پسند ہندوؤں کا نظام فلسفیہ

فلسفہ ہر قوم کے ماحول کا نتیجہ ہوتا ہے اور افکار فلسفہ اس قوم کی تہذیب اور دانش مندی کی بنیاد ہیں۔ اس وجہ سے کسی قوم کی دانشمندی اور تہذیب اس قوم کے فلسفیانہ افکار میں تلاش کرنی چاہیے۔

---

[1] سونسوستار اپنشد ششم ۲۳ (ترجمہ از ہیوم)

[2] اشر یڈر۔ انٹروڈکشن ٹو ابھیر مدھینا اینڈ پنکر اتر سمہیتا باب ۳۷ بحوالہ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۵۰، ۵۱۔

طبقات کے لحاظ سے فلسفہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ مغربی فلسفہ اور مشرقی فلسفہ۔

مغربی فلسفہ کی بنیاد حسب ذیل امور پر ہے۔

۱۔ خالق کائنات کی تحقیق۔

۲۔ مادہ جس سے اشیاء صورت پذیر ہوئیں۔

۳۔ حقیقت بشر۔

۴۔ مقصود عقل۔

۵۔ کسی چیز کو استدلال، عقل، تجزیے اور تجربے سے سمجھنے کا طریق۔

۶۔ تہذیب الاخلاق۔

۷۔ اجتماعی زندگی اور اس کی بہترین صورت۔

۸۔ فہم وعقل۔

۹۔ حسن شناسی۔

اگر چہ مشرقی فلسفہ کے بھی کم وبیش یہی عنوانات ہیں۔ لیکن مشرقی فلاسفہ کا سوچنے کا انداز اور ہے وہ آخر کار خود شناسی، پاکیزگی، افکار اور تزکیہ نفس اعمال پر ختم کرتا ہے۔ مشرقی فلسفہ اگر مذہب کا جزو نہ بھی بنے لیکن مذہب کے قریب ضرور ہو جاتا ہے۔ مشرقی فلسفہ میں ہندی فلسفہ حسب ذیل چار عنوانات میں منقسم ہے۔

۱۔ پردہ پکشا یعنی افکار سلف۔

۲۔ کندانا یعنی افکار سلف پر تنقید۔

۳۔ اترا پکشا یعنی شرح افکار نو۔

۴۔ سدھانتا یعنی نتیجہ افکار نو۔

اس طرح ہندی فلسفہ دو بڑے حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔

۱۔ استیکا: ویدک فلسفہ جو الہامی خیال کیا جاتا ہے۔

۲۔ نستیکا افکار: مستقل و آزاد۔

علم کی دو اقسام ہیں۔

۱۔ مادیات کا علم یعنی وہ علم جو حواس پنجگانہ اور تجزیہ و تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ مجردات کا علم یعنی وہ علم جو قیاس اور استدلال سے حاصل کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ ہر قوم کا فلسفہ اس کے ماحول کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ہر قوم کے فلسفیانہ سوالات بھی الگ الگ ہوں گے۔ ہندی فلسفہ کے سوالات یہ ہیں۔

رنج کس وجہ سے ہے؟ بے چارگی کا باعث کیا ہے؟ جان ہے یا نہیں ہے؟ قیود زندگی کہاں سے

اور کیسے فراہم ہوئی ہیں؟ ان سے رہائی کس طرح ممکن ہے؟ کسی چیز کی اصل اور حقیقت کیا ہے؟

ہندو فلسفہ کا سرچشمہ وید ہیں۔ وید کی تفسیر و تاویل میں مفکرین کے دو گروہ پیدا ہوئے۔ ایک صرف عمل کا قائل تھا جس سے مراد عبادات و رسوم ہی دین تھیں۔ دوسرے گروہ نے وید کی عبادت سے فلسفیانہ افکار استنباط کرنے شروع کر دیے جس سے افکار فلسفہ کا آغاز ہوا۔ پھر اس فلسفہ کے مختلف شعبے ظہور میں آئے۔

یہاں اختصار کے ساتھ چند فلسفیانہ افکار کا ذکر کیا جائے گا۔

فلسفہ نیایہ

نیایہ ''معمولی طور سے بحث مباحثہ کو کہتے ہیں۔''

اس فلسفہ کا بانی گوتم ہے جو تیسری صدی قبل مسیح میں گزرا ہے۔ اس کو ہندوستان کا ارسطو کہا جاتا ہے۔ یہ گوتم بدھ نہیں، یہ ایک اور فلاسفر اور مفکر ہے جس کی تصنیف نیائے سوترا (Nyaya sutra) ہے۔ اس کے پانچ باب ہیں ہر ایک باب دو حصوں میں منقسم ہے۔

نیائے منطقی مذہب ہے جس پر مابعد الطبیعیات کا کچھ اثر ہے۔ اسی وجہ سے اس کے پیرو کے واسطے منطق کی تعلیم لازمی ہے۔ یہ طریقہ استدلال سکھاتا ہے تاکہ انسان اپنے اعمال کا احتساب کر کے برے کاموں سے محفوظ ہو کر نجات حاصل کر سکے۔

تشریحی ادب

''نیائے سوترا'' کی تفسیر (بھاشیہ) واتساین (۴۰۰ عیسوی) نے کی۔ جینت بھٹ نے اپنی تصنیف نیائے منجری گوتم کے چند منتخب سوتروں کی شرح ہے۔ یہ کتاب اپنے زمانہ میں ہندی فلسفیانہ فکر کی اطلاعات کا خزانہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کے جدید پہلو کا آغاز بارھویں صدی میں مشرقی بنگال کے گنگیش کی (۱۲۰۰ء) کی تصنیف ''تتو جنتا منی'' ہے (اس تشریح نے قدیم تصنیفات کی شہرت کو ماند کر دیا۔ ''تتو جنتا کی کئی تفسیریں ہیں اور تفسیروں پر تفسیریں کی گئی ہیں۔ گنگیش کی تصنیف پر رگھو ناتھ کی شرح ''دی دھتی'' بہترین کتاب ہے۔ گدادھر نے اس کی شرح کی ہے۔ یہ شرح ملک بھر نیائے کی تدریس کے مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔

(تلخیص ہندوستانی فلسفہ مصنفہ موہن لال ماتھر ص ۱۶۴، ۱۶۵)

فلسفہ نیائے کی رو سے فقط تخیل، تصور اور عارفانہ رغبت سے حقیقت تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ اس لیے حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے حسب ذیل وسائل کی ضرورت ہے۔

۱۔ احساس محسوسات یا حواس پنجگانہ۔

۲۔ قوت ممیزہ و استدلال۔

۳۔ کلمات یعنی گفتار حکماء۔

۴۔ موازنہ و تطبیق۔

گویا نیایہ مکتبہ فلسفہ بنیادی طور پر منطقی تجزیہ کو حقیقت تک رسائی کرنے کا وسیلہ سمجھتا ہے۔
محسوسات دو قسم کی ہیں۔ بعض محسوسات اعضائے ظاہر سے سمجھی جاتی ہیں یعنی آنکھ، کان، ناک وغیرہ سے۔ بعض محسوسات نفس باطن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو اعضائے باطنی سے سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً نفرت، خوشی، دکھ اور معرفت وغیرہ۔

حکمائے نیایے کے تحقیقی مسائل حسب ذیل ہیں۔

۱۔	جان	۲۔	نفس
۳۔	اجسام	۴۔	حواس پنجگانہ
۵۔	عقل	۶۔	حرکت
۷۔	نواقص ذہن	۸۔	تناسخ
۹۔	احساس رنج و مسرت کا نتیجہ	۱۰۔	مصائب جسمانی و روحانی
۱۱۔	ہر قسم کے دکھوں سے نجات		

فلسفہ نیایہ کے مطابق جان ایک جوہر ہے جو نفس اور بدن سے علیحدہ ہے۔ اس کی صفت عقل یا علم ہے لیکن یہ صفت عارضی واتفاقی ہے۔ ہر شخص کو مستقل جان حاصل ہے جو ناقابل فنا ہے اور زمان اور مکان کی حدود سے آزاد ہے۔[1]

نفس ایک جوہر لطیف ہے جو لاتجزی اور ناقابل شکست ہے۔
جس کی تقسیم حسب ذیل ہے۔

۱۔	عناصر چہارگانہ	۲۔	آسمان
۳۔	زمان	۴۔	مکان

اجسام ذرات سے مرکب ہیں بذاتِ خود شعور سے بے بہرہ ہیں۔
فلسفہ نیایہ میں جان، نفس، حواس اور جسم کا تعلق اس طرح بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ جان جوہر ہے جس کی صفت عقل یا علم ہے جب اس کا نفس سے تعلق پیدا ہوتا ہے تو اس پر عمل کی روشنی پڑتی ہے۔
۲۔ نفس علم کی روشنی سے زندہ ہو جاتا ہے اور حواس کو روشن کرتا ہے۔
۳۔ حواس نفس کے نور سے روشن ہوتے ہیں اور اشیاء کو تابانی بخشتے ہیں۔

فلسفہ نیائے خدا کو علت العلل اور نگہبان سمجھتا ہے اور وہی اشیائے کو نیست و نابود کرنے والا ہے لیکن فلسفہ نیایہ کا خدا کسی چیز کو عدم سے وجد میں نہیں لاتا بلکہ موجودات کو صرف ترتیب اور صورت دیتا ہے۔

---

[1] فلسفہ ہندو یونان از دین محمد شفقی عہدی پوری ص ۴۰ طبع دوم ۱۹۶۲ء۔

فلسفہ ویشسکا (Vaishesika)

وشیشک دشیش سے مشتق ہے جس کے معنی اختصاص ہیں۔ یہ فلسفہ غالباً چھٹی صدی قبل مسیح میں ابھرا جب بدھ مت اور جین مت کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ ویشسک کا بانی کناڈا (Kanada) تھا۔ جس نے بنیادی دستاویز ویشیسک سوتر تحریر کیا۔

دینیات سے زیادہ اس کا موضوع طبیعیات ہے اس میں مادہ اور روح کی تفریق تسلیم کی گئی ہے۔ مادہ غیر فانی، غیر مرئی اور بے صورت ذرات پر مشتمل ہے انھیں کی ترکیب سے کائنات کی تخلیق ہوتی ہے۔ براہم دن کے خاتمہ پر وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں اور دنیا تباہ ہو جاتی ہے۔ یہ فلسفہ جینیوں کے فلسفہ سے مشابہ ہے۔

بعض لوگوں نے فلسفہ ویشسکا کو نیایہ کا ایک حصہ خیال کیا ہے۔ چنانچہ انم بھٹ کی ''ترک سنگرہ'' اور وشوناتھ کی بھاشاپری چھید یا ''کاریکاولی'' جیسے رسالے (جو تقریباً ۱۶۵۰ عیسوی) کے ہیں۔ ان دو نظامات کو باہم ملا کر بحث کرتے ہیں ان تصانیف میں جس اتحاد پسندانہ قوت کا اظہار ہوتا ہے وہ بہت ہی اہم ہے۔[1] دراصل یہ دونوں فلسفے جدا جدا ہیں۔

ادب:۔ اس فلسفہ کی شرح الوکا ملقب بہ کناداا (Kanada) نے ویشسکا سوترا کتاب میں کی ہے۔ یہ کتاب دس باب میں ہے ہر ایک دو حصوں میں منقسم ہے۔ قدیم ترین اور محفوظ تفسیر پرسست پاد نے کی ہے تو تقریباً پانچویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتی ہے یہ اپنی کتاب میں سوتروں کی ترتیب کو پیش نظر نہیں رکھتا۔ یہ تو تفسیر کی بجائے مختلف انداز میں پیش کی ہوئی ایک تصنیف ہے اور واضح طور پر اپنا بیان پیش کر کے اس نے اس نظام کو کافی ترقی دی ہے مثلاً خدا کو خالق کے طور پر تسلیم کر کے نظریہ تخلیق کی بڑی وضاحت کے ساتھ باقاعدہ طور پر بیان کرنا وشیشک نظام کی تاریخ میں پہلی بار دیکھا جاتا ہے۔ ایسی قوتوں کی وجہ سے اس کو اس تشریح کی ایک مستقل اور مستند تصنیف خیال کیا جاتا ہے نہ کہ محض تفسیر (ہندوستانی فلسفہ مصنفہ موہن اول ماتھر صفحہ ۱۶۳)

فلسفہ وشیشک کی وضاحت اداین (۹۸۴ عیسوی) نے کی ہے۔ خاص طور پر اپنی تصنیف کمسا نجلی کے لیے مشہور ہیں۔ جس کی یہ تصنیف ہندی خدا پرستی میں فضل و کمال رکھتی ہے۔ اس کی تفسیر کو ''کرناولی'' کہا جاتا ہے۔

اسی طرح شریدھر کی کتاب ''کندلی'' اور شنکر مشرا کی لکھی ہوئی ''اپکار'' (۱۶۵۰ء) معمولی مفہوم میں ''سوتر'' کی تفسیر ہے۔

فلسفہ نیایہ اور ویشسکا اس امر پر متفق ہیں کہ انسانی مصائب اور تکالیف کا سرچشمہ جہالت ہے اگر انسان جہالت سے نجات پا جائے تو مصائب خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔

ان دونوں فلسفوں میں فرق یہ ہے کہ نیایہ میں عقل کے وسائل چار ہیں اور ویشسکا میں صرف دو یعنی ادراک اور استدلال۔ پہلا حواس پنجگانہ کے ذریعہ سے اور دوسرا قوت ممیزہ کے واسطہ سے حاصل ہوتا ہے۔ نیایہ

[1] ہندوستانی فلسفہ از موہن لال ماتھر (نگارشات) صفحہ ۱۶۲۔

میں ۱۶ عنوانات پر بحث کی جاتی ہے، لیکن ویشسکا میں صرف نو پر بحث کی جاتی ہے جو درج ذیل ہیں۔

جوہر جو اپنی ذات میں مستقل ہے۔ اس میں عرض اور کرم یعنی فعل مضمر ہوتے ہیں۔ اگر جوہر نہ ہو تو عرض اور فعل بھی نہیں ہوتے۔

جوہر نو قسم کے ہیں، جو درج ذیل ہیں۔

۱۔	خاک	۲۔	آب	۳۔	روشنی
۴۔	آسمان	۵۔	ہوا	۶۔	زمان
۷۔	مکان	۸۔	نفس	۹۔	نفس

فلسفہ سانکھیہ (Sankhya)

یہ فلسفہ سب سے پرانا ہے تقریباً ۸۰۰ اور ۵۰۰ ق۔م کے درمیان وجود میں آیا۔

اس فلسفہ کا بانی کپیلا مُنی نامی فلاسفر ہے۔ اس کی تصنیف کا نام تت وسماس (Tataivasmase) ہے چونکہ یہ کتاب بہت ہی مختصر اور ادق تھی۔ اس لیے کپیلا نے خود اس کی شرح لکھی۔ اس کے بعد اس کے شاگرد آسوری (Asuri) اور آسوری کے شاگرد پنکا سیکھا (Panca sikha) نے اس کی شرح لکھی۔

یہ نظام فلسفہ گوتم بدھ اور مہاویر سے قبل رائج ہوا ہے۔

سانکھی کائنات کو دو مستقل اور متبائن اجزاء میں تقسیم کرتا ہے۔ روح یا پروشہ (Parusha) ۲۔ پراکرتی (Prakiriti) یعنی وہ قوت جو عالم مادیات کی عادت العلل ہے۔

سانکھی یہ تعلیم دیتا ہے کہ پروشہ یعنی روح بہت سے ہیں اور یہ ہمیشہ ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں۔ اس لیے اس فلسفہ کو انفرادیت بھی کہا جا سکتا ہے۔

پروشہ یا روح غیر متغیر ہوتا ہے۔ اس لیے یہ پراکرتی کی طرح ظاہری اشکال میں متغیر نہیں ہوتا چونکہ بے حس مادے کی چیزیں بدھی وغیرہ کی طرح اس سے متحد رہتی ہیں۔ اس لیے وہ باحس ہو جاتی ہے اور غیر عامل پروشہ (روح) عامل معلوم ہونے لگتا ہے۔

پراکرتی دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک علی اور ہم جنس و یکساں، دوسرا معلولی اور مختلف اور غیر یکساں۔ آخر الذکر معلول ہے جو محدود و متغیر اور مختلف الاشکال ظاہری حالت قابل تقسیم اور تابع ہوتا ہے۔ اوّل الذکر اس کے برعکس ہوتا ہے۔

سانکھیہ معلول کو علت سے جدا نہیں جانتا۔ اس نے اس پر مفصل بحث کی ہے۔ نتیجہ میں کہتا ہے کہ علت معلول کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ علل و معلول بہت ہیں۔ جہاں یہ سلسلہ منتہی ہوتا ہے وہاں ایک علت العلل صورت اور جسمانیت سے نکل کر محض قوت بن جاتی ہے، جسے پراکرتی کہتے ہیں۔ علل و معلول یا جواہر و اعراض کا سلسلہ پراکرتی اور عالم مادیات سے وابستہ ہے۔ روح نہ علت ہے، نہ معلول، محض علم ہے جو

پراکرتی کے ساتھ متعلق ہے۔ روح کا یہ ارتباط پراکرتی کی فضائے تاریک و بے شعور کو نور علم سے منور کرتا ہے اور پراکرتی میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ اس حرکت کا نتیجہ تولید اشیاء اور ظہور کائنات ہے۔ علت معلول سے زیادہ لطیف اور معلول پر محیط ہے۔[1]

تین صفات

پراکرتی میں تین صفات ہیں جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے۔

۱۔ ستوہ (Sattava)

۲۔ رجس (Rajas)

۳۔ تمس (Tamas)

ستوہ جسم کو مسرت اور روشنی دیتی ہے۔ رجس اشیاء کو متحرک کرتی ہے اور تمس نفس پر جمود وخمود طاری کرتی ہے۔ یہ تینوں صفات ہر جسم میں پائی جاتی ہیں۔ جب ستوہ رجس اور تمس پر غالب آ جائے تو انسان نیک ہو جاتا ہے۔ اگر رجس غالب آ جائے تو شجاعت اور حرکت پیدا ہوتی ہے اور انسان کی فعالیت اسی سے ہے۔ اگر تمس غالب آ جائے تو انسان پر جہالت، غفلت، جمود وخمود طاری ہو جاتا ہے۔

ان تینوں صفات کی مثال ایسی ہے جیسے تیل، بتی اور روشنی ہے۔ تینوں ایک دوسرے سے جدا ہیں لیکن لازم ملزوم ہیں۔ جب تک تینوں نہ ہوں روشنی نہیں پیدا ہوتی۔ اسی طرح یہ تینوں صفات ہر چیز اور ہر انسان میں پائی جاتی ہیں۔ دریا کی لہروں کی طرح کبھی ایک اوپر ابھر آتی ہے تو دوسری دو نیچے دب جاتی ہیں۔ دنیا کی حرکت، بلندی اور تنزل انہی سے وابستہ ہیں۔

فلسفہ سنکھیہ میں پروشہ اور پراکرتی دو مستقل حقیقتیں ہیں اور دونوں ازلی اور ابدی ہیں اور آپس میں ہم شکل اور ہم جنس ہیں لیکن ایک دوسرے کے قریب رہتی ہیں۔ ان کا آپس میں قرب مادی زندگی ہے اور یہی ثنویت ہے یعنی دو مستقل خداؤں کا اقرار۔

فلسفہ سنکھیہ میں خدا کا کوئی تصور نہیں۔ متاخرین سانکھیہ میں سے بعض نے یہ کہا ہے۔ اگرچہ خدا خالق نہیں لیکن مخلوقات کا محافظ اور نگہبان ضرور ہے۔ یہ فلسفہ روح کو ہی حقیقی اور ابدی ازلی قرار دیتا ہے اور تمام عیوب سے منزہ تصور کیا جاتا ہے۔

تشریحی ادب

فلسفہ سانکھیہ کی وضاحت ہر مستند کتاب ''سانکھ کاریکا'' ہے۔ اس کا مصنفہ ایشور کرشن خیال کیا جاتا ہے جو کالی داس کا ہمعصر تھا۔ یہ ستر (۷۰) شلوک پر مشتمل ہے۔ اس لیے بعض اوقات اس کو ''سانکھ

[1] فلسفہ ہندوستان از دین محمد شفیق عبدی پوری ص ۴۴، ۴۵ طبع دوم اگست ۱۹۶۲ء۔

سپتی'' کا لقب دیا جاتا ہے۔ اس میں اگر نظام کی نظری تعلیم کا مختصر لیکن بہت ہی وضاحت کا اظہار ہے۔ ایسا کہا گیا ہے کہ یہ ہندوستان کی تمام عالمانہ طرز کے ادب کا درشہوار ہے۔[1]

اس نظام کی دوسری قابل ذکر کتاب ''تتو سماس'' ہے جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ یہ بہت ہی مختصر ہے۔ اس موضوع پر ایک اور تیسری اہم تصنیف ''سانکھ سوتر'' ہے جو خود کپل سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس کتاب کا بہت کچھ مواد ممکن ہے کہ واقعی قدیم ہو۔ لیکن صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بعد کی پیداوار ہے اور چودھویں صدی عیسوی سے قبل کی نہیں اس کے چھ باب ہیں جن میں سے چار تو نظریہ کی توضیح کے لیے مختص ہیں۔ ایک باب میں دوسرے نظامات کی تنقیح کی گئی ہے اور ایک باب میں نظریہ کے خاص نقاط کو مثالوں کے ذریعہ سمجھانے کے لیے روحانی حکایات بیان کی گئی ہیں۔ واقعی سوتروں کی کتاب میں ایک انوکھی خصوصیت ہے۔

اس فلسفہ کی شرح کرنے والوں میں ایک وگیان بھکشو بھی ہیں۔ اس شرح میں سانکھ کئی ایک تبدیلیوں اور ترمیموں کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ ان ترمیمات کی عام غرض یہ ہے کہ اس کو ویدانت کے قریب لایا جائے۔[2]

فلسفہ یوگ

لفظ یوگ (یوج Yuji) سے ماخوذ ہے جس کا مطلب جوتنا یا شامل کرنا ہے۔

اگر چہ یوگ کی ابتداء وادی سندھ کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ لیکن یہ فلسفہ پتنجلی سے منسوب ہے جس کی تصنیف یوگ سوتر (Yogasutra) ہے، جسے پتنجلی سوتر بھی کہتے ہیں۔ اس کا دور ۲۰۰ قبل مسیح اور ۵۰۰ عیسوی کے درمیان ہے۔ اس فلسفہ سے ہندوستان کے تمام مذاہب متاثر ہوئے۔

فلسفہ سنکھیہ نظری ہے اور فلسفہ یوگ عملی۔ اس فلسفہ میں خدا کا تصور بھی پایا جاتا ہے۔ فلسفہ سنکھیہ اور یوگ دونوں میں پروشہ (روح) حقیقی پاک اور بے نقص ہے۔ جس نے عقل نفس اور حواس کے ذریعہ جسم سے تعلق پیدا کیا ہے۔ اس تعلق کی وجہ سے وقتی طور پر اپنی خصوصیات سے دست بردار ہو جاتی ہے۔ عقل پراکرتی کی پہلی معلول ہے جس پر صفت ستوہ محیط ہے۔

اگر چہ جان غیر متحرک ہے لیکن جب اس کا اتصال کسی جسم سے ہوتا ہے تو وہ متحرک نظر آتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ چاند بادلوں میں متحرک نظر آتا ہے۔

جو تغیرات ظاہر ہوتے ہیں انھیں احوال ذہن یا ذہنی کیفیات کہا جاتا ہے۔ یہ بے شمار ہیں۔ ان کو فلسفہ یوگ میں اس طرح تقسیم کیا جاتا ہے۔

---

[1] ہندوستانی فلسفہ مصنفہ موہن لال ماتھر ص ۱۹۴۔

[2] تفصیل کے لیے دیکھئے ہندوستانی فلسفہ مصنفہ لال ماتھر صفحہ ۱۹۵۔

۱۔ پرمانہ (Parman) اشیاء کی صحیح شناخت۔

۲۔ ویریایہ (Viparyaya) اشیاء کی غلط شناخت۔

۳۔ وی کلپ (Vikalpa) تصور وخیال۔

۴۔ ندرہ (Nidra) غفلت کی حالت۔

۵۔ سمرتی (Smirti) حافظ کا محفوظ۔

حواس پنجگانہ کی وساطت سے شناخت (اس صورت میں کہ سب درست ہوں) عقل استدلال تجربہ اور عقلائے سلف کی شہادتیں حاصل ہوں۔

ویریایہ، اشتباہات ہیں جو راست نما ہوتے ہیں اور تحقیق و تدقیق کے بعد درست ثابت ہوتے ہیں۔ خواب میں تمس کا عنصر نفس پر غالب ہوتا ہے اور انسان بہت کچھ دیکھتا ہے۔ سمرتی سے مقصد معرفت کا ذخیرہ ہے جو ذہن میں نقش ہو جاتا ہے اور جب توجہ کریں تو دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ کیفیات بلا توقف آنکھوں کے سامنے گزرتی رہتی ہیں۔ جان انھیں عقل کی تختی پر دیکھ کر اپنے آپ کو متحرک خیال کرتی ہے اور اسے اشتباہ ہوتا ہے کہ آغاز ہوا اور ماں کے پیٹ سے تولد ہوئی اب بچہ ہے اب جوان ہوگئی اور آخر کار مرگئی۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے کیونکہ نہ اس کا آغاز ہے نہ انجام فلسفہ یوگ بتاتا ہے کہ اس مغالطہ سے کیونکر بچیں؟ اس کی تین اصلیں ضروری مانی گئی ہیں۔[1]

پہلی اصل جسمانی صحت

جسمانی صحت کیونکہ صحیح روح جسم میں ہوتی ہے، جب تک جسم صحیح نہ ہو اس وقت تک صحیح فکر پیدا نہیں ہوتا۔ جب فکر صحیح نہیں ہوگا تو صحیح حقائق پیدا نہیں ہوں گے۔

جسمانی صحت کے تین اصول ہیں۔

۱۔ فکر و ذہن کی صحت: بیہودہ افکار ہمیشہ جسمانی صحت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے مفکر کو بیہودہ افکار سے پرہیز کرنا چاہیے۔

۲۔ ورزش: اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ا۔ عادی ورزش۔ اس سے اعضاء رئیسہ اور اعصاب مضبوط ہوتے ہیں۔ دورانِ خون درست ہوتا ہے۔

دوسری ورزش معنوی ہے جو فلسفہ یوگ سکھاتا ہے۔ اس ورزش سے انسان فوق العادۃ کام کر گزرتا ہے۔ اس ورزش سے انسان کے اندر اچھے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

۳۔ صحیح خوراک: صحیح خوراک انسان کی صحت پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔ اس سے انسان خوش وخرم اور توانا رہتا ہے۔

[1] فلسفہ ہند و یونان از دین محمد شفیقی عبد پوری ص ۵۲۔

دوسری اصل، مراقبہ

یہاں پہنچ کر ہستی باری تعالیٰ کا عقیدہ لازمی ہو جاتا ہے کیونکہ توجہ کا مرکز ایک ایسی ذات ہونا چاہیے جو بے عیب اور کامل اور تمام خوبیوں کا جامع ہو۔ مراقبہ میں مستقل مزاجی اور پاک ارادہ ضروری جزو ہیں۔

مراقبہ کے لیے کامل راہنما کی اشد ضرورت ہے۔

اصل سوم تحمل

یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

ا۔ یام (Yama) تحمل اور اس کے متعلقات

الف۔ اھمسہ یعنی بے آزاری۔ کسی ذی روح کو نقصان اور تکلیف نہ پہنچانا۔

ب۔ ستیہ (Satya) جھوٹ نہ بولنا۔

ج۔ استیہ (Asteya) چوری سے اجتناب۔

د۔ برہما چاریہ (Brahma chraya) یعنی تجرد یا شادی نہ کرنے کا عہد۔

ہ۔ اپریگرہ یعنی کسی سے بخشش، دھن دولت کو قبول نہ کرنا۔

ا۔ نیام (Nyama)

۲۔ جسم اور باطن کی صفائی

اس سے مراد جسم اور باطن کی صفائی اور پاکیزگی ہے۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جسم کی صفائی باطن کی صفائی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر جسم کو صاف ستھرا رکھا جائے گا تو اس سے خیالات اور افکار کو صاف رکھنے میں مدد ملے گی۔

جسم کی صفائی نہانے دھونے اور طہارت کے اصولوں کو اپنانے سے حاصل ہوتی ہے اور باطن کی صفائی دل میں پاکیزہ خیالات کو جگہ دینے سے حاصل ہوتی ہے۔

ب۔ سنتوش (قناعت)۔ ج۔ تپ (تحمل)۔

د۔ سوادھیائے (مطالعہ)۔

ہ۔ ایشور سندھان (ایشور کی بھگتی) ان کو یوگ کے دس لفظ کہا جا سکتا ہے۔

۳۔ آسن (Asana) یعنی نشست

فلسفہ یوگ میں طریق نشست کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کے لیے مخصوص نشست معین

ہے۔''آسن ایسی نشست ہے۔جس میں دوران خون میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا اور اعضائے رئیسہ کو ایسا سکون میسر آتا ہے کہ وہ صحیح طور پر کام کر سکتے ہیں۔[1]

صحیح نشست سے انسان کئی امراض سے بچ جاتا ہے اور نہایت ہی اطمینان سے ذکر و فکر کر سکتا ہے۔

صحیح نشست کے لیے کامل استاد کی ضرورت ہے۔

۴۔ پرانا یام (Parna yam) یعنی طریقہ دم کشی

فلسفہ یوگ میں دم کشی سخت ترین ورزش ہے۔مختصر طریقہ یہ ہے کہ مقررہ وقت پر پاک اور ہوادار جگہ پر جب کہ معدہ بھرا ہوا نہ ہو ناک کے ایک سوراخ سے لمبی سانس کھینچ کر سینہ میں جمع کرے اور ناک کے دوسرے سوراخ سے آہستہ آہستہ سانس چھوڑے۔[2] اس کے لیے ایک ماہر اور کامل استاد کی ضرورت ہے۔ بغیر استاد کے اس ورزش کو اپنانے سے نقصان ہوتا ہے۔بعض اوقات غلط طریقہ اختیار کرنے سے انسان دیوانہ ہو جاتا ہے۔اس ورزش میں کمال حاصل کر لینے کے بعد مراقبہ شروع کرنا چاہیے۔''

۵۔ پرتی ھار (Partyahara) یعنی حواس پنجگانہ پر تسلط

انسان بہت کمزور ہے۔وہ حواس پنجگانہ کے تابع ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ ہر قسم کے دکھوں اور تکالیف کا شکار ہو جاتا ہے۔حواس پنجگانہ اس کو گمراہی اور ضلالت کی وادی میں چھوڑ دیتے ہیں، جس میں وہ حیران و سرگرداں پھرتا رہتا ہے۔اگر انسان حواس پنجگانہ پر تسلط اور فتح حاصل کر لے اور ان حواس کو صحیح راستہ پر چلائے اور ان سے صحیح کام لے تو دل اطمینان اور راحت سے بھر جاتا ہے۔حواس پر کامل تسلط حاصل کرنے کے لیے استقامت اور عرصہ دراز چاہیے۔

۶۔ دھارن (Darana) یعنی مشق ذہن

ابتداء میں ایک نقطہ پر اپنی توجہ مرکوز کرنی پڑتی ہے۔جب طبیعت اس کی عادی ہو جائے تو پھر تصور باطن میں مشغول ہونا چاہیے۔حقیقی مطلوب تک رسائی کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان کا ظاہری اور باطنی تصور ایک نقطہ پر جمع ہو جائے۔

۷۔ دھیان (Dhiana) یعنی مراقبہ

تنہائی میں بیٹھ کر تمام مادی علائق سے رشتہ توڑ کر یاد الٰہی میں مصروف ہو جانے کا نام دھیان یا مراقبہ ہے۔مطلوب حقیقی تک پہنچنے کے لیے مراقبہ بہت ضروری ہے۔

---

۱ فلسفہ ہند و یونان از دین محمد شفقی عہدی پوری ص ۵۶۔

۲ فلسفہ ہند و یونان از دین محمد شفقی عہدی پوری ص ۵۷۔

۸۔ سمادھی (Samadhi)

یہ رہبان کی اعلیٰ ترین صورت ہے کہ جب انسان اللہ کی محبت اور عشق میں اتنا محو ہو جاتا کہ وہ اپنی ذات سے بھی بے گانہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ اعلیٰ مقام ہے جہاں انسان پہنچ کر مظہر خدا بن جاتا ہے۔[1] یہ مقام ہر شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

چند اصول موضوعہ

یہاں ہم سانکھ، یوگ کے چند اصول موضوعہ کو باہم ایک جگہ جمع کرتے ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جو کچھ ہے ہمیشہ ہے اور جو کچھ نہیں وہ کبھی بھی نہیں ہے۔

(مادہ ابدی ازلی ہے اور کبھی فنا نہیں ہوگا۔ نیست ہست نہیں ہو سکتا۔ عدم وجود کی شکل اختیار نہیں کر سکتا ہے) یعنی نیستی سے کسی شے کی ہستی نہیں ہو سکتی۔

۲۔ تغیر دلالت کرتا ہے اس وجود پر جو تبدیل ہوتا ہے۔

(تغیر کا اثر مادہ پر ہوتا ہے تو مادہ میں تبدیلی شروع ہو جاتی ہے۔ اسی سے مادہ مختلف اشکال اختیار کرتا ہے)

۳۔ معلول لازمی طور پر وہی ہے جو اس کی مادی علت ہے۔

(سانکھیہ معلول کو علت سے جدا نہیں کرتا۔ یعنی علت اور معلول لازم و ملزوم ہے۔ جہاں علت ہوگی وہاں معلول ہوگا۔ مثلاً جب سورج طلوع ہوگا تو روشنی ہوگی۔ گویا سورج اور روشنی لازم و ملزوم ہیں۔ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔

۴۔ تمام مختلف چیزوں کے مجموعہ کا پتہ بالآخر تین ماخذوں سے لگایا جا سکتا ہے جو اگرچہ آزاد نہیں ہیں مگر ایک دوسرے کے پابند ہیں۔

ا۔ پرکرتی (بنیادی صورت میں اصل مادہ) ۲۔ مہت (بدھی اور عقل) ۳۔ اہنکار (خودی وانا)

۵۔ مادہ دوامی حرکت کے وصف سے متصف کیا جاتا ہے۔

(یعنی مادہ ہر وقت حرکت میں رہتا ہے۔ اسی حرکت کی وجہ سے مادہ مختلف اشکال اختیار کرتا ہے۔

۶۔ نہ ذہن مادہ سے ماخوذ ہے اور نہ مادہ ذہن سے۔[2]

فلسفہ (پورو میماسہ) (Mimasa)

اس فلسفہ کا بانی جے منی ہے۔ یہ انسان کو راہ عمل (کرم مارگ) دکھاتا ہے اس فلسفہ کے مصنفوں

[1] مزید مطالعہ کے لیے کتاب در ہندوستانی فلسفہ مصنفہ موہن لال ماتھر صفحہ ۱۹۳ تا ۲۱۷ کی طرف رجوع کیا جائے۔
[2] ہندوستانی فلسفہ مصنفہ موہن لال ماتھر صفحہ ۲۰۷۔

نے وید کی عظمت اور حقانیت ثابت کرنے کی کوشش ہے اور حد سے زیادہ مبالغے سے کام لیا ہے۔ ان کا یہ نظریہ ہے کہ وید خود بخود مقدس مفکروں کی زبان پر جاری ہو گئے اور ان مصنفین کو الوہیت کا مرتبہ دیا۔ اسی طرح ان کا یہ بھی نظریہ ہے کہ وید مقدس ہر نقص سے پاک ہیں۔ اس وجہ سے ان کی تعلیم پر بے چون و چرا عمل کرنا چاہیے۔ ان کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق ہی مذہبی رسوم ادا کرنی چاہئیں۔ قربانی اور نیاز دینی چاہیے اور جن باتوں سے وید نے منع کیا ہے ان سے رک جانا چاہیے۔ اسی میں انسان کی بھلائی اور بہبودی ہے۔ اس سے انسان کو بہشت ملے گا۔ اس فلسفہ کی رو سے وید کا علم روح اور جسم کو متحد رکھتا ہے۔ جب روح جسم سے جدا ہو جائے تو وہ علم کی محتاج نہیں رہتی کیونکہ روح کے معنی حیات کے ہیں۔ اس زندگی کی عقل مندرجہ ذیل وسائل سے وابستہ ہے۔

۱۔ پرت یکشا (Prat yaksha) اوراک یعنی دریافت بوسیلہ محسوسات۔

۲۔ انومانہ (Anumana) قیاس واستدلال۔

۳۔ اپامانہ (Upamana) تطبیق۔

۴۔ شبدہ (Shbada) مفکرین سلف کے افکار کی تصدیق۔

۵۔ ارتاپتی (Arthapati) پرستش۔

تطبیق سے مراد صرف یہ ہے کہ ایک چیز کو اس چیز کے ساتھ تطبیق دے دی جائے جو اس نے پہلے دیکھی تھی۔ مثلاً کسی نے کبوتر دیکھا تو اس کے ذہن میں فوراً ایک صورت نظر آئے گی کہ یہ پرندہ اس نے پہلے دیکھا ہوا ہے تو ذہن فوراً تطبیق اور موازنہ کر کے یہ کہہ دے گا کہ یہ وہی کبوتر ہے۔

پرستش سے مراد یہ ہے کہ ہم ایک شخص کو جانتے ہیں کہ وہ بقید حیات ہے لیکن ہم اس کے گھر پر جاتے ہیں وہ وہاں موجود نہیں ہوتا تو ہم فرض کر لیتے ہیں کہ وہ کہیں باہر گیا ہوا ہے۔

مفکرین سلف کے افکار اور تجربات بالکل صحیح ہیں۔ اس لیے عقل کے گھوڑے کو انہی کے راستہ پر چلانا چاہیے۔

اگر انسان کی فطرتی استعدادیں اور حواس صحیح کام کرتے ہوں تو قیاس اور استدلال سے جو بھی نتائج نکالے گا صحیح ہوں گے۔[1]

میماسہ کے بنیادی عقائد

۱۔ دنیا اور اس کی موجودات حقیقت ہیں۔

۲۔ ارواح بے شمار ازلی اور ابدی ہیں۔

۳۔ اس قانون کو بھی ازلی ابدی مانتے ہیں جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے دیکھیے ہندوستانی فلسفہ مصنفہ موہن لال ماتھر صفحہ ۲۳۲ تا ۲۳۵۔

۴۔ جو شخص ویدوں کی تعلیم کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے تو اس کی روح توانا ہو جاتی ہے۔ اس کو ابدی بہشت اور برکت نصیب ہوتی ہے۔

۵۔ ویدوں کی تعلیم پر عمل نفع ونقصان کا خیال کیے بغیر فرض سمجھ کر کرنا چاہیے۔

۶۔ اس فلسفہ کے پیرو خدا کو نہیں مانتے۔

بعد میں یہ فلسفہ ویدانت میں ضم ہو گیا۔

فلسفہ کرم

برہما کے عقیدے نے دو فلسفوں کو جنم دیا۔ ایک فلسفہ کرم، دوسرے فلسفہ شمسار۔

کرم کے معنی اعمال ہیں۔ رگ وید کے زمانہ میں یہ لفظ قربانی کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ برہمنا میں یہ لفظ قربانی کے ساتھ اعمال صالحہ کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔

ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ انسان جس قسم کے اعمال اس دنیا میں کرے گا، اسی کے مطابق اگلا جنم لے گا، اگر اچھے اعمال بجا لائے گا تو جنت میں داخل ہوگا اور اگر برے اعمال کیے ہیں تو کیڑے مکوڑوں اور دوسرے حیوانات کی شکل میں پیدا ہوگا۔ اس فلسفہ کی بناء پر ایک ہندو اپنی بری حالت یا تکالیف کے لیے خدا کو ذمہ دار نہیں ٹھہراتا بلکہ اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار گردانتا ہے۔

شمسارہ کے معنی اِدھر اُدھر بھاگنے کے ہیں، لیکن ہندو اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کے نتیجہ میں اس دنیا میں بار بار مختلف شکلوں اور صورتوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس چکر کو ختم کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ برہما کے ساتھ مکمل اتحاد کرنا ہے۔ یہ اتحاد گیان اور معرفت کے ساتھ ہوتا ہے۔ معرفت حقیقی داخلی تجربہ سے حاصل ہوتی ہے۔ معرفت کے ذریعہ انسان برہما کا ایک جزو بن جاتا ہے۔

تشریحی ادب

فلسفہ میماسہ کی قدیم شرح ''جیمنی کی تصنیف ''میمانسا سوتر'' ہے۔ اس کا زمانہ دیگر فلسفیانہ سوتروں کی مانند غیر متعین ہے لیکن اب یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ سب سے زیادہ قدیم ہے اور تقریباً ۲۰۰ عیسوی کی تصنیف کی گئی۔ اس میں (۲۵۰) سے زیادہ سوتر ہیں۔ ان کو بارہ (۱۲) باب میں تقسیم کیا گیا ہے اور سب مل کر کوئی ساٹھ (۶۰) ذیلی فصلیں ہیں۔ اس میں تقریباً ایک ہزار عنوانات پر بحث کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے فلسفے کے سوتروں میں یہ سب سے بڑا ہے۔''[1]

کمارل بھٹ[2] کا ایک شاگرد منڈن مشرا تھا۔ یہ بہت ہی مشہور مفکر تھا۔ جس نے میمانسا پر کئی ایک کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً ''ودھی ودیک'' اور ''بھاونا ودیک''۔[3] اسی طرح ''پارتھا سارتھی کی شاستر ودیلیکا''

---

[1] ہندوستانی فلسفہ موہن لال ماتھر ص ۲۲۰، ۲۲۱۔
[2] ہندو میماسا فلسفہ کا ایک مشہور مفکر ہے۔ فلسفہ میمانسا کا شارح ہے۔ جو آٹھویں صدی عیسوی میں گزرا ہے۔
[3] ہندوستانی فلسفہ ص ۲۲۱۔

دھوا کی نیالے والا دستار (سنہ ۱۳۵۰ء) اور دیوکی ''بھٹ دیلیکا'' (سنہ ۱۶۵۰ء) یہ سب اپنی تشریح میں جیمنی کی سوتر کی ترتیب کی پیروی کرتے ہیں۔''

ایسی ہی ایک کتاب آپ دیوکی ''میمانسانیایے پرکاش'' ہے اور ایک اور کتاب ''مان مے دیویہ'' ہے۔[1]

فلسفہ ویدانت (ادویت) یا اتر میمانسا

ویدانت کے معنی ہیں۔''ویدوں کا آخری حصہ'' یا ان کا نچوڑ اس کی بنیاد اپنشدوں کے فلسفہ پر ہے۔

فلسفہ ویدانت سانکھیہ کے نظریہ آفرینش اور یوگ کے ہشت پہلو ضابطے کو بطور مفروضہ تسلیم کرتا ہے۔ یہ فلسفہ اخلاقی اور روحانی امور پر بہت زور دیتا ہے۔ اس وجہ سے اس فلسفہ کو ہندو تصوف کہا جا سکتا ہے۔

اپنشد وید کی تفسیر ہے اور ویدک ادب میں اپنشد کو وہی حیثیت ہے جو اسلام میں وجود تصوف کو۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسلام میں توحید کو اس واضح اور غیر مبہم انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ کوئی بھی فلسفہ اس پر غالب نہیں آ سکا۔ لیکن وید میں توحید کی تعلیم واضح طور پر نہیں ہے۔ اس وجہ سے اپنشد کا فلسفہ یا فلسفہ ویدانت اس پر غالب آ گیا اور توحید گم ہو گئی۔ اس فلسفہ کو ''ادویت'' بھی کہتے ہیں۔ یعنی روح اور خدا میں کوئی فرق نہیں۔ خدا روح ہے اور روح خدا ہے۔ اس فلسفہ کے ماننے والے یہ نہیں کہتے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ وہ ہر چیز میں موجود ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے نزدیک عالم کی ہر چیز قابل پرستش ہوئی اور خدا کی احدیت دلوں سے مٹ گئی۔

اس فلسفہ کے ماننے والے یہ کہتے ہیں کہ ہم غیر خدا کی پرستش نہیں کرتے بلکہ خدا کی ہی پوجا کرتے ہیں کیونکہ تمام اجرام، اصنام اور اجسام میں خدا موجود ہے، اس لیے یہ سب خدا ہیں۔ حالانکہ ان کو یہ سمجھ نہیں آتی کہ وہ خود بھی تو خدا ہیں۔ ان میں بھی خدا موجود ہے، پھر وہ دوسرے خدا کے سامنے کیوں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ گویا ویدانت فلسفہ ''کثرت فی التوحید'' اور ''توحید فی الکثرت'' کا قائل ہے۔ یعنی دنیا کی ہر شے (خدا میں ہے) اور ہر شے میں خدا ہے۔''

فلسفہ ویدانت کی اہمیت

فلسفہ ویدانت نے ہندوؤں پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے۔ آج ہندوؤں کے تمام فلسفیانہ نظریات فلسفہ ویدانت کے گرد گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس فلسفہ نے تمام ہندوؤں کو ایک اتحاد کی لڑی میں پرو رکھا ہے۔ اگر یہ فلسفہ ایجاد نہ کیا ہوتا تو ہندو سماج کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہوتا۔

روح کے متعلق نظریہ

فلسفہ ویشیشکا کا روح سے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ وہ ایک حقیقت ہے جس میں شعور قائم ہے۔

[1] ہندوستانی فلسفہ ص ۲۲۲۔

لیکن شعور اس کی لازمی خصوصیت نہیں۔ سانکھیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ روح خود شعور ہے لیکن اس کی تعلیم ہے کہ روحوں کی تعداد لامحدود ہے۔ فلسفہ ویدانت اس نتیجہ پر پہنچا کہ روح نہ صرف بذات خود شعور ہے بلکہ تمام ذی حس موجودات میں بھی ایک ہی ہے۔ روح اور خدا بھی ایک ہی ہیں۔ سوائے اس روح کے جو جہل سے معمور ہو کر سنسار میں آتی ہے اور مصائب کا شکار ہوتی ہے۔ مصائب اور آلام سے نجات صرف اسی صرت میں ہے کہ جہالت کو دور کرے اور اصل حقیقت پہچانی جائے۔

فلسفہ ویدانت کے اثرات

اس فلسفہ نے صرف ہندوؤں کے ذہنوں اور عقلوں کو متاثر نہیں کیا بلکہ یہ فلسفہ مسلمانوں کے صوفی طبقہ پر اثر انداز ہوا ہے۔ وہ طبقہ وجودی صوفیاء کہلاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابوالحسین حلاج ہندوستان آئے جہاں جوگیوں کی صحبت میں رہے اور اس فلسفہ کے اثرات لے کر یہاں سے گئے۔ اس فلسفے کے سرخیل شیخ محی الدین ابن عربی "فصوص الحکم" میں فرماتے ہیں۔

فلا تنظر الی الحق و تعریه عن الخلق

ولا تنظر الی الحق و تکسوه سوی الخلق

و نزهه و شبهه وکن فی مقعد الصدق

وکن فی الجمع ان شئت وان شئت خفی الفرق

ولا یلقی علیک الوحی

وفی غیره لا تلق

یعنی خدا کو مخلوق سے الگ کر کے مت دیکھو۔ نہ خدا کو لباس غیریت پہنا کر دیکھو۔ اس کی صفات تشبیہی اور تنزیہی پر ایمان رکھو اور مقام صدق پر کھڑے ہو جاؤ اور اگر تم چاہو تو مقام جمع میں ہو جاؤ یا مقام تفریق پر۔ اگر تو اس کا غیر ہے تو نہ تجھ پر اس کی وحی آ سکتی ہے اور نہ اس سے ملاقات ہو سکتی ہے۔

ہمارے وجودی صوفیاء نے صفاتِ الٰہیہ سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان خواہ روحانیت کے کتنے بلند مقام پر پہنچ جائے۔ وہ عبدیت کی آلائش سے پاک نہیں ہو سکتا۔

تنقید

اس فلسفہ کی رو سے کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی عین ٹھہرتی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور اشیاء کائنات مخلوق، خالق اور مخلوق عین نہیں ہو سکتے بلکہ خالق اور مخلوق کے رشتے میں ایک واضح خط امتیاز ہے۔ وہ یہ ہے کہ خالق قیوم اور صمد ہے اور مخلوق اللہ کے سہارے قائم ہے اور اسی کی محتاج ہے۔ اشیاء کائنات کو اللہ تعالیٰ کا عین ٹھہرانے سے خط امتیاز اٹھ جاتا ہے اور توحید کا مصفا پانی شرک سے مکدر ہو جاتا ہے۔

تشریحی ادب

ویدانت (ادویت) کی وضاحت بادرائن[1] کے برہمہ سوتر میں خلاصہ کے طور پر درج ہے۔ اسی طرح اسی مفکر کا ایک عالمگیر مسلمہ رسالہ ''ویدانت'' سوتر ہے۔ اس رسالہ میں اپنشدوں میں ثانوی سانکھ (ثنویت یعنی دو خدا) کی تردید کی گئی ہے۔ بادرائن کا یہ نقطہ نگاہ ہے کہ اپنشد توحید کی تعلیم کے حامل ہیں۔ یہ کتابیں ادق اور مشکل ہیں۔ بعض مسائل کو واضح نہیں کرتیں۔ مثال کے طور پر کائنات نے برہمہ سے ارتقاء پائی ہے یا اس کا محض ایک مظہر ہے۔ شنکر نے ان ادق اور مشکل مسائل کو حل کیا ہے اس کے علاوہ بھاسکر اور یادو پرکاش کے مانند شارحین نے وضاحتیں کی ہیں۔

دھرم راج ادھوریندر کی ویدانت پری بھاشا اس نظریہ پر کافی اور باقاعدہ اظہار ہے اسی طرح سدانند کی ویدانت سار (سنہ ۱۵۵۰ء) اور سری ہوش کا کھنڈن کھنڈ کھادیہ (۱۱۰۰ء) قابل ذکر کتب ہیں۔[2]

ہندومت کے مقبولہ و مروجہ عقائد اور ان کا رد

مسئلہ نیوگ

دنیا کے ہر مذہب میں مرد و عورت کے باہمی جنسی تعلق کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ معاشرہ کی عمارت اسی تعلق پر استوار ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ہر مذہب نے اس تعلق کا بنیادی پتھر پاکیزگی اور طہارت قرار دیا ہے کیونکہ جب تک یہ تعلق پاکیزہ نہ ہو اس وقت تک نہ سوسائٹی پاکیزہ رہ سکتی ہے اور نہ انسانیت کی عمارت قائم رہ سکتی ہے۔ دیانند جی نے مرد و عورت کے باہمی جنسی تعلق کا ایک نیا طریقہ بتلایا ہے وہ نیوگ ہے۔ نیوگ یہ ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر مر جائے تو اس بیوہ کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر وہ چاہے تو کسی غیر مرد سے ہم بستر ہو کر اولاد پیدا کر لے اور اپنی شہوت کو تسکین دیتی رہے۔ اس حکم کو صرف یہیں تک محدود نہیں کیا بلکہ ایک شوہر والی عورت کو بھی اجازت دے دی ہے کہ اگر اس کے شوہر سے اولاد پیدا نہ ہو تو وہ کسی غیر مرد سے ہم بستر ہو کر نطفہ لے لے اور اولاد حاصل کر لے۔ وہ عورت دس مردوں سے علیحدہ علیحدہ ہم بستر ہو کر نطفہ لے سکتی ہے۔ اس طرح جو اولاد پیدا ہوگی وہ اس خاوند کی ہوگی جس کی ہم بستری سے اولاد پیدا نہیں ہوئی۔

سوامی دیانند جی ستیارتھ پرکاش لکھتے ہیں:

''جب خاوند اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ ہو، تب اپنی عورت کو اجازت دے کہ اے نیک بخت اولاد کی خواہش کرنے والی تو مجھ سے علاوہ دوسرے خاوند کی خواہش کر کیونکہ اب مجھ سے تو اولاد نہیں ہو سکے

---

1. یہ مفکر تقریباً ۲۵۰ ق۔م اور ۴۵۰ عیسوی کے درمیان گزرا ہے۔
2. تفصیلات کے لیے ہندوستانی نسخہ مصنفہ موہن لال ماتھر صفحہ ۲۴۵ تا ۲۴۸ ملاحظہ ہو۔

گی۔ تب عورت دوسرے کے ساتھ نیوگ کر کے اولاد پیدا کرے، لیکن اس بیاہے عالی حوصلہ خاوند کی خدمت میں کمربستہ رہے۔ ویسے ہی عورت بھی جب بیماری وغیرہ میں پھنس کر اولاد پیدا کرنے کے ناقابل ہو، تب اپنے خاوند کو اجازت دے کہ اے مالک آپ اولاد کی امید مجھ سے چھوڑ کر کسی دوسری بیوہ عورت سے اولاد پیدا کر لیجئے، جیسے پانڈو راجہ کی عورت کنتی اور ماوری وغیرہ نے کیا اور جیسا دیاس جی نے چتیرانگد اور وچتر ویرج کے مر جانے پر اپنے بھائیوں کی عورتوں سے نیوگ کر کے امبکا امبا سے دھرت راشٹر اور امبالیکا سے پانڈو اور والسی سے دور کو پیدا کیا۔ اس قسم کے تاریخی واقعات بھی اس بارہ میں ثبوت ہیں۔" (ستیارتھ صفحہ ۱۴۷)

سوامی جی کے نزدیک شادی اور نیوگ کے ذریعہ عورت اور مرد کو دس دس اولاد پیدا کرنے کی اجازت ہے مگر کب اور کس طرح؟ سوامی جی لکھتے ہیں۔

اگر شادی شدہ مرد دھرم کی خاطر غیر ملک میں گیا ہو تو بیاہی عورت ۸ برس، اگر علم و نیک نامی کے لیے گیا ہو تو چھ برس اور دولت کمانے کے لیے گیا ہو تو تین برس تک انتظار کر کے نیوگ کے ذریعہ اولاد پیدا کر لے۔ جب شادی شدہ خاوند واپس آئے تب نیوگ شدہ خاوند سے قطع تعلق ہو جائے ویسے ہی مرد کے لیے بھی قاعدہ ہے۔

۲۔ عورت بانجھ ہو تو آٹھویں برس اولاد ہو کر مر جائے تو دسویں برس جب جب اولاد ہو تب لڑکیاں ہی ہوں لڑکے نہ ہوں تو گیارھویں برس اور جو بدکلام بولنے والی ہو تو جلدی ہی اس عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت سے نیوگ کر کے اولاد پیدا کرے۔

۳۔ اسی طرح اگر مرد نہایت تکلیف دہندہ ہو تو عورت کو چاہیے کہ اس کو چھوڑ کر دوسرے مرد سے نیوگ کر کے اولاد پیدا کر کے اس بیاہے خاوند کی وارث کرے۔

۴۔ اگر حاملہ عورت سے ایک سال کے عرصہ میں مرد سے یا دائم المریض مرد کی عورت سے رہا نہ جائے اور اس کا عالم شباب ہو تو کسی سے نیوگ کر کے اس کے لیے اولاد پیدا کر دے۔[1]

مسئلہ نیوگ کے اخلاقی پہلو کو سوامی جی خود ہی سوال و جواب میں اسی طرح بیان کرتے ہیں۔

سوال: یہ نیوگ کی بات زناکاری کی مانند معلوم ہوتی ہے؟

جواب: جیسا کہ قواعد کے مطابق بیاہ ہونے پر زناکاری نہیں کہلاتی، اسی طرح قاعدہ کے مطابق نیوگ ہونے پر زناکاری نہیں کہی جائے گی۔

سوال: ہے تو ٹھیک لیکن یہ رنڈی بازی کا سا کام نظر آتا ہے۔

جواب: رنڈی بازی میں کوئی مقررہ آدمی یا مقررہ قاعدہ نہیں ہوا کرتا مگر نیوگ میں بیاہ کی مانند قواعد ہیں۔

سوال: ہم کو نیوگ کی بات میں گناہ معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] ستیارتھ پرکاش ص ۱۳۸۔

جواب: گناہ تو نیوگ کے روکنے میں ہے کیونکہ ایشور کے قواعد کے مطابق مرد و عورت کا فطرتی عمل رک ہی نہیں سکتا بجز تارک الدنیا عالم باکمال اور جوگیوں کے۔[1]

سوامی جی کے اس بیان سے دو امور مستنبط ہوتے ہیں۔

۱۔ نیوگ کا مسئلہ۔ مرد و عورت کے فطری عمل کو جاری رکھنے کے لیے ہے۔

۲۔ نیوگ نہ کرنا گناہ ہے۔ بالفاظ دیگر نیوگ پر عمل کرنا بڑا ثواب ہے۔

پھر سوامی جی رقمطراز ہیں۔

''ایک نیوگ میں دوسرے لڑکے کے حمل رہنے تک نیوگ کی حد ہے، اس کے پیچھے صحبت نہ کریں۔ حاصل کلام مذکورہ بالا طریقے سے دس اولاد تک ہوتے ہیں پیچھے شہوت پرستی سمجھی جاتی ہے۔''[2]

گویا سوامی جی کے نزدیک جب تک ایک عورت غیر مردوں سے یا مرد غیر عورتوں سے دس بچے پیدا نہ کرلیں تب تک وہ برابر نیوگ کر سکتے ہیں۔

اسلام کے نزدیک سوامی جی کا یہ تمام فلسفہ بدکاری میں شامل ہے۔ اسلام نکاح کو حفاظت عصمت کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

هُوَ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (البقرہ ۲:۱۸۷) عورتیں تمھارے لباس ہیں اور تم عورتوں کے لیے لباس ہو۔

لباس وہ ہے جو انسان کے قبیح امر کو ڈھانپ دے (مفردات امام راغبؒ)

امام راغب فرماتے ہیں کہ میاں کو بیوی کا اور بیوی کو خاوند کا لباس اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی محافظت کرتے اور دوسرے کو امر قبیح کے ارتکاب سے بچاتے ہیں۔

دوسری جگہ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ (النساء ۴:۲۴)

اور جو اس کے سوا ہیں وہ تمھارے لیے حلال ہیں۔ اس طرح کہ تم اپنے مالوں کے ساتھ ان کو چاہو نکاح میں لا کر نہ شہوت رانی کرتے ہوئے۔

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا ہے کہ مرد کا جنسی تعلق صرف نکاح کے ذریعہ ہی جائز ہے، دوسری کوئی صورت جائز نہیں اور اس کے علاوہ جو بھی کوئی طریقہ اختیار کیا جائے گا وہ شہوت رانی اور بدکاری کا ہوگا۔

وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ (الممتحنہ ۶۰:۱۲) یعنی نہ زنا کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ بہتان کی اولاد ساتھ لائیں گی جس کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان (نطفہ شوہر سے جنی ہوئی دعویٰ کے ساتھ) بنا لیں۔

---

[1] ستیارتھ پرکاش ص ۱۳۲، ۱۳۳۔ [2] ستیارتھ پرکاش ص ۱۳۷۔

مادہ وروح کے ازلی وابدی ہونے کا عقیدہ اور اس کا رد

سوامی دیانند اللہ تعالیٰ کی طرح مادہ اور روح کو ازلی وابدی مانتا ہے۔ ستیارتھ پرکاش کے صفحہ ۲۷۴ پر مذکور ہے کہ جب سوامی دیانند سے یہ سوال کیا گیا کہ ازلی کس کو کہتے اور کتنی اشیاء ازلی ہیں؟ تو وہاں جواب دیتے ہیں کہ تین چیزیں ازلی ہیں۔ پرمیشور، جیو اور پرکرتی۔

دوسری جگہ پانچ چیزوں کو ازلی قرار دیا کہ ''پیدائش عالم سے پرمیشر پرکرتی کال (زمانہ) اور اکاش نیز جیو جو ازلی ہیں موجود ہوتے ہیں۔ اس سے دنیا کی پیدائش ہوتی ہے۔''[1]

اسی کی مزید تائید اس عبارت سے ہوتی ہے کہ ''درحقیقت آکاش کی پیدائش نہیں ہوتی کیونکہ بغیر آکاش کے پرکرتی اور پرمانو کہاں ٹھہر سکیں۔[2]

پھر لکھا ہے کہ ''آکاش غیر متناہی اور محیط کل ہے۔''[3]

اسلام کی رُو سے دنیا و مافیہا اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ روح اور مادہ کو ازلی وابدی ماننے سے اللہ تعالیٰ کی بعض صفات میں نقص لازم آتا ہے اور نقص عیب ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات ہر عیب سے منزہ ہے۔

پہلا نقص

اگر ہم جیو اور پرکرتی کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق نہ مانیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا علم بھی ناقص ہے کیونکہ اگر خدا تعالیٰ جیو اور پرکرتی کے متعلق کامل علم رکھتا تو وہ ضرور ان کو بنا بھی سکتا۔ ہم اس بات کا قیاس آسانی سے انسان کی حالت سے کر سکتے ہیں کہ جس چیز کا علم انسان کو ہو جائے اور وہ چیز محدود ہو تو انسان بنا بھی سکتا ہے جو چیز انسان بنا نہیں سکتا تو ہم کہتے ہیں کہ اس کا علم اس کے متعلق ناقص ہے پس مادہ اور روح کو غیر مخلوق ماننے سے یہ لازم آتا ہے کہ مادہ اور روح کے متعلق اللہ تعالیٰ کا علم ناقص ہے۔

دوسرا نقص

اس عقیدہ کی رو سے اللہ تعالیٰ مادہ اور روح کا حقیقی مالک نہیں کہلا سکتا کیونکہ حقیقی ملکیت تو یہی ہے کہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہوں۔

تیسرا نقص

خدا کی ایک صفت صمدیت ہے۔ یعنی وہ کسی کا محتاج نہیں اور سب اسی کے محتاج ہیں۔ لیکن اس عقیدہ کی رو سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ روح و مادہ کا محتاج ہے۔ اگر مادہ اور روح نہ ہوں تو وہ کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتا۔

---

[1] ستیارتھ پرکاش ص ۲۸۳۔ [2] ستیارتھ پرکاش ص ۲۹۰۔

[3] ستیارتھ پرکاش ص ۲۴۹۔

چوتھا نقص

روح اور مادہ کو ازلی ماننے سے اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت کو ایک عرصہ کے لیے بیکار اور معطل ماننا پڑتا ہے کیونکہ جب تک روح اور مادہ اپنی اصلی حالت میں ہیں۔ اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت کا قطعاً ظہور نہیں ہوسکتا۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ روح اور مادہ کو ازلی اور ابدی ماننے سے اللہ تعالیٰ کی صفات میں نقص لازم آتا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ عقیدہ باطل ہے۔

پانچواں نقص

اللہ تعالیٰ سرب شکتیمان ہے یعنی قادر مطلق ہے۔ پس اگر خدا تعالیٰ ارواح اور مادہ کا خالق نہیں ہے تو وہ تو وہ سرب شکتیمان یعنی قادر مطلق بھی نہیں ہے۔

دلائل تردید از روئے قرآن مجید

لمی دلیل

یعنی علت سے معلول کی طرف دلیل ''لمی دلیل'' کہلاتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (الرعد ۱۶:۱۳) کہہ دے اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ اکیلا ہے اور سب پر غالب ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا خالق قرار دیا ہے اور اس دعویٰ کی ایک دلیل یہ دی ہے کہ اللہ واحد ہے یعنی وہ اپنی ذات، صفات اور افعال میں یکتا اور لیس کمثلہ ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ القہار ہے۔ یعنی اللہ سب پر حکمران اور متصرف ہے اور سب اشیاء کو اپنے ماتحت رکھتا ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کا خالق نہ ہو۔ کچھ چیزیں اس کی خلق سے باہر ہوں اور وہی صفات رکھتی ہوں جو اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ جیسا کہ آریہ سماج کا عقیدہ ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی ذات صفات اور افعال میں یکتا اور لیس کمثلہ نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات صفات اور افعال میں لیس کمثلہ نہ ہونا نقص ہے۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کے تصرف سے کچھ چیزیں باہر رہیں تو وہ قہار نہیں کہلا سکتا۔ اس سے بھی اللہ کی صفت مالکیت میں نقص لازم آتا ہے۔

تمام مذاہب کے نزدیک یہ بات مسلمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے جس عقیدہ سے اللہ کی ذات میں نقص لازم آتا ہو وہ باطل اور غلط ہے چونکہ روح اور مادہ کو قدیم اور انادی ماننے سے اللہ تعالیٰ کی صفت احدیت اور قہاریت پر زد پڑتی ہے۔ اس وجہ سے یہ عقیدہ سراسر باطل ہے۔

دوسری دلیل انی ہے۔ یعنی معلول سے علت کی طرف یعنی مخلوق سے خالق شناسی حاصل کرنا۔
قرآن مجید میں آتا ہے۔ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا.
(فرقان ۲:۲۵) حکومت میں اس کا کوئی شریک ہے اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کے لیے ایک اندازہ ٹھہرایا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کیا ہے کہ ہر ایک مخلوق کی طاقت اور کام کی ایک حد مقرر کر دی ہے۔ کوئی چیز بھی اپنی حد سے باہر نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ چاند ایک مہینہ میں اپنا دورہ ختم کر لیتا ہے یعنی ۲۹ یا ۳۰ دن تک، مگر سورج ۳۶۴ دن میں اپنے دورے کو پورا کرتا ہے۔ نہ چاند میں یہ طاقت ہے کہ وہ اپنے دورہ کو اس مدت میں کم یا زیادہ میں مکمل کرے، نہ سورج کو یہ طاقت ہے کہ وہ اپنے مقررہ وقت سے کم یا زیادہ میں دورہ مکمل کرے۔ اگر دنیا کے تمام سائنس دان اس بات پر اتفاق کر لیں کہ ان دونوں چیزوں کے دوروں میں کچھ کمی بشی کر دیں تو وہ ہرگز نہیں کر سکیں گے۔ اسی طرح دنیا کی ہر چیز اپنی اپنی حد میں مقید ہے۔ وہ اس قید سے باہر نہیں نکل سکتی۔ یہ حد بندی قانون کا تقاضا کرتی ہے اور قانون مقنن کا تقاضا کرتا ہے اس ہے لامحالہ ماننا پڑے گا کہ حد بندی کرنے والا کوئی محدد ہے۔ پھر یہ حد بندی بھی ایک قانون کے تابع ہے۔ اسی لیے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کوئی مقنن ہے۔ پس وہ محدد اور مقنن اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

جس طرح حد بندی اجسام اور مادہ میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح یہ حد بندی ارواح میں بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً جس قدر انسانی روح اپنے کمالات ظاہر کر سکتی ہے شیر اور ہاتھی کی ارواح وہ کمالات ظاہر نہیں کر سکتیں۔

پس جس طرح اجسام کی حد بندی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان کا کوئی محدد اور خالق ہے اسی طرح ارواح کی حد بندی بھی اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ ان کا کوئی پیدا کرنے والا اور حد باندھنے والا ہے۔

سائنس کے انکشافات اور تجربات نے اس امر کو واضح کر دیا ہے کہ دنیا کی ہر چیز ایک اٹل قانون کے تحت کام کر رہی ہے۔ چنانچہ جارج ارل ڈیوس (پی ایچ ڈی ماہر طبیعات) رقمطراز ہے۔

''ایک عالم طبیعات کی حیثیت سے مجھے کائنات کے اس ناقابل یقین حد تک پیچیدہ نظام کے مطالعہ کا موقع ملا ہے اور میں نے ایک ذرے سے لے کر بڑے سے بڑے ستارے میں حیرت انگیز ضابطہ بندی اور نظم پایا ہے۔ اس کائنات میں روشنی کی ہر شعاع پر طبیعیاتی اور کیمیائی ردعمل اور ہر ذی حیات شے کی ہر خصوصیت اسی نظم اور اسی ضابطے کے تابع فرمان نظر آتی ہے۔ یہ اس کائنات کی وہ تصویر ہے جو سائنس کے انکشافات نے ہمارے سامنے پیش کی ہے اور آپ سائنس کا جتنا گہرا مطالعہ کریں اتنا ہی زیادہ کائنات کے اس پرپیچ اور دلکش نظام سے آپ مسحور ہوتے چلے جائیں گے۔''[1]

[1] خدا موجود ہے ص ۱۲۵ طبع اوّل۔

دلیل قیاس الخُلف

قیاس الخُلف اس قیاس کا نام ہے کہ جس میں اثبات مطلوب کا ابطال اس کے نقیض سے کیا جاتا ہے اور اس قیاس کو علم منطق میں خُلف اس جہت سے کہتے ہیں کہ خُلف لغت میں بمعنی باطل کے ہے اس طرح اس قیاس میں اگر مطلوب کو جس کی حقیقت کا دعویٰ ہے سچا مان نہ لیا جائے تو نتیجہ ایسا نکلے گا جو باطل کو مستلزم ہوگا۔ قیاس مذکور یہ ہے۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ اَمْ خَلَقُوا السَّموٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَا يُوْقِنُوْنَ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ. (طور ۵۲: ۳۵۔۳۶) کیا یہ بغیر کسی کے پیدا کرنے کے پیدا ہو گئے ہیں یا یہی پیدا کرنے والے ہیں یا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے بلکہ یقین نہیں کرتے کیا ان کے پاس تیرے رب کے خزانے ہیں یا یہ مسلط ہیں۔

پس نہ تو انسان خود بخود پیدا ہوا ہے اور نہ وہ خالق ہے کیونکہ ہمارا تجربہ ہے کہ انسان ایک معمولی سا کیڑا بھی نہیں بنا سکتا۔ نہ انسان زمین اور آسمانوں کا پیدا کرنے والا ہے نہ انسان کے پاس بے انت خزانے ہیں جن سے اس کو یہ علم ہو سکے کہ مادہ اور روح وغیرہ غیر مخلوق ہیں کیونکہ انسانی عقل محدود ہے خدا کی بے انت باتوں کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ نہ انسان آزاد ہے، بلکہ وہ تو قانون کی قید میں مقید ہے۔ پس جب یہ باتیں واضح اور ثابت شدہ ہیں تو خود بخود ایک منطقی نتیجہ نکلے گا کہ سب اشیاء کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى (حشر ۵۹: ۲۴) اللہ تعالیٰ اندازہ کرنے والا وجود بخشنے والا اور رنگ برنگ کی صورتیں عطا کرنے والا ہے۔ تمام صفات کاملہ سے موصوف اور تمام نقائص اور عیوب سے منزہ ہے۔

جب اللہ تعالیٰ تمام کمالات کا مالک ہے تو وہ نیست سے ہست کیوں نہیں کر سکتا۔ عدم سے وجود میں لانا بھی ایک کمال ہے۔ پس مادہ اور روح کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہی تمام اشیاء کو عدم سے وجود میں لاتا ہے۔

عقیدہ تناسخ اور اس کا رد

انسان کے مرنے کے بعد روح کا کیا حشر ہوگا۔ اس کی تین صورتیں ہیں۔ ا۔ جسم کے ساتھ روح بھی ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے۔ ۲۔ اسے اپنے اعمال کے مطابق جزا و سزا دی جائے۔ ۳۔ اسے اپنے اعمال کے مطابق مختلف روپ بدلنا پڑیں۔ پہلا خیال مادئین کا ہے دوسرا یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کا ہے۔ تیسرا ہندوؤں اور بعض دیگر اقوام کا ہے۔

تناسخ کو سنسکرت والے اواگون کہتے ہیں۔ تناسخ کے ماننے والے اس کے یہ معنی بتاتے ہیں۔

گناہوں اور نیکیوں کے باعث بار بار جنم لینا اور مرنا۔

آریوں کا عقیدہ ہے کہ روحوں کی تعداد محدود ہے۔ اللہ تعالیٰ نئی روح پیدا نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے ہر روح کو اس کے گناہ کی وجہ سے اواگون کے چکر میں ڈال رکھا ہے اور ہر گناہ کے بدلے میں روح ایک لاکھ چوراسی ہزار مرتبہ مختلف شکلوں میں جنم لیتی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے اپنے گذشتہ اعمال اور علم کے مطابق بعض حصول جسم کے لیے رحم میں داخل ہوتی ہیں اور بعض مقیم اشیاء پودوں وغیرہ میں۔ (کٹھ اپنشد ۵۔۷)

دنیا میں حیوانات، نباتات، جمادات، دنیا میں اختلاف اور انسانوں کا بیماری اور دکھ میں مبتلا ہونا سب پچھلے گناہوں کی وجہ سے ہے۔

بعض اپنشدوں کے مطابق ارواح کو مرنے کے بعد دو راستوں میں سے ایک سے سفر کرنا ہوتا ہے۔ ایک تو دیوتاؤں کا راستہ (دیوآئین) دوسرا آباء (مردہ انسان بزرگوں) کا راستہ (پتر آئین) ہے۔ اعلیٰ ترین روحیں پہلے راستہ سے سفر کر کے عالم خداوندی (برہم لوک) تک پہنچ جاتی ہیں اور مراقبہ میں محو ہو کر اپنے کو مکمل کرتی ہیں۔ آخرکار اللہ تعالیٰ کی ذات میں جذب ہو جاتی ہیں۔ نیک روحیں دوسرا راستہ اختیار کر کے چاند تک پہنچتی ہیں اور وہاں جا کر اپنے نیک اعمال کی وجہ سے آرام اور سکھ اٹھاتی ہیں اور وقت پورا ہونے پر پھر زمین میں دوبارہ پیدا ہونے کے لیے نزول کرتی ہیں۔ اپنشدوں سے قبل تناسخ کا ذکر نہیں ملتا۔ (منڈک ۱۔۲......۱، چھاندگیہ ۵۔۳۔۱۰)

ا۔ رد از روئے سائنس

اس عقیدہ کی رو سے حیوانات، نباتات وغیرہ انسان کے پچھلے جنم کے اعمال کی مختلف شکلیں ہیں۔ سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی پیدائش سے کروڑوں سال قبل دنیا میں صرف جمادات، نباتات اور حیوانات ہی بستے تھے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ حیوانات اور نباتات وغیرہ انسانی اعمال کے نتائج نہیں۔ کیونکہ یہ ضروری ہے کہ نسل انسانی سے پہلے نباتات اور حیوانات موجود ہوں۔ اگر ان اشیاء کی موجودگی سے قبل انسان پیدا ہوتا تو وہ زندہ نہ رہ سکتا۔

جب نباتات اور حیوانات کی پیدائش سے قبل انسان ہی نہ تھا تو اعمال بھی نہ تھے۔ لہٰذا نباتات اور حیوانات انسانی اعمال کا نتیجہ نہیں ہیں۔

انسان کی عقل بھی یہی فتویٰ دیتی ہے کہ انسان کی پیدائش سے قبل وہ تمام چیزیں موجود ہوں جو اس کی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ نباتات، حیوانات، جمادات وغیرہ انسانی زندگی کے لیے ازحد ضروری اور لابدی ہیں۔ انسان ان کے بغیر زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔ اس وجہ سے ماننا پڑے گا کہ یہ تمام چیزیں انسانی پیدائش سے قبل تھیں اور وہ بغیر کسی انسانی اعمال کے پیدا ہوئی تھیں۔

قرآن مجید نے اسی امر کو اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کے تحت بیان کیا ہے۔ رحمانیت وہ فیض ربانی ہے جس کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے انسانی ضروریات کے سامان اس کی پیدائش سے قبل ہی دنیا میں پیدا

کر دیئے۔ جن سے ہر شخص خواہ وہ موحد ہو یا ملحد یکساں فائدہ اٹھاتا ہے۔ پس یہ صفت ربانی ظاہر کرتی ہے کہ سورج، چاند، ستارے، ہوا، زمین، چرند پرند، حیوانات غرض کہ ہر چیز انسان کی پیدائش سے پہلے پیدا کی گئی تھی۔

۲۔ رد از روئے مسئلہ ارتقاء

عقیدہ تناسخ اصول ارتقاء کے خلاف ہے۔ دنیا میں ہر چیز آگے کی طرف رواں دواں ہے قرآن مجید نے اس مسئلہ کو لفظ رب سے بیان کیا ہے۔ رب کے معنی ہیں ایک چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف نشوونما دینا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے کمال کو پہنچ جائے (مفردات امام راغب) عقیدہ تناسخ کی رو سے ایک انسان اپنے گناہ کی پاداش میں کتا، سور، مولی، گاجر وغیرہ کی جون اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ارتقا نہیں بلکہ تنزل ہے۔ سائنس کہتی ہے زندگی بالترتیب ہوئی ہے۔ اور نیچر میں سب جگہ یا کل انواع مخلوقات میں لا آف کنٹینوئی (Law of continuity) موجود ہے۔ ابتداء مردہ مادہ ہے پھر زندہ اور جاندار مادہ (Living matter) یا سادہ زندگی پیدا ہوئی۔ ایک طویل عرصہ کے بعد جانداروں میں آہستہ آہستہ تکمیل حواس ہوئی۔ پھر ایسے جاندار پیدا ہوئے جن میں عقل کی تخلیق ہوئی۔

پس مسئلہ ارتقاء کی روشنی میں انسان نے آگے کی طرف ترقی کرنا ہے اور ضروری ہے کہ اس کی اگلی حالت موجودہ حالت سے بہتر ہو۔ اگر اس کی موجودہ زندگی میں اعمال کی وجہ سے کوئی نقص رہ گیا ہے تو اس کا تدارک اگلی زندگی میں ہونا چاہیے۔ نہ کہ دوبارہ اس دنیا میں کسی دوسری جون میں لوٹا کر اصلاح کی جائے۔

اگر تمام عالموں میں غور کیا جائے تو ان میں ایک لاتبدیل قانون نظر آئے گا۔ وہ یہ کہ اگر کسی ایک عالم میں کوئی نقص رہ گیا ہو تو اس کی اصلاح دوسرے عالم میں ہوتی ہے نہ کہ اس نقص کا علاج کرنے کے لیے دوبارہ پہلے عالم میں لوٹایا جاتا ہے۔ مثلاً جو کچھ ہم کھاتے ہیں ضروری ہے کہ وہ نیچر کے ہاتھوں پختہ ہو چکا ہو۔ اگر وہ پختہ نہیں ہوا تو ہم اس کو اپنے ہاتھوں سے پختہ کرتے ہیں۔ اگر وہ خام حالت میں معدہ میں چلا گیا ہے جس سے معدہ کے نظام میں خرابی پیدا ہو گئی ہے تو اس کی اصلاح اور علاج دوا کے ذریعہ کرتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس خام چیز کو دوبارہ معدہ سے نکال کر پختہ کیا جاتا ہو۔ اسی طرح اگر کوئی بچہ اس دنیا میں رحم سے نقص کی حالت میں پیدا ہوا ہو تو اس کا علاج اور اصلاح اس دنیا میں کرتے ہیں نہ کہ دوبارہ اس کو رحم مادر میں بھیجتے ہیں۔

پس اللہ تعالیٰ نے تمام عالموں میں یہ ایک لاتبدیل قانون بنا دیا ہے کہ اگر ایک عالم میں کوئی نقص رہ گیا ہو تو اس کی اصلاح دوسرے عالم میں کی جاتی ہے۔ اسی طرح جب ایک انسان اس دنیا میں سانس لیتا ہے۔ اگر وہ اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کی وجہ سے اپنی روح کو پاکیزہ اور صاف نہیں کر سکا تو اس کی روح کی اصلاح دوسرے جہان میں ہوگی نہ کہ دوبارہ کسی دوسری جون میں بدل کر اصلاح کی جائے گی کیونکہ یہ طریقہ خدا تعالیٰ کے ہی لاتبدیل قانون کے خلاف ہے۔ قرآن مجید نے دوسرے عالم کو، جہاں اس گندی روح کی اصلاح اور علاج ہوتا ہے، دوزخ یا جہنم کا نام دیا ہے۔ دوزخ اور جہنم قرآنی نظریہ کے لحاظ سے روح کو پاک

اور صاف کرنے کے لیے شفاخانہ ہے۔ جس طرح اس دنیا میں جب جسم بیمار ہوتا ہے تو وہ شفاخانہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ جب اس کے جسم کی بیماری دور ہو جاتی ہے واپس گھر لوٹ آتا ہے۔ یہی حالت اس بیمار روح کی ہے۔ جب وہ دوزخ میں رہ کر پاک اور صاف ہو جائے گی۔ وہ اپنے اصل ٹھکانے یعنی جنت میں داخل ہو جائے گی۔ یہ انسانی روح کے لیے ارتقاء ہوگا۔

۳۔ رد از روئے آسمانی علم

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ تمام کتب سماوی اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت کا مظہر ہیں لیکن بعد میں انسانوں نے آسمانی علم کے مصفا پانی کو اپنی آمیزشوں کے ذریعہ گدلا کر دیا لیکن یہ بھی مسلّمہ حقیقت ہے۔ قرآن مجید ہی وہ کتاب ہے جو انسانی دست برد سے محفوظ چلی آ رہی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (الانبیاء۲۱:۹۵) یعنی مردے[1] کبھی بھی اس دنیا میں واپس نہیں آئیں گے۔ پروفیسر میکسمولر نے لکھا ہے کہ "وید میں تناسخ کا کوئی ذکر نہیں"

تمام کتب سماوی نے اعمال کی جزا و سزا کے لیے کوئی دوسرا عالم بتایا ہے اور اس جہان کو دار العمل قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ عقیدہ آسمانی علم پر مبنی نہیں بلکہ انسانی ذہن کی پیداوار ہے۔

۴۔ رد از روئے فطرت انسانی

انسانی فطرت یہ گواہی دیتی ہے کہ وہ اس سے قبل دنیا میں کبھی نہیں آئی۔ نہ اس نے ہزاروں جسمے تبدیل کیے بلکہ اس کے برعکس یہ گواہی دیتی ہے کہ انسان پہلی دفعہ اس دنیا میں آیا اور اس نے دوسروں سے اپنے رشتے ناطے جوڑے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کے منافی ہے

تمام مذاہب عالم کا یہ متفقہ اور مسلّمہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام عیوب سے منزہ اور پاک ہے۔ تناسخ کا عقیدہ اللہ کی صفات خالقیت اور غفوریت کے خلاف ہے۔ اس عقیدہ کی رُو سے یہ ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ کوئی نئی روح پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں نقص ہے۔ اسی طرح قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کو مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہا ہے یعنی جزا کے دن کا مالک قرآن مجید نے مالک کا لفظ بجائے ملک کے اس لیے اختیار کیا ہے کہ ملک محدود اختیارات کا حاکم ہوتا ہے وہ کسی مجرم کو چھوڑ نہیں سکتا۔ مالک کے اختیار وسیع ہوتے ہیں، جسے چاہے معاف کر دے۔ پس اللہ تعالیٰ جس گناہگار کو چاہے معاف کر سکتا ہے۔ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کو "غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ (المومن ۴۰:۳) کہا ہے یعنی اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔

---

[1] یعنی بطور قانون عام معجزے کی بابت دوسری ہے۔

اگر یہ مانا جائے کہ کسی گناہگار کے گناہ معاف نہیں ہو سکتے تو یہ خیال اللہ کی صفت مالکیت اور غفوریت کے منافی ہے۔

۶۔ ہماری اس دنیا کی تمام نعمتیں مثلاً گھوڑا، گائے، بیل، گھی، دودھ، مکھن، پھل نظریہ تناسخ کی رو سے پچھلے جنم کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہیں۔ یہ ایک مسلمہ اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ یہ تمام نعمتیں نہ صرف بابرکت ہیں بلکہ انسان کی زندگی کا انہی پر دارومدار ہے۔ جب یہ تمام نعمتیں گناہوں کا بابرکت ثمر ٹھہریں تو لامحالا گناہ کو ہی زندگی کا دارومدار ٹھہرانا پڑے گا۔ اگر دنیا میں گناہ نہ ہوتے تو یہ چیزیں پیدا نہ ہوتیں لیکن قائلین تناسخ بھی گناہ کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے۔ ہمارا یہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ گناہ صرف انسان کی روح کو ہی سیاہ نہیں کرتا، بلکہ معاشرہ میں بگاڑ پیدا کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے تمام مصلحین اور فلاسفہ نے گناہوں کے خلاف جہاد کیا ہے۔ پس اس عقیدہ کی رو سے گناہ نہ صرف عمدہ فعل متصور ہوتا ہے بلکہ انسانی زندگی کا مدار ٹھہرتا ہے۔

۷۔ اس عقیدہ کی رو سے یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ تمام مصلحین اور موجد جو لوگوں کے ہاتھوں دکھ اور اذیت دیے گئے، گھروں سے باہر نکالے گئے، قتل کیے گئے۔ وہ سب اپنے پچھلے جنم میں بدکار اور فاسق تھے کیونکہ وہ اس عقیدہ کی رو سے اپنے پچھلے جنم کی بداعمالوں کی وجہ سے دکھ دیے گئے ہیں۔

۸۔ قائلین تناسخ کہتے ہیں کہ دنیا میں جو اختلاف نظر آتا ہے یہ پچھلے اعمال کے نتیجہ میں ہے قرآن مجید کہتا ہے کہ دنیا کا اختلاف اعمال کا نتیجہ نہیں بلکہ اختلاف کا نتیجہ اعمال ہیں۔ اگر دنیا میں اختلاف نہ ہوتا تو عمل کا وجود ہی نہ ہوتا اور نہ دنیا کا نظام قائم رہ سکتا۔ اگر زمین کے قطعات اور آب و ہوا میں اختلاف نہ ہوتا تو مختلف قسم کی سبزیاں، ترکاریاں، اجناس، پھل وغیرہ پیدا نہ ہوتے۔ اگر سورج چاند کی شعاعوں کی تاثیرات میں اختلاف نہ ہوتا تو دنیا میں زندہ رہنا مشکل ہو جاتا۔ اگر سورج چاند اور زمین کے دائرہ گردش میں اختلاف نہ ہوتا تو وہ آپس میں ٹکرا کر فنا ہو جاتے۔ اگر انسان میں مرد اور عورت میں اختلاف نہ ہوتا تو نہ کوئی بڑھئی بنتا نہ کوئی لوہار، نہ کوئی درزی، نہ کوئی تاجر، نہ کوئی کاشت کار، نہ کوئی حاکم نہ کوئی محکوم، غرض کہ تمدن کی عمارت بالکل قائم نہ ہوتی۔ دنیا میں جو تمدنی نظام چل رہا ہے۔ وہ بالکل بند ہو جاتا۔

پس اسی اختلاف کی وجہ سے نظام کائنات چل رہا ہے۔ اسی اختلاف کی وجہ سے ہر قسم کا رزق حاصل ہو رہا ہے۔ اسی اختلاف کی وجہ سے تمدن کی گاڑی چل رہی ہے۔ پس اس دنیا میں جو اختلاف نظر آ رہا ہے وہ ایک حمت بالغہ پر مبنی ہے اور رحمت کا موجب ہے۔ اس اختلاف کو پچھلے جنم کے اعمال کی پاداش قرار دینا محض نادانی اور جہالت ہے۔

۹۔ قائلین تناسخ کا دکھ درد تکلیف بیماری کو پچھلے جنم کے اعمال کا نتیجہ قرار دینا بھی جہالت اور حماقت ہے۔

یہ کس طرح ثابت ہوا کہ دنیا میں جو بھی دکھ درد اور تکلیف بیماری کسی انسان کو پہنچتی ہے وہ اس کے

گذشتہ جنم کے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ یہ کس نے ثابت کر دکھایا ہے کہ جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ پہلے بھی کسی انسانی پیکر میں دنیا میں آئی تھی۔ پس یہ دعویٰ ہے۔ اس کے حق میں کوئی دلیل اور ثبوت نہیں ہے۔

دکھ اور درد اور بیماری تو اولیاء، مصلحین، انبیاء علیہم السلام کو بھی پہنچتی ہیں، کیا وہ پچھلے جنم میں بدکار رہے ہیں؟ کوئی بھی مذہب اس کے حق میں نہیں۔ ہر دور میں اطباء اس بات پر متفق ہیں کہ ہر بیماری کے کچھ اسباب ہوتے ہیں۔ آج تک کسی طبیب نے یہ نہیں بتایا کہ بیماری بغیر کسی سبب کے پیدا ہوئی ہو۔ تمام نظام کائنات ایک لاتبدیل قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ صحت کے لیے بھی اصول ہیں جو آدمی ان اصولوں کو توڑے گا وہ بیمار ہو جائے گا۔

اگر بیماریوں کو پچھلے جنم کے اعمال کا نتیجہ قرار دے لیا جائے تو تمام طب بے فائدہ اور لغو ثابت ہوتی ہے۔ جب ہم نے یہ مان لیا کہ تمام بیماریاں جو انسانوں اور حیوانوں کو لاحق ہوتی ہیں وہ بداعمالی کا نتیجہ ہیں تو کوئی طبیب نیچرل اسباب کو کیوں ڈھونڈے گا۔ اس عقیدہ سے تمام طب نہ صرف باطل ہو جاتی ہے بلکہ مزید تحقیق کے دروازے بھی بند ہو جاتے ہیں۔

باقی رہا دکھ سکھ، اس کی فلاسفی نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ خیال کر لیا گیا ہے کہ دکھ سکھ پچھلے جنم کی بداعمالی کا نتیجہ ہیں۔

قرآن مجید نے دکھ سکھ کا ذمہ دار خود انسان کو ٹھہرایا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

مَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ (الشوریٰ ۴۲:۳۰) اور جو تم پر مصیبت پڑتی ہے، تمھارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے۔

قرآن مجید اس دکھ سکھ کی یہ فلاسفی بیان کرتا ہے کہ دکھ سکھ سے انسان کی روحانی ترقی وابستہ ہے۔ اگر انسان دکھ میں صبر، شجاعت، استقامت، صدق اور وفا کا نمونہ دکھاتا ہے وہ تو خدا کی رضا، خوشنودگی اور قرب کو حاصل کر لیتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک انسان سکھ میں شکر، حلم، بردباری، شفقت علی مخلوق کا نمونہ دکھاتا ہے تو وہ خدا کے مزید انعامات کا مستحق ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ اس عقیدہ سے تمام دنیا کا قانونی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص قتل ہو گیا۔ اس عقیدہ کی رو سے یہ اس کے گزشتہ جنم کے عمل کا نتیجہ ہے تو پھر قاتل کو کیوں پھانسی دی جائے؟ اس نے تو خدا کی منشاء کے مطابق کام کیا۔ کیا خدا کی منشاء کے مطابق کام کرنے والے کو پھانسی کی سزا دی جا سکتی ہے؟ اسی طرح ایک غریب، مسکین، بے بس سے ہمدردی کا جذبہ بھی ختم ہو جاتا ہے کیونکہ وہ تو اپنے پچھلے جنم کے کسی برے عمل کی سزا بھگت رہا ہے۔ اس کی مدد اور ہمدردی کرنا خدا کی منشاء کے خلاف ہوگا اور ہمدردی کرنے والا جرم کا ارتکاب کرے گا۔

ہندومت پر اسلام کا اثر

جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی جنگ و پیکار ختم ہوئی اور ایک دوسرے سے ملنے جلنے لگے تو مسلمانوں نے ہندو عورتوں سے شادیاں کرنی شروع کر دیں۔ ہندو اور مسلمان بچے مکاتب اور مدارس میں اکٹھے تعلیم پانے لگے۔ ہندوؤں نے مسلمان سلاطین کی نوکریاں اختیار کرنا شروع کر دیں۔ یہ اختلاط ہندومت پر بہت اثر انداز ہوا۔ بے شمار روشن خیال لوگ پیدا ہوئے۔ جو شدت سے محسوس کرنے لگے کہ ہمارا مذہب بہت کچھ اصلاح کا محتاج ہے اور اسلام کی بہت سی باتیں اپنائی جائیں۔ مثلاً توحید، مساوات وغیرہ انھوں نے اسلامی اصولوں کو سامنے رکھ کر ہندو دھرم میں اصلاحات کرنے کی کوششیں کیں۔

بارتھ اپنی کتاب ''ریلیجنز آف انڈیا'' میں لکھتا ہے۔ ''خلافت اسلامیہ کے عرب ان سواحل پر سیاحوں کی حیثیت سے آئے اور اپنے ہم مذہب افغانوں، ترکوں اور منگولوں سے (جو فاتحین کی حیثیت سے آئے) بہت پہلے ان علاقوں سے تجارت اور میل ملاپ کے تعلقات قائم کر چکے تھے اور یہی وہ علاقے ہیں جن میں نویں صدی سے بارھویں صدی تک وہ عظیم مذہبی تحریکیں نمودار ہوئیں جو شنکر آچاریہ، رامانج اندتیرتھ اور بساوَ کے ناموں سے منسوب ہیں۔''

ڈاکٹر تارا چند نے اپنی مشہور کتاب ''اسلام کا اثر ہندی ثقافت پر'' میں بھی اس امر کا اقرار کیا ہے کہ یہ تحریکات دین اسلام کے اثرات کی پیداوار ہیں۔

شنکر آچاریہ

آٹھویں صدی کے اواخر میں مالابار کے ساحل پر دریائے الور کے کنارے گاؤں کالڈی (Kaladi) میں ایک نمبو دری برہمن شوگرو کے ہاں شنکر آچاریہ پیدا ہوا ان کا والد صغرسنی میں فوت ہو گیا۔ ان کی والدہ نے باوجود غریب ہونے کے بچے کی تعلیم کی طرف خاص توجہ دی کل شاستر پڑھائے۔ بچہ بھی اتنا ذہین و فطین تھا کہ سولہ سال کی عمر میں تمام ہندو فلسفوں اور الہیات پر حاوی ہو گیا اور مالا بار میں علم و فضل میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

جب شنکر اچاریہ نے ہندو دھرم کی ابتر حالت دیکھی تو اس کی اصلاح کا مصمم کا ارادہ کر لیا اور گھر سے نکل پڑے۔ سولہ برس تک شنکر ہندوستان میں ادھر اُدھر گھومتے رہے۔ تمام مشہور مقامات اور دارالعلوم میں پہنچے۔ اپنے نظریات پر کتب لکھیں، وہ فتوحات کے نام سے مشہور ہیں۔ مذہبی کتب پر تفاسیر لکھیں۔ ان میں سے تفسیر ویدانت، فلاسفی، اپنشد اور بھگوت گیتا قابل ذکر ہیں۔ بدھ اعظم کی طرح انھوں نے بھی ایک

مذہبی جماعت قائم کرنا چاہی۔ ہند کی چار مختلف سمتوں میں چار بڑی بڑی خانقاہوں کی بنیاد ڈالی۔ ان میں سے سرنگا گری مٹھ کہلاتی ہے۔ دوسری دوار کا میں سرودھا مٹھ کا نام سے مشہور ہے۔ تیسری نے سری کھیتر میں گوردھن مٹھ نام پالیا اور چوتھی بدورک آسرم میں جوشی مٹھ کہلاتی ہے۔[1]

شنکر آچاریہ نے ۳۲ برس کی عمر میں وفات پائی۔[2]

نظریات

شنکر اچاریہ نے تمام ہندوؤں کو ایک ویدک دھرم پر جمع ہونے کی دعوت دی اور کہا۔ خدا ایک ہے۔ وہی حقیقت ہے۔ باقی سب دھوکہ ہے۔ دنیا مایا ہے، اس کی حقیقت برہما ہے اور افراد سب اسی حقیقت کے اجزاء ہیں۔[3] اس دنیا میں ذیل کے طریق سے زندگی بسر کرنی چاہیے۔

۱۔ بزرگان سلف کے افکار کا مطالعہ کسی استاد کامل سے کریں۔

۲۔ حیوانی خواہشات اور حواس کو نفس رحمانی کے تابع رکھیں۔

۳۔ رہبانیت اختیار کریں۔

تصانیف:۔شنکر نے حسب ذیل کتب تصنیف کیں۔ جن سے ان کے عقائد واضح ہوتے ہیں۔

۱۔تفسیر برہما سُترا ۲۔تفسیر اپنشد (اپنشد کے دس اصولوں کی وضاحت کی ہے) ۳۔شرح بھگوت گیتا۔شنکر نے ویدانت کی روشنی میں دو مقالے تحریر کیے ہیں۔ ثابت کیا ہے کہ بھگوت گیتا اور اپنشد میں ماسوائے توحید وجودی کے اور کچھ نہیں۔ ۳۔ وشنو سہاسرا ندما (Vishnu sahasrandma) کی تفسیر تحریر کی۔ مہابھارت پر تبصرہ اس کتاب کا نام سنت سوجیتیا ہے۔

ان کے علاوہ شنکر اچاریہ نے ویدانت کے مرکزی اصولوں پر کتب لکھی تھیں جن میں "ویویکا چیوڈامنی" "اپدی ساساہسری" "اپروکسانوبھتی" "آتمابدھا" "موہاموودگارا" "واسا سلوکی" اور دیوی اور وشنو کی تعریف میں "اسٹوترس" شامل ہیں۔ (Pawett some people of Malabar)

رامانج

شنکر رامانج ۱۰۱۶ء میں مدارس کے پاس ایک گاؤں پرمبر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بزرگوار کا نام کیشب اور والدہ کا نام کانتی ماتی (Kantimati) تھا۔ انھوں نے کنجن پور ضلع بجے میں تعلیم پائی۔ پہلے وہ شنکر کے ایک شاگرد یادو پرکاش کا شاگرد بنا۔ لیکن بعض مسائل پر استاد سے اختلاف کی بنا پر سری رنگم کے جمنا منی (Yamnamani) کا چیلا بن گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا جانشین مقرر ہوا۔ کئی سال قیام کر کے اپنے نظریات اور فلسفہ پر کتب تصنیف کیں۔

اس کے بعد انھوں نے اپنے نظریات کی تبلیغ کے لیے ملک میں دورے کیے، علماء سے بحثیں کیں اور ان کو ہم خیال بنایا۔ سری رنگم کا بادشاہ ان کی جان کا دشمن بن گیا۔ رامانج نے جان بچا کر کرناٹک کے بادشاہ

[1] رہنمایان ہند مترجم مصنفہ ششمتھ ناتھ دت ایم اے ایم آر اے۔ ایس سنہ اشاعت ۱۹۳۲ء بار چہارم ص ۱۹۲، ۱۹۳۔

[2] رہنمایان ہند ص ۱۹۳۔

کی پناہ لی۔ یہاں کا بادشاہ جین تھا۔ رامانج نے کوشش سے اسے وشنو مذہب کا پیرو بنالیا۔ بادشاہ نے جادب کے مقام پر ایک مندر تعمیر کیا، جس میں رامانج بارہ برس مقیم رہے اور اپنے نظریات کی اشاعت کرتے رہے۔

نظریات

رامانج حقیقت میں بھگتی تحریک کا بانی ہے۔ اس نے شنکر اچاریہ کے ''مایا'' کے نظریے کی مخالفت کی۔ شنکر خدا کی صفات کا قائل نہ تھا۔ رامانج نے کہا۔ خدا تمام صفات حسنہ سے متصف ہے۔ اس کی ذات میں کوئی شریک نہیں۔ وہ قادر مطلق ہے۔ وہی روح اور مادہ کو پیدا کرنے والا ہے اور سب اسی کی ہستی کے محتاج ہیں۔ اس نے خدا کے اوتاروں کو بھی تسلیم کیا ہے۔

رامانج ذاتوں کی پرانی تقسیم کے قائل تھے، لیکن شودروں اور چنڈالوں کے حق عبادت کو تسلیم کیا ہے اور ان کی عبادت کے لیے مندر کھول دیے۔

رامانج نے نجات حاصل کرنے کے لیے یہ پانچ درجے بتائے ہیں۔

۱۔ مندر میں جھاڑو دینا۔ ۲۔ پرستش کے واسطے پھول وغیرہ چن کر لانا۔
۳۔ خدا کی پرستش کرنا۔ ۴۔ خدا کے ناموں کے گیت گانا اور شاستروں کا مطالعہ کرنا۔
۵۔ مراقبہ زہد وعشق الٰہی کرنا[1]

رامانج کے بعد دوسرے مصلحین نے اپنے اپنے نظریات بیان کیے ہیں لیکن کوئی بھی بھگتی کے دائرہ سے باہر قدم نہ نکال سکا۔ اب بھگتی تحریک کے یہ عقیدے ہوئے۔

۱۔ شوا (خدا) اور اس کے فضل پر ایمان۔ ۲۔ اپنے گرو سے عقیدت۔
۳۔ عبادت اور ریاضت۔ ۴۔ یوگ کے اعمال اور سماع ورقص اور وجد۔
۵۔ تمام مذاہب سے رواداری۔ ۶۔ بت پرستی کی مخالفت۔
۷۔ مساوات بین الناس۔

ان عقائد سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصلحین ہندو دھرم اسلام کی تعلیم سے ضرور متاثر ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر تارا چند اپنی تصنیف ''ہندو ثقافت پر اسلام کا اثر'' میں لکھتے ہیں کہ وشنو سوامی نمبارک (Nimbarka) اور مادھو (Madhu) (۱۱۹۹-۱۲۷۸) (رامانج کے شاگردان) نے خدا اور انسان کی نوعیت کے متعلق جو مابعد الطبیعی بحثیں کی ہیں ان کو پڑھ کر نظام، اشعری اور غزالی کے مذاکرات ومباحثات یاد آجاتے ہیں۔

لنگایت

لنگایت اور بعض دوسرے فرقوں میں بھی اسلام کے نقوش اور اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ ان کا گروغالباً ''بسوا'' ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا ایک ہے اور وہ تمام صفات عالیہ کا جامع ہے۔ وہی تمام مادے

[1] راہنمایان ہند، ص ۲۰۰۔

اور تمام ارواح کا خالق و مالک ہے۔ وہ اپنے آپ کو معلم عالم کی شکل میں ظاہر کرتا ہے۔ لنگاتیوں میں پیری مریدی اور بیعت کے طریقے مسلمانوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اس فرقے میں رسمیں نہیں ہیں۔ ذات پات کا کوئی امتیاز نہیں۔ ایک چنڈال بھی اس میں شامل ہو جائے تو برہمن کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ بچپن کی شادی ممنوع ہے طلاق کی اجازت ہے۔ بیواؤں کا احترام کیا جاتا ہے اور انھیں نکاح ثانی کا حق حاصل ہے۔ لنگایت اپنے مردوں کو جلاتے نہیں بلکہ دفن کرتے ہیں۔ شرادھ اور دوسری موت کی رسمیں مفقود ہیں۔ تناسخ کا عقیدہ ان کے نزدیک غلط ہے۔ یہ لوگ پرہیزگار اور مجاہد مزاج ہیں۔ کنتری اور تلنگی علاقے میں خصوصاً بلگام، بیجاپور اور دھاوار کے اضلاع میں آبادی کا پینتیس فیصد ہیں۔ میسور اور کولھاپور میں آباد ہیں۔ یہ اپنے آپ کو ویرشیوا (یعنی شیوا کے بہادر) کہتے ہیں۔[1]

بساؤ کے اقوال میں سے بعض ڈاکٹر تاراچند نے نقل کیے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔ وہ ساری کائنات پر حاوی ہے۔ توبہ اور پشیمانی کے سوا اور کوئی نذر نیاز یا قربانی گناہوں کا کفارہ نہیں ہو سکتی۔ گھوڑے وغیرہ کی قربانی کا کچھ فائدہ نہیں۔ ذات پات کے امتیازات بالکل بے معنی ہیں۔ عمل کرو اور جزاء کی توقع نہ رکھو۔ سب روحیں خدا کی ذات میں جذب ہونے والی ہیں۔[2]

راما نند

یہ مصلح ۱۲۹۹ء میں پریاگ (Prayag) الہ آباد کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوا، اور پریاگ اور بنارس میں ہی تعلیم حاصل کی۔ راما نند رامانج کے مذاہب کا پیرو تھا۔ ان کا فلسفہ سیکھا اور ہندو زبان میں اس کی عام اشاعت کی۔ اس نے اپنے پیروؤں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا یعنی زاہد اور دنیادار۔ زاہدوں کے گروہ کی تربیت رامانج کے طریقہ تربیت پر کی۔ شنکر کی جماعت کے دس مٹھ تھے۔ اس نے اپنے گروہ کے لیے مٹھوں کی تعداد سات رکھی۔ ہر پیروکار کے لیے کسی نہ کسی مٹھ سے تعلق رکھنا ضروری تھا۔ مٹھوں کے لیے کچھ اراضی وقف ہوتی تھی۔ جس کا انتظام مہنت کرتے۔ راما نند ذات پات کا سخت مخالف تھا۔ اس کے مریدوں میں تمام ذاتوں کے افراد شامل تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ شنکر کے مٹھوں کے زاہد شیو کی پرستش مثل خدا کے کرتے تھے جبکہ راما نند کے مٹھوں میں رام کو وشنو کا اوتار مان کر پوجا ہوتی تھی۔

راما نند کے شاگرد

راما نند کے بارہ شاگرد تھے جو اعلیٰ قوم برہمن سے لے کر ادنیٰ قوم چنڈال میں سے منتخب کیے گئے تھے۔ اپنے مرشد کی وفات کے بعد انھوں نے ان کے نظریات کی اشاعت کی۔

بارہ شاگردوں میں ناواجی، سورداس، تلسی داس، جے دیو اور کبیر مشہور ہیں۔

---

[1] ہندو ثقافت پر اسلام کا اثر ڈاکٹر تاراچند ص ۱۱۹، ماخوذ از ہندوستان میں مسلم ثقافت مصنفہ عبدالمجید سالک طبع دوم ص ۴۹۹۔ [2] ایضاً ص ۵۰۰۔

ناوا جی

ناوا جی نے ایک ادنیٰ خاندان میں جنم لیا۔ ان کی والدہ قحط کے زمانہ میں ان کو ایک جھاڑی میں چھوڑ آئیں اور دو ویشنو زاہد ان کو اٹھا کر اپنے مٹھ میں لے آئے۔ جب موصوف نے ہوش سنبھالا تو وہ رامانند کے مرید ہو گئے۔ مشہور کتاب بھگت مال اپنے مرشد کی فرمائش پر لکھی۔

سورداس

سورداس کی سوانح حیات سے لوگ بہت کم واقف ہیں۔ وہ اندھے تھے اور اس وقت کے مشہور شاعر تھے۔ ان کا مدفن بنارس کے قریب موضع شب پور میں ہے۔

تلسی داس

تلسی داس چتر کوٹ کی پہاڑی کے قریب جج پور کے ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پہلے وہ راجہ بنارس کے دیوان رہے مگر بعد میں زاہدانہ زندگی اختیار کر کے بندرابن چلے گئے۔ بے شمار مقامات کی زیارت کر کے بنارس چلے آئے اور یہاں رامائن کی مشہور کتاب لکھی۔

جے دیو

جے دیو مغربی بنگال کے موضع کیندا بل میں پیدا ہوئے۔ اپنے وقت کے مشہور شاعر تھے۔ ان کا کلام وجد و سماع کی مجالس اور معابدوں میں گایا جاتا ہے۔

کبیر

ڈاکٹر تاراچند کی تحقیق کے مطابق کبیر غالباً ۱۴۲۵ء میں پیدا ہوا۔ مشہور ہے کہ وہ ایک برہمن بیوہ کے بطن سے پیدا ہوا۔ وہ اس بچہ کو کسی جنگل میں ڈال آئی۔ اس وقت نوری جولاہا اور اس کی بیوی انیما کا اس طرف سے گزر ہوا تو میاں بیوی نے اس بچے کو اٹھا لیا اور اسے متبنیٰ بنا لیا۔ جب ہوش سنبھالا تو اس کے سوتیلے باپ نے شادی کر دی لیکن ازدواجی زندگی سے خاص لگاؤ نہ تھا۔ اس نے روحانی استفاضہ کے لیے کسی پیر یا گرو کی تلاش شروع کی۔ وہ بہت سے مسلمان مشائخ اور سادھوؤں سے ملا لیکن کسی جگہ اس کی تسلی نہ ہوئی۔ آخر کسی نے اس کو رامانند برہمن کا پتہ دیا جو نہایت روشن دماغ پیر کہن سال تھا۔ چنانچہ کبیر رامانند کا چیلا بن گیا۔[1] رامانند کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کے بعد سیر و سفر میں مصروف ہو گیا اور لوگوں کو گیان کا سبق دیتا تھا۔ وہ ہندو دھرم کے ورن آشرم اور چھ درشن (شاستر) اور دوسرے مسلمات کا منکر تھا۔ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ حقیقی عبادت کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نجات نہیں۔

کبیر کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے، خدا ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ بت پرستی گمراہی اور ضلالت ہے۔ ذات پات انسانیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ آپس میں محبت اور بھائی چارہ سے رہنا چاہیے۔

چَیتنیہ (Chaitanya)

۱۴۸۵ء میں بنگال کے مقام ''نودیپ'' میں پیدا ہوا۔ پچیس سال کی عمر میں سنیاسی بن کر تمام ملک

[1] دبستان مذاہب محسن فانی (ترجمہ) ۱۸۶۔

میں دورہ کر کے محبت اور امن کا پرچار کیا۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ خدا ہر آتما میں موجود ہے اس لیے ہر فرد قابل تکریم و تحریم ہے۔ ذات پات کی تمیز کا شدید مخالف اور مساوات بین الناس کا حامی تھا۔ غرباء، مساکین، مفلوک الحال اور مصیبت زدہ لوگوں سے محبت کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔ خدا کے نزدیک برہمن اور شودر میں کوئی تمیز نہیں۔ صرف خدا کی عبادت اور محبت ہی حقیقی نجات کا ذریعہ ہے۔

بنگال میں چے تنیہ کا بے حد احترام ہے اور اس کو سری کرشن کا اوتار مانتے ہیں۔ ۱۵۳۳ء میں وفات پائی۔

سادھو

مہاراشٹر میں ایک مرہٹہ سادھو نام دیو کسی نیچ ذات خاندان میں پیدا ہوا اس نے توحید کا پرچار کیا اور بت پرستی کے خلاف آواز بلند کی اور ذات پات کی شدید مخالفت کی۔

نانک (Nanak)

لاہور کے پاس تحصیل شرقپور کے ایک گاؤں تلونڈی میں ۱۴۶۹ء میں مہتہ کالو چند کھتری کے گھر نانک پیدا ہوا۔ اس کے والدین نے پہلے ایک پنڈت سے ہندی پڑھوائی۔ پھر ایک معلم ملا قطب الدین سے فارسی پڑھی لیکن نانک نے ابتدائی اسباق کے سوا کچھ زیادہ نہ پڑھا۔ پڑھائی کی طرف بالکل توجہ نہ دی۔ ہر وقت سوچ بچار کے سمندر میں مستغرق رہتا۔ اس کے والدین جس کام میں لگاتے اس کو اچھی طرح سرانجام نہ دے سکتا۔ جب نانک کی بہن نواب دولت خان لودھی کے دیوان جے رام سے بیاہی گئی تو اس نے اپنی ذاتی کوشش سے نانک کو نواب کے خیرات خانے میں ملازم کرا دیا۔ نانک یہاں ۱۴۹۹ء تک رہا۔

جب نانک کی عمر تیس سال ہوئی تو اس نے ملازمت چھوڑ دی اور تلونڈی کے ایک مسلمان مردانہ اور بھائی بالا کو ساتھ لے کر تیرتھوں اور خانقاہوں اور مقدس مقامات کی زیارت کی۔ سادھو سنتوں اور صوفیوں کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ پھر اپنے نظریات اور مسلک کی تبلیغ شروع کر دی۔

پنجاب کے مشہور صوفیائے کرام شیخ اسماعیل بخاری، سید علی ہجویری، بابا فرید، علاء الحق، جلال الدین بخاری، مخدوم جہانیاں اور دوسرے بزرگوں کے چشم معرفت سے اپنی روحانی پیاس بجھائی۔ اس وجہ سے نانک صاحب کے مسلمان ہونے کا عقیدہ آپ کے زمانہ زندگی ہی سے مسلمانوں میں چلا آ رہا ہے۔[1] نانک درویش کے نام سے مشہور تھا۔[2] نانک حاجی درویش بن کر مکے میں حج کے لیے گئے۔[3]

گیانی گیان سنگھ نے لکھا ہے کہ مکہ شریف میں بابا نانک صاحب کا مکان مسجد کی شکل پر بنا ہوا تھا جو ولی ہند کے نام سے مشہور تھا۔[4]

---

[1] جنم ساکھی بالا ص ۱۳۲، جنم ساکھی منی سنگھ ص ۱۰۰، ۱۱۰، تواریخ گورو خالصہ ص ۲۴، ۲۴، ۲۴ مصنفہ پروفیسر سندر سنگھ۔

[2] جنم ساکھی بالا ص ۱۳۹ اجنم ساکھی سری گورو سنگھ سبھا ص ۲۴۸۔

[3] جنم ساکھی بھائی بالا ص ۱۳۱۔ [4] تواریخ گورو خالصہ ص ۴۲۲۔

بابا صاحب کی وفات پر مسلمانوں نے یہ جھگڑا کیا تھا کہ وہ اس کی لاش کو جلانے نہیں دیں گے۔ اس کی وجہ یہ بتائی کہ آپ مسلمان اور حاجی ہیں۔[1] سردار خزاں سنگھ نے بھی مسلمانوں کے اس اصرار کی وجہ یہی بتائی ہے کہ وہ نانک کو پکا مسلمان سمجھتے تھے۔[2]

گورداور ٹریبونل کے ججوں نے مقدمہ نانک کے فیصلہ میں لکھا ہے۔ "کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ گورو نانک صاحب نے اپنے خاص اصول اسلام سے لیے ہیں۔ یہ بات پکی ہے کہ بابا صاحب نے اپنے آپ کو اسلام کا مخالف ظاہر نہیں کیا اور اس نے ایک مسلمان فقیر کی شکل میں مکے کی یاترا کی۔"[3]

گیان گیانی سنگھ کا بیان ہے کہ مسٹر کینگم نے اسلامی تاریخوں کے حوالہ جات سے تحریر کیا ہے کہ نانک صاحب کے ہمسایہ میں سید میر حسن صاحب نے جو اپنے علاقہ میں صلح کل اور بے لاگ پیر مانے ہوئے تھے دینی اور دنیاوی علم بابا نانک صاحب کو پڑھایا اور بڑے بڑے راہِ حق کے بھید بتائے۔[4]

خواجہ عبدالشکور صاحب کے مزار پر چلہ کیا۔[5]

تعلیمات بابا نانک

توحید

بابا نانک صاحب خالص توحید کے قائل تھے۔ فرماتے ہیں یار برہم پرمیشر دھیایئے: گورو پورے تے ایہ مت پایئے (گورو گرنتھ صاحب راگ گوڑی محلہ ۵ ص ۱۸۴) یعنی خالص توحید کا سبق پورے گورو سے ہی مل سکتا ہے بغیر اس کے نہیں۔

رسالت کا اقرار

بابا نانک فرماتے ہیں۔ "محمد من توں من کتاباں چار۔ من خدائے رسول نوں سچا ای دربار" (جنم ساکھی ولایت والی ص ۲۴۷) یعنی ہر ایک انسان کے لیے خدا کی توحید کے رسالت کا ماننا ضروری ہے۔

ارکان اسلام

سری گورو گرنتھ صاحب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بابا صاحب نے اذان دی۔ نماز پڑھی۔ لوگوں کو زکوٰۃ اور روزے رکھنے کی تلقین کی۔ حج کیا۔

---

1. تواریخ گورو خالصہ ۶۳ مصنفہ پروفیسر سندر سنگھ۔
2. ہسٹری اینڈ فلاسفی آف دی سکھ ریلیجن ص ۱۰۶۔
3. اداس سنگھ بنس ص ۲۲۔
4. حاشیہ تواریخ گورو خالصہ ص ۸۶۔
5. تواریخ گورو خالصہ ص ۲۲۴۔

قرآن مجید

قرآن مجید کے متعلق فرماتے ہیں۔ ''کل پروان کتیب قرآن'' یعنی کل یگ میں خدا تعالیٰ نے دنیا کی ہدایت کے لیے قرآن شریف کو منظور فرمایا ہے۔ ایک شخص کے سوال پر بابا صاحب فرماتے ہیں۔ ''قرآن کتیب کمایئے'' یعنی قرآن شریف پر عمل کرو۔ ''کر چانن صاحب ایویں ملے۔'' اس سے جو روشنی پیدا ہوگی اس میں خدا ملے گا۔[1]

بابا صاحب قرآن مجید کے متعلق فرماتے ہیں۔

توریت انجیل زبور تریہہ پڑھ سن ڈھٹے وید
رہیا فرقان کتیھڑے کل یگ میں پروان[2]

یعنی میں نے توریت، انجیل، زبور اور وید پڑھ اور سن کر دیکھ لیے ہیں، قرآن کتاب ہی دنیا کی ہدایت کے لیے خدا تعالیٰ نے منظور فرمائی ہے۔

پنج وقت نماز گزار ہے۔ پڑھے قرآن کتب قرآنا۔[3] یعنی پانچ وقت نماز میں قرآن شریف کی تلاوت کی جاتی ہے۔

بابا نانک صاحب کا وہ قرآن مجید جس کو آپ سفر میں اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے گو وہ ہر سہائے ضلع فیروز پور کے گوردوارہ میں آج تک موجود اور محفوظ ہے۔

قیامت کے متعلق عقیدہ

بابا نانک صاحب کا قیامت کے متعلق بھی وہی عقیدہ ہے جو مسلمانوں کا ہے یعنی ایک دن آسمان، زمین، سورج، چاند، ستارے سب فنا کے پردہ میں چلے جائیں گے صرف اللہ تعالیٰ کی ذات باقی رہ جائے گی۔[4]

بابا نانک صاحب بہشت اور دوزخ کے قائل تھے، آپ فرماتے ہیں۔

عملاں والے تہت دن ہو سن بے پروا
سُٹی چھٹے نانکا حضرت جناں پناہ[5]

یعنی قیامت کے دن وہ لوگ جن کے اعمال اچھے اور نیک ہوں گے بے فکر ہوں گے نانک کہتا ہے وہی لوگ نجات پائیں گے جن کی پشت پناہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں گے۔

1۔ جنم ساکھی سنگھ سبھا ص ۱۲۹، جنم ساکھی بالا ص ۲۱۲۔
2۔ جنم ساکھی بالا ص ۱۲۷۔
3۔ گورو گرنتھ صاحب سری راگ محلہ ا ص ۲۱۲۔
4۔ سری راگ محلہ ا گرنتھ صاحب و جنم ساکھی بالا ص ۱۳۹، ص ۲۵۲، ص ۳۳ و جنم ساکھی سنگھ سبھا ص ۲۵۰۔
5۔ جنم ساکھی سنگھ سبھا ص ۲۵۰۔

بابا صاحب کا چولہ

ڈیرہ بابا نانک میں آپ کی اولاد کے پاس بطور یادگار چولہ چلا آ رہا ہے۔ اس چولہ پر قرآن مجید کی آیات لکھی ہوئی ہیں۔

بابا صاحب اوہام پسندی، ضعیف الاعتقادی، رسوم پرستی، ذات پات کی تمیز کے شدید مخالف تھے۔ بابا نانک کے بعد سکھ گردوں کا سلسلہ چلا، جو بابا نانک کے بتائے اصول اور تعلیم سے ہٹے ہوئے ہیں۔ اگر سکھ قوم بابا نانک کی تعلیم پر گامزن ہوتی تو وہ کبھی بھی مسلمانوں سے الگ نہ ہوتی اور سیاسی زندگی کی باگ دوڑ ہندوؤں کے ہاتھ میں نہ دیتی۔ اگر سکھ قوم غور وتدبر سے کام لے تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ بابا نانک اسلام کے کتنے قریب تھے اور ہندومت سے کتنے دور تھے۔ اور ان کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان کی سیاسی زندگی مسلمانوں کے ساتھ وابستگی کرنے میں ہے۔

بعد کے ہند مصلحین

رام نند کے بارہ چیلوں میں سے کبیر کے علاوہ چار نے اپنے کچھ بھجن چھوڑے ہیں۔ یعنی دھنا، پیپا سائیں اور رائے داس۔ پہلے تین چیلوں کے بھجن سکھوں کی آدی گرنتھ میں محفوظ ہیں اور رائے داس کی تعلیمات الگ جمع کی گئی ہے۔

دھنا (Dhanna)

ذات کا جاٹ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۴۱۵ء میں پیدا ہوا۔ راجپوتانہ کا رہنے والا تھا۔ جہاں سے وہ رام نند کا مرید بننے کے لیے بنارس گیا۔ دھنا پہلے بت پرست تھا۔ پھر رام نند کی صحبت سے اس کے اندر انقلاب پیدا ہوا ہے۔ اس لیے وہ کہتا ہے۔

"جب گرو نے علم الٰہی میرے سینے میں داخل کیا تو میں نے خدا کا دھیان کیا اور اپنے دل میں تسلیم کیا کہ وہ ایک ہے۔ میں نے خدا کی محبت اور خدمت قبول کی اور آسائش سے ہوں۔ میں شکم سیر اور مطمئن ہوں اور میں نے نجات حاصل کر لی ہے۔"

خدا کی وہ روشنی جس سے کائنات معمور ہے جس کے دل میں ہے وہ خدا کو پہچانتا ہے اور اسے فریب نہیں دیا جا سکتا۔[1]

پیپا (Pipa)

بھگت مالا اور اس کی شرح سے گگراوں گڑھ کے راجہ پیپا کا مفصل حال لکھا ہے۔ اس کتاب میں اس کی زندگی کے عجیب وغریب واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ میکالیف (Macauliffe) نے اپنی کتاب

---

[1] اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر از ڈاکٹر تارا چند مترجم چودھری رحمت علی الہاشمی ص ۲۱۸ اشاعت بار اول ۱۹۶۲ء۔

''سکھوں کے مذاہب'' میں اس کے بھجن کا ترجمہ پیش کیا ہے جو گرنتھ میں ملتا ہے۔ جس سے وہی رجحان مترشح ہوتا ہے جو اس کے دوسرے ہمعصر بزرگوں کا تھا یعنی'' یہ کہ خدا بنیادی روح ہے اور گرو خدا تک پہنچنے کا وسیلہ ہے اور یہ کہ پرستش واقعی ہونا چاہیے۔''[1]

سائیں (Sain)

سائیں ذات کا حجام تھا اور باندھوگڑھ کے راجہ کے دربار میں رہتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ راجہ کا روحانی پیشوا تھا۔ نابھاجی سائیں کے متعلق ایک حکایت بیان کرتا ہے جس سے اس کا خدا پر توکل اور خدا کی مدد کرنے پر آمادگی ظاہر ہوتی ہے۔

رائے داس (Raidasa)

اس کے باپ کا نام رگھو (Ragghu) اور ماں کا خربنیا (Ghurbiniya) تھا۔ بنارس میں پیدا ہوا۔ چمڑے کا کام کرتا تھا۔ اسی طرح سماجی حیثیت سے نیچی ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ مذہبی آدمیوں اور رشیوں کا بہت معتقد تھا۔ جو کچھ پیسے باپ سے ملتے وہ ان پر خرچ کر دیتا تھا۔ اس وجہ سے باپ نے ناراض ہو کر گھر سے نکال دیا۔ رائے داس اپنے بال بچوں کو ساتھ لے کر ایک ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں رہنے لگ پڑا اور جوتے ٹانک کر گزارہ کرتا۔ بزرگوں کی خدمت میں مصروف رہتا۔ لوگ اس کی قانع اور سادہ زندگی دیکھ کر اس کی طرف مائل ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک راجپوت رانی نے اسے اپنا گروہ بنا لیا تھا۔ اس کے بھجنوں میں توحید کی تعلیم پائی جاتی ہے، وہ کہتا ہے۔

''گوبند غیر متحرک غیر متشکل غیر پیدا شدہ بے مثل بے خوف خرام والا محدود نظر اور عقل سے دور ناقابل تقسیم غیر مشروط اور انتہائی مسرت۔[2]

''ہری سب میں ہے اور سب ہری میں ہیں۔''[3]

''اے رام تو ہی اکیلا عاقل ہے تو ابدی طور پر بلا جھس کے ہے۔ تو بادشاہوں کا بادشاہ (سلطان) ہے، میں تیرا شکستہ بندہ ہوں۔ میں بدتہذیب اور بدقسمت ہوں۔ میں بے عقل، احمق اور بدی میں مبتلا ہوں میں گناہگار ہوں۔ غریب ہوں، بے پروا، بزدل اور سیاہ قلب، تو قادر ہے اور مجھے سمندر پار لے جانے کی قدرت رکھتا ہے۔ میں حریص اور چالاک ہوں۔ یہ میرا جسم شکستہ اور پارہ پارہ ہے اور میرے دماغ میں بہت سے اندیشے بھرے ہیں۔[4]

---

1. اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۲۱۹۔
2. اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۲۲۰۔
3. اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۲۲۱۔
4. اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۲۲۱۔

دادو دیال (Dadu Dayal)

دبستان کے بیان کے بموجب دادو مارواڑ کے ایک گاؤں نارائنا میں پیدا ہوا۔ ولسن کے قول کے مطابق وہ احمد آباد میں پیدا ہوا۔ اور اپنی سینتیسویں سال کی عمر میں نارائنا آیا جہاں مرتے دم تک رہا۔

فرکوہار (Farquhar) اور ٹریال (Traill) کے مطابق ایک برہمن خاندان میں ۱۵۴۴ء احمد آباد میں پیدا ہوا۔

اکبر بادشاہ کے زمانہ میں تھا۔ اس کے پیشے کے بارہ میں اختلاف ہے۔ بعض اس کو نداف (کپاس صاف کرنے والا) لکھتے ہیں، بعض دباغ اور بعض موچی۔ لیکن زیادہ صحیح یہ مانا جاتا ہے کہ وہ سرسوت برہمن تھا۔

اس کا پہلا نام مہابلی (Mahabli) تھا اور اپنی پہلی بیوی کے مرنے کے بعد دنیا سے منہ موڑ کر ریاضت کی طرف مائل ہو گیا اور کمال کا چیلا ہو گیا۔

اس کے شاعرانہ مقولے پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہیں جنھیں ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ خدا کے متعلق دادو لکھتا ہے۔

"اے اللہ رام میرا فریب نظر جاتا رہا۔ ہندو اور مسلمان میں مطلق کوئی فرق نہیں ہے۔

"تو ایک ہی غیر مرئی الٰہی ہے، تو ہی رام اور رحیم ہے، تو جمیل آقا (مالک) ہے۔ تیرے نام کیشو اور کریم ہیں۔"[1]

کائنات کی تخلیق کے متعلق کہتا ہے۔

"ایک ہی لفظ سے اس نے سب کو پیدا کیا۔"[2]

ملوک داس (Malukdas)

ملوک داس اکبر کے زمانہ ۱۵۷۴ء میں کارا ضلع الٰہ آباد میں پیدا ہوا۔ شادی کی اور ایک بچی پیدا ہوئی اس نے ایک فرقہ کی بنیاد رکھی۔ جس میں نیچے درجہ کے آدمی شامل ہوتے تھے۔ اپنے نظریہ کے پرچار کے لیے کارا۔ جے پور۔ اصفہا آباد (گجرات) ملتان۔ پٹنہ۔ کٹک۔ کولا پور۔ نیپال اور کابل میں جا بجا خانقاہیں بنائیں۔ ایک سو آٹھ برس کی عمر پائی۔ ۱۶۸۲ء میں فوت ہوئے۔ اس نے ظواہر مذہب کو رد کیا اور باطنی پاکیزگی پر زور دیا۔

اس کی تعلیم یہ ہے۔

"سچا مذہب ایک دلی عقیدہ ہے۔ مایا انسان کی دشمن ہے اور اس سے حفاظت کا راستہ صرف خدا کا نام ہے۔ یہ کہ دنیا فانی ہے اور دنیاوی رشتے کام کے نہیں ہیں۔ یہ کہ آدمی مٹی سے پیدا ہوا ہے اور مٹی میں مل جائے گا۔ یہ کہ جو لوگ روحانی زندگی سے منسلک نہیں وہ دنیا کے لیے کتے ہیں۔ یہ کہ نجات خود کو جاننے، غرور

1۔ ایضاً ص ۲۲۶۔ 2۔ ایضاً ص ۲۲۷۔

اور خودی کو مارنے، جذبات پر قابو رکھنے، گرو پر اعتماد کرنے اور خدا سے محبت کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہی اس کے نزدیک سچے درویش کی تعریف ہے۔"[1]

"جو شخص پانچ عنصروں سے الگ رہتا ہے۔ وہ خدا کا محبوب ہے۔ جو پیاسے کو پانی پلاتا ہے اس کی خدمت کو محمد بڑی سمجھتے ہیں۔ جو شخص بھوکے کو کھانا کھلاتا ہے وہ جلد مالک کو پالیتا ہے۔ جو شخص جذبات کو ترک کر دیتا ہے اور زندگی میں مر جاتا ہے اس کے سامنے عزرائیل سر جھکاتا ہے جو شخص دوسروں کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھتا ہے۔ ملوک داس اسے سچا درویش سمجھتا ہے۔"[2]

بیر بھان (Birbhan) اور ست نامی فرقہ

دادو کا ایک ہم عصر بیر بھان تھا۔ جس نے سادھوؤں یا ست نامیوں کے فرقہ کی بنیاد رکھی۔ بڑا موحد تھا، خدا کو ست نام (حقیقت) سے پکارتا تھا۔

وہ جنوب مشرقی پنجاب میں نارنول کے پاس موضع بجیر میں ۱۵۴۳ء میں پیدا ہوا۔ ست نامی فرقے کے مراکز دہلی، رہتک، آگرہ، فرخ آباد، مرزاپور (یوپی) اور راجپوتانہ میں جے پور ہیں۔

اس فرقہ کی تعلیمات ہندی بھاشا میں ہیں۔ ان کے مجموعے کا نام پوتھی ہے ان کے بارہ احکام ہیں جو آدی اُپدیش (پہلے احکام) میں ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ صرف ایک خدا کو مانو۔ جس نے تمھیں بنایا ہے اور بگاڑ بھی سکتا ہے جس سے بڑا کوئی اور نہیں ہے اور صرف وہی پرستش کا مستحق ہے نہ کہ زمین یا دھات یا پتھر یا لکڑی یا اور کوئی مخلوق۔ مالک صرف ایک ہے اور اس کا ایک کلام ہے جو شخص بھی جھوٹ پر دھیان دیتا ہے، جھوٹ پر عمل کرتا ہے اور گناہ کرتا ہے وہ دوزخ میں گر پڑتا ہے۔

۲۔ حلیم اور منکسر رہو۔ دنیا سے اپنی لو نہ لگاؤ۔ اپنے عقیدہ پر وفاداری سے قائم رہو۔ ان لوگوں سے میل جول نہ رکھو۔ جو اس عقیدے کے نہ ہوں۔ اجنبی کی روٹی نہ کھاؤ۔

۳۔ کبھی جھوٹ نہ بولو نہ کسی وقت کسی سے کسی چیز کی، زمین یا پانی یا درختوں یا جانوروں کی برائی کرو زبان کو ہمیشہ خدا کی ثناء وصفت میں مصروف رکھو۔ چوری نہ کرو، نہ روپیہ کی، نہ زمین کی، نہ جانور کی اور نہ چراگاہ کی۔ اپنی ملکیت کو دوسرے کی ملکیت سے الگ رکھو اور جو کچھ تمھارے پاس ہے اس پر قانع رہو، بدی کبھی نہ سوچو۔ کسی غیر مناسب چیز پر نظر نہ ڈالو خواہ مرد یا عورت، ناچ یا تماشا۔

۴۔ برائی کی گفتگو کو نہ سنو۔ نہ کوئی اور بات۔ سوائے خالق کی ثناء کے نہ کہانیاں نہ گپ نہ بہتان، نہ موسیقی نہ گانا۔ بجز بھجن کے اور اس میں بھی موسیقی کا ساز دماغ کے اندر ہونا چاہیے۔

۵۔ کبھی کسی چیز کی حرص نہ کرو، خواہ جسم کی یا دولت کی۔ دوسرے کا مال نہ لو۔ خدا تمام چیزوں کا دینے والا ہے اور جتنا تم اس پر بھروسہ کرو گے اتنا تمھیں ملے گا۔

۶۔ جب تم سے پوچھا جائے کہ تم کون ہو، تو اپنے کو سادھ بتاؤ۔ ذات کا نام نہ لو۔ بحث میں نہ الجھو۔

[1] اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۲۳۰۔ [2] اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۲۳۰۔

اپنے عقیدے پر مضبوطی سے قائم رہو اور آدمیوں سے آس نہ لگاؤ۔

۷۔ سفید کپڑے پہنو کوئی رنگ یا منجن یا مہندی استعمال نہ کرو۔ نہ اپنے جسم پر کوئی نشان بناؤ۔ نہ پیشانی پر ذات کا امتیاز لگاؤ۔ نہ مالا یا تسبیح یا جواہرات پہنو۔

۸۔ نشیلی اشیاء کبھی نہ کھاؤ پیو، نہ پان کھاؤ، نہ خوشبو سونگھو، نہ تمبا کو پیو، نہ افیون چوسو یا سونگھو۔ مورتیوں یا انسانوں کے لیے آگے نہ اپنا ہاتھ پھیلاؤ نہ سر جھکاؤ۔

۹۔ کسی کی جان نہ لو، نہ کسی پر دست درازی کرو، نہ ملامت آمیز گواہی دو، نہ زبردستی کسی کی چیز لو۔

۱۰۔ ایک مرد صرف ایک بیوی کرے اور عورت صرف ایک شوہر۔ مرد عورت کے آگے کا بچا نہ کھائے مگر عورت مرد کے آگے کا بچا کھا سکتی ہے۔ جیسا کہ دستور ہو، عورت مرد کی تابع رہے۔

۱۱۔ فقیر کا لباس نہ پہنو، نہ بھیک مانگو، نہ تحفہ قبول کرو، جادو کا خوف بالکل نہ کرو، نہ خود جادو کرو، راز بتانے سے پہلے سمجھ لو۔

سادھوؤں کے جلسے ہی یاترا کے مقامات ہیں لیکن سلام کرنے سے پہلے پہچان لو کہ سادھ کون ہے۔

۱۲۔ سادھ کو دنوں، چاند کی گردشوں یا مہینوں، چڑیوں یا جانوروں کے بولنے یا نظر آنے کے توہمات میں نہ پڑنا چاہیے۔ اسے صرف مالک کی رضا تلاش کرنا چاہیے۔[1]

لال داس اور بابا لال (Laldas and Baba lal)

سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں لال داس اور بابا لال پیدا ہوئے تھے۔ لال داسی فرقے کا بانی تھا۔ میو قوم سے تعلق رکھتا تھا۔

بابا لال جو کھشتری تھا۔ جہانگیر کے عہد میں تولد ہوا۔ وہ خود اپنے مذہب کے بارہ لکھتا ہے۔

''عاشق کا عقیدہ دوسرے عقیدوں سے مختلف ہے۔ خدا ان لوگوں کا ایمان اور عقیدہ ہے جو اس کے عاشق ہیں۔ باقی نیک کام کرنا ہر مذہب میں بہتر ہے۔''[2]

اٹھارویں صدی عیسوی میں جو ہندو مصلحیں اور بزرگ ہو گزرے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ جگ جیون، بولا صاحب، کیشو داس، غریب داس، شیونرائن اور رام چرن۔

جگ جیون (Jagjivan)

یوپی کے ضلع بارہ بنکی میں موضع سردہا (Sardaha) میں ۱۶۸۲ء میں پیدا ہوا۔ اس کی تعلیمات اس کی تین کتابوں جناں پرکاش، مہاپرے اور پراتھم گرنتھ میں درج ہیں۔ اس نے توحید کی تعلیم دی۔ وہ خدا کو

---

[1] اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۲۳۵، ۲۳۶۔

[2] اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۲۳۷۔

تمام صفات سے ماوراء تصور کرتا تھا۔ اس نے خود سپردگی اور دنیا سے بے رغبتی پر زور دیا۔ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ انسان کی سعی بلیغ کا منتہائے مقصد گرو کی معرفت اللہ کی ذات میں جذب ہو جانا ہے۔ سچائی، نرمی، بے ضرری اس کا اخلاقی دستور تھا۔

بولا صاحب (Bulla)

بولا صاحب کا اصلی نام بلاقی داس تھا۔ ضلع غازی پور (یو۔ پی) میں پیدا ہوا۔ وہ ایک متقی اور پرہیز گار شخص تھا۔ اس کی تعلیمات کی ایک مثال یہ ہے۔

''جو شخص محبوب کے پیچھے دیوانہ ہے اور نرگن کے گھر (خانہ) میں جام نوش کرتا ہے۔ نرگن مکان ہے اور ترکیونی منزل مقصود اور پرستاروں کی جماعت کا ذریعہ۔ انسان کو ہر لمحہ نرگن کے مکان میں جانا چاہیے اور دن کے آٹھ حصوں میں سرشار رہنا چاہیے۔

اے بولا! نرگن کی شکل کا لوگوں سے ذکر کر۔ اور تو نے آسمانوں کا راز پالیا۔

خدا پر ہمہ وقت سہارے کو وہ اس طرح ظاہر کرتا ہے۔

''اے مالک! میری حاضری لے اور میرا نام دفتر میں درج کر لے۔ میں ایک غریب بے سہارا سپاہی ہوں۔ مجھے روز کچھ نہ کچھ عطا فرما۔''[1]

کیشو داس (Kesavadas)

کیشو داس ذات کا بنیا تھا۔ دہلی کے ایک مسلمان بزرگ یاری (Yari) صاحب (۱۶۶۸ء۔۱۷۲۳ء) کے حلقہ عقیدت میں شامل ہو گیا۔ تنبیہات اس طرح ہیں۔

''وہ دولت، نشان، شان و شوکت، خودی اور غرور رکھتا ہے۔ وہ دنیا سے کسی ذی روح پر ترس نہیں کھاتا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی تمام شان و شوکت عارضی ہے اور یہ کہ موت اپنا جال لیے پھرتی ہے کہ ایک لمحہ میں فنا کر دے۔

یہ تمام خیمہ گاہ، ہاتھی، گھوڑے اور ساز و سامان فریب نظر ہیں۔ رخصت ہوتے وقت بجز ہری کے نام کے اور کوئی چیز کام نہ آئے گی۔ میں بار بار تمھیں تنبیہ کرتا ہوں کہ دنیا (مایا) کی محبت چھوڑ دو۔

اے کیشو! تو خواہشات کے فریب سے کیوں الجھن میں پڑتا ہے۔''[2]

چرن داس (Charandas)

چرن داس ۱۷۰۳ء میں میوات (راجپوتانہ) میں پیدا ہوا۔ اس نے ۱۷۳۰ء کے قریب دہلی میں اپنے فرقہ کی بنیاد ڈالی۔ وہ اپنے حلقہ ارادت میں مرد اور عورت دونوں کو شامل کر لیتا تھا۔

چرن داس بت پرستی کی مذمت کرتے ہوئے کہتا ہے۔

---

[1] اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۲۴۴۔ [2] ایضاً ۲۴۵۔

"شوہر پر اپنی نظر رکھو۔ کسی اور سے تمھیں کیا مطلب؟
تمام دیوتاؤں کو ترک کرو اور صرف ہری کا نام جپو۔"[1]

غریب داس (Gharibdas)

غریب داس ضلع رہتک میں پنجاب کے موضع چھوانی (Chhudani) میں ۱۷۱۷ء سے ۱۷۷۸ء تک رہا۔ وہ ذات کا جاٹ تھا اور زندگی میں گرہست تھا۔ اس کے اشعار فارسی الفاظ اور صوفی تلمیحات سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔

اے صاحب میری دعا کی صدا اپنے عرش پر سن لے۔
تو میرا پدر اور میری مادر ہے اور تو کریم ہے باپ کو اپنے لڑکے کی عزت کرنا واجب ہے۔
اے خالق! میں ہاتھ جوڑ کر تجھ سے التجا کرتا ہوں۔
میرا جسم اور دماغ اور دولت تیری نذر میں مجھے اپنا دیدار نصیب کر۔[2]

شیونرائن (Shivanarayani)

شیونارائنی فرقہ اٹھارھویں صدی ۱۷۳۴ء میں ظاہر ہوا۔ اس کا بانی سوامی نارائن سنگھ تھا۔ اس فرقہ کے لوگ ہستی مطلق کی عبادت کرتے اور اپنی گرنتھ کا احترام کرتے۔ اس فرقہ میں بلا امتیاز تمام لوگ شامل ہو سکتے ہیں۔ جب اس فرقے کا کوئی آدمی مرتا تو اس کی وصیت کے مطابق یا تو اسے دفن کر دیا جاتا یا اس کی لاش دریا میں بہا دی جاتی۔

رام چرن (Ramcharn)

رام سنیہی (Ram sanihi) فرقہ کا بانی رام چرن ۱۷۱۸ء میں موضع سراسینا ضلع جے پور میں پیدا ہوا۔ پہلے بت پرست تھا۔ بعد میں بت پرستی کا شدید مخالف ہو گیا۔ اس وجہ سے برہمنوں کے مظالم کا نشانہ بنا رہا تھا۔ اور انھوں نے اس کو بہت تنگ کیا اور اس فرقہ کا مقام شاہپور میں ہے۔ اس فرقہ میں صرف سادھو ہی شامل ہو سکتے ہیں۔ یہ بتوں کی پرستش نہیں کرتے۔ ان کی مذہبی عبادتیں تقریباً مسلمانوں سے مشابہ ہیں۔ ان کے مندروں میں ہر روز پانچ عبادتیں ہوتی ہیں۔ اس فرقہ میں ہر ذات کا آدمی شامل ہو سکتا ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر اور انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں حسب ذیل مصلح اور ہندو بزرگ ہو گزرے ہیں جن پر اسلامی توحید کا اثر تھا۔

سبحا نند، دوین داس، گلال، بھیکا اور پلٹو داس۔

---

1. ایضاً ص ۲۴۵۔
2. اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۲۴۷۔

سہجا نند (Sahajanand)

سوامی نارائنی فرقہ کا بانی اجودھیا کے قریب ۱۷۸۰ء میں پیدا ہوا۔ اس نے توحید کی تعلیم دی۔ اس نے جان مارنے یا جانور کا گوشت کھانے، مسکرات کا استعمال کرنے کی ممانعت کی، چوری، ڈکیتی، بہتان باندھنے اور تمام اخلاقی برائیوں سے منع کیا۔ اس نے ذات پات کی تمیز کے خلاف جہاد کیا۔ محدود جنسی تعلقات پر زور دیا۔

دولن داس (Dulandas)

جگ جیون داس کا چیلا تھا۔ اس نے ست نامی فرقے کو دوبارہ منظم کیا۔ ضلع رائے بریلی کا رہنے والا تھا۔ وہ اپنی منظومات میں منصور، شمس تبریز، نظام الدین اور حافظ کا ذکر کرتا ہے۔

ایک نظم اس طرح کی ہے۔

''اب دل کی اداسی جاتی رہی اور معشوق کا جلوہ نظر آیا۔

بزرگوں کی صحبت میں رہ کر میں نے اپنا سر سچے ہادی کے سامنے جھکا دیا۔

ہر وقت اس کی صورت میرے تصور میں ہے اور اس کی شکل میرے دل میں چمکتی ہے۔ بوعلی قلندر اور فرید، تبریز سب نے اسی عقیدہ کا گن گایا۔

خلوص اور تحمل کے ساتھ اس نے مجھے اللہ کو دکھایا، جو لامکان اور حدود نظر سے دور ہے۔

اے لوگو! دیکھو دولن نے جس کا گرو جگ جیون ہے معشوق اپنے دل کے اندر جگہ دی اور بے نظیر شوہر اور غیبی حضور میرے دل کے اندر آ گیا۔''[1]

گلال (Gulal)

ضلع غازی پور کے موضع بشاری کا تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخری چوتھائی حصہ میں پیدا ہوا۔ ذات کا چھتری تھا۔ بولا صاحب کا مرید تھا اور ایک خدا کا پجاری تھا۔

پلٹو داس (Paltoodas)

ضلع فیض آباد کے موضع ناگپور جلال پور کا باشندہ تھا۔ کندو بنیا (Kandu Bania) قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ وجودی نظریہ رکھتا تھا۔ اس نے ذاتوں کے امتیاز کے خلاف آواز اٹھائی اور بھگتی کی بنیاد ڈالی۔ پلٹو کہتا ہے۔

''میں نے ناسوت، ملکوت اور جبروت کو جان لیا۔

اور میں نے لاہوت کی لذت چکھ لی۔

---

[1] اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۲۴۹۔

کیا پرستار وہ ہے، جس کا دل روشن ہو۔
اور جو اپنا مکان لامکان بنائے۔
آسمان کا راز کھل گیا۔
اور روح دل کے اندر سے پکارتی ہے حق حق۔
پلٹو کہتا ہے کہ وہ ہر لحظہ اور ہر سمت مکہ دیکھتا ہے۔''[1]

ہندوؤں اور مسلمانوں کے متعلق کہتا ہے۔
''وہ کہتے ہیں کہ رام مشرق میں ہے اور خدا مغرب میں۔
تو پھر جنوب اور شمال میں کون رہتا ہے۔
مالک کہاں ہے اور کہاں نہیں ہے۔
ہندو اور مسلمان کیوں طوفان اٹھاتے ہیں۔
ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں۔
اور دونوں مذہب ایک دوسرے کے خلاف محاذ بناتے ہیں۔
پلٹو بندہ کہتا ہے کہ مالک سب میں ہے۔
وہ ہرگز بٹا ہوا نہیں ہے یہ حقیقت ہے۔''[2]

مہاتما گاندھی

موہن داس کرم چند گاندھی ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ وہ تشدد کے مخالف تھے۔ ہندوستان کو آزادی دلانا ان کی زندگی کا اہم مقصد تھا۔ آخر میں وہ اپنے مقدس مقصد کے حصول میں کامیاب ہوئے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد پر بہت زور دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دور میں مسلمان اور ہندو سامراجیت کو شکست دینے کے لیے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے نظر آتے ہیں۔

ذات پات کے متعلق نظریہ

مہاتما جی بھی اپنے مذہبی عقائد میں اسلام سے متاثر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے آشرم واقعہ احمد آباد میں اچھوتوں کو داخلے کی عام اجازت دے رکھی تھی۔ ذات پات کی تمیز کے شدید مخالف تھے۔ نوا کھالی میں گاندھی جی نے کہا۔ ''اگر ہندو دھرم نے زندہ رہنا تھا تو وہ ذات پات کے بغیر ہوتا۔''

چر کرشنا پور میں کہا۔ ہندو دھرم فنا ہو جائے گا اگر چھوا چھوت فنا نہ ہوئی، جیسے کہ انگریز قوم اپنا نام مٹا دے گی اگر برطانیہ کی حکومت فنا نہ ہوئی حالانکہ وہ ان کی آنکھوں کے سامنے فنا ہو رہی ہے۔'' (گاندھی ۲۴ فروری ۱۹۴۷ء)

---

[1] ایضا ص ۲۵۲۔ [2] ایضا ص ۲۵۲۔

توحید کے متعلق نظریہ

ایک مرتبہ ''ینگ انڈیا'' میں لکھا کہ ''خدا کا کوئی شریک نہیں اور اس کے سوا کچھ موجود نہیں اور یہی حقیقت تم اسلام کے ''کلمہ'' میں دیکھتے ہو، جس پر زور دیا گیا ہے۔''

جدید ہندومت اور اس کی مذہبی تحریکیں

ہندومت کی جامع اور مانع تعریف کرنا محال ہے۔ اس کے عقیدے اور اصول مبہم اور غیر واضح ہیں۔ یہ اَن گنت فرقوں میں بٹا ہوا ہے جن میں کسی قدر مشترک کی تلاش امر محال ہے۔ اس مذہب کے ماننے والوں میں وہ حضرات بھی ہیں جو روح اور مادے کی تفریق کے منکر ہیں۔ خدا کی وحدت کا اقرار بھی اسی جوش وخروش سے کرتے ہیں جس خلوص سے اصنام پرستی کرتے ہیں۔ وحدت الوجودی بھی ہیں اور دہریے بھی، وشنو کے پجاری بھی ہیں اور سیوا جی کے پجاری بھی۔

القصہ ہندو دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، دانشور اور خواص جو اپنشدوں اور بھگوت گیتا ہی کو سرچشمۂ الہام مانتے ہیں اور دوسرے صحیفوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے، یہ توحید کے علمبردار ہیں۔ عوام جو اصنام پرستی اور رسوم کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ دانشور اور خواص بھی توحید پرستی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود عوام کے ساتھ اَن گنت دیویوں اور دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ اور انھیں اسی ذات واحد کے مختلف مظاہر شمار کرتے ہیں۔ عوام اور خاص دونوں تناسخ اور نفرت انگیز ذات پات پر یکساں اعتقاد رکھتے ہیں اور ان کے بغیر اپنے مذہب کو نامکمل سمجھتے ہیں۔

برہمو سماج

اسی فرقہ کا بانی رام موہن رائے ۱۷۷۴ء میں بمقام بردوان ایک معزز برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ چھوٹی عمر میں عربی اور فارسی پڑھ لی۔ سنسکرت بنارس میں پڑھی۔ پندرہ برس کی عمر میں انھوں نے بت پرستی کے خلاف بنگالی زبان میں پمفلٹ شائع کرنے شروع کر دیے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ بت پرستی کی تصدیق ویدوں میں نہیں ہوتی۔ توحید کے پرچار کی وجہ سے رام موہن رائے کو اپنے والد اور گھر سے الگ ہونا پڑا۔ اس کے بعد انھوں نے انگریزی، فرانسیسی، لاطینی، یونانی، عبرانی زبانیں پڑھیں۔ تمام مذاہب کی مقدس کتب کا خود مطالعہ کیا۔ ان کا ذریعہ معاش سرکاری ملازمت تھی۔ ۳۹ سال کی عمر میں اس ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور کلکتہ میں سکونت اختیار کر لی۔ اور اپنے مذہبی خیالات کی اشاعت شروع کر دی۔ انھوں نے مذہبی کتب کا سنسکرت سے انگریزی اور بنگالی میں ترجمہ کیا۔

۱۸۳۱ء میں دہلی کے مغل شہنشاہ نے اپنے مالی حقوق کی وکالت کے لیے انگلستان بھیجا۔ ۱۸۳۳ء تک وہیں مقیم رہے۔ ۱۸۳۳ء میں وہ برسٹل چلے گئے اور اسی سال وہاں ماہ ستمبر میں بخار کے مرض میں انتقال

کر گئے۔ان کی قبر نوز ویل قبرستان میں موجود ہے۔[1]

پہلی بار فارسی میں ایک کتاب توحید پر لکھی اور اس کا دیباچہ عربی زبان میں لکھا۔

۱۸۲۰ء میں انھوں نے اپنی کتاب ''یسوع کے احکام'' بنگالی زبان میں شائع کی جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا انکار کیا تو سیرامپور کے مشنریوں نے تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے اور بحث و مباحث کا سلسلہ جاری ہو گیا۔۱۸۲۸ء میں انھوں نے برہمو سماج کی بنیاد ڈالی۔[2]

نظریات

ان کے خیالات ۱۸۳۰ء کے امانت نامے میں مندرجہ ذیل الفاظ میں قلمبند ہیں۔''پرستش اسی ذات کی ہونی چاہیے جو غیر فانی ہے، جس کا پتا تلاش سے نہیں ملتا، جو تغیر سے محفوظ ہے اور جو تمام کائنات کو پیدا کرتی اور قائم رکھتی ہے۔[3]

رام موہن رائے ذات پات کی تمیز کے سخت مخالف تھے۔ستی کی رسم کا خاتمہ انہی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔کثرت ازدواج اور بچوں کی شادی کی مخالفت کی۔ان انقلابی نظریات کی وجہ سے رائے رام موہن رائے جدید ہندوستان کا باپ کہلاتا ہے۔

سری راما کرشن (۱۸۳۴ء۔۱۸۸۶ء)

راما کرشن سوچ و بچار کے بعد اس بات کا قائل ہو گیا کہ تمام مذاہب کی پشت پر ایک واحد سچائی کارفرما ہے جسے خدا کہا جاتا اس نے وحدت ادیان کا تصور اور اتحاد بین الناس کا پیغام دیا۔اس کی وفات کے بعد اس کے شاگرد فریندر ناتھ وت (۱۸۳۶.....۱۹۰۲ء) نے اس کے پیغام کا مبلغ رہا۔۱۸۹۳ء میں بمقام شکاگو ''مذاہب کی پارلیمنٹ'' میں ہندومت کی ترجمانی کی۔

مہارشی دیوندر ناتھ ٹیگور

بارہ سال تک برہمو سماج کسمپرسی کی حالت میں رہی۔رام موہن رائے نے جو روح پیدا کی تھی۔وہ مرتی جارہی تھی۔حتیٰ کہ ۱۸۴۲ء میں مہارشی دیوندر ناتھ ٹیگور (رابندر ناتھ ٹیگور کے والد) نے اس جماعت کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی۔امانت نامے کی رو سے مادی معاملات بااثر اور معاملہ فہم امینوں کے سپرد کر دیے گئے اور روحانی معاملات خادم دین کے سپرد تھے۔جن کے متعلق امانت نامے میں یہ درج تھا کہ ''وہ نیک نام ہو۔اور اس کی علمیت پاکیزگی اور اخلاق حمیدہ مسلمہ ہوں۔''[4]

---

[1] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ مصنف علامہ عبداللہ یوسف علی ص ۱۹۲۔

[2] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ مصنف علامہ عبداللہ یوسف علی ص ۱۹۴۔

[3] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ص ۱۹۴۔

[4] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ص ۱۹۴۔

دیوندر ناتھ کی پرورش اور تربیت کسی فرقہ وارانہ ماحول میں نہیں ہوئی تھی، اس وجہ سے ان میں تنگ نظری نہیں تھی۔ ۱۸۳۹ء میں تتوابودھنی سبھا (انجمن تبلیغ حق) کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی۔ اس کی دوسری سالگرہ کے موقع پر دیوندر ناتھ نے کہا: ''انگریزی تعلیم کی اشاعت کے باعث اب ہم جاہلوں کے مانند لکڑی اور پتھر کو خدا سمجھ کر ان کی پرستش نہیں کر سکتے۔''[1]

۱۸۴۲ء میں برہمو سماج میں شامل ہو کر ہندو ازم کی تجدید کرنے لگے۔ انھوں نے اس تحریک کی خدمت کے لیے ایک مطبع اور رسالہ جاری کر دیا۔

عقائد

دیوندر ناتھ ٹیگور ویدوں کو ہر قسم کی غلطیوں سے پاک نہیں سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے طریقہ کے متعلق فرماتے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ تمام انسان جن میں ادنیٰ طبقے کے لوگ بھی شامل ہیں برہم (ایشور) کی پرستش کریں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ جو لوگ گاتیری کی مدد سے پرستش کر سکتے ہیں وہ اسی طرح کرتے رہیں۔ لیکن جو یہ نہیں کر سکتے ان کو اس امر کی آزادی ہو کہ وہ کوئی آسان طریقہ اختیار کر لیں جس کے مطابق وہ ''خدا کے دھیان میں مگن ہو سکیں۔''[2]

کیشب چندر سین (۱۸۳۸ء۔۱۸۸۴ء)

کیشب چندر سین ۱۸۵۷ء میں سماج میں شامل ہوئے۔ دیوندر ناتھ نے کیشب کو کلکتہ سماج کا ''خادم دین'' مقرر کیا۔ دونوں نوجوان برہمو سماج کی ترقی اور نوجوانوں کی تربیت میں کوشاں رہے۔

نظریات

۱۔ ذات پات کی کوئی تمیز نہیں۔

۲۔ بچپن کی شادی کے دستور کا شدید مخالف تھا۔

۳۔ بیواؤں کی دوبارہ شادی کو رواج دینا چاہتا تھا۔

۴۔ مختلف فرقوں میں باہمی شادیاں کرنے کا زبردست حامی تھا۔ ۱۸۶۳ء میں کیشب نے ایک موقع پر مختلف فُرقوں کے درمیان ایک شادی کی رسم ادا کی۔

۵۔ خدا کی وحدانیت کا قائل تھا۔

برہمو سماج میں اختلاف

کیشب اور دیوندر ناتھ دونوں ہی برہمو سماج کی تقویت کا باعث تھے۔ لیکن دونوں کے مزاج میں اختلاف تھا۔ آخر یہ اختلاف برہمو سماج میں تفرقہ کا باعث بنا۔ فروری ۱۸۶۵ء میں کیشب نے دیوندر ناتھ

۱۔ ایضاً۔ ص ۱۹۵۔ ۲۔ ایضاً۔ ص ۱۹۵۔

کے نظام سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے نظریات کی اشاعت میں شب و روز کام کرنے لگا۔

کیشب کے اصول

۱۸۶۴ء کے ایک جلسہ میں سماج کے جلسے میں کیشب نے حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا۔

"ہماری مقدس جگہ تمام دنیا ہے۔ ہماری مذہبی کتاب صحیفہ فطرت کی دانش و حکمت ہے۔ ہماری نجات کا ذریعہ عبادت ہے۔ ہمارا حصول مدعا دلوں کی پاکیزگی ہے۔ ہمارا استاد اور رہنما ہر دیندار آدمی ہے۔"[1]

یہ بہت ہی وسیع خیالات ہیں اور برہمو سماج کے اس مقولے میں صدائے بازگشت پیدا کرتے رہے۔ "یہ وسیع عالم ایشور کا پوتر مندر ہے۔ صاف اور پاکیزہ دل مقدس ترین عبادت گاہ ہے۔ سچائی ہمیشہ رہنے والا مذہبی صحیفہ ہے۔ ایمان کل مذہب کی جڑ ہے۔ محبت سچا روحانی تمدن ہے۔ نفس کشی حقیقی زہد و تقویٰ ہے۔"[2]

کیشب کی تبلیغی سرگرمیاں

کیشب نے برہمو سماج سے علیحدگی کے بعد ایک نئی جماعت قائم کی۔ اندرونِ ہند اور بیرونی علاقوں میں مبلغ بھیجے۔ پرتاپ چندر موز مدار (۱۸۴۰ء تا ۱۹۰۵ء) بہت مشہور اور ممتاز مشنری ہو گزرے ہیں۔ ۱۸۷۰ء میں تمام ہند کا دورہ کیا۔ اس کے بعد دو مرتبہ انگلستان اور امریکہ گئے ۱۸۹۳ء میں شکاگو میں مذہب کی پارلیمنٹ کا اجلاس منعقد ہوا اس میں شرکت کی۔ ۱۸۷۰ء میں کیشب نے خود بھی انگلستان کا دورہ کیا۔ انگلستان سے واپس آ کر ایک انجمن قائم کی جس کے کام کے پانچ حصے تھے۔ یعنی "طبقہ نسواں کی فلاح و بہبود، ارزاں قیمت پر علمی کتابوں کی اشاعت، نشے کی چیزوں کو بند کرنے کی کوشش اور خیرات کی تنظیم۔"[3] ۱۸۷۲ء میں کیشب نے سول میرج ایکٹ پاس کرایا، جس کی رو سے مذہبی رسوم کے بغیر عیسائی اور برہمو سماج کی شادی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔[4]

کیشب کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ ان کو وحی آتی ہے اور وہ اپنے مذہب کے نبی ہیں۔[5]

بنگال کے باہر برہمو اصول کی تحریک

بمبئی کی پرارتھنا سماج (قائم شدہ ۱۸۶۸ء) کے مشہور لیڈروں میں مسٹر رام جی راناڈے (۱۸۴۲ء تا ۱۹۰۱ء) اور مسٹر ان جی چند اور کرکی (۱۸۵۵ء تا ۱۹۲۳ء) تھے۔ یہ دونوں اصلاح معاشرت کی تحریک کے حامی تھے۔

مسٹر ان جی چند اور کرکی دو تحریکیں قابل ذکر ہیں۔ ایک اچھوت ذاتوں کی امداد (۱۹۰۶ء) اور دوسری معاشرتی خدمت کرنے والی انجمن۔

---

[1] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ مصنفہ علامہ عبداللہ یوسف علی ص ۲۶۴۔

[2] ایضاً ص ۲۶۴۔ [3] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ص ۲۶۴۔

[4] ایضاً ص ۲۶۴۔ [5] ایضاً ص ۲۶۵۔

برہمو سماج کے بنیادی عقائد

۱۔ اصلی اور ابدی ایک خدائے برتر ہے۔ اس کی شان میں جو کچھ کہیے تھوڑا ہے وہ از بسکہ نیک اور رحیم ہے۔

۲۔ وہ مبارک خدا سراسر روح ہے اس معقول باعث سے اس کی کوئی شکل اور شبیہ نہیں۔

۳۔ صرف اس کی پرستش اور اطاعت سے اس دنیا اور آنے والے جہاں کی خوش وقتی حاصل ہوتی ہے۔

۴۔ بندگی اور ستائش اس کی پرستش ہے اور نیکی اور بھلائی کرنا اس کی عبادت اور اطاعت ہے۔

۵۔ انسان کی روح جب تک گناہوں سے پاک نہ ہو اور عنایات ایزدی شامل نہ ہوں قالب بہ قالب پھرتی رہتی یعنی اداگوں کیا کرتی ہے۔

۶۔ اصل مذہب معرفت ہے جو لوگ کہ زیرک اور عقل مند اور تجربہ کار ہیں اس وسیلہ سے نجات پاتے ہیں۔[1]

برہموسماج کے بعض خیالات اور معتقدات مسلمانوں کے جدید فرقہ نیچریہ سے کچھ ملتے جلتے ہیں۔

برہموسماج اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے ضرور قائل ہیں لیکن الہام، قبولیت دعا اور خوارق کے منکر ہیں اس طرح یہ لوگ سلسلہ رسالت کو بھی نہیں مانتے اس تحریک کی بنیاد محض عقلی دلائل پر ہے۔

جہاں تک اخلاقی اصولوں اور طریقہ عبادت کا تعلق ہے راجہ رام موہن رائے نے عیسائی مذہب کے اصولوں کو اختیار کیا تھا۔ اسی لیے برہموسماج کو "مذہب عیسائی بے عیسیٰ" کہتے ہیں۔

بھگتی اور گیتا کی تحریکیں

عقلی دلائل سے روحانی پیاس بجھائی نہیں جا سکتی تھی۔ اس وجہ سے اس کے خلاف ردِ عمل ہونا ضروری تھا، سو وہ بنگال میں کئی صورتوں میں ظاہر ہوا۔ پنڈت جوجے کرشنا گوسامی نے بھگتی فلسفے کا خوب پرچار کیا اور بھگتی یوگ ان کی زندگی کا طریقہ تھا۔ اس کے علاوہ ایشور چندر و دیاساگر، اشوینی کمار دت (Ashwi-nikumar Datta) اور مانورنجن گوہا ٹھاکرتا (Manorangan Guha-Thokurta) بھی بھگتی اصولوں کے پُر جوش مبلغ تھے۔ یہ لوگ گیتا کو ہی چشمۂ ہدایت سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور بھی انہی خیالات کے موید تھے۔

آریا سماج

اس تحریک کا بانی سوامی دیانند سرسوتی (۱۸۲۴ء تا ۱۸۸۳ء) ریاست موروی کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ یہ ریاست مغربی ہند میں جزیرہ نما کاٹھیاواڑ میں واقع ہے۔

ان کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے ایک دفعہ وہ اپنے والد اور دوسرے لوگوں کے ساتھ شیو جی کی پرستش کر رہے تھے۔ سویرے پہر سب لوگ سو گئے لیکن وہ جاگ رہے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک چوہا

[1] منقول از رسالہ "برہم مذہب" (مطبوعہ تھوڈسٹ پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ ۱۸۹۸ء)

شیومورتی کے سر پر بیٹھا ہوا چاول کھا رہا ہے۔ سوچا کہ اگر یہ مورتی اس چوہے کو بھی بھگانے کی طاقت نہیں رکھتی تو اس کی پوجا سے کیا حاصل۔ اس نظارہ کو دیکھ کر انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ آئندہ مورتی کی پوجا نہیں کیا کریں گے۔ اس کے بعد انھوں نے مذاہب کی کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ان کے والدین نے بہت سمجھایا بجھایا۔ لیکن دیانند جی والدین کے راستہ پر نہ آئے۔ آخر کار اس غرض سے ان کی شادی بھی طے کر دی۔ اور جب شادی کی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو سوامی جی گھر سے غائب ہو کر بنارس چلے گئے اور پندرہ سال تک (۱۸۴۵ء سے ۱۸۶۰ء) وہاں مطالعہ اور یوگ میں مصروف رہے اس کے بعد تمام ہندوستان میں اصلاحی اور تبلیغی دورے کیے۔

۱۸۷۵ء میں بمبئی میں جب وہ ۵۱ء سال کے تھے آریہ سماج کی بنیاد رکھی اس کا منشاء بت پرستی اور شرک کو دور کر کے ویدک مذہب کو زندہ کرنا تھا۔

دو سال کے بعد لاہور میں اس کی ایک شاخ کا افتتاح کیا اپنی بقیہ زندگی اپنے نظریات کی تعلیم دینے، کتابیں لکھنے اور سماج کی نئی شاخوں کی نگہداشت میں صرف کی۔

آریا سماج کے اصول

دیانند سرسوتی نے آریا سماج کے یہ اصول بیان کیے۔

۱۔ تمام علم اور معلوم کی اولین مستور علت خدائے مطلق ہے۔

۲۔ خدا کی ہستی موجود ذہین اور کامل مسرت ہے وہ بے ہیست، قادر مطلق، منصف رحیم، لاولد، غیر محدود غیر متغیر بے ابتداء، یکتا سب کو قائم رکھنے والا مالک کل حاضر مطلق خلقی نا قابل تغیر، لافانی بے خود ابدی اور خالق کل ہے۔

۳۔ وید حقیقی علم کے صحائف ہیں۔ انھیں پڑھنا سیکھنا، ان کا ورد اور دوسروں سے سننا سب آریوں کا فرض ہے۔

۴۔ حقیقت کو قبول اور غیر حقیقی کو مسترد کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

۵۔ آریا سماجی کا بنیادی مقصد ساری دنیا کی بھلائی ہے یعنی اس کی مادی، سماجی اور روحانی بہتری میں مدد کرنا۔

۶۔ سب انسانوں کے ساتھ برتاؤ محبت اور انصاف کے تحت، دھرم کے اصول کے مطابقت میں ہونا چاہیے۔

۷۔ ودیا (موضوع و معروض کا علم) کو فروغ دینا اودیا (سراب) کی بیخ کنی کرنی چاہیے۔

۸۔ صرف اپنے فائدے اور بہتری کے لیے نہیں بلکہ سب کے فائدے اور بہتری کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔

۹۔ معاشرے کی بے غرضانہ حکمرانی پر عمل کر کے خود کو پابند سمجھنا چاہیے جبکہ انفرادی فلاح کے اصولوں کی پیروی میں آزاد ہونا چاہیے۔

کتب

ہر مذہب کے عالموں سے مناظرے کیے اور ۱۹ کتابیں لکھیں[1] جن میں رگوید آدی بھاشیہ بھومکا اور ستیارتھ پرکاش بہت مشہور ہیں۔ ان میں سے پہلی کتاب چار ویدوں کی تفسیر کا دیباچہ ہے۔ ستیارتھ پرکاش کے چودھویں باب میں اسلام پر نہایت ہی ناروا حملے کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں سکھوں، جینیوں اور عیسائیوں کے واجب الاحترام ہستیوں کا تمسخر اڑایا گیا ہے یہ کتاب انگریزی میں شائع ہو چکی ہے۔

سوامی دیانند کی تعلیم

سوامی جی نے ہندوؤں کے کل شاستروں کو سوائے چار وید کے مسترد کر دیا اور ویدوں کی مروجہ شرحوں پر شدید نکتہ چینی کی۔ اور ان کے بے شمار مطالب کے ماننے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے برہمنوں کے اس خیال کی دھجیاں اڑا دیں کہ وید صرف برہمن پڑھ سن سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا ویدوں کے علم کا دروازہ ہر آدمی کے لیے کھلا ہے اور ذات پات کی تمیز پر خاص ضرب لگائی۔ انھوں نے بت پرستی اور متعدد دیوتاؤں کی پوجا، ویدانت کے مسئلہ وحدت وجود اور اوتار کے مسائل کو ناقابل قبول قرار دیا۔[2] اور اگنی، وایو، جل، سورج، چاند وغیرہ کی طرح طرح سے تاویلیں کیں۔ اگرچہ آریہ سماج ایک خدا کے پرستار ہونے کے مدعی ہیں لیکن دراصل ان کی توحید ناقص ہے کیونکہ آریہ سماجی روح اور مادہ کو قدیم مانتے ہیں جیسا کہ ستیارتھ پرکاش اور رگوید آدی بھاشیہ بھومکا میں لکھا ہے۔ "پرمیشور (خدا) جیو (روح) اور پراکرتی (مادہ)" انادی (قدیم) ہیں۔ پرمیشور نے اپنے گیان سے جیو اور پراکرتی پر قابو پا کر دنیا قائم کی۔

سماج میں داخل ہونے کی شرائط

سماج کا ممبر بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر ممبر سماج کو اپنی آمدنی کا ایک فیصد دے اور دس اصولوں کو قبول کرے۔ پہلے تین اصول تو خدا اور ویدوں کی صفات کے متعلق ہیں۔ چھ اصولوں کا تعلق اخلاقی چال چلن سے ہے اور دسواں اصول کو ذاتی معاملات میں آزادی دیتا ہے لیکن کسی ممبر کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ سماج کے مفاد میں حارج ہو۔

آریہ سماج کے تین غلط نظریات اور ان کا رد

آریہ سماج کے تین معرکۃ الآراء نظریات ہیں، جن کے رد میں مسلمان علماء نے بہت کچھ لکھا ہے، پہلا نظریہ یہ ہے کہ مادہ اور روح اللہ کی طرح ازلی ابدی ہیں اور غیر مخلوق ہیں۔ دوسرا نظریہ تناسخ ہے، تیسرا نظریہ نیوگ کا ہے۔ ان تینوں نظریات اور عقائد کے رد میں بحث گزر چکی ہے۔

---

1. ملاحظہ ہو "دیانند سدھانت بھاسکر" مولفہ کشن چند راولپنڈی ۱۹۴۰ء۔
2. انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ص ۲۶۷۔

ہندومت اور اسلام کا موازنہ

قرآن مجید نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہر قوم کی طرف نبی آئے اور ان پر ان کی زبان میں اس قوم کی ہدایت کے لیے وحی کی۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ اِنْ مِنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ. (۳۵:۲۴) یعنی ہر امت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈرانے والے مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ وَلِکُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلٌ. (۱۰:۴۷) یعنی ہر امت کی طرف رسول آتے رہے ہیں۔

آریا صرف آریا قوم میں الہام وحی اور ہدایت الٰہی کے قائل ہیں۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ (النساء آیت ۱) اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ. (الحجرات ۴۹:۱۱) وہ لوگ جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں وہ بھائی بھائی ہیں۔

وید نے برہمن، چھتری، ویش، شودر، راکشس، ملیچھ، ویلو، اُسر کی تقسیم کر کے تفریق بین الناس کی بنیاد رکھی ہے جو معاشرتی زندگی کا نہایت ہی بھیانک پہلو ہے۔

اسلام نے کسی قوم سے بحیثیت قوم نفرت نہیں سکھائی۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّکَ لِلنَّاسِ (لقمان آیت ۱۸) تو لوگوں سے نفرت کر کے اپنا رخ مت پھیر۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ (الحجرات ۴۹:۱۱)

اے ایمان والو! ایک قوم دوسری قوم کو حقیر جان کو ہدفِ تضحیک نہ بنائے، کیا عجب ہے کہ وہ ان سے بہتر ہو۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔

الخلق عیال اللّٰہ فاحب الخلق الی اللّٰہ من احسن الی عیالہ. (بیہقی کتاب الایمان)

ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو اللہ کی مخلوق کو سب سے زیادہ چاہتا ہے۔

وید نے ویلوؤں کو ڈاکو کا خطاب دے کر ان سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔ اسلام نے کسی زبان سے نفرت نہیں سکھائی جیسا کہ وید نے "آریہ واچہ اور دھر راچہ" کہہ کر غیر آریوں کی زبان سے نفرت

سکھائی ہے۔

اسلام خدائے واحد، خالق کون و مکان، پروردگار عالم پر ایمان رکھتا ہے۔ ہندومت اَن گنت دیوتاؤں اور دیویوں پر ایمان کو لازمی قرار دیتا ہے۔

اسلام نادیدنی خدا کی پرستش اور عبادت بغیر دیدنی وسائل کے سکھاتا ہے تاکہ انسان کردار کی اعلیٰ منازل تک پہنچے اور خدا پرستی کی زندگی اختیار کر کے رشد و ہدایت حاصل کرے ہندومت واضح طور پر بت پرستی کی تعلیم دیتا ہے۔

اسلام ایک اخلاقی، اقتصادی، معاشرتی اور روحانی ضابطہ پیش کرتا ہے۔ ہندومت رسوم پرستی کے علاوہ کسی اور منزل کی نشان دہی نہیں کرتا۔

اسلام ایک آفاقی اور عالمگیر مذہب ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (یوسف ۱۰۴:۱۲) یہ کتاب تمام جہانوں کے لیے نصیحت ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا ۲۸:۳۴) اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے تجھے تمام لوگوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

ہندومت ہندوستانی قوم کی حد تک محدود ہے اور دوسری قوموں کو اپنے حلقہ ارادت میں شمولیت کا حق نہیں دیتا۔

اسلام کا ہندومت سے ایک شدید اختلاف ایک اخلاقی مسئلہ نیوگ میں بھی ہے۔ مسئلہ نیوگ پر مفصل بحث گزر چکی ہے۔

تصویر کا دوسرا رُخ

آریا جب ہندوستان میں وارد ہوئے تو وہ اس وقت بے مثال خدا کی عبادت کرتے تھے۔ پنڈت سندر لال الہ آبادی نے ''گیتا اور قرآن'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے ویدوں کے خدا کو وحدہ لاشریک قرار دیا ہے۔ وہ گیتا کا ایک شلوک نقل کرتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے۔

''دیوتاؤں کے اپاسک دیوتاؤں کو پہنچتے ہیں اور ایشور کے اپاسک ایشور کو۔'' (۹:۲۵)

اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

''اس لیے گیتا کی بار بار اور صاف شبدوں میں تعلیم یہ ہے کہ اور سب دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف ایک ہی ایشور کی پوجا کرنی چاہیے۔ (۹:۲۸-۲۷)

اس طرح بھگوت گیتا کی اخلاقی تعلیم بھی قرآن کریم کی اخلاقی تعلیم سے کسی حد تک ملتی جلتی ہے۔

جب آریا قوم ہندوستان میں داخل ہوئی تو یہاں اس کو دراوڑ قوم سے واسطہ پڑا۔ یہ قوم بت پرست تھی۔ ۱۹۱۲ء اور ۱۹۳۴ء کے درمیان موہنجو ڈارو اور ہڑپا کی کھدائی سے جو چیزیں دستیاب ہوئی ہیں ان

سے معلوم ہوتا ہے کہ دراوڑی قوم نادیدہ خدا اور غیر مرئی وجود کی پرستش نہیں کرتے۔ وہ درختوں اور جانوروں وغیرہ کی پوجا کرتے تھے۔

اسی طرح کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں میں ''تریمورتی'' کا تصور ہے یعنی برہما، شیو اور، وشنو ان میں سے شیو اور وشنو دراوڑین دیوتا تھے اور ان کے مجسموں کی پوجا کرتے ہیں۔

دراوڑ قوم کے ساتھ اختلاط کی وجہ سے آریوں نے بھی آہستہ آہستہ شیو اور وشنو کے مجسموں کی پوجا شروع کر دی۔ آج تمام ہندوستان میں ان دونوں دیوتاؤں کی پرستش زوروں پر ہے۔

برہما جو آریوں کا دیوتا تھا جس کو وہ خالق اور معبود کے معنوں میں بولا کرتے تھے ابھی تک شیو اور وشنو کی طرح اس کی پوجا نہیں ہوتی۔ شاید پورے ہندوستان میں برہما کا ایک ہی مندر ہے۔ یہ بھی اس امر کا بین ثبوت ہے کہ آریوں کے ہاں دیوتاؤں کا تصور ضرور تھا مگر ان کے مجسموں کی پوجا نہیں کرتے تھے۔ جب آریا قوم کا اختلاط اور ملاپ دراوڑ قوم کے ساتھ ہوا تو ان میں اجسام پرستی آ گئی۔

جین مت

جین، جینا سے ماخوذ ہے۔ جی کا مطلب تسخیر کرنا ہے۔ جینا کا لفظی مطلب ایسا شخص جس نے تمام جذبات پر غلبہ پایا اور نجات حاصل کر لی۔ جینوں کو تیرتھنکر بھی کہا جاتا ہے۔ تیرتھ کا مطلب ہے دریا میں کھڑے ہونے کی جگہ۔

جینیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کا مذہب بہت پرانا ہے۔اس میں چوبیس تیرتھنکر یعنی راہنما ہو گزرے ہیں جو سب چھتری گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جین روایت کے مطابق رامشو پہلا مہاویر وردھمان چوبیسواں تیرتھنکر تھا۔

ان مصلحین نے مختلف اوقات میں دین حق کی تبلیغ کی۔ تاریخ میں ان راہنماؤں کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ جین روایات کے مطابق ان کی عمریں ناقابل یقین حد تک طویل تھیں اور وہ انتہائی دراز قد تھے۔ ان میں سے اول ترین مصلح آدی ناتھ کی عمر کئی کروڑ سال تھی اور قد دو میل اونچا۔ سب سے آخری مصلح کا نام پرسوناتھ تھا۔ مہاویر کی پیدائش پرسوناتھ سے اڑھائی سو سال بعد ہوئی۔

پرسوناتھ کا زمانہ ۸ ویں صدی ق م ہے۔ پرسوناتھ کے باپ کو بنارس کا راجہ بتایا جاتا ہے۔ اور ایک عرصہ تک عیش وتنعم اور خوشحالی کی زندگی بسر کی۔ اس کے بعد راہبانہ زندگی اختیار کی۔ چوراسی دن کے مراقبہ کے بعد مکمل علم حاصل کر لیا۔ حصول علم کے بعد ستر سال زندگی کو مکمل ترین بنانے اور طہارت، پاکیزگی اور تقدس حاصل کرنے میں لگے۔ ان منازل سے گزرنے کے بعد سمیتا پہاڑ پر اور پیروؤں کے درمیان نروان حاصل ہوا۔ اس نے اپنے ماننے والوں کو عدم تشدد، صداقت چوری سے اجتناب اور رہبانیت کی تعلیم دی۔

مہاویر (مہابیر)

جین روایت کے مطابق مہاویر چوبیسویں تیرتھنکر ہیں۔ ان کا اصلی نام وردھمان تھا۔ وہ پٹنہ سے ۲۷ میل شمال سے ویشالی میں ایک چھتری گھرانے میں ۵۴۰ ق م کو پیدا ہوئے۔[1] ان کے والد کا نام سدھارتھ تھا۔ جو "کنداپور اور تیرسالہ" کے قبیلے "جیاترکا" کے سردار تھے۔ ان کی والدہ تیرشیلا ایک کھشتری خاتون تھیں جو ویشالی اور مگدھ کے حکمران خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ سفید پوش جینیوں کی روایات کے مطابق اس نے ایک شہزادی "ایشوما" سے شادی کی تھی۔ ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی کچھ عرصہ متاہلانہ زندگی بسر

[1] بعض روایات کے مطابق ولادت ۵۹۹ ق م میں ہوئی۔

ی۔ جب تیس سال کی عمر میں قدم رکھا تو دنیا ترک کر دی اور پرسوناتھ کا مسلک اختیار کیا۔ بارہ سال مکمل برہنگی کی حالت میں راہبانہ زندگی بسر کی۔

تقریباً چھ سال تک وہ ایک بھکشو "گوسالہ" کی معیت میں رہا۔ لیکن گوسالہ نے اسے چھوڑ دیا اور خود "اجویکا" ایک نئے عقیدے کی داغ بیل ڈالی اور اس کی اشاعت شروع کر دی۔ ریاضت کے تیرھویں سال مہاویر نے ایک غیر معروف بستی "جو بھاما گرام" میں (دریائے اجو پالگا کے کنارے آباد تھی) ڈیرہ لگایا اور بیالیس سال کی عمر میں اس کو وہ حقیقی معرفت اور گیان حاصل ہوا۔ جس کو "کیول جنانا" کہا جاتا تھا۔ اب مہاویر ایک نئے مذہب "نرگرنتھیں" کا رہنما بن گیا۔ اس مذہب کو بعد میں جین مت سے تعبیر کیا گیا۔ اور اس کے پیروکاروں کو جینی یعنی جینا (فاتح) کہا گیا۔ جین کے لفظی معنی فاتح کے ہیں۔ یعنی اپنی سفلی خواہشات پر قابو اور فتح پانے والا۔

تیس سال تک اپنے عقیدے کا پرچار کیا۔ اس سلسلہ میں انگا دیہا اور مگدھ کا سفر اختیار کیا۔ مگدھ کے مشہور حکمران بمبیسار اور اس کے لڑکے اجا تا سترد سے کئی بار ملاقات کی جین اور بدھ روایات ان دونوں حکمرانوں کو اپنے پیروؤں میں شامل کرتی ہیں۔

بنیادی عقائد

جین مت کے بنیادی عقائد سات کلیوں کی شکل میں بیان کیے جاتے ہیں۔ جن کو سات حقائق (تتو یا) کہا جاتا ہے۔

۱۔ جیوا: روح ایک حقیقت ہے۔
۲۔ اجیوا:[۲] غیر ذی روح وجود ہے۔
۳۔ اسرو تتو: روح میں مادہ کی ملاوٹ ہو جاتی ہے۔
۴۔ بندھ تتو: روح میں ملاوٹ روح کو مادہ کی قیدی بنا دیتی ہے۔
۵۔ سموا: روح میں مادہ کی ملاوٹ کو روکا جا سکتا ہے۔
۶۔ نیر جرا: روح میں موجود پہلے سے مادہ کو زائل کیا جا سکتا ہے۔
۷۔ موکش: روح کی مادہ سے مکمل علیحدگی کے بعد موکش حاصل ہو سکتا ہے۔

مہاویر نے ۷۲ سال کی عمر میں جنوبی بہار کے ایک مقام "پاوا" ۴۸۶ ق م میں وفات پائی۔[۱]

۱۔ اموئیہ رنجن مہاپتر کے نزدیک وفات ۵۲۷ ق م میں ہوئی۔ (فلسفہ مذاہب ص ۲۰۳)

۲۔ یہ پانچ عناصر پر مشتمل ہے مادہ (پدگل) حرکت (دھرم) سکون (ادھرم) مکان (اکاش) وقت (کال) یہ پانچوں عناصر ازلی ابدی ہیں۔ صرف جیو میں زندگی ہے باقی تمام چیزیں بغیر زندگی کے ہیں۔

نروان (نجات) کے حصول کے طریقے

جس دور میں مہاویر پیدا ہوئے اس وقت سب سے اہم مسئلہ نروان کا حاصل کرنا تھا۔ مہاویر نے نروان کے حصول کے لیے دو طریقے سلبی اور ایجابی بیان کیے ہیں۔

نروان کے حاصل کرنے کا سلبی طریقہ تو یہ ہے کہ انسان اپنے دل سے ہر قسم کی خواہشات اور آرزوئیں نکال دے۔ کیونکہ خواہشات اور تمنائیں ہی مصائب اور رنج کا باعث ہوتی ہیں۔ جب انسان کی خواہش پوری نہیں ہوتی تو وہ غم سے دوچار ہوتا ہے۔ جب خواہش ہی نہ ہوگی تو روح مسرت اور خوشی سے ہمکنار ہوگی اور یہ قلبی مسرت اور راحت ہی نروان ہے۔

مہاویر کے نزدیک نروان کے حصول کا ایجابی طریقہ یہ ہے کہ انسان کے عقائد علم اور عمل صحیح اور درست ہوں۔ انھیں تین رتن کہا جاتا ہے۔

اعمال کی درستگی کی بنیاد پانچ باتوں پر رکھی۔

۱۔ اہمسہ (Ahimsa) یا آزادی یعنی کسی ذی روح کو تکلیف نہ دی جائے جس طرح انسان کا اپنا وجود محترم اور عزیز ہوتا ہے اسی طرح دوسروں کو بھی سمجھنا چاہیے۔

۲۔ ستیام (Satham) یا راستی۔ ہمیشہ راستی کو اپنا شعار بنایا جائے اور دوسروں کے اموال کو ناجائز طریقہ سے حاصل کرنے سے پرہیز کیا جائے۔

۳۔ استیام (Asteyam) یا چوری سے اجتناب۔ حلال روزی کمائی جائے اور دوسروں کے اموال کو ناجائز طریق سے حاصل کرنے سے پرہیز کیا جائے۔

۴۔ برہمچاریام (Brahma charyam) یعنی عفت۔ پاکدامنی کی زندگی بسر کی جائے۔

۵۔ اپری گواہیہ (Apari Graha) یعنی لذت مادی۔ حواس خمسہ یعنی سننے دیکھنے، سونگھنے اور چکھنے پر مکمل طور پر غلبہ اور فتح ہونی چاہیے کیونکہ یہی حواس انسان کو مادی لذات کی وادی میں گمراہی کا باعث بنتے ہیں۔

جینی عدم تشدد کی حدود بہت وسیع ہیں۔ اس کی رو سے صرف ذی روح کو ہی ایذا دینا منع نہیں کیا گیا، بلکہ غیر ذی روح کو بھی نقصان پہنچانے سے روکا گیا ہے۔

جین مت کسی مافوق الفطرت تخلیقی قوت کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک خدا انسان کی روح میں مضمر استعدادوں اور صلاحیتوں کی جلاء تکمیل اور اظہار کا دوسرا نام ہے۔ مہاویر وید کے نظریہ روح کے بھی مخالف ہے۔

نظام اخلاق

جین مت میں دو طبقے

جین مت اپنے پیروکاروں کو دو طبقوں میں تقسیم کرتا ہے۔

۱۔ شرِوک (مرد) اور شرِوکا (عورت) ان کو گرہسی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سماجی زندگی بسر کرتے ہیں۔ دوسرا طبقہ شرامن سنیاسی (بھکشو سادھو) ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مکمل طور پر جین مت کی اخلاقی تعلیم پر عمل کرنا چاہتے ہیں وہ معاشرتی زندگی کو تیاگ دیتے ہیں۔ اور جین مت نے ہر دو طبقے کے لیے نرمی اور سختی کے لحاظ سے اخلاقی اصول مقرر کیے ہیں۔ یہی راہ نجات یا موکشا مارگ ہیں۔

۱۔ سمیک درشن:۔ (صحیح عقیدہ) جینیوں کے نزدیک اس کے بغیر صحیح علم اور صحیح عمل کا تصور ناممکن ہے صحیح عقیدے پر ہی علم اور عمل کی بنیاد ہے۔

۲۔ سمیک گیان (صحیح علم) جین مت کے نزدیک اشیاء کی حقیقی ماہیت جاننے کا نام ہے یہ اس وقت حاصل نہیں ہوسکتا جب تک ہر طرح کا باطل علم زائل نہ ہو جائے۔

۳۔ سمیک چرتر (صحیح عمل) جینیوں کے نزدیک یہ وہ عمل ہے جو براہ راست روح کو مادے کی قید سے آزاد کرانے نجات کے حصول کا ذمہ دار ہے۔

مذکورہ اصولوں کے ساتھ جین مت پانچ عظیم نیکیوں کی تلقین کرتا ہے۔ ۱۔ اہنسا یا عدم تشدد۔ ۲۔ ستیہ یا حق۔ ۳۔ استیہ یا چوری نہ کرنا۔ ۴۔ برہم چاریہ تجرد۔ ۵۔ اپری گراہیہ یا تیاگ۔ گرہست جینیوں کے لیے سات مزید فروعی عہد کرنے پڑتے ہیں۔

۱۔ دِگ ورت:۔ یہ عہد کرنا کہ زندگی بھر کسی سمت میں مخصوص مقامات سے آگے نہیں جائے گا۔

۲۔ دیش ورت:۔ یہ عہد کرنا کہ علاقائی اعتبار سے بھی مخصوص مقامات کے اندر محدود رہنے کا عہد کرنا۔

۳۔ انرتھ ڈنڈ ورت:۔ زندگی بھر بے مقصد برائیوں سے پرہیز کرنا۔ مثلاً فضول تفکرات خواہ مخواہ خطرات میں کود پڑنا۔ ۳۔ دوسروں کو فضولیات پر اکسانا۔

۴۔ ساما نکا:۔ روزانہ کچھ دیر مراقبہ کرنے کا عہد۔

۵۔ پروشادھو پادسا:۔ عمر بھر مہینے کے چار مخصوص دنوں میں روزہ رکھنے کا عہد کرنا۔

۶۔ اُپا بھوگ پری بھوگ، پری مان:۔ کھانے پینے اور استعمال کی اشیاء سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک حد قائم کرنے کا عہد۔

۷۔ اتی تھی سنو بھاگ:۔ سادھوں کو کھانا کھلائے بغیر خود نہ کھانے کا عہد کرنا۔ ان سات فروعی عہدوں

کے علاوہ تمام جین علماء کے نزدیک ایک گرہست کو عمر کے آخری حصے یا کسی جان لیوا بیماری میں فاقے کے ذریعہ خودکشی کا عہد کرنا بھی جین مت میں قابل تعریف موت سمجھی جاتی ہے۔

۱۔ تین قسم کے ضبط نفس:۔
۱۔ ذہین کو برے اور ناپسندیدہ خیالات سے پاک رکھنا۔ ۲۔ گفتگو پر ضبط۔ ۳۔ جسمانی حرکات پر ضبط۔

۲۔ پانچ طرح کی احتیاطیں:۔ چلنے پھرنے بولنے بھیک مانگنے یا کھانا کھانے کی چیزوں کو رکھنے یا اٹھانے یا رفع حاجت کے دوران انتہائی احتیاط۔ ان اعمال کے دوران کسی چھونے سے چھوٹے جاندار کو تکلیف نہ پہنچے۔ یا اس کی جان ضائع نہ ہونے پائے۔

۳۔ دس نیکیاں:۔ حد درجہ کی معافی۔ حد درجہ کی نرمی۔ حد درجہ کا اخلاص۔ حد درجہ کی قناعت۔ حد درجہ کی راست۔ حد درجہ کا ضبط نفس۔ حد درجہ کی ریاضت۔ حد درجہ کا ترک دینا۔ حد درجہ کی بے لوثی۔ حد درجہ کی پاک بازی۔

۴۔ بارہ قسم کے مراقبے کے موضوعات:۔ دنیا کی بے ثباتی۔ انسان کی بے بسی۔ روح کی دنیاوی قید۔ انسان کی تنہائی۔ روح کی مادے اور تمام علائق سے علیحدگی۔ جسم کی کثافت، روح میں مادے کی مداخلت، روح میں مادے کی مداخلت کو روکنا۔ روح میں پہلے سے موجود مادے کا انخلاء۔ کائنات کی وسعت اور کاریگری۔ روحانی علم کی کیابی اور اس کے حصول کی مشکلات اور راہ معفرت کی رغبت۔

۵۔ بائیس قسم کی تکالیف:۔ وہ تکالیف سادھو اور سادھونی کو برداشت کرنی ہوتی ہیں۔ بھوک، پیاس، سردی، گرمی، کپڑوں کے کاٹنے کی تکلیف، ننگے رہنا، ناپسندیدہ جگہ رہنا، جنسی جذبے کے تقاضے، زیادہ چلنا، ایک وضع میں طویل وقفے میں بیٹھنا، زمین پر آرام کرنا، برا بھلا سننا، مار پیٹ سہنا، بھیک مانگنا، بھیک مانگنے پر بھیک نہ ملنا، بیماری، کانٹے گڑنا، جسمانی گندگی اور ناپاکیاں، بے عزتی سہنا، اپنے علم کی قدردانی نہ ہونا، کسی نہ کسی درجہ میں اپنے اندر جہالت کو موجود پانا، جین مت کے معتقدات کے سلسلہ میں شکوک وشبہات کا پیدا ہونا۔

۶۔ پانچ طرح کے اخلاقی معیار:۔ مکمل جمعیت قلبی، سکون قلب کے درہم برہم ہو جانے پر دوبارہ حاصل کرنا۔ مکمل اور غیر مشروط اہنسا جذبات اور خواہشات سے مکمل آزادی اور بے غرض مثالی طرز عمل۔

۷۔ چھ جسمانی ریاضتیں:۔ مختلف اوقات میں روزے رکھنا، بھوک سے کم کھانا، خوراک کے سلسلہ میں اپنے اوپر مختلف طرح کی پابندیاں عائد کرنا۔ مثلاً فلاں شرط پوری ہو جائے جب ہی کھانا کھاؤں گا وغیرہ چھ پسندیدہ اشیاء یعنی گھی، دودھ، دہی، شکر، نمک، تیل میں سے درجہ بدرجہ ایک یا ایک سے زائد کو ترک کرتے رہنا۔

۸۔ چھ باطنی ریاضتیں:۔ اس میں مختلف قسم کے کفارے جین مت کی مقدس ہستیوں کے لیے جذبہ عقیدت اور محبت کی پرورش، جین ولیوں اور بزرگوں کی خدمت، مقدس کتابوں کا مطالعہ، جسم اور اس کے متعلقات سے بے نیازی پیدا کرنا اور مراقبہ میں مکمل یکسوئی حاصل کرنے کی کوشش کرنا شمار کیے جاتے ہیں۔[1]

سادھوں کے لیے پانچ قسمیں:۔ ۱۔ کسی جاندار کو نقصان نہ پہنچانے کی قسم کھانا۔ ۲۔ سچ بولنے کی قسم کھانا۔ ۳۔ کسی بھی ایسی چیز کو لینے سے انکار کر دینا جو انھیں نہ دی گئی ہو۔ ۴۔ جنسی لذتوں سے دست برداری۔ ۵۔ ہر قسم سے دستبرداری کی قسم کھانا یعنی دنیاوی چیزوں سے علیحدگی اس وجہ سے مہاویرا اپنے خاندان اور ملکیتی چیزوں سے دستبردار ہو گیا تھا۔ کسی ایک جگہ بھی قیام نہ کرتے تھے کہ کہیں کوئی نیا تعلق قائم نہ ہو جائے۔

جین مت کی کتب:۔ دونوں فرقوں شویتامبر اور دیگمامبر کا یہ دعویٰ ہے کہ مہاویر کی اصل تعلیم ان کے پاس ہے۔ دیگمامبر اس امر کے بھی مدعی ہیں گو مہاویر کی تعلیم ان کی وفات کے بعد ہی ضائع ہو گئی تھی لیکن وہ ان کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں۔ لہٰذا اصل فرقہ (دیگمامبر) ہے۔ جن رسومات اور معتقدات پر وہ عمل پیرا ہیں وہی اصل مہاویر کی تعلیمات کا ماخذ ہیں۔

اب جینیوں کے پاس دو قسم کے صحائف ہیں۔ انھیں ''پورو اور انگ کہا جاتا ہے پوروں کی تعداد ۱۴ ہے اور یہ ناپید ہیں تاہم اس وقت ۱۱۴ نگ، ۲۲ اُپ انگ، ۱۰ پا کنکا۔ ۶ چھید، ۴ مول سوتر اور دو دیگر سوتر جین ادب کا مرکزی حصہ ہیں۔ جینیوں کے صحائف کو آگم (ہدایت نامے) یا سیدھانت (مقالے) کہا جاتا ہے۔ عام جینیوں کا یہ اعتقاد ہے یہ آگم وہی ہیں جو مہاویرا اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے تھے۔ لیکن جینیوں میں صحائف کی تعداد میں بھی اختلاف ہے۔ شویتامبر فرقہ کے نزدیک ان تعلیمات کا بارہواں حصہ جو چودہ کتابوں پر مشتمل تھا۔ ضائع ہو چکا ہے جب کہ دوسرے فرقے دیگمامبر کے نزدیک اب جین مت کے پاس کی کوئی کتاب نہیں۔ مروجہ کتب ان علماء کی تحریرات ہیں۔ جن میں ایک جینی عالم امادستی کی کتاب تتوارتھ دیگما سوتر کو پہلی کتاب کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کتاب کی یہ خصوصیت ہے۔ اس کو دونوں فرقے قابل احترام سمجھتے ہیں۔

فرقے

چندر گپت موریا کے عہد میں جین مت دو فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک فرقے کا نام ''شویتامبر''[2] تھا جو سفید کپڑے پہنتا تھا۔ دوسرے فرقے کا نام ''ڈگامبر''[3] جو بالکل برہنہ رہتے تھے۔ لیکن اسلامی

[1] ایس۔ گوپلن صفحات ۲۰۵۔ ۲۰۹۔ سادھوں اور گرہستیوں میں نظام اخلاق پر عمل کرنے میں سختی اور نرمی کے لحاظ سے فرق ہے۔ سادھو نظام اخلاق پر سختی سے پابند ہوتے ہیں جبکہ گرہستیوں کے لیے سختی سے عمل پیرا ہونا ضروری نہیں۔ [2] شویت سفید لباس۔ [3] دیگ امبر فلک پوش یعنی فضا کا لباس پہننے والے۔

حکومت کے زمانہ میں انھیں ستر پوشی پر مجبور کیا گیا۔ ان کا تیسرا فرقہ بھی تھا سادھو۔ یہ لوگ جائیداد رکھتے تھے لہٰذا موکش (نجات) سے محروم تھے۔

مہاویر کے بعد جین مت

مہاویر کا تمام فلسفہ تہذیب نفس، ترک خواہشات اور رہبانیت پر مبنی ہے۔ ان چیزوں کے لیے کسی معبد کی ضرورت نہیں۔ اسی وجہ سے شروع میں جین مت میں عبادت کے لیے مندروں وغیرہ کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ بعد میں عبادت خانے تعمیر ہوئے۔ ان میں تیرتھنکروں کی مورتیاں رکھی گئیں۔ تیرتھنکروں کی مورتیاں بہت لمبی بنائی جاتی تھیں۔ عموماً ان کو برہنہ بناتے تھے بعض مورتیاں بیٹھی ہوتی ہیں اور بعض کھڑی۔ شروع میں ان کی پرستش کی جاتی تھی اور نہ ان کو مقدس سمجھا جاتا۔ مرور زمانہ کے ساتھ ان کی پرستش شروع ہوگئی۔ شوتیا مبروں میں ایک فرقہ ''ڈھونڈھیا'' ہے جو بت پرستی نہیں کرتا۔

جین مذہب ہمیشہ ہندوستان تک محدود رہا۔ اس مذہب کا مگدھ میں بڑا زور تھا۔ لیکن جب موریہ خاندان کے عہد میں اس کو وہاں زوال ہوا تو اجین اور متھرا میں اس نے عروج پکڑا۔ دکن میں شنکراچاریہ کے زمانہ میں اس کا تنزل ہوا اب گجرات جینیوں کا مرکز سمجھا جاتا ہے اس صوبہ میں کوہ ابو پر اس کے عالیشان مندر ہیں جن کا شمار ہفت عجائبات ہند میں ہوتا ہے۔

اس مذہب کے ماننے والوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو سرادک یا گرہستھ جو اہلی زندگی بسر کرتے ہوئے جین مذہب کی تعلیم پر عمل کرتے ہیں اور دوسرے شرامن یا سادھو جو راہبانہ زندگی گزارتے ہیں اور جماعت (سنگھ) بنا کر جین مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔

فلسفہ

جین لوگ ہندوؤں کی طرح اواگون اور مکتی میں اعتقاد رکھتے ہیں۔ لیکن مکتی (نجات) کے بارے میں ان کا عقیدہ ہندوؤں سے مختلف ہے۔ ان کے نظریہ کی رو سے جب کوئی روح گناہ کرتی ہے تو وہ بوجھل ہو کر نیچے کی طرف ڈوبنے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس قدر بوجھل ہو جاتی ہے کہ ساتویں دوزخ میں جا گرتی ہے جو روح مطہر ہو جاتی ہے وہ ہلکی پھلکی ہو کر اوپر کو صعود کرتی ہے اور چھبیس بہشتوں میں سے کسی ایک میں قرار کرتی ہے۔ جب وہ بہت ہی لطیف اور تمام آلائشوں سے منزہ ہو جاتی ہے۔ تو چھبیسویں بہشت میں پہنچ جاتی ہے۔ تب اسے نروان حاصل ہو جاتا ہے۔ جینی مادہ روح (جیو) کو ابدی مانتے ہیں۔ جو روح مکتی پا جاتی ہے وہ پیدائش اور موت کے چکر میں نہیں آتی۔ کرموں سے نجات پا جانے کا نام ہی مکتی ہے جو مکتی حاصل کر لیتا ہے وہ

پرمیشور (خدا) ہو جاتا ہے۔ چوبیس تیرتھنکروں نے مکتی حاصل کر لی اس لیے وہ پرمیشور ہیں۔ اس دنیا میں ایک پرمیشور نہیں۔ جتنے لوگ مکتی حاصل کر لیتے ہیں وہ پرمیشور ہیں۔ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں وہ ایسے پرمیشور کے وجود کے قائل نہیں جسے قدیم اور خالق کہا جا سکے وہ اپنے اعتراض کی بنیاد اس مفروضہ پر رکھتے ہیں۔ اگر خدا (ایشور) کو کائنات کا بنانے والا اور ارواح کے کرموں (اعمال) کا نتیجہ دینے والا مانو گے تو ایسا خدا (ایشور) دنیا کا پابند ہو جائے گا۔ حالانکہ وہ آزاد ہے۔ ایشور کی خواہش سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ ہوتا ہے وہ کرم سے ہوتا ہے۔ ارواح اعمال کے نتائج کو اسی طرح بھگتتی ہیں جس طرح وہ نشہ آور چیز پینے سے نشے میں آ جاتی ہے اس میں ایشور کا کوئی دخل نہیں جینی اپنے تیرتھنکروں کی ان الفاظ میں پوجا کرتے ہیں۔ ''آقا جتیدر کے سامنے اپنا سر عاجزی سے جھکاتا ہوں، جو ساری دنیا کا معبود اور امن و راحت کا بخشنے والا ہے دنیا کی تمام مخلوقات کو وہ ابدی سکون عطا کرتا ہے کاش کہ میں اس کی مہربانی سے نروان کا اعلیٰ ترین تحفہ حاصل کر سکوں۔ شری شانتی!''

بدھ مت

بدھ مت سے پہلے ہندوؤں کی مذہبی، اخلاقی، معاشرتی، سیاسی زندگی

مذہبی حالت

ہر الہامی مذہب کی اساس وحدانیت پر ہے اسلام کے نظریہ کے مطابق ہر قوم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہادی اور نذیر آتے رہے ہیں جو ان کو خدا سے الہام پا کر راہ راست پر چلنے کی تلقین کرتے رہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد ۱۳:۷) یعنی ہر قوم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہادی آتے رہے ہیں۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ اِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر ۳۵:۲۴) یعنی ہر امت میں اللہ کی طرف سے نذیر ہو گزرے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ ہندو مذہب بھی ایک الہامی مذہب ہے لیکن مرور زمانہ سے اس کی الہامی اور سچی تعلیم اس کے ماننے والوں کے غلط اور باطل نظریات کے نیچے آ کر دب گئی۔

اگر تعصب کی پٹی اتار کر رگ وید کا مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس وید میں خدائے واحد کی تعلیم موجود ہے جیسا کہ رگ وید دسویں منڈل ۸۲ دیں سوکت کی تیسری رچا میں لکھا ہے۔

''وہ باپ جس نے ہمیں بنایا ہے وہ خالق کی حیثیت سے کل اقوام اور کائنات کو جانتا ہے وہی ایک خدا ہے۔ دوسرے دیوتاؤں کو نام دینے والا، سب اسی سے دریافت کرتے آئے ہیں۔''

آخر وید کی وحدانیت آہستہ آہستہ کثیر التعداد دیوتاؤں کے نیچے ایسی دبی تو یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا کہ آیا ویدوں میں وحدانیت کی تعلیم بھی ہے یا کہ نہیں۔

اس وقت جو وید ہمارے پاس موجود ہیں وہ توحید کامل سے بالکل معرا ہیں۔ ان میں مختلف لوگوں سے اتنے اضافے ہوئے ہیں کہ ان کے متعلق اب یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ یہ کتابیں انسانوں کے ذہن کی اختراع ہیں اور انسانی سوچ بچار کا نتیجہ ہیں۔ ان پر خاص الہامی ہونے کی مہر نہیں لگائی جا سکتی۔ جیسا کہ ویدوں کے باب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وہ تحریف وتبدل سے مبرا نہیں۔ ان کی تعلیم ایسی نہیں۔ جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ خدا کی جانب سے ہے۔

مظاہر پرستی

رگ ویدان بھجنوں اور گیتوں کا مجموعہ ہے جو آریائی حملے سے پہلے اور ان کے ہندوستان میں آباد ہونے کی ابتدائی صدیوں میں گائے جاتے تھے۔ ان میں مذکور سینکڑوں دیوتاؤں میں سب سے اہم اگنی اندر اور سوریہ بالترتیب آگ، بارش، سورج دیوتا ہیں۔ یہ دیوتا کائنات میں اپنا اپنا حلقہ اختیار رکھتے ہیں اور ان کا تعلق ان تین لازمی عناصر سے ہے جن پر حیاتِ انسانی کی بقاء و بہبود کا انحصار ہے۔ آریاؤں کا مذہب ان دیوتاؤں کی خوشنودی اور رضا کے حصول کی خاطر قربانیاں دینے کی رسوم پر مشتمل تھا۔ جب یہ قوم ہندوستان میں داخل ہوئی تو ہندوستان کی جغرافیائی ساخت اور قدیم اقوام اور مذہبی اعتقادات آریاؤں کے مذہبی اعتقادات پر اثر انداز ہوئے ان دیوتاؤں کے علاوہ ندیوں، پہاڑوں، جانوروں اور درختوں کی پرستش شروع کر دی۔

جب اپنشدوں اور منوسمرتی کا رواج ہوا تو ہندو دھرم میں سات عقیدے رائج ہوئے۔

اوّل ویدوں کا الہامی ہونا، دوم ویدک دیوتاؤں اندرا، درونا اور بعد وید پیدا ہونے والے دشنو اور شیو کی پرستش، سوم ویدک دیوتاؤں کے حضور میں قربانی، چہارم چار درنوں کا قیام، برہمن کھشتری، دیش اور شودر، پنجم چار اشرم یعنی انسانی زندگی کے حصے، برہمچریہ آشرم، گوہست آشرم وان پرست آشرم اور سنیاس آشرم، نجات کلی صرف سنیاس آشرم پر موقوف ہے۔ برہمن یہ کہتے تھے کہ آخری دو آشرم صرف برہمنوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ششم آتما (روح) اور پرماتما (روح اعلیٰ) کا نظریہ ہفتم کرم کا عقیدہ اور روح کے اواگون کا نظریہ (تناسخ)[1]

جب ہندو مذہب ہر قسم کی مذہبی خرابیوں کا مرقع بن گیا تو ان حالات کے تقاضے کے مطابق مہاویر اور گوتم بدھ پیدا ہوئے۔ انھوں نے قربانیوں کی غلط رسم کو موقوف کیا۔ ذات پات کی تمیز کا قلع قمع کیا۔ اعمال کو ذریعہ نجات ٹھہرایا۔ بدھ مت اور جین مت کا زور ہرش کے زمانہ تک رہا۔ ہرش کے مرنے کے بعد ایک ایسا انقلاب آیا کہ بدھ مت اور جین مت کا زور بالکل ختم ہو گیا۔ ہندو مت از سر نو پھیلنے لگا۔ بت پرستی اور اوہام پسندی عود کر آئی۔ جتنے بت تھے ان سے زیادہ فرقے بن گئے۔

ادریسی نے بارہویں صدی عیسوی میں اپنی کتاب نزہتہ المشتاق میں ہندوستان کے مذاہب کی کثرت کا یہ حال لکھا تھا کہ

''ہندوستان کی بڑی بڑی قوموں میں ۴۲ فرقے ہیں۔ بعض ایک خالق کائنات کے وجود کو مانتے ہیں لیکن پیغمبروں کے منکر ہیں۔ بعض دونوں ہی سے انکار کرتے ہیں۔ بعض فرقے پتھر کے بتوں کی شفاعت کے قائل ہیں اور بعض ایسے پتھروں کو پوجتے ہیں جو مکھن اور تیل سے چپڑے جاتے ہیں۔ بعض آگ کے پجاری ہیں اور اپنے آپ کو آگ میں ڈال دینے سے بھی باز نہیں رہتے۔ بعض آفتاب کی عبادت کرتے ہیں

---

[1] سی وی ویدیا کی تاریخ حصہ ۲ صفحہ ۴۴،۴۴، ۵۰، ۴۸۔

اور اس کو کائنات کا خالق و ہادی تصور کرتے ہیں۔ بعض درختوں کے آگے جھکتے ہیں۔ بعض سانپوں کی پوجا کرتے ہیں اور ان کو اپنے گھروں میں رکھ کر کھلانا پلانا موجب ثواب جانتے ہیں ان کے علاوہ ایسے بھی ہیں جو ہر عقیدے کے منکر ہیں اور کسی ہستی کی عبادت نہیں کرتے۔"[1]

اخلاقی زندگی

بت پرستی ایک ایسا روگ ہے جس سے ہر قسم کے اخلاقی امراض پیدا ہوتے ہیں جو قوم بت پرست ہوگی ان کی اخلاقی حالت درست ہوگی نہ ان کی معاشرتی حالت صحیح ہوگی، نہ ان کا قانون مبنی بر انصاف ہوگا۔ غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ میں بگاڑ اور فساد ہوگا۔ ہندوؤں کا بھی یہی معاملہ تھا، ان میں بت پرستی کی وجہ سے زندگی کا ہر شعبہ بگاڑ ہوا تھا۔

سوامی دیانند سرسوتی مصنف کتاب ستیارتھ پرکاش کے قول کے مطابق ہندوؤں کے اخلاق کی خرابی کے آثار مہا بھارت کی جنگ سے ایک ہزار سال پیشتر رونما ہو چکے تھے لیکن جنگ مہا بھارت کے بعد ہندوؤں میں اور بھی زیادہ بداخلاقی اور عیاشی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ اس کی وجہ مصنف ستیارتھ پرکاش یہ بتاتا ہے کہ اس جنگ میں بڑے بڑے عالم، رشی، مہارشی وغیرہ مارے گئے۔ ویدوں اور دھرم کی اشاعت رک گئی گو اس میں کوئی شک نہیں کہ علماء اور مصلحین کے وجود کے اٹھ جانے سے کسی قوم کی اخلاقی حالت خراب ہو جاتی ہے لیکن ہندوؤں کی اخلاقی خرابی کی وجہ صرف شرک تھی۔

جنسی آزادی

زنا کاری کی نہ صرف اجازت دی گئی تھی بلکہ ایک خاص موقع ''بھرویں چکر'' پر شراب خوری اور زنا کاری مذہباً فرض قرار دی گئی۔ اس موقع پر مرد اور عورت ایک جگہ پر جمع ہوتے۔ مرد ایک ایک عورت کو مادر زاد برہنہ کر کے پوجا کرتے اور عورتیں کسی مرد کو ننگا کر کے پوجتیں۔ اس موقع پر شراب پی جاتی اور بدمست ہو کر کوئی کسی کی عورت کو، کوئی اپنی یا کسی لڑکی کو، کوئی کسی اور کی یا اپنی ماں بہن بہو وغیرہ کو (جو وہاں موجود ہوتی) پکڑ لیتا اور جس کے ساتھ چاہتا بدفعلی کر سکتا تھا۔ اس مذہبی تقریب کے علاوہ عام طور پر زنا کاری کے لیے ایک خاص فقرہ مقرر کیا گیا تھا جس کو پڑھ کر ہر مرد عورت، سماگم (ہم بستری) کر سکتے تھے اور ایسی بدکاری میں کسی رشتے کے لحاظ کی ضرورت باقی نہ رہتی تھی۔ شراب خوری تو جائز تھی ہی، ایک خاص تیوہار کے روز اتنی شراب پینا کہ آدمی بے ہوش ہو کر گر جائے، نجات کا باعث سمجھا جاتا تھا۔[2]

---

[1] سی وی ویدکی تاریخ جلد دوم صفحہ ۱۹۶۔

[2] ہندوستان میں مسلم ثقافت مصنفہ عبدالمجید سالک طبع دوم ص ۱۴۱۔ سالک صاحب نے یہ تمام تفصیلات ستیارتھ پرکاش مصنفہ سوامی دیانند کے گیارہویں سمولاس سے اخذ کی ہیں۔

مندروں میں لنگ اور یونی کی پوجا ہوتی تھی۔ ہندو ان کی پرستش کرتے وقت نہایت ہی شرمناک حرکات کرتے۔

ہندو فاحشہ عورتوں کے پیشے کو جائز سمجھتے۔ مسز ویدیا لکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں تمام مندروں میں پیشہ ور عورتیں ناچنے کے لیے اپنی زندگی کو وقف کیے ہوئے تھیں، خاص کر شو جی کے مندروں میں یہ رسم عام تھی اور راجا ان مندروں سے خاصی آمدنی حاصل کرتے تھے۔

مصنف ستیارتھ پرکاش نے بھی زنا کا نام نیوگ رکھ کر ہر ضرورت مند عورت کے لیے گیارہ مرد تک مباشرت کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ اسی طرح بدمعاش خاوند کی بیوی کو بدمعاشی کی اجازت دے رکھی ہے۔

ہندوؤں میں قمار بازی اور سود خوری بھی جائز ہے۔ قمار بازی کا ذکر مہابھارت میں ہے اور سود خوری کے احکام منوسمرتی میں درج ہیں۔

معاشرتی زندگی

ذات پات کی تقسیم

تمام معاشرہ کو چار ذاتوں میں تقسیم کیا اور پھر ہر ذات کا دائرہ عمل اور اوصاف مقرر کر دیے۔ ہندوؤں کی کتب میں لکھا ہے کہ برہمن برہما کے سر سے پیدا ہوئے۔ چونکہ سر جسم حیوانی میں بلندترین حصہ ہے اس وجہ سے برہمن کو ہندوؤں میں سب سے بلندترین ذات سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد کھشتریوں کا مقام ہے جو ہندوؤں کے نزدیک برہما کے کندھوں اور ہاتھوں سے پیدا ہوئے۔ تیسرا درجہ ویشوں کا ہے جو برہما کی زانوں سے پیدا ہوئے تھے۔ چوتھے درجہ پر شودر تھے جو برہما کے پاؤں سے پیدا ہوئے۔

ذاتوں کا دائرہ عمل اور اوصاف

برہمنوں کا یہ کام تھا کہ وہ مذہبی تعلیم کی اشاعت کریں عبادت گزار ہوں، عقل وخرد اور سکون قلب کی دولت سے مالا مال ہوں۔

کھشتریوں کا کام ملک کا دفاع تھا۔ اس وجہ سے ان کو بہادر اور عالی حوصلہ ہونا چاہیے۔

ویشوں کا کام یہ تھا کہ وہ زراعت میں مصروف رہیں مویشی پالیں، تجارت کریں، ملک کا معاشی نظام ان کے ہاتھ میں تھا۔

شودروں کا یہ فرض تھا کہ وہ باقی ذاتوں کی خدمت بجالائیں۔

آٹھویں صدی عیسوی تک ان چار ذاتوں کی تقسیم نہیں ہوئی تھی لیکن دسویں صدی عیسوی تک یہ چار ذاتیں آگے بے شمار ذیلی ذاتوں میں تقسیم ہو گئیں۔

باہمی شادیاں

مختلف ذاتوں کے مابین بعض شرائط کے ساتھ شادیاں ہوتی تھیں۔ برہمن کھشتری کی بیٹی کے ساتھ شادی کر لیتا تھا۔ لیکن اپنی بیٹی کھشتری کے نکاح میں نہیں دیتا تھا۔ اسی طرح کھشتری دیش کی لڑکی لے لیتا تھا۔ لیکن دیتا نہیں تھا۔ لیکن بعد میں مخلوط شادیوں کی وجہ سے بعض الجھنیں پیدا ہو گئیں اس وجہ سے یہ رسم بھی ختم ہو گئی۔

اولاد کا تعین

جو بچہ کسی شخص کی جائز بیوی سے پیدا ہوتا تو وہ اپنے باپ کا بیٹا سمجھا جاتا۔ لیکن اگر شادی کے وقت عورت یہ شرط منوا لیتی کہ اس کی اولاد اس کے باپ کی اولاد سمجھی جائے گی۔ شوہر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا تو وہ بچہ نانا کا تصور کیا جاتا۔ اسی طرح اگر کوئی غیر مرد کسی عورت سے اس کے شوہر کی رضامندی سے مباشرت کر لیتا اور عورت حاملہ ہو جاتی تو بچہ شوہر کا تصور کیا جاتا کیونکہ عورت زمین ہے۔ اس زمین کا مالک شوہر ہے۔ زمین میں کوئی بیج ڈال دے پیداوار مالک کی ہوگی۔[1]

خودکشی کی اجازت

ہندوؤں کے ہاں بعض حالات میں خودکشی کی اجازت تھی۔ بیوہ اپنے شوہر کی وفات پر آگ میں جل مرتی تھی۔ جو لوگ غربت بیماری بڑھاپے یا کسی نقص اعضاء کی وجہ سے تنگ آ جائیں تو ان کو بھی آگ میں جل کر مر جانے کی اجازت تھی۔

اونچی ذات کے لوگ آگ سے خودکشی نہیں کرتے تھے۔ صرف دیش اور شودر آگ سے مرتے تھے لیکن اگر برہمن اور کھشتری خودکشی کرنا چاہیں تو انھیں یہ حکم تھا کہ کسوف یا خسوف کے وقت کسی طریقہ سے خودکشی کر لیں یا کسی شخص سے کہہ کر اپنے آپ کو گنگا میں غرق کرا لیں۔ گنگا اور جمنا کے سنگم پر بڑ کا ایک درخت ہے جس کو پریاگ کہتے ہیں۔ برہمن اور کھشتری عام طور پر اس درخت پر چڑھ جاتے اور وہاں سے گنگا میں کود کر خودکشی کر لیتے۔[2]

معاشرتی ناانصافیاں

ہندو معاشرہ میں عورت کو کوئی مقام حاصل نہیں تھا۔ وہ ناقابل اعتماد عقل کی کوری، دھوکے کی ٹٹی اور مال و دولت سے محروم سمجھی جاتی تھی۔ جائیداد کی طرح جوئے میں ہار دی جاتی تھی۔ نکاح ثانی اور خلع کی ممانعت تھی۔

---

1. البیرونی سخاؤ جلد اول صفحہ ۱۰۷۔ 2. البیرونی سخاؤ جلد دوم صفحہ ۱۷۰۔

ہندو معاشرہ میں سب سے زیادہ قابل رحم ذات شودر تھی جن کی پیدائش کی غرض و غایت ہی خدمت قرار دی گئی تھی۔ ہندوؤں کا قانون ان کو درجہ انسانیت دینے کو تیار نہیں۔

تفریحات

آریوں کی پسندیدہ اور مقبول تفریح رتھوں کی دوڑ تھی۔ جوا کھیلنا اور شراب پینا بھی عام تھا۔ اپنی تمام جائیداد جوا اور شراب کی نذر کر دیتے تھے۔ اس وجہ سے وہ اکثر قرضدار رہتے تھے۔ رقص اور موسیقی کے بھی دلدادہ تھے۔

سیاسی زندگی

بادشاہت

برہمنی زمانہ میں ہندوؤں کی سیاسی زندگی کا انحصار خود مختاری بادشاہت پر تھا۔ بادشاہ کو خدا کا نائب تصور کیا جاتا اور اس کی اطاعت خدا کی طرح ہی کی جاتی تھی۔ منو لکھتا ہے۔

''بادشاہ اگر طفل نابالغ بھی ہو تو اسے یہ خیال کر کے یہ بھی ایک انسان ہے۔ حقارت سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ بادشاہ فی الواقع خدا ہے۔ انسان کی شکل میں۔'' (باب ہفتم ۸)

بادشاہ کے مشیر برہمن ہوتے تھے۔ بادشاہ کے لیے یہ لازم تھا کہ وہ ان سے مشورہ لے اور انھیں دان دے۔

بادشاہ گو خود مختار تھا لیکن اس کو وہ فرائض ادا کرنے ضروری ہوتے تھے جو منو شاستر نے مقرر کیے تھے۔ اس وجہ سے وہ اپنے اختیار کو بے جا عمل میں نہیں لا سکتا تھا۔

بادشاہ زیادہ عرصہ اپنے محل میں رہتا۔ اس کے محل میں کسی کو باہر سے جانے کی اجازت نہ تھی۔ بعض اوقات بادشاہ بڑی دھوم دھام کے ساتھ سخت پہرہ کے درمیان محل سے باہر شکار کے لیے بھی جاتا تھا۔

عوام بادشاہ کو اس وقت دیکھتے جب وہ چڑھاوا دینے آتا یا مقدمات کی سماعت کے لیے عدالت میں آتا یا لڑائی میں فوج کی قیادت کرتا۔

عدالتی انتظام

مقدمات کی سماعت بادشاہ کرتا چونکہ تمام مقدمات بادشاہ خود نہیں سن سکتا تھا اس وجہ سے برہمنوں کو اپنا نائب مقرر کر دیتا تھا۔ منو لکھتا ہے۔ جب بادشاہ مقدمات سننا چاہے تو اسے چاہیے کہ عدالت میں تمکنت کے ساتھ داخل ہو اور اس کے ساتھ برہمن اور تجربہ کار مشیر ہوں۔'' (منو باب ہشتم)

اگر بادشاہ خود فصل مقدمات نہ کر سکے تو اسے چاہیے کہ کسی عالم برہمن کو اس کام کے لیے مقرر کرے۔ (منو باب ہشتم ۲۱)

فیصلے معاشرہ کے رسم ورواج کے مطابق ہوتے تھے۔ منولکھتا ہے۔

جو بادشاہ شاستر سے واقف ہے اسے چاہیے کہ مختلف جاتیوں اور صوبوں اور فرقوں اور خاندانوں کے رسوم ورواج کی تحقیقات کرے اور ہر ایک کے لیے علیٰحدہ علیٰحدہ تجویز کرے۔" (منو باب ہشتم ۴۱)

جب ہندوؤں کے ہر شعبہ زندگی میں فساد اور خرابی آ گئی تو ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے گوتم بدھ نے میدان عمل میں قدم رکھا۔

گوتم بدھ کے حالاتِ زندگی

گوتم بدھ ۵۶۳ ق م میں شمالی ہند کے علاقہ نیپال میں ساکیہ قبائل کی راجدھانی کپل دستو کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں لمبنی میں پیدا ہوئے۔ کپل دستو دریائے روہنی کے کنارے بنارس سے سو میل کے فاصلہ پر گوشہ شمال مشرق میں واقع ہے۔ ان کے والد کا نام شدھودھن تھا۔ ان کی والدہ کا نام مہامایا تھا۔ شدھودھن کے دو حرم تھے لیکن پینتالیس سال تک کسی بیوی کے ہاں اولاد نہ ہوئی۔ جب بڑی ملکہ مہامایا حاملہ ہوئیں تو تمام راجدھانی میں خوشیاں منائی گئیں۔ ملکہ کو ملک کے رسم ورواج کے مطابق وضع حمل کے لیے ان کے والدین کے گھر بھیجا گیا۔ مگر راستہ ہی میں چند بلند درختوں کے نیچے بچہ پیدا ہو گیا اور ملکہ کو بچہ سمیت کپل دستو آنا پڑا۔ ایک ہفتہ میں ہی بچہ ماں کی شفقت سے محروم ہو گیا اور سوتیلی ماں نے بچہ کی خبر گیری کی۔

بچے کا نام سدھارتھ رکھا گیا۔ ان کا خاندانی نام گوتم تھا۔ بعد میں جب گیان حاصل کر لیا تو بدھ[1] کے نام سے مشہور ہوا۔ ایسا ہی ایک نام ساکیہ منی یا ساکیہ سنگھ بھی ہے۔

ساکیہ منی گوتم کی تربیت و پرورش شاہی طریقہ پر ہوئی۔ بچپن میں ہی سدھارتھ خاموش طبع غور و فکر کا عادی اور نیکیوں کی طرف مائل رہتا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں گوتم سدھارتھ کی شادی اپنے چچا کی بیٹی یشودھرا (سنسکرت: یشودھا) سے ہوئی۔ شادی کے دس سال بعد ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ گوتم کی اوائل عمری کے حالات پردہ کتمان میں ہیں۔ جب ساکیہ منی گوتم انتیس برس کا ہوا تو اپنے ایک خادم چین کو ساتھ لے کر باہر نکلا۔ راستہ میں ایک مفلوک الحال، فرسودہ دل، مضمحل اعضاء والا بڈھا دیکھا جس پر چلنا دوبھر اور گراں تھا۔ اس کے بعد ایک کمزور اور ضعیف البنیان بیمار پر نظر پڑی جو ضعف اور بیماری کی وجہ سے بمشکل ایک قدم چلتا تھا اور ٹھہر جاتا تھا، قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی اور ٹانگیں جسم کا بوجھ اٹھانے

---

[1] بدھ سنسکرت کا لفظ ہے جس کے معنی بیدار، ہوشیار، دانا، روشن اور نور وغیرہ ہیں۔ بدھوں کی اصطلاح میں یہ لفظ اس شخص پر بولا جاتا ہے۔ جس نے معرفت الٰہی حاصل کر لی ہو اور دنیا کی تاریکیوں سے باہر نکل آیا ہو اور دوسروں کو گمراہیوں کی ظلمت سے نکال کر روشنی کی طرف بلا رہا ہو۔ بدھ مذہب کی کتاب مجھیم نکایا ستا ص ۶۳ میں بدھ کا ایک قول ہے۔

"میں نے دکھ پر روشنی ڈالی ہے اور اس سے باہر آنے پر روشنی ڈالی ہے..... وہ راستہ جو دکھ سے نجات دیتا ہے اس پر روشنی ڈالی ہے کیونکہ یہ انسان کے لیے سودمند ہے۔ یہ مذہب کی اساس اور اصل ہے۔"

سے قاصر تھیں۔ آگے چل کر دیکھا کہ لوگ ایک جنازہ کو کندھا دیے ہوئے قبرستان کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد ایک فقیر درویش صاف باطن کو دیکھا۔ جس کا چہرہ نور کی شعاعوں سے روشن تھا۔ قناعت کی دولت سے مالا مال تھا۔

گوتم انسانی زندگی کے تین حسرت ناک پہلوؤں بڑھاپا، بیماری اور موت سے بہت متاثر ہوا اور دل سے دنیا کی محبت کی آگ سرد ہوگئی۔ آن واحد میں دل میں یہ خیال گزرا کہ ایک دن وہ بھی پیرانہ سالی، بیماری اور موت کے پنجہ میں اسیر ہوگا۔ جن سے نہ فرار ہے نہ گریز۔ اس کے ساتھ ہی اس فقیر باصفا اور روشن دل کا خیال آیا کہ وہ کس طرح اطمینان قلب کی دولت سے مالا مال ہے اور تمام دنیاوی بکھیڑوں اور عوائق کی زنجیروں کو توڑ کر یاد الٰہی میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ دل میں یہ گزرا کہ وہ بھی کیوں نہ اس فقیر باصفا کی طرح دنیا کے تمام عیشوں اور آراموں سے منہ موڑ کر یاد الٰہی میں مشغول ہو جائے تاکہ وہ بھی حقیقی مسرت اور اطمینان کی دولت پا سکے انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں گوتم گھر کی طرف لوٹا۔

گوتم طبعی طور پر دنیاوی لذات سے متنفر تھا۔ باپ نے دنیاوی لذات سے رغبت پیدا کرنے کے لیے گوتم کی شادی سولہ سال کی عمر میں جسودھارا نام کی عورت سے کر دی اور اس کے بطن سے ایک خوبصورت بچہ بھی پیدا ہو چکا تھا جس کا نام راہل تھا۔

جب رات کی تاریکی نے پردے پھیلانے شروع کیے تو گوتم نے اپنے نوکر چین سے گھوڑا مانگا، ذاتی خادم تعمیل حکم میں گھوڑا لینے کے لیے گیا۔ خود گوتم اس کمرہ کی طرف گیا جس میں اس کی بیوی اور بچہ سو رہے تھے۔ دہلیز پر کھڑے ہو کر دیکھا کہ ماں اپنے لاڈلے اور حسین بچے کے ساتھ سوئی ہوئی ہے دل میں خیال گزرا کہ بچے کو گود میں لے کر آخری الوداع کہے لیکن پھر خیال آیا کہ شاید بچے اور بیوی کی محبت عیش و تنعم اور گھر بار ترک کرنے میں روک پیدا کر دے۔ آپ نے دہلیز سے اپنی بیوی اور بچے پر الوداعی نظر ڈالی اور گھر سے نکل پڑے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۹ سال تھی۔

دریائے ایومہ پر پہنچ کر زیور اور جواہرات چین کو دیے اور کہا کہ ان کو لے کر کپل وستو کو لوٹ جائے۔ باوفا خادم نے اصرار کیا کہ وہ بھی اپنے آقا کے ساتھ زہدانہ زندگی بسر کرے گا۔ لیکن گوتم نے کہا کہ نہیں تم واپس کپل وستو جاؤ اور ان کے والد سے تمام حال بیان کرو۔ چنانچہ خادم اپنے دل پر پتھر رکھ کر واپس لوٹا۔ گوتم نے دریا اتر کر بھدرا کرایا اور ایک غریب آدمی سے لباس بدل کر زاہدانہ زندگی اختیار کر کے راج گڑھی کی طرف چل دیے۔

راج گڑھی مگدھ کی سلطنت کا دارالخلافہ تھا اور خوبصورت اور دلکش وادی میں پانچ پہاڑوں کے درمیان واقع تھا۔ ان پہاڑوں کی غاروں میں چند مشہور درویش رہتے تھے۔ گوتم ان کے پاس گیا۔ ایک الترانائی فقیر کے مرید ہو گئے۔ جب اس فقیر کی صحبت سے تسکین قلب کی دولت میسر نہ آئی تو ایک عابد و زاہد

فقیر اورک نامی کی طرف گیا۔ ان دونوں درویشوں نے ہندو مذہب کا فلسفہ سکھایا۔ اس کے بعد گوتم نے نفس کشی کے لیے چلوں اور ریاضتوں کا قصد کیا۔ ازویل کے جنگل میں چھ سال تک سخت ریاضتیں اٹھائیں۔ جسم کانٹے کی طرح خشک ہو گیا لیکن نور قلب میسر نہ آیا۔ ان ریاضتوں اور مشقتوں کے اٹھانے کی وجہ سے گوتم کی شہرت قرب و جوار میں پھیل چکی تھی۔ آپ کے چند مرید بھی بن گئے۔ ایک دن ضعف کی وجہ سے زمین پر گر پڑے۔ مریدوں نے خیال کیا کہ آپ نے دم توڑ دیا ہے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد بے ہوشی اور سکر دور ہوا۔ آپ نے دیکھا کہ ان جسمانی ریاضتوں اور مشقتوں کی وجہ سے نور قلب میسر نہیں آ رہا۔ آپ نے نفس کشی ترک کر دی اور کھانا پینا شروع کر دیا۔

اس وجہ سے مرید آپ سے الگ ہو گئے اور گوتم کو چھوڑ کر بنارس چلے گئے۔ گوتم گوہر مقصود کی تلاش میں سرگرداں پھرنے لگے۔ ہندو درویشوں کی صحبت نے بھی اطمینان قلب نہ بخشا۔ ریاضتوں اور مشقتوں سے بھی دلی راحت میسر نہ آئی۔ اس بے اطمینانی کی حالت میں نہ فیصلہ کر پائے کہ واپس کپل وستو چلا جائے اور وہی عیش و مسرت والی زندگی اختیار کر لی جائے اور نہ یہ فیصلہ کر پائے کہ وہ اسی درویشانہ اور فقیرانہ زندگی میں ہی حیران و سرگرداں پھرتا رہے۔

اسی حالت میں تھے کہ ایک روز ایک نا کت خدا دہقان لڑکی کی نظر گوتم پر پڑی۔ گوتم کو شکستہ حال دیکھ کر پوچھا: اے فقیر! کیا آپ بھوکے ہیں اور کیا آپ میرے ہاتھ سے کھانا تناول کر لیں گے؟ گوتم نے سر اٹھا کر دیکھا اور پوچھا: اے بہن! تمہارا نام کیا ہے؟ لڑکی نے جواب دیا: مہاراج! میرا نام سوجات ہے۔ گوتم نے کہا: ہاں میں بھوکا ہوں، لیکن یہ تو بتاؤ کیا تمہاری غذا میری بھوک کو تسلی دے سکے گی۔

لڑکی یہ نہ سمجھ سکی کہ اس درویش کی بھوک سے کیا مراد ہے اور کس قسم کی تسلی چاہتا ہے۔ لڑکی نے نہایت محبت اور شفقت سے کھانا لائی۔ گوتم نے ایک بڑ کے درخت کے نیچے بیٹھ کر تناول کیا۔ سوجات چلی گئی۔ گوتم دن بھر اسی درخت کے نیچے یاد الٰہی میں مصروف رہے۔ اسی مراقبہ اور زہد و جہد کی حالت میں گوتم مختلف اقسام کے امتحانات اور آزمائشوں میں ڈالے گئے۔ اس قسم کی آزمائشوں اور ابتلاؤں میں گوہر مقصود کو حاصل کرنے سے پہلے رشیوں اور پیغمبروں کو ڈالا جاتا رہا ہے۔ ان امتحانات کی تفصیل للت وستر میں بیان کی گئی ہے۔

پہلی آزمائش

شیاطین نے مختلف وسوسوں سے گوتم کو ان کے مقصد حیات اور مطمح نظر سے الگ کرنے کی کوشش کی، لیکن گوتم شیاطین کے وسوسوں پر غالب آ گئے۔

دوسری آزمائش

گوتم کو حوروں کے جم غفیر نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اور گوتم کو محبت آمیز سرگوشیوں اور وصل

کے وعدوں سے یادالٰہی سے غافل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، وہ گوتم کو کہتی ہیں۔

'ادھر آ و۔ ذرا تو انھیں دیکھ لے۔ تیرا مکھڑا تو پورا چاند ہے۔ لیکن یہ بھی نئی کنول کے پھول سے کم نہیں۔ ان کی آوازوں کو سن۔ کیسی پیاری اور تہ دل سے نکلتی ہیں۔ ان کے دانت ایسے سفید ہیں۔ جیسے برف یا چاندی۔ ان کی مثل جنت میں بھی ملنا مشکل ہے، اس دنیا میں بھلا تجھے یہ کہاں ملیں گی یہ تو ایسی حسین ہیں کہ بڑے بڑے دیوتا ان کی تمنا میں مرتے ہیں۔'' (للت وستر اکیسواں باب ۲۲۴ویں گاتھا)

گوتم نے ان بدروحوں کو یہ جواب دیا۔

'' یہ جو شکلیں میرے سامنے کھڑی ہیں نہایت ہی کریہہ منظر اور بے جوڑ ہیں۔ ان کے اندر کیڑے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ تو بالکل جلنے والی ہیں اور دکھ درد سے بھری ہوئی ہیں۔ میں وہ چیز حاصل کروں گا جو جاودانی ہے جسے عقل مند مانتے ہیں اور جس سے تمام آسودگی ہاتھ لگتی ہے۔''

ان روحوں نے پھر کہا کہ تو کیوں اتنی نفرت کرتا ہے؟ گوتم نے جواب دیا: ''ہر ایک مخلوق میں گناہ ہے، جس کسی نے اپنے کو ہوا و ہوس سے پاک کیا وہ اس بات کو جانتا ہے۔ انسان کی شہوات نفسانی کی مثال تلوار یا تیر یا نیزے یا استرہ کی ہے۔ جس پر شہد لگا ہوا ہے۔ ان کی مثال سانپ کے سر یا دہکتی ہوئی آگ کی ہے اور میں اس کو خوب جانتا ہوں۔''

کتاب کہتی ہے۔

''وہ اس مخلوق کو نہ محبت کی نگاہ سے دیکھتا تھا نہ غضب کی نگاہ سے۔ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ سمندر خشک ہو جائیں گے۔ آفتاب اور ماہتاب زمین پر گر پڑیں گے۔ لیکن وہ (گوتم) جو تینوں عالم کے گناہوں کو دیکھ رہا تھا۔ ہرگز عورتوں کے قبضہ میں نہیں آئے گا۔'' (للت وستر اکیسواں باب ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۳۱ گاتھائیں)

تیسری آزمائش

اس کے بعد ملک الشیاطین آیا اور اس نے گوتم کو تمام جہانوں کی حکومت دینے کا وعدہ کیا۔ بشرطیکہ وہ علم و معرفت کے حصول کو خیر باد کہہ دے۔ ملک الشیاطین بولا۔

میں تمام دنیا میں شہوات نفسانی کا بادشاہ ہوں۔ تمام دیوتا اور تمام انسان اور حیوانات میرے تابع ہیں اور میرے حکم پر چلتے ہیں۔ اٹھ تو بھی میری اقلیم میں ہے۔ اپنی آواز مجھے سنا۔''

شاکیا منی (گوتم) نے جواب دیا: اگر تو شہوات نفسانی کا بادشاہ ہے تو ہوا کر۔ دنیا پر تو تیری حکومت نہیں ہے۔ مجھے غور سے دیکھ۔ میں ہوں بادشاہ قانون کا۔ اگر تو شہوات کا بادشاہ ہے تو بری راہ نہ چل۔ تو کچھ ہی کر میں تو ضرور آنکھوں کے سامنے عرفان حاصل کرلوں گا۔ (للت وستر اکیسواں باب ۱۲۶، ۱۶۷ گاتھائیں)

جب گوتم ان تینوں آزمائشوں میں پورا اترا تو غیب سے یہ دلنواز آواز آئی: ''دیوتا اسے موتیوں کا ہار اور نشان اور پرچم دے رہے ہیں: اے جواں مرد! دشمن کی فوج نے تیرے درخت کا محاصرہ کرنے کے بعد

بالآخر شکست پائی۔ اسی مقام پر اس بہترین کرسی پر آج تجھے عرفان شہوات نفسانی سے خالی حاصل ہوگا اور تجھے بدھ کی ساری حکومت ملے گی کیونکہ تو نے اپنی شیریں کلامی سے شیطان کی فوج پر فتح پائی۔ (للت دستر اکیسواں باب ۲۰۲،۲۰۳ گاتھائیں)

اب گوتم کو اپنے نفس امارہ پر مکمل فتح حاصل ہوگئی۔ وہ راستہ مل گیا جس کی تلاش میں تھا۔ وہ شربت کافور مل گیا جس کے لیے کام ودہن پیاسے تھے۔ وہ شربت زنجبیل مل گیا۔ جس کے پینے سے روحانی منزلیں جلد طے ہونے لگیں۔ دیدار الٰہی نصیب ہوگیا۔ جس کے لیے روحانی آنکھیں ترس رہی تھیں۔ محبوب کا شیریں کلام سننے لگا جس کے سننے کے لیے کان برسوں سے بے تاب تھے، گویا زندگانی کا عقدہ کھل گیا اور جوہر مقصود مل گیا۔

عرفان اور روشنی حاصل کرنے کے بعد گوتم بدھ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے دین دارو! میں نے اس طرح رنج وغم کی حقیقت کو اور اس کے غیر متناہی ہونے کو اور اس کے دور کرنے کے طریقے کو سیکھا ہے۔ میں نے معلوم کیا ہے کہ خواہش نفسانی کی کیا مصیبت ہے۔ دنیوی زندگی اور اجل کی کیا مصیبت ہے اور ان کل مصیبتوں سے انسان کیونکر بچ سکتا ہے۔ یہ مصیبتیں کس طرح بالکل غائب ہوسکتی ہیں، بلا اس کے کہ ان کا کوئی نشان باقی رہ جائے مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مایا کیا چیز ہے۔ مایا کی مصیبت کیا ہے اس سے انسان کیوں کر سربر ہوسکتا ہے اور یہ کیونکر اس طرح غائب ہوسکتی ہے کہ اس کا پتہ بھی نہ ہے۔" (للت دستر بائیسواں باب)

دراصل گوتم کا یہ معراج تھا۔ جو تمام خدا کے پیاروں کو ہوا کرتا ہے۔ جس طرح خدا کے محبوبین کے مراتب ہوتے ہیں اسی طرح ان کے معراج کے مراتب ہیں۔ جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے تمام محبوبین کے سرتاج ہیں۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج ہوا تھا۔ وہ سب سے اعلیٰ تھا۔ جس کی نظیر روحانی دنیا میں نہ ملتی ہے اور نہ ملے گی۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَايَغْشٰى مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (النجم ۵۳:۱۳۔۱۸) اور یقیناً اس (محمد) نے اپنے آپ کو ایک اور مرتبہ پر دیکھا سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اس کے قریب مقام جنت ہے جب سدرہ پر پرچھائیں چھا رہی تھیں اس مقام پر بھی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ کج نہ ہوئی اور نہ حد سے بڑھی۔ یقیناً اس نے وہاں اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں کو دیکھا۔

ان آیات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معراج کا ذکر ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح نوری جسم کے ساتھ تمام روحانی بلندیوں کو طے کرتے ہوئے دیدار الٰہی سے شرف یاب ہوئی۔

بڑ کا درخت بدھوؤں کے نزدیک ایک مقدس درخت ہے۔ اب تک اس بڑ کے نیچے جلسے اور

اجتماع ہوتے تھے۔ تھیوصوفی والوں نے بھی اسی طریقہ کو اپنا لیا ہے۔ ہندوؤں میں بھی پیپل اور بڑ کے درخت مقدس خیال کیے جاتے ہیں۔ جن کے نیچے دیوتا استراحت کرتے ہیں۔ (اتھروید کانڈ ۵ سوکت منتر اور رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۱۳۵ منتر ا منڈل ۱۶۴ سوکت ۲۰۔۲۲)

یونانی کتب الہیہ اور مصری کتاب الموتی میں یہ بیری کا درخت (سدرۃ) حیرت عقل اور حکومت بر کائنات کا انتہائی مقام کہلاتا ہے۔ ہومر کہتا ہے: جو اس درخت کا پھل کھالیتا ہے پھر واپس نہیں لوٹتا۔ وہ آرام وسکون روح کا مقام ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا)

مبشرانہ زندگی کا آغاز

گوتم مسرت کے عالم میں اس درخت کے نیچے سے اٹھے اور طمانیت قلب کا الٰہی نسخہ ساتھ لے کر راج گرھی کی طرف چل دیے تاکہ ان لوگوں کو بھی اس نسخہ سے اطمینان قلب کی دولت سے مالا مال کر سکیں۔ سب سے پہلے اپنے دونوں استادوں کی طرف روانہ ہوئے تو معلوم ہوا کہ وہ اس فانی دنیا سے کوچ کر چکے ہیں۔ وہاں سے بنارس کی طرف چلے۔ راستہ میں ایک پرانے دوست سے ملاقات پر یوں گفتگو ہوئی۔

اُپک (گوتم سے) دوست! خاصے مطمئن اور ہشاش بشاش نظر آتے ہیں اور تمھارے چہرہ پر نور کے آثار ہویدا ہیں۔ یہ کس طریقت کا نتیجہ ہیں؟

گوتم (اُپک سے): میں دنیا کی تمام اخلاقی اور روحانی طاقتوں پر قادر ہو گیا ہوں اور نفس امارہ کی سرکش اونٹنی کو ذبح کر دیا ہے جس کے نتیجہ میں مجھے دائمی راحت حاصل ہو گئی ہے۔

اُپک (گوتم سے): آپ کس طرف جا رہے ہو۔

گوتم (اُپک سے) بنارس۔

اُپک (گوتم سے) کس غرض سے؟

گوتم (اُپک سے) لوگوں کو وہ طریقہ بتانے کے لیے جس پر چل کر وہ ابدی اور حقیقی راحت حاصل کر سکتے ہیں۔

لیکن اُپک نے سنی ان سنی کر کے دوسرا راستہ اختیار کر لیا اور گوتم بنارس کی طرف چل دیے۔

چند روز بعد گوتم ہرن بن میں جا پہنچے۔ یہ بن بنارس سے شمالی جانب واقع ہے۔ وہاں گوتم کے پانچ بڑے مرید رہتے تھے۔ جب گوتم نے نفس کشی ترک کر دی تھی تو یہ پانچوں مرید حلقہ عقیدت سے الگ ہو گئے تھے۔ پانچوں نے گوتم کی طرف ذرا بھی توجہ نہ دی۔ ظاہری رواداری کے طور پر ایک پرانا بوریا بچھا دیا۔ گوتم اس پر بیٹھ گئے۔ گوتم کی قلبی نور پاشی نے ان کی مخالفت کو دھواں کر دیا۔ بدھ نے اپنا مشہور وعظ، راست کاری کے پہیے متحرک کرنے "Setting in" "Motion the wheel of righteousness" کا دیا۔ جس سے دائمی مسرت حاصل کی جا سکتی ہے۔ کافی دیر تک مریدوں سے گفتگو ہوتی رہی۔ آخر کار حق

کے قبول کرنے کے لیے ان کا سینہ کھل گیا۔ سب سے پہلے مسن ''کندینا'' حلقہ ارادت میں شامل ہوا۔ بعدازاں دوسرے بھی حلقہ عقیدت میں شامل ہو گئے۔ کچھ عرصہ گوتم ہرن بن میں مقیم رہے اور لوگوں کو ابدی اور حقیقی نجات کا پیغام پہنچاتے رہے۔ اس پیغام کے پہنچانے میں مرد عورت، امیر غریب، عالم جاہل کسی کی تفریق نہ تھی۔ امراء میں سب سے پہلے ''یاس'' نامی ایک امیر کبیر نوجوان نے پیغام کو قبول کیا۔ اس کے ساتھ اس کے ہمراہیوں کی ایک خاصی جماعت شامل ہوگئی۔ یاس کے ماں باپ اور اس کی بیوی سب بدھ مت میں شامل ہو گئے۔

ہرن بن پہنچنے کے تین ماہ بعد گوتم نے اپنے تمام مریدوں کو جمع کیا۔ جن کی تعداد ساٹھ کے قریب تھی۔ ان سب کو مختلف اطراف میں نجات ابدی کی خوشخبری کا پیغام پہنچانے کے لیے بھیجا۔ فقط یاس اپنے والدین کے پاس بنارس میں مقیم رہا۔ گوتم خود تبلیغی وفود کے نتائج دیکھنے کے لیے وہیں مقیم رہے۔

اُزدیل کے جنگل میں تین بھائی فقیرانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کی عام شہرت تھی۔ انبوہ در انبوہ شاگردان کے پاس جا کر رہتے تھے۔ بادشاہ اور عمائدین ان تینوں بھائیوں کی بہت توقیر کرتے تھے۔ گوتم ان کے پاس گئے اور دوسرا وعظ ''اگنی'' "The fire sermon" دیا۔ گوتم نے انسانی احساسات کو ہوس، غضب، فریب اور نفرت کی دہکتی ہوئی آگ کا آلاؤ قرار دیا۔ اور یہ بتایا کہ ایک دانش مند آدمی ہوس کی آگ بجھا کر دکھ اور کرب کی جڑیں دل سے باہر نکال کر پھینک سکتا ہے ایک بھائی حلقہ ارادت میں شامل ہو گیا۔ بعدازاں اس فقیر کے تمام شاگرد اور پیروکار گوتم کی غلامی میں آ گئے۔ اس طرح گوتم کی شہرت عام ہوگئی۔ دور ونزدیک سے لوگ گوتم کو دیکھنے کے لیے آنا شروع ہو گئے۔ گوتم اپنا پیغام ان تک پہنچاتے رہے اور آہستہ آہستہ گوتم کے پیروؤں کی تعداد بڑھنا شروع ہوگئی۔

گوتم اپنے مریدوں کو لے کر ازویل سے چلے اور مگدھ کے دارالخلافہ راج گڑھی میں آئے۔ شاہ بمباسر نے ان کا استقبال کیا۔ یہاں ''بہشت'' پر ایک وعظ کیا، اور بتایا کہ جنت کا دروازہ طہارت ہے اور منزل مقصود عشق۔ شاہ بمباسر نے گوتم اور ان کے مریدوں کی بہت توقیر کی اور گوتم کے فلسفہ پر ایمان لے آئے۔ بادشاہ کے فلسفہ قبول کرنے کے ساتھ ہی بے شمار آدمی گوتم پر ایمان لے آئے۔ قصبہ کے قریب ''ویلوبن'' کی جھاڑی ان کے رہنے کے واسطے تجویز کی۔ یہ مقام اس وجہ سے مشہور ہے کہ گوتم یہاں کئی برسات کے موسموں میں مقیم رہے۔ کئی وعظ اور مباحثے کیے۔

اس عرصہ میں گوتم کے والد نے پیغام بھیجا کہ کپل وستو آؤ اور ایک دفعہ اپنا دیدار کرا جاؤ۔ یہ پیغام حاصل کرنے کے بعد گوتم اپنے مریدوں کے ساتھ کپل وستو روانہ ہوئے۔ کپل وستو پہنچ کر شہر کے باہر ایک جھاڑی میں ڈیرہ ڈال دیا۔ ان کے والد اپنے ۱۰۶ واقارب کو ساتھ لے کر ملنے آئے۔ لیکن ان کی زاہدانہ اور درویشانہ زندگی کو دیکھ کر خوش نہ ہوئے۔ گوتم اور ان کے مریدوں کے کھانے کا بندوبست بھی نہ کیا۔ اگلے دن گوتم نے شہر کے گھر گھر سے بھیک مانگنی شروع کی۔ جب بادشاہ کو اس بات کا علم ہوا تو ان کو بہت ملال ہوا اور

گوتم کے پاس گیا کہ وہ اس حرکت سے رک جائے۔ گوتم نے اپنے والد کو اپنے فلسفہ کی تبلیغ کی مگر اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ باپ نے گوتم کے ہاتھ سے کاسہ فقیری لے لیا اور اپنے قصر شاہی میں لے آیا اور اس کی بہت تکریم کی۔ گوتم کی بیوی ان کے پاس نہ آئی اور کہا کہ اگر ان کے دل میں میری کچھ بھی عزت و توقیر ہے تو گوتم خود میرے پاس آئے گا۔ اس دن اس نے اپنے خاوند کو مردہ سمجھ کر تمام عیش و آرام ترک کر دیا۔ دن میں صرف ایک دفعہ کھانا کھاتی اور چٹائی پر لیٹی رہتی۔ گوتم کو شہر میں داخل ہوتے ہی اس بات کا علم ہو چکا تھا۔ گو بدھ مذہب کا کوئی پیرو عورت کا چھونا اور اپنا جسم عورت کو چھونے دینا روا نہ رکھتا تھا، تاہم گوتم دو مریدوں کو ساتھ لے کر اپنی بیوی کے پاس گیا۔ بیوی نے اپنے خاوند کو زاہدانہ لباس میں دیکھ کر ان کے قدموں کو آ لیا۔ گوتم نے فرقہ اناث کے لیے ایک حلقہ اپنے مذہب میں قائم کیا۔ ان کی بیوی جسودھارا بدھ کے حلقہ ارادت میں داخل ہو کر پہلی گوشہ نشین بیراگن ہوئی۔

پندرہ روز تک گوتم شہر کے باہر جھاڑی میں مقیم رہا۔ اعزہ و اقارب اور دوستوں کی دعوتوں میں شریک ہوتا رہا اور اپنا وعظ لوگوں تک پہنچاتا رہا۔ ایک دن گوتم کی بیوی نے اپنے بچے رہل کو عمدہ کپڑے پہنائے۔ جب گوتم محل کے پاس سے گزرا تو ماں نے بیٹے کو کہا: دیکھو تمہارا باپ جا رہا ہے۔ اس کے پاس جاؤ اور اپنا ورثہ طلب کرو۔ بیٹا گوتم کے پاس گیا اور ورثہ طلب کرنے لگا۔ گوتم نے اس وقت تو کوئی جواب نہ دیا اور جب دعوت سے فارغ ہو کر واپس اپنے ٹھکانہ کی طرف جانے لگا تو بیٹا بھی پیچھے ہو لیا اور اپنا ورثہ طلب کرتا رہا۔ جب گوتم اپنی جائے رہائش پر پہنچ گیا تو اپنے ایک مرید سے کہا کہ بھائی میں اس لڑکے کو وہ نعمت غیر مترقبہ دیتا ہوں۔ جو مجھے بڑ کے درخت کے نیچے ملی تھی۔ تم اس کو اس دولت کا والی اور وارث بناؤ۔ گوتم کے اس اشارہ سے رہل کو حلقہ مریدی میں شامل کر لیا گیا۔ جب دادا کو اس بات کا علم ہوا تو وہ بہت مغموم ہوا۔

گوتم نے راج گڑھی کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ اس تبلیغی دورہ میں بہت سے رشتہ دار اور اہل وطن آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ ان میں سے چار شخصوں کا ذکر ضروری ہے۔ انند اور دیودت ان کے رشتہ کے بھائی تھے۔ اپالی قوم کا نائی اور انردوہ ان کا ہم وطن تھا۔ انند تمام عمر ان کے ساتھ رہا۔ دیودت ان کا مدمقابل ہو گیا۔ اپالی حجام ان کے گروہ کا بڑا نامور پیشوا بنا۔ انردوہ بودھ مذہب کی حکمت نظری کا عالم ہوا۔

موسم برسات کے اختتام پر گوتم بدھ راج گڑھی سے چل کر سلطنت کوسل کے پایہ سلطنت سراوستی کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں ایک متمول سوداگر رہتا تھا، جس نے گوتم بدھ اور ان کے مریدوں کے لیے ایک وسیع جنگل نامزد کر دیا۔ یہاں بڑے بڑے وعظ اور مناظرے ہوئے۔

یہاں آپ کی تبلیغی مساعی کا تیسرا سال ختم ہوتا ہے۔ چوتھے سال سے چالیسویں سال تک گوتم کی تبلیغی مساعی بہت کم ملتی ہیں۔ لہٰذا جو بھی مساعی پراگندہ طور پر کتب میں موجود ہیں ان کو لکھ دیا جاتا ہے۔

چوتھے برس گوتم مہابن میں مقیم رہے۔ ایک نٹ کو اپنے حلقہ مریدی میں شامل کیا۔

پانچویں سال وہ اپنے باپ سے ملاقات کرنے کے لیے دوبارہ کپل وستو گئے۔ پہنچنے پر ان کا والد فوت ہو گیا۔ ان کی نعش کو جلا کر واپس آ گئے۔ ان کی بیوی اور سوتیلی ماں ساتھ آ گئیں۔ ان کے ساتھ چند اور بھی عورتیں تھیں، ان کو بھی گروہ میں داخل کر لیا گیا۔

چھٹے برس گوتم راج گڑھی میں واپس آ ئے۔ اور بمباسر کی رانی چھما کو اپنے حلقہ میں شامل کیا۔ ایک اور مرید نے کرامت دکھائی۔ لیکن آپ نے کرامات دکھانے سے منع کر دیا اور کہا کہ کرامات اور معجزات کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔

ساتویں برس ایک دشمن نے ایک عورت چنچا نامی کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ گوتم پر زنا کاری کا الزام لگائے مگر اس کی فریب کاری کا پردہ جلد چاک ہو گیا۔

آٹھویں برس گوتم کپل دستو کے قریب ایک پہاڑ پر سے گزرے۔ وہاں چند نئے آدمیوں کو اپنے حلقہ میں داخل کر کے کسمی کو چلے گئے۔

نویں برس بدھ مذہب کی جماعتوں میں اختلاف اور انتشار رونما ہو گیا گوتم بدھ نے اس انتشار اور اختلاف کو دور کرنے کی سعی کی۔ مگر آپ کی کوشش بار آور ثابت نہ ہوئی۔ اس وجہ سے تمام مریدوں کو چھوڑ کر ''پارلیاک'' کے جنگل میں چلے گئے۔

دسویں برس قرب و جوار کے کسانوں نے ان کے لیے ایک جھونپڑا تیار کیا جس میں گوتم نے برسات کاٹی، ذکر الٰہی میں مشغول رہے۔ اختلاف کرنے والوں نے آپ کو ڈھونڈ لیا۔ آپ سے معافی طلب کی، توبہ کی۔ آپ نے ان کے قصور کو معاف کر دیا۔ اپنے تائب مریدوں کو ساتھ لے کر سراوستی ہوتے ہوئے راج گڑھی پہنچے۔

گیارہویں برس گوتم بدھ نے چند مشہور آدمی اپنے حلقہ ارادت میں شامل کیے اور مگدھ اور کوسل کے ملکوں میں تبلیغی فریضہ سرانجام دیا۔

بارہویں برس ایک لمبا تبلیغی سفر اختیار کیا اور جس مقام پر سے گزرتے وہاں وعظ کرتے۔

تیرھویں برس مقام چلیا اور سراوستی میں اپنے فلسفہ کا پرچار کیا۔

چودھویں برس گوتم سراوستی میں رہے اور اپنے بیٹے رھل کو مبلغ بنا کر کپل دستو کی جانب روانہ کیا۔

پندرھویں برس کپل دستو کے باہر ایک جنگل میں ڈیرہ لگایا۔ اپنے چچا زاد بھائی موہانم جوان کے باپ کی جگہ تخت نشین ہوا تھا۔ وعظ کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی وعظ کیے جن میں یہ بتایا کہ راست بازی کو صدقات اور خیرات پر فضیلت حاصل ہے۔

سولھواں برس مقام الادی میں بسر کیا اور اپنے پیغام حق کو لوگوں تک پہنچایا۔

سترھویں برس راج گڑھی کی طرف گئے اور وہیں موسم برسات گزارا۔ ایک کسبی سریمتی کی میت پر

وعظ کیا۔ اب گوتم بدھ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب تک کسی بھوکے آدمی کو کھانا نہ کھلا لیتے اسے وعظ نہ سناتے۔

اٹھارھویں برس چلیا میں جا کر ایک جولاہے کو جس کی لڑکی مر گئی تھی وعظ سنایا اور برسات کا موسم گزار کر راج گڑھی واپس آ گئے۔

انیسویں برس گوتم بدھ نے مگدھ کے راستہ سے سفر اختیار کیا۔ جس گاؤں سے گزرتے وہاں وعظ سناتے۔ ایک مرتبہ ایک ہرن کو پھندے میں پھنسا ہوا دیکھ کر اس کے پاس گئے۔ اس کے آگے گھاس چرنے کو ڈالی۔ شکاری بہت ناراض ہوا اور ان کو مارنے کے درپے ہوا۔ مگر گوتم نے اپنا وعظ سنایا تو وہ مع اپنے خاندان کے ان کا مرید بن گیا۔

بیسویں برس دیہات اور قصبات میں وعظ سنائے۔ چلیا کے جنگل میں ایک مشہور ڈاکو "انگولی مل" کو اپنے لطف وعنایت کے برتاؤ سے جادۂ حق کی طرف لائے اور حلقہ ارادت میں شامل ہونے کی رغبت دلائی۔

اکیسویں برس سے پچالیسویں برس تک گوتم بدھ کے حالات بالکل پردہ کتمان میں ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ایک سال کے حالات دوسرے سال کے حالات سے ملتے جلتے ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے ان مشابہ حالات کو احاطہ تحریر میں لانا پسند نہ کیا۔

گوتم بدھ عورتوں کی بہت تکریم کرتے تھے۔ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مستورات نے اس مذہب کے لیے اپنی جان و مال کو وقف کر دیا۔ فرقہ اناث میں سرادستی کی رہنے والی ایک عورت بشاکہ نے بہت شہرت حاصل کی۔ اس نے ایک سایہ دار کنج زاہدوں کو دیا۔ ان کی رہائش کے لیے قصبہ سرادستی کے مشرق جانب ایک خانقاہ تعمیر کرائی۔

گوتم عام بازاری اور خانگی کسبیوں کی دعوتیں بھی قبول کر لیتے تھے۔

امباپلی، کپل دستو اور چند اور مقامات پر گوتم بدھ کسبیوں کے ہاں مدعو ہوئے۔ اس بات کا عوام میں بہت چرچا ہوا اور انھوں نے اس امر کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ راج گڑھی میں ایک خانگی کسبی شریمتی کی میت پر جا کر وعظ کیا اور تمام مجمع میں حیرانی کی لہر دوڑ گئی۔

گوتم بدھ کا وعظ کرنے کا طریقہ

گوتم بدھ کے وعظ کرنے کا طریقہ نرالا تھا۔ ذیل میں دو روائتیں درج کی جاتی ہیں۔

روایت ہے کہ ایک جوان لڑکی کا نام کسا گوتمی تھا۔ اس کی شادی ایک امیر آدمی کے اکلوتے بیٹے سے ہوئی اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ بچہ ہی تھا کہ موت نے اسے اپنے آہنی پنجوں میں لے لیا۔ وہ جوان عورت بچہ کو سینے لگائے ہوئے ہر فقیر و درویش کے گھر گئی۔ ان سے دوا مانگتی جس سے اس کا بچہ زندہ ہو جائے۔ ایک درویش نے کہا۔ میرے پاس دوائی تو نہیں ہے۔ ہاں میں تمھیں ایک درویش کا نام بتا سکتا ہوں جس کے پاس اس کا علاج ہے۔ اس عورت نے اس کا نام پوچھا تو درویش نے کہا: گوتم بدھ۔ وہ عورت گوتم

بدھ کے پاس گئی تو بدھ نے کہا: ہاں میرے پاس اس کا علاج ہے۔ اس زمانہ میں یہ طریقہ تھا کہ جو مریض ہوتا تھا وہی طبیب کی مطلوبہ جڑی بوٹی لاتا تھا۔ گوتم نے کہا کہ سرسوں کے دانے ایسے گھر سے لاؤ جس کا کوئی آدمی نہ مرا ہو۔ عورت گھر گھر جاتی۔ سرسوں کے دانے مانگتی اور پوچھتی: کیا ان کا کوئی آدمی مرا تو نہیں؟ ہر گھر سرسوں کے دانے دینے کو تو تیار ہو جاتا لیکن یہ بھی کہتا کہ اس کے گھرانے کے اتنے آدمی لقمہ اجل ہو چکے ہیں۔ جب اس عورت نے دیکھا کہ ہر انسان کی زندگی موت کے پنجہ میں اسیر ہے تب اس کے دل سے ظلمت کا پردہ چاک ہوا۔ اس نے اپنے بچہ کو جنگل میں دفن کیا اور گوتم بدھ کی خدمت میں حاضر ہو گئی۔ گوتم نے پوچھا کہ سرسوں کے دانے لائی ہو۔ عورت نے کہا سوامی جی سرسوں کے دانے تو ملتے ہیں لیکن کوئی گھر موت سے خالی نہیں۔ تب گوتم نے اپنے وعظ کا آغاز کیا اور کہا کہ ہر چیز فانی ہے۔ اس عورت کے دل پر گوتم بدھ کے خیالات ایسے مرتسم ہوئے کہ وہ فوراً حلقہ عقیدت میں شامل ہو گئی۔

دوسری روایت ہے کہ ایک مرتبہ کوئی متمول برہمن اپنے کھیت سے فصل کاٹ کر گھر آ رہا تھا گوتم بدھ اپنی جھولی لے کر اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ برہمن جھنجھلا کر بولا: میں قلبہ رانی کر کے تخم ریزی کرتا ہوں اور بڑی محنت اور مشقت سے روزی کماتا ہوں تو بھی اسی طرح اپنی روزی کما۔ گوتم نے جواب دیا۔ میں بھی قلبہ رانی اور تخم ریزی کرتا ہوں اور تیری طرح محنت کرتا ہوں اور اپنا رزق حاصل کرتا ہوں۔ برہمن نے کہا کہ تم اپنے آپ کو کاشت کار کہتے ہو، لیکن تمھارے پاس کاشت کاری کے آلات و سامان نہیں ہے۔ بدھ نے جواب دیا: سنو! ایمان میرا تخم ہے جسے میں بوتا ہوں اور نیک کاموں کی بارش سرسبز اور شاداب کرتی ہے۔ عقل وحیا میرے ہل کے پرزے ہیں اور میرا دل اسے چلاتا ہے۔ مذہبی قانون میرے ہل کا دستہ ہے۔ شوق اور سنجیدگی میرا پینا ہے۔ محنت اور سعی میرے بیل ہیں اس قلبہ رانی سے مغالطہ کے بیکار اور خودرو پودے اکھاڑ پھینکتا ہوں اور جو فصل پیدا ہوتی ہے وہ نروان کے امرت پھل ہیں جن کے کھانے سے تمام تکالیف اور مصائب دور ہوتے ہیں۔

دیودت کی دشمنی

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ دیودت گوتم بدھ کا چچازاد بھائی تھا۔ اس کے دل میں تکبر پیدا ہوا کہ وہ بودھ سے بھی بڑھ سکتا ہے اور برتر درجہ پا سکتا ہے۔ اس لیے اس نے گوتم بدھ سے اپنی زیر ہدایت ایک گروہ تشکیل کرنے کی اجازت چاہی اور یہ بھی تجویز کی کہ اس گروہ میں داخل ہونے والوں پر ایسی قیود عائد کی جائیں جو گوتم بدھ کے اختیار کردہ قواعد سے بدرجہا سخت ہوں۔ راج گڑھی کا بادشاہ اجات سترو اس کا معاون تھا۔ بہت سے درویش اس کے پیروکار تھے۔ گوتم بدھ نے اس تجویز کو منظور نہ کیا اور یہ بھی کہا: جو تیری قیود کا جوا اپنی گردن میں رکھنا پسند کرے اس کو اختیار ہے وہ آپ کے گروہ میں شامل ہو جائے۔ میرا کام تو صرف لوگوں کو راہ نجات دکھانا ہے۔ سب کے لیے ایک ہی آئین بنا دینا طالبان نجات کے لیے دشوار ہے کیونکہ

معاشرہ میں ہر قسم کے لوگ ہیں ہر قسم کی قیود اور پابندی کا بوجھ اٹھا نہیں سکتے۔

دیودت نے گوتم سے علیحدگی اختیار کر کے ایک نیا گروہ بنالیا اور دل میں ٹھان لی کہ وہ گوتم اور اس کے گروہ کو برباد کر دے گا۔ اس نے خود بادشاہ اجات سترو کے ذریعہ چند آدمی متعین کر کے گوتم بدھ کو مارنے کے لیے تین دفعہ کوشش کی، لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

دیودت تو جلدی مر گیا لیکن شاہ اجات سترو گوتم کا جانی دشمن بن گیا۔ اس نے سراوستی پر جو بدھ مذہب کا صدر مقام تھا حملہ کر کے تباہی ڈالی اور کپل وستو کو بھی برباد کیا۔

گوتم بدھ چوالیسویں سال کا موسم برسات سراوستی گزار کر کدسکھر (قلعہ کرگس) کی طرف واپس آئے۔ وہاں سے امباپلی کی طرف چلے۔ امباپلی سے گوتم بدھ نے بیلوگھنک پہنچ کر پینتالیسویں سال کی برسات گزاری۔ مگر اس سال سخت بیمار ہو گئے اور موت کے آثار نظر آنے لگے، درویشوں کو بلایا اور کہا: اے درویشو! آج سے تین ماہ بعد ہم اس فانی دنیا سے کوچ کر جائیں گے۔ میری یہی نصیحت ہے کہ تم ثابت قدم رہنا اور اپنی خواہشات نفسانی پر ضبط رکھنا، جو شخص اس قانون اور تربیت کی پوری پابندی کرے گا وہ فلاح اور طمانیت قلب کو پائے گا۔

بیماری سے ذرا افاقہ ہوا تو کشتی نگر کی طرف روانہ ہوئے۔ پادی پہنچ کر چندا زرگر نے دعوت کی۔ گوتم کھانا کھانے سے فارغ ہو کر وہاں سے چل دیے۔ دریائے گلگشت کے کنارے پہنچ کر انھیں تھکان اور پیاس محسوس ہوئی۔ اپنے مرید انند سے پانی منگوا کر پیاس بجھائی۔ ندی میں غسل کیا اور وہاں سے کشتی نگر چل دیے۔ وہاں پہنچ کر موت کے آثار نظر آنے لگے۔

مریدوں کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ جب سے گوتم نے سنار چندا سے کھانا کھایا ہے اسی وقت سے بیمار ہو گئے ہیں۔ جب یہ الفاظ گوتم بدھ نے سنے تو اپنے پیارے مرید انند کو بلا کر کہا کہ میری موت کے بعد چندا سنار کے پاس جانا اور کہنا کہ گوتم کہتا تھا کہ اس کو کھانا کھلانے کا بدلہ اگلے جہان میں ملے گا اور کہنا کہ جن جن لوگوں نے کھانا کھلایا ہے ان میں سے دو شخصوں پر اللہ کی رحمت زیادہ ہوگی۔ ایک سوجات جس نے معرفت حقیقی حاصل ہونے سے قبل درخت دانش کے نیچے کھانا کھلایا تھا۔ اور دوسرا چندا جس نے موت سے پہلے کھانا کھلایا۔

گوتم درختوں کے جھنڈ کے نیچے بیٹھ گئے اور اپنی تجہیز و تکفین اور ان قواعد سے متعلق باتیں کرنا شروع کر دیں جن پر ان کے مریدوں کا چلنا ضروری تھا۔ جب انند نے دیکھا کہ ان کا معلم ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہو رہا ہے تو وہ مارے غم کے بیہوش ہوا جاتا تھا اور رو رو کر اپنی آتش غم کو بجھانے کی کوشش کرتا تھا جب گوتم بدھ نے انند کی اضطرابی کیفیت دیکھی تو بلا کر کہا: اے باصفا مرید! تمہاری مجھ سے بہت قربت رہی ہے اور تم ہمیشہ میرے فلسفہ پر ثابت قدم رہے ہو۔ اب بھی اسی فلسفہ کی پیروی کرنا، تم بھی دنیوی خواہشات اور قید

جہالت سے رہائی حاصل کرلو گے۔

گوتم پھر دوسرے مریدوں کی طرف متوجہ ہوا اور ان کے سامنے اللہ کی صفات گنائیں۔

اب گوتم کی حالت خراب ہونے لگی۔ مریدوں نے تیمارداری میں اپنی محبت اور خلوص کے پیمانے انڈیل دیے۔ تمام رات تیمارداری میں گزاری۔ نصف شب کے قریب ایک برہمن آیا۔ انند نے استاد کی حالت خراب دیکھ کر ملاقات کی اجازت نہ دی۔ جب گوتم بدھ کو علم ہوا تو برہمن فلاسفر کو بلایا اور اس کے تمام سوالات سنے۔ گوتم نے کہا: اب مباحثہ کا وقت نہیں ہے، میں اپنا فلسفہ بیان کر دیتا ہوں اس کو غور سے سنیں، وہ آپ کی ہدایت کا موجب ہوگا۔ گوتم نے کہا: دیکھو برہمن! حقیقی نجات طہارت اور تقویٰ کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔

برہمن کے چلے جانے کے بعد گوتم نے انند کو بلایا اور کہا: میرے بعد میرے مشن اور تعلیم کو لوگوں تک پہنچانا، اور اسی تعلیم کو اپنا مرشد اور معلم سمجھنا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص چان نامی کے لیے سزا تجویز کی، جس نے کسی معاملہ میں بے جا کلمات اپنی زبان سے نکالے تھے۔ یہ گوتم کا آخری کام تھا۔

اس کے بعد گوتم بدھ ایک یا دو گھنٹے خاموش رہے۔ پھر مریدوں کو پاس بلایا اور کہا کہ اگر کسی امر میں شک وشبہ ہو تو دریافت کرلیں۔ لیکن سب کی زبانیں بارے غم کے گنگ تھیں اور آنسوؤں کے دریا بہہ رہے تھے۔

پھر تھوڑی سی دیر کے بعد کہا: اے درویشو! یاد رکھو دنیا کی کل اشیاء پر فنا آنے والی ہے اس لیے تمھیں چاہیے کہ اپنے جذبات پر فتح پاکر حقیقی نجات حاصل کرو۔

یہ گوتم بدھ کے آخری الفاظ تھے۔ وہ اسی سال کی عمر ۴۸۸ ق م میں کسی تارا نامی مقام پر (گورکھپور کے علاقے میں) اپنی سال گرہ کے دن انتقال کر گئے۔ اس وقت تک بدھ مت مگدھ اور کوشل یعنی بہار صوبہ جات متحدہ اگرہ و اودھ میں پھیل چکا تھا۔

مریدوں میں گروہ بندی

گوتم بدھ نے مریدوں کو دو گروہ میں تقسیم کیا۔ پہلا گروہ درویشوں کا تھا اور دوسرا گروہ دنیاداروں کا۔ دونوں کو عمل کی تعلیم دی۔

درویشوں کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے حسب ذیل شرائط تھیں۔

۱۔ وہ کسی متعدی مرض اور عوارض ذی نوائب میں مبتلا نہ ہو۔

۲۔ کسی کا غلام اور مقروض نہ ہو۔

۳۔ داخلہ سے قبل والدین کی رضامندی حاصل کر لی ہو۔

۴۔ داخلہ سے قبل سائل کو سر منڈوانا پڑتا تھا اور نارنجی رنگ کے کپڑے پہن کر گوشہ نشینی اختیار کرنا

ہوتی تھی۔

- شراب نوشی کی قطعاً ممانعت تھی۔
- حصول رزق کے لیے دردر پھرنا پڑتا۔ بھیک مانگنے کا طریقہ تھا کہ سائل دروازہ پر جا کر کھڑا ہوتا۔ گھر والے جھولی میں ڈال دیتے تو لے لیتا ورنہ آگے چلا جاتا۔ جب کھانے کے لیے کافی ہو جاتا تو قیام گاہ کو چلا جاتا۔
- صبح صادق سے قبل اٹھ کر خانقاہ میں جھاڑو دینا ہوتا تھا۔ پھر گوشہ میں جا کر قلب کی طہارت کے لیے ذکر الٰہی میں مصروف ہونا ہوتا تھا۔
- خانقاہوں میں رہنا اور سادہ زندگی بسر کرنا ہوتی تھی۔

درویشوں کے تین کام تھے۔

- علم حاصل کرنا۔
- دنیاداروں کو تعلیم دینا۔
- نجات کے حصول کے لیے محنت کرنا

رویشوں کے مشاغل

درویش صبح صادق سے قبل اٹھتے خانقاہ کو صاف کرتے اور پھر ذکر الٰہی سے قلب طہارت کرتے، ی دیر کے بعد جھولی اٹھا کر اپنے سرکردہ کے ہمراہ بھیک مانگنے کے لیے چلے جاتے۔ واپس آ کر اس کے منے جھولی رکھ دیتے۔ پھر لکھنا پڑھنا شروع کر دیتے۔ اپنے استاد سے معرفت اور گیان کی باتیں دریافت تے۔ غروب آفتاب سے قبل دوبارہ خانقاہ کی صفائی کرتے اور چراغ روشن کرتے۔ بعدازاں اپنے سرکردہ تعلیمات کی طرف رجوع کرتے۔ فلسفہ گوتم پر غور فکر کرتے۔ گھر گھر علم پھیلاتے اور انسانوں کو قلبی طہارت تلقین کرتے۔

یاداروں کے کام

دنیاداروں کے تین کام تھے۔

۱۔ علم حاصل کرنا۔ ۲۔ فرائض خانہ داری کا ادا کرنا۔

زاہدوں کی خورد نوش کا بندوبست کرنا۔

تعلیمات بدھ

گوتم بدھ نے دونوں گروہوں کے لیے علیحدہ علیحدہ تعلیم دی ہے۔ درویشوں کے گروہ کے لیے جو منضبط کیا تھا وہ چھ حصوں میں منقسم ہے۔

۱۔ چار سرگرم مراقبے۔۲۔ چار بلیغ کوششیں۔۳۔ چار دینداری کے راستے۔ پانچ اخلاقی طاقتیں
۵۔ سات دانشیں۔۶۔ آٹھ اعلیٰ طریقے (بودھ مت ص ۶۱۔۶۳)

اب ان اصولوں کی تشریح کرتے ہیں۔

۱۔ چار سرگرم مراقبے

(الف) پہلا مراقبہ جسمانی کثافت پر۔
(ب) دوسرا مراقبہ پُرجوش حس کی پیدا کی ہوئی برائیوں پر۔
(ج) تیسرا مراقبہ خیالات کے عدم استقلال پر۔
(د) چوتھا مراقبہ ہستی کی حالتوں پر۔

۲۔ چار بلیغ کوششیں

(الف) پہلی کوشش برائیوں کی پیدائش کو روکنے کے لیے۔
(ب) دوسری کوشش موجودہ برائیوں کو دور کرنے کے لیے۔
(ج) تیسری کوشش غیر موجود نیکی پیدا کرنے کے لیے۔
(د) چوتھی کوشش پیدا کی ہوئی نیکی کو ترقی دینے کے لیے۔

۳۔ چار دینداری کے راستے

(الف) دیندار بننے کی خواہش۔
(ب) دیندار بننے کے لیے ضروری جدوجہد۔
(ج) دین دار بننے کے لیے دل کی ضروری تیاری۔
(د) دیندار بننے کے لیے تحقیقات۔

۴۔ پانچ اخلاقی طاقتیں

(الف) ایمان۔
(ب) تہمت۔
(ج) حافظہ۔
(د) تصور
(ہ) الہام (باطنی دانش)

۵۔ سات دانشیں

(الف) ہمت۔

(ب) حافظہ۔

(ج) تصور۔

(د) تحقیقات کتب مقدس۔

(ہ) نشاط۔

(و) استراحت۔

(ز) سلیم الطبعی۔

۶۔ آٹھ اعلیٰ طریقے

(الف) صدق و عقیدت۔

(ب) صدق ارادت۔

(ج) راست گوئی۔

(د) راست بازی۔

(ہ) حلال روزی۔

(و) عزم صمیم۔

(ز) سچی توجہ۔

(ح) صادق تصور

گوتم بدھ نے اس اعلیٰ وارفع ہشت پہلو راستہ کو دو انتہاؤں تن پروری اور تعذیب نفس کی درمیانی راہ قرار دیا ہے۔ ان دو حدوں سے الگ رہ کر انسان درمیانی راہ پر چل کر نورازل تک رسائی کر سکتا ہے۔ اسی کے فیض سے بصیرت، علم اور روشنی یعنی نروان پا سکتا ہے۔

یہ درمیانی راستہ چار خاص اصولوں سے نکالا گیا ہے۔ یعنی ۱۔ تکلیف۔ ۲۔ اسباب تکلیف۔ ۳۔ انسداد تکلیف۔ ۴۔ طریقہ انسداد تکلیف۔

۱۔ انسانی زندگی دکھوں اور مصائب سے مملو ہے۔

۲۔ ان دکھوں کا سبب خواہشات ہیں۔

۳۔ خواہشات سے اپنے آپ کو بچایا جا سکتا ہے۔

۴۔ اس کے لیے نہ تو سخت ریاضت کی ضرورت اور نہ ہی عیش پرستی کی۔ بلکہ درمیانی راستہ اختیار

کرنا چاہیے۔

بدھ فرماتے ہیں: اس طریق میں قدم رکھنے سے جملہ تکالیف کا خاتمہ ہوتا ہے۔ میں نے یہ طریقہ اس بات کو دریافت کرکے تلقین کیا ہے کہ پیکانِ غم کی کھٹک دل سے کیوں کر ہٹ سکتی ہے۔ تم کو خود اس معاملہ میں کوشش کرنی چاہیے۔ بدھ صرف تعلیم و تلقین کرتے ہیں جو ہوش مند اس طریق میں قدم رکھتے ہیں۔ وہ فریب دینے والوں کے دامِ تزویر سے آزاد ہو جاتے ہیں۔[1]

طریق مذکور میں چار مرحلے آتے ہیں۔

پہلا مرحلہ

جب چار ارفع اور اعلیٰ اصول تکلیف، اسباب تکلیف، انسداد تکلیف اور طریقہ انسداد تکلیف معلوم ہو جاتے ہیں تو وہ فلسفہ بدھ کا پیروکار ہو جاتا ہے۔

ان اصولوں کا علم حسب ذیل ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔

۱۔ نیکوں کی صحبت۔ ۲۔ قانون مذہبی کا سننا۔ ۳۔ محققانہ غور و خوض۔ ۴۔ نیکی کی مشق کرنا۔

دوسرا مرحلہ

جب انسان نفس امارہ اور غلط قسم کی دینی رسوم سے نجات حاصل کر لیتا ہے اس مرحلہ میں شہوانی جذبات اور مغالطہ کافی حد تک دور ہو جاتے ہیں۔

تیسرا مرحلہ

اس مرحلہ میں دل سے دنیاوی خواہشات کی میل اور نفس پرستی، حسد، بغض کافی حد تک دور ہو جاتا ہے اور شیطان کے پنجہ سے نجات حاصل کر چکتا ہے۔

چوتھا مرحلہ

یہ وہ مرحلہ ہے جب انسان کو مکمل طور پر گیان اور معرفت حاصل ہو جاتا ہے۔ طمانیت قلب کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے اور دنیا کی تمام اشیاء سے مستغنی ہو جاتا ہے۔

دنیاداروں کے واسطے دلپذیر اخلاقی نصائح

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ گوتم بدھ نے اپنے پیروکاروں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا۔ ایک دینداروں کا گروہ تھا۔ دوسرا گروہ دنیاداروں کا گروہ۔ پہلے گروہ کے لیے جفاکشی اور ریاضت کے قواعد وضع کیے اور دوسرے گروہ کو اخلاقی نصائح دیے۔

---

[1] رہنمایان ہند مترجم بابو رائن پرشاد ورما ص ۱۶۹ سنہ طباعت ۱۹۳۳ بار چہارم۔

۱۔ کسی جانور کو قتل نہ کریں۔
۲۔ نہ خود چوری کریں اور نہ کسی کو چرانے دیں۔
۳۔ زنا کاری نہ کریں۔
۴۔ ہر قسم کی دروغ گوئی سے اجتناب کریں۔
۵۔ مسکرات اور منشی اشیاء کے استعمال سے خود بھی پرہیز کریں اور دوسروں کو بھی شرابیں نہ پلائیں۔

دنیاداروں کے لیے حسب ذیل فرائض بیان فرمائے۔

۱۔ والدین اور اولاد کے فرائض

والدین کو چاہیے کہ وہ اپنی اولاد کو

۱۔ برے کاموں سے بچائیں۔
۲۔ نیکی کرنا سکھائیں۔
۳۔ علوم وفنون کی تعلیم دلائیں۔
۴۔ لڑکوں کے لیے شریف بیویاں اور لڑکیوں کے لیے شریف شوہر تلاش کریں۔
۵۔ ورثہ اور ترکہ دیں۔

اولاد کے فرائض

۱۔ والدین کی مدد کریں۔
۲۔ ان کے لازمی فرائض خانہ داری ادا کریں۔
۳۔ ان کے مال واسباب کی حفاظت کریں۔
۴۔ ان کے نیک اعمال کی پیروی کریں تاکہ وہ والدین کے حقیقی جانشین ثابت ہوں۔
۵۔ ان کی وفات کے بعد بھی ان کی یاد تعظیم وتکریم سے کریں۔

۲۔ شاگرد اور استاد کے فرائض

شاگرد کے فرائض

۱۔ شاگرد اپنے استادوں کی تعظیم وتوقیر کریں۔
۲۔ ان کے روبرو مودبانہ کھڑے ہوں۔
۳۔ ان کے نائب کی طرح کام کریں۔
۴۔ اس کے حکم کو مانیں۔
۵۔ ان کی حاجات کو رفع کریں۔

۶۔ ان کے پند و نصائح اور تعلیم پر پوری توجہ کریں۔

استاد کے فرائض

۱۔ شاگردوں کو ایسی تعلیم دیں جس سے ان کا علم دیرپا ہو۔
۲۔ اچھی باتیں سکھائیں۔
۳۔ انھیں عقل و شعور کی تعلیم دیں۔
۴۔ ان کے اور ان کے احباب اور اعزہ و اقارب کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں۔
۵۔ انھیں خطرہ سے محفوظ رکھیں۔

۳۔ شوہر اور زن کے فرائض

شوہر کے فرائض

۱۔ بیوی سے عزت کے ساتھ پیش آئے۔
۲۔ اس کے ساتھ ثابت قدم رہے۔
۳۔ اس پر مہربانی رکھے۔
۴۔ دوسروں سے عزت کرائے۔
۵۔ مناسب کپڑے اور زیورات دے۔

بیوی کے فرائض

۱۔ امور خانہ داری کو بہتر طور پر سرانجام دے۔
۲۔ خاوند کے رشتہ داروں کی عزت اور مہمان داری کرے۔
۳۔ خاوند کی عدم موجودگی میں اپنی عصمت کی حفاظت کرے۔
۴۔ کفایت شعاری سے کام لے۔
۵۔ تمام کام عقل اور ہوشیاری سے سرانجام دے۔

۴۔ دوستوں کے فرائض

۱۔ ان کو تحائف اور ہدیہ دے۔
۲۔ شائستگی کے ساتھ بات چیت کرے۔
۳۔ ان کی اغراض اور دلچسپی کو بڑھاتا رہے۔
۴۔ برابری کا سلوک کرے۔

۵۔ اپنی خوشی میں ان کو شریک کرے۔
۶۔ دوست کی عدم موجودگی میں اس کے مال واسباب اور گھربار کی نگرانی کرے۔
۷۔ خطرہ کی حالت میں اس کو پناہ دے۔
۸۔ غربت اور برے دنوں میں اس کا ساتھ دے۔
۹۔ اس کے اہل وعیال کے ساتھ مہربانی کے ساتھ پیش آئے۔
۱۰۔ تنہائی میں اس کی حفاظت کرے۔

۵۔ آقا اور ملازمین کے فرائض

آقا کے فرائض

۱۔ ملازمین کی طاقت کے مطابق ان سے کام کروائے۔
۲۔ ان کو مناسب کھانا اور مزدوری دے۔
۳۔ لطف وکرم کے ساتھ پیش آئے۔
۴۔ کاموں میں ان کا ہاتھ بٹائے۔
۵۔ کبھی کبھی انھیں تعطیل دے دیا کرے۔

ملازمین کے فرائض

۱۔ آقا کی دل وجان سے تعظیم کریں، جب آقا آئے تو کھڑے ہو جائیں۔
۲۔ اس کے استراحت فرمانے کے بعد سونے کو جائیں۔
۳۔ آقا جو کچھ دے اسی پر قناعت کرلیں۔
۴۔ خندہ پیشانی سے ٹھیک ٹھیک کام کریں۔
۵۔ آقا کو اچھے کلمات سے یاد کریں۔

۶۔ دنیاداروں اور دینداروں کے فرائض

۱۔ دنیادار دینداروں کی محبت کے ساتھ اطاعت وعزت کریں۔
۲۔ ان کی ضرورتوں کو رفع کریں۔

دینداروں کے فرائض

۱۔ نیک کاموں کی ہدایت کریں۔
۲۔ برے کاموں سے روکیں۔
۳۔ انھیں مذہب کی تعلیم دیں۔

۴۔ ان کے شکوک رفع کریں۔
۵۔ انھیں حقیقی نجات کا راستہ دکھائیں۔
۶۔ ان پر مہربانی کی نظر رکھیں۔

فلسفہ بدھ کا مرکزی نقطہ

بدھ کی تعلیم کا مرکزی نقطہ نروان کا حصول ہے اگر گوتم بدھ کے نزدیک ہر برائی کی جڑ خواہش نفسانی ہے۔ جب انسان خواہشات نفسانی کی سرکش اونٹنی کو اطاعت الٰہی کی چھری سے ذبح کر دیتا ہے اور اپنے آپ کو اللہ کی صفات میں رنگین کر لیتا ہے تو اس وقت اس کی روح اللہ کی روح سے اتصال کر جاتی ہے گوتم بدھ اس حالت کا نام نروان رکھتا ہے۔

گوتم بدھ کا خدا، روح، فرشتے، قیامت اور حیات بعد الموت کے متعلق عقیدہ

گوتم بدھ کے متعلق عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ وہ خدا، روح، فرشتوں، قیامت اور حیات بعد الموت کے عقیدہ کے منکر ہیں۔ یہ خیال حقائق کی روشنی میں بالکل بے بنیاد اور غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ گوتم بدھ نے ویدک دھرم کے تصور خدا اور روح کا انکار کیا ہے۔ ویدک دھرم میں روح کو ازلی، ابدی اور غیر متغیر مانا جاتا ہے اور خدا کو ہمہ اوست تصور کیا جاتا ہے۔ بدھ ان نظریات کا مخالف تھا۔

اس خیال کی تردید بدھ مت کی کتب اور اشوک کے کتبات کی روشنی میں کی جائے گی۔ اشوک کے کتبات گوتم بدھ کی اصلی تعلیم کو معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔

خدا کے متعلق گوتم بدھ کا عقیدہ

جب گوتم بدھ کو درخت دانش کے نیچے بدھ کا رتبہ ملا، تو وہ پکار اٹھے۔

''اے کالبد خاکی کے بنانے والے! جب تک میں نے تجھے نہیں پایا تھا، مجھے بہت سی حیات و ممات میں گزرنا پڑتا تھا اور وہ سب دردانگیز حالتیں تھیں۔ مگر اب میں نے تجھے دیکھ لیا ہے، مجھے امید ہے تو اس کالبد خاکی کو پھر نہ بنائے گا۔ دل نے دولت نروان حاصل کی۔ تمام خواہشیں فنا ہو گئیں۔'' (دھرم پد ۵۔۱۵۳)

پرنسپ جو کہ اشوک کے کتبوں کا پہلا پڑھنے والا محقق ہے۔ جب ستونی کتبہ ہفتم اور دھولی کتبہ دستیاب ہوئے تو ان کتبوں میں تین جگہ ایسانا (Isana) کا ذکر آتا ہے، جس کے معنی ایشور کے ہیں۔ پرنسپ نے واضح طور پر ایسانا پڑھ کر اس کے معنی خدا کے لیے ہیں۔ اس نے کتبہ دھولی کو یوں پڑھا۔

''خدا (ایسانا) پر ایمان لاؤ اور اس کی ہستی کا اقرار کرو کیونکہ وہی اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کی جائے۔'' (دھولی کا پہلا کتبہ)

آرتھر للی اپنی کتاب "Buddism in Christendom" میں یہ اقتباس دینے کے بعد لکھتا ہے کہ اشوک کے وقت کے برہمن خدا تعالیٰ کو ایسانا کہتے تھے۔ (ص ۲۱۹)

ایک دفعہ گوتم بدھ نے فرمایا: ''جب کوئی حق کو قبول کرے۔ پاک صاف زندگی گزارے بے حد محبت بھرا دل رکھتا ہو، جو سب تک بلاتفریق پہنچے۔ وہی برہما کے وصال کو حاصل کرنے کے قریب ہے۔ وہ موت کے بعد جب جسم فنا ہو جائے گا برہما سے جا ملے گا، جو ہمیشہ یکساں ہے۔'' (تیوی جاستا Tevi jjasutta)

ایک اور حوالہ ہے۔ کسی نے بدھ سے پوچھا: کیا آپ برہما کے دیش کو جانتے ہیں؟ جواب دیا: ''ہاں برہما کو میں جانتا ہوں۔ ویستھا (Vasettha) یعنی برہما کے دیش اور اس تک پہنچنے کی راہ مجھے معلوم ہے، بالکل ایسے جس طرح کوئی خود اس میں داخل ہو چکا ہو اور اس کو لے کر پیدا ہوا۔

برہما اپنشدوں میں خدائے واحد و برحق کا نام ہے۔

تے وگا ستا میں برہما یعنی ہستی باری تعالیٰ آسمانی بادشاہت، حیات بعد الموت، بقائے روح اور وصال خدا کا ذکر واضح الفاظ میں موجود ہے۔ (مکالمات بدھ از رائس ڈیوڈن صفحہ ۳۱۹)

روح کے متعلق عقیدہ

گوتم بدھ روح کے تغیر پذیر اور بقا کا عقیدہ رکھتے تھے۔ شردھے پرکاش دیو جی لکھتے ہیں: ''جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے جسم کی مثال جو کہ عناصر میں خلط ملط ہو جاتا ہے۔ اس مہمان کی سی ہے۔ جو میزبان سے رخصت ہوتے وقت اس کے گھر کے تعلقات کو زمانہ گزشتہ کی بات سمجھ کر وہیں چھوڑ جاتا ہے۔ لیکن اس کا آتما (روح) نہیں مرتا، بلکہ ایک اعلیٰ زندگی پاتا ہے جس میں تمام رشتوں کی اصطلاحیں ختم ہو جاتی ہیں۔'' (بدھ دیو جی کی سوانح عمری حصہ سوئم ص ۱۸۲ از شردھے پرکاش دیو جی)

تے وگا ستا میں لکھا ہے۔

''میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ یہ لوگ ویدوں کو خواہ کتنا ہی پڑھیں لیکن وہ تمام خوبیاں اور کام جن کے باعث کوئی شخص حقیقی برہمن کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ ان میں نہیں پائے جاتے...... یہ کب ممکن ہے کہ ان کا آتما (روح) جو موہ کے جال میں پھنسا ہوا ہے۔ اس جسم کو چھوڑ دینے کے بعد برمھ کے ساتھ مل جائے گا۔'' آگے فرمایا: ''میں چونکہ برمھ کو جانتا ہوں اور اس کی بادشاہت میں بسا ہوا ہوں۔ اس لیے اس کے وصال کا راستہ میرے سوا کوئی نہیں بتا سکتا۔'' (مکالمات بدھ از رائس ڈیوڈس ص ۳۰۰، ۳۲۰)

گوتم بدھ اپنے ایک شاگرد کے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:۔

''ہاں حقیقت میں ایک ایسا آنند دھام اور سورگ موجود ہے۔ مگر وہ ملک روحانی ہے اور ان کو ہی نصیب ہوتا ہے جو لوگ روحانی ہیں۔ تمہارا بیان تو بہت اچھا ہے۔ لیکن آنند دھام کے جلال کو پورے طور سے ظاہر کرنے کے لیے کافی نہیں۔ دنیا کے لوگ اس کا دنیاوی طور پر ذکر کرتے اور دنیاوی استعارے اور الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن وہ پوتر بھومی جس میں پوتر آتما (مقدس روح) رہتے ہیں۔ اس قدر اعلیٰ اور خوبصورت ہے کہ جس کو تم اپنے گیان میں بھی نہیں لا سکتے اور نہ اس کو بیان کر سکتے ہو۔ اس پوتر بھومی میں وہی پہنچ سکتا ہے۔ جس کا آتما راستی کی لامحدود جوتی سے پُر ہو گیا ہے۔'' (بدھ دیو جی کی سوانح عمری حصہ دوم ص ۱۶۲-۱۶۴)

فرشتوں کے متعلق عقیدہ

اشوک دیوتاؤں یعنی فرشتوں کا قائل تھا۔ بدھ لٹریچر میں دیوتاؤں کا ذکر اکثر آتا ہے۔ "کی وڈھا ستا" میں ہے کہ سمٰوت اعلیٰ علیین تک دیوتاؤں سے معمور ہیں۔ سب سے اوپر برہما کا عرش اور اس کے دیوتا ہیں۔" (مکالمات بدھ ص ۲۸۰۔۲۸۱)

بدھ صحیفہ میں لکھا ہے کہ ایک سورگی دیوتا جس کا چہرہ روشن اور لباس برف کی مانند سفید تھا۔ ایک برہمن کی شکل میں گوتم کے پاس آیا اور اخلاقیات کے متعلق چند سوال کیے۔ جواب شافی پا کر سلام کیا اور غائب ہو گیا۔ (بدھ دیو جی کی سوانح عمری حصہ سوم ص ۴۷ از شردھے پرکاش دیو جی)

ایڈورڈ کونز جو کہ بدھ لٹریچر کا مسلمہ عالم ہے وہ کہتا ہے کہ بدھ لٹریچر میں دیوتاؤں کو ہندو میتھالوجی کے مطابق نہیں مانا گیا بلکہ فرشتوں کا درجہ دیا گیا ہے۔ گوتم بدھ یہ بھی مانتے ہیں کہ سادھو پرش یعنی مقدس لوگ ترقی کر کے دیوتا بن جاتے ہیں۔

اشوک اپنے چھوٹے سنگی کتبہ میں کہتا ہے:۔

"میرے مذہب میں پورے جوش وخروش سے کام کرنے کی وجہ سے میری مملکت کے طول وعرض میں وہ لوگ جو دیوتاؤں سے اپنا تعلق توڑ چکے تھے۔ دوبارہ انھوں نے دیوتاؤں سے اپنا تعلق جوڑ لیا۔ یہ سعی و کاوش اور جدوجہد کا ثمرہ ہے۔"

قیامت کے متعلق عقیدہ

اشوک قیامت کا قائل تھا۔ سنگی کتبہ چہارم میں لکھا ہے:۔

"بادشاہ کے بیٹے، پوتے اور پروتے بھی دھرم کی پابندی کو تاقیامت ترقی دیتے رہیں گے۔"

"میری اولاد اور جانشین اگر تاقیامت میرا اتباع کریں تو وہ قابل ستائش کام کریں گے۔ لیکن جو اس فرض کا ایک جزو بھی ترک کر دے گا، وہ فعل قبیح کا مرتکب ہوگا۔" (سنگی کتبہ پنجم)

حیات بعد الموت

اشوک کے دریافت یافتہ کتبوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اشوک حیات بعد الموت کا قائل تھا۔ سنگی کتبہ ششم میں اشوک کہتا ہے:۔

"میں اپنی مساعی سے اور اپنے کام کی رفتار سے کبھی مطمئن نہیں رہتا، کیونکہ میں ساری دنیا کی خبر گیری (بھلائی) اپنے لیے مقدس فرض سمجھتا ہوں تاکہ میں کچھ لوگوں کے لیے اس دنیا میں خوشی کا باعث بن سکوں اور تاکہ لوگ دوسری دنیا میں بہشت حاصل کر سکیں۔"

سنگی کتبہ دہم میں لکھا ہے:۔

''میری جتنی مساعی ہیں وہ عقبیٰ کے لیے وقف ہیں تا کہ لوگ قید گناہ سے آزاد ہو جائیں۔''

تیرھویں چٹانی کتبہ میں لکھا ہے:۔

''یہ فتح جو حاصل ہوئی ہے۔ ہر جگہ محبت کی فتح کہلائے گی اور یہ محبت دھرم کی فتح کے ذریعے سے حاصل ہوئی ہے۔ بادشاہ کی رائے میں وہ محبت بہت اہم ہے جو آخرت میں کام آئے۔ اس فتح کو سچی فتح سمجھنا چاہیے جو دھرم کے ذریعے حاصل ہو۔ ایسی فتح سے دنیا اور عاقبت دونوں سُدھر جاتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ لوگ ریاضت سے محبت کریں کیونکہ اس سے دنیا و عقبیٰ دونوں میں فائدہ ہے۔''

کتبہ نہم (کانسی) میں لکھا ہے۔

''عام رسومات اور تقریبات اسی دنیا میں ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن دھرما کے طور وطریق وقت کی قید سے آزاد ہیں۔ اگر کوئی شخص اس دنیا میں دھرما کی غایت کو حاصل نہ کر سکے تو کوئی بات نہیں، آنے والی دنیا اسے غیر منقطع انعام سے نوازے گی۔ لیکن اگر کوئی اس غرض و غایت کو اس دنیا میں بھی پایا جاتا ہے تو ہم خرما و ہم ثواب وہ اس دنیا میں ہی کعبۂ مقصود تک پہنچ گیا اور دھرما کے آئین کی وجہ سے آخرت میں بھی وہ بے پایاں انعام کا پانے والا ہو گا۔''

ڈاکٹر رادھا کمود مکر جی ایم اے اپنی کتاب ''اشوکا'' میں لکھتے ہیں:

''اشوک کے مذہب میں سے ایک عقیدہ آخرت (پرلوک) کے بارے میں تھا۔ جس کا بار بار اس کے کتبوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا اس بات پر بھی اعتقاد تھا کہ آئندہ جہان میں ''سورگا'' یا خوشی وطمانیت اس دنیا میں ''دھرما'' پر عمل کرنے کے باعث ہی مل سکتی ہے۔ وہ بہشت کو ابدی خیال کرتا تھا۔ اور نتیجۃً روح کو غیر فانی (چنانچہ وہ گیارھویں چٹانی فرمان میں اس امر کو ''انیم تم پونم پراسادتی، یعنی غیر منقطع روحانی انعام'' کے الفاظ میں بیان کرتا ہے) بیان کردہ قدروں کے مطابق اشوک آئندہ جہان کو انتہائی نقطۂ عروج اور زندگی کا مقصد سمجھتا تھا۔''

پھر لکھتے ہیں:۔

''اشوک چونکہ سورگ پر اعتقاد رکھتا تھا۔ اس لیے وہ چٹانی کتبہ چہارم میں موت کے بعد ملنے والی روحانی نعماء کا نقشہ کھینچتا ہے اور یوں وہ لوگوں کو نیکی کی ترغیب دیتا ہے۔'' (ص ۷۵)

ڈاکٹر مکر جی نے گوتم بدھ کا بھی ایک حوالہ دیا ہے۔ یہ بتانے کے لیے کہ اس بارہ میں اشوک کا وہی عقیدہ تھا جو گوتم بدھ کا تھا۔ گوتم بدھ کہتے ہیں:

''ایک نیکوکار گرہستی آئندہ جہان میں ایک دیوتا کی شکل میں جنم لے گا۔'' (مجھم نکائے)

رائس ڈیوڈس مکالمات بدھ میں لکھتا ہے:۔

''کوتاونتاستا میں لکھا ہے کہ حقیقی قربانی کرنے والا شخص جسم کے چھوڑنے کے بعد فردوس بریں میں بحالت مسرت دوبارہ جنم لے گا۔'' (مکالمات بدھ از رائس ڈیوڈس ص ۱۸۱)

تناسخ یا کرم کے متعلق عقیدہ

موجودہ بدھ مت کا ہندوازم سے متاثر ہو کر یہ عقیدہ ہے کہ ہر روح کو نروان حاصل کرنے کے لیے تناسخ کے چکر میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اشوک اس عقیدہ کا قائل نہیں تھا۔ وہ نروان حاصل کرنے کے لیے عبادت، روزہ، خیرات اور اعمال صالحہ کو ضروری خیال کرتا تھا۔

ڈاکٹر رادھا کمود مکر جی لکھتے ہیں:۔

''اشوک اپنے ستونی فرمان چہارم میں گناہوں کی بخشش کے متعلق اپنے عقیدہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ ایسے مجرم جن کو موت کی سزا دی جا چکی ہو وہ روزہ رکھ کر اگلی دنیا میں خوشی و مسرت حاصل کر سکتے ہیں۔'' (اشوکا ص ۷۵)

چنانچہ اشوک ستونی کتبہ چہارم میں کہتا ہے:۔

''میں نے یہ بھی حکم دے دیا ہے کہ ایسے مجرموں کو جنھیں سزائے موت دی گئی ہے۔ تین دن کی مہلت دی جائے۔ اس مدت میں یا تو ان کے اعزہ راج یوگوں سے رحم کی درخواست کر کے ان کی سزا معاف کرا لیں یا وہ روحانی موت سے بچنے کے لیے خیرات کریں گے اور روزے رکھ رکھ کر عقبیٰ کے لیے تیار ہوں گے۔ میری خواہش ہے کہ قید کی حالت میں بھی وہ آخرت سدھارنے کی کوشش کریں اور میری تمنا ہے کہ میری رعایا میں مذہبی امور کی پابندی ضبط نفس اور سخاوت ترقی کرے۔''

سنگی کتبہ دہم میں بادشاہ کہتا ہے:۔

''دیوتاؤں کے محبوب بادشاہ کی جتنی مساعی ہیں وہ آخرت کے لیے ہیں تاکہ بہت سے لوگ اس قید سے آزاد ہو جائیں جسے گناہ کہتے ہیں۔ مگر یہ امر اُمراء و غرباء دونوں کے لیے مشکل ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ سخت ریاضت کریں۔''

اسی کتبہ میں لکھا ہے:۔

''دھرم کی نعمت لاثانی ہے۔ یعنی دھرم پہچاننا''...... دھرم میں حصہ لینا اور دھرم کو اپنانا اس سے بڑھ کر کوئی قابل قدر چیز نہیں۔ جو شخص ان تمام امور کو بجا لاتا ہے وہ اس دنیا میں آسودہ رہتا ہے اور آخرت میں بے پایاں روحانی مدارج دھرم کی نعمت کی بدولت حاصل کرتا ہے۔''

ستونی کتبہ اوّل میں لکھا ہے:۔

دھرم کی شدید محبت بے انتہا معرفت نفس عظیم اطاعت شدید تقویٰ اور بے پایاں قوت عمل کے بغیر

دنیا اور عقبیٰ کا حاصل کرنا سخت مشکل ہے۔"

کتبات کی ان عبارتوں کی روشنی میں موجودہ بدھ مت کا عقیدہ تناسخ باطل ہو جاتا ہے۔ اشوک کے نزدیک نروان کے حاصل کرنے کا ذریعہ عبادت، اعمال صالحہ، روزہ اور خیرات ہیں۔ یہی وہ تعلیم ہے جو گوتم بدھ کی تھی۔

بدھ مت کی مقبولیت کا راز

۱۔ بدھ ایک شاہی خاندان کا فرد تھا۔ معاشرہ کو صحیح خطوط پر چلانے کے لیے وہ خود میدان عمل میں آیا۔ گدائی اختیار کی۔ لوگوں کے دکھوں میں شریک ہوا۔ ان کی ذہنی پستیوں کو دور کرنے کے لیے ہمت بندھائی۔ شاہی خاندان کا فرد ہونا، پھر خود عالم باعمل ہو کر لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف بلانا عوام میں مقبولیت کا ایک بڑا سبب ہے۔

۲۔ بدھ نے جس وقت اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا، اس وقت تمام ہندوستانی معاشرہ ذات پات کی لعنت کے نیچے دبا ہوا تھا۔ برہمن باوجود بداعمالیوں کے ایک مقدس وجود تصور کیا جاتا تھا۔ شودر باوجود نیک ہونے کے معاشرہ میں دھتکارا ہوا خیال کیا جاتا تھا۔ وہ ہر قسم کے ظلم وستم کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ قانون میں اس کی کوئی دادرسی نہ تھی۔

عورت کی بھی کوئی قدر و منزلت نہ تھی۔ لڑکی کی پیدائش بدشگون خیال کی جاتی تھی اور لڑکے کو آسمانی نور سمجھا جاتا تھا۔

گوتم ہندوستان کے پہلے مذہبی راہنما ہیں۔ جس نے ذات پات کی تقسیم کے خلاف اور عورت کی عزت کو برقرار کرنے کے لیے آواز اٹھائی اور ایسے مذہب کی بنیاد ڈالی جس میں ہر ذات کا آدمی اور عورتیں شامل ہو سکتی ہیں اور ان کے برابر حقوق تھے اور یہ اعلان کیا کہ "آدمی اپنے اعمال سے برہمن ہوتا ہے، پیدائشی نہیں۔ حسب نسب، پیدائش اور لٹیں رکھنے سے کوئی برہمن نہیں ہوتا بلکہ برہمن وہ ہے جو راست کار ہو۔ وہی مبارک اور سعدت مند ہے۔" (دھم پد)

۳۔ ہندوستان میں مکتی حاصل کرنے کے لیے بے معنی تپیاؤں اور سخت قسم کی ریاضتوں کا رواج تھا۔ ہندوستان کے جنگل بے شمار سادھوؤں سے اٹے پڑے تھے، جو نروان حاصل کرنے کے لیے اپنے جسموں کو طرح طرح کی اذائیں پہنچاتے تھے۔ پہلے گوتم نے خود بھی ان ریاضتوں پر عمل کیا، لیکن حقیقی نروان حاصل نہ کر سکا۔ آخرکار نورِ قلب حاصل کرنے کے لیے ان بے معنی ریاضتوں کو ترک کیا اور ایسا راستہ اختیار کیا۔ جس سے نفسانی خواہشات جو دکھوں اور مصیبتوں کا ذریعہ ہیں مٹ سکیں۔ جس راستہ پر گوتم خود چلے اور دوسروں کو چلنے کی تلقین کی، اس پر پہلے بحث

ہو چکی ہے، یہ درمیانی راستہ تھا۔ اس راستہ پر چلنے سے نہ تو اس وقت کی مروجہ ریاضتوں میں گزرنا پڑتا تھا اور نہ اتنی سہولت اور تن آسانی تھی کہ آدمی کو اپنی خواہشات ختم کرنے کے لیے کسی قسم کی قربانی نہ کرنی پڑے۔

۴۔ گوتم بدھ کی بعثت سے قبل تمام ہندوستان ظاہری رسومات اور مابعدالطبعیاتی نظریات کی موشگافیوں میں الجھا ہوا تھا۔ مقدس گنگا میں ایک اشنان تمام گناہوں کے دھونے کے لیے کافی خیال کیا جاتا تھا۔ سینکڑوں مقدس مقامات کی زیارت کے لیے ہر قدم بھگوان اور مکتی کو قریب لانے کا ذریعہ خیال کیا جاتا تھا۔

گوتم بدھ نے ان ظاہری رسوم اور مابعدالطبعیاتی نظریات کی الجھنوں سے نکال کر ایک ایسی سیدھی سادی اخلاقی تعلیم پیش کی، جس کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا آسان تھا۔

۵۔ بدھ مذہب کی کامیابی کا ایک بڑا سبب اس وقت کے امراء اور راجوں کا اس مذہب کو قبول کر لینا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مذہب کی اشاعت اور ترویج میں سیاسی طاقت کو بھی کافی دخل ہے۔ حکومت رومی میں جس وقت قسطنطین نے عیسائی مذہب قبول کیا۔ اس وقت عیسائیت تمام ملک میں پھیل گئی۔

بدھ مذہب کی تعلیمات کی تدوین

بدھ مذہب کی موجودہ تعلیمات چھٹی قبل مسیح سے دوسری صدی عیسوی تک مرتب ہوتی رہیں۔ اس دوران میں چار مجالس منعقد ہوئیں۔ جن میں باہمی غور و خوض اور نظر و فکر کے بعد تعلیمات کو مرتب کیا گیا۔

پہلی مجلس

گوتم بدھ کی وفات کے فوراً بعد راج گڑھ کے مقام پر پانچ سو راہنماؤں کی ایک مجلس منعقد ہوئی تا گوتم بدھ کی تعلیمات اور عقائد کو مرتب کیا جائے اس میں سے تین شاگرد منتخب کیے گئے تاکہ وہ گوتم بدھ کی تعلیمات ضبط تحریر میں لائیں۔ اپالی نے رسوم و اخلاق سے متعلق حصہ کو منضبط کیا۔ انند نے معتقدات کے متعلق گوتم کے ارشادات کو پیش کیا۔ تیسرے نے ضابطہ زندگی سے متعلق تعلیم کو بیان کیا۔

ان تینوں حصوں کو ترپٹا کا کہتے ہیں۔ اکثر جدید محققین اس مجلس کے انعقاد کو مشکوک گردانتے ہیں۔ اختلاف کے بارہ میں اگسٹ کارل ریشاور (August karl reishawar) کہتا ہے:۔

”یہ بات تعجب خیز نہیں کہ گوتم بدھ کی وفات کے بعد اس کے پیرو باہم اپنے ہادی کی تعلیمات کے بارے میں مختلف الخیال ہو گئے۔ روایات کے مطابق ان امور کو طے کرنے کے لیے بڑی کونسلیں منعقد ہوئیں۔[1]

---

[1] The Great Religions fo the Modern World P.106.

دوسری مجلس

گوتم بدھ کی وفات سے ایک سو سال بعد دیسائی کے مقام پر منعقد ہوئی تاکہ بدھوں کے مختلف فرقوں کے متضاد رسوم اور عبادات کو دور کیا جائے۔ چنانچہ دس نکات طے کیے گئے لیکن مقدس پاشا نے ان کو ناجائز قرار دیا، جس پر اس کو برادری سے خارج کر دیا گیا۔ لیکن اس نے بعض بڑے راہبوں کے اتفاق رائے سے ان دس اصولوں کو غلط قرار دیا۔

تیسری مجلس

تیسری مجلس ۲۴۴ ق م میں اشوک نے اپنے جلوس سے انیس سال بعد پاٹلی پتر میں طلب کی، تاکہ فرقہ وارانہ اختلاف کو دور کیا جا سکے۔ اس کی صدارت مگالی پتہ لسانے کی، جس کو شمالی تصانیف میں اُپا گپت کہا گیا ہے۔ کونسل کے اجلاس کے بعد بدھ مذہب کی اشاعت کے لیے تبلیغی کوششیں تیز تر ہو گئیں۔ ہند کے مختلف حصوں اور ہمسایہ ریاستوں میں مبلغ بھیجے گئے۔

اس مجلس نے ساٹھ ہزار بھکشوؤں کو الحاد کے الزام میں بدھ مت سے خارج کر دیا۔[1]

چوتھی مجلس

راجہ کنشک کے عہد میں اسکی زیر سرپرستی ایک مجلس منعقد ہوئی۔ راجہ کنشک سن عیسوی کی پہلی صدی کے اختتام پر سندھ، کابل، کشمیر، قندھار وغیرہ کا حکمران بتایا جاتا ہے۔ اس مجلس کے انعقاد کا مقصد یہ تھا کہ بدھ مذہب کے اصولوں کے صحیح مطالب بیان کیے جائیں۔

کونسل کے مقام کے متعلق دو مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت کے مطابق فیروز پور میں اور دوسری کے مطابق کشمیر میں منعقد ہوئی۔ یہ مجلس واسومترا کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس نے متنازعہ فیہ مسائل پر قابل وثوق فیصلے دیے۔ اس میں تقریباً پانچ سو علماء نے حصہ لیا۔ اس مباحث کے نتائج کو تانبے کے ٹکڑوں پر کندہ کرا کر ایک استوپہ میں دفن کر دیا گیا، جو اسی غرض کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔

بدھ مذہب کی کتب

یہ ایک مسلمہ حقیقت کہ بدھ نے اپنے پیچھے کوئی لکھی ہوئی کتابیں نہیں چھوڑیں۔

مسٹر وارڈ لکھتا ہے:۔

The Budha (like Jesus) left behind him no written works."

یعنی بدھ نے حضرت یسوع کی طرح اپنے پیچھے کوئی تحریری ضابطہ نہیں چھوڑا۔

---

[1] The Great Religione of the Modern World by rev. J. Freeman.

باوجود اس تاکید کے جو بدھ نے اپنے شاگردوں کو کی تھی: ''سیکھو جو کہا گیا ہے، اسے مضبوط پکڑلو، دل میں اس کو بٹھالو۔'' (مجھمہ ۲:۱۹۹)

بدھوں کا یہ عقیدہ ہے کہ بدھ کے شاگردوں نے اپنے استاد کے ملفوظات اور تقاریر کو از بریاد کرلیا اور پھر مندرجہ بالا حکم کی بناء پر نہایت دیانت داری سے دوسروں کو پہنچادیا۔ اگر الفاظ یاد نہیں رہے تو مفہوم ان کے حافظوں میں ضرور محفوظ رہا ہے۔

مختلف اوقات میں جو مجلسیں منعقد ہوئیں اور بدھ مت کے فرقوں کے اصولی اختلافات اس امر پر بین ثبوت ہیں کہ زبانی روایات میں تحریف و تبدل ضرور ہوا ہے۔

بدھ مذہب کے صحیفے اس کی وفات کے صدیوں بعد مرتب ہوئے۔ اس کی وجہ سے یہ کہنا مشکل ہے کہ جو باتیں ان صحائف میں درج ہیں وہ گوتم بدھ کی کہی ہوئی ہیں یا نہیں۔ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ دونوں فرقے جن کی کتب گوتم کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، سراسر مختلف ہیں۔

ہنا ئنا (Hynayana) فرقہ کی کتب

ہنا ئنا فرقہ کے تمام بنیادی اصول اور عقیدے شاید تیسری کونسل میں طے ہو گئے تھے لیکن یہ بھی دو صدی بعد تک لکھے نہ گئے تھے۔ یعنی بدھ کی وفات کے تقریباً چار سو پچاس سال سے زیادہ عرصہ بعد یہ پالی زبان میں لکھے گئے تھے۔ یہ تی پٹاکا (Pitaka) یا ترپٹاکا (تین ٹوکرے) پر مشتمل ہیں۔ ان کے الگ الگ نام ہیں:۔

۱۔ ونیہ پٹاکا (Vinaya pitaka) جس میں وہ ضوابط درج ہیں۔ جو پروہتوں کے لیے بدھ نے مقرر کیے تھے۔

۲۔ سُتاپٹاکا (Sutta pitaka) جو بدھ کے ملفوظات اور وعظوں پر مشتمل ہے، اس کی پانچ فصلیں ہیں۔ (الف) فنائے عظیم کا سُتا (The sutta of the great deccase) (ب) مجھمہ نکایا (Majjhima nikaya) (ج) سم یوتا نکایا (Samyutta nikaya) یہ راست کاری کے پہیے کو محرک کرنے کے وعظ پر مشتمل ہے۔ (د) انگوترا نکایا (Anguttara nikaya) (ذ) کھدکا نکایا (Khuddaka nikaya) اس میں اور باتوں کے علاوہ جتاکا (Jataka) یعنی (The birth stories) پیدائش کا حال۔ تویجاسُتا (Tevijja sutta) اور دھمہ پدا (Dhamma pada) اور سُتا نپتا (Sutta niputa) شامل ہیں۔

۳۔ ابھی دھماپٹاکا (Abhi dhamma pitaka) جس میں بدھ مت کا دینی فلسفہ اور نفسیات ہے۔

ان تینوں کتب کی بنیاد ان روایات پر رکھی گئی تھی جو راج گرھ کے مقام پر منعقدہ مجلس میں بیان

ہوئی تھیں۔ ایک شاگرد کسیاپا (Kasyapa) نے گوتم کے فلسفیانہ اقوال لوگوں کے سامنے پیش کیے جو بعد میں ''ابھی دھمہ'' (Abhi dhamma) کے نام سے مشہور ہوئے۔ دوسرے شاگرد اوپالی (Upali) نے ضبط و نظم کے اصول حاضرین کے سامنے پیش کیے جو بعد میں ونایا پٹکا (Vinaya putaka) کے نام سے موسوم ہوئے اور انند نے گوتم بدھ کی ان تقاریر اور مواعظ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جو گوتم نے وقتاً فوقتاً کی تھیں، جو بعد میں سُتا کہلائیں۔

تری پٹکا کے تین حصوں میں ستا پٹکا (Sutta putka) کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اس حصے میں گوتم کے اقوال جمع کیے گئے ہیں۔ اس مذہب کے پیروکار اس حصے کو خاص طور پر یاد کرتے ہیں۔ جو افراد اس کو یاد نہیں کر سکتے ان کے لیے اس کا ایک خلاصہ تیار کیا گیا ہے جو دھمہ پد (Dhamma padas) کے نام سے مشہور ہے۔ جس کے معنی نیکی کی راہ کے ہیں۔

یہ کتاب بدھ مت کی تعلیمات کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ دھمہ پد کی تدوین کی تاریخ متعین کرنا بہت مشکل امر ہے۔ لیکن یہ امر یقینی ہے کہ یہ کتاب اشوک کے زمانے میں موجود تھی۔ دھمہ پد میں راج گاہ اور ویسالی (Vesali) میں منعقدہ کونسل ۳۷۷ ق م کا ذکر پایا جاتا ہے۔ لیکن اشوک کے عہد کی منعقدہ مجلس کا کوئی ذکر نہیں۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب پہلی دو کونسلوں کے بعد اور اشوک کے عہد سے پہلے کے درمیانی وقفہ میں لکھی گئی۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ جیمس گرے نے کیا ہے۔

ان کتب کی زبان پالی ہے جو بعد میں وجود پذیر ہوئی۔ گوتم بدھ اس زبان میں کلام نہیں کرتا تھا۔ بدھی کہتے ہیں کہ گوتم کے اقوال علماء کی بھرپور مساعی سے ترجمہ ہو کر ہم تک پہنچے ہیں مگر مسز رائس ڈیوڈ کہتی ہے: ''بدھ پتا کا میں کہیں ایسے راویوں اور حفاظ کا ذکر نہیں۔'' (ساکیہ مصنفہ مسز رائس ڈیوڈ صفحات ۳۶۰، ۳۸۴، ۳۸۹)

اس کتاب کو قرون اولیٰ میں کبھی مستند تسلیم نہیں کیا گیا۔ راج گاہ کی کونسل کی روئیداد میں پورن راہب کا اس نسخہ کو مستند قبول کرنے سے انکار موجود ہے۔ مجلس کے ممبران نے مستند قرار دیا ہے۔ مگر اس نے اپنے نسخہ کو اس پر ترجیح دی۔ (Geden's studies) (گیڈنز سٹڈیز حاشیہ ص ۳۲۳ ہسٹری آف پالی لٹریچر مصنفہ بی سی لا پی ایچ ڈی ایم اے بی ایل کی تمہید اور باب اوّل)

مہاین (Mahayana) فرقہ کی کتاب

مہاین فرقہ کی مذہبی کتب ہناین کی پالی کتابوں کے بخلاف ترتیب سے عاری ہیں۔ وہ چار زبانوں سنسکرت، چینی، تبتی اور جاپانی میں ہیں۔ ان میں سے اکثر کا متن سنسکرت میں ہے۔ مہاین بدھ مت کی کتب کا بیشتر حصہ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ کچھ حصے بہت پرانے ہیں تاہم رقہ ہناین کی کتب سے زیادہ پرانے نہیں۔ ان میں سے مشہور ڈی مند سترا (Dimond sutra)۔ ۲۔ لنکاوتر استرا (Lanka vatara sutra)۔ ۳۔ قانون کامل کا پدم (The lotus of the perfect law)۔ ۴۔ سورنکما سترا

(Surangama sutra)۔۵۔ سکھاوتی یوہا سترا (Sukhavati uyuha sutra)۔۶۔ بیداری ایمان (The awakening of the faith) ہیں۔

بدھ مت کے فرقے

گوتم بدھ کی وفات کے معاً بعد جو مجلس منعقد ہوئی تھی۔ اس کے نتیجہ میں بدھ مت دو فرقوں میں منقسم ہو گیا: ایک کا نام مہاسنگی کاس اور دوسرے کا نام ستھاور داونس تھا آخر الذکر فرقے کے بطن سے ایک اور فرقہ سرواستھیو اونس پیدا ہوا۔ تیسری مجلس یعنی اشوک کے عہد تک بدھ مذہب اٹھارہ فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔

بدھ مذہب کی اقسام

عام طور پر بدھ مذہب کے دو بڑے فرقے بیان کیے جاتے ہیں۔ یہاں ان کے متعلق بحث کی جائے گی۔

مہانی بدھ مت

کنشک نے اپنے عہد میں ایک مجلس بلائی اور ایک نئے فرقے کی بنیاد رکھی، جس کا نام مہایان یعنی ''بڑی گاڑی'' رکھا۔ جس سے مراد یہ تھی کہ اس ''بڑی گاڑی'' میں سوار ہو کر بہت سے افراد نروان تک سفر کر سکتے ہیں۔

فرقہ مہایاں کے عقائد

۱۔ ایک حقیقت اعلیٰ کا تصور دیا گیا ہے جس سے کائنات کا وجود ہوا۔

۲۔ مہاتما بدھ ایمان کو نجات کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

۳۔ تصاویر اور بتوں کے استعمال کی اجازت دی گئی اور رحم کی دیوی کو بدھ مت میں وہی مقام حاصل ہے جو عیسائیت میں حضرت مریم علیہ السلام کا ہے۔

۴۔ نروان کا حصول سب کے لیے ضروری قرار دیا بلکہ اگر کوئی نروان حاصل نہ کر سکے تو وہ لوگوں سے رحم دلی، شفقت اور محبت سے پیش آئے اور ان کی خدمت کرے۔

۵۔ فرقہ مہایاں نے دوزخ اور جنت کا تصور پیش کیا جس سے اس فرقہ کے پیروکاروں میں جنت کے حصول کی خواہش پیدا ہوئی۔

مہانی فرقہ کے نزدیک بدھ کا جسم نہ تھا، بلکہ وہ بالاتر از انسان تھا۔ ساکیہ منی کبھی دنیا میں مجسم نہیں ہوا، بلکہ اس نے اپنا اوتار اور ظل دنیا میں ڈالا۔ بدھ خود ہی خدا ہے، بلکہ دائمی و ازلی خدا ہے[1] یہ اوتار بدھ

[1] لٹریری ہسٹری آف سنسکرت بدھ ازم مصنفہ جی کے نریمان ص ۵۔

اور علم کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے اور بدھی بھی خود تین صورتوں میں ظاہر ہوئی، وہ صورتیں یہ ہیں:۔

۱۔ دھرم کایا: بدھی کے ظہور کی پہلی صورت دھرم کایا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی عارضی نمو کے پیچھے ایک دائمی اور غیر فانی شے موجود ہے۔

۲۔ نرمان کایا: دھرم کایا جب خود کو ظاہر کرنا چاہتا ہے تو کوئی شکل اختیار کر لیتا ہے یہ بدھ کی دوسری شکل ہے۔

۳۔ سمبھوگ کایا: بدھی کے ظہور کی تیسری صورت سمبھوک کایا ہے، جس کے لفظی معنی ''جسم رحمت'' کے ہیں۔ وہ رحمت کی قوت ہے جو بدھی میں جاگزین ہے اور گوتم کی معرفت اس کے مقتدیوں میں کام کرتی رہتی ہے۔ یہ قوت بدھ دھرم کی محافظ قوت کی حیثیت رکھتی ہے۔[1]

بدھی ستیوا کا تصور

یہ فرقہ بدھی ستیوا (Bodhisative) کو ہی زندگی کا بلند ترین نصب العین قرار دیتا ہے۔ یعنی ایک شخص نجات کے لیے پختہ ہونے کے باوجود اسے قبول کرنے سے انکار کر دے تاکہ دوسروں کو نجات حاصل کرنے میں ضروری مدد بہم پہنچا سکے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے نیک اعمال کو دوسروں کے نام منتقل کرنے کی عظیم قربانی دینے تک تیار رہے۔ لہٰذا اس فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ بدھی ستیوا کے اختیار میں ہے کہ دوسروں کو مآل گناہ سے بچانے کے لیے وہ نیابت کا کام بھی کر سکتا ہے۔ یہ فرقہ نجات بالایمان پر عقیدہ رکھتا ہے۔

اس فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ بدھی ستیوا آسمان سے مفلوک الحال، مصیبت زدہ لوگوں کی طرف نظر رکھتے ہیں اور ان کو ہر قسم کی مصیبت اور غم سے نجات دلاتے ہیں۔ ان کی اس کریمانہ عادت کو مہا کرونا (Maha karuna) کہا جاتا ہے۔ وہ لوگوں کو حصول نجات کے طریقوں سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ جن پر چل کر وہ نروان حاصل کر سکیں۔

اس فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ گوتم ہی بدھی ستیوا نہ تھے بلکہ آپ سے پہلے بھی بے شمار بدھ ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ گوتم بدھ نے بھی یہی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ دگانستا میں بدھ کا فرمان ان الفاظ میں درج ہے:۔

''تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس دنیا میں ہر زمانہ میں ایک تتھاگت (ریفارمر) پیدا ہوتا ہے جو کہ عالم کل، مکمل طور پر بیدار نیکی اور حکمت پر حاوی، عالمین کی حکمتوں سے مسرور، دیوتاؤں اور انسانوں کا استاد، بابرکت وجود اور ایک بدھ کے مقام پر فائز۔ وہ اس کائنات کے اسرار کو مکمل طور پر سمجھنے اور اسے روبرو دیکھنے والا ہوتا ہے۔ اس جہان کے اوپر جو عالمین ہیں یعنی ملائک، شیاطین اور برہما کی اقالیم وہ ان سب کو جانتا ہے اور نیچے کی دنیاؤں کو جن میں برہمن، نیک لوگ، شہزادے اور عوام بستے ہیں۔ ان سے بھی وہ واقف ہے۔ تب

[1] کارل کلیمن ''مذاہب عالم'' ص ۳۱۳۔

وہ اس علم سے دوسروں کو بھی مستفیض کرتا ہے۔" (تے وگا ستاص ۴۰ بحوالہ بدھ کتب مقدسہ ص ۳۱۶)

ایک شخص نے بدھ سے کہا: "اے آقا! آپ جیسا عارف دنیا میں کوئی نہیں ہے، نہ پہلے کبھی ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔"

یہ سن کر بدھ نے جواب دیا: "اے ساری پُتر! تم مبالغہ کرتے ہو۔ تم ان تمام ہادیوں کے بارے میں کہ جو پہلے ہو چکے ہیں یا جو آئندہ پیدا ہوں گے یا جواب موجود ہیں کیا جانتے ہو؟ صرف لاعلمی کی وجہ سے تم میری اس قدر تعریف کرتے ہو۔" (مہاپری زبان سوتر کا ص ۱۳ بحوالہ بدھ دیو جی کی سوانح عمری حصہ دوم ص ۱۲۵)

پھر فرمایا: میں ہی ایک بدھ نہیں ہوں جو زمین پر مبعوث ہوا ہوں، اور نہ میں آخری بدھ ہوں۔ وقت مقررہ پر ایک دوسرا بدھ دنیا میں مبعوث ہوگا۔ (گاسپل آف بدھ از کاروس ص ۲۱۷)

بدھ مت والوں نے تین بدھی ستواؤں کو تسلیم کیا اور ان کی پرستش کی جاتی ہے:۔

۱۔ میتریا (Maitreya) جس کے معنی رحم کے ہیں۔ مہایان کے عقیدے کے مطابق گوتم پانچ ارب سڑسٹھ کروڑ سال کے بعد اس دنیا میں پھر آئیں گے اور اپنے عقائد اور تعلیمات کی اشاعت کریں گے۔ میتریا کے بہت سے پتھر کے بت بنائے جانے لگے۔ اس کی مورتی اس طرح بنائی جاتی کہ ایک موٹا تازہ آدمی ہے جو ہنس رہا ہے۔ تمام آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں گل دستہ ہے جس کا ہر پھول ایک ہزار سال کو ظاہر کرتا ہے، جو گوتم نے جود و کرم اور رحم دلی کے کاموں میں گزارے ہیں۔ دوسرے ہاتھ میں ایک تھیلا ہے۔ جس میں بہت سی عمدہ چیزیں ہوتی ہیں، جو دنیا میں آنے کے بعد لوگوں میں تقسیم کی جائیں گی۔[1]

۲۔ منجوسری (Menjusri) اس کے لفظی معنی حیرت انگیز اور مبارک کے ہیں۔ یہ عقل کا مجسمہ ہے۔ اس کی بھی مورتی تیار کی جائے گی۔ اس کی پیشانی پر پانچ بل دکھائے جاتے ہیں، جن سے گوتم کی عقول خمسہ کا اظہار مطلوب ہوتا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے۔ کبھی گوتم بدھ کا نواں پیشرو کہا جاتا ہے اور کبھی ان کا لاڈلا اور محبوب شاگرد اور پیارا بیٹا بتایا جاتا ہے۔ اس کو بدھی ستیو اؤں میں ہمیشہ تفوق حاصل رہا ہے۔

۳۔ اولوکیسٹسوارا (Avalokistesvara) اولوکیتا (Avalokita) یہ سب سے زیادہ مکرم و محترم بدھی ستوا ہے، جس کی عبادت دور دراز علاقوں میں کی جاتی ہے۔ اولوکیسٹسوارا رحم اور مہربانی کا مجسمہ ہے۔ انسانیت کو مصائب کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے ہر وقت سرگرم عمل ہے جو شخص اس پر کامل بھروسہ اور اعتماد جما لیتا ہے۔ وہ اس کی دلگیری اور مدد کرنے میں بڑی سے بڑی مصیبت سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہتا ہے۔

[1] انسائیکلو پیڈیا مذہب ص ۲۴۱۔

اولوکیتشوارا کی پوجا برصغیر ہندو پاک میں تیسری سے بارھویں صدی تک عام تھی۔تبت میں اسے دلائی لامہ کا نام دے دیا گیا، جس کا ذکر آگے آئے گا۔ چین کے لوگ اس سے بہت بعد میں روشناس ہوئے ہیں۔ آٹھویں صدی عیسوی سے قبل چین میں اس کی پرستش کے آثار نہیں ملتے۔ یہاں اس کو نسوانی شکل دی گئی اور کوان نون (Kwan noon) کہتے ہیں۔[1]

بدھی ستیوا کے عقیدہ کے نتائج اور اثرات

۱۔ اس عقیدہ نے بدھ مذہب میں شرک کو جنم دیا۔ گوتم بدھ کو ازلی اور دائمی خدا بنا دیا اور اس کے ساتھ اور بھی بے شمار اوتار ہیں جو انسانوں کو مصیبت کے چنگل سے نجات دلاتے ہیں اور راہ مستقیم کی ہدایت دیتے ہیں۔

۲۔ نروان کو حاصل کرنے کے لیے نیک اعمال کے بجائے بدھی ستیواؤں پر عقیدہ ہی کو کافی سمجھا جانے لگا۔ اس طرح عمل کی جگہ بے عملی نے لے لی۔

۳۔ بدھ مت میں عبادت کا کوئی ظاہری طریقہ رائج نہیں تھا۔ اس عقیدہ نے عبادات کے ظاہری طریقے مقرر کر دیے۔ بدھی ستیوا معبود بن گئے۔ خانقاہیں مندر بن گئیں۔ راہب پروہتوں کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ عبادت کی رسومات میں پیچیدگیاں اور سختیاں پیدا ہونے لگیں۔ بدھی ستیوا کی ولادت اور وفات کے دن شان و شوکت سے منائے جانے لگے۔ اس دن عبادت اور مقررہ رسوم ادا کی جاتیں۔

۴۔ بدھی ستیوا کو بدھ کا مظہر قرار دیا اور بدھ کو اعلیٰ حقیقی شے قرار دیا جو دوسری دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ دہیانی بدھ (Dhyani bhuddha) ہے، جس سے پانچ دہیانی بدھی ستیوا پیدا ہوئے۔ ہر دہیانی بدھ اور بدھی ستیوا کے مقابلہ میں ایک نسوانی ہستی کے عقیدہ نے بھی جنم لے لیا اور یہ دعویٰ کیا گیا کہ ہر بدھی ستیوا کے لیے اس دنیا میں ایک انسانی بدھ موجود ہے۔

۵۔ اخلاقی اور عملی تعلیم کی جگہ دقیق اور بعید از فہم فلسفہ نے لے لی۔ گوتم کے خیالات کی تشریحات و توضیحات کی جانے لگیں۔ مثلاً گوتم بدھ کے نزدیک انسانی وجود مصائب و آلام سے گھرا ہوا ہے اور اس میں تین چیزیں شامل ہیں۔

۱۔ رنج و الم (۲) عارضی ہونا یا انیکا (Annica) یعنی دنیا فانی ہے اور کسی چیز کو قرار نہیں۔ (۳) غیر حقیقی ہونا یا اناتھا (Anatha) یعنی تمام چیزیں غیر حقیقی ہیں، کیونکہ اگر حقیقی ہوتیں تو پردہ فنا میں نہ جاتیں۔ ان صفات کی تشریح میں وہ کچھ کہا گیا ہے اور لکھا گیا ہے جو احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ سب سے زیادہ بحث تیسری صفت ''اناتھا'' یا غیر حقیقی ہونے پر کی گئی۔ اناتھا کا مفہوم سنیاتا

[1] انسائیکلو پیڈیا مذاہب و مذاہب ص ۴۰۔

(Sunyata) بیان کیا گیا۔ جس کے معنی ہیں "خالی ہونے" کے۔ یعنی دنیا کی تمام چیزیں صفات سے خالی ہیں، اور دنیا ویسی نہیں جیسی کہ ہم دیکھتے ہیں۔ ایک طبقہ کا عقیدہ یہ ہو گیا کہ دنیا کا وجود صرف ہمارے ذہن میں ہے، خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اب گوتم کی بتلائی ہوئی صفات کی جگہ تین اور صفتوں نے لے لی، وہ صفتیں یہ ہیں:۔ (۱) خالی ہونا، سنایا (Sunya) (۲) بے صفت ہونا، انی متھا (Animitha) (۳) بغیر خواہش کے ہونا، اپرانہیلا (Apranihila)۔

مہایان کی تقسیم

فلسفیانہ اعتبار سے مہایاں کو دو گروہوں میں منقسم کیا۔ وادیا مدھیا مک ۲۔ وجناں وادیا یوگا چار۔

مدھیا مک: بدھ مت کے ۷۰۰ سو سال بعد بدھوں میں ایک بڑا بھکشو پیدا ہوا وہ بھکشو اسری گھوش کا شاگرد تھا۔ ناگ ارجن نے بدھ مت کی تعلیم پر ایک گرنتھ لکھا۔ جس کو دوازش وکیہ شاستر کہا جاتا ہے یہ اس فرقے کا سب سے خاص گرنتھ ہے۔ یہ فرقہ خارجی دنیا کے مطلق وجود اور ادراک سے انکار کرتا ہے۔ ناگ ارجن کے نزدیک حقیقت مطلق ہست ہے نہ عدم۔ تیتیہ کا مطلب سراب ہے۔ اس وجہ سے یہ فرقہ خارجی دنیا کے مطلق وجود اور ادراک سے انکار کرتا ہے۔ یہ چیزیں نظر آتی ہیں۔ ان میں نہ روح (جوہر) ہے نہ سچائی۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے نہ وہ پیدا ہوتی ہیں اور نہ فنا۔ نہ ان کا ظہور ہوتا ہے۔ نہ عدم وہ صرف وہم اور وجود بے بود ہے گوتم بدھ کہتا ہے انسانوں کی جو ضعیف الاعتقادی ہے کہ نظر آنے والی سب چیزیں حقیقت میں اسی ضعیف الاعتقادی کو ختم کرنا نظریہ شنیہ ہے۔

وجناں وادیا یوگا چار: اس فرقہ نے حقیقت اعلیٰ کی معرفت کے لیے عملی یوگا کو اپنایا۔ اس گروہ کے نزدیک تمام اشیاء مشہور ہیں۔ مکتبہ فکر روح کو تمام زندہ ہستیوں پر محیط خیال کرتا ہے۔

ہنا ئنا (Hynayana) فرقے کے عقائد

ہنا ئنایا جنوبی فرقے کی تعلیمات کا خلاصہ ہے، نہ آتما ہے نہ پرماتما ہے، یعنی خدا ہے نہ روح۔ بھکو ناردا اپنی تصنیف بدھ ازم میں لکھتا ہے: "اس (مہا ئنا) کے خلاف ہنا نا کا فرقہ خدا اور الہام دونوں کا منکر ہے۔" اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ بدھ انسان تھا۔ انسان کی طرح پیدا ہوا تھا۔ انسان کی طرح زندہ رہا اور مرا۔ گو وہ انسان تھا، پر ایک غیر معمولی صفات کا حامل تھا۔ جو بدھوں کی اصطلاح میں اجار یہ منش کہلاتا ہے۔

اس فرقے کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ مستقل ہستی کا نظریہ ایک فریب محض ہے۔ ہستی بے ربط اور عارضی عناصر سے وجود میں آئی اور خواہش سے ہی قائم ہے۔ ان کے عقیدے کی رو سے نروان کا مطلب ان عارضی عناصر کو مٹانا اور خود کو مکمل طور پر فنا کرنا ہے، یعنی مطلق نیستی۔

یہ فرقہ نجات کے لیے عمل اور خود اعتمادی پر بہت زور دیتا ہے۔ پری نبھان سُتا میں بدھ کا قول ہے۔ ''تم خود اپنے جزیرے بنو اور خود اپنے لیے پناہ بنو۔ دوسروں میں پناہ تلاش نہ کرو۔''
یہ فرقہ بدھ مت کی قدیم روایات عقائد اور خانقاہی نظام کا حامل ہے۔ خانقاہی نظام میں داخل ہونے والوں کے لیے گوتم بدھ کا ضابطہ اخلاق پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

فرقہ ہنیان کے دو گروہ

ویبھا شک: یہ دھڑا خارجی دنیا اور ذہنی مظاہر کی حقیقتوں کو تسلیم کرتا ہے اس کے مطابق نظریہ ثنیہ غلط ہے۔ انھیں پرتیکشا واردی یا حقیقت پسند کہا جاتا ہے یہ مکتبہ روح اور مادہ دونوں کو مانتا ہے۔
سوتر اشک: اس مکتبہ فکر نے معرفت کو تسلیم کیا ہے اور کہا ہے اگرچہ خارجی دنیا (مابعد الطبیعیاتی دنیا) کا شعور نہیں کیا جا سکتا لیکن صادق لوگوں کی شہادت سے خارجی دنیا کا استنباط کیا جا سکتا ہے۔ سوتیرا شکوں کا یہ نظریہ ہے کہ علم خود اشکار ہے اور اسے ثابت کرنے کے لیے کسی چیز کی ضرورت نہیں یہ ایک چراغ کی مانند خود افروز وخود درخشاں ہے۔

بدھ فرقوں میں فساد اور اختلاف کی وجوہات

۱۔ بدھ فرقوں میں اختلاف اور فساد کی وجہ پالی زبان ہے، جس میں یہ صحیفے لکھے گئے اس زبان کی قواعد اس قدر مہمل ہے کہ ہر ایک عالم اپنے خیال کے مطابق تشریح و توضیح کر سکتا ہے۔

۲۔ بدھ تعلیمات کی تصحیح اور حفاظت کے لیے سو سو سال کے وقفہ کے بعد تین مجلسیں منعقد ہوئیں۔ پہلی تین مجالس کے وقت اگرچہ رسم الخط موجود تھا، لیکن بدھ کی تعلیم کو احاطہ تحریر میں بہت ہی کم لایا گیا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بدھ کی تعلیمات کو کتابی صورت میں لانے کا کام بدھ کے ایک طویل عرصے کے بعد کیا گیا۔ پتا کا راجہ اشوک کے زمانے میں بھی لکھی ہوئی موجود نہ تھی۔ کیستھ کہتا ہے کہ اشوک کے دو سو سال بعد سُتا پتا کا احاطہ تحریر میں آئی بلکہ اس کا ایک حصہ دوسری صدی مسیحی میں مکمل ہوا۔

تاریخی طور پر بھی یہ بات ثابت ہے کہ ہندوستان میں ایک ہزار سال کا پرانا نسخہ کوئی موجود نہیں۔ مسٹر اے برنل (A.Burnel) جس نے سب سے پہلے بدھ مت کے قدیم نسخوں کو جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس کا یہ فیصلہ ہے کہ ہندوستان میں آج کل ایک ہزار سال کا پرانا نسخہ کوئی نہیں ہے بلکہ ۵۰۰ سال کا بھی پرانا کوئی نسخہ نہیں ہے۔
کہتے ہیں کہ گوتم بدھ نے خود فرمایا تھا کہ میرے بعد یکے بعد دیگرے پانچ چیزیں گم ہوں گی۔ ان میں سے ایک اس کی تعلیم کا گم ہونا ہے۔ چنانچہ بدھ کہتے ہیں کہ ایک وقت بدھ راجہ اعلان کرے

گا جسے بدھ کی چار سطریں یاد ہوں وہ ہاتھی پر لدے ہوئے سونے کے ڈبے میں بند ۱۰۰۰ روپیہ حاصل کرے۔ مگر شہر میں تین چار مرتبہ منادی کے بعد بھی کوئی بدھ نہ لے سکے گا۔

ہنائنا اور مہائنا فرقوں کے عقائد پر تنقید

اسلامی نقطہ نگاہ سے مروجہ بدھ مت میں بے شمار قابل اعتراض باتیں شامل ہوگئی ہیں۔ ہنائنا یعنی جنوبی بدھ مت ہستی باری تعالیٰ، وجود روح اور وحی الہام کا منکر ہے۔ مہائنا فرقہ نے بدھ کو ہی خدا قرار دے دیا ہے اور اس کے ساتھ دوسرے بہت سے دیوتاؤں کی پرستش لازمی قرار دے دی ہے۔ ہر جگہ بدھ مت نے مقامی توہم پرستی اور رسوم کو بھی اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ اس طرح مروجہ بدھ مت رسوم، بت پرستی اور بزرگوں کے تبرکات کی پرستش اور رہبانیت کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے جو سراسر منفیانہ طرز عمل ہے۔ خدا، روح، حیات بعد الموت سے انکار، فنائے مطلق کو نروان قرار دینا اور رہبانیت، یہ زندگی سے فرار ہے۔ اس عمل سے نہ تو انفرادی اصلاح ہوتی ہے اور نہ سماجی اصلاح اور فلاح۔

اسلام نہ صرف ان غلط عقائد کی اصلاح کرتا ہے بلکہ کامل نظریہ حیات پیش کرتا ہے جو انفرادی اور معاشرتی زندگی کی اصلاح اور فلاح کا ضامن ہے۔

اسلام کے نظریات پر بحث ''اسلام'' کے عنوان کے ضمن میں آئے گی۔

بدھ پرستی

گوتم بدھ کے انتقال کے بعد جب رسوم میت ادا کی جا چکیں۔ تو ان کے جسم کی راکھ، ہڈیاں، دانت اور بال وغیرہ محفوظ کر لیے گئے۔ انھیں گنبد کی وضع کی عمارتوں میں رکھا گیا۔ جنھیں ''استوپ'' کہتے ہیں۔ سیلون کے ''استوپ'' داگوبا اور برما وغیرہ کے پیگوڈ کہے جاتے ہیں۔ ایشیا میں لاکھوں ''استوپ'' ہیں چونکہ گوتم بدھ کے اتنے بال اور ہڈیاں نہیں ہیں۔ اس لیے ان میں سے بہتوں میں بت، مقدس تحریریں یا مناجاتیں رکھی گئی ہیں۔ استوپوں کا طواف کیا جاتا ہے۔ ان پر پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ یہ گویا بدھ کے آثار جسم کی پوجا ہے۔ اس طرح کی پوجا نیز استوپوں کا تعمیر کرانا۔ حفاظت کرنا۔ بدھ کا دھیان کرنا، بھکشوؤں کو کھلانا یہ سب باتیں موجب ثواب ہیں اور نروان کے حصول میں مدد ملتی ہے۔

بدھ مت کی اشاعت اور ماحول کے مطابق تبدیلیاں

ہر ملک میں جہاں جہاں بدھ مت پھیلا ہے وہاں کے عقائد اور روایات بدھ مت کا جزو بنتے چلے گئے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ''اپنی توسیع کے دوران وہ (بدھ مت) بڑے تغیرات سے گزرا اور بعض اوقات تو اس میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوئیں لیکن اس طرح بحیثیت مجموعی بدھ مت دراصل ایک مذہب کے بجائے

مذاہب کا خاندان ہے۔ عملاً اس نے مقامی مذاہب وعقائد کے ساتھ مصالحت کے ذریعہ اپنا راستہ پیدا کیا۔ اکثر اوقات اس طرح مختلف عقائد میں امتزاج کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس میں بدھ مت کے خصوصی وامتیازی عنصر کا پتہ چلانا مشکل ہے۔ مزید برآں چین اور جاپان جیسے ممالک میں بدھ مت کے بیشتر پیرو ساتھ ساتھ اپنے اصل قومی مذاہب کے بھی وفادار تھے۔ جس کے باعث یہ معلوم کرنا دشوار ہوتا تھا کہ بدھ مذہب کے معنی کیا ہیں۔"[1]

چین کی قوم پرست حکومت کی وزارت اطلاعات کی رائے یہ ہے:۔

''چین کا بدھ مذہب جو ہندوستان سے پہلی صدی کے بعد داخل ہوا تھا اصل بدھ مذہب سے بہت کم مشابہت رکھتا ہے۔ متعدد مقامی قصص، روایات، رسوم اور فرائض کا بدھ مذہب اضافہ کر دیا گیا ہے تا کہ اس کو گہرا چینی رنگ دیا جا سکے۔''[2]

جزیرہ نمائے ملایا میں بدھ مت کا حال سنئے:۔

''بدھ مذہب جزیرہ نمائے ملایا خصوصاً جزیرہ جاوا میں بھی شائع ہو گیا، جہاں بدھ مذہب کی ایک عظیم ترین یادگار باربوڈ ویر (barbodoer) پائی جاتی ہے۔ اس عظیم الشان عمارت کے آثار دراصل پتھروں پر سوال و جواب کے ذریعے مذہبی تلقین کا ایک نادر نمونہ ہے، جس کی ہر جماعت میں بھگتوں کو ایک نئی چیز کی تعلیم ملتی تھی۔ ان جزائر میں ان ہندو نو آبادکاروں کے ذریعے پہنچا، جن کی بڑی تعداد ظاہر ہے کہ ان علاقوں سے آئی تھی جہاں بدھ مذہب مہایانا بدھ مت اور ہندو مذہب کا مخلوط مجموعہ تھا۔ گو ہیانا بدھ مت کی خصوصیات بھی بالکل معدوم نہیں ہیں۔ اسلام کی آمد اور اشاعت نے بدھ مت کو بتدریج یہاں سے محو کر دیا۔[3]

ہندوستان میں اس کی داستان یہ ہے:۔

''واقعہ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں تاگر جونا اور اسنگا کے زمانہ سے بدھ مت کے عقیدہ میں زبردست احیاء ہوا تھا۔ اس کے بعد ہندو اور بدھ فلسفہ میں جو فرق تھا وہ بتدریج دھندلا ہو گیا۔''[4]

ایک اور مصنف لکھتا ہے:

''بدھ مذہب نے بہرحال ایک آزاد مذہب کی حیثیت سے اپنے لیے مقام پیدا کر لیا اور کئی صدیوں تک ہندوستان کے بڑے حصہ کا غالب مذہب رہا لیکن وہ بھی بالآخر ہندو مذہب سے گھل مل گیا۔''[5]

''ہندوستان کی تاریخ میں ایک زمانہ ایسا تھا کہ برہمنی اور بدھ دیوتاؤں میں اس درجہ میل ہو گیا کہ

---

1. The Great Religions of the Modern World P.9.
2. The China hand book P.29.
3. The Great Religions of the Modern World P.7.
4. India and China by Pain kar P.48.
5. The Great Religions of the Modern World P.91.

خود محققین بھی اس زمانے کے مندروں کی بمشکل تفریق کر سکتے ہیں اور اسی مندر کو کبھی بدھسٹ کہتے ہیں اور کبھی برہمنی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ایک ہی زمانہ کی عمارتوں میں بدھ اور برہمنی مندر ایک دوسرے کے پہلو میں نظر آتے ہیں۔ اگر ہم اپنے متخیلہ کو اس قدیم زمانے تک پہنچائیں۔ جبکہ برہمنی اور بدھ مذہب آپس میں شیر و شکر ہو رہے تھے اور ان میں التباس پیدا ہوتا تھا تو ہماری سمجھ میں بخوبی آ سکتا ہے کہ اس زمانہ کے پادشاہ اپنے روپیہ کو ان دونوں مذاہب کی یادگاروں میں ایسی فیاضی سے صرف کرتے تھے جیسے یورپ کے ازمنہ متوسط میں کوئی بادشاہ مختلف عیسائی فرقوں کے گرجوں کی تعمیر کراتا تھا۔''[1]

نیپال میں اس کی داستان سنیئے:

''پس نیپال کا ملک بدھ مذہب کے قدیم گہواروں میں ہے اور یہ مذہب یہاں دو ہزار سال سے رائج ہے اگرچہ اس ملک کے ہندوستان سے علیحدہ ہونے کے سبب یہاں بدھ مذہب قائم رہ گیا ہے۔ لیکن یہ علیحدگی مذہب کو ان تغیرات سے نہ بچا سکی جو اس میں برہمنی مذہب کی ہمسائیگی کی وجہ سے وقوع میں آئیں اور جنھوں نے بالآخر اسے برہمنی مذہب میں ضم کر دیا۔۔۔۔۔ نیپال میں جو حالت بدھ مذہب اور برہمنی مذہب کی ساتویں صدی میں تھی وہ اس وقت بھی موجود ہے۔ یعنی یہ علیحدہ تو ہیں لیکن ان دونوں میں وہ اتحاد اور ایک دوسرے کی رواداری پائی جاتی ہے جو اس وقت تمام ہندوستان میں تھی اور جو بدھ مذہب کے ختم ہو جانے کے ماقبل کی حالت تھی۔ ان دونوں مذاہب کا اتحاد اس درجہ پر ہے کہ اس وقت نیپال میں مندر، دیوتا اور مذہبی مراسم ایسی موجود ہیں جو دونوں فرقوں میں مشترک ہیں۔''[2]

مختلف ممالک میں بدھ مذہب کی اشاعت کی تاریخ

ہندوستان میں اشاعت

بدھ مذہب اپنی سادہ اور اخلاقی تعلیم کی وجہ سے ہندوستان میں تیزی سے پھیلنا شروع ہو گیا۔ اس مت کو قبول کرنے کے لیے ہر کس و ناکس کے لیے دروازہ کھلا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تین سو قبل مسیح یہ مذہب پورے شمالی ہند پر غالب آ گیا۔ پھر اس کے بعد دو بدھی بادشاہوں اشوک (۲۷۳ ق م تا ۲۳۲ ق م) اور کنشک کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ اشوک نے اس کو سرکاری مذہب قرار دیا۔ اس کی اشاعت کے لیے باہر مبلغ بھیجے۔ ستونوں اور کتبوں پر تعلیم کی اشاعت کی۔ بے شمار برہمن اور راہب اس مذہب میں داخل ہو گئے ان کو اس مذہب سے پوری واقفیت حاصل نہ تھی، اس وجہ سے بدھ مت میں بداعتقادیاں پھیلنا شروع ہو گئیں۔ اشوک نے ان بداعتقادیوں کو دور کرنے اور تعلیم کی تصحیح کے لیے تیسری کونسل طلب کی۔

---

1. تمدن ہند اردو ترجمہ مصنفہ ڈاکٹر گستاؤلی بان ص ۲۷۷، ۲۷۸۔
2. تمدن ہند اردو ترجمہ ص ۲۷۸، ۲۸۹۔

اشوک کے بعد کنشک نے اس مذہب کو اور بھی ترقی دی۔ اس نے بودھوں کی چوتھی کونسل منعقد کرائی۔ جس میں مذہبی کتب لکھی گئیں۔

آٹھویں صدی عیسوی تک ہندوستان کے کونے کونے میں یہ مذہب پھیل گیا۔ اس کے بعد تنزل اور ادبار کا شکار ہوا۔ جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

تبت

تبت میں بدھ مت ساتویں صدی عیسوی میں پہنچا۔ سرانگ سان گیمپو (Srong tsan gampo) نامی راجا کی ذاتی مساعی سے یہ مذہب تبت میں پھیلا اس نے ایک وفد ہندوستان میں بھیجا۔ مہایانی نظریات تبت میں مقامی رنگ کے ساتھ قبول کر لیے گئے۔ ابتدائی سو سال میں تبت کے باشندے اس مذہب کی طرف راغب نہ ہوئے اس کی ایک وجہ تو انھیں اپنے قدیم مذہب بونپا (Bonpa) سے بڑی عقیدت تھی۔ دوم، ان کو مہایانی عقائد کا سمجھنا مشکل تھا۔ البتہ آٹھویں صدی عیسوی میں ہندی مبلغین کی ایک جماعت تبت میں گئی۔ اس نے اس مذہب کی خوب اشاعت کی یہی وجہ ہے کہ تبتی بدھ مت میں ہندی بدھ مت کے زیادہ اثرات ہیں۔

تبتی مہایان زندہ بودھوں پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ وہ سب سے بڑے پروہت کو لاما یعنی معلم اعلیٰ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کے متعلق ان کا یہ عقیدہ ہے کہ گوتم کی روح ان لاماؤں میں حلول کر گئی ہے اور گوتم بدھ ان لاماؤں کے بھیس میں بار بار جنم لیتے ہیں اسی وجہ سے لاماؤں کی پوجا کی جاتی ہے۔ ان کو ارواح خبیثہ کے دور کرنے پر قادر تصور کیا جاتا ہے۔ لوگ ان کو اپنے گھروں میں دعوت دیتے ہیں اور وہ اپنے جادو منتر سے ان بدارواح کو گھروں سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لاما کے عہدہ تک پہنچنے کے لیے کئی عہدوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلا عہدہ امیدواروں کا ہوتا ہے۔ دوسرا عہدہ نو آموز راہب (Getsul) کا ہوتا ہے۔ تیسرا عہدہ مکمل راہب (Gelomg) کا ہوتا ہے۔ چوتھا عہدہ سند یافتہ راہب (Gesne) کا عہدہ ہوتا ہے۔ پانچواں عہدہ صدر راہب (Khanpo) کا ہوتا ہے۔ یہی لاما کہلاتا ہے۔ تبت میں لاماؤں کا اثر اور اقتدار زبردست ہے۔ ان کی خواہشات ہی قانون کا درجہ رکھتی ہے۔[1]

دوزخ کا خوف ''ارواح خبیثہ کا ڈر، جنت کی خواہش، تناسخ پر ایمان، جادو، ٹونے ٹوٹکے اور تعویذوں پر اعتقاد یہ تبتی بودھ عوام کے عقائد کا مجموعہ ہے۔ ہر قسم کی تکلیف اور مصیبت سے نجات لاماؤں سے وابستہ کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی گردنوں پر لاماؤں کی عقیدت اور غلامی کا جوا پڑا ہوا ہے۔

---

1. کارل کلیمن مذاہب عالم ص ۳۳۲۔

چین

ہن خاندان کے بادشاہ ووٹی (Wuti) نے ۱۲۳ ق م میں ہوکوپنگ (Hokuping) کی زیر کمان ایک فوج تاتاری حملہ آوروں کو پسپا کرنے کے لیے ترکستان کے سرحدی علاقوں میں بھیجی۔ یہ فوج ترکستان کے علاقہ میں گھس گئی اور واپسی پر گوتم کا سونے کا مجسمہ ساتھ لے گئی۔ اس طرح چین کے لوگ دوسری صدی قبل مسیح کے اواخر میں بدھ مذہب سے روشناس ہوئے۔

بادشاہ منگ ٹی (Ming-T) بھی اس مذہب کی اشاعت کا سبب بنا۔ اس نے بدھ مت کی معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک وفد مغرب بعید بھیجا۔ یہ وفد اپنے ہمراہ دو راہب اور بہت سے بدھی تبرکات لایا۔

چین میں بدھ مت بہت سست رفتاری سے پھیلا، اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں:

(الف) اہل چین خود ایک اعلیٰ تہذیب اور ثقافت کے مالک تھے۔ وہ باہر کی کسی تہذیب اور مذہب کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

(ب) اہل چین کے مذہب کے عناصر آبا پرستی تھے۔ وہ ایک ایسے مذہب کو کیسے قبول کر سکتے تھے جو راہبانہ زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہو۔

(ج) بدھ مت کی مقدس کتب کا ترجمہ چینی زبان میں ہوا تھا۔ اس وجہ سے لوگوں کی رسائی تعلیم تک نہیں ہوئی تھی۔ پانچویں صدی عیسوی میں جا کر مقدس کتب کا ترجمہ چینی زبان میں ہوا۔ اس ترجمہ کا اہتمام کماراجیو (Kumarajiva) ایک ہندوستانی بدھ نے کیا۔ آٹھ سو بھکشوؤں نے اس کام میں اس کی مدد کی، اور اس کی تین سو جلدیں تیار ہوئیں۔

(د) جادو اور علم النجوم میں مہارت رکھنے والے تعلیم یافتہ طبقہ نے اس مذہب کی شدید مخالفت کی کیونکہ بدھ مذہب کو اس قسم کی باتوں سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ وہ اس نئے مذہب کی کامیابی کو اپنی عزت اور وقعت کے لیے خطرے کا باعث تصور کرتے تھے۔

بدھ مت کی چین میں کیوں کر اشاعت ہوئی؟

چین میں بدھ مت کی قبولیت کے تین اسباب ہیں: پہلا سبب، عقیدہ نروان۔ دوسرا سبب، بادشاہوں کا اس مذہب کو قبول کر لینا۔ تیسرا سبب، بدھ کی لچک کہ وہ مقامی مذاہب کے ساتھ مفاہمت پیدا کر لیتا ہے۔

پہلا سبب

اہل چین کا یہ عقیدہ تھا کہ مردے اس فانی دنیا سے انتقال کر جانے کے بعد بھی اپنے غم زدہ

پسماندگان سے تعلق قائم رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ اس بات کے بہت خواہاں ہوتے تھے کہ وہ یہ جانیں کہ مرنے کے بعد ان کے آباء واجداد پر کیا کیا گزرتی ہے۔ تاؤ ازم اور کنفوشزم موت کے بعد زندگی کے متعلق بالکل خاموش تھے۔ جب اہل چین کو یہ علم ہوا کہ بدھ مت موت کے بعد کی زندگی کے حالات پر روشنی ڈالتا ہے اور نروان کے حصول کی بھی تعلیم دیتا ہے تو یہ باتیں اس مذہب کی اشاعت کا سبب بنیں۔ اہل چین نے تاؤ ازم اور کنفوشزم کو مانتے ہوئے بھی اس مذہب کو قبول کرلیا۔

دوسرا سبب

چین میں بدھ مت کی اشاعت کا سہرا بادشاہ ووٹی (Wu-Ti) کے سر پر ہے۔ جس نے اس مذہب کو قبول کیا بھی اور راہبانہ زندگی اختیار کر کے اس مت کی تعلیم کا عملی ثبوت دیا۔ اس نے ہر قسم کی ذی روح چیز کے قتل کا ارتکاب قانوناً ممنوع قرار دے دیا۔ حتیٰ کہ جسمانی سزا کو بھی موقوف کردیا۔

منگول بادشاہ کیلا خان نے بھی اس مت کو قبول کرلیا اور اس کی اشاعت میں مد ہوا۔

تیسرا سبب

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ بدھ مت جہاں بھی گیا وہاں کے مقامی مذاہب کے ساتھ مفاہمت کرلی۔ چین میں بھی مقامی مذاہب تاءازم اور کنفوشزم کے بعض اثرات قبول کر لیے اور لوگوں نے تاؤ ازم اور کنفوشزم کو مانتے ہوئے بھی اس مت کو قبول کرلیا۔ کارل کلیمن لکھتا ہے کہ چینی بدھ مت نے تاؤوں کے اثرات قبول کر لیے اور خود تاؤمت بودھ مت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی صورت بدل کر رہ گئی۔ چین میں بدھ مت کی خانقاہوں کے ساتھ تاؤمت کی بھی خانقاہیں ہوتیں۔[1]

چین میں بدھ مت شرک سے محفوظ نہ رہ سکا۔ گوتم جسے سکیا مونی کے نام سے یاد کرتے ہیں، کی مورتی بنائی گئی۔ اس کی پرستش شروع ہوگئی۔ اس کے علاوہ اور بھی بے شمار دیویوں کی پرستش کی جانے لگی۔ سب سے مشہور دیوی کا نام الوکیتیشوارا ہے، جو رحم کی دیوی کہلاتی ہے۔

چینی مذاہب

چینی بدھ مت کے راہب عموماً ادنیٰ طبقے سے ہوتے تھے۔ بچپن میں ہی ان کو خانقاہوں میں داخل کردیا جاتا۔ وہاں ان کو بدھ مت کی تعلیم دی جاتی۔ یہ لوگ جلوس کی شکل میں بھیک مانگنے کے لیے باہر نکلتے۔ ان کا لباس پیلے رنگ کا ہوتا۔ سر اُستروں سے منڈے ہوئے ہوتے۔ ان کی کھوپریوں کو داغا جاتا۔

[1] کارل کلیمن مذاہب عالم ص ۳۳۴۔

تجدید بدھ مت کی تحریک

چین

چین میں بدھ مت کی تجدید کی تحریک شروع ہوئی۔ اس کا بانی لوہوی ننگ (Lo-Hwei-Neng) تھا۔ اس نے ووڈی کیان (Wu-Wdi-Kian) فرقے کی بنیاد رکھی۔ یہ فرقہ سولہویں صدی میں بہت طاقتور بن گیا۔ اس فرقہ میں شامل ہونے والے عموماً ادنیٰ طبقہ کے لوگ تھے۔

یہ فرقہ گوتم کی مورتی کی پرستش کا شدید مخالف تھا۔ دل کی طہارت حاصل کرنے کے لیے مراقبہ پر ایمان رکھتے تھے۔

ان میں دیوی کن مو (Kin-Mu) کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ اس کے متعلق ان کا یہ خیال ہے کہ وہ روحوں کی ماں ہے اور وفات کے بعد جنت کی وارث بنائے گی اور اس دنیا میں اس پر ایمان رکھنے والوں کو مصائب و آلام سے نجات دلاتی ہے۔ یہ تحریک تجدید بھی تاؤ مت کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی اور شرک کی دلدل میں پھنس کر رہ گئی۔

جاپان

بدھ مت چین سے کوریا پہنچا۔ ڈیڑھ سو سال کے اندر اندر یہ مذہب خوب پھیل گیا۔ کوریا سے مبلغ جاپان آئے۔ انھوں نے شاہ جاپان کو بدھ مت کی تبلیغ کی اور اس کو تحفہ کے طور پر متبرک چیزیں بھی دیں۔ جاپان میں ابتداء میں شنتو مذہب نے بدھ مت کی بہت مخالفت کی۔ آخر ایک شہزادہ شوٹوکو ڈیشو (Shotuku Daishu) (متوفی ۶۲۱ء) نے اس نووارد مذہب کو قبول کر لیا۔ اس سے اس مذہب کی اشاعت کو تقویت پہنچی۔ شنتو مذہب سے مفاہمت کرنے کے لیے اس مذہب کے خاص خاص دیوتاؤں کو بدھی ستیوا کا مرتبہ دے دیا گیا۔

بدھ مت جاپان میں ۱۸۶۸ء تک سرکاری مذہب رہا۔ اس کے بعد یہ حیثیت شنتو مذہب کو حاصل ہو گئی۔

جاپان میں بدھی خانقاہیں اور معابد نہایت ہی خوبصورت بنائے گئے ہیں جن میں بے شمار مورتیاں پڑی ہوئی ہیں۔ ان کی پوجا کی جاتی ہے۔

زین بدھ مت (Zen Buddists)

جاپان میں زین (Zen) بدھ مت رائج ہے۔ اس فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہبی کتب کے ذریعے حق و صداقت تک رسائی نہیں ہو سکتی، بلکہ انسان کے اندر ہی ایک ایسی استعداد مضمر ہے جو حق اور صداقت کی طرف لے جاتی ہے۔ اس استعداد کو ابھارنے اور عمل میں لانے کے لیے یوگ اور سادہ زندگی ضروری ہے۔

یہ لوگ وجدان کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

اس فرقہ کی یہ تعلیم ہے کہ کامیابی کی صورت میں نہ تو اتنا خوش ہونا چاہیے اور نہ ناکامی کی صورت میں زیادہ مایوس ہونا چاہیے۔ زیادہ خوشی اور زیادہ مایوسی دونوں حالتیں انسان کو راہ مستقیم سے ہٹا دیتی ہیں اور حق کے حاصل کرنے میں مانع ہیں۔ ان دونوں حالتوں میں پُروقار رہنا چاہیے۔ اس فرقہ کے عقائد اور اعمال میں بہت ہم آہنگی ہے۔ اس وجہ سے لوگ اس فرقہ کو اچھی طرح سے دیکھتے ہیں۔

نیپال

بدھ مت نیپال میں دو ہزار سال سے رائج ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ خود شاکیا منی وہاں گئے۔ نیپال بدھ مت کا قدیم گہوارہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ نیپال کی قدیم خانقاہوں میں اس مذہب کی سب سے پرانی کتب دستیاب ہوئی ہیں۔

نیپال کے بدھ مت میں شرک کی آمیزش

نیپال کے بدھ مت میں تین دیوتاؤں کی پرستش سکھائی گئی ہے۔ اوّل، آدی بدھ: یہ سب سے بڑا خدا ہے۔ اس سے مراد روح ہے۔ دوم، دھرم: جس سے مراد مادہ ہے۔ تیسرا، سنگھ: جس سے مراد خارجی دنیا ہے جو روح اور مادہ کے ملاپ سے پیدا ہوئی ہے۔

ان دیوتاؤں کے علاوہ اور بھی برہمنی مذہب کے بہت سے دیوتا ہیں۔ جن کی پرستش کی جاتی ہے۔ مثلاً وشنو، شیو، گنیش، لکشمی وغیرہ۔

نیپال کے بدھ مت میں روح کے متعلق وہی عقیدہ ہے جو برہمنی مذہب کا ہے۔ یعنی ارواح آدی بدھ سے پیدا ہوتی ہیں اور لاتعداد مدارج تناسخ طے کرنے کے بعد پھر اسی آدی بدھ میں شامل ہو جاتی ہیں۔ ان تناسخوں کی تعداد اور ان کی نوعیت کا دارومدار انسان کے افعال پر ہے۔

نیپال میں برہمنی مذہب کا بدھ مت پر اتنا اثر ہوا ہے کہ دونوں عبادت گاہوں میں دونوں فرقوں کے دیوتا ملے جلے ہیں۔ مذہبی حکایات، روایات اور رسوم ایک جیسی ہیں۔ یہ فرق کرنا مشکل ہے کہ ان میں بدھ مت کی کونسی ہیں اور برہمنی مذہب کی کون سی۔

برما

برما میں بدھ مذہب برہمنی دیوتا کے ساتھ گیا۔ مسٹر ویلر جو کہ برما میں ایک برٹش عہدہ دار تھا لکھتا ہے کہ "برما کے بدھسٹ ویدی دیوتاؤں میں علی الخصوص اندرا اور برہما کی بھی پرستش کرتے تھے اور برہما کا بادشاہ اپنے دربار میں ہمیشہ برہمنوں کو رکھتا ہے۔" اور وہی صاحب لکھتے ہیں کہ کوہ التائی کے حوالی کے مغل خوانین ویدی دیوتاؤں کو پوجتے ہیں۔"[1]

---

[1] تمدن ہند ص ۴۷۵۔

لنکا

لنکا کے باشندے ہنایان فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ گوتم بدھ کے تبرکات کے ساتھ ساتھ وہاں بے شمار مورتیوں کی پوجا کا رواج ہے۔ یہ مورتیاں لنکا میں پلما [1] کہلاتی ہیں۔ ان مورتیوں کے رکھنے کے لیے خوبصورت عمارتیں بنائی گئی ہیں، جن کو ویرا [2] (Vihara) کہا جاتا ہے۔ زائرین وہاں جاتے ہیں اور مورتیوں کی پرستش کرتے ہیں۔

ویرا کے علاوہ لنکا میں ڈاگوبا یا ڈاگوب (Dagoba) خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاگوبا کے معنی ہیں: ایسا روضہ جہاں استخوانی یادگار محفوظ رکھی جاتی ہے۔ ڈاگوبا میں ایک پتھر کا ڈبہ ہوتا ہے۔ جس میں ہڈی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سونے کے پترے، چند انگوٹھیاں، مورتیاں، تسبیح کے دانے اور ناگا (سانپ کے دیوتا)، چند مٹی کی بنی ہوئی مورتیاں اور دو چراغ ہوتے ہیں۔ یہ چیزیں گوتم ہی سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ان متبرک یادگاروں میں سب سے زیادہ اہم وہ دانت ہے جو گوتم کا بتلایا جاتا ہے۔ [3]

لنکا میں پرانے دیوتاؤں کی پوجا بدھ کے تبرکات کے ساتھ ساتھ رائج ہے۔

جزیرہ نما ملایا

بدھ مذہب جزیرہ نمائے ملایا خصوصاً جاوا میں بھی شائع ہو گیا، جہاں بدھ مذہب کی ایک عظیم ترین عمارتی یادگار بار بوڈویر پائی جاتی ہے۔ اس عظیم انسان عمارت کے آثار دراصل پتھروں پر سوال و جواب کے ذریعہ مذہبی تلقین کا ایک نادر نمونہ ہے جس کی ہر جماعت میں بھگتوں کو ایک نئی چیز کی تعلیم ملتی تھی۔ ان جزائر میں بدھ مذہب ان ہندو نو آبادکاروں کے ذریعہ پہنچا جن کی بڑی تعداد ظاہر ہے کہ ان علاقوں سے آئی تھی جہاں بدھ مذہب مہایانا بدھ مت اور ہندو مذہب کا مخلوط مجموعہ تھا۔ گو مہایانا بدھ مت کی خصوصیات بھی بالکل معدوم نہیں ہیں۔ اسلام کی آمد اور اشاعت نے بتدریج بدھ مت کو یہاں محو کر دیا۔

(The Great Religions of Modern World P.7)

بدھ مت کے زوال کے اسباب

دنیا میں کوئی مذہب یا تحریک اس وقت زندہ نہیں رہتی جب وہ اپنے بنیادی اصولوں کو برقرار نہیں رکھتی۔ بدھ مت کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ جس ملک میں بھی گیا۔ وہاں کے عقائد اور

[1] تاریخ مذاہب مصنفہ پروفیسر رشید احمد ایم اے ص ۳۶۳ سال اشاعت ۱۹۶۸ء دوسرا ایڈیشن۔
[2] تاریخ مذاہب مصنفہ پروفیسر رشید احمد ایم اے ص ۳۶۳ سال اشاعت ۱۹۶۱ء دوسرا ایڈیشن۔
[3] تاریخ مذاہب مصنفہ پروفیسر رشید احمد ایم اے ص ۳۶۳ سال اشاعت ۱۹۶۸ء دوسرا ایڈیشن۔

روایات اس کا جزو لاینفک بنتے چلے گئے۔ ہندوستان میں برہمنی عقائد سے مفاہمت کی، پھر آہستہ آہستہ برہمنی عقائد بدھی عقائد پر غالب آ گئے اور بدھی فلسفہ بتدریج دھندلا ہونے لگا۔ اسی طرح تبت، چین، جاپان، نیپال، لنکا، برما اور دیگر ممالک میں بدھ مت مقامی مذاہب کے عقائد سے مصالحت کے ساتھ پھیلا۔ آخر کار بدھ مت میں مقامی مذاہب میں ہی ضم ہو گیا۔

سردار پانیکر لکھتا ہے "واقعہ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں ناگر جونا اور اسنگا کے زمانے میں بدھ مت کے مقررہ میں زبردست احیا ہوا تھا۔ اس کے بعد ہندو اور بدھ فلسفہ میں جو فرق تھا وہ بتدریج دھندلا ہو گیا۔

(India China P48)

ایک اور مصنف رقمطراز ہے۔ "بدھ مذہب نے بہرحال ایک آزاد مذہب کی حیثیت سے اپنے لیے مقام پیدا کر لیا اور کئی صدیوں تک ہندوستان کے بڑے حصے کا غالب مذہب رہا لیکن وہ بھی بالآخر ہندو مذہب سے گھل مل گیا۔" (The Great Religion of Modern World P 91)

دوسرا سبب

یہ ہے کہ "اس مذہب میں کثرت سے فرقے پیدا ہو گئے۔ ہوئین تسانگ اپنے وقت میں اٹھارہ مختلف فرقوں کا ذکر کرتا ہے، جن میں اس گرما گرمی سے مباحثہ ہوا کرتا تھا کہ اس کی آواز سمندر کی موجوں کی طرح دور سے آتی تھی۔ اس وقت انیسویں صدی میں بھی بدھ مذہب میں نہ اعتقادات کے لحاظ سے اتحاد پیدا ہوا اور نہ اعمال کے لحاظ سے۔ دو بڑے فرقے موجود ہیں: ایک جنوبی اور دوسرا شمالی۔ جن میں سے ہر ایک اپنے کو حق پر بتاتا ہے اور شاکیا منی کی اصلی تعلیم کے مورث ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔"[1]

تیسرا سبب

برہمنی مذہب نے کسی حد تک ان باتوں کو چھوڑ دیا، جن کی وجہ سے لوگ اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسی طرح بدھ مت کی ان باتوں کو اپنا لیا جن کی وجہ سے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سری نواس جاری اور راما سوامی آئینگر "ہسٹری آف انڈیا" میں لکھتے ہیں:۔

"عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کی اس دوڑ میں برہمن مذہب کو کامیابی حاصل ہوئی اس نے خاموشی اور آہستگی کے ساتھ بدھ مذہب کی بہت سی باتیں لے لی تھیں، یہاں تک کہ عوام کے سامنے اس کی تبلیغ کے طریقوں کو بھی اختیار کر لیا تھا۔ پرانوں کے دیوتاؤں کی پوجا کے لیے بہت سے نئے مندر بنائے گئے اور نہایت شاندار جلوس اور رعب ڈالنے والے تہواروں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ذات کی سختیاں ڈھیلی کر دی

[1] تمدن ہند ص ۲۸۹، ۲۹۰۔

گئیں۔ بغیر ذات والے باہر سے آنے والے لوگ جنھوں نے یہاں حکومت کی بنیادیں ڈالی تھیں اور غیر کھتری حکمران جیسے کہ گپت راجہ تھے ان کو کھتری فرقہ میں شامل کرلیا گیا۔ برہمن پروہت بھی اس میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں تھے کہ حکمرانوں کو گوترا عطا کریں۔ اس طرح کی خوشامد اور چاپلوسی کے بعد اس میں کسی کو تعجب نہ ہونا چاہیے کہ حکمران ہندو مذہب کی ترقی کے لیے پوری کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ وشنو، شیوا، چندی اور سوریہ وغیرہ کے ادیان بہت پھیل گئے اور عام ہو گئے [1]

بدھ مت کی تعداد

بدھ مت کی تعداد احمد عبداللہ المسدوسی کی تحقیق کے مطابق پندرہ کروڑ اکتالیس لاکھ ستاون ہزار ایک سو چھہتر (۱۵۴۱۵۷۱۷۶)[2] ہے۔

اسلام اور بدھ مت

مہاتما بدھ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوانح حیات میں مماثلت

پہلی مماثلت

مہاتما بدھ نے جب اپنے ماحول میں دکھوں اور گناہوں کا طوفان بلاخیز موجیں مارتا ہوا دیکھا تو ان کے شفیق دل میں عوام کی اصلاح کا جذبہ موجزن ہوا۔ اپنے تمام آرام اور آسائش کو خیر باد کہہ کر دکھوں اور گناہوں کا حقیقی علاج معلوم کرنے کے لیے گھر سے نکل پڑے۔ آخرکار ایک بڑ کے درخت کے نیچے گیان اور روشنی نصیب ہوگئی اور لوگوں کی اصلاح کے لیے میدان میں نکل پڑے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرب کی فضا میں فسق و فجور، بدکاری اور اخلاقی ضعف کے بادل منڈلاتے دیکھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بسترِ راحت سے اٹھ کر غارِ حرا میں چلے گئے۔ مخلوقِ خدا کی ہدایت کے لئے رو رو کر دعائیں مانگیں۔ بالآخر وہ دن آ گیا جب اللہ تعالےٰ نے تمام دنیا کی اصلاح کا بوجھ آنحضرت کے کندھوں پر ڈال کر میدانِ عمل میں اترنے کا حکم دیا۔ اس حکم خداوندی کے تحت دن رات ایک کرکے لوگوں کو فسق و فجور اور گناہوں کی دلدل سے نکالنے کی سعی بلیغ کی۔ اس کوششِ تمام کا ذکر اللہ نے قرآنِ مجید میں ان الفاظ میں کیا ہے۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (الشعراء ۲۶:۳) اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! شاید تو اپنے آپ کو ہلاک کر دے گا کہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔

---

[1] ہسٹری آف انڈیا حصہ اوّل (ہندو انڈیا) ص ۱۷۴، ۱۷۵۔

[2] مذاہب عالم مصنفہ احمد عبداللہ المسدوسی بی اے ایل ایل بی۔ بار دوم اپریل ۱۹۶۴ء ص ۲۲۷۔

دوسری مماثلت

مہاتما بدھ راجہ کے بیٹے تھے۔ مخلوق خدا کی ہدایت کی خاطر تاج شاہی چھوڑا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگرچہ ابتداء میں بادشاہ نہ تھے۔ لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شرک اور گناہوں کے خلاف آواز بلند کی تو اہل مکہ نے مل کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بادشاہت پیش کی کہ ان کے بتوں کے خلاف آواز بلند نہ کریں۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بادشاہت کو ٹھکرا دیا اور تبلیغ حق کی خاطر ہر قسم کے مصائب اور تکالیف جھیلیں۔

جب حق غالب آ گیا اور باطل پاش پاش ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلامی ریاست کے مقتدر اعلیٰ بن گئے تو اس اقتدار کے وقت بھی نہ شاہی تاج پہنا، نہ محل بنوایا اور نہ سونا چاندی گھر میں جمع کیا۔ بلکہ اس کے برعکس الفقر فخری کہہ کر تمام بادشاہی آداب کو خاک میں ملا دیا۔

تیسری مماثلت

گوتم بدھ کو بڑ کے درخت کے نیچے روحانی معراج نصیب ہوا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اس سے کہیں بڑھ کر معراج نصیب ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام بلندیوں کو تیزی سے طے کرتے ہوئے ایسے مقام ارفع تک پہنچ گئے۔ جہاں نہ کوئی اس مقام پر پہلے پہنچا اور نہ اب کوئی پہنچ سکے گا۔ قرآن مجید نے اس مقام محمود کا کئی مقامات پر ذکر کیا ہے، ارشاد الٰہی ہے: ثُمَّ دَنَی فَتَدَلّٰی فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی (النجم ۵۳:۸:۹) پھر نزدیک ہوا یعنی اللہ تعالیٰ سے پھر نیچے کی طرف اترا یعنی مخلوق کی طرف تبلیغ احکام کے لیے نزول کیا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اوپر کی طرف صعود کیا۔ تو انتہائی درجہ قرب تام کو پہنچ گئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اور خدا میں کوئی پردہ نہ رہا۔ پھر نیچے کی طرف نزول کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اور مخلوق میں کوئی حجاب نہ رہا چونکہ آپ اپنے صعود اور نزول میں اتم و اکمل ہیں اور کمالات انتہائیہ تک پہنچ گئے ہیں۔ دو قوسوں کے درمیان میں یعنی وتر کی جگہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتم اور اکمل طور پر مقام ہے بلکہ اس وتر کی حد سے بھی آگے بڑھے اور نور الوہیت کے ناپید اکنار سمندر میں اپنے آپ کو ڈال کر صعود کی انتہاؤں تک پہنچ گئے، یہ وہ قرب کا انتہائی مقام ہے جہاں تمام صفات الٰہیہ صاحب قرب کے وجود میں بتمام تر صفائی منعکس ہو جاتی ہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسا کہ کوئی شخص ایک مصفا اور وسیع شیشہ میں اپنا منہ دیکھ کر اس شکل کو اپنی شکل کے مطابق دیکھتا ہے۔

اس ارفع مقام کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم کے کمال کا بھی ذکر کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علم کے اس انتہائی مقام پر پہنچ گئے جہاں اوّلین اور آخرین کا علم منتہیٰ ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (سورۃ النجم ۵۳:۱۳،۱۴) اور اس نے اسے ایک اور نزول کے وقت بھی دیکھا سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ سدرہ سے مراد وہ مقام ہے جس سے آگے کسی مخلوق کا

قدم نہیں جا سکتا۔ یونانی کتب الٰہیہ اور مصری کتاب الموتی میں بیری کا درخت (سدرۃ) حیرت عقل اور حکومت بر کائنات کا انتہائی مقام کہلاتا ہے۔

چوتھی مماثلت

گوتم بدھ نے برہمنوں اور برہمن کتب کے غلط عقائد اور رسوم کی تردید کی، اور لوگوں کو مذہبی اجارہ داروں کی غلامی سے نجات دلائی اور ان کو یہ تعلیم دی کہ انھیں خود ہی ریاضت کرنی چاہیے اور خود ہی علم سیکھنا چاہیے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان تمام بدعات اور غلط عقائد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جو مذاہب عالم کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ اسی طرح کاہنوں، راہبوں اور برہمنوں کی اجارہ داری کا خاتمہ کیا اور ہر آدمی پر مذہبی علوم سیکھنا فرض قرار دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث ہے: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ یعنی علم کا حاصل کرنا ہر مسلم مرد اور مسلمان عورت پر فرض ہے۔

اسلام اور بدھ مت کی تعلیم میں مماثلت

پہلی مماثلت

گوتم بدھ نے رسوم مذہبی اور عبادات کو بغیر اصلاح نفس کے عبث اور بے سود ٹھہرایا ہے۔ ان کے پیغام کا نقطہ مرکزی ہی اصلاح نفس ہے۔ قرآن مجید نے بھی اسلامی عبادات کی غرض و غایت تقویٰ اور اصلاح نفس کو قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (العنکبوت ۲۹:۴۵) یعنی نماز بے حیائیوں سے روکتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ صحابہ کرامؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بتاؤ تو سہی اگر کسی کے دروازے کے سامنے سے ایک نہر بہتی ہو اور اس میں وہ دن رات میں پانچ دفعہ غسل کرے، کیا اس کے جسم پر میل رہ جائے گی؟ صحابہؓ نے جواب دیا؟ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص کا بھی یہی حال ہے جو دن رات میں پانچ دفعہ نماز پڑھتا ہے۔ اس کے دل پر گناہوں کی میل نہیں رہ سکتی۔

روزہ کا حکم دیا تو فرمایا: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ تاکہ تم متقی بنو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو روزہ رکھے تو تیرے کان بری باتوں کے سننے سے اجتناب کریں، تیری نظر ایسی چیزوں پر نہ پڑے جو برائی کا محرک ہوتی ہیں، تیری زبان اکل حرام سے بچے، تیرے ہاتھ ظلم وتعدی کرنے سے گریز کریں۔ غرض کہ ہر ایک عضو اللہ کے احکام کے تابع عمل کرے اور منع کردہ امور سے اجتناب کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقدس الفاظ یہ ہیں:

وَاِذَا صُمْتَ فَلْيَصُمْ سَمْعُكَ وَبَصَرُكَ وَلِسَانُكَ وَيُدُكَ وَعُضْوُ مِنْكَ جو شخص

ہوا وہوس کے خیال سے عبادت بجالاتا ہے تو اس کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے: أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ (الفرقان ۲۵:۴۳) کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی ہوس کو اپنا خدا بنالیا۔

دوسری مماثلت

گوتم بدھ نے حرص و ہوا کو تمام تکالیف اور مصائب کا منبع قرار دیا ہے، اس وجہ سے آپ نے اپنے متبعین کو حرص و ہوا کی سرکش اونٹنی کو ذبح کرنے کی تعلیم دی۔ قرآن مجید نے بھی اس تعلیم کو نہایت ہی عمدہ رنگ میں بیان فرمایا ہے، ارشاد الٰہی ہے: وَاَمَّا مَنْ طَغٰی وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی. (النزعت ۷۹:۳۷۔۴۱) سو جس نے سرکشی کی ہو اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی ہو، پس اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور جو کوئی اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور اس نے اپنے نفس کو سفلی خواہشات سے روکا اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّکَ ثَوَابًا وَّخَیْرٌ اَمَلًا (الکہف ۱۸:۴۶) یقیناً مال اور اولاد دنیا کی زندگی کی زینت ہے، تیرے رب کے پاس تو باقی رہنے والے نیک اعمال ہی بہترین ثواب کی چیز ہیں اور انہی کی آرزو بہتر ہے۔

ایک اور مقام پر اموال اور اولاد کو فتنہ قرار دیا ہے۔

تیسری مماثلت

گوتم بدھ نے ہشت پہلو راہ کی تعلیم دی ہے۔ یعنی صدق عقیدت، صدق ارادت، راست گوئی، راست بازی، اکل حلال، عزم صمیم، سچی توبہ، صادق تصور، یہ تعلیم معناً اسلام کی روح سے متفق ہے۔

اسی طرح گوتم بدھ نے سرقہ، زنا، نشہ آور چیزوں، رقص و سرود کی محفلوں اور جانداروں کو اذیت دینے سے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ امور سچی راحت کے حصول میں حارج ہیں۔ اسلام نے بھی ان امور سے سختی سے منع کیا ہے۔

بدھ مت کی معاشرتی تعلیم یعنی والدین اور اولاد کے حقوق و فرائض، شاگرد اور استاد کے حقوق و فرائض، شوہر اور بیوی کے حقوق و فرائض، دوستوں کے فرائض، آقا اور ملازمین کے حقوق و فرائض، دین داروں اور دنیاداروں کے حقوق و فرائض پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔ یہ حقوق و فرائض اسلام میں بھی نہایت وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

چوتھی مماثلت

اسلام بھی اطمینانِ قلب اور حقیقی معرفت کے حصول کی راہیں بتاتا ہے۔ اطمینانِ قلب کے حصول کی راہوں کو متعین کرنے میں دونوں مذاہب میں اختلاف ہے۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔ قرآن مجید میں آتا

ہے: يٰأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر ۸۹: ۲۷ تا ۳۰) اے نفس اطمینان یافتہ اپنے رب کی طرف لوٹ آ، اللہ تجھ سے راضی ہوا۔ سو تو میرے بندوں میں داخل ہو اور جنت میں داخل ہو جا۔

یہ وہ مرتبہ ہے جب انسان تمام ارضی خواہشات اور سفلی جذبات سے نجات پا جاتا ہے۔ اس کے دل میں ہر قسم کی برائیوں سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر نیک عمل کی طرف اس کا قدم تیزی سے اٹھتا ہے۔ اس کی روح آستانہ الوہیت پر ایسے گرتی ہے جیسا کہ اوپر سے پانی گرتا ہے اور بندہ اللہ تعالیٰ سے ایسا اتصال پیدا کر لیتا ہے کہ اس کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ اس مرتبہ پر پہنچے ہوئے انسان کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (المجادلہ ۵۸: ۲۲) انہی کے دلوں کے اندر (اللہ نے) ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی روح سے ان کی تائید کی ہے۔ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (الحجرات ۴۹: ۷، ۸) اور اسے تمہارے دلوں میں زینت دی ہے۔ کفر اور فسق اور نافرمانی کو تمہارے نزدیک مکروہ کر دیا ہے۔ یہی بھلائی کی راہ پر چلنے والے ہیں۔ اللہ خوب جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (سورہ بنی اسرائیل ۱۷: ۸۱) حق آیا اور باطل بھاگ گیا۔ یقیناً باطل بھاگا ہی کرتا ہے۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ جب حقیقی گیان اور معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو انسان ہر قسم کی برائی اور بے حیائیوں سے نفرت اور ہر قسم کی نیکی سے محبت کرتا ہے۔

اس مضمون کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بھی بیان کیا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (الشمس ۹۱: ۹، ۱۰) جس نے ارضی جذبات سے اپنے نفس کو پاک کیا وہ کامیاب ہو گیا اور ہلاکت سے بچ گیا اور جس نے گناہوں کی آلودگیوں سے اپنے نفس کو ملوث کیا وہ ناکام و نامراد ہو گیا اور تباہی کے گڑھے میں جا گرا۔

پانچویں مماثلت

گوتم بدھ نے ہندو مذہب کی سوختنی قربانیوں کا بھی انکار کیا اور کہا کہ کوئی انسان محض دیوتاؤں کے حضور قربانی گزارنے سے نہ نیک بن سکتا ہے اور نہ خدا کو راضی کر سکتا ہے۔ یہ رسم وحشیانہ ہے۔ خدا کو راضی کرنے کے نیک اعمال بجالانے چاہئیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان تمام وحشیانہ رسوم اور قربانیوں کو ختم کر دیا۔ جو بتوں کے نام پر کی جاتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اعمال صالحہ پر زور دیا اور کہا کہ حقیقی نجات اعمال صالحہ میں ہے اور اللہ تعالیٰ نفس کی سرکش اونٹنی کو ذبح کرنے سے خوش ہوتا ہے۔

چھٹی مماثلت

گوتم بدھ نے ویدوں کی غیر معقول تعلیم کے الہامی ہونے سے انکار کیا چنانچہ ان کے اپنے الفاظ ویدوں کے متعلق یہ ہیں:۔

''چونکہ وید زمانہ کے لحاظ سے غلط ہے، خدا کے نشانات سے خالی اور خلاف عقل ہے اس لیے وہ خدا کا کلام نہیں۔'' (بدھ شاستر ادھیاء۲ سوتر۱)

''یہ وید صداقت سے خالی اور مشکوک ہیں۔ بھوس کی مانند ہیں۔ نہ ان میں کوئی اصلیت ہے اور نہ ان کی کوئی صداقت۔'' (سیکرڈ بکس آف دی ایسٹ جلد ۲۵ صفحہ ۱۸)

''بدھ نے ویدک قربانیوں کو رد کیا اور نہایت مضبوطی سے اعلان کیا کہ ویدوں کی تعلیم حماقت محض ہے۔'' (بدھ مصنفہ اولڈن برگ صفحہ ۱۷۲)

''ویدوں کا پڑھنا، پروہتوں کو نذر دینا، دیوتاؤں کو قربانیاں چڑھانا، گرم اور سرد تپ اور ازیں قبیل ریاضتیں درازی عمر کے لیے کرنا۔ یہ انسان کو پاک نہیں کرتیں اور نہ توہمات سے باہر نکالتی ہیں۔'' (اگمند ھا سُتا بدھ ازم مصنفہ رائس ڈیوڈز صفحہ ۱۳۱)

''جب ان پوپوں (ہندو پنڈتوں) کی ایسی بدفعلیاں دیکھیں.....تو ایک سخت غضب ناک وید وغیرہ شاستروں کی مذمت کرنے والا بدھ یا جین مت رائج ہوا۔'' (ستیارتھ پرکاش مصنفہ سوامی دیانند سملاس ۱۱، ۱۲)

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی تمام کتب سماوی کی غیر معقول تعلیم اور ان کے من وعن الہامی ہونے کا انکار کیا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ یعنی اہل کتاب اپنی کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھ کر یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اسلام بھی تمام اہل کتاب کی کتب کو من وعن الہامی نہیں مانتا۔ آج محققین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان میں سے کسی مذہب کی کتاب بھی تحریف وتبدل سے مبرا نہیں ہے۔

گوتم بدھ کے طرزِ عمل اور اسلام میں اختلاف

گوتم بدھ کی تعلیم کا مرکزی نقطہ حصول زوان ہے۔ اسلام بھی نروان کے حصول کی تعلیم دیتا ہے۔

لیکن دونوں مذاہب میں طریقہ حصول میں اختلاف ہے۔ بدھ مت کا طریقہ غیر فطری ہے اور اسلام کا طریقہ عین فطرت کے مطابق ہے۔

بدھ مت کہتا ہے کہ نروان اپنے جذبات کو مٹا دینے اور اپنی خواہشات اور تمام دنیاوی تعلقات کو ترک کر دینے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ رہبانیت کی تعلیم ہے اسلام رہبانیت کا شدید مخالف ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ یعنی اسلام میں ترک دنیا جائز نہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو انسان کو جذبات، قویٰ اور استعدادیں عطا کی ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق

استعمال کرے۔ بیوی اور بچوں کے حقوق ادا کرے، انسانی معاشرت اور تمدن کے تمام حقوق پورا کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو جذبات اور قویٰ انسان کے اندر ودیعت کیے ہیں۔ ان کو فنا کرنا خدا کی منشاء کے خلاف ہے، بلکہ ان کا پیدا کرنا عبث اور نقصان دہ ٹھہرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفت قدوسیت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان جذبات اور استعدادوں کو اس وجہ سے انسان کے اندر ودیعت کیا ہے کہ ان کو احکام خداوندی کے ماتحت استعمال کر کے روحانی اور تمدنی ترقی کی جائے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوائے شہوانی عطا فرمائے ہیں، تو اس کا یہ منشا نہیں کہ ان قویٰ کو فنا کر دیا جائے۔ ان کو فنا کرنا فطرت کے خلاف علم بغاوت اٹھانا ہے اور نسل انسانی کی بقاء کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قوائے شہوانی کے پیدا کرنے سے مطلب یہ ہے کہ ان کو صحیح رنگ میں استعمال کر کے نسل انسانی کی بقاء اور افزائش کی جائے۔ اسی طرح دوسرے جذبات اور قویٰ کے پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ نے حکمتیں رکھی ہیں۔

پس جو مذہب ان جذبات اور قویٰ کو فنا کرنے کی تعلیم دیتا ہے وہ فطری مذہب نہیں ہو سکتا۔ فطری مذہب وہی ہو سکتا ہے جو تمام انسانی جذبات اور قویٰ کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی تعلیم دے۔ تمام مذاہب عالم میں صرف اسلام میں ایک ایسا مذہب ہے جو جذبات انسانی کو قدر و منزلت سے دیکھتا ہے اور ان کی صحیح رنگ میں آبیاری کی تعلیم دیتا ہے۔

اب میں ان ذرائع کو بیان کرتا ہوں جو اسلام نے نجات حاصل کرنے کے لیے بتائے ہیں۔

پہلا ذریعہ، اللہ تعالیٰ پر ایمان

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا یہ مطلب ہے کہ ہر قسم کے شرک سے اجتناب کیا جائے اور ہر کام میں اسی کو مقدم سمجھا جائے اور اسی کی رضا مقصود ہو۔ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ میں اپنے آپ کو رنگ لیا جائے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے جو انسان غیر اللہ کا سہارا ڈھونڈتا ہے وہ کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو تمثیل کے رنگ میں قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ إِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ (الرعد ۱۳:۱۴) یعنی دعا کرنے کے لائق صرف خدا ہی ہے۔ جو لوگ اس کے غیروں کو پکارتے ہیں وہ ان کو کچھ جواب نہیں دے سکتے۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسا کہ کوئی پانی کی طرف اپنا ہاتھ پھیلائے تا کہ پانی اس کے منہ تک پہنچ جائے لیکن پانی اس کے منہ تک نہیں پہنچ سکے گا۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو خدا کے سوا غیر کو پکارتے ہیں وہ ان کو کسی قسم کا نفع نہیں پہنچا سکتے۔

دوسرا ذریعہ، اللہ تعالیٰ کے حسن و جمال اور احسان پر اطلاع

انسان بالطبع حسین چیز کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔ اس کے مشاہدہ سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ اس

طبعی جذبہ کے تحت یہ ضروری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ پر اطلاع حاصل کرے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت تمام غیر اللہ کے بندھنوں اور زنجیروں کو کاٹ کر اس سے کامل اتصال پیدا کر دیتی ہے۔ انسان کو یزدان اللہ تعالیٰ سے کامل اتصال سے حاصل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بہت سی اپنی صفات حسنہ بیان کی ہیں تا کہ اس کا حسن انسان کے دل کو اس کی طرف مائل کر دے۔

اللہ تعالیٰ کے احسان پر اطلاع پانے سے بھی انسان منزل حقیقی تک پہنچ سکتا ہے کیونکہ محبت کی محرک دو چیزیں ہیں: حسن اور احسان۔ اللہ تعالیٰ نے احسانی صفات قرآن مجید میں بیان فرمائی ہیں۔ جن کا خلاصہ سورہ فاتحہ میں ہے۔ سورہ فاتحہ کے آغاز میں چار احسانی صفات بیان کی ہیں: ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت اور مالکیت۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے احسانات بار بار جتائے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (النحل ۱۶:۱۸) یعنی اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو تم ہرگز شمار نہیں کر سکو گے۔

تیسرا ذریعہ، دعا

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن ۴۰:۶۰) تم دعا کرو میں قبول کروں گا۔ روحانی انعامات حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ دعا ہے اور دعا اس وقت کارگر ثابت ہوتی ہے۔ جب انسان اپنی زندگی اور اپنی تمام قوتوں کو اللہ کے راستے میں وقف کر دیتا ہے اور قرآن مجید کی اس آیت کا مصداق ہو جاتا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الانعام ۶:۱۶۲) کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا رب ہے۔

اسلامی نقطہ نگاہ سے دعا کرنا اپنے اوپر ایک موت وارد کرنا ہوتا ہے۔ جب انسان کی ارضی خواہشات اللہ کی محبت کی آگ سے بھسم ہو جاتی ہیں اور انسان کی روح آستانہ الوہیت پر پانی کی طرح بہہ نکلتی ہے۔ جب انسان پر یہ حالت وارد ہو جاتی ہے تو وہ اس وقت نروان اور نجات کی مستحکم چٹان پر کھڑا ہوتا ہے۔ شیطان اس آدمی کو گناہوں کے راستہ پر چلانے سے بالکل مایوس ہو جائے۔

چوتھا ذریعہ، توبہ استغفار

توبہ لغت عرب میں رجوع کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں خدا کا نام توآب ہے۔ یعنی بہت رجوع کرنے والا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب انسان اپنے کردہ گناہوں سے دست بردار ہو کر کامل صدق و وفا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کے دست استعانت کو پکڑ کر اپنے فضل و کرم کی چادر میں لپیٹ لیتا ہے۔

توبہ کے لیے تین شرائط ہیں:۔

۱۔ اقلاع: یعنی توبہ کرنے والا اپنے دل سے خیالات فاسدہ کو دور کر دے، کیونکہ خیالات فاسدہ ہی افعال بد کا محرک ہوتے ہیں۔ عمل سے پہلے تصور جنم لیتا ہے، وہ تصور عمل کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے۔ جب ایک انسان اپنے دل کو خیالاتِ فاسدہ سے پاک کر لے گا تو اس سے افعال رویہ سرزد نہیں ہوں گے۔

۲۔ ندم: یعنی اپنے کیے پر حقیقی پشیمانی اور ندامت اختیار کرنا۔ جب انسان اپنے کیے پر حقیقی پشیمانی اور ندامت اختیار کرتا ہے تو پھر اس سے مزید خصائل رویہ سرزد نہیں ہوتے کیونکہ ندامت روح کے لیے ایک ایسی ضرب ہے جو ہمیشہ انسان کو افعال فاسدہ سے آگاہ رکھتی ہے اور لغزشوں سے بچاتی ہے۔

۳۔ عزم: یعنی آئندہ کے لیے مصمم ارادہ کر لینا کہ پھر ان افعال رویہ اور خصائل فاسدہ کی طرف رجوع نہیں کرے گا جو اس سے پہلے سرزد ہو چکے ہیں۔ جب بندہ اس عزم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف قدم بڑھائے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اسے سچی توبہ کی توفیق عطا کر دے گا۔

استغفار: غفر سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کرنا کہ بشریت کی کمزوری ظاہر نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں استغفار کے معنی استمداد اور استعانت کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں استغفار اور توبہ کرنے کے متعلق بہت تاکید کی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:
وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُومِنَاتِ (محمد ۴۷:۱۹) یعنی خدا سے درخواست کر کہ وہ تجھے بشریت کی کمزوری سے محفوظ رکھے۔ اسی طرح مومن مرد اور مومن عورتوں کو بھی محفوظ رکھے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ (ہود ۱۱:۳) یعنی تم اپنے رب سے استغفار کرو اور اسی کی طرف رجوع کرو۔

استغفار اور توبہ دو ایسی شمعیں ہیں جن کی روشنی سے انسان اللہ تعالیٰ کے قرب کی راہوں پر آسانی سے چل سکتا ہے۔

پانچواں ذریعہ، مجاہدہ

قرآن مجید میں آتا ہے:۔
وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت ۲۹:۶۹) وہ لوگ جو نروان اور نجات حاصل کرنے کے لیے پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔ ہم ان کو جادۂ صواب پر چلا کر نروان اور نجات کے وارث کر دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سعی بلیغ کے بغیر کوئی چیز بھی حاصل نہیں ہو سکتی چہ جائیکہ نروان اور نجات حاصل ہو جائے، یہ قانون قدرت کے ہی خلاف ہے۔

چھٹا ذریعہ، استقامت

استقامت یہ ہے کہ اگر انسان ہر قسم کے مصائب اور تکالیف میں گھر جائے، کوئی بھی مونس و معاون نہ ہو۔ اس حالت میں بھی اس کی زبان اور اس کے جوارح سے کسی قسم کی بے چینی و اضطراب ظاہر نہ ہو، بلکہ مصائب کے کڑوے گھونٹ آب شیریں سمجھ کر پی جائے۔ اس کے چہرے پر انبساط اور بشاشت کی ہی لہریں دوڑیں۔ اس کا قدم اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے اور بھی تیزی سے اٹھے۔

قرآن مجید میں آتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ (حٰمٓ السجدہ ۴۱: ۳۰) یعنی وہ لوگ جنھوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر استقامت اختیار کی یعنی ہر قسم کی تکلیف اور آزمائش کے وقت ثابت قدم رہے۔ ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم مت ڈرو اور مت غمگین ہو۔ جنت اور دائمی خوشی کی بشارت پاؤ جس کا تمھیں وعدہ دیا گیا ہے۔ ہم دنیا اور آخرت کی زندگی میں تمھارے دوست ہیں۔

پس نجات حاصل کرنے کے لیے استقامت نہایت ضروری امر ہے۔

ساتواں ذریعہ، راست بازوں کی صحبت

یعنی ان لوگوں کی صحبت اور معیت اختیار کرو جو اپنے قول اور فعل میں صادق ہیں۔ انسان بالطبع نمونہ کا محتاج ہے۔ جب انسان نیک اور راست بازوں کی صحبت اختیار کرے گا تو لازماً اپنی زندگی صادقین کی زندگی میں ڈھالے گا۔

آٹھواں ذریعہ، اکل حلال وطیب

خوراک کا انسان کے اخلاق پر نہایت ہی گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس کی وجہ سے قرآن مجید نے حلال، طیب، مکروہ اور حرام کے متعلق احکام بیان کر دیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام چیزوں کے کھانے سے منع فرمایا جو انسان کی روحانی زندگی کے لیے پیغام موت ہیں۔ مثلاً اسلام نے سور کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ جانور نجاست خور اور حد درجہ کا دیوث اور بے غیرت ہے۔ تمام یونانی طبیبوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے۔ اس جانور کا گوشت حیاء کو کم کرتا ہے۔ دیوثی کو بڑھاتا ہے۔ اس رائے کی صداقت کا مشاہدہ اور تجربہ کرنا ہو تو یورپ کی اقوام کو دیکھ لو کہ کس طرح ان میں حیاء کی کمی اور دیوثی پائی جاتی ہے۔

اسی طرح اسلام نے مردار کھانے سے منع فرمایا ہے۔ مردار کا کھانا صرف طبی نقطہ نگاہ سے مضر نہیں بلکہ روحانی اور اخلاقی لحاظ سے بھی بہت مضر ہے۔ اگر اس حکم کی صداقت دیکھنی ہو تو اپنے ملک کے ان لوگوں

کو دیکھئے جو مردار خوار ہیں، وہ اخلاق کے لحاظ سے کتنے گرے ہوئے ہیں۔

قرآن مجید میں حلال اور طیب کھانے کے متعلق ارشادِ الٰہی ہے:

يٰاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (مومنون ۲۳:۵۱) اے رسولو! پاک اشیاء کھاؤ اور نیک اعمال بجالاؤ۔ قرآن مجید کا طرزِ استدلال یہ ہے کہ نبیوں کو مخاطب کیا جاتا ہے اور مراد سب متبع ہوتے ہیں۔ اس آیت میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ حلال اور طیب اشیاء کھاؤ۔ اس کے بعد نیک اعمال کے بجالانے کا حکم ہے۔ طیب کھانے اور نیک اعمال کو اکٹھا بیان کر کے یہ اشارہ کیا ہے کہ طیب کھانے کے نتیجے میں نیک اور اچھے اعمال بجالانے کی توفیق ملتی ہے۔

۲۔ گوتم بدھ نے دیندار گروہ کے لیے یہ ضروری ٹھہرایا کہ وہ خانقاہوں میں زندگی بسر کریں اور اپنی شکم پری کے لیے شہر میں جا کر دربدر پھر کر بھیک مانگتے پھریں۔ اسلام اس تعلیم کا شدید مخالف ہے اور ہر شخص کے لیے کام کرنا ضروری قرار دیتا ہے۔ اور بھیک مانگنے کو بنظرِ استحقار دیکھتا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے:

اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا (۷۶:۲۲) یہ تمہارا بدلہ ہے اور تمہاری کوشش کی قدر کی جائے گی۔

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ (۶:۱۳۵) اے میری قوم تم اپنی طاقت کے مطابق عمل کرتے جاؤ میں بھی عمل کرنے والا ہوں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی محنت کرنے کی ترغیب دی ہے اور بھیک مانگنے کی مذمت کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

''کوئی شخص اس سے بہتر روٹی نہیں کھاتا جو وہ اپنے ہاتھ سے کام کر کے کھاتا ہے۔'' (بخاری ۳۴:۱۵)

''اگر تم میں سے ایک شخص ایک رسہ لے اور ایندھن کا ایک گٹھا اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لے آئے اور پھر اسے فروخت کر دے جس سے اللہ اس کی عزت بچائے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ لوگوں سے سوال کرتا پھرے، پھر وہ اس کو دیں یا نہ دیں۔'' (بخاری ۲۴:۵۰)

۳۔ گوتم بدھ کا دل جب دنیا کے آلام و تکالیف کو دیکھ کر اچاٹ ہوا تو وہ اپنے بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر رات کی تاریکی میں جنگلوں کی طرف چلے گئے اور ریاضتوں میں لگ گئے۔ اس معاشرتی بندھن کو ایک آن میں توڑ دیا جو خاوند اور بیوی کو ایک مقدس رشتے میں منسلک کرتا ہے۔ اسلام اس عمل کی ہرگز تعلیم نہیں دیتا بلکہ اسلام ایک مرد پر بحیثیت خاوند اور بحیثیت باپ ہونے کے ذمہ داریاں عائد کرتا ہے۔ جن کا پورا کرنا آئینی طور پر ضروری ہے۔ اسلام نے مردوں کو عورتوں کا نگران اعلیٰ قرار دیا ہے۔ اس وجہ سے عورت کے نفقہ کی ذمہ داری مرد پر عائد ہو جاتی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (النساء ۴:۳۴) یعنی مرد عورتوں کے سرپرست ہیں۔ پھر عورت

کے نفقہ کے لیے آئینی طور پر مرد کو پابند ٹھہرایا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: لِيُنْفِقْ ذُوْسَعَةٍ مِنْ سَعَتِهِ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللّٰهُ (الطلاق ۶۵:۷) چاہیے کہ وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس پر اس کی روزی تنگ ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اس سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا۔

جب ایک مرد کسی عورت سے نکاح کر لیتا ہے تو وہ آئینی طور پر عورت کے نفقہ کا پابند ہو جاتا ہے۔ اگر مرد اس بارہ میں کوتاہی کرے تو عورت اس مرد سے عدالت کی معرفت بھی خرچہ لے سکتی ہے۔

عورتوں سے حسن سلوک کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے: "وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ" (۴:۱۹) اور عورتوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ وَاَنَا خَيْرُكُمْ لِاَهْلِيْ" (ترمذی) تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنے اہل کے حق میں بہتر ہے، میں اپنے اہل کے حق میں تم سے بہتر ہوں۔

اولاد کے بارہ میں قرآن مجید میں آتا ہے: قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (الانعام ۶:۱۴۰) بے شک وہ گھاٹا میں ہیں۔ جنھوں نے اپنی اولاد کو بے وقوفی سے لاعلمی میں قتل کر دیا۔ اور جو اللہ نے ان کو رزق دیا تھا۔ اس کو اللہ پر افتراء کر کے حرام کر دیا۔ یقیناً وہ گمراہ ہیں اور وہ کبھی ہدایت نہ پا سکیں گے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اولاد کی اچھی تربیت نہ کرنا ان کا قتل ہے۔

کتب احادیث میں اس قسم کی بے شمار روایات پائی جاتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض صحابہؓ کے اس عمل کو ناپسندیدگی سے دیکھا جو دنیا کے تمام کام کاج چھوڑ عبادت میں مصروف ہو گئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ (نیل الاوطار جلد ۶ کتاب النکاح) یعنی اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں۔

حضرت عثمان بن مظعون کو مخاطب کر کے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اَبْدَلَنَا بِالرَّهْبَانِيَّةِ الْحَنِيْفِيَّةَ السَّمْحَةَ (طبرانی بحوالہ نیل الاوطار) ہمیں اللہ تعالیٰ نے رہبانیت کے بجائے آسان اور خالص ابراہیمی دین عطا فرمایا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ (الحدید ۵۷:۲۷) انھوں نے رہبانیت کو ازخود اختیار کر لیا ہے، ہم نے انھیں اس کا حکم نہیں دیا تھا۔

اگر اسلام اور بدھ مت کا معاشرتی زندگی کا نظام دنیا کے سامنے پیش کیا جائے تو کوئی بھی بدھ مت کی تعلیم کو پسندیدہ نگاہ سے نہ دیکھے گا اور نہ کوئی گوتم بدھ کے نقش قدم پر چل سکے گا۔ اب تو بدھ کے اس اصول کے خلاف بدھوں کو بھی شادی کرنا پڑتی ہے۔

باب ۳

ایرانی مذاہب

زرتشت مذہب

مانوی مذہب

زرتشت مذہب

زرتشت سے قبل ایران کی مذہبی حالت

مظاہر پرستی

زرتشت کی بعثت سے قبل ایران میں مظاہر پرستی اور اصنام پرستی زوروں پر تھی۔ ایران کا ذریعہ معاش زراعت تھا۔ اس وجہ سے ایرانیوں نے ہر اس مظاہر قدرت کی پوجا کی جو ان کی زراعت کے لیے مفید تھے۔ سورج کی اس وجہ سے پرستش کی کیونکہ سورج کی گرمی کھیتوں کے پکنے اور نشو ونما کے لیے ضروری ہے، زمین کو اس لیے سجدہ کیا کہ اس میں فصلیں بوئی جاتی ہیں اور ان کے بڑھنے کا سبب بنتی ہے۔ اسی طرح چاند، پانی، ہوا اور آگ کی عبادت کی جاتی تھی۔

شجر پرستی

ایران میں درختوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

آباء پرستی

ایران میں خاندانوں اور قبائل کے بزرگوں کی پرستش کا رواج تھا۔ ان کی مورتیاں تیار کی جاتی تھیں، پھر ان کے سامنے بھجن گائے جاتے تھے۔ اسی آباء پرستی کے نتیجہ میں پروہتی نظام شروع ہوا۔ پروہتوں کو مُغ کہا جاتا تھا۔ انھوں نے رسوم، قربانیوں اور سحر وفسوں کو رواج دیا۔ اس طبقہ کا اثر عوام پر بہت زیادہ تھا۔ عوام میں ان کے متعلق یہ خیال پایا جاتا تھا کہ وہ دیوتاؤں کے مقرب ہوتے ہیں، اپنے منتروں کے ذریعہ حسب خواہش کام نکال سکتے ہیں اور زمین کی پیداوار اور جانوروں کا دودھ بڑھانے کی قدرت رکھتے ہیں۔

دیوتا

قبائلی اور خاندانی دیوتاؤں کے علاوہ اور بھی بے شمار دیوتا تھے جن کی پرستش کی جاتی تھی۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور ''متھرا'' نامی دیوتا تھا۔ یہ دیوتا ہندوستان میں ''مترا'' کے نام سے پوجا جاتا تھا۔ ابتداء میں سورج دیوتا تھا۔ خاص معبود یہ تھے۔ سپہر (آسمان) خورشید (سورج) ماہ (چاند) ارمائتی (زمین) آتش (آگ) آب (پانی) باد (ہوا) ہیروڈوٹس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۵ ویں صدی ق۔م کے وسط میں

ایرانی ان معبوں کی پوجا کرتے تھے۔اسٹریبو نے بھی ایرانیوں کے آگ اور پانی پوجنے کا ذکر کیا ہے۔

بعض ماہرین کا یہ خیال ہے کہ متھرا کے معنی عہد نامہ کے ہیں چونکہ یہ سب سے بڑا وفاداری کا دیوتا تھا، اس لیے اس کا یہ نام رکھا گیا۔ جنگ کے موقع پر اس دیوتا کی خاص طور پر پرستش کی جاتی تھی۔ جنگی مہم پر جانے سے پہلے اس دیوتا کے سامنے فتح و نصرت، کامیابی و کامرانی کی دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ ایرانیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر اس دیوتا کی چشم عنائت کسی پر پڑ جائے تو دشمن اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ متھرا کے علاوہ ایک اور دیوتا انٹریا اندر تھا۔

ایک انگریز مورخ زرتشت سے قبل ایران کی مذہبی حالت کا نقشہ یوں کھینچتا ہے:

''جب وہ (زرتشت) ظاہر ہوئے۔ میڈ اور ایرانیوں کے آباء واجداد میں، تو انھوں نے اپنی قوم کو جانوروں، متوفی آباء واجداد، زمین اور سورج کی پرستش کرتے ہوئے پایا اور دیکھا کہ ان لوگوں کے مذہب میں وہ عناصر اور وہ ہی خدا تھے جو وید کے زمانے کے ہندوؤں میں پائے جاتے تھے۔ زرتشت سے پہلے کے اس مذہب کے خدا یہ تھے۔ متھرا، آفتاب کا خدا، عنا پیدائش اور افزائش کی خدائی، زمین، ہوا، سانڈ کے نمونہ کا خدا جو مر گیا اور پھر زندہ ہوا اور بنی نوع انسان کو زندگی دوام عطا کرنے کی غرض سے اپنا خون پینے کو دیتا تھا۔ زمانہ قدیم کے ایرانی اس کی پرستش اس طرح سے کرتے تھے کہ ہوما گھاس کا نشہ آور عرق پیتے تھے۔ ان خداؤں کی پرستش اور کافرانہ رسوم کو دیکھ کر زرتشت کو بہت غم اور تعجب ہوا۔ اس نے ان مجوسی پجاریوں کے خلاف بغاوت کی جو ان خداؤں کی پرستش کرتے تھے اور ان پر قربانیاں چڑھاتے تھے اور اپنے ہمعصر انبیاء عاموس اور یسعیاہ کی سی جرأت کے ساتھ دنیا میں خدائے واحد کا اعلان کیا۔ یہاں اس خدائے واحد کا نام اہورامزدا تھا جو نور و سمٰوٰت کا خدا تھا اور باقی مفروضہ خدا کچھ نہیں تھے، صرف اس کی صفات کا دوسرا نام تھے۔''[1]

زرتشت کے حالاتِ زندگی

زرتشت کے زمانہ میں محققین کا شدید اختلاف ہے۔ زمانہ حال کے محققین کی رائے کے مطابق وہ ۶۶۰ ق۔م میں پیدا ہوئے اور ۵۸۳ء میں انتقال کیا۔[2] مغربی ایران کے رہنے والے تھے۔ ان کا جائے پیدائش شہر رے ہے۔ ان کے والد کا نام پوراشاسپ تھا اور والدہ کا نام وگدو اور اسال بتایا جاتا ہے اور خاندان سپتما میں سے تھے۔ قوم کے مجوسی تھے۔ فارسی میں اس کو مُغ کہتے ہیں اور انگریزی میں Magus کہا جاتا ہے۔ اسی کو (Magian) کہتے ہیں، جس کے معنی جادوگر کے ہیں۔

قدیم ایران میں ان پروہتوں اور پجاریوں کی ایک جماعت تھی جن کا تسلط عوام پر تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ زرتشت کا خاندانی تعلق جادوگروں اور پروہتوں کی جماعت کے ساتھ تھا۔

---

1. Our oriental heritage chap XIII P 366-7 بحوالہ فلسفہ اسلام مصنفہ آغا محمد سلطان مرزا ص ۱۳۳
2. بعض علماء زرتشت کا زمانہ ۱۰۰۰ ق۔م ظاہر کرتے ہیں ڈاکٹر محمد معین پروفیسر طہران یونیورسٹی نے ۱۰۰۰ بیان کیا۔

تعلیم

زرتشت نے اپنے زمانہ کے مشہور استاد حکیم برزا کرزا سے تعلیم حاصل کی۔ دس سال کے قلیل عرصہ میں متعدد علوم مذہب، زراعت، گلہ بانی اور جراحی کے ماہر ہو گئے۔

زرتشت کی جوانی کے حالات

زرتشت نے جوانی کی عمر میں قدم رکھتے ہی اپنے آپ کو خدمت خلق کے لیے وقف کر دیا۔ مصیبت زدہ اور مفلوک الحال لوگوں کی خدمت ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کے والدین کی یہ خواہش تھی کہ ان کا لڑکا آبائی پیشہ اختیار کرے، لیکن زرتشت کا دل اس طرف مائل ہی نہیں ہوتا تھا۔ ان کے سامنے ایک بلند نصب العین تھا۔ اس جوانی کے زمانہ میں ہی اپنے مذہب سے غیر مطمئن تھا۔ وہ جان و دل سے حقیقت کی طرف راغب ہوا۔ بیس سال کی عمر میں گھر بار کو خیر باد کہہ کر سیالان پہاڑ میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ انہی افسانوں کے مطابق اسے تیس سال کی عمر میں معراج آسمانی نصیب ہوا اور اس نے براہ راست اہورامزدا (Ahuramazda) سے وہ الفاظ حاصل کیے جو اس کی تعلیمات اور گاتھا کی بنیاد ہیں۔ گاتھا وہ مقدس منظومات ہیں جو زرتشت نے لکھی تھی۔

تبلیغ

زرتشت نے توحید کی اشاعت اور شرک کی مخالفت میں انتھک کوشش کی۔ دس سال کی لگاتار کوشش کرنے کے بعد صرف اس کا چچیرا بھائی اس کا ہم خیال بن سکا۔ وجہ یہ تھی کہ ان کی تعلیمات کا تعلق غیر مرئی قوت سے تھا۔ لوگ ایسے معبود پسند کرتے تھے۔ جنھیں وہ آنکھوں سے دیکھ سکیں اور ہاتھوں سے چھو سکیں۔

جب عوام نے زرتشت کی آواز پر کان نہ دھرے اور سرد مہری کا ثبوت دیا تو وہ توحید کا پیغام لے کر بلخ کے بادشاہ گشتاسپ سے ملنے گئے۔ بادشاہ کے درباری علماء سے مناظرہ کیا، جو تین دن اور تین رات جاری رہا۔ جس میں زرتشت نے اپنی تعلیمات کو دلائل کے ساتھ بیان کیا اور اس وقت کے مروجہ عقائد کا بطلان ثابت کیا۔ بادشاہ نے زرتشت کی تعلیم کو قبول کر لیا۔ اس کے بعد یہ مذہب تیزی سے ترقی کرنے لگا۔ اشاعت کے لیے دور دراز ممالک میں مبلغ بھیجے۔ زرتشت نے شاہ ایران کی مدد سے اپنے مذہب کو توران میں پھیلانا چاہا۔ جس کے نتیجہ میں دونوں ملکوں کے تعلقات خراب ہو گئے اور دونوں ملکوں میں جنگ چھڑ گئی۔ زرتشت کو ایک تورانی سپاہی نے پیٹھ میں خنجر مار کر شہید کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق عقیدہ

زرتشت پکا موحد تھا۔ ان کے خدا کا نام اہورامزدا تھا۔ اہور کے معنی مالک اور مزد کے معنی دانا کے

ہیں، یعنی دانا مالک۔

زرتشت اللہ تعالیٰ کے متعلق فرماتے ہیں: ''تو ہی خدا ہے، یہ میں جانتا ہوں۔ اے قادرِ مطلق تو ہی اوّل تھا، جب زندگی نے جنم لیا۔ انسان کے ہر خیال، قول اور فعل کا پھل ہے۔ جس طرح تیرے ابدی قانون میں مرقوم ہے کہ برائی کا انجام برا ہے اور اچھائی کا انجام اچھا ہے قیامت تک تیری مصلحت کے تحت یہ بات مقرر ہو چکی ہے۔''

صفاتِ الٰہیہ

۱۔ زرتشت فرماتے ہیں: ہمیرام اسپ ہامیرام ہروار (یکسیت نہ یک در شمار) خدا ایک ہے۔ مگر اس کی توحید عددی نہیں بلکہ احدیت ذاتی ہے۔
(نامہ شت وخشور زرتشت دساتیر مطبوعہ ساتیر مطبوعہ بمبئی ۶۹)

۲۔ ہتماندارد۔ یعنی اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ (دساتیر مطبوعہ بمبئی صفحہ ۶۹)

۳۔ ہیچ چیز بادنماند۔ یعنی اس کی کوئی مثل نہیں۔ (دساتیر مطبوعہ بمبئی صفحہ ۶۹)

۴۔ جز آغاز وانجام انباز ودشمن و مانند دیار و پدرد مادر وزن وفرزند و جای سوی وتن وتن آسا وتنانی ورنگ وبوی است۔ (ترجمہ) وہ آغاز، انجام، شریک، دشمن، مانند، دوست، ماں، بیوی، اولاد، جگہ، جسم، راحت، جسمانیت اور رنگ و بو کے بغیر ہے۔ (دساتیر صفحہ ۳)

۵۔ ہستی وہ ہمہ۔ یعنی ہر چیز کو ہست کرنے والا ہے۔ (دساتیر صفحہ ۳)

۶۔ نہ یابند اور اچشمہا دنہ آسانید اور اندیشہا۔ یعنی نہ اسے آنکھیں پا سکتی ہیں اور نہ خیال میں گرفت میں لایا جا سکتا ہے۔ (دساتیر صفحہ ۶۸)

دوسری جگہ ہے: ''یا مردم گو بدیں چشم ہر آئینہ باش راز بیند چشم دیگر خواہید۔'' (دساتیر صفحہ ۱۰۷) لوگوں سے کہو تم ان آنکھوں سے خدا کو نہیں دیکھ سکتے۔ اس کی دید کے لیے دوسری آنکھیں چاہئیں۔

ایک اور جگہ فرمایا: ''پوشیدہ ونہاں گردیدہ از سخت آشکاری۔'' (دساتیر صفحہ ۶۰) ظاہر و آشکار ہونے کی وجہ سے پوشیدہ و نہاں ہے۔

۷۔ توئی نخستی کہ نیست نخست ترے پیشتر از تو، توئی باز پس ترے کہ نیست باز پس تراز پست۔ (دساتیر صفحہ ۶۶) یعنی تو ہی پہلی وہ ہستی ہے جس سے پیشتر کوئی ہستی نہیں ہو سکتی۔

۸۔ ہر چہ پنداری ازاں برتر است۔ (دساتیر صفحہ ۶۹) اس کی ہر صفت برتر ہے۔

۹۔ ناامید از مہربانی و بخشندگی اور مشوید۔ (دساتیر صفحہ ۳۳) اس کی مہربانی اور بخشش سے ناامید نہ ہو۔

۱۰۔ دمن نزدیک تر تر از تو ام۔ (دساتیر صفحہ ۱۲۲) میں تمہاری ذات سے بھی تم سے زیادہ قریب ہوں۔

۱۱۔ امپیر شاد یعنی غیر فانی ہے۔

۱۲۔ وہومنیو عقل کل ہے۔

۱۳۔ خشادیریا تمام ارضی نعمتوں کا مالک ہے۔

۱۴۔ اشارہست۔ یعنی وہ حقیقت اعلیٰ ہے۔

۱۵۔ ارمائتی دیندار اور متقی ہے۔

۱۶۔ ہورداتاد یعنی وہ قوی ہے۔

۱۷۔ چوک پاک۔

۱۸۔ ہرمزد وروح اعلیٰ۔

۱۹۔ داوا منصف۔

۲۰۔ پردرتار محافظ۔

۲۱۔ نیز ان سب سے قوی

ملائکہ کے متعلق عقیدہ

ملائکہ وہ خارجی ہستیاں ہیں جو ہماری روحانی اور جسمانی ربوبیت کے لیے پیدا کی گئی ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان وسائط ہیں۔ زرتشت ملائکہ کے وجود کے قائل ہیں، وہ فرماتے ہیں: ''سروشان بے شمار اند۔'' یعنی ملائکہ بے شمار ہیں۔ (دساتیر صفحہ ۶)

حضرت آدم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اے آباد گفت و گفتار یزداں آنست کہ فرشتہ بردل تو آرد۔'' (دساتیر صفحہ ۳۷) یعنی فرشتے کلام الٰہی پیغمبر کے دل پر نازل کرتے ہیں۔

جنت و دوزخ کے متعلق عقیدہ

زرتشت بعث بعد الموت اور جنت و دوزخ کے قائل تھے، فرماتے ہیں: ''چوں فرودین تن گزارد در سروشستانش رسانم۔ (دساتیر صفحہ ۱۳) جب نیک آدمی جسم کو چھوڑتا ہے میں اسے بہشت میں پہنچا دیتا ہوں۔

بہشتیاں راتنے از بخشش یزداں برتر باشد کہ نہ ریزد و کہنہ شود، و نہ در گیرو نہ آلائش در و فراز آید۔ (صفحہ ۹) اللہ تعالیٰ بہشتیوں کو جو جسم عطا کرتا ہے وہ نہ تو ریزہ ریزہ ہوگا اور نہ پرانا، نہ تھکے گا، نہ اس میں کوئی گند پیدا ہوگا۔

پھر فرمایا: درآں خورم آباد جاوید پایند۔ (دساتیر صفحہ ۱۲) بہشت میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔

دوزخ کے متعلق فرمایا: ''رستگاران در بہشت جاوید باشند و گنہکاران را در دوزخ سخت بدخو یہائے اود رپیکر آتش سوز ندو برف فشرندہ و سرو کنندہ مارکژدم و جز آں از آزندگان و رنج آوران شدہ آرائش دہند۔'' (دساتیر صفحہ ۲۸) یعنی نجات پانے والے جنت میں ہمیشہ رہیں گے اور دوزخ میں گنہگاروں کو ان کی برائیاں آگ کی صورت میں جلائیں گی۔ ٹھٹھرنے والی اور ٹھنڈا کرنے والی برف، سانپ، بچھو اور

دوسرے موذی زہریلے جانور عذاب دیں گے۔

رسولوں کے متعلق عقیدہ

پیغمبروں کی ضرورت بعثت کے متعلق زرتشت فرماتے ہیں۔ (ترجمہ) پیغمبر اس لیے چاہیے کہ لوگ کاروبار زندگی میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ ان کے لیے ایسے مرتبانِ شرائع کی ضرورت ہے جنھیں سب لوگ مان لیں، تاکہ باہمی داد وستد ظلم وستم نہ ہو، کوئی دھوکہ اور فریب نہ ہو اور نظام عالم درست رہے: اور یہ موسسین قانون خدا کی طرف سے ہونے چاہئیں تاکہ عام لوگ ان کو یکساں قبول کریں۔ اسی بناء پر پیغمبر مبعوث کیا جاتا ہے۔" (نامہ شت وخشور آیات ۴۵ تا ۴۹) (دساتیر مطبوعہ بمبئی)

شناخت پیغمبر کے متعلق فرمایا (ترجمہ) "تجھ سے پوچھتا ہے کہ ہم پیغمبر کو کیسے اس کے قول اور فعل میں صادق سمجھیں۔ (جواب) اس سے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے دوسرے نہیں جانتے اور وہ تمہاری فطرت سے اطلاع دے اور جو کچھ اس سے پوچھا جائے اس کے جواب میں عاجز نہ ہو۔ جو وہ کرے دوسرے نہ کر سکیں۔"
(نامہ شت وخشور زرتشت آیات ۵۰۔۵۴)

تخلیق کائنات کے متعلق عقیدہ

زرتشت فرماتے ہیں: تخلیق کائنات چھ ادوار میں ہوئی اور اہورا مزدا نے ترتیب وار آسمان، پانی، زمین، نباتات، حیوانات اور آخر میں انسان کو پیدا کیا۔"

"تمام نسل انسانی کو ایک ہی جوڑے سے پیدا کیا گیا، جن کا نام مشیہ اور مشیاتا (نر اور ناری) مشیہ کے معنی مرد کے ہیں۔

اخلاقیات

افکار کی پاکیزگی

زرتشت نے افکار اور خیالات کی پاکیزگی پر بہت زور دیا ہے، کیونکہ انسانی اعمال افکار کے ہی تابع ہوتے ہیں۔ اگر انسان کے افکار میں پاکیزگی اور صفائی آجائے تو اعمال میں درستی خود بخود آجاتی ہے۔

راستی

زرتشت کی اخلاقی تعلیم میں راستی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ بچوں کو نہایت کم سنی میں دو چیزیں سکھلائی جاتی تھیں۔ اول سچ بولنا۔ دوم تیراندازی۔ جھوٹ بولنا بدترین گناہ تھا جو مقروض ہونے سے بھی زیادہ برا سمجھا جاتا تھا۔[1]

[1] بحوالہ تاریخ مذاہب مصنفہ رشید احمد ص ۱۸۹۔

صفائی

زرتشت نے صفائی اور پاکیزگی کو بہت اہمیت دی ہے۔ اوستا میں صفائی وسیع معنوں میں مستعمل ہے، جو جسمانی صفائی کے علاوہ اقوال اور اعمال کی پاکیزگی کو لازمی قرار دیتی ہے۔

امداد

زرتشت نے مالی امداد پر بہت زور دیا ہے۔ ان کا قول ہے: ''جو شخص مالدار ہو، اس کو چاہیے کہ وہ اپنے فاضل مال کے ذریعے دوسروں کی مدد کرے اور اعلیٰ تعلقات کے قیام کے لیے عمدہ کام انجام دے۔''[1]

لیکن وہ اس امداد میں خندہ پیشانی کو ضروری بتلاتے۔ اہورا نے زرتشت سے کہا: ''اے زرتشت ایسے شخص پر حیف ہے جو شخص خیرات دے لیکن خیرات دیتے وقت اس کا دل خوش نہ ہو۔''[2]

ان کا کہنا ہے کہ مالی امداد صرف مستحقین کو دینی چاہیے۔ ''جو رقم غیر مستحقین کو دی جاتی ہے وہ رائیگاں جاتی ہے۔''[3]

غیر مذاہب کے مستحق اور نادار افراد کو خیرات دینا ضروری بتلایا گیا ہے۔

رہبانیت

زرتشت رہبانیت کا شدید مخالف ہے اور شادی کو ضروری قرار دیتا ہے۔ یشت میں ہے: اے اسپیما زرتشت وہ شخص جس کی بیوی ہو اس شخص سے بدرجہا بہتر ہے جس کی بیوی نہ ہو، اور ایسا شخص جو خاندان رکھتا ہو اس سے بہتر ہے جس کا کوئی خاندان نہ ہو۔[4]

محنت

زرتشت محنت اور کوشش کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ خود آخری عمر تک زراعت کے کاموں میں دلچسپی لیتا رہا۔

پروفیسر گرنڈی لکھتے ہیں۔ ''اس کا مذہب حقیقت اور عمل کا مذہب تھا۔ یونانی مذہب کی طرح رسموں اور ریتوں کا مذہب نہ تھا اس نے مذہب کو ایرانیوں کی روزانہ زندگی کی ایک حقیقت بنا دیا اور اخلاق اس مذہب کا مرکزی عنصر تھا۔''[5]

زردشت کی تعلیمات کو دو تاریخ ساز بادشاہوں نے قبول کیا۔ ایک سائرس تھا جو پارس کے ''اکیمی نیز'' خاندان کا ایک نوجوان گورش تھا۔ عبرانیوں نے اسے خواش، یونانیوں نے سائرس اور عربوں نے اسے

---

1. ایضاً ص ۱۹۰۔
2. ایضاً ص ۱۹۰۔
3. ایضاً ص ۱۹۰۔
4. ایضاً ص ۱۸۸۔
5. یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲ صفحہ ۱۱۴۳ بحوالہ ترجمان القرآن جلد دوم ص ۲۱۷۔

کے خسرو کے نام سے پکارا یہی وہ شخصیت ہے جسے قرآن میں ذوالقرنین کہا گیا ہے اللہ اور آخرت پر ذوالقرنین کے ایمان کی شہادت دی ہے بلکہ قرآن ذوالقرنین کو ملہم من اللہ قرار دیتا ہے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ زردشت کی تعلیم توحید تھی۔

دوسرا بادشاہ دارا بن گشتاسپ تھا۔ جو سائرس کا چچازاد بھائی تھا۔ اس کے عقائد اور افکار کتبات سے ظاہر ہوتے ہیں۔ استخر کا کتبہ دارا کے ایمان اور عقائد کی شہادت دے رہا ہے۔ یہ شہادت کیا ہے؟ یہ ہے کہ ''خدا برتر ہوا موزدہ ہے اسی نے زمین پیدا کی، اسی نے آسمان بنایا، اسی نے سعادت بنائی، وہی ہے جس نے دارا کو بہتوں کا تنہا حکمران اور آئین ساز بنایا۔''

زرتشت کے بعد

زرتشی مذہب شاہان خورس اور دارا کے عہد (چھٹی اور پانچویں صدی ق م) میں اپنے نقطہ عروج پر تھا زرتشت کے مرنے کے ڈھائی سو سال بعد ۳۳۱ ق م میں سکندر اعظم نے ایران پر حملہ کیا۔ شراب کے نشہ میں دھت ہو کر مقدونی فاتح نے پرسیپولس Persepolice کے عظیم کتب خانہ کو، جہاں زرتشی عالم اور پروہت اپنی جانیں بچانے کے لیے پہاڑوں کی غاروں میں جا چھپے آخرکار جب زرتشی مذہب کا احیاء ہوا تو پروہتوں کے حافظوں کی مدد سے کتب مدون کی گئیں۔ لازمی طور پر ان مدونہ کتب میں تحریف ضرور ہوئی ہوگی۔

زرتشی مذہب کا دوسرا سنہری دور تیسری صدی عیسوی میں ساسانی خاندان کے عروج کے ساتھ شروع ہوا۔ شاہ ارتبانس Artabnus اسی خاندان کا بانی مبانی تھا۔ زرتشی کتب تالیف کروائی گئیں۔ پہلوی زبان میں تراجم ہوئے۔ یہی مذہب ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔ اسلام تک ایران میں یہی مذہب رائج رہا۔

آج ایران میں صرف ۱۰۰۰۰ زرتشتی آباد ہیں۔ ہندوستان میں ان کی تعداد ۹۰۰۰۰ ہے۔ یہ پیروان زردشت پارسی کہلاتے ہیں۔

مدوّنہ کتب

قدیم ایرانیوں کی مذہبی کتب میں دو دفتر اہم ہیں: ایک دساتیر اور دوسرے ژنداوستا۔ ان کتب کے دو حصے ہیں۔ خوردہ دساتیر اور کلاں دساتیر۔ ۲۔ خوردہ اوستا اور کلاں اوستا۔ اوستا کے پانچ حصے ہیں۔ ۱۔ یاسنا۔ ۲۔ گاتھا۔ ۳۔ وسپرید۔ ۴۔ وندیداؤ۔ ۵۔ یاشت ان میں سے خاص طور پر اہم ہیں۔ پہلا عبادت اور قربانی سے متعلق ہے دوسرا حمد و مناجات سے متعلق انہی دو کو ژند اور مہاژند بھی کہتے ہیں۔

پانچویں صدی قبل از مسیح ایران میں زرتشی مذہب کے ستر کے قریب فرقے تھے۔ ہر فرقہ کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کے پاس ہی اصلی اوستا ہے شاہ ایران ارتخشاہ (Artaxeues) نے ان اختلافات کو مٹانے

کے لیے قریب ۴۵۰ ق۔م علماء کی ایک کونسل منعقد کی۔ اس کونسل میں قریب اسی ہزار پجاری شامل ہوئے۔ اس قدر کثیر پجاریوں کی وجہ سے اوستا کی تدوین کا کام مشکل ہو گیا۔ بادشاہ نے ان میں سے سات پجاری (مغ) منتخب کر لیے۔ ان سات پجاریوں نے اوستا کی از سر نو تدوین کی۔ اس کے متعلق کہن لکھتا ہے۔

''ان سات مغوں (پجاریوں) میں سے ایک مقدس نوجوان، ادوادیرف نامی کے سامنے آتشیں شراب کے تین پیالے پیش کیے گئے۔ اس نے انھیں پیا اور اس کے بعد ایک لمبی اور گہری نیند سو گیا۔ جب وہ بیدار ہوا تو اس نے بادشاہ اور دیگر حاضرین کو بتایا کہ اس نے کس طرح آسمانوں کی سیر کی۔ یہاں مقدس دیوتاؤں کی اس سے ملاقات ہوئی۔ سننے والوں کے شک و شبہ کے خیالات اس نوجوان کی مافوق الفطرت شہادت (آسمانی) کے سامنے دب گئے اور اس طرح زرتشت کے مذہب کا ضابطہ قوانین مرتب کیا گیا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں مسٹر کپاڈیا کی کتاب **"The Teachings of Zoroaster"**)

ادوادیرف کی مدونہ اوستا بھی اسکندر کے حملے کے وقت نذر آتش ہو گئی۔ اس واقعہ کے بعد مدت دراز تک اوستا کا کہیں نام نہیں۔ اس کے زرتشت کے مروجہ اقوال کے کچھ حصے جونسک کے نام سے مشہور ہے۔ پہلوی زبان میں مدون کیے گئے۔ موجودہ تحقیقات کی رو سے یہ ترجمہ مستند ہیں۔

ساسانیوں کے دور میں زرتشت کی تعلیمات کو پھر اکٹھا کر کے ایک مجموعہ مدون کیا گیا۔ جو اس وقت اوستا کے نام سے مشہور ہے اس میں ایک حصہ یسنا کہلاتا ہے جو ۷۲ ابواب پر مشتمل ہے اس میں قربانیوں کی رسومات اور دعائیں درج ہیں۔ اس میں ۲۸ سے ۵۴ ابواب تک جناب زرتشت کی طرف منسوب ہیں۔ یہ ان کی پانچ گتھائیں کہلاتی ہیں۔ **(Introduction to the history of science)**

دوسرا حصہ وندیداؤ کہلاتا ہے۔ جس میں دیوتاؤں اور بھوتوں سے محفوظ رہنے کے منتر ہیں۔ تیسرا حصہ وسپیر ید ہے چوتھا یشت ہے۔ جس میں متعدد خداؤں اور مردہ روحوں سے استمداد کی دعائیں ہیں۔

اوستا کے علاوہ پندرہ مختلف اشخاص کے نامے ہیں مثلاً نامہ امہ آباد وخشور۔ نامہ زرتشت وخشور[1] نامہ منوچہر۔ نامہ کیخسرو۔ ان ناموں کا ساسان پنجم نے خسرو پرویز کے عہد میں دری زبان میں ترجمہ کیا۔

یہ کتب ژندی اور پہلوی دو زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان دونوں قسم کے رسم الخط کے علاوہ کچھ لٹریچر خط میخی میں بھی موجود ہے۔ پہلوی رسم الخط موجودہ فارسی خط سے ملتا جلتا ہے، لیکن ژندی اور میخی دونوں خط اس سے مختلف ہیں۔

ان کتابوں کی تعداد، زبان اور زمانہ تدوین کے متعلق اس قدر شدید اختلافات ہیں کہ کوئی محقق بھی قطعی طور پر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جو کتب زرتشت کی طرف منسوب ہیں وہ واقعی بغیر کسی تحریف کے ان کی ہی ہیں۔

---

[1] وخشور کے معنی پیغمبر کے ہیں۔

توحید کا زوال

جہاں زرتشت کی کتاب میں لفظی تحریف کی گئی وہاں معنوی تحریف لازمی تھی۔ توحید کی جگہ مظاہر پرستی نے لے لی۔ گھر گھر میں دیوتاؤں کی پوجا شروع ہوگئی۔ ایک انگریز مورخ مذہب میں فساد کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے:

''زرتشت کے بعد جب یہ مذہب انبیاء کے دائرہ سے نکل کر ملکی سیاست دانوں کے قبضہ میں آیا تو پھر خدائے واحد اہورامزدا کا تخیل ایک شہنشاہ کا سا ہوگیا۔ لوگوں نے اعتقاد قائم کرلیا کہ وہ دنیا کا خالق اور مدبر ہونے میں بہت سے خداؤں کی مدد کا محتاج ہے اور ان کو چھوٹے چھوٹے خدا تصور کرلیا گیا۔''[1]

اویستا کا جو حصہ زردشت کے بعد تصنیف ہوا۔ اس میں خدا کا تصور زوال پذیر ہے۔ ۱۔ خدا کی صفات کو مشخص کر کے ''سات غیر فانی ہستیاں'' ایشاء اسپنتا قرار دی گئیں۔ یہ سات روحیں جن میں سرفہرست خود آہوراماز دا کا نام ہے یہ ہیں:۔ وہومنو (بہمن) عقل اول اشا وہشت (اردی بہشت) راستی، شتھر اویریہ (شہریور) ارضی نعمتیں، اسپتا ایتی (اسفندارند) دینداری، سورداتاد (خرداد) صحت امرتاو (مرداد) حیات جاوداں۔ انھیں ہفت ملائکہ سے یہودیوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خداوند کے تخت کے سامنے سات روحیں ہیں۔ ۲۔ آگ کو اہوراماژدا کا بیٹا مان کر پوجنے لگے۔ ۳۔ ماہ و مہر کی بھی پرستش ہونے لگی۔ سورج کو اہوراماژدا کی آنکھ مانا گیا۔ ۴۔ متھرا کے نام کو آہورماژدا کے نام سے ملا دیا گیا۔ ۵۔ ایک دیوی کی بھی پوجا ہونے لگی جس کا پورا نام اردوی سورا اناتھا۔ جس کے معنی ہیں ''بلند طاقت ور اور پاک باز ہستی'' غالباً یہ پانی کی دیوی تھی۔ مختصراً اسے اناہتا کہتے تھے اور غالباً یہی لفظ موجودہ فارسی کا ناہید بن گیا۔ جس کے معنی زہرہ ستارہ کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی دیوی تھی جسے شمالی سامی اقوام اشتر یا، استارتہ کہتی تھیں۔ ان کے علاوہ فرشتوں اور محافظ ارواح کا عقیدہ تھا لیکن ان سب کو (بہ شمول متھرا اور اناہتا) آہورماژدا کی تخلیق مانا جاتا تھا۔

ہنمانشی دور میں معبود کے تخیل میں مزید زوال ہوا اور نادیدہ خدا کی تصویریں بھی بنائی جانے لگیں آہورماژدا کی یہ تصاویر مثل اشور کے بنائی جاتی تھیں۔[2]

اسی طرح زرتشی آفتاب ماہتاب اور آگ بھی پرستش کرتے تھے۔

اسلام اور زرتشی مذہب

قرآن حکیم کی تعلیم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام قوموں کی طرف نبی بھیجے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ (۱۰:۴۷) یعنی ہر امت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول آتے رہے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: اِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (۳۵:۲۴) یعنی ہر امت میں اللہ کی طرف سے ڈرانے والا آیا ہے۔

---

[1] Our Oriental Heritage chap XIII 366.

[2] خدا اور تصور خدا علامہ نیاز فتح پوری۔

ان آیات کی روشنی میں ایک مسلمان کو یہ ماننا پڑے گا کہ زرتشت اللہ کی طرف سے اپنی قوم کے لیے مصلح تھے۔ زرتشتی مذہب کے بنیادی عقائد اور اسلام میں کافی حد تک یکسانیت اور موافقت ہے۔ ہر دو خدا کی وحدانیت اور رحمت پر ایمان لاتے ہیں۔ ہر دو انسانی زندگی کو ایک اخلاقی جنگ قرار دیتے ہیں۔ اس جنگ میں انسان اچھائی کے انتخاب میں صاحب اختیار ہے، جس کے ذریعہ وہ اپنی تکمیل کے مراحل طے کر سکتا ہے، یا برائی اختیار کر کے خدا اور اپنے مقصد حیات سے دور رہنے پر قادر ہے۔

ہر دو کا حیات بعد الموت پر اعتقاد ہے۔ جب انسان کے اعمال کی اچھائی اور برائی نکھر کر سامنے آئے گی اور وہ اس کا بدلہ پا کر جنت میں لامحدود روحانی ارتقاء کی زندگی میں داخل ہوگا۔ یا گناہ کے باعث ایک ایسے مقام پر وارد ہوگا جہاں اسکی روح سے گناہ کے داغ جلائے جائیں گے تا کہ وہ ابدی زندگی کا اہل ہو جائے۔ ہر دو کی اخلاقی تعلیم تقریباً یکساں ہے۔

اس کے برعکس جب ہم آج کل کے زرتشتی مذہب کا جائزہ لیتے ہیں تو حسب ذیل اختلافات پاتے ہیں۔

	اسلام		مجوسیت
۱۔	اسلام ایک تاریخی مذہب ہے اور اس کے بانی کی زندگی اور تعلیمات کی تمام تفاصیل قرآن اور احادیث کی ایسی کتب میں محفوظ ہیں جو تنقید کے ہر معیار پر پوری اترتی ہیں۔	۱۔	مجوسیت قصے اور کہانیوں کا مرقع ہے۔ زرتشت کی زندگی افسانوی عنصر میں اس قدر پوشیدہ ہے کہ اسکے بارہ میں کوئی بات بلا تردید کہنا محال ہے، حتیٰ کہ زرتشت کے نام کے صحیح تلفظ کے متعلق گیارہ مختلف رائیں ہیں۔ اس نام کے معنوں میں بیسوں شبہات ہیں۔ اسی طرح ان کی جائے پیدائش اور وطن کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ انہی اختلافات کی وجہ سے بعض محققین نے زرتشت کا وجود ہی وہمی قرار دیا ہے۔
۲۔	اسلام کا الہامی صحیفہ یعنی قرآن مجید بغیر کسی تحریف کے اسی شکل میں موجود ہے جس شکل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔ تمام مستشرقین کا اس بارہ میں اتفاق ہے۔	۲۔	مجوسیت کے صحائف تباہی کا شکار ہونے کے صدیوں بعد پروہتوں کی یادداشت کی بناء پر تالیف ہوئے۔ پھر پروہتوں کی نوشتہ تفسیریں متن کے ساتھ اس طرح غلط ملط ہوئیں کہ ہر ایک کی الگ حیثیت مقرر کرنا محال ہے۔ ژنداوستا کا بہت ہی قلیل حصہ زرتشت کی اپنی تعلیمات کا آئینہ دار قرار دیا جا سکتا ہے۔

اسلام	مجوسیت
۳۔ اسلام صرف ایک اور ایک ہی خدا پر جو خالق اور رب العالمین ہے ایمان لانے کی تلقین کرتا ہے۔	۳۔ مجوسیت دو خداؤں یعنی اہورمزدا اور اہرمن کا تصور پیش کرتی ہے اور اہورمزدا کے ساتھ امیشیا پینتا کو لازم قرار دیتی ہے۔ علاوہ ازیں اس نے ان قدیم دیوتاؤں کا، جن پر زرتشت سے پہلے اعتقاد رکھا جاتا تھا، احیاء کیا ہے۔
۴۔ اسلام سادہ اور عقل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ اپنے معتقدوں کی اخلاقی تنظیم کے لیے اس کی رسمیں بہت کم ہیں۔ بلند اخلاق اور خدمت خلق پر زور دیتا ہے۔	۴۔ مجوسیت کے گرد دیومالا اور عجیب فوق الفطرت عناصر کا ایک طومار ہے اور پارسیوں کے ہاتھوں سراسر رسومات کا پلندہ بن گئی ہے، جس کا اہم ترین جزو آتش پرستی ہے۔
۵۔ اسلام عالمگیر اور آفاقی مذہب ہے انسانی اخوت اور مساوات کا علم بردار ہے۔ اس میں نسل آدم کے ہر فرد کے لیے جگہ اور مقام ہے۔	۵۔ مجوسیت ایک قومی مذہب ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زرتشت کے صحیح مذہب کی تجدید کی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں تمام بنی نوع انسان کی راہنمائی کے لیے اس کی تکمیل ہوئی۔ اسی تکمیل شدہ مذہب کا نام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی الٰہی سے اسلام رکھا۔

مانوی مذہب

۱۔ مانی طیغون کے شہر ۲۱۵ء میں پیدا ہوا۔ طیغون عراق میں دجلہ کے مشرقی کنارے پر موجودہ بغداد سے بیس میل جنوب میں واقع تھا۔ اشکانی خاندان کے آخری بادشاہوں کا پایہ حکومت تھا۔ اس کے والد کا نام فتق تھا۔ جو یہودی فرقہ مغتسلہ کا پیروکار تھا۔ ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ ان کے نزدیک دریا میں مسلسل غسل کرنا بدن اور روح دونوں کی پاکیزگی کے لیے ضروری ہے۔ اس فرقے کے اکثر عقائد غناسطی یا عرفانی اصولوں سے متاثر تھے۔ عرفانی تحریک کے تین بنیادی اصول تھے اور مادی دنیا فطرتاً بدی کی حامل ہے اور اس مادی دنیا کے مقابل ایک اعلیٰ دنیا ہے جس کی طرف روح انسانی نے جانا ہے۔

۲۔ روح کا اصلی وطن وہی اعلیٰ دنیا ہے۔ جہاں سے کسی افاقی حادثے کے باعث شعوری زندگی سے پہلے ہی وہ نچلی دنیا میں پھینک دی گئی۔

۳۔ روح کی آزادی صرف خدائی کوشش سے ممکن ہے، کیونکہ مادہ میں قید ہو جانے کی وجہ سے اس کی فطری قوت بے کار ہو چکی ہے۔

زرتشی مذہب اپنی حقیقت اور اصلیت کھو بیٹھا تھا۔ اسی طرح دوسرے توحیدی مذہب کی تعلیم میں شرک اور بت پرستی نے جگہ لے لی تھی اس مشرکانہ فضا اور ماحول میں پرورش پائی۔ ابن ندیم کی روایت کے مطابق ۱۲ سال کی عمر میں (۹/ ۲۲۸ عیسوی) پہلی وحی ہوئی۔ بقول مانی یہ وحی ملک جنان النور یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی۔ وحی لانے والے فرشتے کا نام ''التوم'' تھا۔ جس کے لفظی معنی ''قرین'' ہیں۔ پہلی وحی کے ذریعہ مندرجہ ذیل مقالات دیے گئے۔ (۱) آج سے تم اپنی قوم سے علیحدہ سمجھو۔ (۲) ان سے ایک طرف ہو جاؤ۔ (۳) پاکیزہ روی اختیار کرو۔ (۴) شہوات ترک کر دو۔ (۵) جب تک تم کم سن ہو، اس وقت تک نہ اپنے مذہب کا اظہار کرو اور نہ تبلیغ کا۔

پہلی وحی کے آنے کے ۱۲ سال بعد یعنی ۱/ ۲۴۰ء میں جب اس کی عمر ۲۴ سال تھی مانی کو دوسری وحی ہوئی۔ اس دفعہ یہ حکم ہوا ''دیکھو! وقت آ گیا ہے کہ اپنے مذہب کا اظہار کرتے ہوئے تبلیغ شروع کر دی جائے۔'' فرشتے نے مانی سے یہ بھی کہا ''اے مانی میں اپنی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو سلام کہتا ہوں آپ کو اس راہ میں بے حد مشقت برداشت کرنا پڑے گی۔''

اثار الباقیہ میں بیرونی نے مانی کی کتاب شاہ پورگاں سے مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے۔ مختلف زمانوں میں خدا کے نبی انسانوں کو حکمت اور نیک اعمال کی تلقین کرتے آئے ہیں۔ ایک زمانے میں بدھ نے ہندوستان میں یہ پیغام دیا۔ دوسرے زمانے میں زرتشت نے ایران میں اور عیسیٰ نے مغربی علاقے میں۔ اس آخری زمانے میں وحی اور خدمت میرے (یعنی مانی کے) ذریعے بابل کے شہر میں نازل ہوئی۔"[1]

مانی نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی۔ جس کی تبلیغ اس نے شاپور اوّل کے عہد سے ۲۴۰ء میں شروع کی۔ کہا نہیں جاسکتا کہ شاپور نے مانی کے مذہب کو تسلیم کیا تھا یا کہ نہیں لیکن یہ بات ثابت ہے کہ شاپور سے مانی کے تعلقات اچھے تھے اور اس نے مانی اور اس کے متبعین کو کبھی تنگ نہیں کیا۔ ابن ندیم کی روایت ہے کہ مانی نے بادشاہ سے دو معاملات کی درخواست کی۔ مانی کے داعیوں کی ان کے وطن کے ہر شہر اور قریہ میں تعظیم کی جائے (۲) ان کی تبلیغ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے۔

تاریخ سے یہ بات ہے کہ شاپور کا بھائی پرویز مانی کا مربی تھا لیکن ایرانی کاہنوں اور زرتشی مذہب کے پیروکاروں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مانی کو ملک چھوڑنا پڑا۔ اس نے وسط ایشیا، چین اور ہندوستان کا سفر اختیار کیا۔ پھر وہ ترکستان آیا۔ یہاں اس نے ایک سنسان وادی میں خلوت اختیار کرلی اور ایک کتاب 'ارژنگ یا ارتنگ" تیار کرلی۔ اس کتاب کو لے کر واپس ایران آیا۔ اب اسے نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ شاپور کی وفات کے بعد (۲۷۲ء) اس کا لڑکا ہرمزد اوّل تخت پر بیٹھا۔ اس نے مانی کے متعلق اپنے باپ کی پالیسی کو برقرار رکھا۔ وہ ۲۷۳ء میں فوت ہوگیا۔ ہرمزد کی وفات کے بعد بہرام اول تخت نشین ہوا۔ بہرام نے مانی اور اس کے متبعین پر سختیاں کرنا شروع کردیں۔ مانی نے وطن سے بھاگ جانے کی کوشش کی لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکا۔

۲۷۷ء میں مانی کو گرفتار کرکے بہرام کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے اس کی کھال کھنچوا کر بھس بھروادیا۔ مانی کی کھال کا پتلا ایک عرصہ تک شہر شاپور کے پھاٹک پر عبرت کے لیے رکھا۔

اس ظلم کو دیکھ کر مانی کے پیروکار بلاد مشرق کی طرف بھاگ گئے۔ وسط ایشیا اور چین میں مانوی مذہب خوب پھیلا تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں مانی مذہب مغربی ایشیا شمالی افریقہ، جنوبی یورپ، گال (فرانس) اور اسپین میں پھیل گیا۔ لیکن ساتویں صدی میں اس کا اثر زائل ہونے لگا اور تیرھویں صدی میں بالکل مٹ گیا۔

مانی کی سات تصنیفات میں چھ سریانی زبان میں ایک پہلوی میں آخری کا نام شاپورگان ہے جو شاپور کے نام معنون ہے۔ یہ کتاب بادشاہ شاپور کے لیے تصنیف کی گئی تھی۔ ۱۹۰۴ء میں قان می کاق نامی محقق نے طرفان (وسط ایشیا) سے بعض مانوی صحایف برآمد کیے۔

---

[1] بحوالہ رسالہ ثقافت مئی ۱۹۷۵ء شمارہ ۵۔

تعلیمات

مانی ثنویت کا علمبردار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ خالق دو ہیں، خالق خیر، خالق شر اور اس کے نزدیک دو ازلی اور ابدی عناصر ہیں یعنی نور اور ظلمت کی آمیزش سے یہ دنیا وجود میں آئی۔ ہر چیز میں نور ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ظلمت کے عناصر نور کے عناصر پر حملہ آور ہیں اور دونوں دست وگریباں ہیں۔ انسان کا یہ فرض ہے کہ نور کے عناصر کو ظلمت کے عناصر کی قید و بند سے آزاد کرائے۔ اس کے لیے مجاہدہ، عبادت، ریاضت بہت ضروری ہے۔

ابن ندیم نے مانویوں کی نماز کے چند الفاظ نقل کیے ہیں جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ ہمارا ہادی نور کا سفیر مبارک ہے۔ اس کے محافظ فرشتے مبارک ہیں اس کے منور ملائکہ کی مدح ہو۔

۲۔ مانی، اے منور ہستی تو قابل ستائش ہے۔ ہمارے ہادی، نور کے سرچشمے، حیات کی شاخ، اے شجر عظیم جو کہ سراپا شفا ہے۔

۳۔ میں سربسجود ہوتا ہوں اور حمد کرتا ہوں کل دیوتاؤں کی۔ نورانی فرشتوں کی، کل تجلیات کی سب ملائکہ کی جن کا منبع خداوند تعالیٰ ہے۔

۴۔ میں سر جھکاتا ہوں اور مدح کرتا ہوں گروہ ملائکہ کی اور منور دیوتاؤں کی جنھوں نے اپنی دانش سے تاریکی میں نفوذ کر کے اسے زیر کیا اور دفع کیا۔

۵۔ میں سجدہ کرتا ہوں اور تمجید کرتا ہوں رب ذوالجلال کی۔ ہستی عظیم اور سراپا نور کی۔[1]

دس احکام

مانی کے دس احکام ہیں۔

مندرجہ ذیل برائیوں سے بچو:۔ ۱۔ بت پرستی۔ ۲۔ جھوٹ۔ ۳۔ لالچ۔ ۴۔ قتل وخون۔ ۵۔ زنا۔ ۶۔ چوری۔ ۷۔ جادو یا اس طرح کے منتر جنتر۔ ۸۔ مذہب کے متعلق شکوک وشبہات کا شکار ہونا۔ ۹۔ کاروبار میں سستی اور بے پروائی۔ ۱۰۔ دن میں چار (یا سات) دفعہ نماز ادا کی جائے۔[2]

---

[1] خدا اور تصور خدا ص ۱۷۱ مصنفہ علامہ نیاز فتح پوری۔

[2] یہ فہرست ابن ندیم سے لی گئی ہے۔

باب ۴

چینی مذاہب

تاؤ ازم

کنفیوشس ازم

تاؤازم (Taoism)

چین کی تاریخ تقریباً ۲۷۰۰ قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے۔ قدیم گیتوں کی جو نامکمل کتابیں دستیاب ہوئی ہیں اور شیہ چنگ (Shihching) کہلاتی ہیں اور ایرانی تاریخی اسناد جو شو چنگ (Shu-ching) کے نام سے موسوم ہیں، ان کے بارے میں یہ عمومی اعتقاد ہے کہ کنفیوشس (Confucious) کی زیر ادارت مدون ہوئیں اور دوسری روایات بھی اس امر کی شاہد ہیں کہ قدیم چین میں توحید پرستی کا دور دورہ تھا اور وہ خدائے واحد، سعادت مطلق یا حاکم مطلق کے نام سے باری تعالیٰ کو یاد کرتے تھے۔ اسی ذات نے کائنات پیدا کی ہے اور وہ جزاء و سزاء کے قائل تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد مذہب اپنی خوبیاں کھو بیٹھا۔ توحید کی جگہ شرک نے لے لی اور عقل کی جگہ توہمات اور رسومات نے۔ ذات مطلق کے حضور قربانی خصوصاً بیلوں کی قربانی کے رواج کا آغاز ہوا۔ واقعات اور حادثات کی خبر پہاڑوں پر آگ جلا کر بھیجی جاتی تھی اور یہ بات ایمان میں شامل ہوگئی کہ اس آگ کا دھواں زمین کے باسیوں کی مصیبتوں اور مسرتوں کی روئیداد ذات باری تعالیٰ سے بیان کرے گا طبعی طاقتیں آندھی، رعد، دریا اور زمین بھی لائق پرستش قرار دے دی گئیں بلکہ یہی چینی مذہب کی ایک نمایاں خصوصیت ہوگئی۔

چھٹی صدی ق م تک چین مذہبی اور سماجی اعتبار سے دیوالیہ ہو چکا تھا۔ اس ظلمت اور گمراہی کے دور میں تین عظیم مذہبی رہنما لاؤزے (Lao-tze) اور کنگ فوتزو (Kung Fotuzu) یا کنفیوشس (Confucious) پیدا ہوئے۔ ان کے مذہبی نظریات ایک دوسرے کی تردید نہیں بلکہ تکمیل تھے۔ پہلے تاؤ ازم کا ذکر کیا جاتا ہے۔

لاؤزے بحیثیت مصلح

بعض محققین نے یہ ماننے سے انکار کر دیا ہے کہ اس نام کی کوئی ہستی پیدا ہوئی تھی۔ جس طرح کرشن جی مہاراج کا وجود خیالی قرار دے دیا ہے۔ اسی طرح دنیا کی بعض اور مشہور ہستیوں کے وجود سے بھی انکار کیا جا چکا ہے لیکن یہ انتہا پسندانہ نظریہ ان بندگانِ خدا کے وجود کی تاریخی شہادتوں کے سامنے قائم نہیں رہ سکتا۔ بات صرف یہ ہے کہ افسانوی عنصر تاریخی واقعات پر اس قدر غالب ہے کہ ان کی اصلی شخصیت نگاہوں سے اوجھل ہوگئی ہے۔

لاؤزے ۶۰۴ قبل مسیح میں ٹشو Tchu کے صوبہ میں پیدا ہوا۔ لاؤزے کے لفظی معنی ہیں "بوڑھا فلسفی یا بوڑھا لڑکا (کہتے ہیں وہ پیدا ہوا تو اس کے بال سفید تھے) اس کا اصلی نام لی پہ یانگ تھا، جس کے معنی بیر کے ہیں۔ کنفیوشس کا ہمعصر تھا۔ اس نے بڑی طویل عمر پائی اور اگلی صدی کے اختتام تک زندہ رہا۔ اس کی پیدائش کے متعلق عجیب وغریب افسانے بنے ہوئے ہیں کہ وہ اکیاسی سال تک ماں کے پیٹ میں رہا، اور جب وہ پیدا ہوا تو اس کا سر سفید اور عقل پختہ تھی۔ یہ بھی دعویٰ ہے کہ اسے ایک کنواری نے جنم دیا۔ اس کے بارہ میں جو قلیل معلومات موجود ہیں ان کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ افلاس اور غربت کی وجہ سے چو (Chou) خاندان کی تاریخی دستاویزات کے محافظ کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی، جہاں اسے کتب کا مطالعہ کرنے کا خوب موقع مل گیا۔ جب اپنی تعلیمات کی اشاعت شروع کی تو لوگوں نے اسے لاؤزے یعنی بوڑھے فلسفی کا لقب دیا اور اسی لقب سے مشہور ہوا۔

ملازمت سے استعفاء

حاکمانِ ملک کی دغا بازیوں اور ظلم وستم سے نالاں ہو کر ملازمت سے استعفا دے دیا اور لنگ پو (Lingpo) کی پہاڑیوں پر سکونت اختیار کر کے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگا۔ درے کے ایک محافظ نے لاؤزے سے درخواست کی کہ وہ اپنی تعلیمات کے بنیادی اصول اسے لکھوا دے۔ اس طرح لاؤزے نے اپنے فلسفیانہ خیالات لکھوا دیے، جس کا نام تاؤتی چنگ (Tao-te-ching) ہے، یعنی کتاب صراط مستقیم۔ ٹی Te کے معنی راستہ کے ہیں اور راستہ خیر کا قرار دیا گیا ہے اور تاؤ Tao چین کے فلسفہ کا نام ہے۔ اب یہ کتاب ۵۰۰۰ لفظوں پر مشتمل ہے اور اس کے ۸۱ باب ہیں۔ اکثر محققین کی یہ رائے ہے کہ یہ لاؤزے کی اصل کتاب کا محرف اور مسخ شدہ نسخہ ہے۔ کچھ اسے سراسر غیر مستند اور ناقابل اعتماد قرار دیتے ہیں۔ اس امر کی صراحت کی کوئی ضرورت نہیں کہ یہ نظریہ انتہا پسندانہ ہے۔ گزشتہ صدیوں کی فروگزاشتوں اور اضافے کی گنجائش قبول کرتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ اس کتاب کا بہت سا حصہ لاؤزے کے اپنے اقوال پر مبنی ہے۔

تاؤازم کی تعلیمات

تاؤتی چنگ (Tao-te-ching) میں اہم ترین لفظ تاؤ ہے۔ اس کے متعدد معانی بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً خدا، آفاقی عقل کل، بے علت وجود یا علت العلل، امن کا راستہ، بولنا اور گفتگو کرنا، اصول وقانون۔

تاؤ کی صفات

۱۔ اس کا وجود ہمیشہ سے ہے۔ ۲۔ تاؤ ہر جگہ موجود ہے۔

۳۔ تاؤ ہی کی ذات سے تمام کائنات کی عظمت اور شان وشوکت قائم ہے۔

۴۔ چاند اور سورج اپنے مدار پر اسی کی وجہ سے گھومتے ہیں۔ ننھے ننھے کیڑوں کو زندگی بخشنے والا ہے۔

۵۔ تاؤ کا جسم نہیں، وہ ایک لطیف چیز ہے۔ تمام اجسام اسی کے پیدا کردہ ہیں۔ اس کی اپنی کوئی آواز

نہیں، تمام آوازیں اس کی بنائی ہوئی ہیں۔

۶۔ تاؤ غیر متحرک ہے، بایں ہمہ تمام کا خالق اور رازق ہے۔

۷۔ وہ ناقابل تقسیم ہے۔

تاؤ فلسفہ کے ماہر ہوائی مان زو (Huai-man-zu) نے ان صفات کو نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے، وہ لکھتا ہے:

''تاؤ ہی آسمان کا سہارا دینے والا اور زمین کا بچھانے والا ہے۔ جس کی نہ کوئی حد ہے اور نہ انتہا۔ جس کی بلندی ناپی نہیں جاسکتی اور نہ ہی اس کی گہرائی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تمام کائنات اس کے قبضہ قدرت میں ہے...... وہ بے حد لطیف اور باریک ہے۔ ہر شے میں اس طرح موجود ہے جس طرح کہ پانی دلدل میں ہوتا ہے۔ پہاڑوں کی بلندی اور غاروں کی پستی تاؤ ہی کے دم سے قائم ہے۔ جانوروں کا چلنا، پرندوں کا اُڑنا، چاند اور سورج کی روشنی کی گردش سب اسی کے فیض کے کرشمے ہیں۔ بہار کی ٹھنڈی ہوائیں وہی چلاتا ہے اور برسات کی سہانی بارش وہی برساتا ہے۔ پرندوں کے انڈے وہی دلاتا ہے، ان انڈوں سے بچے وہی نکالتا ہے۔ جب درختوں سے پتیاں نکلتی ہیں، انڈوں سے بچے اور رحم سے اولاد پیدا ہوتی ہے تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب کے سب کام خود ہورہے ہیں کیونکہ کرنے والے کا ہاتھ ہم کو نظر نہیں آتا۔ تاؤ دھندلے سے سائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا جسم نہیں۔ اس کے ذرائع غیر محدود اور پوشیدہ ہیں۔ لیکن تمام چیزوں کو عدم سے وجود میں لانے والا وہی ہے۔ اس سے کبھی کوئی بے کار اور غیر مفید کام نہیں ہوا۔[۱]

اَمولیہ رنجن مہاپتر تاؤ کا ذکر کر کے لکھتا ہے۔ ''لاوزے کے مطابق تاؤ واحد ہے یہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ یہ لافانی ہے اور ناقابل تردید ہے یہ بے نام اور غیر مادی اور حسیات سے ناقابل ادراک ہے ہم اسے دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھتے، ہم اسے ''یکساں رو'' کا نام دیتے ہیں۔ ہم اسے سنتے ہوئے بھی نہیں سنتے اور اسے ''ناقابل سماعت'' کا نام دیتے ہیں۔ ہم اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سمجھ نہیں پاتے اور اسے ''لطیف'' کا نام دیتے ہیں۔ ان میں خصوصیات کی وجہ سے تاؤ کو بیان نہیں کیا جاسکتا، تاہم ان تینوں کو ملا کر ہم واحد کو حاصل کرتے ہیں۔'' (فلسفہ مذاہب ص ۲۱۷)

تاؤ کی معرفت

لاوزے کا تاؤ بہت مبہم ہے اور وہ فہم سے بالاتر ہے۔ اس کے متعلق وہ خود کہتا ہے کہ تاؤ کے متعلق معلومات حاصل کرنا یا اس کی معرفت تک پہنچنا مشکل کام ہے کیونکہ اس کا حصول قوت بازو پر منحصر ہے نہیں اور نہ ہی دوسروں کی مدد اس سلسلہ میں کارآمد ثابت ہوتی ہے کیونکہ جو تاؤ کے متعلق بتلاتے ہیں وہ اس کی بابت کچھ نہیں جانتے اور جو جانتے ہیں وہ اس کے متعلق گفتگو نہیں کرتے۔ تاؤ کے متعلق ہم سب یہ جانتے ہیں کہ وہ ہے اور اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جان سکتے تاوقتیکہ اس کے جاننے سے پہلے ہم سب کچھ نہ جان لیں۔[۲]

۱۔ بحوالہ دنیا کا مذہبی نظام ص ۷۸۔

۲۔ گیر ''بڑے مذاہب کا آغاز کیونکر ہوا؟'' بحوالہ تاریخ مذاہب مصنفہ رشید احمد ص ۱۲۶، ۱۲۷۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۸ء۔

اخلاق

لاؤزے کی اخلاقی تعلیمات کا اہم پہلو عدم مداخلت ہے۔ اس کا قول ہے کہ اگر بنی آدم اس اصول کو اپنا لیں تو جنگ و جدل، حرص و ہوس اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ اس نے انکساری اور محبت کا سبق دیا اور خود ادعائی، غرور اور بالادستی کو مذموم قرار دیا۔ وہ کہتا ہے۔ ''کہ اگر تم کسی سے جھگڑا نہ کرو گے تو کوئی تم سے جھگڑا نہ کرے گا۔ اگر کوئی تکلیف بھی پہنچائے تو تم اس سے نیکی کرو۔ جو اچھے ہیں میں ان سے اچھا ہوں، جو بُرے ہیں میں ان سے بھی اچھا ہوں، لہٰذا سب کو اچھا ہو جانا چاہیے جو مخلص اور راست باز ہیں میں بھی ان سے مخلص اور راست باز ہوں، اور جو مجھ سے مخلص اور راست باز نہیں ہیں۔ میں ان سے بھی مخلص اور راست باز ہوں۔ نرم اور نازک ترین شے دنیا میں سخت ترین شے کو توڑ ڈالتی ہے۔ دنیا میں پانی سے زیادہ کوئی نرم شے نہیں۔ لیکن سخت ترین چٹانوں کو پانی کاٹ ڈالتا ہے۔''[1]

اس کا خیال ہے کہ اصلاح سزا اور تعذیب سے نہیں ہو سکتی۔ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ محبت اور نرمی سے بڑے بڑے گناہ گاروں اور سرکش انسانوں کو راہ راست پر لایا جا سکتا ہے۔

لاؤزے نیکوکار کو پانی سے تشبیہ دیتا ہے کہ بنی آدم میں سب سے اچھا پانی کی مانند ہے۔ پانی ہر شے کو فائدہ دیتا ہے اور کسی سے مقابلہ نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ ایسی پست جگہوں میں جمع ہوتا ہے جو حقیر سمجھی جاتی ہیں۔

لاؤزے کے نزدیک سب سے بہترین وہ شخص ہے جو بنی آدم سے محبت کرے اور کسی سے نفرت نہ کرے۔

جذبات پر قابو پانا

لاؤزے سفلی خواہشات اور جذبات پر غلبہ پانے پر بہت زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو دوسرے پر غالب آ جاتا ہے وہ قوی ہے اور جو خود بخود غالب آ جاتا ہے وہ قوی تر ہے۔[2] اور دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں کہ انسان اپنی خواہشات کا غلام بن کر رہ جائے۔ لالچ سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں اور حرص سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں۔ حرص سے بڑھ کر کوئی وبال نہیں۔[3]

حیات بعد الممات

لاؤزے حیات بعد الممات کا قائل ہے۔ وہ اس کو خوش گوار تبدیلی قرار دیتا ہے۔ لیہ زو کا کہنا ہے کہ موت ہر ذی حیات پر لازمی آئے گی، اس وجہ سے اس سے ڈرنا نہیں چاہیے۔[4]

---

[1] فلسفہ اسلام حصہ اول مصنفہ آغا محمد سلطان مرزا دہلوی بی اے، ایل ایل بی ص ۱۴۹۔

[2] بحوالہ دنیا کا مذہبی نظام صفحہ ۸۰۔ [3] بحوالہ دنیا کا مذہبی نظام ص ۸۰۔

[4] بحوالہ دنیا کا مذہبی نظام ص ۸۱۔

ایک اور موقع پر کہتا ہے:

''موت اور زندگی میں وہی تعلق ہے جو جانے اور آنے میں ہے۔ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس دنیا سے کوچ کرنے کے معنی دوسری دنیا میں پیدا ہونے کے نہیں ہیں اور کیا انسان زندگی سے محبت کر کے بہت فریب میں مبتلا نہیں ہے۔ میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں مر جاؤں تو میری زندگی اس زندگی سے زیادہ خوشگوار ہوگی جو پیدا ہونے سے پہلے تھی۔ افسوس کہ انسان موت کی ہولناکیوں سے تو واقف ہے لیکن اس کی راحتوں کو نہیں جانتا۔ انسانی زندگی کا تابناک پہلو ہی یہی ہے کہ ازل ہی سے موت تمام انسانوں کا نوشتہ تقدیر بنی ہوئی ہے۔ موت نیکوں کے لیے سکون اور بُروں کے لیے پردہ ہے۔ موت گھر کی طرف واپس کے مترادف ہے۔ مردے وہ ہیں جو اپنے گھروں کو جا پہنچے اور زندہ ابھی تک بھٹکتے پھر رہے ہیں۔''[1]

حکومت کے متعلق تعلیم

لاؤزے کے نزدیک بدترین حکومت وہ ہے جس میں فلاسفر حکمران ہوں۔ کیونکہ علماء اور فلاسفر اپنے علم کو بدی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

لاؤزے نے یہ نظریہ اور خیال اپنے دور کے بڑے علماء اور فلاسفروں کو دیکھ کر پیش کیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے علم کو لوگوں کی ہدایت کی بجائے بدی اور برائی کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر یہ نظریہ پیش کیا کہ حکمران سیدھا سادہ اچھا ہوتا ہے کیونکہ وہ رعایا کو اپنا طرز عمل خود مرتب کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ جس سے لوگوں کی مخفی استعدادیں اور اخلاقی قوتیں اپنا عمل کرنا شروع کر دیتی ہیں۔

نیچر سے لگاؤ

لاؤزے نے نیچر پر بڑا زور دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح نیچر میں تمام چیزیں خاموشی سے اپنا کام سرانجام دے رہی ہیں، اسی طرح انسان کو بھی بغیر کسی حرص اور شہرت کا خیال کیے کام میں مشغول رہنا چاہیے۔ اس سے سکون اور راحت نصیب ہوتی ہے۔

مابعد تاؤازم

تقریباً ہر مذہب میں مرور زمانہ کے ساتھ خارجی عناصر شامل ہوتے رہتے ہیں۔ یہی ستم تاؤازم کے ساتھ ہوا۔ اس مذہب کے بگڑنے کی دو وجوہ ہیں۔

ایک وجہ یہ ہے کہ اس کے کچھ صحائف تلف ہو گئے اور کچھ محرف۔ جو کچھ بچا وہ مفسرین کی تاویلوں کی تاریکی کے نیچے آ کر اپنی روشنی کھو بیٹھا۔ عوام اپنے آقا کے اقوال کی معنویت تک پہنچنے کی صلاحیت سے عاری ہو گئے۔

---

[1] دنیا کا مذہبی نظام ص ۸۱۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ اس مذہب کے نظریات فلسفیانہ تھے جن کو عوام آسانی سے سمجھ نہیں سکتے تھے۔ ان فلسفیانہ نظریات کی عجیب وغریب تشریح کی جانے لگی۔ لائزو نے کہا کہ انسان فطرت کے ساتھ منفعلانہ اتحاد کے ذریعہ غیر فانی بن سکتا ہے۔ لاؤزے کے بعد اس نظریہ کی روشنی میں یہ کوشش کی جانے لگی کہ حیات جاودانی کا کوئی نسخہ مل جائے۔ چنانچہ لاؤزے کے پانچ سو سال کے بعد ایک شخص چنگ تاؤلنگ نے یہ اعلان کیا کہ اس نے ایک ایسا شربت تیار کیا ہے کہ جو شخص اس کو پی لے گا وہ حیات جاودانی سے ہمکنار ہو جائے گا۔ یہ شخص تاؤوں کا معبود بن گیا۔ اس طرح اس ''مت'' میں شرک، سحر وفسوں اور توہم پرستی نے جگہ حاصل کر لی۔

اسلام اور تاؤازم

تاؤتی چنگ کے موجودہ نسخہ میں صرف ایک لفظ تاؤ ہی ہے جس کے کئی ایک معنی ہیں، جو تصور ذات کی عکاسی کرتا ہے۔ فی زمانہ تاؤازم کے پیرو کئی دیوتاؤں اور ارواح کو مانتے ہیں۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ لاؤزے ایک ازلی اور ابدی روحانی ہستی کا قائل تھا۔

''بدل وجان ایک ہی سے لپٹے رہو تو تاؤ تمہاری یاد سے محو نہیں ہوگا۔ اپنی تمام تر قوت اور توجہ حصولِ شرافت پر مرکوز رکھو تو ہی تم نوزائیدہ بچے کی طرح ہو سکو گے۔ اپنی بصیرت، وجدان اور ضمیر کو پاک و صاف رکھ کر ہی تم کمال حاصل کر سکتے ہو۔ رعایا پر شفقت اور نظام امور سے حکومت کے قیام و دوام کی مشکلات پر غلبہ حاصل کر سکو گے۔''

تاؤتی چنگ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لاؤزے ایک سچے خدا پر ایمان رکھتا تھا اور خود کو اس کی رضا کے تابع کرنے میں ہی عظیم تر نیکی قرار دیتا ہے۔ وہ لوگوں کو خدا کی محبت اور عشق میں قائم رہنے کی تلقین کرتا تھا۔ تاؤازم کی اخلاقی تعلیم اخلاق کے ان ہمہ گیر اصولوں پر حاوی ہے۔ جو تمام الہامی مذاہب کی روح ہیں۔ امراء کے ظلم وتشدد کے دور میں اس نے نیکی، سکون، عدم مداخلت اور صلح پر زور دیا۔ ایک ایسے سماج میں جہاں خود غرضی، لوٹ کھسوٹ اور نفسا نفسی کا دور دورہ تھا۔ اس نے بدی کا بدلہ نیکی سے چکانے کو فرض قرار دیا۔ تاہم تاؤازم ایک مکمل دین نہیں ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کی راہنمائی نہیں کرتا۔ جس صورت میں یہ آج کل رائج ہے اسے کفر، الحاد اور توہم پرستی سے ممیز کرنا ناممکن ہے۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کی راہنمائی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہر شرک سے پاک ٹھہراتا ہے۔ نیکی اور بدی کے مسئلہ کو واضح طور پر بیان کرتا ہے۔ حشر ونشر کی تعلیمات کے ہر گوشہ پر روشنی ڈالتا ہے۔ اسلامی تعلیم تمام اقوام اور زمانوں کے لیے ہے اور ہر دور کی ضرورت کو کما حقہ، پورا کرتی ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ خدا نے ہر قوم میں مختلف زمانوں میں نبی بھیجے اور ہر ایک کے پاس اس قوم کی ضرورت کے مطابق خدا کا پیغام تھا۔ اسلام کا پیغام سب دنیا کے لیے ہے اور دنیا کے سب لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے آیا ہے۔

کنفیوشس مذہب

چین کے دو مذہب تاؤ ازم اور کنفیوشس ازم مشہور ہیں، لیکن کنفیوشس کے مذہب نے چین پر دیرپا اثرات چھوڑے ہیں۔ ایسے انقلابی دور میں زندگی بسر کرتے ہوئے جب کہ امراء کی باہمی لڑائیاں زوروں پر تھیں کنفیوشس (Confucious) نے سماجی یک جہتی اور توازن پر زور دیا۔ سماجی ہم آہنگی کی اہمیت کی نشاندہی کی۔ وہ اپنے ہم وطنوں کی نظر میں رہبر اعظم یا حکیم الحکماء کا درجہ رکھتا ہے۔

کنفیوشس بحیثیت مصلح

یہ فلاسفر موضع کوفو Ch'ufu میں جو سلطنت لیو (Lu) موجودہ صوبہ شان تنگ (Shantung) میں ہے۔ ۵۵۰ ء ق۔م یا ۵۵۱ ء میں پیدا ہوا اور ۴۷۹ ق م میں وفات پائی۔ والدین نے نام کنگ چن رکھا لیکن تاریخ میں کنفیوشس کے نام سے مشہور ہوا۔ بچہ کی پیدائش کے وقت والدین اپنی عمر کی سترویں بہار دیکھ چکے تھے۔ جب کنفیوشس تین سال کا ہوا تو باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس عہد کے سربرآوردہ قبیلے کی (Ki) نے اس کی پرورش کی۔ جب انیس سال کا ہوا تو اس نے شادی کر لی۔ ایک بچہ پیدا ہوا۔ چار سال کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور اس کے بعد کوئی شادی نہیں کی۔ چوبیس پچیس سال کی عمر میں اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ تین برس تک اپنی والدہ کا سوگ منایا۔ سب سے پہلے حکومت کے مال خانہ میں ملازمت کی۔ ایک سال کے اندر ہی اپنی عمدہ کارکردگی کی بناء پر زراعت اور جانوروں کے چرواہوں کا نگران مقرر کر دیا گیا۔ ملازمت کے دوران تاریخ، ادب، شاعری اور سیاسیات کے متعلق خوب مطالعہ کیا۔ جب ستائیس سال کا ہوا تو اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور ملازمت سے استعفا دے کر تعلیم و تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا۔ وہ جلد ہی اپنی زاد بوم (Lu) میں ہزاروں شاگردوں کا ہادی بن گیا۔ اس کی تعلیم سقراط کی طرح زبانی ہوا کرتی تھی۔ اس کی تعلیم اور رشد و ہدایت کا اتنا چرچا ہو گیا کہ صوبہ "لو" کے وزیراعظم نے بستر مرگ پر اپنے بیٹے کو وصیت کی تھی کہ وہ کنفیوشس سے تعلیم حاصل کر لے۔

اس زمانے میں ریاست کے تین مقتدر خاندانوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ انجام کار وہ امیر جس کی ملازمت میں کنفیوشس تھا شہر بدر کر دیا گیا۔ کنفیوشس اس کے ساتھ قریبی صوبے ٹسی (Tsi) میں چلا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ واپس لو (Lu) میں آ گیا۔ لیکن اسے مناسب ملازمت حاصل کرنے میں پندرہ سال لگے۔ ۵۱ سال کی عمر میں شہر چنگ تو (Chung-tu) کا قاضی بنا دیا گیا۔ نہایت ہی ایمانداری اور

دیانتداری سے اپنے فرائض سرانجام دیے۔ ایک مثالی نظامیہ اور عدلیہ قائم کرنے میں کامیابی اس کا حصہ تھی۔ ملک میں امن وامان کا پرچم لہرانے لگا۔ امرا کی بالادستی اور رشوت خوری کا بازار ماند پڑ گیا۔ جرائم اور بداخلاقی ناپید ہوگئی۔ وہ اپنی اس ملازمت کے دوران انہی اصولوں کا پابند تھا جن کی تعلیم دیتا تھا۔ عدل وانصاف پر مبنی طرزِ عمل سے اس کے بدخواہ پیدا ہو گئے جو بڑی عیاری اور چالاکی سے اسے شکست دینے کی کوشش میں تھے۔

افسانہ طرازوں نے یوں بیان کیا ہے کہ حاسدوں نے جواں سال امیر ریاست کے دربار میں چند حسین رقاصائیں پیش کیں۔ امیر ان کا والہ وشیدا ہو کر امورِ سلطنت سے غافل ہو گیا اور اس نے عیاشی اور بے راہ روی کو اپنا محبوب مشغلہ بنا لیا۔ ان حالات میں کنفیوشس کا اسے سمجھانا اور تنبیہ کرنا ناگزیر امر تھا۔ امیر اور اس کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد اختلافات اس قدر بڑھ گئے کہ اسے تمام اختیارات سے محروم کر کے ملک بدر کر دیا گیا۔

۴۹۷ ق م سے اس کی سرگردانی کا دور شروع ہوا۔ چند شاگردوں کے ساتھ اس نے جگہ جگہ غریب الوطنی میں زندگی بسر کی۔ اکثر اسے اپنی جان کا خطرہ درپیش رہا۔ کسمپرسی اور مفلسی کے دن ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔ جب ڈیوک گائی (Gae) لو (Lu) کی حکومت پر قابض ہوا تو اس نے ۴۸۳ ق م میں کنفیوشس کو اپنے شہر میں واپس بلایا اور ایک اصلاح اور تعلیم کا سلسلہ از سرِ نو شروع کر دیا۔ ۴۷۸[1] ق م میں کنفیوشس نے وفات پائی۔

تعلیمات

اللہ تعالیٰ کے متعلق نظریہ

کنفیوشس کا قول ہے: "پندرہ سال کی عمر میں مجھے مطالعہ کا شوق ہوا۔ تیس سال کی عمر میں مجھے کردار کی پختگی حاصل ہوگئی۔ چالیس سال کی عمر تک سب ذہنی الجھنوں پر غلبہ پا لیا اور پچاس سال کی عمر میں خدا کا عرفان حاصل کر لیا۔ (اینلیکٹس) (Analects) خدا نے مجھے ون وانگ (Wennwaang) کی قدیم دانائی بخشی، لہٰذا اب مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا (Analects) نور وہدایت ہمیں خدا کی طرف سے حاصل ہوئے ہیں جن کے ذریعے ہم اپنا اور نسل آدم کا احیاء کر کے انسانی کمال تک پہنچ جاتے ہیں۔"

اس مقتدر اور عظیم فلاسفر کے یہ تین قول ہی مغربی محققین کی تمام آراء کا ازالہ کرنے کے لیے کافی ہیں کیونکہ ان کا یہ خیال ہے کہ کنفیوشس خدا کی ہستی کا معتقد نہ تھا، بلکہ صرف ایک لامذہب استاد تھا۔

چینی زبان کے دو الفاظ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ہستی کے تصور کو ظاہر کرتے ہیں:

شنگٹی (Shangti) بمعنی حاکم مطلق اور ٹی ین (T-ien) یعنی آسمان۔

کنفیوشس نے اپنی تقریروں میں ٹی ین کے لفظ کو استعمال کیا ہے۔ ٹی ین (T.ien) خدا کی

[1] بعض روایات کے مطابق ۴۷۹ ق م۔

پروردگاری اور لامحدودیت پر دلالت کرتا ہے۔کنفیوشس کی تعلیم کے مطابق خدا ایسے قانون وضع اور نافذ کرتا ہے جس کے ذریعہ کائنات وجود میں آئی ہے اور اپنے مقررہ وقت تک قائم رہے گی۔وہ اپنی شریعت انسان پر عیاں کرتا ہے جس پر عمل کر کے انسان مقصد حیات اور سعادت ابدی حاصل کر سکتے ہیں۔ اینلیکٹس (Analects) سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ کنفیوشس نے ایسے زمانے میں خدائے واحد کا نام سر بلند کیا جب کہ چین میں فطرتی مظاہر، ارواحِ خبیثہ اور باپ دادا کی روحوں کی پرستش کا رواج تھا۔اس زمانہ میں کنفیوشس نے کہا: خدا ہی حقیقی پناہ گاہ ہے جس کی تلاش ہمیشہ سے جاری ہے۔ جو خدا کو ناراض کرتا ہے اس کی نجات مشکل ہے۔کنفیوشس خدا پر راسخ ایمان اور توکل رکھتا تھا، وہ کہتا ہے کہ اگر خدا چاہتا کہ یہ عمدہ تمدن مٹ جائے تو وہ ایک ذی نفس بھی اس روئے زمین پر نہ چھوڑتا جو اس تمدن کو قائم رکھ سکتے، اور نہ کسی کو اس کی جانب توجہ کرنے کی توفیق دیتا چونکہ خدا نے اسے مٹنے نہیں دیا، لہٰذا کوانگ (Kuang) کے باشندے میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔کنفیوشس کے نزدیک تقویٰ اور راضی بر رضاء الٰہی ہونا ہی صراط مستقیم ہے۔

حیات بعد الممات

حیات بعد الممات اور جزاء وسزا کا تصور کنفیوشس کی تعلیم میں واضح نہیں ملتا۔لیکن بعض ایسے اشارات ضرور ملتے ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ حیات بعد الممات اور جزاء وسزا کا معتقد تھا۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو ایک مانتا ہو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو وہ لازمی طور پر حیات بعد الممات اور جزاوسزا کا معتقد ہوگا۔

ایک موقع پر اس نے کہا کہ اچھے بادشاہ اور نیکوکار عہدہ دار جنھوں نے اپنی زندگی میں نمایاں کام کیے ہوں گے۔ مرنے کے بعد ان کو آسمان پر خدا کی قربت نصیب ہوگی اور ان کو اختیار ہوگا کہ جب چاہیں وہ زمین پر آئیں جائیں اور اپنے عزیزوں کی مدد کریں جو ان کو نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔لیکن ظالم بادشاہ اور بدکار عمال حکومت کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟ اس کے متعلق کنفیوشس بالکل مہر بہ لب ہے۔

کنفیوشس ادبیات میں جہنم کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔البتہ کہیں کہیں ایسے اشارات ملتے ہیں جن سے کوئی یقینی نتیجہ اخذ کرنا ممکن نہیں۔مثلاً یی کنگ (Yeking) نامی کتاب جو کنفیوشس کی خود اپنی تصنیف کہی جاتی ہے، میں ہے: جو خاندان نیکی کرتا ہے وہ یقیناً بے انتہا خوشیاں جمع کر لے گا اور جو گھرانا برائیوں کے درپے ہوتا ہے اسے غیر محدود غم وافسوس سے سابقہ پڑے گا۔[1]

لیکن خوشی سے کیا مراد ہے اور غم کا کیا تصور ہے؟ اس کی تشریح کہیں نہیں ملتی۔ایک اور موقع پر لکھتا ہے: ''والدین کی نیکیاں اور برائیاں بچوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔''[2]

---

[1] دنیا کا مذہبی نظام ص ۴۷ بحوالہ تاریخ مذاہب مصنفہ رشید احمد دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۸ء ص ۱۱۵۔

[2] ایضاً ص ۴۷ بحوالہ تاریخ مذاہب ص ۱۱۶۔

انسان دوستی اور اعلیٰ انسانیت

کنفیوشس انسان کو ہی ہر چیز کا معیار ٹھہراتا ہے۔ اس کا قول ہے: ''سچائی کی عظمت انسان سے ہے نہ کہ انسان کی عظمت سچائی ہے۔'' وہ ایمان رکھتا ہے کہ انسان طبعاً نیک ہے اور وہ نیکی کی طرف رغبت کرے گا، اگر اعلیٰ اور حکمران طبقہ اس کے سامنے اچھی مثال قائم کریں۔ پیدائشی اور موروثی گناہ کے مابعدالطبیعیاتی الزام سے اس کا کوئی سروکار نہیں رہے گا۔ وہ زندگی اور انسان کا دوست ہے۔ کنفیوشس خوب جانتا ہے کہ انسان بغیر کسی الزام کے بوجھ کے کافی دکھی ہے اور ہمیشہ دو خطرات ''تباہ کن عناصر اور بدکردار فرمانرواؤں'' سے دوچار رہا ہے۔ وہ ہمیشہ انسانوں کا معاون رہا ہے اور ان کی تکمیل پذیرانہ صلاحیتوں پر اعتماد رکھتا ہے۔ اس کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ انسان تباہ نہ ہوں۔

کنفیوشس کے مقولے

اعلیٰ انسان سمجھتا ہے کہ حق کیا ہے۔ پست آدمی بھی سمجھتا ہے کہ حق کیا ہے لیکن وہ مصلحت اندیش ہوتا ہے۔

''انسان اعلیٰ اپنی روح کو عزیز رکھتا ہے اور پست آدمی اپنی دولت اور جائیداد کو۔ انسان اعلیٰ کو یاد رہتا ہے کہ اسے کس طرح اور کب کوتاہیوں کی سزا ملی، لیکن پست آدمی صرف یہ یاد رکھتا ہے کہ اسے کیا کیا انعامات اور بدلے ملے۔ انسان اعلیٰ کوتاہی کا الزام اپنے ذمہ لیتا ہے اور کمتر آدمی دوسروں کے سر تھوپتا ہے۔ انسان اعلیٰ باعظمت باوقار اور مطمئن ہے اور مغرور نہیں ہوتا، پست آدمی مغرور ہوتا ہے اور ہر عظمت اور وقار سے خالی۔ انسان اعلیٰ دوسروں کی رائے کے بارے میں فراخ دلی سے کام لیتا ہے لیکن مکمل طور پر ان سے متفق نہیں ہوتا، پست آدمی دوسروں سے متفق ہوتا ہے لیکن ان سے کشادہ دلی میں بخل سے کام لیتا ہے۔ انسان اعلیٰ مزاج کا پختہ ہوتا ہے لیکن جھگڑالو نہیں، وہ دوسروں کے ساتھ آزادانہ میل جول رکھتا ہے مگر دھڑے بندیوں سے الگ رہتا ہے۔''

انسان اعلیٰ کے کردار کی علامت بنی نوع انسان سے ہمدردی اور شفقت ہے۔ دوسروں کی نیکیوں اور قابلیتوں سے اس کو غصہ نہیں آتا بلکہ خود ان سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب وہ اپنے سے کمتر انسان کو دیکھتا ہے تو وہ اپنے اوپر نظر ڈالتا ہے اور دیکھتا ہے کہ جو برائیاں دوسروں میں نظر آتی ہیں مجھ میں تو نہیں کیونکہ بہت سے ایسے نقائص ہیں جو دوسروں میں ہیں اور ہم میں بھی ہیں۔

انسان اعلیٰ حسب ذیل باتوں کا خیال رکھتا ہے:

۱۔ اس کی آنکھیں صفائی سے دیکھیں۔

۲۔ اس کے چہرے سے نشان مہر و الفت نمایاں ہو۔

۳۔ اس کا رویہ باعزت ہو۔

۴۔ گفتگو میں خلوص ہو۔

۵۔ معاملات میں ہوشیاری ہو۔

۶۔ جن امور میں شک ہو وہ دوسروں سے سوال کرے۔

۷۔ جب اس کو غصہ آئے تو وہ خیال کرے کہ اس غصے کا نتیجہ کیا ہوگا اور اس کے لیے کیا مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

۸۔ جب وہ نفع حاصل کرنے کا خیال کرے تو سب سے پہلے حق و نیکی کا خیال کرے یعنی نفع اس طرح حاصل کیا جائے کہ حق و نیکی کا پہلو قائم رہے۔[1]

۹۔ محنت سے کام کرنا۔

اخلاقیات

کنفیوشس نے اخلاقیات پر بہت زور دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سارے اعمال کا دار و مدار خلوص نیت پر ہے اور بلند کردار آدمی کی یہ نشانی ہے کہ اس کے قول اور عمل میں مطابقت ہوتی ہے۔

اصلاح اخلاق کے لیے علم و تربیت کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی دولت علم ہے اور علم کے لیے غور و خوض لازمی ہے۔ بغیر غور و خوض کے علم سعی لا حاصل ہے۔

کنفیوشس نے باہمی مراعات اور ہمدردی پر بہت زور دیا ہے، وہ کہتا ہے:

اس کا آغاز سب سے پہلے اپنے خاندان سے ہو پھر اس کی حدیں پھیلتے پھیلتے تمام معاشرہ کو اپنے اندر لے لیں۔ اس نے انسان کے پانچ اہم بنیادی تعلقات پر بہت زور دیا ہے جو روائتی طور پر پہلے سے ہی چین میں موجود تھے۔

کنفیوشس کے پانچ رابطے (تعلقات)

کنفیوشس کے نزدیک زندگی میں پانچ بنیادی رابطے (تعلقات) ہیں۔

۱۔ باپ کا بیٹے کے ساتھ تعلق: باپ کے اندر شفقت، محبت ہو اور بیٹا میں فرزندانہ احترام و تکریم ہو۔

۲۔ بڑے بھائی کا چھوٹے بھائی کے ساتھ تعلق: بڑے بھائی میں شرافت اور چھوٹے میں انکساری ہونی چاہیے۔

۳۔ شوہر کا بیوی کے ساتھ تعلق: شوہر کو راست باز اور بیوی کو اطاعت شعار ہونا چاہیے۔

۴۔ بڑوں کا چھوٹوں کے ساتھ تعلق: بڑوں کو غور و خوض کرنا جبکہ چھوٹوں کو ادب کرنا چاہیے۔

---

[1] فلسفہ اسلام حصہ اول مصنفہ آغا محمد سلطان مرزا دہلوی ایم اے ایل ایل بی ص ۱۵۳۔

۵۔ حاکم کا رعایا کے ساتھ تعلق: حکمرانوں میں خیر اندیشی اور عوام میں وفاداری ہونی چاہیے۔

کنفیوشس کا زیادہ تعلق اخلاقیات، سیاسی اور سماجی پہلوؤں سے ہے۔ مذکورہ رابطے (تعلقات) سماج کے متعلق ہیں۔ معاشرہ کے اہم عناصر یہی پانچ ہیں۔

کنفیوشس اس بات کو جان چکا تھا کہ بدنظمی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب حاکم اپنے مرتبہ کے تقاضے نبھانے میں قاصر ہو، اور رعایا بھی اپنے مقام سے دور ہو چکی ہو۔ باپ اپنے مقام اور مرتبہ سے غافل ہو اور بیٹا اپنے فرائض سے منہ موڑ چکا ہو۔ علیٰ ہذا القیاس۔ وہ اس بات کو بخوبی جان گیا تھا کہ بنیادی انقلاب اس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک کہ ہر ایک اپنے اپنے مرتبہ اور مقام کا خیال نہ رکھے۔ کسی نے ایک بار اس سے پوچھا: کیا کوئی ایک لفظ ایسا ہے جو زندگی کے لیے بنیادی اصول کا کام دے سکے؟ اس نے جواب دیا: ''ہاں'' باہمی مراعات یعنی دوسروں کے ساتھ وہ سلوک نہ کرو جو تم دوسروں سے اپنے لیے پسند نہیں کرتے۔''

فرمایا: ''دل میں سچائی ہوگی۔ تو کردار میں خوبصورتی ہوگی کردار میں خوبصورتی ہوگی تو گھر میں ہم آہنگی پائی جائے گی۔ گھر میں ہم آہنگی ہونے سے قوم میں آہنگی ہوگی۔ قوم میں ہم آہنگی ہونے سے پوری دنیا میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔

کنفیوشس کے فلسفہ اخلاق کی خصوصیت

کنفیوشس کے فلسفے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ قابل عمل اور فطرت کے مطابق ہے۔ اس نے اپنے ہم عصر فلاسفر لاؤزے کی طرح یہ نہیں کہا کہ بدی کا بدلہ نیکی سے دو، بلکہ اس نے قصاص اور باہمی انتقام کے واضح اصول پیش کیے۔

چار نظریات

۱۔ پہلا نظریہ لی (Li) ہے جس کا مطلب رسوماتی کے علاوہ تعظیم بھی ہے ہم اسے درست راستہ یا درست رویہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ نظریہ ''لی'' ہماری اندرونی فطرت اور رویے کا بنیادی اصول ہے۔

۲۔ دوسرا نظریہ یی (Yi) ہے جس کا مطلب چیزوں کو سرانجام دینے کا بہترین طریقہ ہے۔ یعنی یی (Yi) وہ انداز عمل ہے جو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ اپنی اپنی فطرت کے مطابق کام کریں اور یہی بہترین طرز عمل ہے۔

۳۔ تیسرا نظریہ جن (Jan) ہے یعنی سماجی اعتبار سے بہترین کام کرنے پر آمادگی۔ اس نظریہ کی رو سے یہ ضروری ہے کہ ہر فرد کو اسی کی فطرت کے مطابق کام کرنے کی اجازت دی جائے۔

۴۔ چوتھا نظریہ چی (Chih) ہے یہ ایک مثالی حالت ہے۔ تدریجاً حاصل ہوتی ہے۔ چی (Chih) میں ہر شخص سوال کا سامنا کیے بغیر عادت کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔

سیاسیات کے متعلق تعلیم

کنفیوشس نے نظام سلطنت کے متعلق حسب ذیل اصول بنائے ہیں:

پہلا اصول یہ ہے کہ بادشاہ خود اپنے عمل سے رعایا کے لیے اچھی مثالیں قائم کرے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ حکومت بغیر عوام الناس کی حمایت کے قائم نہیں رہ سکتی۔

اس وجہ سے حکمرانوں کو چاہیے کہ وہ عوام الناس کا اعتماد حاصل کریں۔ اعتماد محبت کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اور محبت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب حکمران طبقہ عوام الناس کی بھلائی اور بہبودی کے کام کریں۔

تیسرا اصول یہ مقرر کیا ہے کہ حکمران طبقہ اور رعایا اپنے اپنے فرائض خلوص سے سرانجام دیں۔

چوتھا اصول یہ ہے کہ حکمران علم وعقل کو اپنا مشیر بنائیں۔

پانچواں اصول یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے جسے وہ خود اپنے لیے پسند نہ کریں۔

چھٹا اصول یہ ہے کہ عہدوں پر ایماندار اور دیانت دار آدمیوں کو مقرر کیا جائے۔

سلطنت کو درست کرنے کا طریقہ

"قدماء جب چاہتے تھے کہ ساری سلطنت میں نیکی پھیل جائے تو سب سے پہلے اپنی ریاست کو درست کرتے تھے۔ ریاست کو درست کرنے سے پہلے اپنے خاندانوں کو درست کرتے تھے۔ خاندانوں کو درست کرنے سے پہلے وہ خود اپنے تئیں درست کرتے تھے۔ اپنے تئیں درست کرنے سے پہلے وہ اپنے دلوں کو درست کرتے تھے۔ اپنے دلوں کو درست کرنے کے لیے وہ اپنے خیالات میں خلوص پیدا کرتے تھے۔ اپنے خیالات میں خلوص پیدا کرنے سے پہلے وہ اپنا علم بڑھاتے تھے اور اشیاء کے علم بڑھانے کے لیے اشیاء کی ماہیت کی تحقیقات میں مصروف ہو جاتے تھے۔

جب اشیاء کی ماہیت معلوم ہو گئی تو پھر علم مکمل ہو جاتا ہے جب علم مکمل ہو جاتا ہے تو ان کے خیالات میں بھی خلوص پیدا ہو جاتا ہے۔ خیالات کے بعد دل میں بھی خلوص آ جاتا ہے۔ اور جب دل درست ہو جاتا ہے تو خود وہ درست ہو جاتے ہیں۔ جب وہ درست ہو جاتے ہیں تو ان کا خاندان درست ہو جاتا ہے۔ جب ان کے خاندان درست ہو جاتے ہیں تو ان کی ریاست درست ہو جاتی ہے اور جب ریاستیں درست ہوئیں تو ساری سلطنت درست ہو جاتی ہے۔"[1]

ان دو پیراگراف میں کنفیوشس کے تمام فلسفے کا نچوڑ آ جاتا ہے۔

---

[1] فلسفہ اسلام مصنفہ آغا محمد سلطان مرزا دہلوی ص ۱۵۳۔

مابعد کا کنفیوشس ازم

کنفیوشس کو یہ احساس تھا کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا ہے کیونکہ اسے مناسب حاکم نہیں ملا جو استقامت کے ساتھ اس کے اصولوں پر کاربند ہو سکتا۔ لیکن اس کی وفات کے بعد فوراً اس کے نظریات لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا شروع ہو گئے اور آہستہ آہستہ اس کی ہر دلعزیزی اور اثر میں اضافہ ہوتا چلا گیا، حتیٰ کہ اس کا نام چینی ثقافت کا ہم معنی ہو گیا۔ اس کی شخصیت اور تعلیم کی مہر چینی زندگی کے ہر پہلو پر نمایاں نظر آنے لگی۔ پہلی عیسوی میں کنفیوشس کو ڈیوک نی (Ni) یعنی کامل اور اعظم کا خطاب دیا گیا۔ ۵۷ عیسوی میں اس کے لیے قربانی چڑھانے کا حکم ہوا۔ ۶۰۹ء میں ہر سکول میں اس کے نام سے ایک مندر تعمیر کیا گیا۔ ۶۵۷ء میں اسے کو ینگ (Kung) یعنی قدیم استاد یا دانائے کامل کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، یہ لقب آج تک اس کے نام کا حصہ ہے۔

مرورِ زمانہ کے ساتھ یہ مذہب بے لچک اور فاسد ہو گیا۔ کنفیوشس کا گزشتہ تقدس اور احترام نئے نظریات کی ترویج اور اشاعت میں رکاوٹ بن گیا بلکہ بزرگوں اور فطری ارواح کی پرستش پھر سے مذہب کا جزو لاینفک بن گئی۔ رفتہ رفتہ لوگ اس بات پر ایمان لے آئے کہ کنفیوشس کوئی نیا مذہب لے کر نہیں آیا تھا، بلکہ وہ قدیم اعتقادات اور رسوم کے دوام اور احیاء کے لیے سینہ سپر ہوا تھا۔ اس کی توحید پرستی میں ارواحِ فطرت اور شیاطین پرستی کے پرانے عقیدے شامل کر لیے گئے۔

کنفیوشس نے اپنے معتقدوں پر ذاتی اور اجتماعی نظم و ضبط کے لیے چند رسوم کی ادائیگی لازمی ٹھہرائی تھی۔ لیکن اس کے بعد یہ مذہب کئی ایک بے معنی رسموں اور قربانیوں کا طومار بن گیا۔ اس کے علاوہ کنفیوشس ازم میں توہم پرستی نے ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ فال گیری اور دوسرے کئی وہمی طریقے حادثات اور ارواحِ خبیثہ سے بچنے کے لیے مذہب کا لازمی جز قرار دے دیے گئے۔

کنفیوشس کی وفات کے سو سال کے کچھ عرصہ بعد اس مذہب میں ایک عظیم مصلح پیدا ہوا، جس کا نام مین شیس (Mencious) (۳۷۲-۲۸۹ ق م) تھا۔ اس نے اپنی تعلیمات میں توحید، انسان کی طبعی نیکی اور کنفیوشس کے اعلیٰ اصولوں پر زور دیا۔ انسانی ہمدردی کو برقرار رکھنے کے ساتھ اس نے راست کاری کو لازمی قرار دیا لیکن ظلم و ستم اور فساد اس قدر زوروں پر تھا کہ مین شیس اور کنفیوشس کے دوسرے سچے عقیدت مندوں کے لیے یہ بات بہت مشکل تھی کہ وہ برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔

کنفیوشس ازم پر تباہی

کنفیوشس کے تقریباً اڑھائی سو سال کے بعد سین شیہ ہوانگ ٹی نام کے بادشاہ نے چین پر قبضہ کرنے کے منصوبے باندھے اور بہت سی ریاستوں پر تسلط جما لیا اور شہنشاہ کا لقب اختیار کیا۔ اس نے اہل

چین کے دلوں سے ان کے بادشاہوں اور قابل احترام ہستیوں کی یاد کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن وہ ناکام رہا۔ آخرکار اس نے اپنے وزیروں سے مشورہ کرنے کے بعد کنفیوشس ازم کی تمام کتب کو جلا دینے کا حکم دیا۔ اس وقت تک ان کتب کی تعداد اس قدر زیادہ ہو چکی تھی کہ یہ تین ماہ تک جلتی رہیں۔ کچھ آدمی چند کتب کو محفوظ کر لینے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے ان کتب کو دیواروں میں چن دیا۔ جب سین بادشاہ کا انتقال ہوا تو لوگوں نے بہت خوشی منائی اور کتب کو نکال کر از سرِ نو اشاعت کی اور کنفیوشس اہل چین کا محبوب بن گیا۔

کنفیوشس ازم کی مقبولیت کے اسباب

۱۔ کنفیوشس نے پرانی اور قدیم روایات کے خلاف کوئی بات نہیں کہی، بلکہ اپنے پیشروؤں کے اقوال اور نظریات کو زندہ کیا اور ان کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔

۲۔ کنفیوشس نے زیادہ تر معاشرتی امور کی اصلاح کی طرف توجہ کی۔ اس نے معاشرہ کو پانچ طبقات میں تقسیم کیا: ۱۔ بادشاہ اور رعایا۔ ۲۔ باپ بیٹا۔ ۳۔ بڑا بھائی اور چھوٹا بھائی۔ ۴۔ میاں بیوی۔ ۵۔ دوست دوست۔

کنفیوشس کی ژرف بین نگاہ نے دیکھ لیا تھا کہ ہر طبقہ اپنے اپنے حقوق اور فرائض خلوص سے سرانجام نہیں دیتا، اس وجہ سے معاشرہ میں بگاڑ اور فساد ہے اور پھر ہر طبقہ کو اپنے اپنے حقوق اور فرائض خلوص کے ساتھ سرانجام دینے کی دعوت دی۔

۳۔ کنفیوشس نے مابعد الطبیعاتی مسائل پر بہت کم گفتگو کی۔ اگر کی ہے تو اس رنگ میں جس کو عوام آسانی سے سمجھ سکیں۔

۴۔ کنفیوشس نے اپنی تعلیم کو نہایت سادہ اور عام فہم زبان میں پیش کیا۔

۵۔ کنفیوشس نے اخلاقی تعلیم پر بہت زور دیا ہے، خاص طور پر ان امور کے متعلق جن کا تعلق روز مرہ زندگی سے تھا۔ مثلاً لوگوں میں باہمی تعاون، ہمدردی، محبت وغیرہ۔ اس تعلیم کا اثر صرف انفرادی زندگی پر ہی نہیں پڑا تھا بلکہ اجتماعی زندگی پر بھی پڑا۔ ملک کی اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔

۶۔ کنفیوشس کا ذاتی کردار بہت بلند تھا۔ جو وہ کہتا تھا، خود اس کا عملی نمونہ ہوتا تھا۔ مختلف عہدوں پر فائز رہا اور لوگوں کی خدمت کی، جس وجہ سے اس کو خاصی شہرت نصیب ہو گئی۔

کنفیوشس کے صحائف

اس مذہب کو اکثر مذہب کتب کہا گیا ہے۔ اس کی متعدد کتب میں سے لُن یو (Lun-yu) یعنی

اینلکٹس (Analects) اہم ترین ہے کیونکہ اس کے مطالعہ سے اس کی تعلیمات کا سمجھنا آسان ہے۔ یہ کنفیوشس کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو اس کے چند شاگردوں نے اس کی وفات کے بعد تالیف کیا۔ اس میں زندگی کے ہر پہلو کے حقائق کو عام فہم کہانیوں اور عمدہ تمثیلوں میں بیان کیا ہے۔ ایک اور کتاب کنفیوشس کی طرف منسوب ہوتی ہے اور یہ انتساب محل نظر ہے۔ اس کا نام ''علم عظیم'' (Great learning) ہے۔ ایک اور کتاب بنام تعلیم آدمی (Doctrine of the Men) کنفیوشس کے پوتے تسزے (Tsesze) کے نام سے منسوب ہے، لیکن حقیقتاً وہ لی چی (Li-Chi) اور مین شس (Mencious) کی کتابوں کا اکتیسواں باب ہے۔ ان کے علاوہ پانچ اور قدیم کتابیں ہیں جو قدیم روایات کے مطابق کنفیوشس کی ادارت میں لکھی گئیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ شوچنگ (Shu-ching) کتاب التواریخ، جو تاریخی دستاویزیوں پر مشتمل ہے۔ پہلے سو تھیں لیکن اب صرف اٹھاون رہ گئی ہیں، جو ۲۴۰۰ ق م سے ۸۰۰ قبل ق م تک کے زمانہ پر مشتمل ہے۔

۲۔ شی چنگ (Shih-ching) گیتوں کی کتاب، اس میں تین سو پانچ نظمیں ہیں یہ ۱۲۰۰ ق م سے ۷۰۰ ق م کے عرصہ میں لکھی گئیں۔

۳۔ لی چی (Li-Chi) رسموں کی کتاب، جس میں ان سب رسوم کا ذکر ہے جو مذہبی اور غیر مذہبی تہواروں پر ضروری ہیں۔

۴۔ یی چنگ (Yi-Ching) انقلابات کی کتاب۔

۵۔ چون چن (Ch'un-chin) خزاں اور بہار کی تاریخ، صوبہ لو (Lu) کے ۷۳۲ سے ۴۸۱ ق م تک کے واقعات، حادثات اور حالات کی تاریخ۔ کنفیوشس کا سب سے پہلا سوانح نگار زی ماچی (Ze-Ma-Chien) یوں رقم طراز ہے:

''کنفیوشس نے تاریخ کی کتاب پر مقدمہ لکھا، جس میں اس نے ان رسومات اور تقریبات کا بھی جائزہ لیا جس کو قدیم عقلاء اور سلاطین نے نافذ کیا تھا۔ اس نے قدیم نظموں کی تدوین کی اور ان کو مرتب کیا۔ موسیقی میں اس نے اصلاحات کیں۔'' (دنیا کا مذہبی نظام ص ۴۳)

کنفیوشس ازم اور اسلام

تاؤ ازم اور اسلام میں کسی مشابہت کے بارے میں شک کی گنجائش ہے، لیکن کنفیوشس ازم کے متعلق شکوک وشبہات کی کوئی گنجائش نہیں۔ کنفیوشس ازم ۶۰۰ ق م کی سماجی اور قومی زندگی کے سانچے میں ڈھلا ہوا اسلام ہی ہے۔ بنیادی اصول تقریباً ملتے جلتے ہیں، ان کی ظاہری شکل اور رسمیں مختلف ہیں۔ اسلام کنفیوشس ازم کی تعلیمات انسان دوستی، انسانی فطرت کا گناہ سے مبرا ہونا، ارتقائے انسان، انسانی ہمدردی

اور اخوت اور افراط و تفریط سے اجتناب کرنے کی تصدیق کرتا ہے بلکہ اسلام وہ مکمل دین ہے جس میں یہ تعلیم اعلیٰ رنگ میں پائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اسلام کنفیوشس ازم کے بعد کے فساد اور بگاڑ مثلاً مظاہر پرستی، بزرگ پرستی، قربانیاں علم غیب حاصل کرنے کے طریقوں کی تردید کرتا ہے۔

اسلام کنفیوشس ازم سے زیادہ واضح اور اعلیٰ رنگ میں اللہ تعالیٰ کی ہستی اور آخرت کے تصور کو پیش کرتا ہے۔

کنفیوشس ازم نے مابعد الطبیعاتی مسائل پر اشارۃً کنایۃً روشنی ڈالی ہے۔ اسلام نے ان مسائل کو اس رنگ میں بیان کیا ہے۔ ان کا سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔

باب ۵

جاپانی مذہب

شنٹوازم (Shintoism)

شنٹو کے معنی

لفظ شنٹو چینی زبان کے دو لفظوں شن اور ٹو سے مرکب ہے، جن کا مطلب ہے، دیوتاؤں کے ڈھنگ یا طور واطوار۔

شنٹو مذہب کی تاریخ

شنٹوازم جاپان کا قومی مذہب ہے اور اسی قوم اور ملک تک محدود ہے۔ ہندومت کی طرح اس کا کوئی ایک بانی نہیں اس کا آغاز زمانہ قبل از تاریخ ہوا ہے۔ یہ دونوں مذہب خاص قوموں کی فطرت کی عکاسی کرتے ہیں اور سماج اور ثقافت کا ہی ایک حصہ ہے۔ ان کے دروازے دوسروں پر بند ہیں۔

زمانہ قبل از تاریخ میں جاپان پر جو قبیلہ حکمران تھا وہ سورج کی دیوی کی پرستش کرتا تھا۔ جس کے گرو ہزارہا دیوی دیوتا اور بھی تھے۔ ان کے علاوہ اسلاف کی بھی پرستش کی جاتی تھی۔ اسی مظاہر اور اسلاف پرستی نے آگے چل کر اس مذہب کی شکل اختیار کر لی۔ اب جاپان میں یہ مذہب قومی تمدن کی حیثیت بھی اختیار کر گیا ہے۔

شینٹو ازم پر بیرونی اثرات

جاپان کی ثقافت میں چینی اور کوریائی تاجروں اور پروہتوں کے ذریعہ بیرونی اثرات داخل ہوئے۔ ۵۲۲ عیسوی میں چین سے مہایاں بدھ مت جاپان میں متعارف ہوا۔ اس سال جاپان کے شہنشاہ کو بدھ کا مجسمہ اور کتب پیش کی گئیں۔ آخر کار آٹھویں صدی کے بعد شنٹوازم اور بدھ ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے اور شنٹوازم کی جداگانہ حیثیت ختم ہو گئی۔ ٹوکوگاوا (Tokogawa) کے عہد سے مذہبی مصلحین نے شنٹو ازم کو از سرِ نو زندہ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ چنانچہ ۱۸۶۸ء میں جاپان میں قومی انقلاب ہوا۔ تو انھوں نے شنٹوازم کو بیرونی اثرات سے پاک کر دیا۔

شنٹوازم کی خصوصیات

ا۔ کثرت پرستی کا مذہب

شنٹوازم کثرت پرستی کا مذہب ہے۔ اس کثرت پرستی کا خاصہ اس کے دیوتاؤں کی تعداد سے ہو سکتا ہے۔ کبھی یہ دعویٰ ہے کہ اسی کروڑ ہیں، کبھی ان کی تعداد آٹھ سو کروڑ تک جا پہنچتی ہے۔

۲۔ مظاہر پرستی

اہل جاپان مظاہر پرستی پر بہت زور دیتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا معبود سورج ہے۔ ان کے خیال میں سورج ایک دیوی ہے۔ جس کا نام اماٹراسو رکھا تھا۔ اماٹراسو کو وہ کائناتی قوت کا درجہ نہیں دیتے، بلکہ اس کی حیثیت محض ایک دیوی کی ہے۔

اہل جاپان سمندر، پہاڑ، کھیتوں، درختوں، دریا، حیوانات، پرندوں اور پودوں وغیرہ کی عبادت کرتے تھے۔

۳۔ آباء پرستی

جاپانی مذہب میں اسلاف پرستی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ اسلاف پرستی کا آغاز مردوں کے خوف و ہراس سے ہوا۔ وہ مردوں سے محبت کی وجہ سے پرستش نہیں کرتے تھے، نہ ہی ان کے دل میں اس بات کا احترام ہوتا تھا کہ یہ ان کے خاندان کے افراد ہوا کرتے تھے بلکہ ان کی پرستش محض ان کے شر سے بچنے کے لیے ہوتی تھی۔

وہ نعشوں کو ناپاک سمجھتے تھے، اس وجہ سے جب کوئی آدمی مر جاتا تھا تو اس کی لاش سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ جس مکان میں کسی کی وفات ہوتی تو اس کے عزیز و اقارب اس مکان کو چھوڑ کر کسی دوسرے مکان میں چلے جاتے۔

۴۔ شاہ پرستی

جاپان میں بادشاہوں نے سورج دیوی کی اولاد ہونے کا دعویٰ کیا۔ یہ دعویٰ سب سے پہلے جموٹینو (Jimmotenno) نے کیا۔ اہل جاپان کے نزدیک جس طرح یہ سورج دیوی تمام معبودوں کی آقا ہے، اسی طرح بادشاہ بھی تمام جاپانیوں کا مخدوم اور سردار ہے۔ اس طرح شاہی محل مذہب کا مرکز بن گیا اور جاپان میں مذہب اور سیاست لازم و ملزوم ہو گئے۔ بادشاہ آہستہ آہستہ خدائی درجہ پر فائز ہو گیا۔ اس عقیدہ نے جاپانی سیاست کو استحکام بخشا۔ ایک خاندان اڑھائی ہزار سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک برسر اقتدار رہا۔ جاپانی بادشاہت کا بانی جم موتھا جس کی حکومت کا آغاز ۶۶۰ ق م میں ہوا۔ جنگ دوم کے زمانہ میں بادشاہ ہیرو ہیٹو

ایک سو چوبیسواں بادشاہ تھا۔

پروفیسر چیمبر لین لکھتا ہے:

''آج تک شنٹو مذہب کے پیرو صرف اپنے شہنشاہ کی خیر و سلامتی کے لیے دعا مانگتے ہیں، اپنے لیے دعا نہیں مانگتے۔ اور شہنشاہ روزانہ اپنی رعایا کی خیر و سلامتی کے لیے دعا کرتا ہے۔ شہنشاہ کو ایک زندہ کامی سمجھا جاتا ہے، جس کی عظمت اور محبت قوم کے دل میں سب سے بڑھ کر ہے۔ شہنشاہ خود اس قوم سے جس کی خبر گیری اس کے سپرد ہے محبت رکھتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ شہنشاہ اور قوم کا یہ تعلق ایسا ہے جس کو جاپان کا ہر متنفس بخوبی سمجھے ہوئے ہے۔ بادشاہ ہماری ضروریات پر توجہ کرتا ہے اور ہماری تکلیفوں کو محسوس کرتا ہے۔ پس اس کے بعد کیا چیز باقی رہ جاتی ہے جس کو ہم بلا واسطہ کامی سے مانگیں۔ شنٹو مذہب شہنشاہ پرست ہے۔ کامی کی رضا شہنشاہ کی رضا ہے۔ یہی وہ احساس ہے جو ہر ایک جاپانی کی لوح دل پر نقش ہے۔''[1]

۵۔ ہیرو پرستی

جاپانی صرف بادشاہ کی پرستش نہ کرتے تھے، بلکہ ہر اس آدمی کو قابل پرستش قرار دیتے تھے جو قوم اور سلطنت کے لیے کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیتا۔

شنٹو ازم میں کامی کا مفہوم

کامی (Kami) جاپانی زبان میں دیوتا کو کہتے ہیں۔ اس کا مطلب بلند اور اعلیٰ ہے۔ چنانچہ موتو دی جو شنٹو مذہب کا عالم ہے، لکھتا ہے:

''لفظ ''کامی'' اوّلاً زمین اور آسمان کے متعدد دیوتاؤں کے لیے استعمال ہوا، جن کا قدیم تذکروں میں ذکر آتا ہے۔ اسی طرح ان کی ارواح (می تاما) کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ان معبدوں میں رہتے ہیں جہاں ان کی پوجا ہوتی ہے۔ یہ لفظ نہ صرف انسان بلکہ چرند، پرند، نباتات، دریا، پہاڑ اور ہر قسم کی دوسری اشیاء جس سے خوف کرنا اور ان کی عزت کرنا اس لیے لازمی ہے کہ ان کو غیر معمولی اور اہم اختیارات حاصل ہیں۔ جن کا صرف نیکی اچھائی یا فائدہ رسانی میں اعلیٰ ہونا ضروری نہیں، ان سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بُری اور ناپسندیدہ اشیاء بھی کامی کہلاتی ہیں بشرطیکہ ان کا خوف عام ہو۔ کامی کی قسم میں جو انسان داخل ہیں ان میں میکاڈو (شہنشاہ جاپان) کا تذکرہ غیر ضروری ہے۔ دوسری اشیاء کے منجملہ اعداد (جن کو جاپانی میں تاردکامی یا صوتی خدا کہتے ہیں) اژدہا گونج (جس کو جاپانی لوڈاما یا روح شجر کہتے ہیں) اور لومڑی شامل ہیں، جو اپنی عیارانہ اور وحشی فطرت کے لحاظ سے کامی ہے۔''[2]

۱۔ Encyclopadia of Religion and Ethics vol II P 462.

۲۔ Encyclopadia of Religions and Ethics.

ایک اور مصنف لکھتا ہے:

''مجموعی حیثیت سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''کامی'' اوّلاً، زمین اور آسمان کے دیوتاؤں کا مظہر ہے جو پرانی کتابوں میں ملتے ہیں اور وہ جن کی معابد اور مندروں میں پوجا ہوتی ہے۔''[1]

شنٹو مذہب میں طریقہ عبادت

''شنٹو عبادت میں آدمی دو مرتبہ پہلے اور بعد میں جھک جاتا ہے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ جانا اور بعض اوقات تالیاں بجانا بھی عبادت میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ دیوتاؤں پر پرساد کا طریقہ بھی رائج ہے۔ مندروں میں ناچ کا طریقہ بھی ہے، یہاں تک کہ بعض اہم معابد میں اسٹیج اور ناچنے والیاں مہیا ہیں۔''[2]

کروڑوں دیوتاؤں کے باوصف اس مذہب کی عبادات بہت سادہ ہیں۔ مقدس مقامات بھی سادہ ہیں۔ ان میں پروہت مقرر ہیں اور وہاں دعائیں کی جاتی ہیں۔ ان میں بت نہیں ہوتے اور رسمیں بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سوائے سرکاری تقریبوں کے۔

شنٹو مذہب کی دعائیں

''احترام سے میں آئس Ise کے دو مقاموں کے عظیم خدا کی پرستش کرتا ہوں۔ جن میں پہلے مقام آٹھ سو کروڑ آسمانی دیوتا اور دوسرے مقام پر آٹھ سو کروڑ آبائی دیوتا ہیں۔ کل سولہ سو کروڑ دیوتا ہوئے، جن کے نام تمام صوبوں جزیروں اور آٹھ جزیروں کی عظیم سرزمین کے تمام مندر مختص ہیں اور وہ سولہ سو کروڑ دیوتا ان سے عبادت کراتے ہیں۔ میں کانپتا ہوا دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے رحم و کرم سے میری کوتاہیوں کا جو انھوں نے دیکھی یا سنی ہوں یا جن کا میں مرتکب ہوا ہوں چارہ کریں اور مجھے اپنے اختیارات کے مطابق جو انھیں الگ الگ حاصل ہیں اپنے فضل و کرم سے نوازیں اور مجھے نیکی کی توفیق دیں۔''

''پاک ہوجیو آسمان، پاک ہوجیو زمین، پاک ہوجیو باطن اور ظاہر اور چھ جڑیں۔'' چھ جڑوں سے مراد حواس خمسہ اور ایک دل ہے۔

جاپانیوں کے اس بھجن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظاہری اور باطنی پاکیزگی کے کتنے قائل ہیں۔

تخلیق کائنات کے متعلق نظریہ

تخلیق کائنات کے متعلق ان کا یہ نظریہ ہے کہ آسمان کے تیرتے ہوئے پل پر ایک جوڑا رہا کرتا تھا۔ نر کا نام ازونگی (Izongi) اور مادہ کا نام ازونمی (Izonami) تھا۔ وہ جوڑا زمین کے ایک جزیرے پر اترا اور وہاں انھوں نے ایک مکان بنایا، جس میں ایک بڑا ستون تھا۔ وہ دونوں اس ستون کے گرد گھومتے

---

[1] The Great Religions of Modern World P 49.

[2] مذاہب عالم احمد عبداللہ المسدوسی ص ۱۳۲۔

اور جب ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہوا تو پہلے مادہ بولی۔ اس سے نر کو غصہ آ گیا۔ اور اس نے دوبارہ گھومنے کے لیے کہا۔ جب پھر وہ ایک دوسرے کے سامنے ہوئے تو پہلے نر بولا اور اس نے مادہ کی خوبصورتی کا اظہار کیا۔ اس سے دونوں میں میاں بیوی کے تعلقات پیدا ہو گئے۔ اس تعلق کے نتیجہ سے جاپان کے مختلف جزیرے اور بہت سے دیوی دیوتا پیدا ہوئے۔ اس جوڑے سے آگ کی دیوی کی پیدائش کے وقت ازونمی (Izonami) کا انتقال ہو گیا۔ اس پر نر کو غصہ آیا اور اس نے اس نومولود (آگ کی دیوی) کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ جس سے اور بہت سے دیوی دیوتا نمودار ہو گئے۔ اب یہ نر اپنی بیوی کے پیچھے "مردوں کی سرزمین یومی (Yomi) میں گیا۔ وہاں سے واپسی پر ایک سمندر میں غوطہ لگایا تو اس کی پلکوں سے پانی کے جو قطرے ٹپکے اس سے سورج پیدا ہوا اور ناک کے قطروں سے چاند وغیرہ۔

کتابیں

دیوتاؤں کی وہ کہانیاں جو جاپان میں سینہ بسینہ چلی آ رہی تھیں، آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایک مقدس مؤلف یاسومارو (Yasumaro) نے دو ضخیم جلدوں میں ان کو جمع کیا۔ ایک کتاب کا نام "کوجی کی" (Kojiki) یعنی قدیم حالات کی کہانی اور دوسری کا نام "نی ہوں گی" (Nihongi) یعنی تاریخ جاپان ہے۔ ان میں قدیم دیوتاؤں کے محیر العقول کارنامے اور قصے مذکور ہیں۔

شنٹو ازم کا عظیم تر پہلو

یہ سادہ اور تصنع سے عاری کثرت پرستی بہت دیر تک انسانوں کے روحانی اور ذہنی تقاضوں کو پورا نہ کر سکی۔ لہٰذا جاپان میں بھی ہندوستان کی طرح مذہبی مفکر پیدا ہوئے جو اس کثرت کے پس پشت ایک قوت واحدہ کے وجود پر زور دیتے تھے۔ مشہور شنٹو مصنف ازاوانا گاہڈے (Izawa-naaghede) کہتا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ بیک وقت آٹھ سو کروڑ دیوتا ہونے کے باوجود ایک ہی ہے، یہی زمین و آسمان کا عظیم ترین اصل ہے اور کائنات کی تمام اشیاء اسی ایک ذات میں موجود ہیں۔ شرائی ساون (Shirai soin) رقمطراز ہے: "باری تعالیٰ ہی قادر مطلق ہے۔ یہ انسانی الفاظ سے ماوراء ہے۔ یہ فہم سے بالاتر ہونے کے باوجود ہر شے میں جاری و ساری ہے۔ جہاں تک شنٹو اخلاقیات کا تعلق ہے یہ خلوص، خود ایثاری، روح و بدن کی پاکیزگی اور صفائی پر زور دیتا ہے۔ یہ پاکیزگی جسمانی طہارت کے علاوہ خود تمام تر اچھائی کی علامت ہے۔ نیکی پاکیزگی ہے اور بدی ناپاکی ہے۔ دیوتا بد اعمالی سے اس کی ناپاکی کے باعث متنفر ہیں۔"

شنٹو ازم کی دوسری خوبی خلوص نیت ہے، ان کا یہ نظریہ ہے:

اگر انسان کی جدوجہد مخلصانہ ہے تو یقیناً وہ دیوتاؤں سے ملاپ حاصل کر لے گا۔ باطنی پاکیزگی اور خلوص نیت ہی دل کی پاکیزگی کا دوسرا نام ہے۔

شنٹوازم کی کتابوں اور تعلیمات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مقدس مقامات کی پرستش اسی وقت سہل ہوتی ہے جب یہ خلوص نیت اور پاک دلی سے کی جائے۔

تاہم ہندومت کی طرح شنٹوازم اس بلند فکری، عمل صالح اور پاک باطنی کے ساتھ بے انتہا توہم پرستی کو، جو کسی صورت مظاہر پرستی سے الگ نہیں، یکجا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی شیاطین اور ارواح بد کے اثرات سے بچنے کے لیے جادو ٹونے پر بھی بضد ہے۔ شنٹوازم کا مرکزی نقطہ کثرت پرستی ہے اور یہ اس کی جدید ترین صورتوں پر بھی حاوی ہے۔

اسلام اور شنٹوازم

شنٹوازم ایک ایسا مذہب ہے جس کے ساتھ اسلام کی کوئی مماثلت نہیں اور نہ ان میں کوئی قدر مشترک ملتی ہے۔ یہ ایک قوم کا روائتی اور موروثی مذہب ہے جبکہ اسلام الہامی دین ہے۔ اخلاقیات میں دونوں کی تعلیمات میں کچھ تھوڑی سی مشابہت کے آثار نظر آتے ہیں۔ موجودہ معلومات کے پیش نظر یہ کہنا بالکل ناممکن ہے کہ آیا شنٹوازم کے وہ بلند تر پہلو جن میں وحدتِ ذات اور اعلیٰ اخلاقی تعلیم کے آثار ملتے ہیں کسی ایسے کامل استاد کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہیں جسے زرتشت، موسیٰ، یسوع مسیح، حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح ملہم کہا جا سکے۔ جس شکل میں شنٹوازم کے معتقد اس پر کاربند ہیں، اس میں مذہبوں کے تقابل مطالعہ کے شائقین کو اسلام اور اس میں کسی مماثلت کی بجائے واضح طور پر اختلافات نظر آئیں گے:

شنٹوازم	اسلام
۱۔ شنٹوازم ایک قوم کا مذہب ہے۔	۱۔ اسلام آفاقی اور عالمگیر مذہب ہے۔
۲۔ شنٹوازم مظاہر پرستی کا قائل ہے اور آج بھی یہ مظاہر پرستی رائج اور مسلم ہے۔	۲۔ اسلام خالص توحید کی تعلیم دیتا ہے اور ہر قسم کے شرک کو گناہ قرار دیتا ہے۔
۳۔ یہ اَن گنت دیوتاؤں کا قائل ہے جس میں مظاہراتِ فطرت، بادشاہ، قومی بہادر اور آباؤ اجداد شامل ہیں جنھیں دیوتا کا مرتبہ دیا جاتا ہے۔	۳۔ اسلام خدا پرستی کی تعلیم دیتا ہے۔

ذات باری تعالیٰ کی ماہیت کے بارے میں ہر دو کے تصورات بالکل مختلف ہیں۔ شنٹوازم جاپانیوں کو ایک برگزیدہ قوم قرار دیتا ہے۔ اسلام عالمگیر انسانی اخوت اور مساوات کا علمبردار ہے اور تقویٰ کو وجہ تکریم قرار دیتا ہے۔

باب ٦

یہود کی وجہ تسمیہ

عہد نامہ عتیق کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے۔ اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام کے دو بیٹے تھے، جن میں سے بڑے کا نام عیسو تھا جو اسماعیل کا داماد تھا اور چھوٹے کا نام یعقوب تھا۔ انہی کا دوسرا نام اسرائیل تھا۔ یہ لفظ عبرانی ہے۔ اسر بمعنی عبد اور ایل اللہ کا نام ہے۔ پس اسرائیل کے لفظی معنی عبداللہ یا اللہ کا بندہ ہوئے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل اسرائیل کے نام پر بنی اسرائیل کہلائی۔ اسرائیل کے بارہ بیٹے تھے جن میں سب سے بڑے کا نام یہود اور سب سے چھوٹے کا بن یامین تھا۔ ملک فلسطین کے ایک حصہ کا نام یہودیہ تھا۔ جہاں یہودا، اور بن یامین کی نسل آباد ہوئی اس لیے اس علاقہ کے رہنے والے یہود کہلائے۔ تمام یہود نسلی لحاظ سے بنی اسرائیل ہیں، لیکن تمام بنی اسرائیل یہود نہیں۔ گو بعد کے زمانہ میں یہود اور بنی اسرائیل ہم معنی الفاظ استعمال ہونے لگے۔ عرف عام میں بنی اسرائیل کو یہود سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

مختصر تاریخ

یہودی عبرانی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اصلی وطن کے بارے میں محققین کا شدید اختلاف ہے۔ اکثریت کا یہ خیال ہے کہ عراق ہی ان کا قدیم وطن ہوگا۔ اسرائیلیوں کے جدامجد بابل کے ایک شہر اُر کے رہنے والے تھے۔ مشہور مورخ کیلٹ کہتا ہے کہ اسرائیلیوں کے مصری آثار سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ یہودی فلسطین میں یوشع کی فتح سے پہلے بھی آباد تھے جس سے نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ یہودی دریائے فرات کے ساحلی علاقے کے رہنے والے تھے ان کے آباؤ اجداد قدیم زمانے سے فرات کے اس پار رہتے تھے۔[1]

دوسری ہزاردیں قبل مسیح میں یہودی، عراق سے شام اور فلسطین کے علاقوں میں پھیل گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے، ایک حضرت اسماعیل علیہ السلام اور دوسرے حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ جن کی اولاد عرب میں پھیلی، دوسرے بیٹے

---

1. کیلٹ، مذاہب کی مختصر تاریخ ص ۳۷۔

حضرت اسحاق علیہ السلام کی شادی اپنی چچا زاد بہن بی بی ربیکہ بنت ناہور سے ہوئی، جن کے دو بیٹے عیص اور حضرت یعقوب پیدا ہوئے۔ حضرت یعقوب کا لقب اسرائیل (بندہ خدا) تھا۔ اسی نسبت سے تمام عبرانی جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ بنی اسرائیل کہلائے یہ نسل فلسطین میں پھیلی، حضرت یعقوب کی چار بیویاں تھیں۔ جن سے بارہ بیٹے پیدا ہوئے۔ حضرت یوسف اور بن یامین ایک بیوی راخیل سے پیدا ہوئے۔

حضرت یوسف کے علاوہ حضرت یعقوب کے دو اور بیٹوں کو بنی اسرائیل کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ ان میں ایک لوی یا لاوی ہے۔ جس کی نسل سے یہودیت کے اندر ایک خاص مذہبی طبقہ وجود میں آیا، جس نے بچاریوں کی جگہ لی۔ دوسرا یہودا ہے۔ جس کی طرف منسوب ہو کر بنی اسرائیل یہود کے نام سے مشہور ہوئے۔ بعد میں یہ لفظ مذہبی اصطلاح بن گیا اور اس سے مراد تمام لوگ لیے جانے لگے جنھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء علیہم السلام (سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے) کی پیروی کا دعویٰ کیا۔

حضرت یوسف کے عزیز مصر ہو جانے کے چند سال بعد آپ کا خاندان مصر میں منتقل ہو گیا اور اس مقام پر آباد ہوا۔ جسے جشن یا گوشن (Goshen) کہتے ہیں۔ آپ نے تقریباً اسی سال مصر پر حکومت کی۔ بائبل کی روایت کے مطابق ایک سو دس سال کی عمر میں وفات پائی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی وجہ سے بنی اسرائیل کو مصر میں بہت عروج حاصل ہوا۔ اس زمانہ مصر میں سامیوں کے خاندان ہائیکسوس کی حکومت تھی۔ جب ان کی حکومت ختم ہوئی تو ایک سخت متعصب قبطی النسل خاندان برسر اقتدار آ گیا۔ تو فرعون وقت نے اسرائیل پر بڑے مظالم ڈھائے۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا، جو چھ لاکھ بنی اسرائیل کو فرعون (رعمیسس ثانی) کی غلامی سے ۱۳۹۱ ق۔م میں نکال لائے۔ اور چالیس سال تک بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کی نافرمانی کرنے کی وجہ سے دشت فاران میں سرگردان پھرتے رہے۔

بنی اسرائیل کی حکومت

چالیس سال بعد نئی نسل یوشع کی قیادت میں فلسطین کے علاقے میں داخل ہوئی۔ پہلے اس نے ریخو کو زیر کیا۔ اس کے بعد (خروج سے تقریباً پچاس سال بعد) فلسطینیوں کو شکست دے کر فلسطین پر قبضہ کیا۔ یہاں سے ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ مگر اوائل میں ان کی حکومت بہت ہی مختصر علاقے کے اندر محدود تھی۔ اس کا سربراہ قاضی کہلاتا تھا اور لوگوں کے مقدمات کے فیصلے کرتا تھا۔ اس طرح قبائلی یا عدالتی نظام تقریباً تین سو سال تک چلتا رہا۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کی ایک سلطنت وجود میں آئی۔ جب حضرت سموئیل نے ساؤل (طالوت) کو ۱۰۵۰ ق۔م میں بادشاہ مقرر کیا تو بنی اسرائیل نے ان کی زیر قیادت فلسطین کے اردگرد کے علاقے زیر کرنے کے بعد زباہ کی ریاست پر حملہ کیا۔ اس وقت وہاں کا حکمران جالوت تھا۔

[1] مولانا حفیظ الرحمن نے قصص القرآن حصہ اول میں بیوی کا نام بحوالہ توریت رفقہ بنت بتوئیل لکھا ہے۔ (ص ۲۵۱)

طالوت اور جالوت کے لشکروں میں لڑائی ہوئی تو حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کا مقابلہ کیا اور اسے قتل کر کے زباہ کی ریاست پر قبضہ کیا۔ طالوت نے اپنی بیٹی حضرت داؤد کو بیاہ دی۔ اس تعلق سے حضرت داؤد، طالوت کے بعد بادشاہ ہوئے۔ آپ نے اردگرد کے بہت سے علاقے کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ ساٹھ سال کی عمر میں تقریباً ۹۷۴ ق۔م میں وفات پائی۔ آپ نے یروشلم کو فتح کر کے وہاں بیت المقدس کی تعمیر کی بنیاد رکھی۔ مگر اس کی تکمیل آپ کے بیٹے اور جانشین حضرت سلیمان کے عہد میں ہوئی۔ آپ کے عہد میں اسرائیلی حکومت نے بہت ترقی کی۔ آپ کا عہد حکومت ۹۷۴ ق۔م تا ۹۳۷ ق۔م بیان کیا جاتا ہے۔

حکومت کا زوال

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد آپ کا بیٹا رحو بام تخت نشین ہوا مگر بنی اسرائیل کے دس قبائل نے اس کی اطاعت قبول نہ کی۔ ۹۳۱ ق۔م میں بنی اسرائیل کی حکومت دو حصوں میں بٹ گئی۔ شمال کی بنی اسرائیلی حکومت جس کا صدر مقام سامریہ مقرر ہوا اور جنوب کی یہودا حکومت یا یہودیہ، جس کا پایہ تخت یروشلم رہا۔ ان دونوں حکومتوں کے مابین ہمیشہ جنگ و جدل کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا جب ۹۳۰ ق۔م میں فرعون مصر شیشک نے یروشلم پر حملہ کیا۔ تو وہ اپنے مقام کی بھی حفاظت نہ کر سکے۔ اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعمیر کردہ مسجد کو تباہ کر دیا۔ اس واقعہ کے دو سو سال بعد اشوری بادشاہ تغلد بلاسر سوم نے شام پر حملہ کیا۔ اور سامریہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے شلما نصر پنجم نے پھر اس کا محاصرہ کیا۔ وہ محاصرہ کے دوران ہی فوت ہو گیا مگر اس کے جانشین سرغون دوم نے ۶۵۱ ق۔م میں سامریہ کو تباہ و برباد کر دیا اور تقریباً ستائیس ہزار بنی اسرائیل کو (دس قبیلے) شام سے جلاوطن کر دیا۔ اور اشور اور میڈیا کے درمیان انھیں آباد کیا۔ یہ گم شدہ فرقے کہلائے۔ سامریہ کو زیر کرنے کے بعد سرغون نے فلسطین پر چڑھائی کی اور حکومت یہودیہ کو مطیع کیا۔ سرغون کے بعد سناخریب کے عہد حکومت میں یہودیوں نے کلدانیوں سے ساز باز کر کے آشوری حکومت سے آزادی حاصل کرنا چاہی۔ مگر کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ سناخریب نے سامریہ اور یروشلم کو تباہ و برباد کر کے دو لاکھ یہودیوں کو جلاوطن کر دیا۔ گو وہ یروشلم پر قبضہ نہ کر سکا۔ مگر سامریہ کی ریاست ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

آشوریوں کے کمزور ہو جانے کے بعد مصریوں نے حملے شروع کر دیے۔ ۵۸۶ ق۔م میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یروشلم پر چڑھائی کی۔ یہودیوں کے تین سرداروں پر مقدمہ قائم کر کے دس ہزار یہودیوں کے ساتھ بابل بھیج دیا۔ مسجد بیت المقدس کو پیوند خاک کر دیا۔ یہ لوگ وہاں پچاس سال رہے۔ ۵۳۶ ق۔م میں ایران کے بادشاہ خورس دوم نے اہل بابل کو شکست دے کر ان یہودی اسیروں کو رہا کیا۔ اور یہ لوگ اپنے وطن واپس آئے۔ حضرت دانیال کے برباد شدہ بیت المقدس کو از سر نو تعمیر شروع کیا۔ ۴۴۴ ق۔م کے قریب یہودی پیشواؤں کو صحائف آسمانی جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس بارے میں حضرت عزرا اور

حزقیل کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے کاہنوں اور لاویوں کی مدد سے "کتب خمسہ" کو جن میں تورات بھی شامل ہے۔ دوبارہ جمع کیا۔ ایرانیوں کی حکومت کے بعد فلسطین پر سکندر اعظم نے حملہ کیا اور بنی اسرائیل یونانیوں کی غلامی میں زندگی بسر کرنے لگے۔

یونانیوں کے کمزور ہو جانے کے بعد مصریوں نے حملے کرنے شروع کر دیے۔ جن کے بادشاہ ٹالیمی نے خاص سبت کے دن پر یروشلم پر حملہ کیا۔ مصری ایک لاکھ یہودی گرفتار کر کے لے گئے اور اسکندریہ اور سائرین میں انھیں آباد کیا۔ کچھ عرصہ بعد فلسطین پر شامیوں کا قبضہ ہوا۔ ان کے خلاف یروشلم کے لوگوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ اس پر شاہ انطیوکس نے ۱۶۸ ق۔م میں چالیس ہزار اہل شہر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بہت سوں کو اسیر بنالیا۔ بیت المقدس کی قربان گاہ پر سور قتل کر کے اسے ناپاک کیا۔ ۱۶۷ ق۔م میں ایک حکم جاری کیا، جس کا منشاء یہ تھا کہ یہودی قوم کو کلیتاً نیست و نابود کر دیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل میں اپولینس نے سبت کے دن مردوں کا قتل عام کیا۔ پھر شہر کو لوٹ کر نذر آتش کر دیا۔ اس بربادی کے بعد شاہ مذکور نے وہاں اپنا حلقہ تعمیر کیا اور بیت المقدس کو اپنے دیوتا کا مندر بنا دیا۔ ختنہ کی رسم کی ممانعت کر دی۔ دو عورتوں نے اپنے بچوں کی ختنہ کرائی تھی۔ انھیں قتل کر کے شارع عام پر لٹکا دیا۔ ان تمام سختیوں کے باوجود یہودی مذہب کو ختم نہ کر سکا۔ ان مظالم کے ردعمل میں ایک تحریک اٹھی جو مکابی (Maccabean) تحریک کہلاتی ہے۔ اس تحریک نے بڑی کشت و خون کے بعد ۱۴۱ ق۔م میں یونانیوں کو نکال باہر کیا اور اپنی ایک آزاد ریاست قائم کر لی۔ اس آزادی کی تصدیق رومی حکومت نے کر دی۔ حکومت فلسطین کا آخری حکمران ہیراڈ تھا۔ جو ۶ ق۔م میں فوت ہوا۔ ۷ء میں یہ صوبہ رومی حکومت کے تحت آ گیا۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہودیوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے۔ یہودیوں نے ان پر مقدمہ چلایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس دنیا سے چلے جانے کے تقریباً تین سو سال بعد روم کے بادشاہ قسطنطین نے عیسائیت کو قبول کر لیا۔ جس سے مذہب عیسوی کو اس قدر عروج حاصل ہوا کہ دنیا کی اکثر حکومتوں کا مذہب بن گیا۔

بت پرستی

یہود نے بھی دوسری اقوام کے نقش قدم پر چل کر بت پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ اسرائیلی سلطنت کے سوائے ایک بادشاہ جہو (Jehu) کے سب مشرک تھے۔ ان کا سب سے مشہور بادشاہ عمری تھا۔ جس نے ۸۸۵ ق۔م سے ۸۷۴ ق۔م تک حکومت کی۔ اس نے سماریہ (Samaria) کو آباد کیا۔ جس کا موجودہ نام سباسطیہ ہے۔ عمری کا بیٹا اخب (Ahab) ۸۵۲/۸۷۴ ق۔م بادشاہ ہوا۔ اس نے بت پرستی میں بہت مبالغہ کیا۔

سلطنت جوڈیا کے بھی انیس بادشاہ ہوئے ان میں سے صرف چھ بادشاہ موحد تھے۔ باقی سب بت پرست تھے۔ "یہودیہ کی ریاست میں علانیہ بت پرستی، بدکاری ہونے لگی۔ تو زکریا نبی نے اس کے خلاف

ل تواریخ ۲۴:۲۱۔

آواز بلند کی تو شاہ یہوداہ یوآس کے حکم سے انھیں ہیکل سلیمانی کے سامنے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان سنگسار کر دیا گیا۔

قرآن مجید نے بنی اسرائیل کے ایک سنگین جرم یعنی قتل اور ارادہ قتل انبیاء علیہم السلام کا بار بار ذکر کیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ (بقرہ ۲:۶۱) یعنی وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے۔

مثال کے طور پر بائبل سے چند واقعات یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

۱۔ حضرت سلیمان کے بعد جب بنی اسرائیل کی سلطنت تقسیم ہو کر دو ریاستوں (یروشلم کی دولت یہودیہ اور سامریہ کی دولت اسرائیل) میں بٹ گئی تو ان میں باہم لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک آئی کہ یہودیہ کی ریاست نے اپنے ہی بھائیوں کے خلاف دمشق کی آرامی سلطنت سے مدد مانگی۔ اس پر خدا کے حکم سے حنانی نبی نے یہودیہ فرمانروا آسا کو سخت تنبیہ کی۔ مگر آسا نے اس تنبیہ کو قبول کرنے کے بجائے خدا کے پیغمبر کے جیل میں بھیج دیا۔ (۲ تواریخ باب ۱۶۔ آیت ۷۔۱۰)

۲۔ حضرت الیاس (ایلیاہ Elijah) علیہ السلام نے جب بعل کی پرستش پر یہودیوں کو ملامت کی اور از سر نو توحید کی دعوت کا صور پھونکنا شروع کیا، تو سامریہ کا اسرائیلی بادشاہ اخی اب اپنی مشرک بیوی کی خاطر ہاتھ دھو کر ان کی جان کے پیچھے پڑ گیا۔ حتیٰ کہ انھیں جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں پر پناہ لینی پڑی۔ اس موقع پر جو دعا حضرت الیاس نے مانگی اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"بنی اسرائیل نے تیسرے عہد کو ترک کیا...... تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک میں ہی اکیلا بچا ہوں۔ سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں۔" (۱۔ سلاطین باب ۱۹ آیت ۲۶۔۲۷)

۳۔ ایک اور نبی حضرت میکایاہ کو اسی اخی اب نے حق گوئی کے جرم میں جیل بھیجا اور حکم دیا کہ اس شخص کو مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا...... (۱۔ سلاطین باب ۲۲ آیت ۲۶۔۲۷)

۴۔ پھر جب یہودیہ کی ریاست میں علانیہ بت پرستی اور بدکاری ہونے لگی اور زکریا نبی نے اس کے خلاف آواز بلند کی تو شاہ یہوداہ یوآس کے حکم سے انھیں عین ہیکل سلیمانی میں مقدس اور قربان گاہ کے درمیان سنگسار کر دیا گیا۔ (۲ تواریخ باب ۲۴ آیت ۲۱)

۵۔ اس کے بعد جب سامریہ کی اسرائیلی ریاست آشوریوں کے ہاتھوں ختم ہو چکی اور یروشلم کی یہودی سلطنت کے سر پر تباہی کا طوفان تلا کھڑا تھا تو یرمیاہ نبی اپنی قوم کے زوال پر ماتم کرنے اٹھے، اور کوچے کوچے میں انھوں نے پکارنا شروع کر دیا کہ سنبھل جاؤ، ورنہ تمہارا انجام سامریہ سے بھی بدتر ہوگا۔ مگر قوم کی طرف سے جو جواب ملا۔ وہ یہ تھا کہ ہر طرف سے ان پر لعنت اور

پھٹکار کی بارش ہوئی۔ پیٹے گئے۔ قید کیے گئے۔ رسّی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیے گئے تا کہ بھوک اور پیاس سے وہیں سوکھ سوکھ کر مر جائیں اور ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ قوم کے غدار ہیں، بیرونی دشمنوں سے ملے ہوئے ہیں۔ (یرمیاہ باب ۱۵ آیت ۱۰ باب ۱۸ آیت ۲۰۔۲۳ باب ۲۰ آیت ۱۔۸ باب ۳۶ تا ۴۰)

۶۔ ایک اور نبی حضرت عاموس کے متعلق لکھا ہے کہ جب انھوں نے سامریہ کی اسرائیلی ریاست کو اس کی گمراہیوں اور بدکاریوں پر ٹوکا اور ان حرکات کے برے انجام سے خبردار کیا تو انھیں نوٹس دیا گیا کہ ملک سے نکل جاؤ اور باہر جا کر نبوت کرو۔ (عاموس باب ۷ آیت ۱۰۔۱۳)

۷۔ حضرت یحییٰ (یوحنا) علیہ السلام نے جب ان بداخلاقیوں کے خلاف آواز اٹھائی جو یہودیہ کے فرمانروا ہیرودیس کے دربار میں کھلم کھلا ہو رہی تھیں۔ تو پہلے وہ قید کیے گئے۔ پھر بادشاہ نے اپنی معشوقہ کی فرمائش پر قوم کے اس صالح ترین آدمی کا سر قلم کر کے ایک تھال میں رکھ کر اس کی نذر کر دیا۔ (مرقس ا باب ۶ آیت ۱۷۔۲۹)

۸۔ آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بنی اسرائیل کے علماء اور سرداران قوم کا غصہ بھڑکا کیونکہ وہ انھیں ان کے گناہوں اور ان کی ریاکاریوں پر ٹوکتے تھے اور ایمان اور راستی کی تلقین کرتے تھے۔ اس قصور پر ان کے خلاف جھوٹا مقدمہ تیار کیا گیا اور رومی عدالت سے ان کے قتل کا فیصلہ حاصل کیا گیا اور جب رومی حاکم پیلاطس نے یہود سے کہا کہ آج عید کے روز میں تمہارے یسوع اور برآباڈا کو دونوں میں سے کس کو رہا کروں تو ان کے پورے مجمع نے بالاتفاق پکار کر کہا کہ برآبا کو چھوڑ دے اور یسوع کو پھانسی پر لٹکا۔ (متی باب ۲۷ آیت ۲ تا ۲۶)[1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبل عبرانی نسل کا مذہب

یہودی عبرانی نسل سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے، کہ یہودیوں کے مذہبی عقائد اکثر و بیشتر عبرانی ہی تھے۔ سامی النسل ہونے کی وجہ سے ان کا مذاہب نہایت سادہ تھا اور عربوں کے مذہب کے ساتھ کچھ ملتا جلتا تھا۔ البتہ مصر میں ایک لمبا عرصہ مقیم رہنے کی وجہ سے انھوں نے بعض مصری عقائد اپنا لیے۔

کثرت پرستی

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے قبل بنی اسرائیل لاتعداد معبودوں کی پرستش کرتے تھے جن کو الن گرنٹ (Allen Grant) نے تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔

---

[1] بحوالہ تفہیم القرآن مصنفہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ص ۸۱،۸۲۔

۱۔ خاندانی دیوتا۔
۲۔ حجر پرستی۔
۳۔ قومی دیوتا

خاندانی دیوتا

ہر خاندان کا الگ الگ دیوتا ہوتا تھا۔ یہ دیوتا مورتیوں کی شکل میں ہوتے تھے۔ عموماً ان مورتیوں کی جسامت اتنی ہوتی تھی کہ نقل مکانی کی صورت میں آسانی سے ایک جگہ لے جایا جا سکے۔ یہ مورتیاں متوفی آباء واجداد کی نمائندگی کرتی تھیں۔ یہودی قبر پرستی کے مرض میں بھی مبتلاء تھے۔ جب انھیں اس سلسلہ میں مشکلات سے دوچار ہونا پڑا تو انھوں نے اپنے آباؤ واجداد کی قبروں کو مورتیوں میں بدل لیا۔ اس طرح ہر خاندان کے الگ الگ دیوتا ہو گئے۔

خاندان کے افراد کی خوشحالی اور مسرت کا دار ومدار دیوتاؤں کی خوشنودی پر ہوتا تھا لیکن قومی زندگی اور خوشحالی میں ان کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ خاندان کے سرداران بتوں کے پروہت ہوتے تھے۔ ان بتوں کے لیے قربانی بھی دی جاتی تھی۔ ان بتوں کو ''تراخیم'' کا نام دیا جاتا تھا۔

حجر پرستی

سامی اقوام میں حجر پرستی شروع سے جاری تھی۔ وہ پتھروں کو نہایت ہی مقدس اور واجب التعظیم تصور کرتے تھے کیونکہ ان پتھروں سے ان کے معبود تراشے جاتے تھے۔ بتوں کے لیے قربانیاں دی جاتی تھیں۔ ان میں بھی ان پتھروں کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ قربان گاہ کے لیے یہ پتھر علامت کا کام دیتے۔ قربانی سے پہلے ایک پتھر کھڑا کیا جاتا، یہ پتھر جس جگہ پر رکھا جاتا اسے بیت ایل کہا جاتا۔ بیت ایل وہ عبادت گاہ ہوتی تھی۔ جہاں اس قسم کی مذہبی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ ان پتھروں پر تیل وغیرہ ملا جاتا تھا۔ ان سے منتیں مانگی جاتی تھیں، یہ پتھر لمبے ہوتے تھے۔ بانجھ عورتیں ان سے اولاد طلب کرتی تھیں۔

شجر پرستی

ان مقدس پتھروں کا تعلق درختوں سے ہوتا تھا۔ عبرانی ادب میں جہاں کہیں کسی مقدس درخت کا ذکر آیا ہے۔ وہاں مقدس پتھر کا بھی ضرور ذکر آیا ہے۔

حیوان پرستی

مصریوں کی حیوان پرستی کے زیر اثر یہودیوں میں بھی بیل گائے وغیرہ کی پوجا کی جانے لگی۔ بیت ایل اور دان (Dan) کے معبدوں میں بچھڑے کی پرستش مصریوں کے طریقہ پر کی جاتی تھی۔ جانوروں میں

سانپ کی بھی پرستش کی جاتی تھی۔ مصریوں کے نزدیک سانپ ایک مقدس چیز تھی۔ حیوان پرستی ان کی گھٹی میں اتنی رچی ہوئی تھی کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنو اسرائیل کو فرعون کی غلامی کے چنگل سے نجات دلا کر صحراء سینا میں لے آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو وہیں چھوڑ کر چالیس دن رات کے لیے کوہ طور پر چلے گئے۔ بعد میں ان کی قوم بچھڑے کی پرستش میں لگ گئی۔

قومی دیوتا

قدیم یہودیوں کے خاندانی اور مقدس پتھروں، درختوں اور جانوروں کے علاوہ کچھ قومی دیوتا بھی تھے۔ ان کی تفصیل کے بارے میں تاریخ بالکل خاموش ہے کیونکہ جب قوم یہود توحید کی طرف مائل ہوئی تو تمام دیوتاؤں کا نام ونشان مٹا دیا گیا تھا۔ البتہ دو معبودوں کے نام تاریخ میں ملتے ہیں۔ جن کو یہودیوں نے کنعان پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے اپنایا۔ یہ دو معبود بعل اور مولک (Molech) ہیں۔ یہ دونوں مقامی بادشاہوں کی روحیں تھیں۔ اس وجہ سے یہود بادشاہ کی پرستش کرتے تھے۔ بعل کے لفظی معنی آقا یا مالک کے ہیں۔ یہ دیوتا کنعانیوں کا اپنا نہ تھا بلکہ انھوں نے فینقیوں سے لیا تھا۔ یہود کے نزدیک بعل زرخیزی کا دیوتا تھا۔ ہر شہر کا الگ بعل ہوتا تھا۔ بعل کے علاوہ کچھ اور بھی دیویاں تھیں۔

بعل کے علاوہ دوسرا دیوتا مولک ہے، جس کے لفظی معنی ''بادشاہ'' یا ''فرمانروا'' کے ہیں۔ یہود نے اسے اکادیوں سے لیا۔ اکادیوں کے نزدیک یہ آگ کا دیوتا تھا۔ یہ نام بھی بعل کی طرح کئی معبودوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس طرح مؤلک کی پرستش دنیا کی بہت سی قومیں کرنے لگیں۔ اسرائیلی قوم نے بھی اس کو اپنا معبود اپنا لیا۔ یہود اس پر اپنے بچوں کی قربانی دیتے تھے۔ مقدس کتابوں میں بنی اسرائیل کو اس قربانی سے منع کیا گیا۔ بعد میں یہ دیوتا یہوواہ کے نام سے موسوم ہوا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے میں ''الشد ائی'' خدائے واحد کے مفہوم میں استعمال ہوتا تھا۔ جس کے معنی ہیں خدائے قوی، بعد میں یہی نام یہوواہ کے نام سے پکارا جانے لگا۔ کتاب الخروج میں ہے:

''خدا نے موسیٰ سے کہا: یہوواہ اور میں ابراہیم علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کے سامنے الشد ائی (Elshadai) کی حیثیت سے نمودار ہوا لیکن یہوواہ کے نام سے وہ مجھے نہیں جانتے تھے۔''

یہوواہ

یہوواہ کے تلفظ کے بارے میں اختلاف ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود کو خدا کا خاص نام لینے کی اجازت نہ تھی کیونکہ وہ اس میں خدا کی ہتک اور بے ادبی سمجھتے تھے جو شخص اس کا نام لیتا تھا۔ اس کو سنگسار کر دیا

جاتا تھا۔ سال میں ایک مقدس دن میں سب سے مقدس انسان سب سے پاک جگہ کے اندر ایک دفعہ اس کا نام لیتا تھا، دوسرے سب لوگ خاموشی سے سنتے تھے۔

یہود عدم تلاوت کی وجہ سے اس کا تلفظ بھول گئے۔ اب اس تلفظ کے بارے میں شدید اختلاف ہے۔ یَہوَوہ، یہوٗ، یہوٗ، یہوَ، یہوٗ انسائیکلو پیڈیا بیلیکا میں اس کا صحیح تلفظ یَہوٗ بتایا ہے۔

مفہوم

لفظ یَہوٗ ایوالڈ (Ewald) کے خیال میں یاھُوَ کی مختصر شکل ہے۔ اے وہ جو ہے۔ اور خروج ۳:۱۴ میں یہی موسیٰ علیہ السلام کو بتایا گیا تھا۔ یہ لفظ ساری بائبل میں ۶۸۲۳ دفعہ آتا ہے۔

یہوواہ عبرانیوں کا قومی دیوتا تھا۔ لیکن عبرانیوں نے اپنے قومی دیوتا کے لیے یہ لفظ کب استعمال کیا؟ اس کے متعلق محققین کا اختلاف ہے۔ کیلٹ کہتا ہے اس سلسلہ میں دو قول ہیں [1] کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے شخص ہیں۔ جنھوں نے یہوواہ کی پرستش کے لیے ایک عبادت خانہ بنوایا اور مصر میں یہوواہ سے ملاقات بھی کی۔ حضرت اسحاق کے متعلق بھی آتا ہے کہ ان کے لیے یہوواہ نے رہو بوتھ (Rohoboth) میں جگہ بنوائی۔ قدیم روایات میں یہاں تک دعویٰ کیا گیا ہے کہ انسان قدیم زمانے سے یہوواہ سے متعارف ہے۔ حتیٰ کہ انسان کی تیسری نسل نے ہی اپنے معبود کو اس نام سے پکارنا شروع کر دیا۔

اس کے برعکس دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام یہوواہ کے نام سے ناآشنا تھے اور وہ اپنے معبود کو الشدائی کے نام سے پکارتے تھے۔ خروج ۶:۴ میں لکھا ہے۔ ''پھر خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا اور کہا: میں خدا ہوں اور میں نے ابراہیم، اسحاق اور یعقوب پر خدائے قادر مطلق کے نام سے اپنے آپ کو ظاہر کیا۔ اور یہوواہ کے نام سے ان پر ظاہر نہ ہوا۔''

یہ قول پیدائش ۲۲:۱۴ سے ہی غلط معلوم ہوتا ہے۔ لکھا ہے: اور ابراہیم نے اس مقام کا نام یہوواہ یری رکھا۔ چنانچہ آج تک کہا جاتا ہے کہ خداوند کے پہاڑ پر دیکھا جائے گا۔''

محققین کے ایک طبقہ کا یہ خیال ہے کہ یہوواہ مدائن کے اس قبیلے کا دیوتا تھا جس کے سردار حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔ جن کی بیٹی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نکاح میں آئی تھی۔ ممکن ہے یہود نے اس دیوتا کو اپنا لیا ہو یا پھر اپنے قومی دیوتا کا نام بدل کر یہوواہ رکھ لیا ہو۔

یہوواہ کی صفات میں تدریجاً اضافہ

یہود یہوواہ کی پوجا قومی دیوتا کی حیثیت سے کرنے لگے۔ اس کے علاوہ وہ دیگر اقوام کے

[1] کیلٹ تاریخ مذاہب ۴۲-۴۳۔

دیوتاؤں کی بھی پرستش کرتے تھے۔ ان کا دیوتا باقی اقوام کا دیوتا نہیں تھا۔ یہوواہ کے بارے میں یہود کا یہ عقیدہ ہو گیا کہ وہی دشمنوں پر فتح عطا کرتا ہے اور دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

یہود جب دوسرے ممالک میں جاتے یا کسی دوسری قوم کے غلام بن جاتے تو ان کو فاتح قوم کے معبودوں کی پوجا کرنی پڑتی۔ لیکن وہ اپنے معبود یہوواہ کو دوسرے معبودوں کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور خیال کرتے تھے۔

مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ یہوواہ کی صفات میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آغاز میں یہ دیوتا محض زمینوں کی زرخیزی اور فصل کی افزائش کا دیوتا خیال کیا جاتا تھا۔ جب بنی اسرائیل مصر اور شام کے ساتھ برسر پیکار تھے اور وہ افزائش نسل کے بہت محتاج تھے تاکہ اولاد کی زیادتی ان کی عددی قوت میں اضافے کا موجب بنے۔ اس لڑائی کے زمانہ میں اولاد کے لیے بھی اس دیوتا سے دعا اور مدد مانگی جاتی تھی۔ والدین اور اس کے لیے اپنے مولود اوّل کی قربانی کی منت مانتے اور یا پھر اپنے بچوں کو اس کے نام سے منسوب کر دیتے تھے۔

دشمنوں سے مسلسل برسر پیکار رہنے کی وجہ سے یہوواہ دیوتا میں مزید صفات کا اضافہ ہو گیا۔ یہود فتح و نصرت کے لیے اس سے دعائیں مانگتے، مرادیں پوری ہو جانے کی صورت میں قربانی اور نذر و نیاز کا وعدہ کرتے۔ یہوواہ کے نام پر بڑے بڑے معبد بنائے جانے لگے۔ حتیٰ کہ ہیکل سلیمانی کے بارے میں بھی یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اسی دیوتا کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا تھا۔

جب یہوواہ کی قدر و منزلت یہود میں بہت زیادہ ہو گئی اور اس کی پرستش کرنے والوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا۔ تو اب اس کے پجاری اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے اس کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے تھے۔ اس کے باوجود یہود کے نزدیک کوئی قادرِ مطلق دیوتا نہ تھا اور نہ ہی وہ ہر جگہ موجود سمجھا جاتا تھا۔ یہودیوں کا اس کے متعلق صرف یہ عقیدہ تھا کہ اس کی قوت اور علم عام انسانوں سے زیادہ ہے۔ وہ ان کی دعاؤں کو سنتا ہے اور ان کی مدد کرتا ہے۔ ہر غیر معمولی اور خلاف توقع امر میں یہوواہ کی موجودگی کا احساس کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص غیر معمولی کام انجام دیتا یا کوئی ایسی خلاف عقل بات کہہ دیتا جو بعد میں پوری ہو جاتی تو لوگ اس کے متعلق یہ یقین کر لیتے کہ اس میں یہوواہ کی روح جاگزین ہو گئی ہے۔ جنون اور پاگل پن کو بھی اسی کا اثر خیال کیا جاتا تھا۔ بعد میں ان ارواح کی تجسیم عمل میں آئی تو کچھ فرشتے قرار پائے اور کچھ شیطان۔

یہوواہ کے بارے میں ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ وہ صرف آبادیوں میں رہتا ہے۔ جنگل اور ویرانے اس کے وجود سے خالی ہیں کیونکہ وہ خود زندہ ہے اور زندوں میں رہنا پسند کرتا ہے۔

زمانہ کے گزرنے کے ساتھ یہوواہ کی صفات میں ایک اضافہ یہ ہوا کہ اسے طوفان اور بادلوں کا

-لو یوتا بھی سمجھا جانے لگا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ یہوواہ کا مسکن بادل کی گرج اور کڑک میں خیال کیا جانے لگا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی وفات کے ایک صدی بعد اس کی صفات میں مزید اضافہ ہوا۔ اب اسے آدم کا خالق قرار دے دیا گیا۔ اب اس کے بارہ میں یہ نظریہ ہو گیا کہ وہ برہنہ آنکھ سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی اسے دیکھنے کی سعی کرے گا تو وہ فوراً مر جائے گا۔

یہودیوں کی نقل مکانی کی وجہ سے یہوواہ کے ٹھکانے بھی بدلتے رہے۔ اوّل اوّل اس کا مسکن پہاڑ تھے۔ پھر بادلوں میں منتقل ہوا۔ جب بنی اسرائیل مصر سے نکل کر صحرائے سینا میں وارد ہوئے تو یہوواہ بھی وہیں سکونت پذیر ہو گیا۔ جب بنی اسرائیل نے کنعان فتح کیا تو یہوواہ بھی کنعان پہنچ گیا اور کنعانیوں کے عبادت خانے، جو یہودیوں کی تحویل میں تھے، اس کا مسکن قرار پائے۔ یروشلم میں ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے بعد یہوواہ وہاں منتقل ہو گیا۔ اور یہی اس کی مستقل قرار گاہ ٹھہری۔

ابراہیم علیہ السلام

ابراہیم علیہ السلام وہ عظیم نبی ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں تقریباً ستر مرتبہ آیا ہے۔ ان کو اس لحاظ سے بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے کہ دنیا کے تین بڑے مذاہب کے پیروکار مسلمان، یہودی اور عیسائی انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نسب نامہ تورات میں اس طرح مذکور ہے۔

ابراہیم بن تارح بن ناحور بن سروج بن رعو بن فالج بن عابر بن شالخ بن ارفکشاد بن سام بن نوح علیہ السلام۔

قرآن مجید نے ان کے والد کا نام آزر بیان کیا ہے اور تورات کا بیان کردہ نسب نامہ تارح بتاتا ہے۔ (اسی طرح عرب کے نساب بھی اس بات پر متفق ہیں اور زرقانی نے بھی تارخ لکھا ہے) ان دونوں ناموں کے متعلق علماء کے مختلف نظریات اور رائیں ہیں:

پہلا نظریہ

یہ دونوں نام ایک شخصیت کے ہیں۔ تارخ علم اسمی ہے اور آزر علم وصفی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا وصفی نام زیادہ مشہور تھا۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے مشہور وصفی نام کو بیان کیا ہے۔ سہیلی نے روض الانف میں اسی کو اختیار کیا ہے۔[1]

دوسرا نظریہ

مجاہد نے آزر اس بت کا نام قرار دیا ہے۔ جس کی تارخ پوجا کرتا تھا۔ صغانی نے بھی یہی رائے

---

[1] جلد ا۔

اختیار کی ہے۔ دونوں کے نزدیک آزر''ابیہ'' کا بدل نہیں۔ بلکہ بت کا نام ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام مذکور نہیں۔

تیسرا نظریہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ تھا اور چچا کا آزر چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے چچا کے پاس ہی پرورش پائی۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے آزر کو باپ کہہ کر پکارا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: العم صنو ابیہ یعنی چچا باپ ہی کی طرح ہے۔ عربی زبان میں ''اب'' کا لفظ باپ کے علاوہ چچا، دادا وغیرہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ اسی طرح معلم پر بھی۔ ''وجدنا آبائنا علی امة'' میں آباء نا سے مراد علماء لیے گئے ہیں:

چوتھا نظریہ

بعض اوقات کسی نام کی صورت دوسری زبان میں بدل جاتی ہے۔ تارخ عربی زبان میں آزر بن گیا ہے۔ یوسیفس ایک یہودی مورخ نے تارخ کو آتھر لکھا ہے جو آزر سے ملتا جلتا ہے۔

پانچواں نظریہ

''اوار'' کالدی زبان میں بڑے پجاری کو کہا جاتا ہے۔ عربی میں یہ لفظ آزر کہلایا۔ تارخ چونکہ بت تراش اور سب سے بڑا پجاری تھا۔ اس وجہ سے وہ آزر کے نام سے مشہور ہو گیا۔ قرآن مجید نے وہی لفظ اختیار کیا ہے۔

تیسرا نظریہ صحیح ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کسی بزرگ کا نام ہے۔ اس بزرگ کو''اب'' کے نام سے پکارا ہے۔ چچا یا کسی بزرگ کو''اب'' کے ساتھ پکارنا عربی زبان کے خلاف نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے قصبہ عور اس کے باشندے اور اہل فدان میں سے تھے۔ اس وقت تمام عراق میں بت پرستی، چاند پرستی، سورج پرستی اور ستارہ پرستی رائج تھی۔ انھوں نے اس مشرکانہ ماحول میں آنکھ کھولی اور معجزانہ رنگ میں تمام مشرکانہ عبادات سے بچ رہے۔

بعثت

جب آپ سن رشد کو پہنچے تو شرک کے خلاف آواز بلند کی۔ قرآن مجید میں آتا ہے، وَلَقَدْ اٰتَيْنَا اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاهٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ وَاَنَا عَلٰى

ذٰلِكُم مِنَ الشّٰهِدِيْنَ (الانبیاء ۲۱:۵۱......۵۶) اور بلاشبہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو پہلے سے ہی رشد و ہدایت دی تھی اور ہم اس کو خوب جانتے تھے، جب اس نے اپنے بزرگ اور اپنی قوم سے کہا: یہ مجسمے کیا ہیں جن کی تعظیم میں تم لگے ہوئے ہو؟ انھوں نے کہا: ہم نے اپنے بڑوں کو ان کی عبادت کرتے ہوئے پایا۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ تم اور تمھارے بڑے کھلی گمراہی میں تھے۔ انھوں نے کہا: کیا تو ہمارے پاس حق لایا ہے۔ یا تو مذاق کرنے والوں میں سے ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: بلکہ تمہارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ جس نے انھیں پیدا کیا اور میں اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں۔

بتوں کی پرستش نہ کرنے کی یہ دلیل دی کہ یہ بت نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں اور نہ کسی کی حاجت روائی کر سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَالَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا يٰاَبَتِ اِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَالَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِي اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا. (مریم ۱۹:۴۲۔۴۳) جب اس نے اپنے بزرگ سے کہا: اے میرے بزرگ! تو کیوں اس کی عبادت کرتا ہے جو نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے اور نہ کچھ تیرے کام آ سکتا ہے۔ اے میرے بزرگ! مجھے وہ علم ملا ہے جو تجھے نہیں ملا۔ سو تو میری پیروی کر میں تجھے سیدھا راستہ دکھاتا ہوں۔

جب ابراہیم علیہ السلام کے بزرگ نے توحید کا پیغام سنا۔ اس نے تہدیدانہ رنگ میں کہا۔ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِي يٰاِبْرٰهِيْمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا (مریم ۱۹:۴۶) اس نے کہا۔ اے ابراہیم! تو میرے معبودوں سے بے رخی کرتا ہے۔ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کروں گا تو ایک مدت مجھ سے الگ ہو جا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بت پرستی کے ساتھ کواکب پرستی بھی کرتی تھی۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اجرام فلکی ہی رزق، نفع، ضرر، قحط سالی، بارش وغیرہ کا باعث ہیں۔ اس وجہ سے ان کی خوشنودی ضروری ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کواکب پرستی کو بھی دلائل اور براہین سے رد کیا۔ کواکب پرستی کے رد میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دلائل سورہ انعام میں درج ہیں۔

"اور اسی طرح ہم ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہت کے جلوے دکھاتے رہے اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو۔ سو جب رات چھا گئی اس نے ستارہ دیکھا، کہا: کیا یہ میرا رب ہے؟ سو جب وہ ڈوب گیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: میں ڈوب جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر جب چاند چمکتا ہوا دیکھا کہا! کیا یہ میرا رب ہے؟ سو جب وہ ڈوب گیا، کہا اگر میرے رب نے مجھے راہ نہ دکھائی ہوتی تو ضرور گمراہ لوگوں میں سے ہو جاتا۔ پھر جب سورج کو چمکتا ہوا دیکھا کہا یہ میرا رب ہے۔ یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا کہا! اے میری قوم! میں اس سے بیزار ہوں، جو تم شریک بناتے ہو۔ میں نے یک سُو ہو کر اپنا منہ اس کی طرف کیا ہے۔ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ اور میں مشرکوں

میں سے نہیں۔ (الانعام ۶: ۷۵۔۷۹)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مناظرہ میں کواکب پرستی کے رد میں یہ دلیل دی ہے۔ سورج، چاند ستارے کبھی طلوع ہوتے ہیں اور کبھی غروب ہوتے ہیں۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ یہ کسی قانون میں جکڑے ہوئے ہیں۔ قانون میں جکڑی چیز معبود نہیں ہو سکتی۔ کسی چیز کا قانون میں جکڑا ہونا اس امر پر شاہد ہے کہ وہ مجبور ہے، اپنے دائرہ میں مختار نہیں۔ یہ نقص ہے چونکہ اللہ تعالیٰ ہر نقص سے منزہ ہے اس وجہ سے تو اب معبود نہیں بن سکتے۔

جب قوم ابراہیم علیہ السلام کے دلائل قاطع سن کر بھی شرک سے باز نہ آئی۔ تو انھوں نے بتوں کی بے بسی اور بے چارگی کو ظاہر کرنے کے لیے ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ وہ یہ تھا: ایک دفعہ لوگوں سے آنکھ بچا کر مندر میں چلے گئے اور مندر کے بڑے بتوں کے سوا تمام بتوں کو توڑ دیا۔ جب پجاری پوجا کے لیے مندر میں گئے تو بتوں کو شکستہ حالت میں پایا اور ان کے غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہ خبر تمام شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ تمام مشرک کہہ اٹھے کہ یہ کام ابراہیم علیہ السلام ہی کا ہے۔ وہی ہمارے دیوتاؤں کا بڑا دشمن ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗ اِبْرٰهِيْمُ. قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ. قَالُوْٓا ءَ اَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَالَ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ. فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ. ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ. قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ.

(الانبیاء ۲۱: ۵۹۔۶۶) انھوں نے کہا ہمارے معبودوں کا یہ حال کس نے کیا؟ وہ تو کوئی بڑا ہی ظالم ہے لوگوں نے کہا: ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے ہوئے سنا تھا جسے ابراہیم علیہ السلام کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا: اسے لوگوں کے سامنے لاؤ تاکہ وہ گواہی دیں۔ لوگوں نے کہا: اے ابراہیم علیہ السلام! کیا تو نے ہمارے معبودوں سے یہ حرکت کی ہے؟ اس نے کہا بلکہ یہ کیا جس نے بھی کیا ان کا یہ بڑا بت ہے۔ سو ان سے پوچھو اگر وہ بولتے ہیں۔ سو وہ اپنے دلوں میں سوچنے لگے اور کہنے لگے تم خود ہی ظالم ہو۔ اس کے بعد اپنے سروں کو نیچا جھکا کر کہنے لگے۔ اے ابراہیم! تو جانتا ہے کہ یہ بات نہیں کرتے کہا، تو کیا اللہ کو چھوڑ کر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔ جو تمھیں کچھ نفع نہیں دیتا اور نہ تمھیں نقصان پہنچا سکتا ہے؟ تم پر افسوس ہے اور تمھارے معبودانِ باطلہ پر بھی جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

بادشاہ سے مناظرہ

اس زمانہ میں عراق کے بادشاہ کا نام نمرود تھا۔ تمام رعایا اس کو معبود مانتی تھی۔ جب بادشاہ کو

...رت ابراہیم علیہ السلام کی پیغمبرانہ دعوت وتبلیغ کا علم ہوا تو اس کو یہ خیال آیا اگر اس شخص کی یہ سرگرمیاں جاری رہیں تو رعایا اس کی ربوبیت اور ملوکیت سے برگشتہ ہو جائے گی۔ بادشاہ نے فوراً حضرت ابراہیم کو دربار میں بلایا اور ہستی باری تعالیٰ کے متعلق مناظرہ کیا۔ قرآن مجید نے اس مناظرہ کو اس رنگ میں بیان کیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ. (بقرہ:۲۵۸) ''کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کا واقعہ جس نے ابراہیم علیہ السلام سے اس کے رب کے بارے میں مناظرہ کیا کیونکہ اس کو اللہ نے بادشاہت دی ہوئی تھی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا میرا رب وہ ہے جو زندگی بخشتا ہے، اور مارتا ہے۔ اس نے کہا میں بھی زندگی دیتا ہوں اور مارتا ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو مغرب سے نکال، پھر وہ کافر حیران رہ گیا اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ ہدایت نہیں دکھاتا۔''

ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بادشاہ کے سامنے ہستی باری تعالیٰ کی دو دلیلیں دی ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ اللہ ہی قوموں کو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ بادشاہ نے اس کا یوں رد کیا کہ میں بھی یہ قدرت رکھتا ہوں کہ جس کو چاہوں زندہ رکھوں اور جس کو چاہوں مار دوں، حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ بادشاہ زندگی اور موت کے فلسفہ کو نہیں سمجھا، فوراً نظام کائنات کی دلیل پیش کر دی اور کہا میرا رب تو اپنے قانون کے مطابق مشرق سے سورج نکالتا ہے۔ تم اس قانون کو بدل کر اگر تم خدا کی خدائی میں شریک ہو تو مغرب سے سورج کو طلوع کرو۔ یہ دلیل سن کر بادشاہ مبہوت رہ گیا۔

آگ کا سرد ہونا

جب قوم اور بادشاہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دلائل قاطعہ وساطعہ کا جواب نہ دے سکی تو انھوں نے برافروختہ ہو کر آگ کے الاؤ میں ڈال دیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے انھیں صحیح وسلامت بچالیا۔

ہجرت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلاف دشمنی کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے تحت حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی سارہ کو ساتھ لے کر فرات کے غربی کنارہ کے قریب ایک بستی میں چلے گئے جو کلدانیین کے نام سے مشہور ہے حضرت لوط علیہ السلام بھی ساتھ تھے کچھ عرصہ یہاں قیام کرنے کے بعد حران کی جانب چلے گئے اور وہاں توحید کا پیغام پھیلاتے رہے۔ اس طرح تبلیغ کرتے کرتے فلسطین پہنچ گئے۔ آپ نے فلسطین کے غربی اطراف میں سکونت اختیار کی۔ اس زمانہ میں یہ علاقہ کنعانیوں کے ماتحت تھا۔ پھر قریب ہی شکیم (نابلس) میں چلے گئے۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کیا۔ اس کے بعد مصر پہنچ گئے۔ اس وقت

مصر میں عمالقہ کی حکومت تھی، اور بادشاہ کا نام رقیون[1] تھا۔ شاہانِ عمالقہ عیاشی اور بدکاری میں یہاں تک آگے گزر چکے تھے کہ رعایا کی شوہردار حسین بیوی کو ان کے خاوندوں سے چھین کر اپنے حرم میں داخل کر لیتے تھے۔ بی بی سارہ کو بھی بادشاہ نے اپنے لیے پسند کر لیا لیکن خدا تعالیٰ نے رات کو رویاء میں بتا دیا کہ وہ برگزیدہ نبی کی بیوی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ناپاک ارادہ سے باز رہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بہت قدر و منزلت کی اور رضاجوئی کے لیے ایک صاحبزادی ہاجرہ کو بھی ساتھ کر دیا۔ حضرت سارہ نے اولاد سے محروم ہونے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ وہ حضرت ہاجرہ سے شادی کر لیں۔ حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے اور اس کے بعد حضرت سارہ کے بطن سے بھی حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالاتِ زندگی

بنی اسرائیل کی مذہبی اور سیاسی زندگی کا جائزہ

بعض مفسر لفظ موسیٰ کو مو بمعنی ماء (پانی) شی بمعنی شجر سے مرکب بتاتے ہیں۔ بعض اس کو ماس یمیس سے فعلیٰ کا وزن بتاتے ہیں۔ مفسرین بائبل اس کو ماشہ (نکلنا) سے مشتق بتاتے ہیں، نئی تحقیق کی رُو سے یہ مصری لفظ ہے جس کے معنی بچہ یا بیٹا ہے۔

نسب وولادت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسب چند واسطوں سے حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد کا نام عمران اور والدہ کا نام یوکابد تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کی ولادت عمران کے گھر ایسے وقت میں ہوئی جب رعمیسس ثانی فرعونِ مصر بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کر دیتا تھا۔ بنی اسرائیل پر یہ مصیبت نازل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ تاریخ اثریات سے پتہ چلتا ہے کہ "اسیویہ" قبائل جو مصر کے قریب تھے۔ ان کے اور فراعنہ کے اس خاندان کے درمیان پیہم نو سال تک جنگ جاری رہی۔ بدیں وجہ یہ قرین قیاس ہے کہ رعمیسس دوم نے اس خوف سے کہ کہیں بنی اسرائیل کا یہ عظیم الشان قبیلہ جو لاکھوں نفوس پر مشتمل تھا۔ اندرونی بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائے بنی اسرائیل کو ان مصائب میں مبتلا کرنا ضروری سمجھا جن کا ذکر تورات اور قرآن حکیم میں ہے۔[2]

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کے والدین سخت پریشان ہوئے۔ اس پریشانی کے وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کے دل میں القاء کیا کہ ایک تابوت بنا کر اس بچہ کو اس میں رکھ کر دریا میں ڈال دے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اِذْ اَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّکَ مَا یُوْحٰی اَنِ اقْذِفِیْهِ فِی

1. خطبات احمدیہ ص ۱۰۹۔
2. قصص القرآن مصنفہ مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی ص ۳۶۳۔

التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ. (طٰہٰ ۲۰:۳۸۔۳۹) جب ہم نے تیری ماں کی طرف وحی کی جو اب وحی کی جاتی ہے کہ اسے صندوق میں ڈال دے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ہدایت خداوندی کے تحت ویسا ہی کیا۔ صندوق تیرتا ہوا شاہی محل کے کنارے آ لگا تو فرعون کے گھرانے کے آدمیوں نے اس صندوق کو کنارہ سے اٹھالیا اور بچہ کو محل میں لے گئے۔ فرعون نے بچہ کو قتل کرنا چاہا لیکن فرعون کی بیوی آسیہ نے کہا کہ بچے کو قتل نہ کرو یہ بچہ میرے اور تیرے لیے آنکھ کی ٹھنڈک ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَالْتَقَطَهٗ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ. وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ لَا تَقْتُلُوْهُ عَسٰى اَنْ يَّنْفَعَنَا اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (القصص ۲۸:۸۔۹) پس فرعون کے گھرانے کے لوگوں نے اس کو اٹھالیا تاکہ وہ ان کے لیے دشمن اور غم کا موجب ہو، فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر بلاشبہ خطا کار تھے اور فرعون کی عورت نے کہا۔ میرے لیے اور تیرے لیے آنکھ کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل نہ کرو، شاید وہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے بیٹا بنالیں۔ اور وہ نہیں جانتے تھے۔

بچہ کسی عورت کا دودھ نہیں پیتا تھا۔ چنانچہ موسیٰ کی ہمشیرہ جو صندوق کے پیچھے پیچھے گئی تھی، اس نے آل فرعون کو یہ کہا کہ میں تمھیں ایک ایسی دایہ کا پتہ بتاتی ہوں جو اس بچہ کی خدمت کے لیے نہایت ہی موزوں ہے چنانچہ اس نے اپنی والدہ کی نشان دہی کی اور اجازت چاہی کہ وہ اس کو لے آئے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیرہ گھر آئیں۔ اور والدہ کو لے گئیں۔ بچہ اپنی والدہ کی آغوشِ تربیت میں آ گیا اور خدا کا وعدہ پورا ہو گیا کہ بچے کو تیری طرف لوٹا دیا جائے گا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (القصص ۲۸:۷) یعنی ہم اس کو تیری طرف لوٹا دیں گے اور اس کو رسولوں میں سے بنانے والے ہیں۔

جوانی اور قبطی کا قتل

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گو شاہی محل میں پرورش پائی، لیکن ان کی بیدار آنکھیں بنی اسرائیل کے ظلم وستم کو دیکھ رہی تھیں۔ بنی اسرائیل اس زمانہ میں نہایت ہی ذلت اور مسکنت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خون بنی اسرائیل کی ذلت اور غلامی کے بندھنوں کو دیکھ کر کھولتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی راستے پر جا رہے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مصری ایک اسرائیلی کو زدوکوب کر رہا ہے۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدد کے لیے بلایا۔ اس کی مظلومیت کو دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام فوراً آگے بڑھے اور مصری کے منہ پر طمانچہ دے مارا۔ مصری اس ضرب سے جان بحق ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھا تو بہت افسوس کیا کیونکہ ان کا ارادہ قتل کرنے کا نہ تھا۔ خدا کے آستانہ پر گر گئے اور ندامت اور توبہ واستغفار کے پانی سے اپنی غلطی کے دھبہ کو دھو ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی توبہ قبول فرما کر اپنی رداء مغفرت میں لے لیا۔

حسن اتفاق سے اگلے دن اسی راستہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام جا رہے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہی اسرائیلی کسی قبطی سے جھگڑ رہا ہے اور قبطی غالب ہے۔ اسرائیلی نے پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر مدد کے لیے بلایا۔ موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے اور مصری کو اس کے ظلم سے باز رہنے کو کہا اور دوسری طرف اسرائیلی کو بھی جھڑکا اور فرمایا: اِنَّکَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ تو یقیناً کھلا کھلا گمراہ ہے۔ یعنی خواہ مخواہ لوگوں سے جھگڑتا رہتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اسرائیلی کو اس مصری کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لیے آگے بڑھے تو اس نے شور مچانا شروع کر دیا۔ کل تم نے ایک شخص کو قتل کیا تھا۔ آج مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔[1] اس سے حکام کو خبر ہو گئی۔ اور انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا۔ کسی آدمی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکام کے فیصلہ کی خبر دے دی اور آپ وہاں سے بھاگ نکلے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (القصص ۲۱:۲۸) سو ڈرتا ہوا مڑ مڑ کر دیکھتا ہوا وہاں سے نکل پڑا۔ کہا میرے رب! مجھے ظالم لوگوں سے نجات دے۔

مدین کی طرف سفر

حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے بھاگ کر مدین کی طرف چلے گئے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔
وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (القصص ۲۲:۲۸) اور جب موسیٰ علیہ السلام نے مدین کی طرف رخ کیا کہا: امید ہے کہ میرا رب مجھے سیدھے راستے پر چلائے گا۔

مدین طولاً خلیج عقبہ (عیلانہ) کے سواحل پر دہانہ خلیج سے ساحل بحر احمر وارض ثمود و حجاز تک جہاں ثمود و جرہم وعرب اسماعیل آباد تھے، واقع تھا۔[2]

جب موسیٰ علیہ السلام مدین پہنچے تو وہاں لوگوں کو ایک کنویں پر مویشیوں کو پانی پلاتے ہوئے دیکھا اور ان کے علاوہ وہاں دو عورتیں بھی تھیں جو اپنی بھیڑ بکریوں کو روک رہی تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے پوچھا: تمہارا کیا معاملہ ہے؟ انھوں نے جواب دیا۔ ہم اس وقت تک پانی نہیں پلا سکتیں جب تک چرواہے اپنے جانوروں کو پانی نہ پلا لیں۔ ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔ سو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا۔ پھر درخت کے سایہ کی طرف چلے گئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی اے میرے پروردگار! مجھ پر رحم فرما اور اپنی عنایت سے میری پریشانی کو دور فرما۔

کچھ عرصہ کے بعد ایک لڑکی شرم سے منہ نیچے کیے ہوئے آئی اور کہنے لگی۔ میرا باپ تجھے پانی پلانے کی مزدوری کے لیے بلا رہا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام شیخ کبیر کے پاس پہنچے تو اپنی تمام

۱ سورۃ القصص ۱۹:۲۸۔
۲ ارض القرآن حصہ دوم مصنفہ مولانا سید سلیمان ندوی ص ۳۔

سرگزشت سنائی۔ انھوں نے آپ کو تسلی دی اور کہا اب آپ گھبراہٹ اور خوف کو اپنے دل سے نکال دیں کیونکہ ان ظالموں کے پنجۂ استبداد سے نجات پا چکے ہیں۔

شادی

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور شیخ کبیر کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں کہ لڑکی نے کہا! اے باپ! اس مہمان کو اپنے جانوروں کے چرانے اور پانی پلانے کے لیے نوکر رکھ لیجئے کیونکہ یہ قوی اور امانت دار ہیں۔

باپ کو لڑکی کی بات بہت پسند آئی تو انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا۔ اگر تم آٹھ سال تک میرے پاس رہو اور میری بکریاں چراتے رہو تو میں اپنی ایک لڑکی کی شادی تم سے کروں گا، اور اگر تم دو سال مزید میری خدمت میں گزار دو تو یہ اور بہتر ہوگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے وطن سے دور تھے۔ وہاں نہ کوئی مددگار تھا اور نہ کوئی رشتے دار اس لیے ایک ہمدم کی شدید ضرورت تھی۔ اس شیخ کبیر کی درخواست کو فوراً قبول کر لیا۔ اس کے بعد اس شیخ کبیر نے اپنی لڑکی کی شادی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کر دی۔

اس واقعہ کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ قَالَتْ اِحْدٰهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ. قَالَ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰٓى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ. قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ. (قصص ۲۸:۲۶۔۲۸) دونوں لڑکیوں میں سے ایک نے کہا: اے میرے باپ! اسے نوکر رکھ لیجئے۔ البتہ بہترین نوکر جس کو تو رکھنا چاہے وہ ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔ اس نے کہا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تجھ سے کر دوں۔ اس شرط پر کہ تو آٹھ سال میری نوکری کرے۔ پھر اگر تو دس سال پورے کرے تو یہ تیری طرف سے ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تجھ پر تکلیف ڈالوں، اگر اللہ چاہے تو تو مجھے نیک لوگوں میں سے پائے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یہ میرے اور تیرے درمیان وعدہ ہوا۔ جونسی مدت میں پوری کر دوں۔ مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی اور اللہ اس پر جو ہم کہتے ہیں کارساز ہے۔

شیخ کبیر کون تھا؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر کے بارے میں مفسرین اور اصحاب سیر کا اختلاف ہے۔ اکثر مفسرین کے نزدیک حضرت شعیب علیہ السلام کے بھتیجے اثیرون تھے۔ بعض نے اس شیخ کبیر کا نام ثیری لکھا ہے۔ مگر ثیری والی روایت میں یہ نہیں کہا گیا کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام کا بھتیجا تھا۔ بائبل میں اس شخص کو مدین کا کاہن رعوائل نام قرار دیا ہے۔ بائبل میں حضرت شعیب علیہ السلام کا نام ثیرو ہے۔

بعض مفسرین نے یہ لکھا کہ نام کے بارے میں کوئی روایت صحت کو نہیں پہنچتی، اس لیے جس طرح قرآن مجید نے نام کی تصریح نہیں کی، ہم بھی نام کے پیچھے نہ پڑیں۔

مصر کی طرف روانگی

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مقررہ مدت ختم کر چکے تو فوراً بعد ہی مصر کو روانہ ہو گئے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖ (قصص ۲۸:۲۹) سو جب موسیٰ علیہ السلام نے مدت پوری کر لی، اور اپنے گھر والوں کو ساتھ لے کر چل پڑے۔

نبوت

جب واپس مصر جا رہے تھے تو وادیٔ مقدس میں طور کی جانب میں آگ کی روشنی دیکھی تو اپنے گھر والوں سے کہا: ٹھہر جاؤ، میں نے آگ دیکھی ہے، شاید میں تمھارے پاس اس میں سے شعلہ لے آؤں یا اسی آگ پر رستہ پاؤں۔ جب اس آگ کی طرف آئے تو وادی کے دائیں جانب سے آواز آئی یٰمُوْسٰى اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۲۸:۳۰) اے موسیٰ میں اللہ جہانوں کا پروردگار ہوں۔

یہاں ہی اللہ نے عصا اور بیضا کا معجزہ دیا، جس کی تشریح بعد میں آئے گی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی کے ذریعہ یہ حکم دیا کہ وہ ان نشانوں کے ساتھ فرعون کے پاس جائے اور اس کو راہ ہدایت کی طرف بلائے اور بنی اسرائیل کو آزاد کرنے کا مطالبہ کرے کیونکہ بنی اسرائیل عرصہ دراز سے فرعون اور اس کی قوم کے پنجۂ استبداد میں جکڑے چلے آرہے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میرے بھائی ہارون کو بھی میرا مددگار بنا۔ تاکہ دونوں بنی اسرائیل کو پنجۂ ظلم سے نجات دلا سکیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ هٰرُوْنَ اَخِی اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ وَاَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ (طٰہٰ ۲۰:۲۹-۳۲) اور میرے ساتھیوں میں سے ہارون میرے بھائی کو میرا بوجھ بٹانے والا بنا دے، میری قوت کو اس کے ساتھ مضبوط کر اور میرے کام میں اسے شریک کر۔

حکم خداوندی کے تحت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس گئے، توحید کا پیغام پہنچایا۔ شرک اور گناہوں سے باز رہنے کی تعلیم دی۔ بنی اسرائیل کو اپنے پنجۂ ظلم سے نجات دینے کا مطالبہ کیا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَقَالَ مُوْسٰى یٰفِرْعَوْنُ اِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ حَقِیْقٌ عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ (۷:۱۰۴-۱۰۵) اور موسیٰ نے کہا: اے فرعون میں جہانوں کے رب کی طرف سے رسول ہوں۔ اس پر قائم کہ اللہ پر سوائے حق کے کچھ نہ کہوں۔ میں تمھارے پاس رب سے کھلی دلیل لایا ہوں۔ سو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔

دوسری جگہ آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں فرعون کے پاس گئے اور اس سے بنی اسرائیل کو پنجۂ غلامی سے نجات دینے کو کہا: ارشاد الٰہی ہے: فَأْتِيَهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكَ وَالسَّلَامُ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَى (۲۰:۴۷) سو اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم تیرے رب کے دو رسول ہیں۔ سو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور انھیں دکھ نہ دے، ہم تیرے رب کی طرف سے تیرے پاس ایک نشان لائے ہیں اور اس پر سلامتی ہے جو ہدایت کی پیروی کرتا ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہم تیرے رب کی طرف سے پیغمبر ہو کر آئے ہیں تو فرعون نے متکبرانہ لہجہ میں کہا: اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے، پھر ان کی جسمانی اور روحانی پرورش کے لیے ہر قسم کے سامان مہیا کیے، انسانوں کو ان کے کمال تک پہنچانے کے لیے رسول بھیجے۔ وحی نازل کی، فرعون نے کہا: پہلی قومیں جنھیں ہدایت نہیں ملی ان کا کیا حال ہے؟ اس کا جواب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیا کہ وہ میرا کام نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے مناسب حال جو سامان چاہا کر دیا۔ سب علم اللہ کے پاس ہی ہے وہ نہ کسی کے متعلق غلطی کرتا ہے اور نہ کسی کو بھولتا ہے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے انعامات بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اللہ کی وہ ذات ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو فرش بنایا اور تمھارے لیے اس میں راستے چلائے اور بادل سے پانی اتارا اور پھر ہم اس کے ساتھ مختلف سبزیوں کے جوڑے پیدا کرتے ہیں۔''[1]

نشان کا مطالبہ

فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اگر تو سچا ہے تو کوئی نشان دکھا۔ تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا تو وہ ناگہاں صریح اژدہا تھا اور اپنا ہاتھ باہر نکالا تو ناگہاں وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید تھا۔[2]

جب فرعون کی قوم کے سرداروں نے نشان دیکھے تو انھوں نے کہا کہ یہ کوئی دانا جادوگر ہے، اور یہ چاہتا ہے کہ تمھیں تمھارے ملک سے نکال دے۔ سو تم اس بارے میں کیا مشورہ دیتے ہو؟ انھوں نے کہا اسے اور اس کے بھائی کو کچھ عرصہ مہلت دیجیے اور شہروں میں نقیب بھیج دیجیے اور ملک بھر کے تمام جادوگر تیرے پاس لے آئیں گے۔ فرعون نے نقیب تمام شہروں میں پھیلا دیے اور وہ ملک کے بڑے بڑے جادوگروں کو فرعون کے پاس لے آئے، جادوگروں نے فرعون سے کہا: اگر ہم غالب آ گئے تو ہمیں ضرور اجر ملے گا۔ فرعون نے کہا: تم یقیناً میرے مقربوں میں سے ہو گے۔

---

1. طٰہٰ ۲۰:۵۳۔ 2. الاعراف ۷:۱۰۷.....۱۰۸۔

فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو بھی دربار میں بلالیا، اور جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا، کیا تم پہلے جادو دکھاؤ گے یا ہم دکھائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: تمھارے پاس جو کچھ ہے وہ دکھادو۔ جادوگروں نے اپنی رسیاں اور سونٹیاں ڈالیں۔ اور لوگوں کی آنکھوں کو دھوکا دیا اور ڈرایا وہ رسیاں اور سونٹیاں سانپ معلوم ہونے لگیں۔

تب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف اللہ تعالیٰ نے وحی کی اور کہا کہ تم اپنا سونٹا پھینکو۔ ارشاد خداوندی کے تحت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سونٹا پھینکا تو وہ اژدہا بن گیا۔ اور جادوگروں کے سانپوں کو نگل گیا۔

جب جادوگروں کا جادو باطل ہوگیا اور وہ ہار گئے تو وہ فوراً حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔

فرعون نے کہا: کیا تم نے ایمان لانے سے پہلے مجھ سے اجازت لی تھی؟ یہ تم نے ایک سازش کے تحت کام کیا ہے تاکہ تم اس شہر کے رہنے والوں کو اس سے نکال دو۔ تم کو اس سازش کا نتیجہ چکھاؤں گا، میں تمھارے ہاتھ اور پاؤں مخالف طرف سے کاٹ دوں گا۔ پھر تم کو صلیب دوں گا تاکہ لوگوں کے لیے عبرت کا نشان بنو۔

ایمان لانے والے جادوگروں نے کہا۔ ہم کو ایک دن مرنا ہے اور اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اس وجہ سے ہم ایمان کی دولت کو اپنے دلوں سے نکال نہیں سکتے تو ہمیں صرف اس وجہ سے عذاب کی دھمکی دے رہا ہے کہ ہم اپنے رب کی باتوں پر ایمان لے آئے۔

مومنین کی دُعا

انسانی فطرت ہے کہ جب انسان دشمن کے نرغے سے گھر جاتا ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔ تب انسان اللہ تعالیٰ کے آستانہ پر گرتا ہے اس کی روح پانی کی طرح گداز ہوکر بہہ نکلتی ہے اور خدا سے نجات کا ملتجی ہوتا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی نجات کے لیے دوڑ کر آتا ہے اور اس کو صبر و استقلال کی دولت سے نوازتا ہے۔ جب ایمان لانے والے جادوگروں نے دیکھا کہ وہ فرعون کے پنجۂ ظلم سے نجات نہیں پا سکتے تب ان کی روح آستانۂ الوہیت پر گری اور دعا کی، اے اللہ ہم کو اس آزمائش میں کامیاب کرنا اور ہمیں ایمان کی حالت میں وفات دینا۔

دوسرے نشان

بائبل میں ذیل کی نشانیوں کا ذکر ہے: دریا کا لہو بن جانا، مینڈکوں کی آفت جوئیں، مچھر، مویشی پر مری، پھوڑوں کی آفت، ٹڈی، تاریکی۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ (بنی اسرائیل ۱۰۱:۱۷) اور یقیناً

ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نو کھلے نشان دیے۔

وہ نو نشان مختلف آیات میں یہ ہیں: قحط، پھلوں کی کمی،[1] طوفان، ٹڈیاں، جوئیں، مینڈکیں، خون،[2] عصا اور ید بیضا۔

مصریوں پر عذاب الٰہی

فرعون اور اس کی قوم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیغام رشد و ہدایت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ معدودے چند کے سوا مصریوں میں کوئی بھی ایمان نہ لایا بلکہ فرعون کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی زیادہ توہین اور تذلیل ہونے لگی۔ جب مصریوں کا ظلم اپنی انتہا کو پہنچ گیا، تب اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق یکے بعد دیگرے عذاب بھیجے، جب بھی عذاب نازل ہوتا تو فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کرتا کہ وہ عذاب کے ہٹ جانے کی دعا کرے اور وعدہ کرتا کہ عذاب کے ہٹ جانے پر وہ ضرور ایمان لے آئے گا۔ لیکن جب عذاب ہٹ جاتا تو وہ پھر اپنی پرانی روش پر چل پڑتا۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يٰمُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِي إِسْرَائِيلَ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلَى أَجَلٍ هُمْ بَالِغُوهُ إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ. (الاعراف ۷: ۱۳۴......۱۳۵) اور جب ان پر عذاب پڑتا تو کہتے! اے موسیٰ! ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر جیسا کہ اس نے تجھ سے عہد کیا ہے اگر تو ہم سے عذاب دور کردے ہم ضرور تجھ پر ایمان لے آئیں گے اور ضرور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے۔ پس جب ہم ان سے ایک وقت کے لیے جس کو وہ پہنچنے والے تھے۔ عذاب اٹھا دیتے تو فوراً عہد شکنی کرتے۔

بنی اسرائیل کا مصر سے خروج

جب مصریوں کا ظلم و تشدد اپنی عروج کو پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر فلسطین کی طرف لے جائے تب وہ رات کی تاریکی میں بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر منزل مطلوب کی طرف چل دیے۔

مصر سے فلسطین جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک خشکی اور وہ قریب کا ہے۔ دوسرا بحرہ احمر (قلزم) کا راستہ یعنی اس کو عبور کر کے بیابان سور اور سینا (تیہ) کی راہ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بحرہ احمر کا راستہ اختیار کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام خشکی کا راستہ اختیار کرتے تو لازمی طور پر بنی اسرائیل کو مصریوں کے ساتھ جنگ لڑنی پڑتی تھی، چونکہ بنی اسرائیل مدتوں تک مصریوں کی غلامی میں رہ چکے تھے۔ اس وجہ سے وہ مصریوں کا دلیری کے ساتھ مقابلہ نہیں

---

[1] الاعراف ۷: ۱۳۰۔ [2] الاعراف ۷: ۱۳۳۔

ہو سکتے تھے۔ تورات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

''جب فرعون نے ان لوگوں کو جانے کی اجازت دے دی، تو خدا ان کو فلستیوں کے ملک کے راستہ سے نہیں لے گیا۔ اگر چہ ادھر سے نزدیک پڑتا، کیونکہ خدا نے کہا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ لڑائی بھڑائی دیکھ کر پچھتانے لگیں، اور مصر کو لوٹ جائیں بلکہ خداوند ان کو چکر کھلا کر بحیرہ قلزم کے بیابان کے راستے لے گیا۔''[1]

دوسری وجہ یہ تھی کہ اللہ کے علم میں فرعون اور اس کے لشکر کو تباہ کرنا بھی تھا، تا کہ وہ اپنے ظلم و تکبر کی سزا پائیں۔

جب صبح ہوئی تو فرعون کو علم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام تو بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر لے گیا ہے۔ فوراً ایک لشکر جرار جمع کیا اور ان کے تعاقب میں چل دیے۔ جب بنی اسرائیل نے لشکر کو دیکھا تو گھبرا کر کہنے لگے کیا مصر میں قبریں نہ تھیں جو تو ہم کو مرنے کے لیے بیابان میں لے آیا۔ تو نے ہم سے یہ کیا کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا؟ کیا ہم تجھ سے مصر میں یہ بات نہ کہتے تھے کہ ہم کو رہنے دے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں؟ کیونکہ ہمارے لیے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر ہوتا۔''[2]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو تسلی دی کہ فرعون ان کو پکڑ نہیں سکے گا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم بنی اسرائیل کو لے کر بحرہ قلزم کے کنارے پہنچے تو کنارہ سے پانی ہٹا ہوا تھا۔ وہ خشک راستہ پر چل دیے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا (طٰہٰ ۲۰:۷۷) یعنی دریا میں ان کو خشک راستہ پر لے جاؤ۔ دوسری جگہ آتا ہے: جَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ (الاعراف ۷:۱۳۸) یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو دریا پار کرا دیا...... ایک جگہ اور آتا ہے: فَانْفَلَقَ (الشعراء ۲۶:۶۳) یعنی دریا پھٹ گیا۔

بائبل میں صرف یہ آتا ہے۔ ''خداوند نے بہ سبب پوربی آندھی کے تمام رات میں دریا کو چلا دیا اور دریا کو سکھا دیا۔'' (خروج ۱۴:۲۱)

اب کس طرح دریا پھٹا؟ آندھی سے یا جوار بھاٹا سے یا خدا کی کسی اور قدرت سے؟ بہر حال یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ ہے کہ وہ دشمن سے بچ کر نکل گئے۔

فرعون نے بھی اپنے لشکر کو اسی راستہ میں بنی اسرائیل کے پیچھے ڈال دیا۔ جب بنی اسرائیل کا ہر فرد دوسرے کنارے پر پہنچ گیا تو پانی پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا اور فرعون اور اس کا تمام لشکر پانی میں غرق ہو گیا۔

جب فرعون غرق ہونے لگا تو فوراً پکار اٹھا ''میں وحدہٗ لاشریک ہستی پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔''

اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔

آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ. فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ

[1] خروج باب ۱۳ آیات ۱۷، ۱۸۔

[2] خروج باب ۱۴ آیات ۱۱۔۱۲۔

لِمَنْ خَلْفَکَ اٰیَۃً. (یونس۱۰: ۹۱......۹۲) کیا اب تو ایمان لاتا ہے اور پہلے تو نے نافرمانی کی اور تو فساد کرنے والوں میں سے تھا۔ سو آج ہم تیرے بدن کو بچا دیں گے تاکہ تو ان کے لیے جو تیرے پیچھے ہیں۔ نشان ہو۔

قرآن مجید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت پر یہ ایک واضح دلیل ہے کہ اس بات کا پتہ دیا جس کا علم اس زمانہ میں کسی کو نہ تھا۔ بائبل میں نہ اور کسی کتاب میں فرعون کی لاش کو دریا سے باہر پھینکنے کا ذکر ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ سے وحی پا کر یہ اطلاع دی کہ فرعون کی لاش محفوظ ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا بری ٹینیکا میں مضمون ممی کے نیچے لکھا ہے کہ رعمسیس ثانی کی لاش آج تک ان لاشوں میں محفوظ ہے جو مصالح وغیرہ کے ذریعے رکھی جاتی ہیں۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر سینا کی راہ لی، تو راستہ میں لوگوں کو بتوں کی پوجا کرتے ہوئے پایا۔ بنی اسرائیل نے یہ پوجا پاٹ دیکھ کر کہا! اے موسیٰ علیہ السلام! ہم کو بھی ایسے معبود بنا دے، تاکہ ہم بھی اسی طرح ان کی پرستش کریں، حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ سن کر بہت غصے میں آئے اور کہنے لگے کہ خدائے واحد کی ہی عبادت کرو، بتوں کی پرستش کی طرف مت جھکو اور ان نعمتوں کو مت بھولو، جن کا تم مشاہدہ کر چکے ہو۔

دیگر مطالبات اور نشانات کا ظہور

چشموں کا جاری ہونا

جب بنی اسرائیل بحیرہ قلزم کو عبور کر کے وادئ سینا میں پہنچے، وہ بے آب گیاہ میدان تھا۔ یہاں شدید گرمی پڑتی تھی۔ دُور دُور تک پانی اور سبزہ کا نام ونشان نہ تھا۔ بنی اسرائیل اس حالت کو دیکھ کر گھبرا گئے کہ پانی کے بغیر کیسے زندہ رہ سکیں گے۔ اس وقت بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی طلب کیا۔ تو عصا موسیٰ علیہ السلام کی ایک ٹھوکر سے چشمے جاری ہو گئے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اِذَاسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِہٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاکَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا (البقرہ:۶۰) اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا، اپنا عصا چٹان پر مار پس اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔

ایلم ایک مقام ہے جہاں بارہ چشمے تھے (خروج ۱۵: ۲۵، ۲۷) اور آج تک عیون موسیٰ کے نام سے مشہور ہیں۔

من وسلویٰ کا انتظام

جب بنی اسرائیل کو پانی مل گیا تو بھوک لگی اور کھانے کی چیزیں طلب کیں۔ اس بے آب وگیاہ وادی میں کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، اے اللہ کھانے کی اشیاء مہیا کر۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سنی تو من اور سلویٰ نازل کیا۔ قرآن مجید میں

آتا ہے: وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ. (البقرہ۲:۵۷) اور ہم نے تم پر من اور سلویٰ نازل کیا۔ ان طیب چیزوں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو دیں۔

بادلوں کا سایہ

چٹیل بیابان ہو، گرمی کا موسم ہو، سورج نصف النہار پر ہو، مکانوں اور خیموں کا کوئی بندوبست نہ ہو، ایسے وقت میں بادل نعمت غیر مترقبہ ہوتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو اس تکلیف کی حالت میں دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو آسمان پر بادلوں کے پرے کے پرے آ گئے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ (۲:۵۷) اور ہم نے پر بادلوں کا سایہ کیا۔

طور پر اعتکاف اور نزول شریعت

اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام ستر آدمیوں کو ساتھ لے کر کوہ طور پر چالیس راتوں کے لیے گئے۔ بائبل میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چالیس دن پہاڑ پر پڑا رہنا مذکور ہے: "اور موسیٰ بدلی کے درمیان چلا گیا اور پہاڑ پر چڑھ گیا اور موسیٰ پہاڑ پر چڑھ گیا۔" (خروج ۱۸:۲۴) یہ وہ زمانہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توریت کے احکام نازل ہوئے۔ یہ واقعہ مصر سے آنے کے بعد کا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے ان ستر آدمیوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے ہم کلام ہو کر یہ احکام دیے ہیں۔ تب انھوں نے کہا: ہم یہ نہ مانیں گے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے کلام کرتا ہے جب تک کہ خود بھی خدا کو نہ دیکھ لیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی دکھائی، جس سے پہاڑ میں زلزلہ آ گیا اور آدمیوں پر غشی کی موت طاری ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو یوں سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ کو ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جاتا، بلکہ وہ اپنی قدرتوں اور کاموں سے پہچانا جاتا ہے۔

احکام عشرہ

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احکام عشرہ دیے جن کا ذکر آگے زیر عنوان حقوق العباد میں آئے گا۔

بچھڑے کی پرستش

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں سامری کی ہدایت کے مطابق بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے ان کو بہت سمجھایا کہ وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، لیکن انھوں نے سنی اَن سنی کر دی۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تو حضرت ہارون علیہ السلام سے بہت خفا ہوئے۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا کہ میں نے ان کو شرک سے بہت روکا تھا، لیکن وہ رکے نہیں۔ تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑے کے بت کو جلا کر اس کی راکھ سمندر میں بکھیر دی۔

قرآن مجید میں آتا ہے:

اے سامری! تو اپنے معبود کی طرف دیکھ جس کی عبادت میں تو لگا ہوا تھا۔ ہم اسے جلا دیں گے۔ پھر اسے دریا میں اچھی طرح بکھیر دیں گے۔

مصر میں جہاں بنی اسرائیل چار سو سال سے رہتے تھے گائے کی پرستش ہوتی تھی، اسی کے زیر اثر بنی اسرائیل نے ایک گائے کی پوجا شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس خاص گائے کی پوجا کے متعلق اطلاع دے دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ اطلاع دی ہے کہ تم گائے کی پوجا کرتے ہو۔ تب انھوں نے بڑے حیلوں اور بہانوں کے بعد گائے کو جا کر ذبح کیا۔[1]

فلسطین کی طرف جانے کا حکم

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو ارض مقدس میں بحیثیت فاتح داخل ہونے کو کہا اور کہا کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ ارضِ مقدس تمھیں ضرور ملے گا۔ لیکن اس کے لیے جدوجہد ضروری ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو ارض مقدس میں بحیثیت فاتح داخل ہونے کو کہا اور کہا کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ ارضِ مقدس تمھیں ضرور ملے گا لیکن اس کے لیے جدوجہد ضروری ہے۔

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کی نافرمانی کر دی اور کہا کہ اس علاقہ میں ایک زبردست قوم رہتی ہے، جب تک وہ قوم اس علاقہ میں ہے ہم ہرگز نہیں جائیں گے۔ گنتی ۱۲:۱۲ میں ہے:

”ہمیں زور نہیں کہ ان لوگوں پر چڑھیں، کیونکہ وہ ہم سے زیادہ زور آور ہیں۔“

قرآن مجید میں آتا ہے: قَالُوْا يَا مُوْسٰى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دَاخِلُوْنَ (۵:۲۲) انھوں نے کہا، اے موسیٰ! اس میں قوی ہیکل لوگ رہتے ہیں اور ہم ہرگز اس میں داخل نہ ہوں گے۔ جب تک وہ اس میں سے نکل نہ جائیں، ہاں اگر وہ اس میں سے نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہوں گے۔

پھر فرمایا: قَالُوْا يٰمُوْسٰى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا اَبَدًا مَّادَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ. انھوں نے کہا: اے موسیٰ! ہم اس بستی میں کبھی داخل نہیں ہوں گے۔ جب تک وہ اس میں رہتے ہیں، پس تو اور تیرا رب جاؤ اور جنگ کرو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔

پس قوم بنی اسرائیل اپنی بزدلی اور نافرمانی کی سزا میں چالیس سال بیابانوں میں پھرتی رہی۔ ارشاد الٰہی ہے: ”اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اب وہ زمین ان پر چالیس سال کے لیے حرام کر دی گئی ہے، اسی زمین پر سرگرداں پھرتے رہیں۔ سو تو ان نافرمان لوگوں پر افسوس نہ کر۔“ (۵:۲۶)

چالیس سال بیابان میں سرگرداں پھرنے کے بعد آخر کار ۱۲۵۰ ق م میں وہ کنعان پہنچے۔ حضرت

---

[1] البقرہ ۲: ۶۷......۷۱۔

ہارون فوت ہو چکے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم سے ان کے جنرل یوشع نے حملہ کیا۔ پہلا حملہ جیرکو (Jericho) پر ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی انتقال ہو گیا۔ حضرت یوشع شہر میں داخل ہوئے۔ سات سال کے عرصہ میں پورا کنعان فتح کر لیا۔ حضرت یوشع نے قانون موسوی نافذ کیا۔ اس قانون کے مطابق ججوں کی حکومت شروع ہوئی، جس کا ذکر بائبل میں آتا ہے۔

معجزات حضرت موسیٰ علیہ السلام

عصا:۔ قرآن میں آتا ہے: فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ۔ (الاعراف ۷:۱۰۸) پس اس نے اپنا عصا ڈالا تو واضح طور پر اژدہا تھا۔ عصا کے عام معنی آلہ کے ہیں۔ لغت میں عصا کے اصل معنی اجتماع اور ائتلاف لکھے ہیں یعنی اکٹھا ہونا۔ اصمعی کہتا ہے عصا کے معنی سونٹا اس لیے ہے کہ اس پر انگلیوں کا اجتماع ہوتا ہے عصوت کے معنی ہیں میں نے جمع کیا۔ خوارج کے متعلق آتا ہے۔ شَقُّوْا عَصَا الْمُسْلِمِیْن یعنی انھوں نے مسلمانوں کی جماعت میں اختلاف اور انتشار پیدا کر دیا۔ ایسا ہی ایاک و قتیل العصا کے معنی ہیں جماعت اسلام میں تفرقہ ڈالنے سے بچو۔ پس عصا کے معنی سونٹا اور جماعت دونوں ہیں۔

معجزہ عصا کا ایک مفہوم یہ ہے جو قرآن مجید کے ظاہری الفاظ کے زیادہ قریب ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنے سونٹے کو پھینکتے تھے تو وہ اژدھا بن جاتا تھا، جیسا کہ آیت سے ظاہر ہے ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کی جماعت اپنے مخالفین پر غالب آ جائے گی۔

بعض نے عصا کے معنی اللسان یعنی زبان بھی لیے ہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے وہ القی عصاہ کی تشریح یہ کرتے ہیں کہ جادوگروں نے باطل کی حمایت میں جو تقریریں کی تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو اپنے زور بیان سے باطل کر دیا۔

ید بیضا

قرآن مجید میں آتا ہے: نَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّاظِرِينَ (الاعراف ۷:۱۰۸) اس نے اپنا ہاتھ باہر نکالا تو ناگہاں وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید تھا۔

ید بیضا کا ایک مفہوم جو زیادہ واضح اور مقبول عام ہے، یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی رسالت منوانے کے لیے مخالفین کو یہ معجزہ دکھایا کہ جب وہ اپنا ہاتھ باہر نکالتے تو نور کی شعاعوں سے چمکنا شروع ہو جاتا تھا۔ جس کو ناظرین اپنی برہنہ آنکھ سے دیکھ سکتے تھے۔

بعض مفسرین نے ید بیضا سے مراد دلائل اور براہین بھی لیے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دلائل قاطعہ سے مخالفین کے دلائل باطلہ کو رد کر دیا۔ جیسا کہ لسان العرب میں الید البیضاء کے معنی الحجۃ المبرہنۃ یعنی روشن یا واقع دلیل ہیں۔

بارہ چشموں کا معجزہ

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا. اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا کہ اپنا عصا چٹان پر مارو، اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔

جب بنی اسرائیل فرعون سے بھاگ کر ویرانوں میں گھوم رہی تھی، تو ان کو پیاس بجھانے کے لیے پانی کی ضرورت پڑی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے دعا مانگی تو اللہ نے کسی خاص پہاڑ پر جانے کی ہدایت کی اور پتھر کو سونٹا مارنے کا حکم دیا، جہاں سے چشمے پھوٹ پڑے۔

ایلم ایک مقام ہے جہاں بارہ چشمے تھے۔ (خروج ۱۵: ۲۵......۲۷) آج تک یہ چشمے موسیٰ علیہ السلام کے نام سے مشہور ہیں۔ (بائبل ڈکشنری مطبوعہ آکسفورڈ پریس)

باقی کے نشان

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ (الاعراف ۷: ۱۳۳) پس ہم نے ان پر طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈکیں اور خون کھلی ہوئی نشانیاں بھیجیں۔

بائبل میں ذیل کی نشانیوں کا ذکر ہے۔

۱۔ دریا کا لہو بن جانا۔ ۲۔ مینڈکوں کی آفت۔ ۳۔ جوئیں۔ ۴۔ مچھر۔ ۵۔ مویشیوں پر مری۔ ۶۔ پھوڑوں کی آفت۔ ۷۔ اولے۔ ۸۔ ٹڈی۔ ۹۔ تاریکی۔

قرآن مجید نے جو آفات بیان کی ہیں وہ سات ہیں، پانچ مذکورہ آیت کریمہ میں اور دو سورہ الاعراف کی آیت ۱۳۰ میں ارشاد الٰہی ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ. اور البتہ ہم نے فرعون کے لوگوں کو قحط اور پھلوں کی کمی میں پکڑا تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

یونانی اقتدار کا اثر یہودیوں پر

جب سکندر نے دارا کو شکست دی تو یہودی یونانیوں کے زیر اثر آ گئے۔ غلبہ کے ابتدا میں یہودیوں پر کوئی خاص اثر دکھائی نہیں دیتا۔ سکندر کی وفات کے بعد تقریباً ایک صدی تک یہودی مصر کے بطلیموس خاندان کے ماتحت رہے لیکن یہود نے حکمران طبقہ کا اثر قبول نہ کیا لیکن اس کے برعکس یہودیوں میں قومیت کا احساس شدت سے اُبھرنا شروع ہوا۔ جب فلسطین یونانی بادشاہ سیکولس کے زیر نگین آیا تو یونانی

حکمرانوں نے یونانی تہذیب اور یونانی مذہبی رسوم کو غیر پر ٹھونسنا چاہا اور انطاکیہ کے یونانی حکمرانوں نے اپنی تہذیب اور مذہبی رسوم کا پرچار شروع کر دیا۔

انطالیس چہارم نے یہودی مذہب مٹانے اور یونانی دیوتا زیس (Zeus) کی پرستش کو عام رواج دینے کی کوشش کی، تو اس کے نتیجہ میں یہودیوں میں قومی احساس پیدا ہوا۔ ایک کامیاب بغاوت کی اور فلسطین میں ایک یہودی ہاسمونین خاندان کی حکومت قائم کر دی چونکہ حکمران خاندان کو مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ یہودیوں نے اس خاندان کی حکومت اس وجہ سے قائم کی کہ وہ یونانی اثرات سے محفوظ رہیں گے۔ اس سے ان کا مقصد پورا نہ ہوا اور یہودیوں کے مذہبی طبقات نے اس خاندان سے تعلقات منقطع کر لیے۔ یہ مذہبی طبقات ''حسدین'' (Hasdaeans) کہلاتے تھے۔ جس کے معنی ''متقی اور پارسا'' لوگ ہیں۔ ان کے بعد فریسیوں کا گروہ پیدا ہوا۔ یہ لوگ یونانی تصورات اور رسوم سے سخت متنفر تھے۔ ان کا ایک الگ گروہ تھا۔ یہ لوگ عزرا اور نحمیاہ نبی کے پیرو تھے۔ جنھوں نے یہودیوں کو غیر یہودی عورتوں سے شادی کرنے سے منع کر کے یہودیوں کو بت پرستی سے محفوظ رکھنا چاہا تھا۔ مذہبی طبقہ اور حکمران طبقہ کے درمیان مخالفت پیدا ہو گئی۔ آخر کار مذہبی طبقہ کی قیادت و سیادت تسلیم کر لی گئی۔ اب یہودیوں کے مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں مذہبی اور دنیاوی قیادت کی باگ ڈور آ گئی سلطنت روم تک اس طبقہ کو یہودیوں پر کامل اختیارات حاصل تھے۔ حتیٰ کہ ایک بار رومی حکمران کو بھی ان کے سامنے حاضر ہونا پڑا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں یہودیوں کے مذہبی طبقے کا کتنا زور تھا اور معاشرہ میں ان کو کتنا بلند مقام حاصل تھا۔ انھیں عشر کی آمدنی کے علاوہ ہر فصل میں پھلوں کی پہلی کھیپ دی جاتی تھی اور عوام ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

مذہبی قوانین کے مطالعہ کا شوق

یونانی تہذیب کی مخالفت کا ایک ردعمل یہ ہوا کہ یہودیوں میں مذہبی قوانین کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا۔ ۴۴۴ ق م میں عزرا اور نحمیاہ نبی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قوانین کو مدون کیا اور کاہنوں، پجاریوں اور کاتبوں نے ان قوانین کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ۲۶ ق م میں عہد نامہ قدیم کا یونانی ترجمہ ہوا اور غیر اسرائیلی یہودیوں کو خود ان کی اپنی مادری زبان میں کتب مقدسہ کے مطالعہ کا موقع ملا۔ فقہ کی تدوین اور اشاعت کی وجہ سے یہودیوں میں سے کئی ایک فرقے پیدا ہو گئے۔ جیسے جیسے یہودیوں کو یونانی تہذیب سے واسطہ پڑا، وہ یونانی رسوم اور افکار کو بنظر استحسان دیکھنے لگے۔ ابتداء میں وہ یونانیوں کی تہذیب و تمدن اور رسوم سے عمدہ عناصر جذب کرنا چاہتے تھے لیکن بعد میں وہ اپنی مذہبی رسوم اور تہذیب سے بالکل الگ ہو گئے اور یونانی تہذیب کے رنگ میں رنگین ہو گئے۔

حسیدین (Hasdaeans)

یونانی اثر کو روکنے کے لیے حسیدین نے بہت کام کیا اس جماعت کا بڑا قائد جوڈاس تھا۔ جس کی زیر قیادت اس جماعت نے شاندار ایثار اور قربانی کا مظاہرہ کیا۔ یہ لوگ اپنے اعتقادات اور مذہبی قوانین پر سختی سے پابند تھا۔ مثلاً سبت کے دن اگر کوئی ان پر حملہ کر دیتا تو وہ بجائے مدافعت کے اپنی جانیں قربان کر دیتے تھے لیکن بعد میں یہ جماعت اندرونی خلفشار اور انتشار کا شکار ہوگئی۔

یہودیت کا مذہبی ادب

بائبل یونانی لفظ بیلاس سے ماخوذ ہے جو اس چرمی وصلی کا نام ہے جو لکھنے کے لیے مصر میں استعمال ہوتی تھی جب یہ صحیفے شروع میں لکھے گئے تو ان کا نام اس چرمی وصلی کے نام پر مشہور ہوگیا۔ بائبل دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصے کا نام عہد نامہ عتیق ہے اور دوسرے کا نام عہد نامہ جدید یہودی لوگ عہد نامہ عتیق کو مانتے ہیں مگر عیسائی عہد نامہ جدید کو مانتے ہیں اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ عہد نامہ جدید عہد نامہ عتیق کا ناسخ اور نافذ ہے۔

عہد نامہ عتیق کے دو نسخے ہیں۔ ایک عبرانی زبان میں مسورہ (یعنی روایتی نسخہ) کہلاتا ہے، دوسرا یونانی نسخہ جسے نسخہ سبعیہ (سیپٹوایجنٹ) کہتے ہیں۔

یہودی لوگ عبرانی نسخہ مسورہ کو مستند تسلیم کرتے ہیں اور عیسائی یونانی نسخہ کو مانتے ہیں۔

اصل یونانی نسخہ میں ۱۹ کتابیں مسودہ سے زائد ہیں جو رومی اور یونانی کلیسا میں پڑھی جاتی ہیں، مگر پروٹسٹنٹ نے انھیں بائبل سے خارج کر دیا ہے۔ (ہسٹری آف دی انگلش بائبل ص ۱۳)

عبرانی نسخہ (مسورہ) تین حصوں پر مشتمل ہے۔ ۱۔ تورات ۔ نبیم ۔ ۳۔ کتبیم۔

نبیم اور کتبیم کی کتابوں کی ترتیب یونانی اور مسورہ میں مختلف ہے۔

عہد نامہ عتیق

عہد نامہ عتیق میں ۲۹ کتب ہیں۔

۱۔ توریت میں پانچ کتابیں ہیں۔ یعنی ۱۔ پیدائش۔ ۲۔ خروج۔ ۳۔ احبار۔ ۴۔ گنتی۔ ۵۔ استثناء (بعض کے نزدیک چھٹی کتاب یعنی یشوع بھی توراۃ میں شامل ہے)

۲۔ پرانے انبیاء کی کتب۔ اس حصے میں چھ کتب شامل ہیں یعنی یشوع، قاضیوں، ایک سموئیل، دو سموئیل، ایک سلاطین اور دو سلاطین۔

۳۔ متبرک تحریرات۔ اس میں تیرہ کتب ہیں۔ روتھ، ایک تواریخ، دو تواریخ، عزرا، نحمیاہ، استر، ایوب، زبور، امثال سلیمان کی کتاب، غزلیات سلیمان، نوحہ یرمیاہ اور دانیال۔

۴۔ بعد کے انبیاء کی کتب۔ یہ تین ہیں۔ یعنی یسعیاہ، یرمیاہ اور حزقیل کی کتب۔

۵۔ چھوٹے انبیاء کی کتب۔ اس فہرست میں بارہ کتب ہیں۔ ہوسیا، جول، آموس، عبیدیا، یونس، میکاہ، نحوم، حبقوق، صفنیہ، ہگائی، ذکریا اور ملاکی کتاب۔

پس عہد نامہ عتیق کی مسلمہ کتب ۳۹ ہیں۔ ان کے علاوہ چودہ کتب اور ہیں جو صرف یونانی عہد نامہ شامل ہیں جن کو خفیہ تحریرات کہتے ہیں۔

پہلی یا تیسری اور اس دوسری یا چوتھی اور اس طوبت، جوڈتھ، آستھر کا وہ حصہ جو استھر کی کتاب میں شامل نہیں۔ سلیمان کی عقل کی باتیں، یسوع بن سیراخ کی عقل کی باتیں، باروخ، تین پاک بچوں کا گیت، تاریخ سوسانا بیل اور اژدھا۔ یہودا کے بادشاہ مناسیس کی دعا پہلی میکابیس اور دوسری میکابیس۔

اندرونی شہادت کہ بائبل تحریف وتبدل سے مبرا نہیں

سب سے پہلے بائبل کی اندرونی شہادتیں درج کی جاتی ہیں جن سے یہ واضح ہو جائے گا کہ بائبل اصلی حالت میں محفوظ نہیں۔

ا۔ بعض گمشدہ کتب بائبل جن سے واقعات نقل کیے گئے ہیں

سترہ کتب ایسی ہیں جو کسی زمانہ میں موجود تھیں لیکن اب ناپید ہیں، مگر ان کے حوالہ جات عہد نامہ عتیق میں موجود ہیں چنانچہ ان کتابوں کے نام معہ ان آیات کے حوالوں کے جن میں ان کا ذکر آیا ہے۔ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

نمبر شمار	نام کتب گم شدہ	حوالہ جات عہد عتیق موجودہ
۱۔	کتاب عہد نامہ موسیٰ	خروج باب ۲۴ آیت ۷
۲۔	جنگ نامہ خداوند	گنتی باب ۲۱ آیت ۱۴
۳۔	کتاب یشیر (الیاشر)	یشوع باب ۱۰ آیت ۱۳، سموائیل دوم باب ۱ آیت ۱۸
۴۔	کتاب یاہو بن حنانی	تواریخ دوم باب ۲۰ آیت ۳۴
۵۔	کتاب سمعیاہ نبی	تواریخ دوم باب ۱۲ آیت ۱۵
۶۔	کتاب اخیاہ نبی	تواریخ دوم باب ۹ آیت ۲۹

۷۔	کتاب ناتن نبی	تواریخ دوم باب ۹ آیت ۲۹
۸۔	کتاب مشاہدات عید و غائب میں	تواریخ دوم باب ۹ آیت ۲۹
۹۔	کتاب اعمال سلیمان	سلاطین اول باب ۱۱ آیت ۴۱
۱۰۔	کتاب مشاہدات یسعیاہ بن اموص	تواریخ دوم باب ۲۶ آیت ۲۲
۱۱۔	کتاب مشاہدات یسعیاہ بن اموص	تواریخ دوم باب ۳۲ آیت ۳۲
۱۲۔	سموائیل غیب بین کی تواریخ	تواریخ اول باب ۲۹ آیت ۲۹، ۳۰
۱۳۔	نغمات سلیمان ایک ہزار پانچ	سلاطین اول باب ۴ آیت ۳۲، ۳۳
۱۴۔	سلیمان کی کتاب خواص نباتات وحیوانات	سلاطین اول باب ۴ آیت ۳۲، ۳۳
۱۵۔	کتاب امثال سلیمان (یہ تین ہزار امثال اس سے مختلف ہیں جو موجودہ عہد عتیق میں درج ہیں)	سلاطین اول باب ۴ آیت ۳۲
۱۶۔	جادغیب بین کی تواریخ	تواریخ اول باب ۲۹ آیت ۲۹
۱۷۔	مرثیہ یرمیاہ (یہ مرثیہ اس نوحہ یرمیاہ سے مختلف ہے جو بائبل میں درج ہے بقول بشپ پیٹرک یہ مرثیہ اب گم ہے)	تواریخ دوم باب ۳۵ آیت ۲۵

۲۔ان کتب کے علاوہ اور بھی چند ایک کتب معدوم ہو چکی ہیں جس کا اعتراف مسیحی علماء کو ہے۔ چنانچہ ہمفنڈ رڈ صاحب اپنی کتاب ''سوالات'' مطبوعہ لندن ۱۸۴۳ء میں سوال دوم کے ذیل میں رقمطراز ہیں:
''یہ کتابیں جن میں حضرت مسیح علیہ السلام کو ناصری کہا گیا ہے (اور جس کا ذکر مقدس متی نے باب ۲ آیت ۲۳ میں کیا ہے) نیست و نابود ہو گئی ہیں۔ اس لیے کہ جو کتابیں نبیوں کی اب موجود ہیں ان میں کسی میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ناصری نہیں لکھا گیا۔''

گریز اسٹم صاحب اپنی ہوملی یعنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ''پیغمبروں کی بہت سی کتابیں ناپید ہو گئیں۔ اس لیے کہ یہودیوں نے غفلت سے بلکہ بے دینی سے بعض کتابوں کو کھو دیا اور بعض کو پھاڑ ڈالا اور بعض کو جلا دیا۔''

یہوداہ کے خط (عہد جدید) آیت ۹ میں لکھا ہے کہ جب میکائیل نے شیطان سے تکرار کر کے موسیٰ کی لاش کی بابت بحث کی۔'' ظاہر ہے کہ یہوداہ نے یہ واقعہ توریت سے ہی اخذ کیا ہوگا لیکن موجودہ

توریت میں یہ واقعہ نہیں ملتا۔

تمطاؤس دوم باب ۳ آیت ۸ میں لکھا ہے کہ ''یانا س اور یمبر اس نے موسیٰ کا سامنا کیا۔'' یہ دونوں نام موجودہ عہد عتیق میں نہیں پائے جاتے۔

یہوداہ نے اپنے خط کی آیت ۱۴، ۱۵ میں حنوک کی پیش گوئی کا جو ذکر کیا ہے وہ موجودہ توریت میں کہیں درج نہیں۔

زبور ۱۰۵ آیت ۱۸ میں یوسف علیہ السلام کی بیڑیوں اور بیڑیوں کا جو حال درج ہے، اس کا ذکر توریت میں کہیں نہیں ملتا۔

تفسیر ڈوائیلی مطبوعہ ۱۸۵۶ء جلد ۲ صفحہ ۱۳۹ پر لکھا ہوا ہے۔

''اس بادشاہ روشن ضمیر یعنی سلیمان نے اس دانائی کو جو اس نے پائی انسانوں کے فائدے کے لیے استعمال میں لانا چاہا، اور بہت سی کتابیں ان کی تعلیم کے لیے لکھیں۔ مگر حضرت عزرا نے ان میں سے صرف تین کو مقدس کتابوں میں داخل کیا اور بقیہ کتابیں (جو کتب مقدسہ میں داخل نہیں کی گئیں) یا تو مذہبی تربیت کے لیے نہیں لکھی گئی تھیں یا ایک زمانہ کے گزر جانے کے باعث خراب اور ناقص ہوگئی تھیں۔''

۳۔ وہ کتب جو عہد عتیق میں داخل تھیں لیکن ان کو جعلی قرار دیا گیا ہے

بعض ایسی کتب ہیں جو عہد عتیق میں داخل تھیں لیکن اب ان کو جعلی قرار دیا گیا ہے اور بائبل سے خارج کر دی گئی ہیں۔ یہ سب کتب عہد عتیق کے یونانی ترجمہ سپٹواجنٹ یعنی سبعینیہ میں جو ۲۸۴ برس قبل مسیح تیار ہوا تھا، موجودہ ہیں۔ اور یونانی اور رومی کلیسا کے نزدیک مقدس ہیں اور بعض کی اب تک تلاوت کی جاتی ہے لیکن پراٹسٹنٹ کلیسا نے ان کو عہد عتیق سے خارج کر دیا ہے۔ علماء یورپ اب ان کی تاریخی اہمیت تسلیم کرتے ہیں، کیونکہ ان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تین سو برس قبل کی تاریخ و حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

بعض واقعات تو ایسے ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بزرگ آزر سے مناظرہ جو سورۃ انعام میں مذکور ہے، توریت کی کتاب پیدائش میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ لیکن یہ مناظرہ کتاب جوبلی کی آیت ۱۲ میں درج ہے جو جعلی قرار دے کر عہد نامہ عتیق سے خارج کر دی گئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں بعض کتب حقیقتاً جعلی ہیں۔ جب یہود کے فرقوں میں باہمی مناظروں اور مباحثوں کا بازار گرم ہوا تو مناظرین نے اپنے مدعا کے مطابق کتب تصنیف کر کے ان کو انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب کر دیا۔

متروکہ کتب کے نام حسب ذیل ہیں۔

نمبر	کتب متروکہ	نمبر	کتب متروکہ
۱ تا ۷۔	کتب سبعہ شیث ۳	۲۶۔	تاریخ بربادی بل اور ذرگن
۸۔	کتاب حنوک	۲۷۔	دعائے منیس شاہ یہودیہ
۹۔	کتاب مشاہدات ابراہیم	۲۸۔	کتاب مقابیں (مقابیاں) اول
۱۰۔	کتاب مشاہدات موسیٰ	۲۹۔	کتاب مقابیں (مقابیاں) دوم
۱۱۔	کتاب پیدائش صغیر	۳۰۔	کتاب معراج اشعیاء
۱۲۔	کتاب قیاسِ موسیٰ	۳۱۔	ملفوظات حبقوق
۱۳۔	کتاب الوصیت موسیٰ	۳۲۔	کتاب لموئیل
۱۴۔	کتاب اسرار موسیٰ	۳۳۔	کتاب جوبلی
۱۵۔	کتاب معراج موسیٰ	۳۴۔	کتاب حزقیل بابت یروشلم
۱۶۔	کتاب عزرا نمبر ا	۳۵۔	کتاب حزقیل بابت صدقیاہ اور بائبل بعض عیسائی علماء نے تین مزید کتب کا اضافہ کیا ہے۔
۱۷۔	کتاب عزرا نمبر ۲	۳۶۔	سموائیل کی وہ کتاب جس کا ذکر سموئیل اوّل باب ۱۰ آیت ۲۵ میں آیا ہے۔
۱۸۔	کتاب توبٹ	۳۷۔	ہوسیاہ جس کا ذکر تواریخ دوم باب ۳۳ آیت ۹ میں آیا ہے۔
۱۹۔	کتاب جودتھ	۳۸۔	عیدو نبی کی تفسیر جس کا ذکر تواریخ دوم باب ۱۳ آیت ۲۲ میں آیا ہے۔
۲۰۔	بقیہ ابواب استر		
۲۱۔	کتاب سلیمان کی دانائی		
۲۲۔	کتاب الواعظ		
۲۳۔	کتاب باروق		
۲۴۔	کتاب تاریخ سینا		
۲۵۔	تین معصوم بچوں کا نغمہ		

۴۔ توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہیں لکھی

توریت کا نسخہ مسورہ عبرانی زبان میں ہے۔ مسورہ کے معنی روایتی نسخہ ہیں۔ یہ ہیکل میں روایتی طور پر تلاوت کیا جاتا تھا، لیکن اس نسخہ کی اصل کے متعلق کچھ علم نہیں کہ وہ کہاں ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہاڑ پر بیٹھ کر صرف دو الواح (احکام عشرہ) کندہ کر لی تھیں[1] ان کے علاوہ کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی۔ یہی الواح خداوند کے صندوق میں محفوظ تھیں۔ مگر یہ صندوق فلسطینی لوگ بنی اسرائیل سے چھین کر لے گئے اور بادشاہ مساؤل (طالوت) دشمنوں سے چھین کر واپس لایا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد مبارک میں وہ

1۔ استثناء ۴:۱۳، ۵:۲۲، ۱۰:۴، ۵، ۹، ۱۰، ۱۱۔

صندوق کھولا گیا تو اس میں سے صرف ذوالواح نکلی[1] تھیں۔ اس کے بعد ان دو الواح کے متعلق بھی کسی کو علم نہیں ہے کہ وہ کہاں گئیں کیونکہ یہودی قوم پر دشمنوں نے کئی حملے کیے۔ ان کے ہیکل کو جلا دیا۔ یہود کو اسیر بنا کر جلاوطن کر دیا گیا۔

ان حوالہ جات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہ تو خود توریت لکھی اور نہ لکھوائی۔ اس لیے اس کتاب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر غائب کے صیغہ میں آتا ہے۔ مثلاً گنتی باب ۱:۱۲ تا ۵ میں درج ہے۔

''مریم اور ہارون نے موسیٰ کا شکوہ اس کوشی عورت کی بابت کہ اس نے لی تھی کیا۔ کیونکہ اس نے کوشی عورت لی تھی۔ اور بولے کیا خداوند نے صرف موسیٰ ہی سے باتیں کی ہیں۔ کیا اس نے ہم سے بھی باتیں نہیں کی ہیں۔ چنانچہ خداوند نے یہ سنا پر وہ مرد موسیٰ سارے لوگوں سے جو روئے زمین پر تھے زیادہ حلیم تھا۔ سو خداوند نے ناگہاں موسیٰ کو اور ہارون کو اور مریم کو فرمایا کہ تم تینوں جماعت کے خیمہ کے پاس آؤ۔ سو وے تینوں آئے تب خداوند بدلی کے ستون میں ہو کے اترا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب میں بعد کے واقعات

موجودہ توریت میں ایسے مقامات اور واقعات کا ذکر ہے۔ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صدہا برس بعد رونما ہوئے۔ مثلاً پیدائش ۳۵:۲۱ میں درج ہے۔

''پھر اسرائیل نے کوچ کیا اور اپنا خیمہ مجدل عدر کے اس پار کھڑا کیا۔''

میکہ نبی کی کتاب ۴:۸ کی بنا پر بیت المقدس کے ایک مینار کا نام مجدل عدر ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ۷۰۰ سال بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا۔

کتاب پیدائش ۳۶:۳۱ میں درج ہے۔

''اور بادشاہ جو ملک ادوم پر مسلط ہوئے پیشتر اس سے کہ اسرائیل کا کوئی بادشاہ ہو یہی ہیں۔''

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کتاب پیدائش چند بادشاہ ہو چکنے کے بعد لکھی گئی۔

اسرائیل کا پہلا بادشاہ ساؤل حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا ہے۔ (سموئیل اول باب ۸) گویا یہ عبارت حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کم از کم چھ سو برس بعد کی ہے۔

خروج ۱۶:۳۵،۳۶ میں لکھا ہے کہ ''بنی اسرائیل ۴۰ برس جب تک کہ وہ بستی میں آئے من کھاتے رہے جب تک کہ وے زمین کنعان کی نواحی میں آئے من کھاتے رہے۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب خروج اس وقت لکھی گئی جب کہ بنی اسرائیل کنعان میں پہنچ چکے تھے اور من کا کھانا موقوف ہو چکا تھا اور ایفہ کا وزن رائج ہو چکا تھا۔ کتاب یشوع باب ۵ آیت ۱۱،۱۲ کے مطابق یہ باتیں موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں نہیں ہوئیں۔

---

[1] سلاطین اول ۸:۹ تواریخ دوم ۵:۱۰ عبرانیوں کا خط ۴:۹۔

دان نام کا شہر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد قاضیوں کے زمانہ میں بسایا گیا (قاضیوں ۲۹:۱۸)
موسیٰ علیہ السلام کو کتاب پیدائش ۱۴:۱۴ اور استثناء ۱:۳۴ میں دان نام کے شہر کا ذکر موجود ہے۔

بنی اسرائیل کی ابتدائی تاریخ میں دو بغاوتوں کا ذکر آتا ہے۔ ایک بغاوت کا سرغنہ قارون تھا اور دوسری کا داتن اور ابرام۔ ان دونوں کو تاریخ نویسوں نے باہم خلط ملط کر دیا ہے۔ حالانکہ دونوں واقعات الگ الگ زمانہ کے ہیں چنانچہ سائیکلو پیڈیا ببلیکا میں لکھا ہے۔

In numbr 15.17 the revolt of Dathon and Abiram is mingled and confused with an other revolt that of Korah consiquently it is difficult indeed impossible to interpret the narrative as it stands.

نمبر ۱۵:۱۷ میں داتن اور ابرام کی بغاوت کو قارون کی بغاوت سے غلط ملط کر دیا گیا ہے چنانچہ موجودہ قصے کو سلجھانا محال ہے۔

کتاب استثناء باب ۳۴ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا ذکر ہے۔ مفسرین بائبل کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ کسی اور نبی نے لکھ کر موسیٰ کی کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ اس میں لکھا ہے!

۵۔ سو خداوند کا بندہ موسیٰ خداوند کے حکم کے مطابق موآب کی سرزمین میں مر گیا۔ ۶۔ اور اس نے اسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغفور کے بالمقابل گاڑا، پر آج کے دن تک کوئی اس کی قبر کو نہیں جانتا۔ ۷۔ اور موسیٰ اپنے مرنے کے وقت ۱۲۰ برس کا تھا کہ نہ اس کی آنکھیں دھندلائیں اور نہ اس کی تازگی جاتی رہی۔ ۸۔ سو بنی اسرائیل موسیٰ کے لیے موآب کے میدانوں میں تیس دن تک رویا کیے اور ان کے رونے پیٹنے کے دن موسیٰ کے لیے آخر ہوئے۔''

آیت نمبر ۵ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا ذکر ہے آیت نمبر ۶ میں ان کی تدفین اور قبر کا ذکر کیا ہے اس کے بعد یہ بھی بتا دیا کہ آج تک اس کی قبر کے متعلق کوئی نہیں جانتا۔ آیت ۷، ۸ میں وفات کے بعد کے حالات مذکور ہیں۔

گنتی باب ۲۱ آیت ۳ میں ہے کہ ''خداوند نے اسرائیل کی آواز سنی اور کنعانیوں کو گرفتار کر دیا اور انھوں نے انھیں اور ان کی بستیوں کو حرام کر دیا اور اس نے اس مقام کا نام حرمہ رکھا۔'' اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کتاب اس وقت لکھی گئی جب کہ کنعانی قتل ہو چکے تھے اور ان بستیوں کا نام حرمہ ہو چکا تھا اور قاضیوں کے باب اوّل آیت ۱۷ کی رو سے یہ واقعات موسیٰ علیہ السلام سے بہت بعد کے ہیں۔

گنتی باب ۲۱ آیت ۱۴ میں لکھا ہے کہ ''اس سبب خداوند کے جنگ نامہ میں لکھا ہے کہ خداوند آندھی میں واہیب پر قابض ہوا اور ارنون کی نہروں پر۔'' اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب کا مصنف حضرت موسیٰ علیہ السلام نہیں بلکہ اس کا لکھنے والا کوئی اور شخص ہے جس نے بعض حالات کو ''جنگ نامہ خداوند'' سے نقل کیا۔ یہ کتاب بقول طامس اسکاٹ مفسر کے کسی اسرائیلی یا بت پرست نے خداوند کے نام سے تصنیف کی اور فتح سیحون کے حالات کو اس میں درج کر دیا۔ ان فتوحات کا وقوع موسیٰ علیہ السلام سے بعد ہوا۔ یہ

جنگ نامہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کی تصنیف ہے۔

۵۔ تصحیحات احبار

علماء یہود نے جان بوجھ کر بائبل میں تحریف کی۔ یہ تحریفات ''تصحیحات احبار'' کے نام سے مشہور ہیں۔ (ہسٹری آف دی انگلش بائبل مصنفہ ریورنڈ طامس ص ۱۴)

اس کی چند ایک مثالیں درج ہیں۔

پیدائش ۱۸: ۲۲ میں تھا: ''یہودہ ابراہیم کے سامنے کھڑا ہوا۔ مگر اس میں خداوند یہودہ کی ہتک سمجھ کر اسے یوں بدلا گیا: ''ابراہیم یہودہ (خدا) کے سامنے کھڑا رہا۔''

قاضیوں کی کتاب ۱۸: ۳۰ میں یہوتن مرتد کو منسہ کا پوتا لکھ دیا۔ حالانکہ وہ موسیٰ کا پوتا تھا۔

اس مضمون پر بحث کرتے ہوئے سائیکلوپیڈیا ببلیکا ص ۵۰۳۸ پر لکھا ہے۔

It is in Daniel 12:11 that we find شقوص شیمم intentional Perversion of بعل شامم

کہ دانیال نبی کی کتاب ۱۲: ۱۱ میں احبار نے بعل شامم کی جگہ شقوص شیمم بنا کر دیدہ دانستہ تحریف زدہ کر دیا۔

بائبل کی متضاد باتیں

بائبل میں بے شمار متضاد باتیں پائی جاتی ہیں۔ جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بائبل اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہیں۔ یہاں اختلافات بائبل کا نقشہ درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ آدم کو کہا گیا کہ جس دن تو نیک و بد کے درخت سے پھل کھائے گا تو ضرور مرے گا۔ (پیدائش ۲: ۱۷)	۱۔ مگر آدم پھل کھانے کے بعد ۹۳۰ برس جیتا رہا۔ (پیدائش ۵: ۵)
۲۔ انسان کو خدا نے حیوانات پیدا کرنے کے بعد بنایا۔ (پیدائش ۲۵: ۲۷)	۲۔ خدا نے آدم کے پاس جانور بنا کر بھیجے۔ گویا آدم پہلے جانور بعد (پیدائش ۲: ۱۸ تا ۲۰)
۳۔ سلح ارفکسد کا بیٹا تھا۔ (پیدائش ۱۱: ۱۲)	۳۔ سلح ارفکسد کا پوتا تھا۔ (لوقا ۳: ۳۶)
۴۔ کشتی نوح میں سات سات نر و مادہ (پیدائش ۷: ۲)	۴۔ سب جانوروں کے جوڑے جوڑے۔ (پیدائش ۶: ۱۰، ۷: ۸۔ ۹، ۱۴۔ ۱۵)
۵۔ خدا کا پچھتانا۔ (پیدائش ۶: ۶ خروج ۳۲: ۱۴)	۵۔ خدا پچھتاتا نہیں۔ (گنتی ۲۳: ۹)

۶۔ یعقوب کو مکفیلہ کے کھیت میں گاڑا۔ (پیدائش ۵۰:۱۳)	۶۔ سکم میں گاڑا۔ (اعمال ۷:۱۶)
۷۔ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ (پیدائش ۱:۳۱)	۷۔ خدا انسان کے پیدا کرنے سے پچھتایا۔ (پیدائش ۶:۶،۸ اور ۸:۲۱)
۸۔ فرشتہ وغیرہ کی تصویر نہ بنائیو۔ (خروج ۲۰:۴)	۸۔ اور تو سونے کے دو کروبی (فرشتے) بنائیو۔ (خروج ۲۵:۲۱)
۹۔ اسرائیل کے بزرگوں نے خدا کو دیکھا۔ (خروج ۲۴:۹،۱۰۔۳۳:۱۱)	۹۔ کوئی انسان نہیں کہ مجھے دیکھے اور جیتا رہے۔ (خروج ۳۳:۲۰)
۱۰۔ ساتویں دن خدا نے آرام کیا اور تازہ دم ہوا۔ (خروج ۳۱:۱۷)	۱۰۔ خدا تھک نہیں جاتا اور ماندہ نہیں ہوتا۔ (یسعیاہ ۴۰:۲۸)
۱۱۔ موسیٰ روئے زمین کے سب مردوں سے حلیم تھا۔ (گنتی ۱۲:۳)	۱۱۔ موسیٰ غصہ ہوا تمام بچوں اور عورتوں، مردوں کے قتل کا حکم دیا۔ (گنتی ۳۱:۱۴،۱۶)
۱۲۔ ہارون کوہ حور پر مرا اور گاڑا گیا۔ (گنتی ۲۰:۲۸،۲۳:۳۷،۳۸)	۱۲۔ ہارون موسیرہ میں فوت ہوا۔ (استثناء ۱۰:۱۶)
۱۳۔ جاتی جولیت کو داؤد نے مارا۔ (سموئیل اول ۱۷:۴، ۷، ۵۰)	۱۳۔ جاتی جولیت کو الحنان بن یاری نے مارا۔ (سموئیل دوم ۲۱:۱۹)
۱۴۔ ساؤل خود گر کر مر گیا۔ (سموئیل اول ۳۱:۶۔۴۰)	۱۴۔ ساؤل کو عمالیقی نے قتل کیا۔ (سموئیل دوم ۱:۱۰)
۱۵۔ داؤد کو خدا نے کہا کہ اسرائیل کو گن۔ (سموئیل دوم ۲۱:۱)	۱۵۔ شیطان نے کہا کہ اسرائیل کو گن۔ (تواریخ اول ۲۱:۱)
۱۶۔ میکل مرتے دم تک بے اولاد رہی۔ (سموئیل دوم ۶:۲۳)	۱۶۔ میکل کے پانچ بیٹے تھے۔ (سموئیل دوم ۲۱:۸)
۱۷۔ اخزیا ۲۲ برس کا تھا جب بادشاہ ہوا۔ (سلاطین دوم ۸:۲۶)	۱۷۔ اخزیا ۴۲ برس کا تھا جب بادشاہ ہوا۔ (تواریخ دوم ۲۱:۲)
۱۸۔ یہویکین اٹھارہ برس کا تخت پر بیٹھا۔ (سلاطین دوم ۲۴:۸)	۱۸۔ یہویکین آٹھ برس کا بادشاہ ہوا۔ (تواریخ دوم ۳۶:۹)
۱۹۔ خدا اندھیرے میں رہتا ہے۔ (خروج ۱۹:۹،۱۶۔۲۰:۲۱)	۱۹۔ خدا نور میں رہتا ہے۔ جس تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ (تمطاؤس اول ۶:۱۶)

۲۰۔ عیسو نے ایلون حتی کی بیٹی بشامت سے بیاہ کیا۔ (پیدائش ۲۶:۳۴)	۲۰۔ عیسو نے اسماعیل کی بیٹی بشامت سے بیاہ کیا۔ (پیدائش ۲۶:۳)
۲۱۔ عماسہ اترا کا بیٹا تھا جو اسرائیلی تھا۔ (سموئیل ۱۷:۲۵)	۲۱۔ عماسہ کا باپ تیرا اسماعیلی تھا۔ (تواریخ ۲:۱۷)
۲۲۔ زرو بابل کے ساتھ قبیلہ بنی ارخ کے ۷۷۵ افراد یروشلم میں آئے۔ (عزرا ۲:۵)	۲۲۔ زرو بابل کے ساتھ اس سفر میں نبی ارخ کے ۶۵۲ افراد تھے۔ (نحمیاہ ۷:۱۰)
۲۳۔ بنی پخت موآب بنی یشوع اور یوآب کی اولاد سے ۲۸۱۲ افراد تھے۔ (عزرا ۲:۶)	۲۳۔ بنی پخت موآب بنو یشوع اور یوآب کی نسل میں سے ۲۸۱۸ افراد تھے۔ (نحمیاہ ۷:۱۱)
۲۴۔ جو گھر سلیمان بادشاہ نے خداوند کے لیے بنایا اس کی لمبائی ۶۰ ہاتھ چوڑائی ۲۰ ہاتھ اور اونچائی تیس تھی۔ (سلاطین ۶:۲)	۲۴۔ تواریخ میں ۳:۴ ہے کہ اس کی اونچائی ۲۰ ہاتھ تھی۔

توریت کی تدوین اور اس پر آسمانی بلائیں

تمام مسیحی علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ توریت پندرہ سو برس قبل مسیح لکھی گئی۔ پہلے وہ ایک جلد میں مدون ہوئی لیکن مسیحی علماء کے نزدیک جب بہتر علماء نے ۲۸۴ قبل مسیح میں توریت کو عبرانی زبان سے یونانی زبان میں منتقل کیا تو اس ایک کتاب کو پانچ مختلف کتابوں میں تقسیم کر دیا۔ ۱۔ پیدائش۔ ۲۔ خروج۔ ۳۔ احبار۔ ۴۔ گنتی۔ ۵۔ استثناء۔ باب اور آیات کی تفصیل مسیح کے بارہ سو چالیس سال بعد کارڈنل ہوگو نے کی۔ یہ تقسیم ناقص ہے کیونکہ کہیں کہیں معانی کے لحاظ سے اس تفصیل میں باہمی ربط کا فقدان نظر آتا ہے۔

توریت کی پہلی بربادی

مسیحی علماء کے نزدیک توریت کی پہلی گمشدگی ۶۹۸ قبل مسیح بادشاہ یہودیہ کے عہد میں ہوئی۔[1] تقریباً ۷۵ برس کی گمشدگی کے بعد ۶۲۴ قبل مسیح بادشاہ یوسیاہ کے عہد میں کاہنوں کے سردار خلقیاہ نے اعلان کیا کہ اس نے ہیکل یروشلم میں توریت پائی ہے۔ جس پر وقت کے بادشاہ نے اس کتاب کو پڑھوایا تو گھبرا کر اپنے کپڑے پھاڑ دیے۔[2]

ایک تحقیق یہ ہے کہ ۹۷۱ ق۔م رحعام شاہ یہود کی سلطنت کے پانچویں سال سیق شاہ مصر نے

1۔ احوال کتاب مقدس حصہ اول باب ۴۸ ص ۱۱۷ مطبوعہ لندن ۱۸۶۰ء۔

2۔ دوم سلاطین باب ۲۲ آیات ۸ تا ۱۱۔

جب یروشلم پر حملہ کیا اور ہیکل اور یہودی بادشاہ کے گھر کو لوٹا، اس وقت توریت ضائع ہوئی، اس حساب سے توریت تین سو برس تک لوگوں کی نظر سے اوجھل رہی۔[1]

بہرحال توریت ایک لمبے عرصہ تک گم رہی اور جب سردار خلقیاہ نے اس کے دوبارہ مل جانے کا اعلان کیا، اس وقت یہود میں سے کوئی بھی ایسا انسان موجود نہیں تھا جو حتمی طور پر اس امر کی تصدیق کرتا کہ حاصل شدہ کتاب توریت ہی ہے۔

اس دور میں نہ تو لکھنے کا عام رواج تھا، جس وجہ سے یہ خیال کرلیا جائے کہ توریت کے کئی نسخے احاطہ تحریر میں آگئے ہوں گے اور سردار خلقیاہ کو کوئی ایک نسخہ مل گیا ہوگا۔ بائبل خود اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اس زمانہ میں توریت کے تحریری نسخے بہت ہی قلیل تھے۔ صرف ایک بات یقینی ہے، وہ یہ کہ صرف ہیکل میں ایک نسخہ توریت کا رہتا تھا۔ تمام بنی اسرائیل وہاں آکر اسے سن لیا کرتے تھے تو وہ بھی ہر سال نہیں بلکہ سات سال کے بعد توریت سب کو سنائی جاتی تھی۔[2]

پس اس سے معلوم ہوا کہ نہ تو توریت کی عام اشاعت تھی اور نہ اس کی کثرت سے تلاوت ہوتی تھی جو نسخہ ہیکل میں موجود تھا وہ اس کی تباہی کی وجہ سے ضائع ہوگیا۔

توریت کے نقلوں کی قلت کا اعتراف خود عیسائی علماء کو بھی ہے چنانچہ تعلیم الایمان میں لکھا ہے:

''دنستی اور امون بت پرست بادشاہوں کے عہد میں بائبل کی نقلوں کی اس قدر قلت ہوگئی کہ یوسیا بادشاہ نے اپنے سن جلوس کے اٹھارہویں برس تک اس کی ایک جلد بھی نہ دیکھی۔''[3]

ان حالات اور واقعات میں یہ امر اطمینان بخش نہیں ہے کہ سردار خلقیاہ نے جو کتاب پیش کی تھی وہ حقیقتاً توریت ہی تھی۔ عیسائی علماء اس امر کا جواب دینے سے خاموش ہیں کہ ۵۷ برس یا ۳۰۰ برس کے بعد خلقیاہ کو توریت ہیکل سے کیسے مل گئی۔

توریت کی دوسری بربادی

تقریباً چھ سو برس قبل مسیح بخت نصر بابل کے بادشاہ نے سلطنت یہود پر حملہ کیا اور بے رحمی سے یہودیوں کو قتل کیا جو قتل سے بچ گئے۔ ان کو قیدی بنا کر بابل میں لے گیا۔ یہ لوگ بابل میں ستر برس اسیر رہے۔ جب وہاں سے آزاد ہوئے تو وہ اپنی زبان بھول چکے تھے۔

اس تباہی کا واقعہ دوم تواریخ باب ۳۶ میں ان الفاظ میں درج ہے:

''لیکن انھوں نے خدا کے پیغمبروں کو ٹھٹھے میں اڑایا اور اس کی باتوں کو ناچیز جانا اور اس کے

---

[1] اول سلاطین باب ۱۴ آیات ۲۸، ۲۶۔

[2] استثناء باب ۳۱ آیات از ۹ تا ۱۲، ۲۶، نحمیاہ باب ۸۔

[3] تعلیم الایمان (اردو ترجمہ) مصنفہ پادری روڈلف صاحب ص ۱۱۹، ۱۲۰۔

نبیوں سے بدسلوکی کی یہاں کہ خداوند کا غضب اپنے لوگوں پر ایسا بھڑکا کہ کوئی چارہ نہ رہا۔ تب وہ کسدیوں کے بادشاہ کو ان پر چڑھا لایا۔ اس نے ان کے مقدس گھر میں ان کے جوانوں کو تلوار سے مار ڈالا اور اس نے نہ کنوارے پر، نہ کنواری پر اور نہ بوڑھوں پر بلکہ اس پر بھی جو بہت بوڑھا تھا رحم نہ کیا۔ خدا نے سب اس کے قابو میں کر دیا اور وہ خدا کے گھر کے سارے چھوٹے بڑے باسیوں کو اور خدا کے گھر کے خزانے کو اور بادشاہ کے اور اس کے امیروں کے خزانے کو سب کے سب بابل میں لے گیا اور انھوں نے خدا کے گھر کو جلا دیا اور یروشلم کی دیوار کو ڈھا دیا۔ اور اس کے سارے محلوں کو آگ سے جلا دیا اور اس کی ساری قیمتی چیزوں کو برباد کیا اور وہ انھیں جو تلوار سے بچے بابل کو اسیر کر کے لے گئے اور وہاں وے اس کے اور اس کے بیٹوں کے غلام رہے، جب تک کہ فارس کی سلطنت شروع نہ ہوئی۔''

سردار خلقیاہ کی پیش کردہ توریت کا نسخہ ہیکل میں رہتا تھا۔ بخت نصر نے ہیکل کو جلا کر پیوند خاک کر دیا اور توریت کا نسخہ جل گیا۔

تورایت کی از سرِ نو ترتیب

جب بنی اسرائیل اسیری سے نجات پا کر واپس لوٹے اور کچھ سکون نصیب ہوا تو انھوں نے توریت کو از سرِ نو ترتیب دینے کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ عزرا نبی نے اس کام کو سرانجام دیا۔ چنانچہ عزرا کی نسبت یہودی کتب میں لکھا ہے: ''شریعت بھلا دی گئی تھی مگر عزرا نے پھر اسے دوبارہ قائم کیا۔[1]

پھر لکھا ہے: ''عزرا نے توریت کو دوبارہ زندہ کیا اور اس میں اشورین حروف داخل کیے۔''[2]

''دیکھو اے خدا میں جاؤں گا جیسا کہ تو نے مجھے حکم دیا تھا اور جو لوگ موجود ہیں۔ میں ان کو فہمائش کروں گا لیکن جو لوگ اس میں رہتے ہیں بغیر روشنی کے ہیں، کیونکہ تیرا قانون جل گیا۔ پس کوئی نہیں جانتا۔ ان چیزوں کو جو تو کرتا ہے اور ان کاموں کو جو شروع ہونے والے ہیں لیکن اگر مجھ پر تیری مہربانی ہے تو تُو روح القدس کو مجھ میں بھیج اور میں لکھوں جو کچھ کہ دنیا میں ابتدا سے ہوا ہے اور جو کچھ تیرے قانون میں لکھا ہے تاکہ تیری راہ کو پاویں اور وہ لوگ جو اخیر زمانہ میں ہوں گے زندہ رہیں۔ اس نے مجھ کو یہ جواب دیا کہ جا اپنے راستہ سے لوگوں کو اکٹھا کر اور ان سے کہہ کہ وہ چالیس دن تک تجھ کو نہ ڈھونڈیں لیکن دیکھ تو بہت سے صندوق کے تختے تیار کر اوز اریا، ڈبریا، سلیمیا، ایکانس اور عازیل پانچوں کو جو بہت تیزی سے لکھنے والے ہیں اپنے ساتھ لے اور یہاں آ۔ اور میں تیرے دل میں سمجھ کی شمع روشن کروں گا۔ جو نہ بجھے گی تاوقتیکہ وہ چیزیں پوری نہ ہوں جو تو لکھنی شروع کرے گا۔[3]

پھر آگے لکھا ہے:

1۔ Sank 20۔ 2۔ Sank 21۔

3۔ عزرا کتاب دوم باب ۱۴ آیت ۲۰۔۳۵۔

''انھوں نے چالیس دن میں دو سو چار کتابیں لکھیں۔''[1]

اس حوالہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے:

۱۔ عزرا نبی کے وقت تورات اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی کتب جل چکی تھیں۔

۲۔ عزرا نے دوبارہ ان کتب کو لکھا۔

۳۔ وہ کتب تعداد میں دو سو چار تھیں۔

توریت کیسے مرتب ہوئی

امر محقق ہے کہ اسفار موسیٰ کی تدوین ۴۴۴۔۴۵ ق م میں کی تھی۔[2]

عزرا نبی نے توریت کیسے مرتب کی! اس بارہ میں مسیحی علماء کا اختلاف ہے۔ ایک بیان یہ ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ عزرا نے زمانہ اسیری میں صحف مقدسہ کا خصوصیت سے مطالعہ کیا اور نحمیاہ نبی اور کنیسہ عظمیٰ کے دیگر اراکین کی مدد سے ان غلطیوں کو درست کیا جو کاتبوں کے سہو یا تغافل سے ان مقدس نوشتوں میں داخل ہو چکی تھیں۔ اس نے ان تمام کتابوں کو اکٹھا کیا جو اس زمانہ میں مقدس مانی جاتی تھیں۔ انھیں ترتیب دیا اور اپنے عہد کے لیے بائبل کا قانون مدون کیا۔ اس نے مقدس روح کی مدد سے ان میں ان چیزوں کا اضافہ کیا جو توضیح مطالب یا ترتیب وتکملہ کے لیے ضروری سمجھی گئیں۔ اگرچہ وہ خود نبی نہ تھا لیکن اس نے یہ سب کچھ روح القدوس کے ماتحت لکھا اور اس کی کتاب کی شرعی حیثیت کبھی محل نظر نہیں ٹھہری۔[3]

لیکن کیٹو (Kitto) اپنے انسائیکلو پیڈیا آف بلیکل لٹریچر میں لکھتا ہے:

یہاں تک کہا جاتا ہے کہ عزرا نے تمام عہد عتیق کو محض حافظہ کی مدد سے از سر نو تحریر کیا، کیونکہ ان کتابوں کے تمام نسخے تغافل شعاری کی وجہ سے معدوم ہو چکے تھے۔''

دونوں تاریخی بیانات میں کتنا فرق ہے پہلے بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عزرا نے منتشر اور پراگندہ نوشتوں کو اکٹھا کر کے از سر نو مرتب کیا، اگرچہ اپنی طرف سے کچھ اضافے بھی کیے۔ دوسرے حوالہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عزرا فقیہہ نے اپنے حافظہ کی مدد سے توریت کو لکھا، کیونکہ ان کے زمانہ میں تمام نسخے تلف ہو چکے تھے۔

عزرا کے حافظہ کے متعلق ریورنڈ آدم کلارک مفسر بائبل اپنی تفسیر مطبوعہ ۱۸۹۱ء کے صفحہ ۱۶۸۱ پر تواریخ باب ۴ آیت ۷ کے تحت لکھتے ہیں:

''اس جگہ غلطی سے عزرا نے بیٹے کی جگہ پوتا لکھ دیا ہے۔ ایسے اختلافات میں تطبیق بے فائدہ ہے۔''

---

[1] عزرا کتاب دوم باب ۱۴ آیت ۴۴۔

[2] Chronological index to the Bible۔

[3] Introduction to Polyglot Bible۔

توریت کی تیسری بربادی

۱۷۰ق م میں انطاکیہ کے یونانی بادشاہ انیٹونیس نے یہودیوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے یروشلم پر بار بار حملے کیے۔ ہیکل کو بے حرمت کیا۔ مقدس صحیفوں کو جلایا اور یہود کو تہ تیغ کیا۔ مفتاح الکتاب مطبوعہ مرزاپور ص ۱۴۴، ۴۵ متعدد عیسائی علماء نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ انیٹونیس (انطاکیہ کے یونانی بادشاہ) نے یروشلم کو فتح کر کے بائبل کے جس قدر نسخے مل سکے انھیں جلا دیا اور اعلان کیا کہ جس شخص کے پاس اس کتاب کا کوئی نسخہ نکلے یا جو شخص رسم شریعت ادا کرے اس کو تہ تیغ کر دیا جائے چنانچہ اس حکم کی رو سے یہودیوں کے گھروں کی تفتیش ہوتی رہی جس کے گھر میں کوئی کتاب نکلتی اس کو قتل کر دیا جاتا اور کتاب کو پھاڑ کر جلا دیا جاتا۔

اس تباہی کے بعد جب یہوداہ مقابیس (مقابی) نے ۱۶۵ قبل مسیح میں ہیکل کی مرمت شروع کی، اس وقت اس نے توریت کی نقل کہیں سے مہیا کر کے ہیکل میں رکھی۔

توریت کی چوتھی بربادی

۷۰ء میں طیطس (ٹائیٹس) شہزادہ روم نے یروشلم پر حملہ کر کے اسے پیوند خاک کر دیا۔ ہیکل کو بالکل مسمار کر دیا۔ گیارہ لاکھ یہودیوں کو تہ تیغ کیا۔ ہزاروں کو قیدی بنا کر فروخت کیا پادری اسکاٹ اپنی رومن تفسیر کے صفحہ ۱۸۵ پر رقم طراز ہیں۔

''لڑائی سے پیشتر طیطس نے چاہا کہ اس کو (یعنی شہر کو) اور خاص کر ہیکل کو بچائے اور اس لیے یوسف مورخ کو کئی بار یہودیوں کے پاس بھیجا کہ اپنی بغاوت کو چھوڑو اور شہر میرے قبضہ میں کر دو۔ میں تم کو معاف کر دوں گا اور تمہارا شہر غارت نہ ہوگا مگر یہودیوں نے اس گھمنڈ پر بھروسہ کر کے کہ خدا ہماری طرف ہے اور ہماری شہر پناہ بھی مضبوط ہے۔ اس کی نہ سنی، اور یہاں تک بڑی جانفشانی اور ہمت سے اس کا مقابلہ کیا کہ جب شہر اس کے قبضہ میں آیا تب رومی سپاہ بہت غصہ ہو کر رک نہ سکی اور شہر میں پھیل کر مرد و عورت سبھوں کو مار ڈالا اور گھروں میں آگ لگا دی۔ پھر یہودی لوگ جو پناہ کے لیے ہیکل میں بھاگ گئے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ کچھ نہ بچے گا تب کئی برآمدوں میں آگ لگا دی۔ اس وقت رومی فوج حملہ کر کے ہیکل میں گھس پڑی، اور ایک سپاہی نے بغیر حکم کے ایک مشعل خاص ہیکل کے اندر پھینکی، تب جلد اس میں آگ لگ اٹھی۔ طیطس نے اس کے بجھانے کا حکم دیا لیکن اس زور شور کی ہلچل میں کون کس کی سنتا تھا۔ سپاہیوں نے ہیکل پر دھاوا کر دیا اور کسی طرح نہ رک سکے۔''

شہر اور ہیکل کی اس قیامت خیز تباہی میں توریت آگ کی نذر ہوگئی۔

توریت کی پانچویں بربادی

طیطس کے حملے تقریباً ۶۵ سال بعد قیصر ہڈرین کے عہد میں یہودیوں نے اپنی طاقت جمع کر

رومیوں کے ساتھ پھر ایک مقابلہ کیا، مگر شکست کھائی۔ پانچ لاکھ کے قریب آدمی قتل ہوئے۔ بقیہ لوگ شہر سے نکال دیے گئے اور یروشلم کے کھنڈرات میں بھی ان کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ بیت المقدس کو پیوند خاک کر دیا۔ پھر اس کی جگہ جیوپیٹر دیوتا کا ایک مینار بنا دیا اور کوہ کلوری پر وینس دیوی کی مورتی رکھ دی اور شہر کا نام بدل کر ایلیا رکھ دیا۔

توریت کی چھٹی بربادی

۴۰۰ء کے قریب جب کہ رومیوں پر شمال کی طرف سے حملہ آور وحشی قوموں نے غلبہ حاصل کر لیا تو موسویت اور مسیحیت کو تباہ و برباد کر دیا چونکہ یہ اقوام بت پرست تھیں، اس وجہ سے جہاں جہاں ان کا غلبہ ہوتا گیا وہاں مکتوبات، صحیفے، مدرسے اور کتب خانے نذر آتش ہوتے گئے اور تمام پرانے مذاہب کی بیخ کنی ہوگئی۔

وحشی اقوام کی طرف سے توریت پر یہ چھٹی تباہی نازل ہوئی۔

توریت کی ساتویں بربادی

۶۱۳ء میں شاہ ایران خسرو پرویز نے یروشلم پر چڑھائی کر کے نوے ہزار آدمی قتل کیے اور تمام گرجوں اور متبرک مکانوں کو پیوند خاک کر دیا۔[1]

تحریف اور بگاڑ کے وجوہات

۱۔ یہ کسی کو معلوم نہیں کہ سب سے پہلے کس نے مرتب کیا۔

۲۔ یہ بھی کسی کو معلوم نہیں کہ مرتب کرنے والے کے پاس صحت کا معیار کیا ہے۔

۳۔ توریت پر کئی بار تباہی نازل ہوئی، اس وجہ سے توریت کے نسخوں کا تواتر ختم ہو گیا۔

۴۔ ہر ایک فرقہ نے اپنے اپنے مفاد اور نظریات کے مطابق توریت میں کمی بیشی کی۔

۵۔ توریت کی اصل زبان عبرانی تھی۔ ایک عرصہ کے بعد یہود کی زبان آرامی ہوگئی۔ اس تبدیلی زبان سے توریت میں تحریف لازمی تھی۔

۶۔ موجودہ عبرانی رسم الخط سے پہلے عبرانی حروف ہجا کا رسم الخط اور تھا۔ اس میں حروف کے رسم الخط میں تشابہ زیادہ تھا۔ مثلاً ط اور ع قریباً قریباً ایک ہی طرح لکھے جاتے تھے۔ اس وجہ سے ضروری تھا کہ توریت میں اختلاف رونما ہوتا۔

۷۔ عیسائی علماء کا یہ خیال ہے کہ بائبل کے مصنفین کے دو گروہ تھے۔ ایک کا نام جہوسٹک اور دوسرے کا نام ایلوہسٹک تھا۔ یعنی ایک خدا کا نام یہوده افضل ماننے والے اور دوسرے خدا کا نام ایلوہ مقدس ماننے والے، دونوں کی الگ الگ تصنیفات کو چھٹی صدی عیسوی میں اکٹھا کر دیا گیا۔

---

[1] دیکھو تفصیل عیسائی تصنیف ''الکتاب کے مقامات المعروف'' مطبوعہ مرزاپور ۱۸۶۰ء ص ۱۹، ۲۰۔

۸۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی اولاد سے بنی اسرائیل کو نفرت، دشمنی اور رقابت تھی۔ اس وجہ سے حضرت اسماعیل اور ان کی اولاد کے بارہ میں حقارت آمیز جملے توریت میں ایزاد کر دیے گئے۔

تحریف بائبل کے متعلق مسیحی علماء محققین کے بیانات

بیرونی واندرونی شہادت سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ بائبل تحریف وتبدل سے پاک نہیں مسیحی محققین کو یہ بات مسلّم ہے کہ بائبل کے نسخوں میں تحریف ہوتی رہی ہے چند مسیحی علماء کی آرا درج کی جاتی ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا میں مقالہ زیر ''بائبل'' لکھا ہے۔

''عرصہ دراز تک کتب مقدسہ کا مطالعہ جرح وتعدیل کے مستند اصول سے محروم رہا۔ یہود محض اس عبرانی نسخے کی پیروی کرتے تھے۔ جن کی نسبت یہ مشہور تھا کہ غالباً وہ دوسری صدی عیسوی میں جمع کیا گیا اور بعد ازاں احتیاط سے محفوظ رکھا گیا۔ لیکن اس نسخہ میں چند تحریفیں تو ایسی ہیں جو اب صاف نظر آتی ہیں اور غالباً ایک کافی تعداد تک ایسی تحریفیں اور بھی موجود ہیں جن کی شاید اب یا کبھی پورے طور سے قلعی نہ کھل سکے۔ عیسائی اور اسکندریہ کے یہود علماء کی حالت اس سے بھی بدتر تھی کیونکہ پانچویں صدی عیسوی تک شاذ ونادر اور استثناء کے ساتھ اور پانچویں صدی سے پندرہویں صدی تک بلا استثناء ان بزرگوں نے تمامتر ترجموں ہی پر اکتفا کیا ہے۔''

ریورنڈ ہارن صاحب اپنی کتاب جلد اوّل صفحہ ۶۸ پر رقمطراز ہیں۔ ''الحاق کے باب میں یہ قبول کرنا پڑے گا کہ توریت میں الحاقی فقرے موجود ہیں۔''

کینو اپنی انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے۔ ''یہی کافی نہیں کہ جن مقامات کو ہم غلط سمجھیں انھیں کو الحاقی مانیں اور باقی کو بلام وکاست صحیح جانیں بلکہ ممکن ہے جنھوں نے الحاق کیا ہے انھوں نے باقی حصوں میں بھی تصرف کیا ہو۔''

انسائیکلوپیڈیا ببلیکا جلد ۴ ص ۴۹۹۳ میں لکھا ہے:۔

''جو بات یقینی ہے وہ یہ ہے کہ چوتھی صدی کے درمیان میں بائبل کا لاطینی نسخہ نہایت ہی پراگندہ حالت میں تھا اور یہ مضامین کی پراگندگی یونانی نسخہ سے مقابلہ کی وجہ سے اور لاطینی اصطلاحوں کی تبدیلی کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی۔ اور یہ اختلافات قائم رہے یہاں تک کہ پرانے لاطینی نسخہ کی جگہ جیروم کا اصلاح شدہ نسخہ جو ۳۸۳ء سے ۴۰۰ء کے درمیانی زمانہ کے پوپ ڈیمیس کے حکم سے تیار کیا گیا تھا، عیسائیوں میں رائج کیا گیا۔''

''عہد نامہ قدیم عیسائیوں نے عیسائیوں کی خاطر لکھا تھا۔ علاوہ ازیں یہ یونانی میں یونانی بولنے والوں کے لیے لکھا گیا تھا اور طرز تحریر اس وقت کے رائج طرز تحریر کے مطابق تھا۔ یونانی بولنے والے گرجا کے

تاریخی تسلسل میں کوئی حقیقی فرق نہ پڑا۔ اس لیے ہمیں تحریر کی کوئی حقیقی غلطی موجودہ نسخوں میں نہیں ملتی۔ گو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اختلافات پائے نہیں جاتے لیکن وہ اختلافات اتفاقی نہیں بلکہ دیدہ دانستہ پیدا کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ عہد نامہ قدیم اپنے ابتدائی زمانہ میں کوئی مذہبی تقدس نہیں رکھتا تھا (یعنی اسے خدائی کتاب نہیں کہا جاتا تھا) اس لیے جہاں کہیں تبدیلیوں اور زیادتیوں سے مضمون میں اصلاح کی امید کی جاتی تھی۔ وہاں تبدیلیاں اور زیادتیاں دلیری سے کردی جاتی تھیں۔[1]

یہودی روایات اگرچہ اس امر پر زور دیتی ہیں کہ عہد نامہ عتیق کی بعض کتابیں ان ہی کی لکھی ہوئی ہیں۔ جن کے حالات پر وہ مشتمل ہیں (اور اس کا باور کرنا کچھ غیر معقول نہیں) لیکن انھیں اس حقیقت کے اعتراف میں بھی ذرا تامل نہیں کہ بعض کتابوں میں بعد میں ردوبدل اور حک واضافہ بھی ہوا ہے۔[2]

آگے چل کر لکھا ہے:

''تاریخ اور وقائع کے مستند ماخذ کی حیثیت سے بائبل کی حالت عام طور پر مایوس کن ہے۔ اس کے بیانات اور معلومات یا تو مبہم اور متضاد ہیں اور یا اس زمانہ کی تاریخ سے بالکل مطابقت نہیں رکھتے۔'' (صفحہ ۹۵)

جیوئش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:

اگرچہ اسفار موسیٰ خود حضرت موسیٰ کی تصنیف بتائی جاتی ہیں لیکن تحقیق جدید کی رو سے ان کے قریب اٹھائیس ماخذ تسلیم کیے گئے ہیں۔'' (جلد ۹)

پادری ڈمیلو کتاب گنتی کی تفسیر میں لکھتا ہے:

''پانچ کتابیں جو اسفار خمسہ موسیٰ سے منسوب ہیں کسی اور شخص نے لکھ کر موسیٰ سے منسوب کیں۔''

سفر ایوب کے متعلق تو سینگلر لکھتا ہے کہ اس کا انداز قطعاً یہودی بلکہ اسلامی ہے۔[3] پال (Lesltepaul) لکھتا ہے:

''عہد نامہ عتیق یا جدید سائینٹفک اصلاح میں خدا کے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ تو صرف اس انسانی کوشش کا ریکارڈ ہیں جو خدا تک پہنچنے کے لیے کی گئی۔ اس لیے یہ خدا کے متعلق اکتشافات ہیں، خدا کی وحی نہیں ہیں۔[4]

چرچ مشن پاکستان کی شائع کردہ مشہور کتاب ''روحوں کو آزماؤ'' کے ص ۱۹، ۲۰ پر لکھا ہے۔

''درحقیقت تاریخوں کی صحت تاریخی تفصیلات اور سائنس کے اصول ونظریات سے بائبل مقدس میں غلطیاں، متضاد بیانات اور نامکمل علم پایا جاتا ہے۔ یہ غلطیاں زیادہ اہم مسائل جیسے خدا کا ذہن اور خدا کی مرضی وغیرہ میں بھی نظر آتی ہیں۔''[5]

---

[1] انسائیکلوپیڈیا بلیکا ص ۴۹۸۰ جلد ۴۔ [2] Valletine's Jewish Ensyclopedia P 93۔

[3] زوال مغرب جلد دوم ص ۲۰۸۔ [4] The Annihilation of Man۔

[5] مسیحی رسالہ المائدہ لاہور ۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء۔

پادری ڈاکٹر جے پیرن سانتھ صاحب ڈی۔ ڈی اپنی کتاب ''بائبل کا الہام'' مطبوعہ ریلیجس بک سوسائٹی ص ۶، ۷ پر ''بائبل کا عالم'' کے عنوان کے تحت لکھتا ہے:

''ایک دوسرے پہلو سے بھی ایک اور اثر میرے اعتقادی امور پر پڑ رہا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ بہت سی باتیں جو بائبل کے متعلق میرے کئی ایک خیالات کے الٹا دینے والی ہیں ایسے اشخاص کی طرف پیش کی جاتی ہیں جو نہ تو بے اعتقاد ہیں، نہ مذہب کے دشمن ہیں نہ اس کی توہین روا رکھنے والے ہیں بلکہ وہ بڑے ادب اور لحاظ سے سالہا سال تک اس کے متعلق امور کی تحقیقات میں مشغول رہے ہیں۔ ان میں یونیورسٹیوں کے پروفیسر، کلیسا کے بشپ اور اعلیٰ عہدیدار اور ایسے ایسے اصحاب شامل ہیں جن کی اعلیٰ علمیت اور دینداری اور خدا پرستی میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہو سکتا اور نہ یہ صرف ایک جماعت سے بلکہ مختلف کلیساؤں سے تعلق رکھنے والے اور مختلف سلسلہ خیالات کے پابند ہیں۔ ان کی باتوں سے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب بائبل کی نسبت وہی خیالات نہیں رکھتے جیسے کہ انھیں بچپن میں تعلیم دی گئی تھی یا جیسا کہ عوام الناس میں سے ہزاروں دینداروں مرد و عورت آج کل بھی مانتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اس میں بہت کچھ انسانی عنصر پایا جاتا ہے۔ اگرچہ باقاعدہ غور سے الٰہی عنصر کچھ کم نظر نہیں آتا۔ ان کا خیال ہے کہ بائبل بہت سی باتوں میں دیگر کتب کی مانند ہے، خاص کر عہد عتیق کے نوشتوں کے لحاظ سے اور وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ یہ ممکن ہے کہ قدیم مصنفوں نے بعض علمی اور تواریخی باتوں کی نسبت بیانات کر دیے ہوں جو غیر صحیح اور بے ڈھنگے ہوں۔ وہ یہ بھی دکھلاتے ہیں کہ عہد عتیق میں اخلاقی تعلیم بمقابلہ عہد جدید کے بہت ہی گری ہوئی ہے اور وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان کتابوں کی تالیف اور ترتیب میں بہت کچھ آزادی برتی گئی ہے۔ یہ باتیں میرے مسلمہ تصورات کو جو بائبل کی حیثیت کی نسبت رکھتا ہوں بالکل تباہ کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔''

''ان سب امور کی موجودگی میں میرے لیے ان خیالات کا پابند رہنا جو بچپن میں مجھے سکھائے گئے تھے، بالکل ناممکن ہے۔ مگر ساتھ ہی ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا ان خیالات کو ترک کرنا پاک نوشتوں کے الٰہی اختیار و سند کو ترک کرنے کے برابر ہے۔''

پھر پادری صاحب اسی کتاب کے صفحہ ۱۴۶، ۱۴۷ پر ''بائبل کے سہو و خطا سے پاک ہونے کے متعلق عام تصورات کی حالت'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

''اب ایک قدم آگے بڑھو۔ پاک نوشتوں کے ہر ایک طرح کے تفصیلی امور میں کامل طور پر بے خطا ہونے پر اصرار کرنا فقط ایک غیر ضروری اور بے سند بات ہی نہیں ہے بلکہ اس کا ماننا الہام کے عقیدہ کو سخت معرض خطرہ میں ڈالتا ہے۔ بھلا بتاؤ تو فرانس کے مشہور مصنف اور فصیح البیان رینان کو کس چیز نے ملحد بنا دیا ہے؟ یہی خیال کہ الہام کا عقیدہ سہو و خطا سے بریت کے عقیدہ کے ساتھ جکڑا ہوا ہے۔ چارلس بریڈلا کو کس چیز نے بائبل کا دشمن بنا دیا؟ یہ کہ پادری جس نے اسے مستقیم ہونے کے لیے تیار کیا۔ اس ذی فہم لڑکے کے

سوالات کو جو وہ الہام کے مسئلہ پر کرتا تھا اپنی تنگ خیالی کی وجہ سے زجر و توبیخ کے ساتھ رد کر دیا اور ان کا کچھ تسلی بخش جواب نہ دیا۔ ناظرین آپ بھی کئی لوگوں سے واقف ہوں گے جن کا ایمان اس قسم کی تعلیمات کے سبب سے زائل ہو گیا ہے۔ چند ماہ ہوئے خود میرے ذاتی تجربہ میں بھی یہ امر آیا اور میں نے دیکھا کہ میرے ایک بڑے گاڑھے دوست کے ایمان پر اسی قسم کی غلط تعلیم نے پانی پھیر دیا......

''جب مذہبی معلموں کی جماعت میں ایسے اشخاص موجود ہوں جو یہ کہیں کہ ایک ذرا سی غلطی ثابت ہونے سے بائبل کا الہامی ہونا مردود ٹھہرے گا جبکہ لفظوں کے صاف صاف معنوں کو کھینچ تان کر ذرا ذرا سے اختلافات کو تطبیق دینے کی کوشش کی جاتی ہے یا اس کے علمی امور کی متعلقہ باتوں کو زمانہ حال کی تحقیقاتوں اور دریافتوں سے ملایا جاتا ہے۔ تو اس سے بائبل کو کچھ نفع حاصل نہیں ہوتا، بلکہ الٹا اس کی جان عذاب میں پھنستی ہے۔ ایسی کتابوں کو پڑھ کے تو خواہ مخواہ یہ خیال پیدا ہو گا کہ گویا ہماری نجات کا مدار اسرائیلیوں کی ادنیٰ علمی واقفیت کی صحت پر موقوف ہے یا یہ کہ ہمارا مذہب معرض خطر میں ہے۔

پھر ص ۲۰۸ پر پادری صاحب لکھتے ہیں:

''ہم کو ہمیشہ اس امر کے ماننے کے لیے رضامند اور تیار رہنا چاہیے کہ اور لوگ بھی دیندار اور راستی پسند ہیں ان کے دل میں بھی خدا اور بائبل کی نسبت ایسی ہی عزت و لحاظ جاگزین ہے۔ ہمیں ہرگز لوگوں کی دینداری اور دیانتداری کے متعلق بے جا شبہات کو جگہ نہیں دینی چاہیے اور نہ ان کی نسبت طرح طرح کی بدظنیاں پیدا کرنی چاہئیں۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ اس قسم کے مسائل کی تاکید کرتے ہیں کہ موسیٰ نے توریت کی پانچوں کتابیں تمام و کمال تصنیف نہیں کیں اور پاک نوشتوں میں ہمارے خیال کی نسبت (یعنی لفظی الہام ماننے کی نسبت) زیادہ تر انسانی عنصر کو دخل ہے۔

پھر ص ۴۸، ۴۹ پر لکھتے ہیں:

''بائبل آسمان پر سے بنی بنائی نیچے نہیں گری اور وہ جیسا کہ پرانے مطلا نسخوں میں تصویریں کھینچی ہوئی نظر آتی ہیں۔ طلائی نسخوں سے جنھوں کو فرشتے لیے بیٹھے ہیں نقل کی گئی ہے۔ اسے آدمیوں نے نقل لکھا۔ البتہ یہ سچ ہے کہ وہ آدمی خدا کی طرف سے ملہم ہوتے تھے۔ مگر تو بھی وہ انسانی دل اور انسانی کمزوریاں اور انسانی حیات رکھنے والے آدمی تھے اور یہ بالکل طبعی طور پر لکھی گئی اور جس طرح ہم لکھتے وقت اپنے ہاتھ اور دل و دماغ کو استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح لکھنے والوں نے کہا۔''

بائبل میں انسانی زبان کا عنصر ماننا ضروری ہے

پھر پادری صاحب اپنی کتاب کے ص ۹۸ پر لکھتے ہیں:

یقیناً سارا بائبل الہامی مکاشفہ نہیں ہے۔ بہت سی باتیں جو محض انسانی قواء کے ذریعہ معلوم نہ ہوئیں وہ خدا نے معجزانہ طور پر بذریعہ مکاشفہ ظاہر کر دیں۔''

پھر صفحہ ۱۲۵ پر لکھتے ہیں:

''ہمیں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بائبل میں انسانی عنصر کی موجودگی پر خاص طور پر زور دیا جائے۔ یہ پہلو اس وقت تک اکثر مذہبی لوگ فراموش کرتے رہے ہیں اور یہی غفلت ایک بڑی حد تک موجود بے چینی کے لیے جواب دہ ہے۔''

پھر ص ۱۶۲ پر لکھتے ہیں:

''ہم الٰہی اور انسانی عنصر کے درمیان ایک خط فاصل نہیں کھینچ سکتے۔ ہم اس کے کسی حصہ کی نسبت نہیں کہہ سکتے کہ وہ الٰہی ہے۔''

بائبل غلطی سے مبرا ہونے کی مدعی نہیں

پھر ص ۱۳۷ پر لکھتے ہیں:

اس قسم کا دعویٰ کتاب مقدس میں کہیں نہیں کیا گیا۔ لکھنے والے بھی اس بات کے دعوے دار نہیں ہوئے کہ ان کی کتاب غلطی سے مبرا ہے..... سلاطین اور تواریخ کی کتابوں کے مصنف ایک ہی واقعہ کی متوازی تاریخیں لکھتے ہیں جو تفصیلی امور میں ایک دوسرے سے ہرگز اتفاق نہیں کرتیں اور بعض اوقات ایسے اختلافات بھی پائے جاتے ہیں جنھیں باہم تطبیق دینا امکان سے باہر ہے۔''

پھر ص ۱۶۷ پر لکھتے ہیں:

''ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بائبل میں انسانی عنصر موجود ہے اور کچی دھات اگرچہ سونے سے معمور ہے تو بھی وہ بالکل خالص ہوتا نہیں۔

توریت کا مصنف نامعلوم

پھر پادری صاحب ص ۱۸۸، ۱۸۹ پر لکھتے ہیں:

''توریت یعنی موسیٰ کی پانچ کتابوں کی نسبت یہودی ہمیشہ سے یہ اعتقاد رکھتے چلے آئے ہیں کہ وہ عہد عتیق کے جملہ صحیفوں سے زیادہ مقدس اور قابل تعظیم ہے اور وہ کبھی یہ جرأت نہیں کرتے تھے کہ اس کی نسبت کسی قسم کی نکتہ چینی کو دخل دیں۔ کبھی کسی شخص کے دل میں یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ ان کی نسبت اس قسم کا سوال اٹھے کہ اس کا مصنف کون ہے، اور وہ کب اور کس طرح سے تالیف ہوئی! عموماً یہ اعتقاد تھا کہ حضرت موسیٰ نے اس کو اس صورت میں جس میں وہ اب موجود ہے لکھا تھا۔ مگر تو بھی بعض اشخاص کو یہ عجیب معلوم ہوا کرتا تھا کہ ایسی کتاب میں موسیٰ کی وفات کا حال بھی درج ہے اور اس کے حق میں اس قسم کے کلمات لکھے ہیں کہ اسے یعنی موسیٰ علیہ السلام کو سارے لوگوں سے جو روئے زمین پر تھے زیادہ علم تھا۔ اور اب تک بنی

اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام کی مانند کوئی نبی نہیں اٹھا اور آج کے دن تک کوئی اس کی قبر کو نہیں جانتا نیز یہ کہ اثنائے تحریر میں لکھنے والا ہمیشہ اس گزشتہ زمانہ کی طرف اشارہ کرتا رہتا ہے جبکہ بنی اسرائیل بیابان میں تھے اور کنعانی ملک میں تھے اور مشرقی ممالک کا ذکر کرتے ہوئے انھیں ہمیشہ یردن کے اس پار بتاتا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ مصنف فلسطین کے ملک میں یردن کے مغربی علاقہ میں رہتا تھا اور جغرافیے کے متعلق کسی سوال کو حل کرتے ہوئے وہ گویا بطور سند کے ایک قدیمی کتاب یعنی یہوداہ کے جنگ نامہ سے نقل کرتا ہے جو کسی موسیٰ کے زمانہ سے پہلے نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ تنقید کے ابتدائی زمانہ میں یہ سوال کیا گیا تھا کہ اس اعتقاد کے لیے کیا سند ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کتابوں کی موجودہ صورت میں ان کا مصنف مانا گیا ہے؟ اور یہ معلوم ہوا کہ اس کے جواب میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہودی کلیسا ہمیشہ سے مانتی چلی آئی ہے۔ اس وجہ سے نکتہ چینیوں نے اپنے کو موسیٰ علیہ السلام کی تورات کا مصنف ہونے پر اعتراض کرنے کے لیے آزاد سمجھا، یا کم سے کم یہ مانا کہ موسیٰ علیہ السلام کی تحریریں فقط بطور مصالح کے ایک حصہ تھیں جن کی مدد سے ان کے اصل مصنف یا ایڈیٹر نے موجودہ پانچ صحیفے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نام سے مشہور ہیں تیار کر لیے۔''

کتاب ''تحقیق بائبل'' جو پروفیسر اوز ڈی ڈی کے لیکچروں سے مرتب ہوئی، جسے ریلیجس بک سوسائٹی لاہور نے ۱۹۱۱ء میں شائع کیا، اس میں لکھا ہے:

''ہاں بائبل میں ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت نہیں کہہ سکتے کہ وہ کسی نبی یا رسول یا مقرر کیے ہوئے شخص نے لکھی ہوئی تھیں۔ مثلاً پہلی اور دوسری تواریخ، آستر، یعقوب، واعظ کوئی نہیں جانتا کہ ان کتابوں کو کس نے لکھا۔'' (ص ۳۸)

کتب عہد عتیق کے اجزائے ترکیبی

موجودہ مروجہ عہد عتیق میں جو انتالیس کتابیں شامل ہیں۔

۱۔ پیدائش یا تکوین۔ ۲۔ خروج۔ ۳۔ احبار۔ ۴۔ گنتی یا اعداد۔ ۵۔ استثناء یا توریت مثنیٰ۔ ۶۔ یشوع یا یوشع۔ ۷۔ قاضیوں یا قضاہ۔ ۸۔ روت یا عورت۔ ۹۔ سموائیل یا صموئیل اوّل۔ ۱۰۔ سموائیل دوم یا صموئیل دوم۔ ۱۱۔ سلاطین اوّل یا ملوک اوّل۔ ۱۲۔ سلاطین دوم یا ملوک دوم۔ ۱۳۔ تواریخ اوّل یا ملوک اوّل۔ ۱۴۔ تواریخ دوم یا ملوک دوم۔ ۱۵۔ عزرا۔ ۱۶۔ نحمیاہ۔ ۱۷۔ آستر یا اشتیر۔ ۱۸۔ ایوب۔ ۱۹۔ زبور۔ ۲۰۔ امثال سلیمان۔ ۲۱۔ واعظ۔ ۲۲۔ غزل الغزلات۔ ۲۳۔ یشعیاہ۔ ۲۴۔ یرمیاہ۔ ۲۵۔ نوحہ یرمیاہ۔ ۲۶۔ حزقیل یا حزقی ایل۔ ۲۷۔ دانیال۔ ۲۸۔ ہوسیع۔ ۲۹۔ یوئیل۔ ۳۰۔ عاموس یا عموس۔ ۳۱۔ عبدیاہ۔ ۳۲۔ یونہ۔ ۳۳۔ میکہ یا میکاہ۔ ۳۴۔ نحوم۔ ۳۵۔ حبقوق۔ ۳۶۔ صفنیاہ۔ ۳۷۔ حجی۔ ۳۸۔ ذکرہ۔ ۳۹۔ ملاکی۔

عہد عتیق کے مختلف قدیم نسخے

اس وقت دنیا میں عہد عتیق کے چھ قدیم نسخے ہیں۔ ا۔ سماریہ کا نسخہ۔ ۲۔ قدیم یونانی یا سبعینیہ۔ ۳۔ ارامی ترگم۔ ۴۔ اقولا۔ (Aqwila) ۵۔ سیریا کا نسخہ پشتو۔ (Peshto) ۶۔ لاطینی کا نسخہ جدیدیہ (Vulgate)

سماریہ کا نسخہ جو تورات کی صرف پہلی پانچ کتابوں پر مشتمل ہے۔ ۴۰۰ قبل مسیح کا تصور کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نسخہ کامل بائبل کا نہیں ہے یہ فرقہ سامری کے پاس ہے۔ سامریوں نے بنی اسرائیل سے علیحدگی اختیار کر کے یورشلم کی بجائے اپنا مرکز کوہ جرزیم بنا لیا تھا۔ وہاں ان کو اپنا الگ معبد بھی تعمیر کرنے کے لیے اس نسخہ میں اضافہ کرنا پڑا اور کوہ جرزیم پر عبادت خانہ بنانے کا حکم خروج ۲۰: ۱۷ میں داخل کر دیا گیا ہے۔ یہ حکم کسی دوسرے بائبل کے نسخے میں موجود نہیں ہے۔

سماریہ کا نسخہ ۱۶۱۶ء میں پیرس کے اندر پہلے پہل طبع ہو۔ ۱۷۹۰ء میں اس کا عبری متن الگ شائع ہوا۔

دوسرا نسخہ قدیم یونانی یا سبعینیہ ہے۔ اس نسخہ کو ستر علماء نے مرتب کیا۔ اس کا ایک حصہ تیسری صدی قبل مسیح کا ہے۔ یہ یونانی کلیسا کا مستند نسخہ ہے۔ اسکندریہ کے یہود کی روایت ہے کہ وہاں کی مشہور لائبریری کے لیے بادشاہ کے حکم سے ستر علماء یہود نے جو ہر فرقہ یہود سے چھ چھ علماء منتخب کیے گئے، الگ الگ ترجمہ کر دیا۔ مقابلہ کرنے پر سب کا ترجمہ ایک جیسا نکلا۔ یہ صرف اسفار خمسہ کا ترجمہ ہے۔ اس کے بعد اس کے ساتھ مزید کتب کا ترجمہ بھی شامل کر دیا گیا یہ کام حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد تک جاری رہا۔

یہودی عالم فائیلو کے وقت (۳۰ تا ۵۰ قبل مسیح) کتاب آستر، تاریخ، غزل الغزلات اور دانیال نبی کی کتاب اس میں شامل نہ تھی۔

۳۔ بائبل کا تیسرا نسخہ ترگم ارامی زبان میں ترجمہ ہے، جو صومعہ میں پڑھایا جاتا ہے۔ یہ نسخہ زیادہ پرانا نہیں ہے۔

۴۔ چوتھا نسخہ اقولا (Aqvila) عبرانی سے یونانی میں دوسری صدی مسیح کا ترجمہ شدہ ہے۔

۵۔ پانچواں سیریا کا نسخہ پشتو (Peshto) عبری کا ترجمہ ہے جو چوتھی صدی مسیحی کا ہے۔

۶۔ چھٹا نسخہ لاطینی زبان میں ترجمہ جیروم کا پانچویں صدی مسیحی کا ہے جس کو ویلگیٹ (Vulgate) کہا جاتا ہے۔

تعلیمات عہد عتیق

اعتقادات

عہد عتیق میں خدا کا تصور اور غیر اللہ کی پرستش سے ممانعت

ہر نبی توحید کا پیغام لے کر آتا ہے اور دین کی اساس ہی توحید ہے۔ مرور زمانہ سے ہر قوم نے توحید کے آب مصفا کو شرک کی ملونی سے مکدر کر دیا۔

عہد عتیق میں اللہ تعالیٰ کے بیسوں اسماء صفات کا ذکر آتا ہے اور ان میں سب سے زیادہ یہودہ نام کو عظمت اور فضیلت دی گئی ہے۔ یہ بائبل میں ۶۸۲۳ مرتبہ آیا ہے۔ بائبل نے غیر اللہ کی پرستش کو سختی سے منع کیا ہے۔ چنانچہ بائبل میں آتا ہے۔

''میرے حضور تیرے لیے دوسرا خدا نہ ہووے۔'' (خروج ۲۰:۳۔ استثناء ۵:۷، ۶:۱۴)

خدا کی صفات

۱۔ خداوند تعالیٰ مہذب ہے وہ تمام زمین کے اوپر بادشاہ عظیم ہے۔ (زبور ۴۷ آیت ۱)

۲۔ میں نے خداوند کو اس کی کرسی پر بیٹھے دیکھا اور سارا آسمانی لشکر اس کے پاس اس کے داہنے ہاتھ اور اس کے بائیں ہاتھ کھڑا تھا۔ (اسلاطین باب ۲۲ آیت ۱۹)

۳۔ خداوند آسمان پر سے دیکھتا ہے۔ وہ سارے بنی آدم پر نگاہ کرتا ہے وہ اپنی سکونت کے مقام سے زمین کے سب باشندوں کو تاکتا ہے۔ (زبور ۳۳ آیات ۱۳......۱۴)

۴۔ خداوند کا تخت آسمان پر ہے اس کی آنکھیں دیکھتی ہیں۔ اس کی پلکیں بنی آدم کو آزماتی ہیں۔ (زبور ۱۱ آیت ۴)

یہود کو خدا کا نام لینے کی اجازت نہیں۔ چنانچہ لکھا ہے:

''تو خداوند اپنے خدا کا نام بے فائدہ مت لے کیونکہ جو اس کا نام بے فائدہ لیتا ہے، خداوند سے بے گناہ نہ ٹھہرائے گا۔'' (خروج ۲۰۔ استثناء ۵:۱۶)

اس حکم کے تحت سال میں ایک مقدس انسان بیت المقدس کے اندر ایک دفعہ اللہ کا نام لیتا ہے اور سب لوگ خاموشی سے سنتے ہیں۔

بائبل میں جہاں جہاں یہودہ کا نام آتا وہاں اس سے پہلے لفظ ادونئی آتا تھا۔ تلاوت کرنے والا رک جاتا کیونکہ ادونئی کے بعد جو نام ہے۔ وہ اس نے نہیں پڑھنا۔ قاری بغیر نام پڑھے آگے گزر جاتا تھا۔

علماء یہود ہر وقت خدا کا نام لینے میں اس کی ہتک اور بے ادبی تصور کرتے تھے۔ اس وجہ سے انھوں نے یہ سزا مقرر کی کہ جو شخص اس کا نام لے گا وہ سنگ سار کیا جائے گا۔ شارحین بائبل نے یہ بھی لکھا ہے کہ غیر یہودی کی سزا بھی قتل ہے۔

بابلی طالمود (یوم B۳۹) کی رو سے اس کی تلاوت ممنوع ہے۔ یہاں تک کہ کاہن برکت دیتے وقت بھی خدا کا یہ نام نہیں لے سکتا۔ شمعون کے وقت یعنی ۲۷۰ قبل مسیح سے اس حکم پر سختی سے عمل کیا گیا۔ (طالمود یوروشلم یوم ۳:۷)

یہود کو اس نام کے نہ پڑھنے پر سختی سے اصرار ہے۔ اس کی بجائے یا تو اَدونئی پڑھا جاتا ہے یا ایلوہیم۔

یہود خدا کا نام عدم تلاوت کی وجہ سے بھول گئے۔ اب ان کو خداوند کے نام کا صحیح تلفظ یاد نہیں رہا۔ اس میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ یَہوَہ۔ یَہوِ۔ یَہو۔ یَہُو۔ یَہُو۔ حالانکہ یہودہ کا نام بائبل میں ۶۸۲۳ مرتبہ آیا ہے۔ اب تمام علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ تلفظ غلط ہے۔ سائیکلو پیڈیا بطیکا میں اس کا صحیح تلفظ یہو بنایا ہے۔ لفظ یہو ایوالڈ Euold کے خیال میں یاہُو کی مختصر شکل ہے، اے وہ (جو ہے) اور خروج ۳:۱۴ میں یہی موسیٰ علیہ السلام کو بتایا گیا تھا۔

اس بحث سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ بائبل میں خدا کا صحیح نام معلوم نہیں۔ اس سے بائبل کی اصلیت معلوم ہو جاتی ہے۔

بائبل کا خدا قومی خدا ہے

بائبل میں یہود کا خدا قومی خدا ہے۔ ہر جگہ اللہ تعالیٰ کو خداوند اسرائیل کے نام سے پکارا ہے۔ ان الفاظ سے خدا تعالیٰ کی ذات کا مفہوم محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ بائبل میں لکھا ہے:

''اے خداوند اسرائیل کے خدا تجھ سا کوئی خدا نہ اوپر آسمان میں ہے، نہ نیچے زمین میں، جو کہ اپنے بندوں کے لیے جو تیرے آگے اپنے سارے دلوں سے چلتے پھرتے ہیں، اپنے عہد کو اور اپنی رحمت کو نگاہ رکھتا ہے۔'' (سلاطین اول ۸:۲۳)

''تیرے سوا جہاں تک کہ ہم نے اپنے کانوں سے سنا کوئی خدا نہیں اور دنیا میں تیری قوم اسرائیل کی مانند ایک قوم کون ہے کہ جس کے بچانے کو خدا آپ گیا، تاکہ اسے اپنی قوم آپ بنائے۔'' (سموئیل دوم ۷:۲۲،۲۳)

غضب ناک خدا کا تصور

عہد عتیق میں غضب ناک خدا کا تصور ہے، وہ ایک ایسی ہستی ہے جو انسان کی سرکشی اور بغاوت کی وجہ سے آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ پھر غصہ میں آ کر ایک قوم بلکہ اس کے ساتھ چرند پرند اور حیوانات کو بھی ہلاکت کی بھٹی میں جھونک دیتا ہے۔ یہ فعل گزرنے کے بعد وہ دل گیر ہوتا اور پچھتاتا بھی ہے۔ جیسا کہ ایک انسان جلد بازی سے کوئی فعل کرنے کے بعد پچھتاتا ہے چنانچہ پیدائش ۶:۷:۸ کی بناء پر انسان کی بدی کو دیکھ کر اس کے پیدا کرنے پر پچھتاتا ہے اور دل گیر ہوتا ہے حالانکہ پیدائش ۱:۲۶، ۵:۲۲، ۵:۱، ۹:۶ زبور ۳:۱۰۰۔ واعظ ۷:۲۹۔ اعمال ۱۷:۲۶، ۲۸، ۲۹۔ قرنتیوں اول ۱۱:۷۔ افسیون ۴:۲۴۔ قلیلون ۳:۱۰۔ نامہ

یعقوب ۹:۳ کی بناء پر خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا۔ تاہم غصہ میں آ کر تمام انسانوں کو مع چرند پرند کیڑوں مکوڑوں کے ہلاک کر دیا۔ پیدائش ۷:۲۱،۲۳ مگر اس کے بعد ۸:۲۱،۹:۱۱ میں خداوند اپنے فعل پر پچھتایا، توبہ کی اور آسمان پر قوس قزح کی کمان رکھ کر انسان سے عہد باندھا کہ پھر ایسا نہ کروں گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں فرعون کے پلوٹھے سے لے کر جانوروں تک کے پلوٹھے مار ڈالے۔ (خروج ۱۴:۹۲)

ذیل کے حوالہ جات میں خداوند کا غصہ بھڑ کنے، قوموں کو نیست و نابود کرنے اور بعد میں افسوس کرنے کا ذکر ہے۔

خروج ۳۲:۱۰،۱۱،۱۲۔

گنتی ۱۱:۱،۲۳۔ ۲۱:۶۔ ۲۵:۶،۸،۱۱۔ ۱۲:۹،۱۰۔ ۱۶:۲۱،۳۱،۳۵۔

سموئیل اوّل ۶،۱۹۔ سموئیل دوم ۶:۷۔ ۲۴:۱،۱۶۔

احبار ۱۰:۲۔ تواریخ اوّل ۲۱:۱۵۔ یرمیاہ ۲۶:۳۔

حزقیل باب ۲۰:۲۱۔

ملائکہ کے متعلق نظریہ

بائبل میں ملائکہ کا ذکر دو طرح سے کیا ہے: ایک تو فرشتوں کو انسان سے افضل قرار دیا ہے۔

بنی ایلوہیم[1] بنی الیم۔ بنی اللہ یعنی فوق البشر ہستیاں۔

ایلوہیم[2] قدوسی[3] گویا فرشتوں کو خداوند خدا کے بیٹے قدوسی اور پاک نام دیا گیا ہے۔

لشکر خداوندی (زبور ۱۰۳:۲۱،۱۴۸:۲)

خدا کے مشاورتی۔ (پیدائش ۳:۲۲ اور ۱۱:۷)

خدا کی مرضی انسان پر ظاہر کرتے ہیں۔ (دانیال ۸:۱۶،۱۷......۹:۲۱،۲۳۔ ۱۰:۱۱۔ ۱۲:۶،۷)

خدا کی مرضی پر چلتے ہیں۔ (زبور ۱۰۳:۲۰)

خدا کے حکم کا نفاذ کرتے ہیں۔ (گنتی ۲۲:۲۲۔ زبور ۱۰۳:۲۱)

خدا کے انصاف کو نافذ کرتے ہیں۔ (سموئیل دوم ۲۴:۱۶۔ سلاطین دوم ۱۹:۳۵۔ زبور ۳۵:۵،۶)

---

[1] پیدائش ۶:۲،۴، ایوب ۳۸:۷۔

[2] زبور ۲۹:۱، ۸:۵، ۹۷:۷، ۱۳۸:۱، ۸۲:۱،۶۔

[3] ایوب ۵:۱، زبور ۸۹:۵،۷، ذکریا ۱۴:۵، دانیال ۴:۱۳۔ ۸:۱۵۔

دوسرے، فرشتوں کو نہایت ہی برے رنگ میں بیان کیا ہے۔ جیسا کہ ایوب ۴:۱۸، ۱۵:۱۵ فرشتوں خط اوّل ۶: ۳ میں لکھا ہے۔ ''مگر فرشتوں کی ایک جماعت گنہ گار ہوگئی اور انسان سے ادنیٰ ہو گئے۔ ان کا انصاف انسان کریں گے۔'' (فرشتگان بد کا ذکر۔ پیدائش ۶:۲......۴)

تخلیق عالم

پیدائش عالم کے متعلق یہودیوں کا اعتقاد تھا کہ دنیا خدا کے حکم سے وجود میں آئی۔ یہ وہی نظریہ ہے جو قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ کُنْ فَیَکُوْنَ. بائبل میں آتا ہے، اور خدا نے کہا کہ اجالا ہو گیا...... اور خدا نے کہا کہ پانیوں کے بیچ فضا ہو اور پانیوں سے جدا کرے...... اور خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے کے پانی ایک جگہ جمع ہوں کہ خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہو گیا۔ (پیدائش باب ۱)

''خداوند کے کلام سے آسمان سے اور ان کے سارے لشکر اس کے منہ کے دم سے...... اس نے کہا کہ وہ ہو گیا۔ اس نے فرمایا اور وہ برپا ہوا۔ (زبور ۳۳ آیات ۶......۹)

''ابتداء میں خدا نے آسمان کو اور زمین کو پیدا کیا اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی۔ (پیدائش باب ۱ آیات ۲۶)

سو آسمان و زمین اور ان کی ساری آبادی تیار ہوئی اور خدا نے ساتویں دن اپنے کام کو جو کرتا تھا پورا کیا اور ساتویں دن اپنے سارے کام سے جو کام کرتا تھا فراغت پائی اور خدا نے ساتویں دن کو مبارک کیا اور اسے مقدس ٹھہرایا۔ اس لیے کہ اس نے اپنے سب کام سے جو خدا نے کیا اور بنایا تھا۔ اسی دن فراغت پائی۔'' (پیدائش ۲:۱، ۳)

پھر لکھا ہے:

''خداوند نے چھ دن میں آسمان و زمین اور دریا اور سب کچھ جو اُن میں ہے بنایا اور ساتویں دن آرام کیا...... چھ دن کام کرنا لیکن ساتواں دن آرام کے لیے سبت ہے...... اس لیے کہ چھ دن میں خداوند نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا، اور تازہ دم ہوا۔'' (خروج ۲۰:۱۱۔ ۳۱:۱۵ تا ۱۷ عبرانیوں ۴:۴)

عصمت انبیاء

عہد نامہ عتیق میں انبیاء علیہم السلام کو معصوم نہ مانا گیا ہے، اس کے متعلق چند حوالے درج کیے جاتے ہیں۔

آدم علیہ السلام

حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تب خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت

اور اپنی مانند بنادیں اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ (پیدائش ۲۶:۲۷)

جس دن خدا نے آدم کو پیدا کیا۔ خدا کی صورت پر اسے بنایا۔" (پیدائش ۱:۵)

حضرت ادریس علیہ السلام یا حنوک کی عصمت

"حنوک ۳۰۰ برس تک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور حنوک کی ساری عمر ۳۶۵ برس کی ہوئی اور حنوک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور غائب ہو گیا، اس لیے کہ خدا نے اسے لے لیا۔" (پیدائش ۵:۲۲۔۲۴)

حضرت نوح علیہ السلام کی عصمت

نوح اپنے قرنوں میں صادق اور کامل تھا اور نوح خدا کے ساتھ چلتا تھا۔" (پیدائش ۹:۶) خدا نے اسے خطاب کر کے فرمایا:

میں نے تجھی کو اپنے حضور میں اس زمانہ کے اندر صادق دیکھا۔" (پیدائش ۱:۷)

"نوح علیہ السلام اس راست بازی کا جو ایمان سے ملتی ہے وارث ہوا۔" (عبرانیوں ۱۱:۷)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عصمت

"میں خدائے قادر ہوں تو میرے حضور میں چل اور کامل ہو۔" (پیدائش ۱:۱۷)

خداوند فرماتا ہے۔ "اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا ہاں اپنا اکلوتا ہی بیٹا دریغ نہ رکھا میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا...... تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی۔" (پیدائش ۲۲:۱۶۔۱۸)

خداوند نے سب باتوں میں ابراہیم علیہ السلام کو برکت بخشی تھی۔" (پیدائش ۲۴:۱)

ابرام نے میری آواز کو سنا اور میری تاکید کو، میرے حکموں اور میرے قانونوں اور میرے شرعوں کو حفظ کیا۔" (پیدائش ۲۶:۵)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عصمت

عہد نامہ عتیق میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بزرگی اور عصمت کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔"

"میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔ سوم میرے قانونوں اور حکموں پر عمل کرو۔" (احبار ۱۸:۲،۴،۵،۲۵)

"خداوند نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا، اس لیے کہ میری نظر میں مقبول ہے اور میں تجھ کو بنام پہچانتا ہوں۔" (خروج ۳۳:۱۷)

حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں

''عوض کی سرزمین میں ایوب نامی ایک شخص تھا اور وہ شخص کامل اور صادق تھا اور خدا سے ڈرتا اور بدی سے دور رہتا تھا۔'' (ایوب ۱:۱، ۸ اور ۲:۳)

مرد کامل کالب کے متعلق فرمایا

لیکن میرا بندہ کالب جو از بسکہ اور ہی روح اس کے ساتھ تھی اور اس نے میری پوری پیروی کی۔'' (گنتی ۱۴:۲۴ اور ۳۲:۱۲)

یوسیا کے متعلق

اس نے وہ کام کیے جو خداوند کی نظر میں بھلے تھے اور اپنے داؤد کی ساری راہوں پر چلا اور داہنے یا بائیں مطلق نہ مڑا۔'' (سلاطین دوم ۲۲:۲)

آسا کی بے گناہی

باوجود اس کے اس کا سارا دل جب تک وہ جیتا رہا خداوند ہی سے لگا تھا۔'' (تواریخ دوم ۱۵:۱۷)

عہد نامہ عتیق میں انبیاء علیہم السلام کے متعلق گندے قصے بھی منسوب ہیں۔ ان حوالہ جات کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد کی ملاوٹ ہیں۔ ان قصوں کا ذکر بعد میں آئے گا تا کہ ایک قاری پر یہ بات عیاں ہو جائے کہ توریت تحریف و تبدل سے پاک نہیں ہے۔

یوم آخرت کے متعلق عقیدہ

یہودی قیامت اور جزاو سزا کے قائل تھے۔ ایوب ۱۹:۲۵، ۲۶ میں لکھا ہے۔

کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میرا بدلہ دینے والا زندہ ہے اور وہ روز آخر زمین پر دائم و قائم ہوگا اور ہر چند میرے پوست کے بعد میرا جسم کرم خوردہ ہو جائے گا۔ لیکن میں اپنے گوشت میں سے خدا کو دیکھوں گا۔''

زبور ۹:۷ میں ہے:

خداوند ابد تک تخت نشین ہے، اس نے عدالت کے لیے اپنی مسند تیار کی ہے اور وہ صداقت سے جہان کا انصاف کرے گا اور راستی سے قوموں کی عدالت کرے گا۔''

واعظ کی کتاب ۱۱:۹ میں لکھا ہے۔

اے جوان تو اپنی جوانی میں خوش ہو، اور اپنی بلوغت کے دنوں میں اپنا جی بہلا۔ پر جان رکھ کہ ان ساری باتوں کے لیے خدا تجھ کو عدالت میں لا دے گا۔''

حقوق العباد

موسوی احکام عشرہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام، کے احکام عشرہ میں حقوق العباد کے متعلق نہایت ہی عمدہ تعلیم دی گئی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:"

تو اپنے ماں باپ کو عزت دے، تا کہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے، دراز ہووے تو خون مت کر۔ تو زنا مت کر۔ تو چوری مت کر۔ تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی نہ دے تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر تو اپنے پڑوسی کی جورو، اس کے غلام، اس کی لونڈی اس کے بیل، اس کے گدھے اور اس کی کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ مت کر۔" (استثناء ۵: ۲۲۔ خروج ۲۰: ۱۲ تا ۱۷)

بائبل اور عورت

بائبل کی عبرانی زبان میں بیوی کو بعولہ (جائیداد منقولہ) کہا گیا ہے اور خاوند کو بعل یعنی مالک، سائیکلو پیڈیا ببلیکا میں ان دونوں لفظوں پر لکھا ہے۔

"The man is the owner, the woman the chattel."

موسوی شریعت نے عورتوں کو مردوں کا ہمیشہ محکوم اور غلام بنایا ہے، چنانچہ لکھا ہے۔

"اور خدا نے کہا میں تیرے درد حمل کو بڑھاؤں گا، تو درد کے ساتھ بچہ جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔" (پیدائش باب ۳)

شادی سے پہلے عورت اپنے باپ یا ولی کی ملکیت ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے لڑکی کو اغواء کرنے والا قانوناً لڑکی کے والد کو جرمانہ ادا کرتا تھا۔ چنانچہ خروج ۲۲: ۱۶ میں لکھا ہے۔

"اگر کوئی ایک چھوکری کو جو اس کی منگیتر نہیں، فریب دے کر اس سے مباشرت کرے وہ البتہ اس کی قیمت دے کر اس سے نکاح کرے۔ اگر اس کا باپ ہرگز راضی نہ ہو کہ اسے اس کو دے تو وہ کنواریوں کے اجر کے موافق اسے نقدی دے۔"

اس کی وضاحت کتاب استثناء ۲۲: ۲۸، ۲۹ میں کی گئی ہے۔

اگر کوئی آدمی کنواری لڑکی کو پاوے جو کسی کی منگیتر نہ ہو، اور اسے پکڑ کے اس سے ہم بستر ہو۔ اور وے پکڑے جاویں تو وہ مرد جو اس کے ساتھ ہم بستر ہوا لڑکی کے باپ کو پچاس مثقال چاندی دے اور وہ اس کی جورو ہو کیونکہ اس نے اسے رسوا کیا اور اپنی زندگی بھر اسے طلاق نہ دے۔

مہر

نکاح میں عورتوں کو حق مہر دینا موسوی شریعت میں داخل ہے، ملاحظہ ہو، پیدائش باب ۳۴: ۱۲

خروج باب ۲۲ آیت ۱۶ استثناء باب ۲۲ آیت ۲۹ سموئیل اوّل ۱۸: ۲۵۔

تعدد ازدواج

عہد نامہ عتیق کی رو سے ایک سے زائد بیویاں کرنا جائز ہے اور کئی اسرائیلی انبیاء علیہم السلام نے ایک سے زائد شادیاں کیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین نکاح کیے۔ بی بی سارہ، بی بی ہاجرہ اور بی بی قطورہ۔ اگر بی بی قطورہ سے شادی حضرت سارہ کی وفات کے بعد بھی تسلیم کی جائے تب بھی دو بیویوں کا ہونا تاریخی طور پر ثابت ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں۔ حضرت سموئیل نبی کے والد کی دو بیویاں تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں۔ داؤد علیہ السلام کی سو بیویاں تھیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سات سو بیویاں تھیں۔

توریت کے حسب ذیل حوالہ جات سے تعدد ازدواج ثابت ہے۔

پیدائش باب ۱۶ آیت ۳، ۴ باب ۲۵ آیت ۱، باب ۳۵ آیت ۲۳ تا ۲۶ اخبار۔ باب ۱۸ آیت ۱۸۔ استثناء باب ۲۱ آیت ۱۵۔ قاضیوں باب ۸ آیت ۳۰۔ اوّل سموئیل باب ۱ آیت ۱، ۲، ۳، باب ۲۵ آیت ۴۲، ۴۳۔ دوم سموئیل باب ۳، باب ۵ آیت ۱۳، باب ۱۱ آیت ۲۷۔ باب ۱۲ آیت ۸۔ باب ۵ آیت ۱۶، اوّل سلاطین باب ۱ آیت ۱ تا ۴۔ باب ۱۱ آیت ۱ تا ۳۔ اول تواریخ باب ۳ آیت ۱ تا ۹ باب ۱۴ آیت ۳۔ دوم تواریخ باب ۱۱ آیت ۲۱، باب ۳۱ آیت ۲۱، باب ۲۴ آیت ۲۔ ۳۔

پادری فانس اپنی کتاب ''غلطیوں کی اصلاح، مطبوعہ امریکن مشن پریس لکھنؤ ۱۸۷۱ء کے صفحہ ۲۰۶، ۲۰۷ پر رقمطراز ہیں۔

''تعدد ازدواج کے مقدمہ میں ہم بے تردد تسلیم کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں بھی اس دستور نے رواج پایا تھا اور خداوند نے بھی اس کو منع نہیں کیا بلکہ اس رسم پر چلنے والوں کو برکت کا وعدہ فرمایا ہے۔''

طلاق

جب بائبل کی رو سے عورت خاوند کی مملوکہ ہے تو شریعت کے تمام احکام اسی محور کے گرد گردش کریں گے۔ چنانچہ کتاب استثناء ۲۴: ۱ میں لکھا ہے۔

''اگر کوئی مرد کوئی عورت لے لے، اس سے شادی کرے اور بعد اس کے ایسا ہو کہ وہ اس کی نگاہ میں عزیز نہ ہو، اس سبب سے کہ اس نے اس میں کچھ پلید بات پائی ہو تو وہ اس کا طلاق نامہ لکھ کے اس کے ہاتھ دے اور اسے اپنے گھر سے باہر کر دے۔''

خروج باب ۲۱ میں ہے:

''اگر کسی شخص نے اپنے غلام کا نکاح کر دیا ہو اور اس کی بیوی سے اولاد پیدا ہوگئی ہو تو ساتویں

برس جب وہ آزاد ہو جائے تو وہ اکیلا جائے۔ اس کی بیوی اور بیٹے بیٹیاں اس سے الگ ہو کر آقا کی ملکیت ہو جائیں گی۔"

استثناء ۲۱:۴ میں لکھا ہے:

"جب کسی اسیرانِ جنگ میں سے کوئی عورت پسند آ جائے تو وہ اسے اپنی بیوی بنا لے۔ اس کے بعد اگر وہ اسے اچھی نہ لگے تو اسے گھر سے نکال دے۔"

نحمیا ۱۳:۲۰ میں غیر اقوام کی عورتوں کو طلاق دینے کا تاکیدی حکم پایا جاتا ہے۔

ورثہ

یہودیت میں عورت ورثہ کی حقدار نہیں ہوتی، بلکہ اس کی اپنی کمائی بھی شادی سے پہلے اس کے والدین کی اور شادی کے بعد اس کے شوہر کی ہوتی ہے۔ اس مذہب میں عورت یہاں تک گری ہوئی نظر آتی ہے کہ باپ کی بیویاں بیٹے کی وراثت میں آ جاتی ہیں۔ سموئیل دوم ۱۶:۲۰، روبن نے جیتے جی اپنے باپ (یعقوب) کی منکوحہ پر قبضہ کر لیا۔" (پیدائش ۲۵:۲۲)

"کالب نے بھی اپنے باپ کی بیوی سے شادی کر لی۔" (تواریخ اول ۲:۲۴)

حقوق اولاد

بائیبل میں اولاد کی تعلیم و تربیت کے بارے میں سختی کرنے کے احکام موجود ہیں۔ والد کی جائیداد میں صرف پلوٹھا بیٹا جائیداد کا وارث ہوتا ہے۔

بائبل کے ظالمانہ احکام

بائیبل میں بعض ایسے ظالمانہ احکام ملتے ہیں جن کو پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

غلام اور لونڈیوں کے بارہ میں

اگر کوئی اپنے غلام یا لونڈی کو لاٹھیاں مارے اور وہ مار کھاتے ہوئے مر جائے تو اسے سزا دی جائے لیکن اگر وہ ایک دن یا دو دن جیئے تو اسے سزا نہ دی جائے۔ اس لیے کہ وہ اس کا مال ہے۔" (خروج باب ۲۱ آیت ۲۰، ۲۱)

"مرد یا عورت جس کا یار دیو ہے یا جادوگر ہے تو دونوں قتل کیے جائیں۔ چاہیے کہ تم ان پر پتھراؤ کرو۔ اور ان کا خون انہی پر ہو۔" (احبار باب ۲۰ آیت ۲۷)

"تو جادوگروں کو جینے مت دے۔" (خروج باب ۲۲ آیت ۱۸)

جنگ اور قیدیوں کے متعلق احکام

''جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کر دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر...... لیکن ان قوموں کے شہروں میں جنھیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے کسی چیز کو جو سانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑیو۔'' (استثناء ۲۰:۱۳، ۱۶)

''سو تم ان بچوں کو جو لڑکے ہیں سب کو قتل کرو، اور ہر ایک عورت کو جو مرد کی صحبت سے واقف ہو چکی ہو جان سے مارو لیکن وے لڑکیاں جو مرد کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں ان کو اپنے لیے زندہ رکھو۔'' (گنتی باب ۳۱:۹۔۱۶۔۱۷)

قاضیوں کی کتاب ۲۱:۱۱ میں لکھا ہے۔

''تب انھوں نے ۱۲۰۰۰ مرد بہادر روانہ کیے اور انھیں حکم دیا کہ یبیس جلعاد کے باشندوں کو عورتوں اور بچوں سمیت قتل کرو۔''

حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے۔''

''اور داؤد نے اس سرزمین کو حرم کیا اور عورت مرد کسی کو جیتا نہ چھوڑا اور ان کی بھیڑ بکریاں بیل اور گدھے اور اونٹ لے کر لوٹا۔'' (سموئیل اوّل ۲۷:۹)

خداوند نے ساؤل کو حکم دیا۔

''سو اب تو جا اور عمالیق کو مار اور سب جو کچھ ان کا ہے یک لخت حرم کر (قتل کر) اور ان پر رحم مت کر، بلکہ مرد اور عورت اور ننھے بچے اور شیر خوار، بیل بھیڑ اور اونٹ اور گدھے تک سب کو قتل کر۔'' (سموئیل اول ۱۵:۳)

یشوع کے متعلق لکھا ہے۔

''اور انھوں نے ان سب کو جو اس شہر میں تھے کیا مرد کیا عورت کیا جوان یا بوڑھا کیا بیل کیا بھیڑ اور گدھا سب کو تہ تیغ کیا۔'' (یشوع ۶:۲۱)

خدا کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ملتا ہے:

''جب کہ خداوند تیرا خدا انھیں تیرے حوالے کرے تو تُو انھیں ماریو اور حرم کیجیو۔ نہ تو ان سے کوئی عہد کریو اور نہ ان پر رحم کریو۔ نہ ان سے بیاہ کرنا۔ اس کے بیٹے کو اپنی بیٹی نہ دینا۔ نہ اپنے بیٹے کے لیے اس کی بیٹی لینا۔'' (استثناء ۷:۳۲)

یشوع نے عی کے ساتھ جنگ میں جو قتل عام کیا۔ اس کے متعلق لکھا ہے۔

''چنانچہ وے جو اس دن مارے گئے مرد اور عورت بارہ ہزار تھے۔ یعنی عی کے سب لوگ کیونکہ یشوع نے اپنا ہاتھ جس سے بھالا اٹھایا ہوا تھا۔ جب تک کہ عی کے رہنے والوں کو ختم نہ کر دیا تھا پھر نہ کھینچا......

اور یشوع نے عی کو جلا کر ہمیشہ کے لیے راکھ کا تودہ کر دیا۔" (یشوع ۸: ۲۵۔۲۸)

"تم ہر ایک محکم شہر اور ہر ایک نامی بستی کو مار لو گے اور ہر ایک اچھے درخت کو کاٹ کر گرادو گے اور پانی کے ہر ایک کنویں کو بھر دو گے اور ہر ایک اچھے کھیت کو پتھروں سے خراب کرو گے۔"

خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا۔

"بنی اسرائیل کو خطاب کر، اور انھیں کہہ کر جب تم یردن سے پار ہو کر زمین کنعان میں داخل ہو تو تم ان سب کو جو اس سرزمین کے باشندے ہیں۔ اپنے سامنے سے بھگاؤ۔ اور ان کی مورتیں فنا کر دو، اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو نابود کر دو اور ان کے سب اونچے مکانوں کو ڈھا دو اور ان کو جو اس زمین کے بسنے والے ہیں خارج کر دو۔ اور وہاں آپ بسو۔" (گنتی ۳۳: ۵۲)

حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق لکھا۔

"اس نے ربہ پر چڑھائی کی اور فتح کر لیا اور اس نے ان لوگوں کو جو اس میں تھے باہر نکال کر آروں اور لوہے کی گاہن اور آہنی کلہاڑوں سے روندا اور انیٹوں کے جلتے پزاووں میں سے گزارا اور اس نے بنی عمون کے تمام شہروں سے یہی کیا۔" (سموئیل دوم ۱۲: ۳۱)

"یہودی بادشاہ فتح کے بعد حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑ دیتے تھے۔" (سلاطین دوم ۵: ۶ یسعیاہ ۱۳: ۱۶)

طہارت

اخبار باب ۱۵، استثناء باب ۲۳، دوم سموئیل باب ۱۱ میں طہارت پر بڑا زور دیا گیا ہے۔

مے نوشی کی ممانعت

احبار باب ۱۰، آیت ۹، ۱۰ میں شراب کو قطعاً حرام قرار دیا ہے۔"

سُود

مندرجہ ذیل آیات میں سود لینے کی ممانعت آئی ہے۔

خروج باب ۲۲ آیت ۲۵۔ احبار باب ۲۵ آیت ۲۶۔۲۷، استثناء باب ۲۳ آیت ۱۹۔ زبور ۱۵ آیت ۵۔ امثال ۲۸ آیت ۸۔ حزقی ایل باب ۱۸ آیت ۸۔ یرمیاہ باب ۱۵ آیت ۱۰۔

لحم الخنزیر

سُور کا گوشت حرام ہونے کا حکم حسب ذیل آیات میں ہے۔

احبار ۱۱ آیت ۷۔ استثناء باب ۱۴ آیت ۸۔ یسعیاہ باب ۶۵ آیت ۳، ۴۔

بائبل کی خلافِ اخلاق باتیں

عہد نامہ عتیق میں انبیاء علیہم السلام پر اس قسم کے گندے اور فحش الزام لگائے گئے ہیں جن کا مطالعہ مذاق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ اس قسم کی اخلاق سوز باتیں پڑھ کر ایک عامی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ وہ باتیں اللہ کی کہی ہوئی نہیں بلکہ انسانوں کی اختراع ہیں۔ نمونہ کے لیے صرف چند حوالوں کی پوری عبارتیں لکھی جاتی ہیں اور دوسرے صرف حوالے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق

پیدائش باب ۹ آیت ۱۹ تا ۲۵ میں لکھا ہے۔ ''اور نوح کاشتکاری کرنے لگا اور اس نے ایک انگور کا باغ لگایا۔ اس نے اس کی مے پی اور اسے نشہ آیا اور وہ اپنے ڈیرہ میں برہنہ ہو گیا۔''

حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق

''اور لوط ضغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا اور اس کی دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں، کیونکہ اسے ضغر میں بستے ڈر لگا اور وہ اس کی دونوں بیٹیاں غار میں رہنے لگے۔ تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اس سے ہم آغوش ہوں، تا کہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو انھوں نے اسی رات اپنے باپ کو مے پلائیں اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی، پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اُٹھ گئی اور دوسرے روز یوں ہوا کہ پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی، آؤ آج بھی ہم اس کو مے پلائیں، اور تو بھی اس سے جا کر ہم آغوش ہو۔ تا کہ ہم اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو اس رات بھی انھوں نے اپنے باپ کو مے پلائی، اور چھوٹی گئی اور اس سے ہم آغوش ہوئی، پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اُٹھ گئی۔ سو لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں اور بڑی کے ایک بیٹا پیدا ہوا، اور اس نے اس کا نام موآب رکھا وہی موآبیوں کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں اور چھوٹی نے بھی ایک بیٹا پیدا ہوا اور اس کا نام بن عمی رکھا۔ وہی بن عمیوں کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں۔''

(پیدائش باب ۱۹ آیت ۳۱ ... ۳۸)

داؤد علیہ السلام کے متعلق

''اور شام کے وقت داؤد اپنے پلنگ پر سے اٹھ کر بادشاہی محل کی چھت پر ٹہلنے لگا اور چھت پر سے اس نے ایک عورت کو دیکھا جو نہا رہی تھی اور وہ عورت نہایت خوبصورت تھی۔ تب داؤد نے لوگ بھیج کر اس عورت کا حال دریافت کیا اور کسی نے کہا کیا وہ العام کی بیٹی بت سبع حِتّی اوریاہ کی بیوی ہے اور داؤد نے لوگ بھیج کر اسے بلایا۔ وہ اس کے پاس آئی اور اس نے اس سے صحبت کی (کیونکہ وہ اپنی ناپاکی سے پاک ہو چکی تھی) پھر وہ اپنے گھر کو چلی گئی اور وہ عورت حاملہ ہوگئی۔ سو اس نے داؤد کے پاس خبر بھیجی کہ میں حاملہ ہوں۔'' (سموئیل دوم باب ۱۱: ۲......۵)

سلیمان علیہ السلام کے متعلق

اور سلیمان بادشاہ فرعون کی بیٹی کے علاوہ بہت سی اجنبی عورتوں سے یعنی موآبی، عمونی، اَدومی، صیدانی اور حِتّی عورتوں سے محبت کرنے لگا۔ یہ ان قوموں کی تھیں جن کی بابت خداوند نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ تم ان کے بیچ نہ جانا، اور نہ وہ تمھارے بیچ آئیں۔ کیونکہ وہ ضرور تمھارے دلوں کو اپنے دیوتاؤں کی طرف مائل کر لیں گی۔ سلیمان ان ہی کے عشق کا دم بھرنے لگا، اور اس کے پاس سات سو شہزادیاں اس کی بیویاں اور تین سو حرمیں (لونڈیاں) تھیں اور اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر لیا اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا، جیسا اس کے باپ داؤد کا دل تھا۔ کیونکہ سلیمان صیدانیوں کی دیوی عستارات اور عمونیاں کی نفرتی ملکوم کی پیروی کرنے لگا اور سلیمان نے خداوند کے آگے بدی کی۔ اور اس نے خدا کی پوری پیروی نہ کی، جیسی اس کے باپ داؤد نے کی۔'' (سلاطین اوّل باب ۱۱ آیت ۱ تا ۶)

پھر لکھا ہے:

''اور خداوند سلیمان سے ناراض ہوا کیونکہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے پھر گیا تھا، جس نے اسے دوبارہ دکھائی دے کر اس کو اس بات کا حکم کیا تھا کہ وہ غیر معبودوں کی پیروی نہ کرے۔ پر اس نے وہ بات نہ مانی جس کا حکم خداوند نے دیا تھا۔'' (سلاطین اوّل باب ۱۱ آیت ۹، ۱۰)

طوالت سے بچنے کے لیے قارئین کے لیے صرف بائبل کے ادب کثیف کے حوالے درج کر دیے جاتے ہیں:

یہوداہ بن یعقوب کا ناگفتہ بہ قصہ، کتاب پیدائش باب ۳۸ آیت ۱۲ تا ۳۰۔

فحش عبارت۔ سلاطین اول باب ۱۴ آیت ۲۴، باب ۱۵ آیت ۱۲، باب ۲۲ آیت ۴۶، سلاطین دوم باب ۲۳ آیت ۷۔ استثناء باب ۲۳ آیت ۱۷۔

روت نام ایک عورت کا گندہ قصہ۔ روت آیت ۲، ۳، ۴۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے بیٹے امنون کا فحش قصہ۔ سموئیل دوم باب ۱۳۔

خداوند کی جورو کا طلاق نامہ۔ یسعیاہ باب ۵۰۔

خداوند کی جوروؤں کا گندہ اعمال نامہ۔ یرمیاہ ۳۔ حزقیل ۱۲، ۲۳۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جھوٹ بولنے کی تہمت پیدائش باب ۱۲: ۱۹۔

حضرت اسحاق علیہ السلام پر جھوٹ بولنے کی تہمت پیدائش باب ۲۶: ۹۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا جھوٹ بول کر بڑے بھائی کی برکت خود لے لینا پیدائش ۲۷،

حضرت یعقوب کا اپنے سسر کو پے در پے دھوکے دینا اور ان کا مال اور زیور ہتھیانا۔ پیدائش باب ۳۰: ۲۵ تا ۴۳ اور باب ۳۱۔

حضرت نحمیاہ کا فارس کے بت پرست بادشاہ کی شراب پلانے کی نوکری کرنا۔ اور اسے شراب پلانا اور اس نبی کا اس بادشاہ سے (یعنی غیر اللہ سے) ڈرنا۔ کتاب نحمیاہ باب ۱: ۱۱ اور باب ۲: ۱، ۲۔

حضرت اسحاق علیہ السلام کا اپنے بیٹے یعقوب علیہ السلام کے ہاتھ سے شراب پینا اور اس کے بعد اپنے بیٹے کو دعائے برکت دینا بھی کتاب پیدائش باب ۲۷: ۲۵۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر دھوکہ دہی کا الزام خروج باب ۱۱: ۲، ۳۔ ۱۲: ۳۵، ۳۶۔ لکھا ہے خداوند نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا۔

''سو اب تو لوگوں کے کانوں میں کہہ ہر ایک مرد اپنی پڑوسی اور ہر ایک عورت اپنی پڑوسن سے چاندی کے برتن اور سونے کے برتن مانگ لیں اور خداوند نے ان لوگوں کو مصریوں کی نظر میں عزت بخشی۔''

''اور بنی اسرائیل نے موسیٰ کے کہنے کے موافق کیا اور انھوں نے مصریوں سے چاندی کے برتن اور سونے کے برتن اور کپڑے عاریت لیے اور خداوند نے ان لوگوں کو مصریوں کی نگاہ میں ایسی عزت بخشی کہ انھوں نے انھیں عاریت دی اور انھوں نے مصریوں کو لوٹ لیا۔''

طالمود

دوسری تورہ شبعلفہ یعنی وحی غیر مکتوب ہے، جو حضرت ہارون اور ان کی اولاد کی وساطت سے روایات کی سورت میں عزرا تک پہنچی، جس نے تورات کی کتاب کے لیے ۱۲۰ علماء کی ایک مجلس مقرر کی۔ اس طرح یہ سلسلہ روایات ان علماء تک پہنچا اور ان سے آگے بڑھا۔ اس جماعت کا آخری رکن شمعون ۳۰۰ قبل مسیح میں فوت ہو گیا۔ اس سے یہ سلسلہ روایت کاتبان وحی تک پہنچا۔ وہاں سے یہ سلسلہ عام علماء تک، پھر ان سے احبار و ربیین تک پہنچا۔

دوسری صدی عیسوی کے آخر میں ربی یہودا نے ان اقوال کو کتابی شکل دی۔ اس مجموعہ کا نام مشنا

(Mishnah) رکھا۔ مشنا کے معنی ہیں: زبانی تعلیم۔ یہ مذہبی قوانین اور علماء یہود کے فیصلہ جات کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ فیصلے عہد نامہ عتیق کی روشنی میں کیے گئے ہیں۔ گویا یہ کتاب علماء یہود کے اجتہادی مسائل کا مجموعہ ہے۔ مشنا سے متعلقہ مواد اور مسائل جو بعد کے زمانہ میں پیش آئے اور جن کو بعد میں اکٹھا کیا گیا دو الگ کتب میں جمع کیا گیا، جن کے نام توسفتا (بمعنی ایزادی اور مدراشیم بمعنی تفسیر) ہیں۔

مشنا کتاب کے تفسیری مواد کا نام گمارا (Gemara) ہے۔ اس کے معنی ہیں تکمیل تعلیم یا فیصلہ۔

پس طالمود مشنا اور گمارا دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

طالمود کے بھی دو حصے ہیں: فلسطینی طالمود اور بابلی طالمود۔

فلسطینی طالمود مختصر اور جامع ہے، اور چوتھی صدی عیسوی میں طبیریس کے مقام پر مکمل ہے۔

بابلی طالمود۔ اس طالموں کے لکھنے میں فلسطینی طالمود سے استفادہ کیا گیا۔ حجم میں فلسطینی طالمود سے تین گنا بڑی ہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس طالمود کو ''ہماری طالمود'' بھی کہا جاتا ہے۔

معابد

یہودیوں کا سب سے بڑا اور قدیم معبد یروشلم میں تھا، جس کی تعمیر حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو مضبوط بنیادوں پر ازسرِ نو تعمیر کیا۔ یہ معبد نہایت ہی خوبصورت تھا۔ جس میں قیمتی پتھر لگے ہوئے تھے۔ اس میں ایک تابوت رکھا ہوا تھا، جو صدیوں سے متبرک سمجھا جاتا تھا۔

اس معبد کے علاوہ زیروبیبل (Zerubaabel) کا معبد بھی خاص اہمیت کا حامل ہے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تقریباً پانچ سو سال قبل تعمیر ہوا تھا۔ اس معبد میں تابوت نہ تھا۔ اس میں یہوداہ پرستی اور قربانی کا انتظام تھا۔

ان کے علاوہ شہنشاہ ہر دو کا تعمیر کردہ معبد بھی بہت اہمیت کا حامل تھا۔ وسعت میں کوئی معبد اس کے مدمقابل نہ تھا۔

یہودی مجالس

فلسطین سے باہر جن جن علاقوں میں یہودی آباد تھے۔ انھوں نے اپنے لیے علیحدہ عبادت گاہیں تعمیر کرلیں۔ جنھیں صومعہ کہا جاتا ہے۔ ہر قریہ، قصبہ اور شہر میں یہودی گاہے بگاہے اکٹھے ہوتے، وہاں عبادت کے علاوہ مذہبی قوانین کی درس وتدریس کا انتظام وانصرام کرتے اس طرح صومعہ نے معبد یروشلم کی جگہ لے لی، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ صوامع عوامی زندگی سے قریب تھے، اور ان میں خوبیاں اور اچھائیاں پائی جاتی تھیں۔ وہ معبد یروشلم میں مفقود ہو چکی تھیں۔ امام عوام سے منتخب ہوتا تھا۔ جو قوانین پڑھ کر سناتا،

حاضرین مجلس اس طرح بیٹھتے کہ ان کا رخ یروشلم کی طرف ہوتا۔ اس کے ایک گوشہ میں ایک تابوت رکھا ہوتا اور اس کے قریب ایک چراغ جلتا رہتا۔ حاضرین مذہب پر آزادانہ تنقید کر سکتے تھے۔ صومعہ کی عمارت کے درمیان ایک چبوترہ ہوتا۔ اس چبوترہ پر منبر ہوتا، جس کے دونوں جانب لوگ بیٹھتے تھے۔

فلسطین سے جلاوطنی اور علیحدگی کی وجہ سے یہودیوں میں ایک یہ عقیدہ پیدا ہو گیا کہ یہودیت کی بقا کے لئے فلسطین سے وابستگی ضروری نہیں اور دوسرے ممالک میں یہودیت فروغ پا سکتی ہے، چنانچہ جب رومی شہنشاہ ٹائیٹس (Titus) بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا رہا تھا۔ یہودیوں کا ایک مذہبی رہنما وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے جانبیہ کے مقام پر ایک مدرسے کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسہ نے یہودیت کی بہت خدمت انجام دی۔ یروشلم کی تباہی کے بعد یہودی قنوطیت اور یاس کا شکار ہو گئے تھے۔ اس مدرسہ نے یہودیوں میں امید اور رجا کی کرن پیدا کر دی۔

مدرسہ جانبیہ نے ایک اور بڑی خدمت انجام دی، وہ یہ کہ یہودی مذہب کی تمام روایات کو جمع کیا، جو بالآخر طالمود کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

اس مدرسہ کی طرز پر کچھ اور مدرسے بھی تعمیر ہوئے، ان میں ایک گلیلی اور دوسرا بابل میں تھا۔ ان مدارس ہی میں علماء یہود نے کتب مقدسہ کی تحقیق کی، اور ان کی زمانہ کے تقاضوں کے مطابق تفاسیر لکھیں ابھی یہ کام مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ فلسطین کا خاتمہ ہو گیا جس کے بعد مذہبی قوانین کے مطالعہ اور تحقیق کا کام جوش و خروش سے شروع ہوا۔ عقبہ بن یوسف نے اس سلسلہ میں بڑی خدمات انجام دیں۔

یہودیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کے قوانین الہامی اور ناقابل ترمیم ہیں لیکن بعض صورتوں میں ترمیم کی جا سکتی ہے، مثلاً کسی مذہبی قانون کے نفاذ سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ حکومت وقت کے قانون سے اس کا تصادم ہوتا ہو۔ اس قسم کے حالات میں مذہبی قانون میں ترمیم کی جا سکتی ہے۔

فرقے

یہود کے بہت سے فرقے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں مشہور فرقے یہ تھے۔

1۔ سامرٹیز (Samartians) یہ لوگ فقیر اور اچھوت قسم کے تھے۔

2۔ اسینی (Essene) یہ لوگ عزلت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی نجی کوئی جائیداد نہیں ہوتی تھی۔ ان میں تمام فرقہ والوں کے اموال مشترکہ تھے ان میں شادی کا رواج بہت کم تھا۔ یہودی معبد کے مراسم سے انھیں کوئی واسطہ نہیں تھا۔

3۔ ناسٹکس (Gnostics) اس فرقہ کے نزدیک علم نجات کا ذریعہ ہے، ایمان نہیں۔

4۔ کارائیٹیز (Karaities) یہ لوگ توریت کے احکام کے الفاظ پر سختی سے پابند رہتے تھے۔

5۔ فریسی (Phriseis) یہ لوگ حیات بعد الممات اور جزاء و سزا کے قائل تھے۔ یہ لوگ بڑے زاہد

اور عبادت گزار تھے۔ فریسی جماعت کا یہودیوں پر بہت اثر تھا۔ یہ فرقہ کتب مقدسہ کے علاوہ روایات کو بھی قانون سازی میں اہمیت دیتا تھا۔

۶۔ صدوقی (Sadducees) یہ فرقہ خدا کو صرف بنی اسرائیل کا خدا ہی مانتا تھا۔ یہ فرقہ نہ تو فرشتوں پر ایمان رکھتا تھا اور نہ قیامت پر۔ مذہبی قانون کی لفظی پیروی پر زور دیتے تھے، روایات کے منکر تھے اور قانون میں اضافہ و ترمیم کو باطل تصور کرتے تھے۔ ان کا یہ نظریہ تھا کہ نیک اعمال کے انعام کی خواہش نہیں رکھنی چاہیے۔ یہ گروہ انسانی اختیار کا قائل تھا۔

یہودی فلسفہ

عہد نامہ عتیق میں احکام خداوندی، ایمان اور الہام پر زیادہ بحث ہے۔ البتہ سلیمان اور ایوب کی کتب میں کسی قدر فلسفہ کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔

یہود کے نزدیک حصول علم کے مندرجہ ذیل ذرائع ہیں۔

۱۔ ذاتی کوشش۔ ۲۔ حواس خمسہ کے ذریعے مشاہدہ و تجربہ۔

۳۔ عقلی دلائل۔ ۴۔ الہام۔

یہودی فلسفیوں کے بنیادی مسائل یہ ہیں:

خدا کائنات، انسانی روح عقل الہام اور جزاء و سزا۔

یہودی فلسفیوں کے چار گروہ ہیں:

۱۔ کلامی جو عرب فلسفی متکلموں کے نظریوں کے قائل ہیں۔ یہ لوگ تناسخ سے قائل نہیں۔

ان میں یوسف البصیر اور داؤد بن مروان المقمص مشہور ہیں۔

۲۔ افلاطونی نظریات کے حامل (Neoplatonists) اس گروہ کا یہ نظریہ ہے کہ تمام کائنات کا صدور خدا کی ذات سے ہوا ہے اور جوں جوں مادہ اپنے مصدر سے دور ہٹتا جاتا ہے۔ اس کی خاصیتیں بدلتی رہتی ہیں۔ نیز یہ کہ مادہ کی اصل ماہیت کا کسی کو کچھ علم نہیں۔ البتہ جس حالت میں وہ پایا جائے۔ اس حالت کے خواص معلوم ہو سکتے ہیں۔

اس گروہ میں ابراہام برحیہ، ابراہام بن عزرا اور یوسف ابن ذودیق مشہور فلسفی ہیں۔

۳۔ حاملین فلسفہ ارسطو Aristotelians اس گروہ نے توریت کے احکام کو عقلی دلائل سے قابل قبول بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک انسان آزاد ہے اور اللہ کی ذات عظیم ہے۔ اس گروہ میں ابراہام بن داؤد اور موسیٰ مائی اور موئی ڈیس مشہور فلسفی ہیں۔

باغی فرقہ (Anti-Rationalists) اس گروہ کا یہ نظریہ ہے کہ روح غیر فانی نہیں، ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ خدا جو ایک غیر مادی اور غیر مرئی ہستی ہے، وہ کس طرح مادہ سے بنی

ہوئی کائنات کے متعلق علم رکھ سکتا ہے۔ یہ لوگ جزاء وسزا کے قائل ہیں۔

اس گروہ کے سرخیل ہائی واس کریسی آس اور یہودا اہلیونی ہیں۔

یہود کی رسوم

ختنہ

ہر لڑکے کا ختنہ یوم پیدائش سے آٹھویں دن کیا جاتا ہے۔ اسے اللہ کا عہد قرار دیا جاتا ہے۔ یہ حکم ان الفاظ میں ہے۔

۱۔ ''اور میرا عہد جو میرے اور تمھارے (یعنی ابرہام کے) درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے۔ جسے تم یاد رکھو، سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے اور تم اپنے بدن کی کھلوی کا ختنہ کرو۔ اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا۔ جو میرے اور تمھارے درمیان ہے۔ تمھارے پشت در پشت ہر لڑکے کا جب وہ آٹھ روز کا ہو ختنہ کیا جائے گا۔ کیا گھر کا پیدا، کیا پردیس سے خریدا ہوا جو تیری نسل کا نہیں لازم ہے کہ تیرے خانہ زاد اور تیرے زرخرید کا ختنہ کیا جائے اور میرا یہ عہد تمھارے جسموں میں عہد ابدی ہوگا اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہیں ہوا وہ ہی شخص اپنے لوگوں میں سے کٹ جائے کہ اس نے میرا عہد توڑا'' (پیدائش باب ۱۷ آیت ۹۔۱۷)

۲۔ مذہبی پابندیوں کے لیے لڑکا تیرہ سال کی عمر میں پورا بالغ تصور ہوتا ہے۔ البتہ عورتوں پر ایسی پابندیاں نہیں ہیں۔

تہوار

یہود کے بڑے بڑے تہوار حسب ذیل ہیں۔

۱۔ عید فصح (Passover) جو خروج کی یاد میں جب کہ وہ مصر سے بھاگے تھے۔ منایا جاتا ہے اس کی تاریخیں ۱۵ اور ۱۶ اپریل ہیں۔

۲۔ پوریم۔ یہ دن یہود ہامان کے ہاتھ سے بچ جانے کی خوشی میں مناتے ہیں۔ یہ دن ۱۱ فروری کو منایا جاتا ہے۔

۴۔ چونوکاہ۔ یہ دن اس فتح کی یاد میں منایا جاتا ہے جب یہودی سالار یہودا امکابیس نے شامیوں کے لشکر پر حاصل کی تھی۔

۵۔ یوم ہائز موت، یہ ایک نیا تہوار ہے جو اس دن کی یاد میں منایا جاتا ہے جب موجودہ اسرائیل کی سلطنت فلسطین میں قائم ہوئی۔

۶۔ یوم السبت۔ یہودیوں کے نزدیک یوم السبت یعنی ہفتے کا دن مبارک خیال کیا جاتا ہے، اس دن

سارے کام کاج چھوڑ کر عبادت کی جاتی ہے۔ (خروج باب ۲۰ آیت ۹،۸)

۷۔ یوم خمیس (Pentecost) یہ یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں پچاسواں، یہ تہوار عید فصح کے بعد پچاسویں دن منایا جاتا ہے، اس لیے یہ تہوار اس نام سے موسوم ہے اس موقع پر یہ رسم ادا کی جاتی ہے کہ پروہت نئے گیہوں کی دو خمیری روٹیاں یہوداہ کے سامنے لہراتا ہے۔ پھر اس کے بعد انھیں کھالیتا ہے۔ اس وقت سات بھیڑیں یا بیل اور دو دنبے ذبح کیے جاتے ہیں، اور اس دعوت میں غرباء مساکین بیواؤں، یتامیٰ اور مسافروں کو مدعو کیا جاتا ہے۔

۸۔ یہود میں سات کا عدد مقدس سمجھا جاتا ہے، جس طرح ہفتہ کا ساتواں دن ان کے نزدیک بہت مقدس ہے، اسی طرح ساتواں مہینہ بھی مقدس خیال کیا جاتا ہے۔ جب ساتواں مہینہ شروع ہوتا ہے تو قربانی دگنی کر دی جاتی ہے اور دن بھر بگل بجتا رہتا ہے۔ ہر ساتویں سال زمینیں بلا کاشت چھوڑ دی جاتی ہیں۔ دعوتوں سے غرباء کی تواضع دھن کی جاتی ہے جو غرباء سے بچ جائے، اس کو جانوروں کے آگے ڈال دیا جاتا ہے۔ اس سال تمام قرض معاف کر دیے جاتے ہیں، یا کم از کم ادائیگی کی میعاد میں توسیع ضرور کر دی جاتی ہے۔ یہ سال کنعان میں آباد ہونے کے بعد ہر سات سال بعد منایا جاتا ہے۔

۹۔ اس کے بعد ہر انچاسویں یا پچاسویں سال کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس دن زمینیں ان کے اصل مالکوں کو لوٹا دی جاتی ہیں، اور غلام کی غلامی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا مقصد صرف اقتصادی ہے کہ سرمایہ صرف ایک شخص کا اجارہ نہ بن جائے۔

عصر حاضر میں یہودیوں کی اجتماعی حالت

اےء میں جب ٹائٹس (Titus) نے انھیں فلسطین سے نکال دیا اور ان کا مرکزی معبد پیوند خاک کر دیا تو یہودی دربدر کی خاک چھاننے لگے، اور دنیا کے مختلف دور دراز ملکوں میں منتشر ہو گئے۔ مختلف اقوام اور مذاہب کے مظالم کا ہدف بنے رہے۔ مثلاً ڈاکٹر ارنلڈ اپنی کتاب ''دعوتِ اسلام'' کے صفحہ ۹۳ پر لکھتے ہیں۔

''ساڑھے تین سو برس تک سلطنت انگلستان نے یہودیوں کو اپنے ملک میں داخل ہونے نہیں دیا لیکن یہودیوں کی قوم بڑی سخت جان تھی کہ دیگر مذاہب اور خصوصاً عیسائیت کے تشدد کے باوجود وہ اپنے آپ کو باقی رکھ سکی۔ اس کوشش میں ان کو مسلمانوں کی رواداری سے کافی سہارا ملا۔''

تمام مورخین اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ مغرب کی نشاۃ ثانیہ سے پہلے عیسائیوں کے متعصبانہ سلوک کے مقابل میں یہودیوں کے ساتھ اسلامی ممالک میں زیادہ رواداری کا سلوک کیا گیا۔ چنانچہ ایک عیسائی اڈورڈ عطیہ اپنی کتاب (The Arabs) کے صفحہ ۱۲۵ پر لکھتا ہے۔

''جیسا کہ ہم اس کتاب کے پچھلے باب میں دیکھ چکے ہیں۔ یہودیوں نے ان عملی اور سائنٹیفک

مسائی میں بڑا خوش آئند اور ممتاز حصہ لیا۔ جنھوں نے بغداد اور سپین کے خلفاء کے تحت عرب تہذیب کو پیدا کیا تھا۔ عربوں اور ترکوں کی حکومت کی پوری تاریخ عرب ممالک میں یہودی اقلیتوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا گیا۔ جب یورپ میں یہودیوں کو ہدف ظلم وستم بنایا تھا تو انھیں صرف مسلمانوں کی حکومت میں پناہ ملی۔''

ایک یہودی عالم کی یہ شہادت ہے۔

''مسلمانوں کے اثر کے ماتحت اور بعدازاں عیسائی مدرسیت کے برخلاف یہودیت اپنے نقطہ نظر کو مسلمہ طریق کے مطابق منظم کرنے پر مجبور ہوئی۔ جس کے باعث بآسانی وہ مقابل کے غالب اور حریف ادیان سے اپنے موافق ومخالف پہلوؤں کو نمایاں کر سکی۔[1]

جب اسلامی ممالک میں زوال اور ادبار کے بادل منڈلانے لگے اور ان پر معاشی اور سیاسی دباؤ بڑھنے لگا۔ عیسائیت کے جوش انتقام کے کم ہونے پر یہودیت کا اثر عیسائی ممالک میں پھیلنے لگا۔ نیز مغرب میں قومیت کا غلبہ ہوگیا تو ان میں بھی ایک قومی وطن اور قومی مملکت کا خیال ونشوونما پانے لگا۔ چنانچہ بتھ مین اپنی کتاب Bridge to Islam میں لکھتا ہے۔

''صیہونیت کی پہلی چنگاری لیوپنسکر (Leopinsker) نے ۱۸۸۲ء میں روشن کی، جو ایک روسی یہودی تھا اور یہ واقعہ ۱۸۸۱ء میں الگزنڈر دوم زار روس کے قتل کے بعد پیش آیا۔''

پنسکر Pinsker نے ایک کتاب لکھی جو خود مختاری Auto Emanspation کے نام سے موسوم ہے۔ تھیوڈر ہرزل نے ۱۸۹۶ء میں ایک کتاب ''یہودی مملکت'' لکھ کر یہودیوں کے سیاسی شعور کو اور زیادہ بیدار کیا۔ ۱۸۹۶ء میں باسل کے مقام پر پہلی صیہونی کانفرنس ہوئی۔ ہرزل نے اپنے خیال اور نظریہ کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ شروع میں یہودیوں کی آبادکاری کے لیے کوئی مخصوص ملک پیش نظر نہ تھا۔ ارجنٹائن، یوگنڈا، اور کینیا کے بارے میں خیال تھا کہ ان علاقوں میں یہودیوں کو آباد ہونا چاہیے۔ لیکن مشرقی یہودیوں کا خیال زیادہ غالب آ گیا۔ جنھوں نے اپنے قدیم وطن فلسطین کا مطالبہ شروع کیا۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء تک یہودیوں کا صرف یہ خیال تھا کہ ان کا ایک وطن ہو، صیہونی حکومت قائم کرنے کا نہ تھا۔ باسل کے مقام پر ۱۹۱۱ء میں جو دسویں کانفرنس ہوئی، تو صدر نے حسب ذیل بیان دیا۔

''صیہونیت کا مدعا پوری قوم کے لیے سرکاری طور پر تسلیم شدہ اور قانونی طور پر حاصل شدہ فلسطین میں ایک وطن کا قیام ہے، یہودی مملکت کا نہیں، بلکہ ہمارے آباؤ اجداد کی قدیم سرزمین پر ایک گھر بنانا ہے۔ جہاں ہم بغیر کسی جبر وتعدی کے ایک یہودی کی زندگی گزار سکیں۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ فلسطین میں داخل ہونے والے تارکین وطن کو بغیر کسی تجدید کے ایک شہری کے حقوق حاصل کرنے کا موقع دیا جائے اور اس امر کا موقع دیا جائے کہ وہ یہودی رسم ورواج کے مطابق بغیر کسی رکاوٹ کے زندگی گزار سکیں، یہی اور صرف یہی ہمارا مقصد ہے۔''

1. The Great Religions of the Modern World P 234.

چنانچہ ڈاکٹر چیم ویزمن سے برطانوی حکومت کی طرف سے یہ وعدہ کیا گیا کہ برطانوی حکومت فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کو ہمدردی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۱۷ء میں اعلان بالفور کیا گیا، جس میں یہ کہا گیا کہ

''ملک معظم کی حکومت یہودی قوم کے لیے فلسطین میں ایک قومی وطن کے قیام کو ہمدردی سے دیکھتی ہے اور اس مقصد کے حصول میں سہولت پیدا کرنے کے لیے اپنی بہترین کوششوں کو استعمال کرے گی۔ لیکن یہ صاف طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی ایسی بات نہ کی جائے گی جو فلسطین کی موجودہ غیر یہودی قوموں کے موجودہ دیوانی اور مذہبی حقوق یا دوسرے ملک میں یہودیوں کو حاصل شدہ حقوق یا سیاسی مرتبہ کے خلاف ہو۔''

کہا جاتا ہے کہ یہ اعلان امریکہ کے مشورہ سے ہوا تھا۔ چنانچہ فرناؤ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

''صدر امریکہ نے اعلان بالفور کے وجود میں لانے کے مسئلہ میں کافی حصہ لیا اور ۱۹۴۸ء میں صدر ٹرومین کے تحت ممالک متحدہ امریکہ نے اسرائیل کی آزاد مملکت کے وجود میں لانے میں کافی امداد کی۔''[1]

دوسری طرف برطانوی حکومت عربوں کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی، اور میک موہن معاہدے کے ذریعہ انھیں تسلی دے رہی تھی، ولسن کے ''چودہ نکات'' میں بھی یہودی مملکت کے قیام کا واضح طور پر کوئی ذکر نہیں تھا۔ لیکن ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۸ء تک ایسے سیاسی حالات پیدا ہوئے کہ فلسطین کی مقامی آبادی کی خواہشات کے خلاف یہودی مملکت اسرائیل کا قیام طے پا گیا۔ چنانچہ اس تیس سالہ دور میں فلسطین کو یہودی سلطنت میں تبدیل کرنے کے لیے یہ حربہ استعمال کیا گیا کہ دنیا کے مختلف ممالک سے یہودیوں کو یہاں لاکر آباد کرنا شروع کر دیا۔ اعلان بالفور سے قبل فلسطین میں یہودیوں کی کل آبادی ایک لاکھ تھی۔ ''فلسطین عرب دنیا کا ایک لاینفک جز تھا جو شام سے غیر ممیز تھا اور اس کی آبادی نوے فیصد عرب آبادی تھی۔''[2]

آج حالت اس کے برعکس ہے کہ یہودیوں کی آبادی نوے فیصد اور عرب صرف دس فیصد ہیں۔

دنیا کے مختلف ممالک سے یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنے سے عربوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ عربوں کی اشک شوئی اور دل جوئی کے لیے برطانیہ نے مختلف تحقیقاتی کمیشن بھیجے۔ لیکن حالات سلجھ نہ سکے۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء تک عربوں اور یہودیوں میں مسلسل فسادات ہوتے رہے۔ بالآخر ۱۹۲۹ء میں خونریز لڑائی ہوئی۔ اس وجہ سے رمزے میکڈانلڈ کی مزدور برطانوی حکومت کو ایک ایسی پالیسی کا اعلان کرنا پڑا جو یہودیوں کے خلاف تھا۔ لیکن برطانیہ میں یہودیوں کا خاصا زور اور اثر تھا، چنانچہ اس اثر کی وجہ سے برطانوی حکومت کو اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنا پڑی اور یہودی ایک نئی دستاویز حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جسے عرب ''سیاہ دستاویز'' کے نام سے پکارتے ہیں۔

فلسطین میں یہودیوں کی کثرت آمد کی وجہ جرمنی میں یہودیوں پر نازیوں کے مظالم بھی ہیں۔ آمد کی یہ رفتار ترقی کرتے کرتے ساٹھ ہزار سالانہ تک پہنچ گئی اور یہ سلسلہ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک جاری رہا۔

1. The Arabs P.94 2. Muslim on the march P.488.

اس مدت میں تقریباً دو لاکھ یہودی فلسطین میں آباد ہو گئے اور اپنی طاقت کو مضبوط بنانا شروع کر دیا۔ اس صورت حالات کو دیکھ کر مجبوراً ۱۹۳۶ء میں عربوں نے مقاطعہ کر دیا جو دو ماہ تک جاری رہا اور عرب مجاہدین نے یہودیوں سے مسلح مقابلہ شروع کر دیا۔

یہود کی پشت پناہی بیس ہزار برطانوی فوج کر رہی تھی لیکن دوسری جنگ عظیم کے آغاز تک عربوں کی مسلح مقاومت کو کچلا نہ جا سکا۔ عرب کو یہ نظر آ رہا تھا کہ یہودی فلسطین میں اپنی طاقت اور غلبے کو حاصل کرنے کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے لیے کس طرح نازیوں کے مظالم کی داستانیں سنا کر عالمی رائے کو دھوکہ دے رہے ہیں اور یہودیوں کی معاشی ترقی سے ملک کا معیار زندگی بلند ہونے کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں اور اس طرح فلسطین میں اثر بڑھا کر سیاسی اقتدار کا سامان کر رہے ہیں۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک عربوں اور یہودیوں کی باہمی جھڑپوں سے ۲۹ برطانوی اور ۹۲ یہودی، ۴۸۶ عرب سویلین اور ۱۱۳۸ عرب مجاہدین کی جانیں تلف ہوئیں[1]

اس باہمی کشمکش اور خونی جھڑپوں کے نتیجہ میں برطانوی حکومت نے ایک رائل کمیشن مقرر کیا کہ وہ فلسطین کے فسادات اور حالات اور واقعات کا جائزہ لے کیونکہ برطانوی حکومت پر یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہو چکا تھا کہ عربوں اور یہودیوں میں مصالحت ناممکن ہے۔ کمیشن نے فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہود کے بااثر طبقہ نے پوری جدوجہد کی۔ یہی تجویز بالآخر ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کی اس قرارداد کی اساس بنی جس کی بناء پر فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

عرب اس تقسیم کو اپنے لیے نہایت ہی خطرناک سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے تمام عرب ممالک اور حکومتوں نے اس کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کیا اور دو مطالبے پیش کیے۔

۱۔ فلسطین میں یہودیوں کا داخلہ بند کیا جائے۔

۲۔ فلسطین کو تقسیم کی تجویز مسترد کر کے مقامی آبادی کو آزادی دی جائے۔

۱۹۳۹ء میں تمام یورپ جنگ کی گرفت میں تھا اور مغربی طاقتیں اس نازک مرحلہ پر عربوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اس وجہ سے تقسیم کی تجویز کو عارضی طور پر ملتوی کر دیا۔ ۱۹۳۹ء میں برطانوی حکومت نے یہ وعدہ کیا کہ وہ دس سال کے اندر اندر ایک آزاد فلسطین مملکت قائم کرے گی۔ جس میں عربوں اور یہودیوں کو اس طرح حکومت میں نمائندگی ملے گی کہ دونوں قوموں کے حقوق اور مفادات کا تحفظ ہو جائے۔ نیز دس سال کے درمیان صرف ڈیڑھ لاکھ یہودیوں کو فلسطین میں داخل کیا جائے گا۔ آخر کار ۱۹۳۹ء تک فلسطین میں صیہونی مملکت کے قیام کے ارادے کو مسترد کیا جاتا رہا۔ یہودیوں کے دباؤ سے آزاد فلسطینی مملکت قائم نہ ہو سکی چونکہ دوسری جنگ چھڑ چکی تھی۔ اس سے یہود نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ۱۹۴۴ء میں اتحادیوں کی مدد کے لیے ایک مستقل یہودی فوج کا بریگیڈ قائم کیا گیا جنگ ختم ہونے پر مزید ایک لاکھ یہودیوں کو فلسطین میں داخل کر دیا گیا، کیونکہ

[1] The Arbs P-130.

''برطانیہ میں صیہونی طاقتور نہ تھے۔ لیکن وہ ممالک متحدہ امریکہ میں زیادہ طاقتور تھے۔ جہاں نیویارک اور ایلنیائس (Illinois) میں انتخابی رائے میں ان کا فیصلہ کن حصہ تھا، جو صدارت کے انتخاب کو بدل سکتا تھا۔ اس لیے وہاں ان کے درپردہ مذاکرات ارکان کانگرس اور دونوں پارٹیوں کے گورنروں پر دباؤ ڈال سکتے تھے۔''[1]

''لیکن دوسری جنگ عظیم کے اختتام سے کچھ پہلے لیبر پارٹی انگلستان میں برسراقتدار آ گئی، جس نے فلسطین میں یہودیوں کے غیر محدود داخلہ کی قرارداد منظور کی اور کہا کہ یہودیوں کے فلسطین میں داخل ہونے اور عربوں کے فلسطین سے باہر جانے کی ہمت افزائی ہونی چاہیے۔''[2]

عرب برابر یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ فلسطین کو آزاد کیا جائے لیکن اس کے برعکس امریکہ اور برطانیہ کی ایک مشترکہ کمیٹی نے فلسطین میں مزید یہودیوں کے داخلہ کی سفارش کی، جو اس شرط پر منظور کی گئی کہ یہودی دہشت پسندی اور فساد برپا کرنے سے باز آ جائیں۔ لیکن یہودیوں نے اپنا غیر قانونی داخلہ جاری رکھا۔ اور دوسری طرف یہودیوں کی دہشت پسندی اور فساد برپا کرنے میں شدت آ گئی۔ اب امریکہ اور برطانیہ کا یہ ارادہ تھا کہ عربوں اور یہودیوں کی دو آزاد مگر وفاقی حکومتیں قائم کی جائیں لیکن یہودیوں نے اس ارادہ کی شدید مخالفت کی۔ برطانوی حکومت نے ۱۹۴۷ء میں عرب حکومتوں کی ایک کانفرنس بلائی جو ناکام ہوئی۔ اس دوران میں یہودیوں کا داخلہ جاری رہا۔ یہودی ملک کا زرخیز اور بہترین نیز ۶۵ فیصد حصہ لینا چاہتے تھے۔

۱۹۴۷ء کے موسم بہار میں اقوام متحدہ کی ایک کمیٹی نے تقسیم فلسطین اور ایک یہودی اور ایک عرب مملکت کے قیام کی سفارش پیش کی۔ ''جس میں ملک کی ایک یہودی تہائی آبادی کو ملک کا بڑا اور زیادہ زرخیز حصہ دیا گیا۔ نیز ساحلی میدانوں کا مفید ترین حصہ اور تنہا عمدہ بندرگاہ دی گئی۔ اس طرح عرب موثر بحری مواصلات سے کٹ گئے، نیز ان کی آبادی کا نصف یعنی ۵ لاکھ عرب یہودی سلطنت میں چھوڑ دیے گئے۔''[3]

برطانیہ نے اس سکیم کی بحث میں حصہ نہ لیا اور غیر جانبداری کا رویہ اختیار کیا۔ آخرکار اقوام متحدہ نے ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء میں تقسیم فلسطین کی قرارداد منظور کر لی، جس میں ممالک متحدہ امریکہ کا بڑا حصہ تھا۔ برطانوی حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو فلسطین پر اپنے انتداب کو ختم کر کے اپنی فوجیں بلائے گی، اقوام متحدہ نے اس انتداب کے ختم ہو جانے پر فلسطین میں امن برقرار رکھنے کا کوئی انتظام نہ کیا، یہودیوں کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر فلسطین میں اپنی حکومت قائم کر لیں۔

چنانچہ ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو انتداب کے ختم ہونے سے چند گھنٹے پہلے یہودیوں نے مملکت اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا اور صدر ٹرومین نے فوراً اس کو تسلیم کر لیا۔[4] ''ممالک متحدہ امریکہ کے قبول کرنے کے چند دنوں کے بعد سوویت یونین نے بھی اسرائیل حکومت کو تسلیم کر لیا۔

۱ The Arabs P 172.
۲ The Arabs P 174.
۳ The Arabs P 177.
۴ The Arabs P 180.

باب ۷

عیسائیت

مسیح علیہ السلام کی بعثت سے قبل یہودیوں کی مذہبی اور سیاسی حالت اور مسیح علیہ السلام موعود کا انتظار

مذہبی حالت

حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد سے قبل یہود و عقائد کے لحاظ سے کئی جماعتوں میں بٹے ہوئے تھے۔

۱۔ ایک جماعت صدوقی تھی۔ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ انسان کے اعمالِ نیک و بد کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے۔ قیامت، آخرت میں جزاء و سزا، حشر و نشر سب باتیں غلط اور بے بنیاد ہیں۔

۲۔ دوسری جماعت فریسی کہلاتی تھی۔ اس جماعت کے لوگ قیامت، آخرت میں جزا و سزا، حشر و نشر وغیرہ کو حق سمجھتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے لیے یہ ضروری سمجھتے تھے کہ دنیا کی لذات سے کنارہ کشی اختیار کی جائے۔ چنانچہ وہ آبادیوں سے الگ خانقاہوں اور جھونپڑوں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک وقت ایسا آیا جب کہ خانقاہیں اور جھونپڑیاں بدکاری کا اڈہ بن گئیں، وہاں ہر قسم کی بدکاری کا ارتکاب کیا جانے لگا۔

۳۔ تیسری جماعت کاہن کے نام سے موسوم تھی۔ یہ لوگ مذہبی رسوم اور خدمت ہیکل بجالاتے تھے لیکن ان کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ انھوں نے مذہبی رسوم اور خدمت ہیکل کو تجارتی کاروبار بنالیا تھا۔ جب تک ہر ایک رسم اور خدمت ہیکل پر نذرانے وغیرہ نہ لے لیتے وہ کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ تورات کے احکام میں اغراض نفسانی کی تکمیل کے لیے تحریف کرتے تھے۔ اپنی تصنیفات اور اجتہادات کو کتاب الٰہی کا درجہ دیتے تھے۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے: يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ (مائدہ ۵:۴۱) وہ الفاظ کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتے تھے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ. (بقرہ ۲:۷۹) پس ہلاکت

ہو ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ وہ اس سے دنیا کا معمولی فائدہ اٹھائیں تو ہلاکت ہے ان پر اس وجہ سے جو لکھتے ہیں اور ہلاکت ہے ان پر اس سے جو وہ کماتے ہیں۔

۴۔ احبار اور فقیہہ یہ لوگ مذہب کے اجارہ دار سمجھے جاتے تھے اور عوام میں سب سے زیادہ مقبول تھے۔ یہ جنت کے پروانے لکھ دیتے اور لوگوں سے اس کے معاوضہ میں بڑی بھاری رقوم وصول کرتے تھے۔ حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیتے اور عوام میں یہ عقیدہ پیدا کر دیا تھا کہ حرام اور حلال کچھ نہیں مگر وہی جس کو وہ حلال یا حرام قرار دیتے ہیں۔ قرآن مجید نے ان کو اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ[1] کہا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان مذہبی پیشواؤں کے متعلق یہ کہا ہے: تم خدا کے حکم کو ترک کر کے آدمیوں کی روایت کو قائم رکھتے ہو اور اس نے ان سے کہا: تم اپنی روایت کو ماننے کے لیے خدا کے حکم کو کیا خوب باطل کرتے ہو۔" (مرقس باب ۷ آیات ۸، ۹) متی نے بھی انجیل میں لکھا ہے: "یسوع نے جواب میں کہا کہ تم اپنی روایت سے خدا کے حکم کو کیوں ٹال دیتے ہو...... پس تم نے اپنی روایت سے خدا کا کلام باطل کر دیا ہے۔" (متی باب ۱۵ آیات ۳، ۷)

دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا للبستانی) میں یہود سے متعلق جو مقالہ ہے اس کے تاریخی مواد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی بعثت سے پہلے یہود کے عقائد و اعمال کا یہ حال تھا کہ وہ مشرکانہ رسوم و عقائد کو جزو مذہب بنا چکے تھے اور جھوٹ، فریب، بغض و حسد جیسی بداخلاقیوں کو تو عملاً اخلاقِ کریمانہ کی حیثیت دے رکھی تھی اور بجائے شرمسار ہونے کے وہ ان پر فخر کا اظہار کرتے تھے اور ان کے علماء و احبار نے تو دنیا کے لالچ اور حرص میں کتاب اللہ (توراۃ) تک کو تحریف کیے بغیر نہ چھوڑا اور درہم و دینار پر خدا کی آیات کو فروخت کر ڈالا۔ یعنی عوام سے نذر اور بھینٹ حاصل کرنے کی خاطر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا اور اس طرح قانون الٰہی کو مسخ کر ڈالا۔

یہود کی اعتقادی اور عملی زندگی کا مختصر اور مکمل نقشہ ہم کو شعیاہ (علیہ السلام) کی زبانی خود توراۃ نے اس طرح دکھایا ہے:

"خداوند فرماتا ہے یہ امت (بنی اسرائیل) زبان سے تو میری عزت کرتی ہے مگر ان کا دل مجھ سے دور ہے اور یہ سب بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں کیونکہ میرے حکموں کو پیچھے ڈال کر آدمیوں کے حکموں کی تعلیم دیتے ہیں۔"

---

[1] التوبہ ۹: ۳۱۔

سیاسی زندگی

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد سلطنت یہود پر زوال کے بادل چھانے شروع ہو گئے اور یہود تشتت وافتراق کا شکار بن گئے ۹۳۱ ق۔م میں فلسطین کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ شمالی سلطنت میں بنو اسرائیل کے دس قبیلے آباد تھے، اس کا نام سلطنت اسرائیل تھا۔ جنوبی سلطنت کو سلطنت جوڈیا کہتے تھے۔ اس میں بنو اسرائیل کے باقی دو قبیلوں کی اولاد تھی۔ اس کا دارالحکومت یروشلم تھا۔ شمالی سلطنت کو اسیریا والوں نے ۷۲۲ ق۔م میں نیست ونابود کر دیا اور جنوبی کو بابل والوں نے ۵۸۶ ق م میں برباد کر کے ہیکل سلیمانی کو پیوند خاک کر دیا۔ ان مصائب کے دور میں یہود رو رو کر دعائیں مانگتے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی اولاد میں کوئی ایسا بادشاہ یعنی مسیحا پیدا ہو جو دشمنوں کو تباہی کے گڑھے میں اتار کر یہود کی عظمت کو دوبارہ قائم کر لے۔[1]

جب یہود کی تمام امیدیں مایوسی میں بدل گئیں تو ایک دوسرا مترادف خیال تسکین کا باعث بنا۔ وہ یہ کہ "ابن آدم" یعنی اسرائیل کے متفقہ اسباط کی پھر حکومت قائم ہوگی۔[2]

اسی زمانہ میں سکندر تمام ایشیاء پر چھا گیا اور ایران میں آ کر آتش کدوں کی آتش کو پجاریوں کے خون سے بجھا دیا تو ہیکل سلیمانی کو جو بخت نصر کے بعد کیخسرو شاہ ایران کی اجازت سے ازسرِ نو تعمیر ہوا تھا، انطاکیوس پی فینس ملک شام کے یونانی بادشاہ نے پھر پیوند خاک کر دیا۔ مقدس صحیفوں کو جلا دیا اور یہودیوں کو مظالم کا تختہ مشق بنایا۔ اسرائیلیوں میں ازسرِ نو جوش پیدا ہوا اور یہوداہ مکابی کی قیادت میں یہ مظالم اور مصائب کا دور ختم ہوا اور یونانیوں کو شکست دی۔ ۱۶۷ برس ق م میں یہودا نے بیت المقدس کو ازسرِ نو تعمیر کیا۔ تورات کو مرتب کیا۔ دانیال اسی عہد میں لکھی گئی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں یہوداہ مکابی کے جانشینوں نے رعایا پر ظلم وتشدد کرنا شروع کر دیا۔

چونکہ مکابی حضرت داؤد علیہ السلام کی نسل سے نہ تھے اس لیے یہود پھر ایسے مسیحا کا انتظار کرنے لگے جو ان کی کھوئی ہوئی جاہ وحشمت کو قائم کرے۔ اسی زمانہ میں (۶۳ ق م) پومپی نے بیت المقدس کو فتح کر لیا اور مکابی کا دور بھی ختم ہو گیا۔ یہود پھر غیر قوم کی غلامی کی زنجیر میں جکڑ گئے۔ ایسے پرآشوب زمانہ میں یہود مسیح کے آنے کا شدت سے انتظار کرنے لگے عیسیٰ علیہ السلام یہود کی اس مذہبی اور سیاسی ابتر حالت میں پیدا ہوئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالاتِ زندگی اور تعلیمات

کتب سابقہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بشارات

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے متعلق متعدد انبیاء علیہم السلام نے پیشگوئیاں کی ہوئی تھی۔

[1] کتاب یسعیاہ باب ۹ آیت ۶ یرمیاہ باب ۱۲ آیت ۵۔ حزقیل باب ۳۴۔

[2] دانیال باب ہفتم آیات ۱۳ تا آیت ۲۷۔

ان بشارات کی وجہ سے یہود اس مسیح کے شدید منتظر تھے کہ وہ آ کر ان کی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ لوٹائے گا اور ان کے ایمان کی خشک کھیتی کو آبِ عرفان سے سرسبز کرے گا۔ چنانچہ تورات استثناء میں ہے:

''اور اس موسیٰ نے کہا کہ خداوند سنیا سے آیا اور شعیر (ساعیر) سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑوں سے جلوہ گر ہوا۔''[1]

اس پیشینگوئی میں سینا سے خدا کی آمد سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت ہے۔ سعیر سے طلوع ہونا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی جانب اشارہ کرتا ہے، کیونکہ ان کی پیدائش اسی پہاڑ کے ایک مقام بیت اللحم میں ہوئی۔ فاران کے پہاڑوں سے جلوہ گر ہونا ''بعثت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کا اعلان ہے۔

حضرت یسعیاہ نبی علیہ السلام کے صحیفہ میں ہے:

''دیکھ میں اپنا پیغمبر تیرے آگے بھیجتا ہوں جو تیری راہ تیار کرے گا۔ بیابان میں پکارنے والے کی آواز آتی ہے کہ خداوند کی راہ تیار کرو، اس کے راستے سیدھے بناؤ۔''[2]

اس پیشینگوئی میں پیغمبر سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور بیابان میں پکارنے والے حضرت یحییٰ علیہ السلام ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے قبل یہود کو ان کی بعثت کا مژدہ سناتے تھے۔

یوحنا کی انجیل میں ہے:

''اور یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کے لیے اس (یحییٰ علیہ السلام) کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انھوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیا ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں۔ پس انھوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟ تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا میں جیسا کہ یشعیاہ نبی نے کہا ہے بیابان میں پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو۔''[3]

مرقس اور لوقا کی انجیلوں میں ہے:

''وہ لوگ منتظر تھے اور سب اپنے دل میں یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی بابت سوچتے تھے کہ آیا وہ مسیح تھے یا نہیں۔ تو یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) نے ان سب کے جواب میں کہا میں تمھیں بپتسمہ دیتا ہوں۔ مگر جو مجھ سے زور آور ہے وہ آنے والا ہے۔ میں اس کی جوتی کا تسمہ کھولنے کے لائق نہیں، وہ تمھیں روح القدس سے بپتسمہ دے گا۔''[4]

---

[1] باب ۳۳ آیت ۲۰۔
[2] باب ۴۰ آیات ۸۔۳۔
[3] باب ۱ آیات ۲۳۔۹۔
[4] لوقا باب ۲ آیات ۱۶۔۱۵۔

ان پیشگوئیوں اور بشارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود چند ایک عظیم المرتبت اور اولوالعزم پیغمبروں کی بعثت کے منتظر تھے، ان میں سے ایک حضرت مسیح علیہ السلام تھے۔

حالات زندگی بیان کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان مصادر کا تنقیدی جائزہ لیا جائے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات طیبہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمری کے مصادر اناجیل اربعہ ہیں۔ اناجیل کے متعلق آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کے مصنف کون کون تھے؟ کیونکہ ہر انجیل کے عنوان پر ''بقول متی'' یا ''حسب بیان متی'' درج ہے اور ''مصنفہ متی'' کہیں نہیں لکھا گیا۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ تیسری انجیل واقعی لوقا کی لکھی ہوئی ہے۔ لیکن خود لوقا کا بیان یہ ہے: ''میں ان بیانات کا عینی شاہد نہیں ہوں، بلکہ جس طرح مجھ سے قبل اور بہت سے آدمیوں نے یسوع کے حالات قلمبند کیے ہیں اسی طرح میں بھی کہتا ہوں۔''

علماء مسیحیت نے یہ اقرار کرنا شروع کر دیا ہے کہ عیسائیت کے ابتدائی دور میں ہی جعلی انجیلیں دوسرے کے ناموں پر شائع ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ چنانچہ رومن تواریخ کلیسا مطبوعہ مرزاپور ۱۸۵۶ء صفحہ ۹۰ پر لکھا ہے:

''بہت سی مسیحی کتابیں خود لکھ کر کسی حواری مسیح یا حواری مسیح کے کسی خادم یا کسی بڑے اسقف کے نام سے مشہور کر دیتے تھے۔ ایسی جعلی کاروائیاں تیسری صدی عیسوی سے شروع ہوئیں اور کئی برس تک جاری رہیں۔ یہ نہایت ہی خلاف حق اور قابل شرم حرکت تھی۔''

پادری موشیم اپنی تاریخ کلیسا مطبوعہ ۱۸۶۰ء جلد دوم باب دوم صفحہ ۳۶ پر رقمطراز ہے:

''متعدد وجوہ ایسے تھے جن کے باعث ضرورت محسوس ہوئی کہ پہلی صدی میں تمام مروجہ انجیلوں کو ایک نسخہ میں جمع کر دیا جائے۔ دنیا میں بہت سی ایسی تحریریں پھیل گئی تھیں جن پر پاک پیغمبروں کے نام بطور مصنفین درج کر دیے گئے تھے۔ اس قسم کے غیر یقینی مصادر پر کلی طور پر اعتماد کر کے کسی شخصیت کی صحیح سوانح عمری نہیں لکھی جا سکتی۔''

اسی طرح اگر ان روایات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے جن میں حضرت مسیح علیہ السلام کی سوانح عمری بیان ہوئی ہے تو وہ بھی متضاد امور کا پلندہ معلوم ہوتی ہیں۔ کنواری کے پیٹ سے پیدا ہونا اور مر کر دوبارہ زندہ ہونا حضرت مسیح علیہ السلام کی سوانح عمری کے خاص دو واقع ہیں۔ لیکن ان دونوں باتوں کے متعلق جو روایات اور شہادتیں اناجیل میں موجود ہیں ان میں شدید اختلاف ہے۔

کنواری کے حاملہ ہونے کا ذکر صرف متی اور لوقا میں موجود ہے مرقس میں نہیں ہے۔ مزید برآں متی اور لوقا نے مسیح کو کنواری کا بیٹا بتانے کے باوجود اس کا شجرہ نسب بھی درج کیا ہے۔

وفات اور احیاء ثانیہ سے متعلق انجیل مرقس اور انجیل متی میں اختلاف ہے۔

مسیح علیہ السلام کی ہستی سے انکار

انجیل کی تاریخی کمزوری اور متضاد بیانات کی وجہ سے بعض محققین نے حضرت مسیح علیہ السلام کی ہستی سے انکار کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک فرانسیسی محقق ڈوپواے (Dupuis) نے اپنی تصنیف ابتداء مذہب (Origin of cults) میں لکھا ہے کہ "دنیا میں جتنے مذہب پیدا ہوئے ان سب کی بنیاد علم ہیئت کے قصوں پر ہے، جن میں سورج اور آسمانی بادشاہت کو بہت اہمیت دی جاتی تھی اور اس کے ساتھ کسی نہ کسی دیوتا کا مر کر زندہ ہونا بھی دکھایا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب فصل خزاں آتی ہے تو آفتاب کو زوال ہوتا ہے اور اس کی حرارت بھی کم ہو جاتی ہے۔ اس حالت کو قدیم لوگوں نے سورج دیوتا کے مرنے سے تعبیر کیا۔ پھر جب فصل بہار آتی ہے تو آفتاب مائل بہ عروج ہوتا ہے اور اس کو سورج دیوتا کا احیاء ثانیہ سمجھا گیا۔ گویا "مرنا" اور دوبارہ زندہ ہونا تداخل فصلین سے عبارت ہے۔" پروفیسر مذکور نے بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ یسوع ناصری کا وجود فی الخارج تھا ہی نہیں، بلکہ اس سے مراد صرف "آفتاب" ہے جو دوشیزہ بہار (کنواری مریم) کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ فصل خزاں کا پلاطس (رومی گورنر) اسے گرفتار کر کے مصلوب کر دیتا ہے (یعنی سردیوں کا موسم آ جاتا ہے اور تمام عالم ٹھٹھر کر بے جان ہو جاتا ہے) اور پھر وہ کچھ دنوں کے بعد مائل بہ عروج ہوتا ہے جسے احیاء ثانیہ سمجھنا چاہیے۔

۱۸۳۵ء میں جرمنی کے ایک مشہور مذہبی عالم ڈاکٹر سٹراس (Strass) نے اپنی کتاب سیرۃ المسیح (Life of jesus) میں یہ ثابت کیا ہے کہ اناجیل میں جو سوانح یسوع کے درج ہیں وہ تمام تر اصنام پرستوں کے مذہبی خرافات سے ماخوذ ہیں۔ تولین (Tulane) یونیورسٹی کے پروفیسر ڈبلیو بی اسمتھ نے بھی اپنی کتاب (Ecoedeus) میں مسیح کی تاریخی حیثیت سے انکار کیا ہے۔ اسی طرح جرمن پروفیسر ڈریوز (Drews) فرانسیسی ڈاکٹر کوچو (Couchow) پراسپر الفاریق (Prosper Alfaric) وٹوریس ماشیورو (Vittoris machioro) وغیرہ محققین نے یسوع مسیح کی ہستی کو محض ایک فرضی ہستی قرار دیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالاتِ زندگی

حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کا زمانہ، ابتدائی عمر، تبلیغ اور مصلوب کیے جانے کے صحیح اور مستند واقعات کا علم نہ تو یہودیوں کی کتب سے ہوتا ہے اور نہ ہی اس زمانہ کی بت پرست اقوام کے نوشتے اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مشہور مورخ فیرر (Farrar) اپنی کتاب لائف آف کرائسٹ (Life of Christ) میں یہودی مورخ جوزیفس[1] (Josephus) کے متعلق لکھتا ہے۔

---

[1] شروع عیسوی کا ایک مشہور مورخ تھا۔ جس کی کتاب History of the jewish war and antiqui-ties of the jews نے بائبل کی تاریخ کے متعلق کافی مواد بہم پہنچایا ہے۔

''جوزیفس ایک منکر دین اور چاپلوس قسم کا آدمی تھا۔ اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس کا عیسائیت کے متعلق جان بوجھ کر چپ رہنا ایمانداری سے بہت بعید ہے۔ اس لیے حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کے حالات کے لیے ہمیں مجبوراً عیسائیت کی مذہبی کتابوں انجیلوں، اعمال ناموں اور خطوط پر انحصار کرنا پڑتا ہے اس سلسلہ میں پولوس کے خطوط (جو کہ عہد نامہ جدید کا حصہ ہیں) عیسائیت کے ابتدائی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

تاریخ ولادت

کینن فیرر نے اپنی کتاب ''حیات مسیح میں اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ مسیح کی تاریخ ولادت کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ انجیل سے صرف یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس رات گڈریے بھیڑوں کو لیے ہوئے بیت اللحم کے کھیتوں میں موجود تھے، لیکن انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں کرسمس ڈے کے آرٹیکل پر لکھنے والے نے اس پر ایک نہایت عمدہ تنقید کی ہے، وہ لکھتا ہے کہ دسمبر کا مہینہ تو ملک یہودیہ میں سخت بارش کا مہینہ ہے ان دنوں میں کس طرح بھیڑیں یا گڈریے کھلے آسمان تلے رہ سکتے ہیں۔ اس کے مقابل چار صدیوں تک ۲۵ دسمبر تاریخ ولادت مسیح نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ۵۳۰ء میں سیتھیا کا ایک راہب ڈایونیس اکسیگز نام جو منجم بھی تھا۔ تاریخ ولادت مسیح کی تحقیق اور تعین کے لیے مقرر ہوا۔ سو اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کی تاریخ ولادت ۲۵ دسمبر مقرر کی کیونکہ مسیح سے پانچ چھ صدی قبل ۲۵ دسمبر ایک مقدس تاریخ تھی۔ بہت سے سورج دیوتا اسی تاریخ پر یا اس سے ایک دو دن بعد پیدا ہونا تسلیم کیے جا چکے تھے، سو راہب نے آفتاب پرست اقوام میں عیسائیت کو مقبول بنانے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تاریخ ولادت ۲۵ دسمبر مقرر کر دی۔ قرآن مجید کی سورت مریم پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت مریم علیہا السلام کو دروزہ کی تکلیف ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت کی کہ کھجوروں کے تنے کو ہلاتا کہ ان پر تازہ پکی کھجوریں گریں اور وہ اس کو کھائیں اور چشمہ کا پانی پی کر طاقت حاصل کر سکیں۔ اب فلسطین میں موسم گرما کے وسط یعنی جولائی، اگست میں ہی کھجوریں ہوتی ہیں۔ اس سے بھی یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت جولائی یا اگست کے کسی دن میں ہوئی تھی اور ۲۵ دسمبر کی تاریخ غلط ہے۔

متی کی انجیل کے مطابق احتیاط سے حساب لگایا جائے تو حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کا زمانہ ۸ اور ۲ ق۔م کے درمیان ہے۔

عیسائیوں کے اعتقاد کے مطابق جناب یسوع کا ایک نام عمانوئیل (خدا ہمارے ساتھ ہے) ہے۔ جس کا ذکر یسعیاہ نبی کی پیش گوئی میں ہے۔ ''دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی اور اس کا نام عمانوئیل (یعنی خدا ہمارے ساتھ) رکھا جائے گا۔'' (یسعیاہ ۷:۱۴) عہد نامہ جدید سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ کا نام عمانوئیل رکھا گیا۔ یسعیاہ نے عمانوئیل کا دوسرا نام مہیر شالال حاش نبر بتایا ہے۔ اناجیل سے یہ نام

بھی کہیں مذکور نہیں۔ آپ کا نام یشوعا (ارامی زبان میں یسوع عربی میں عیسیٰ) تھا۔ یسوع کے معنی سید اور مبارک ہیں۔ دوسرا نام مسیح ہے جو مسح سے مشتق ہے۔ مسح کے معنی کسی چیز پر ہاتھ پھیرنا اور اس سے اثر دور کرنا ہے۔ (راغب)

سیر بمعنی چلنے کو بھی مسح کہتے ہیں۔ قيل سمى عيسىٰ عليه السلام مسيحاً لكونه ماسحاً في الارض اي ذاهبا فيها یعنی حضرت علیہ السلام کا نام مسیح اس لیے رکھا گیا کہ وہ زمین میں چلنے والے یا سیاحت کرنے والے تھے۔

اناجیل میں نذارین کے نام سے بھی پکارا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے یہ فرض کر لیا ہے کہ یسوع کو نذارین اس لیے پکارا کہ آپ نزارتھ (ناصرہ بستی) کے باشندے تھے۔

اگر اناجیل کا بنظر تعمق مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نذارین کا لفظ تین مختلف صورتوں میں ملتا ہے۔ یعنی نذاریناس، تدارائنوس، نذارینوس یہ تمام الفاظ ہم معنی اور مرادف ہیں۔ ان الفاظ میں سے کوئی لفظ بھی نذارتھ سے ماخوذ نہیں۔

اناجیل میں یہ لفظ مقدس ہستی کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔

انجیل مرقس میں آتا ہے: ''اے نذارتھی یسوع! ہمیں آپ سے کیا واسطہ؟ کیا ہمیں برباد کرنے آئے ہیں؟ میں جانتا ہوں کہ آپ کون ہیں؟ خدا کے مقدس۔'' (مرقس ۱:۲۴) یوحنا میں پطرس یسوع سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

''ہم ایمان رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ آپ خدا کے مقدس ہیں۔'' (یوحنا ۶۹)

انجیل لوقا میں ہے:

''جو ذات آپ کے ہاں پیدا ہوگی وہ مقدس کہلائے گی۔'' (لوقا ۱:۳۵)

انسائیکلو پیڈیا ببلیکا کے مولفوں کا کہنا ہے: ''پس نذارین کے لفظ نے جناب مسیح کے کسی لقب کی جگہ لے لی ہوگی۔ اس کا صحیح تلفظ نذیر یعنی مقدس ہوگا، جو مسیح کا لقب ہے۔'' (کالم ۳۳۶۰)

پروفیسر ایل سالویٹور یلی نے بھی اپنی کتاب "IT significants de Nazareng" میں یہ رائے دی ہے کہ مسیح موعود کا لقب نذیر بھی ہے۔

پس آپ کا ذاتی نام یشوعا یا یسوع عیسیٰ تھا۔ مسیح آپ کا وصفی نام تھا اور نذارین آپ کا لقب تھا۔ ابن مریم کنیت تھی۔

جائے پیدائش

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے، متی کی انجیل میں بیت اللحم کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش بتایا ہے۔ لوقا (۴:۱۶) میں لکھا ہے کہ یسوع کا اپنا شہر ناصرہ

(Nazareth) تھا جہاں وہ پیدا ہوا اور پرورش پائی۔ بائبل کی انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ مسیح بیت اللحم جوڈا میں نہیں بلکہ ناصرہ میں پیدا ہوئے۔ ۳۳۶۱۔ا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ گلیلی (Galilee) کے علاقہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کا یہودی کتب میں نام بیتھلیہن الناصرہ (Bethlehen-EN-Nosiryyah) لکھا ہے۔ یہ گاؤں ناصرہ (Nazareth) سے سات میل شمال مغرب کی جانب واقع تھا۔ اس گاؤں میں حضرت مریم اور ان کی بہن کا آبائی مکان تھا۔ جب حضرت مریم حاملہ ہوئیں تو وہ بیت اللحم کے قصبہ سے آ کر اس مکان میں اپنی بہن کے پاس آ گئیں تا کہ پہلوٹھی کا بچہ جن سکیں۔ (یوحنا ۱:۴۶: ۷: ۴۰ تا ۴۳ اور ۵۲)

ولادت مبارک

آپ کی پیدائش کے بارہ میں عیسائیوں کے قدیم فرقوں میں بھی بعض فرقے اختلاف رکھتے ہیں۔ بعض کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کنواری مریم کے بطن سے پیدا نہیں ہوئے، بلکہ ان کے باپ کا نام یوسف نجار تھا۔ اپنے اس دعویٰ کی دلیل کی بنیاد انجیل پر رکھتے ہیں۔

انجیل میں لکھا ہے، اس کی ماں نے اس سے کہا بیٹا! تو نے ہم سے ایسا کیوں کیا؟ دیکھ تیرا باپ اور میں کڑھتے ہوئے تجھے ڈھونڈتے ہیں۔ اس نے ان سے کہا: تم مجھے کیوں ڈھونڈتے تھے؟ کیا تم کو معلوم نہیں تھا کہ مجھے اپنے باپ کے ہاں ہونا ضروری ہے مگر جو بات اس نے ان سے کہی وہ نہ سمجھے۔" (لوقا باب ۲ آیات ۴۸ تا ۵۰)

"یسوع کے ماں باپ عید فسح پر یروشلم کو جایا کرتے تھے..... جب وہ لوٹے تو یسوع یروشلم میں رہ گیا اور ان کے ماں باپ کو خبر نہ ہوئی۔" (لوقا باب ۲ آیات ۴ تا ۴۳)

"جب یسوع خود تعلیم دینے لگا قریباً تیس برس کا تھا اور (جیسا کہ سمجھا جاتا تھا) یوسف کا بیٹا تھا۔" (لوقا باب ۳ آیت ۲۳)

"لوگ کہنے لگے کیا یہ بڑھئی کا بیٹا نہیں اور اس کی ماں کا نام مریم اور اس کے بھائی یعقوب اور یوسف اور شمعون اور یہوداہ نہیں، اور اس کی سب بہنیں ہمارے ہاں نہیں؟ پھر یہ سب کچھ اس میں کہاں سے آیا؟ اور انھوں نے اس کے سبب سے ٹھوکر کھائی۔ مگر یسوع نے ان سے کہا کہ نبی اپنے وطن اور اپنے گھر کے سوا کہیں بے عزت نہیں ہوتا۔" (متی باب ۱۳ آیات ۵۵، ۵۷)

"اور یعقوب سے یوسف پیدا ہوا یوسف جو مریم کا شوہر تھا یسوع پیدا ہوا جو مسیح کہلاتا تھا۔" (متی باب ۱ آیت ۱۶)

جمہور مسلمانوں اور عیسائیوں کا مروجہ اور مقبولہ عقیدہ یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت اعجازی رنگ میں بن باپ ہوئی۔

ختنہ اور نام

جب حضرت یسوع آٹھ دن کے ہوئے تو ان کا ختنہ ہوا۔ کتاب مقدس میں لکھا ہے:

''جب آٹھ دن پورے ہوئے اور یسوع کے ختنہ کا وقت آیا تو اس کا نام یسوع رکھا گیا...... پھر جب موسیٰ کی شریعت کے موافق ان کے پاک ہونے کے دن پورے ہو گئے تو وہ اس کو یروشلم میں لائے تاکہ خداوند کے آگے حاضر کریں (جیسا کہ خداوند کی شریعت میں لکھا ہے کہ ہر ایک پلوٹھا خداوند کے لیے ٹھہرے گا)۔''[1]

یروشلم جانا

اناجیل اور مستند تواریخ سے بچپن کے حالات کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ جب بارہ سال کی عمر ہوئی تو ان کے والدین یروشلم لے جاتے ہیں۔ لکھا ہے:

''یسوع کے ماں باپ ہر برس فسح پر یروشلم کو جایا کرتے تھے اور جب وہ بارہ برس کا ہوا تو عید کے دستور کے موافق یروشلم کو گئے۔ جب وہ ان دنوں کو پورا کر کے لوٹے تو یسوع یروشلم رہ گیا۔[2]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جوانی کے حالات گوشہ ظلمت میں ہیں۔ بعض مصنفین نے جوانی کے زمانہ کے بعض مضحکہ خیز اور عجیب وغریب افسانے وضع کیے ہیں، جن کی کوئی تاریخی سند نہیں۔ بعض حقیقت پسند مورخین کو بھی اس امر کا اعتراف ہے۔ چنانچہ موشیم ایک بڑا مسیحی مورخ ہے، وہ اپنی کتاب ''تاریخ کلیسا'' میں لکھتا ہے:

''آپ کی بقایا زندگی بالکل نجی حیثیت سے گوشہ ظلمت میں گزری، حتیٰ کہ آپ کی عمر تیس سال کی ہو گئی۔''

اس کے بعد یہی مورخ لکھتا ہے:

''بہت سے مصنفین نے اپنے تصورات کی دنیا میں مست (ہو کر) یا عام لوگوں کی توجہات کو مرکوز کرنے کے لیے ہمارے نبی کی زندگی کے گمنام گوشے کے متعلق عجیب وغریب مضحکہ خیز افسانے وضع کر رکھے ہیں۔''

کتاب مقدس سے صرف یہ علم ہوتا ہے کہ آپ نے والدین بہن بھائیوں کا پیٹ، پالنے کے لیے بڑھئی کا کام شروع کر دیا تھا۔ انجیل میں لکھا ہے:

''جب سبت کا دن آیا تو یسوع عبادت خانہ میں تعلیم دینے لگا اور بہت لوگ حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ یہ باتیں اس میں کہاں سے آ گئیں۔ اور یہ کیا حکمت ہے جو اسے بخشی گئی اور کیسے معجزے اس کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ کیا یہ وہی بڑھئی نہیں جو مریم کا بیٹا اور یعقوب اور یوسیس اور یہوواہ اور شمعون کا

1۔ لوقا باب ۲ آیات ۲۱ تا ۲۴۔ 2۔ لوقا باب ۲ آیات ۴۱ تا ۴۳۔

بھائی ہے اور کیا اس کی بہنیں یہاں ہمارے پاس نہیں۔ پس انھوں نے اس کے سبب سے ٹھوکر کھائی۔ یسوع نے ان سے کہا: نبی اپنے وطن اور رشتہ داروں اور اپنے گھر کے سوا اور کہیں بے عزت نہیں ہوتا۔"[1]

تبلیغی کام

جب حضرت مسیح علیہ السلام تیس سال کے ہوئے تو انھوں نے یوحنا سے بپتسمہ لیا۔ یوحنا ایک نبی اور یسوع کے رشتہ کا بھائی تھا، جو لوگوں کی اخلاقی پستی اور مذہبی بے راہ روی کی وجہ سے ہر وقت متفکر رہتا تھا اور ان کو گناہوں کی زندگی ترک کر کے نیک اور پاکیزہ زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرتا تھا اور گناہوں کی معافی کے لیے توبہ کے بپتسمے کی ترغیب دیتا تھا۔ جب یسوع یوحنا سے بپتسمہ لے چکا تو اناجیل کے بیان کے مطابق آسمان کھل گیا اور روح القدس کبوتر کی شکل میں اس پر آ ٹھہرا اور آسمان سے یہ آواز آئی: "یہ میرا پیارا بیٹا ہے۔ جس سے میں خوش ہوں۔"

تبلیغ شروع کرنے سے پیشتر یسوع بیابان میں عبادت اور روزے رکھنے کے لیے تنہا رہتا تھا۔ وہاں جیسے مہاتما بدھ اس سے چھ سو برس پہلے آزمایا گیا تھا وہ بھی ابلیس سے آزمایا گیا۔ ابلیس نے دوسری آزمائشوں کے علاوہ اسے دنیا کی ساری حکومتیں دکھائیں اور کہا اگر تو میرے قدموں پر گر کر مجھے سجدہ کر لے تو یہ سب اور ان کی ساری شان و شوکت تجھے بخش دوں گا۔ یسوع نے کہا "اے شیطان دور ہو" کیونکہ کلام میں لکھا ہے تو خداوند اپنے خدا ہی کو سجدہ کر اور اسی کی پرستش کر۔ (متی)

حضرت مسیح علیہ السلام خدا سے لوگوں کی اصلاح کا حکم پا کر میدان عمل میں اتر آئے۔ لوگوں کو محبت اور اخوت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔

عید فسح کے تہوار میں شامل ہونے کے لیے یروشلم گئے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ بیت المقدس میں صراف چولیاں بچھائے روپیہ کا لین دین کر رہے تھے کبوتر اور مویشی بیچنے والوں کا اژدہام تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے غضب ناک ہو کر جانوروں کو اللہ کے گھر سے باہر نکال دیا اور تاجروں کو ڈانٹ کے کہا کہ یہاں سے سب چلے جائیں۔

اس واقعہ سے کاہن اور فریسی ناراض ہو گئے۔ جب آپ ۳۳ سال کے ہوئے تو پھر عید فسح میں شرکت کے لیے گئے تو وہی منظر دیکھا جو تین سال قبل دیکھا تھا۔ تو آپ نے وہی کہا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے پیغام خداوندی کو اسرائیل کے بارہ قبیلوں تک پہنچانے کے لیے بارہ رسول مقرر کیے۔ پانچ سال تک وہ خدا اور انسان کی محبت کی انجیل کی اشاعت کرتے رہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم کا نچوڑ اس کے پہاڑ کے وعظ میں ہے۔

---

[1] مرقس باب ۶ آیت ۲ تا ۴۔

یہود کی مخالفت اور اس کی وجوہات

عیسیٰ علیہ السلام نے خدا کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے شہر شہر اور گاؤں گاؤں، قریہ قریہ گھومنا شروع کر دیا تو ان کے محبت بھرے پیغام میں یہود کے علماء کو اپنی موت نظر آنے لگی اور انھوں نے یسوع مسیح کو ناکام بنانے کے لیے مخالفت شروع کر دی انجیل کی رو سے مخالفت کی حسب ذیل وجوہ ہیں۔

ا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سخت کلامی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہود کو سخت اور درشت کلام سے مخاطب کیا، جس وجہ سے ان کی آتش غضب بھڑک اٹھی۔ آپ نے فرمایا: ''اے ریا کار و فقیہو اور فریسیو!...... تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو...... اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے۔''[1]

سبت کی بے حرمتی

یہود یسوع کی اس بات پر معترض تھے کہ وہ سبت کی حرمت نہیں رکھتے۔ اس پر یسوع نے کہا: سبت ابن آدم کے لیے ہے نہ کہ ابن آدم سبت کے لیے۔''[2]

۳۔ ظاہری طہارت سے پرہیز

یہود کو یہ بھی اعتراض تھا کہ ''یسوع کے شاگرد بغیر ہاتھ دھوئے کھانا کھانے لگ جاتے ہیں۔''[3]

یسوع نے نہایت ہی پر حکمت جواب دیا کہ ''اصل پاکیزگی دل کی ہوتی ہے۔ ظاہر کی عبادت کی کوئی قیمت نہیں۔'' (۱۵:۱۰،۱)

۴۔ یروشلم کی تباہی کے لیے بددعائیں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یروشلم کی تباہی کے لیے بددعائیں کیں۔ یہودیوں کا یہ مقدس شہر تھا، اس کی تباہی کی بددعا کو کبھی برداشت نہ کر سکتے تھے اور وہ ان کے دشمن بن گئے۔ کتاب مقدس میں ہے:

''پھر جب تم یروشلم کو فوجوں سے گھرا ہوا دیکھو تو جان لینا کہ اس کا اُجڑ جانا نزدیک ہے...... ملک میں بڑی مصیبت اور اس قوم پر غضب ہوگا اور وہ تلوار کا لقمہ ہو جائیں گے اور اسیر ہو کر سب قوموں میں پہنچائے جائیں گے اور جب تک غیر قوموں کی معیاد پوری نہ ہو یروشلم غیر قوموں سے پامال ہوتا رہے گی۔''[4]

---

[1] متی باب ۲۳:۲۹۔۳۳۔

[2] مرقس ۲:۲۷۔

[3] مرقس ۷، ۵، ۶۔

[4] لوقا ۲۱:۲۰ تا ۲۴۔ متی ۲۳:۳۸ اور ۲۴:۲ میں ہیکل کی تباہی کی پیش گوئی صاف الفاظ میں ہے۔

۵۔ خدا کا بیٹا کہلانے کا الزام

یہود کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ یسوع اپنے تئیں خدا کا بیٹا کہلاتا ہے اور یہ کلمہ کفر ہے۔ اس وجہ سے بہت برہم تھے۔ (متی باب ۹ آیت ۳ باب ۲۶ آیت ۶۵۔ مرقس باب ۲ آیت ۷۔ لوقا باب ۵ آیت ۲۱ اور یوحنا باب ۱۰ آیت ۲۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس الزام کا جواب دیا کہ سب الفاظ استعارہ اور مجاز ہیں اور حقیقت پر مبنی نہیں۔ لیکن یہودیوں نے اس تاویل کو قبول نہ کیا۔

۶۔ نئی حکومت قائم کرنے کا الزام

یہود نے یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ یسوع داؤد کے تخت کا وارث ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس وجہ سے وہ رومی حکومت کے اندر ایک ایسی حکومت قائم کرے گا جو رومی حکومت کا تختہ الٹ دے گی۔

۷۔ اخوت اور مساوات کی تعلیم کی اشاعت

فریسی غیر یہودیوں اور غریب اور نچلے طبقہ کے لوگوں سے میل جول رکھنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیغام ہی مودت اور اخوت کا تھا۔ اس وجہ سے فریسی عیسیٰ علیہ السلام کے شدید مخالف ہو گئے۔ پیغام اخوت ومودت حکمران طبقہ کے لیے بھی ناخوش گوار تھا۔

مخالفت کا نتیجہ

یہود نے خدا کا بیٹا کہلانے اور نئی حکومت قائم کرنے کے متعلق خوب پروپیگنڈا کیا اور حکومت کو یسوع کے خلاف اکسایا اور کہا کہ ایک تو یہ شخص اپنے تئیں خدا اور خدا کا بیٹا کہلاتا ہے اور دوسرا اپنی ایک نئی حکومت قائم کر کے رومی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا ہے۔ فریسیوں اور احبار کے اصرار پر گورنمنٹ نے یسوع مسیح کو گرفتار کر لیا، اور اس پر دو فرد جرم عائد کیے: ایک تو وہ خدا اور اس کا بیٹا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، دوم حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا ہے۔ صفائی دینے کے لیے یسوع مسیح کو پلاطوس کی کچہری میں بطور ملزم پیش کیا گیا تو یسوع مسیح نے پہلے الزام کا یہ جواب دیا کہ "خدا کا بیٹا کہلانا مجازی کلمات ہیں۔" کیونکہ تورات میں علماء کو خدا تک کے الفاظ سے پکارا گیا ہے چنانچہ لکھا ہے۔

"تم خدا ہو اور تم سب خدا تعالیٰ کے بیٹے ہو۔"[1]

دوسرے الزام کا یہ جواب دیا کہ میرا مقصد دنیا کی حکومت قائم کرنے کا نہیں، بلکہ آسمانی حکومت قائم کرنے آیا ہوں۔

یسوع مسیح کو صلیب پر لٹکانے کے بارہ میں اختلاف

یسوع مسیح کو صلیب پر لٹکائے جانے کے بارہ میں یہود، عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان شدید

[1] زبور باب ۸۲ آیت ۶۔

اختلاف ہے۔ یہود کہتے ہیں کہ پلاطوس کے حکم کے تحت یسوع مسیح صلیب پر لٹکا دیے گئے۔
موسوی شریعت کی رو سے وہ لعنتی ثابت ہوئے (نعوذ باللہ) کیونکہ موسوی شریعت میں یہ لکھا ہے کہ جو صلیب پر چڑھایا جائے وہ لعنتی موت مرتا ہے۔ استثناء باب ۲۱ آیت ۲۳ میں لکھا ہے: "جسے پھانسی ملتی ہے وہ خدا کی طرف سے ملعون ہے۔"

عیسائی کہتے ہیں کہ یسوع مسیح کو صلیب پر چڑھایا گیا اور صلیب پر ہی انھوں نے جان دی۔ دفن کے تیسرے دن بعد زندہ ہوئے اور آسمان پر چڑھے، اور اب وہ اپنے باپ کے دائیں طرف بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور ان کی صلیبی موت ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے۔

گلتیوں باب ۳ آیت ۱۲ میں لکھا ہے:

"مسیح جو ہمارے لیے لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے بچایا، کیونکہ لکھا ہے کہ جو کوئی لکڑی پر لٹکایا گیا وہ لعنتی ہے۔"

یوحنا باب ۱۹ آیت ۱۶، ۱۷ میں لکھا ہے:

"پلاطوس نے یسوع کو ان کے حوالہ کیا کہ مصلوب کیا جائے...... یسوع اپنی صلیب آپ اٹھائے ہوئے اس جگہ تک باہر گیا...... وہاں انھوں نے یسوع اور اس کے ساتھ دو بدکاروں کو مصلوب کیا۔"

مرقس باب ۱۵ آیت ۲۳ تا ۳۲ میں لکھا ہے:

"انھوں نے یسوع کو مصلوب کیا...... اور انھوں نے دو ڈاکو مصلوب کیے۔ تب اس سے وہ نوشتہ کہ وہ بدکاروں میں شمار ہوا پورا ہوا اور چلنے والے سر ہلا ہلا کر اس پر لعن طعن کرتے اور کہتے تھے کہ صلیب پر سے اتر کر اپنے تئیں بچا...... ٹھٹھے سے کہتے تھے اس نے اوروں کو بچایا اپنے تئیں نہیں بچا سکتا۔ اسرائیل کا بادشاہ مسیح صلیب پر سے اتر آئے تاکہ ہم دیکھ کر ایمان لائیں اور جو اس کے ساتھ مصلوب ہوئے وہ اس پر لعن طعن کرتے تھے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ صلیب کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف ہے۔ جمہور مسلمان علماء کا یہ عقیدہ ہے کہ یسوع مسیح کو صلیب دیے جانے سے قبل اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھا لیا اور ان کے ہم شکل آدمی کو مصلوب کرا دیا۔ ان کے برعکس بعض علماء کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر فوت نہیں ہوئے اور نہ آسمان پر اٹھائے گئے بلکہ اپنی طبعی موت مرے۔[1] یہ معتزلہ اور عقلیت پسند علماء کا نظریہ ہے۔ پاک و ہند میں سر سید وغیرہ کا یہی نظریہ ہے۔

---

[1] اس اختلافی مسئلہ پر تقریباً پچھلی ایک صدی میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ یہاں تک تکفیر بازی تک نوبت پہنچ گئی۔ اس بارہ میں مولانا مودودی صاحب کا یہ خیال زیادہ بہتر ہے کہ یہ مسئلہ ہماری ایمانیات کا حصہ نہیں جس پر اس شد و مد کے ساتھ بحث کی جائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت صرف بنی اسرائیل کی طرف تھی:۔ اناجیل سے یہ بات عیاں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت صرف بنی اسرائیل کی طرف تھی چنانچہ انھوں نے خود اپنے شاگردوں سے کہا ہے:

''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔''[1]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک کنعانی عورت آئی تو اس کو کہا:

''میں بچوں کی روٹی کتوں کے سامنے نہیں پھینک سکتا۔ اس عورت نے عرض کیا: بچوں کے دسترخوان سے جو ٹکڑے گرتے ہیں انھیں کتے ہی لیا کرتے ہیں۔''[2]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان معجزات کو سورہ آل عمران میں ذکر فرمایا ہے: اَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ اَنِّيْ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ (آیت ۴۹) کہ میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس ایک نشانی لایا ہوں کہ میں تمھارے لیے کیچڑ سے پرندے کی شکل کی مانند بناتا ہوں، پھر اس کے اندر پھونکتا ہوں، پس وہ اللہ کے حکم سے اڑنے والا ہو جاتا ہے اور اللہ کے حکم سے شبکور اور پھلبہری والے کو اچھا کرتا ہوں اور مردوں کو زندہ کرتا ہوں۔

اس آیت سے پادریوں نے یہ دھوکا دینے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پرندے پیدا کیا کرتے تھے، اندھوں، پھلبہری والوں کو شفا دیا کرتے تھے۔ مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔

یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ قرآن مجید کی تشریح محکمات کے تابع ہونی چاہیے۔ خلق اشیاء اور مردوں کو زندہ کرنا صفات باری تعالیٰ ہے۔ ان صفات میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا۔ خلق اشیاء کے متعلق اللہ تعالیٰ ایک عام قانون بیان فرماتا ہے۔ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (الرعد ۱۳:۱۶) کہ اللہ ہی تمام اشیاء کو پیدا کرنے والا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: رَبُّنَا الَّذِيْ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (طٰہٰ ۲۰:۵۰) ہمارا رب وہی ہے جس نے ہر ایک چیز کو اس کی پیدائش عطا کی۔ پھر اپنے کمال کی راہ دکھائی۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اصولی طور پر بیان فرما دیا ہے کہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ بائبل کی روشنی میں معجزات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقت آگے آئے گی۔

---

1. متی باب ۱۰ آیات ۵، ۶۔
2. مرقس باب ۷ آیات ۲۷، ۲۸۔

تعلیماتِ مسیح علیہ السلام

توحید کی تعلیم

حضرت مسیح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی نسبت بیان کیا ہے کہ وہ واحد و یگانہ ہستی ہے جس کی عبادت کرنا فرض ہے۔ مقدس کتاب میں لکھا ہے:

''پھر ابلیس (یسوع کو) ایک اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی سب سلطنتیں اور ان کی شان و شوکت اسے دکھائی اور اس سے کہا کہ اگر تو جھک کر مجھے سجدہ کرے تو یہ سب کچھ تجھے دے دوں گا۔ یسوع نے اس سے کہا اے شیطان دور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔''[1]

انجیل کی یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وحدہٗ لاشریک ہے، اس کا کوئی ہمسر نہیں اور وہی معبود حقیقی ہے، اسی کے سامنے سر جھکانا چاہیے۔

''ایک فقیہہ نے یسوع سے پوچھا کہ سب حکموں میں اوّل کون سا ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ اوّل یہ ہے اے اسرائیل سُن! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔ اور تو خداوند خدا سے اپنے سارے دل سے اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ۔ دوسرا یہ کہ تو اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ ان سے بڑا اور کوئی حکم نہیں۔ فقیہہ نے اس سے کہا: اے استاد بہت خوب! تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں...... جب یسوع نے دیکھا کہ اس نے دانائی سے جواب دیا تو اس نے کہا تو خدا کی بادشاہی سے دور نہیں۔[2]

''اور دیکھو ایک عالم شرع اٹھا اور یہ کہہ کر اس کی آزمائش کرنے لگا کہ اے استاد میں کیا کروں کہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث بنوں۔ اس نے اس سے کہا: تورات میں کیا لکھا ہے، تو کیا پڑھتا ہے؟ اس نے کہا کہ خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ اور اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ اس نے اس سے کہا: تو نے ٹھیک جواب دیا، یہی کر تو جیئے گا۔''[3]

اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ انسان تجھ خدائے واحد اور برحق کو جانے اور مسیح کو تیرا بھیجا ہوا (یعنی رسول یقین کرے)۔''[4]

خدا کی صفات

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک ازلی بادشاہ یعنی غیر مرئی واحد خدا (۱ تمتھیس ۱:۱۷) کی تعلیم دی ہے جو اوّل اور آخر ہے جس کی ''ان دیکھی صفتیں یعنی اس کی ازلی قدرت اور الوہیت دنیا کی چیزوں کے

---

[1] متی باب ۴ آیات ۱۰، ۱۱۔
[2] مرقس باب ۱۲ آیات ۲۸ تا ۳۲، ۳۴۔
[3] لوقا باب ۱۰ آیات ۲۵ تا ۲۸۔
[4] یوحنا باب ۱۷ آیت ۳۔

ذریعہ سے صاف نظر آتی ہے۔" (رومیوں ۱:۲۰) اس سے مخلوقات کی کوئی چیز چھپی نہیں بلکہ جس سے ہم کو کام ہے اس کی نظروں میں سب چیزیں کھلی اور بے پردہ ہیں۔ (عبرانیوں ۴:۱۳) "وہ قادر مطلق ہے اس کے کام بڑے اور عجیب ہیں۔" (مکاشفہ ۱۵:۳) وہی تمجید اور عزت اور قدرت کے لائق ہے کیونکہ اسی نے ساری چیزیں پیدا کیں۔ (مکاشفہ ۴:۱۱) "وہ انسانوں کا روز قیامت میں حساب کرے گا۔ (رومیوں باب ۲ آیات ۵۔۶)

"خدا کی حمد ہو جو رحمتوں کا باپ ہے۔" (کرنتھیوں ۱:۳) خدا ظالم بھی ہے۔ "ہمارا خدا بھسم کر دینے والی آگ ہے۔ (استثناء ۴:۲۴، عبرانیوں ۱۲:۲۹)

"جس خدا نے دنیا اور اس کی ساری چیزوں کو پیدا کیا۔ وہ آسمان اور زمین کا مالک ہو کر ہاتھ کے بنائے ہوئے مندروں میں نہیں رہتا نہ کسی چیز کا محتاج ہو کر آدمیوں کے ہاتھوں سے خدمت لیتا ہے کیونکہ وہ تو خود سب کو زندگی اور سانس اور سب کچھ دیتا ہے اور اس نے ایک ہی اصل سے آدمیوں کی ہر ایک قوم تمام روئے زمین پر رہنے کے لیے پیدا کی اور ان کی معیادیں اور سکونت کی حدیں مقرر کیں تاکہ خدا کو ڈھونڈیں۔ شاید کہ ٹٹول کر اسے پائیں ہر چند کہ وہ ہم میں کسی سے دور نہیں کیونکہ اس میں ہم جیتے اور چلتے پھرتے اور موجود ہیں۔ (اعمال باب ۱۷ آیات ۲۴۔۲۸)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے رسول تھے

اناجیل سے یہ بات عیاں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو رسول کہا ہے کتاب مقدس میں لکھا ہے:

"یسوع نے آنکھیں اٹھا کر کہا: اے باپ میں تیرا شکر کرتا ہوں کہ تو نے میری سن لی اور مجھے تو معلوم تھا کہ تو ہمیشہ میری سنتا ہے۔ مگر ان لوگوں کے باعث جو آس پاس کھڑے ہیں۔ میں نے کہا تاکہ وہ ایمان لائیں کہ تو ہی نے مجھے بھیجا ہے۔[1]

اس آیت میں حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے تئیں خدا کا مقرب بندہ اور رسول بیان کیا ہے۔ جس کی دعا کو اللہ تعالیٰ شرف قبولیت بخشتا ہے۔

"یسوع نے پکار کر کہا کہ جو مجھ پر ایمان لاتا ہے وہ مجھ پر نہیں بلکہ میرے بھیجنے والے پر ایمان لاتا ہے۔"[2]

"میں نے جو کچھ کہا اپنی طرف سے نہیں بلکہ باپ جس نے مجھے بھیجا ہے اس نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ کیا کہوں اور کیا بولوں اور میں جانتا ہوں اس کا حکم ہمیشہ کی زندگی ہے۔"[3]

1۔ یوحنا باب ۱۱ آیات ۴۱، ۴۲۔ 2۔ یوحنا باب ۱۲ آیت ۴۴۔

3۔ یوحنا باب ۱۲ آیت ۴۹، ۵۰۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے واضح الفاظ میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ خدا کے فرستادہ ہیں، جو کچھ وہ کہتے اور بولتے ہیں خدا کے حکم کے ماتحت کہتے اور بولتے ہیں۔

''میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ جو میرے بھیجنے والے کو قبول کرتا ہے۔ وہ مجھے قبول کرتا ہے اور جو مجھے قبول کرتا ہے وہ میرے بھیجنے والے کو قبول کرتا ہے۔ وہ مجھے قبول کرتا ہے او جو مجھے قبول کرتا ہے وہ میرے بھیجنے والے کو قبول کرتا ہے۔''[1]

''جس طرح باپ نے مجھے حکم دیا میں ویسا ہی کرتا ہوں۔''[2]

''اور جب یسوع گدھے پر سوار ہو کر یروشلم میں داخل ہوا تو سارے شہر میں ہل جل پڑ گئی اور لوگ کہنے لگے یہ کون ہے۔ بھیڑ کے لوگوں نے کہا یہ گلیل کے ناصرہ کا نبی یسوع ہے۔''[3]

توبہ کی تلقین

حضرت مسیح علیہ السلام نے یہود کو توبہ اور استغفار کرنے کی بہت تلقین فرمائی، اور کہا کہ انسان توبہ کے ذریعہ ہی اپنے گناہوں کے دھبوں کو دھو سکتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر نبی نے انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کا کیمیا نسخہ توبہ ہی بتایا ہے۔ کتاب مقدس میں لکھا ہے:

''اس وقت سے یسوع نے منادی کرنا اور یہ کہنا شروع کیا کہ توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آئی ہے۔''[4]

توبہ سے خدا تعالیٰ خوش ہوتا ہے۔

''جس طرح ایک گڈریا ایک گم شدہ بھیڑ کو واپس پا کر خوش ہوتا ہے۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ اسی طرح ننانوے راست بازوں کی نسبت جو توبہ کی حاجت نہیں رکھتے ایک توبہ کرنے والے گناہگار کے باعث آسمان پر زیادہ خوشی ہوگی۔''[5]

توبہ سے ہی جنت حاصل ہوتی ہے۔

''یسوع نے ان سے کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ محصول لینے والے اور کسبیاں تم سے پہلے خدا کی بادشاہی میں داخل ہوتے ہیں کیونکہ یوحنا راست بازی کے طریق پر تمھارے پاس آیا اور تم نے اس کا یقین نہ کیا مگر محصول لینے والوں اور کسبیوں نے اس کا یقین کیا اور تم یہ دیکھ کر پیچھے بھی نہ پچھتاتے کہ اس کا یقین کر لیتے۔''[6]

''یسوع نے ایک بچے کو پاس بلا کر اسے ان کے بیچ میں کھڑا کیا اور کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ

---

[1] یوحنا باب ۱۳ آیت ۲۰۔ [2] یوحنا باب ۱۴ آیت ۳۱۔
[3] متی باب ۲۱ آیت ۱۱۔ [4] متی باب ۴ آیت ۱۷۔
[5] لوقا باب ۱۵ آیت ۷۔ [6] متی باب ۲۱ آیات ۳۱، ۳۲۔

اگر تم توبہ نہ کرو اور بچوں کی مانند نہ بنو تو آسمان کی بادشاہی میں ہرگز داخل نہ ہو گے۔"[1]

نجات اعمال پر ہے

ہر نبی نے نجات حاصل کرنے کے لیے ایمان اور خدا کے احکام کی پابندی پر زور دیا ہے۔ اسی اصول کی تبلیغ حضرت مسیح علیہ السلام نے کی۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اعمال صالح کے بجالانے پر زور دیتے ہوئے فرمایا:

"جب تم میرے کہنے پر عمل نہیں کرتے تو کیوں مجھے خداوند خداوند کہتے ہو۔ جو کوئی میرے پاس آتا اور میری باتیں سن کر ان پر عمل کرتا ہے میں تمھیں جتاتا ہوں کہ وہ کس کی مانند ہے۔ وہ اس آدمی کی مانند ہے جس نے گھر بناتے وقت زمین گہری کھود کر چٹان پر بنیاد ڈالی جب رو آئی تو دھارا اس گھر پر زور سے گری مگر اسے ہلا نہ سکی...... لیکن جو سن کر عمل میں نہیں لاتا وہ اس آدمی کی مانند ہے جس نے زمین پر گھر کو بے بنیاد بنایا، جب دھارا اس پر زور سے گری تو وہ فی الفور گر پڑا اور وہ گھر بالکل برباد ہوا۔"[2]

"اور دیکھو کہ ایک شخص نے پاس آ کر یسوع سے کہا: اے استاد! میں کون سی نیکی کروں تاکہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں۔ اس نے کہا تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے۔ نیک تو ایک ہی ہے یعنی خدا۔ لیکن اگر تو زندگی میں داخل ہونا چاہتا ہے تو حکموں پر عمل کر...... اس نے کہا: میں نے ان سب احکام پر عمل کیا اب مجھ میں کس بات کی کمی ہے؟ یسوع نے اس سے کہا: اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا اپنا مال و اسباب بیچ کر غریبوں کو دے، تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا۔"[3]

"(نیکی نہ کرنے والے) ہمیشہ کی سزا پائیں گے مگر راست باز ہمیشہ کی زندگی پائیں گے۔"[4]

گناہ جہنم کا موجب ہے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جس طرح احکام الٰہی کی پیروی کرنے کو ابدی اور حقیقی زندگی کے حصول کا ذریعہ ٹھہرایا ہے۔ اسی طرح گناہ کو جہنم کا وسیلہ قرار دیا ہے فرماتے ہیں۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو...... تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو...... اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟"[5]

"فرشتے بدکاروں کو اس کی بادشاہی میں سے جمع کریں گے اور ان کو آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے، وہاں رونا اور دانت پیسنا ہوگا۔ اس وقت راست باز لوگ اپنے باپ کی بادشاہی میں آفتاب کی مانند چمکیں گے۔"[6]

1۔ متی باب ۱۸ آیات ۲، ۳۔
2۔ لوقا باب ۶ آیات ۴۶ تا ۴۹۔
3۔ متی باب ۱۹ آیات ۱۶ تا ۲۱۔
4۔ متی باب ۲۵ آیت ۴۶۔
5۔ متی باب ۲۳ آیات ۲۹ تا ۳۳۔
6۔ متی باب ۱۳ آیات ۴۱ تا ۴۳۔

''اے سانپ کے بچو! تم برے ہو کر کیوں کر اچھی باتیں کہہ سکتے ہو کیونکہ جو دل میں بھرا ہے وہی منہ پر آتا ہے۔ اچھا آدمی اچھے خزانے سے اچھی چیزیں نکالتا ہے۔ اور برا آدمی برے خزانے سے بری چیزیں نکالتا ہے اور میں تم سے کہتا ہوں جو نکمی بات لوگ کہیں گے عدالت کے دن اس کا حساب دیں گے کیونکہ تو اپنی باتوں کے سبب سے راست باز ٹھہرایا جائے گا اور اپنی باتوں کے سبب سے قصوروار ٹھہرایا جائے گا۔''[1]

''جو مجھ سے اے خداوند اے خداوند کہتے ہیں ان میں سے ہر ایک آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگا مگر وہی جو میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلتا ہے...... اس وقت میں ان سے صاف کہہ دوں گا کہ میری کبھی تم سے واقفیت نہ تھی۔ اے بدکارو! میرے پاس سے چلے جاؤ۔ پس وہ جو کوئی میری باتیں سنتا اور ان پر عمل کرتا ہے وہ عقل مند ہے...... اور جو کوئی میری یہ باتیں سنتا ہے اور ان پر عمل نہیں کرتا وہ بے وقوف ہے۔''[2]

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ عیسائیوں نے جو نجات کا ذریعہ کفارہ ٹھہرالیا ہے وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے فرمودات کے خلاف ہے۔ نجات کا دار و مدار صرف ایمان اور احکام الٰہی کی پیروی اور گناہوں سے اجتناب پر ہے۔

اخلاقی تعلیم

اس عہد کے یہودی خدا کو محض منتقم خیال کرنے لگ گئے تھے جو باپ دادا کے گناہوں کی سزا اولاد کی تیسری اور چوتھی پشت تک دیتا تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے خدا کی محبت پر بہت زور دیا۔ اسے بنی آدم کا باپ کہا۔ خدا کی محبت کو بعض اچھوتی تمثیلوں کے ذریعہ بیان کیا اور یہود کو عفو و درگزر کرنے کی تعلیم دی فرماتے ہیں:

''مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، جو حلیم ہیں، جو راست بازی کے بھوکے اور پیاسے ہیں، جو رحم دل ہیں، جو پاک دل ہیں، جو صلح کراتے ہیں، جو راست بازی کے سبب ستائے گئے۔''[3]

''اس وقت پطرس نے پاس آکر اس سے کہا: اے خداوند! اگر میرا بھائی میرا گناہ کرتا رہے تو میں کتنی دفعہ اسے معاف کروں، کیا سات بار؟ یسوع نے اس سے کہا میں تجھ سے یہ نہیں کہتا کہ سات بار بلکہ سات دفعہ کے ستر بار تک۔ پس آسمان کی بادشاہی اس بادشاہ کی مانند ہے جس نے اپنے نوکروں سے حساب لینا چاہا...... مالک نے ترس کھا کر اسے چھوڑ دیا اور اس کا قرض بخش دیا...... جس شخص نے اپنے بھائی کا سو دینار نہ بخشا تھا اس کے مالک نے خفا ہو کر اس کو جلادوں کے حوالے کر دیا کہ جب تک تمام قرض ادا نہ کرے قید میں رہے۔ میرا آسمانی باپ بھی تمھارے ساتھ اسی طرح کرے گا، اگر تم میں سے ہر ایک اپنے بھائی کو دل سے معاف نہیں کرے گا۔''[4]

''تم میں ایسا کون سا آدمی ہے کہ اس کا بیٹا اس سے روٹی مانگے تو وہ اسے پتھر دے یا اگر مچھلی

1۔ متی باب ۱۲ آیات ۳۴ تا ۳۷۔ 2۔ متی باب ۶ آیات ۲۱ تا ۲۶۔

3۔ متی باب ۵ آیت ۱ تا ۱۰۔ 4۔ متی باب ۱۸ آیات ۲۱ تا ۳۵۔

مانگے تو اسے سانپ دے؟ پس جب کہ تم برے ہو کر اپنے بچوں کو اچھی چیزیں دینا جانتے ہو تو تمہارا باپ جو آسمان پر ہے اپنے مانگنے والوں کو اچھی چیزیں کیوں نہ دے گا؟ پس جو تم چاہتے ہو کہ لوگ تمھارے ساتھ کریں وہی تم بھی ان کے ساتھ کرو کیونکہ توریت اور نبیوں کی تعلیم یہی ہے۔[1]

''اے ہمارے باپ! تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور جس طرح ہم نے اپنے قصورواروں کو معاف کیا ہے۔ تو بھی ہمارے قصور معاف کر اور ہمیں آزمائش میں نہ لا...... اس لیے کہ اگر تم آدمیوں کے قصور معاف کرو گے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تم کو معاف کرے گا اور اگر تم نہ کرو گے تو تمہارا باپ بھی تمھارے قصور معاف نہ کرے گا۔[2]

اخلاقی تعلیم کا اُصول

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس خلق حسنہ کو اللہ کے ہاں مقبول قرار دیتے ہیں جو ریاکاری اور دکھاوے سے پاک ہو۔ فرماتے ہیں:

''خبردار اپنے راست بازی کے کام آدمیوں کے سامنے دکھانے کے لیے نہ کریں، نہیں تو تمھارے باپ کے پاس جو آسمان میں ہے تمھارے لیے کچھ اجر نہیں ہے۔ پس جب تو خیرات کرے تو اپنے آگے نرسنگا نہ بجوا، جیسا ریاکار عبادت خانوں اور کوچوں میں کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کی بڑائی کریں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے بلکہ جب تو خیرات کرے تو جو تیرا داہنا ہاتھ کرتا ہے اسے تیرا بایاں ہاتھ نہ جانے تاکہ تیری خیرات پوشیدہ رہے۔ اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلہ دے گا۔'' (متی باب ۶ آیات ۱ تا ۴)

معاشرتی تعلیم

حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے قبل محبت کا پودا مرجھا چکا تھا آپ نے اس پودے کو ازسرِنو شاداب کیا اور معاشرے کی بنیاد محبت پر رکھی۔

شریر کا مقابلہ نہ کرنے کی تعلیم

''اور تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا تھا کہ خون نہ کرنا، اور جو کوئی خون کرے گا وہ عدالت کی سزا کے لائق ہوگا اور میں تم سے کہتا ہوں جو کوئی اپنے بھائی پر غصے ہوگا وہ عدالت کی سزا کے لائق ہوگا اور جو کوئی اپنے بھائی کو پاگل کہے گا وہ صدر عدالت کی اور جو کوئی اسے احمق کہے گا وہ آتش جہنم کا سزاوار ہوگا۔ تم سن چکے ہو کہ تم سے کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، لیکن میں سے کہتا ہوں کہ شریر کا

---

[1] متی باب ۷ آیت ۹ تا ۱۲۔ [2] متی باب ۶ آیات ۹ تا ۱۵۔

مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی نالش کر کے تیرا کرتہ لینا چاہتا ہے تو چغہ بھی اسے لینے دے۔ اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا جو کوئی تجھ مانگے اسے دے اور جو کوئی تجھ سے قرض چاہے اس سے منہ نہ موڑ۔''[1]

پڑوسی کی عزت کرنے کی تعلیم

''تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھ اور اپنے دشمنوں سے عداوت۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لیے دعا کرو تا کہ تم اپنے باپ کے جو آسمان میں ہے بیٹے ٹھہرو۔''[2]

غیر محرم عورت کی طرف بری نظر سے دیکھنا

''تم اگلے لوگوں سے سن چکے ہو کہ زنا بہت پاپ ہے۔ لیکن میں کہتا ہے کہ جو شخص پرائی عورت کی طرف بری نظر سے دیکھتا ہے وہ دل میں زنا کا مرتکب ہو چکا۔ اس لیے اگر تمہاری آنکھ یا ہاتھ ایسی حرکت کرے تو اسے کاٹ کر پھینک دے۔''[3]

ماں باپ کی عزت کرنے کی تعلیم

''تم لوگ خدا کے حکم تو باطل کرتے ہو اور اپنے گھڑے ہوئے قوانین برقرار رکھتے ہو۔ خدا نے تورات میں حکم دیا تھا کہ ماں باپ کی عزت کرو اور جو کوئی ماں باپ کو برا کہے وہ جان سے مارا جائے مگر تم کہتے ہوں کہ جو شخص اپنی ماں یا باپ سے یہ کہہ دے کہ میری جو خدمت تمھارے کام آ سکتی تھی انھیں میں خدا کی نذر کر چکا ہوں، اس کے لیے بالکل جائز ہے کہ پھر ماں یا باپ کی کوئی خدمت نہ کرے۔''[4]

غرباء کو خیرات اور صدقہ دینے کی تعلیم

ایک دولت مند شخص حضرت مسیح علیہ السلام کے پاس آیا اور پوچھا کہ اے نیک استاد! میں کون سا نیک کام کروں کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: اگر تو کامل ہونا چاہے تو جا کے سب کچھ جو تیرا ہے بیچ ڈال اور محتاجوں کو دے۔ تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا۔ تب آ کے میرے پیچھے ہو لے۔''[5]

---

1. متی باب ۵ آیات ۲۱، ۲۲ اور ۳۸ تا ۴۲۔
2. متی باب ۵ آیات ۴۳، ۴۴۔
3. متی باب ۵۔
4. متی ۱۵: ۳۔۹۔ مرقس ۷: ۱۵۔۱۳۔
5. متی ۱۹ آیت ۲۔

تعلیم مسیح علیہ السلام کے متعلق علماء یورپ کا خیال

موسیو رینان اپنی کتاب ''حیات مسیح'' میں لکھتا ہے:

''(حضرت) مسیح علیہ السلام کی تعلیم میں عملی اخلاقیات یا شرعی قوانین کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ صرف ایک مرتبہ شادی کے بارے میں آپ نے حتمی طور پر کچھ فرمایا اور طلاق کی ممانعت کی۔''[1]

اناجیل کی تعلیم کے متعلق جوڈ لکھتا ہے:

''سیاسی اور اقتصادی معاملات کے متعلق (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی تعلیم افسوس ناک حد تک مبہم ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسیحی علماء سرمایہ داری، استعماریت، غلامی، جنگ، قید و بند دشمنوں کو زندہ جلانا اور تکالیف دینا غرض کہ جس چیز کو چاہیں بلا دقت مسیح کی تعلیم ثابت کر سکتے ہیں۔'' (صفحہ ۲۳۱)

عبادات

اصول عبادت

مسٹر ریمنڈ ابا (Raymond Abba) نے عیسائی مذہب کی عبادت کے چار اصول بیان کیے ہیں۔

۱۔ ''عبادت'' درحقیقت اس قربانی کا شکرانہ ہے ''جو کلمۃ اللہ'' یعنی حضرت مسیح علیہ السلام نے بندوں کی طرف سے دی تھی۔[2]

۲۔ صحیح عبادت روح القدس ہی کے عمل سے ہو سکتی ہے۔ پولوس رومیوں کے نام اپنے خط میں لکھتا ہے۔

''جس طور سے ہمیں دعا کرنی چاہیے ہم نہیں جانتے، مگر روح خود ایسی آہیں بھر بھر کر ہماری شفاعت کرتا ہے جن کا بیان نہیں ہو سکتا۔'' (رومیوں ۸:۲۶)

۳۔ عبادت ایک اجتماعی عمل ہے جو صرف کلیسا ہی انجام دے سکتا ہے اگر کوئی شخص انفرادی طور پر عبادت کرنا چاہے تو وہ بھی اسی وقت ممکن ہے جب وہ کلیسا کا رکن ہو۔

۴۔ عبادت کلیسا کا بنیادی کام ہے اور اسی کے ذریعے وہ ''مسیح کے بدن'' کی حقیقت سے دنیا کے سامنے پیش ہوتا ہے۔

عبادت کے طریقے

عیسائی مذہب میں عبادت کے کئی طریقے ہیں لیکن یہاں مروجہ طریقہ بیان کیا جاتا ہے۔

[1] حیات مسیح ۲۱۳۔ [2] Principles of Chrisian Worship 196 P.3

حمد خوانی

مسٹر ایف۔ سی برکت (F.C.Burkit) کے بیان کے مطابق اس عبادت کا طریقہ یہ ہے کہ لوگ صبح و شام کلیسا میں اکٹھے ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک بائبل کا ایک حصہ پڑھتا ہے۔ یہ حصہ عام طور پر زبور کا کوئی ٹکڑا ہوتا ہے۔ زبور خوانی کے دوران تمام حاضرین کھڑے رہتے ہیں۔ زبور کے ہر نغمے کے اختتام پر گھٹنے جھکا کر دعا کی جاتی ہے۔ اور اس دعا کے موقع پر گناہوں کے اعتراف کے طور پر آنسو بہانا بھی ایک پسندیدہ فعل ہے۔ یہ طریقہ تیسری صدی عیسوی سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ اتہانی شیس کی بعض تحریریں ابھی تک باقی ہیں جن میں اس طریقے کی تلقین کی گئی ہے۔[1] اس کے بعد یہ دعا کی جاتی ہے۔

''اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے۔ تیرا نام مقدس ہو۔ تیری بادشاہت آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر ہے زمین پر بھی پوری ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے۔ اور ہمارے قرض ہمیں معاف کر، جیسے ہم بھی اپنے قرض داروں کو معاف کرتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں مت ڈال بلکہ برائی سے بچا کیونکہ بادشاہت اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرا ہی ہے۔ آمین۔''

روزہ

انجیل سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن تک جنگل میں روزہ رکھا۔ متی انجیل میں لکھا ہے: اور جب چالیس دن اور چالیس رات روزہ رکھ چکا آخر کو بھوکا ہوا۔''[2]

متی انجیل ۶:۱۶ میں لکھا ہے: ''جب تم روزہ رکھو ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ۔''

''متی ۶:۱۸ میں روزہ کے ثواب کا ذکر ہے: ''اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے آشکار تجھے بدلہ دے۔''

لوقا ۵:۳۳۔۳۵ سے ثابت کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا تھا کہ ان کے شاگردان کے بعد بہت روزے رکھیں گے۔ پر وے دن آویں گے کہ دولہا ان سے جدا کیا جائے گا ان دنوں میں وے البتہ روزہ رکھیں گے۔''

زکوٰۃ

انجیل لوقا (۱۸۔۱۰) میں ہے: ''جو اپنا عشر (زکوٰۃ) ریا، نمائش اور فخر کے لیے دیتا ہے۔ اس سے وہ شخص بہتر ہے جو اپنے قصور پر نادم ہے۔''

اسی انجیل کے ۲۱ویں باب کی پہلی آیت میں ہے:

---

1. The Christian Religion PP 152, 13V.3 Cambridge 1930.
2. متی ۴:۲۔

''اگر کوئی دولت مند ہیکل کے خزانہ میں اپنی زکوٰۃ کی بڑی رقم ڈالے اور اس کے مقابلہ میں کوئی غریب بیوہ خلوص دل سے دو دمڑی ڈالے تو اس کی زکوٰۃ کا رُتبہ اس دولت مند کی زکوٰۃ سے کہیں بڑھ کر ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خود اپنی طرف سے نیز اپنے رفیق کی طرف سے آدھے مثقال والی زکوٰۃ ادا کی۔ (متی ۱۷۔۲۴)

زکوٰۃ نہ دینے والے دولت مندوں کے متعلق عذاب الیم کی بشارت!

حضرت عیسیٰ علیہ السلام دولت مندوں کو مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزر جانا آسان ہے مگر دولت مند کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے۔'' (متی ۱۹۔۲۴)

قرآن مجید میں آتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَاَوْصَانِي بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَادُمْتُ حَيًّا (مریم ۱۹:۳۱) اور مجھے نماز اور زکوٰۃ کا تاکیدی حکم دیا ہے جب تک میں زندہ رہوں۔

دوسری جگہ روزہ کی فرضیت سے متعلق ارشاد الٰہی ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ ۲:۱۸۳) مسلمانوں تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا۔

حواری

حواری حور سے مشتق ہے۔ حور کے معنی ہیں: ایک چیز سے لوٹ آنا یا ایک چیز کی طرف لوٹ جانا اور اسی سے یحور ہے۔ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ (الانشقاق ۸۴۔۱۴) اور تحاور جو ایک دوسرے کی طرف کلام کو لوٹانے کا نام ہے۔

وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا (المجادلہ ۵۸۔۱) حور اصل میں سفیدی کو کہتے ہیں اور حَوْرَاء اس عورت کو کہا جاتا ہے جس کی آنکھ کی سفیدی اعلیٰ درجہ کی سفید اور سیاہی شدت سے سیاہ ہو اور جس کا رنگ بھی سفید ہو۔ ابن اثیر اور راغب کے نزدیک لفظ حواری اسی سے مشتق ہے۔ یہ لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب پر بولا گیا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ حواری قصار کو کہتے ہیں یعنی جو کپڑے دھو کر ان کو سفید کرتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے اصحاب کو حواری اس وجہ سے نام دیا گیا کہ ان میں سے اکثر دھوبی تھے۔ دوسری توجیہہ یہ بھی ہے کہ یہ لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے لوگوں کے دلوں کو گناہوں کی میل سے صاف کر دیا کرتے تھے۔ حواری کے معنی مددگار اور ناصح کے بھی آتے ہیں جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔ والزبير ابن عمتي و حواري من أمتي یعنی زبیر میری پھوپھی کا بیٹا ہے اور میری امت سے میرا حواری ہے۔ زجاج کا قول لسان العرب میں منقول ہے کہ الحواريون خلصان الانبياء وصفواتهم یعنی

نبیوں کے خالص اور برگزیدہ دوست حواری کہلاتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ اپنی خلوص نیت اور پاکیزہ کردار کی وجہ سے حواری کہلائے۔

عیسائی حواریوں کو ''شاگرد'' کہتے ہیں۔ یہ اصل کے اعتبار سے ''حبور'' عبرانی لفظ ہے جس کے معنی شاگرد کے ہیں اور اس کی جمع حبوریم آتی ہے۔ یہی حبوریم عربی میں جا کر حوار اور حوارین بن گیا۔

حواریوں کے نام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری بارہ تھے، جن کے نام اناجیل میں حسب ذیل ہیں:

۱۔ سمعون جو پطرس کہلاتا تھا۔ ۲۔ اس کا بھائی اندرادس۔ ۳۔ زبدی کا بیٹا یعقوب۔ ۴۔ اس کا بھائی یوحنا۔ ۵۔ فیلپس۔ ۶۔ (برتلمائی) برثولماوس۔ ۷۔ توما۔ ۸۔ متی۔ ۹۔ حلفی کا بیٹا یعقوب۔ ۱۰۔ لباوس (ملقب بہ تداوس) ۱۱۔ سمعان القانوی۔ ۱۲۔ یہوداا سکریوطی۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی وعظ کے لیے ہدایات

حضرت مسیح علیہ السلام نے حواریوں کو یہ حکم دیا: ''انھیں حکم دے کر کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا اور چلتے چلتے یہ منادی کرنا کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آ گئی ہے۔''

حواریوں کے کام

حواریوں کا یہ کام قرار دیا گیا: بیماروں کو اچھا کرنا۔ مردوں کو جلانا، کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا۔ بدروحوں کا نکالنا۔'' اور انھیں یہ حکم تھا کہ اپنے پاس کچھ نہ رکھیں۔

''نہ سونا اپنے کمر بند میں رکھنا نہ چاندی نہ پیسے راستے کے لیے نہ جھولی لینا نہ دو دو کرتے نہ جوتیاں نہ لاٹھی۔''[1]

حواریوں کی ایمانی حالت بروئے اناجیل

یہوداہ اسکریوطی نے تیس روپے کی رقم لے کر اپنے مرشد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرا دیا تھا۔

یوحنا باب ۱۳ آیت ۲۶، ۲۷ میں لکھا ہے:

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نوالہ ڈبویا اور یہوداہ کو دیا اور اس نوالہ کے بعد شیطان اس میں سما گیا۔'' شیطان یا لالچ نے اس کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ ''تھوڑی سی رقم لے کر اپنے آقا کو گرفتار کرا دے۔''

اسی طرح پطرس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مخاطب فرما کر کہا: ''اے شیطان! میرے سامنے

[1] متی ۱۰: ۱۵۔ ۱۰

سے دور ہو جا۔"[1]

پطرس نے بھی اپنے آقا سے غداری کی اور لعنت بھیج کر یہ کہا کہ وہ اس شخص کو نہیں جانتا۔ انجیل میں لکھا ہے:

"پطرس لعنت کرنے اور قسم کھانے لگا کہ میں اس آدمی کو جس کا تم ذکر کرتے ہو نہیں جانتا۔"[2]

"پھر ان گیارہ کو بھی جب کھانا کھانے بیٹھے تھے، یسوع دکھائی دیا اور اس نے ان کی بے اعتقادی اور سخت دلی پر ان کو ملامت کی۔"[3]

یسوع نے پطرس کو مخاطب کر کے کہا:

"اے کم اعتقاد! تو نے کیوں شک کیا؟"[4]

تمام حواریوں کو مخاطب کر کے کہا:

"اے کم اعتقادو! تم آپس میں کیوں چرچا کرتے ہو کہ ہمارے پاس روٹی نہیں۔"[5]

"پھر ان سے کہا: تم کیوں ڈرتے ہو، اب تک ایمان نہیں رکھتے۔"[6]

"یسوع نے شاگردوں سے جواب میں کہا: اے بے اعتقادو اور کج رو قوم! میں کب تمہارے ساتھ رہوں گا اور تمہاری برداشت کروں گا۔"[7]

حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ملامت کی اور ان سے علیحدگی اختیار کر لی۔

"اس لیے اس کے شاگردوں میں سے بہتوں نے سن کر کہا کہ یہ کلام ناگوار ہے اسے کون سن سکتا ہے..... اس پر اس کے شاگردوں میں سے بہتیرے اس سے پھر گئے اور اس کے بعد اس کے ساتھ نہ رہے۔"[8]

"پطرس یسوع کو الگ لے گیا اور ملامت کرنے لگا۔"[9]

ان حوالہ جات سے حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں کی ایمانی حالت ظاہر ہو جاتی ہے۔ کہیں چند کوڑیوں کے بدلے اپنے آقا کو گرفتار کروا رہے ہیں، کہیں ان کو پہچاننے سے انکار کر رہے ہیں اور کہیں ہدف ملامت بنا رہے ہیں اور ان کے اس ضعف ایمان اور کج روی کی وجہ سے حضرت مسیح علیہ السلام ان کو بے اعتقاد اور کج رو قرار دے رہے ہیں۔

---

1. مرقس باب ۸ آیت ۳۳۔
2. مرقس باب ۱۴ آیت ۷۱۔
3. مرقس باب ۱۶ آیت ۱۴۔
4. متی باب ۱۴ آیت ۳۱۔
5. متی باب ۱۶ آیت ۸۔
6. مرقس باب ۴ آیت ۴۰۔
7. لوقا باب ۹ آیت ۴۱۔
8. یوحنا باب ۶ آیت ۶۰۔
9. مرقس باب ۸ آیت ۳۲۔

قرآن مجید کا عیسائیوں پر احسان

قرآن مجید نے حواریوں کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کو فرماں بردار قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

فَلَمَّا اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ. (آل عمران ۳:۵۲) پھر جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے کفر محسوس کیا تو کہا کون اللہ کے ساتھ میرے مددگار ہیں۔ حواریوں نے کہا ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم فرمانبردار ہیں۔

اس آیت میں قرآن مجید نے حواریوں کو مددگار اور فرمانبردار قرار دیا ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ. (الصف ۶۱:۱۴) اے ایمان والو تم اللہ کے مددگار بن جاؤ، جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا اللہ کے راستہ میں کون میرا مددگار ہے تو حواریوں نے کہا ہم اللہ کی راہ میں مددگار ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کو جو وفا اور ایثار کے پیکر تھے کہتا ہے کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں کی مانند انصار اللہ بن جائیں۔ اس سے بڑھ کر حواریوں کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ (المائدہ ۵:۱۱۱) اور جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔ انھوں نے کہا: ہم ایمان لائے اور گواہ رہ کہ ہم فرماں بردار ہیں۔

اس آیت میں حواریوں کے ایمان لانے اور پھر اس پر ثابت قدم رہنے اور احکام الٰہی کے سامنے سر جھکانے کا ذکر ہے۔

عہد نامہ جدید کی سرگزشت

بائبل کے دو حصے

بائبل عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید دو حصوں پر مشتمل ہے۔ یہود صرف عہد نامہ عتیق کو خدا کا کلام مانتے ہیں۔ عیسائی عہد نامہ عتیق کو منسوخ اور عہد نامہ جدید کو ناسخ مانتے ہیں۔ عہد نامہ جدید میں لکھا ہے: ''چنانچہ اپنا جسم دے کر دشمن یعنی شریعت کے حکموں اور رسموں کو کھو دیا۔[1] ''اس نے نیا کیا تو پہلے کو پرانا

[1] افیسوں ۲:۱۵۔

ٹھہرایا۔ پر وہ جو پرانا اور ادنیٰ ہے سو مٹنے کے قریب ہے۔"[1] "اس نے تمھارے سب گناہ بخش دیے اور حکموں کا نوشتہ جو ہمارا مخالف تھا ہماری بابت مٹا ڈالا۔"[2] "شریعت کی رو سے راست باز بننا چاہتے ہو تو مسیح سے جدا ہوئے تم فضل کی نظر سے گرے۔"[3]

عیسائیوں کے خیال میں عہد نامہ عتیق شریعت کا عہد ہے، یعنی اس عہد میں لوگ شریعت پر عمل کریں اور نجات حاصل کریں۔ عہد نامہ جدید فضل اور کفارہ کا عہد ہے کہ لوگ شریعت کو لعنت سمجھ کر مسیح کو لوگوں کے گناہوں کے فدیہ میں مصلوب سمجھیں اور نجات پائیں۔

انجیل کا اصل نام

انجیل یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کی یونانی شکل ایونجلیون (Evangelion) ہے۔ اصل زبان میں اس کا مفہوم ہے: وہ انعام جو خوش خبری پر عطا کیا جاتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی مادری زبان ارامی تھی نہ کہ یونانی۔ ارامی زبان سامی ہونے کی وجہ سے عبری اور عربی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ یونانی آرین سلسلہ کی زبان ہے اور بہت مختلف ہے۔ اس لیے مسیح کے پیغام کا ابتدائی نام انجیل نہ ہوگا۔ بشیرہ یا بشری ہوسکتا ہے۔ عہد نامہ عتیق میں یہ لفظ بار بار استعمال ہوا ہے۔[4]

انجیل کا نام، اس کی تدوین اور ترتیب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے بعد کوئی ایسی لکھی ہوئی کتاب چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔ جس کی حواری اشاعت کرتے۔ عہد نامہ جدید میں لفظ انجیل استعمال ہوا ہے لیکن ہر جگہ اس سے مراد خوش خبری ہے نہ کہ کتاب۔[5]

اب نئے ترجموں میں ان تمام حوالہ جات میں انجیل کی بجائے خوشخبری ترجمہ کیا گیا ہے۔

لفظ انجیل کتاب کے طور پر حضرت مسیح علیہ السلام سے ۱۵۰ بعد استعمال ہونے لگا۔ انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے:

"Thus was not till the middle of the second century that the word came to signify a book and even after that till the end of the 2nd century it continued to bear its original meaning as well."[6]

---

[1] عبرانیوں ۸:۱۳۔ [2] نامہ گلتیوں ۲:۱۴۔

[3] نامہ گلتیوں ۵:۱۴۔ [4] سموئیل دوم ۴:۱۰ اور ۱۸:۲۰ تا ۲۷ اور لفظ بشورہ کے مشتقات اسی معنی میں سموئیل اول ۳۱:۹ یسعیاہ ۴۱:۲۷ اور یرمیاہ ۲۰:۱۵ وغیرہ میں بارہا استعمال ہوا ہے۔

[5] متی ۴:۲۳،۱۴:۱،۱۱:۵۔ مرقس ۱:۱۵،۱۶، لوقا ۲:۱۰،۱۲ اور لوقا ۱۶،۱۶۔

[6] انسائیکلوپیڈیا ببلیکا صفحہ ۱۸۸۹ء۔

چنانچہ دوسری صدی کے وسط تک اس لفظ نے ''کتاب'' کے معنی اختیار کر لیے اور اس کے بعد دوسری صدی کے اختتام تک اپنے انہی اصل معنوں میں استعمال ہوتا رہا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد جعل سازی

حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد ہی جعل سازی، فریب کاری اور جعلی تصانیف کا بازار گرم ہو گیا تھا۔ پولوس کے تھسلنیکیوں کے نام دوسرے خط کے باب ۲ آیت ۲ میں ہے کہ ''تم اس خیال سے کہ مسیح کا دن آ پہنچا ہے جلد اپنے دل کی ڈھارس مت کھوؤ اور نہ گھبراؤ۔ نہ کسی روح، نہ کسی کلام، نہ کسی خط سے یہ سوچ کر کہ وہ ہماری طرف سے ہے کوئی تمھیں کسی طرف سے فریب نہ دے۔''

اس سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ پولوس کے زمانہ میں ہی جعلی خطوط کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا بلکہ ۲ کرنتھیوں کے باب ۱۱ آیت ۱۳، ۱۴ میں اس امر کی شہادت پائی جاتی ہے کہ پولوس کے زمانہ سے جھوٹے مدعیان رسالت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ چنانچہ اسکاٹ صاحب نے رومن تفسیر مطبوعہ الٰہ آباد ۱۸۶۶ء کے صفحہ ۱۸۶ پر لکھا ہے:

''نہ صرف جعلی مصنف بلکہ مسیح ہونے کا بہتوں نے دعویٰ کیا تھا۔ چنانچہ یوسف مورخ کتنوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ یوں لکھتا ہے کہ ملک جادوگروں اور دغابازوں سے بھر گیا۔ جنھوں نے بہتوں کو ورغلایا اور بیابان میں لے گئے تاکہ اپنی کرامتیں دکھلائیں۔ ان میں سے دوسیتھیوس سامری کا ذکر ہے جس نے اپنے آپ کو مسیح کہا اور شمعون مجوسی جو اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہتا تھا اور تھیوڈس جس نے بہت لوگوں کو دھوکا دے کر کہا کہ میں یردن ندی کو دو حصہ کر کے بیچ میں راستہ بنا دوں گا۔ القصہ چوبیس شخصوں کا ذکر ہے جنھوں نے اور دین قیصر کے وقت سے لے کر ۱۶۸۲ء تک مسیح ہونے کا دعویٰ کیا۔''

جعلی تصنیفات

جھوٹے مدعیان رسالت کے علاوہ دیندار عیسائیوں نے دین کے معاملات میں کذب بیانی کا شیوہ اختیار کر لیا تھا۔ اس بات کی تائید پولوس کی تحریر سے ملتی ہے۔ انھوں نے خط رومیوں کو بھیجا تھا اور جو مجموعہ عہد جدید میں شامل ہے اس کے باب ۳ آیت ۷، ۸ میں لکھا ہے:

''پھر اگر میرے جھوٹ کے سبب خدا کی سچائی اس کے جلال کے لیے زیادہ ظاہر ہوئی تو مجھ پر کیوں گنہگار کی طرح حکم ہوتا ہے اور ہم کیوں برائی نہ کریں تاکہ بھلائی نکلے۔ چنانچہ یہ تہمت ہم پر لگائی بھی جاتی ہے۔''

دوسری صدی عیسوی۔ کرذکر میں رومن تواریخ کلیسا مطبوعہ مرزاپور ۱۸۵۶ء کے صفحہ ۹۰ پر ذیل کی عبارت درج ہے:

دوسری صدی میں مسیحیوں میں گفتگو رہی کہ جب بت پرست فیلسوف اور حکیموں کے ساتھ دین کا مباحثہ کیا جاوے تو انھیں کے بحث کا طور اور طریقہ اختیار کرنا جائز ہے یا نہیں اور آخر کار اُرجن وغیرہ کی رائے کے بموجب طریقہ مذکور تسلیم ہوا۔ اس سے البتہ مسیحی بحاثون کی تیز عقلی اور نکتہ سنجی نے بحث میں زیادہ رونق پائی۔ لیکن راستی اور صفائی میں کچھ خلل پڑا۔ پھر اسی سبب سے بعضے لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ جعلی تصنیفات پیدا ہوئیں جو کہ اس زمانہ کے بعد کثرت سے لکھی گئیں۔ اس طرح سے کہ جب فیلسوف لوگ کسی طریقہ کی پیروی کرتے تھے تو کبھی کبھی اس کے حق میں کتاب لکھ کر کسی معروف حکیم کے نام سے اجرا کرتے تھے کہ اس حیلے سے لوگ اس پر متوجہ ہو کر اس کی باتیں زیادہ مانیں، اگرچہ اس کی باتیں برملا خود مصنف کی ہوتیں۔ سو اسی طرح مسیحی جو فیلسوفوں کی طرح بحث کرتے تھے کتاب لکھ کر کسی حواری یا خادم حواری یا معروف اسقف کے نام سے رواج دیتے تھے۔ ایسا دستور تیسری صدی میں شروع ہوا اور کئی سو برس تک رومی کلیسا میں جاری رہا۔ یہ بات بہت ہی خلاف حق اور قابل الزام شدید تھی۔"

بارن صاحب اپنی تفسیر کی دوسری جلد کے صفحہ ۳۳۱ پر لکھتے ہیں:

"بلاشبہ بعض خرابیاں (یعنی تحریفیں) جان بوجھ کر ان لوگوں نے کی ہیں جو کہ دیندار مشہور تھے اور اس کے بعد انہی خرابیوں کو ترجیح دی جاتی تھی، تاکہ اپنے مطلب کو قوت دیں یا اعتراض اپنے پر نہ آنے دیں۔"

عیسائی مصنفین کے نزدیک جعلی تصنیفات کی وجوہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ عیسائیوں کے ہر فرقے نے اپنے مسلک کی تائید میں کسی حواری یا خادم حواری یا کسی بڑے شخص کے نام پر کتب لکھ کر شائع کر دیں۔

۲۔ جعلی مسیح اور جھوٹے مدعیان رسالت کی کثرت جعلی تصانیف میں اضافہ کا باعث ہوتی رہی۔

۳۔ دیندار لوگوں نے بھی دین کے معاملات میں جھوٹ بولنا جائز سمجھ لیا۔ اس بات کا اعتراف پولوس کو بھی ہے۔

ترتیب و تدوین کا نرالا طریقہ

جب مسیح فرقوں کے اصولی اختلاف اور انتشار کی وجہ سے جعلی اناجیل نویسی کا رواج عام ہو گیا تو ۳۲۵ھ میں قسطنطین اعظم نے ۳۰۰ پادریوں کی ایک کونسل بلائی تاکہ وہ اصل انجیل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحیح عقائد کا فیصلہ کرے۔ چنانچہ انھوں نے تاریخی اور عقلی دلائل کی روشنی میں اصل انجیل اور حضرت مسیح علیہ السلام کے صحیح عقائد کی تدوین کی بجائے ایک عجیب اور نرالا طریقہ اختیار کیا، وہ یہ کہ "کونسل میں جو اناجیل پیش کی گئی تھیں انھوں نے ان کو ایک بے ترتیب ڈھیر کی طرح گرجا کے اندر عشاء ربانی کی میز کے نیچے رکھ دیا اور خداوند سے درخواست کی کہ ان میں سے الہامی نوشتے پھلانگ کر میز پر آ جائیں اور جعلی نسخے میز کے نیچے پڑے رہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آ گیا۔"[1]

---

[1] The Apocryphal New Testament, صفحہ ۱۳ (دیباچہ)

چنانچہ قسطنطین اعظم نے چار اناجیل کے علاوہ باقی سینکڑوں نسخوں کو جعلی قرار دے کر جلا دینے کا حکم دے دیا بلکہ یہاں تک حکم دے دیا کہ جو شخص ایسی تحریر چھپا رکھے گا، یا جلا نہ دے گا، یا بادشاہ کی خدمت میں پیش نہ کرے گا اسے سزائے موت دی جائے گی۔ اس طرح سینکڑوں نسخے جلا دیے گئے۔

موشیم چرچ ہسٹری میں لکھا ہے:

''یہ احکام اس قدر ظالمانہ اور نامعقول تھے کہ بعد میں خود بادشاہ کو پچھتانا اور پشیمان ہونا پڑا۔ اس کونسل میں ایریس (Areis) فرقہ کے متعلق بادشاہ نے ان کی تحریرات جلا دینے اور ان کو جلاوطن کر دینے کا حکم دیا۔ مگر اس کے چند سال بعد ۳۲۰ء میں جب بادشاہ کی بہن نے اپنے بستر مرگ پر کہا کہ ایریس کے خلاف فیصلہ ظالمانہ تھا اور یہ فیصلہ اس کے دشمنوں کے تعصب کی وجہ سے ہوا نہ کہ صداقت کی بناء پر۔ اس پر شہنشاہ نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ مگر یہ حکم پہنچنے سے پہلے ایریس فوت ہو چکا تھا۔[1]

عہد جدید کی مشمولہ

عہد نامہ جدید میں ستائیس کتابیں شامل ہیں جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ متی کی انجیل۔ ۲۔ مرقس کی انجیل۔ ۳۔ لوقا کی انجیل۔ ۴۔ یوحنا کی انجیل۔ ۵۔ رسولوں کے اعمال۔ ۶۔ پولس رسول کا خط رومیوں کو۔ ۷۔ پولس رسول کا پہلا خط کرنتھیوں (قرنتیوں) کو۔ ۸۔ پولس رسول کا دوسرا خط قرنتیوں کو۔ ۹ پولس رسول کا خط گلتیوں کو۔ ۱۰۔ پولس رسول کا افسیوں کو۔ ۱۱۔ پولس رسول کا خط فلپیوں کو۔ ۱۲۔ پولس رسول کا خط قلسیوں کو۔ ۱۳۔ پولس رسول کا خط تھسلینکیوں کو۔ ۱۴۔ پولس رسول کا دوسرا خط تھسلینکیوں (تسلونیقیوں) ۱۵۔ پولس رسول کا پہلا خط تمطاؤس کو۔ ۱۶۔ پولس رسول کا دوسرا خط تمطاؤس کو۔ ۱۷۔ پولس رسول کا خط طِطُس کو۔ ۱۸۔ پولس رسول کا خط فلیموں کو۔ ۱۹۔ عبرانیوں کو خط۔ ۲۰۔ یعقوب کا خط۔ ۲۱۔ پطرس کا پہلا خط۔ ۲۲۔ پطرس کا دوسرا خط۔ ۲۳ تا ۲۷۔ یوحنا فقیہہ کے ۳ خطوط و مکاشفات اور یہوداہ کا ایک خط۔

اس منتخب مجموعہ کو پوپ گلاسیوس (۴۹۲ء لغایت ۴۹۶ء) نے باضابطہ طور پر سند قبول عطا کی اور عیسائیوں میں آج تک یہی مجموعہ مروج ہے۔

کتب غیر مشمولہ

عیسائی مفسرین و مصنفین کی تحریروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم ایک سو اٹھاون (۱۵۸) کتابیں ایسی ہیں جو کسی زمانہ میں معتبر اور مقدس سمجھی جاتی تھیں، مگر اب وہ محققین کے نزدیک جعلی اور مجموعہ عہد جدید سے خارج ہیں۔ ان کتب کے نام معلوم کرنے کے لیے حسب ذیل کتب کی طرف رجوع کیا جائے:

۱۔ انٹروڈکشن علوم بائبل از ہارن صاحب مطبوعہ لندن ۱۸۲۵ء جلد ۱۔

۲۔ ورکس از لارڈنر صاحب مطبوعہ لندن ۱۸۲۹ء جلد ۴۔

[1] صفحہ ۱۲۶ باب ۲ فصل ۵۔

۳۔ جارج سیل کی تحریریں مطبوعہ لندن ۱۸۶۱ء۔

۴۔ یسیو مواورا۔پوکریفل نیوٹسمنٹ مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء۔

۵۔ اخبار نور افشاں لودھیانہ کی اشاعت ۲۷ جولائی ۱۸۷۶ء کے صفحہ ۲۳۶ پر پادری ویری کا مضمون۔

ہارن صاحب نے اپنی کتاب جلد ا کے صفحہ ۶۴۲ پر لکھا ہے کہ کتب غیر مشمولہ میں چند ایسی بھی کتب تھیں جن کے متعلق یہ بیان کیا جاتا تھا کہ وہ خود حضرت مسیح علیہ السلام کی لکھی ہوئی تھیں۔ان کے نام یہ ہیں:

ا۔ نامہ بنام آبیگارس۔ ۲۔ نامہ بنام پطرو پال۔ ۳۔ کتاب تمثیلوں اور وعظ کی۔ ۴۔ کتاب مناجاتِ مسیح۔ ۵۔ کتاب سحر۔ ۶۔ کتاب پیدائش مسیح و مریم۔ ۷۔ نامے جو آسمان سے گرے۔ ۸۔ نامہ حضرت مسیح جو متی کیس نے پیدا کیا۔

رومن تواریخ کلیسا مطبوعہ مرزاپور ۱۸۵۶ء جلد ۲ کے صفحہ ۳۶ پر لکھا ہوا ہے کہ ۳۰۰ء میں مورخ یوسی بیس Eusi Bius نے شہر اویسہ کے شاہی دفتر میں دو خط پائے۔جن میں سے ایک خط ابگرس بادشاہ کی طرف سے مسیح کے نام تھا۔جس میں اس نے ایک شدید مرض میں اپنے مبتلا ہونے کا حال لکھ کر مسیح سے درخواست کی تھی کہ اسے تندرست کردے اور دوسرا خط مسیح کی طرف سے بادشاہ کے خط کا جواب تھا۔مسیح کا یہ خط بھی مروجہ کتب عہد جدید میں شامل نہیں۔

اخبار نور افشاں مورخہ ۹ جولائی ۱۸۷۴ء جلد ۲ نمبر ۲۸ صفحہ ۱۲۳ کالم ۳ میں پادری ویری لکھتا ہے۔

”جعلی انجیلوں کے موجود ہونے سے ہم ناواقف نہیں ہیں بلکہ جن جعلی انجیلوں کا ہارن صاحب نے اپنی تصنیف میں حوالہ دیا ہے وہ ہمارے پاس موجود ہیں ان کو بعض بدنیتوں نے مروج کرنا چاہا مگر وے اپنے فاسد ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔“

کتب عہد جدید پر تبصرہ

کتب مشمولہ عہد جدید مورخ یوسی بیس کے قول کے مطابق تین اقسام میں منقسم ہیں۔ایک وہ جن کی صحت اور معتبر ہونے پر سب کو اتفاق ہے،اس میں حسب ذیل کتب شامل ہیں:

اناجیل اربعہ۔رسولوں کے اعمال۔ پولوس کے چودہ خط۔ پطرس کا پہلا خط۔ یوحنا کا پہلا خط۔ یہ سب ۲۱ کتب ہوئیں۔ جن کی صحت پر عیسائیوں کا اتفاق ہے۔ یوسی بیس مکاشفات کی کتاب بھی اس میں شامل کر لیتا ہے۔

دوسری قسم کے بارہ میں یوسی بیس کہتا ہے کہ بعض ان کی صحت اور معتبر ہونے کے قائل ہیں اور بعض ان کی صحت میں شک کرتے ہیں اور صحت کے معیار سے گرا ہوا سمجھتے ہیں۔ اس میں یہ کتب شامل کی گئی ہیں:

یعقوب کا خط۔ یہوداہ کا خط۔ پطرس کا دوسرا خط اور تیسرا خط۔

تیسری قسم کے کتب کے بارہ میں سب کا اتفاق ہے کہ وہ غیر معتبر ہیں۔لیکن یوسی بیس کو یہ اخلاقی جرأت نہ ہوئی کہ مشمولہ کتب عہد جدید میں سے کسی کا نام داخل کرے لیکن مفتاح الکتاب کے مصنف نے لکھا

ہے کہ بعض نے اس نوع کی کتابوں میں اس خط کو جو عبرانیوں کے نام ہے اور یوحنا کے مکاشفات کو شامل کیا ہے۔ بہر حال مشکوک کتب سات ہیں، ان کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ یعقوب کا خط۔ ۲۔ یہوداہ کا خط۔ ۳۔ پطرس کا دوسرا خط۔ ۴۔ یوحنا کا دوسرا خط۔ ۵۔ یوحنا کا تیسرا خط۔ ۶۔ عبرانیوں کا خط۔ ۷۔ مکاشفات یوحنا۔

اب ہم ان کتب پر سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

انجیل متی

عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق متی کی انجیل سب سے پرانی ہے۔ یہ انجیل اصل میں عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی۔ لارڈنر نے اوریجن کے تین اقوال اپنی کتاب میں لکھے ہیں، جن سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ انجیل عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی۔ یوسی بیس اور اتھنا سیس اور سرل اور جروم سب اس امر پر متفق نظر آتے ہیں کہ یہ کتاب عبرانی زبان میں لکھی گئی۔ ہارن صاحب نے اپنی تفسیر میں تئیس (۲۳) علماء کے نام تحریر کیے ہیں جو اس امر کے قائل تھے کہ متی کی انجیل دراصل عبرانی زبان میں تھی۔

ریو صاحب اپنی تاریخ انجیل میں لکھتے ہیں:

''یہ بات غلط ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ متی نے انجیل یونانی میں لکھی تھی، کیونکہ یوسی بیس اور بہت سے عیسائی علماء نے لکھا ہے کہ متی نے انجیل عبرانی میں لکھی ہے نہ کہ یونانی ہیں۔''

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی جلد ۱۹ میں ہے:

''عہد جدید کی سب کتابیں یونانی میں لکھی گئیں الا انجیل متی اور نامہ عبرانیاں جن کا عبرانی زبان میں لکھا جانا بہ دلائل متیقن ہے۔

بعض محققین کا یہ خیال ہے کہ جس حصہ کا مولف حواری متی تھا وہ حصہ اسی زمانہ میں ضائع ہو گیا تھا۔ اب جو کچھ ہمارے ہاتھوں میں ہے اس کے مولف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔

عہد تالیف کے متعلق عام نظریہ یہ ہے کہ یہ ۶۱ء اور ۶۵ء کے درمیان میں تالیف ہوئی۔ لیکن پروفیسر ہارنک کی تحقیق کے مطابق اس کا زمانہ تالیف ۸۰ء اور ۱۰۰ء کے درمیان ہے۔ اس انجیل کا زمانہ تالیف ۶۱ء ہو یا ۱۰۰ء، تاریخ میں اس انجیل کا نشان ۱۷۳ء سے پہلے نہیں ملتا۔

انجیل مرقس

بعض مورخین کا یہ خیال ہے کہ سب سے قدیم انجیل مرقس کی انجیل ہے جس کا ذکر یوسی بیس (المتوفی ۳۴۰ء) نے اپنی تاریخ کلیسا میں کیا ہے۔ یوسی بیس لکھتا ہے کہ مرقس ایک یہودی الاصل یونانی تھا، پہلے پال اور برنباس کا رفیق تھا اور پھر ان سے علیحدہ ہو کر پطرس حواری کی خدمت میں رہنے لگا۔ لیکن ۶۴ء میں قیصر نیرو نے جب پطرس کو عیسائیوں کے قتل عام میں شہید کر ڈالا تو مرقس نے اس حادثہ کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کی سیرت لکھی۔

اسکاٹ صاحب اپنی رومن تفسیر کے صفحہ ۲۴۰ پر لکھتے ہیں:

"یہ بھی ٹھیک معلوم نہیں کہ کس وقت یہ صحیفہ لکھا گیا، مگر گمان غالب ہے کہ اس کی تصنیف ۵۶ء اور ۶۳ء کے درمیان ہوئی۔ سب متفق طور پر کہتے ہیں کہ شہر روم میں اس کی تصنیف ہوئی۔"

عیسائی علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مرقس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صحبت سے فیض حاصل نہیں کیا، بلکہ پطرس کی تبلیغی مساعی سے عیسائیت قبول کی۔ اس نے جو تعلیم پطرس سے حاصل کی اسے رومی یعنی لاطینی زبان میں لکھ کر شہر روم میں اس نے اپنی انجیل کو شائع کیا۔ لاطینی زبان والی انجیل مرقس ضائع ہو چکی ہے۔ اور اس کا یونانی ترجمہ موجود ہے۔

سینٹ ارینوس ۱۷۸ء میں لکھتے ہیں کہ "پطرس کے مرید اور مترجم مرقس نے بعد موت پطرس وہ چیزیں جو پطرس نے وعظ کی تھیں لکھ کر دیں۔"

یونانی ترجموں میں غلطیوں کے ہونے کا بھی عیسائی مصنفین کو اعتراف ہے۔ چنانچہ وارڈ صاحب اپنے اغلاط نامہ میں لکھتے ہیں کہ بقول جروم کے علماء متقدمین کو اس انجیل کے آخری باب کی صحت میں شبہ تھا۔ مرقس باب ۲ آیت ۲۶ میں جو لفظ ابیاتھر آیا ہے اس کی بابت یہی وارڈ صاحب اپنی کتاب کے صفحہ ۳۶ پر لکھتے ہیں: "مسٹر جوئیل اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ مرقس نے غلطی سے انیملک کی جگہ ابیاتھر لکھا ہے اور متی نے غلطی سے ذکریا کی جگہ یرمیاہ لکھا ہے۔"

انجیل لوقا

لوقا انطاکیہ کا رہنے والا ایک طبیب اور غیر یہودی مورخ تھا۔ اس سے دو کتب منسوب ہیں، ایک انجیل لوقا، دوسری رسولوں کے اعمال۔ بقول مصنف مفتاح الکتاب لوقا نے انجیل ۶۳ء کے قریب اور اعمال ۶۴ء کے قریب لکھے۔

لوقا مسیح کے حواریوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے خود ہی اپنی انجیل کی تمہید میں لکھا ہے کہ جنھوں نے مسیح کو دیکھا اور مسیح کی خدمت کی تھی ان سے پوچھ کر میں نے لکھا ہے۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں:

اوّل: لوقا حضرت مسیح علیہ السلام کی صحبت سے فیض یاب نہیں ہوا۔

دوم: اس کی انجیل کے ماخذ ان لوگوں کے اقوال ہیں جنھوں نے مسیح کی خدمت کی۔

عیسائی علماء لوقا کو پولوس کا شاگرد قرار دیتے ہیں۔ اُردو تاریخ کلیسا مجموعہ ۱۸۷۰ء کے صفحہ ۴۴ پر ہے:

"اور جب پلوس شہر تر واس میں گیا جو بحر روم کے ساحل پر واقع ہے تو یہاں اس سے اور لوقا سے ملاقات ہوئی اور اس وقت سے برابر لوقا پلوس کے ساتھ رہا۔"

پھر اسی صفحہ کے حاشیہ پر یہ عبارت ہے:

"یہ اس کی عبارت سے ظاہر ہے کیونکہ وہ اس کے بعد اعمال الرسل کے آخر تک صیغہ جمع استعمال

میں لاتا ہے۔ لوقا کی انجیل اور اعمال الرسل دونوں اسی کی تصنیف ہیں۔

انجیل لکھنے کی غرض وغایت

لوقا ایک رومن وزیر کو جس کا نام تھیفلس Theophilus تھا۔ پڑھایا کرتا تھا۔ اسے مخاطب کر کے اپنی انجیل تصنیف کرنے کی غرض وغایت ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

''چونکہ بہتوں نے اُس پر کمر باندھی کہ جو باتیں ہمارے درمیان واقع ہوئیں ان کو ترتیب وار بیان کریں جیسا کہ انھوں نے شروع سے خود دیکھنے والے اور کلام کے خادم تھے۔ ان کو ہم تک پہنچایا۔ اس لیے اے تھیفلس میں نے مناسب جانا کہ سب باتوں کا سلسلہ شروع سے ٹھیک ٹھیک دریافت کر کے ان کو تیرے لیے ترتیب سے لکھوں تاکہ جن باتوں کی تو نے تعلیم پائی ہے ان کی پختگی تمھیں معلوم ہو جائے۔ (لوقا ۱:۱)

انجیل یوحنا

یہ انجیل تینوں اناجیل سے اپنے مضامین اور طرز ادا سے منفرد اور یگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں یونان کے فلسفہ الٰہیات کی چاشنی موجود ہے۔ خاص طور پر یہودی فلسفی فائلو (Philo) کے فلسفیانہ خیالات کی آمیزش بہت ہے۔ جس کی بہترین مثال اس انجیل کا ابتدائی فقرہ ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلام بتلایا گیا ہے:

''ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔''

بعض عیسائی علماء اسے حواری یوحنا کی طرف منسوب کرتے ہیں جو تاریخی لحاظ سے غلط ہے۔ یہ بات تحقیق سے ثابت ہے کہ جو دو سگے بھائی یوحنا اور جیمس پسران زبیدی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری تھے پاپیاس کی روایت کے مطابق یہود نے دونوں کو ۶۰ء اور ۷۰ء کے مابین شہید کر ڈالا تھا۔

اس انجیل کا مؤلف اور جامع ایک دوسرا یوحنا ہے جو افیوس واقع ایشیاء کوچک کا رہنے والا تھا اور پہلی صدی کے آخر میں گزرا ہے۔ مکاشفات یوحنا کا بھی یہی مصنف ہے۔ اس انجیل کے سن تالیف میں اختلاف ہے۔ اس کی تاریخ ۶۸ء سے لے کر ۱۰۰ء تک بیان کی جاتی ہے اور مکاشفات کی تاریخ تصنیف ۹۵ء، ۹۶ء اور ۹۷ء بیان کی جاتی ہے۔

انجیل برناباس

برناباس مسیح کے حواریوں میں سے ایک ممتاز حواری تھا۔ اس نے اور پولوس نے اکٹھے مختلف ممالک میں تبلیغی دورے کیے۔ مرقس بھی ان کے ہمراہ بطور ترجمان کے جایا کرتا تھا۔ مسیح کی تعلیم کے بارے میں پولوس اور برناباس میں اختلاف پیدا ہو گیا نظریاتی اختلاف کی وجہ سے برناباس اور مرقس اس سے علیحدہ ہو کر جزیرہ سائپرس کو چلے گئے۔ جو برناباس کا وطن تھا۔ برناباس نے وہیں وفات پائی اور دفن ہوا۔

برناباس نے ایک انجیل لکھی تھی۔ جس کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ایک لمبا عرصہ گزرنے کے بعد ۴۷۸ء میں برناباس کی قبر کھولی گئی تو یہ انجیل اس کی چھاتی پر رکھی ہوئی پائی گئی۔ اٹھارہ سال تک یہ انجیل گرجاؤں میں پڑھی جاتی رہی پھر ۴۹۶ء میں پادریوں کی ایک کونسل نے اس انجیل کا پڑھنا ممنوع اور ناجائز قرار دیا۔ پوپ اسکٹس پنجم Pope sixtus کے کتب خانہ میں یہ انجیل دیگر ممنوعہ کتب کے ساتھ بند ہو گئی اور تقریباً ایک ہزار سال اس حالت میں پڑی رہی۔

ایک عیسائی راہب فرامارینو Framarino بیان کرتا ہے کہ اتفاقاً کچھ پرانا مذہبی لٹریچر اس کے ہاتھ آ گیا۔ ان میں سے ایک ایسا رسالہ تھا۔ جس میں پولوس کی بیان کردہ تعلیم پر سخت محاسبہ اور محاکمہ کیا تھا۔ اور برناباس کی انجیل کو بطور سند کے پیش کیا تھا۔ راہب عیسائی کے دل میں یہ شوق موجزن ہوا کہ اگر کہیں سے یہ انجیل دست یاب ہو جائے تو اس کا مطالعہ کرے۔ کچھ عرصہ بعد یہ راہب پوپ صاحب کے مقربین میں شامل ہو گیا۔ ایک دن وہ پوپ صاحب کی ملاقات کے لیے گیا تو پوپ صاحب کے سیکرٹری نے اسے لائبریری میں بٹھا دیا۔ فرامارینو Framarino بیان کرتا ہے کہ میں لائبریری میں اکیلا بیٹھا پوپ صاحب کا انتظار کر رہا تھا۔ دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اتنی دیر میں کتب ہی دیکھ لوں۔ سب سے پہلے جو کتاب ہاتھ میں آئی وہ یہی برناباس کی انجیل تھی۔ راہب بیان کرتا ہے کہ یہ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں نے فوراً اس انجیل کو چغے کے نیچے چھپا کر بغل میں دبا لیا پھر جلدی سے پوپ صاحب سے رخصت حاصل کر کے چلا گیا۔

انجیل کی دریافت

۱۷۰۹ء میں شاہ پروشیا کے ایک مشیر کرومر کو ایمسٹرڈم کے مقام پر کسی کتب خانہ سے برناباس کی انجیل ہاتھ لگی۔ اس وقت تک صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ کریمر نے یہ اطالوی نسخہ ایمسٹرڈم کے کسی صاحب حیثیت سے حاصل کیا تھا۔ کریمر نے یہ نسخہ شہزادہ آیوجین سافومی کو تحفہ کے طور پر دے دیا۔ اس کے بعد ۱۷۳۸ء میں اسٹریا کے دارالسلطنت وائنا کے شاہی کتب خانہ میں منتقل ہو گیا اور آج تک وہیں ہے۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں ہڈلی کے مقام پر ڈاکٹر ہلمن کو انجیل برناباس کا ایک نسخہ ملا۔ جو ہسپانوی زبان میں تھا یہی نسخہ جارج سیل کو ملا۔ جارج سیل نے اس نسخے پر جو نوٹ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ درحقیقت ہسپانوی نسخہ، اطالوی نسخہ کا ترجمہ ہے جو کسی اُروغانی مسلمان مصطفیٰ حرندی نے کیا ہے۔ مصطفیٰ ہی نے اس کے آغاز میں ایک دیباچہ تحریر کیا ہے جس میں اطالوی نسخے کی دریافت کا پورا حال تحریر کیا ہے۔

۱۹۰۷ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر "ڈاکٹر منک ہاؤس" نے انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ کیا پھر انگریزی کے ترجمہ سے مصر کے مشہور عیسائی عالم ڈاکٹر خلیل سعادت نے عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس عربی ترجمہ سے مولوی محمد حلیم صاحب انصاری نے اردو زبان میں ترجمہ کیا جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔

انجیل برناباس معروف اناجیل اربعہ میں بہت سی باتوں میں مختلف ہے لیکن مندرجہ ذیل تین اختلافی امور خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

۱۔ اس انجیل میں حضرت مسیح نے اپنے ''خدا اور خدا کا بیٹا'' ہونے سے صاف انکار کر دیا ہے۔

۲۔ اس میں حضرت مسیح علیہ السلام نے واضح الفاظ میں یہ بیان کیا ہے کہ وہ ''مسیح یا مسیا'' جس کی بشارت قدیم صحیفوں میں دی گئی ہے۔ اس سے مراد حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

۳۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے جس بیٹے کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ وہ حضرت اسحٰق علیہ السلام نہیں۔

قدیم نسخے

انجیل کے موجودہ تراجم جو مختلف زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ ایک یونانی نسخے سے لیے گئے ہیں۔ کوڈیکس الیگزنڈرین (Codex Alexandrius) کہلاتا ہے اور برٹش میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ پانچویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے۔ (Codex Alexandrius) کے علاوہ اور بھی کئی پرانے نسخے ہیں۔ جن میں سے حسب ذیل مشہور اور قدیم ہیں۔

1- Codex Sinaiticus. کوڈیکس سینائٹکسیس

2- Codex Vaticanus. کوڈیکس واٹیکن

3- Vulgate Latin. والگیٹ لیٹن

یہ تینوں نسخے چوتھی صدی عیسوی کی تصنیف ہیں اور برٹش میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں۔ (Codex Sinaiticus) میں پرانے عہد نامہ کی صرف ۲۶ کتب نئے عہد نامہ کی ساری کتب اور برناباس کی انجیل شامل ہیں۔

نئی انجیل کا انکشاف

۱۹۴۵ء میں بالائی مصر کے علاقہ ناگ حمادی کے قریب کھدائی کے وقت کسانوں نے ایک قدیم خانقاہ کے کھنڈرات معلوم کیے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک پرانی قبر میں جو کہ چونے کی چٹانوں میں کھود کر بنائی گئی تھی ایک مٹی کا برتن رکھا ہے۔ اس مٹکے کو کھولا تو اس میں پے پی رس کے کاغذوں پر قبطی حروف میں لکھے ہوئے صحائف پائے گئے۔ یہ صحیفے تعداد میں ۴۹ تھے اور تیرہ جلدوں میں مجلد تھے۔ یہ صحیفے جب مصر کے قبطی میوزیم میں پہنچے تو وہاں انکشاف ہوا کہ یہ صحائف قدیم صحیدی قبطی زبان اور رسم الخط میں ہیں، تیسری یا چوتھی صدی میں یہ صحائف باطنی فرقہ کے لوگوں نے ترتیب دیے تھے بعض صحائف کا یونانی سے قبطی زبان میں ترجمہ ہوا۔ ترجمہ کے لیے ۱۵۰ عیسوی تک کے صحیفے ان کے پیش نظر تھے۔ یہ صحائف اناجیل، خطوط و رسل

مکاشفات، ادعیہ اور عقائد کی تفصیل پر مشتمل ہیں۔

تیرہ جلدوں کے بعض خاص صحائف کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے ۱۱۴ اقوال تو ما حواری کی مرتب کردہ انجیل۔

۲۔ یوحنا حواری کی کتاب اسرار۔

۳۔ روایات میتھیاس۔

۴۔ یعقوب حواری کا مکتوب۔

۵۔ دوسی تھیوس کا مکاشفہ۔

فی الحال انجیل تو ما یعنی حضرت مسیح کے ۱۱۴ اقوال طبع ہوئے ہیں۔

اعمال

''رسولوں کے اعمال'' لوقا کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس میں صرف پطرس اور پولوس کے حالات درج ہیں۔ ان کے تاریخی واقعات الہامی نہیں ہو سکتے۔ عیسائیوں میں فرقہ والن ٹی ٹینس اور مارسیونی اور سویرینس نے اس کتاب کی ثقاہت کا انکار کیا ہے۔

پولوس کے خطوط

یہ کتاب چودہ خطوط پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ایک خط عبرانیوں کے نام ہے۔ اس کو عیسائی علماء نے مشکوک ٹھہرایا ہے۔ کتاب ''سوال و جواب'' مترجمہ پادری یونس سنگھ اور پادری والش سنگھ صاحب میں سوال ۲۵۱ کے جواب میں عبرانیوں کے خط سے متعلق لکھا ہے کہ ''اس کی بابت لوگوں میں اختلاف ہے۔ بہتیرے اسے پولوس سے نسبت دیتے ہیں اور بہت سے عالی سند نکتہ دان اس بات کو اعتماد کے ساتھ رد کرتے ہیں پر اس کے راقم کا تصفیہ نہیں کر سکتے۔'' پھر اسی کتاب میں آگے چل کر لکھا ہے کہ ''وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کا طرز پولوس کے طرز کی مانند نہیں۔ اکثر مقامات میں اس کے طرز سے اختلاف پڑتا ہے۔ جو لوگ یونانی کا بخوبی علم رکھتے ہیں وے کہتے ہیں کہ اس خط کی یونانی پولوس کی یونانی سے مشابہ نہیں ہے۔''

تاریخ یوسی بیس کی چھٹی کتاب کے باب ۲۵ میں اُرجن کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ''جو احوال قبل ہمارے زبان زد رہا ہے یہ ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ کلیمنٹ نے جو روم کا بشپ تھا۔ نامہ عبرانیوں کو تصنیف کیا اور بعض کہتے ہیں یہ لوقا کا ترجمہ ہے۔

پولوس کے دوسرے خطوط کو عیسائی علماء نے جعلی قرار دیا ہے۔

یوسی بیس نے اپنی تاریخ کی چھٹی کتاب کے باب ۲۵ میں اریجن کا قول نقل کیا ہے کہ ''پولوس نے

۱؎ برکت کی تاریخ انجیل صفحہ ۲۵۲، ۲۵۵۔

تمام لوگوں کو کچھ لکھ کر نہیں بھیجا، مگر بعض کو جو لکھا بھی تو دو چار سطر عبارت۔"

لارڈنر اپنی تفسیر مطبوعہ ۱۸۲۷ء جلد ۶ صفحہ ۳۸۳ پر اریجن کا قول نقل کرتا ہے کہ فرقہ ابیونی کے دونوں گروہوں نے پولوس کے نامہ جات کو رد کیا تھا اور پولوس کو دانا اور نیک آدمی نہیں سمجھتے تھے۔ یوسی بیس بھی اس قول کی تائید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ابیونیوں کے نزدیک پولوس توریت سے منحرف تھا۔

خطوط الہامی نہیں

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ عیسائی علماء نے ہی اس امر پر شک وشبہ کا اظہار کیا ہے کہ آیا پولوس نے خطوط لکھے بھی ہیں یا کہ نہیں۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ پولوس نے ہی خطوط لکھے ہیں تو پھر بھی ان خطوط کو الہامی نہیں کہا جا سکتا۔ اوّل کرنتھون (قرنتیوں) کے باب ۷ آیت ۱۲ میں پولوس لکھتا ہے:۔

"پر باقیوں کو خداوند نہیں میں کہتا ہوں......"

یہ عبارت ظاہر کر رہی ہے کہ پولوس اپنی طرف سے لکھ رہا ہے نہ کہ الہام سے۔ اسی طرح اس باب کی آیت ۲۵ میں وہ لکھتا ہے:

"پر کنواریوں کے حق میں خداوند کا کوئی حکم مجھ پاس نہیں، لیکن جیسا دیانتدار ہونے کے لیے مجھ پر خداوند کی طرف سے رحم ہوا ویسا ہی میں اپنی رائے ظاہر کرتا ہوں۔"

دوم کرنتھیون کے باب ۸ آیت ۸ میں پولوس لکھتا ہے:

"میں کچھ حکم کے طور پر نہیں بلکہ اوروں کی سرگرمی کے سبب اور تمہاری محبت کی حقیقت آزمانے کے لیے یہ کہتا ہوں۔"

یہ عبارات ظاہر کرتی ہیں کہ تمام خطوط پولوس نے اپنی طرف سے لکھے تھے۔ نہ کہ الہام کے تحت لکھے تھے۔

یعقوب کا خط

فرقہ پراٹسٹنٹ کے راہنما اور پیشوا مارٹن لوتھر اس خط کے متعلق لکھتے ہیں کہ "یہ گھاس پھوس ہے۔"

وارڈ اپنی کتاب اغلاط نامہ کے صفحہ ۳۷ پر لکھتا ہے:

"پومرن جو کہ شاگرد رشید لوتھر اور علماء کبار پراٹسٹنٹ سے ہے کہ یعقوب اپنے نامہ کو واہیات میں تمام کرتا ہے اور حوالہ کتابوں کا ایسا مختلف دیتا ہے کہ جس میں روح القدس نہیں رہ سکتا۔ اس لیے وہ نامہ الہامی کتابوں میں نہ گنا جائے۔

پطرس کے دو خطوط

پطرس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں شمار ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے

متعلق فرماتے ہیں کہ ''اے کم اعتقاد! کیوں شک لایا۔''[1] دوسرے موقع پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کو شیطان کہا: ''پر اس نے (مسیح) پھر کے پطرس سے کہا اے شیطان! میرے سامنے سے دور رہو تو میرے لیے ٹھوکر کا باعث ہے کیونکہ تو خدائی باتوں کا نہیں بلکہ انسانوں کی باتوں کا خیال رکھتا ہے۔''[2]

جان کالون کا قول ہے کہ پطرس نے کلیسا میں بدعات پھیلائیں اور عیسائیوں کی آزادی کو خطرہ میں ڈالا اور توفیق طاعت کو ان سے چھین لیا۔ اس بارہ میں وہ پطرس اور نبرناہ کو بہت ملامت کرتا ہے۔

وائی ٹیکر جو فرقہ پرانسٹنٹ میں ایک جید عالم ہوگزرا ہے وہ کہتا ہے کہ بعد عروج مسیح اور نزول روح القدس کے سارے کلیسا نے غلطی کی ہے۔ نہ صرف عوام بلکہ خواص نے بھی بلکہ حواریوں نے بھی جو غیر اسرائیلیوں کو ملت مسیحی کی جانب دعوت دی اور پطرس نے اور بھی غلطی رسوم میں کی اور یہ بڑی غلطیاں حواریوں سے بعد نزول روح القدس کے ہوئیں۔

گلتیوں کے باب ۲ آیت ۱۱ تا ۱۴ میں پولوس کا قول درج ہے کہ ''پر جب پطرس انطاکیہ میں آیا تو میں نے روبرو اس سے مقابلہ کیا، اس لیے کہ وہ ملامت کے لائق تھا۔ کیونکہ وہ پیشتر اس سے کہ کئی شخص یعقوب کی طرف سے آئے غیر قوم والوں کے ساتھ کھایا کرتا تھا۔ پر جب وے آئے تو مختونوں سے ڈر کر پیچھے ہٹا اور الگ ہوگیا اور باقی یہودیوں نے بھی اس کے ساتھ دورنگی کی، یہاں تک کہ برناس بھی دب کر ان کی ریاکاری میں شریک ہوا۔''

پولوس کے قول کے مطابق پطرس ریاکار تھا۔ اسی پطرس کے دو خطوط عہد نامہ جدید میں شامل کیے ہیں۔ پھر عیسائی مبلغ یہ دعویٰ کرتے پھرتے ہیں کہ یہ الہامی کتاب ہے۔

یوحنا کے خطوط و مکاشفات

یہ کتاب یوحنا کے تین خطوط اور مکاشفات پر مشتمل ہے۔ پہلے خط کے متعلق مفتاح الکتاب کے صفحہ ۳۰۰ پر لکھا ہے۔ اگرچہ اس خط کے شروع یا آخر میں یوحنا کا نام نہیں مگر ہر زمانہ کے لوگ اسی رسول کو اس خط کا راقم کہتے آتے ہیں۔ مگر یہ کچھ نہیں لکھا کہ یہ خیال کن واقعات پر مبنی ہے۔ صرف انداز عبارت اور مضامین خط سے ان امور میں خاطر خواہ راہنمائی نہیں ہوسکتی۔''

دوسرے خط کے متعلق مفتاح الکتاب میں لکھا ہے: ''جس برگزیدہ بی بی کو یہ لکھا گیا ہے کہ وہ بظاہر ایک عزت دار عیسائی بیوہ تھی جو کلیسوں میں مشہور تھی، لیکن اس کی تحقیق خبر نہیں کہ وہ کہاں کی رہنے والی تھی، شاید اس کا ٹھکانا شہر افسس کے قرب و جوار میں تھا۔ اگرچہ اس خط میں راقم کا نام نہیں پایا جاتا تو بھی صریح ہے کہ یوحنا نے یہ ۶۹ء کے قریب لکھا تھا۔''

---

1. متی باب ۱۴ آیت ۳۱۔
2. متی باب ۱۶ آیت ۲۳۔

مصنف مفتاح الکتاب نے تاریخ تصنیف کا اندازہ کس طرح لگالیا، جب کہ اس خط میں نہ کاتب کا نام ہے اور نہ مکتوب الیہ کا نام اور نہ تصنیف کا سن۔ معلوم ہوا کہ مصنف مفتاح الکتاب نے اٹکل پچو سے کام لیا ہے۔

ڈاکٹر بلسن کا قول ہے کہ سریا کا کلیسا پطرس کے دوسرے خط اور یوحنا کے دوسرے اور تیسرے خطوط اور یہوداہ کے خطوط اور یوحنا کے مکاشفات کو تسلیم نہ کرتا تھا۔ کونسل لوڈیسیا (۲۶۴ء) نے بھی کتاب مکاشفات کو قابل اعتبار نہیں سمجھا۔

یوسی بیس اپنی تاریخ کے کتاب ۷ باب ۲۵ میں لکھتا ہے کہ بعض نے کتاب مشاہدات کو علیحدہ کر دیا ہے اور اس کے رد میں کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ یہ سب کچھ بے معنی ہے اور جہالت کا بہت بڑا حجاب ہے اور یوحنا کی طرف اس کی نسبت بالکل غلط ہے کیونکہ اس کا مصنف نہ کوئی پاک شخص ہے نہ کوئی عیسائی ہے بلکہ ایک ملحد سرن تھس ہے، جس نے اپنی تصنیف یوحنا کے نام سے غلط موسوم کر دی۔ لارڈ نر اپنی کتاب کی جلد ۴ کے صفحہ ۳۲۳ پر لکھتے ہیں کہ مکاشفات یوحنا پرانے سریانی ترجمہ میں شامل نہیں۔

یہوداہ کا خط

خطوط یوحنا اور مکاشفات یوحنا کے درمیان یہوداہ کا ایک خط درج ہے، اس کی ثقاہت سے متعلق مسیحی علماء کو کلام ہے۔ گروٹیس کا قول اس بارہ میں یہ ہے کہ یہ اس یہوداہ کا خط ہے جو اورین کے عہد میں یروشلم کا پندرھواں اسقف تھا۔

کیا یہ کتابیں الہامی ہیں؟

عہدنامہ جدید کے متعلق بے شمار اندرونی، بیرونی اور تاریخی شہادتیں موجود ہیں جن کی بناء پر یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتب الہامی نہیں بلکہ مصنفین نے خود اپنی طرف سے لکھی ہیں۔ جیسا کہ ان کتب پر تبصرہ کرتے ہوئے بیان کیا جا چکا ہے کہ ان کتابوں کے مصنفین کے بارہ میں بھی اختلاف ہے کہ آیا یہ کتب انہی مصنفین کی ہیں۔

اندرونی شہادتیں

(الف) مصنفین کا اقرار

انجیل نویس خود اقرار کرتے ہیں کہ وہ الہام کے تحت نہیں لکھ رہے بلکہ اپنی طرف سے لکھ رہے ہیں۔ لوقا انجیل نویس ایک رومن وزیر تھیفلس Theophilus کو مخاطب کر کے انجیل کے لکھنے کی غرض و غایت بیان کرتا ہے:

چونکہ بہتوں نے اس پر کمر باندھی ہے کہ جو باتیں ہمارے درمیان واقع ہوئیں ان کو ترتیب وار بیان کریں جیسا کہ انھوں نے جو شروع سے خود دیکھنے والے اور کلام کے خادم تھے۔ ان کو ہم تک پہنچایا۔ اس لیے اے تھیفلس میں نے بھی مناسب جانا کہ سب باتوں کا سلسلہ شروع سے ٹھیک ٹھیک دریافت کر کے ان کو تیرے لیے ترتیب سے لکھوں۔ تا کہ جن باتوں کی تو نے تعلیم پائی ہے ان کی پختگی تمھیں معلوم ہو جائے۔"

(لوقا ۱:۱)

یہ حوالہ ظاہر کرتا ہے کہ لوقا نے لوگوں سے دریافت کر کے رومن وزیر کے لیے لکھا۔ پھر لوقا آگے چل کر کتاب رسولوں کے اعمال میں لکھتا ہے:

"اے تھیفلس! میں نے پہلا رسالہ ان سب باتوں کے بیان میں تصنیف کیا ہے جو یسوع شروع میں کرتا اور سکھاتا تھا۔" (اعمال ۱:۱)

اسی طرح یوحنا بیان کرتا ہے:

"اور بھی بہت سے کام نہیں جو یسوع نے کیے۔ اگر وہ جدا جدا لکھے جاتے تو میں سمجھتا ہوں کہ جو کتابیں لکھی جاتیں ان کے لیے دنیا میں گنجائش نہ ہوتی۔" (یوحنا ۲۱:۲۵)

یوحنا بھی اپنی انجیل کو یسوع مسیح کے سوانح حیات ہی قرار دیتا ہے۔

اول کرنتھیوں کے باب ۷ آیت ۱۲ میں پولوس لکھتا ہے:

"پر باقیوں کو خداوند نہیں میں کہتا ہوں۔"

یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ پولوس اپنی طرف سے لکھ رہا ہے۔

پھر اسی باب کی آیت ۲۵ میں لکھتا ہے:

"پر کنواریوں کے حق میں خداوند کا کوئی حکم مجھ پاس نہیں، لیکن جیسا دیانتدار ہونے کے لیے مجھ پر خداوند کی طرف سے رحم ہوا، ویسا ہی میں اپنی رائے ظاہر کرتا ہوں۔"

دوم کرنتھیوں کے باب ۸ آیت ۸ میں پولوس لکھتا ہے: "میں کچھ حکم کے طور پر نہیں بلکہ اوروں کرنتھیوں کی سرگرمی کے سبب اور تمہاری محبت کی حقیقت آزمانے کے لیے یہ کہتا ہوں۔"

اس نوع کی عبارتیں اس امر پر شاہد ناطق ہیں کہ عہد نامہ جدید کا الہام ربانی سے کوئی تعلق نہیں۔ مصنفین نے اپنے طور پر لکھا جو کچھ لکھا۔

(ب) اندرونی اختلافات

اناجیل میں جو اندرونی اختلافات پائے جاتے ہیں، وہ بھی اس امر پر بین شہادت ہے کہ موجودہ اناجیل انسانی دست برد سے محفوظ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں اختلاف نہیں ہو سکتے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا اگر یہ قرآن مجید غیر اللہ کی طرف سے

ہوتا تو اس میں ضرور اختلاف پاتے۔(النساء۴:۸۲)

۱۔ متی نے اپنی انجیل میں "یسوع ابن داؤد ابن ابراہام کا نسب نامہ" کے زیر عنوان لکھا ہے کہ "مریم جس سے یسوع پیدا ہوا اس کا شوہر یوسف یعقوب کا بیٹا تھا" اور اس کی نسب حضرت داؤد کے بیٹے حضرت سلیمان سے ملاتی ہے۔ مگر لوقا نے اپنی انجیل میں یوسف کو عیلی کا بیٹا قرار دیا ہے۔ پھر اس کا سلسلہ نسب حضرت داؤد علیہ السلام کے بیٹے ناتن سے ملایا ہے۔
پس متی اور لوقا کے بیان میں سے ایک ضرور غلط ہے۔ ایک شخص یوسف حضرت داؤد علیہ السلام کے دو بیٹوں کی اولاد نہیں ہوسکتا۔

۲۔ یسوع مسیح نے جب اپنے شاگردوں کو تبلیغ کے لیے بھیجا تو متی لکھتا ہے کہ اس نے ان کو حکم دے کر کہا: "نہ سونا اپنے کمر بند میں رکھنا نہ چاندی نہ پیسے راستہ کے لیے نہ جھولی لینا نہ دو دو کُرتے نہ جوتیاں نہ لاٹھی۔"[1]
مگر مرقس لکھتا ہے: "حکم دیا کہ راستہ کے لیے لاٹھی کے سوا کچھ نہ لو، نہ روٹی نہ جھولی نہ اپنے کمر بند میں پیسے مگر جوتیاں پہنو اور دو کُرتے نہ پہنو۔"[2]
متی کے قول کے مطابق یسوع مسیح شاگردوں کو حکم دیتا ہے کہ اپنے ساتھ لاٹھی بھی نہ لو، لیکن مرقس کے قول کے مطابق مسیح نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ لاٹھی لے لو۔ ان دونوں بیانوں میں سے ایک ضرور غلط ہے۔

۳۔ متی لکھتا ہے کہ جب یسوع مسیح بیت لحم میں پیدا ہوئے تو وہیں "خداوند کے فرشتہ نے یوسف کو خواب میں دکھائی دے کر کہا: اٹھ بچے اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر مصر کو بھاگ جا اور جب تک کہ میں تجھ سے نہ کہوں وہیں رہنا کیونکہ ہیرودیس اس بچے کو تلاش کرنے کو ہے، تا کہ اسے ہلاک کرے۔ پس وہ اٹھا اور رات کے وقت بچے اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر مصر کو روانہ ہو گیا اور ہیرودیس کے مرنے تک وہیں رہا۔"[3]
مگر لوقا لکھتا ہے کہ جب یسوع مسیح بیت لحم میں پیدا ہوئے تو "جب آٹھ دن پورے ہوئے اور اس کے ختنہ کا وقت آیا تو اس کا نام یسوع رکھا گیا۔ پھر جب موسیٰ کی شریعت کے موافق ان کے پاک ہونے کے دن پورے ہو گئے تو وہ اس کو یروشلم میں لائے تا کہ خداوند کے آگے حاضر کریں..... اور جب وہ خداوند کی شریعت کے مطابق سب کچھ کر چکے تو گلیل میں اپنے شہر ناصرہ کو پھر گئے۔ اور وہ لڑکا بڑھتا اور قوت پاتا گیا اور حکمت سے معمور ہوتا گیا اور خدا کا فضل اس پر تھا۔ اس کے ماں باپ ہر برس عید فسح پر یروشلم کو جایا کرتے تھے اور جب وہ بارہ برس کا ہوا تو وہ عید

[1] متی ۱۰:۱۰۔ [2] مرقس ۶:۸۔ [3] متی ۲:۱۳، ۱۴۔

کے دستور کے موافق یروشلم کو گئے۔"[1]

متی کے بیان کے مطابق یوسف یسوع کی پیدائش کے بعد اسے اور اس کی والدہ کو بیت لحم سے مصر لے گیا، اور ہیرودیس کی وفات تک مصر میں رہا لیکن لوقا کے بیان کی رو سے یسوع مسیح کی پیدائش کے بعد اس کے ماں باپ اسے بیت لحم سے یروشلم لے گئے اور شریعت موسوی کے مطابق قربانی وغیرہ کی رسوم ادا کیں۔ اور وہاں سے گلیل شہر ناصرہ میں چلے گئے اور بارہ برس تک یسوع وہیں رہا۔ پس متی اور لوقا کے بیانوں میں سے ایک بیان ضرور غلط ہے۔

۴۔ یوحنا باب ۱۳ سے ظاہر ہے کہ مسیح نے آخری کھانا عید سے ایک روز پہلے کھایا اور عید کے روز وفات پائی۔ لیکن متی باب ۲۶ آیت ۱۷، مرقس باب ۱۴ آیت ۱۲ تا ۱۶ اور لوقا باب ۲۲ آیت ۱۳ تا ۲۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح نے آخری کھانا عید کی شام کو کھایا تھا اور عید سے دوسرے دن صلیب پائی۔

۵۔ لوقا کی انجیل کے باب ۲۴ آیت ۲۱، ۲۹، ۳۶ اور ۵۱ میں لکھا ہے کہ جس روز مسیح جی اٹھے اسی دن یا پہلی رات جو آئی تھی اس میں آسمان پر چلے گئے۔ لیکن یہی لوقا اعمال باب ۱ آیت ۳ میں لکھتا ہے کہ وہ جی اٹھنے کے چالیس دن بعد آسمان پر چلے گئے۔

۶۔ یوحنا کی انجیل باقی تینوں اناجیل سے مختلف ہے۔ اس میں ذیل کے مضامین نہیں ہیں: توبہ، معافی، ایمان، مال و اموال، طلاق، محصول لینے والا گنہگار ہیں۔ تبلیغ، بدارواح والے، بدارواح کا دھتکارنا، ناپاک، جذامی، منافقت، زنا، ویل اور افسوس، دولت مند، تمثیلیں، صلیب کی بجائے یوحنا لفظ، رفع استعمال کرتا ہے حالانکہ باقی اناجیل میں یہ سب مضامین موجود ہیں۔

(ج) انجیل کا عہد قدیم کی کتب سے اختلاف

۱۔ انجیل متی ۱:۱۱ میں لکھا ہے کہ یوسیاہ سے یکونیاہ پیدا ہوا۔ لیکن عہد قدیم کی کتاب یرمیاہ ۲۸:۴ اور اتواریخ ۳:۱۶ میں لکھا ہے کہ یکونیاہ کا باپ یہویقیم تھا اور یوسیاہ اس کا دادا تھا۔ پس انجیل کا بیان غلط ہے کیونکہ عہد قدیم کی کتابوں سے مختلف ہے۔

۲۔ انجیل لوقا ۳:۳۶ میں ہے کہ سلح قنیاں کا بیٹا تھا اور قیناں ارفکسد کا۔ لیکن عہد قدیم کی کتاب پیدائش بتاتی ہے کہ سلح کا باپ ارفکسد تھا۔ پس دونوں بیانوں میں سے ایک یقینی طور پر غلط ہے۔

۳۔ متی یسوع مسیح کا نسب نامہ ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"سب پشتیں ابراہام سے داؤد تک چودہ پشتیں ہوئیں اور یہود کے گرفتار ہو کر بابل جانے تک چودہ پشتیں۔"[2]

مگر عہد قدیم کی کتاب میں اتواریخ ۴:۱۰، ۱۵ سے واضح ہوتا ہے کہ داؤد سے لے کر گرفتار ہو کر

---

[1] لوقا ۲:۲۱، ۲۲۔ ۳۹ تا ۴۲۔
[2] متی ۱:۱۷۔

بابل جانے تک اٹھارہ پشتیں تھیں جن کا اسم وار ذکر موجود ہے۔لہٰذا انجیل کا بیان غلط ہے۔

(د) نازیبا باتیں

۱۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت وہ باتیں منسوب کی ہیں جو ان کی شان کے بعید اور اخلاقی نقطہ نگاہ سے گری ہوئی ہیں۔ چنانچہ یوحنا اپنی کتاب کے باب ۱۰ میں حضرت مسیح علیہ السلام کا قول بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے پیشتر جس قدر انبیاء آئے ہیں وہ سب چور اور رہزن تھے۔

۲۔ مرقس باب ۱۱ آیت ۱۲ تا ۱۴ میں لکھا ہے: ''صبح کو جب وہ بیت عنیاہ سے باہر آئے اس کو بھوک لگی اور دور سے انجیر کا ایک درخت پتوں سے لدا ہوا دیکھ کر وہ گیا کہ شاید اس میں کچھ پاوے۔ جب وہ اس کے پاس آیا تو پتوں کے سوا کچھ نہ پایا کیونکہ انجیر کا موسم نہ تھا۔ تب یسوع نے اس سے خطاب کر کے کہا کہ کوئی تجھ سے پھل نہ کھاوے۔''

اس حوالہ سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں: اوّل، مسیح علیہ السلام کو اتنا بھی علم نہ تھا کہ انجیر کے درخت کو کب پھل لگتا ہے۔ دوم، اپنی غلطی پر شرمندہ ہونے کی بجائے درخت کو بددعا دی اور کہا کہ آئندہ کوئی تجھ سے کبھی پھل نہ کھاوے۔

یہ دونوں باتیں حضرت مسیح علیہ السلام کی شان اور مرتبے کے منافی ہیں۔

۳۔ متی باب ۱۲ آیت ۴۷، ۴۸ میں لکھا ہے: کسی نے اس سے کہا کہ دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے تجھ سے بات کیا چاہتے ہیں۔ پر اس نے جواب میں خبر دینے والے سے کہا کہ کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی۔''

ایک مقدس نبی اپنی ماں اور بھائیوں کے خلاف حقارت اور توہین آمیز کلمات نہیں کہہ سکتا۔'' کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی۔'' حقارت اور توہین آمیز کلمات ہیں۔''

غلط پیش گوئیاں

قرآن مجید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سچا نبی قرار دیتا ہے اور سچے نبی کی پیش گوئیاں کبھی غلط نہیں ہوئی، کیونکہ پیش گوئی خدا کے علم پر مبنی ہوتی ہے اور خدا کا علم کبھی بھی غلط نہیں ہو سکتا۔ انجیل میں ایسی پیش گوئیاں حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف منسوب کی گئی ہیں جو غلط نکلیں۔

۱۔ ''تم میں سے کئی زندہ ہوں گے کہ میں آ جاؤں گا۔'' (متی ۱۶:۲۸ مرقس ۹:۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تمام دیکھنے والے مر گئے ہیں لیکن وہ اب تک واپس نہیں آئے۔

۲۔ شاگردوں کو کہا: ''تم میرے ساتھ حکومت کرو گے۔'' (متی ۱۹:۲۸)

۳۔ جب مخالفین نے یسوع مسیح سے نشان دکھانے کا مطالبہ کیا تو ''اس نے جواب دے کر ان سے کہا:

اس زمانہ کے بُرے اور زنا کار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یوناہ نبی (یونس) کے نشان کے سوا اور کوئی نشان ان کو نہ دیا جائے گا کیونکہ جیسے یوناہ تین رات مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔"[1]

یسوع مسیح نے یہاں یہ پیش گوئی کی ہے کہ جس طرح یونس نبی مچھلی کے پیٹ میں تین دن اور تین رات رہے اسی طرح وہ بھی زمین کے اندر تین دن اور تین رات رہے گا۔ لیکن دوسری اناجیل اس امر پر متفق ہیں کہ یسوع مسیح جمعہ کی شام کو صلیب سے اتارا گیا، پھر اس کے چند گھنٹے بعد قبر میں رکھا گیا۔

انجیل یوحنا میں لکھا ہے! پس چونکہ تیاری کا دن تھا یہودیوں نے پیلاطوس سے درخواست کی کہ ان کی ٹانگیں توڑی جائیں اور لاشیں اتاری جائیں تا کہ سبت کے دن صلیب پر نہ رہیں کیونکہ وہ سبت ایک خاص دن تھا۔"[2]

دوسری جگہ یوحنا میں لکھا ہے: ہفتہ کے پہلے دن مریم مگدلینی ایسے تڑکے کہ ابھی اندھیرا ہی تھا قبر پر آئی اور پتھر کو قبر سے ہٹا ہوا دیکھا۔ پس وہ شمعون پطرس اور دوسرے شاگرد کے پاس جسے یسوع عزیز رکھتا تھا دوڑی ہوئی آئی اور ان سے کہا کہ خداوند کو قبر سے نکال لے گئے۔"[3]

پس یوحنا کے بیان کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام زمین کے اندر صرف دو راتیں اور ایک دن رہے جبکہ پیشگوئی میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ حضرت یونس علیہ السلام کی طرح زمین میں تین دن اور تین راتیں رہیں گے لہٰذا یہ خدا کا کلام نہیں ہوسکتا۔

ہندوستانی مترجمین نے تین دن اور تین رات کی بجائے تین رات دن ترجمہ کر دیا ہے عربی بائبل میں یہ الفاظ ہیں:

"لانه كما كان يوناه في بطن الحوت ثلاثة و ثلاث ليال هكذا يكون ابن الانسان في قلب الارض ثلاثة ايام و ثلاث ليال."[4]

اسی طرح (The parallel new testament) مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی پریس ۱۸۸۴ء جس میں ۱۶۱۱ء اور ۱۸۸۱ء کے تراجم بالمقابل لکھے گئے ہیں ان میں بھی "Three days and three nights" یعنی تین دن اور تین رات ہی درج ہے۔

پہلے مترجمین نے انجیل متی میں تین رات دن کیا لیکن یوناہ نبی کی کتاب میں یہ تبدیلی نہ کی۔ اس میں تین دن اور تین رات ہی لکھا رہا۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور نے جو

---

[1] متی ۱۲: ۳۹ ...... ۴۰۔ [2] یوحنا ۱۹: ۳۱۔ [3] یوحنا ۲۰: ۱، ۲۔

[4] الکتاب مقدس جو جمعیۃ التوراۃ الامریکیہ و جمعیۃ التوراۃ البریطانیۃ والاجنبیۃ نے شائع کی اور قاہرہ میں ۱۹۳۸ء میں طبع ہوئی۔

بائبل کا اردو ترجمہ شائع کیا اس میں یوناہ نبی کی کتاب کے ۱:۱۷ میں بھی اور یوناہ تین دن اور تین رات مچھلی کے پیٹ میں رہا، کی بجائے اور یوناہ تین دن رات مچھلی کے پیٹ میں رہا'' کر دیا۔

بیرونی شہادتیں

(الف) یسوع مسیح علیہ السلام کی زبان کا عہد نامہ جدید کا کوئی نسخہ موجود نہیں

حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے حواریوں کی زبان عبرانی تھی۔ اس زبان میں عہد نامہ جدید کا کوئی نسخہ نہیں پایا جاتا۔ یونانی زبان میں انجیل کے نسخے ملتے ہیں۔ پھر ان نسخوں سے دنیا کی دوسری زبانوں میں تراجم ہوئے۔ عبرانی زبان میں انجیل کا کوئی نسخہ پایا جاتا اس امر پر بین دلیل ہے کہ موجودہ اناجیل الہامی نہیں۔ بلکہ مصنفین نے اپنی زبان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے روائتی حالات بیان کر دیے تھے۔

(ب) اناجیل کے تحریف وتبدل کے متعلق عیسائی علماء کے خیالات

۱۔ تفسیر ہارن جلد ۴ حصہ دوم باب ۴ مطبوعہ ۱۸۸۲ء میں لکھا ہے:

''کلیساء کے قدماء مورخین نے اناجیل کی تالیف کے زمانہ کے متعلق جو حالات ہم تک پہنچائے ہیں، ایسے غیر معین اور ابتر ہیں کہ کسی ایک امر معین کی طرف نہیں پہنچاتے اور پرانے سے پرانے قدماء نے اپنے وقت کی گپوں کو سچ سمجھ کر لکھ دیا اور ان لوگوں نے جو ان کے بعد ہوئے ادب کر کے ان لوگوں کے لکھے ہوئے کو قبول کر لیا اور یہ روایات سچی اور جھوٹی ایک لکھنے والے سے دوسرے لکھنے والے کو پہنچیں اور مدت دراز کے گزر جانے کے بعد ان کی تنقید متعذر ہو گئی۔''

۲۔ پھر اسی جلد میں لکھا ہے:

''پہلی انجیل ۳۷ یا ۳۸ء یا ۴۱ء یا ۴۳ء یا ۴۸ء یا ۶۱، ۶۲ء یا ۶۴ء عیسوی میں اور دوسری انجیل ۵۶ء سے ۶۵ء تک اور غالباً ۶۳ء میں اور تیسری انجیل ۵۳ء یا ۶۳ء یا ۶۴ء میں اور چوتھی انجیل ۶۸ء یا ۶۹ء یا ۷۰ء یا ۹۸ء عیسوی میں تالیف ہوئیں اور نامہ عبرانیہ اور نامہ دوم پطرس اور نامہ دوم سوم یوحنا اور نامہ یعقوب اور نامہ یہود اور مشاہدات یوحنا اور نامہ اول یوحنا کے بعض درس (یعنی آیات) کا حال تو ایسا ابتر ہے کہ کہنے کے لائق نہیں۔ ان کو تو محض زبردستی سے بلاسند حواریوں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور بہت علماء فرقہ پروٹسٹنٹ نے ان کتب کا انکار کر دیا۔''

۳۔ کاتھلک ہیرلڈ جلد ۷ مطبوعہ ۱۸۴۴ء کے صفحہ ۲۰۵ پر لکھا ہے:

''اسٹاڈسن اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ یوحنا کی انجیل بلا ریب مدرسہ اسکندریہ کے کسی طالب علم نے لکھی اور ہارن اپنی تفسیر میں لکھتا ہے کہ فرقہ ایلوجسین جو دوسری صدی میں تھا اس انجیل (یوحنا) اور اسی طرح یوحنا کی سب تصنیفات سے انکار کرتا ہے۔''

۴۔ یوسی بیس اپنی تاریخ کلیسا، کی کتاب ۳ کے باب ۳ میں لکھتا ہے:

''پطرس کا پہلا خط سچا ہے مگر دوسرا خط پطرس بھی پاک کتاب میں شامل نہیں کیا گیا لیکن پڑھا جاتا تھا۔''

۵۔ پھر اسی کتاب کے ۲۵ ویں باب میں لکھتا ہے کہ ''نامہ یعقوب اور نامہ یہودا اور نامہ دوم پطرس اور نامہ دوم سوم یوحنا پر کلام کیا گیا ہے کہ آیا یہ سب انجیل نویسوں نے لکھے ہیں یا دوسرے لوگوں نے جن کے یہی نام تھے''

۶۔ عہد نامہ قدیم عیسائیوں نے عیسائیوں کی خاطر لکھا تھا۔ علاوہ ازیں یہ یونانی میں یونانی بولنے والوں کے لیے لکھا گیا تھا اور طرز تحریر اس وقت کے رائج طرز تحریر کے مطابق تھا۔ یونانی بولنے والے ترجمے کے تاریخی تسلسل میں کوئی حقیقی فرق نہیں پڑا۔ اس لیے ہمیں تحریر کی کوئی حقیقی غلطی موجودہ نسخوں میں نہیں ملتی۔ گو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اختلافات پائے نہیں جاتے لیکن یہ اختلافات اتفاقی نہیں ہیں بلکہ دیدہ دانستہ پیدا کیے گئے ہیں اور شروع سے ہی بعض مصنفوں نے بالارادہ وہ تغیرات عہد نامہ میں پیدا کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ عہد نامہ قدیم اپنے ابتدائی زمانہ میں کوئی مذہبی تقدس نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے جہاں کہیں تبدیلیوں اور زیادتیوں سے مضمون میں اصلاح کی امید کی جاتی تھی وہاں تبدیلیاں اور زیادتیاں دلیری سے کر دی جاتی تھیں[1]

۷۔ موسیو رینان لکھتا ہے:

''ابتداءً اناجیل کی حیثیت بالکل انفرادی تھی اور سند کے اعتبار سے ان کا درجہ روایت سے بھی کم تھا۔''[2]

یوحنا کی انجیل کے متعلق یہ مورخ لکھتا ہے:

''میں کبھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ چوتھی انجیل تمام کی تمام گلیلی کے ماہی گیر کے قلم کی لکھی ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں اکثر اضافے بعد کے ہیں۔''[3]

لوقا کے متعلق رینان بیان کرتا ہے:

''اس انجیل کی تاریخی حیثیت بہت کمزور ہے۔ یہ صحیفہ ہم تک دوسرے ہاتھوں سے پہنچا ہے...... اس میں کئی فقرے موڑے توڑے ہوئے اور مبالغہ آمیز ہیں...... اسے تو (یروشلم کے) ہیکل کے متعلق بھی صحیح اندازہ نہیں۔''[4]

چاروں اناجیل کے متعلق لکھتا ہے:

۱۔ انسائیکلوپیڈیا ببلیکا صفحہ ۴۹۸۰ جلد ۴۔ ۲۔ حیات مسیح ص ۲۱۴۔

۳۔ حیات مسیح صفحہ ۱۴، ۱۸۔ ۴۔ حیات مسیح صفحہ ۲۲۔

''یہ اناجیل کھلے طور پر ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں۔''[1]

پروفیسر جود (Joad) اپنی کتاب (Good and Evil) میں لکھتا ہے کہ ''اناجیل کے باہمی تضاد نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔''[2]

پھر اس کے بعد لکھتا ہے کہ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسٹر بیون (Bevan) کا یہ بیان بالکل صحیح ہے۔

''ہماری قدیمی اناجیل سینٹ مرقس اور سینٹ پطرس کی یادداشتوں کا مجموعہ ہیں۔ یعنی جب (حضرت) عیسیٰ علیہ السلام نے پطرس کی وفات سے اڑتیس سال قبل جو کچھ کہا اس میں جو کچھ پطرس کو یاد رہ سکا وہ بھی ارامی زبان سے یونانی میں ترجمہ شدہ اس لیے (کلیسا کے فیصلہ سے قطع نظر) یہ سمجھنا بالکل حماقت ہے کہ آج جو کچھ (حضرت) عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اسی طرح لفظاً لفظاً انہی کا ہے۔ گویا کسی مختصر نویس نے اسے لکھ لیا ہو یا فوٹوگراف نے محفوظ کر لیا ہو۔'' (صفحہ ۳۲۳)

مسٹر قلپ ویوین اپنی کتاب ''دی چرچیز اینڈ ماڈرن تھاٹ'' (کلیسا اور خیالات جدید) کے صفحہ ۹۸، ۹۹ پر لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر رابن سن کو اقرار ہے کہ اناجیل اربعہ مشکوک ہیں لیکن اس کا خیال ہے کہ دوسری صدی کی یہ روایت کہ انجیل دوم کا مصنف سینٹ مارک (مرقس ہے) معتبر ہے اور یہ کہ مارک پطرس حواری کا ترجمان تھا اور اپنی انجیل کو حواری مذکور کی روایت سے اس نے روما میں تحریر کیا ہے۔ بہت خوب: ہم اس نتیجہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی یوں سمجھو کہ ایک انجیل کی روایت ایسے راوی سے ہے جو چشم دید روایت بیان کرتا ہے لیکن اس راوی کو صرف ایک سال (اور بقول رجعت پسند ناقدین تین سال) صحبت مسیح حاصل ہوئی۔ یہ حواری ناخواندہ تھا۔ تیس یا چالیس سال کے بعد وہ روایت کرتا ہے، جس کو دوسرا شخص (مرقس) غیر زبان میں تحریر کرتا ہے اور پھر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا ترجمہ کہاں تک اصل کے مطابق ہوا ہے۔ علاوہ اس کے ڈاکٹر رابن سن اپنے ابواب ''وعظ کبیر'' اور ''غیر مرقسی دستاویز'' میں مرقس کی انجیل کی اہم فروگزاشتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ اہم فروگزاشتیں کیا ہیں؟ کیا ہم ان کو معمولی سمجھیں؟ ہم کو خود ان کا تھوڑا سا انتخاب کر کے فیصلہ کرنا چاہیے۔ اس انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بطور اعجاز پیدائش کا نہ کچھ ذکر ہے اور نہ آپ کے عہد طفولیت کے حالات جو کہ سابقہ پیش گوئی کی تصدیق میں ہوں۔ اسی طرح پہاڑی والے مشہور وعظ کا بھی کچھ ذکر نہیں۔ دوبارہ زندہ ہو جانے کا قصہ صرف چند سطروں میں مذکور ہے اور آسمان پر تشریف لے جانا صرف ایک سطر میں۔ بدقسمتی سے یہی وہ سطریں ہیں جو بالاتفاق الحاقی مانی جاتی ہیں کیونکہ انجیل مرقس کا حقیقت میں باب ۱۶ آیت ۸ پر ختم ہو جاتا اس لیے نہ حلول، نہ بعثت ثانی، نہ صعود کسی مسئلہ کا بھی وہاں ذکر نہیں۔ زبانی روایات، مگر

[1] حیات مسیح صفحہ ۲۹۔ [2] صفحہ ۳۱۸۔

شدہ دستاویزات اور نامعلوم کاتب بس یہی وہ ذریعے رہ گئے ہیں جن سے ہم کو ان تفصیلی حالات کا علم ہوتا ہے جو ہمارے مذہب کی روح رواں ہیں۔ کیا اس سے بڑھ کر اور بھی کوئی ناقابل اطمینان امر ہے جس سے مسیحی صداقت اور انجیل کی حقانیت پر شبہ عائد ہوتا ہو؟"

نورٹن اپنی کتاب علم اسناد مطبوعہ بوسٹن ۱۸۳۷ء کے دیباچہ جلد اوّل میں لکھتے ہیں: اگر یہ کمی و زیادتی انجیل میں واقع نہ ہوئی ہوتی تو معتبر ومشہور مورخ سلوس یہ کیوں اعتراض کرتا کہ عیسائیوں نے اپنی انجیلیں تین بار یا چار بار بلکہ اس سے بھی زیادہ بار بدلی ہیں۔"

اختلافات کی وجوہ

پادری بارن صاحب اپنی مشہور کتاب انٹروڈکشن (دیباچہ علوم بائبل) جلد ۲ صفحہ ۳۱۷ میں ان تمام اختلافات کے چار وجوہ بیان کرتا ہے۔

اوّل: ناقلوں کی غفلت یا غلطیوں سے اختلاف کا ہونا۔ اور یہ کئی طرح پر ہوتا ہے:

۱۔ عبری اور یونانی حرف آواز اور صورت میں مشابہ ہیں۔ اس سبب سے غافل اور بے علم نقل کرنے والا ایک لفظ یا حرف کو بجائے دوسرے لفظ یا حرف کے لکھ کر عبارت میں اختلاف ڈال دیتا ہے۔

۲۔ تمام قلمی نسخے بڑے حرفوں میں لکھے جاتے تھے اور لفظوں بلکہ فقروں کے درمیان جگہ نہ چھوڑتے تھے۔ اس سبب سے کہیں لفظوں کے جز لکھنے سے رہ گئے اور کہیں مکرر لکھے گئے یا بے پرواہ اور جاہل نقل کرنے والے نے اختصار کے نشانوں کو، جو قدیم قلمی نسخوں میں اکثر واقع ہوئے ہیں، غلط سمجھا۔

۳۔ بہت بڑا سبب اختلاف عبارت کا نقل کرنے والوں کی جہالت یا غفلت ہے کہ انھوں نے حاشیہ پر جو شرح لکھی ہوئی تھی اس کو متین کا جز سمجھا۔ قدیم قلمی نسخوں کے حاشیہ میں مشکل مقامات کی شرح لکھنے کا اکثر رواج تھا اور آسانی سے سمجھا جاتا تھا کہ یہ حاشیہ کی شرح ہے۔ پس ان حاشیوں کی شرحوں میں سے تھوڑا یا سب ان نسخوں کے متن میں آسانی سے مل گیا ہوگا، جو نسخے ایسے نسخوں سے نقل ہوئے جن کے حاشیہ پر شرحیں لکھی ہوئی ہوں گی۔

دوم: دوسرا سبب اختلاف عبارتوں کا اس قلمی نسخے میں غلطیوں کا ہونا ہے جس سے کاتب نے نقل کی علاوہ ان غلطیوں کے جو بعض حرفوں کے شوشہ کم ہو جاتے یا مٹ جانے سے واقع ہوئی ہیں۔ چمڑے یا کاغذ کے مختلف حالات سے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ کاغذ یا چمڑا پتلا ہو، جس میں ایک طرف کا لکھا ہوا دوسری طرف پھوٹ جائے اور دوسری طرف کے حرف کا ایک جز معلوم ہونے لگے اور سمجھ میں آئے۔

سوم: اختلاف عبارت کا سبب یہ بھی ہے کہ نکتہ چین سے اصلی متن کو ارادتاً بہتر اور درست کرنے کی نیت سے صحیح کرے جبکہ ہم ایک مشہور عالم کی مصنفہ کتاب پڑھتے ہیں اور اس میں صرف ونحو یا قواعد مناظرہ کی کوئی غلطی پاتے ہیں تو اس غلطی کو زیادہ تر چھاپنے والے پر منسوب کرتے ہیں، بہ نسبت اس کے کہ خود مصنف کی طرف نسبت دیں۔ اسی طرح ایک قلمی نسخہ کا نقل کرنے والا جو اس کتاب میں جسے وہ نقل کرتا ہے غلطیاں پائے تو ان کو ناقل اوّل کی طرف منسوب کرتا ہے اور پھر ان کو اپنی دانست میں اس طرح صحیح کرتا ہے کہ مصنف نے اس کو یوں لکھا ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنے خوردہ گیر قیاس کو بہت وسعت دیتا ہے تو وہ خود اس غلطی میں پڑتا ہے جس کے رفع کرنے کا اس نے ارادہ کیا تھا اور اس کا غلطی میں پڑنا کئی طرح پر ہو سکتا ہے۔

۱۔ مثلاً نقل کرنے والا ایک لفظ کو جو حقیقت میں صحیح ہے غلط سمجھے اور یہ جانے کہ اس نے صرف ونحو کی غلطی پکڑی حالانکہ وہ خود غلطی پر ہے یا یہ بات ہو کہ خود مصنف ہی سے وہ غلطی صادر ہوئی جس کو یہ صحیح کرنا چاہتا ہے۔

۲۔ اختلاف عبارت کے اسباب میں بقول میکس بہت بڑا سبب جس کے عہد جدید میں دروغ آمیز مقامات نہایت کثرت سے پیدا ہوئے ہیں، یہ ہے کہ یکساں مقامات کو اس طرح تبدیل کیا ہے جس سے ان میں ایک دوسرے سے زیادہ کامل مطابقت کی جائے اور خاص کر اناجیل کو اس طریقہ سے نقصان پہنچا ہے اور پال کے نامہ جات کو اکثر مقامات میں اس لیے اُلٹ پلٹ کیا کہ عہد جدید کے حوالوں کہ ان مقامات میں جہاں وہ سٹپو ایجنٹ (نسخہ سبعیہ) ترجمہ کے بعینہٖ الفاظ سے تفاوت رکھتے ہیں اسی ترجمہ سے مطابق کریں۔

۳۔ بعض نکتہ چینیوں نے عہد جدید کے نسخوں میں اس طرح اختلاف عبادت ڈال دیے کہ ان کا ترجمہ رومی ولگیٹ کے مطابق کر دیا۔

چہارم: ایک اور سبب اختلاف عبارت کا ایسی خرابیاں یا تبدیلیاں ہیں جو کسی فریق کے مطلب براری کے لیے دانستہ کی گئی ہوں، خواہ وہ فریق درست مذہب رکھتا ہو یا بدعتی ہو۔ یہ بات تحقیق ہے کہ ان لوگوں نے جو دیندار کہلاتے تھے بعض خرابیاں ارادتاً کیں۔ یہ خرابیاں اس دور اندیشی سے کی گئی تھیں کہ جو مسئلہ تسلیم کیا گیا ہے اس کو تقویت ہو یا جو اعتراض اس مسئلہ پر ہوتا ہو وہ نہ ہو سکے۔[1]

اناجیل اربعہ کے ماخذ

اناجیل اربعہ کے ماخذ کے متعلق علماء محققین نے مختلف نظریے پیش کیے ہیں:

(الف) ایک آرامی زبان میں انجیل تھی۔ اناجیل نویسوں نے اسے بنیاد ٹھہرا کر اپنی اپنی انجیل مرتب کی۔

[1] بحوالہ تاریخ صحف سماوی مؤلفہ پروفیسر نواب علی ص ۱۳۰ تا ۱۳۴ ایڈیشن دوم۔

یہ نظریہ اس لیے غلط ہے کہ واقعات بیان کرنے میں شدید اختلاف ہے۔ اگر اناجیل کا ایک ہی ماخذ ہوتا تو اختلاف نہ پایا جاتا۔

(ب) پہلے ایک انجیل مرتب ہوئی۔ دوسری انجیل کے مولف نے پہلی انجیل پر بنیاد رکھی اور اپنی انجیل کو مرتب کیا۔ بعض زبانی اور سنی سنائی روایات کا اس میں اضافہ کیا اور بعض روایات کو قلمزن کر دیا۔ تیسرے مولف انجیل نے اپنی ماسبق دونوں اناجیل سے فائدہ اٹھایا، کچھ اضافہ کیا اور کچھ حذف کیا۔ اس طرح اناجیل میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلی انجیل کون سی ہے، دوسری کونسی اور تیسری کون سی؟ اس پر چھ قسم کی ترتیبیں تجویز ہوئیں:

۱۔ لوقا ۲۔ متی ۳۔ مرقس

۔ لوقا ۲۔ مرقس ۳۔ متی

۱۔ متی ۲۔ لوقا ۳۔ مرقس

مسیحی علماء نے تینوں قسم کی ترتیب کو دلائل کی بناء پر مسترد کر دیا اور ذیل کی ترتیب پر غور ہوا۔

۱۔ متی ۲۔ مرقس ۳۔ لوقا

۱۔ مرقس ۲۔ متی ۳۔ لوقا

۱۔ مرقس ۲۔ لوقا ۳۔ متی

اس میں مسیحی علماء نے دلائل کی بناء پر مرقس کو درجہ اول دیا ہے۔ اس کے بعد متی اور لوقا کے بارہ میں بحث ہے کہ ان میں سے دوسری کون سی اور تیسری کونسی ہے۔ اس بارہ میں مسیحی محققین نے دلائل کے ساتھ فیصلہ کرنا چاہا، لیکن کوئی واضح فیصلہ نہ کر سکے۔ آج کل جس ترتیب سے اناجیل شائع ہو رہی ہیں۔ وہ متی، مرقس، لوقا کی ترتیب ہے جو کثرت آراء سے غلط ہے۔

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ عبرانی یا آرامی زبان میں ایک انجیل لکھی ہوئی تھی، جس سے اناجیل کا ترجمہ کیا گیا ہے یا نقل کی گئیں۔ اس پر بھی وہی اعتراض ہے کہ اگر ایک ہی انجیل سے ترجمہ کیا گیا ہے تو پھر اختلاف کیوں رونما ہو گیا۔

چوتھا نظریہ یہ ہے کہ اس مروجہ مرقس کی بجائے ایک اور مرقس انجیل تھی جس سے مروجہ مرقس اور متی اور لوقا کی اناجیل نقل کی گئیں۔

پانچواں نظریہ یہ ہے کہ اصلی انجیل کا نام مرقس نہیں تھا، بلکہ لوگیا **Logia** تھا۔ جس سے مرقس اور متی نقل کی گئیں۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسیحی محققین یقینی طور پر اس بات کو متحقق نہیں کر سکے۔ کہ اناجیل کا منبع کیا ہے اور مروجہ اناجیل کی تاریخ تالیف کیا ہے۔ کیمبرج اور آکسفورڈ کے شائع کردہ کالج ایڈیشن میں اس

امر کا اعتراف ہے کہ

اناجیل کی تاریخ تالیف مشکوک ہے۔

تینوں اناجیل (متی، مرقس اور لوقا) کے مقاصد

متی کی انجیل یسوع کو مسیح ثابت کرنے کے لیے لکھی گئی۔ مرقس نے مسیح کو ابن اللہ ثابت کرنے کے لیے لکھی۔ اور لوقا نے نواب تھیوفلس کے لیے مسیح کو گنہگاروں کا نجات دہندہ ثابت کرنے کے لیے تالیف کی۔

مسیحی فرقے

عیسائیت کے آغاز میں بنیادی اختلافات رونما ہو گئے تھے۔ یعقوب حواری اور پولوس کا اختلاف، یعقوب اور دیگر حواری نجات کے لیے ایمان اور عمل صالحہ کو لازمی قرار دیتے ہیں، مگر پولوس عمل اور شریعت کی پابندی کو لعنت قرار دیتا ہے اور آزادروی کا درس دیتا ہے۔ اس کا یہ فتویٰ ہے کہ مسیح پر ایمان لانے کے بعد انسان ہر گناہ سے پاک اور حقیقی نجات کا وارث ہو جاتا ہے۔ گویا پولوس کے نزدیک صرف مسیح پر ایمان لانا ہی نجات کے لیے کافی ہے، ایمان لانے کے بعد انسان جو چاہے کرے اللہ تعالیٰ اس کا محاسبہ نہیں کرے گا۔

مسیحی فرقوں کی تفصیل یہ ہے:

ا۔ ابیونی فرقہ

ان کے دو فریق تھے۔ دونوں کا یہ اعتقاد تھا کہ حضرت مسیح بشر تھے۔ ان میں سے اکثر ایسے لوگ تھے جنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خود دیکھا اور ان سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو مافوق الفطرت مانتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ یوسف نجار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باپ ضرور تھے لیکن حضرت مریم کا حمل روح القدس کے ذریعہ ہوا۔ یہ فرقہ اس بات کا بھی معتقد تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر چڑھ جانے کی وجہ سے تمام انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن گئے ہیں۔

مسٹر جے۔ ایم رابرٹسن نصرانی ابیونی فرقہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "یہ لوگ مسیح کی خدائی کا انکار کرتے تھے اور پولوس کو رسول تسلیم نہ کرتے تھے۔"[1]

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار اریئوس سے نقل کر کے بیان کرتا ہے:

"ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ مسیح ایک انسان تھے جسے معجزات دیے گئے تھے۔ یہ لوگ پولوس کے بارے میں یہ تسلیم نہ کرتے تھے کہ وہ موسوی دین سے برگشتہ ہو کر عیسائی ہو گیا تھا۔ اور یہ لوگ خود موسوی شریعت کے احکام اور رسموں یہاں تک کہ ختنہ پر بھی مضبوطی کے ساتھ کاربند تھے۔" (برٹانیکا ص ۸۸۱، جلد ۷)

[1] History of Christianity (London) 1913 P.5

یہ فرقہ صرف متی کی عبرانی انجیل کو مانتے تھے جس میں نسب نامہ نہ تھا۔

۲۔ مارکیونی اور ناستک فرقے

مارکیونی فرقہ اپنے بانی مارکیونی کے نام سے مشہور ہوا۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت، خارق عادت پیدائش اور مرکر جی اٹھنے کا قائل نہ تھا۔

ناستک کے لفظی معنی دانا کے ہیں۔ ان پر فیثا غورث، افلاطون اور زرتشت کی تعلیم کا اثر تھا۔ سینٹ پال کے منکر تھے۔ مسیح کو روح تسلیم کرتے تھے۔ تورات کی صرف پہلی پانچ کتابوں کو تسلیم کرتے تھے۔ تمام انبیاء بنی اسرائیل کو گنہگار تسلیم کرتے تھے۔

۳۔ دوسٹس

یہ لوگ یسوع مسیح کو کلمہ خدا تسلیم کرتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اچانک ایک مکمل اور جواں سال انسان کی صورت میں ظاہر ہو گئے۔ ان کی انسانی صورت فریب نظر تھی۔ وہ روح خالص تھے۔ ان میں جسمانیت کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

۴۔ ارٹمن

یہ فرقہ عیسیٰ سے دو سو سال بعد پیدا ہوا۔ یہ فرقہ مسیح کی الوہیت کا منکر تھا۔ پلوس شمشاطی کلیسا انطاکیہ کا لارڈ پادری اسقوف اس فرقہ سے تعلق رکھتا تھا۔

۵۔ مونٹانس کا گروہ

۱۷۰ء میں یہ دعویٰ کیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے جس فارقلیط کے آنے کی خبر دی ہے وہ میں ہوں۔ اس کے بعد اور لوگوں نے بھی یہی دعویٰ کیا، اور اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہلایا۔

۶۔ مانی کا فرقہ

تیسری صدی عیسوی میں مانی نے ملک ایران میں مجوسی اور عیسوی مذہب سے مرکب ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی۔ یہ فرقہ کتاب الاعمال حواریوں کو نہیں مانتا[1]

۷۔ نوویشین کا فرقہ

یہ فرقہ پوپ کو نہیں مانتا تھا۔ دو سو پچاس عیسوی میں پیدا ہوا اور پانچ سو عیسوی تک موجود رہا۔

۸۔ آریوسی

اس فرقہ کا بانی اریوس (۲۵۶ء تا ۳۳۶ء) تھا۔ وہ لیبیا کا رہنے والا تھا اور اسکندریہ میں پادری تھا۔

---

[1] تفسیر لارڈ نر مطبوعہ لندن ۱۸۲۷ء جلد ۳ حصہ ۶۔

اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اگر چہ حضرت مسیح خدا کے بیٹے تھے لیکن وہ الوہیت کے اس مقام پر فائز نہیں ہیں جو عیسائیوں کا عقیدہ ہے ان کو اقنوم اول یعنی خدا نے پیدا کیا۔ وہ پیدائش سے قبل معدوم تھے۔ اس وجہ سے وہ اپنے باپ کی طرح غیر فانی اور ابدی نہیں ہیں۔ باپ کی ذات ابدی اور لازوال ہے، جس کی نہ کوئی ابتداء ہے اور نہ انتہا۔ لیکن بیٹے کی ابتدا ہے۔ باپ بیٹے سے پہلے موجود تھا۔ عیسائیوں کا یہ عقیدہ تھا باپ بیٹا دونوں ابدی ہیں اور دونوں ایک ہی صفات کے مالک ہیں۔ اس عقیدہ کی تردید میں کئی مجالس بلائی گئیں، جن میں پہلی کونسل نیقیہ ۳۲۵ء میں منعقد ہوئی۔ اس کونسل نے اس عقیدہ کو کفر قرار دیا، دوسری کونسل قسطنطنیہ میں ۳۸۱ء میں منعقد ہوئی اس مجلس میں بھی اس فرقہ کو ملحد اور کافر قرار دیا گیا۔

یاجوجی، سویوی، برگنڈی، لنگوبروی اور بنڈل وغیرہ اس فرقہ کی شاخیں ہیں۔

۹۔ اپولی نیرین

اس کا بانی اپولی نیرلیس (Appoli Naris) تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں، البتہ اس نے ۳۹۲ء میں انتقال کیا۔ اس فرقہ کا عقیدہ تھا کہ یسوع مسیح انسانی جسم میں ضرور نمودار ہوا، لیکن ان میں الوہیت اور بشریت ایسی ملی ہوئی تھی کہ ایک کو دوسری سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کے جسم میں روح کی جگہ کلمۃ اللہ نے لے لی تھی۔ اس لیے مسیح خالص کار الٰہی تھا۔ اس فرقہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت پر زیادہ زور دیا۔ پانچویں صدی عیسوی میں یہ فرق بالکل معدوم ہو گیا۔

۱۰۔ پولسی فرقہ

پانچویں صدی عیسوی میں پولسی فرقہ پیدا ہوا۔ اس فرقہ کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ وہ خدا نہ تھے بلکہ فرشتہ تھے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی اصلاح کے لیے بھیجا چنانچہ وہ کنواری مریم کے پیٹ سے ایک انسان کی شکل میں پیدا ہوئے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے انھی ں ایک مخصوص جلال دیا تھا اس لیے وہ "خدا کے بیٹے" کہلائے اس فرقے کے اثرات زیادہ تر ایشیا کو چک اور ارمیتیا کے علاقوں میں رہے۔[1]

۱۱۔ نسطوری فرقہ

پانچویں صدی کے وسط میں نمودار ہوا جس کا لیڈر قسطنطنیہ کا اسقف نسطوریوس (م ۴۵۱) تھا۔ اس نے عقیدہ حلول کو حل کرنے کے لیے ایک نیا فلسفہ پیش کیا۔ اس نے اس نئے فلسفہ میں حضرت مسیح کو دو قرار دے کر ان کے لیے دو حقیقتیں ثابت کیں۔ ایک انسانی اور ایک خدائی، نسطوریوس نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا بھی تھے اور انسان بھی۔ اور ان کی ذات میں دو شخصیتیں جمع تھیں۔ ایک بیٹا اور ایک مسیح۔ ایک

[1] اس فرقہ کے مزید نظریات کے لیے دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ص ۳۹۷ ج ۱۷۔

ابن اللہ اور ایک ابن آدم۔ بیٹا خالص خدا ہے اور مسیح خالص انسان رومن کیتھولک چرچ کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ''ایک شخصیت اور دو حقیقتیں'' ہیں، اس کے برعکس نسطوریوس کا یہ نظریہ تھا کہ حضرت عیسیٰ ''دو شخصیتیں اور دو حقیقتیں'' تھے۔

۴۳۱ء میں جو شہر افس میں مجلس منعقد ہوئی تھی وہ اس فرقہ کے عقائد سے متعلق تھی۔ نسطوریوس نے ...... کے خلاف ایک زبردست مہم جاری کی۔ اور آریوس کے عقائد رکھنے والوں پر ظلم و تشدد کیا۔ نسطوریوس پر کئی بار مقدمہ چلایا گیا اور اسے جلاوطن بھی کیا گیا۔ جلاوطنی کی حالت میں وفات پائی۔

رومی حکومت کے زیرنگیں علاقوں میں اس فرقہ کو بالکل نیست و نابود کر دیا گیا۔ البتہ عرب شام اور مصر میں اس فرقہ نے ترقی کی۔ بعد میں یہ فرقہ کئی شاخوں میں بٹ گیا۔ ایک فرقہ رومن کیتھولک سے منسلک ہو گیا جو کالدی عیسائی کہلائے دوسرا اپنے قدیم عقائد اور خیالات پر قائم رہا۔

نسطوریوس کے خلاف جو جرم عائد کیا گیا تھا۔ اس کا خلاصہ ڈاکٹر بیدون بیکر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

اس نے ہمارے خداوند کی خدائی اور انسانی حقیقتوں میں اس قدر امتیاز برتا کہ وہ دو مستقل وجود بن گئے اس نے حامۃ اللہ کو یسوع سے اور ابن اللہ کو ابن آدم سے الگ شخصیت قرار دے دیا۔

۱۲۔ یعقوبی فرقہ

چھٹی صدی میں یعقوبی فرقہ (Jacobite church) ظاہر ہوا۔ جس کے اثرات اب تک شام اور عراق میں باقی ہیں۔ اس فرقہ کا بانی یعقوب بیراڈیوس (Jacobite baradeus) تھا۔ اس کا نظریہ اریوس اور نسطوریوس دونوں کے برعکس تھا۔ نسطوریوس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وجود میں دو شخصیتوں کا قائل تھا۔ یعقوب نے کہا کہ حضرت مسیح میں صرف ایک شخصیت اور ایک حقیقت پائی جاتی تھی اور وہ بھی خدائی وہ عرفاً خدا تھے۔ گو تمیں انسان کے لباس میں نظر آتے تھے۔

دی ورلڈ فیملی انسائیکلوپیڈیا میں اس فرقے کا نظریہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ مسیح میں خدائی اور انسانی حقیقتیں کچھ اس طرح متحد ہو گئی تھیں کہ وہ صرف ایک حقیقت بن گئی تھی [1]

۱۳۔ وحدت الفطری فرقہ (Monophysites)

اس فرقہ کا بانی یوٹیکس تھا، جو قسطنطنیہ کے راہبوں کا سردار تھا۔ اس فرقہ کا یہ عقیدہ تھا کہ مسیح میں انسانی اور الوہی دو فطرتیں نہیں پائی جاتی تھیں۔ یوٹیکس نے شہنشاہ تھیوڈوسیس کو لکھا کہ کلیسا کی ایک باقاعدہ کونسل منعقد کرے جس میں اس مسئلہ کا تصفیہ ہو جائے۔ چنانچہ شہنشاہ نے اس مسئلہ کے تصفیہ کے لیے افیس

[1] دی ورلڈ فیملی انسائیکلوپیڈیا ص ۶،۳۸ ج ۱۰ مطبوعہ نیویارک ۱۹۵۷ء۔

کے مقام پر ایک کونسل بٹھائی، جس میں یوٹیکس کے دلائل اور براہین زیادہ وزنی تھے۔ اس کونسل نے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا لیکن اس کونسل کے فیصلہ کو عوام نے مقبولیت کی نظر سے نہ دیکھا، کیونکہ مغربی اور مشرقی کلیسا کی اکثریت وحدت الفطری عقیدہ کے خلاف تھی۔ اس عقیدہ کے خلاف شدید ردعمل ہوا۔ چنانچہ اس فرقہ کے لوگوں پر شدید ظلم وستم ہونے لگے۔ دریں اثنا شہنشاہ تھیوڈوسیس بھی فوت ہو گیا۔ نئے شہنشاہ نے پوپ لیو کے ایماء پر چالسڈن کی مجلس منعقد کی، جس نے یہ اعلان کیا:

''ہم اس یسوع کو مانتے ہیں جو خدا کا بیٹا تھا جو اپنی الوہیت اور انسانیت دونوں میں یکساں کامل تھا۔ جو صحیح معنوں میں خدا اور حقیقی معنوں میں انسان تھا۔ ایک معقول روح اور جسم کا حامل تھا جو اپنے باپ کے ساتھ ہم جوہر تھا اور اپنی انسانیت کے باعث ہم سب کے ساتھ بھی ہم جوہر تھا۔ جو ہر پہلو سے ہمارے مماثل تھا۔ گناہوں کی آلائش سے پاک تھا۔ جسے اس کے باپ نے ازل میں پیدا کیا اور بعد میں ہماری نجات کی خاطر خدا کی ماں مریم کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ ایک ہی مسیح جس کی دو غیر تقسیم پذیر فطرتیں تھیں اور ان فطرتوں کے اتحاد نے ان کے باہمی امتیاز میں کوئی فرق پیدا نہیں تھا بلکہ ہر فطرت کی خاصیت اپنی جگہ مستقلاً ایک واحد شخصیت میں موجود تھی اور جسے دو شخصیتوں میں منقسم نہیں کیا جا سکتا تھا بلکہ ایک ہی بیٹا، ایک ہی مولود اور کلمہ الٰہی تھا۔''

اس کونسل کے فیصلہ کے باوجود وحدت الفطری عقیدہ مصر میں پھلا پھولا۔ اور مصر کے پادریوں نے اس عقیدہ کی تائید کی۔ بعد میں وحدت الفطری فرقہ پانچ شاخوں میں تقسیم ہو گیا:

اوّل: شام کے یعقوبی، دوم: مصر کے قبطی، سوم: اہل حبشہ، چہارم: ارمنی عیسائی اور پنجم لبنان کے میرونی (Maronite)

۱۴۔ وحدت الارادی فرقہ

مجلس چالسڈن کی رو سے یہ فیصلہ ہوا کہ حضرت مسیح دو مختلف فطرتوں الوہی اور انسانی کے حامل تھے۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ مسیح کی فطرت کی مانند اس کے ارادے دو تھے یا ایک؟ الوہی ارادہ اور انسانی ارادہ، ہرقل نے یہ مسئلہ اس وقت اٹھایا جب وہ ایران کو فتح کر کے واپس لوٹا۔ بطریق سرجیس نے پوپ ہنوریس کو شہنشاہ ہرقل کے ایماء پر وحدت الارادی عقیدے پر راضی کر لیا اور شہنشاہ نے سرکاری طور پر اس عقیدے کا اعلان کروا دیا، اور قسطنطنیہ کی کونسلوں میں اس عقیدے کی توثیق کر دی۔

سرکاری تائید کے باوجود مشرقی کلیسا نے اس عقیدہ کی مخالفت کی، اور روما کے لاٹ پادری نے اس عقیدہ کو باطل قرار دیا۔ ہرقل کے پوتے شہنشاہ کانسٹی نیس ثانی نے دونوں کلیساؤں کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کی اور سرکاری عقیدے کو منسوخ کر دیا اور دونوں عقیدوں کو جائز قرار دیا۔ پوپ مارٹن نے اس کی مخالفت کی۔ شہنشاہ نے پوپ کو گرفتار کروا کر قسطنطنیہ بھجوا دیا۔

ایک مدت تک یہ مسئلہ مشرقی اور مغربی کلیساؤں کے درمیان وجہ نزاع بنا رہا۔ آخر کار کانسٹی نیس کے جانشین قسطنطین نے اپنے دارالحکومت میں کلیسا کی چھٹی مجلس منعقد کی، جس میں پوپ بھی شریک ہوا۔ اس مجلس نے یہ فیصلہ کیا کہ مسیح کے اندر دو ارادے اور قوتیں کارفرما تھیں اور یہ دونوں ایک واحد شخصیت میں ایک دوسرے کے موافق تھیں۔ مسیح کا انسانی ارادہ اس کے الوہی ارادے کے تابع تھا۔ جس طرح مسیح کا جسم باوجود الوہیت کے گوشت پوست کا بنا ہوا تھا۔ اسی طرح گوشت پوست کے جسم میں کارفرما ارادی قوت بھی ایک الٰہی قوت تھی۔

۱۵۔ آئی کونو لاسٹک فرقہ

گرجوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی مورتیوں کی پرستش جاری ہوگئی۔ اس فرقہ نے بت پرستی کے خلاف آواز بلند کی۔ آئی کونو لاسٹک (Iconoclastic) یونانی لفظ ہے، جس کے معنی بت شکن کے ہیں۔ اس تحریک کا آغاز مشرقی کلیسا سے لیوسوم کی زیر سرپرستی ہوا۔

۱۶۔ پلیگوس فرقہ

اس کا بانی ملک ونیس کا عابد عیسائی تھا۔ وہ مسیح کے کفارہ ہونے کا اور پولوس نامہ جات کے مضامین کا منکر تھا۔ اس کے پیرو ایشیا اور فرانس میں ہیں۔

۱۷۔ یونانی ٹیرن فرقہ

اس فرقہ کے لوگ مسیح کی الوہیت، ابنیت اور تثلیث کے منکر تھے اور انجیل متی کے باب اوّل، دوم کو الحاقی مانتے تھے۔ اس فرقہ کے لوگ اب بھی موجود ہیں۔ ہندوستان میں ان کا چرچ بھی ہے۔

۱۸۔ سا ئینسن فرقہ

اس کا بانی سوئینس تھا۔ یہ بھی یونی ٹیرن کے قریب قریب عقیدہ رکھتے ہیں۔

۱۹۔ کرنتھیون کا فرقہ

اس کا بانی کرنتھیس اول صدی عیسوی کے قریب تھا۔ اس کے یہ اقوال تھے:

''مسیح کے ظاہر ہونے سے پہلے وہ بزرگ خدا جو سب سے بڑا ہے بالکل نامعلوم تھا اور بڑی بڑی روحوں کے ساتھ بلند ترین آسمان پر جس کا نام پلیر وما ہے رہا کرتا تھا۔ اس نے پہلے بیٹا پیدا کیا اور اس سے کلمہ پیدا ہوا جو بیٹے سے درجہ میں کم تھا۔ مسیح اگرچہ اور روحوں سے بزرگ تر ہے۔ مگر وہ روحیں اس سے بھی بزرگ تر ہیں جن میں سے ایک کا نام زدی یعنی زندگی اور دوسرے کا نام فوس یعنی روشنی ہے۔ اور ان روحوں سے اور چھوٹی چھوٹی روحیں پیدا ہوئیں، ان میں سے ایک خاص روح نے جس کا نام ڈیمیرگس تھا اور اس عالم

محسوس کو اس مادہ سے جو ہمیشہ رہنے کے قابل ہے بنایا۔ یہ ڈیمیرگس اس خدا سے جو پلیر وما پر ہے ناواقف تھا ور یہ ارواح غیر محسوس سے مرتبہ میں کمتر تھا اور یہی اسرائیلیوں کا خاص خدا ہے جس نے موسیٰ کو ان میں بھیجا وران کو شریعت دی کہ اس پر ہمیشہ عمل کریں کہ عیسیٰ ایک انسان تھا جو پاکیزگی اور انصاف میں ممتاز تھا اور وہ یوسف اور مریم کا حقیقی بیٹا تھا اور جب عیسیٰ بپتسمہ پا چکا تو مسیح اس پر کبوتر کی صورت میں اترا اور نامعلوم خدا کو اس پر ظاہر کیا اور اس کو معجزے دکھانے کی قوت بخشی اور یوحنا بپتسمہ دینے والے میں بھی روشنی کی روح اسی طرح داخل ہوئی تھی اور اس لیے بعض باتوں میں یوحنا عیسیٰ سے بڑھ کر تھا۔ اور جب عیسیٰ پر مسیح نازل ہوا تو عیسیٰ یہودیوں کے خدا ڈیمیرگس سے مقابل ہوا اور اسی خدا کی ترغیب سے یہودیوں کے سردار نے عیسیٰ کو پکڑ کر صلیب پر کھینچا اور جب عیسیٰ کو صلیب پر کھینچنے کے لیے گرفتار کر کے لے چلے تب مسیح تو آسمان پر صعود کر گیا، عیسیٰ ذلت اور دردناک تکلیف سے مارا گیا۔''[1]

۲۰۔ کولنز یدینس کا فرقہ

اس فرقہ کے لوگ مریم کو تثلیث میں داخل کر کے پوجتے تھے اور ان کے لیے ایک قسم کی روٹی بھی تیار کرتے تھے۔

۲۱۔ میٹریامائٹ

اس گروہ کے لوگ روح القدس کی بجائے مریم کو تثلیث میں داخل کرتے تھے اور نائس کونسل کے بعض لوگ یہی اعتقاد رکھتے تھے۔ فرقہ قوسیہ کا بھی یہی اعتقاد تھا۔

۲۲۔ باسلیدی فرقہ

ان کا یہ عقیدہ تھا کہ مسیح مصلوب نہیں ہوا بلکہ شمعون قرینی ان کے عوض گرفتار کیا گیا اور صلیب پر چڑھا گیا۔

۲۳۔ گناستی فرقہ

ان کا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا مادہ سے پیدا ہوئی ہے اور مادہ کے لیے شرارت اور معصیت ضرور ہے چونکہ مسیح مادہ سے پیدا نہیں ہوا تھا اس لیے مصلوب نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کا جسم نہ تھا۔''[2]

۲۴۔ یونانی فرقہ

ان کا یہ عقیدہ ہے کہ روح القدس صرف باپ سے نکلتی ہے نہ کہ بیٹے سے۔ حالانکہ پروٹسنٹ فرقہ کے نزدیک یہ صریح کفر ہے اور نیز پوپ کو بے خطا بھی نہیں سمجھتے تھے۔

---

[1] رومن مفتاح الکتاب مطبوعہ ۱۸۵۶ء صفحہ ۱۵۳۔ [2] رومن تواریخ کلیسیا صفحہ ۵۶۔

۲۵۔ ارمنی فرقہ

اس فرقہ کے لوگ کفارہ مسیح کو کافی نہیں مانتے بلکہ مریم کے تہوار میں قربانی بھی کرتے تھے اور اپنے اقارب کی طرف سے بھی قربانیاں کیا کرتے تھے۔

۲۶۔ سورمن فرقہ

یہ تمام عیسائیوں کو کافر و بے دین سمجھتے ہیں اور ہر شخص کے لیے بارہ بیویوں تک جائز سمجھتے تھے اور ان کے پیشوا کے پاس پچاس بیویاں رہتی ہیں۔ یہ لوگ امریکہ کی دور سرحد پر آباد ہیں جن کی تعداد تقریباً اسی ہزار بیان کی جاتی ہے۔

۲۷۔ پرکشیس کا فرقہ

یہ فرقہ ۲۰۰ء میں یونان میں پیدا ہوا۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ بیٹا اور روح القدس خدا کی ذات سے بطور قوتوں کے ظاہر ہوئے، نہ یہ کہ روح القدس بیٹے سے پیدا ہوا۔

۲۸۔ ناصریوں کا فرقہ

وہ صرف عبرانی انجیل متی کو مانتا تھا، اور وہ اس انجیل مروجہ سے مختلف تھی۔ ان کی کتب میں مرقوم ہے کہ مسیح نے گائے کے گوشت کے پرند بنا کر ان میں پھونک ماری اور وہ اُڑ کر چلے گئے اور وہ مسیح کے مصلوب ہونے کے منکر تھے۔

۲۹۔ نجرانی نصاریٰ

یہ لوگ مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے[1] اس فرقہ کے لوگ تثلیث پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مباہلہ کرنے کے لیے آئے تھے۔

۳۰۔ ارجن کا فرقہ

ارجن ۲۲۳ء میں مدرسہ اسکندریہ کا مدرس تھا۔ اس زمانہ میں جعلی کتب تصنیف کر کے حواریوں وغیرہ کے نام پر شائع کی جاتی تھیں۔ مجلس نائیس میں پادریوں کو شادی کی ممانعت ہوئی تھی تو ارجن خوجہ بن گیا۔ اس کے عقائد افلاطونی فلسفہ اور عیسوی مذہب سے مرکب تھے۔ یہ لوگ روح کی تاثیر کے قائل نہ تھے، صرف اپنے مجاہدہ کو ذریعہ نجات جانتے تھے۔

۳۱۔ افلاطونی فرقہ

دوسری صدی کے اختتام پر اسکندریہ میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جس پر فلسفۂ افلاطون کا اثر

---

[1] اردو تاریخ کلیسیا مطبوعہ ۱۷۱۱ء حاشیہ صفحہ ۱۵۳۔

تھا۔ جو مسائل عیسوی مذہب کے ان کی عقل کے برخلاف ہوتے تھے ان سب کا انکار کرتے تھے۔ امونیس سکاس اس گروہ کا سب سے بڑا عالم تھا، جس نے تیس برس تک اپنے عقائد کی تدریس کی۔

۳۲۔ تاتیاں کا فرقہ

انکراتیس کا فرقہ: ان دونوں فرقوں کے لوگ ریاضت اور چلہ کشی کو ذریعہ نجات سمجھتے تھے۔ عیسائیوں کے نزدیک یہ لوگ مردود اور مقہور شمار ہوتے تھے۔ یہ لوگ خدا ترس اور پرہیزگار ہوتے تھے۔ ظہور اسلام سے قبل، شام اور عرب میں یہ لوگ پائے جاتے تھے۔

۳۳۔ تھیوڈوٹس فرقہ

یہ فرقہ دوسری صدی عیسوی کے اختتام پر پیدا ہوا۔ اس گروہ نے شریعت موسوی کو ترک کر دیا اور صرف اس بات کے قائل تھے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو محض انسان جانتے تھے۔

۳۴۔ پوئی کا فرقہ

یہ فرقہ حضرت مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے اور پھر زندہ ہو کر آسمان پر چڑھ جانے کے منکر تھے۔ (اردو تواریخ کلیسیا صفحہ ۲۰۲)

۳۵۔ بلیوس کا فرقہ

اس فرقہ کا یہ اعتقاد تھا کہ خدا کی ذات کا ایک جزء جدا ہو کر حضرت مسیح میں شامل ہو گیا اور اسی طرح دوسرا جزا الگ ہو کر روح القدس بن گیا۔ اسی لیے وہ اس بات کے قائل تھے کہ جو مصلوب ہوا وہ دراصل باپ خدا تھا نہ بیٹا۔

۳۶۔ بالدی اور پالی فرقہ

یہ دونوں فرقے ایک ہزار اسّی یا نواسی عیسوی میں پیدا ہوئے جب کہ پروٹسٹنٹ فرقہ کا ظہور بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ دونوں فرقے رومی کلیسا سے عقیدہ میں مخالف تھے۔ رومی عیسائی دونوں کو واجب القتل سمجھتے تھے۔

۳۷۔ ارسیو فرقہ

اس فرقہ کا یہ اعتقاد تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مریم سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ پچاس برس کی عمر میں ہو کر غیب سے اس دنیا میں آ گئے۔ یہ لوگ عہد قدیم کی کسی ایک کتاب کو بھی نہیں مانتے۔ نہ کسی انجیل کو، مگر انجیل لوقا کو، اور اس کے بھی اوّل باب کو، جن میں حضرت مسیح علیہ السلام کا حضرت مریم علیہ السلام سے

پیدا ہونا لکھا ہے الحاقی کہتے تھے۔

۳۸۔ نزاری فرقہ

یہ فرقہ اوّل صدی عیسوی میں پیدا ہوا۔ اس فرقہ کے لوگ پولوس اور اس کے خطوط کو نہیں مانتے بلکہ اس کو مکار سمجھتے تھے۔

عیسائیت کے عقائد کے بنیادی اختلافات کی وجہ سے بے شمار فرقوں میں بٹ چکی ہے۔ اب دنیا میں جو عیسائی پائے جاتے ہیں، ان کی اکثریت عقیدہ تثلیث اور کفارہ پر ایمان رکھتی ہے۔

۳۹۔ تین کلیسائیں

۱۔ مشرقی کلیسا جو یونانی کلیسا (Orthodox Greek) کہلاتی ہے ان میں چودہ مختلف کلیسا شامل ہیں۔ مثلاً کلیسائے روس کلیسائے یونان اور کلیسائے ریاست بلقان وغیرہ۔

۲۔ رومن کیتھولک (Roman Catholic) ان میں آسٹریا، فرانس وغیرہ شامل ہیں۔

۳۔ پراٹسنٹ یعنی رومی کلیسا کی منکر جماعت۔ اس تحریک کے راہنما جرمنی میں لوتھر (Luther) سوئٹزرلینڈ میں کیلون (Calvin) اور زونگلی (Zwingli) اور سکاٹ لینڈ میں جان ناکس (John Knox) گزرے ہیں۔ ان میں کلیسائے انگلستان اور جرمن خاص طور پر مشہور ہیں۔ رومن کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں کے اختلافات ہولناک اور طویل مذہبی جنگوں پر منتج ہوئے، جن کے باعث یورپ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔ تمام عیسائی ممالک ناقابل بیان مظالم، نفرت انگیز جذباتیت، بربریت اور بہیمیت کا جو مذہبی ایذا رسانی کا لازمہ ہیں شکار ہو گئے۔ اگرچہ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ہر دو تثلیث، الوہیت مسیح، موروثی گناہ اور کفار کے عقیدوں پر متفق ہیں، پھر بھی ان میں مندرجہ ذیل بنیادی اور اصولی اختلافات ہیں:

۱۔ رومن کیتھولک کلیسیا کا یہ اعتقاد ہے کہ خدا نے اپنا منشاء بائبل میں ظاہر کیا۔ لیکن اس کے اظہار اور ابلاغ کا اختیار صرف اسی کلیسیا کو ہے اور کلیسائی احکام بے خطا اور حقیقت مطلق کے علمبردار ہیں بلکہ خدا کے خاص احکام ہیں۔ پروٹسٹنٹ اس عقیدہ کے خلاف اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ صرف بائبل ہی احکام الٰہی کی آئینہ دار ہے۔

۲۔ رومن کیتھولکوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مخصوص پادری خدا اور انسان کے متوسل ہیں اور انھیں اعتراف گناہ اور عفو گناہ کا اختیار ہے اور بشپ کی نافرمانی مسیح کی نافرمانی کے برابر ہے۔ پوپ بہ حیثیت کلیسائی سردار کے معصوم عن الخطا ہے۔ وہ مختلف عقیدے اور اصول وضع اور رائج کرنے کا مجاز ہے اور کسی کو اس کے اعمال اور اقوال پر رائے زنی کی مجال نہیں۔ پروٹسٹنٹ پوپ اور پادریوں

کے اس الٰہی مرتبہ کے معتقد نہیں۔ لیکن ان کے مختلف فرقوں میں پادریوں سے متعلق رویہ میں کوئی ہم آہنگی اور توازن نہیں۔

۳۔ رومن کیتھولکوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا اپنی قدرت کاملہ کو اولیاء کے معجزات کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔ پروٹسٹنٹ صرف مسیح کے معجزوں کو مانتے اور اولیاء کے معجزوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔

۴۔ رومن کیتھولک مقدسہ مریم کو خدا کی ماں ٹھہرا کر اس کی پرستش کرتے اور اس کے مجسمے بنا کر ان سے دعائیں کرتے ہیں۔ پروٹسٹنٹ بت پرستی کے خلاف ہیں۔

۵۔ رومن کیتھولکوں کی کئی کلیسائی رسمیں، تہوار اور دن ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ یسوع مسیح مقدس عشائے ربانی میں بذات خود حاضر ہوتا ہے اور روٹی اور شیرہ انگور حقیقتاً مسیح کے بدن اور خون میں بدل جاتے ہیں۔ پروٹسٹنٹوں کی رسمیں بجز برطانیہ کی کلیسائے اعظم کے سادہ ہیں اور یہ صرف بپتسمہ کے معتقد ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ روٹی اور شیرۂ انگور مسیح میں تبدیل نہیں ہوتے۔

۶۔ رومن کیتھولک کلیسا اپنی عبادت میں مسیح، مقدسہ مریم اور مختلف ولیوں کے بت رکھتے ہیں۔ پروٹسٹنٹ اس کو مذموم گردانتے اور توریت کے پہلے حکم کے تحت بت پرستی میں شمار کرتے ہیں۔

۷۔ مقتدر پروٹسٹنٹ فرقے لوتھرن اور کیلونیسٹ سمیت تقدیر اور نجات بالا یمان کے معتقد ہیں۔

مسیحیت کے باطل عقائد اور ان کا رد

عقیدہ حلول تجسم

حلول وتجسم کا نظریہ سب سے پہلے انجیل یوحنا میں ملتا ہے۔ یوحنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح کا آغاز ان الفاظ سے کرتا ہے۔

''ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔ یہی ابتداء میں خدا کے ساتھ تھا۔''
(یوحنا ۱:۱، ۲)

آگے چل کر لکھتا ہے۔

''اور کلام مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا جلال۔'' (یوحنا ۱:۱۴)

عیسائی مذہب میں ''کلام'' ابن اللہ سے تعبیر ہوتا ہے جو خود مستقل خدا ہے۔ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی صفت کلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انسانی جامہ میں اوتار لیا تاکہ بنی نوع انسان پر اپنی محبت ظاہر کرے اور اسے ازلی عذاب سے نجات دے۔ مارس ریلٹن نے اس عقیدے کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کیتھولک عقیدے کا کہنا ہے کہ وہ ذات جو خدا تھی، خدائی کی صفات کو چھوڑے بغیر، انسان بن گئی۔ یعنی اس نے ہمارے جیسے وجود کی کیفیات اختیار کر لیں۔ جو زبان و مکان کی قیود میں مقید ہے اور ایک عرصہ تک ہمارے درمیان رہی۔

اس عقیدہ کی رو سے حضرت مسیح علیہ اسلام بیک وقت خدا بھی تھے اور انسان بھی الفریڈ ای۔ گارد اس عقیدہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''وہ (حضرت مسیح علیہ السلام) حقیقۃً خدا بھی تھے اور انسان بھی ان کی ان دونوں حیثیتوں میں سے کسی ایک کے انکار یا ان کے وجود میں دونوں کے متحد ہونے کے انکار ہی سے مختلف بدعتی نظریات پیدا ہوئے۔ اتھاناتے شیس نے آریوں کے مقابلے میں اس نظریے کی پُر زور حمایت کی تھی۔ لہٰذا منظور شدہ فارمولا یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ایک شخصیت میں دو ماہتیں جمع ہو گئی تھیں۔'' (انسائیکلو پیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس ص ۵۸۶ ج ۳ مقالہ ''عیسائیت'' انسانی حیثیت سے حضرت مسیح علیہ السلام خدا سے کم رتبہ تھے۔ اسی لیے انھوں نے فرمایا کہ ''باپ مجھ سے بڑا ہے۔'' (یوحنا ۱۴: ۲۸)

خدائی حیثیت سے وہ ''باپ کے ہم رتبہ ہیں۔ یوحنا میں آپ کا یہ قول ہے۔ ''میں اور باپ ایک ہیں۔'' (یوحنا ۱۰: ۳۰)

آگسٹائن لکھتا ہے کہ:

''چونکہ خدا نے بندے کا روپ اس طرح نہیں اپنایا تھا کہ اپنی اس خدائی حیثیت کو ختم کر دے۔ جس میں وہ باپ کے برابر ہے..... لہٰذا ہر شخص اس بات کو محسوس کر سکتا ہے کہ یسوع مسیح اپنی خدائی شکل میں خود اپنے آپ سے افضل ہیں اور اسی طرح اپنی انسانی حیثیت میں خود اپنے آپ سے کمتر بھی ہیں۔''[1]

عقیدہ حلول کی اساس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وہ اقوال ہیں جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے روحانیت پر زور دیا اور کہا کہ ''خدا کی بادشاہت تمھارے اندر ہے۔'' (لوقا ۱۷: ۲۱) اور میں اور میرا باپ ایک ہیں۔'' (یوحنا ۲۰: ۱۰) ''جو مجھے دیکھتا ہے وہ میرے بھیجنے والے کو دیکھتا ہے۔'' (یوحنا ۱۲: ۴۵) ان اقوال کی بناء پر حضرت مسیح علیہ السلام کے ماننے والے آپ کو خدا ماننے لگے۔ ''وہ غیر مرئی خدا کی صورت ہے۔'' (کلسیوں ۱: ۱۵) ''یسوع مسیح خدا کی صورت پر تھا۔'' (فلپیون ۲: ۶)

حضرت مسیح علیہ السلام ہی خدائی صورت پر پیدا نہیں کیے گئے بلکہ کل انسانوں کو ''خدا نے اپنی صورت پر پیدا کیا۔ اور اپنی مانند بنایا۔'' (پیدائش باب ۱ آیات ۲۶، ۲۷)

حضرت مسیح علیہ السلام نے نہ خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور نہ ابن اللہ ہونے کا، ان الفاظ کی وضاحت اور تشریح از روئے بائبل بعد میں آئے گی۔

---

1. آگسٹائن (On the trinty) ص ۶۷۸ ج ۲۔

مسیح نے خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا

حضرت مسیح علیہ السلام نے خدا یا ابن اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ یہ الفاظ انہی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں جن معنوں میں تمام انبیاء علیہم السلام اور بزرگوں پر استعمال ہوتے رہے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت مسیح علیہ السلام نے یہودیوں کے سامنے دعویٰ کیا کہ میں ابن اللہ ہوں۔ یہود یہ سن کر طیش میں آ گئے اور انھوں نے ارادہ کیا کہ مسیح پر پتھراؤ کریں۔ مسیح نے کہا کہ تم مجھے کس قصور پر سزا دیتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ تو انسان ہو کر اپنے تئیں خدا بناتا ہے، اس کفر بکنے کی ہم سزا دیتے ہیں۔ مسیح نے جواب میں کہا: کیا تمہاری شریعت میں نہیں لکھا کہ میں نے کہا کہ تم خدا ہو جب کہ اس نے انھیں جن کے پاس کلام آیا خدا کہا اور ممکن نہیں کہ کتاب باطل ہو۔[1]

حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ بیان ابن اللہ ہونے کی حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ وہ تمام لوگ جن کے پاس خدا کا کلام آیا یعنی وہ خدا ہیں۔

ابن اللہ کا لفظ بائبل میں نہایت ہی وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ عہد نامہ کی رو سے کئی قسم کے لوگ خدا کے بیٹے کہلاتے ہیں:

۱۔	آدم علیہ السلام	خدا کے بیٹے	لوقا ۳ باب ۳۸۔
۲۔	شیث علیہ السلام	خدا کے بیٹے	پیدائش ۶ باب ۲۔
۳۔	اسرائیل علیہ السلام	خدا کے بیٹے	خروج ۴ باب ۲۲۔
۴۔	افرائیم علیہ السلام	خدا کا پلوٹھا بیٹا	یرمیاہ ۳۱ باب ۹۔
۵۔	داؤد علیہ السلام	خدا کے بڑے بیٹے	زبور ۸۹۔ ۲۶، ۲۷۔
۶۔	سلیمان علیہ السلام	خدا کے بیٹے	۱ تاریخ ۲۲ باب ۹، ۱۰، ۲۸ باب ۲۶۔
۷۔	قاضی مفتی	خدا کے بیٹے	زبور ۸۲: ۶۔
۸۔	تمام بنی اسرائیل	خدا کے بیٹے	رومی ۹ باب ۴۔
۹۔	تمام حواری	خدا کے بیٹے	۱ یوحنا ۳ باب ۲۔
۱۰۔	سب عیسائی	خدا کے بیٹے بلکہ سب مومن۔	۱ یوحنا ۳ باب ۹۔
۱۱۔	سب یتیم	خدا کے بیٹے	زبور ۶۸: ۵۔
۱۲۔	سب خاص و عام	خدا کے بیٹے	متی ۶ باب ۶، ۱۸، ۷ باب ۱۱ پیدائش ۶ باب ۴۔
۱۳۔	اشراف	خدا کے بیٹے	پیدائش ۹ باب ۲۔
۱۴۔	فرشتے	خدا کے بیٹے	دانیات ۳: ۲۸۔ زبور ۳۴: ۷۔
			ایوب ۱: ۶، ایوب ۲۸: ۷۔

[1] یوحنا باب ۱۰: ۳۴۔ ۳۶۔

ان تمام مقامات میں ابن اللہ کا کلمہ صلحا لوگوں پر بولا گیا ہے۔ ان میں نہ کوئی خدا ہے اور نہ اس کا کوئی بیٹا۔ لہٰذا ان محاورات کی رو سے مسیح ابن اللہ بھی صرف انسان ہی ہیں۔

ابن اللہ اور عہد نامہ جدید

عہد نامہ جدید میں کلمہ ''ابن اللہ'' (خدا کا بیٹا) ان لوگوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگین ہوتے تھے۔ متی ۵:۹ میں ہے۔

''مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔''

لوقا ۶: ۳۵ میں ہے:

''مگر تم اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور بھلا کرو اور بغیر نا امید ہوئے قرض دو تو تمہارا اجر بڑا ہوگا اور تم خدا کے بیٹے ٹھہرو گے۔''

یوحنا ۱۲:۱ میں مذکور ہے۔

لیکن جنھوں نے اسے قبول کیا اس نے انھیں خدا کے فرزند کا حق بخشا۔

یوحنا کا پہلا خط ۳ باب ۱: دیکھو کیسی محبت باپ نے ہم سے کی ہے کہ ہم خدا کے فرزند کہلاویں۔

اے پیارو! ہم خدا کے فرزند ہیں اور ہنوز ظاہر نہیں ہوا کہ ہم کیا کچھ ہوں گے۔ پر ہم جانتے ہیں کہ جب وہ ظاہر ہوگا تو ہم اس کی مانند ہوں گے۔

اور یوحنا کے ۴ باب ۷ میں کہا ہے: ہر ایک جو محبت رکھتا ہے سو خدا سے پیدا ہوا ہے۔

اور یوحنا کے پہلے خط ۳ باب ۹ میں ہے: ہر ایک جو خدا سے پیدا ہوا ہے گناہ نہیں کرتا کیونکہ اس کا تخم اسی میں رہتا ہے اور وہ گناہ نہیں کر سکتا کیونکہ وہ خدا سے پیدا ہوا ہے۔ اسی سے خدا کے فرزند اور شیطان کے فرزند ظاہر ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی بشریت

مندرجہ بالا محاورات کی رو سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ عہد نامہ میں ابن اللہ کا لفظ مجاز کے طور پر استعمال ہوا ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں۔ عہد نامہ جدید میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ابن انسان ہونا بھی ثابت ہے:

۱۔ متی ۱ باب ۱ یسوع ابن داؤد بن ابراہام کا نسب نامہ۔

۲۔ متی ۱۱ باب آیت ۱۹: انسان کا بیٹا کھاتا پیتا آیا۔

۳۔ متی باب ۴: ۴ میں جو ابن آدم ہوں انسان ہوں۔

۴۔ متی ۸ باب ۲۰: ابن آدم مسیح ہیں۔

مسیح علیہ السلام نے چاروں اناجیل میں ۷۰ مرتبہ اپنے آپ کو ابن آدم کہا ہے اور کہلوایا۔

انسائیکلو پیڈیا ببلیکا صفحہ ۲۶۹۲ پر لکھا ہے کہ:

''سنا ٹپک اناجیل (متی، لوقا، مرقس) میں مسیح کا کوئی قول ایسا نہیں جس میں آپ نے خصوصیت سے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا ہو۔''

حضرت مسیح علیہ السلام میں خدا کی صفات نہیں تھیں۔

پہلی صفت

اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہے اور ذرہ ذرہ کا اس کو علم ہے۔ یہ صفت حضرت مسیح علیہ السلام میں پوری موجود نہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام خود فرماتے ہیں:

''لیکن اس دن یا اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا، نہ آسمان کے فرشتے، نہ بیٹا، مگر صرف باپ۔ (متی ۲۴: ۳۶ اور مرقس ۱۳: ۳۲)

''تو ہاں تو ہی اکیلا سارے بنی آدم کے دلوں کو جانتا ہے۔'' (اسلاطین ۸: ۳۹)

دوسری صفت

اللہ تعالیٰ معبود اور سمیع الدعا ہے۔ لیکن حضرت مسیح علیہ السلام خود اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور اس سے دعائیں مانگتے۔ متی ۱۱، ۲۵ میں ہے:

''اس وقت یسوع نے کہا: اے باپ آسمان اور زمین کے خداوند میں تیری حمد کرتا ہوں۔''

متی ۲۶ باب آیت ۳۸۔۴۴ میں ہے کہ مسیح علیہ السلام خود جنگلوں میں جا کر دعا مانگا کرتے تھے بلکہ حواریوں کو کہا کرتے تھے کہ اٹھو میرے لیے خدا سے دعا کرو۔

لوقا ۵: ۱۶، ۲۲: ۲۴ میں ہے کہ مسیح نے دعا مانگی۔

کیا خدا بھی کسی کی دعا کا محتاج ہے؟

تیسری صفت

خدا قیوم ہے۔ مگر مسیح علیہ السلام قیوم نہیں تھے۔ متی ۲۰ باب ۲۳ میں ہے:

''دائیں بائیں بٹھانا میرا کام نہیں، مگر اسی کو جن کے لیے میرے باپ سے تیار کیا گیا۔''

چوتھی صفت

اللہ تعالیٰ زندہ ہے اور اس پر کبھی موت وارد نہیں ہو سکتی۔ مگر انجیل کہتی ہے کہ مسیح پر موت وارد ہوئی اور تین دن تک مردہ پڑا رہا۔ (متی ۱۷ باب آیت ۲۳)

''ہمارے باپ دادوں کے خدا نے یسوع کو جلایا جسے تم نے صلیب پر لٹکا کر مار ڈالا تھا۔''
(اعمال ۵:۳۰)

پانچویں صفت

اللہ تعالیٰ کی صفت لاتدرکہ الابصار ہے۔ مسیح رحم مادر میں ایک عرصہ رہنے کے بعد پیدا ہوئے اور پھر ''وہ لڑکا بڑھتا اور قوت پاتا گیا اور حکمت سے معمور ہوتا گیا اور خدا کا فضل اس پر تھا۔'' (لوقا ۲:۴۰) انھوں نے خود کہا: ''لومڑیوں کے بھٹ ہوتے ہیں اور ہوا کے پرندوں کے گھونسلے، مگر ابن آدم کے لیے سر دھرنے کی جگہ بھی نہیں۔'' (لوقا ۹:۵۸)

چھٹی صفت

اللہ تعالیٰ کی صفت لاتاخذہ سنۃ و لا نوم یعنی وہ نیند اور غفلت سے بری ہے۔ مگر انجیل سے یہ بات ثابت ہے کہ مسیح پر نیند کا غلبہ ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک دن مسیح علیہ السلام حواریوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے تھے کہ اتنے میں بڑے زور و شور سے طوفان آیا مگر مسیح نہ جاگا۔ جب حواریوں نے جگایا تب ان کو ہوش آیا۔ (لوقا ۸ باب آیت ۲۳، ۲۴)

ساتویں صفت

اللہ تعالیٰ قادر ہے مگر مسیح علیہ السلام کا قول ہے کہ میں اپنے آپ کچھ نہیں کر سکتا۔ (یوحنا ۵ باب آیت ۳۰)

''ہاں وہ کمزوری کے سبب سے صلیب دیا گیا لیکن قدرت کے سبب زندہ ہے۔'' (۲ کرنتھیوں ۱۳:۱۴)

آٹھویں صفت

اللہ تعالیٰ الملک یعنی دونوں جہان کا بادشاہ ہے۔ مگر مسیح علیہ السلام کو اقرار ہے کہ مری بادشاہت اس جہان میں نہیں۔ (یوحنا ۱۸ باب آیت ۳۶)

نویں صفت

اللہ تعالیٰ غنی یعنی کسی دوسرے کی مدد کا محتاج نہیں۔ مگر مسیح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے کہا: ایلی ایلی لما سبقتانی یعنی اے میرے خدا تو میری کیوں مدد نہیں کرتا۔ (مرقس ۱۵ باب آیت ۳۴)
''اور وہ محتاج تھا۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ اسے گدھی اور اس کے بچے کی بھی احتیاج پیدا ہوئی۔''
(متی ۲۱:۳)

دسویں صفت

اللہ تعالیٰ السلام یعنی ہر ذات اور رسوائی سے پاک ہے، مگر عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح کے منہ پر یہودیوں نے تھوکا۔ اس کے منہ پر طمانچے مارے۔ سر پر کانٹوں کا تاج پہنا دیا۔ کوڑے مارے اور بالآخر نہایت ذلت ورسوائی کے ساتھ صلیب پر لٹکا دیا۔

گیارھویں صفت

اللہ تعالیٰ وراء الوریٰ ہستی ہے اور کوئی اس کی آزمائش نہیں کر سکتا، نہ نیکی سے نہ بدی سے۔ چنانچہ یعقوب رسول کہتا ہے: ''نہ تو خدا بدی سے آزمایا جا سکتا ہے اور وہ کسی کو آزماتا ہے۔'' (۱۳:۱)

انجیل سے یہ ظاہر ہے کہ یسوع مسیح کو چالیس دن تک شیطان آزماتا رہا:

''چالیس دن تک روح کی ہدایت سے بیابان میں پھرتا رہا اور ابلیس اسے آزماتا رہا جب ابلیس تمام آزمائش کر چکا تو کچھ عرصے کے لیے اس سے جدا ہوا۔'' (لوقا۴: ۱.....۱۳)

معجزاتِ مسیح کی حقیقت عہد نامہ جدید کی روشنی میں

عیسائیوں کی طرف سے حضرت مسیح علیہ السلام کی خدائی اور الوہیت کی یہ دلیل دی جاتی ہے کہ انھوں نے ایسے معجزات دکھائے جو بشری طاقت سے بالاتر تھے۔ مسیح علیہ السلام کا سب سے معجزہ مردوں کو زندہ کرنا ہے۔ بائبل کی رو سے دوسرے انبیاء علیہم السلام نے بھی یہ معجزہ دکھایا۔

الیشع نبی نے مردہ لڑکے کو زندہ کیا، لکھا ہے:

''جب الیشع اس گھر میں آیا تو دیکھا وہ لڑکا مرا ہوا اس کے پلنگ پر پڑا تھا۔ سو وہ اکیلا اندر گیا اور دروازہ بند کر کے خداوند سے دعا کی اور اوپر چڑھ کے اس بچے پر لیٹ گیا اور اس کے منہ پر اپنا منہ اور اس کی آنکھوں پر اپنی آنکھیں اور اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھے اور اس کے اوپر پسر گیا۔ تب اس بچے کا جسم گرم ہونے لگا۔ پھر وہ اُٹھ کر اس گھر میں ایک بار ٹہلا اور اوپر چڑھ کر اس بچے کے اوپر پسر گیا۔ وہ بچہ سات بار چھینکا اور بچے نے آنکھیں کھول دیں..... تب اس نے اس کی والدہ کو بلایا اور جب وہ اس کے پاس آئی تو اس نے اس سے کہا: اپنے بیٹے کو اٹھا لے۔ تب وہ اندر جا کر اس کے قدموں پر گری اور زمین پر سرنگوں ہوگئی اور پھر اپنے بیٹے کو اٹھا کر چلی گئی۔''[1]

عزقی ایل نبی ارشاد فرماتا ہے:

''خداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا اور اس نے مجھے اپنی روح میں اٹھا لیا اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے پُر تھی مجھے اتار دیا..... اس نے مجھے فرمایا: تو ان ہڈیوں پر نبوت کر اور ان سے کہہ اے سوکھی ہڈیو! خداوند کا کلام

[1] ۲ سلاطین۴: ۳۲.....۳۵۔

سنو.... پس میں نے حکم کے مطابق نبوت کی اور جب میں نبوت کر رہا تھا تو ایک شور ہوا اور دیکھ زلزلہ آیا اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں.... نسیں اور گوشت ان پر چڑھ آئے اور ان پر چمڑے کی پوشش ہوگئی، پر ان میں دم نہ تھا.... میں نے نبوت کی اور ان میں دم آیا اور وہ زندہ ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئیں ایک نہایت بڑا لشکر۔"[1]

الیشع کی مردہ لاش نے مردہ زندہ کیا:

"اور الیشع نے وفات پائی اور انھوں نے اسے دفن کیا اور نئے سال کے شروع میں موآب کے جتھے ملک میں گھس آئے اور ایسا ہوا کہ جب وہ ایک آدمی کو دفن کر رہے تھے تو ان کو ایک جتھا نظر آیا۔ سو انھوں نے اس شخص کو الیشع کی قبر میں ڈال دیا اور وہ شخص الیشع کی ہڈیوں سے ٹکراتے ہی جی اٹھا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔"[2]

دوسرا معجزہ

بیماروں کو اچھا کرنا۔

اس معجزہ میں بھی حضرت مسیح علیہ السلام کو کوئی خاص خصوصیت حاصل نہیں، دوسرے انبیاء علیہم السلام نے بھی یہ معجزہ دکھایا۔

۱۔ الیشع نے نعمان سپہ سالار کو جو کوڑھی تھا اچھا کیا۔[3]

۲۔ یوسف نے اپنے باپ یعقوب کو آنکھیں دیں۔[4]

تیسرا معجزہ

تھوڑے کھانے اور شراب کو بڑھا دینا۔

یہ کام بھی بہت سے انبیاء علیہم السلام سے ظہور پذیر ہوا۔

۱۔ ایلیاہ نے مٹھی بھر آٹے اور تھوڑے تیل کو بڑھا دیا کہ وہ سال بھر تک تمام نہ ہوا۔[5]

۲۔ الیشع نے بھی تیل کو برکت سے بڑھایا۔[6]

چوتھا معجزہ

بغیر کشتی کے دریا پر چلنا۔

اس معجزہ سے بڑھ کر دوسرے انبیاء علیہم السلام نے اس نوعیت کے معجزات دکھائے۔

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمندر کو ایسی لٹھ ماری کہ وہ پھٹ گیا اور سیال پانی الگ الگ دونوں

---

[1] حزقی ایل ۳۷ باب ۱ تا ۱۳۔
[2] ۲ سلاطین ۱۴:۲۰۔
[3] ۲ سلاطین باب ۵ آیت ۱۴۔
[4] پیدائش باب ۴۶ آیت ۱۴......۳۰۔
[5] ۱ سلاطین باب ۱۷ آیت ۱۳......۱۶۔
[6] ۲ سلاطین ۴ باب ۲......۶۔

طرف کھڑا ہو گیا۔ ہزاروں بنی اسرائیل خشک سمندر سے پار ہو گئے اور فرعون کو داخل ہوتے ہی دبا لیا۔[1]

۲۔ یوشع نے یردن کو پایاب ہی نہیں کیا بلکہ سکھلا دیا۔[2]

۳۔ ایلیا اور الیشع نے بھی دریا کو دو ٹکڑے کر دیا۔[3]

انجیل کے محاورہ کے لحاظ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کی حقیقت

مردہ کا زندہ ہونا کتاب مقدس کی رو سے کوئی بات مافوق العادت معلوم نہیں ہوتی۔ یہ ایک عام محاورہ ہے جس سے مراد روحانی مردوں کو زندہ کرنا اور گنہگاروں کو نیک تعلیم کے ذریعہ نیک بناتا ہے۔ یسوع مسیح اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرماتے ہیں:

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص میرے کلام پر عمل کرے گا تو ابد تک کبھی موت کو نہ دیکھے گا۔''[4]

''خدا کو سارے دل، ساری جان، سارے زور سے، ساری سمجھ سے پیار کر اور پڑوسی کو جیسا اپنے ساتھ تو تو جیئے گا۔[5]

پس مسیح نے جن مردوں کو زندہ کیا ہے ان کو اپنی پاک تعلیم سے نیک بنایا ہے۔

بیماروں سے مراد روحانی بیمار مراد ہیں۔

''وے جو نہیں دیکھتے ہیں اور جو دیکھتے ہیں اندھے ہو جائیں۔''[6]

یہاں اندھا ہونا اور دیکھنا حقیقی معنوں میں نہیں بولا گیا بلکہ روحانی بصارت اور اندھا پن مراد ہے۔

مرقس ۱۲:۱۷ اور پطرس ۲:۲۴ کی عبارتیں واضح کرتی ہیں کہ بیماروں سے مراد روحانی بیمار ہیں۔

کھانا بڑھانا

انجیلی محاورہ میں کھانے کے معنی بھی کچھ اور ہیں۔

یسوع نے کہا: میرا کھانا یہ ہے کہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی بجالاؤں۔[7]

مسیح کہتا ہے: زندگی کی روٹی میں ہوں۔ تمھارے باپ دادوں نے بیابان میں من کھایا اور مر گئے۔ روٹی جو آسمان سے اتری ہے وہ یہ ہے کہ کوئی ایسی کھالے تو نہ مرے۔[8]

میں ہوں وہ جیتی روٹی جو آسمان سے اتری۔ اگر کوئی شخص اس روٹی کو کھائے تو ابد تک جیتا رہے

[1] خروج ۱۴ باب ۲۱، ۲۲۔
[2] یوشع ۱۳ باب ۱۴۔
[3] ۲ سلاطین ۲:۸۔
[4] یوحنا ۸:۲۵
[5] لوقا ۱۵ باب ۲۳۔
[6] یوحنا ۹ باب ۳۹۔
[7] یوحنا ۴ باب ۳۴۔
[8] یوحنا ۶ باب ۴۸۔

اور روٹی جو میں دوں گا وہ میرا گوشت جو میں جہان کی زندگی کے لیے دوں گا۔

پانی کا محاورہ

مسیح ایک عورت کو فرماتے ہیں: اگر تو مجھ سے پانی مانگے تو میں جیتا پانی دیتا۔[1]

اگر کوئی پیاسا ہو مجھ پاس آئے اور پئے۔ جو مجھ پر ایمان لاتا ہے اس کے بدن سے جیسے کتاب کہتی ہے جیتے پانی کی ندیاں جاری ہوں گی۔[2]

نہر اور دریا کا محاورہ

انھوں نے مجھ جیتے پانی کو چھوڑ دیا۔[3]

انھوں نے خدا کو جو آب حیات کا سوتا ہے ترک کیا۔[4]

پس معلوم ہوا کہ مردوں کو زندہ کرنا، اندھوں کو بینائی بخشنا، کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا وغیرہ۔ سب مسیح علیہ السلام کا مجازی کلام ہے، جن سے مراد گنہگاروں کی روحانی بیماریاں دور کرنا اور روحانی زندگی عطا کرنا ہے۔ اس کام کے لیے انبیاء علیہم السلام دنیا میں آتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ اے لوگو! جو ایمان لاتے ہو اللہ اور رسول کا حکم مانو جب وہ تم کو اس کے لیے بلاتا ہے جو تمھیں زندگی دیتا ہے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی پیروی روحانی زندگی کا باعث ہے۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام نے روحانی مردہ زندہ کیے ہیں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے کہیں بڑھ کر مردے زندہ کیے۔ (انفال ۸:۲۴)

بنیادی اصول

کلام خواہ آسمانی ہو یا انسانی، اس میں کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو محکمات کہا جاتا ہے۔ ان کے معنی اور مطالب صاف اور واضح ہوتے ہیں۔ کچھ کلام متشابہ ہوتا ہے جو مجاز اور استعارہ پر مشتمل ہوتا ہے مجاز اور استعارہ سے کلام میں فصاحت اور بلاغت پیدا ہوتی ہے اور دلوں پر اثر ڈالتی ہے۔ مذہبی اعتقادات کی بنیاد محکمات پر ہوتی ہے اور متشابہ کلام کو محکمات کی روشنی میں حل کیا جاتا ہے۔

مسیح علیہ السلام کے کلام کا ایک حصہ مجاز اور استعارات پر محمول تھا۔ متی کی انجیل میں لکھا ہے:

شاگردوں نے پاس آ کر اس سے کہا: تو ان سے تمثیلوں میں کیوں باتیں کرتا ہے؟ یسوع نے جواب دیا: میں ان سے تمثیلوں میں اس لیے باتیں کرتا ہوں کہ وہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سنتے اور نہیں

---

[1] یوحنا ۴ باب ۱۱۔ [2] یوحنا ۷ باب ۳۷۔

[3] یرمیاہ ۲ باب ۱۳۔ [4] یرمیاہ ۱۷ باب ۱۳۔

سمجھتے۔" (۱۳:۱۴، ۱۰:۱۳)

کتاب مقدس کی رو سے جسمانی مردے دوبارہ زندہ نہیں ہوتے، ایوب نبی ارشاد فرماتے ہیں:
"جیسے بادل پھٹ کر غائب ہو جاتا ہے ایسے ہی وہ جو قبر میں اترتا ہے پھر کبھی اوپر نہیں آتا۔ وہ اپنے گھر کو پھر نہ لوٹے گا، نہ اس کی جگہ پھر اسے پہچانے گی۔"[۱]

بائبل میں لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا بیٹا جو اس کی بیوی بت سبع سے پیدا ہوا بیمار ہو کر فوت ہو گیا۔ "تب داؤد زمین پر سے اٹھا اور غسل کر کے اس نے تیل ملا اور پوشاک بدلی اور خداوند کے گھر میں جا کر سجدہ کیا۔ پھر وہ اپنے گھر آیا اور اس کے حکم دینے پر انھوں نے اس کے آگے روٹی رکھی اور اس نے کھائی تب اس کے ملازموں نے اس سے کہا: یہ کیسا کام ہے جو تو نے کیا؟ جب وہ لڑکا جیتا تھا تو تو نے اس کے لیے روزہ رکھا اور روتا بھی رہا اور جب وہ مر گیا تو تو نے اٹھ کر روٹی کھائی۔ اس نے کہا کہ جب تک وہ لڑکا زندہ تھا۔ میں نے روزہ رکھا اور میں روتا رہا کیونکہ میں نے سوچا کیا جانے خداوند کو مجھ پر رحم آ جائے کہ وہ لڑکا جیتا رہے۔ پر اب تو وہ مر گیا، پس میں کس لیے روزہ رکھوں؟ کیا میں اسے لوٹا لا سکتا ہوں؟ میں تو اس کے پاس جاؤں گا، پر وہ میرے پاس نہیں لوٹے گا۔"[۲]

حضرت داؤد علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے وہ دوبارہ اس دنیا میں نہیں آتا۔ جب محکم اصول یہ ٹھہرا کہ کوئی شخص مر کر دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا تو اس اصول کی روشنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ "مردوں کو زندہ کرنے" کی یہ تعبیر کی جائے گی کہ وہ مردے حقیقی مردے نہ تھے بلکہ وہ گناہگار انسان تھے، جن کی روح گناہوں کی آلودگیوں سے مر چکی تھی۔ آپ نے اپنی قوتِ قدسیہ سے ان کو گناہوں سے پاک کیا اور روحانی زندگی بخشی۔

مسیح علیہ السلام کا بن باپ پیدا ہونا

عیسائی صاحبان مسیح علیہ السلام کی الوہیت پر ان کا بے باپ پیدا ہونے کی دلیل دیتے ہیں۔ یہ دلیل بھی نہایت کمزور ہے اور ان کے مدعا کو پورا نہیں کرتی۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حوا یہود اور عیسائیوں کے اعتقاد کے مطابق بے ماں اور بے باپ پیدا ہوئے۔

ملک صدق سالم بھی بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے۔[۳]

اگر مسیح علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہونے سے خدائے مجسم ٹھہرتے ہیں تو آدم اور حوا اور ملک صدق بھی خدائے مجسم ہوں گے۔ لیکن عیسائی ان کو خدائے مجسم نہیں مانتے۔

حضرت آدم علیہ السلام کا بن ماں باپ ہونا۔ (پیدائش ۱:۲۷)

حضرت حوا بغیر ماں کے پیدا ہوئیں۔

۱۔ ایوب ۷:۹۔ ۲۔ ۲ سموئیل ۱۲:۲۰......۲۳۔ ۳۔ عبرانیوں باب ۷ آیت ۳۔

''یہ (ملک صدق) بے باپ بے ماں بے نسب نامہ جس کے نہ دنوں کا شروع نہ زندگی کا آخر مگر خدا کے بیٹے سے مشابہ ٹھیر کے ہمیشہ کاہن رہتا ہے۔'' (عبرانیوں باب ۷:۳)

تثلیث کیا ہے

عیسائی مذہب تثلیث تین اقانیم (Persons) سے مرکب ہے۔ باپ، بیٹا اور روح القدس۔ اس عقیدے کو عقیدہ تثلیث کہا جاتا ہے۔ اس عقیدہ کی تشریح و توضیح میں عیسائی فضلا کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں باپ، بیٹے اور روح القدس کے مجموعہ کا نام خدا ہے۔[1] عام عیسائیوں کا یہی عقیدہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ باپ بیٹا اور کنواری مریم وہ تین اقنوم ہیں جن کا مجموعہ خدا ہے۔[2]

عرب میں عیسائیوں کا ایک فرقہ ''ایزمدتمیں اس کا قائل تھا۔

پھر ان اقانیم میں سے ہر ایک کی انفرادی حیثیت کیا ہے۔

اس بارہ میں بھی عیسائی فضلا کا شدید اختلاف ہے۔ ''بعض فضلا کہتے ہیں کہ ان تین میں سے ہر ایک بذات خود بھی ویسا ہی خدا ہے جیسا مجموعہ خدا ہے۔''[3]

علماء کا دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ ان تینوں میں سے ہر ایک الگ الگ خدا تو ہیں مگر مجموعہ خدا سے کمتر ہیں۔ اور ان پر ہر لفظ خدا کا اطلاق ذرا وسیع معنی میں کیا گیا ہے۔[4]

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ یہ تین ہی نہیں خدا تو صرف ان کا مجموعہ ہے۔ یہ فرقہ مرفولیہ کا مذہب ہے۔ اس جگہ وہ تشریح درج کی جاتی ہے جو عیسائیوں میں مقبول ہے اور یہ تشریح انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

''تثلیث کے عیسائی نظریے کو ان الفاظ میں اچھی طرح تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ باپ خدا ہے۔ بیٹا خدا ہے اور روح القدس خدا ہے لیکن یہ مل کر تین خدا نہیں ہیں بلکہ خدا ایک ہی خدا ہیں اس لیے کہ عیسائی نظریے کے مطابق ہم جس طرح ان تینوں میں سے ہر ایک اقنوم کو خدا اور آقا سمجھنے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح ہمیں کیتھولک مذہب نے اس بات کی بھی ممانعت کر دی ہے کہ ہم ان کو تین خدا یا تین آقا سمجھنے لگیں۔''

تیسری صدی عیسوی کے مشہور عیسائی عالم سینٹ آگسٹائن اپنی کتاب تثلیث (On the trinity) میں لکھتے ہیں۔ ''عہد قدیم اور عہد جدید کے وہ تمام کیتھولک علماء جنھیں پڑھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے اور جنھوں نے مجھ سے پہلے تثلیث کے موضوع پر لکھا ہے وہ سب مقدس صحیفوں کی روشنی میں اس نظریے کی تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ باپ بیٹا اور روح القدس مل کر ایک ''خدائی وحدت'' تیار کرتے ہیں۔ جو اپنی ماہیت اور حقیقت کے اعتبار سے ایک ناقابل تقسیم ہے۔ اسی وجہ سے وہ تین خدا نہیں ہیں بلکہ ایک خدا ہے۔

---

1. انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ص ۴۹۷ ج ۲۲۔ مقالہ تثلیث (Trinity)
2. نوید جاوید ص ۳۵۶ بحوالہ پادری سیل صاحب۔
3. انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ۱۹۵۰ صفحہ ۴۱۹ جلد ۲۲ مقالہ تثلیث۔
4. Basic writings of Thomas aquinas P 327 V.I

اگر چہ باپ نے بیٹے کو پیدا کیا۔ لہٰذا جو باپ ہے وہ بیٹا نہیں اسی طرح بیٹا باپ سے پیدا ہوا۔ اس لیے جو بیٹا ہے وہ باپ نہیں اور روح القدس بھی نہ باپ ہے نہ بیٹا بلکہ باپ اور بیٹے کی روح ہے جو دونوں کے ساتھ مساوی اور تثلیثی وحدت میں ان کی حصہ دار ہے۔"

باپ

عیسائیوں کے نزدیک باپ سے مراد خدا کی تنہا ذات ہے یہ ذات بیٹے کے وجود کے لیے اصل ہے۔ مشہور عیسائی فلاسفر سینٹ تھامس باپ کی تشریح وتعبیر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "باپ کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے کسی کو جنا ہے اور کوئی ایسا وقت گزرا ہے جس میں باپ تھا اور بیٹا نہیں تھا۔

بلکہ یہ ایک خدائی اصطلاح ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ باپ بیٹے کے لیے اصل ہے۔ جس طرح ذات صفت کے لیے اصل ہوتی ہے۔ ورنہ جب سے باپ موجود ہے اسی وقت سے بیٹا بھی موجود ہے اور ان میں سے کسی کو کسی پر کوئی زمانی اولیت حاصل نہیں ہے۔[1]

خدا کو باپ کیوں کہا جاتا ہے۔ الفریڈ ای گاروے نے لکھا ہے کہ:

"اس سے کئی حقائق کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے ایک تو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ تمام مخلوقات اپنے وجود میں خدا کی محتاج ہیں۔ جس طرح بیٹا باپ کا محتاج ہوتا ہے دوسری طرف یہ بھی ظاہر کرنا ہے کہ خدا اپنے بندوں پر اس طرح شفیق اور مہربان ہے جس طرح باپ اپنے بیٹے پر مہربان ہوتا ہے۔

(انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس ص ۵۸۵ ج ۳)

بیٹا

بیٹے سے مراد عیسائیوں کے نزدیک خدا کی صفت کلام (Word of God) ہے۔ انسانوں کی صفت کلام اور خدا کی صفت کلام کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے سینٹ تھامس ایکونیاس رقمطراز ہے کہ:

"انسانی فطرت میں صفت کلام کوئی جوہری وجود نہیں رکھتی، اسی وجہ سے اس کو انسان کا بیٹا یا مولود نہیں کہہ سکتے، لیکن خدا کی صفت کلام ایک جوہر ہے جو خدا کی بابت میں اپنا ایک وجود رکھتا ہے۔ اسی لیے اس کو حقیقۃً نہ مجازاً بیٹا کہا جاتا ہے اور اس کی اصل کا نام باپ ہے۔[2]

صفت کلام باپ کی طرح قدیم ہے۔ خدا کی یہی صفت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انسانی شکل میں حلول کر گئی تھی۔ جس کی وجہ سے یسوع بن مریم کو خدا کا بیٹا کہا جاتا ہے۔

روح القدس

روح القدس (Holy Spirit) سے مراد باپ اور بیٹے کی صفت حیات اور صفت محبت ہے۔

---

1. Basic writings of Thomas Aquinas PP. 324......26 V.1.
2. Aquinas the smma theologica Q.33 ART 206,3.

یعنی اس صفت کے ذریعہ خدا کی ذات (باپ) اپنی صفت علم (بیٹے) سے محبت کرتی ہے اور بیٹا باپ سے محبت کرتا ہے۔ یہ صفت بھی جوہری وجود رکھتی ہے اور باپ بیٹے کی طرح قدیم ہے، اسی وجہ سے اسے مستقل اقنوم کی حیثیت حاصل ہے۔[1]

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ جب تک حضرت مسیح علیہ السلام کو بپتسمہ دیا جا رہا تھا تو یہی صفت ایک کبوتر کے جسم میں حلول کر کے حضرت مسیح علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ (متی ۳:۱۶) خلاصہ کلام یہ نکلا کہ خدا تین اقانیم پر مشتمل ہے۔ خدا کی ذات جسے باپ کہتے ہیں خدا کی صفت کلام جسے بیٹا کہا جاتا ہے اور خدا کی صفت حیات ومحبت جسے روح القدس کہا جاتا ہے ان تین میں سے ہر ایک خدا اور تینوں مل کر تین خدا نہیں بلکہ ایک ہی خدا ہے۔ یعنی تین ایک اور ایک تین ہیں۔

تردید از روئے بائبل

جس طرح تمام صحائف سماوی توحید کی تعلیم دیتے چلے آئے ہیں اسی طرح بائبل بھی توحید کی تعلیم سے خالی نہیں۔ چنانچہ بائبل میں لکھا ہے:

''سن اے اسرائیل! خداوند ہمارا ایک ہی خداوند ہے تو اپنے سارے دل اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا سے محبت رکھ۔''[2]

خداوند ہی خدا ہے اس کے سوا کوئی ہے ہی نہیں۔ (استثناء ۴:۳۵)

''میرے حضور تیرے لیے دوسرا خداوند نہ ہووے۔ تو اپنے لیے کوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی میں زمین کے نیچے ہے مت بنا تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر۔ کیونکہ میں خداوند تیرا غیور خدا ہوں۔''[3]

خداوند ہی خدا ہے کہ جو اوپر آسمان کے ہے۔ (استثناء ۴:۳۹)

خداوند ہی خدا ہے خدا ایک ہے۔ (استثناء ۶:۴)

زبور میں ہے:

''خداوند اسرائیل کا بادشاہ اور اس کا فدیہ دینے والا رب الافواج یوں فرماتا ہے: میں ہی اول اور میں ہی آخر ہوں اور میرے سوا کوئی خدا نہیں۔''

عہد نامہ جدید

''پس جس کو تم بغیر معلوم کیے پوجتے ہو میں تم کو اسی کی خبر دیتا ہوں۔''[4]

''تم جو دوسروں سے عزت چاہتے ہو اور وہ عزت جو خدائے واحد سے ہوتی ہے کیونکر ایمان لا

[1] Augustine: The City of God book XI chapter XXIV.

[2] استثناء ۶:۴۔ [3] خروج ۲۰:۳۔۵۔ [4] اعمال ۱۷:۲۳۔

سکتے ہو۔"[1]

"اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے، جانیں۔"[2]

"اوّل یہ کہ اے اسرائیل اس پر خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے اور تو خداوند سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی طاقت سے محبت رکھ۔"[3]

"اور سوا ایک کے اور کوئی خدا نہیں اگرچہ آسمان و زمین میں بہت سے خدا کہلاتے ہیں۔ چنانچہ بہتیرے خدا اور بہتیرے خداوند ہیں لیکن ہمارے نزدیک تو ایک ہی خدا ہے یعنی باپ۔"[4]

اور سب کا خدا اور باپ ایک ہی ہے جو سب کے اوپر اور سب کے درمیان اور سب کے اندر ہے۔"[5]

"میں اپنے باپ اور تمھارے باپ اور اپنے خدا اور تمھارے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں۔"[6]

خداوند ایک خدا سے محبت رکھ۔ (متی ۲۲: ۳۷۔۴۰)

تردید از روئے عقل

عیسائی عقیدہ کی رو سے خدا باپ، خدا بیٹا اور خدا روح القدس تینوں ایک اور ایک تین ہیں۔ یہ ایک علمی اور عقلی دھوکہ ہے۔

علمِ ریاضی میں ایک عدد نہ تو ایک سے زیادہ اور نہ ایک سے کم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ علمِ ریاضی میں ایک کبھی بھی ۱+۱+۱ کے برابر نہیں ہوسکتا اور نہ ایک ۱/۳ کے برابر ہوسکتا ہے۔ نہ تین ایک کے اور نہ تہائی کبھی ایک کے برابر ہوسکتا ہے۔ ایک کے سوا تمام اعداد ایک کی جمع کا نام ہیں۔ جس عدد کا نام تین ہے وہ درحقیقت تین دفعہ ایک کے مجموعہ کا نام ہے۔ ایک اور تین میں جمع اور تفریق کی نسبت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات جمع اور تفریق سے پاک اور مبرا ہے، لہٰذا علمِ ریاضی کی رو سے ایک تین نہیں ہوسکتے اور نہ تین ایک۔

عیسائیوں کے عقیدہ کی رو سے تینوں خدا صفات میں برابر اور مساوی ہیں۔ اگر تینوں کی صفات پر غور کیا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے صفات اور افعال میں برابر نہیں۔ باپ پیدا کرتا ہے، بیٹا پیدا ہوتا ہے اور روح القدس دونوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اقنوم اول یعنی باپ خالق اور فنا کرنے والا، اقنوم دوم یعنی بیٹا نجات دہندہ اور اقنوم ثالث یعنی روح القدس زندگی دینے والا سمجھا جاتا ہے۔

باپ اپنے وجود میں بیٹے کا محتاج نہیں، لیکن بیٹا باپ کا محتاج تھا، بیٹے میں انسانیت بھی داخل ہے۔ باپ علت ہے اور بیٹا معلول۔ علت اور چیز ہے اور معلول اور چیز ہے۔

پس ہر اقنوم کی صفات دوسری اقنوم سے مختلف ہیں۔ لہٰذا تینوں اقنوم صفات مختلفہ کے لحاظ سے

---

[1] یوحنا ۵: ۴۴۔ [2] یوحنا ۱۷: ۳۔ [3] مرقس ۱۲: ۲۹۔۳۰۔

[4] کرنتھیوں ۸: ۲۹۔۳۰۔ [5] افسیوں ۴: ۶۔ [6] یوحنا ۲۰: ۱۷۔

ایک نہ ہوئے۔ اور تثلیث پرستوں کا یہ عقیدہ خود بخود باطل ہو جاتا ہے کہ تینوں اقنوم صفات میں برابر اور مساوی ہیں۔ جب تینوں اقنوم اپنی صفات کے لحاظ سے مختلف ہوئے تو تینوں مل کر ایک نہیں ہو سکتے اور تثلیث کا عقیدہ خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔

کفارہ

کفارہ موجودہ عیسائیت کی عمارت کا بنیادی پتھر ہے۔ اس کے لفظی معنی ڈھانکنے اور چھپانے کے ہیں۔ اصطلاح میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ یسوع مسیح نے صلیب پر جان دے کر تمام بنی آدم کے گناہوں کو چھپا لیا ہے اور ان کے لیے نجات کا موجب بن گئے ہیں۔

عیسائیوں کے نزدیک ہر انسان پیدائشی گناہگار ہے۔ آدم اور حوا نے جو گناہ کیا وہ وراثتاً ہر شخص کی فطرت میں چلا آ رہا ہے، جس کی وجہ سے ہر شخص گناہگار ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک نیک اعمال نجات کا موجب نہیں ہو سکتے۔ اگر اللہ تعالیٰ بندے کے گناہ توبہ اور استغفار سے معاف کر دے تو اس کا یہ رحم اس کے عدل کے خلاف ہے۔ خدا رحیم ہے اس کا رحم چاہتا ہے کہ انسان سزا سے بچ جائے۔ پھر وہ عادل بھی ہے۔ عدل کا یہ تقاضا ہے کہ سزا ضرور دی جائے۔ اب رحم اور عدل ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ بندے کی نجات کا ہونا ضروری ہے۔ بندوں کو نجات دلانے کے لیے ایک صورت یہ نکالی کہ خدا کا بیٹا یسوع مسیح جو تمام گناہوں سے پاک اور معصوم ہے لوگوں کے تمام گناہوں کو اپنے اوپر لے کر جان کی قربانی دے اور سارے لوگوں کے لیے نجات کا ذریعہ بنے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں عقیدہ کفارہ کی تشریح ان الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے۔

''عیسائی علم عقائد میں کفارہ سے مراد یسوع کی وہ قربانی ہے جس کے ذریعہ ایک گناہگار انسان یک لخت خدا کی رحمت کے قریب ہو جاتا ہے۔ اس عقیدہ کی پشت پر دو مفروضے کارفرما ہیں ایک تو یہ کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے انسان خدا کی رحمت سے دور ہو گیا تھا دوسرے یہ کہ خدا صفت کلام (بیٹا) اس لیے انسانی جسم میں آئی تھی کہ وہ انسان کو دوبارہ خدا کی رحمت سے قریب کر دے۔''[1]

رد کفارہ

کیا یسوع مسیح کے سوا کوئی بے گناہ تھا؟

عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ مسیح علیہ السلام کے علاوہ تمام انسان گناہگار ہیں، بائبل کی رو سے غلط ہے۔ بائبل میں بے شمار ایسے آدمیوں کا ذکر موجود ہے جو راست باز، مقدس اور نیک تھے۔

اوّل: یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) بائبل کہتی ہے۔ یوحنا بپتسمہ دینے والا پارساہ اور بے گناہ تھا۔

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ص ۶۵۱ مقالہ کفارہ Atone ment۔

(الف) ''وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز نہ مے نہ کوئی اور شراب پیئے گا اور اپنی ماں کے پیٹ ہی سے روح القدس سے بھر جائے گا۔'' (لوقا ۱:۱۵)

(ب) ''خداوند کا ہاتھ اس پر تھا۔'' (لوقا ۱:۶۶)

(ج) ''اور وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا اور اسرائیل پر ظاہر ہونے کے دن جنگلوں میں رہا۔'' (لوقا ۱:۸۰)

(د) ہیرودیس یوحنا کو راست باز اور مقدس آدمی جان کر اس سے ڈرتا اور اسے بچائے رکھتا تھا۔'' (مرقس ۶:۲۰)

(ذ) یوحنا آیا اور بیابان میں بپتسمہ دیتا اور گناہوں کی معافی کے لیے توبہ کے بپتسمہ کی منادی کرتا تھا۔'' (مرقس ۱:۴)

ان آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت یوحنا برگزیدہ اور معصوم عن الخطا انسان تھے۔

دوم: ہابیل حضرت آدم علیہ السلام کا فرزند تھا۔ انجیل کی رو سے وہ بھی راست باز اور صدیق تھا اور اس سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا۔ اناجیل میں آتا ہے:

(الف) تاکہ سب راست بازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا تم پر آئے۔ راست باز ہابیل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریاہ کے خون تک جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔'' (متی ۲۳:۳۵)

(ب) ''ایمان ہی سے ہابیل نے قائن سے افضل قربانی خدا کے لیے گزرانی اور اسی کے سبب اس کے راست باز ہونے کی گواہی دی گئی کیونکہ خدا نے اس کی نذروں کی بابت گواہی دی۔'' (عبرانیوں ۱۱:۴)

(ج) ''اور قائن کی مانند نہ بنیں جو اس شریر سے تھا اور جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا۔ اور اس نے کس واسطے اسے قتل کیا؟ اس واسطے کہ اس کے کام برے تھے اور اس کے بھائی کے کام راستی کے تھے۔'' (یوحنا ۳:۱۲)

سوم: دانیال علیہ السلام کے متعلق بائبل میں آتا ہے:

(الف) بنوکدنصر بادشاہ نے دانیال کے متعلق کہا: ''اس میں مقدس الہوں کی روح ہے۔'' (دانیال ۴:۸)

(ب) ''تب دانی ایل نے بادشاہ سے کہا: اے بادشاہ تا ابد زندہ رہ۔ میرے خدا نے اپنے فرشتے کو بھیجا ہے اور شیر ببروں کے منہ کو بند رکھا ہے یہاں تک کہ انھوں نے مجھے ضرر نہ پہنچایا۔ اس لیے کہ اس کے آگے مجھ میں بے گناہی پائی گئی اور تیرے آگے اے بادشاہ میں نے خطا نہیں کی۔'' (دانیال ۶:۲۱۔۲۲)

چہارم: یوسیع: اس کے متعلق بائبل میں لکھا ہے۔ ''اس نے وہ کام کیے جو خداوند کی نگاہ میں بھلے تھے اور

اپنے باپ داؤد کی ساری راہوں پر جاتا اور داہنے یا بائیں مطلق نہ مڑا۔ (۲ سلاطین ۲۲:۲)

پنجم و ششم: زکریا اور ان کی بیوی کے متعلق انجیل میں لکھا ہے:

''اور وہ دونوں خدا کے حضور راست باز اور خداوند کے سارے حکموں اور قانونوں پر بے عیب چلنے والے تھے۔''

ہفتم: حزقیاہ بادشاہ۔ اس کے متعلق بائبل میں لکھا ہے:

''اور اس نے خداوند اسرائیل کے خدا پر توکل کیا۔ ایسا کہ بعد اس کے یہوواہ کے سب بادشاہوں میں ویسا ایک نہ ہوا اور نہ اس سے آگے کوئی ہوا تھا۔ وہ خداوند سے لپٹا رہا اور اس کی پیروی کرنے سے باز نہ آیا، بلکہ اس نے اس کے حکموں کو جو خداوند نے موسیٰ کو دیے تھے حفظ کیا اور خداوند اس کے ساتھ تھا۔ وہ جدھر کو گیا کامیاب رہا۔'' (۲ سلاطین ۱۸:۵۔۷)

ہشتم: شمسون بن منوحہ۔ اس کی پیدائش سے پہلے فرشتہ نے ان الفاظ میں بشارت دی:

''سو اب خبردار رہیو اور مے یا نشے کی کوئی چیز نہ پیجیو۔ اور ہر ایک ناپاک چیز کے کھانے سے پرہیز کیجیو کیونکہ دیکھ تو حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی۔ اس کے سر پر کبھی استرا نہ پھرے گا۔ اس واسطے کہ وہ لڑکا رحم ہی سے خدا کا نذیر ہوگا...... وہ لڑکا پیٹ ہی سے اس کے مرنے کے دن تک خدا کا نذیر ہوگا۔'' (قاضیوں ۱۳:۴۔۷)

نہم: صموئیل النبی:

''میں نے کس سے دغا بازی کی؟ اور کس پر میں نے ظلم کیا؟ اور کس کے ہاتھ سے میں نے رشوت لی تاکہ میں اس سے چشم پوشی کروں؟ اب میں اسے پھیر دینے کو حاضر ہوں۔ وہ بولے تو نے ہم سے دغا بازی نہیں کی اور نہ ہم پر ظلم کیا اور نہ تو نے کسی کے ہاتھ سے کچھ لے لیا۔ تب اس نے انھیں کہا کہ خداوند تم پر گواہ اور اس کا مسیح آج کے دن گواہ ہے کہ تم نے میرے ہاتھ میں کچھ نہیں پایا۔ وہ بولے وہ گواہ۔'' (سموئیل ۱۲:۳۔۵)

دہم: شمعون کے متعلق انجیل میں لکھا ہے:

''دیکھو یروشلم میں شمعون نام ایک آدمی تھا اور وہ آدمی راست باز اور خدا ترس اور اسرائیل کی تسلی کا منتظر تھا اور روح القدس اس پر تھا۔'' (لوقا ۲:۲۵)

یازدہم: یوسف شوہر مریم کے متعلق لکھا ہے:

اس کے شوہر یوسف نے جو راست باز تھا اور اسے بدنام کرنا نہیں چاہتا تھا، چپکے سے اس کے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔'' (متی ۱:۱۹)

بائبل کے بیانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام

کے علاوہ اور کوئی نیک نہیں، اور ہر شخص فطری طور پر گناہگار ہے۔ غلط ہے۔ اس طرح کفارہ کی عمارت کا ایک ستون گر جاتا ہے۔

کفارہ کی عمارت کا دوسرا استون

کفارہ کی عمارت کا دوسرا استون یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام نے گناہگار انسانوں کے گناہوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر لے کر صلیب پر موت دے دی، تا کہ صلیب پر ایمان لانے والے نجات پا جائیں۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ آیا بائبل کی رو سے ایک کے گناہوں کا بوجھ دوسرا اٹھا سکتا ہے؟ بائبل اس تعلیم کے سراسر منافی ہے۔ بائبل میں صاف لکھا ہے: ''اولاد کے بدلے باپ دادے مارے نہ جائیں، نہ باپ دادوں کے بدلے اولاد قتل کی جائے۔ ہر ایک اپنے ہی گناہ کے سبب مارا جائے گا۔'' (استثناء۲۴:۱۶)

''موسیٰ کی شریعت کی کتاب میں لکھا ہے کہ اس میں خداوند نے فرمایا ہے کہ بیٹوں کے بدلے باپ دادے قتل نہ ہوں گے اور نہ باپ دادوں کے بدلے بیٹے قتل ہوں گے، بلکہ ہر ایک آدمی اپنے گناہ کے لیے مارا جائے۔'' (۲ تواریخ ۲۵:۴)

''ان دنوں میں یہ پھر کہا جائے گا کہ باپ دادوں نے کچے انگور کھائے اور لڑکوں کے دانت کھٹے ہو گئے کیونکہ ہر ایک اپنی بدکاری کے سبب مرے گا۔ ہر ایک جو کچے انگور کھاتا ہے اس کے دانت کھٹے ہوں گے۔'' (یرمیاہ ۳۱:۲۹۔۳۰)

''دیکھ ساری جانیں میری ہیں۔ دیکھ جس طرح باپ کی جان اس ہی طرح بیٹے کی جان، دونوں میری ہیں۔ وہ جان جو گناہ کرتی ہے سو ہی مرے گی۔'' (حزقیل ۱۸:۴)

''وہ جان جو گناہ کرتی ہے سو ہی مرے گی۔ بیٹا باپ کی بدکاری کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور نہ باپ بیٹے کی بدکاری کا بوجھ اٹھائے گا۔ صادق کی صداقت اسی پر ہوگی اور شریر کی شرارت اسی پر پڑے گی۔ لیکن شریر اپنی ساری خطاؤں سے جو اس نے کی ہیں باز آئے اور میرے سارے حکموں کو حفظ کرے تو وہ یقیناً جئے گا وہ نہ مرے گا۔ اس کے سارے گناہ جو اس نے کیے ہیں اس کے لیے محسوب نہ ہوں گے۔'' (حزقیل ۱۸:۲۰۔۲۲)

ان حوالہ جات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی بھی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ ہر آدمی اپنے ہی گناہوں کا ذمہ دار ہے۔ ان بیانات سے کفارہ کی عمارت کا دوسرا استون بھی پیوند خاک ہو جاتا ہے۔

کفارہ کی عمارت کا تیسرا استون

صلیب پرستوں کا یہ عقیدہ ہے کہ آدم نے جو گناہ کیا تھا اس کا اثر وراثتاً اور نسلاً ہر انسان میں چلا آ رہا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ اثر نطفہ کے ذریعہ نسل انسانی میں منتقل ہو رہا ہے اور مسیح اسی لیے بن باپ پیدا کیے

گئے تھے تاکہ اس کو گناہ کے اثر سے محفوظ رکھا جائے۔

بائبل کی رو سے شجر ممنوعہ کے کھانے میں حضرت آدم علیہ السلام اور حوا دونوں شریک تھے بلکہ حوا کا گناہ زیادہ ہے کیونکہ اس نے پہلے خود کھایا اور پھر آدم کو کھانے کی ترغیب دی۔ چنانچہ لکھا ہے: ''اور عورت نے جوں دیکھا کہ وہ درخت کھانے میں اچھا اور دیکھنے میں خوشنما اور عقل بخشنے میں خوب ہے تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے خصم کو بھی دیا اور اس نے کھایا۔'' (پیدائش ۳:۶)

پولوس کہتا ہے: ''اور آدم نے فریب نہیں کھایا بلکہ عورت فریب کھا کر گناہ میں پڑ گئی۔'' (۱ تمطاؤس ۲:۱۴)

جب بائبل کی رو سے گناہ کے ارتکاب کا اول منبع عورت کی ذات ہے تو حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش عورت کے پیٹ سے ہوئی جو گناہ کا اصل منبع تھا۔ اگر عیسائیت کے انوکھے فلسفہ کی رو سے بنی نوع انسان نطفہ کے اثر کی وجہ سے گناہ گار بن سکتی ہے تو عورت کے پیٹ سے جنم لینے سے حضرت مسیح علیہ السلام گناہ کے اثرات سے کیوں کر بری ہو سکتے ہیں؟

کفارہ کی عمارت کا چوتھا ستون

عیسائیوں کا یہ استدلال ہے کہ انسان نے گناہ کیا۔ خدا کا عدل گناہ کی سزا کا متقاضی ہے اور خدا کا رحم نجات کا متقاضی ہے۔ ہر دو تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے اکلوتے بیٹے یسوع کو دنیا میں بھیج کر خدا کے رحم سے مستفید کیا اور خود اپنی جان صلیب پر دے کر عدل کے تقاضے کو پورا کیا اور بنی آدم کے لیے بخشش کا موجب ٹھہرا۔

عیسائیوں کا یہ استدلال کہ اللہ تعالیٰ کا رحم بلا بدل نہیں ہو سکتا اللہ تعالیٰ کی صفات کی نا سمجھی کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت رحمان ہے، جس کا ظہور انسانوں کے اعمال اور محنت کے نتیجہ میں نہیں ہوتا جیسا کہ ہمارا یہ مشاہدہ ہے کہ انسان کی پیدائش سے قبل ہی اس کی زندگی کے سامان دنیا میں موجود تھے۔ کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ سامان اس کے کسی عمل کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ جب خدا کی ذات پیدائش سے قبل رحم بلا بدل کر سکتی ہے تو وہ موت کے بعد انسانوں پر رحم بلا بدل کیوں نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ کا رحم جو رحمانیت نے ظاہر کیا عدل کی زنجیروں میں جکڑا ہوا نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اپنی صفت رحمانیت کے تحت عدل کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے بھی بلا بدل بنی آدم کو بخش سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کفارہ کے چوتھے ستون کو خاک میں ملا دیتی ہے۔

عقیدہ حیات ثانیہ

حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق عیسائیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ مسیح کتاب مقدس کے بموجب

ہمارے گناہوں کے لیے مرا اور دفن ہوا اور تیسرے دن کتاب مقدس کے بموجب جی اٹھا۔ (کرنتھیوں باب ۱۵ آیات ۳-۴)

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ عیسیٰ سے پہلے مختلف ممالک میں دیوتاؤں کے مر کر زندہ ہونے کا عقیدہ پایا جاتا تھا۔ خصوصاً مصر میں جہاں اوسیریز کا مر کر زندہ ہونے کا تخیل پایا جاتا تھا، مصر سے ہی عقیدہ عیسائیت میں داخل ہوا۔

۱۹۰۳ء، ۱۹۰۴ء کے شہر کالا شیرکٹ کے کھنڈرات سے کچھ سلیں برآمد ہوئی ہیں اور یہ سلیں کتب خانہ اسور میں سے ہیں جو مسیح سے نو سو برس پہلے قائم ہوا تھا۔ ان کتابات سے امر واضح ہوتا ہے کہ بائبل میں بعل دیوتا کے متعلق بھی حیات ثانیہ کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔

ان کتابات کی عبارات میں سے ایک عبارت درج ذیل کی جاتی ہے اور اس کے بالمقابل انجیل کی داستان صلیب کی ایک مثق درج کی جاتی ہے اس سے واضح ہو جائے گا کہ انجیل حیات ثانیہ کا عقیدہ پیش کرتی ہے۔ وہ کتنا بعل کی حیات ثانیہ کے مشابہ ہے۔

بعل کے متعلق

بعل کو جس جگہ رکھا گیا تھا وہاں اس کی تلاش کرتے ہیں۔ خاص کر ایک عورت روتی ہوئی قبرستان کے دروازے پر اس کی تلاش کرتی ہے اور روتے ہوئے کہتی ہے کہ میرے بھائی! میرے بھائی! بعل پھر زندہ ہو گیا ہے اور پہاڑ سے نکلتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق

مریم مگدلینی، قبر پر مسیح کی تلاش میں آتی ہے قبر کو خالی دیکھ کر روتے ہوئے کہتی ہے کہ میرے خداوند کو لے گئے۔ مسیح زندہ ہو کر قبر سے نکلتا ہے۔[1]

عیسائیت پر دیگر مذاہب کا اثر

یورپین مورخ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ مسیحیت کی انجیل یعنی عہد جدید میں یونانی فلسفہ کا عنصر غالب ہے۔ مشہور مورخ ٹائنبی نے اپنی مشہور کتاب مطالعہ تاریخ جلد ۶ [2] میں کئی جگہ اس بات کا تکرار ہے۔

مسٹر ہٹی لکھتے ہیں ''مسیحیت میں یونانی خیالات کی آمیزش کر کے انجیلوں کے لکھنے والوں نے مسیحیت کو تمام دنیا میں پھیلنے کے قابل بنا دیا۔ مسیحیت کو کبھی یونانی، رومی تسلیم نہ کرتے، اگر اس میں یونانی

---

[1] ینابیع المسیحیت، مصنفہ خواجہ کمال الدین مسلم بک سوسائٹی عزیز منزل برانڈرتھ روڈ لاہور ص ۷۸، ۷۹۔

[2] صفحہ ۳۷۷-۴۱۳-۴۱۴(۲)-۴۱۷-۴۶۵(۳)-۴۷۶-۴۸۶(۴)-۴۹۵، (۵)۱-۵۶، ۵۸۔

عقائد شامل نہ کر لیے جاتے۔[1]

ذریپر رقمطراز ہے۔''ان دونوں (عیسائی اور بت پرست رومی) کی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر وشکر ہو گئے اور نیا مذہب پیدا ہو گیا۔ جس میں بت پرستی اور عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل ٹرٹلین نے بیان کی ہے بدل کر ایک عام پسند مگر پایہ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے۔ ان عقائد میں قدیم یونانیوں کی افسانہ پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا۔ عقیدہ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھالا گیا اور مریم عذرا کو خدا کی ماں کا لقب دیا گیا۔[2]

جب عیسائی مذہب فلسطین سے نکل کر پڑوسی ممالک میں پھیلا تو اس وقت بحیرہ روم کے آس پاس کے ممالک میں آفتاب پرستی کا رواج تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آفتاب پرستی کے بیشتر عناصر عیسائی مذہب میں داخل ہو گئے۔

الوہیت کا تصور

ظہور مسیح کے وقت ایران، بابل، نینوا، کارتھج، سیریا، یونان روما۔ مصر دیگر یورپین ممالک خصوصاً ائرلینڈ اور سمندروں پار میکسکو سب جگہ آفتاب پرستی تھی۔ متھرا (ایران) بعل (بابل) اطیس (فریجیا۔ سیریا) اسٹارٹی (کارتھج۔ سیریا) ایڈونس (سیریا) ہیکس (یونان و روما) ہرکیولیس (یونان و روم) ہورس (مصر) اوسیرس (مصر) کٹسول کوٹل (میکسکو) اپالو (روما) خدا تصور کیے جاتے تھے اور ان کی پرستش ہوتی تھی۔

عیسوی مذہب کے آغاز سے پہلے ان ممالک میں سورج دیوتا کے متعلق اس قسم کی کہانیاں رائج تھیں کہ وہ دوشیزاؤں کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ دشمن انہیں قتل کر دیتے۔ ہیں اور مر کر زندہ ہو جاتے ہیں۔

ابنیت عیسیٰ کا تصور

ابنیت عیسیٰ کا تصور بھی یہ ہی تخیل ہے کہ ہندوستان، یونان اور مصر تمام اصنام پرست اقوام کا یہ عقیدہ تھا کہ بہت سے جانوروں اور انسانوں میں خدا حلول کیے ہوئے ہے اور اس لیے وہ بہت سے جانوروں اور انسانوں کو خداؤں کا اوتار سمجھتے ہیں۔ یونان کے مذہب ارفیزم (Orphism) کا یہی نظریہ تھا اس سے حکیم فیثا غورث نے یہ تخیل لیا اور پھر ہندوستان میں یہ عقیدہ رائج ہو گیا، یہ چھٹی صدی قبل مسیح کی بات ہے۔ افلاطون کا یہ ہی نظریہ تھا۔ (Guide to Philosophy by E.M Joad PP287,288) انجیلوں کے مرتب کرنے والوں نے یہ ہی عقیدہ اختیار کر کے انجیلوں میں لکھ دیا۔

(Royston pike: Encyclopedia of religion and religions, Art. Incarnation. Toynbee's history vol. PP. 261.....66)

1۔ ہسٹری آف سیریا باب ۲۵ صفحہ ۳۳۱۔ 2۔ معرکہ مذہب و سائنس ڈریپر صفحہ ۶۴، ۶۵، ۶۶۔

نظریہ ارفیزم (Orphism)

چھٹی صدی قبل یونان میں رائج تھا اس کا بانی ارفس تھا۔ جو خدا کا بیٹا تصور کیا جاتا تھا اور بربط پر خوب گاتا تھا۔ جب اس کی بیوی جس سے اس کو والہانہ محبت اور عشق تھا انتقال کر گئی۔ تو یہ اس کی تلاش میں زمین کے نیچے وہاں چلا گیا جہاں مرذوں کی ارواح رہتی ہیں۔ اس نے اپنی بربط سے ارواح کے نگران خدا کو اتنا خوش کر لیا کہ اس نے اس کی بیوی کو اس کے ساتھ آنے کی اجازت اس شرط پر دے دی کہ جب تک دنیا میں نہ پہنچیں۔ ارفس مڑ کر اپنی بیوی کی طرف نہ دیکھے۔ سارا سفر ختم ہو چکا تھا اوپر کی دنیا پر قدم رکھنے کو ہی تھا، کہ محبت نے جوش مارا۔ اس نے بیوی کو مڑ کر دیکھ لیا۔ دیکھنا تھا کہ وہ ہوا میں غائب ہو گئی۔ ارفس دنیا میں آیا اور رہبانی زندگی گزارنی شروع کر دی عورتوں سے تعلق منقطع کر لیا۔ لیکن عیش پسند مردوں اور عورتوں نے مل کر اس کو قتل کر دیا۔

کچھ عرصہ بعد یہ قصہ یونان کے ایک خدا ڈایونائی سیس (Dionysius) کی طرف منسوب ہونے لگا۔ ڈائنسس بڑے خدا زیوس (Zeus) کا بیٹا تھا۔ ڈائنسس کے معنی ہیں خدا کا بیٹا۔ ان کے اس خدا کو ٹائیٹن (Titans) نے مار کر کھا لیا۔ ٹائٹن، ایک دیوہیکل مخلوق تھی، جو دنیا پر آدمیوں سے پہلے بستی تھی۔ ڈائنسس کا دل بچ رہا تھا جو اس کے باپ زیوس کے پاس بھیج دیا گیا اس نے غصہ میں آ کر ڈائنسس کو اپنی بجلی سے جلا دیا اور ڈائنسس کو دوبارہ زندہ کیا۔ ٹائیٹن کی راکھ سے انسان پیدا ہوئے۔ ان میں زیوس کے تعلق سے نصف ماہیت تو خدا کی ہے اور نصف ماہیت اپنی انسانوں کی۔

قدیمی راہبوں نے یونان میں عیسائیت کو مقبول بنانے کے لیے اس فرضی حصہ کو اپنے مذہب میں عقیدہ کے طور پر داخل کر لیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا لیا۔

کفارہ

نسل انسانی کو مصیبت اور گناہ کی سزا سے بچانے کے لیے خدا یا خدا کے بیٹے کا انسانی شکل اختیار کرنا اور اپنی قربانی سے نسل انسانی کو مصیبت یا گناہ سے نجات دینا ایک عام عقیدہ مسیح سے قبل بے شمار اقوام میں رائج تھا۔ خصوصاً ان مذاہب میں جسے آج عیسائی پیگنزم (Paganism) کہتے ہیں۔

اطیس درخت سے بندھا ہوا اور اس کے جسم میں میخیں چبھی نظر آتی ہیں۔ درخت کے نیچے ایک بچھڑا دکھایا جاتا ہے۔[1]

ایڈونس کی موت کے مختلف طریقے بیان کیے گئے ہیں لیکن ایک مجسمہ میں وہ بطور مصلوب نبی یا شفیع کے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس میں ایک مجسمہ کو کفن میں لٹا کر روتے پیٹتے تھے اور وہی باتیں کرتے تھے جو آج رومن کیتھولک گڈ فرائڈے کے دن کرتے ہیں۔

---

[1] ڈیوپیس صفحہ ۲۵۵ بحوالہ ینابیع المسیحیت ص ۸۱ حاشیہ۔

پرو تھیس نسل انسانی کے لیے کوہ اوقاف کے دامن میں پہاڑ سے باندھا جاتا ہے قہار اور منتقم اور غضب ناک خدا کے کارندے اس کے ہاتھ پاؤں میں کیلیں ٹھونکتے ہیں وہاں وہ صلیب کی طرح ہاتھ پھیلائے نظر آتا ہے اور کہتا ہے ''اس کی مرضی کے خلاف مجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔'' (اسکائیلس)

بیکس ابن جیوپیٹر (خدا) بھی انسانوں کو مصائب اور گناہوں سے نجات دلانے کے لیے مصلوب ہوا۔

سراپیز مصر کے ابن اللہ کے مندر کے کھنڈرات میں ایک صلیب پائی گئی ہے۔ اسیرس قتل ہوا اور اس کے اعضا الگ کیے گئے۔

الغرض دیوتاؤں کا نسل انسانی کو مصائب اور گناہوں سے نجات دلانے کے لیے مصلوب ہونا حضرت مسیح علیہ السلام کے وقت اور اس کے بعد دو تین صدیوں تک ایسا عقیدہ تھا کہ راہب مینوسیس فلپ اپنی کتاب اوکٹویس میں۔ بیکن لوگوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ''ہم لوگ تو صلیب کے پرستار نہیں یہ تو تم اس کی پرستش کرتے ہو تمھارے علموں اور جھنڈوں اور ہر ایک بات پر صلیب کا نشان ہے۔''

ترتولین نے بھی اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ وہ پلوجیا میں بیکن کو مخاطب کر کے لکھتا ہے کہ ''تمھارے سب کے سب خدا تو وہی تصویریں ہیں جو صلیبوں پر نظر آتی ہیں تمھارے سب علموں پر صلیبیں یا مصلوبوں کی شکلیں ہیں۔ ٹنزل کوٹل تصویریں بھی مصلوب ہی نظر آتی ہیں اور وہ موت نسل انسانی کے گناہ کے کفارہ میں تسلیم کی جاتی ہے۔[1] جو روایات ان دیوتاؤں کے متعلق بیان کی جاتی ہیں وہی حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں۔ بیکس دیوتا سے متعلق چند باتیں لکھی جاتی ہیں۔ قاری پڑھ کر دیکھ لیں کہ وہ مسیح کی ہیں یا بے کس کی۔ ''زمین کل گناہ سے اور ناراستی سے بھری ہوئی تھی۔ اور ہلاکت کے منہ میں آئی ہوئی تھی۔ جوپیٹر (خدا) نے ارادہ کیا کہ وہ دنیا اور انسان کو مصیبت سے بچائے اور اپنا اکلوتا بیٹا بھیج کر دنیا کو ہلاکت سے نجات دے۔ وہی دنیا کا معبود ہوا اور دنیا نے اس کی تقدیس کے گیت گائے۔ چنانچہ جیوپیٹر (خدا) نے ایک کنواری پر سایہ ڈالا وہ حاملہ ہوگئی اور اس نے دنیا کے نجات دہندہ کو جنا وہ دنیا میں آیا اس نے انسانوں کے دکھ دور کرنے کے لیے اپنے آپ کو دکھ اور درد میں ڈالا مر گیا۔ اس کے جسم کے ٹکڑے کیے گئے اس کے پرستار اس کو ان ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ اکلوتا بیٹا، المقتول، گناہ اٹھانے والا منجی (اوریجن آف ریلیجن بیلیفس مصنفہ ڈوپیس صفحہ ۱۳۵)

تثلیث

حضرت عیسیٰ علیہ السلام موحد تھے اور انھوں نے توحید کا پرچار کیا اور انبیاء علیہم السلام توحید کے مرجھائے ہوئے چمن کی آب یاری کے لیے ہی آتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی لوگوں کو توحید کا بھولا ہوا سبق دیا۔ چنانچہ وہ ایک جگہ خدا کو ''واحد اور برحق کہتے ہیں۔ (یوحنا ۱۷:۳) اور دوسری جگہ فرماتے

[1] ٹنزل بارز صفحہ ۱۶۶، ۱۶۷ بحوالہ ینابیع المسیحیت حاشیہ ص ۸۲۔

ہیں۔ ''تو کیوں مجھے نیک کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا۔'' (لوقا ۱۸:۱۹)

جب عیسائی لوگ دوسری اقوام سے ملے تو انھوں نے بجائے توحید کے تثلیث کا عقیدہ اختیار کر لیا۔ تثلیث کا عقیدہ کئی اقوام میں رائج تھا۔ قدیم مصریوں میں ہر مندر میں تین بت ہوا کرتے تھے۔ ۱۔ دیوتا۔ ۲۔ دیوی۔ ۳۔ اور ان کا بچہ۔ لیکن یہ تینوں تثلیث فی التوحید کے صورت میں ہوتے تھے۔

قدیم مصریوں کی مشہور تثلیث اوسیریز، آئسیس اور ان کے بیٹے ہورس ہوتی تھی۔ اس سے مسیحی تثلیث لی گئی تھی۔ جس کا مفہوم عیسائیت میں باپ بیٹا اور روح القدس ہے۔ مصر کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی تثلیث کا نظریہ پایا جاتا تھا۔

سیمری	ہندو	یونانی	رومی	کیفیت
اَنو	برہما	زیوس	جوپیٹر	آسمان کا دیوتا
ایا	وشنو	پوزیڈان	نیپچون	پانی کا دیوتا
بیل	شیو	ہیڈس	پلوٹو	زمین کا دیوتا

رسوم

عشائے ربانی

عیسائیت میں اس رسم کی حقیقت یہ ہے کہ روٹی اور شراب جو مسیح کی یاد میں اتوار کے دن گرجے کی عبادت کے بعد کھائی جاتی ہے وہ مقدس ہو جاتی ہے۔ کھانے والے میں پاکیزگی اور طہارت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا الوہیت کے ساتھ اتصال ہو جاتا ہے۔ یہی تصور مشرقی ممالک میں قربانی یا چڑھاووں کے متعلق ہے کہ اس کے کھانے سے کھانے والے کے اندر پاکیزگی اور طہارت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی تصور نے عشائے ربانی کی شکل اختیار کر لی۔

ایسٹر کا تہوار

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مرنے کے بعد تیسرے دن ۲۱ مارچ بروز اتوار زندہ ہو گئے تھے۔ احیائے ثانیہ کی خوشی میں عیسائی ۲۱ مارچ یا اس کے بعد پہلے اتوار کو ایسٹر کا تہوار مناتے ہیں۔

اس کو ایرانیوں نے نوروز کر کے منایا۔ ہندوؤں نے اسے بسنت کا دن ٹھہرایا اس طرح مصر اور ائرلینڈ کے لوگ ایسٹر کے دن بہار کی دیوی آسٹر کی پرستش کے لیے مخصوص کرتے ہیں۔ یہ وہی دیوی سامی اقوام میں ایشنزیا استارتہ کہلاتی تھی۔ ایسٹر کی تقریب دراصل بہار کی دیوی کی تقریب ہے۔

کرسمس

کرسمس ۲۵ دسمبر کو منایا جاتا ہے۔ عیسائی اس تاریخ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی تاریخ

کہتے ہیں لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے یہ دن متعدد مر کر زندہ ہونے والے دیوتاؤں کی ولادت بھی اسی تاریخ میں ظاہر کی جاتی تھی۔

الغرض عیسائی راہبوں نے عیسائیت کو دوسری اقوام میں مقبول بنانے کے لیے ان کے نظریات اور مصطلحات کو اپنے مذہب میں داخل کر لیا۔

مسیحی رہبانیت

یہودیت میں رہبانیت اور ترک الدنیا کا عام رجحان پایا جاتا تھا۔ یوحنا نبی نے جس سے حضرت مسیح علیہ السلام نے بپتسمہ لیا تھا، دنیا چھوڑ دی تھی اور دنیا کی خرافات اور لذائذ کے خلاف آواز بلند کی۔

مورخین کا یہ قیاس ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایسنس (Essenes) سے وابستہ رہ کر ریاضت کی زندگی گزارتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت کی خلعت ملی تب بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے میدان عمل میں آئے۔ مسیحی مورخ یوسی بس (Euse bius) نے فیلو (Philo) کے حوالہ سے ان کے حالات محفوظ رکھے ہیں۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنا زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں صرف کرتے تھے۔ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے۔ درویش منش مرنجاں مرنج قسم کے لوگ تھے۔

جوزیفس لکھتا ہے:

''ان لوگوں کا زہد و تورع بلا کا تھا۔ سورج نکلنے سے پیشتر وہ اٹھ بیٹھتے ہیں اور دنیاوی معاملات سے متعلق بات چیت کرنے سے پہلے اپنی عبادت سے فارغ ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد جن جن باتوں میں وہ ماہر ہوتے ہیں ان کا امیر (صدر) انھیں ان امور کی انجام دہی کے لیے بھیج دیتا ہے۔ واپس آ کر وہ ٹھنڈے پانی سے غسل کر کے سفید لباس پہن لیتے ہیں اور عبادت خانہ میں جمع ہو جاتے ہیں۔ دعاؤں اور مناجاتوں کے بعد کھانا کھاتے ہیں، جس کے اول و آخر خدا کا شکر ادا کیا جاتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں اپنے امیر کے حکم کے تابع رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ آئندہ کی باتوں کے متعلق پیش گوئیاں بھی کرتے ہیں اور مذہبی کتابوں پر خاص طور پر عبور رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں سب کچھ خدا کی مشیت کے تابع ہوتا ہے اور اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں ہوتا۔''[1]

ان کے متعلق اسی قسم کے حالات پلینی Pliny (المتوفی ۷۹ء) نے لکھے ہیں:

''یہی ایک فرقہ ہے جس کے لوگ بغیر مال و متاع اور زن و اولاد کے زندگی بسر کرتے ہیں اور کھجوریں وغیرہ کھا کر زندہ رہتے ہیں۔ وہ لوگ جو زندگی کی مشکلات اور صعوبات سے گھبرا اٹھتے ہیں، ان میں آ کر شامل ہو جاتے ہیں۔ قریب قریب ہر بستی میں اس فرقہ کے لوگ موجود ہیں جو اپنے فرقہ کے مسافروں کی اس طرح تواضع کرتے ہیں گویا وہ خود ان ہی میں سے ہیں، خواہ انھوں نے ایک دوسرے کو پہلی مرتبہ ہی کیوں نہ دیکھا ہو۔ جب وہ سفر کے لیے نکلتے ہیں تو اپنی مدافعت کے ہتھیاروں کے علاوہ اور کچھ (زاد راہ

[1] بحوالہ مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں مصنفہ پرویز ص ۳۶، ۳۷۔

وغیرہ) ساتھ نہیں رکھتے۔ ہر بستی میں ان کے فرقہ کا ایک امیر ہوتا جس کے ذمہ ان مسافروں کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ خرید و فروخت نہیں کرتے بلکہ جس کے پاس کچھ فاضلہ ہو وہ اس کے حاجت مند کو بلا قیمت دے دیتا ہے۔"[1]

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے رہبانیت اور تیاگ کی تعلیم دی، لیکن یہ امر واقع ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو دنیا پرستی سے ہٹا کر خدا پرستی کی تعلیم دی اور ان کو آسمانی حکومت میں داخل کرنا چاہا۔ عفو اور محبت کی تعلیم یہاں تک دی کہ اگر کسی کے گال پر کوئی طمانچہ مارے تو وہ دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے، اور اگر کسی سے کوئی ایک جوتا مانگے تو دوسرا جوتا بھی اتار دے۔

دراصل بنی اسرائیل کے ظلم اور جور و جفا کا وہ وقتی علاج تھا۔ جب مسیح علیہ السلام اس دنیا سے اٹھ گئے تو ان کے پیروکاروں میں سے ایک گروہ نے اس تعلیم کو رہبانیت اور تیاگ کا روپ دے دیا، اور وہ معاشرتی مرض بن گیا۔ گبن اپنی تصنیف میں لکھتا ہے:

"مسیح تپسوی نشاط زندگی اور فرائض دنیوی سے بالکل دستبردار ہو جاتے تھے۔ وہ نہایت سادہ غذا کھاتے جو اکثر مانگی جاتی یا پیش کی جاتی۔ وہ گوشت نہ کھاتے۔ شراب نہ پیتے۔ تمام عمر کنوارے رہتے۔ جسم کو ہر ممکن طریق سے اذیت پہنچاتے۔ محبت، تعیش، آرام اور مسرت کو گناہ خیال کرتے۔ الغرض رہبانیت عام ہو چکی تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں تپسوی ناپاک دنیا سے فرار اختیار کرتے اور مذہبی مجالس کی خلوتوں میں پناہ لیتے۔" (آبد)

مسیحی رہبانیت کا بانی

مسیحی رہبانیت کے آثار مصر میں موجود ہیں اس کا بانی ایک اَن پڑھ نوجوان "انطونی" ہے۔ اس نے دنیا سے منہ موڑا، اپنی تمام ملکیت سے ہاتھ اٹھایا اور اپنے کنبہ سے کنارہ کشی اختیار کر کے صحرا میں چلا گیا۔ اور چلہ کشی اور ریاضت شروع کر دی اور جلد ہی اس کی شہرت تمام مصر میں پھیل گئی اور وہ روحانیت کا سرچشمہ بن گیا۔ اس کی تقلید میں ہزاروں نے رہبانیت کی زندگی اختیار کر لی اور "انطونی" کو اپنا قائد تسلیم کر لیا۔ اس تحریک کو زور پکڑتے دیکھ کر کلیسا نے اس کی حمایت کر دی اور اس تحریک کو منظم خطوط پر چلایا گیا۔ راہبوں نے خانقاہیں بنائیں۔ لیبیا کے صحرا میں راہبوں کی یہ خانقاہیں جاگیروں کی صورت اختیار کر گئیں۔ دریائے نیل کی وادی اور تھیبس کی چٹانیں ان خانقاہوں سے معمور ہو گئیں، جن میں لاکھوں راہب کنارہ کشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ شمالی نیل میں جو پہلی خانقاہ کھولی گئی اس میں چودہ سو راہب رہتے تھے، اور قلیل عرصہ میں ہی ان کی تعداد پچاس ہزار ہو گئی۔ ان سے تیاگ، جسمانی اذیت، ریاضت اور دنیاوی تعیش اور تنعم سے اجتناب کا عہد لیا جاتا تھا۔ انطونی کے مقلدین چوبیس گھنٹوں میں صرف بارہ اونس غذا کھاتے۔ گوشت کا استعمال ممنوع

[1] بحوالہ مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں مصنفہ پرویز ص ۳۷۔

تھا جنوبی نیل کے شہروں میں بھی لاکھوں راہب رہتے تھے۔ کیونکہ کلیسا اور خانقاہیں ان کے قیام کے لیے ناکافی تھیں اس لیے وہ شہر کی دیواروں کو بطور خانقاہ استعمال کر لیتے تھے۔ مورخ ''رفونیس'' کے بیان کے مطابق ایک وقت ایسا آیا جب مصر کی نصف سے زیادہ آبادی نے راہبانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔

انطونی کے پیروکاروں نے روم میں بھی خانقاہوں کا نظام قائم کر لیا۔ گبن لکھتا ہے:

''ان تپسیوں کی صورتیں پہلے تو نفرت اور گھن پھیلاتیں لیکن بعد میں انھیں سادھو تسلیم کر لیا جاتا۔ امیر لوگ اپنے محل ان کی رہائش کے لیے وقف کر دیتے۔ پاکیزگی کی یہ نئی تحریک دلچسپی اور جدت کی خاطر بھی اختیار کی جاتی۔ رؤسا جب سیاہ کاریوں سے تنگ آ جاتے تو سزائے اعمال کے خوف سے رہبانیت کو اختیار کر لیتے تاکہ انھیں موت کے بعد بھی جنت کا لطف اٹھانے کا موقع مل سکے۔ ان خانقاہوں میں عورتیں اکثر راہبوں کی ہوس کاریوں کا شکار ہوتیں۔''

جب انطونی اور پکونیس کے پیروکاروں کی تعداد روم میں بڑھتی چلی جا رہی تھی اور یہ تحریک خاصی مقبول ہو چکی تھی۔ انہی ایام میں ''ہلیرین'' کے پیروکار اور مقلدین شام میں راہبانہ زندگی کی ترویج کے لیے تبلیغ کر رہے تھے۔ ہلیرین نے بارہ سال تک دنیاوی آلائشوں سے کنارہ کشی اختیار کی اور اتنی مقبولیت حاصل کر لی کہ جب وہ سفر اختیار کرتا تو اس کے ساتھ تین ہزار پیروکار ہوتے تھے۔

بیسل بہت ہی مشہور راہب گزرا ہے۔ اس نے ایتھنز کے سکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ اس نے شام کے اسقف اعظم کا جلیل منصب حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اس نے ایشیاء کوچک کے پہاڑوں میں سکونت اختیار کی اور بہت سی خانقاہیں بحیرہ اسود کے کنارے قائم کر دیں۔ شمالی انگلستان میں بھی بے شمار خانقاہیں کھل گئیں۔ ''مارٹن'' مرا تو اس کے دو ہزار مقلدین نے اس کے ساتھ جان دے دی۔ پانچویں صدی عیسوی میں لاکھوں کی تعداد میں مسیحی راہب روم سے برطانیہ اور برطانیہ سے حبشہ اور سپین تک پائے جاتے تھے۔

''گبن'' نے مسیحی رہبانیت کا پس منظر ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''لوگ فوجی زندگی کے مصائب سے بچنے کے لیے خانقاہوں میں پناہ لیتے تھے۔''

تنقید

اسلام رہبانیت کو ناجائز قرار دیتا ہے قرآن مجید میں آتا ہے:

وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (الحدید ۵۷:۲۷) اور رہبانیت انھوں نے خود تراش لی ہے ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا مگر اللہ کی رضا کو حاصل کرنے کے لیے نکالی، پر اس کی وہ نگہداشت نہ کر سکے۔ اس آیت کریمہ میں رہبانیت کو بدعت قرار دیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ یعنی اسلام میں رہبانیت قطعاً جائز نہیں۔

مسلمانوں نے بھی اس قسم کی بدعات نکالی ہیں جن کا کتاب اور سنت میں کوئی نام ونشان نہیں۔

رسمیں

بپتسمہ: بپتسمہ یا اصطباغ عیسائیت کی پہلی رسم ہے۔ یہ ایک غسل ہے جو دائرہ عیسائیت میں داخل ہونے والے کو دیا جاتا ہے۔ اس کے بغیر عیسائیت قبول کرنے والے شخص کو عیسائی نہیں کہا جا سکتا۔ اس رسم کی پشت پر عقیدہ کفارہ کارفرما ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ بپتسمہ لینے سے انسان یسوع مسیح کے واسطے سے ایک بار مر کر حیات ثانیہ پاتا ہے۔ موت کے ذریعے اسے "اصل گناہ" کی سزا ملتی ہے اور حیاتِ نو سے اسے آزاد قوت ارادی حاصل ہوتی ہے۔[1]

یورشلم کے مشہور عالم سائرل نے اس رسم کو بجالانے کا طریقہ لکھا ہے کہ

بپتسمہ لینے والے کو بپتسمہ کے کمرے میں اس طرح لٹا دیا جاتا ہے کہ اس کا منہ مغرب کی طرف ہو پھر بپتسمہ لینے والا اپنے ہاتھ مغرب کی طرف پھیلا کر کہتا ہے کہ "اے شیطان میں تجھ سے اور تیرے ہر عمل سے دست بردار ہوتا ہوں۔"

پھر وہ مشرق کی طرف منہ کر کے زبان سے عیسائی عقائد کا اعلان کرتا ہے اس کے بعد اسے ایک اندرونی کمرے میں لے جاتا ہے کہ جہاں اس کے تمام کپڑے اتار دیے جاتے ہیں اور سر سے پاؤں تک ایک دم کیے ہوئے تیل سے اس کی مالش کی جاتی ہے اس کے بعد اسے بپتسمہ کے حوض میں ڈال دیا جاتا ہے۔

اس موقعہ پر عیسائیت کے اندر داخل ہونے والے سے تین سوال دریافت کیے جاتے ہیں کہ کیا وہ باپ، بیٹے اور روح القدس پر مقررہ تفصیلات کے ساتھ ایمان رکھتا ہے۔ ہر سوال کے جواب میں وہ کہتا ہے کہ "ہاں میں ایمان رکھتا ہوں" اس سوال جواب کے بعد اسے حوض سے باہر نکال لیا جاتا ہے اور اس کی پیشانی، کان، ناک اور سینے پر دم کیے تیل پر دوبارہ مالش کی جاتی ہے۔ پھر اس کو سفید کپڑے پہنا دیے جاتے ہیں جو اس بات کی علامت ہے کہ بپتسمہ لینے والا تمام گناہوں کی آلائشوں سے پاک صاف ہو چکا ہے۔ اس کے بعد بپتسمہ پانے والوں کا جلوس ایک ساتھ کلیسا میں داخل ہوتا ہے اور پہلی بار عشائے ربانی کی رسم میں شریک ہوتا ہے۔[2]

عشاء ربانی

دائرہ عیسائیت میں داخل ہونے کے بعد یہ اہم ترین رسم ہے اور یہ رسم حضرت مسیح علیہ السلام کی قربانی کی یادگار کے طور پر منائی جاتی ہے حضرت مسیح علیہ السلام نے گرفتاری سے ایک دن قبل حواریوں کے

---

1. Augstine the Enchiridion XLII. P.688 V1.

2. انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ص ۸۳ ج ۳ مقالہ بپتسمہ۔

ساتھ رات کا کھانا کھایا تھا۔ انجیل متی میں اس طرح اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ "جب وہ کھا رہے تھے، یسوع مسیح نے روٹی لی اور برکت دے کر توڑی اور شاگردوں کو دے کر کہا لو کھاؤ یہ میرا بدن ہے پھر پیالہ لے کر شکر کیا ان کو دے کر کہا تم سب اس میں سے پیو۔ کیونکہ یہ میرا وہ عہد کا خون ہے جو بہتیروں کے لیے گناہوں کی معافی کے واسطے بہایا جاتا ہے۔ (متی ۲۶:۲۶)

لوقا نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ اس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام نے حواریوں سے کہا کہ "میری یادگار ہی کے لیے یہی کیا کرو۔" (لوقا ۲۲:۱۹)

مشہور عالم جسٹن مارٹر اس رسم کو بجالانے کا طریقہ یہ لکھتے ہیں، کہ:

"ہر اتوار کو کلیسا میں ایک اجتماع ہوتا ہے۔ شروع میں دعائیں اور نغمے پڑھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد حاضرین ایک دوسرے کا بوسہ لے کر مبارکباد دیتے ہیں۔ پھر روٹی اور شراب لائی جاتی ہے اور صدر مجلس اس کو لے کر باپ بیٹے اور روح القدس سے برکت کی دعا کرتا ہے جس پر تمام حاضرین آمین کہتے ہیں۔ پھر کلیسا کے خدام (Deacons) روٹی اور شراب کو حاضرین میں تقسیم کرتے ہیں اس عمل سے فوراً روٹی مسیح کا بدن بن جاتی ہے اور شراب مسیح کا خون اور تمام حاضرین اسے کھا پی کر اپنے عقیدہ کفارہ کو تازہ کرتے ہیں۔"[1]

اس اسم کے اور بھی نام ہیں۔ شکرانہ، مقدس غذا، مقدس اتحاد۔

عیسائیت کی تاریخ

عیسائیت کی تاریخ کے مختلف ادوار ہیں:

غربت اور مظلومیت کا دور

عیسائیت پر پہلی تین صدیوں میں نہایت ہی مظالم ڈھائے گئے۔ قرآن مجید نے اس دور کو سورۃ کہف میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا (۱۸:۲۵) اور وہ اپنی غار میں تین سو سال رہے اور نو اور بڑھائے۔

ان مظالم اور مصائب کا آغاز ۶۵ء میں شہنشاہ نیرو (۳۷ء تا ۶۸ء) کے ہاتھوں ہوا۔ جس نے عیسائیوں کو وہ اذیت ناک اور سفاکانہ سزائیں دیں جن کو پڑھ کر انسان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پطرس اور پولوس بھی اسی شہنشاہ کی اذیت کا نشانہ بنے۔ اس نے عیسائی مذہب کو بذریعہ قانون جرم قرار دے دیا۔

مصائب اور آلام کا دوسرا دور پہلی صدی عیسوی کے اواخر (۹۵ء یا ۹۶ء) میں شروع ہوا۔ اس

[1] Justin Martyr Apol.1,65-67.
Quoted by F.C.Burkit. The chiritian religion P.149 V.III.

زمانہ میں رومی شہنشاہ دومیٹین (Domitian) تھا۔ یہ دور جلد ہی ختم ہو گیا۔ ۱۱۲ء میں تراجن (Tarajan) نے مظالم اور مصائب ڈھانے شروع کر دیے اور مبلغین کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ ان مقتولین میں یوحنا کا شاگرد اگنائیس اور اس کا ساتھی پولی کریپ بھی تھے۔

دوسری تمام صدی عیسائیوں کے مظالم اور مصائب کی دردناک داستان سے پُر ہے۔ متعدد شہنشاہوں نے عیسائیت کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کی کوشش کی۔ بڑے بڑے پولی کریپ بھی تھے۔

تیسری صدی میں صرف ۲۴۹ء تا ۲۵۸ء کا دس سالہ عہد عیسائیت کے لیے دردناک دور ہے۔ جس میں ایذائیں اور مصائب اپنی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ اس کے بعد اگر کوئی شہنشاہ رحمدل آ جاتا ہے تو وہ نرمی کا سلوک کرتا، اگر کوئی عیسائیت کا دشمن برسر اقتدار آ جاتا تو عیسائیوں کے خون سے اپنے جوش انتقام کو بجھاتا۔

جن دنوں رومی حکومت میں عیسائیوں پر مظالم اور مصائب ڈھائے جا رہے تھے۔ ایران میں عیسائی آزادی سے اپنے مذہب کا پرچار کر رہے تھے۔ صرف ایک شرط تھی کہ زرتشتی مذہب کے کسی فرد کو عیسائی بنانے کی اجازت نہیں۔ جب رومی حکومت کا سرکاری مذہب عیسائیت بنا دیا گیا تو ایرانی عیسائیوں کی ہمدردیاں رومی حکومت کے ساتھ ہو گئیں۔ اب ایرانی حکومت نے جو رومیوں کی شدید مخالف اور حریف تھی، عیسائیوں کو مظالم کا تختہ مشق بنانا شروع کر دیا۔ لیکن ۴۷۶ء میں روم اور ایران کے باہمی اختلافات دور ہو گئے تو پھر دوبارہ عیسائیوں کو آزادی اور امن کی فضا میسر آ گئی۔

اس ظلم اور تشدد کے دور میں بھی عیسائیت کی اشاعت نہ رکی۔ لوگ آغوش عیسائیت میں آ کر روحانیت حاصل کرتے تھے۔

اس مظلومیت کے دور میں عیسائی ایک خدا کے سوا کسی دوسرے معبود کو نہیں مانتے تھے اور تین خداؤں کا عقیدہ مروج نہیں ہوا تھا۔ قرآن مجید نے چند لوگوں کے کہف میں جانے کی غرض ہی صرف یہ بتائی ہے کہ وہ خدا کے سوا اور کسی کو معبود نہیں مانتے تھے۔

دور ابتداء کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ عیسائی مذہب کا نظام عقائد اور عبادات ابھی تک مدون نہیں تھا۔ اس وجہ سے اس زمانہ میں بے شمار فرقے پیدا ہو گئے۔ کلیمنٹ (م ۱۰۰ء) آگناشش (م تقریباً ۱۱۷ء) پے پیاس (م ۱۲۰ء) پولیکارپ (م ۱۵۵ء) ائرنیوس (۱۷۷ء) وغیرہ اس دور کے مشہور علماء ہیں۔ جن کی تصانیف اور مکتوبات پر عیسائیت کی اساس قائم ہے۔

حکومت کا سرکاری مذہب

چوتھی صدی عیسوی میں عیسائیت مظلومیت کے دور سے نکل کر غالب مذہب بن گئی۔ قسطنطین پہلا رومی بادشاہ ہے جس نے عیسائیت اختیار کرنے کے بعد ۳۲۵ء میں مذہب تثلیث کو اصل عیسائیت اور سرکاری

مذہب قرار دیا۔ اس نے اشاعت عیسائیت میں زبردست حصہ لیا۔ نیقہ میں اس نے ایک کونسل بلوائی، جہاں انجیل کو مدون اور مرتب کیا گیا۔ ۳۲۷ء میں قسطنطین کی وفات کے بعد چرچ کو رومی حکومت پر پورا تسلط حاصل ہو گیا۔ عیسائیت کی اشاعت سرعت کے ساتھ ہونے لگی۔ حبشہ، عرب حتیٰ کہ ہندوستان میں بھی عیسائیت کو فروغ نصیب ہوا۔

اس کے عہد سلطنت میں عیسائی نظام کے عقائد مدون کرنے کے لیے بڑی بڑی کونسلیں منعقد ہوئیں۔ ان میں سے نیقہ کی کونسل بنیادی اہمیت کی حامل ہے جو ۳۲۵ء میں نیقہ (Nicaea) کے مقام پر منعقد کی گئی۔ اس کونسل میں پہلی بار تثلیث کے عقیدے کو عیسائیت کا بنیادی عقیدہ تسلیم کیا گیا۔ اور اس کے منکرین (اریوس وغیرہ) کو عیسائیت سے خارج کر دیا گیا۔ جو عقائد اس کونسل میں مدون ہوئے۔ وہ عقیدہ اتھانی شین (Athanasian creed) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عقائد مبہم تھے۔ اس تشریح و توضیح کے لیے کئی کونسلیں منعقد ہیں۔ چوتھی اور پانچویں صدی میں ان عقائد کی تشریح و توضیح پر بہت مباحثے ہوئے۔ اس لیے اس دور کو عیسائی مورخین ''عہد مجالس (Age of councils) یا عہد مباحثات (Controversy period) کہتے ہیں۔

قسطنطین سے گریگوری تک ۳۱۲ء سے ۵۳۹ء تک کے عرصے میں عیسائی مذہب سلطنت روما پر غالب آ چکا تھا۔ سلطنت بھی عیسائیت کی حریف نہ رہی تھی۔ اس زمانہ کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس دور میں عیسائیت دو سلطنتوں میں بٹ گئی ایک سلطنت مشرق میں تھی جس کا پایہ سلطنت قسطنطنیہ تھا۔ اس میں بلقان، یونان، ایشیائے کوچک مصر اور حبشہ کے علاقے شامل تھے اور وہاں کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا بطریرک (Patriarch) کہلاتا تھا اور دوسری سلطنت مغرب میں تھی۔ جس کا پایہ تخت بدستور روم تھا اور یورپ کا بیشتر علاقہ اس کے زیر نگین تھا وہاں کا ''پوپ'' یا ''پاپا'' کہلاتے تھے۔ دونوں سلطنتوں میں مذہبی اور سیاسی رقابت شروع ہو گئی۔ ان میں سے ہر ایک اپنی برتری چاہتی تھی۔

اس دور کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رہبانیت نے جنم لیا۔ پانچویں صدی میں برطانیہ فرانس میں بہت سی خانقاہیں تو قائم ہو گئی تھیں لیکن پہلا راہب جس نے اسے باقاعدہ نظام بنایا چھٹی صدی کا پاکم مصری ہے۔ پاکم کے بعد باسیلیوس اور جیروم نظام رہبانیت کے مشہور قائد ہیں:

تاریک دور

۵۹۰ء میں گریگوری اول پوپ بنا تھا۔ اس کے وقت سے لے کر شارلمین (۸۰۰ء) کا تاریک زمانہ کہلاتا ہے۔

اس دور میں عیسائیت کی تاریخ میں سیاسی اور علمی زوال شروع ہو گیا تھا اور عیسائیوں میں انتشار پھوٹ چکا تھا اور اسلام عروج پا رہا تھا۔ اس وجہ سے مشرقی علاقوں میں عیسائیت کے اقتدار کی عمارت پیوند

خاک ہو رہی تھی۔

مغربی عیسائیوں نے یورپ میں تبلیغ شروع کر دی۔اس کے نتیجے میں چار صدیوں تک مسلسل تبلیغی کاوشوں کے بعد پورا یورپ عیسائیت کے آغوش میں آ گیا۔

قرون وسطیٰ

۱۸۴ھ سے لے کر ۱۵۲۱ء/ ۹۲۸ھ تک کا زمانہ قرون وسطیٰ کا عہد کہلاتا ہے۔اس زمانہ کی اہم خصوصیت پوپ اور شہنشاہ وقت کی وہ خانہ جنگی ہے جو ایک لمبا عرصہ تک جاری رہی۔ الفریڈ، ای، گاروے نے اس عہد کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔

۱۔ شارلیمن سے لے کر گریگوری ہفتم تک عہد (۸۰۰ء/۱۸۴ھ تا ۱۰۷۳ء/ ۴۶۶ھ) جس میں پاپائیت کو فروغ حاصل ہوا۔

۲۔ ریگوری ہفتم سے بونیفیس تک کا عہد ۱۰۷۳ء/ ۴۶۶ھ تا ۱۲۹۴ء/ ۶۹۳ھ جس میں پوپ کو مغربی یورپ میں پورا اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔

۳۔ بونیفیس ہشتم سے عہد اصلاح تک کا زمانہ ۱۲۹۴ء/ ۶۹۳ھ تا ۱۵۱۷ء/ ۹۲۳ھ) جس میں پاپائیت کا ستارہ زوال میں آ گیا اور اسلامی تحریکیں اٹھنی شروع ہو گئیں۔

قرون وسطیٰ کے اہم واقعات حسب ذیل ہیں۔

ا۔نفاق عظیم

نفاق عظیم (Great Schism) تاریخ عیسائیت کی ایک اصطلاح ہے۔اس سے مراد مشرق اور مغرب کے کلیساؤں کا وہ زبردست اختلاف ہے جس کی وجہ سے مشرقی کلیسا ہمیشہ کے لیے رومن کیتھولک چرچ سے جدا ہو گیا۔اور اس نے بدل کر اپنا نام دی ہولی آرتھوڈوکس چرچ رکھا نفاق عظیم کے اہم اسباب حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اس علیحدگی کی پہلی وجہ تو مشرقی اور مغربی کلیساؤں کا نظریاتی اختلاف تھا۔مشرقی کلیسا کا یہ عقیدہ تھا کہ روح القدس کا اقنوم صرف باپ کے اقنوم سے نکلا ہے اور بیٹے کا اقنوم اس کے لیے محض ایک وسیلے اور واسطے کی حیثیت رکھتا ہے۔اور مغربی کلیسا کا یہ نظریہ تھا کہ روح القدس کا اقنوم باپ اور بیٹے دونوں سے نکلا ہے دوسرے مشرقی کلیسا کا یہ نظریہ تھا کہ بیٹے کا نام اور رتبہ باپ سے کم ہے اور مغربی کلیسا کا عقیدہ تھا کہ دونوں برابر ہیں۔مشرقی کلیسا، مغربی چرچ پر یہ الزام لگاتا تھا کہ انھوں نے اپنے عقیدے کو ثابت کرنے کے لیے نیقاوی کونسل کے فیصلے میں بعض الفاظ اپنی طرف سے بڑھا دیے ہیں جو اصل فیصلے میں موجود نہ تھے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مشرق اور مغرب کے کلیساؤں میں نسلی امتیاز کی خلیج حائل تھی۔ مغرب میں اطالوی اور جرمنی نسل تھی اور مشرق میں یونانی اور ایشیائی۔

۳۔ سلطنت روما دو حصوں میں بٹ جانے کی وجہ سے قسطنطنیہ کا شہر روم کے قدیم شہر کا حریف بن گیا۔

۴۔ پاپائے روم اپنا اقتدار اور بالادستی قسطنطنیہ کے بطریرک کے نہ حوالے کرنے کو تیار تھا اور نہ اس میں اس کو شریک کرنے کے لیے تیار تھا۔

۵۔ رومی کلیسا کو اس بات پر ناز تھا کہ پطرس اور پولوس نے روم میں شہادت پائی تھی اس لیے یہ شہر اور کلیسا زیادہ مقدس اور اہم ہے۔ قسطنطیہ چونکہ رومی حکومت کا پایہ تخت تھا اس لیے وہ یہ کلیسا رومی کلیسا پر اپنی فوقیت اور برتری ظاہر کرتا تھا۔

۶۔ ''کلیساؤں میں اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں کی زبانیں مختلف تھیں، رومی کلیسا میں لاطینی اور قسطنطنیہ میں یونانی۔ دونوں کی تعلیمات کا ترجمہ جب دوسری زبان میں ہوتا تھا۔ تو مفہوم میں اختلاف پیدا ہو جاتا تھا اور بحثیں چھڑ جاتی تھیں۔

۷۔ پوپ لیونہم نے ۱۰۵۴ء میں مغربی عقائد کو مشرقی کلیسا پر تھوپنے کی کوشش کی۔ قسطنطیہ کے بطریرک میکائیل نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یورپ کے سفراء نے سینٹ صوفیاء کے چرچ میں قربان گاہ پر اناثیما (لعنت) کے کلمات لکھ دیے اور اس بات نے نفاق عظیم مکمل کر دیا۔

صلیبی جنگیں

اس دور میں صلیبی جنگیں لڑی گئیں۔ ۱۰۹۵ء/ ۴۸۸ھ میں پوپ اربن دوم نے کلیر مونٹ کونسل میں یہ اعلان کیا گیا کہ صلیبی جنگ مذہبی جنگ ہے۔ سی۔ پی۔ ایس کلیرک اپنی تاریخ کلیسا میں رقمطراز ہے:

''لوگوں کو ترغیب دینے کے لیے اربن نے یہ عام اعلان کر دیا کہ جو شخص اس جنگ میں حصہ لے گا اس کی مغفرت یقینی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح اس نے بھی یہ وعدہ کیا کہ جو لوگ اس جنگ میں مریں گے وہ سیدھے جنت میں جنگ جائیں گے۔[1]

پاپائیت

۳۰۶ء عیسائیت کی تاریخ میں بڑا خوشگوار سال ہے اس لیے کہ اس سنہ میں شاہ قسطنطین اول روم کا بادشاہ کا بنا۔ اس نے عیسائی مذہب قبول کر کے عیسائیت کو سرکاری مذہب قرار دیا تو مذہبی اور دنیاوی امور یک جا ہو گئے اور حکومت روما مقدس بن گئی۔ اس زمانہ میں کلیسا کا انتظام و انصرام پانچ بڑے پادریوں کے زیر نگرانی بہت سے ماتحت پادری سرانجام دیتے تھے۔ یہ پانچوں بڑے پادری پٹراج (Patriarchs)

[1] Clark, Short History of the Church P.204.

کہلاتے تھے جو انگریزی میں فادر کے ہم معنی ہے۔ یہ یونانی لفظ ہے جس کے معنی باپ کے ہیں۔ لاطینی زبان میں اسے پوپ کہتے ہیں۔

پاپائیت کی بدعنوانیاں

وہ شخص جس نے سب سے پہلے پاپائی نظام کو مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر استوار کیا۔ وہ گریگوری اول (۵۴۰ء تا ۶۰۹ء) تھا۔ بہت سی وحشی اقوام مثلاً گوتھ، ہنس گال، فرینک وغیرہ رومی پوپ کے ذریعہ آغوش عیسائیت میں آئی تھیں، جس سے پوپ کی طاقت میں بہت اضافہ ہو گیا اور وہ دنیاوی اور دینوی طاقتوں کا منبع قرار دیا گیا اور اسے غیر محدود اختیارات حاصل ہو گئے۔ اس کی نافرمانی کو گناہ عظیم اور جرم قرار دیا گیا۔ قانون سازی کے تمام اختیارات پوپ کے ہاتھ میں ہی تھے۔ اس کا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ بڑے بڑے بادشاہوں کو پوپ کی حمایت حاصل کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

اس دور کے پاپائی نظام کے متعلق ڈیوڈ فادرنگھم (David fatheringham) نے لکھا ہے۔

''پاپائی نظام کلیساؤں پر بری طرح چھایا ہوا تھا اور سیاست پر جاگیرداروں کا قبضہ تھا۔ دونوں آزادی اور حریت کے جانی دشمن تھے۔ ظاہری اختیار سے دونوں میں ایک زبردست مشابہت تھی، وہ یہ کہ سربراہ مملکت مطلق العنان تھا۔ جس کی ماتحتی میں سرداروں، افسروں اور فوجیوں کا ایک لمبا سلسلہ ہوتا تھا، جو اپنے آقا کی ہر مرضی کے لیے تیار رہتے تھے اور عوام کی حیثیت اس علاقہ کے مال و اسباب سے تھوڑی بہتر ہوتی تھی۔ جس سے ان کا تعلق ہوتا تھا۔ زمانہ امن میں بھی اپنے افسروں کے اشارے سے ہر قسم کے کام انھیں انجام دینا پڑتے تھے۔ بے شمار جنگوں میں حصہ لینے پر انھیں مجبور کیا جاتا تھا۔ ان عوام کی حیثیت کلیسا والوں کے نزدیک بھی اس سے زیادہ نہ تھی ان کو کوئی روحانی حقوق حاصل نہ تھے، ان کی حالت بھیڑوں کی سی تھی جن کے کھانے کا انتظام تو نہ کیا جاتا لیکن ان کی اُون کاٹ لی جاتی۔ ان عوام کے سروں پر مذہبی عہدیداروں کا ایک لمبا سلسلہ مسلط تھا، جو ایک علاقائی اسقف سے پوپ تک جا پہنچتا تھا۔ یہ پوپ خود کو پطرس کا جانشین اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نائب کہتا، اور اس سلسلہ میں وہ ایسے امور انجام دیتا اور اس اقتدار کا مالک ہوتا جو ربانی تو ہو سکتا ہے لیکن کسی فانی انسان کے لیے سزاوار نہیں [1]

پوپ نے اپنے غیر طبعی نظام کلیسا کو چلانے کے لیے علم کے چراغ کو نہ جلنے دیا۔ جو شخص بھی علمی اور عقلی بات کرتا اس کو گرفتار کر لیا جاتا اور اسے عبرتناک سزا دی جاتی۔ پاپائے روم نے دین کے نام پر علماء پر جو مظالم ڈھائے وہ اتنے دردناک ہیں جن کو پڑھ کر انسانیت کی پیشانی شرم و حیا سے عرق آلود ہو جاتی ہے۔

علم کی روشنی کو بجھانے کے لیے پوپ نے ۱۴۷۸ء میں مجالس تفتیش و احتساب (Enquisition) قائم کر دیں۔ ان مجالس کا یہ کام تھا کہ جس شخص پر شبہ ہو کہ اس کا دل علم کی روشنی سے

[1] بحوالہ تاریخ مذاہب مصنفہ رشید احمد ص ۳۹۱، ۳۹۲ دوسرا ایڈیشن، سال اشاعت ۱۹۶۸ء۔

منور ہے اور دین کے بارے میں اپنی عقل سے کام لیتا ہے اسے فوراً گرفتار کر لیا جاتا تھا اور اس کو جرمانے سے لے کر زندہ جلا دینے کی سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس محکمہ نے ۱۴۱۱ء سے ۱۸۰۸ء تک تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو مختلف نوع کی سزائیں دی تھیں۔ ان میں سے بتیس ہزار انسان ایسے تھے جنھیں زندہ جلا دیا گیا تھا۔ اسپین کے محکمہ تفتیش واحتساب نے جب اپنی پہلی سالگرہ منائی تو بڑے طمطراق سے یہ اعلان کیا کہ بارہ مہینے میں دو ہزار آدمیوں کو نذر آتش کیا گیا ہے اور سترہ ہزار کو بھاری جرمانے اور حبس دوام کی سزائیں دی گئی ہیں۔

پادری تارکوئی میڈا، کیسٹیل اور لیان کا صدر محتسب تھا۔ اس شخص نے اٹھارہ برس کے اندر دس ہزار دوسو بیس آدمیوں کو زندہ جلا دیا اور ستانوے ہزار تین سو اکیس انسانوں کو دوسری الم ناک سزائیں دیں۔

اس درندہ صفت انسان نے صرف زندہ انسانوں کو ہی سزائیں نہ دیں بلکہ اس نے چھ ہزار آٹھ سو ساٹھ قدیم علماء وحکماء کی مورتیں بنوائیں اور انھیں نذر آتش کر کے اپنے آتش غضب کو ٹھنڈا کیا۔

کلیسا کے ان مظالم اور دردناک سزاؤں کے باوجود علم کی روشنی پھیلتی چلی گئی آخر پوپ نے اس روشنی کو گل کرنے کے لیے ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ وہ یہ کہ اس نے ۱۵۱۵ء میں حکم دے دیا کہ کلیسا کی منظوری کے بغیر کوئی کتاب چھاپی نہیں جاسکتی جو شخص بھی کوئی ایسی کتاب چھاپے گا، بیچے گا یا پڑھے گا اس کو سزائے موت دی جائے گی۔

سترھویں صدی کے آغاز میں فلورنس کے مشہور عالم گلیلیو نے دوربین ایجاد کی اور زمین کے گول ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس کو پوپ کی طرف سے فوراً گرفتار کر لینے کا حکم صادر ہوا۔ آخر کار وہ ڈر گیا اور اس نے اپنے ''کفر'' سے توبہ کر لی اور گوشہ عافیت میں جا بیٹھا۔ لیکن گوشہ عافیت میں بھی اس کا دل مضطرب اور طبیعت پریشان رہتی تھی۔ آخر کار پریشانی اور اضطراب کا علاج سولہ برس کی خاموشی کے بعد اپنی کتاب ''نظام عالم'' کی اشاعت میں پایا۔ اس کتاب میں زمین کے گول ہونے کے دلائل دیے گئے ہیں گلیلیو کی اس گستاخی پر اس کو گرفتار کر لیا گیا۔ دردناک سزاؤں کی دھمکی دی گئی۔ لیکن اس دفعہ علم کا وہ خمور اور نشہ تھا جو کوئی سنگین سزا کی دھمکی بھی نہ اتار سکی۔ آخر کار وہ قید خانہ میں سسک سسک کر مر گیا، اور کلیسا نے اس کی لاش مسیحی قبرستان میں دفن نہ ہونے دی۔

اٹلی کے ایک مشہور عالم برونو کو اس جرم میں پکڑا گیا کہ وہ تعدد عوالم کا قائل ہے۔ عدالت احتساب نے اس کے متعلق یہ حکم صادر کیا کہ اس کو بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا جائے۔ جب برونو نے یہ حکم سنا تو اس نے عدالت کو ان الفاظ میں مخاطب کیا: یقین کرو تمہارا حکم سن کر میرے دل پر اس خوف کا عشر عشیر بھی طاری نہیں ہوا جو خود تمھارے دلوں میں اسے صادر کرتے وقت پیدا ہوا ہوگا۔'' آخر کار اس کو ۱۶ فروری ۱۶۰۰ء میں نذر آتش کر دیا گیا۔

مسیحی یورپ اور کلیسا کی اخلاقی حالت اور معافی نامے

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جو قوم بھی جہالت اور شرک کا شکار بنی ہے وہ اخلاقی لحاظ سے بہت ہی پست تھی۔ مسیحی یورپ اور کلیسا کی اخلاقی گراوٹ کی وجہ یہی تھی کہ پوپ علم کے شدید دشمن تھے اور شرک پر کلیسا کی عمارت کھڑی کی ہوئی تھی۔ اس عہد کے ایک مصنف نے انگلستان کی حالت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

''اس قوم کے امراء پیٹو اور عیاش تھے اور کبھی گرجا نہیں جاتے تھے۔ نماز فجر اور صلاۃ اقدس کے ادا کرنے کا انھوں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ پادری جسے چاپلوسی نے ان کی نگاہوں سے گرا رکھا تھا ان کی خواب گاہ میں جا کر بیدار ہونے سے قبل جلد جلد نماز کے الفاظ دُہرا جاتا تھا اور ان کے کانوں میں ایک لفظ بھی نہ پڑتا تھا۔ عام باشندے ان طاقتور امراء کے پنجہ ظلم میں پھنسے ہوئے تھے۔ ان کی لڑکیوں کو بیچ ڈالا جاتا تھا دن رات شراب کے دور چلتے تھے اور جو برائیاں بدمستی کی رفیق ہیں وہ ظاہر ہو کر مردوں کو نامرد بناتی جاتی تھیں۔''[1]

زنا کاری اور بدکاری کی وجہ سے یورپ میں آتشک کی بیماری عام تھی ڈریپر کے الفاظ میں ''خود پاپائے مقدس حضرت لیو دہم بھی تو تاپال بیٹھے اور نیم کی ٹہنی ہلاتے ہوئے پائے گئے۔''[2]

معافی نامہ

اس دور میں پوپ کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ وہ خدا کا نائب اور عیسیٰ کا قائم مقام ہے۔ اس کا نہ کوئی فیصلہ غلط ہو سکتا ہے اور نہ اس کے کسی حکم پر تنقید کی جا سکتی ہے۔ وہ گنہگاروں کے گناہ معاف کر سکتا ہے۔ اس عقیدے نے آہستہ آہستہ معافی ناموں (Indulgences) کی صورت اختیار کر لی۔

ابتداء یوں ہوئی کہ صلیبی جنگوں میں پوپ اربن دوم (Urban II) نے یہ اعلان کیا کہ جو لوگ بذات خویش جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے۔ وہ اپنی طرف سے کسی اور کو بھیج دیں۔ اس کے بدلہ میں انھیں ''معافی نامہ'' دے دیا جائے گا جو اس کی نجات کا ذریعہ ہوگا۔

جب پوپ لیوٗ دہم (Leo X) نے روما میں سینٹ پیٹر کا گرجا بنوانے کا ارادہ کیا تو اس نے بھی اس قسم کے ''معافی نامے'' فروخت کرنا شروع کر دیے۔ اس کے بعد عام معافی نامے بکنے شروع ہو گئے۔ شہر شہر قریہ قریہ، کوبکو غرض کہ ہر مقام پر ان معافی ناموں کی ایجنسیاں قائم کر دی گئیں۔ ہر گناہ کے لیے الگ الگ قیمت کا معافی نامہ ہوتا تھا۔ معافی نامے کی عبارت یہ تھی۔

''تم پر خداوند یسوع مسیح کی رحمت ہو، اور وہ تمھیں اپنے مقدس ترحم (خسروانہ) سے (تمام گناہوں کی پاداش سے) آزاد کر دے۔ میں اس کی اور اس کے بابرکت شاگرد پطرس، پولوس اور مقدس پوپ کی اس سند کی رو سے جو انھوں نے مجھے عطا فرمائی ہے تمھیں آزاد کرتا ہوں۔ سب سے پہلے کلیسا کی تمام ملامتوں سے خواہ وہ کسی شکل میں ہوں، پھر تمھارے ہر ایک، حدود شکنی اور زیادتی سے خواہ وہ کیسے معیب اور

---

[1] بحوالہ مقدمۃ العلم والعلماء از مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ص ۱۴، ۱۵۔ [2] ایضاً۔

شدید کیوں نہ ہو اور میں وہ سزا تم سے اٹھا لیتا ہوں جو تمھیں تمھارے گناہوں کی پاداش میں جہنم میں ملنے والی تھی۔ تاکہ تم جب مرو تو جہنم کے دروازے تم پر بند ہوں اور جنت کی راہیں کشادہ باپ بیٹے اور روح القدس کے نام پر۔"[1]

اس معافی نامہ میں مختلف گناہوں کی قیمتیں مختلف تھیں۔ ہر ایک ایجنٹ کے پاس ان کی فہرست موجود ہوتی تھی جس کی اصل (Tax of the sacred roman chancerx) کی کتابی میں محفوظ ہوتی تھی۔

مختلف گناہوں کی معافی کی مختلف قیمتیں حسب ذیل تھیں:۔

۱۔	اسقاط حمل	۳ شلنگ ۶ پنس
۲۔	چوری	۹ شلنگ
۳۔	عفیفہ کی عصمت دری	۹ شلنگ
۴۔	زنا کی بھیانک صورت میں	۷ شلنگ ۶ پنس
۵۔	قتل	۷ شلنگ ۶ پنس

یہ معافی نامے صرف اپنے گناہوں کی میل دھونے کے لیے نہ ہوتے تھے بلکہ مردوں کے گناہوں کے لیے بطور کفارہ خرید کیے جا سکتے تھے۔ چنانچہ ان معافی ناموں کے فروخت کرنے کے لیے ایجنٹ اس قسم کی آوازیں لگایا کرتے تھے:

"آؤ، بڑھو! جنت کے دروازے کھل رہے ہیں۔ اگر تم اب بھی داخل نہ ہو گے تو کب داخل ہو گے۔ تم بارہ پنس کے عوض اپنے باپ کی روح کو جہنم سے نکلوا سکتے ہو۔ کیا تم ایسے ناخلف ہو کہ اپنے باپ کے یے اس قدر سستی نجات بھی نہیں خرید سکتے؟ اگر تمھارے پاس اور کچھ نہیں فقط ایک کوٹ ہے تو وہی اتار دو تاکہ اس قدر گراں بہا متاع خرید سکو۔"[1]

جب معافی ناموں کی عام تجارت شروع ہو گئی تو تمام مسیحی یورپ اور کلیسا خاص طور پر گناہوں اور جرائم کی دلدل میں پھنس گیا۔ چنانچہ آکسفورڈ کا چانسلر (Thomas Gascuigne) ۱۴۵۰ء میں رقمطراز ہیں۔

آج کل گناہگار (ہر جگہ) یہ کہتے ہوئے سنائی دے رہے ہیں کہ "میں اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا کہ میں خدا کے حضور کتنے ہی گناہ کرتا ہوں اس لیے کہ ہر وقت بلا وقت ہر گناہ اور ہر جرم کے لیے معافی نامہ خرید سکتا ہوں، کبھی چار پنس میں کبھی جوئے کے ایک داؤ کی قیمت کے بدلے۔" اس لیے کہ ان معافی ناموں کے بیچنے والے ہر جگہ دکھائی دے رہے ہیں اور وہ انھیں کبھی دو دو پنس میں کبھی ایک جام شراب کے بدلے یا جوئے میں ہاری ہوئی رقم کے معاوضہ میں اور گاہے کسی رنڈی کے خرچہ کے عوض میں بیچ دیتے ہیں۔"[2]

۱۔ Buck's theodogical dictionary indulgences.

۲۔ Quoted by Mancken in treatise on Right and Wrong PP.187.....188.

یہ خرابیاں صرف عوام میں ہی نہ تھیں بلکہ کلیسا کی فضا گناہوں کی مسموم فضا سے اور بھی زیادہ متعفن ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس باب میں Dr Inge لکھتا ہے:

"جس عہد میں کلیسا سیاسی طور پر صاحب اقتدار رہا وہی عہد سب سے زیادہ بدمعاشیوں کے لیے بدنام رہا۔"[1]

منکن (Mencken) ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"یونیورسل چرچ کے اقتدار کا زمانہ درحقیقت بے مثال جرائم، بدنظمی، ظلم و تعدی، فسادات اور بدکاریوں کا زمانہ تھا۔"[2]

تحریک اصلاح مذہب

بدکاریوں اور جرائم کی کثرت کا یہ نتیجہ ہوا کہ پادریوں کے خلاف نفرت کا جذبہ زور پکڑنے لگا اور عیسائیت کے خلاف شکوک و شبہات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ چنانچہ چند حقیقت پسند ایسے مصلحین کلیسا اور مسیحی مذہب کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

پیٹر والڈو (Peter Waldo)

بارھویں صدی کے اواخر میں ہو گزرا ہے۔ یہ فرانس کا ایک مشہور اور دولت مند تاجر تھا۔ اس کو مذہب سے گہری دلچسپی تھی۔ اس نے کتاب مقدس کا ترجمہ شروع کر دیا۔ ترجمہ کے دوران اس نے یہ محسوس کیا کہ کلیسا اپنی اصلی تعلیمات سے ہٹ چکا ہے۔ جب وہ عیسائیت کی روح کو سمجھ چکا تو اس نے اپنی زندگی میں تضاد محسوس کیا، اور وہ سمجھ گیا کہ حقیقت سے دور لے جانے والی صرف دولت ہی ہے۔ اس نے اپنی تمام دولت غرباء میں تقسیم کر دی اور اپنی زندگی مسیحی تعلیمات کے مطابق بسر کرنا شروع کر دی۔ شہر شہر، قصبہ قصبہ گھوما۔ مسیحی تعلیمات کی اصل روح سے لوگوں کو آگاہ کیا، اس کے پیروؤں کی تعداد جنوبی فرانس، شمالی اٹلی اور اسپین میں خاصی بڑھ گئی۔

والڈو کے حقیقت پسندانہ نظریات کی وجہ سے اسے عیسائیت سے خارج کر دیا گیا۔ اس طرح اس کے حامیوں کو بھی جلاوطنی کی زندگی گزارنا پڑی۔

جان ٹولر (John Tauler)

(۱۲۹۰ء تا ۱۳۶۱ء) جرمنی کا رہنے والا تھا۔ اس نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ جو شخص مسیح مذہب کو بدل و جان مانتا ہے اور وہ صرف پوپ کی نافرمانی کرتا ہے وہ بدعتی نہیں۔ اس کے وعظ نے بھی عوام میں پوپ کے خلاف نفرت کے جذبات ابھار دیے۔

---

[1] P.290 [2] P.105

جان وائی کلف

انگلینڈ میں چودھویں صدی عیسوی میں ایک پادری جان وائی کلف (John Wyclifee) نے (۱۳۲۴ء یا ۱۳۲۰ء تا ۱۳۸۴ء) جو آکسفورڈ میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتا تھا، پوپ کے خلاف آواز بلند کی۔ اس نے کہا: جو پادری خود گناہوں کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہوں ان کو یہ کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ لوگوں کو مذہبی تعلیم دیں۔ انسانوں کو صرف اللہ تعالیٰ کی ہی اطاعت کرنی چاہیے، اس کی اطاعت میں ہی حقیقت نجات مضمر ہے۔ اس نے اعتراف گناہ اور کفارہ پر بھی دل کھول کر تنقید کی۔

جان وائی کلف کو اس ''کافرانہ گستاخی'' کے بدلے کئی بار نظر بند کیا گیا اور اس کی موت کے تیرہ سال بعد یہ فیصلہ ہوا کہ اس کی قبر کھود کر اس کی لاش آگ میں جھونک دی جائے۔

جان وائی کلف کی تعلیم سے لوگ بہت متاثر ہوئے۔ اس کی تعلیم کا سب سے بڑا علمبردار پریگ یونیورسٹی کا معلم دینیات جان ہس (John Huss) (۱۳۶۹ء تا ۱۴۱۵ء) تھا۔ اس نے جان وائی کلف کی تعلیم اور پیغام کی خوب اشاعت کی۔ چنانچہ اسے گرفتار کر کے زندہ جلا دیا گیا۔

مارٹن لوتھر

تحریک اصلاحی میں جس شخص نے انقلابی روح پھونکی وہ مارٹن لوتھر تھا۔ وہ ۱۴۸۳ء میں سکسنی (Saxony) میں ایک غریب اور مفلوک الحال گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک معمولی کان کن تھا۔ عسرت کی وجہ سے اس کے والدین لوتھر کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ کر سکے۔ اس ہونہار بچے نے جرمنی کی سڑکوں پر گانا گانے کا پیشہ اختیار کر لیا، اس کی اُجرت سے اپنے تعلیمی اخراجات کو پورا کرتا۔ اس نے لاء کالج میں داخلہ لے لیا، لیکن قانون کی تعلیم چھوڑ کر یک جہتی سے مذہبی تعلیم کی طرف توجہ کی، حتیٰ کہ وہ پادری بن گیا۔ پچیس سال کی عمر میں وٹن برگ (Witten Berg) یونیورسٹی میں دینیات کا معلم بن گیا اور اس نے جلد ہی اپنی قابلیت کا سکہ منوا لیا۔

۱۵۱۲ء میں وہ روم سیر و تفریح کے لیے گیا اور اسے پوپ کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ وہ جلد اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ پوپ نہ صرف مسیحی مذہب کی روح سے دور ہے بلکہ روحانیت اور اخلاق سے بھی بالکل عاری ہے۔ اس نے جان ٹولر کی تصانیف کا بنظر عمیق مطالعہ کیا۔ جرمنی واپس آ کر پوپ کی مخالفت شروع کر دی۔ اس زبانی مخالفت کو تحریک کا رنگ اس وقت ملا جب پوپ لوئی دہم نے ٹیٹ زیل (Tetzel) کو جرمنی اس غرض کے لیے بھیجا کہ وہاں لوگوں میں معافی نامے فروخت کرے، اور جو رقم وہاں سے موصول ہو اس سے روم میں سینٹ پیٹر چرچ تعمیر کرایا جائے۔ ابتداء میں معافی نامے بیچنے والوں کو کامیابی حاصل ہوئی کیونکہ لوگ پوپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔

عیسائیت کی تاریخ میں ۱۲۱ کتوبر ۱۵۱۷ء کا دن بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ اس دن لوتھر نے پوپ کے خلاف علانیہ طور پر اعلان بغاوت کر دیا اور پادری ٹیٹ زیل (Tetzel) کو کہا کہ وہ مسیح مذہب کے خلاف کام کر رہا ہے اور وہ اس سے اس بات پر مباحثہ کرنے کو تیار ہے۔ دعوتِ مباحثہ کے بعد اس نے پچانوے سوالوں پر مشتمل ایک سوالنامہ تیار کیا اور اس کو ۱۲۱ کتوبر ۱۵۱۷ء کو ایک مقامی گرجا کے صدر دروازہ پر آویزاں کر دیا۔ اس سوالنامے نے جرمنی کے لوگوں میں ایک انقلابی روح پھونک دی۔ وہ پوپ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ لوتھر کے نظریات کے بے شمار لوگ حامی ہو گئے، ان میں سے بعض شہزادے بھی تھے۔
جب اصلاحی تحریک کا سیلاب بڑھنے لگا اور پوپ کو اپنے اقتدار پر زوال اور ادبار کا سایہ نظر آنے لگا تو اس نے ۱۵۲۰ء میں ایک فرمان جاری کیا۔ جس کے ذریعے لوتھر کے اکتالیس عقائد کو باطل قرار دیا۔ اور اس فرمان میں لوتھر کے نظریات سے نفرت کا اظہار کیا گیا اور عوام سے اپیل کی کہ وہ اس ''ملحد اور کافر'' کی کتب جلا دیں اور لوتھر کو اپنے عقائد درست کرنے کے لیے دو ماہ کی مہلت دی گئی۔ جب یہ فرمان لوتھر کو ملا تو اس نے عوام کے سامنے علانیہ طور پر اسے نذر آتش کر دیا۔ لوتھر کو مذہب سے خارج کر دیا گیا اور اسے بادشاہ کے سامنے طلب کیا گیا، جہاں اس نے نہایت دلیری کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ٹھوس دلائل کے ساتھ اپنے خیالات کی صحت کو ثابت کیا اور آخر میں اس نے کہا: ''جب تک کتاب مقدس اور عقل کی رو سے مجھے مجرم ثابت نہ کر دیا جائے، میں اپنے ان خیالات سے باز نہیں آ سکتا۔ یہی میرا موقف ہے۔ جسے میں کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ خداوند! تو میری مدد کر، آمین۔''[1]

اب حالات پہلے جیسے نہیں تھے کہ پوپ اپنے مخالف کو پکڑ کر جو چاہے سزا دے۔ عوام کی ایک بھاری اکثریت لوتھر کے حامیوں کی تھی۔ چنانچہ لوتھر کو ایک مستحکم قلعہ میں رکھا گیا جہاں وہ ایک سال رہے اور بائبل کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔

۱۵۲۰ء وہ سال ہے جب لوگوں نے مارٹن لوتھر کی تقاریر سے متاثر ہو کر رومن کیتھولک سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کے بعد جرمن میں ایک نیا کلیسا وجود میں آ گیا۔ اس کی ساری ذمہ داری پوپ پر عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ مارٹن لوتھر کو دائرہ عیسائیت سے الگ نہ کرتا تو لوگ اس مذہب کو نہ چھوڑتے۔ مارٹن لوتھر کو بہت سے جرمن شہزادوں کی حمایت حاصل ہو گئی تھی۔ مگر بادشاہ چارلس پنجم اسے گرفتار کرنا چاہتا تھا لیکن فرانس سے جنگ کے پیش نظر وہ ایسا نہ کر سکا۔ جب تک جنگ ہوتی رہی لوتھر کے حامیوں اور پیروکاروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔

پروٹسٹنٹ

چونکہ یہ اصلاحی تحریک پاپائیت کے خلاف ایک احتجاج تھا جسے انگریزی میں پروٹسٹ (Protest)

[1] انسائیکلوپیڈیا مذہب و مذاہب ص ۲۳۷۔

کہتے ہیں، اس لیے جو لوگ اس تحریک کے حامی تھے انھیں پروٹسٹنٹ (Protestant) کہا جانے لگا۔

لوتھر ۱۵۴۶ء میں مر گیا، لیکن وہ مذہبی بیداری کی ایسی روح پھونک گیا تھا کہ عوام رومن کیتھولک سے بیزار ہو ہو کر الگ ہوتے چلے گئے اور اس طرح مذہبی اصلاحی تحریک کے حامیوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ ۱۵۵۵ء میں چارلس پنجم اور پروٹیسٹنٹ شہزادوں کے مابین شدید جھگڑا پیدا ہو گیا۔ آخر کار یہ طے ہوا کہ ہر شہزادہ کو یہ آزادی ہے کہ جو چاہے مذہب اختیار کرے۔

مارٹن لوتھر کے بعد کے مصلحین

زونگلی

لوتھر کی وفات کے بعد اصلاح کلیسا کا کام جاری رہا۔ اصلاح کی اہم ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے والوں میں سے ایک ہل رچ زونگلی (Hulrichzwingli) تھا جو سوئٹزر لینڈ کا رہنے والا تھا۔ ۱۴۸۴ء میں پیدا ہوا۔ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کیتھولک پادری بنا۔ ایک دفعہ وہ روم گیا تو کلیسا کی ابتر حالت اس پر عیاں ہوگئی۔ اس نے مسیح مذہب کی اصلاح کا عزم بالجزم کر لیا۔ سوئٹزر لینڈ واپس آ کر تقاریر کے ذریعہ کلیسا کی ابتر حالت کو عوام پر آگاہ کرنے لگا۔ اس طرح کیتھولک مسلک کے پیروؤں کے خلاف جنگوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ انہی جنگوں میں وہ ۱۵۳۱ء میں وفات پا گیا۔

وہ لوتھر کے مقابلہ میں زیادہ متشدد تھا۔ اس نے بائبل کی تعلیم پر عمل کرنے اور اسے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنا راہنما قرار دینے پر بہت زور دیا۔ عشائے ربانی کے بارہ میں اس کا یہ عقیدہ تھا کہ اس کے ذریعے اس قربانی کا اعادہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی یاد تازہ کی جا سکتی ہے۔ اس نے کلیسا کے نظام کو جمہوری بنیادوں پر قائم کیا۔ حکومت کے عمال کے لیے مسیح کی تعلیم پر عمل کرنا لازمی قرار دیا اور کہا کہ اگر کوئی عامل مسیح کی تعلیم کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کو اس کے عہدے سے معزول کر دینا چاہیے۔ پادریوں کی شادی پر زور دیا۔ مورتیوں کو خلاف قانون قرار دیا۔ ہر قسم کے جلوس، تہوار اور تقریبات کی مخالفت کی۔

جان کالون (John Colvin)

کالون ۱۵۰۹ء میں فرانس میں پیدا ہوا۔ اس نے پروٹسٹنٹ نظریات کی حمایت کی۔ اس زمانہ میں پروٹسٹنٹ فرقہ کے حامیوں کے خلاف شدید کاروائی کی جاتی تھی اور ان کے لیے ہر قسم کی سزا روا رکھی جاتی تھی۔ اس وجہ سے کالون کو فرانس چھوڑنا پڑا۔ ۱۵۳۶ء میں اس نے اپنی مشہور کتاب عیسائیت کے مبادیات (Institutes of Chirstian Religion) لکھی۔ اس میں اس نے اپنے مذہبی نظریات بیان کیے ہیں۔ اس نے اپنا اصلاحی کام جنیوا میں شروع کیا۔ اس کے خیالات نہایت ہی انتہا پسندانہ تھے، اس لیے ۱۵۳۸ء میں اسے جنیوا سے باہر نکال دیا گیا۔ لیکن اس کے خیالات کے اثرات سوئٹزر لینڈ میں موجود رہے تین

سال کے بعد وہ دوبارہ جنیوا آیا اور ایک مذہبی حکومت کی بنیاد ڈالی۔۱۵۶۴ء میں اس نے وفات پائی۔

جان کالون گو لوتھر کے نظریات کا حامی تھا، لیکن اس نے الگ فرقہ کی بنیاد ڈالی جس کا نام کالونی فرقہ ہے۔ یہ فرقہ زیادہ زور عقیدہ تقدیر پر دیتا ہے۔ ان کا یہ نظریہ ہے کہ وہ اللہ کے محبوب ہیں اور اس نے ان کو ان کی صلاحیت اور وصف کا خیال کیے بغیر منتخب کر لیا ہے اور وہی نجات کے حق دار ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے صرف اسی فرقہ کے لوگوں کے گناہوں کے کفارہ کے طور پر صلیب پر جان دی ہے۔ اس عقیدہ نے انسانی اختیار کو بالکل ختم کر دیا ہے۔

کالون کا ایک اہم عقیدہ یہ ہے کہ آدم کے گناہ کے باعث تمام انسان فطری طور پر معاصی ہیں اور ان سے نیک کام کرنے کی تمام استعدادیں سلب کر دی گئی ہیں۔ اس طبعی معصیت کی وجہ سے وہ دائمی جہنم کا مستحق ہے۔ البتہ کالونی فرقہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

زونگلی اور کالون کے پیروؤں کے اتحاد سے اصلاح شدہ کلیسا (Reformed Church) وجود میں آیا۔ یہ لفظ لوتھر کے کلیسا سے تمیز کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔

جان ناکس

جان ناکس ۱۵۰۵ء میں اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوا۔ پہلے یہ بھی رومن کیتھولک کا پادری تھا۔ لیکن پادریوں کی بے راہ روی، بد اخلاقی، مسیحی مذہب کی روح سے دوری اور دنیاوی لالچ نے اسے کلیسا کا باغی بنا دیا۔ اس نے پادریوں کے خلاف تقاریر کا سلسلہ شروع دیا۔ اس کے باعث اسے جلاوطنی اور نظربندی کی مصیبتیں اٹھانا پڑیں۔ اٹھارہ سال تک اسے اسیری کی زندگی بسر کرنا پڑی۔ ایڈورڈ ششم کی مداخلت سے اسے آزادی حاصل ہوئی لیکن میری ٹیوڈر (Mary Tudor) انگلستان کی ملکہ بنی تو پھر پروٹسٹنٹوں پر مظالم ڈھائے جانے لگے۔ یہ سب لوگ جنیوا چلے گئے۔ جان ناکس بھی جنیوا چلا گیا اور کالون کے نظریات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ جب الزبتھ انگلستان کی ملکہ بنی تو پروٹسٹنٹ فرقہ کے لوگ واپس انگلستان لوٹ آئے۔ جان ناکس نے آ کر کالونی طرز کے ایک کلیسا کی بنیاد ڈالی جس میں تھوڑا سا ردو بدل کیا گیا یہ کلیسا پرس بی ٹیرنزم (Presby terianism) کے نام سے مشہور ہوا۔

ناکس نے اسکاٹ لینڈ میں کیتھولک نظام کو بالکل ختم کر دیا اور ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈالی جس میں حکومت اور کلیسا دونوں شامل تھے۔ اس نظام میں عوام کے حقوق کو محفوظ کیا گیا۔ اس میں عمال خادم اور عوام مخدوم کی حیثیت رکھتے تھے، ناکس کی یہ رائے تھی کہ حکومت اور کلیسا کے انتظام میں بھی زمانہ کے تقاضے کے مطابق تبدیلی ہونی چاہیے۔ کوئی ایسا نظام قائم کرنا ممکن نہیں ہے جو ہر زمانہ میں مفید اور قابل عمل ہو۔ کیونکہ حالات کے تحت تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ ان تقاضوں کے مطابق ہی نظام قائم کرنا چاہیے۔

ناکس کئی کتب کا مصنف ہے، لیکن اس کی سب سے مشہور کتاب، اسکاٹ لینڈ میں اصلاح مذہب کی

تاریخ (History of reformation of religion within realm of scotland) ہے۔

ردعمل اصلاحی تحریک

اصلاحی تحریک کے اثر سے لوگ چرچ کو چھوڑ رہے تھے۔ کلیسا کے عہدیداروں میں احساس پیدا ہوگیا کہ اگر اسی طرح لوگ چرچ کو چھوڑتے چلے گئے تو بنیادی چرچ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے قائم کیا تھا وہ ختم ہو جائے گا اور جب تک اس چرچ میں برائیاں موجود ہیں اس وقت تک لوگ اسے چھوڑتے چلے جائیں گے۔ بعض مخلصین کلیسا نے یہ کوشش کی کہ کیتھولک چرچ میں اصلاح کی جائے۔ اس اصلاحی کوشش کا نام ''ردعمل اصلاحی تحریک'' ہے۔ مخلصین کلیسا کی کوششوں سے آسٹریا کے مقام ٹرنٹ پر ۱۵۴۵ء، ۱۵۵۲ء میں کونسل کا انعقاد ہوا۔ جس کا ایک مقصد یہ تھا کہ دونوں کلیساؤں کے اختلافات کو ختم کیا جائے۔ لیکن یہ مقصد پورا نہ ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے پادریوں کی زندگی کو بہتر اور پاک بنانے کے اصول مرتب کیے۔ جہاں تک پوپ کا تعلق ہے اس کی طاقت کو برقرار رکھا گیا تھا۔

''ردعمل اصلاحی تحریک'' کا صرف یہی مقصد نہ تھا کہ صرف چرچ کی برائیوں کو ہی دور کیا جائے تا کہ لوگ اسے نہ چھوڑیں، بلکہ یہ بھی تھا کہ جو لوگ علیحدگی اختیار کر گئے ہیں انہیں واپس لایا جائے۔ اس مقصد کے لئے ایک مجلس تفتیش واحتساب (Inquisition) قائم کی۔ اس مجلس کو ''ردعمل اصلاحی تحریک کی تلوار'' (Sword of the counter reformation) بھی کہا جاتا ہے۔ ابتداء میں اس مجلس کے چھ بڑے پادری ممبر ہوئے تھے جو رومن ایمپائر میں کام کرتے تھے۔ ان لوگوں کے ذمہ یہ کام سپرد تھا کہ اس شخص کو گرفتار کرلیا جائے جس نے رومن کیتھولک چھوڑا ہے۔ کوشش کریں کہ وہ دوبارہ اپنے مذہب میں لوٹ آئیں۔ ان لوگوں کو جرمنی کے رومن کیتھولک شہزادوں کی مدد حاصل ہوگئی تھی۔ جو کوئی بھی پروٹسٹنٹ مسلک کا اقرار کرتا اسے اسٹیٹ افسران کے سپرد کر دیا جاتا تا کہ وہ اسے سزا دیں۔

رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹوں کے درمیان جو لڑائیاں ہوئیں ان کا یہاں طوالت کے خوف سے تذکرہ کرنا ممکن نہیں۔ بے شمار پروٹسٹنٹوں کو سنگین ترین سزاؤں کا نشانہ بنایا گیا۔

کرین مر کو ۱۵۵۵ء میں دو اور بڑے پادریوں لیٹمر اور ریڈلے کے ساتھ پروٹسٹنٹ ہونے کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ پہلے تو کرین مر نے کمزوری دکھائی اور پروٹسٹنٹ مسلک سے علیحدگی کا اعلان کر دیا، مگر ضمیر نے اسے جھنجھوڑا اور زجر و توبیخ کے تازیانے مارے، آخر کار دوبارہ پروٹسٹنٹ ہونے کا اعلان کر دیا۔ دوبارہ پکڑا گیا اور دہکتی ہوئی آگ میں جلا دینے کی تجویز ہوئی۔ جب اسے جلانے لگے تو اس نے سب سے پہلے اپنا ہاتھ یہ کہتے ہوئے آگ کے سپرد کر دیا: ''یہی وہ گنہگار ہاتھ ہے جس سے میں نے وہ غلط اور بزدلانہ توبہ نامہ لکھا تھا۔

اس موقع پر لیٹمر نے جو الفاظ اپنے دوسرے ساتھی ریڈلے سے کہے تھے وہ بھی مسیحی تاریخ میں

سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں: " ریڈلے! یہ کام ہمیں مردانہ وار کرنا چاہیے۔ آج ہم خدا کے فضل سے انگلستان میں وہ شمع روشن کر رہے ہیں جو ہمیشہ فروزاں رہے گی اور کبھی نہ بجھے گی۔"

۱۵۳۴ء میں ایک اور سوسائٹی جیسوٹ (Drdler of jesuits) کی تشکل ہوئی۔ اس کا بانی اگنٹس لویولا (Ignatius Loyula) تھا۔ یہ اسپین کا باشندہ تھا۔ اس سوسائٹی کے افراد کے لئے حسب ذیل شرائط تھیں:

۱۔ باعصمت اور مفلسی کی زندگی بسر کرنا۔

۲۔ قائد کی اطاعت وفرمانبرداری۔

۳۔ تبلیغ کے ذریعہ اپنے نظریات کی اشاعت۔

اس سوسائٹی کی جدوجہد سے فرانس اور جرمنی میں کیتھولک مذہب دوبارہ قائم ہوگیا۔

کلیسائے انگلستان (Church of England)

چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں عیسائیت کا پودا اگسائن کے ہاتھوں انگلستان کی سرزمین میں بویا گیا، اور رومی کلیسا کی ایک شاخ قائم کردی گئی۔ سولہویں صدی عیسوی تک انگریزی کلیسا رومی کلیسا کے زیراثر رہا۔ انگلستان میں بھی بہت ہی شروع میں اصلاحی مذہب کی تحریکات چلائی گئیں۔ لیکن ان کو کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ بنی ڈکٹنی فرقہ (Benedictines) انگلستان میں مقبول ہوگیا۔ اس فرقہ کا بانی سینٹ بنی ڈکٹ (ST.Benedict) ہے۔ یہ لوگ راہبانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ قانون کی حتی الامکان پابندی کے قائل ہیں اور ذاتی ملکیت کو جائز قرار نہیں دیتے۔

چودھویں اور پندرھویں صدی میں جان وائی کلف کے متبعین کے ایک فرقہ لوٹر نے انگلستان میں مقبولیت حاصل کر لی۔ یہ فرقہ کاہنوں کی متجردانہ زندگی کلیسا کی آرائش وزیبائش، مُردوں کے لئے دُعا، مورت پرستی، جنگ اور سزائے موت کے خلاف تھا۔ ہنری چہارم کے زمانہ میں یہ فرقہ ہدف مظالم بنا رہا۔ ہنری پنجم کے عہد میں مظالم اور مصائب اپنی انتہائی صُورت اختیار کر گئے۔ بے شمار سربرآوردہ لوگ زندہ نذر آتش کردیئے گئے اور وقتی طور پر یہ تحریک دب گئی۔

سولہویں صدی عیسوی میں بادشاہ اور پوپ کے درمیان اقتدار کی کشمکش کا آغاز ہوا۔ اس وقت ہنری ہشتم انگلستان کا بادشاہ تھا۔ ہنری یہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی بیوی کیتھرائن کو طلاق دے دے، لیکن پوپ نے اجازت نہ دی۔ طلاق پوپ کی رضامندی کے بغیر نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہنری نے انگریزی کلیسا کو کلیسا سے الگ کرلیا۔ اور کلیسائے انگلستان، کے نام سے ایک نئے کلیسا کی بنیاد رکھی۔ اس کلیسا کا سربراہ خود بادشاہ تھا۔ انگریزی اور رومی کلیسا میں صرف ایک ہی فرق تھا کہ یہاں دعائیں انگریزی زبان میں پڑھی جاتی تھیں اور رومی کلیسا میں لاطینی زبان میں، باقی تمام مذہبی رسوم وہی تھے جنھیں پاپائے روم کی سند حاصل تھی۔

حتیٰ کہ بادشاہ پوپ کے عطا کردہ خطاب ''محافظ ملت'' سے بھی دست بردار نہیں ہوا تھا۔

ملکہ الزبتھ اول کے عہد میں انگریزی کلیسا نے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عقائد کے لحاظ سے درمیانی راستہ اختیار کر لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب کوئی رومن کیتھولک حکمران برسر اقتدار آتا تو وہ پروٹسٹنٹوں پر مظالم کے پہاڑ ڈھاتا اور جب کوئی پروٹسنٹ حکمران عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیتا تو رومن کیتھولکوں کو مظالم کا نشانہ بناتا۔ عوام کو مظالم سے نجات دلانے کے لیے کلیسائے انگلستان نے ایسی درمیانی راہ اختیار کر لی۔ گو یہ روش بھی عارضی تھی۔

سترھویں صدی عیسوی میں پیورٹین تحریک (Puritans) وجود میں آئی۔ جس کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ انگریزی کلیسا رومن کلیسا کے طرز عمل اور عقائد کو ترک کر دے۔ پھر تحریک انابسٹسٹ (Anabastists) منصۂ شہود پر آئی۔ اس کے لفظی معنی ہیں، دوبارہ بپتسمہ لینے والے۔ وہ بالغ لوگوں کو دوبارہ بپتسمہ لینے پر مجبور کرتے تھے۔ ۱۶۱۱ء میں تھامس ہلولیس (Thomas Helwvs) نے بپٹسٹ (Bapitst) کلیسا کی بنیاد ڈالی۔ اس کو قید کر دیا گیا اور قید خانے میں ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ ۱۶۶۰ء تا ۱۶۸۹ء کا زمانہ ان لوگوں کے لیے نہایت ہی کٹھن اور آزمائش کا زمانہ تھا۔ بعد میں مصائب کے بادل چھٹ گئے اور آزادی سے اپنے نظریات کی تبلیغ اور اشاعت کرنے لگے۔ یہ فرقہ بھی ذیلی فرقوں میں منقسم ہو گیا۔

ایک اور فرقہ جس نے انگریزی کلیسا کی مخالفت کی وہ کویکر (Quacker) کے نام سے مشہور تھا۔ اس کا بانی فاکس تھا کویکر کے معنی ڈرنے والے کے ہیں۔ جب فاکس ایک عدالت میں پیش کیا گیا تو اس نے جج سے کہا تھا: ''خدا سے ڈرو'' اس وقت سے اس کے پیروکار اور متبعین اسی نام سے موسوم ہو گئے۔ اس فرقہ کے لوگ اپنے آپ ''انجمن احباب'' (Society of friends) یا ''احباب صداقت'' کہا کرتے تھے۔ اس فرقہ کے کوئی خاص متعین عقائد نہیں تھے۔ اس وجہ سے جو بھی اس فرقہ میں داخل ہوتا تھا اس سے کوئی بھی عہد نہیں لیا جاتا تھا۔ ان کے ہاں نہ تو کسی پادری کی گنجائش تھی اور نہ کسی کلیسا کی۔ ان کا یہ نظریہ تھا کہ حقیقی مذہب انسان کے دل میں ہوتا ہے، جس کو وہ نورِ داخلی کہتے تھے اور جس جگہ بھی چند نیک اور سچے عیسائی جمع ہو جاتے ہیں وہی جگہ مقدس بن جاتی ہے۔ اس لیے گرجا کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اس فرقہ کا یہ بھی نظریہ ہے کہ وعظ و نصیحت اور تبلیغ کے لیے کسی خاص طبقہ کی ضرورت نہیں بلکہ یہ وہ مقدس ملکہ ہے جو روح القدس کی طرف سے ملتا ہے۔ اس وجہ سے جس شخص کو بھی یہ ملکہ عطا ہو وہ وعظ و نصیحت کر سکتا ہے۔ اس فرقہ کے لوگ مذہبی رسوم کے قائل نہیں۔ ان کا یہ نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاموشی سے ہم کلام ہونا ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔ یہ فرقہ مرد اور عورت کو مساوی حقوق دینے کا حامی تھا۔ ان عقائد کی وجہ سے اس فرقہ کی تمام فرقوں نے شدید مخالفت کی اور ان کو نہایت ہی سفاکی سے قتل کیا گیا۔

عیسائیت اور عصر جدید

عیسائیت کے جدید معتقدات اور اسلام کا اثر

عصر جدید عقل اور سائنس کا دور ہے۔ اس دور میں غیر عقلی عقائد کی اشاعت اور ترویج نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے اب مشاہیر کلیسا نے پولوسی عقائد سے انحراف شروع کر دیا ہے اور اسلام کے زیر اثر ایسی تشریح شروع کر دی ہے جو اسلامی روح کے قریب ہے۔ اس انحراف اور عیسائیت کے جدید عقائد کا جائزہ لیا جاتا ہے تا کہ اسلام کی حقانیت اور عیسائیت کے مروجہ عقائد کا کھوکھلا پن واضح ہو جائے۔

موجودہ عیسائیت پولوس کا مذہب ہے، نہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا۔ کیونکہ عیسائیت کی مروجہ تعلیم کا نشان تک اناجیل میں نہیں ملتا۔ عیسائیت میں عقائد کی تمام خرابیاں پولوس سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس امر کا اعتراف عیسائی مصنفین نے بھی شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں نیو امریکن لائبریری نے ہربرٹ ملر کی ایک کتاب دی یوسس آف دی پاسٹ شائع کی ہے، جس میں مصنف نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ موجودہ عیسائی عقائد سینٹ پال نے اختراع کیے تھے۔ چنانچہ تحریر کرتا ہے:

"پولوس نے اولین کام یہ کیا کہ مسیح کے حقیقی تاریخی وجود کو اپنے خیالات کی بھینٹ چڑھا دیا...... اس نے یہ خیال پیش کیا کہ نجات صرف مسیح کے ذریعہ وابستہ ہے۔ اس نے خود اپنی اور عام بنی نوع انسان کی بدیوں پر نگاہ رکھتے ہوئے عیسائیت کے عقائد کا بنیادی پتھر مسیح کا نجات دہندہ ہونا بیان کیا، جس کے ذریعہ سے آدم کے ہبوط سے لے کر اب تک تمام گناہوں کا کفارہ ہوا ہے۔ پولوس نے بڑے خلوص کے ساتھ اس انجیل کی منادی کی جس کی تعلیم مسیح نے اپنی اناجیل میں قطعاً نہیں دی...... یہی وجہ ہے کہ آج کل کے محققین پولوس کی کامیابیوں کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے۔ چنانچہ برنارڈ شاہ اس کے متعلق تحریر کرتا ہے:

"یہ پولوس ہی تھا کہ جس نے اس مذہب کو جو صرف ایک انسان کو گناہ اور موت سے نجات دیتا ہے ایسے مذہب میں تبدیلی کر دی گئی ہے کہ جس سے اب کروڑوں انسان اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان کی فطرت صحیحہ ان کو ملامت کرتی ہے اور وہ مذہبی زندگی سے معرا ہیں۔"[1]

پھر لکھتا ہے:

"پولوس ہی وہ سب سے پہلا انسان ہے کہ جس نے دوسرے دیوتاؤں کی طرح یہ عقیدہ مسیح کے متعلق پھیلایا کہ اس نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو بنی نوع انسان کی نجات کے لیے وقف کر دیا...... تاریخی طور پر بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ نجات دہندہ کا مترادف لفظ قربانی کا بکرا (Icape Goat) ہے پرانے لوگ ایک بکرے کے سر پر اپنے گناہوں کا بوجھ رکھ کر اسے جنگل کی طرف ہانک دیتے یا پہاڑ کی چوٹی سے دھکا دے دیتے۔"[2]

---

1. دی یوسس آف دی پاسٹ ص ۱۱۶۔ 2. دی یوسس آف دی پاسٹ ص ۱۵۹۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی محققین نے یہ اعتراف کرنا شروع کر دیا ہے کہ موجودہ مروجہ عیسائیت پولوس کی اختراع ہے۔ مسیح کی تعلیمات کا ان باطل عقائد سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

پولوس کون تھا

اس کا نام ساؤل تھا۔ یہودالنسل تھا اور کلکیہ کے شہر ترسیس میں پیدا ہوا اور گملی ایل نے اس کی تعلیم و تربیت کی۔ شروع میں مسیح حواریوں کا شدید مخالف اور معاند تھا۔ اچانک اس نے عیسائیت قبول کر لی اور اس نے دعویٰ کیا کہ دمشق کے راستہ میں مجھ پر ایک نور چمکا ہے اور آسمان سے حضرت مسیح کی آواز سنائی دی کہ: ''تو مجھے کیوں ستاتا ہے؟'' اس واقعہ سے متاثر ہو کر عیسائیت قبول کر لی۔ پولوس نے جب حواریوں کے درمیان پہنچ کر اس بات کا اعلان کیا تو اکثر حواری اس کی بات نہ مانے۔ لیکن پہلے برناباس حواری نے اس کی تصدیق کی اور ان کی تصدیق سے مطمئن ہو کر تمام حواریوں نے اسے اپنی برادری میں شامل کر لیا۔ ساؤل نے اپنا نام بدل کر پولوس رکھ لیا اور تبلیغ کرنا شروع کر دی اور الوہیت کفارہ، حلول وغیرہ کے عقائد ایجاد کیے۔

پولوس کی مصلحت بینی

پولوس خود کہتا ہے۔ ''میں یہودیوں کے لیے یہودی بنا تاکہ یہودیوں کو کھینچ لاؤں۔ جو لوگ شریعت کے ماتحت ہیں ان کے لیے میں شریعت کے ماتحت ہوا تاکہ شریعت کے ماتحتوں کو کھینچ لاؤں۔ بے شرع لوگوں کے لیے بے شرع بنا تاکہ بے شرع لوگوں کو کھینچ لاؤں...... کمزوروں کے لیے کمزور بنا تاکہ کمزوروں کو کھینچ لاؤں۔ میں سب آدمیوں کے لیے سب کچھ بنا ہوا ہوں تاکہ کسی طرح بعض کو بچاؤں۔''[1]

اس بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پولوس کا مطمح نظر حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم کی اشاعت نہ تھا، بلکہ منافقت سے دوسروں کے عقائد اور نظریات کا لبادہ اوڑھ کر حضرت مسیح علیہ السلام کا منوانا مقصود تھا۔

صحائف مقدسہ کے متعلق جدید رجحانات

یونائیٹڈ پریس بائی ٹیراین چرچ مشہور اور بااثر فرقوں میں سے ہے۔ سولہویں صدی کے دوران میں جب پروٹسٹنٹ کی تحریک برطانیہ میں پھیلنی شروع ہوئی تو اس کی جو شاخ سکاٹ لینڈ میں زیادہ مقبول اور بااثر ہوئی وہ پریس بائی ٹیراین کہلائی۔ یہ فرقہ مشہور پروٹسٹنٹ لیڈر جان کالون (John Calvin) کے خیالات کا ترجمان تھا۔ بعد میں یہ فرقہ سکاٹ لینڈ سے انگلینڈ، ویلز، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور ممالک متحدہ امریکہ کے علاوہ دنیا کے اور کئی ممالک میں پھیل گیا۔ اس فرقہ سے تعلق رکھنے والے کئی کروڑ ہیں۔ ایشیاء افریقہ، پاکستان اور ہندوستان میں ان کے تبلیغی مشن اور تعلیمی مرکز قائم ہیں۔

سولہویں صدی کے دوران میں چرچ کو منظم کرنے کے لیے ایک مسودہ باتفاق رائے تسلیم کیا گیا،

---

[1] کرنتھیوں ۹۔۱۹...۲۲۔

اسے ویسٹ منسٹر کنفیشن (West minster confession) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔اس مسودہ میں بائبل کے متعلق مندرجہ ذیل عقیدہ بیان کیا گیا ہے۔

''کتاب مقدس کی اتھارٹی جس کی بناء پر اس پر ایمان لانا اور اس کی اتباع کرنا لازمی ہے وہ نہ کسی ایک شخص کی شہادت پر مبنی ہے۔نہ چرچ کی تصدیق پر، بلکہ کلیتہً خدا تعالیٰ پر جو ذات حق ہے اور کتاب مقدس کا مصنف ہے۔اس لیے اس کتاب کو اس وجہ سے تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔''

تقریباً پانچ سو سال تک پریس بائی ٹیرائن چرچ کے معتقدین کا یہ عقیدہ رہا کہ بائبل الہامی ہے اور جزوِ ایمان ہے۔آخر کار علماء چرچ اس امر پر مجبور ہو گئے کہ وہ اس نظریہ پر نظر ثانی کریں۔چنانچہ ۱۹۶۷ء میں ایک تازہ مسودہ تیار کیا گیا جس کو ۱۹۶۷ء کی کنفیشن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔اس مسودہ میں بائبل کے متعلق لکھا ہے:

''اگرچہ صحائف مقدسہ روح القدس کی راہنمائی میں تفویض ہوئے لیکن پھر بھی وہ انسانوں کا کلام ہیں۔ ایسے انسانوں کا کلام جو محاورات زبان، اظہار خیال کی مختلف اشکال اور اپنے زمانہ اور مقام جن میں وہ صحائف لکھے گئے ادبی اسلوب سے متاثر تھے۔ایسے انسان جو زندگی، تاریخ اور جو کائنات کے متعلق ان نظریات کا انعکاس کرتے ہیں جو اس زمانہ میں مروج تھے۔اس لیے چرچ کا فرض ہے کہ وہ اس تاریخی اور ادبی تفہیم کے ساتھ بیان کی طرف توجہ کرے۔''

سولہویں صدی کی ویسٹ منسٹر کنفیشن اور ۱۹۶۷ء کی کنفیشن کے دستورِ اساسی میں بائبل کے بارہ میں بین اور مبرہن فرق ہے۔سابقہ دستور بائبل کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ اور انسانی دست برد سے پاک قرار دیتا ہے، نیا مسودہ اس کو انسانوں کی تصنیف قرار دیتا ہے۔

مارچ ۱۹۲۲ء میں ڈین انجی (سینٹ پال کے بڑے پادری) نے ایوننگ سٹینڈرڈ میں ایک مضمون لکھا جس میں آپ کہتے ہیں:

''معاملہ تصنیف میں کامیاب سے کامیاب فریب اگر کہیں ہوا تو کلیسا میں ہوا۔ابتدائے عیسائیت ہی میں ایک وقت آ گیا جب کسی کتاب کی عزت تو یہی ہوتی تھی جب اسے کسی بڑے نام پر منسوب کر دیا جائے؟ بکثرت جعل سازی شروع ہو گئی اور آج ہم وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ عہد نامہ جدید میں بھی یہ کتابیں جن کے نام پر منسوب ہیں وہ انہی کی ہیں یا نہیں۔ پطرس کا دوسرا خط تو بالاتفاق اس کا نہیں اور عہد نامہ جدید کی بعض کتابوں کی صحت شبہ سے خالی نہیں۔''[1]

رومن تواریخ کلیسا مطبوعہ مرزاپور ۱۸۵۶ء صفحہ پر لکھا ہے:

بہت سی مسیحی کتابیں خود لکھ کر کسی حواری مسیح یا حواری مسیح کے کسی خادم یا کسی بڑے استف کے نام

---

[1] ینابیع المسیحیت مصنفہ خواجہ کمال الدین صاحب ص ۴۰۔

سے مشہور کر دیتے تھے۔ ایسی جعلی کارروائیاں تیسری صدی عیسوی سے شروع ہوئیں اور کئی سو برس تک جاری رہیں۔ یہ نہایت ہی خلاف حق اور قابل شرم حرکت تھی۔"

"بارن صاحب اپنی تفسیر بائبل مطبوعہ لندن ۱۸۲۳ء جلد دوم صفحہ ۳۳۱ پر رقمطراز ہیں:

بلاشبہ بعض تحریفیں جان بوجھ کر ان لوگوں نے کی ہیں جو دین دار، پرہیزگار اور راہب تھے۔ غضب یہ ہے کہ بعد میں انہی تحریفات کے سچا ہونے پر اصرار کیا جاتا تھا تاکہ اپنے مطلب کو قوت دیں یا اپنے پر کوئی اعتراف نہ آنے دیں۔"

تردید الوہیت وابنیت

مروجہ عیسائیت کی بنیاد ہی الوہیت پر ہے۔ اب علماء مسیحیت اس عقیدہ سے بھی بیزار نظر آتے ہیں۔

۹ اگست ۱۹۱۷ء کو گرٹن کالج کیمرج میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں چوٹی کے پادری صاحبان نے شرکت کی۔ سینٹ پال کے گرجا کے بڑے پادری ڈین انجی صاحب نے جو ایک مشہور فاضل ہیں ایک مقالہ پڑھا۔ زیر بحث سوال یہ تھا کہ "کیا مسیح نے موجودہ کلیسا قائم کیا؟ ڈین موصوف نے دوران تقریر بیان کیا کہ "مسیح اپنے معاصرین میں ایک نبی کی حیثیت میں ظاہر ہوئے۔ انھوں نے کبھی موسوی تعلیم سے انحراف نہیں کیا۔ نہ کوئی نئی تعلیم دی، نہ موسوی مذہب کے مقابل کوئی نیا مذہب قائم کیا۔ روحانی معاملات میں وہ بالضرور آزادی چاہتے تھے، لیکن اپنے ملک اور وقت کی باتوں کو انھوں نے قبول کیا۔ اس پر موسوی مذہب سے جدائیگی تو ایک لازمی امر تھا، لیکن مسیح نے عیسائیوں کے لیے کوئی اصول یا تعلیم خود تجویز نہیں کیا۔"[1]

اگست ۱۹۲۱ء میں بمقام آکسفورڈ ریشڈل ڈین کارلائل نے مسئلہ الوہیت پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ہم مسیح کے نام یا ذات کے ساتھ الوہیت کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس لفظ کے مفہوم میں ذیل کی باتیں کبھی ذہن میں نہیں رکھتے۔

اوّل: جناب عیسیٰ نے کبھی اپنی ذات کے لیے الوہیت کا دعویٰ نہیں کیا۔ یہ ممکن ہے کہ دوسرے اسے (مسیح کو) کہتے رہے ہوں اور اس نے انھیں نہ روکا ہو۔ مگر جو باتیں اس کے اپنے منہ سے نکلی ہیں خواہ وہ نازک سے نازک وقت پر کیوں نہ تھیں، ان سے صاف پایا جاتا ہے کہ جناب عیسیٰ خدا کے ساتھ اپنا رشتہ خدا اور انسان کا سمجھے۔ چوتھی انجیل (یعنی یوحنا) میں اگر ان کی بعض تقریریں اس بات سے آگے جاتی ہیں تو وہ تاریخی پایہ سے گری ہوئی ہیں۔

دوم: اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسیح ہر معنوں میں انسان تھے۔ وہ جسماً ہی خدا نہ تھے بلکہ ان کی روح قوت تعقل، قوت ارادی سب انسانی تھی۔

سوم: یہ بھی قدیم عقیدہ نہیں کہ مسیح کی انسانی روح ازل سے موجود ہے۔ ہاں اگر کل انسانوں کی روحیں

[1] ینابیع المسیحیت مصنفہ خواجہ کمال الدین ص ۲۹۔

قدیم سے موجود ہوں تو یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے لیکن یہ مسلمہ عقیدہ نہیں۔

چہارم: الوہیت مسیح سے بھی لازم نہیں آتا کہ وہ بن باپ ضرور ہی تھے یا صاحب معجزہ تھے۔ اگر تاریخاً ان کی پیدائش ایسی ہی ثابت ہو تو بھی یہ الوہیت کا مظہر نہیں اور اگر یہ امر ثابت نہ ہو تو اس سے بھی اس مسئلہ میں فرق نہیں آتا۔

پنجم: مسیح کی الوہیت علم غیب یا علم کل پر مشتمل نہیں۔ اس بات کے فرض کرنے کی بھی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ مسیح کا علم اپنے معاصرین سے کوئی زیادہ تھا۔ (مثلاً) جنوں کا سر سے نکالنا (آج اگر) اسے ایک دماغی مرض سمجھا گیا ہے (اور مسیح کے معاصر اسے جن سمجھتے تھے) تو مسیح بھی ایسا ہی سمجھتے تھے۔ آج اگر توریت کی پہلی کتابوں اور مزامیر کے مصنف کے متعلق کوئی اور رائے ہے تو اس سے بھی مسیح ناواقف تھے۔ اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جناب مسیح کو کچھ آئندہ کی توقعات تھیں لیکن تاریخ نے انھیں پورا نہیں کیا۔[1]

ڈین موصوف کی تقریر یہ ظاہر کرتی ہے کہ مسیح علیہ السلام انسان تھے نہ کہ خدا یا اس کا بیٹا۔

"ریورنڈ میجر پرنسپل، رپن ہال کالج آکسفورڈ نے اس مباحثہ میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "جناب مسیح نے نہ تو جسمانی معنوں میں ابن اللہ ہونے کا دعویٰ کیا جیسا کہ بن باپ ہونے والے قصے سے اخذ کیا جاتا ہے، نہ انھوں نے ذہنی (روحانی) معنوں میں ایسا دعویٰ کیا جیسا کہ نیقہ کی کونسل نے قرار دیا۔ انھوں نے اخلاقی معنوں میں ایسے ہی اپنے آپ کو خدا کا بیٹا ظاہر کیا جیسے کہ ہر ایک انسان خدا کا بیٹا کہلا سکتا ہے۔ یعنی انسان میں اور خدا میں ایک قسم کا باپ بیٹے کا رشتہ اس طرح سے ہے کہ انسان ان اخلاق کو ظاہر کرے جو خدا کے ہیں۔"[2]

ریورنڈ اون نے اس مسئلہ کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے:

"اگر ہم خدا کے بچے ہیں تو ہم میں الوہیت ہے لیکن اگر الوہیت مسیح ہماری الوہیت سے الگ ہے تو پھر وہ ہم جیسا نہیں۔ لہٰذا ہم اس جیسے نہیں ہو سکتے، لیکن وہ تو ہمیں اپنے جیسا بننے کو کہتا ہے۔"[3]

معجزات مسیح کی نئی تشریح

معجزات مسیح کی جو نئی تشریح کی جاتی ہے وہ صریحاً مسلمہ عقائد کے خلاف ہے۔ رپن ہال کالج (مدرسہ الٰہیات) آکسفورڈ کے پرنسپل ریورنڈ ڈاکٹر میجر نے مسیح کے قبر سے جی اٹھنے سے انکار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ "ان کا موت کے بعد جی اٹھنا روحانی ہے جسمانی نہیں۔"[4]

کنواری کے پیٹ سے پیدا ہونے کی کہانی کے متعلق پروفیسر پرنگل پیٹس نے ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو

---

1. ینابیع المسیحیت ص ۳۱، ۳۲۔
2. ینابیع المسیحیت ص ۳۷۔
3. ینابیع المسیحت ص ۳۹۔
4. ینابیع المسیحیت ص ۴۳۔

اپنی تقریر میں کہا کہ اس کا پتہ پرانی روایات میں نہیں ملتا اور قصہ اگر انجیل میں داخل کیا گیا تو اس لیے کہ اس سے مسیح کی خدائی منوانا مقصود تھی بلکہ اس لیے کہ انسان سمجھا جائے کیونکہ اس زمانے میں ایک عقیدہ بھی تھا کہ مسیح دراصل روح ہی روح ہے اور اس میں کوئی انسانی جسم کا حصہ نہیں۔ لہٰذا ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہونا اس کی جسمانیت ثابت کرنے کے لیے تجویز کیا گیا۔"[1]

بنی آدم فطرتی گناہگار ہے

مروجہ عیسائیت کی بنیاد الوہیت مسیح اور کفارہ مسیح ہے۔ کفارہ کی ضرورت آدم کے گناہ سے پیدا ہوتی ہے۔ مسیحیت کی کفارہ کے متعلق یہ توجیح ہے کہ "آدم نے گناہ کیا۔ یہ گناہ انسان کی فطرت میں آ گیا۔ اس سے انسان مستوجب سزائے ابدی ٹھہرا۔ محبت خدا نے عذاب سے بچانا چاہا۔ عدل کے تقاضے نے سزا دینا چاہی کفارہ کی ضرورت پڑی، کوئی اور انسان فطرتاً گناہگار ہونے کے کفارہ نہ ہو سکا۔ آخر خدا خود کفارہ ہوا۔[2]

اس کہانی سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ مقبولہ مسیحیت کی بناء قصہ آدم مندرجہ کتاب پیدائش ہے۔ علماء مسیحیت کے نزدیک قصہ آدم غلط ہے۔ ویسٹ منسٹر گرجا کے ڈین نے (جو لنڈن کا شاہی گرجا ہے) بچوں کے نصاب تعلیم کے مذہبی حصے پر بحث کرتے ہوئے ایک جلسہ میں فرمایا کہ اگر ہم اس نصاب میں کتاب پیدائش کی کہانیاں رکھ دیں تو آئندہ نسل یہی سمجھے گی کہ ہمارا معیار صداقت بہت ادنیٰ درجے کا ہے۔"[3]

یہ حوالہ ظاہر کرتا ہے کہ ڈین کے نزدیک کتاب پیدائش کی کہانیاں صداقت سے خالی ہیں۔ جب بقول ڈین قصہ آدم غلط ہے تو پھر مقبولہ اور مروجہ مسیحیت کی کہانی غلط اور باطل ہو جاتی ہے۔

"یہوواہ وٹنسز" تحریک

یہوواہ کے تلفظ میں اختلاف اور اس کے معنی

یہود کو خدا کا خاص نام لینے کی اجازت نہ تھی۔ صرف سال میں ایک مقدس دن میں سب سے مقدس انسان بیت المقدس کے اندر ایک دفعہ خدا کا نام لیتا تھا اور لوگ خاموشی سے سنتے تھے۔

"یہوواہ (عبری عہد عتیق میں) میں جہاں جہاں یہ لفظ آتا ہے وہاں اس سے پہلے ادونئی ضرور آتا ہے۔ اس ادونئی کو دیکھتے ہی تلاوت کرنے والا رک جاتا کہ اس کی تلاوت نہ کرتا۔ ادونئی ایک سرخ خطرہ کا نشان ہے۔ یہود میں صرف اس نام کی تلاوت ہی ناجائز اور ممنوع نہ تھی بلکہ خلاف ورزی کرنے والے کو سزا دی جاتی تھی۔

---

1. ینابیع المسیحیت ص ۴۳۔
2. ینابیع المسیحیت ص ۲۵۔
3. ینابیع المسیحیت ص ۲۵۔

خدا کے نام کی عدم تلاوت کی وجہ سے یہود صحیح تلفظ بھول گئے اور اب اس لفظ کی مختلف تعبیرات ہیں: یہوہ، یہوَ، یہوِ، یہوَ۔ انسائیکلوپیڈیا بلیکا میں اس کا صحیح تلفظ یہوُ لکھا ہے۔ لفظ یہوِ اوالڈ (Ewald) کے خیال میں یاہُو کی مختصر شکل ہے، اے وہ (جو ہے)

بائبل میں یہ لفظ ۶۸۲۳ مرتبہ آیا ہے۔

(Authorised Version) جو کنگ جیمز کے زمانہ میں چھپی تھی اس میں خروج (۶:۳) زبور (۸۳:۱۸) یسعیاہ (۱۲:۲۸) میں (Jehovah) کا لفظ موجود ہے۔ امریکن سٹینڈرڈ ورشن میں ہر جگہ (Jehovah) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

سب سے قدیم نسخوں میں (YHWH) کے حروف استعمال ہوئے تھے۔

غرض کہ یہوواہ کا صحیح تلفظ متعین کرنا مشکل ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بائبل کی رو سے یہ خدا کا نام ہے، جیسا کہ خروج (۶:۴) میں لکھا ہے:

''پھر خدا نے موسیٰ کو فرمایا اور کہا میں خداوند ہوں اور میں نے ابراہام اور اصحاق اور یعقوب پر خدائے قادر مطلق کے نام سے اپنے آپ کو ظاہر کیا اور یہووہ کے نام سے۔ ان پر ظاہر نہ ہوا۔''

یہ حوالہ ظاہر کرتا ہے کہ خدا نے اپنا خفیہ نام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ظاہر کیا۔ وِٹنسز انگریزی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں گواہ۔ پس یہوواہ وٹنسز کے معنی ہیں: ''گواہانِ خدا''

یہ تحریک کس طرح، کب اور کہاں سے شروع ہوئی

چارلس ٹیز رسل (Charles Taze Russull) جو یہوواہ وٹنسز کے پیش رو ہیں، پٹس برگ امریکہ میں ۱۶ فروری ۱۸۸۲ء کو پیدا ہوئے۔ انھیں بچپن میں بائبل پڑھنے کا از حد شوق تھا۔ اکثر وقت بائبل کے مطالعہ میں صرف کرتے۔ پندرہ سولہ کی عمر میں بائبل پر غور وخوض کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ عیسائیت کے مروجہ اور مقبولہ عقائد باطل ہیں۔ وہ اکثر اس بات پر غور و فکر کیا کرتا تھا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ بعض انسانوں کے لیے ابدی جہنم کی سزا مقرر کی جائے۔ مسیح ناصری کی آمد بھی اس کی دلچسپی کا خاص مرکز تھا۔

بائبل کلاس کا اجراء

بائبل کے مطالعہ کو رواج دینے کے لیے رسل نے اپنے چند دوستوں کو ساتھ ملایا اور ۱۸۷۰ء میں ایک بائبل کلاس جاری کی۔

مسیح کی آمد ثانی کے متعلق عقیدہ

رسل اور اس کے ساتھیوں کا مسیح کی آمد ثانی کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ ان کی آمد اس دنیا میں روحانی شکل میں ہوگی، جسمانی شکل میں نہیں آئیں گے۔ چنانچہ ۱۸۷۴ء میں رسل اور اس کے ساتھیوں نے

محسوس کیا کہ یسوع مسیح دوبارہ دنیا میں واپس آ گئے ہیں۔ اور ان کا کام یہ ہے کہ وہ ان تمام لوگوں کو جو ان پر حقیقی ایمان رکھتے ہیں جمع کریں اور غلط عقائد سے نجات دلائیں۔ یہ کام ۱۹۱۴ء تک مکمل کر لیں گے۔ اس کے بعد وہ کفر کی حکومت (Gentile Rule) کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کا اعلان کریں گے۔ اور پھر خدا کی حکومت قائم ہو جائے گی جس میں ان کے اپنے معتقدین شامل ہوں گے۔

باربر سے الحاق

۱۸۷۴ء میں این۔ ایچ باربر کے رسالہ دی ہرلڈ آف دی مارننگ کی ایک کاپی ان کی نظر سے گزری تو اس کے مطالعہ سے اس کو یہ علم ہوا کہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو یسوع مسیح کی آمد ثانی روحانی مانتے ہیں نہ کہ جسمانی۔ چنانچہ رسل اور اس کے بائبل سٹڈی گروپ نے باربر سے الحاق کر لیا اور رسل نے باربر کے پرچے کے ضروری اخراجات مہیا کرنے شروع کر دیے۔

دو سال کے اندر اندر ان دونوں میں بعض اختلافات پیدا ہو گئے۔ رسل اور اس کے بائبل سٹڈی گروپ نے باربر سے الحاق توڑ لیا اور رسالہ کو مالی امداد دینا بند کر دی۔

واچ ٹاور رسالہ

جولائی ۱۸۷۹ء میں ایک الگ رسالہ جاری کیا، جس کا نام (Zion's the watch tower and herlad of christ's presence) رکھا۔ اس پرچے کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

''واچ ٹاور کی پہلی جلد کا یہ پہلا شمارہ ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ کوئی بات جو اس میں موجود ہونی چاہیے وہ شائع ہونے سے رہ جائے۔ جس زمانے میں ہم زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ آخری زمانہ ہے۔ یہ خداوند کا دن ہے۔ خوش خبری کے زمانے کا آخری حصہ ہے اور اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ نئی دنیا کا آغاز ہے۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں کہ جو شخص بائبل کا مطالعہ کرے گا وہ انھیں آسانی سے سمجھ سکے گا کیونکہ روح القدس اس کی راہنمائی کرے گا۔ بیرونی شہادتیں بھی اس بات کی طرف توجہ دلا رہی ہیں جو ہم کہتے ہیں۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ گھر کے لوگ (یعنی عیسائیت کے پیروکار) اس حقیقت سے آشنا ہوں۔''

مسیح کی آمد ثانی کے پیغام کی اشاعت کے لیے ایک ہزار مبلغین کی ضرورت کا اعلان ان الفاظ میں کیا۔

''کیونکہ چرچ یعنی عیسائیت کا نظام خدا کا باغ ہے اور اس باغ میں ہر شخص کے لیے کام موجود ہے۔ خدا نے ہر شخص کو اس کام کے لیے بلایا ہے۔ اگر آپ کے پاس نصف گھنٹہ یا ایک گھنٹہ یا دو تین گھنٹے فارغ ہیں تو اتنا ہی وقت آپ دیں اور خدا اسے قبولیت عطا کرے گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اتنے سے کام سے کس قدر برکت ملے گی۔''

اپنے مخصوص نظریات کی اشاعت کے لیے ہر جگہ بائبل کی سٹڈی کے گروپ ترتیب دیے گئے۔
چنانچہ ۸۰۔۱۸۷۹ء میں انھوں نے تیس کے قریب سٹڈی گروپ بنائے۔اس کے علاوہ اشتہار اور کتابچے شائع کر کے مفت تقسیم کیے۔لٹریچر کی مانگ اس قدر زیادہ ہوگئی تو ۱۸۸۱ء میں اس سوسائٹی کی بناء ڈالی جس کا نام (Zion's watch tower tract society) رکھا۔۱۸۸۴ء میں اسے کارپوریشن کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا اور اس کا نیا نام (Watch tower Bible and tract society of pennsyluania) رکھا گیا۔
۱۹۰۰ء میں انگلستان میں اپنی شاخ کھولی۔اس کے بعد دنیا کے دیگر حصوں میں کام کرنا شروع کر دیا۔

وفات

سی ٹی رسل Russell نے ۱۹۱۶ء میں وفات پائی تو دو ماہ تک کارپوریشن کا کام تین آدمیوں کے ہاتھ رہا۔جنوری ۱۹۱۷ء میں جے فروتھر فورڈ (Fruther ford) کارپوریشن کے صدر بنے، اور وہ ۱۹۴۲ء تک اس عہدہ پر کام کرتے رہے۔۱۹۴۲ء میں ان کی وفات پر ناتھن ایچ نار (Nathan H Knorr) کارپوریشن کے صدر منتخب ہوئے۔
اس تحریک سے منسلک لوگ اپنے آپ کو کوئی الگ فرقہ خیال نہیں کرتے۔ان کا یہ خیال ہے کہ ہر ایک شخص اپنی ذمہ داری اور فرض کو ادا کر رہا ہے۔ممبروں کی رجسٹریشن نہیں۔ جب کوئی شخص ان کے نظریات سے متفق ہو جاتا ہے تو پہلے اسے بائبل کے مطالعہ کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، اس کے بعد اس کو یہ اجازت دی جاتی ہے کہ وہ بھی دوسروں سے مل کر نظریات کی اشاعت میں حصہ لے۔
تحریک کے آغاز میں بعض لوگ انھیں بائبل سٹوڈنٹس کے نام سے پکارتے تھے۔ یا ''عالمگیر بائبل سٹوڈنٹس۔'' اب بعض لوگ رسلائٹس یا فروتھر فورڈائیس بھی کہتے ہیں۔ایک لمبے عرصہ تک انھوں نے اپنی تحریک کا کوئی نام نہ رکھا۔لیکن ۱۹۳۱ء میں امریکہ میں ایک اجتماع ہوا، جس میں اس تحریک کے ممبروں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ انھیں اس نام سے پکارا جائے جس سے خدا تعالیٰ نے انھیں بائبل میں پکارا ہے یعنی یہوواہ وٹنسز (Jehovah's witnesses) (یسعیاہ کی دو آیات ۴۴:۸۔۴۳:۱۰ میں یہ نام آتا ہے) چنانچہ اس کے بعد یہ تحریک اسی نام سے پکاری جانے لگی۔
گو اس تحریک کو رسل نے شروع کیا تھا، لیکن وہ خود اپنی اس تحریک کو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے شروع ہونے کی وجہ سے یہوواہ (Jehovah) کو اس کا بانی قرار دیتا ہے۔ چنانچہ (Let Good be true) کے صفحہ ۲۱۳ پر لکھا ہے:
''اگر یہ حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں رسل اور فروتھر فورڈ نے ''گواہانِ خدا'' کے کام میں بہت حصہ لیا ہے، جس طرح اس سے پہلے یسوع مسیح، پال، پطرس، یوحنا، حضرت موسیٰ، ابراہیم، نوح علیہ اسلام،

ابیل (Abel) اور متعدد دیگر افراد نے خدا کی گواہی دی تھی۔ لیکن اس مقدس صحیفہ (یعنی بائبل) اور دیگر حقائق سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ (God Jehovah) (خدا یہوواہ) نے خود اس تحریک کا آغاز کیا اور وہ خود اپنے گواہ پیدا کر رہا ہے، اور اس بات کا ثبوت مہیا کرنے کے لیے اس نے انھیں اپنا نام دیا۔"

عیسائیوں کے مروجہ عقائد سے اختلاف

یہوواہ وٹنسز (گوہانِ خدا) کا عیسائیوں کے مروجہ اور مقبولہ عقائد سے شدید اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی وجہ سے بعض فرقے یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ لوگ عیسائی ہی نہیں۔

تثلیث کے متعلق نظریہ

عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا باپ خدا بیٹا اور خدا روح القدس ازلی ابدی ہیں اور تینوں برابر ہیں۔ تینوں مل کر ایک خدا بناتے ہیں۔

یہوواہ وٹنسز (گوہانِ خدا) اس سے اختلاف کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ایک ایسا وقت بھی تھا جب خدا جس کا اصل نام یہوواہ ہے اکیلا تھا۔

"اس لیے ایک ایسا وقت بھی تھا جب کہ یہوواہ تمام کائنات میں اکیلا تھا۔ تمام تر زندگی قوت اور قوت متخیلہ اس میں تھیں۔ لیکن یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اکیلا پن محسوس کرتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے آپ میں مکمل ہے اور کوئی ایسی چیز نہیں جس کی وہ کمی محسوس کرتا ہو۔"

محولا بالا سطور سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہوواہ وٹنسز کے نزدیک حقیقی طور پر خدا ایک ہی ہے۔

یسوع مسیح سے متعلق عقیدہ

عام عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ یسوع مسیح ازلی ابدی ہیں لیکن یہوواہ وٹنسز کے عقیدے کے مطابق وہ خدا کی سب سے پہلی مخلوق ہیں۔

"He was the 1st of Jehovah Good Creation"

یعنی وہ یہوواہ خدا کی سب سے پہلی مخلوق ہیں [1]

اسی طرح عیسائیوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ہر چیز یسوع مسیح نے پیدا کی ہے۔ یوحنا کی انجیل میں لکھا ہے:

سب چیزیں اسی کے وسیلہ سے پیدا ہوئیں اور جو کچھ پیدا ہوا ہے اس میں کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی۔" (یوحنا ۱:۳-۴)

انگریزی میں الفاظ یہ ہیں:

1 Let God be true P.35.

"All things were made by Him and without Him was not anything made that was made."

یہوواہ وٹنسز (گواہان خدا) کا یہ عقیدہ ہے:

"He is not the author of the creation of God."

یعنی خدا کی مخلوق کو انھوں نے نہیں بنایا۔

البتہ وہ یہ کہتے ہیں کہ خدا نے سب سے پہلے یسوع مسیح کو پیدا کیا اور پھر باقی اشیاء کو بنانے کے لیے اس کو اپنا رفیق کار بنا لیا۔

جیسا کہ پہلے اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ عام عیسائی تینوں خداؤں کو برابر کا خدا مانتے ہیں، لیکن یہوواہ وٹنسز کے نزدیک خدا کے برابر خیال کرنا ابلیس کی پیروی کے مترادف ہے۔ چنانچہ "Let God be true" میں لکھا ہے:

''اس نے شیطان کی پیروی نہ کی اور اپنے آپ کو قادر مطلق خدا کے روبرو پیش کرنے کی سازش نہ تھی۔ نہ خدا کے وقار اور اس کی بلندی کو چرانے کی کوشش کی۔ اس کے بالمقابل اس نے اپنے آپ کو خدا کا ماتحت ثابت کیا اور نہایت عجز کے ساتھ اس بات کا اقرار کیا اور نہایت بے عزتی کی زندگی قبول کی، یعنی بے عزتی کی موت گوارا کی۔''[1]

حضرت مریم کے متعلق نظریہ

کیتھولک عیسائی حضرت مریم کو خدا کی ماں کہتے ہیں، لیکن یہوواہ وٹنسز کہتے ہیں:

"It is blasphemously improper to call mother of God."

یعنی اسے خدا کی ماں کہنا گستاخانہ حد تک نازیبا ہے۔

یسوع مسیح کی آمد ثانی کے متعلقہ نظریہ

عام عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ یسوع مسیح صلیب کے چند روز بعد آسمان پر چلے گئے۔ وہاں خدا کے داہنے ہاتھ بیٹھے ہیں اور آخری زمانہ میں واپس دنیا میں آئیں گے۔

یہوواہ وٹنسز (گواہانِ خدا) کا یہ نظریہ ہے کہ یسوع مسیح جسمانی طور پر واپس نہیں آئیں گے، کیونکہ وہ اب انسانوں کے زمرہ سے نکل کر فرشتوں میں شامل ہو چکے ہیں۔

جس یونانی لفظ (Parousia) کا ترجمہ ''آنا'' کیا ہے وہ غلط ہے۔ اس لفظ کا انگریزی ترجمہ (Presence) یعنی موجودگی ہے اور انگریزی بائبل میں بعض جگہوں پر (مثلاً فلپیون ۲:۱۲) موجودگی یا

[1] Let God be true.

حاضری ہی ترجمہ کیا گیا ہے۔

''پس اے میرے عزیزو! جس طرح تم ہمیشہ سے فرمانبرداری کرتے آئے ہو، اسی طرح اب بھی نہ صرف میری حاضری میں بلکہ اس سے بہت زیادہ میری غیر حاضری میں ڈرتے اور کانپتے ہوئے اپنی تجارت کا کام کیے جاؤ۔''

اس گروہ کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ۱۹۱۴ء تک شیطان کی حکومت رہے گی، اس کے بعد یسوع مسیح کی حکومت شروع ہو جائے گی۔ گویا یہوواہ وٹنسز کے نزدیک یسوع مسیح روحانی طور پر اس دنیا میں آ چکے ہیں، ان کی موجودگی کے دو دلائل دیتے ہیں: ایک تو یہ کہ ۱۹۱۴ء سے دنیا میں جنگوں اور تباہی کا دور دورہ شروع ہو چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ ۱۹۱۸ء سے مسیح کی آمد کی اس قدر منادی شروع ہو گئی ہے کہ اس سے پہلے اتنی زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۵ء تک یہوواہ وٹنسز نے اڑتالیس کروڑ کتابچے ۸۸ زبانوں میں شائع کیے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی شدید مخالفت کے باوجود اس زور سے اور اس وسیع پیمانے پر منادی صرف اللہ تعالیٰ کی محض توفیق سے ہے۔

رحمان اور شیطان کی آخری جنگ

مسیح کی آمد ثانی کے متعلق عام عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ دنیا میں دوبارہ آئیں گے اور ساری دنیا کے اعمال کے لیے ایک عدالت قائم کریں گے اور اپنے ماننے والوں کو جنت اور اعلیٰ زندگی کی خوشخبری دیں گے اور منکرین کو عذاب الیم کی خبر سنائیں گے۔

لیکن یہوواہ وٹنسز کا یہ نظریہ ہے کہ اس دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے۔ آخری ایک ہزار سال عدالت کا دن ہے۔ جب سے حضرت مسیح آسمان پر گئے تھے خدا یہوواہ نے شیطان کو کھلا چھوڑ رکھا کہ وہ لوگوں کو راہ مستقیم سے بہکائے۔ جب وہ واپس آئیں گے خدا کی بادشاہت کا زمانہ شروع ہو جائے اور شیطان اور رحمان کی فوجوں کا مقابلہ ہوگا۔ اس جنگ کا نام ارمگڈن (Armageddon) ہے۔ رحمانی فوجوں کے سپہ سالار حضرت مسیح علیہ السلام ہوں گے۔ اس جنگ میں شیطان کو شکست ہوگی اور اس کی تمام قوتیں پاش پاش ہو جائیں گی۔ اس زمین پر خدا کی بادشاہت قائم ہو جائے گی اور ہر طرف امن وامان کا دور دورہ ہوگا۔

اس جنگ کے بعد یسوع مسیح اپنے جسم کو لے کر آسمانی بادشاہت میں داخل ہوں گے۔ اور ان کے ساتھ ایک لاکھ چوالیس ہزار (۱۴۴۰۰۰) متبعین ہوں گے۔

(Armageddon) کو عبرانی زبان میں ہرارمگڈن کہتے ہیں۔ یہ لفظ نئے عہد نامے کی کتاب مکاشفہ کے سولھویں باب کی سولھویں آیت میں پایا جاتا ہے:

''یہ شیاطین کی نشانی دکھانے والی روحیں ہیں جو قادر مطلق خدا کے روز عظیم کی لڑائی کے واسطے جمع کرنے کے لیے ساری دنیا کے بادشاہوں کے پاس نکل کر جاتی ہیں۔ دیکھو میں چور کی طرح آتا ہوں۔

مبارک وہ ہے جو جاگتا ہے اور اپنی پوشاک کی حفاظت کرتا ہے تاکہ ننگا نہ پھرے اور لوگ اس کی برہنگی نہ دیکھیں اور انھوں نے ان کو اس جگہ جمع کیا جس کا نام عبرانی میں ہرمجدون ہے۔

ایک لاکھ چوالیس ہزار کی تعداد انجیل کی ان آیات سے لی جاتی ہے۔ مکاشفہ کی کتاب کے ساتویں باب میں تیسری اور چوتھی آیت یہ ہے:

جب تک ہم اپنے خدا کے بندوں کے ماتھے پر مہر نہ کرلیں زمین اور سمندر اور درختوں کو ضرر نہ پہنچانا اور جن پر مہر کی گئی میں نے ان کا شمار سنا کہ بنی اسرائیل کے سب قبیلوں میں سے ایک لاکھ چوالیس ہزار پر مہر کی گئی۔"

اس حوالہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے لے کر اختتام دنیا تک کل ایک لاکھ چوالیس ہزار لوگ ہوں گے جو آسمانی بادشاہت میں داخل ہوں گے۔

سبت

سبت کے بارہ میں عام عیسائیوں اور یہوواہ وٹنسز کے مابین اختلاف ہے۔ عام عیسائی سبت یعنی اتوار کو (اگرچہ بعض عیسائی ہفتہ کو سبت قرار دیتے ہیں) آرام کا دن قرار دیتے ہیں اور اس دن کوئی کام کرنا شریعت کی روح کے منافی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہوواہ وٹنسز اس دن تبلیغ کرتے ہیں اور مذہبی لٹریچر تقسیم کرتے ہیں۔

سبت کی تشریح میں بھی دونوں کا اختلاف ہے۔ عام عیسائیوں کے خیال کی رو سے سبت ہر ہفتہ آتا ہے، چاہے اسے ہفتہ کا دن کہہ لیں یا اتوار کا۔ لیکن یہوواہ وٹنسز کہتے ہیں کہ سبت چوبیس گھنٹے والا دن نہیں بلکہ اس سے مراد وہ دن ہے جس کا ذکر بائبل میں ہے اور ہر دن ہزاروں سال کا ہے۔ بائبل میں آتا ہے کہ خدا نے چھ دن کام کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔ یہوواہ کے خیال کے مطابق اس دور کی تکمیل میں ایک ہزار سال کے قریب عرصہ باقی ہے۔ جب یہوواہ کا سبت کا سات ہزار سال دن ختم ہوگا تو اس وقت دنیا کے تمام لوگ پاک اور مطہر بن جائیں گے۔

یہوواہ وٹنسز کے عقائد پر تبصرہ

تحریک یہوواہ وٹنسز سے تعلق رکھنے والے یسوع مسیح کو ازلی نہیں مانتے۔ نہ اسے خدا کے برابر خیال کرتے ہیں، بلکہ اسے مخلوق خدا مانتے ہیں۔ چونکہ وہ یسوع مسیح کو خدا نہیں مانتے اس لیے وہ تثلیث کے بھی قائل نہیں۔ تثلیث یسوع مسیح کو خدا ماننے ہی سے قائم ہوسکتی ہے۔

یہ لوگ عام عیسائیوں کی طرح کفارہ پر ایمان نہیں رکھتے کیونکہ ان کے عقائد میں یہ بات شامل ہے کہ صرف یہوواہ ہی منجی ہے۔

"Only Jehovah is the saviour".

یعنی صرف یہوواہ ہی نجات دہندہ ہے۔

عام عیسائیوں کے مقبولہ اور مروجہ عقائد تثلیث اور کفارہ سے انکار کرنا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ یہ لوگ اسلام سے متاثر ہوئے ہیں۔

اسلام اور مسیحیت

کلیسائی معتقدات	اسلام کے معتقدات
ا۔ تثلیث	**ا۔ توحید**
عیسائیت تثلیث (باپ، بیٹا روح القدس کے قائل ہے۔ یعنی خدائی تین اقنوم سے مرکب ہے۔ یہ تینوں اقنوم مل کر ایک بھی ہیں۔ ہر اقنوم الگ الگ خدائی صفات کی مالک ہے۔ یہ وہ بنیادی عقیدہ ہے جس پر موجودہ عیسائیت کی عمارت قائم ہے۔	اسلام خالص توحید کا قائل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات، صفات اور افعال میں یکتا ہے۔ مسئلہ توحید کو نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ سورۃ اخلاص میں بیان کر دیا ہے۔ **قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ.** کہو اللہ ایک ہے، سب اسی کے محتاج ہیں، نہ اس کا لڑکا ہے اور نہ باپ اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے: **اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ.** (۱۳:۳۱) یعنی شرک بہت بڑا ظلم ہے۔
۲۔ بنی نوع انسان گناہ گار ہے	**۲۔ انسان خدا کا خلیفہ ہے**
آدم نے گناہ کیا، اب یہ گناہ وراثتاً نسل انسانی میں چلا آ رہا ہے۔ لہٰذا جمیع بنی نوع انسان گناہ میں ملوث ہیں جس سے وہ نکل نہیں سکتے۔	اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے۔ **اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً** (بقرہ۲:۳۰) دوسری جگہ آتا ہے: ہم نے انسان کو تقویم احسن میں پیدا کیا ہے۔ **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ** (بنی اسرائیل ۱۷:۷۰) اور ہم نے نوع انسان کو قابل تکریم بنایا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: **كل مولود يولد على الفطرة فابواه يهودانه**

او ینصرانه او یمجسانه (حدیث)
یعنی ہر بچہ فطرت صحیح پر پیدا ہوتا ہے اس کے والدین اس کو یہود یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

۳۔ رحم بلا بدل کفارہ

اللہ تعالیٰ سراسر رحم اور محبت ہے۔ اس کا رحم انسانوں کے گناہوں کی بخشش کا تقاضا کرتا ہے اور اس کا عدل یہ تقاضا کرتا ہے کہ انسان کو اس کے گناہ کی سزا ملے۔ عدل کے تقاضا کو پورا کرنے کے لیے پاک، بے عیب، معصوم بیٹے یسوع مسیح کو صلیب پر موت دی تا کہ سارے اگلے پچھلے انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ہو۔

۳۔ اللہ غفور و رحیم ہے

اسلام کا خدا غفور و رحیم ہے۔ وہ انسانوں کے گناہ توبہ استغفار کرنے سے معاف کر دیتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (۱۱۶:۴) یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کو نہیں بخشتا جو اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے اور جو اس کے علاوہ ہے وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔

اسلام کا خدا بہت وسیع رحمت والا ہے۔ اس کی رحمت کی چادر ہر چیز کو ڈھانپے ہوئے ہے۔

ارشاد الٰہی ہے:

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۱۲:۶) یعنی اس نے اپنے اوپر رحم کو لازم کر لیا ہے۔

رَبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ (۱۴۶:۶) تمہارا رب وسیع رحمت والا ہے۔ پھر فرمایا:

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (۱۵۶:۷) اور میری رحمت سب چیزوں پر حاوی ہے۔

اسلام کے نزدیک کسی بے گناہ کو دوسروں کے گناہوں کے بدلے سزا دینا خود صفت عدل کے خلاف ہے۔

۴۔ شریعت لعنت ہے

اللہ تعالیٰ نے متعدد شرائع نازل کیں۔ تجربہ سے

۴۔ شریعت ذریعہ ہدایت ہے

اسلام شریعت کو ھدی للنّاس کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

یہ ثابت ہوا کہ انسان شریعت پر عمل نہیں کر سکتا۔ اس لیے شہریت لعنت ثابت ہوئی۔ کیونکہ آدم کے ارتکاب گناہ کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام بھی بے گناہ نہ نکلے۔

نے شریعت بنی نوع انسان کے لیے ہدایت اور رحمت کے طور پر نازل فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم حکمت کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ اس نے کوئی ایسا حکم نازل نہیں کیا جن پر انسان عمل نہ کرسکتا ہو۔

ارشاد الٰہی ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ۲:۲۸۲)

یعنی اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے شریعت میں کوئی ایسا حکم نازل نہیں کیا جس پر وہ عمل نہ کرسکتا ہو اسلام کے نزدیک شریعت عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ

(روم۳۰:۳۰) پس اپنا منہ دین حنیف کی طرف کر، یہ وہ خدا کی فطرت ہے جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا اللہ کی پیدا کی ہوئی حالت کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا، پس قائم رکھنے والا یا رہنے والا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اس آیت میں دین حنیف کو اللہ کی فطرت قرار دیا ہے اور اسی پر انسان کو پیدا کیا ہے۔ گویا شریعت عین فطرت انسانی کے مطابق ہے۔

۵۔ نجات کا ذریعہ کفارہ ہے

انسان فطرتاً گناہگار ہونے کی وجہ سے کفارہ پر ایمان لائے بغیر نجات حاصل نہیں کرسکتا۔

۵۔ نجات کا دارومدار ایمان اور اعمال صالحہ پر ہے

اسلام کے نزدیک جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے اور اعمال صالحہ بجالاتا ہے وہ نجات پا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے:

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا

فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (البقرہ۲:۶۲) یعنی جو اللہ پر اور آخری دن پر ایمان لایا اور نیک عمل کیے۔ پس ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے:

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۲:۲۵)

یعنی جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں وہ ان باغوں کے وارث ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ پھر ارشادِ الٰہی ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت۲۹:۶۹) یعنی جو ہمارے راستہ میں محنت کرتے ہیں ہم ان کو اپنا راستہ دکھا دیتے ہیں۔

۶۔ یسوع خدا کا بیٹا تھا

اللہ تعالیٰ نے اپنے اکلوتے بیٹے یسوع کو انسانی شکل میں بھیجا، اور وہ خدائی صفات کا حامل تھا۔

۶۔ خدا کا کوئی بیٹا نہیں

اللہ تعالیٰ کی ذات توالد اور تناسل کے سلسلہ سے پاک ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام بشر ہیں۔ اس قاعدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک بشر اور خدا کے مقدس نبی ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (مریم۱۹:۸۹۔۹۱) اور کہتے ہیں کہ رحمٰن نے بیٹا بنایا ہے یقیناً تم ایک خطرناک بات کر گزرے ہو قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائے اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں کہ وہ رحمٰن کے لیے بیٹے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

۷۔ یسوع مسیح لعنتی موت مرا

یسوع مسیح دنیا کے گناہوں کے عوض صلیب پر لعنتی موت مرا۔ تین دن جہنم میں رہا۔ پھر مردوں سے جی اٹھا اور بادلوں میں غائب ہو کر آسمان پر چلا گیا۔ خدا کے داہنے ہاتھ بیٹھا ہوا ہے۔

۷۔ تمام انبیاء مکرم ہوتے ہیں

انبیاء علیہم السلام ملعون نہیں ہوتے بلکہ وہ مکرم اور منصور ہوتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی خدا کے برگزیدہ، مکرم اور منصور نبی تھے۔

۸۔ یسوع مسیح کا پیغام قومی تھا

اناجیل کی رو سے یسوع مسیح کا پیغمبرانہ کلام عالمگیر نہ تھا، بلکہ صرف بنی اسرائیل کے لیے تھا۔ اپنے شاگردوں سے کہا: ''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔'' (متی ۱۰:۵،٦)

۸۔ اسلام کا پیغام عالمگیر ہے

اسلام کا پیغام عالمگیر ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تمام دنیا کی طرف ہوئی۔

ارشادِ الٰہی ہے:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِيْنَ. یہ کتاب تمام جہانوں کے لیے نصیحت ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا. (سبا ۳۴:۲۸) اے رسول ہم نے تجھے تمام لوگوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

باب ۸

اسلام

جغرافیہ عرب

وجہ تسمیہ

اہل لغت کے نزدیک عرب ''اعراب'' سے مشتق ہے۔ جس کے معنی فصاحت اور زبان آوری کے ہیں۔ چونکہ عرب نہایت فصیح اللسان اور زبان آور تھے۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنا نام عرب رکھا، باقی دنیا کی اقوام کو عجم کے نام سے پکارا۔ عجم کے معنی ژولیدہ بیان اور گونگے کے ہیں۔

اہل جغرافیہ کے نزدیک عرب کا پہلا نام عربۃ تھا اور سامی زبانوں میں بھی عربہ صحرا اور بادیہ کو کہتے ہیں۔ چونکہ عرب کا ملک زیادہ تر ایک بیابان اور ریگستان ہے۔ اس لیے اس کا نام عربۃ پڑ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ وہاں کے رہنے والوں کو بھی عرب کہا جانے لگا۔

حدود و وسعت عرب

عرب تین براعظموں یعنی ایشیاء یورپ اور افریقہ میں مرکز کے طور پر ہے اور تین طرف سے سمندر سے گھرا ہوا ہے۔ مشرق میں خلیج فارس اور بحر عمان، جنوب میں بحر ہند، مغرب میں بحر احمر۔

عرب خشکی اور تری دونوں راستوں سے دنیا کو اپنے دائیں اور بائیں ہاتھ سے ملا کر ایک کر رہا ہے۔

عرب کی پیائش حقیقی طور سے نہیں ہوئی وہ ہندوستان سے بڑا ہے۔ اور ملک جرمن اور فرانس سے چار گنا ہے۔ طول تقریباً چودہ سو میل اور عرض مختلف، جنوب میں زیادہ اور شمال میں کم ہوتا گیا ہے۔ مجموعی رقبہ بارہ لاکھ مربع میل ہے۔

اس ملک کا ایک بڑا حصہ ریگستان ہے۔ شمالی حد میں شام اور عرب کے درمیان ایک ریگستان ہے جس کو بادیہ شام یا بادیہ عرب کہا جاتا ہے۔ جنوبی حد میں یمن، عمان اور یمامہ کے درمیان ایک وسیع صحرا ہے۔ جس کو الدھنا یا ربع خالی کہا جاتا ہے۔ اس ملک میں سب سے بڑا طویل السلسلہ پہاڑ جبل السراۃ ہے جو جنوب میں یمن سے شروع ہو کر شمال میں شام تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی سب سے اونچی چوٹی آٹھ ہزار فٹ ہے۔ اس طرح حجاز کا سب سے بڑا پہاڑ جبل الہدیٰ، طائف کا جبل الکرا، نجد کا جبل عارض وطریق، شمر کا

جبل سلمی اور یمن کا جبل کو کبان ہے۔

ملک عرب میں کوئی دریا نہیں ہے۔ پہاڑوں سے چشمے جاری رہتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ چشمے پھیل کر دور تک ایک مصنوعی دریا بن جاتے ہیں۔ پھر ریگستان میں جذب ہو جاتے ہیں یا سمندروں میں گر جاتے ہیں۔

عرب کے وہ حصے جو سواحل بحر پر واقع ہیں۔ وہ سرسبز و شاداب اور زرخیز ہیں، خاص طور پر یمن کا صوبہ بہت ہی زرخیز ہے۔

عمان، حضرت موت، نجد اور حجاز میں طائف عرب کے شاداب اور زرخیز علاقے ہیں۔

پیداوار عرب

عرب کی پیداوار زیادہ تر کھجور اور سیب ہیں۔ علامہ ہمدانی نے صفۃ جزیرۃ العرب میں ایک ایک کان کا نشان دیا ہے۔

عربوں کے پیشے

عربوں کے پیشے تجارت، زراعت اور گلہ بانی تھے۔

اقطاع عرب

عرب کا ایران سے ملتا ہوا حصہ عراق عرب کے نام سے مشہور ہے۔ جس میں بصرہ اور کوفہ کے مشہور اسلامی شہر آباد ہیں۔

شام سے ملتا ہوا حصہ عرب شام کہلاتا ہے اور حلب تک پھیلا ہوا ہے موجودہ تقسیم ملکی عرب سے الگ نظر آتے ہیں۔

ان کے علاوہ عرب حسب ذیل چار صوبوں میں تقسیم ہے:

عروض، نجد، یمن اور حجاز آگے ہر صوبہ متفرق چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہے۔

عروض

مشرقی نجد اور حدود عراق سے سواحل خلیج فارس تک پھیلا ہوا ہے۔ اس صوبہ میں یمامہ، بحرین، عمان تین اقطاع ہیں۔

نجد

وسط عرب میں ایک سرسبز و شاداب، زرخیز اور بلند قطعہ ہے۔ تین طرف سے صحراؤں سے محیط ہے۔ شمال میں صحرائے شام، مغرب میں صحرائے حجاز، مشرق میں صحرائے دہنا اور جنوب میں صوبہ یمامہ ہے۔ یہ صوبہ سطح سمندر سے ۱۲۰۰ میٹر بلند ہے۔ آج کل نجد شمر، قصیم اور عارض تین حصوں میں تقسیم ہو کر شیوخ کے

زیر حکومت ہو گیا ہے۔

نجد کے گھوڑے اور اونٹ بہت مشہور ہیں۔ ہر قسم کے میوے یہاں پیدا ہوتے ہیں۔ وادیوں اور پہاڑوں کے دامن میں زراعت بھی ہوتی ہے۔

یمن

عرب کا سب سے زیادہ زرخیز، سرسبز اور آباد علاقہ ہے جو اسلام سے قبل اور اسلام کے بعد بھی علم و ہنر کا مرکز رہا ہے۔ محققین آثار قدیمہ نے یہاں سے ایسے آثار پائے ہیں جو قدیم تمدن کا پتہ دیتے ہیں۔

یمن کو مندرجہ ذیل اقطاع میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

حضر موت، احقاف، صنعا، نجران، عسیر، جو علی الترتیب مشرقی جنوبی حدود یعنی حضر موت سے جنوبی مغربی حدود یعنی حجاز تک سواحل بحر احمر پر واقع ہیں۔

احقاف

یہ وہی حصہ ہے جہاں کبھی عاد کی زبردست قوم آباد تھی، جس کی تباہی کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے۔

حجاز

مغرب میں بحر احمر کے ساحل پر ایک مستطیل کی صورت میں حجاز کا مشہور پہاڑی علاقہ ہے جس میں مکہ، مدینہ اور طائف کے مشہور شہر آباد ہیں۔ اس کی دو بڑی بندرگاہیں ہیں: جدہ، جہاں سے مکہ معظمہ کو جاتے ہیں ینبوع، جہاں سے مدینہ منورہ کو جاتے ہیں۔

مکہ

حجاز کا دارالخلافہ ہے۔ یہ ایک بے آب و گیاہ وادی میں واقع ہے۔ اس کے چاروں طرف خشک پہاڑیاں ہیں۔ اس کی آبادی کی ابتداء حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانہ سے ہوئی تھی۔ اس شہر میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے۔ اس شہر میں خانہ کعبہ ہے جس کے معمار دو نبی یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ یہی وہ پہلا توحید کا چشمہ ہے جس سے دنیا روحانی پیاس بجھائے گی اور یہ چشمہ دلوں کی خشک کھیتیوں کو تاابد سیراب کرتا رہے گا۔

مدینہ

مدینہ کا پرانا نام یثرب ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کر کے یہاں تشریف لائے تو اس کا نام مدینۃ النبی پڑ گیا، بعد میں صرف مدینہ کہلانے لگا۔ بعض تاریخی قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی تعمیر ۱۶۰۰ قبل مسیح اور ۲۲۰۰ قبل مسیح کے درمیان ہوئی۔ سب سے پہلے یہاں عمالیق آباد ہوئے۔

عمالیق کے بعد یہاں سب سے پہلے یہود آ کر آباد ہوئے۔ اس کے بعد قبیلہ ازد کی دو شاخیں اوس اور خزرج آباد ہوئیں۔

طائف

حجاز کی جنت ہے۔ بہت زرخیز اور شاداب علاقہ ہے۔ رؤساء حجاز عموماً گرمیوں کا موسم یہیں بسر کرتے تھے۔ یہ مکہ معظمہ سے مشرق کی طرف قدرے جنوب کو واقع ہے۔ ابتداءً قبیلہ عدوان کا مسکن تھا، بعد میں قبیلہ ثقیف کے قبضہ میں آ گیا۔ ہجرت سے قبل رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعوتِ اسلام لے کر یہاں تشریف لائے۔ اہل طائف نے غرور کے نشہ میں بدمست ہو کر دعوت حق کو رد کر دیا ۸ھ ہجری میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طائف کا محاصرہ کیا۔ ۹ھ میں سردار ثقیف عروہ بن مسعود نے اسلام قبول کیا اور اپنی قوم کے ہاتھ سے مارا گیا اور اسی سال وفد ثقیف رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام میں داخل ہوا۔

عرب کی قدیم اقوام

مورخین نے عرب کی اقوام کو تین طبقات میں تقسیم کیا ہے:

ا۔عرب بائدہ

عرب بائدہ سے مراد وہ قبائل ہیں جو سب سے پہلے عرب میں آباد ہوئے جو اسلام سے قبل سب فنا ہو چکے تھے۔

۲۔عرب عاربہ

یہ طبقہ قحطان کی اولاد سمجھا جاتا ہے۔ ان کا اصلی اور قدیم وطن یمن سمجھا جاتا ہے۔ اس خاندان کی تین بڑی شاخیں ہیں: قضاعة، کہلان، ازد۔ حمیر اسی کی شاخ ہے۔

۳۔عرب مستعربہ

اس طبقہ سے مراد بنو عدنان یا اولاد حضرت اسماعیل علیہ السلام ہے۔ یہ لوگ عرب کے اصلی باشندے نہیں ہیں۔ اسی لیے ان کو عرب مستعربہ کا خطاب دیا گیا ہے۔ عدنانی قبائل میں ایاد، ربیعہ اور مضر مشہور ہیں۔ پھر ربیعہ اور مضر زیادہ شہرت کے مالک ہیں۔ مضر کے مشہور قبیلہ کنانہ میں فہر بن مالک تھے، جن کو قریش بھی کہتے تھے۔ قریش کی اولاد میں سے بہت سے قبائل ہیں۔ جن میں بنی سہم، بنی مخزوم، بنی تیم، بنی جمح، بنی عدی، بنی عبدالدار، بنی زہرہ، بنی عبد مناف بہت مشہور ہیں۔ عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ عبد شمس، نوفل، مطلب، ہاشم۔ اور ہاشم میں سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے۔

عرب میں آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے کے وجوہ

پہلی وجہ

اللہ تعالیٰ کے ارادہ ازلی میں تھا کہ بنی نوع انسان کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات نازل فرمائے، جو ہر زمانہ میں دنیا کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے سرچشمہ ہو۔ اس لیے یہ لازمی امر تھا کہ اس قسم کی کتاب نہایت ہی ادق اور ارفع مضامین کی حامل ہوگی۔ اس قسم کے مضامین کو ادا کرنے کے لیے وہی زبان متحمل ہو سکتی ہے جو اپنے اندر وسعت رکھتی ہو، پھر زیادہ سے زیادہ مضامین مختصر سے مختصر الفاظ میں بیان کیے جا سکتے ہوں۔ اگر تمام السنہ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عربی زبان ہی وہ زبان ہے جو اپنے اندر اتنی وسعت رکھتی ہے کہ ادق سے ادق مضمون بھی بخوبی ادا کیا جا سکتا ہے۔ پھر زیادہ سے زیادہ مضامین چند ایک الفاظ میں بیان کیے جا سکتے ہیں۔

بعض محققین کا یہ بھی نظریہ ہے کہ عربی زبان ام الالسنہ[1] ہے۔ اگر یہ تحقیق سے ثابت ہو جائے کہ عربی زبان تمام زبانوں کی ماں ہے اور اسی سے تمام زبانیں متفرع ہیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ آخری شریعت عربی زبان میں ہی نازل کی جانی چاہیے تھی۔

آخری شریعت کو عربی زبان میں نازل کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آخری نبی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عرب میں مبعوث فرمایا۔

دوسری وجہ

آخری نبی کو عرب میں نازل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عرب معمورہ عالم کے وسط میں ہے۔ اس کی تصدیق تحقیق جدید سے بھی ہوتی ہے کہ وہ درحقیقت دنیائے قدیم کے قلب میں واقع ہے۔

عرب کے ایک طرف ایشیا، دوسری طرف افریقہ، تیسری طرف یورپ کا راستہ اس سے قریب ہے۔ وہ خشکی اور تری دونوں راستوں سے دنیا کو اپنے اندر دائیں اور بائیں ہاتھ سے ملا کر ایک کر رہا ہے۔

اس لیے یہ ضروری تھا کہ تمام دنیا کی ہدایت کے لیے عرب کو ہی مرکز بنایا جاتا تا کہ ندائے حق جلد تمام دنیا میں پہنچ سکے۔ اسی لیے عرب کے مشہور شہر جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے اور دعویٰ نبوت کیا اس کو قرآن مجید میں "ام القریٰ" کہا گیا ہے۔

تیسری وجہ

تیسری وجہ یہ ہے کہ خدا کی عبادت کے لیے سب سے پہلا گھر حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے مکہ میں تعمیر کیا، قرآن مجید نے اسے واضح الفاظ میں اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ قرار دیا ہے۔ یعنی

[1] دیکھئے کتب ام الالسنہ مصنفہ خواجہ کمال الدین اور ایڈووکیٹ محمد احمد (فیصل آباد)

سب سے پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لیے مقرر کیا گیا تھا اس کا نام بیت عتیق بھی رکھا۔

تاریخ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عرب میں بیت اللہ کی تکریم قدیم زمانہ سے چلی آ رہی ہے۔ اس سے خانہ کعبہ کی قدامت ثابت ہوتی ہے۔ یہ غلط ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اس گھر کو تعمیر کیا تھا بلکہ جب یہ گھر حوادثات زمانہ سے منہدم ہو گیا تو باپ بیٹے نے خدا کے حکم سے انہی قواعد پر دوبارہ اس گھر کو کھڑا کیا۔ سر ولیم میور بھی اپنی کتاب لائف آف محمد میں خانہ کعبہ کی قدامت اور ہر سال عربوں کا اس کا حج کرنے کا اقرار کرتا ہے۔

دنیا میں جس گھر کو سب سے پہلے خدا کی عبادت گاہ ہونے کا شرف حاصل ہوا اور جس سے خدا کی توحید کا چشمہ پھوٹا اور پیاسی دنیا کو سیراب کیا، وہ بیت اللہ ہے اس وجہ سے یہ ضروری تھا کہ جب حکمت ایزدی سے اس دنیا میں آخری نبی آتا تو ایسی جگہ پیدا ہوتا جس جگہ وہ معبد ہے، تاکہ وہ اس معبد کو تمام دنیا کے لیے قبلہ اور توحید کا آخری مرکز مقرر کرے۔

چوتھی وجہ

چوتھی وجہ یہ ہے کہ عرب کبھی بھی کسی غیر حکومت کے ماتحت نہیں رہا۔ شمالی عرب نے کبھی کسی کی غلامی کا جوا اپنی گردن پر نہیں رکھا۔ اس آزادی سے ان کے دل و دماغ کی مخفی استعدادیں، آزادی کی روح اور فاتحانہ طاقت بدستور برقرار رہیں تاکہ یہ مخفی استعدادیں اسلامی حکومت کے قیام و بقاء میں کارآمد ہوں۔

پانچویں وجہ

پانچویں وجہ یہ ہے کہ عربوں میں بعض اوصاف حمیدہ پائے جاتے تھے۔ وہ بڑے بہادر، پُرجوش، حق گو، فراست مند، دانش مند، ذہین و فطین، فیاض، وفادار، مہمان نواز اور علمیت پسند تھے۔ یہ وہ اخلاق ہیں جو ایک مبلغ کے لیے ضروری ہیں۔ اس وجہ سے خدا تعالیٰ نے ان کو آخری شریعت کا اہل سمجھا اور ان کو اولین مخاطب ہونے کا شرف بخشا۔

یہ اوصاف اُس زمانہ میں نہ ہندوستان کے رہنے والوں، نہ ایران کے رہنے والوں، نہ روم کے رہنے والوں، غرض کہ دنیا کے کسی خط کی قوم میں نہ پائے جاتے تھے۔

چھٹی وجہ

چھٹی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربوں کو آخری شریعت کا اولین مخاطب اس لیے بنایا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کی غلامی میں نہیں آئے۔ گو اس وقت عرب میں بڑے بڑے مذہب تھے۔ بعض مذاہب کے پیچھے شاہی قوت بھی تھی لیکن پھر بھی سوائے چند قبائل کے دوسرے تمام اہل عرب بدستور اپنی خالص حالت پر تھے۔ ان میں دوسرے مذاہب کی سی تنگ دلی اور تعصب نہ پیدا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دعویٰ نبوت کیا تو سب سے پہلے زیادہ ماننے والے وہی تھے جو کسی مذہب میں شامل نہ

تھے۔ یہودیت، عیسائیت وغیرہ سے بہت کم دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

ساتویں وجہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل ایران، روم اور دوسری دنیا کے تمام خطوں میں تہذیب، دولت وثروت اور دوسرے تمدنی اثرات کی وجہ سے جدید طغرائے حق کو قبول کرنے کی صلاحیتیں مسخ ہو چکی تھیں۔ عرب کا خطہ ہی ان تمام اثرات سے بالکل محفوظ تھا اور ان میں قبول حق کے لیے صلاحیتیں محفوظ تھیں۔ اس وجہ سے خدا تعالیٰ نے اپنی آخری امانت کی تفویض کے لیے عرب کو ہی منتخب کیا اور ان میں خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے۔

بعثت نبوی کے وقت دنیا کی حالت

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ

بر و بحر میں فساد ظاہر ہو گیا

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل دنیا جہالت اور گمراہی کی وادی میں بھٹک رہی تھی۔ توحید کا چراغ جو مختلف انبیاء علیہم السلام نے مختلف ادوار میں روشن کیا تھا، گل ہو چکا تھا۔ کہیں بھی صحیح عقیدہ موجود نہ تھا۔

ایران کی حالت

ایران عرب کی ہمسایہ مملکت تھی، جس کا شمار دنیا کی عظیم سلطنتوں میں ہوتا تھا۔ یہاں توحید کا فقدان، شرک اور بت پرستی کا ظہور تھا۔ زرتشت کو خدائی صفات سے متصف کر کے معبودانِ باطلہ میں شمار کر لیا تھا۔ نیکی اور بدی کے دو معبود یزدان اور اہرمن کے نام سے پوجے جاتے تھے۔ سورج، چاند، ستارے، آگ، حجر و شجر کی پرستش کی جاتی تھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے کچھ صدیاں قبل مانی نے مسیحیت اور مجوسیت کی آمیزش سے ایک نیا مذہب بنایا جس کے فلسفہ نور و ظلمت میں ایرانی قوم پھنس کر رہ گئی۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ دنیا سے قطع تعلق کر کے جنگلوں اور ویرانوں میں زندگی بسر کرنی چاہیے اور ترک ازدواج سے نسل انسانی کو منقطع کر دیا جائے تاکہ بدی کا خاتمہ ہو جائے۔

ایران میں مزدک کی تعلیم کا زور تھا، جس نے عورتوں کو مشترکہ جائیداد قرار دیا اور ہر قسم کی بدی کے راستے کھول دیے۔ باپ کا بیٹی کو اور بھائی کا بہن کو اپنی زوجیت میں لینا جائز تھا۔ یزدگرد ثانی جو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں ایران کا بادشاہ تھا اس نے اپنی بیٹی سے شادی کی اور پھر اس کو قتل کر ڈالا۔

مشاہیر پرستی بھی رائج تھی، ان کی الوہیت کے گیت گائے جاتے تھے۔

روم کی حالت

ایرانی سلطنت کے مقابل دنیا کی دوسری سب سے بڑی طاقت رومیوں کی حکومت تھی۔ ۳۲۵ء میں رومی سلطنت کے مشرقی اور مغربی دو حصے ہو گئے تھے۔ مشرقی حصہ کا بادشاہ قسطنطین تھا۔ اس نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ اس حصہ سے ایرانیوں کی صدیوں سے آویزش اور جنگ جاری تھی۔ عہد نبوی کے ابتدائی زمانہ میں ایرانیوں نے مصر اور شام وغیرہ کے علاقے چھین لیے۔ ۶ھ میں نینوی کے میدان میں رومی شہنشاہ ہرقل نے ایرانیوں کو شکست فاش دی۔ اس طرح مشرقی روم صدیوں کی بیرونی جنگوں کے سبب تباہ و برباد ہو چکا تھا۔

مغربی رومیوں پر جرمن وغیرہ وحشی قبائل نے دھاوے بول دیے تھے، اور صدر مقام روما پر قبضہ کر لیا تھا۔ اہل روم کی مذہبی حالت بھی ابتر تھی۔ وہ ستاروں، دیوتاؤں اور بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ وہ لوگ جنھوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت اور بشریت کی بحثوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ ۵۱۴ء میں خود عیسائیوں کے دو گروہوں میں مذہبی جنگ چھڑ گئی جس میں ۶۵۰۰۰ عیسائیوں کو شہر بدر کر دیا گیا۔[1]

عیسائیت کئی فرقوں میں بٹ گئی۔ ہر فرقہ دوسرے فرقہ کے خون کا پیاسا تھا۔ پادریوں نے اپنے مذہبی منصب کو جاہ و حشمت کے حصول کا ذریعہ بنایا ہوا تھا۔ ہر پادری دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ہر ممکن سعی کرتا اور ان پادریوں میں ہر قسم کی برائی پیدا ہو چکی تھی۔ ان کی بدکاریوں کا ایک عیسائی نے یوں نقشہ کھینچا ہے کہ کنواریاں پادریوں کے پاس اقرار گناہ کے لیے جاتیں مگر کنواریاں واپس نہ آتیں۔

سیل صاحب ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"گرجا کے پادریوں نے مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن، محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا۔ اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے۔ اس تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کے لیے باعث ننگ تھے۔ مذہبی صورت میں قائم کیے گئے۔ خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی سے ہونے لگی۔ نائیس کی کونسل کے بعد مشرقی چرچ روزانہ کے مناظرات میں مشغول ہو گیا اور اریس، سبلینس، نسطوریس اور یوٹیکینس کے جھگڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ انصاف علانیہ فروخت کیا جاتا اور ہر طرح کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں۔"

مصر کی حالت

مصری تمدن کی عظمت اور تفوق اہرام مصر، ابوالہول کے مجسمے اور موجودہ زمانہ میں آثارِ قدیمہ سے

[1] گبن کی تاریخ زوال وانحطاطِ سلطنت روم جلد ۳ ص ۳۴۴۔

برآمد ہونے والی اشیاء ظاہر کرتی ہیں۔ مصر ایک زرعی ملک ہے۔ جب مصر کی سیاسی قوت میں ضعف اور کمزوری آئی تو رومیوں، ایرانیوں اور یونانیوں نے پے در پے حملے کیے اور ملک مصر پر قابض ہو گئے۔ فاتحین رعایا کو چوپایوں سے زیادہ ذلیل سمجھتے تھے۔ جو عیوب حکمران طبقے میں موجود تھے۔ وہ سب محکوم طبقے میں بھی سرایت کر گئے تھے۔ انسانیت پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ مصر کا ایک بڑا طبقہ عیسائیت قبول کر چکا تھا، لیکن وہ عیسائیت کی اصل روح سے بالکل نا آشنا تھے۔ ایک طبقہ بتوں کے سامنے سجدہ ریز تھا۔

ہندوستان کی حالت

مورخین ہندوستان کی تہذیب وتمدن کو پانچ ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:

ایک ہندو ویدک کا دور جو دو ہزار سال قبل مسیح سے لے کر تقریباً چودہ سو سال قبل مسیح تک رہا۔

دوسرا دور وہ دور ہے جس میں کوروں اور پانڈووں کی لڑائیاں لڑی گئیں، جو چودہ سو سال قبل مسیح سے لے کر تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح تک رہا۔

تیسرا دور علم و ہنر کا دور ہے جس میں ہیئت، ریاضی، فلسفہ وغیرہ علوم ہیں۔ ہندیوں نے کمال دکھایا۔ جو ایک ہزار قبل مسیح سے لے کر تیسری صدی قبل مسیح کے نصف تک رہا۔

چوتھا دور بدھ مذہب کا ہے جس میں اس مذہب کو عروج حاصل ہوا ہے اور دو سو پچاس سال قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک رہا۔

پانچواں دور پرانک دور کہلاتا ہے۔ یہ دور تقریباً پانچویں صدی کے اواخر سے لے کر مسلمانوں کے فتح ہند تک قائم رہا۔

مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ دور ہندوستان کی تاریخ میں نازک ترین دور تھا۔ اس دور کی نمایاں اور اہم خصوصیت حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ہر قسم کا شرک کمال پر تھا۔ چنانچہ وید میں ۳۳ دیوتاؤں کی تعداد تھی۔ اس دور میں بڑھتے بڑھتے دیوتاؤں کی تعداد ۳۳ کروڑ ہو گئی۔[1]

۲۔ اس دور میں ہندوستان کے اندر بت پرستی عام تھی۔[2] نیز سورج، چاند، ستاروں، پہاڑوں، دریاؤں اور حیوانوں کی پرستش کرنا اعتقادات میں شامل تھا۔

۳۔ مندروں کے نگران ومحافظین ہر قسم کی بداخلاقی میں مبتلا تھے، جو لاکھوں کروڑوں ناواقف پرستش کرنے والوں کو مذہب کے نام پر لوٹتے۔[3]

۴۔ اس دور میں ذات پات کی تفریق شروع ہوئی جس نے نظام معاشرت کو تباہ و برباد کر دیا۔[4]

---

[1] ارئی دت کی ''ہندوستان قدیم'' جلد ۳ ص ۲۷۶۔ [2] ایضاً ص ۲۸۱۔
[3] ارئی دت کی ''ہندوستان قدیم'' جلد ۳ ص ۲۸۳۔ [4] ایضاً ص ۳۰۷۔

۵۔ عورتوں کو اس دور میں غلام کی حیثیت دی جاتی تھی۔

۶۔ ملک میں غیر منصف اور غیر معقول قوانین رائج تھے۔

(الف) برہمن کو کسی بھی سنگین جرم میں سزائے موت نہیں دی جاتی تھی۔

(ب) کسی اونچی ذات کے مرد کا کسی نیچی ذات کی عورت کے ساتھ زنا کرنا جرم نہیں تھا۔

(ج) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات والے کو چھو لے تو اس کو سزائے موت دی جاتی تھی۔

(د) اگر کوئی نیچی ذات والا اپنے سے اونچی ذات والے کو مارے تو اس کے اعضاء قطع کر دیے جاتے تھے۔ اگر گالی دے تو اس کی زبان کاٹ دی جاتی تھی۔ اگر اسے تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو گرم تیل اس کے منہ میں ڈالا جاتا تھا۔[1]

(ھ) شودر کے کان میں ویدکی آواز پڑ جائے تو اس میں سیسہ پگھلا کر ڈالنے کا حکم تھا۔

۷۔ راجاؤں کے محلات میں شراب نوشی کثرت سے رائج تھی۔ رانیاں حالت نشہ میں ہی برہنہ ہو جاتی تھیں۔[2]

۸۔ شاہراؤں پر آوارہ گروہ اور جرائم پیشہ افراد جمع رہتے تھے۔[3]

۹۔ رہبانیت سب سے عمدہ عبادت تصور کی جاتی تھی اور اپنے جسم کو سخت سے سخت ایذا دینا رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔

۱۰۔ شاکت مت جیسے فرقے پیدا ہو گئے۔ جس میں ماں بہن تک کی حرمت باقی نہ رہی اور نیوگ کے رنگ میں اسے مذہب میں داخل کر لیا۔

۱۱۔ مرد اور عورت کے مخصوص مقامات کی ننگی تصویریں مندروں میں رکھی جاتیں اور مرد اور عورتیں انھیں دیکھتے اور عبادت کرتے۔

۱۲۔ عورتیں قمار بازی میں ہاری جاتیں۔ ایک عورت کے کئی خاوند ہوتے تھے۔ وہ بیوہ ہو کر ہر لذت سے عمر بھر قانوناً محروم کر دی جاتی تھی اور اسی لیے خاوند کے مرنے پر بعض عورتیں زندہ آگ میں جل جانا پسند کرتی تھیں۔

۱۳۔ عورتیں فروخت کی جاتی تھیں۔

۱۴۔ راجاؤں کی بیویوں کی کوئی تعداد قانوناً مقرر نہ تھی۔

۱۵۔ وہم پرستی ان کے مذہب کا ایک جزو لانیفک بن چکی تھی۔

---

[1] ایضاً ص ۳۴۳، ۳۴۴۔ [2] ایضاً ص ۴۶۹۔

[3] ایضاً ص ۴۶۹۔

چین کی حالت

جن ممالک کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یہ سب کے سب عرب کے ہر چار سمت واقع ہیں اور یہی متمدن اور ترقی یافتہ ملک سمجھے جاتے تھے۔ ان متمدن ممالک میں ملک چین کا بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔ عہد نبوی کے آغاز سے قبل چین کی سیاسی اور مذہبی حالت دگرگوں تھی۔ ہن (Huns) خانوادے کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ وائی (Wai) اور شو (Shu) کی تین حکومتیں قائم ہو گئیں۔ لیکن ساتھ ہی خانہ جنگیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس پر مستزاد تاتاریوں اور ہسیو نگ نو اور تبت والوں کے حملے بھی تھے۔ ایک امن سوز لمبے جھگڑوں کے سلسلے کے بعد خانوادہ سوئی نے ۵۸۹ء تا ۶۱۲ء تیس سال کے قلیل عرصہ کے لیے ملک میں وحدت اور امن قائم کیا مگر ہجرت نبوی سے دو سال پہلے ہی اس حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ پھر ٹانگ خانوادہ کے ہاتھ میں زمام حکومت آئی تو ملک کی حالت بہتر ہوتی۔

سیاسی ابتری کے ساتھ ملک کے قومی مذہب کنفیوشس کی بھی اصلی صورت بگڑ چکی تھی۔ یہ مذہب کئی ایک بے معنی اور مردہ رسموں، ریتوں اور قربانیوں کا طومار بن گیا۔ اس کے علاوہ مذہب کنفیوشس میں توہم پرستی نے ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ فالگیری اور دوسرے کئی وہمی طریقے آئندہ حادثات اور کسی مجوزہ طرز عمل کے بارے میں دیوتاؤں اور بزرگوں سے الہام اور ہدایت حاصل کرنے کے لیے مذہب کی لازمی قدر قرار دیے گئے، بزرگوں اور فطری ارواح کی پرستش مذہب کا جزو لاینفک بن گئی۔

ترکستان

سن عیسوی کی سات صدیوں تک یہاں کی حالت پر تاریکی کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ پھر ہن (Huns) تبت پر قابض ہو گئے۔ ان میں بھی نہ کوئی تمدن تھا، نہ کوئی ضابطہ حیات، ان کا مطمح نظر صرف لوٹ کھسوٹ اور خود غرضی تھی۔

حبشہ

حبشہ ایک بڑا علاقہ ہے۔ اس نے ایرانی حکومت سے یمن کا علاقہ ہتھیا لیا۔ ولادتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سال جب یہ شمالی عرب کی طرف بڑھے تو تباہ و برباد ہو گئے۔ عہد نبوی میں ان کی حکومت خانہ جنگیوں کی وجہ سے بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی۔

اس ملک کا شاہی مذہب عیسائیت تھا۔ جو ہر قسم کے مشرکانہ عقائد کا مرقع بن چکا تھا اور عیسائیت کی اصل روح ان مشرکانہ عقائد میں دب کر فنا ہو چکی تھی۔ قرآن مجید نے ان مشرکانہ عقائد کی جا بجا تردید کی ہے۔

عہدِ جاہلیت

ظہورِ اسلام سے پیشتر عربوں کی مذہبی، اخلاقی، تمدنی، اقتصادی اور سیاسی حالت

عرب کی اُس حالت کا نام، جو ظہور اسلام سے قبل تھی، قرآن مجید نے جاہلیت رکھا ہے کیونکہ انسانیت مردہ ہو چکی تھی۔ روحانیت معدوم ہو چکی تھی۔ علم ناپید تھا۔ ہر قسم کی برائی علی الاعلان کی جاتی تھی اور پھر اس کو فخریہ مجالس میں بیان کیا جاتا تھا۔

عرب کی مذہبی حالت

ابوالحسن علی بن حسین المسعودی نے اپنی کتاب ''مروج الذہب'' میں اہل عرب کے عقائد پر بحث کی ہے:

۱۔ وہ موحدین جو اللہ کو خالق مانتے تھے حشر نشر کے بھی قائل تھے اور ان کا اس امر پر ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے اطاعت گزار بندوں کو اجر عظیم دے گا۔ گناہگاروں کو سزا۔ قس بن ساعدہ الایادی اور بحیرا راہب جو قبیلہ عبدالقیس میں سے تھے۔ قرآن مجید نے بھی اس بات کا اقرار کیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ (لُقمٰن ۳۱:۲۵) اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے کہ خدا نے، تم کہو کہ خدا کا شکر ہے۔

آج کل عرب کے قدیم کتبات دریافت ہوئے ہیں، ان پر اللہ کا لفظ لکھا ہوا ہے۔ البتہ اللہ کی بجائے حلّہ لکھا ہوا ہے۔ چنانچہ مذاہب داخلاق کے انسائیکلوپیڈیا میں پروفیسر نولدیکی کا جو قول نقل کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے: ''اللہ جو صنعاء کے کتبوں میں ''حلّہ'' لکھا ہوا ہے نباتی اور دیگر قدیم باشندگان عرب شمالی کے نام کا ایک جزو تھا۔

ولیاسن نے عرب قدیم کے لٹریچر میں بہت سے عبارتیں نقل کی ہیں۔ جن میں اللہ کا لفظ بطور ایک معبود اعظم کے مستعمل ہوا ہے۔

۲۔ وہ جو اللہ کی خالقیت کا اقرار کرتے اور حدوث عالم کے بھی قائل تھے۔ روز جزا و سزا کو مانتے تھے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کا انکار کرتے اور بتوں کی پوجا بھی کرتے۔ بت پرستی کو رواج دینے والا عمرو بن لحی بن حارثہ تھا۔ اس نے لڑ کر جرہم کو مکہ سے نکال دیا تھا اور خود حرم کا متولی ہو گیا تھا۔ یاقوت حموی نے معجم البلدان (ذکر مکہ) میں تحریر کیا ہے کہ عرب میں عام بت پرستی کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ قبائل عرب حج کے لیے آتے، واپس جاتے ہوئے حرم کے پتھروں کو اٹھا لیتے تھے اور ان کو اصنام کعبہ کی صورت پر گھڑ کر ان کی پرستش کرتے تھے۔

بتوں کے متعلق ان کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ ہر قسم کی حاجت روائی کرتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مختلف کاموں کی انجام دہی مختلف بتوں کے سپرد کر رکھی ہے۔ جیسا کہ جب ابوجہل مسلمانوں سے پہلی لڑائی لڑنے کے لیے نکلا تو کعبہ میں گیا اور بتوں سے فتح کی دعا مانگی۔

دوسرا عقیدہ یہ تھا کہ ان کی عبادت سے خدا کا قرب حاصل ہوتا تھا، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: مَانَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر ۳۹:۳) ہم بتوں کی صرف اس وجہ سے عبادت کرتے ہیں کہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں۔ بتوں سے شگون بھی لیتے تھے۔ وہ اس طرح کہ بتوں کے سامنے فال کے تیر پڑے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک پر ''نعم'' یعنی ہاں اور ایک پر ''لا'' یعنی نہیں لکھا ہوا ہوتا تھا۔ جو کام کرنا چاہتے فال نکالتے۔ اگر ہاں کا تیر نکل آتا تو کام کرتے ورنہ باز رہتے۔

بت پرستی کے عقیدہ میں ایک یہ رسم بھی داخل تھی کہ بتوں کے نام پر جانوروں اور انسانوں کی قربانیاں دی جاتی تھیں۔

عرب بتوں کا حج اور ان کے پاس حلفیہ معاہدے بھی کرتے تھے۔

عرب میں ہر قبیلہ کا الگ الگ بت تھا جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔ خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو ساٹھ بت تھے۔[1] ان میں سے قرآن مجید میں چند ایک بتوں کے نام بتائے ہیں، وہ یہ ہیں: لات، عزیٰ، مناۃ، یغوث، یعوق، نسر، ود، سواع، بعل۔

۳۔ عرب میں بعض ایسے لوگ بھی تھے۔ جو خدا کے تو قائل تھے لیکن روز جزا و سزا کے منکر تھے۔ ان کے رد میں ارشاد الٰہی ہے: قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِىْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ (یٰسین ۳۶:۷۹) کہہ دو کہ (ہڈیوں کو) وہی دوبارہ زندہ کرے گا جس نے پہلی دفعہ پیدا کیا۔

۴۔ ایک گروہ وہ تھا جو الحاد اور دہریت کی ہر تاریک وادی میں بھٹکتا پھرتا تھا۔ ان کے الحاد کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

وَقَالُوْا مَاهِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيٰى وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (الجاثیہ ۴۵:۲۴) اور کہتے ہیں یہ کچھ نہیں مگر ہماری دنیا کی زندگی ہے ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور سوائے زمانہ کے ہمیں کوئی ہلاک نہیں کرتا اور انھیں اس کا کچھ علم نہیں وہ صرف ظن سے کام لیتے ہیں۔

۵۔ اسلام کے ظہور سے قبل عرب میں ستارہ پرستی بھی رائج تھی۔ ان میں سب سے اہم سورج اور چاند تھے۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے ان کی عبادت سے روکا، فرمایا:

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ (حم السجدہ ۴۱:۳۷) نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو۔

[1] صحیح بخاری باب فتح مکہ۔

اسی لیے قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى (نجم ۵۳:۴۹) اور وہی خدا شعریٰ کا رب ہے۔

۶۔ ملائکہ کی الوہیت: اہل عرب میں ایک گروہ تھا جو ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں تصور کرتا تھا۔ اس وجہ سے وہ ملائکہ کی پرستش کرتا تاکہ وہ اللہ تعالیٰ سے ان کی شفاعت کریں۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى (سورۃ نجم ۵۳:۲۷) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کے نام عورتوں کے رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے:

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ (النحل ۱۶:۵۷) اور وہ اللہ کے لیے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں وہ پاک ہے اور ان کے لیے ہے جو وہ چاہتے ہیں۔

ایک اور جگہ فرمایا: وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا (آل عمران ۳:۸۰) اور نہ یہ کہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب ٹھہراؤ۔

۷۔ جنات کی الوہیت: اہل عرب میں سے ایک گروہ جنوں کو بھی خدا کا عزیز اور مقرب تصور کرتا تھا، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (الصّٰفّٰت ۳۷:۱۵۸) اور اس کے اور جنوں کے درمیان ناطہ تجویز کرتے ہیں۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ (الانعام ۶:۱۰۰) اور انھوں نے اللہ کے لیے جن شریک بنا رکھے ہیں حالانکہ اس نے ان کو پیدا کیا ہے۔

بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ (سبا ۳۴:۴۱) بلکہ وہ جنوں کی عبادت کرتے تھے اور ان میں سے اکثر ان پر ایمان لانے والے تھے۔

قدیم مذاہب عرب

عرب میں اسلام سے پہلے مختلف مذاہب کے پیرو پائے جاتے تھے جن میں سے زیادہ ممتاز یہودی، عیسائی، صابی اور مجوسی اور حنفا تھے۔

یہودیت

اسلام سے قبل یہودیت بالکل بگڑ چکی تھی، اس میں ہر قسم کی برائیاں سرایت کر چکی تھیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ یہودی علماء نے اپنے منشاء کے مطابق احکام الٰہی کو بدل دیا اور اپنی تصنیفات اور اجتہادات کو کتاب الٰہی کا درجہ دیتے تھے۔ ارشاد الٰہی ہے:

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ (مائدہ ۵:۱۳) یعنی وہ الفاظ کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتے تھے۔

۲۔ جاہل اور اَن پڑھ سنے سنائے قصوں کو ہی روحِ مذہب سمجھتے تھے، ارشادِ الٰہی ہے:

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ اِلَّا اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (بقرہ ۲:۷۸) اور ان میں سے بعض اَن پڑھ ہیں جن کو تورات کا علم تک نہیں محض بناوٹی باتیں معلوم ہیں وہ صرف ان کے خیالات ہیں۔

۳۔ احکام خداوندی میں سے جو آسان اور ضرورت کے مطابق ہوتے ان پر عمل کر لیتے اور دوسرے احکام پس پشت ڈال دیتے ارشادِ الٰہی ہے:

نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (بقرہ ۲:۱۰۱) جن کو خدا کی کتاب دی گئی تھی ان میں سے ایک فریق اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈالتا ہے گویا وہ جانتا ہی نہیں۔

۴۔ ان کا یہ باطل وہم تھا کہ وہ خدا کے برگزیدہ ہیں اور قیامت کو ان کے گناہوں کی وجہ سے مواخذہ نہ ہوگا، ارشادِ الٰہی ہے: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ ۵:۱۸) ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے پیارے ہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (بقرہ ۲:۸۰) اور کہا کہ ہم کو نارِ جہنم ہرگز نہیں چھوئے گی لیکن چند روز۔

۵۔ یہود میں باہم آویزش اور مقاتلہ کا بازار گرم رہتا تھا، ناحق ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ پھر کوئی قید ہو جاتا تو اس کو فدیہ دے کر چھڑا بھی لیتے تھے، ارشادِ الٰہی ہے:

"پھر تم ہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے اور ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو اور ان کے خلاف گناہ اور ظلم سے مدد کرتے ہو اور اگر قید ہو کر تمھارے پاس آئیں تو فدیہ دے کر انھیں چھڑاتے ہو، حالانکہ ان کا نکالنا ہی تم پر حرام تھا، تو کیا تم کتاب کے بعض حکموں کو مانتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو۔" (البقرہ ۲:۸۵)

۶۔ طمع اور حرص میں حد سے بڑھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے ہر قسم کی برائی اور اخلاقی کمزوری میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اگر وہ کسی عرب سے لین دین کرتے تو کبھی بھی دیانت داری نہ برتتے۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کی اخلاقی کمزوری کو اس طرح بیان کیا ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَادُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا (آل عمران ۳:۷۵) اہل کتاب (یہود) میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کو ایک دینار ہی امانت رکھنے کے لیے دے دو تو وہ تم کو اس وقت تک واپس نہ دیں گے جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ رہو۔

۷۔ سودی کاروبار کرنے کی وجہ سے یہودی سنگ دل ہو گئے تھے اور کسی معصوم بچے کے زیور کو اتارنے کے لیے اس کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آتا ہے:
وَاَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَاَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ (النساء۴:۱۶۱) اور ان کے سود لینے کی وجہ سے حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور ان کے لوگوں کا مال ناحق کے ساتھ کھانے کی وجہ سے۔

۸۔ وہم پرست۔ تعویذ گنڈے کو سچ سمجھتے تھے۔ لبید اعصم وغیرہ مدینہ میں بہت سے عامل تھے جو کنگھیوں اور بالوں میں منتر پڑھ کر پھونکتے تھے۔[1]

۹۔ عیسائیوں کے نقش قدم پر چل کر یہود نے بھی عزیر کو خدا کا بیٹا بنا لیا تھا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ عُزَيۡرُ ابۡنُ اللّٰهِ (توبہ۹:۳۰) اور یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔

عیسائیت

عیسائیت میں غلط عقائد داخل ہو چکے تھے۔ ایک باطل عقیدہ تثلیث کا تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح القدس اور حضرت مریم کو خدا مانتے تھے۔ قرآن مجید نے الگ الگ آیات میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح القدس اور حضرت مریم کی الوہیت کی تردید کی ہے اور ایک آیت میں عقیدہ تثلیث کو رد کیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنۡ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (مائدہ۵:۷۳) وہ لوگ کافر ہوئے جو کہتے ہیں کہ خدا تین میں کا تیسرا ہے، حالانکہ ایک معبود کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔

دوسرا باطل عقیدہ کفارہ کا تھا۔ اس عقیدے کی رو سے خدا کے عدل کو اس موروثی گناہ کے فدیے میں خون کی قربانی درکار تھی۔ یہ قیمت یسوع مسیح علیہ السلام نے ادا کی، جس نے اپنا خون صلیب پر بہا کر اس موروثی گناہ کا فدیہ دیا۔

اب جو بھی کفارہ پر ایمان لاتا ہے اس کے تمام گناہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اٹھا لیتے ہیں۔ وہ گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔ اس عقیدہ نے عیسائیوں میں ہر قسم کی برائی کو رواج دیا، اور وہ بے باکی سے گناہوں کی وادی میں سرگردان پھرنے لگے۔

تیسرا باطل عقیدہ موروثی گناہ تھا۔ اس عقیدہ کے مطابق آدم آزمایا گیا اور اس نے پہلا گناہ کیا۔ آدم اپنے اس گناہ کے باعث خود ہی فضل ایزدی سے محروم نہ ہوا بلکہ تمام نسل آدم اور سب مرد اور عورتیں گناہ کے اس کلنک کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں جو موروثی ہے۔ وہ گناہ میں پیدا ہونے کے باعث غضب الٰہی اور ابدی سزا کے مستحق ہیں۔ گویا حضرت آدم علیہ السلام کے گناہ نے تمام نسل انسانی سے ملوث کر دیا ہے۔

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الطب باب السحر۔

صابئیت

صابئین کا اصل مولد بابل تھا۔ متواتر سیاسی انقلابات کی وجہ سے ان میں یہودیت، مجوسیت اور عیسائیت کے اجزاء شامل ہو گئے تھے۔ ایک خدا پر اعتقاد رکھتے تھے۔ ستاروں اور بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ ستاروں کی ارواح کو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان وسیلہ سمجھتے تھے۔ تین وقت ستاروں کی پرستش کرتے تھے۔ صبح کو تا طلوع آفتاب، دوپہر کو زوال کے وقت تک اور شام کو غروب آفتاب تک۔ ان کے مذہبی عقائد بنی اسرائیل کے بالکل ضد تھے۔ تورات کے تمام انبیاء کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر آخر تک سب کو مفتری اور کاذب سمجھتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابل فرعون کو اچھا سمجھتے تھے اور اس کو اپنا پیشوا جانتے تھے۔ اسی زمانہ کا مذہب صحیح خیال کرتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جو مصری فرعون کے ساتھ ڈوبنے سے بچ گئے تھے وہ قطب شمالی کی جنت میں آرام کر رہے ہیں۔

مجوسیت

ایران کا قدیم مذہب ہے جس کا بانی زرتشت ہے۔ مجوس یزدان اور اہرمن دو خداؤں کے قائل تھے۔

یزدان خیر کا اور اہرمن شر کا خدا تصور کرتے تھے۔ اسی طرح یزدان کو نور اور اہرمن کو ظلمت سے بھی تعبیر کرتے تھے۔ قرآن مجید میں ان کے اعتقاد کو بھی رد کیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (النحل ۱۶:۵۱) یعنی خدا نے فرمایا کہ دو خدا نہ بناؤ وہ تو ایک ہی خدا ہے۔

حنیفیت

قرآن مجید کی رو سے حنیف کے معنی اوّل، خدا پرست اور دین دار کے ہیں، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: حَنِيْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (انعام ۶:۱۶۱) میں خدا پرست ہوں اور مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ (حج ۲۲:۳۱) وہ اللہ کے پرستار ہیں اور مشرک نہیں ہیں۔

ان آیات میں حنیف کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی شرک کی بھی نفی کی گئی ہے۔

دراصل حنفیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہی مذہب تھا، جس میں خالص توحید پائی جاتی تھی۔ اسی مذہب پر تمام انبیاء علیہم السلام آئے اور سب کی یہی دعوت ہوتی تھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل عرب میں ایک تحریک شرک سے بیزاری کی اٹھی تھی۔ وہ لوگ اپنے آپ کو حنیف کہتے تھے۔ وہ صرف ایک خدا کے پرستار تھے۔ ان کو نہ نصرانیت سے تعلق تھا

اور نہ یہودیت سے۔ ان میں سے مشہور زید بن عمرو بن نفیل اور امیہ بن ابی الصلت تھے۔ تاریخ سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی اشخاص تھے مثلاً قس بن ساعدہ، عثمان بن حویرث، قیس۔

ورقہ بن نوفل آغوش حنفیت میں جانے کے بعد آغوش نصرانیت میں چلے گئے تھے۔ اس تحریک کا صرف یہ مقصد تھا کہ بت پرستی کی جگہ توحید کو فروغ دیا جائے۔ لیکن اس تحریک سے عرب کی مشرکانہ فضاء میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوا۔

عرب کی اخلاقی حالت

عربوں کے گندے خصائل اور اعمال کی ایک لمبی فہرست ہے، جن کو بیان کرنا طوالت سے کام لینا ہے۔ صرف چند ایک بیان کیے جاتے ہیں:

بادہ نوشی

بادہ نوشی جو اُم الخبائث ہے عربوں میں اس قدر عام تھی کہ ہر گھر مے کدہ بنا ہوا تھا۔ دوست و احباب ایک دوسرے کے گھروں میں جمع ہوتے، شراب پیتے، جوا کھیلتے۔ صاحب خانہ بے جا فیاضی میں اپنے اونٹوں کو نحر کرتا۔ لوگ گوشت کھاتے، مغنیہ گاتیں بجاتیں، شعراء اپنی بادہ نوشی کا ذکر اپنے قصائد میں فخریہ بیان کرتے۔ عربی زبان میں شراب کے سو سے زیادہ نام تھے۔ علامہ مجدالدین فروز آبادی نے ان ناموں پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔

قمار بازی

عرب جاہلیت میں قمار بازی کا بہت رواج تھا۔ قمار بازی کی کئی صورتیں تھیں۔ زیادہ تر جوا ازلام کے ذریعہ ہوتا تھا۔ ان کی تعداد دس تھی۔ ہر ایک تیر کا نام جدا جدا تھا۔ اور ان کے الگ الگ حصے مقرر تھے۔

ایک طریقہ قمار بازی کا یہ تھا کہ تھوڑی سی ریت جمع کر کے کوئی چیز اس میں چھپا دیتے۔ اس کے بعد اس ریت کی دو ڈھیریاں بنا دیتے اور دریافت کرتے کہ بتاؤ پوشیدہ چیز کس ڈھیری میں ہے۔ جو شخص بتا دیتا وہ جیت جاتا، جو غلط بتاتا وہ ہار جاتا۔

جوئے کا ایک طریقہ جس کو رہان کہتے تھے عرب میں رائج تھا۔ کسی شرط پر بازی لگاتے۔ جب وہ شرط پوری نہ ہوتی تو جس چیز پر بازی لگائی ہوتی تھی، وہ دوسرا جیت جاتا۔ جو لوگ قمار بازی کی مجلسوں میں شریک نہیں ہوتے تھے ان کو بخیل تصور کیا جاتا تھا۔ وہ سوسائٹی کی نظر میں گرے ہوئے انسان ہوتے تھے۔ ان سے عورتیں شادی وغیرہ نہیں کرتی تھیں۔ ان کو ''برم'' کا خطاب دیا جاتا تھا۔

• زنا

قوموں اور ملکوں کی تباہی و بربادی اور تنزل کے گڑھے میں دھکیلے جانے کا سب سے بڑا سبب زنا اور فواحشی ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جو اقوام قعرِ مذلت میں گری ہیں ان سب میں زنا کا مرض بہت عام تھا۔ عرب کے لوگ اس مرض خبیثہ سے نہیں بچے تھے۔

شعراء فخریہ اپنے قصائد میں زنا کے واقعات بیان کرتے تھے۔ وہ قصائد بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کی زبان پر جاری رہتے۔ امرء القیس عرب کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ وہ اپنی عم زاد بہن عنیزہ پر عاشق تھا۔ اس نے اپنے مشہور قصیدہ لامیہ میں عنیزہ اور دوسری عورتوں کے ساتھ جو افعال شنیعہ اور بے حیائیاں کیں بیان کرتا ہے۔

فاحشہ عورتیں گھروں کے سامنے جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں[1] وہ صاحب الرایات کہلاتی تھیں۔ رؤساء عرب کے گھروں میں لونڈیاں ہوتی تھیں، وہ ان سے پیشہ کرواتے۔ عبداللہ بن ابی رئیس مدینہ کی دو لونڈیاں تھیں، وہ ان سے بدکاری کرواتا اور ان کی کمائی کھاتا۔

عرب میں نکاح کی بعض ایسی صورتیں تھیں جو دراصل زنا ہی تھا۔ صحیح بخاری کتاب النکاح میں یہ صورتیں ہیں۔

ایک صورت یہ تھی کسی بہادر کے پاس اپنی عورت کو بھیج دیتا تھا اور کہتا تھا کہ اس سے ہمبستر ہو۔ بچہ پیدا ہوتا تو سمجھتے تھے کہ اس میں بھی وہی اوصاف آ جائیں گے جس کا یہ نطفہ ہے۔

نکاح کی دوسری صورت یہ تھی کہ چند آدمی ایک وقت میں ایک عورت کے پاس جاتے۔ سب اس سے باری باری ہم بستر ہوتے۔ جب وہ حاملہ ہو جاتی اور بچہ جنتی تو سب کو کہلوا بھیجتی اور کسی ایک سے کہتی کہ یہ بچہ تمہارا ہے اور اس کو قبول کرنا پڑتا۔ پھر وہ اس کا بیٹا خیال کیا جاتا۔

تیسرا طریقہ یہ ہوتا کہ جب کسی فاحشہ عورت کے بطن سے کوئی لڑکا پیدا ہوتا تو وہ قیافہ شناس کو بلوا بھیجتی۔ وہ شکل دیکھ کر بتاتا کہ یہ لڑکا فلاں شخص کا ہے۔ پھر وہ فاحشہ عورت اس مرد کو کہلوا بھیجتی اور اس کو کہتی کہ یہ تیرا لڑکا ہے، تو اس کو قبول کرنا پڑتا۔

ایک قسم عارضی نکاح کی تھی۔ اس نکاح کی صورت یہ ہوتی تھی کہ کوئی مرد کسی عورت سے مقررہ مدت کے لیے نکاح کر لیتا۔ اس مدت کے گزرنے کے بعد اس کی اُجرت دے دیتا۔ پھر اس کو الگ کر دیتا اس کو متعہ کہتے تھے۔

1۔ صحیح بخاری کتاب النکاح جلد ۲ ص ۷۶۹۔

سود خوری

ملک عرب میں سود خوری کا عام رواج تھا۔ تمام صاحب ثروت سود پر لین دین کرتے تھے۔ طائف ایک زرخیز علاقہ تھا۔ اس وجہ سے وہاں کے لوگ بہت امیر تھے، وہ بہت زیادہ سودی کاروبار کرتے تھے۔

غارت گری

عرب میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک حضری اور دوسرے بدوی۔ بدوی تو رہزنی اور غارت گری میں بہت مشاق تھے اور انھوں نے رہزنی کو اپنا ذریعہ معاش بنا رکھا تھا۔ بعض قبائل غارت گری کی وجہ سے بہت مشہور تھے اور ان میں سے قبیلہ طے عام طور پر اس وجہ سے مشہور و معروف تھا۔

اس قسم کے لوگوں کو لصوص یا ذوبان العرب (عرب کے بھیڑیے) کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ مسافروں اور قافلوں کو لوٹتے تھے۔

چوری

عربوں میں چوری کا عام رواج تھا۔ لیکن بعض قبائل کے نوجوان چوری کرنے میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سے سلیک بن السلکہ اور تابط شرا خاص شہرت کے مالک تھے۔ چوری کا مرض صرف بدوی قبائل میں ہی نہ تھا بلکہ قریش جو تجارت اور خانہ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے خاصے متمول تھے۔ ان میں بھی یہ مرض تھا۔ چنانچہ کلبی نے متعدد ممتاز قریشیوں کے نام بتائے ہیں۔ جنھوں نے خانہ کعبہ کے تحفوں اور نذرانوں کے خزانے سے چوری کی تھی۔ ان میں سے خاص طور پر ابولہب کا نام لیا جاتا ہے۔

چوری کی عادت عربوں میں اس قدر عام ہو چکی تھی کہ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب مرد اور عورتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیعت کرنے کے لیے آئی تھیں تو آپ دوسری باتوں کے ساتھ یہ عہد بھی لیتے تھے کہ آئندہ چوری نہ کریں گے۔

جنگ جوئی

عرب میں ہر وقت جنگ و قتال کا بازار گرم رہتا۔ بہت ہی معمولی بات پر لڑائی برسوں جاری رہتی۔ کئی کئی نسلیں تباہ ہو جاتیں۔ ہر خاندان دوسرے خاندان سے برسرِ پیکار رہتا۔ اگر کسی خاندان کا آدمی قتل ہو جاتا تو مقتول کے بیٹے اور رشتے دار قاتل سے انتقام لینے کے درپے رہتے۔ جونہی موقع پایا قاتل کو تلوار کی ضرب سے ابدی نیند سلا دیا۔ اس طرح ایک لڑائی کا سلسلہ غیر متناہی ہو جاتا۔ ان لڑائیوں کو مورخین ایام العرب کے نام سے پکارتے ہیں جن کی تعداد حد سے تجاوز کر گئی ہے۔ دو لڑائیاں خاص طور پر مشہور ہیں:

۱۔ لڑائی عبس و ذبیان ۲۔ حرب بسوس

عشق بازی

عربوں میں عشق کا مرض بہت بڑھ گیا تھا۔ جو آدمی عشق نہیں کرتا تھا وہ سوسائٹی میں ذلیل خیال کیا جاتا تھا۔ اپنے عشق کو فخریہ بیان کرتے۔ شعراء اپنے عشق کے واقعات بڑے بڑے میلوں میں سناتے۔ امرء القیس نے اپنے قصیدہ میں اپنی چچازاد بہن کے ساتھ عشق و وصال کا واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ قصیدہ اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بلند ترین شمار کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے اس کو خانہ کعبہ میں آویزاں کیا گیا۔

تکبر

تکبر وہ وصف ہے جس سے تمام برائیوں اور مظالم کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ اس مرض میں عرب کے لوگ بری طرح سے مبتلا تھے۔ بعض آدمیوں یا قبائل کا تکبر ضرب المثل بن گیا تھا۔ جذیمہ ابرش کے تکبر کی یہ حالت تھی کہ وہ کسی کو اپنا ہم نشین نہیں بناتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ فرقدین کے ستارے ہی اس کے ہم مجلس اور ہم صحبت ہو سکتے ہیں۔ بنی مخزوم تکبر کی وجہ سے بہت شہرت کے مالک تھے۔

بے شرمی و بے حیائی

جس ملک میں زنا کی کثرت ہو وہاں شرم و حیا کا وجود مفقود ہو جاتا ہے۔ عرب میں بے شرمی اور بے حیائی کی کوئی حد ہی نہیں تھی۔

بیت اللہ کا حج کرنے کے لیے لاکھوں آدمی جمع ہوتے تھے۔ سوائے قریش کے سب ننگے ہو کر کعبہ طواف کرتے۔ اسی طرح عورتیں بھی ننگا طواف کرتیں۔

نہانے اور حاجت کے وقت پردہ نہیں کرتے تھے۔ مجلسوں میں اپنی بیویوں سے ہم بستری کے واقعات لطف لے لے کر بیان کرتے۔

سفاکی و ظلم

شب و روز کی لڑائیوں نے اہل عرب میں درندگی اور بربریت پیدا کر دی تھی۔ لڑائیوں میں عورتیں قیدی ہوتیں۔ اگر وہ حاملہ ہوتیں تو ان کے پیٹ چاک کر دیتے۔ مقتولوں کے ناک کاٹ لیتے اور عورتیں ان کا ہار بنا کر پہنتیں۔

سزا دینے کے بھی عجیب و غریب سنگ دلانہ طریقے تھے۔ مجرم کو دو اونٹوں سے باندھ دیتے، پھر ان کو مخالف سمتوں میں چلاتے تو مجرم کا بدن چر جاتا۔ اسی طرح دو درختوں کی ٹہنیاں جھکا کر باندھ دیتے، پھر ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے تو مجرم کا جسم چر جاتا۔ کبھی کبھی گھوڑے کی دُم سے باندھ دیتے اور سرپٹ دوڑا دیتے تو آدمی کے جسم کے ٹکڑے ہو جاتے۔ کبھی آدمی کو کسی تاریک کوٹھڑی میں قید کر کے کھانا پینا بند کر دیتے، وہ بیچارہ

تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا۔

زندہ جانوروں کو درخت کے ساتھ باندھتے اور اس پر نشانہ کی مشق کرتے۔ زندہ اونٹ اور دنبوں کی کوہان اور چکیاں کاٹ لیتے اور کباب بناتے۔

اخلاق حمیدہ

اہل عرب میں سخاوت، مہمان نوازی، وفائے عہد، شجاعت نمایاں ترین اوصاف حمیدہ تھے۔

تمدنی حالت

تہذیب و تمدن کے لحاظ سے عرب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ حصہ جہاں کسی زمانہ میں تہذیب و تمدن انتہائی درجہ تک ترقی کر چکا تھا۔ مثلاً یمن میں کسی زمانہ میں تہذیب و تمدن اوج کمال پر پہنچ چکا تھا یورپ کے محققین آثار قدیمہ جنھوں نے یمن کے آثار قدیمہ کی تحقیقات کی ہے اور پرانے کتبے پڑھے ہیں، وہ یمن کی تہذیب و تمدن کا اعتراف کرتے ہیں۔

اس کے برعکس عرب کے اندرونی حصہ میں تہذیب و تمدن کا نام و نشان نہ تھا۔ اندرونی حصوں میں تقسیم آبادی کے لحاظ سے عرب دو حصوں میں منقسم تھا۔ حضری اور بدوی۔

چونکہ حضری ایک جگہ پر سکونت اختیار کرتے تھے اس وجہ سے ان کا ایک خاص تمدن تھا۔ ان میں مدنیت کا رنگ پایا جاتا تھا۔ مگر بدوی لوگوں کی زندگی خانہ بدوشوں کی سی تھی۔ ان کا کوئی مستقل ٹھکانا نہ ہوتا تھا۔ جہاں اپنے مویشیوں کے لیے گھاس پانی پایا، وہیں خیمے نصب کر لیے۔ جب گھاس ختم ہوا تو وہاں سے اپنا اثاثہ اونٹوں پر لاد کر اور کسی مقام پر جا ڈیرا لگایا۔

اندرونی حصے میں تہذیب و تمدن نہ پایا جانے کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ عربی ایک نہایت وسیع زبان ہے۔ لیکن عربی زبان میں ان چیزوں کے نام ہی نہیں جن کا تمدن سے تعلق ہے بلکہ اہل عرب نے ان چیزوں کے نام ایران اور روم سے مستعار لیے ہیں۔ سکہ کے لیے کوئی نام نہیں۔ درہم اور دینار دونوں غیر زبان کے الفاظ ہیں۔ کوزہ کے لیے کوئی لفظ نہیں، کوزہ کو کوز بنا لیا۔ جب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے نام عربی زبان میں نہیں ہیں تو بڑی بڑی اشیاء جن سے تہذیب و تمدن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہاں سے لفظ آتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اندرونی حصہ میں کچھ معمولی تہذیب و تمدن کا نشان پایا جاتا تھا تو وہ بیرونی مہذب ممالک کے اثرات تھے۔

احادیث سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ تک عیش و نعمت کے سامان بہت کم تھے۔ نہ گھروں میں چراغ جلتے تھے اور نہ چھلنیاں ہوتی تھیں، نہ کوئی اور سامان عیش۔ طرز زندگی کے لحاظ سے اہل عرب کی خوراک، لباس عام بود و باش نہایت سادہ تھی۔ عام خوراک عربوں کی اونٹوں

اور بکریوں کا گوشت، دودھ، کھجور اور جو کے ستو تھی۔ لباس کی سادگی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ عام لوگوں کے پاس ایک چادر سے زائد کپڑا نہ ہوتا تھا۔ قمیض خاص خاص لوگ پہنتے تھے۔ گھروں میں لوگ چٹائیوں پر سوتے تھے، ہاں دولت مند لکڑی کے تخت استعمال کرتے تھے۔

اقتصادی حالت

ملک عرب کی اقتصادیات اور معاشیات کا تمامتر دارو مدار زراعت، تجارت اور مویشیوں پر تھا۔ ملک کا زیادہ حصہ غیر آباد اور ریگستان ہے اس لیے وہاں زراعت سے زیادہ تجارت کو فروغ تھا۔ اس کے آباد حصے ملک کے تین طرف بحری سواحل پر واقع ہیں۔ مغرب کی طرف بحرین اور عمان خلیج فارس پر، شمال میں حضرموت اور یمن بحر عرب پر اور مشرق میں حجاز اور مدین بحر احمر پر واقع ہیں۔ اس جغرافیائی تحدید سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عرب کے ساحلی صوبے دنیا کے بڑے بڑے ممالک کے آمنے سامنے واقع ہیں۔

عمان اور بحرین ایران اور عراق سے تعلق رکھتے ہیں۔ یمن اور حضرموت افریقہ اور ہندوستان کے سامنے واقع ہیں۔ حجاز مصر کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔

برآمد سامان تجارت

عرب تاجر اپنے ملک سے عموماً تین چیزیں باہر لے جاتے تھے:

۱۔ کھانے کا مسالہ اور خوشبودار اشیاء۔

۲۔ سونا، جواہرات اور لوہا۔

۳۔ چمڑا، کھالیں، زمین پوش، بھیڑ بکری۔

درآمد

عرب کے تجار غیر ملکوں سے حسب ذیل چیزیں لاتے تھے۔

کپڑا، غلہ، شراب، ہتھیار، آئینہ اور سامان آرائش۔

عرب کے تجارتی میلے

عرب میں مختلف جگہوں پر تجارتی بازار لگتے تھے۔ وہاں خرید و فروخت کا بازار گرم رہتا۔ عکاظ اور ذوالمجاز کے مشہور تجارتی میلے ہیں۔

زراعت

عرب میں زراعت کا پیشہ بہت ہی کم تھا۔ عرب کے وہ مقامات جو سواحل بحر پر واقع ہیں عموماً

سرسبز اور زرخیز ہیں۔ خصوصاً یمن کا صوبہ جو بحر ہند اور بحر احمر کے ساحل پر واقع ہے نہایت زرخیز تھا۔ اس کے علاوہ یمامہ، نجد اور یثرب و خیبر کے علاقے زرخیز تھے۔ یہاں کاشتکاری ہوتی تھی۔

حیوانات

حیوانات کے لحاظ سے بھی عرب بہترین ملک ہے۔ عرب کے گھوڑے خوبصورتی اور تیز رفتاری کی وجہ سے مشہور ہیں۔ گھوڑوں کے علاوہ اونٹ، بھیڑ بکریاں عرب میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ بھیڑ بکری اور اونٹ کے بالوں سے کمبل اور کپڑے بنائے جاتے ہیں اور ان کا گوشت کھانے میں استعمال کرتے ہیں۔

سیاسی حالت

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے وقت عرب میں کوئی مرکزی حکومت نہ تھی۔ تمام عرب قبائل میں بٹا ہوا تھا۔ ان قبائل کی باہمی شیرازہ بندی نسب اور اتحاد خون کے رابطہ سے ہوتی تھی۔

قبیلہ کی حکومت جمہوری طرز پر ہوتی تھی۔ ہر قبیلہ کا رئیس اعلیٰ اہل قبیلہ میں سے ہوتا۔ جمہوری اصول کے مطابق وہی شخص منصب سیادت کا اہل ہوتا تھا جس کے حامی سب سے زیادہ ہوں اور وہ شجاعت، مہمان نوازی، فیاضی وغیرہ میں ممتاز حیثیت رکھتا ہو۔

قبیلہ کا رئیس اعلیٰ کنبوں کے دوسرے سرداروں کو جمع کرتا، جن سے شیخ القبیلہ کی قسم کی کمیٹی تشکیل پاتی تھی۔ اس میں جنگ و صلح یا دوسرے اہم امور کے متعلق گفتگو ہوتی۔ قبیلہ کا کوئی خاص قانون نہیں ہوتا تھا بلکہ حکومت کی بنیاد موروثی روایات پر مبنی ہوتی اور انہی کے مطابق فیصلے کیے جاتے تھے۔

عرب میں مرکزی حکومت کے فقدان کی وجہ سے نہ کوئی محکمہ عدلیہ تھا نہ نظم امن قائم رکھنے کے لیے محکمہ پولیس تھا اور نہ خارجی خطرات کے دفاع کے لیے فوجی نظام تھا۔ نہ ان کے پاس اپنا سکہ یا ٹکسال تھی۔

عرب میں صوبہ حجاز اور اس کی امارت کو خاص اہمیت حاصل تھی کیونکہ اس صوبہ میں مکہ کا مقدس شہر آباد تھا۔ اس شہر میں بیت اللہ تھا۔ جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پرانی بنیادوں پر از سرِ نو تعمیر کیا تھا۔ سب سے پہلے اس گھر کے متولی حضرت اسماعیل علیہ السلام ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے لڑکے نابت بیت اللہ کے متولی بنے۔ آخر یہ تولیت ان کے خاندان میں منتقل ہوتی رہی اور ہوتے ہوتے فہر تک پہنچی۔ اس کا لقب قریش تھا، اس نسبت سے اس کی نسل قریشی کہلائی ہے۔

اس کی پانچویں پشت میں قصی پیدا ہوا۔ اس وقت حرم کی تولیت پر بنو خزاعہ کا قبضہ تھا۔ قصی نے بنو کنانہ کی مدد سے بنو خزاعہ سے حرم کا قبضہ لے لیا، اور تمام قریش کو مکہ میں آباد کیا۔ ان کی تنظیم کر کے ایک چھوٹی سی ریاست کی بنیاد ڈالی۔ اس دن سے قریش کو حجاز میں سیاسی اور اجتماعی اہمیت حاصل ہو گئی۔

قصی نے اس ریاست کی بنیاد جمہوری طرز پر رکھی۔ اس کے کئی شعبہ جات تھے جو مختلف قبائل

میں تقسیم تھے، بڑے تین تھے، فوجی، عدالتی، مذہبی۔ پھر یہ تینوں شعبے کئی شعبوں میں تقسیم تھے، جو قریش کی مختلف شاخوں میں منقسم تھے۔ اسلام سے قبل ان کی تقسیم حسب ذیل تھی۔

۱۔	عقاب کا عہدہ	بنی امیہ میں۔
۲۔	قبہ اور اعنہ کا	بنی مخزوم میں۔
۳۔	سفارت	بنی عدی میں۔
۴۔	ندوہ	بنی عبدالدار میں۔
۵۔	مشورہ	بنی اسد میں۔
۶۔	اشناق	بنی تمیم میں۔
۷۔	حکومت	بنی سہم میں۔
۸۔	سقایہ اور ثارہ	بنی ہاشم میں۔
۹۔	رفادہ	بنی نوفل میں۔
۱۰۔	سدانہ	بنی عبددار میں۔
۱۱۔	ایسار	بنی جمح میں۔
۱۲۔	اموال المحجرہ	بنی سہم میں۔

عرب کی حکومتیں

قبائلی نظام کے علاوہ بعض حکومتوں کے قیام کا بھی پتہ چلتا ہے، ان میں سے اکثر دوسری بڑی حکومتوں کے ماتحت تھیں اور انھیں خراج ادا کرتی تھیں۔ وہ حکومتیں یہ ہیں۔

۱۔ ملوک حیرہ۔
۲۔ ملوک شام۔
۳۔ ملوک یمن۔
۴۔ ناجی حکومت۔

معاشرتی حالات

جس ملک میں نہ مذہبی حالت اچھی ہو، نہ اخلاقی، نہ تمدنی تو اس ملک میں معاشرت کا درخت کیسے سرسبز ہو سکتا ہے۔ عرب میں معاشرت کا پہلو بھی بہت تاریک تھا۔ جیسا کہ زنا کے عنوان کے تحت عورت کی حالت بیان کی گئی ہے کہ وہ کس حد تک ذلیل اور محکوم سمجھی جاتی تھی یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ جس گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تھی اس کو سخت رنج ہوتا اور شرم کے مارے گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ دختر کشی کی رسم جاری

ہوگئی۔ ایک صاحب نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کہا کہ انھوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کی ہیں۔ بعض اوقات نکاح کے وقت ہی یہ معاہدہ کرلیا جاتا تھا کہ جولڑکی پیدا ہوگی اسے مار دیا جائے گا۔

عورت وراثت میں حصہ دار نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ وہ شوہر کے وارثوں کی مِلک تصور کی جاتی تھی۔ کسی قوم اور ملک کی ترقی میں عورت کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے کیونکہ پہلے اسی کی گود سے بچے نے عزت نفس، ذہنی بلند پردازی اور خدمت قوم کا سبق لینا ہوتا ہے۔ جب معاشرہ میں عورت کو ہی یہ ذلت آمیز درجہ دیا جائے گا تو اس نے اپنے بچہ کی کیا پرداخت کرنا ہے؟ عرب کے جاہلی معاشرہ میں نہ ہمسائیگی کے حقوق کا خیال رکھا جاتا تھا۔ نہ غریب بیکس یتیم کے حقوق کی حفاظت ہوتی تھی۔ غلامی کا عام رواج تھا۔

مکی زندگی

خاندان حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

خاندان نبوی

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ خدا کے حکم کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ہاجرہ کو وادی غیر ذی زرع (جہاں اب مکہ آباد ہے) میں چھوڑ آئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بیت اللہ تعمیر تھا۔ لیکن حوادثات زمانہ کی وجہ سے منہدم ہو چکا تھا۔ اب خدا تعالیٰ کی مشیت نے چاہا کہ اس گھر کو دوبارہ تعمیر کیا جائے۔ اس وادی غیر ذی زرع میں قدرت خداوندی سے چشمہ پھوٹ پڑا تھا اور سب سے پہلے قبیلہ بنوجرہم اس کے جوار میں آباد ہوا۔

جب حضرت اسماعیل علیہ السلام سن بلوغت کو پہنچے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام دوبارہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاس آئے اور دونوں باپ بیٹے نے فرمانِ خداوندی کے تحت بیت اللہ کو از سرِ نو تعمیر کیا جس کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ (بقرہ ۲: ۱۲۷) اور جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بنوجرہم کی ایک لڑکی سے شادی کر لی۔ آپ کی بارہ اولادیں ہوئیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے قیدار بہت نامور ہوا۔ اس کی اولاد مکہ میں آباد ہوئی اور بیت التوحید کے حقوق کی نگہداشت کی۔

قیدار کی اولاد میں عدنان اول ایک اولوالعزم اور صاحب ہمت شخص گزرا ہے۔ اس نے اپنے مقدس باپ کے مقدس ورثہ کی پوری حفاظت کی۔

بنوجرہم کا غلبہ

عدنان کی وفات کے بعد قبیلہ بنوجرہم غالب آ گیا اور کعبہ کی تولیت بنواسماعیل سے نکل کر جرہم کے خاندان میں آ گئی۔ مدت تک یہ قبیلہ صاحب اقتدار اور جاہ وحشمت کا مالک رہا۔ بنواسماعیل نے اپنے آبائی ورثہ کے حصول کی سعی نہ کی۔

بیت اللہ کی دوبارہ تولیت

قصی نے جو عدنان دوم سے پندرھویں پشت میں ہے، اپنا آبائی ورثہ حاصل کر لیا اور مکہ پر قبضہ کر

لیا اور ایک مشترکہ حکومت کی بنیاد ڈالی اور مندرجہ ذیل عہدے قائم کیے۔

(۱) حجابت کعبہ (۲) سقایت (۳) رفادت (۴) صدارت (۵) لواء (۶) قیادت۔

قصی نے مرتے وقت کلید کعبہ کے ساتھ تمام اعزازات عبدالدار کو تفویض کر دیے۔ گو وہ اپنے بھائیوں میں سب سے نااہل تھا، لیکن کچھ نہ کچھ فرائض سرانجام دیتا رہا۔

بنوعبدالدار اور بنوعبد مناف میں اختلاف

عبدالدار کے بعد اس کے فرزند اور عبد مناف کے بیٹوں میں مناقشت پیدا ہوگئی۔ عبدالدار کے بیٹے سے کعبہ کی کلید لینے پر اصرار کیا گیا۔ اس مناقشہ پر قریش کے دو گروہ ہو گئے۔ لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی چند آدمیوں کی مداخلت کی سے مصالحت ہوگئی۔ عبد مناف کو سقایت اور رفادت کے اعزازات اور بنوعبدالدار کو کلید برداری، عَلَم اور ندوہ کی صدارت کے فرائض سونپے گئے۔

ابنائے عبد مناف میں سے ہاشم سب سے بڑے تھے، اس نے مکہ کی تجارت کو فروغ دینے کے لیے قیصر روم، حبشہ کے بادشاہ نجاشی، تاجداران یمن اور فارس سے باہمی امن و سلامتی کے معاہدے کیے اور یہ بھی معاہدہ کیا کہ اگر قریش ان ممالک میں سامان تجارت لے کر آئیں تو ان سے کوئی ٹیکس نہ لیا جائے۔ اس طرح مکہ کی تجارت کا سورج نصف النہار تک پہنچ گیا۔

ہاشم کی وفات کے بعد تمام مناصب اور اعزازات مطلب کو تفویض ہوئے۔ وہ اپنی سخاوت اور دریا دلی کی وجہ سے عرب میں ''الفیض'' کے نام سے مشہور تھے۔

جب مطلب فوت ہوئے تو تمام مناصب اور فرائض قومی عبدالمطلب کو تفویض ہوئے۔ عبدالمطلب کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ چاہ زمزم ایک مدت سے اَٹ کر گم ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے زائرین کعبہ کو پانی کی فراہمی کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ عبدالمطلب نے جگہ کا پتہ لگا کر چاہ زمزم کو نئے سرے سے کھدوا کر درست کروایا۔

عبدالمطلب کے دس لڑکے تھے۔ ان میں سے حضرت عبداللہ کی شادی قبیلہ زہرہ کے سردار وہب بن عبد مناف کی صاحبزادی حضرت آمنہ سے ہوئی۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد سفر شام سے واپسی پر مدینہ میں حضرت عبداللہ وفات پا گئے۔

ولادت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وطلوع آفتاب اسلام

ظہور قدسی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت موسم بہار میں دوشنبہ کے دن ۹ ربیع الاوّل ۲۰ اپریل ۵۷۱ء میں ہوئی۔ دادا نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام محمد اور والدہ نے احمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

نام رکھا۔ دونوں ناموں کا ذکر قرآن مجید اور احادیث میں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسم بامسمی تھے۔ اخلاق اور کمالات کی وجہ سے دنیا میں سب سے زیادہ تعریف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کی گئی ہے، اس وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہلائے۔ اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ حمد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے جاری ہوئی، پس اس وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہلائے۔

رضاعت اور ایام طفولیت

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ نے دو تین روز دودھ پلایا۔ اس کے بعد ابولہب کی لونڈی ثویبہ نے دودھ پلایا۔ پھر حضرت حلیمہ نے دودھ پلایا۔ اس زمانہ میں عربوں میں یہ دستور تھا کہ شہر کے روساء اور شرفاء اپنے بچوں کو دودھ پلانے کے لیے دیہات اور قصبات میں بھیج دیا کرتے تھے تاکہ جسمانی لحاظ سے صحت مند اور زبان کے لحاظ سے فصیح ہو جائیں۔

دستور مذکور کی بناء پر سال میں دو دفعہ عورتیں شہر میں آتیں اور بچوں کو لے جایا کرتی تھیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش سے چند دن قبل ہوازن قبیلہ کی عورتیں مکہ آئیں۔ ان میں حضرت حلیمہ سعدیہ بھی تھیں۔ بی بی آمنہ نے اپنے لخت جگر کو حلیمہ کے سپرد کر دیا۔ ہر چھٹے ماہ مکہ لا کر ان کی والدہ کو دکھا جاتی تھیں۔ دو سال کے بعد دودھ چھڑا دیا اور حضرت حلیمہ مائی آمنہ کے پاس لائیں چونکہ ان ایام میں وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی والدہ ماجدہ نے حضرت حلیمہ کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ جب چار سال کے ہوئے تو دوبارہ حضرت حلیمہ مکہ لائیں تو والدہ مکرمہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے پاس رکھ لیا[1]

والدہ کا انتقال

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر جب چھ برس ہوئی تو آپ کی والدہ ماجدہ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کرنے کے لیے مدینہ ساتھ لے گئیں۔ ایک ماہ وہیں مقیم رہیں۔ اس سفر میں ام ایمنؓ ساتھ تھیں۔ واپس آتے ہوئے مقام ابواء پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا اور وہیں مدفون ہوئیں۔ ام ایمنؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ لے کر آئیں۔

دادا کی تربیت اور ان کا انتقال

حضرت آمنہ کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عبدالمطلب نے اپنی پرورش اور

[1] مورخین میں اختلاف ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت حلیمہ کے پاس کتنے برس رہے۔ ابن اسحاق ۶ برس کی مدت لکھتے ہیں، محمد حسین ہیکل ۵ برس۔

نگرانی میں لے لیا اور ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر آٹھ برس اور دس دن کی ہوئی تو عبدالمطلب نے بیاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

ابو طالب کی کفالت اور شام کا سفر

عبدالمطلب نے وفات کے وقت ابو طالب سے یہ وصیت کی کہ یہ تمھارے مرحوم بھائی عبداللہ کی نشانی ہے، اس پیاری نشانی کو دل و جان سے عزیز رکھنا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارہ سال کی عمر تھی کہ ابو طالب کو تجارت کے سلسلہ میں شام کا سفر پیش آیا۔ سفر کی صعوبت اور تکلیف کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابو طالب سے اتنی محبت تھی کہ جب وہ سفر پر روانہ ہونے لگے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جذبہ محبت میں ابو طالب کے ساتھ چمٹ گئے۔ انھوں نے اپنے ساتھ لے لیا۔

حرب فجار

۵۸۰ء اور ۵۹۰ء کے درمیان قریش اور قیس کے قبیلوں کے درمیان وہ مشہور لڑائی ہوئی جو حرب فجار کے نام سے مشہور ہے۔

قریش کے تمام خاندانوں نے اس میں حصہ لیا۔ سپہ سالار اعظم حرب بن امیہ تھا۔ آل ہاشم کے علمبردار زبیر بن عبدالمطلب تھے۔ چونکہ قریش حق پر تھے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا ساتھ دیا۔ لیکن کسی پر تلوار نہیں اٹھائی۔ صرف چچا کو تیر وغیرہ پکڑاتے رہے۔

حلف الفضول میں شرکت

عرب قبائل کی متواتر خانہ جنگیوں کی وجہ سے ہزاروں گھرانے تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ حجاز کا خرمن امن آتش حرب سے بھسم ہو چکا تھا۔ قتل و سفاکی نے رستوں کو پرخطر بنا دیا ہوا تھا۔ غرباء، روساء اور امراء کے تختہ مشق بنے ہوئے تھے۔

حرب فجار کے بعد لوگوں کو ان تباہ کن نتائج کا احساس پیدا ہو گیا تو زبیر بن عبدالمطلب نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک ایسی انجمن کا انعقاد ہو جو ملک میں امن و سلامتی قائم رکھے۔ چنانچہ اس تحریک پر خاندان ہاشم زہرہ، تمیم، عبداللہ بن جدعان کے گھر اکٹھے ہوئے اور یہ معاہدہ ہوا کہ اس انجمن کے ممبر مندرجہ ذیل عہد و اقرار کریں۔

۱۔ ہم ملک سے بے امنی دور کریں گے۔

۲۔ ہم غریبوں کی اعانت کریں گے۔

۳۔ مسافروں کی حفاظت کریں گے۔

۴۔ مظلوموں کو ظالموں کے پنجہ سے چھڑائیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مقدس معاہدہ میں شریک ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے نبوت کے زمانہ میں بھی فرمایا کرتے تھے۔ "اگر اس معاہدہ کے بدلے مجھے سرخ اونٹ بھی دیے جاتے تو میں ہرگز قبول نہ کرتا۔ اگر آج بھی اس قسم کا معاہدہ ہو تو میں شرکت کرنے کو تیار ہوں۔"[1]

امین کا لقب پانا

اس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیکی، تقویٰ، دیانت وامانت اور راست بازی مکہ میں زبان زد خلائق بن چکی تھی۔ جس آدمی کا بھی واسطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پڑا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کھرا پایا۔ اس وجہ سے لوگ آپ کو نام سے نہیں بلاتے تھے بلکہ "الامین" کے نام سے یاد کرتے تھے۔

جوانی اور شادی

جوان ہونے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے معاش کے لیے شام، بصریٰ اور یمن کے متعدد تجارتی سفر کیے اور ہمیشہ دیانتداری اور راست بازی کو مدنظر رکھتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی راست بازی اور دیانت داری کی شہرت کی وجہ سے مکہ کی ایک معزز خاتون خدیجہؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ آپ ان کے مال سے تجارت کریں، جو معاوضہ میں دوسروں کو دیتی ہوں۔ اس سے دوگنا آپ کو دوں گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ پیش کش قبول فرمائی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مال تجارت لے کر بصریٰ چلے گئے۔ خدیجہؓ کا ذاتی نوکر میسرہ بھی ہمراہ تھا۔ اس تجارتی سفر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معرفت حضرت خدیجہؓ کو بہت ہی منافع ہوا۔ میسرہ غلام نے حضرت خدیجہؓ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق حمیدہ کے متعلق بہت کچھ بتایا اور حضرت خدیجہؓ بہت ہی متاثر ہوئیں۔ چنانچہ واپس آنے کے تین ماہ بعد حضرت خدیجہؓ نے شادی کا پیغام بھیج دیا۔ اس وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر پچیس سال۔ تاریخ مقررہ پر ابوطالب اور تمام روساء خاندان حضرت خدیجہؓ کے مکان پر آئے۔ ابوطالب نے خطبہ نکاح پڑھا اور پانچ سو طلائی درہم مہر مقرر کیا۔

تعمیر کعبہ

خانہ کعبہ کی دیواریں سیلاب کی وجہ سے کمزور ہو گئی تھیں۔ قریش نے عمارت گرا کر از سرِ نو تعمیر کرائی۔ ہر قبیلہ کی یہ خواہش تھی کہ حجر اسود کو رکھنے کی سعادت اسے نصیب ہو۔ یہ جھگڑا طول پکڑ گیا۔ آخر کار قبائل کی تلواریں میانوں سے باہر آ گئیں۔ ابوامیہ بن مغیرہ نے یہ رائے دی کہ کل سویرے جو شخص کعبہ میں

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۲۲۰۔

سب سے پہلے داخل ہو وہی اس جھگڑے کا فیصلہ کرے۔ تمام قبائل اس بات پر متفق ہو گئے۔ دوسرے دن صبح ہوتے ہی تمام قبائل کے معزز آدمی موقع پر پہنچ گئے۔ حکمت الٰہی سے بیت اللہ میں سب سے پہلے داخل ہونے والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ سب لوگ بیک زبان پکار اٹھے۔ "ھذا الامین" یہ امین آ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جھگڑے کا فیصلہ اس طرح کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی چادر بچھائی، اس پر حجر اسود رکھ دیا اور قبائل کے روساء کو چادر کے چاروں کونے پکڑا دیے۔ جب چادر اس جگہ آ گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجر اسود کو اپنے دست مبارک سے اٹھا کر نصب کر دیا۔

یاد الٰہی اور ریاضت

حضرت خدیجہؓ سے شادی کے بعد فکر معاش سے قدرے بے نیاز ہو گئے۔ یاد الٰہی اور ریاضت کی طرف طبیعت مائل رہتی۔ چنانچہ یاد الٰہی کے لیے غارِ حرا کو پسند کیا۔ یہ غار مکہ سے دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر سال رمضان کا پورا مہینہ اسی غار میں یاد الٰہی اور ریاضت میں مشغول رہتے۔ تھوڑا سا توشہ ہمراہ لے جاتے، اسی پر تمام مہینے کا گزران ہوتا۔

نبوت کا دیباچہ

احادیث سے یہ ظاہر ہے کہ نبوت سے قبل خواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اسرار منکشف ہوتے تھے جو خواب میں دیکھتے تھے۔ صبح کی سپیدی کی طرح وہ پورے ہو جاتے تھے۔

بعثت ونبوت

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چالیس سال کے ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسب معمول غارِ حرا میں عبادت میں مصروف تھے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ ایک مبارک رات میں جبرائیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا: اقرا یعنی پڑھ۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا۔ مَا اَنَا بقارِی میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ تب جبرائیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سینے سے لگا کر زور سے دبایا اور کہا اِقرا یعنی پڑھ۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہی پہلا جواب دیا۔ پھر دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جبرائیل علیہ السلام نے سینہ سے لگا کر زور سے دبایا اور فرمایا اِقرا جواب وہی "مَاانَا بقارِی" پایا۔ غرض تیسری بار کے بعد حضرت جبرائیل علیہ السلام نے یہ پانچ آیات تلاوت فرمائیں۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِی خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِی عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (علق ۹۶:۱......۵) اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا، انسان کو ایک لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھ اور تیرا رب سب سے بڑھ کر بزرگی والا ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔

یہ وہ پہلا دن تھا۔ جب نبوت کا بارگراں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کندھوں پر ڈالا گیا۔ وہ راستہ جس کی خاطر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دن رات جویاں تھے مل گیا۔ وہ آب زلازل جس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام و دہن پیاسا تھا دست یاب ہو گیا۔ وہ نور ہدایت جس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باطنی بینائی جستجو میں تھی۔ حاصل ہو گیا۔ وہ سکون قلب جس کے لیے حیران و سرگردان تھے نصیب ہو گیا۔ یہ پیغام الٰہی صرف ایک قوم کے لیے نہیں تھا، بلکہ ایک عالمگیر پیغام تھا جس کی یہ گراں ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ڈالی گئی جس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبھانا تھا۔

اصلاح عالم کی ذمہ داری کا احساس اپنے دل میں لیتے ہوئے گھبراہٹ کے عالم میں گھر آئے۔ حضرت خدیجہؓ سے تمام ماجرا کہہ سنایا اور پاک باز بیوی نے ان الفاظ میں تسلی دی کہ خدا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کبھی رسوا نہیں ہونے دے گا اور کبھی ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھنے نہیں دے گا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلہ رحمی کرتے ہیں، بے کسوں کے معاون و مددگار ہیں، مہمان نوازی کا پورا حق ادا کرتے ہیں۔ مظلوموں کی جائے پناہ ہیں، مسافروں کا ملجا و ماویٰ ہیں، مصائب میں حق کے مددگار ہیں، جس آدمی میں یہ اوصاف ہوں، بھلا وہ کیسے ضائع ہو سکتا ہے؟

ذرا طبیعت سنبھلی تو حضرت خدیجہؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ وہ حضرت خدیجہؓ کے عمزاد بھائی تھے۔ بت پرستی سے متنفر اور دین حق کے متلاشی تھے۔ آخر کار وہ آغوش نصرانیت میں چلے گئے تھے۔ وہ عبرانی زبان جانتے تھے۔ تورات اور انجیل کے خوب ماہر تھے۔ انھوں نے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تمام واقعہ سنا، سننے کے بعد فرمایا۔ یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر اترا تھا۔ اس میں مثیل موسیٰ والی پیشگوئی کی طرف اشارہ تھا۔ پھر ورقہ نے آرزو کی کہ کاش میں بھی اس وقت تک زندہ ہوتا جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ سے نکال دے گی۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعجب ہو کر پوچھا۔ کیا میری قوم مجھ کو مکہ سے نکال دے گی؟ ورقہ نے جواب دیا۔ ہاں ہر نبی کے ساتھ ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ اس کے بعد ورقہ جلد فوت ہو گئے۔ اسی اظہار ایمان کی وجہ سے ورقہ بن نوفل کو صحابہ میں شامل کیا گیا ہے۔

پہلے پیغام کے بعد کچھ مدت تک وحی آنا بند ہو گئی۔ دوسری وحی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی، وہ یہ تھی۔

يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْ (المدثر ۷۴:۱،۲) اے لباس نبوت کے اوڑھنے والے! اٹھ اور لوگوں کو ڈرا۔

اس پیغام میں خدا نے یہ فرمایا کہ خلوت میں بیٹھ کر صرف عبادت الٰہی کرنے کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ بلکہ لوگوں کو نور توحید سے ظلمات سے نکال کر صراط مستقیم کی طرف لانے کا وقت آ گیا ہے۔ اس وجہ سے اٹھ اور لوگوں کو توحید الٰہی کی طرف بلا۔ جو اس پیغام حق سے انحراف کرے گا وہ دین و دنیا میں خسران اور

گھاٹے میں رہے گا۔ اس حکم کو پاتے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میدان عمل میں آ گئے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابتدائی زمانہ نبوت میں پیغام حق پہنچانے میں نہایت رازداری اور احتیاط وحزم سے کام لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہی لوگوں کو پیغام پہنچاتے تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حرکات وسکنات سے واقف تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حلقہ احباب میں داخل تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لانے والی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ تھیں۔ سب لوگوں سے بڑھ کر یہی بیوی رازدار تھیں۔ آپ کے حلقہ زوجیت میں آئے ہوئے پندرہ سال گزر چکے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی بات حضرت خدیجہؓ سے نہاں نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ پاک بیوی نبوت سے قبل ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غموں کی گھڑیوں میں موجب تسکین ہوتی تھیں ان کے قلب پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی راست بازی، امانت داری اور دیانت داری کا بہت گہرا اثر تھا۔ جونہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غارِ حرا سے پیغام ہدایت لے کر باہر نکلے اور گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ سے اس پیغام کا ذکر کیا تو آپ نے اس پیغام کو حق سمجھا اور ایمان لے آئیں اور ساتھ یہ کہا انھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا راست باز شخص کبھی ناکام نہیں ہوسکتا۔

اس کے بعد حضرت خدیجہؓ ورقہ بن نوفل کے پاس رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لے گئیں۔ ورقہ بن نوفل کے اعضاء پیری کی وجہ سے مضمحل اور آنکھیں سفید ہو چکی تھیں اور موت کے دروازے کو دستک دے رہے تھے۔ ورقہ پیغام الٰہی سنتے ہی اٰمَنْتُ وَصَدَّقْتُ کہہ اٹھے اور السابقون الاولون میں شمار ہوئے۔

حضرت ابوبکرؓ دولت مند، صائب الرائے اور ماہر النساب تھے۔ آپ کی ہتھیلی سے فیاضی کا دریا بہتا تھا اور غرباء، مساکین وغیرہ کے لیے ابرِ رحمت تھے۔ اس وجہ سے مکہ میں بہت ہی ہر دلعزیز تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص طبعی لگاؤ تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیغام حق سنتے ہی ایمان لے آئے۔ مردوں میں اوّل المومنین ہوئے اور صدیق اکبر کا لقب پایا۔

حضرت ابوبکرؓ کے متعلق یورپ کا مشہور مستشرق سپرنگر لکھتا ہے کہ ''ابوبکر کا آغاز اسلام میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خواہ دھوکا کھانے والے ہوں۔ مگر دھوکا دینے والے ہرگز نہیں تھے بلکہ صدق دل سے اپنے آپ کو خدا کا رسول یقین کرتے تھے۔'' سرولیم میور کو اس رائے سے اتفاق ہے۔ (لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مصنفہ میور صفحہ ۵۶)

حضرت علیؓ ابوطالب کے فرزند تھے۔ آپ بچپن سے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہے تھے۔ وہ بچوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے ہیں۔

زید بن حارث رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق حمیدہ کی وجہ سے عاشق جاں نثار تھے۔ غلاموں میں سب سے پہلے ایمان لانے والوں

میں شمار ہوئے۔

حضرت ابوبکرؓ کا لوگوں کے ساتھ بہت میل ملاپ تھا۔ ان کی تبلیغ سے حضرت عثمان غنیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ مسلمان ہوئے۔ پھر ابوعبیدہؓ، عامر بن عبداللہ بن الجراحؓ، عبیدہؓ بن الحارث، ابوسلمہؓ بن عبدالاسد، ابو حذیفہ بن عتبہؓ، سعیدؓ بن زید، عثمانؓ بن مظعون، عبداللہ بن جحشؓ، عبید اللہ بن جحشؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، بلال بن رباحؓ، خباب بن الارتؓ، ابوذر غفاریؓ، صہیبؓ رومی، عمارؓ، یاسرؓ، عامرؓ بن فہیرہ وغیرہ جیسی ہستیاں اسلام میں داخل ہوئے۔

عورتوں میں سے خدیجہؓ کے بعد حضرت عباس کی بیوی ام الفضلؓ، اسماءؓ بنت عمیس، اسماءؓ بنت ابوبکر، سمیہؓ، فاطمہؓ خواہر عمر فاروقؓ نے اسلام قبول کیا۔

اوائل زمانہ میں حضرت ارقمؓ مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کا گھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغی کوششوں کا مرکز بن گیا تھا اور تین سال میں تقریباً چالیس پاک نفوس حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے۔

اعلانیہ تبلیغ کا آغاز

تین سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت رازداری اور احتیاط سے فریضہ تبلیغ سرانجام دیتے رہے۔ آخر کار کھل کر میدان عمل میں آنے کا حکم آیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (حجر ۱۵:۹۴) جو تم کو حکم دیا گیا ہے اس کو واشگاف کر دو اور اس کے قریب ہی یہ آیت اتری: وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (شعراء ۲۶:۲۱۴) یعنی اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوہ صفا پر چڑھ کر قریش کو بلایا۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک جرار لشکر آ رہا ہے تو تم یقین کر لو گے؟ سب نے ایک زبان ہو کر کہا: ہاں، کیونکہ آپ ہمیشہ جادۂ راست پر گامزن رہے ہیں اور ہم سے الامین کا لقب پایا ہے۔ ہم کیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کو جھٹلا سکتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو سنو میں تم کو خبر دیتا ہوں کہ اللہ کے عذاب کا لشکر تمھارے قریب پہنچ چکا ہے۔ خدا پر ایمان لاؤ تاکہ اس عذاب سے بچ جاؤ۔'' یہ سن کر سب لوگ جن میں ابولہب بھی تھا سخت برافروختہ ہوئے اور برا بھلا کہتے ہوئے چلے گئے۔

اقرباء کی دعوت

چند روز کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ سے کہا کہ ایک دعوت کا انتظام کرو۔ یہ تبلیغ کا پہلا موقع تھا۔ اس دعوت میں تمام خاندان عبدالمطلب مدعو تھا۔ ابو طالب، حمزہ، عباس سب شریک تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھانا کھا چکنے کے بعد فرمایا کہ میں وہ چیز لایا ہوں جو اس کو قبول

کرے گا۔ وہ دین و دنیا میں فلاح پا جائے گا۔ اس بارگراں کے اٹھانے میں میرا کون ساتھ دے گا۔ تمام حاضرین محفل خاموش رہے۔ دفعتہً ایک کونے سے ایک تیرہ سال کا بچہ کھڑا ہوا اور کہا: گو میں عمر میں سب سے چھوٹا ہوں، پتلی ٹانگوں والا ہوں اور مجھے آشوب چشم ہے۔ اصلاح عالم کا بارگراں اٹھانے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معاون اور مددگار رہوں گا۔ حاضرین محفل کو بے ساختہ ہنسی آ گئی اور چل دیے۔

عرب میں عکاظ، یُعینہ اور ذوالمجاز کے میلے بہت مشہور تھے۔ عرب کے ہر کونے سے لوگ وہاں آتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں جاتے اور ان کو وعظ کرتے۔

وعظ کی بڑی بڑی باتیں

خدا کو ایک مانو۔ اسی کے سامنے سر جھکاؤ۔ وہی ذات قابل عبادت ہے۔ وہ تمام عیوب سے منزہ ہے اور تمام خوبیوں کی جامع ہے۔ زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے وغیرہ اسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے سر نہ جھکاؤ۔ جوا نہ کھیلو۔ جسمانی اور قلبی پاکیزگی اختیار کرو۔ وعدہ کی پابندی کرو۔ چوری، زنا سے باز آ جاؤ۔ لین دین میں کسی سے دغا نہ کرو۔

قریش کی مخالفت کا آغاز

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توحید، اخلاق فاضلہ مساوات بین الناس اور غرباء وغیرہ سے حسن سلوک کی تعلیم دینا شروع کی تو یہ پاک تعلیم قریش کے بیمار مزاج کو بھلا کب پسند آ سکتی تھی۔ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہر قسم کی ایذائیں دینا شروع کیں۔ چنانچہ سر ولیم میور لکھتا ہے کہ قریش نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ''یہ نیا مذہب صفحہ دنیا سے مٹا دیا جائے اور اس کے متبعین اس سے بزور روک دیے جائیں اور قریش کی طرف سے جب ایک دفعہ مخالفت شروع ہوئی تو پھر دن بدن ان کی ایذا رسانی بڑھتی اور آتش غضب تیز ہوتی گئی۔''[1]

جو بہیمانہ سفاکیاں اور جلادانہ ایذائیں کفار نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کو پہنچائیں۔ ان کو پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن کفار کی ایذائیں ایک مسلمان کو بھی صراط مستقیم سے متزلزل نہ کر سکیں، بلکہ ان کو بنیان مرصوص بنا دیا۔ ایک عیسائی نے لکھا ہے۔

''عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مسائل نے وہ درجہ نشہ دینی کا آپ کے پیروؤں میں پیدا کیا جس کو عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے۔ جبکہ عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے۔ ان کا نشہ دینی جاتا رہا۔ وہ اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیے۔ برعکس اس کے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیرو اپنے مظلوم کے گرد

[1] میور صفحہ ۶۱۔

آپ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا۔“[1]

مستشرقین کی مخالفت کے اسباب حسب ذیل تھے:

۱۔ اسلام ان کے آبائی عقائد کو باطل کر رہا تھا۔

۲۔ اسلام ان کے معبودوں کو وقودِ نار قرار دیتا تھا۔

۳۔ اسلام قریش کی بداخلاقیوں کی پردہ دری کرتا تھا۔

۴۔ اسلام ان کے اس اقتدار کا خاتمہ کر رہا تھا جو متولی کعبہ کی حیثیت سے ان کو ملا ہوا تھا۔

۵۔ بنی امیہ اور بنی ہاشم ایک دوسرے کے پرانے دشمن تھے۔ بنی امیہ آل ہاشم میں نبوت کا اعزاز ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس لیے یہ لوگ سب سے زیادہ عداوت اور مخالفت میں پیش پیش تھے۔

ابو طالب سے شکایت

قریش کا ایک وفد ابو طالب کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ وہ اپنے بھتیجے کو بتوں کو برا بھلا کہنے سے روکیں۔ ابو طالب نے اس وفد کو سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ قریش کا دوسرا وفد پھر ابو طالب کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ ”تم اپنے بھتیجے کی مدد سے دست بردار ہو جاؤ، ورنہ میدان میں ہمارے مقابلہ کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

ابو طالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلا کر سمجھایا اور کہا ”اے میرے بھتیجے! اپنے چچا پر اتنا بوجھ نہ ڈالو۔ وہ اپنی تمام قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آب دیدہ ہو کر فرمایا: ”اے چچا! اگر آپ قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو بے شک میری معاونت سے دست کش ہو جائیں۔“ پھر فرمایا: ”اے مہربان چچا! خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند رکھ دیں اور کہیں کہ اس کے عوض میں تبلیغ اسلام کو ترک کر دوں، مجھے منظور نہ ہوگا۔ اگر مجھے اس راہ میں ہلاکت نظر آئے تو میں پیچھے نہیں لوٹوں گا۔“

ابو طالب کے قلب پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ الفاظ بجلی کا سا اثر کر گئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ جو بات تمھیں لوگوں سے کہنا ہو کہہ دیجیے، بخدا میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر قدم پر مدد کروں گا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکلیف گوارا نہ کروں گا۔

دنیاوی ترغیبات

قریش مکہ نے ایک اور منصوبہ بنایا کہ شاید اسی سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعوت اسلام سے رک جائیں۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو طمع دو۔ یہ مشورہ کر کے عتبہ بن ربیعہ کو

[1] اپالوجی گاڈ فری ہیگنس ترجمہ اردو صفحہ ۲۶، ۲۷ مطبوعہ بریلی ۱۸۷۳ء بحوالہ سیرت النبی جلد اول ص ۲۳۳۔

اس سفارت پر مقرر کیا، وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہا:

اے برادر زادہ من! آپ قریش میں عالی النسب تو ہیں مگر آپ نے قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا ہے۔ چند تجاویز پیش کرتا ہوں، امید ہے کہ آپ ان میں سے کوئی ایک منظور فرمالیں گے۔

۱۔ اگر اس قسم کی تبلیغ سے آپ کا منشاء مال سمیٹنا ہو تو ہم لوگ آپ کے لیے اتنی دولت جمع کر سکتے ہیں کہ عرب میں آپ سے بڑا کوئی تونگر نہ ملے گا۔

۲۔ اگر یہ نیت ہو کہ آپ تمام عرب کے سردار بن جائیں تو ہم برضاء ورغبت آپ کی سیادت قبول کرنے کے لیے حاضر ہیں۔

۳۔ اگر آپ بادشاہت کے طلب گار ہوں تو ہمیں یہ بھی منظور ہے۔

۴۔ اگر آپ آسیب زدہ ہیں اور اس کے معالجہ سے معذور ہیں تو فرمایئے ہم لوگ از خود طبیب اور اس کا معاوضہ مہیا کر سکتے ہیں۔[1]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عتبہ کو سورۃ "حٰمٓ" کی چند آیات سنائیں۔ وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے قریش کو مشورہ دیا کہ "تم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی حالت پر چھوڑ دو۔"

ایذاؤں میں ترقی

جب قریش رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ندائے حق کو دبانے اور روکنے سے ہر طریقہ سے ناکام ہو گئے اور مسلمانوں کا حلقہ آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہوا تو کفار نے ایک کمیٹی قائم کی، جس کا امیر ابولہب تھا۔ پچیس رؤساء اس کے ممبر تھے۔ اس کمیٹی نے یہ ریزولیشن پاس کیا: محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہر طرح سے ستایا جائے، تمسخر کیا جائے۔ سخت ایذائیں دی جائیں، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماننے والوں کو سخت تکالیف دی جائیں۔" چنانچہ اس ریزولیشن کے بعد ایمان لانے والوں کے لیے مصائب کا دروازہ کھل گیا اور ان کے ایمان کی آزمائش کا وقت آ گیا۔

سنگ دل کفار نے بے بس مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے ان کو احاطہ تحریر میں لانا مشکل ہے۔ مسلمانوں کو دھکتے ہوئے انگاروں اور تپتی ریت پر لٹایا گیا۔ رسیوں سے باندھ کر زمین پر گھسیٹا گیا۔ چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیا۔ بعض عورتوں کی فرج پر برچھا مار کر شہید کیا گیا ہو۔ غرض کہ تکالیف اور ایذا دینے کا کوئی ایسا طریقہ نہیں تھا جو استعمال نہ کیا گیا ہو۔ جتنی ایذاؤں میں ترقی ہوتی جاتی تھی۔ اتنا ہی حلقہ اسلام وسیع ہوتا جاتا تھا۔

حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ کا قبول اسلام

ایک دن حضرت عمرؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کے لیے گھر سے نکلے۔ ہاتھ میں

[1] حیات محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مصنفہ محمد حسین ہیکل ص ۳۴۲ (اردو ایڈیشن)۔

برہنہ تلوار تھی۔ بازار سے جارہے تھے۔ راہ میں اتفاقاً نعیمؓ بن عبداللہ ملے اور حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ اس غصہ کے عالم میں کدھر کا رخ ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے جارہا ہوں۔ نعیمؓ نے جواب دیا پہلے اپنے گھر کی خبر تو لو۔ تمھارے بہنوئی اور بہن دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔ حضرت عمرؓ غصے کی حالت میں بہن کے گھر پہنچے تو حضرت خبابؓ ان کو قرآن مجید پڑھا رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کی آواز سن کر قرآن مجید کے اوراق چھپا دیے۔ حضرت عمرؓ نے جلالی آواز میں کہا، مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم مرتد ہو گئے ہو۔ یہ کہہ کر حضرت سعیدؓ کو پکڑا اور مارنا شروع کر دیا۔ بہن اپنے شوہر کو بچانے کے لیے آگے بڑھیں تو ان کو بھی چوٹیں آئیں اور لہولہان ہو گئیں۔ بہن کو زخمی دیکھ کر حضرت عمرؓ کا غصہ فرو ہوا تو فرمایا۔ بہن جو کچھ تم پڑھ رہے تھے مجھے بھی سناؤ۔ چنانچہ قرآن مجید کی چند آیات سن کر اتنے متاثر ہوئے کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

حضرت حمزہؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا تھے۔ ان کو شکار اور سپہ گری کا بہت شوق تھا۔ ہر روز شکار کو باہر نکل جاتے۔ ایک دن ابوجہل نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گستاخی کی۔ حضرت حمزہ کی لونڈی دیکھ رہی تھی۔ جب حضرت حمزہ واپس گھر لوٹے تو لونڈی نے کہا کہ اتنے شہسوار شہ زور بنے پھرتے ہو، آپ کو معلوم ہے کہ آج آپ کے بھتیجے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ابوجہل کس طرح پیش آیا؟

حضرت حمزہ قرابت کے جوش میں حرم میں ابوجہل کے پاس پہنچے اور زور سے کمان ابوجہل کے سر پر دے ماری اور مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ جب گھر واپس لوٹے تو متردّد ہوئے کہ آبائی دین کو دفعتہ چھوڑ دینا ٹھیک نہیں۔ تمام دن سوچتے رہے، آخر کار اس نتیجہ پر پہنچے کہ اسلام ہی درست دین ہے۔

حبشہ کی ہجرت۔ ماہ رجب ۵ نبوی

جب کفار کی سختیاں اور ایذائیں حد سے بڑھ گئیں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو حبشہ میں ہجرت کا حکم دیا۔ چنانچہ اس اجازت سے اوّل بارہ مرد اور چار عورتوں کا ایک مختصر سا قافلہ رات کی تاریکی کے پردہ میں نکلا اور بندرگاہ شعیبہ سے جہاز میں سوار ہو کر حبش کی طرف روانہ ہو گیا۔ حبشہ کے نجاشی نے ان کو امان دے دی۔ قریش نے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ کو تحفہ تحائف دے کر حبشہ روانہ کیا تاکہ عیسائی بادشاہ کو مسلمانوں سے بدظن کیا جائے۔ یہ سفیر دربار میں پہنچے اور درخواست کی کہ مہاجرین ہمارے مجرم ہیں، ان کو واپس کیا جائے۔ بادشاہ کو یہ کہہ کر اکسایا کہ ان لوگوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کر لیا ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے مسلمانوں کو جواب دینے کے لیے دربار میں طلب کیا۔ تب حضرت جعفرؓ نے تقریر کی، جس نے قریش کے وفد کو ناکام بنا دیا۔ اس سفارت کی ناکامی کے بعد قریش کے ظلم وستم اور بھی بڑھ گئے۔ چنانچہ دوبارہ ایک سو تین مسلمانوں کو جن میں ۸۳ مرد اور بیس عورتیں تھیں۔ حبشہ میں ہجرت کرنا پڑی۔

بنی ہاشم سے قطع تعلق۔محرم ۷ نبوی

قریش نے اسلام کی دعوت کو دبانے کے لیے ہر قسم کا حربہ استعمال کیا۔ایذائیں دیں۔لالچ وطمع دیا لیکن اسلام کا دائرہ پھیلتا چلا گیا۔اسلام کی شعاعیں تاریک قلوب کو منور کرتی چلی جا رہی تھیں۔اس لیے کفار نے یہ معاہدہ کیا کہ بنی ہاشم سے مکمل سوشل بائیکاٹ کیا جائے۔یعنی ان سے ناطہ رشتہ کرنا چھوڑ دیا جائے۔گلی بازار میں پھرنے سے روک دیا جائے۔کوئی ان سے خرید وفروخت نہ کرے۔یہ معاہدہ منصور بن عکرمہ نے لکھا اور کعبہ میں آویزاں کر دیا گیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کا قبیلہ شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے۔تین سال تک وہیں رہے۔یہ ایسا زمانہ تھا کہ محصورین درختوں کے پتے اور چھال کھا کھا گزارہ کرتے تھے۔بالآخر قریش کے چند افراد ہشام مخزومی، زمعہ بن الاسود، مطعم بن عدی اور زبیر کو غیرت آئی۔انھوں نے معاہدہ نامہ چاک کر دیا اور بنی ہاشم کو گھاٹی سے باہر نکالا اور ان کو اپنے اپنے گھروں میں بھیج دیا۔

ابوطالب اور حضرت خدیجہ کی وفات۔۱۰ نبوی

قید سے رہائی پانے کے چند ایام بعد ابوطالب کا انتقال ہو گیا۔اس کے تھوڑے عرصہ بعد حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سال کو ''عام الحزن'' فرمایا۔

مکہ کے آخری ایام

جب کفار مکہ کی حد سے زیادہ ہٹ دھرمی، ضد اور مخالفت دیکھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طائف کا رخ کیا۔حضرت زیدؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔وہاں عمیر کا خاندان رئیس القبائل تھا۔عبدیالیل، مسعود اور حبیب تین بھائی تھے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس گئے اور دعوت اسلام دی۔ان تینوں نے نہایت گستاخی سے جواب دیا اور آوارہ گرد اور اوباش نوجوانوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے لگا دیا۔انھوں نے سید کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پتھر مار مار لہولہان کر دیا۔آخر کار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک باغ میں پناہ لی، وہاں سے پانی پیا اور انگور کا خوشہ کھایا۔

بے کسی میں دعا

جب اہل طائف کی یہ سنگ دلی اور سیاہ باطنی دیکھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کی طرف متوجہ ہوئے۔مگر اس حال میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اندر مایوسی پیدا نہیں ہوئی، بلکہ خدا کی محبت سے دل معمور تھا۔اور ان الفاظ میں خدا سے دعا کی۔

''اے میرے خدا! اپنی کمزوری اور طاقت کی کمی اور لوگوں کی نظر میں ہیچ ہونے کی تیری طرف

شکایت کرتا ہوں۔ اے رب اے رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والے! تو ہی کمزوروں کا رب ہے اور تو ہی میرا رب ہے تو کس کی طرف مجھے سپرد کرے گا۔ کسی اجنبی شخص کی طرف جو مجھ سے ترش روئی کے ساتھ پیش آتا ہے یا قریب دوست کی طرف جس کے قبضہ میں تو نے میرا معاملہ دیا ہے۔ اگر تیری ناراضگی مجھ پر نہیں تو ان تمام باتوں کی مجھے کچھ پرواہ نہیں۔ لیکن تیری حفاظت میرے لیے بہت وسیع ہے۔ میں تیرے چہرے کے نور کی پناہ میں آتا ہوں جس کے ساتھ ساری تاریکیاں پاش پاش ہو کر روشن ہو جاتی ہیں جس سے دنیا اور آخرت کے امور اصلاح پذیر ہوتے ہیں۔ اس بات سے میں تیرے منور چہرے کی پناہ میں آتا ہوں کہ مجھ پر تیری ناراضگی ہو یا تیرا غصہ ہو۔ تیرے حضور عذر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے اور کوئی طاقت اور قوت نہیں مگر تیرے ساتھ۔"

مدینہ میں طلوع اسلام۔ ۱۱ نبوی

ایام حج میں جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مختلف قبائل کو دعوت اسلام دیتے پھرتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خزرج کے چند آدمیوں کے پاس آئے اور دعوت اسلام دی۔ چھ آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔ یہ نبوت کے گیارھویں سال کا واقعہ ہے۔ جب یہ لوگ یثرب پہنچے تو اسلام کا چرچا گھر گھر میں ہونے لگا۔ اور ہر ایک کی زبان پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسم مبارک کا ورد تھا۔

بیعت عقبہ اولیٰ۔ ۱۲ نبوی

اگلے سال ۱۲ نبوت میں یثرب کے بارہ آدمی مکہ میں حاضر ہوئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی۔ یہ بیعت عقبہ اولیٰ کے نام سے مشہور ہے۔

بیعت کی شرائط

۱۔ ہم خدائے وحدہ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔
۲۔ چوری نہیں کریں گے۔
۳۔ زنا نہیں کریں گے۔
۴۔ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔
۵۔ کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے، نہ کسی کی چغلی کریں گے۔
۶۔ امر بالمعروف میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی نہیں کریں گے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو تبلیغ اسلام کے لیے مدینہ بھیجا وہ ہر روز صبح سویرے باہر تبلیغ کے لیے نکل جاتے اور لوگوں کو دعوتِ اسلام دیتے۔ اس طرح دو تین آدمی ہر حلقہ اسلام میں داخل ہو جاتے تھے۔

بیعت عقبہ ثانیہ۔۱۳ نبوی

۱۳ نبوت میں تہتر مرد اور دو عورتیں حج کے زمانہ میں مکہ آئے۔ عقبہ کے مقام پر بیعت کی۔ اس وقت حضرت عباس بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے، لیکن اسلام نہیں لائے تھے۔ انصار نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ آنے کی دعوت دی۔ حضرت عباسؓ نے انصار سے مخاطب ہو کر کہا، گروہ خزرج! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے خاندان میں معزز اور محترم ہیں۔ دشمنوں کے مقابل میں ہم ہمیشہ سینہ سپر رہے ہیں۔ اب وہ تمھارے پاس جانا چاہتے ہیں۔ اگر مرتے دم تک ان کے ساتھ دے سکو تو بہتر ورنہ ابھی سے جواب دے دو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس بات پر بیعت کرو کہ اپنے اہل و عیال کی طرح میری حفاظت کرو گے۔ یہ سن کر براء بن معرور نے ہاتھ بڑھایا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے بیعت لی۔ حضرت براء بن معرورؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: ''ہم نے پشت ہا پشت سے جنگ و جدل میں پرورش پائی ہے..... وہ اسی قدر کہنے پائے تھے کہ ابوالہیثمؓ نے ٹوک کر کہا، یا رسول اللہ! ہم میں اور یہود میں جو تعلقات ہیں وہ بیعت کے بعد ٹوٹ جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اقتدار حاصل ہو جائے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم کو چھوڑ کر آ جائیں۔'' رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں تمہارا خون میرا خون، تم میرے ہو، میں تمہارا ہوں۔''[1]

صحابہ کا مدینہ میں ہجرت کر جانا

عقبہ ثانیہ کی بیعت کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کو یثرب جانے کی اجازت دے دی۔ مسلمانوں نے اپنے گھر بار، خویش و اقارب، بہن بھائی، زن و فرزند چھوڑ کر مدینہ جانا شروع کر دیا۔ لیکن کفار مکہ نے مہاجرین کی سخت مزاحمت کی۔

دشمنوں میں اکیلا رہ جانا اور خدا پر بھروسہ

تمام صحابہ کرام ہجرت کر کے یثرب چلے گئے۔ مکہ میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ رہ گئے تھے۔ یہ بات رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے توکل کو ظاہر کرتی ہے کہ عدائے اسلام غیظ و غضب کی آگ میں جل کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان کے درپے تھے، پھر بھی پہلے صحابہ کو مکہ سے جانے کو کہا اور خود مکہ میں ٹھہرے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے مکہ سے چلے جاتے تو کس نے اعتراض کرنا تھا۔ صحابہ تو اپنی جانیں نچھاور کرنے کو تیار رہتے تھے۔ پھر اسلام کی بقاء بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی پر منحصر تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی حفاظت و صیانت کے لیے پہلے بھروسہ تھا نہ کہ ظاہری اسباب پر۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے چلے جاتے تو سنگدل کفار مکہ صحابہ

---

[1] سیرۃ ابن ہشام جلد اول صفحہ ۴۴۲۔

کرامؓ کو ایک ایک کر کے قتل کر دیتے لیکن محسن عالم کے شفیق قلب نے ایسا نہ کیا کہ خود پہلے جائیں، بلکہ صحابہ کرامؓ کو مکہ سے جانے کی اجازت دے دی۔

ہجرت ۔ ۱۳ نبوی

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو صحابہ کرامؓ کو ہجرت کی اجازت دے دی اور خود حکم الٰہی کے منتظر تھے۔ صرف مکہ میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے رہ گئے تھے۔ قریش رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامیابیوں پر پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ اس لیے انھوں نے دارالندوہ میں ایک خفیہ اجلاس رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ترقی روکنے کے لیے بلایا اور قریش کے تمام مشہور سردار موجود تھے۔ اس اجلاس میں روسائے قریش عتبہ، ابوسفیان، جبیر بن مطعم، ابوجہل، امیہ بن خلف اور حکیم بن حزام نے اپنی اپنی تجاویز پیش کیں۔ ابوجہل کی رائے پر سب کا اتفاق ہوا۔ اس نے یہ رائے ظاہر کی کہ ہر قبیلے سے ایک ایک آدمی منتخب کر لیا جائے اور یہ جماعت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کر دے۔ بنی ہاشم سب قبیلوں سے جنگ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس جماعت نے رات کی تاریکی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا محاصرہ کر لیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگے۔

ادھر یہ کفار اپنی فراست اور عقل کے گھوڑے دوڑا رہے تھے کہ کس طرح اس مقدس انسان کا خاتمہ کریں، اُدھر خدا اپنے بندہ کی حفاظت وصیانت کے لیے ملائکہ کو حکم دے رہا تھا کہ زمین پر جائیں اور اپنے پروں کے سائے میں اس کو منزل مقصود تک پہنچائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے ارادوں سے آگاہ کر دیا۔ حضرت علیؓ کو بلایا اور ان کو اہل مکہ کی امانتیں دیں اور کہا۔ میرے پلنگ پر سو جاؤ اور صبح کو سب امانتیں واپس کر دینا۔ خدا کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدائے قادر و توانا کی حفاظت میں گھر سے باہر نکلا، کعبہ کو دیکھا اور فرمایا۔ ''مکہ تو مجھ کو دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے۔''

سید الکونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے گھر تشریف لائے جو پہلے ہی چشم براہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو شرف معیت بخشا۔ تھوڑا سا زاد راہ لے کر عقبی دروازہ سے نکل کر شہر کی جنوبی سمت پر چل پڑے۔ یمن کی جہت پر کوہ ثور ہے۔ اس کی چڑھائی مشکل تھی۔ راستہ سنگلاخ تھا۔ چلنے سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاؤں زخمی ہو گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کندھوں پر اٹھا لیا۔ ایک غار تک پہنچے۔ حضرت ابوبکرؓ پہلے غار میں داخل ہوئے، غار کو صاف کیا اور پھر عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اندر تشریف لے آئیں۔ چنانچہ اس غار میں تین دن تک مقیم رہے۔

عبداللہ بن ابی بکر نوجوان تھے۔ رات کو غار میں ہی سوتے، علی الصبح شہر چلے جاتے۔ قریش کے مشوروں کا پتہ لگاتے اور شام کو آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عرض کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کا غلام رات کو بکریاں لاتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ دودھ پی لیتے۔

کفار کا تعاقب اور ناکامی

کفارِ مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تلاش میں نکلے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے غارِ ثور کے منہ تک پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کے پاؤں کی آہٹ کو سنا۔ آپ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر ان لوگوں نے ذرا جھک کر دیکھا تو ہم پر نظر پڑ جائے گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کے چہرے سے خوف کے نشان دیکھ کر کہا۔ "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" (التوبہ ۹:۴۰) گھبراؤ نہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

سفرِ ہجرت

چوتھی شب دو اونٹنیاں آئیں جن کو حضرت ابوبکرؓ نے پہلے ہی سے اس کام کے لیے تیار رکھا ہوا تھا۔ ایک پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ابوبکرؓ سوار ہو گئے اور دوسری پر عامر بنؓ فہیرہ اور عبداللہ بن اریقط (یہ ایک کافر تھا راہنمائی کے لیے اجرت پر مقرر کیا گیا تھا) سوار ہوئے۔

سراقہ کا تعاقب

قریش نے انعام مقرر کر رکھا تھا کہ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا اس کو سو اونٹ بطور انعام دیے جائیں گے۔ سراقہ نے یہ خبر پا کر کہ فلاں راستہ پر فلاں قبیلہ کے رہگزر جا رہے ہیں، اسی راستہ کی طرف اپنا بادرفتار گھوڑا ڈال دیا۔ سراقہ نے آپ کو دیکھ لیا تو لالچ میں اپنے گھوڑے کو مہمیز کیا۔ مگر گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور سراقہ گر پڑا۔ سوار ہوا پھر گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا مگر اس دفعہ گھوڑا گھٹنوں تک دھنس گیا۔ گھوڑے سے اترا، فال نکالی۔ جواب "نہیں" نکلا۔ اس کی ہمت پست ہوگئی۔ یقین ہو گیا کہ یہاں آثار اور ہی ہیں۔ اگر ان پر ہاتھ ڈالا تو میری جان کی خیر نہیں۔ باادب کھڑا ہو گیا اور آواز دی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کھڑے ہو گئے۔ سراقہ قریب گیا، امان طلب کی اور پھر دوبارہ مکہ لوٹ آیا۔

اہل مدینہ کا استقبال

مکہ سے روانگی کی خبر مدینہ پہنچ چکی تھی تمام مسلمان رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ان کے رفیق سفر کے انتظار میں چشم براہ تھے۔ لوگ ہر روز مدینہ کے باہر چلے جاتے تھے۔ تمام دن انتظار کر کے واپس لوٹ آتے۔ ایک دن حسب معمول انتظار کر کے واپس لوٹے تو ایک یہودی نے قلعہ سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر پکارا۔ "اہل عرب! جس شخص کا تم انتظار کرتے تھے وہ آ گیا۔" یہ سنتے ہی تمام شہر تکبیروں سے گونج اٹھا اور انصار والہانہ محبت میں گھروں سے باہر نکل آئے۔

قباء میں ورود اور مسجد کی بنیاد

مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر جو بالائی آبادی ہے اس کو عالیہ اور قباء کہتے ہیں۔ وہاں چند انصاری خاندان تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہاں پہنچ کر کلثوم بن الہدم کو شرف میزبانی بخشا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قباء میں چودہ دن قیام کیا۔ سب سے پہلا کام جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سرانجام دیا، وہ عبادت الٰہی کے لیے مسجد کی تعمیر تھی۔ خود بھی صحابہ کرام کے ساتھ کام کرتے تھے۔ یہی وہ مسجد ہے جس کا ذکر سورۂ توبہ میں ہے۔

حضرت علیؓ بھی دو ہفتوں کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قباء میں آن ملے۔

مدینہ میں داخلہ اور انصار کی عقیدت

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد تعمیر کرنے کے بعد مدینہ روانہ ہوئے۔ راستہ میں بنی سالم کا محلہ پڑتا تھا، وہاں جمعہ کی پہلی نماز ادا کی۔ زیارت اور استقبال کے لیے سارا مدینہ ٹوٹ پڑا۔ قبا سے مدینہ تک دورویہ انصار کی صفیں تھیں۔ ہر قبیلہ عقیدت سے حاضر خدمت ہوتا اور عرض کرتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ گھر ہے، یہ مال ہے، یہ جان ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعا خیر دیتے اور آگے بڑھتے جاتے۔ شہر قریب آ گیا۔ مکانوں کی چھتوں پر عورتیں اور معصوم لڑکیاں خوشی کے عالم میں دف بجا بجا کر یہ اشعار پڑھتیں۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَادَعٰى لِلّٰهِ دَاعٍ

یعنی وداع کی گھاٹیوں سے چاند ابھر آیا ہے ہم پر خدا کا شکر واجب ہے جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں۔

جب کوکبہ نبوی حضرت ابو ایوبؓ انصاری کے گھر کے پاس پہنچا تو ہر ایک عقیدت مند نے میزبانی کی پیش کش کی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے پہلو میں ایک مادر مہربان سے زیادہ شفیق قلب رکھتے تھے، وہ کسی کی پیش کش کو ٹھکرا کر رنجیدہ خاطر بنانا نہیں چاہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری ناقہ کو چھوڑ دو، وہ خدا کی طرف سے مامور ہے، جہاں بیٹھ جائے گی وہی میری قیام گاہ ہوگی۔ آخر یہ انمول اور گراں بہا نعمت حضرت ابو ایوبؓ انصاری کے حصہ میں آئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سات ماہ تک وہیں مقیم رہے۔ اسی وقت سے سنہ ہجری کا آغاز ہوتا ہے۔

مدنی زندگی

ہجرت کا پہلا سال

تعمیر مسجد

مدینہ میں جا کر سب سے پہلا کام خانہ خدا کی تعمیر تھی۔ قیام گاہ کے قریب بنی نجار کی افتادہ زمین

تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کی قیمت ادا کر کے صحابہ کی مدد سے ایک سادہ اور مختصر مسجد تعمیر کروائی۔ مسجد سے متصل ازواج مطہرات کے حجرے تعمیر ہوئے تعمیر مسجد کے بعد باجماعت نماز ہونے لگی اور اذان کا طریقہ ظہور میں آیا۔

اصحاب صُفّہ

مسجد کے ایک سرے پر ایک چبوترا تھا۔ یہاں وہ لوگ رہتے تھے۔ جن کے اپنے گھر بار نہ تھے اور وہ اصحاب صفہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ مسجد کے ساتھ درسگاہ کی بنیاد تھی۔

مواخات

مکہ سے جن مسلمانوں نے ہجرت کی تھی، وہ بالکل تہی دست اور بے سروسامان تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مسئلہ آبادکاری اور خوردونوش حل کرنے کے لیے ایک ایک مہاجر کا ایک ایک انصاری کے ساتھ رشتہ اخوت قائم کر دیا۔ انصار نے مہاجرین کو اپنے مال و دولت، زمین و جائیداد اور تجارت میں برابر کا شریک کر لیا۔

میثاق مدینہ

مدینہ میں یہودی کافی صاحب اقتدار اور طاقت ور تھے۔ ان سے معاہدہ امن قائم کیے بغیر نہ تو مدینہ کی فضا پُر امن و پُرسکون رہ سکتی تھی اور نہ مدینہ کی سالمیت برقرار رہ سکتی تھی۔ اس وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ میں تشریف آوری کے معاً بعد ایک معاہدہ کیا جو "میثاق مدینہ" کہلاتا ہے۔ اس کی شرائط یہ تھیں۔

۱۔ خون بہا اور فدیہ کا قدیم طریقہ جاری رہے گا۔

۲۔ یہودیوں کو مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔

۳۔ یہود اور مسلمانوں کے تعلقات دوستانہ ہوں گے اور جب دونوں فریقوں کو کسی تیسری فریق سے جنگ پیش آئے گی تو وہ ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔

۴۔ کوئی فریق قریش کو امان نہیں دے گا۔

۵۔ مدینہ پر جب کوئی بیرونی طاقت حملہ کرے گی تو دونوں فریق مل کر مدافعت کریں گے اور صلح میں بھی دونوں فریق شریک ہوں گے۔

۶۔ جھگڑوں اور اختلافات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ثالث تسلیم کیا جائے گا۔

غزوات

غزوہ۔ بدر ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ: ۶۲۴ء

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ (ال عمران ۱۲۳) اور یقیناً اللہ نے تمھیں بدر میں مدد دی

جب تم کمزور تھے۔

قریش مکہ اسلام کی عداوت میں اتنے جلے بیٹھے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمان مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے آئے لیکن کفار کو چین نہ آیا تو انھوں عبداللہ بن ابی بن سلول کو جو ہجرت سے قبل رئیس انصار تھا، اور انصار نے اس کی تاج پوشی کے لیے تیاری کر رکھی تھی، خط لکھا، ''تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے۔ ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں۔ یا تو تم اس کو قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو ورنہ ہم تم پر حملہ کریں گے اور تم کو فنا و برباد کر دیں گے اور تمہاری عورتوں کو قیدی بنا لیں گے۔''[1]

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس خط کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عبداللہ بن ابی کے پاس تشریف لے گئے اور اس سمجھایا بجھایا کہ ''کیا تم اپنے ہی بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے۔'' چونکہ انصار اکثر دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے اس لیے عبداللہ اس بات کو سمجھ گیا اور قریش کے حکم پر عمل نہ کر سکا۔

اس کے بعد قریش نے مدینہ کے یہودیوں سے ساز باز شروع کر دی۔ جب ان کو خفیہ طور پر اپنے ساتھ ملا لیا تب مسلمانوں کو تہدیدی پیغام بھیجا کہ تم مغرور نہ ہو جانا کہ مکہ سے جان بچا کر آ گئے ہو۔ ہم مدینہ پر حملہ کر کے تمھیں فنا و برباد کر دیں گے۔

اس پیغام کے بعد کفار مکہ نے مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ ربیع الاول ۲ھ میں کرز بن جابر الفہری مسلمانوں کی ایک چراگاہ پر حملہ آور ہو کر مال مویشی لوٹ کر لے گیا اور صاف بچ کر نکل گیا۔

جب کفار نے امن پسند مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا مصمم ارادہ کر لیا اور پھر اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مسلمانوں پر شب خون مارنے بھی شروع کر دیے۔ تب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خود حفاظت کے لیے تلوار اٹھانے کی اجازت دی، ارشاد الٰہی ہے۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْر ، (الحج ۲۲:۳۹) ان لوگوں کو اجازت دی گئی ہے جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔

قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (البقرہ ۲:۱۹۰) اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔

اب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دفاع اور حفاظت کا اہم فریضہ تھا جس کو ادا کرنا تھا۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے تلوار اٹھائی۔

اس دفاع اور حفاظت کے سلسلہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبداللہ بن جحشؓ کو بارہ

---

[1] سنن ابی داؤد جلد ۲ باب خبر النضیر۔

آدمیوں کے ہمراہ نخلہ کی طرف روانہ کیا، ساتھ ایک خط دیا اور فرمایا کہ اس خط کو دو دن کے بعد کھولا جائے۔ عبداللہؓ نے جب اس خط کو کھولا تو لکھا تھا: ''مقام نخلہ میں قیام کرو اور قریش کے حالات کا پتہ لگاؤ اور اطلاع دو'' اتفاق سے قریش کا ایک تجارتی قافلہ ادھر سے گزر رہا تھا، عبداللہؓ نے اس پر حملہ کر دیا، اور اس جھڑپ میں حضرت واقدؓ بن عبداللہ سہمی کے تیر سے عمرو بن حضرمی مارا گیا۔ دو کافر گرفتار ہوئے اور کچھ مال غنیمت ہاتھ آیا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ اس واقعہ سے کفار مکہ بہت برہم ہوئے۔

فوری وجہ

ان دنوں ابوسفیان کی سرکردگی میں قریش کا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ شام سے واپس آ رہا تھا۔ کسی نے یہ افواہ اڑا دی کہ مسلمان اس قافلے کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر ابوسفیان نے ایک قاصد ضمضم غفاری نام کو مکہ روانہ کر دیا۔ اس نے مکہ پہنچتے ہی واویلا اور چلانا شروع کر دیا: ''اے قریش! تمہارا قافلہ خطرے میں ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے رفقاء سمیت ابوسفیان پر حملہ کرنے کو ہے۔ امید نہیں کہ تم اپنا مال بچا سکو۔ کون دلاور ہے جو ابوسفیان کو بچانے کے لیے نکلے؟[1]

ابوجہل کا نعرہ جنگ

ابوجہل تو پہلے ہی مسلمانوں پر حملہ کرنے کا بہانہ تلاش کر رہا تھا۔ عمرو بن حضرمی کے قتل اور ضمضم غفاری کے واویلے نے ابوجہل کے آتش غضب کو بھڑکا دیا۔ وہ کعبہ گیا اور اپنے خداؤں سے استمداد کی۔ پھر اہل مکہ کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لیے ابھارا تا کہ مسلمانوں کے خون سے اپنی آتش غضب کو بجھائے۔

مدینہ کی طرف کوچ

ایک ہزار پیادے اور سو سواروں کا لشکر عتبہ بن ربیعہ کی سرکردگی میں مدینہ کی طرف روانہ ہو پڑا۔

مومنین کا خروج

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان حالات کا علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام صحابہ کو مشورہ کے لیے جمع کیا۔ سب سے پہلے ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ پھر حضرت مقدادؓ اٹھے اور جان نثاری کا اظہار کیا۔ جب انصار کی طرف سے سعدؓ بن معاذ نے کامل وفاداری کا اظہار کیا تو ۱۲ رمضان ۲ھ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین سو تیرہ جان نثاروں کو ساتھ لے کر شہر سے باہر نکلے، جن میں کم سن بچے بھی تھے۔ اسلامی لشکر کے سازوسامان کی یہ ناگفتہ بہ حالت تھی کہ صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے۔

[1] حیات محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ص ۵۵۰ اردو ایڈیشن۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان قدوسیوں کو ساتھ لے کر بدر کی طرف روانہ ہو پڑے۔ اس دوران میں قریش مقام بدر پر پہنچ چکے تھے جو مدینہ سے ۸۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ مسلمانوں نے وہاں پہنچ کر ایک چشمے پر قبضہ کر لیا۔

رسول خدا کی دعا

۱۶ رمضان کی رات کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آستانہ الوہیت پر گر کر یہ دعا کی، اے خدا! اگر تو نے اس چھوٹی سی جماعت کو ہلاک کر دیا تو زمین میں تیری عبادت کرنے والا، توحید کا پیغام پہنچانے والا کوئی نہ رہے گا۔" پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو رکعت نماز ادا کی اور غنودگی کی حالت میں قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی: "**سیھزم الجمع و یولون الدبر**" یعنی کفار کو شکست ہوگی اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔

فریقین کی صف بندی

۱۷ رمضان بروز جمعہ صبح ہوتے ہی آپ نے صف بندی کی اور سپاہیوں کو اہم ہدایات دیں۔

۱۔ مسلمان صف بندی کو نہ توڑیں۔

۲۔ اس وقت تک لڑائی کا آغاز نہ کریں جب تک آپ اجازت نہ دیں۔

دشمن دور ہو تو تیر چلا کر ضائع نہ کریں، زد میں آئے تو تیر چلائیں، اور بھی قریب آئے تو پتھروں سے ماریں، اس سے بھی نزدیک ہو جائے تو نیزوں سے روکیں اور سب سے آخر میں تلواریں کھینچیں۔

آمنے سامنے دونوں فوجیں کھڑی ہیں۔ قریش میں سے اسود بن عبدالاسد بے قابو ہو کر حوض کی منڈیر ڈھانے کے لیے مسلمانوں کی صفوں میں جا گھسا۔ حضرت حمزہؓ نے ایک ہی وار میں کام تمام کر دیا۔

باقاعدہ جنگ

لڑائی کا آغاز یوں ہوا کہ عامر حضرمی آگے بڑھا۔ مہجع حضرت عمرؓ کا غلام مقابلہ پر نکلا اور مارا گیا۔ پھر سالار فوج عتبہ، ولید اور شیبہ نکلے۔ مسلمانوں کی طرف سے حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبیدہؓ ان کے مقابلہ پر نکلے۔ تینوں کافر وہیں ڈھیر ہو گئے۔ حضرت عبیدہؓ کو مہلک زخم آیا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ عبیدہ بن سعید سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبا ہوا نخوت اور تکبر میں چور صف سے باہر نکلا اور للکارا کہ "میں ابوکرش ہوں۔" حضرت زبیرؓ مسلمانوں کی طرف سے نکلے، تاک کر آنکھ میں برچھی ماری اور عبیدہ بن سعید زمین پر گر پڑا۔

اس کے بعد عام لڑائی شروع ہوگئی۔ مسلمان ایمان کے نشہ میں اتنے سرشار تھے کہ وہ بڑھ بڑھ کر

کفار کی فوج پر حملے کر رہے تھے۔ مسلمانوں کے تابڑ توڑ حملوں کی تاب نہ لا کر کفار کے لشکر میں بھاگڑ مچ گئی۔ معوذ اور معاذ دو انصاری بچے تھے۔ انھوں نے ابوجہل کا کام تمام کر دیا۔ قریش کا ایک اور سردار امیہ بن خلف بھی مارا گیا اور نامور سردار بھی مارے گئے۔ سرداروں کے کھیت ہونے کی وجہ سے کفار ایسے بددل ہوئے کہ ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور ستر مقتول میدان میں چھوڑ کر بھاگ نکلے اور ستر کے قریب قیدی بنے۔ ان میں مشہور عقیل، عباس، نوفل، اسود اور عبد بن زمعہ تھے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے مطابق اسیران جنگ کو فدیہ لے کر رہا کر دیا اور جو لوگ فدیہ دینے کی طاقت نہیں رکھتے تھے لیکن خواندہ تھے۔ انھیں حکم دیا کہ وہ مدینہ کے دس دس لڑکوں کو لکھنا پڑھنا سکھا کر رہائی حاصل کر سکتے ہیں۔

مسلمانوں کی فتح کے اسباب

۱۔ جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے مسلمانوں کی نصرت کی۔

۲۔ قریش میں باہم اتفاق نہ تھا۔ عتبہ سردار لشکر لڑنے پر راضی نہ تھا۔ قبیلہ زہرہ کے لوگ میدان جنگ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

۳۔ بارش ہو جانے کی وجہ سے کفار جہاں صف آراء تھے وہاں کیچڑ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے حربی نقل و حرکت کرنا تھی۔

۴۔ کفار کی فوج میں کوئی ترتیب اور صف بندی نہ تھی۔

۵۔ کفار اسلامی فوج کا تخمینہ کرنے میں غلطی کر رہے تھے۔

نتیجہ

جنگ بدر نے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام ایک ایسی بڑھتی ہوئی طاقت ہے کہ اس کو مٹانا بالکل محال ہے۔ اس جنگ نے مزید جنگوں کے دروازے کھول دیے، جن کے نتیجے میں مسلمانوں نے مکہ فتح کر لیا اور اسلام کی حکومت تمام عرب پر ہو گئی۔

جنگ بدر کی یسعیاہ نبی کی کتاب میں پیش گوئی

کیونکہ خداوند نے مجھے یوں فرمایا ہے ہنوز ایک برس ہاں مزدور کی برسوں کی طرح ایک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیر اندازوں کے بقیہ لوگ جو قیدار کے بہادر ہیں گھٹ جائیں گے کیونکہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا ہے۔ (یسعیاہ ۲۱: ۱۶، ۱۷)

یہ پیش گوئی جنگ بدر میں پوری ہوئی جو ہجرت کے ایک سال بعد ہوئی۔ اس میں قیدار کی ساری حشمت تباہ ہو گئی اور ان کے تیر اندازوں کی شہرت خاک میں مل گئی اور ان کے رؤساء مارے گئے۔

غزوہ اُحد۔۳ھ: ۶۲۵ء

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران۳: ۱۳۹) اور ست نہ ہو اور غمگین نہ ہو اور تمام ہی غالب رہو گے جب تم مومن ہو۔

قریش غزوہ بدر میں مسلمانوں کی ایک قلیل اور بے سروسامان جماعت کے ہاتھوں مغلوب ہونے اور ان کے عظام اور رؤساء کے میدان جنگ میں مارے جانے کی وجہ سے جوش انتقام سے لبریز تھے۔ مدینہ کے یہودیوں اور منافقوں نے بھی آتش غضب کو بھڑکانے میں کوتاہی نہ کی۔ سو قریش شکست بدر اور تجارتی ناکہ بندی ختم کرنے کے لیے آتش زیرپا تھے۔ چنانچہ رؤساء قریش اپنے نئے قائد ابوسفیان کے پاس گئے اور مدینہ پر حملہ کرنے کا مشورہ دیا اور یہ بھی کہا کہ سامان تجارت سے جو نفع ہوا ہے اس سے اسلحہ حرب خریدا جائے۔ ابوسفیان مسلمانوں سے معرکہ لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ چنانچہ ۳ھ مطابق ۶۲۵ء میں قریش تین ہزار کی جمعیت کے ساتھ مکہ سے نکلے۔ ان میں دو سو گھوڑے، تین ہزار اونٹ اور سات سو زرہ پوش تھے۔ اس فوج میں سپاہیوں کے حوصلے بڑھانے اور کٹ مرنے پر برانگیختہ کرنے کے لیے معزز گھرانے کی عورتیں بھی تھیں۔

۹ شوال ۳ھ بروز جمعرات اس لشکر نے اُحد کے نیچے جو مدینہ کے شمال کی طرف تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے خیمے گاڑ دیے اور مدینہ کی چراگاہوں پر قبضہ کر کے اونٹوں اور گھوڑوں کو ان میں کھلا چھوڑ دیا۔

مدینہ میں جنگ کی تیاری

حضرت عباسؓ مسلمان ہو چکے تھے اور ابھی مکہ میں ہی مقیم تھے۔ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قریش کے حملے کی اطلاع دے دی تھی۔ جمعہ کا دن تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز جمعہ پڑھا کر مسلمانوں کو جنگ کی تیاری کا فرمان صادر فرمایا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارادہ تھا کہ اس دفعہ مدینہ میں رہ کر ہی دشمن سے مقابلہ کیا جائے۔ لیکن جوشیلے نوجوانوں نے کھلے میدان میں لڑنے کا مشورہ دیا۔ آخر کار اکثریت کے فیصلہ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ہزار سپاہیوں کو لے کر اُحد کی طرف روانہ ہوئے۔ عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین اپنے تین سو سپاہی لے کر واپس مدینہ لوٹ گیا۔ اب اسلامی لشکر کی تعداد سات سو رہ گئی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُحد کو پشت پر اور کوہ عینین کو، جو وادی قنات میں ہے، اپنی بائیں طرف رکھ کر صف آرائی کی۔ جبل عینین پر پچاس تیر انداز متعین کیے کہ اگر وادی قنات کی راہ سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے کوئی دستہ آئے تو اسے روکیں۔ حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کو ان تیراندازوں کا قائد مقرر کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں ہدایت فرمائی۔ اگر تم دیکھو کہ پرندے ہم کو اُچک کر لے گئے ہیں تو اپنی جگہ کو نہ چھوڑو۔ یہاں تک کہ میں تمھارے پاس کسی کو بھیجوں، اور اگر

ہو کہ ہم نے دشمن کو شکست دی ہے اور مار کر پامال کر دیا ہے تو بھی ایسا ہی کرنا۔"[1]

ش کی صف آرائی

مشرکین نے جو کوہ عینین (جبل الرماۃ) میں وادی قنات سے مدینہ کی طرف کے کنارے پر ہوئے تھے۔ صفیں آراستہ کیں۔

ئی کا آغاز

انفرادی مقابلہ کے لیے مشرکین کا علمبردار طلحہ میدان میں نکلا۔ حضرت علیؓ نے ایک ہی وار سے تمام کر دیا۔ اس کے بعد اس کا بھائی عثمان مقابلہ کے لیے نکلا اور حضرت حمزہؓ کی ایک ہی ضرب سے زمین پر گرا۔

اب عام جنگ شروع ہوئی۔ مسلمانوں نے خوب بہادری کے جوہر دکھائے اور دشمن کو پسپا کر دیا۔ قریش میدان چھوڑ کر بھاگے تو مسلمان مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور پچاس آدمیوں کا دستہ بھی درہ کو خالی کر مال غنیمت کے لوٹنے میں شریک ہو گیا۔ خالد بن ولید نے جو کفار کی فوج کے میمنہ کا قائد تھا اس درہ کے راستہ سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمان اس ناگہانی حملے کی تاب نہ لا سکے۔ مسلمانوں کے علمبردار حضرت مصعبؓ بن عمیر شہید ہو گئے۔ چونکہ ان کی شکل کسی حد تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شکل سے مشابہ تھی اس وجہ سے یہ مشہور ہو گیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ اس خبر نے مسلمانوں کے حوصلوں کو بالکل ہی پست کر دیا۔ اس افراتفری کے عالم میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد صرف بارہ آدمی رہ گئے تھے۔ ایک کافر عبداللہ بن قمیہ بڑھتے بڑھتے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچ گیا اور روئے مبارک پر تلوار سے حملہ کیا۔ جس سے مغفر کی دو کڑیاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرے میں پیوست ہو گئیں اور خون بہنا شروع ہو گیا۔ ابن ہشام کے پتھر سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زخمی ہوا اور عتبہ کے پتھر سے چار دانت شہید ہوئے۔

مشرکین کے حملہ کا دباؤ کم ہوا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلامی فوج کو لے کر پہاڑ پر چلے گئے۔ اس معرکہ میں ستر مسلمان شہید ہوئے۔

ار کی بربریت

جنگ ختم ہوئی تو قریش کی عورتوں نے اپنے جوش انتقام کو بجھانے کے لیے شہداء کی لاشوں کا مثلہ کیا۔ ناک کان کاٹ کر اپنے گلوں کے ہار بنائے۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبالیا۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب ما یکرہ من التنازع والاختلاف فی الحرب۔

قرآن مجید میں جنگ اُحد کا ذکر سورہ آل عمران میں ہے۔ اس میں کفار کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ فَيَنقَلِبُوا خَائِبِينَ یعنی وہ ناکام و نامراد لوٹے۔

بعض مورخین نے حربی ناواقفیت کی بناء پر یہ لکھا ہے کہ اس لڑائی میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس لڑائی میں مسلمانوں کا زیادہ جانی نقصان ہوا ہے۔ اس بناء پر اس نقصان کی وجہ سے قرآن نے اس لڑائی کو "قرح" یعنی مصیبت کہا ہے۔ لیکن یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ زیادہ نقصان سے ہار جیت کا فیصلہ نہیں کیا جاتا، بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس فوج نے پہلے میدان جنگ کو چھوڑا ہے اور کون سی فوج میدان پر قابض رہی۔ جو فوج میدان جنگ پر قابض ہوگی وہی فوج فاتح شمار ہوگی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ لڑائی کے دوسرے دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ستر آدمیوں کی ایک جماعت کفار کی فوج کے تعاقب میں بھیجی، جن میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت زبیرؓ بھی شامل تھے۔ قرآن مجید میں یہ واقعہ مسلمانوں کی تعریف کے ساتھ مذکور ہے۔ چنانچہ یہ جماعت حمراء اسد تک، جو مدینہ سے آٹھ میل ہے، تشریف لے گئی۔ تعاقب کرنے والی فوج کو کیسے شکست خوردہ کہا جا سکتا ہے۔

نتیجہ

مسلمانوں کے ظاہری نقصان کی وجہ سے کفار، یہود، منافقین اور مدینہ کے اردگرد قبائل کے حوصلے بلند ہو گئے اور اس زعم میں مبتلا ہو گئے کہ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹایا جا سکتا ہے۔ اس طرح معرکوں میں شدت آ گئی۔

یہودیوں سے معرکے

قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ (آل عمران:۱۸) ان کے مونہوں سے بغض ظاہر ہو گیا اور جو ان کے سینے چھپاتے ہیں۔ وہ اس سے بڑھ کر ہے۔

یہود کے تین قبیلے قینقاع، نضیر اور قریظہ مدینہ کے اطراف میں آباد تھے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں ہجرت کر آئے تو مدینہ کے دفاع اور شہر کی فضا کو پُرامن بنانے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہود سے معاہدہ کیا، جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ لیکن یہود اپنے معاہدہ پر قائم نہ رہے بلکہ اسلام کی بیخ کنی کے ناپاک منصوبے گھڑنے شروع کر دیے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے کفار سے ساز باز شروع کر دی۔ غرض کہ عداوت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راتوں کو گھر سے باہر نکلتے تو جان کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔

غزوہ قینقاع۔ ۲ھ

میثاق مدینہ کی رو سے ہر جماعت کو پُرامن رہنا ضروری تھا لیکن سب سے پہلے بنو قینقاع نے عہد شکنی کی۔ واقعہ یہ ہوا کہ انصار کی ایک نقاب پوش عورت بنو قینقاع کے محلہ میں گئی۔ ایک بدخصلت یہودی نے

اپنی ہوس دید بجھانے کے لیے اس عورت کو بے نقاب کر دیا اور مسلمان عورت نے واویلا شروع کر دیا۔ ایک مسلمان یہ دیکھ کر آگے بڑھا اور یہودی کو قتل کر دیا۔ دوسرے یہودیوں نے اس مسلمان کو شہید کر دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا۔

''اگر تم لوگوں نے مسلمانوں کی ایذا رسانی سے ہاتھ نہ روکا اور صلح کے معاہدہ پر عمل نہ کیا تو تمھارے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو قریش مکہ کے ساتھ ہوا ہے۔''

وہ بولے! ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ دھوکے میں نہ رہیں۔ تم نے ایسی قوم سے مقابلہ کیا تھا جو فن حرب سے نا آشنا تھی۔ بخدا اگر ہمارے ساتھ سابقہ پڑا تو ہم دکھادیں گے کہ لڑائی اس کا نام ہے۔''

یہ بنو قینقاع کی طرف سے کھلم کھلا اعلان جنگ تھا۔ اس اعلانِ جنگ اور نقض معاہدہ کی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۲۰ ماہ شوال ۲ھ میں صحابہ کو لے کر بنو قینقاع کے قلعوں کی طرف بڑھے اور ان کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا۔ یہودی پندرہ دن کے سخت محاصرے کے بعد اس پر راضی ہوئے کہ جو فیصلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کریں وہ منظور ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مدینہ چھوڑ دو۔ چنانچہ یہ لوگ شام کے علاقہ میں جا بسے۔

غزوہ بنونضیر۔ ۴ھ

بنونضیر نے قبیلہ عامر کے دو آدمیوں کے قتل کا خون بہا دینا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان مقتولین کی دیت کا مطالبہ کرنے کے لیے ان کے محلہ میں گئے، تو یہودیوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قریب سے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک یہودی عمرو بن جحاش کوٹھے پر چڑھا، تاکہ اوپر سے پتھر لڑھکا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہلاک کر دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس منصوبہ کا علم ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوراً مدینہ واپس آ گئے، اور پرانے معاہدہ کی تجدید کرنا چاہی۔ بنو قریظہ نے تو تجدید کر دی۔ مگر بنونضیر نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے علماء سے مناظرہ کے لیے بلا کر دوبارہ قتل کرنے کی سازش کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت محمد بن مسلمہؓ کے ذریعہ یہ پیغام بھیجا کہ ''ہمارے شہر سے نکل جاؤ، کیونکہ تم نے عہد شکنی کی ہے۔ ورنہ دس روز کے بعد تم میں سے جو شخص مدینہ میں دیکھا جائے گا۔ اس کو قتل کر دیا جائے گا۔''

عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین نے کہلا بھیجا کہ اپنے گھروں کو ہرگز نہ چھوڑنا، میں دو ہزار آدمی لے کر تمہاری اعانت کروں گا۔

چنانچہ حی بن اخطب رئیس بنونضیر نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہلا بھیجا کہ ہم شہر کسی صورت میں بھی خالی نہیں کریں گے، ہمارے خلاف جو چاہیں کر گزریں۔ یہ کہلا بھیجتے ہی قلعہ بندی کی تیاری شروع کر دی اور ایک سال کے لیے اشیاء خوردنی سے گھر بھر لیے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ پیغام سن کر بنونضیر کا محاصرہ کر لیا۔ یہود پندرہ دن تک قلعہ بند رہے اور مقابلہ کی تاب نہ لا کر اس بات پر راضی ہو گئے کہ وہ مدینہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور ان کو مال و اسباب اونٹوں پر لے جانے کی اجازت ہو۔ چنانچہ سب گھروں کو چھوڑ کر نکل گئے اور خیبر میں جا کر آباد ہو گئے۔

یہودیوں نے مدینہ کے گرد و نواح کے قبائل کو مشتعل کرنا شروع کر دیا۔ اس وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شعبان ۵ھ میں قبیلہ بنی مصطلق یا اہل مریسیع سے جنگ کرنا پڑی۔ اس غزوہ میں چھ سو آدمی گرفتار اور دس قتل ہوئے۔ دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں غنیمت میں ہاتھ آئیں۔

غزوہ خندق (احزاب) ۵ھ، ۶۲۷ء

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا (الاحزاب ۲۲:۳۳) اور جب مومنوں نے جماعتوں کو دیکھا انھوں نے کہا یہ وہ ہے جس کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول نے دیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا اور اس نے انھیں صرف ایمان اور فرمانبرداری میں بڑھایا۔

یہود کے دو قبیلے بنو قینقاع اور بنو نضیر مدینہ سے جلاوطن کیے جا چکے تھے وہ لوگ خیبر اور شام کی سرحدوں میں آباد تھے۔ اب مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے منصوبے گھڑنا شروع کیے۔ یہودی رؤسا کا ایک وفد مکہ گیا اور قریش کو اپنے تعاون اور مدد کا یقین دلایا۔ قریش تو پہلے ہی مسلمانوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکستیں کھانے کی وجہ سے آتش انتقام سے بھرے بیٹھے تھے، یہود کے تعاون کی وجہ سے ان کے مردہ جسم میں بھی حرکت آ گئی۔

رؤسا یہود بنو غطفان کے پاس بھی گئے اور وعدہ کیا کہ وہ خیبر کے محاصل کا نصف حصہ انھیں دیا کریں گے۔ اس نفع بخش شرط پر بنو غطفان بھی مسلمانوں کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ اس طرح بنو نضیر، بنی قریظہ، بنو غطفان اور قریش کے متحدہ لشکر نے مدینہ پر چڑھائی کر دی۔ فوج کی کل تعداد بروایات مختلفہ کم سے کم دس ہزار اور زیادہ سے زیادہ چوبیس ہزار تھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلمان فارسیؓ کے مشورہ پر مدینہ منورہ کے گردا گرد خندق کھودنا شروع کر دی۔ عورتوں اور بچوں کو محفوظ گڑھیوں میں بھیج دیا چونکہ بنو قریظہ کے حملے کا اندیشہ تھا اس لیے دو سو مجاہدین کو حضرت سلیم بن اسلم کی سرکردگی میں متعین کیا گیا تاکہ ادھر سے حملہ نہ ہونے پائے۔

جب خندق مکمل ہو گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پوری فوج کے ساتھ جبل سلع پر پڑاؤ لگا کر مقیم ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خیمہ جبل سلع کے ایک اہم مگر محفوظ مقام پر نصب کر دیا گیا۔

بنو قریظہ کی بدعہدی

جب بنو قریظہ نے کفار کا اتنا عظیم لشکر دیکھا اور ان کو یقین ہو گیا کہ یہ لشکر مسلمانوں کو تباہ کیے بغیر

واپس نہیں لوٹے گا، وہ مدینہ کے اندر رہ کر مسلمانوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔

مسلمانوں کی فوج میں منافق بھی شامل ہو گئے تھے، لیکن راتوں کی بے خوابی اور متواتر فاقوں نے ان کی منافقت کا راز فاش کر دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اجازت مانگتے کہ ہمارے گھر محفوظ نہیں، ہم کو شہر میں واپس چلے جانے کی اجازت دی جائے۔

غرض کہ مسلمان شہر سے باہر اور اندر دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے اور مسلمانوں کے لیے نہایت ہی نازک وقت تھا۔ قرآن مجید نے اس پُرخطرہ گھڑیوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

إِذْ جَاءُ وْكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا. هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا (الاحزاب ۳۳: ۱۰، ۱۱) جب وہ تمھارے اوپر سے اور تمھارے نیچے سے تم پر آ گئے اور جب آنکھوں میں اندھیرا آ گیا اور دل دہشت سے گویا حلقوں تک پہنچ گئے اور تم اللہ پر مختلف قسم کے ظن کرنے لگے۔ وہاں مومن آزمائے گئے اور سخت مصائب میں ڈالے گئے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ نے کئی کئی دن کے فاقے گزارے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعد بن عبادہؓ اور حضرت سعد بن معاذؓ جو روسائے انصار تھے بلا کر مشورہ کیا کہ غطفان سے مدینہ کی پیداوار کے ایک ثلث پر معاہدہ کر لیں۔ دونوں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگر یہ خدا کا حکم ہے تو انکار نہیں، اگر رائے ہے تو گزارش ہے کہ کفر کی حالت میں بھی ہم نے کبھی خراج نہیں دیا، اب ہم ان سے دب کر خراج ادا کرنے کو تیار نہیں۔ جو کچھ بھی ہو ہم لڑائی لڑیں گے۔

کفار نے ایک ماہ تک محاصرہ جاری رکھا۔ اس دوران کئی بار کفار کے بہادروں نے خندق پھاندنے کی کوشش کی۔ ایک جگہ سے خندق کم چوڑی تھی، وہ حملہ کے لیے انتخاب کی گئی۔ ضرار، جبیرہ، نوفل، عمرو بن عبدود نے خندق کے بیرونی کنارے سے اپنے اپنے گھوڑے کو مہمیز کیا اور چشم زدن میں مسلمانوں کے سر پر آ پہنچے۔ عمرو بن عبدود نے مسلمانوں کو مبارزت کے لیے للکارا۔ حضرت علیؓ مقابلہ کے لیے نکلے اور عمرو بن عبدود کا کام تمام کر دیا۔ جبیرہ اور نوفل ڈر کر پیچھے لوٹے۔ نوفل خندق میں گرا۔ حضرت علیؓ خندق میں اترے اور تلوار سے قتل کر دیا۔

اس اثناء میں شوال کا مہینہ ختم ہو چلا اور ذی قعدہ قریب آ گیا جو شہر حرم کا آغاز تھا، جس میں قریش مذہباً لڑائی نہیں کر سکتے تھے۔ موسم خراب آ گیا۔ بارش، آندھی، سردی اور قلت رسد وغیرہ سے محاصرین کے پائے ثبات میں لغزش آ گئی۔ آخر بیزار ہو کر ابوسفیان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مکہ روانہ ہو گیا اور دوسرے قبائل بھی یکے بعد دیگرے چلتے بنے۔

بنوقریظہ کا خاتمہ۔ ۵ھ

بنوقریظہ نے جنگ خندق میں نہ صرف معاہدہ کی خلاف ورزی کی بلکہ جہاں مسلمان عورتیں مقیم تھیں وہاں انھوں نے حملہ کرنے کی کوشش کی۔ اہل مکہ کے ساتھ دیگر قبائل کو جنگ پر ابھارا۔ محاصرہ اٹھ جانے کے معا بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنوقریظہ کا محاصرہ کیا۔ ایک ماہ بعد بنوقریظہ نے ہتھیار ڈال دیے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ حضرت سعدؓ بن معاذ جو فیصلہ کریں گے وہ منظور ہے۔ سعدؓ نے توریت کے مطابق یہ فیصلہ کیا۔

۱۔ بنوقریظہ کے جنگ جو مرد قتل کر دیے جائیں۔

۲۔ عورتیں اور بچے مملوک بنا لیے جائیں۔

۳۔ مال واسباب غنیمت قرار دیا جائے۔

اس فیصلہ کی رو سے چار سو یہودی قتل کر دیے گئے۔

یہ فیصلہ یہود کے اپنے نامزد ثالث نے تورات کی رو سے کیا تھا۔ یقیناً اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں فیصلہ ہوتا تو نرم فیصلہ کرتے۔ بنوقینقاع اور بنونظیر کے متعلق فیصلے مثال ہیں کہ عہد شکنوں کے متعلق کتنے رحمدلانہ فیصلے کیے۔

صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان۔ ۶ھ۔ ۶۲۸ء

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا (الفتح ۴۸:۱) ہم نے تیرے لیے ایک کھلی فتح کی راہ کھول دی ہے۔

جنگ احزاب پر قریباً ایک سال کی مدت گزر گئی۔ موسم حج قریب آیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رویاء میں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں۔ اس رویاء کے پیش نظر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیت اللہ کی زیارت کا اعلان فرمایا۔ یہ خبر سرعت کے ساتھ مدینہ میں پھیل گئی، کیونکہ صحابہ پہلے سے ہی اس سعید گھڑی کے منتظر تھے۔ ان کی ارواح بیت اللہ کی زیارت کے لیے تڑپتی تھیں۔ ان کے قلوب میں بیت اللہ کی یاد گدگدی لیتی رہتی تھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چودہ سو پاک باز مقدس صحابہ کے ساتھ ذی قعدہ ۶ھ میں عمرہ کے لیے عازم مکہ ہوئے۔ قربانی کے اونٹ ساتھ تھے۔ حذر واحتیاط کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ کوئی بھی جنگ کے ہتھیار اور سامان ساتھ نہ لے تاکہ قریش مزاحمت کا بہانہ نہ بنالیں۔ صرف تلوار جو عرب کا ضروری اسلحہ تھا۔ ساتھ لی جائے۔ اس میں بھی یہ شرط تھی کہ نیام میں بند ہو۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذوالحلیفہ پہنچے جو اہل مدینہ کا میقات ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احرام باندھا اور قربانیوں کو شعار کیا۔

جب کفار مکہ کو مسلمانوں کی آمد کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے ایک لشکر مقابلہ کے لیے تیار کیا، تاکہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روکیں۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ علم ہوا کہ کفار لڑائی

کے لیے تیار ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ ہم عمرہ کی نیت سے آئے ہیں۔ اگر کوئی شخص ہمارے اور بیت اللہ کے درمیان حائل ہو تو ہمیں مجبوراً اس سے لڑنا چاہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ رائے پسند فرمائی اور آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بڑھتے ہوئے ثنیۃ المراء تک پہنچ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی اس جگہ بیٹھ گئی۔ لوگوں نے کہا کہ اونٹنی نے دھوکہ دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اونٹنی نے دھوکہ نہیں دیا، حرمات اللہ کے خلاف تمہاری خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اونٹنی کو جھڑکا۔ وہ اُٹھ کر چل پڑی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیبیہ کے پرلی طرف کنویں پر اترے۔

قبیلہ خزاعہ کا رئیس اعظم بدیل بن ورقاء چند آدمیوں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ قریش نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مزاحمت کے لیے ایک عظیم لشکر جمع کر رکھا ہے، وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کعبہ میں جانے نہیں دیں گے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدیل کے ذریعے قریش کو یہ پیغام بھیجا کہ ان کے لیے یہ بہتر ہے کہ ایک مدت کے لیے ہمارے ساتھ معاہدہ کرلیں۔ جب بدیل نے یہ پیغام دیا تو عروہ بن مسعود ثقفی نے کہا۔ یہ بات تمھارے لیے مناسب اور بہتر ہے، اسے قبول کرلو۔

عروہ قریش کی طرف سے سفیر ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور گفتگو کی۔ اس دوران میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت اور والہانہ محبت کا بھی نظارہ کیا۔ گفتگو کرنے کے بعد عروہ واپس مکہ چلا گیا۔ چونکہ معاملہ ناتمام رہ گیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خراشؓ بن امیہ کو قریش کے پاس بھیجا، لیکن قریش اس سے بدسلوکی سے پیش آئے۔

قریش نے ایک دستہ بھیجا کہ وہ مسلمانوں پر حملہ آور ہو، لیکن صحابہ کرام نے دیکھ لیا اور سب کو گرفتار کرلیا۔ لیکن بعد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے سب کو آزاد کر دیا گیا۔

حضرت خراشؓ کی ناکامی کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو قریش کی طرف مصالحت کے لیے بھیجا۔ قریش نے ان کو نظر بند کرلیا۔

بیعت رضوان

حضرت عثمانؓ بن عفان کے واپس آنے میں تاخیر ہوئی تو یہ خبر مشہور ہوگئی کہ وہ شہید کر دیے گئے ہیں۔ اس خبر کے سنتے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک عثمانؓ کا بدلہ نہ لے لیں گے۔ یہاں سے نہ ٹلیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور تمام صحابہ سے جان نثاری کی بیعت لی۔ تاریخ میں یہ بیعت ''بیعت رضوان'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ

فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا (الفتح ۴۸:۱۸) خدا مومنوں سے راضی ہو گیا کہ وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ خدا نے جان لیا جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں تھا تو خدا نے ان پر تسلی نازل کی اور جلد فتح دی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد حضرت عثمانؓ مکہ سے تشریف لے آئے۔ انھوں نے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس قسم کی بیعت کی۔

قریش کے فہمیدہ طبقہ نے سہیل بن عمرو کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ قریش نے ان سے صاف صاف یہ کہہ دیا تھا کہ صلح صرف اس شرط پر ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس سال واپس چلا جائے۔

سہیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ اس نے شرائط صلح پیش کیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان شرائط کو قبول فرما دیا۔

شرائط معاہدہ

۱۔ مسلمان اس سال بغیر عمرہ کیے واپس چلے جائیں۔

۲۔ اگلے سال آئیں مگر تین دن سے زیادہ مکہ میں قیام نہ کریں۔

۳۔ ہتھیار لگا کر نہ آئیں۔ صرف تلوار ساتھ لائیں۔ وہ بھی نیام میں اور نیام بھی حلبان میں۔

۴۔ مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں۔ ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے کوئی مکہ میں رہنا چاہے تو اس کو نہ روکیں۔

۵۔ مسلمانوں میں سے کوئی شخص مدینے جائے تو واپس کر دیا جائے۔ لیکن لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں آ جائے تو واپس نہیں کیا جائے گا۔

۶۔ قبائل عرب کو اختیار ہو گا کہ جس فریق کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔

ابھی شرائط نہیں لکھی گئی تھیں کہ ابوجندلؓ سہیل کا لڑکا بیڑیوں میں جکڑا ہوا آیا، لیکن معاہدہ کی پابندی کرتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوجندلؓ کو مکہ واپس چلے جانے کی نصیحت کی۔

اس معاہدہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ یہیں قربانی کر دیں۔ چنانچہ وہیں قربانیاں کر دی گئیں اور احرام اتار دیے گئے۔

فتح مبین

عہدنامہ کے بعد قبیلہ خزاعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حلیف ہو گیا اور قبیلہ بنوبکر، قریش کا حلیف بن گیا۔

صلح کے بعد تین دن تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ میں قیام فرمایا۔ پھر وہاں سے مدینہ روانہ ہوئے تو راستہ میں سورہ فتح نازل ہوئی۔

صلح حدیبیہ مسلمانوں کی فتح کا دیباچہ بن گئی۔ اس صلح سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوئے۔

۱۔ لوگ آزادی سے مکہ اور مدینہ آنے جانے لگے۔ اس اختلاط اور ملاپ کی وجہ سے کفار کو اسلامی معاشرہ کے دیکھنے کا قریب سے موقع مل گیا، اور وہ اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ لوگوں نے سرعت کے ساتھ اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔

۲۔ ایک مسلمان ابو بصیرؓ مکہ سے بھاگ کر مدینہ چلا گیا۔ معاہدہ کی شرط کے مطابق مکہ والے اس کو واپس لینے کے لیے آئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو بصیرؓ کو واپس چلے جانے کا حکم دے دیا۔ ابو بصیرؓ نے راستے میں ایک کو توقتل کر دیا اور دوسرا بھاگ کر مدینہ پہنچا۔ ابو بصیرؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو واپس کر دیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ یہ کہہ کر اس نے مقام عیص میں جو سمندر کے کنارے پر ہے۔ سکونت اختیار کر لی۔ اب مکہ کے مظلوم مسلمان بھاگ بھاگ کر عیص پہنچنا شروع ہو گئے۔ اس طرح ایک نو آبادی بن گئی۔ اب ان لوگوں نے اتنی طاقت پکڑ لی کہ قریش کے تجارتی قافلوں پر حملہ آور ہوتے اور مال غنیمت حاصل کر کے گزران کرتے۔ قریش نے مجبور ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں لکھا کہ ہم معاہدہ کی اس شرط کو چھوڑتے ہیں، اب جو آدمی مسلمان ہو کر مدینہ جانا چاہتا ہے۔ اس کو مدینہ جانے کی اجازت ہے۔

شاہانِ عرب وعجم کو دعوتِ اسلام

(آخر ۶ھ تا ۹ھ)

قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ (آل عمران ۳:۶۴) کہو اے اہل کتاب اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے تمہارے درمیان برابر ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو سوائے اللہ کے رب بنائے۔

اسلام دوسرے مذاہب کی طرح قومی مذہب نہ تھا بلکہ عالمگیر مذہب تھا۔ جونہی یہود کی طاقت ٹوٹنے اور حدیبیہ کی صلح سے کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو وقت آ گیا کہ اتمام حجت کے لیے اسلام کا پیغام تمام دنیا تک پہنچا دیا جائے۔ سب سے پہلے یہ کام سرانجام دیا۔ ایک دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام صحابہ کو اکٹھا کیا اور خطبہ دیا۔ اے لوگو! خدا نے مجھے تمام دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ دیکھو حوارین

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح اختلاف نہ کرنا۔ جاؤ میری طرف سے پیغام حق ادا کرو۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیصر روم، کسریٰ، عزیز مصر، نجاشی اور روسائے عرب کے نام خطوط ارسال کیے۔ مکتوب الیہم اور حاملین مکتوبات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

	مکتوب الیہ	حامل
۱۔	قیصر روم	حضرت وحیہؓ کلبی
۲۔	کسریٰ ایران (خسرو پرویز)	حضرت عبداللہ بنؓ حذافہ سہمی
۳۔	عزیز مصر	حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ
۴۔	نجاشی بادشاہ حبش (اصحمہ)	حضرت عمروؓ بن امیہ الضمری
۵۔	رئیس یمامہ ہوذہ بن علی	حضرت سلیط بنؓ عمر بن عبد شمس
۶۔	منذر بن ساوی شاہ بحرین	حضرت علاء بنؓ حضرمی
۷۔	شاہ عمان	حضرت عمروؓ بن العاص
۸۔	حارث بن ابوشمر رئیس غسان	حضرت شجاعؓ بن وہب الاسدی
۹۔	حارث بن عبد کلال حمیری شاہ یمن	حضرت مہاجرؓ بن ابی امیہ مخزومی
۱۰۔	شرجیل حاکم بصری	حارث بنؓ عمیر

ایران اور بصری کے والی سفیروں کے ساتھ گستاخی سے پیش آئے۔ آخر الذکر نے سفیر کو قتل کر دیا۔ نجاشی شاہ حبش نے اسلام قبول کیا۔ مقوقس شاہ مصر نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کچھ تحفے تحائف بھیجے۔ ان تحائف میں ایک خچر تھی۔ اور دو لونڈیاں تھیں، جن میں ایک ماریہ قبطیہ تھیں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح کے بعد اپنے حرم میں داخل کیا، دوسری حضرت حسانؓ بن ثابت کی زوجیت میں آئیں۔ ہرقل بھی بہت متاثر ہوا، اس نے اپنے علماء کو بلا کر ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ دین اسلام کو قبول کر لینے میں ہماری بہتری اور بھلائی ہے۔ جب ان علماء کو سخت متنفر پایا تو کہہ دیا کہ میں نے تو صرف تمھیں آزمانے کے لیے ایسا کہا ہے۔ بحرین کے حاکم منذر بن ساوی نے اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔ عمان کے دونوں بھائی جیفر اور عبد کافی لیت ولعل کرنے کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ یمامہ کے حاکم ہوذہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جواب میں لکھا کہ اگر حکومت کا نصف مجھے دے دیا جائے تو میں اسلام قبول کرلوں گا۔ دمشق کا حاکم پہلے تو بہت بگڑا، بعد میں سفیر کو احترام کے ساتھ روانہ کیا۔

غزوہ خیبر۔ ۷ھ: ۶۲۹ء

خیبر یہودی قوت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ بنونضیر مدینہ سے جلاوطنی کے بعد یہاں آ کر آباد ہوئے تھے۔ ان کے دل اسلام کی عداوت میں جل رہے تھے۔ انھوں نے تمام قبائل عرب اور قریش مکہ کو مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لیے برانگیختہ کیا، جس کے نتیجہ میں احزاب کا معرکہ ہوا۔

حی بن اخطب کے قتل کے بعد ابو رافع سلام بن ابی الحقیق اس کا جانشین ہوا۔ سلام نے قبیلہ غطفان اور آس پاس کے قبائل کو اسلام کے خلاف اکسایا اور ایک لشکر جرار اکٹھا کر کے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ایک انصاری عبداللہ بن عتیکؓ نے خیبر میں جا کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت سے سلام کو قتل کر دیا۔

سلام کے قتل کے بعد اُسیر بن زرام مسند نشین ہوا۔ غطفان اور دیگر قبائل میں دورہ کر کے ایک عظیم الشان فوج تیار کی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خبریں پہنچیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو چند صحابہ کے ساتھ تحقیق کے لیے بھیجا۔ انھوں نے چھپ کر اُسیر کی زبانی تمام تدابیر سنیں۔ واپس آ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گوش گزار کیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارہ اُسیر کی خدمت میں عبداللہ بن رواحہؓ کو تیس آدمیوں کے ساتھ خیبر بھیجا۔ وہ اُسیر سے ملے اور کہا کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ اگر تم مدینہ آ جاؤ تو خیبر کی حکومت تم کو دے دی جائے گی۔ چنانچہ وہ بھی تیس آدمیوں کو لے کر خیبر سے نکلا۔ ایک ایک اونٹ پر ایک ایک یہودی اور ایک ایک مسلمان ہم رکاب ہوئے۔ قرقرہ پہنچ کر اُسیر نے عبداللہ پر حملہ کرنا چاہا، تو عبداللہ نے بڑھ کر اُسیر کا خاتمہ کر دیا۔ اب مسلمان یہود پر ٹوٹ پڑے اور ایک کے سوا سب کا خاتمہ کر دیا۔ یہ اخیر ۶ھ کا واقعہ ہے۔

اس واقعہ نے جنگ کے شعلے بھڑکا دیے۔ کنانہ بن الربیع بن ابی الحقیق نے زمام امارت ہاتھ میں لیتے ہی مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ قبیلہ غطفان کو اپنے ساتھ ملایا۔ غطفان کا ایک طاقت ور قبیلہ بنو فزارہ خیبر میں آیا اور مدد کا وعدہ کیا۔ چنانچہ غطفان نے مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

اس قبیلہ کے چند آدمیوں نے عبدالرحمٰن بن عتبہ کی قیادت میں ذی قرہ کی چراگاہ پر چھاپہ مارا۔ حضرت ابوذرؓ کے صاحبزادے کو قتل کر کے ۱۲۰ اونٹنیاں اور ان کی بیوی کو پکڑ کر لے گئے۔ لیکن مسلمانوں کی بروقت مدد نے اونٹنیوں اور حضرت ابوذرؓ کی بہو کو چھڑا لیا۔ اس واقعہ کے تین دن بعد خیبر کی جنگ ہوئی۔

محرم کے مہینے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سولہ سو مسلمانوں کی جمعیت لے کر خیبر کی طرف روانہ ہوئے۔ خیبر میں دس قلعے تھے جن میں بیس ہزار جنگی سپاہی رہتے تھے۔ ان میں قموص سب سے زیادہ مضبوط اور محفوظ قلعہ تھا۔ مرحب عرب کا مشہور پہلوان اس قلعہ کا رئیس اعظم تھا۔ ابن ابی الحقیق کا خاندان بھی یہیں رہتا تھا۔

پہلے قلعہ ناعم کو فتح کیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے کچھ دوسرے چھوٹے چھوٹے قلعے فتح کیے۔ سب سے زیادہ سخت مقابلہ قموص کے فتح کرنے میں پیش آیا۔ پہلے یکے بعد دیگرے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو قلعہ فتح کرنے کے لیے مامور کیا، لیکن قلعہ فتح نہ ہوا۔ تب حضرت علیؓ کو اس مہم پر مامور کیا۔ حضرت علیؓ نے مرحب اور عنتر سے جنگ کر کے انھیں ابدی نیند سلا دیا۔ ان کے قتل ہوتے ہی یہودیوں کے حوصلے پست

ہو گئے۔ بیس دن کے بعد قلعہ فتح ہو گیا۔ یہودیوں کی درخواست پر خیبر انہی کے قبضہ میں رہنے دیا گیا۔ نصف پیداوار ہر سال بیت المال میں آتی تھی۔

رئیس خیبر کی لڑکی حضرت صفیہ قیدیوں میں گرفتار ہو کر آئیں اور وہ حضرت دحیہؓ کلبی کے حصہ میں آئیں۔ لوگوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: اتنے بڑے رئیس کی لڑکی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شایان شان ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صفیہ کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیا۔

خیبر کی فتح کے بعد یہود کے بقیہ مراکز۔ ۱۔ فدک۔ ۲۔ وادی القری۔ ۳۔ وادی تیماء مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئے۔

ادائے عمرہ۔ ۷ھ

صلح حدیبیہ کے مطابق اسی سال رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرہ کرنے کے لیے مکہ تشریف لے گئے۔ اہل مکہ نے تین دن کے لیے شہر خالی کر دیا۔ عمرہ ادا کرنے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس تشریف لے آئے۔

غزوہ موتہ۔ ۸ھ: ۶۳۰ء

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شاہ بصری شرجیل بن عمرو غسانی کے نام ایک تبلیغی مراسلہ حضرت حارث بنؓ عمیر کے ہاتھ بھیجا۔ شاہ نے سفیر کو قتل کر دیا۔ اس کا قصاص لینے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین ہزار کا لشکر حضرت زید بنؓ حارثہ کی قیادت میں روانہ کیا، اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اگر زیدؓ بن حارثہ شہید ہو جائیں تو جعفرؓ کو امیر بنا لینا۔ اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بنؓ رواحہ کو امیر بنا لینا اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو پھر مسلمان جس کو مناسب سمجھیں اپنا امیر بنا لیں۔

لشکر کو روانہ کرتے ہوئے حسب ذیل وصیت فرمائی۔

۱۔ راہبوں سے کوئی تعرض نہ کرنا۔
۲۔ کسی عورت پر ہرگز ہاتھ نہ اٹھانا۔
۳۔ کسی بچے کو قتل نہ کرنا۔
۴۔ کسی بوڑھے کو نہ مارنا۔
۵۔ پھل دار درخت اور سرسبز درختوں کو نہ کاٹنا۔
۶۔ کوئی مکان منہدم نہ کرنا۔

اس کے بعد فرمایا کہ اظہار تعزیت کے لیے اس مقام پر جانا جہاں حارث بن عمیرؓ کو شہید کیا گیا تھا۔ شرجیل ایک لاکھ کا لشکر لے کر مقابلہ کے لیے نکلا۔ مسلمانوں نے نہایت ہی پامردی اور جانبازی

سے مقابلہ کیا، مگر دونوں لشکروں کی تعداد میں کیا نسبت؟ حضرت زیدؓ نے شہادت کا جامِ نوش کیا۔ فوراً علم حضرت جعفرؓ نے سنبھالا۔ وہ بھی پامردی سے شہید ہوئے تو حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے لشکر کی قیادت سنبھال لی۔ وہ بھی شہید ہو گئے۔ اس کے بعد مسلمانوں نے بالاتفاق لشکر کی کمان حضرت خالدؓ بن ولید کے سپرد کی۔ حضرت خالدؓ نے دشمن کے لشکر پر اس خوبی سے پے در پے حملے کیے کہ دشمن لشکر کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ جب شام ہونے کو آئی تو رومی لشکر میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ مسلمانوں نے تھوڑی دور تک تعاقب کیا اور کچھ مالِ غنیمت بھی ہاتھ آیا۔

اس جنگ میں کل بارہ صحابی شہید ہوئے۔ کفار کے مقتولوں کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی۔

فتح مکہ......تاریخ اسلام کا عظیم واقعہ

رمضان ۸ھ: جنوری ۶۳۰ء

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا (الفتح ۴۸:۱) ہم نے تیرے لیے ایک کھلی فتح کی راہ کھول دی۔

(دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا۔) (استثناء ۳۳:۲)

صلح حدیبیہ کی رو سے بنوخزاعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حلیف بن گئے اور بنوبکر قریش کے۔ دونوں قبیلوں کے درمیان پشتینی عداوت چلی آ رہی تھی۔ صلح حدیبیہ کے بعد بظاہر عداوت کی آگ ٹھنڈی ہو گئی، لیکن معاہدہ پر ابھی دو برس بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ بنوبکر نے رات کے وقت بنوخزاعہ پر حملہ کیا۔ قریش مکہ نے بنوبکر کو اسلحہ وغیرہ سے مدد دی۔ عکرمہ، صفوان بن اُمیہ اور سہیل بن عمرو نے راتوں کو بھیس بدل کر بنوبکر کے ساتھ تلواریں چلائیں۔ بنوخزاعہ نے مجبور ہو کر حرم میں پناہ لیں۔ لیکن ان ظالموں نے حرم کا بھی احترام نہ کیا۔ وہاں بھی انسانوں کا خون بہا دیا گیا۔

قبیلہ بنوخزاعہ کا سردار عمرو بن سالم چالیس ناقہ سواروں کی جمعیت میں مدینہ پہنچا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں صحابہ کرام کے درمیان تشریف فرما تھے۔ عمرو بن سالم نے قریش مکہ کی بدعہدی اور مظالم کی شکایت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی درد بھری فریاد سنی۔ تسلی دی اور کہا کہ ہم تمہاری امداد کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرائط پیش کیں کہ ان میں سے کوئی منظور کی جائے۔

۱۔ مقتولوں کا خون بہا دیا جائے۔

۲۔ قریش بنوبکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

۳۔ اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

قرطہ بن عمرو نے قریش کی زبان سے کہا کہ "صرف تیسری شرط منظور ہے۔" قاصد کے چلے

جانے کے بعد قریش کو اپنی عاقبت نااندیشی پر ندامت ہوئی کیونکہ ان کو مستقبل کی تاریکیوں میں خطرات کے سیلاب امڈتے نظر آرہے تھے۔ انھوں نے ابوسفیان کو فوراً مدینہ بھیجا کہ وہ معاہدہ کی تجدید کرائے۔ ابوسفیان مدینہ آیا اور تجدید معاہدہ کی خواہش کی، مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منظور نہ فرمایا۔

مکہ پر چڑھائی

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱۰ رمضان ۸ھ میں دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ مکہ روانہ ہوئے اور نہایت تیز رفتاری سے منزلیں طے کرتے ہوئے جارہے تھے۔ مقام جحفہ میں پہنچے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب مع اہل وعیال مسلمان ہو کر مدینہ کی طرف آتے ہوئے ملے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اہل وعیال کو تو مدینہ منورہ بھیج دیا اور حضرت عباسؓ کو اپنے ہمراہ لے لیا۔ مرالظہران (جو مکہ سے چار کوس کے فاصلہ پر ہے) پہنچ کر اسلامی لشکر نے پڑاؤ ڈالا اور مختلف دستے دور دور تک پھیل گئے۔ رات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ ہر مسلمان مجاہد پڑاؤ پر آگ روشن کرے۔ چرواہوں کے ذریعہ قریش کو خبر پہنچی تو ابوسفیان، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء حالات معلوم کرنے کے لیے آئے لیکن گرفتار ہو گئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوسفیان کو معاف کر دیا اور وہیں دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اور بعد کے غزوات میں اپنے عمل سے خلوص اور وفاداری کا اظہار کیا۔ غزوہ طائف میں ان کی ایک آنکھ زخمی ہوئی اور یرموک میں وہ بھی جاتی رہی۔

ابوسفیان کی عزت افزائی

حضرت عباسؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: یارسول اللہ! ابوسفیان کو اس موقع پر خاص عزت بخشیں۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اچھا، جو شخص خانہ کعبہ میں پناہ لے گا اس کو امان دی جائیگی۔ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا اس کو بھی امان دی جائے گی۔ جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے گا وہ بھی امان میں رہے گا جو شخص بغیر ہتھیار لگائے راہ میں ملے گا۔ اس کو بھی امان دی جائے گی۔"

اس وقت قدوسیوں کا لشکر مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ مختلف سمتوں سے مختلف دستے مکہ میں داخل ہوئے۔ حضرت خالدؓ بن ولید کے دستہ کے سوا باقی اسلامی لشکر بغیر مزاحمت کے اپنے مقررہ راستوں سے شہر میں داخل ہو گئے۔ مگر حضرت خالدؓ کو مقابلہ کرنا پڑا، کیونکہ اس سمت کے لوگوں نے صفوان بن امیہ، سہیل بن عمرو اور عکرمہ بن ابی جہل کی قیادت میں مورچے سنبھالے ہوئے تھے۔ جونہی حضرت خالدؓ کا دستہ قریب پہنچا، انھوں نے تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ لیکن حضرت خالدؓ نے جوابی حملہ کیا۔ یہ لوگ تیرہ بروایت دیگر اٹھارہ مقتولین چھوڑ کر بھاگ گئے۔ تین مسلمانوں نے شہادت پائی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلواروں کی چمک دیکھی تو حضرت خالدؓ سے باز پرس کی۔

لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ قتال کا آغاز دشمنوں کی طرف سے ہوا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''قضائے الٰہی یہی تھی۔''

تھوڑا سا عرصہ استراحت کرنے کے بعد اپنی ناقہ قصواء پر سوار ہو کر بیت اللہ کی طرف گئے۔ کسی جابر فاتح کی طرح نہیں، کہ جب وہ اپنے دشمنوں پر قابو پالیتا ہے تو نشہ نخوت میں چور ہو کر اکڑتا ہوا اور سینہ تانتا ہوا چلتا ہے، بلکہ ابن ہشام کے قول کے مطابق ''شرماتے، بارگاہ خداوندی میں سر نیاز جھکاتے اور بار بار اونٹنی کے کجاوے ہی پر سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے جا رہے تھے۔''

سواری پر ہی سات بار بیت اللہ کا طواف کیا۔ بیت اللہ کے اردگرد جتنے بت تھے ایک ایک کو لکڑی کی ٹھوکر مارتے جاتے اور یہ پڑھتے جاتے تھے۔ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل ۱۷:۸۱) حق آیا اور باطل بھاگ گیا یقیناً باطل بھاگ ہی جاتا ہے۔

اس کام سے فارغ ہو کر عثمان بن ابی طلحہ کو طلب فرمایا۔ ان کے خاندان میں مدت سے کعبہ کی کلید چلی آتی تھیں۔ کلید طلب کی۔ دروازہ کھلوایا۔ عین کعبہ کے اندر بہت سے بت تھے، جن کو قریش خدا مانتے تھے۔ داخل ہونے سے قبل حکم دیا کہ سب کو نکلوا دیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے اندر جا کر سب تصاویر کو مٹا دیا۔ جب بیت اللہ بتوں اور تصاویر سے پاک ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت بلالؓ اور حضرت طلحہؓ کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور نماز ادا کی۔ پھر کنجی عثمان کو واپس کر دی اور فرمایا کہ یہ ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس اور تمہاری نسل میں رہے گی۔ اس کے بعد خانہ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا، جس میں توحید الٰہی اور نسل انسانی کی وحدت کو بیان کیا، وہ خطبہ یہ ہے۔

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کیا اس نے اپنے بندہ کی مدد کی۔ تمام جتھوں کو تنہا شکست دی۔ ہاں تمام تفاخر، ہر قسم کا مطالبہ خواہ وہ خون کا مطالبہ ہو یا مال کا وہ میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ صرف حرم کعبہ کی تولیت اور حجاج کے لیے پانی فراہم کرنے کی خدمت اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اے قوم قریش! اب جاہلیت کا تکبر اور نسبت کا افتخار اللہ تعالیٰ نے مٹا دیا ہے تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے ہے۔''

پھر قریش سے پوچھا۔ ''تمھیں معلوم ہے کہ میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟'' وہ فوراً پکار اٹھے: ''اخ کریم وابن اخ کریم۔'' تو شریف بھائی ہے اور شریف بھائی کا بیٹا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ جواب سن کر فرمایا: ''اچھا میں بھی تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے مجرم بھائیوں کو کہا تھا۔ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ: آج تم پر کوئی گرفت نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔'' چنانچہ چند مجرموں کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کی خطاؤں کو معاف کر دیا۔

نماز کا وقت آیا تو حضرت بلالؓ نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی۔ ان کی جاہلیت کی رگ حمیت پھڑک اٹھی۔ عتاب بن اسید نے کہا: ''خدا نے میرے باپ کی عزت رکھ لی کہ اس آواز کے سننے سے

پہلے اس کو دنیا سے اٹھالیا۔ ایک اور رئیس قریش نے کہا: "اب جینا بیکار ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صفا پہاڑی پر چڑھ گئے اور مسلمان ہونے والوں کی بیعت قبول کی۔

بیعت کرنے والے مندرجہ ذیل باتوں کا اقرار کرتے تھے:۔

۱۔ میں خدا کے ساتھ کسی کو بھی اس کی ذات، صفات اور عبادت میں شریک نہ کروں گا۔

۲۔ میں چوری نہ کروں گا، زنا نہ کروں گا، خون ناحق نہ کروں گا، لڑکیوں کو زندہ درگور نہ کروں گا، کسی پر بہتان نہ لگاؤں گا۔

۳۔ امر بالمعروف میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت بقدر استطاعت کروں گا۔ عورتوں سے مزید اقرار یہ بھی لیے جاتے تھے۔

کسی کے سوگ میں منہ نہ نوچیں گی۔ طمانچوں سے چہرہ نہ پیٹیں گی۔ نہ سر کے بال گھسوٹیں گی۔ نہ گریبان چاک کریں گی۔ نہ سیاہ کپڑے پہنیں گی۔ نہ قبر پر سوگواری میں بیٹھیں گی۔

فتح مکہ کا ذکر بائبل میں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آخری وصیت میں بشارت۔

"اور کہا خداوند سینا سے آیا اور طلوع ہوا۔ شعیر سے ان کے لیے وہ جلوہ گر ہوا فاران کے پہاڑ سے اور وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا ہے اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لیے آتشی شریعت ہے۔"

(استثناء ۳۳:۲)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی بشارت

حضرت سلیمان علیہ السلام غزل الغزلات باب ۵ آیت ۱۵ میں فرماتے ہیں:

"میرا دوست روشن چہرہ اور سرخ رنگ دس ہزار میں ممتاز۔"

غزوہ حنین۔ شوال ۸ھ: ۶۳۰ء

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ (توبہ ۹:۲۵) حنین کے دن جب تمہاری کثرت تمھیں اچھی لگی پھر وہ تمھارے کچھ کام نہ آئی اور تم پر زمین باوجود فراخی کے تنگ ہوگئی تب تم پیٹھ دیتے ہوئے پھر گئے۔

فتح مکہ کے بعد بنو ہوازن اور ثقیف نے مسلمانوں سے آخری لڑائی لڑنے کی تیاری شروع کر دی۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی تیاری کا علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجبوراً مقابلہ کی تیاری شروع کر دی۔

شوال ۸ھ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پورے ساز و سامان کے ساتھ لیس ہو کر بارہ ہزار

کی جمعیت کے ساتھ حنین کی طرف بڑھے۔ اپنی تعداد اور اسلحہ کی کثرت کی وجہ سے بعض صحابہ کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے۔ ''آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے۔'' اللہ تعالیٰ کو یہ الفاظ پسند نہ آئے۔ اب اللہ تعالیٰ یہ دکھانا چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی فتوحات اس کی نصرت اور فضل سے تھیں۔ آغاز جنگ میں مسلمانوں کو وہ نظارہ دیکھنا پڑا جس کا ذکر عنوان باب میں نقل ہو چکا ہے۔

حنین کی لڑائی جبل اوطاس کے دروں اور پر پیچ وادیوں کے قریب ہوئی تھی۔ دشمن لشکر السلام کے آنے کی خبر سن کر پہاڑ کے دروں اور پیچیدہ گزرگاہوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جونہی مسلمان پیچیدہ گزرگاہوں میں سے نشیب کی طرف اترے اچانک لشکر کفار نے کمین گاہوں سے نکل کر تیر اندازی شروع کر دی اور غیر متوقع حملے نے مسلمانوں کو سراسیمہ اور حواس باختہ کر دیا۔ دو ہزار طلقائے مکہ سب سے پہلے میدان کو چھوڑ کر بھاگے۔ ان کو دیکھ کر مسلمانوں میں بے ترتیبی اور پسپائی کی صورت پیدا ہو گئی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھوڑے سے رفقاء رہ گئے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ثابت قدمی

تیروں کا مینہ برس رہا تھا۔ اسلامی لشکر میں بدنظمی اور افراتفری پھیل چکی تھی۔ خدا کا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک کوہ ہمت بنا ہوا تھا۔ دشمن کے سامنے کھڑا جلال نبوت کے لہجہ میں فرما رہا تھا۔ ''میں خدا کا بندہ ہوں اور اس کا رسول ہوں۔'' بخاری کی دوسری روایت ہے: ''انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب.'' میں نبی ہوں یہ جھوٹ نہیں میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عباسؓ کو حکم دیا کہ مہاجرین اور انصار کو آواز دو۔ انھوں نے آواز دی: ''یامعشر الانصار یا اصحاب الشجرۃ'' اے انصار کے گروہ اے درخت کے نیچے بیعت کرنے والو۔ جونہی یہ پکار اسلامی لشکر نے سنی دفعتہً آواز کی طرف پلٹ آئے۔ ایسا سخت حملہ کیا کہ لڑائی کا رنگ ہی بدل گیا۔ بنو ہوازن کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ باقی بھاگ گئے۔ ثقیف کی ایک شاخ بنو مالک نے تھوڑی دیر میدان کارزار گرم رکھا، آخر اپنے ستر آدمیوں کو میدان جنگ میں لہو میں لت پت چھوڑ کر فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کا علمبردار عثمان بن عبداللہ بھی مارا گیا۔ شکست خوردہ فوج کا کچھ حصہ اوطاس میں پناہ گزین ہو گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تھوڑی سی فوج اوطاس کی طرف بھیجی اور وہ ان کی جمعیت کو منتشر کر کے واپس آ گئے۔

کفار کی شکست خوردہ فوج کا کچھ حصہ طائف میں محصور ہو گیا۔ یہ ایک محفوظ مقام تھا۔ شہر کے چاروں طرف چار دیواری تھی۔ لوگ فنون حرب سے خوب واقف تھے اور نئے قسم کے آلات حرب جیسے منجنیق وغیرہ سے واقف تھے۔ انھوں نے سال بھر کا رسد شہر میں جمع کر لیا۔ اور شہر کے چاروں طرف منجنیق اور تیر انداز متعین کر دیے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود طائف کی طرف بڑھے۔ پہلی دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم نے منجنیق، دبابے، عرادے اور اسی طرح قلعہ شکن آلات استعمال کیے۔ پھر معاشی دباؤ ڈالنے کے لیے بیرون قلعہ ان کے باغات تباہ کرنے کی دھمکی دی۔ لیکن اہل طائف کی درخواست پر باغوں کی مزید قطع و برید روک دی گئی۔

اہل طائف نے دبابوں پر لوہے کی گرم سلاخیں برسائیں اور شدت سے بوچھاڑ کی۔ چنانچہ مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ بیس دن تک محاصرہ جاری رہا، لیکن شہر فتح نہ ہوا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوفلؓ بن معاویہ کو بلا کر مشورہ لیا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ انھوں نے جواب دیا۔ لومڑی بھٹ میں گھس گئی ہے۔ اگر کوشش جاری رہی تو پکڑ لی جائے گی، لیکن چھوڑ دی گئی تو بھی کوئی نقصان نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ چلتے وقت یہ دعا کی: اللھم اھد ثقیفاً و ائت بھم: اے خدا! ثقیف کو ہدایت کر اور ان کو میرے پاس لے آ۔

اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا قبول کی۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

تقسیم غنائم

محاصرہ چھوڑ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جعرانہ تشریف لائے۔ وہاں چھ ہزار اسیران جنگ، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زائد بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی۔ مال غنیمت کے پانچ حصے کیے گئے۔ چار حصے حسب قاعدہ فوج میں تقسیم کیے گئے۔ خمس بیت المال اور غرباء و مساکین کے لیے رکھا گیا۔ چھ ہزار اسیر قبیلہ ثقیف کی درخواست پر رہا کر دیے گئے۔

پندرہ دن قیام کرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معاذؓ بن جبل کو نو مسلموں کی تعلیم کے لیے مکہ چھوڑ گئے اور خود واپس مدینہ تشریف لے گئے۔ ذی قعدہ ۸ھ کو اپنے صحابہ کے ساتھ مدینہ منورہ میں داخل ہو گئے۔

غزوہ تبوک۔ ۹ھ: ۶۳۱ء

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّ سَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوكَ وَلَكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ (توبہ ۹:۴۲) اگر فائدہ جلد ملنے والا اور سفر میانہ ہوتا تو ضرور تیرے پیچھے ہو لیتے لیکن مشقت کا سفر انھیں بہت دور کا معلوم ہوا۔

شام کے سوداگر مدینہ آئے، انھوں نے خبر دی کہ قیصر نے مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لیے لشکر گراں جمع کیا ہے اور فوج میں سال بھر کی تنخواہیں تقسیم کر دی ہیں۔ اس فوج میں لخم، جذام اور غسان کے تمام عرب شامل ہیں اور مقدمۃ الجیش بلقاء تک پہنچ چکا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیال فرمایا کہ حملہ آور فوج کی مدافعت دور سرحد پر ہونی چاہیے اندرون ملک امن کی فضا مکدر نہ ہو۔ اس بناء پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوج کی تیاری کا حکم دے دیا مگر کئی ایک موانع بھی تھے۔ سفر لمبا تھا۔ شدت کی گرمی تھی۔ فصل پکی ہوئی تھی اور کاٹنے کا موسم تھا۔ اس وجہ سے یہ وقت سخت آزمائش کا تھا۔ مگر اسلامی مہم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد جان نثاران اسلام پر اثر کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

منافقوں نے جنگ میں شامل نہ ہونے کے لیے طرح طرح کے بہانے بنانے شروع کر دیے جو منافق بھی بہانہ بنا کر مدینہ میں رہنے کی درخواست کرتا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اجازت دیے جاتے تھے۔

مالی اعانت

سفر لمبا تھا۔ مسلمان بے سروسامان تھے۔ یہ دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امراء سے اپیل کی کہ غریب مجاہدین کی اعانت کریں۔ صحابہ میں سے حضرت عثمان غنیؓ نے ۹۰۰ اونٹ، ایک سو گھوڑے اور ایک ہزار دینار چندہ میں دیے۔

حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے چالیس ہزار درہم دیے۔

حضرت ابوبکرؓ نے گھر کا تمام اثاثہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کر دیا۔

حضرت عمرؓ نے گھر کا نصف اثاثہ پیش کر دیا۔

حضرت ابوعقیل انصاریؓ نے دو سیر چھوہارے لا کر پیش کیے اور کہا "رات بھر پانی نکال نکال کر ایک کھیت کو سیراب کر کے چار سیر چھوہارے مزدوری میں کمائے ہیں، ان میں سے دو سیر بیوی کے لیے چھوڑ آیا ہوں اور دو سیر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے آیا ہوں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ان چھوہاروں کو جملہ ساز و سامان پر بکھیر دو۔

غرض تیس ہزار کا لشکر تیار ہوا اور جب ۹ھ کو تبوک کی طرف روانہ ہوا۔ حضرت علیؓ کو مدینہ میں چھوڑا۔ ابھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبوک کے راستہ میں ہی تھے کہ حضرت علیؓ بھی پہنچ گئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ سے آنے کی وجہ دریافت فرمائی تو حضرت علیؓ نے کہا: "منافق نکما ہونے کا طعنہ دیتے ہیں، میں نے اس طعنہ کو برداشت نہ کیا، اس وجہ سے لشکر کے ساتھ آملا ہوں۔"

تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ خبر غلط ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیس دن تک تبوک میں قیام فرمایا۔ ایلہ کا عیسائی سردار یوحنا حاضر ہوا اور اطاعت قبول کی۔ جربا اور اذرح کے عیسائیوں نے بھی جزیہ دینا قبول کر لیا۔ حضرت خالدؓ بن ولید چار سو سپاہی لے کر دومۃ الجندل پہنچے اور اکیدر حاکم جندل نے اطاعت قبول کر لی۔ حاکم دومۃ الجندل رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے امان نامہ عطا فرمایا۔

منافق اور ان کا انجام

اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (التوبہ۹:۶۶) اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف کر دیں گے تو ایک گروہ کو عذاب دیں گے اس لیے کہ وہ مجرم ہیں۔

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی تو نئے نرالے رنگ کے دشمن پیدا ہو گئے، جو اصطلاح اسلام میں منافق کہلاتے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ظاہراً اسلام کا اقرار کرتے تھے لیکن پس پردہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی ہر ممکن سعی کرتے تھے۔ ان کا رئیس عبداللہ بن ابی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے پہلے اہل مدینہ اس کو اپنا بادشاہ بنانے کو تیار تھے۔ اس نے ظاہراً اسلام قبول کر لیا لیکن دل سے اسلام کا دشمن تھا۔ جب مسلمانوں کو اپنے دشمنوں سے ہر وقت خطرہ لاحق رہتا تھا تو منافق لوگ مارِ آستین بنے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے۔ دنیا کی تاریخ میں صرف ایک ہی انسان نظر آتا ہے جس نے اتنے شدید دشمن سے بھی محبت کا برتاؤ کیا ہے، وہ ہے سید المرسلین خیر البشر النبی الامی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف رئیس المنافقین کی زندگی میں ہی محبت سے پیش نہیں آئے، بلکہ جب وہ مرتا ہے تو اس کے بیٹے حضرت عبداللہؓ کی درخواست پر اپنا کرتہ عنایت فرماتے ہیں کہ اس میں کفنایا جائے اور اس کے جنازہ کی نماز میں شامل ہوتے ہیں۔ رحمۃ للعالمین کا شفیق قلب دشمن کے لیے بھی کتنا رحم اور شفقت سے بھرا ہوا ہے۔

عبداللہ بن ابی کی وفات کے ساتھ منافقوں کا زور ٹوٹ گیا۔ بعض منافق تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اسوہ حسنہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ وہ سچے مسلمان ہو گئے۔ ہاں چند ایک شقی القلب باقی رہ گئے تھے جن کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نام لے لے کر مسجد سے نکال دیا۔ ان لوگوں کو قتل نہ کیا، شہر سے خارج نہ کیا، صرف مسلمانوں کو ان کی شرارت سے آگاہ کر دیا۔ صرف سزا کے طور پر ان سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جاتی تھی۔

وفود کا سال

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (النصر ۱۱۰: ۱-۳) جب اللہ کی مدد اور فتح آ گئی اور تو نے لوگوں کو اللہ کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہوتے دیکھ لیا تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور اس کی حفاظت مانگ وہ رجوع برحمت کرنے والا ہے۔

ابن اسحاقؒ نے صرف پندرہ وفود کا حال لکھا ہے۔ ابن سعدؒ نے ستر وفود کا۔ لیکن سیرت شامی نے ایک سو چار وفود کا تذکرہ کیا ہے۔ حافظ ابنؒ قیم اور قسطلانیؒ نے نہایت تحقیق اور احتیاط کے ساتھ ان میں سے صرف ۳۴ وفود کا حال لکھا ہے۔

یہ وفود زیادہ تر فتح مکہ کے بعد ۸ھ اور ۱۰ھ میں آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام عرب مسلمانوں اور قریش کے انجام پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ ان دونوں میں سے کون غالب آتا ہے۔ جب مکہ فتح ہو چکا تو قریش کی طاقت ٹوٹ گئی۔ اب ہر قبیلہ نے چاہا کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جا کر کوئی فیصلہ کرے۔

مشہور وفود حسب ذیل ہیں۔

۱۔ وفد بنی الحارث۔ ۲۔ وفد قبیلہ طے۔ ۳۔ وفد ثقیف۔ ۴۔ وفد نجران۔ ۵۔ وفد بنو اسد۔ ۶۔ وفد بنوفزارہ۔ ۷۔ وفد کندہ۔ ۸۔ وفد عبدالقیس۔ ۹۔ وفد بنو عامر۔ ۱۰۔ حمیرہ کے وفود۔ ۱۱۔ بجیلہ کا وفد۔ ۱۲۔ وفد بنی حنیفہ۔ ۱۳۔ وفد تجیب۔ ۱۴۔ وفد عذرہ۔ ۱۵۔ وفد خولان۔ ۱۶۔ وفد محارب۔ ۱۷۔ وفد غسان۔ ۱۸۔ وہ نبی عیش۔ ۱۹۔ وفد غامد۔ ۲۰۔ وفد سلامان۔ ۲۱۔ وفد نخع۔

حجۃ الوداع۔ ۱۰ھ: ۶۳۲ء

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِی. (مائدہ ۵:۳) آج کے بعد میں نے تمہارا دین کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کو تم پر پورا کر دیا۔

ذی قعدہ ۱۰ھ میں اعلان ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں۔ اس اعلان کے بعد تمام اکناف عرب سے انبوہ در انبوہ لوگ مدینہ میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ ۲۶ ذی قعدہ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غسل فرمایا۔ چادر تہد باندھی۔ نماز ظہر کے بعد مدینہ منورہ سے باہر نکلے اور تمام ازواج مطہرات کو ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ جب ذوالحلیفہ پہنچے۔ جو مدینہ کا میقات ہے، وہاں رات گزاری۔ دوسرے دن دوبارہ غسل فرمایا، اس کے بعد دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر قصواء پر سوار ہوئے اور احرام باندھا۔ یہیں سے لبیک اللھم لبیک لاشریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک لاشریک لک کا ترانہ بلند کیا۔ جب یہ مقدس اور پاک باز قافلہ احرام کے ساتھ کی طرف چل پڑا تو راستہ میں ہر قبیلہ کے لوگ شامل ہوتے جاتے تھے۔

ذوالحجہ کی چار تاریخ اتوار کے روز مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ جب کعبہ پر نظر پڑی تو فرمایا کہ ”اے خدا! اس گھر کو اور زیادہ عزت اور شرف دے۔“

کعبۃ اللہ کا طواف کیا۔ طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر صفا اور مروہ پر تشریف لے گئے۔ بیت اللہ کی طرف منہ کر کے یہ الفاظ فرمائے۔

''اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کے لیے بادشاہت ہے۔ اور اسی کے لیے حمد ہے۔ وہ زندہ رکھتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ وہ تمام چیزوں پر قادر ہے۔ کوئی معبود نہیں مگر وہ اکیلا خدا۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اپنے بندہ کی مدد فرمائی۔ اکیلے تمام قبائل کو شکست دی۔''

ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام حاجیوں کے ساتھ منیٰ میں ٹھہرے۔ ظہر وعصر، مغرب وعشاء حج کی نمازیں منیٰ میں ادا فرمائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نویں ذوالحجہ کو طلوع آفتاب کے بعد وادی نمرہ میں آ کر ٹھہرے۔ دن ڈھلنے کے بعد یہاں سے روانہ ہو کر عرفات میں قیام فرمایا۔ میدان عرفات میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کا اجتماع تھا۔ جن کے قلوب صافی سے توحید اور عشق الٰہی کے چشمے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہے تھے۔ تکبیر تہلیل تحمید و تقدیس سے فضا عطر بیز تھی۔ دن ڈھلنے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناقہ پر سوار ہو کر میدان میں آئے اور خطبہ پڑھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اے لوگو! میری بات کو اچھی طرح سن لو، کیونکہ میں نہیں جانتا کہ اس سال کے بعد پھر بھی میں کبھی اس موقع پر تمھارے درمیان ہوں گا۔''

پھر فرمایا:

''تم جانتے ہو یہ کون سا دن ہے؟ یہ یوم الحج یعنی حج کا دن ہے۔ تم جانتے ہو یہ کون سا مہینہ ہے؟ یہ شہر حرام یعنی حرمت والا مہینہ ہے۔ پس تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ تمھارے خون اور تمھارے مال اور تمہاری عزتیں اسی طرح ایک دوسرے پر حرمت کا استحقاق رکھتی ہیں۔ جیسے اس حرمت والے شہر میں، اس حرمت والے مہینہ میں، یہ حرمت والا دن دیکھو! حاضر غائب کو یہ بات پہنچا دے اور تم اپنے رب سے ملنے والے ہو، سو وہ تمھارے اعمال کے متعلق سوال کرے گا۔''

''آج تمام سود کی رقمیں چھوڑی جاتی ہیں اور عباس بن المطلب کی رقم سود بھی چھوڑی جاتی ہے۔''

''آج تمام خون جو جاہلیت میں ہو چکے ہیں ان کا قصاص موقوف کیا جاتا ہے اور سب سے پہلے ربیعہ بن الحراث ابن عبدالمطلب کے خون کا قصاص موقوف کیا جاتا ہے۔''

''اے لوگو! آج شیطان اس بات سے مایوس ہو گیا ہے کہ تمہاری سرزمین میں اس کی عبادت بھی کبھی ہو۔ لیکن اس کے سوائے اگر اور امور میں اس کی اطاعت کی گئی۔ ایسے اعمال میں جن کو تم حقیر خیال کرو، تو یہ اس کی خوشی کا موجب ہو گا۔ پس اپنے دین میں اس سے بہت احتیاط کرو۔''

''اے لوگو! تمھارے تمہاری بیبیوں پر حق ہیں اور تمہاری بیبیوں کے تم پر حق ہیں۔ وہ تمھارے ہاتھ میں خدا کی امانت ہیں۔ پس تم ان سے نیک سلوک کرو، اور تمھارے غلام، دیکھو تم ان کو وہ خوراک دو جو خود کھاتے ہو، اور وہ لباس پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔''

''اے لوگو! میری باتوں کو سن لو اور ان کو سمجھ لو۔ جان لو کہ ہر مسلم دوسرے مسلم کا بھائی ہے اور تم سب بھائی یکساں ہو (یعنی ایک جیسے حقوق اور ذمہ داریاں رکھتے ہو) اور تم سب ایک ہی سلسلہ اخوت میں ہو۔ پس کسی شخص کے لیے اپنے بھائی سے کچھ لینا جائز نہیں مگر وہی جو وہ اپنے نفس کی خوشی سے خود دے۔ پس اپنے لوگوں پر کوئی ظلم مت کرو۔ یعنی ان کا کوئی حق مت چھینو۔''

تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلند آواز سے کہا۔ ''**اللھم ھل بلغت**'' کیا میں نے پیغام پہنچا دیا ہے؟ لاکھوں انسانوں کی زبان سے جواباً یہ آواز بلند ہوئی: ''**اللھم نعم**'' بے شک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیغام پہنچا دیا ہے۔

خطبے کے بعد نماز ظہر و عصر سے فارغ ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موقف تشریف لائے۔ مزدلفہ پہنچ کر نماز مغرب ادا کی اور رات وہیں بسر فرمائی۔ نماز فجر کے بعد روانہ ہوئے، جمرہ پہنچے اور رمی الجمار کیا۔ اس کے بعد منیٰ کے میدان میں تشریف لائے اور بقیہ مناسک حج ادا فرمائے۔ ۱۲ ذی الحجہ تک منیٰ ہی میں قیام کیا۔ ۱۳ ذی الحجہ کو یہاں سے روانہ ہو کر وادی محصب میں قیام فرمایا۔ نماز فجر خانہ کعبہ پہنچ کر ادا کی۔ پھر آخری طواف کر کے مدینہ کی طرف روانہ ہو پڑے۔

حجۃ الوداع کے متعلق یسعیاہ نبی کی کتاب میں پیشگوئی

یسعیاہ نبی کی کتاب میں اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو مخاطب ہو کر فرمایا۔ اٹھ روشن ہو کہ تیری روشنی آئی اور خداوند کے جلال نے تجھ پر طلوع کیا ہے۔ دیکھ تاریکی زمین پر چھا جائے گی اور تیرگی قوموں پر لیکن خداوند تجھ پر طالع ہوگا اور اس کا جلال تجھ پر نمودار ہوگا۔'' (یسعیاہ ۶۰:۱ تا ۳)

''تیری روشنی آئی۔'' یہ الفاظ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد مبارک کو ظاہر کرتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن مجید میں نور کہا ہے، ارشاد الٰہی ہے: قَدْ جَاءَ كُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ (المائدہ ۵:۱۵) اسی طرح سورۂ نور میں ''مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ'' (النور ۲۴:۳۵) میں نور سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

فتح مکہ سے بیت اللہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے اور خدا کے گھر کے نور کو بتوں نے مکدر کر رکھا تھا تو اللہ تعالیٰ یسعیاہ نبی کی کتاب میں بیت اللہ کو مخاطب ہو کر فرماتا ہے کہ وقت آ گیا ہے کہ خدا کا نور آئے اور بتوں کی تاریکی کو ختم کر کے تجھے دوبارہ روشنی عطا کرے۔ یہ پیشگوئی فتح مکہ کے موقع پر پوری ہوئی۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیت اللہ کو بتوں سے پاک صاف کیا۔ ظلمت کو نور سے پاش پاش کیا، بیت اللہ روشن ہو گیا۔ حتیٰ کہ روشنی اب تک تاریک دلوں کو منور کر رہی ہے اور قیامت تک کرتی رہے گی۔

وفات نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ ۶۳۲ء

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْقُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (آل عمران ۳:۱۴۴) اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک رسول ہیں اور اس سے پہلے بہت رسول مر چکے ہیں۔ پھر اگر وہ مر جائے یا قتل کیا جائے تو کیا تم اس لیے پاؤں پر پھر جاؤ گے؟

۱۱ھ ماہ صفر کے آخری ایام میں بیمار ہوئے۔ وہ دن حضرت میمونہؓ کی باری کا دن تھا۔ پانچ دن تک بیماری کی حالت میں ازراہِ عدل باری باری ہر بیوی کے حجرہ میں تشریف لے جاتے رہے۔ جب مرض میں شدت ہوئی اور ضعف کی وجہ سے چلنا پھرنا دوبھر ہوگیا تو ازواج مطہرات سے اجازت لی کہ حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں ہی قیام فرمائیں۔ آخری ہفتہ آپ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حجرہ میں گزارا۔

چلنے پھرنے کی سکت جب تک رہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں نماز پڑھانے کی غرض سے تشریف لے جاتے رہے۔ جب ضعف بہت زیادہ اور چلنا مشکل ہوگیا، تو امامت کے لیے حضرت ابوبکرؓ کو مقرر فرمایا اور اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھاتے رہے۔ ایک دن ظہر کی نماز کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت کچھ سنبھلی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پانی کی سات مشکیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ڈالی جائیں۔ جب غسل فرما چکے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے کندھوں کے سہارے مسجد میں تشریف لائے۔ حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ صدیقؓ پیچھے ہٹنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشارہ سے روکا۔ پھر حضرت صدیق اکبرؓ کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھائی۔ حضرت ابوبکرؓ آپ کی اقتداء کرتے تھے اور باقی لوگ حضرت ابوبکرؓ کی تکبیرات پر نماز ادا کرتے تھے۔ نماز کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خطبہ دیا۔

''اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندہ کو اختیار عطا فرمایا ہے کہ وہ دنیا وعقبیٰ اور خدا کی نعمت دونوں میں سے کسی ایک کو اپنے لیے قبول کرے، مگر اللہ کے اس بندہ نے خدا کی ملاقات کو ترجیح دی ہے۔''

یہ سن کر رازدار نبوت حضرت ابوبکرؓ رو پڑے اور سمجھ گئے کہ وہ بندہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا فانی سے اٹھ جانے والے ہیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ کو اس فانی دنیا سے کوچ کر گئے اور اگلے روز جسم مبارک کو حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں دفن کر دیا گیا۔

ازواج مطہرات

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا (الاحزاب ۳۳:۲۸) اے نبی اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارا مقصد دنیا کی

زندگی اور اس کی زینت ہے تو آؤ میں تمھیں سامان دوں اور اچھی طرح رخصت کر دوں۔

ازواج مطہرات کا ذکر کرنے سے قبل اس اعتراض کا جواب دینا ضروری ہے جو مستشرقین ایک سے زیادہ بیویوں کے متعلق کرتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ وہ ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجرد کی زندگی بسر کی، یہ پچیس سال کی عمر تک ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بیوی سے شادی کی، یہ پچیس سال سے پچپن سال کی عمر تک ہے۔ تیسرا حصہ وہ ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی ازواج سے شادی کی، یہ پچپن سال سے ساٹھ سال تک ہے۔ اور آخری حصہ ساٹھ سال سے وفات تک ہے، اس حصہ عمر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی شادی نہیں کی۔

مجردانہ زندگی

زندگی کا ہی وہ وقت ہوتا ہے۔ جب جذبات حیوانیہ میں اشتعال ہوتا ہے، ان پر قابو پانا اور حکمرانی کرنا مشکل ترین کام ہوتا ہے۔ خصوصاً گرم ممالک میں جہاں بلوغت کی عمر جلد آ جاتی ہے۔ یہی وہ عمر کا دور ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عفیف اور پاک زندگی کی وجہ سے قوم کی طرف سے ''الامین'' کا خطاب ملا ہے۔

ایک بیوی سے نکاح کی حالت

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر پچیس سال کی تھی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ سے شادی کی، جن کی عمر چالیس سال کی تھی۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی شادی نہیں کی۔ ان کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا۔ چونکہ وہ نابالغ تھیں اور جب تک وہ بالغ نہ ہوں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مجرد ہی رہنا تھا، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک معمر بی بی حضرت سودہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شادی کی جو ایک مخلص صحابی کی بیوہ تھیں۔ یہ معمر بی بی تین سال مکہ میں اور دو سال مدینہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں رہیں۔ حضرت عائشہؓ کا رخصتانہ ہجرت کے دوسرے سال ہوا۔

متعدد شادیاں

متعدد شادیاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زندگی کے تیسرے دور میں کی ہیں۔ یہ دور پچپن سے ساٹھ سال تک کا ہے۔ جو شخص پچیس سال تک عفیفانہ زندگی بسر کرتا ہے، پھر ایک شادی کر کے دوسری شادی کی طرف مائل تک نہیں ہوتا۔ جبکہ لوگ حسین سے حسین عورت سے شادی کرانے کی پیش کش کرتے

ہیں، وہ پچپن سال کے بعد جب کہ بڑھاپے کے آثار ظاہر ہو چکے ہوتے ہیں۔ اپنی نفسانی خواہش کے مطابق کیونکر متعدد شادیاں کرے گا؟

جب ہم واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ متعدد شادیوں کا زمانہ اور اقوام عرب کے ساتھ جنگ کرنے کا زمانہ ایک ہی ہے، یعنی ۲ھ سے لے کر ۸ھ تک کا زمانہ جب اقوام عرب سے لڑائیوں کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی شادی نہیں کرتے۔ پھر یہ وہ زمانہ ہے جبکہ دشمن مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت کو ہستی سے نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ہر وقت قبائل کی طرف سے حملوں کے دفاع کے لیے مسلمانوں کو مسلح رہنا پڑتا ہے۔ صرف باہر سے ہی مسلمانوں کو خطرہ لاحق نہیں تھا بلکہ شہر کے اندر منافق اور یہود مار آستین بنے ہوئے تھے۔ ان خطرناک حالات میں کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق عیش و عشرت کا وہم بھی دل میں نہیں لا سکتا۔

پس بڑھاپے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا متعدد شادیاں کرنا اور صرف جنگ کے زمانہ تک کرنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ تعداد ازدواج کا جنگ سے ضرور تعلق ہے۔ اب واضح ہے کہ لڑائی میں مرد مارے جاتے ہیں، عورتوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ ضروری ہے کہ عورتوں کی خبر گیری اور اخلاق حسنہ کے زیور سے پیراستہ رکھنے کے لیے متعدد شادیاں کی جائیں۔

پس ایک تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیواؤں پر ترحم اور خبر گیری کے لیے نکاح پر نکاح کیے۔ باسورتھ سمتھ ایک عیسائی مصنف نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ ''یہ یاد رکھنا چاہیے، کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے نکاحوں کی جہاں دیگر وجوہ ہو سکتی ہیں۔ یہ معقول وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ نے ان بیبیوں پر رحم کھا کر کیے جو بے کس اور بے یار و مددگار رہ گئی تھیں۔ یہ عورتیں سب کی سب بیوہ ہی تھیں اور ان کے حسن و دولت کا کوئی شہرہ نہ تھا، بلکہ بات اس کے بالکل برعکس تھی۔''

دوسرے تجرد کی زندگی سے بیواؤں میں طرح طرح کی اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جذبہ شہوانی ایک فطری جذبہ ہے، اس کو زائل نہیں کیا جا سکتا۔ جذبات روکنا صحت کے لیے مضر ہے۔ ان حالات خاصہ میں تعداد ازدواج کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

چوتھا زمانہ

یہ دور ساٹھ سال سے وفات تک کا زمانہ ہے۔ جب ملک عرب میں جنگ کا خاتمہ ہو چکا تھا، عیش و عشرت کے لیے مناسب وقت تھا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دور میں کسی عورت سے شادی نہیں کی۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی نفسانی خواہشات کے تحت شادیاں کرتے ہوئے تو اب نفس کی شہوانی ہوس کی تسکین کے لیے موزوں ترین وقت تھا۔ ملک کے بادشاہ تھے۔ دشمن کی طاقت کا عصا ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا نہیں کیا کیونکہ تعداد ازدواج کی ضرورت ختم ہو چکی تھی۔

دنیا کے تمام مذاہب ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی تائید میں ہیں، اور ان کے بڑے بڑے مقدس انسانوں کی زندگی میں ایک سے زائد عورتوں سے شادی کرنے کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

ازواج مطہرات کے اسماء گرامی

ا۔ حضرت خدیجہؓ۔ ۲۔ حضرت عائشہؓ۔ حضرت سودہؓ۔ ۴۔ حضرت حفصہؓ۔ ۵۔ حضرت زینب بنت خزیمہؓ۔ ۶۔ حضرت ام سلمہؓ۔ ۷۔ حضرت زینبؓ بن امیم۔ ۸۔ حضرت جویریہؓ۔ ۹۔ حضرت ام حبیبہؓ۔ ۱۰۔ حضرت میمونہؓ۔ ۱۱۔ حضرت صفیہؓ۔ ۱۲۔ حضرت ماریہ قبطیہؓ۔

اولاد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کی تعداد میں سخت اختلاف ہے۔ متفق علیہ روایت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چھ بچے تھے۔ قاسم۔ ابراہیم۔ زینب۔ رقیہ۔ ام کلثوم۔ فاطمہ۔

ابن اسحاق نے دو اور صاحبزادوں کا ذکر کیا ہے۔ طاہر۔ طیب۔ اس بناء پر لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد برابر ہو جاتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کے بارے میں تمام اقوال جمع کیے جائیں تو ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارہ بچے تھے، جن میں آٹھ لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں۔ قاسم اور ابراہیم پر تمام راویوں کا اتفاق ہے۔

حضرت ابراہیم حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے اور بقیہ اولاد حضرت خدیجہؓ سے تھی۔

خصائص النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بعثت عظمیٰ

دنیا میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل جتنے بھی انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں وہ ایک قوم کی طرف آتے رہے ہیں۔

کتاب خروج باب سوم میں ہے۔

"اب دیکھ بنی اسرائیل کی فریاد مجھ تک آئی اور میں نے وہ ظلم جو مصری ان پر کرتے ہیں دیکھا ہے۔ پس اب تو جاؤ میں تجھے فرعون کے پاس بھیجتا ہوں۔ میرے لوگوں کو جو بنی اسرائیل ہیں مصر سے نکال۔" (آیات ۹، ۱۰)

کتاب استثناء میں ہے۔ "موسیٰ علیہ السلام نے ہم کو ایک شریعت فرمائی جو کہ یعقوب کی جماعت کی میراث ہو۔" (باب ۳۲ درس ۴)

یہ حوالے ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور تورات صرف بنی اسرائیل کی طرف تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق انجیل ظاہر کرتی ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کی طرف آئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

''میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔'' (انجیل ۵:۲۴)

بدھ مذہب کی تاریخ پر غور کریں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے ہندو جاتی کے سوا کبھی اپنے عروج کے زمانہ میں بھی کسی قوم تک اپنے مذہب کی تعلیم کو نہیں پہنچایا اور کسی غیر مذہب کے پیروکار کو داخل مذہب خود نہیں کیا۔

ہندو مذہب میں وید کی تعلیم وقرات کا کام صرف برہمن کے ساتھ مخصوص ہے۔ اگر وید کی تعلیم تمام لوگوں کے لیے ہوتی تو پھر صرف برہمن کے لیے کیوں قرأتِ وید مخصوص کر دی جاتی۔ ہندو قوم میں بھی کوئی نصرانی، یہودی یا مغربی نسل کا شخص رشی یا مہارشی بلکہ کسی مندر کا پجاری بھی نہیں بنایا گیا۔ ان امور کے علاوہ یہ بات بھی ظاہر کرتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل کے تمام انبیاء علیہم السلام صرف اپنی اپنی قوم کی طرف آتے رہے۔

مختلف اقوام کے مسلمہ انبیاء علیہم السلام نے کسی دوسرے نبی کے متعلق یہ نہیں بتایا کہ وہ صادق تھا یا کاذب۔ کیونکہ جب کسی ایسی قوم کو دعوت دی جائے جو کسی نبی کی پیرو ہو تو لازمی طور پر اس قوم کے نبی کی صداقت زیر بحث آئے گی۔ تمام مذاہب کی مذہبی کتب کا مطالعہ کریں تو کسی کتاب میں بھی کسی نبی کے متعلق یہ ذکر نہیں آئے گا کہ وہ صادق تھا یا کاذب۔

اگر قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اپنے اندر عالمگیریت کا رنگ رکھتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (سبا ۲۸:۳۴) ہم نے تجھے جملہ انواع انسانی کے لیے بھیجا ہے۔ پھر فرمایا: قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا. (الاعراف ۵۸:۷) یعنی کہہ اے لوگو! میں تم سب لوگوں کی طرف اللہ کا نبی ہو کر آیا ہوں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: كان النبی يبعث الى قومه خاصة و بعثتُ الى الناس كافة. مجھ سے پہلے نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے لیکن میں تمام لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

خاتم النبیین

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کمالاتِ نبوت ختم ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجمع جمیع کمالات انبیاء ہیں۔ اور نبوت کا کوئی درجہ اور کوئی مقام ایسا نہیں جو کسی نبی کو تو ملا ہو۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کو حاصل نہ ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ قرآن مجید میں آتا ہے:
مَاکَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب:۴۰) یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے آدمیوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسول اور نبیوں کو ختم کرنے والے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس آیت کریمہ کی تشریح ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں: **عن ابی هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ان مثلي ومثل الانبياء من قبلي كمثل رجل بنى بيتاً فاحسنه واجمله الاموضع لبنة من زاوية فجعل الناس يطوفون به يعجبون له و يقولون هلاً و ضعت هذه اللبنة قال فانا اللبنة وانا خاتم النبيين** (بخاری) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میری مثال اور نبیوں کی مثال جو مجھ سے پہلے تھے اس شخص کی مثال کی طرح ہے کہ اس نے ایک گھر بنایا اور اسے اچھا بنایا اور اسے خوبصورت بنایا سوائے کونے میں ایک اینٹ کی جگہ کے سو لوگ اس کے گرد گھومنے لگے اور اس پر تعجب کرتے اور کہتے کہ یہ اینٹ کیوں نہ لگائی تو فرمایا میں ہی وہ اینٹ ہوں اور میں نبیوں کو ختم کرنے والا ہوں۔

زرقانی شرح المواہب اللدینہ میں ہے:

ان الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدى ولا نبى یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اب رسالت اور نبوت منقطع ہو چکی ہے۔ لہٰذا میرے بعد نہ کوئی رسول ہوگا نہ کوئی نبی۔

سراج منیر

روحانی عالم میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سراج منیر (روشن کرنے والا سورج) ہیں۔
ارشادِ الٰہی ہے: **يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا ۙ‏ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذۡنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيۡرًا** (الاحزاب ۳۳: ۴۵) اے نبی ہم نے تجھے گواہ بنا کر بھیجا ہے اور خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن ہونے والا سورج۔

اس آیت میں اشارہ ہے کہ اس آفتاب عالمتاب کے طلوع کے بعد ان روشنیوں کی کوئی ضرورت نہیں رہی جو پہلے مختلف ملکوں اور مختلف قوموں کو روشن کیا کرتی تھیں۔ وہ روحانی چراغ ایک وقت کے لیے روشن ہوئے اور اندھیروں کو اجالے میں تبدیل کیا۔ طلوع آفتاب کے بعد اب کسی چراغ کی ضرورت نہیں رہی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سراج منیر کہنے میں یہ حکمت بالغہ ہے کہ جو شخص بھی اپنے شیشہ قلب کو صاف کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحانی شعاعوں کے سامنے رکھے گا، تو اس کے اندر اس روحانی آفتاب کی روشنی منعکس ہو جائے گی، اور جتنا زیادہ شیشہ قلب صاف ہوگا اتنی ہی زیادہ نور کی لہریں اس میں منعکس ہوں گی۔

گویا دنیا میں اب صرف روحانی منبع ایک ہی ہے، وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات

گرامی ہے۔ انھی کی ذات سے اتصال پیدا کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔

موعود اقوام عالم

قرآن مجید نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کا وعدہ تمام انبیاء علیہم السلام کو دیا گیا تھا اور پھر ہر ایک نبی کے ذریعہ سے اس کی امت سے یہ عہد لیا گیا کہ تمھارے پاس ایک ایسا نبی آئے گا جو پہلے تمام انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرے گا، اس پر ایمان لانا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ (آل عمران ۳:۸۱) اور جب اللہ نے نبیوں کے ذریعہ سے عہد لیا کہ جو کچھ میں نے تمھیں کتاب اور حکمت سے دیا ہے پھر تمھارے پاس وہ رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تم نے ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہوگی کہا کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرے عہد کا بوجھ لیتے ہو۔ انھوں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں کہا پس گواہ رہو اور میں تمھارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔

الوہیت کا مظہر اتم

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مظہر اتم الوہیت ہیں۔ ان کا کلام خدا کا کلام، ان کا ظہور خدا کا ظہور، ان کا آنا خدا کا آنا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل ۱۷:۸۱) کہ حق آیا اور باطل بھاگ گیا اور باطل نے بھاگنا تھا۔ حق سے مراد اللہ تعالیٰ، قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ پھر فرمایا: مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (النجم ۵۳:۳،۴) اس آیت کریمہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام کو وحی سے تعبیر کیا ہے۔ ایک اور آیت میں ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (الفتح ۴۸:۱۰) جو لوگ تیری بیعت کرتے ہیں گویا وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو مجازی طور پر اپنی ذات قرار دیا ہے۔ اسی طرح ایک اور آیت ہے: مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی یعنی تو نے نہیں چلایا لیکن اللہ تعالیٰ نے ہی چلایا جب کہ تو نے چلایا۔ (انفال ۸:۱۷)

عطاءِ کوثر

قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّآ اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ (الکوثر ۱۰۸:۱) یعنی ہم نے تجھے کوثر عطا کی۔

امام فخر الدین رازیؒ نے خیر کثیر کے تحت بہت سی اشیاء کا ذکر کیا ہے۔ از انجملہ۔

۱۔ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے ایسی نبوت کاملہ اور ریاست عامہ اور ہدایت جامعہ پہلے کب

کسی کو عطا ہوئی تھی؟

۲۔ کوثر سے مراد اسلام ہے۔

۳۔ کوثر سے مراد کثرت امت ہے۔

۴۔ کوثر سے مراد قرآن مجید ہے۔

۵۔ کوثر سے مراد وہ اخلاق حمیدہ، فضائل کثیرہ اور محامد جمیلہ ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود باوجود میں پائے جاتے ہیں۔

اسی لیے قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم) اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو یقیناً خلق عظیم پر ہے۔ لفظ "عظیم" محاورہ عرب میں اس چیز کی صفت پر بولا جاتا ہے۔ جس کو اپنا نوعی کمال پورا پورا حاصل ہو۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے ۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

حصول منتہائے کامیابی

قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (الجمعہ ۶۲:۲) یعنی اللہ وہ پاک ذات ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان پر اس کی آیات پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے۔ کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اگرچہ وہ اس سے قبل کھلی گمراہی میں تھے۔

اس آیت کریمہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چار عظیم الشان کام بیان کیے ہیں۔

۱۔ آیات پڑھ کر سنانا۔

۲۔ تزکیہ نفوس۔

۳۔ کتاب الٰہی کی تعلیم دینا۔

۴۔ حکمت کی باتیں سکھانا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کاموں کو نہایت کامیابی سے سرانجام دیا، جبکہ ان مقدس کاموں کے سرانجام دینے میں ہر قسم کی رکاوٹیں موجود تھیں۔ مستشرقین کو بھی اس امر کا اعتراف ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت کامیاب مصلح تھے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف بری ٹینکا میں لفظ قرآن کی بحث کے نیچے یہ اعتراف کیا ہے۔

"دنیا کی تمام مذہبی شخصیتوں میں سب سے زیادہ کامیاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔"

میور لکھتا ہے۔

''بسا اوقات جب ایک ایسے شخص کے ہاتھوں چند نتائج رونما ہوں، جو بظاہر اس کی اپنی طاقت سے بالاتر دکھائی دیں تو ان کے ظہور کی وجہ بعض کے نزدیک یہ ہوتی ہے کہ گرد و پیش کے چند اسباب ایسے پیدا ہو گئے جن کا لازمی نتیجہ وہ نتائج تھے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے اور سارا عرب ایک جدید اور روحانی مذہب کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ ایسے لوگ اس سے قیاس کرتے ہیں کہ عرب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے وقت اصلاح کے لیے بے قرار تھا اور اسے قبول کرنے پر ہمہ تن آمادہ۔ لیکن جب ہم عرب کے عہد ماضی پر غور سے نظر ڈالتے ہیں تو اسلام سے پہلے زمانہ کی تاریخ اس قیاس کی تردید کرتی ہے۔''

تکمیل دین

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک اکمل دین لے کر آئے۔ اور وہ دین تا قیامت لوگوں کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۔ (المائدہ ۵:۳) آج کے دن میں نے تمھارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام کو دین کی حیثیت سے میں نے تمھارے لیے پسند کیا۔

قرآن مجید کے اس عقیدہ کے مطابق دین عہد بعہد دنیا کی عمر کے ساتھ مختلف انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں مکمل ہوتا رہا اور یہ دین رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ سے اپنے کمال کو پہنچا ہے۔

وحدت نسل انسانی

ختم نبوت اور تکمیل دین کا لازمی نتیجہ وحدت نسل انسانی کا پیغام ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل تمام انبیاء علیہم السلام نے افراد کو اکٹھا کر کے ایک قوم بنائی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام قوموں کو اکٹھا کر کے نسل انسانی کی وحدت کی بنیاد ڈالی، اور اپنے مذہب کی بنیاد ٹھہرایا۔ یہ راز اتنا بلند تھا کہ بغیر خدا کی وحی کے اس کا انکشاف قلب انسانی پر نہ ہو سکتا تھا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس ۱۰:۱۹) اور سب لوگ ایک ہی قوم ہیں لیکن وہ باہم جھگڑتے ہیں۔

مکمل سوانح حیات

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل جتنے انبیاء علیہم السلام اور مصلحین ہو گزرے ہیں ان کی زندگی کے حالات ہم تک صحیح ذرائع سے نہیں پہنچے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کے بے شمار پہلو پردہ تاریک میں پڑے ہوئے ہیں۔ فارس کے مصلحان دین صرف شاہنامہ کے ذریعہ روشناس ہوئے ہیں۔ وید کے ملہم کون تھے، کیسے تھے، کہاں تھے، ان کا چال چلن کیا تھا، کب ہوئے؟ تاریخ میں معمہ بنے ہوئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے متعلق موجودہ تورات بتاتی ہے۔ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے

تین سو سال بعد احاطہ تحریر میں آئی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ مقدس اور برگزیدہ ہستی ہے جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ احاطہ تحریر میں لایا گیا۔

معجزات

اللہ تعالیٰ اہل دنیا کی نظر میں پیغام الٰہیہ کے من جانب اللہ ثابت کرنے کے لیے اپنی جملہ صفات کے تحت اپنے نشان قائم کرتا ہے، جو اپنے اندر ایسی ارفع شان رکھتا ہے کہ انسانی دل و دماغ اس کا مثل لانے سے عاجز ہو جاتے ہیں۔ اس کو اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں۔ اور قرآن مجید کی زبان میں اسے آیت اللہ کہتے ہیں۔

معجزہ کسی سنت کے توڑنے کا نام نہیں بلکہ معجزہ خود ایک سنت اللہ ہے جو وحی الٰہی کے من جانب اللہ ہونے پر ایک اقوی دلیل ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ سے بے شمار معجزات کا ظہور ہوا، صرف چند ایک معجزات لکھے جاتے ہیں۔ ایسے تو سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے لیکن اس کا مفصل ذکر یہاں نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ قرآن مجید پر مستقل عنوان کے تحت بحث ہوگی، وہاں اس کے اعجاز پر بحث ہوگی۔

پہلا معجزہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے وقت عامہ عرب کسی مذہب کے پابند نہ تھے۔ کوئی کتاب نہیں رکھتے تھے۔ شجر و حجر، شمس و قمر، سیاروں اور بھوت و پریت کی پوجا کرتے تھے۔ جزا و سزا کے منکر۔ سیاست و تمدن سے نا آشنا، چوری، قمار بازی، جنگ و جدل، بغض و عناد، جہالت، فخر اور کبر ان کے اوصاف تھے۔ قرآن مجید میں ان کے متعلق ارشاد الٰہی ہے: اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ (اعراف ۷:۱۷۹) یعنی وہ چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ زیادہ گمراہ۔

لیکن وہی عرب جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مقدس پر بیعت کر لیتے تھے تو تمام برائیوں کو چھوڑ کر آستانہ الوہیت پر گر جاتے تھے اور وہ خدا کی صفات میں رنگین ہو کر اس دھرتی پر چلتے پھرتے فرشتے دکھائی دیتے تھے۔ قرآن مجید ان کے بارہ میں فرماتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّھِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا (الفرقان ۲۵:۶۴) یعنی رات دن نمازوں میں گزارنے والے ہو گئے۔

دوسرا معجزہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس غرض کے لیے اس دنیا میں آئے اسے پورا کر گئے۔ یہ وہ بے نظیر کامیابی ہے جس کی نظیر دنیا کے کسی نبی کی زندگی میں نہیں ملتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام راستہ میں ہی فوت ہو گئے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کو ان کے حواری مصیبت میں گھرا ہوا دیکھ کر بھاگ گئے۔ بلکہ بقول انجیل

ایک حواری نے ان کے منہ پر تھوکا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی زندگی میں ہی ملک عرب پر تسلط اور اپنی قوم پر پوری حکومت مل گئی اور لوگوں کو دائرہ اسلام میں فوج در فوج داخل ہوتے دیکھ لیا۔ قرآن مجید نے اس کامیابی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے: اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا. (النصر ١١٠: ١،٢) جب اللہ کی مدد پہنچ گئی اور فتح و کامیابی، اور تو نے لوگوں کو اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔

تیسرا معجزہ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر منقطع اور دائمی برکات اور فیوض ہیں۔ اب تمام انبیاء علیہم السلام کے چشمہ ہائے فیوض خشک اور بند ہو چکے ہیں اور صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چشمہ فیض جاری ہے۔ اس فیض کا زندہ اور بین ثبوت یہ ہے کہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایک نہیں، بیس نہیں بلکہ ہزاروں ایسے افراد ہو گزرے ہیں جن کا اتباع رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مکالمہ ومخاطبہ الٰہیہ کا دعویٰ تھا۔ یہ نعمت سوائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کے نہیں مل سکتی۔ ارشاد الٰہی ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (ال عمران ٣: ٣١) کہ اگر تم اللہ کے محبوب بننا چاہتے ہو تو میری (رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی کرو تو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔

چوتھا معجزہ

یہ معجزہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص ہے۔ وہ یہ کہ دنیا کا کوئی ایسا حصہ نہیں ہے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہر وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے دعا نہ کرتی ہو اور یہ نہ پڑھتی ہو: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ......

پانچواں معجزہ: انشقاق قمر

انشقاق قمر کا وقوع خلاف سنت اللہ نہیں۔ کسی قانون قدرت نے کوئی فیصلہ نہیں دیا کہ ان اجرام سماوی میں کوئی بڑے بڑے تغیرات نمودار نہیں ہوتے رہتے بلکہ قانون قدرت کی شہادت اس کے خلاف ہے۔ آخر زمین پر جو بڑے بڑے پہاڑ بنے تو کیا یہ بغیر کسی تغیر عظیم کے ہی بن گئے اور خود سورج میں تغیر اور انقلاب آتے رہتے ہیں اور بعض وقت بڑے بڑے داغ نمودار ہو جاتے ہیں۔ تو یہ کونسی بعید بات ہے کہ کوئی عظیم الشان تغیر چاند کے اندر نمودار ہو اور اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوتِ اعجازی کے اظہار کے لیے یہ تغیر کفار کو بھی دکھا دیا ہو، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نشان طلب کرتے تھے۔

شق قمر کے معجزہ کے پیچھے یہ حقیقت مضمر تھی کہ وہ گھڑی قریب آ رہی ہے کہ جب رؤساء کفار کی قوت پاش پاش ہو جائے گی، جیسا کہ آیت کریمہ: "اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ" (القمر ٥٤: ١) سے ظاہر

ہے۔ یہاں الساعة سے مراد قیامت کبریٰ نہیں بلکہ ساعة وسطی ہے یعنی قریش یا مخالفین کی ہلاکت کی گھڑی۔

اہل عرب قمر سے مراد سردار لیتے تھے گویا انشقاق قمر میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ کفار کے قائدین کی قوت پاش پاش ہو جائے گی۔ جس کا پہلا نظارہ غزوہ بدر میں ہوا۔ کفار کے تمام سردار مارے گئے اور کفار کی طاقت ختم ہوگئی۔

چھٹا معجزہ قرآن مجید

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے۔ اور قرآن مجید خود ایک معجزہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۸۸) یعنی کہو اگر انسان اور جن اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ اس قرآن کی مثل بنا لائیں تو اس کی مانند نہ لا سکیں گے۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔

باسورتھ سمتھ لکھتے ہیں۔

یہ ایک ہی معجزہ تھا جس کا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دعویٰ تھا۔ وہ اس کو مستقل معجزہ کہتے تھے۔ فی الحقیقت یہ ایک ہی معجزہ تھا۔ (لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ص ۲۹۰) قرآن مجید کے مختلف اعجازی پہلوؤں پر بحث بعد میں آئے گی۔

قرآن مجید

قرآن مجید تقریباً تئیس سال کے عرصہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔ قرآن کا نام خود اس وحی الٰہی میں تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ (سورۃ بقرہ ۲:۱۸۵) رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ اس کے علاوہ سورۃ یونس آیت ۳۷ بنی اسرائیل آیت ۱۰۶ میں لفظ قرآن آتا ہے۔

قرآن یا تو قرءٌ سے مشتق ہے یا قراءۃ سے یا قرن سے۔ قرن کے معنی جمع کرنا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے قرآن کو قرآن اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ اولین اور آخرین کے علوم کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ نَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (النحل ۱۶:۸۹) یعنی ہم نے تجھ پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جو تمام چیزوں کو واضح بیان کرنے والی ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ فِیْهَا کُتُبٌ قَیِّمَةٌ (البینۃ ۹۸:۳) اس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔ یعنی قرآن مجید میں تمام کتب کے علوم جمع ہیں۔ نیز یہ تمام منتشر دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے والا ہے۔ اس میں اتحاد بین الناس کا پیغام ہے، ارشاد الٰہی ہے: کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (البقرہ ۲:۲۱۳) یعنی سب لوگ ایک ہی قوم ہیں۔

اگر قراءۃ سے مشتق ہو تو اس کے معنی ہیں پڑھی ہوئی چیز۔ تو اس کتاب کو قرآن اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ جب جبرائیل علیہ السلام آتے تو پڑھ کر سناتے تھے۔ دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ یہ کتاب دنیا میں بہت پڑھی جائے گی۔

اگر قرن سے مشتق ہو تو قرن کے معنی ہیں ملنا یا ساتھ رہنا۔ اس معنی کی رو سے اس کتاب کو قرآن اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ یہ کتاب حق اور ہدایت اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ نیز اس کی سورتیں اور آیات اسی طرح آپس میں مربوط ہیں کہ ان میں نہ کوئی تعارض ہے اور نہ تخالف۔ اور قرآن مجید کے مضامین باہم دیگر ایسے ملے ہوئے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا، وہ سب ایک سلک میں منسلک ہیں۔

دعویٰ نبوت سے قبل رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار حراء میں ریاضت اور عبادت کیا کرتے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر چالیس سال کی ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار حراء میں یاد

الٰہی میں مشغول تھے۔ دفعتہً وہ منزل مل گئی جس لیے جویاں تھے۔ وہ گوہر مل گیا جس کے متلاشی تھے۔ وہ ہدایت مل گئی جس کے لیے گریاں تھے۔ جبرئیل علیہ السلام وحی نبوت لے کر آئے اور کہا: اِقْرَأْ یعنی پڑھ۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَا اَنَا بقاری. میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتے نے زور سے دبایا، پھر چھوڑ دیا اور کہا: اِقْرَأْ یعنی پڑھ۔ آپ نے پھر وہی جواب دیا: مَااَنَا بقاری. یعنی میں پڑھا ہوا نہیں ہوں اور فرشتے نے زور سے دبایا، پھر چھوڑ دیا اور کہا: اِقْرَأْ. اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر پہلا ہی جواب دیا۔ تیسری مرتبہ کے بعد فرشتے نے یہ آیات پڑھیں: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (العلق ۹۶: ۱۔۵) یعنی تو اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے انسان کو ایک لوتھڑے سے پیدا کیا پڑھ اور تیرا رب سب سے بڑھ کر عزت والا ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پیغام ربانی کو لے کر کانپتے ہوئے آئے۔ حضرت خدیجہؓ سے فرمایا کہ مجھ پر کوئی کپڑا اوڑھا دو۔ جب ذرا سکون آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام ماجرا کہہ سنایا اور کہا۔ خشیت علی نفسی یعنی مجھے اصلاح دنیا کی ذمہ داری کے بوجھ سے ڈر لگتا ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے جواب دیا: واللہ مایخزیک اللہ ابداً انک لتصل الرحم و تحمل الکل و تکسب المعدوم و تقری الضیف و تعن علی نوائب الحق یعنی آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، کمزوروں کے بوجھ کو اٹھاتے ہیں، ناداروں کی خبر گیری کرتے ہیں، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں۔

یہ کہہ کر حضرت خدیجہؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ حضرت خدیجہؓ کے عم زاد بھائی تھے۔ ورقہ کو تمام ماجرا کہہ سنایا، ورقہ نے کہا۔ "یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا۔ کاش میں جوان ہوتا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گھر سے باہر نکالنا چاہتی تو میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دل و جان سے مدد کرتا۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا، کیا میری قوم مجھ کو گھر سے باہر نکال دے گی؟" ورقہ نے جواب دیا: "ہاں۔"

پہلی وحی کے نازل ہونے کے بعد کچھ عرصہ وحی رک گئی، وہ زمانہ فترت الوحی کے نام سے موسوم ہوتا ہے، دوسری وحی یٰاَیُّھَا الْمُدَثِّرْ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ (۷۴: ۱۔۵) اے اوڑھنے والے اٹھ اور ڈرا اور اپنے رب کی بڑائی کر اور اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھ اور ناپاکی سے دور رہ۔

اس کے بعد سلسلہ وحی جاری ہوگیا اور کم وبیش تیئس سال تک جاری رہا۔ قرآن مجید کا نزول ضرورت اور حالات کے مطابق ہوتا تھا۔ کبھی کچھ لوگ خود مسائل چھیڑ دیتے تھے، پھر قرآن نازل ہوتا۔ کبھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوالات پوچھے جاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وحی کے ذریعہ جواب دیتے۔ کبھی معاشرہ میں ایسے مسائل ابھر آتے جن کا جواب دینا ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح قرآن مجید ضرورت کے مطابق آہستہ آہستہ نجماً نجماً نازل ہوتا رہا، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً كَذَالِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيْلاً (الفرقان ۲۵:۳۲) اور کافر کہتے ہیں کہ قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اترا، اسے اسی طرح سے اترنا چاہیے تھا تا کہ تیرے دل کو ہم تسکین دیں اور ہم نے اسے ایک ترتیب سے اتارا ہے۔

تدوین وحفاظت

قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ (الحجر ۱۵:۹) یعنی ہم نے ہی ذکر (قرآن) اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔ دوسری جگہ آتا ہے: اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (القیمۃ ۷۵:۱۷) یعنی اس کتاب کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔

یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں کہ قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔

قرآن مجید کی حفاظت دو طریقوں سے ہوئی ہے۔ ایک زبانی یاد کرنے سے، دوم کتابت سے اور یہی دو طبعی اور قدرتی طریقے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی صحابہ کرام سارا قرآن مجید حفظ کر چکے تھے۔ امام سیوطی نے ابوعبیدہ کی کتاب القراءت سے نقل کر کے اپنی تصنیف الاتقان میں حفاظ صحابہ کے نام ذکر کیے ہیں۔

مہاجرین صحابہ

حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت سعد، حضرت ابن مسعود، حضرت حذیفہ، حضرت سالم، حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن سائب، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

انصار

حضرت عبادہ بن صامت، حضرت معاذ ابوحلیمہ حضرت مجمع بن جاریہ، حضرت فضالہ بن عبید، حضرت مسلمہ بن مخلد رضی اللہ عنہم اجمعین۔

ابن ابی داؤد نے تمیمؓ الداری اور عقبہؓ بن عامر کو قاری صحابہ میں شامل کیا ہے۔ ابوموسیٰ اشعریؓ نے بھی قرآن مجید حفظ کیا تھا۔ اسی طرح حضرت ابیؓ بن کعب، حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت زید بن ثابت مشہور قراء میں سے تھے۔

ان حفاظ سے صحابہ کرام اور کثیر تابعین نے قرآن مجید پڑھا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عہد رسالت میں ہی کثیر صحابہ نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام کو قرآن حفظ کرنے کا بہت شوق دلاتے تھے۔ بخاری کی ایک حدیث ہے: **عن عثمان رضی اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم خیر کم من تعلّم القرآن و علمه** یعنی حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن سیکھتا ہے اور سکھاتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس شخص کو نماز میں امام بناتے جس کو سب سے زیادہ قرآن مجید حفظ ہوتا۔

کتابت

صدر اوّل میں قرآن مجید کی کتابت کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ عہد رسالت۔

۲۔ عہد صدیقی۔

۳۔ عہد عثمانی

عہد رسالت

قرآن مجید عہد رسالت میں ہی احاطہ تحریر میں آ چکا تھا۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کاتب وحی کو بلاتے اور اس آیت کو اس کی جگہ پر لکھوا دیتے تھے۔ اس طرح قرآن مجید آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی لکھا جا چکا تھا۔ ایک حدیث ہے۔ **قبض رسول اللّٰه علیه وسلم والقرآن فی العسب والقضم** یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت دنیا سے اٹھائے گئے جب کہ قرآن مجید کھجور کے پتوں پر لکھا جا چکا تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسب ذیل کاتبین وحی مقرر فرمائے تھے:۔

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ثابت بن قیسؓ۔

محدث حاکم نے مستدرک میں زیدؓ بن ثابت سے روایت کیا ہے کہ زید بن ثابتؓ نے کہا ہم عہد

رسالت میں ''رقاع'' سے قرآن جمع کیا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں: جمعتُ القرآن فقراء ت به کل لیلة فبلغ النبی صلی اللہ علیه وسلم فقال اقراء ہ فی شهر (مسند احمد) میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہی سارا قرآن جمع کرلیا تھا اور ایک رات میں سب پڑھ ڈالتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علم ہوا تو فرمایا ایک مہینہ میں ختم کیا کرو۔

کان زیداخر عرض النبی القرآن علی مصحفه وهواقرب المصاحف من مصحفنا یکتب زید لعمر. یعنی زید نے آخری سالوں میں اپنا لکھا ہوا قرآن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنایا اور وہ قرآن ایسے ہی تھا۔ جیسے ہمارے مصاحف اور زیدؓ نے عمرؓ کے کہنے پر بھی ایک قرآن لکھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں جن چیزوں پر قرآن مجید لکھا جاتا تھا، حسب ذیل ہیں:

۱۔ عسیب کھجور کی شاخوں کا وہ حصہ جو تنے سے متصل ہوتا ہے۔ اس میں کافی کشادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس حصہ کو شاخ سے الگ کرلیا جاتا تھا۔ پھر ان کو خشک کر کے ان پر لکھا جاتا تھا۔

۲۔ لخفہ: ہر معمولی پتھر کو نہیں کہتے بلکہ بالاتفاق اہل لغت نے لکھا ہے کہ سفید رنگ کی پتلی پتلی چوڑی چوڑی تختیاں پتھر سے بنائی جاتی تھیں۔

۳۔ کتف: اونٹ یا بکری کے مونڈھے کے پاس کی گول اور چوڑی ہڈی کو کہتے ہیں۔

۴۔ ادیم: باریک کھال سے دباغت کے عمل سے تیار ہوتا ہے۔

۵۔ قتب: اونٹ کے کجاوہ میں چھوٹی چھوٹی تختیاں استعمال ہوتی تھیں، ان کو کہتے ہیں۔

عہد صدیقی

قرآن مجید رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں مدون ہو چکا تھا اور بے شمار حفاظ کے سینوں میں محفوظ تھا۔ بے شمار افراد کے پاس قرآن مجید کے مکتوبہ نسخے موجود تھے۔ امام ابن حزم نے لکھا ہے کہ خلیفہ اول کے زمانہ میں کوئی ایسا شہر نہیں تھا۔ جہاں لوگوں کے پاس کثرت سے قرآن مجید کے مکتوبہ نسخے نہ ہوں اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مسلمانوں کے پاس قرآن مجید کے مکتوبہ نسخے ایک لاکھ سے کم نہ تھے۔ (کتاب الفصل الملل والنحل)

عہد صدیقی میں کتابی صورت میں ایک مستند نسخہ مرتب کرنے کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب حفاظ لڑائیوں میں کثرت کے ساتھ شہید ہو رہے تھے۔ قرآن لکھا ہوا موجود تو تھا لیکن اس کے اجزاء منتشر تھے۔ سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور حضرت ابوبکرؓ سے کہا۔ بخاری میں روایت ہے۔

"مجھے ابوبکرؓ نے جنگ یمامہ کے بعد بلوا بھیجا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ عمر بن الخطابؓ ان کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ ابوبکرؓ نے فرمایا کہ عمرؓ میرے پاس آئے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جنگ یمامہ میں قرآن کے بہت سے قراء شہید ہوئے ہیں اور مجھے خطرہ محسوس ہوا ہے کہ اگر اسی طرح دوسری لڑائیوں میں قراء شہید ہوتے رہے تو بہت سا قرآن ہاتھوں سے جاتا رہے گا، لہٰذا میری رائے ہے کہ آپ قرآن کو جمع کرنے کا حکم دیں تو میں نے عمرؓ کو جواب دیا کہ ہم اس کام کو کس طرح انجام دیں جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا تو عمرؓ نے کہا۔ خدا کی قسم یہ نہایت ضروری اور بہتر کام ہے اور عمرؓ مجھ سے اس معاملہ میں اصرار اور بحث کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے کو اس کام کے لیے کھول دیا اور میری بھی وہی رائے ہوگئی جو عمرؓ کی ہے۔"

پھر زیدؓ بن ثابت کہتے ہیں کہ ابوبکرؓ نے مجھے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"تم جوان اور زیرک ہو۔ ہم تم پر کسی طرح کی تہمت نہیں لگا سکتے۔ نیز تم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں کاتب وحی تھے۔ لہٰذا تم پورے قرآن کو ایک جگہ جمع کرنے میں لگ جاؤ۔ خدا کی قسم اگر وہ مجھے کسی پہاڑ کو منتقل کرنے کی تکلیف دیتے تو مجھ پر اس قدر گراں نہ گزرتا۔ جتنا قرآن کے جمع کرنے کی ذمہ داری کا بار گراں، جس کا انھوں نے حکم دیا۔ میں نے کہا کہ آپ دونوں کس طرح وہ کام کرنا چاہتے ہیں جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا تو ابوبکرؓ نے فرمایا۔ اللہ کی قسم یہی بہتر ہے۔ پس ابوبکرؓ مجھ سے اصرار اور بحث کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ نے میرا سینہ اس کام کے لیے کھول دیا جس کے لیے اس نے ابوبکرؓ اور عمرؓ کے سینوں کو کھول دیا تھا۔ چنانچہ میں قرآن کو کھجور کے درخت کی چھالوں سے اور پتھر کی تختیوں سے اور لوگوں کے سینوں سے جمع کرتا رہا۔ البتہ سورۃ توبہ کا آخری حصہ مجھے صرف ابوخزیمہؓ انصاری کے پاس سے ملا اور ان کے سوا کسی اور کے پاس سے وہ مجھے نہ ملا۔ یعنی **لقد جاء کم رسول من انفسکم** ختم سورہ براءت تک۔ پس یہ صحیفے ابوبکرؓ کے پاس ان کی وفات تک رہے، پھر عمرؓ کے پاس ان کی وفات تک، پھر حفصہ بنت عمرؓ کے پاس۔"[1]

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے:

اللہ تعالیٰ ابوبکرؓ پر رحم فرمائے وہ پہلے شخص تھے جس نے قرآن کو کتابی صورت میں جمع کیا۔[2]

عہد عثمانی

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سہولت کے لیے عرب کے ہر قبیلہ کو اپنے اپنے لہجہ اور رسم الخط میں پڑھنے اور لکھنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ عثمانی عہد میں اختلاف قراءت کی وجہ سے نومسلم عجمیوں

1۔ بخاری کتاب فضائل القرآن باب جمع القرآن شرح ابن حجر عسقلانی جلد نمبر ۹ ص ۸۔

2۔ برہان ج ۱ صفحہ ۲۳۹۔

میں ایک فتنہ اٹھ کھڑا ہوا، جس کا ذکر احادیث میں آتا ہے۔ حضرت امام بخاریؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے۔

''حذیفہ بنؓ الیمان حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے ارمینیہ کی فتح میں اہل شام کے ساتھ اور آذربیجان کی فتح میں اہل عراق کے ساتھ جہاد میں شرکت کی تھی۔ وہاں ان دونوں علاقوں کے مسلمانوں کا قرأت قرآن میں اختلاف دیکھ کر گھبرا گئے۔ پس جب وہ حضرت عثمانؓ کے پاس آئے تو کہا: اے امیر المومنین! اس امت کی خبر لیجئے۔ قبل اس کے کہ وہ کتاب اللہ میں اس طرح اختلاف کرنے لگیں جس طرح یہود اور نصاریٰ نے اختلاف کیا تو حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ ہمارے پاس صحیفے ارسال کر دیں تاکہ ہم اس کی نقلیں مصاحف میں کر لیں، پھر آپ کو اصل صحیفے واپس کر دیں گے۔ تو حضرت حفصہؓ نے ان صحیفوں کو حضرت عثمانؓ کی خدمت میں بھیج دیا اور حضرت عثمانؓ نے زید بنؓ ثابت، عبداللہ بن زبیرؓ، سعید بن العاصؓ اور عبدالرحمٰن بنؓ الحارث کو حکم دیا تو ان لوگوں نے اس کو مصاحف میں نقل کیا۔ حضرت عثمانؓ نے (زید بنؓ ثابت کے سوا بقیہ) تینوں قرشی اصحاب سے کہا تھا کہ جب تم لوگ اور زید بنؓ ثابت قرآن کے کسی معاملہ میں اختلاف کرو تو اس کو لغت قریش پر لکھنا کیونکہ وہ انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے تو انھوں نے ایسا ہی کیا۔ یہاں تک کہ جب اصل مسودات مصاحف میں نقل کر لیے گئے تو حضرت عثمانؓ نے اصل صحیفوں کو حضرت حفصہؓ کے پاس بھیج دیا اور جو مصاحف نقل کرائے تھے۔ ان میں کا ایک ایک نسخہ مملکت کے علاقے میں بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس کے سوا جس صحیفہ یا مصحف میں قرآن لکھا ہوا ہو اسے جلا دیا جائے۔ زید بنؓ ثابت کہتے ہیں کہ جس وقت ہم مصحف لکھ رہے تھے تو سورۃ احزاب کی ایک آیت (اصل صحیفوں میں) ہمیں نہ ملی، جسے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا، تو ہم نے اس کی تلاش کی۔ خزیمہؓ بن ثابت انصاری کے پاس لکھی ہوئی پائی اور وہ آیت ''مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ'' تھی۔ چنانچہ ہم نے اس کو اسی سورۃ میں مصحف میں شامل کر دیا۔''[1]

غیر مسلموں کی شہادتیں

سر ولیم میور دیباچہ حیات محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں لکھتا ہے:

''اس بات کی تسلی بخش اور قابل اطمینان اندرونی اور بیرونی شہادت موجود ہے کہ قرآن اس وقت بھی ٹھیک اسی شکل وصورت میں محفوظ و مامون ہے جس حالت میں (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔''[2]

''نیو یونیورسل انسائیکلوپیڈیا میں ''قرآن'' کے عنوان سے مقالہ درج ہے، اس میں لکھا ہے:

1۔ صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن۔

2۔ دیباچہ لائف آف محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ص ۲۵۔

"یہ کتاب پیمبر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) پر ان کی زندگی کے آخری تئیس سال میں مکہ اور مدینہ میں نازل ہوتی رہی، اور مسلمانوں کے عقیدہ میں کلام الٰہی ہے بہ خلاف حدیث کے جو مجموعہ کلام رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے۔ قرآن پیمبر (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی زندگی میں ہی اور انہی کی زیر ہدایت و نگرانی ضبط تحریر میں آ گیا تھا اور ان کے صحابیوں نے اسے حفظ یاد کر لیا تھا، اور یہ معمول آج تک جاری ہے۔ چنانچہ صدہا مسلمان کلام پاک کے حافظ ہیں اور اسے سارے کا سارا دہرا سکتے ہیں۔ بغیر کسی ایک غلطی کے۔ اس کتاب کا دعویٰ ہے کہ اس میں تمام کتب آسمانی کے حقائق آ گئے ہیں اور یہ کہ آخری اور ناقابل تغیر کتاب ہے۔ نیز یہ کہ نوع انسان کے لیے وہ جامع ترین دستور العمل ہے اور اسلام یعنی دین فطرت کی آخری توضیح ہے اور یہی دین ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام اور سارے قدیم انبیاء کا رہ چکا ہے اس کی عبارت کا غیر محرف ہونا مسلم ہے۔"

جرمن کے مشہور مستشرق نولڈیکی نے لکھا ہے:

"یورپ کے جن جن مصنفین نے اب تک اس امر کی زبردست کوشش کی ہے کہ قرآن میں تحریف ثابت کریں وہ اپنی سعی اور جدوجہد میں حیرت انگیز طور پر ناکام ثابت ہوئے ہیں۔"[1]

خصائص قرآن

۱۔ اعجاز قرآن

قرآن مجید کا بے مثل ہونا

قرآن مجید وہ کتاب ہے جس نے ہر پہلو سے بے مثل ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: **قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا** (بنی اسرائیل ۱۷:۸۸) کہہ دے کہ اگر انس و جن جمع ہو جائیں اور کوشش کریں کہ اس قرآن کی مثل بنا لائیں تو وہ ہرگز ہرگز اس کی مثل نہ بنا سکیں گے خواہ وہ ایک دوسرے کے ظہیر و مددگار بن جائیں۔

سورۃ بقرہ میں منکرین کو صرف ایک سورۃ کے مانند کلام پیش کرنے کا چیلنج دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا (سورۃ بقرہ ۲:۲۳، ۲۴) اگر تمھیں اس امر میں شک ہو کہ جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے تو تم اس کی مانند کوئی سورۃ بنا لاؤ اور اپنے گواہوں کو بلاؤ اگر تم سچے ہو پس اگر تم نے اس کی مثل پیش نہ کی۔ اور یاد رکھو کبھی نہ کر سکو گے۔

یہ دونوں آیات قرآن مجید کا بے مثل ہونا ظاہر کرتی ہیں۔

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ قرآن۔

دلائل اعجاز

قرآن مجید کن کن پہلوؤں کے لحاظ سے معجزہ ہے۔ ان تمام کا احاطہ کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے، صرف چند ایک اعجازی پہلوؤں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

علمی لحاظ سے معجزہ

قرآن مجید دقائق علمیہ کا خزانہ ہے، جن کو بوجہ خارق عادت ہونے کے علمی اعجاز کہنا چاہیے۔ قرآنی علوم کو چار موٹے موٹے عنوانات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے۔

اوّل: روحانی علوم: جن میں خدا کی توحید اور اس کی صفات کا علم، تعلق باللہ کا علم، ملائکہ کا علم، مبدا و معاد کا علم، اخلاق فاضلہ کا علم اور عبادات کا علم شامل ہے۔

دوم: معاشرتی علوم: جن میں عمرانیات، علم سیاست، علم اقتصاد، علم قانون، علم تمدن، علم ہندسہ، علم نفس اور علم مناظرہ شامل ہیں۔

سوم: سائنسی علوم: جن میں فضائیات، علم کیمیا، علم طبیعیات، علم نباتات، علم طبقات الارض، علم الجبال، علم الحیوان، علم ہیئت، علم طبابت شامل ہیں۔

چہارم: علوم لسانیہ: جس میں صرف ونحو اور معانی و بیان کے علوم شامل ہیں۔

قرآن مجید میں آتا ہے: مَافَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ. (الانعام ۶: ۳۸) ہم نے کتاب میں بیان کرنے سے کوئی چیز نہیں چھوڑی۔

قرآن مجید میں یہ سب علوم خدمت دین کے لیے بطور خارق عادت بیان ہوئے ہیں۔ جن سے بڑے بڑے دقیق مسائل حل کیے جاسکتے ہیں۔ خاص طور پر ہستی باری تعالیٰ ثابت کرنے کے لیے یہ علوم دست بستہ کھڑے نظر آتے ہیں۔

برکات روحانیہ کے لحاظ سے معجزہ

قرآن مجید کے نزول سے قبل اہل عرب ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے، جن سے قوم کا نجات پانا محال نظر آتا تھا۔ اس گمراہی اور ظلمت کے زمانہ میں قرآن مجید نے عربوں کو ہر قسم کی بدی سے نجات دلا کر باخلاق اور باخدا انسان بنادیا۔

موسیو سیڈیو فرانسیسی لکھتا ہے: ''اسلام کو جو لوگ وحشیانہ مذہب کہتے ہیں۔ انھوں نے قرآن کی تعلیم کو نہیں دیکھا، جس کے اثر سے عربوں کی تمام بری اور معیوب عادتوں کی کایا پلٹ ہوگئی۔''[1]

مسٹر ٹامس کارلائل انگلستان کے فاضل اپنی کتاب لیکچرز آن ہیروز میں لکھتے ہیں: ''اسلام قوم

[1] بحوالہ تاریخ القرآن مصنفہ مولانا عبدالقیوم ندوی ص ۷۱۔

عرب کے حق میں گویا تاریکی میں روشنی کا آنا تھا۔ عرب کا ملک پہلے پہل اس کے ذریعے سے زندہ ہوا۔"

فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ

قرآن مجید اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے۔ اس کا اعتراف نہ صرف مسلمانوں کو ہے بلکہ مخالفین کو بھی۔ نزول قرآن کے وقت عرب میں بے شمار فصیح اللسان خطیب اور شاعر تھے، جن کی زبان آوری مسلمہ تھی۔ سب فصحاء و بلغاء قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کے سامنے اپنے آپ کو ضعیف اور پست سمجھنے لگ پڑے۔ ان کے بلغاء کو قرآن کی فصاحت و بلاغت کا اعتراف کرنا پڑا۔ لبید معلقہ کا شاعر تھا، جب وہ مسلمان ہوا تو اس نے شعر کہنے ترک کر دیے اور کہا کرتا تھا: "جب خدا نے مجھے سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران سکھائی ہے تو اب مجھے شعر کہنا موزوں نہیں۔"

پاپولر انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے:

"قرآن کی زبان بلحاظ لفظ عرب نہایت فصیح ہے۔ اس کی انشائی خوبیوں نے اسے اب تک بے مثل اور بے نظیر ثابت کیا ہے۔"

"قرآن مجید اثر ڈالنے، یقین دلانے کی طاقت، فصاحت و بلاغت اور تراکیب و بندش الفاظ میں بے نظیر ہے اور دنیائے سائنس کے تمام شعبوں کی حیرت انگیز ترقی کا باعث ہے۔[1]

"یہ امر کہ عرب کے بہترین مصنف بھی قرآن کی خوبیوں کے برابر کوئی چیز پیدا کرنے پر قادر نہ ہوئے کوئی تعجب کی بات نہیں۔"[2]

جارج سیل لکھتا ہے:

"قرآن کریم بے شبہ عربی زبان کی سب سے بہتر اور سب سے مستند کتاب ہے۔ کسی انسان کا قلم ایسی معجزانہ کتاب نہیں لکھ سکتا۔ اور یہ مردوں کو زندہ کرنے سے بڑھا ہوا معجزہ ہے۔"

ڈاکٹر موریس فرانسیسی لکھتا ہے:

"قرآن کی سب سے بڑی تعریف اس کی فصاحت و بلاغت ہے۔ مقاصد کی خوبی اور مطالب کی خوش اسلوبی کے اعتبار سے قرآن کو تمام آسمانی کتابوں پر فوقیت ہے۔"

قوت تاثیر کے لحاظ سے معجزہ

قرآن مجید کے الفاظ میں خارق عادت تاثیر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنْبَاءِ مَافِيهِ مُزْدَجَرٌ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ (قمر، ۵۴: ۴، ۵) اور یقیناً ان کو (قرآن کے ذریعہ) وہ باتیں پہنچ چکی ہیں جن میں تنبیہ ہے۔ یہ قرآن دل تک پہنچ جانے والی دانائی ہے مگر ڈرانا کسی کام نہ آیا۔

---

[1] ہرش فیلڈ نیو ریسرچز صفحہ ۸، ۹۔ [2] Palmer introduction P.58.

اس قوت تاثیر سے ڈر کر مخالفین لوگوں کو قرآن مجید کے سننے سے روکتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ جب کوئی مسلمان قرآن پڑھ کر سنانے لگے تو شور کرو۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ (حٰمٓ السجدہ ۴۱:۲۶) یعنی کفار نے کہا کہ اس قرآن کو سنا نہ کرو اور اس کے پڑھنے کے وقت شور وغل کیا کرو شاید تم غالب آ جاؤ۔

حضرت عمرؓ کا اسلام لانے کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ گھر سے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کے لیے نکلتے ہیں اپنی بہن کے گھر سے قرآن مجید کی آیات سن لیتے ہیں تو ان کے دل میں قرآن کی صداقت اور حقانیت کی میخ گڑ جاتی ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا جوا اپنی گردن پر رکھ کر باہر نکلتے ہیں، سیدھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور دائرہ اسلام میں داخل ہو کر اشاعت قرآن کا عہد کرتے ہیں۔

سبعہ معلقہ کا شاعر لبید سورۃ بقرہ کی چند آیات پڑھ کر بے اختیار بول اٹھا کہ خدا اور اس شخص کے سوا جس پر وحی نازل ہوئی ہے کوئی شخص ایسا کلام نہیں کر سکتا، اور وہ فوراً دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ جارج سیل مشہور مستشرق نے بھی لبید کے ایمان لانے کے واقعہ کی تصدیق اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں کی ہے۔

خالد بن عتبہؓ، حضرت عثمانؓ بن مظعون، حضرت طفیلؓ بن عمرو اور بے شمار صحابہ تھے جنھوں نے قرآن کی چند آیات سنیں اور وہ مسلمان ہو گئے۔

جان ریبک جرمن فلاسفر کہتا ہے:

''جب کہ قرآن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے منکر سنتے تھے تو بے تاب ہو کر سجدے میں گر جاتے تھے اور مسلمان ہو جاتے تھے۔''[1]

جارج سیل لکھتا ہے:

قرآن مجید کا طرز بیان عموماً دلکش اور اس میں روانی ہے، اور بہت سے مقامات پر خصوصاً اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی عظمت وشان اور جلال کا ذکر ہے۔ اس کا طرز بیان اور بھی دلکش اور شاندار اور بلند پایہ ہے۔ وہ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس قدر کامیاب ہوا اور اس نے اپنے سامعین کے قلوب کو اس قدر مسخر کیا کہ کئی مخالف یہ خیال کرنے پر مجبور تھے کہ یہ گویا کسی جادو یا سحر کا اثر ہے۔''[2]

عدم اختلاف کے لحاظ سے معجزہ

قرآن مجید تئیس برس دکھ اور سکھ کے مختلف اوقات میں نازل ہوتا رہا ہے۔ اور یہ ایک ایسے شخص پر نازل ہوا جو محض امی تھا۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس قدر مختلف حالات زندگی میں سے گزرنا پڑا کہ منصوبہ باز شخص ان حالات میں ایک حالت پر قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ اس کے نظریات اور عقائد بدلتے

---

[1] بحوالہ تاریخ القرآن مصنفہ عبدالقیوم ندوی ص ۶۷۔ [2] Sale preliminary.

رہتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک وہ وقت آیا جب اپنی قوم کی اصلاح اور بہتری کے لیے غار حراء میں آہ وبکا کیا کرتے تھے۔ پھر چادر نبوت اوڑھ کر میدان عمل میں آ گئے تو چاروں طرف سے مخالفت کے بادلوں میں گھر گئے۔ کیا اپنے اور کیا بیگانے سبھی جان لیوا بن گئے۔ آخر کار مکہ معظمہ سے ہجرت کرنا پڑی اور مدینہ چلے گئے۔ ان کے سر پر سیادت کا تاج رکھ دیا گیا۔ ایک چھوٹی سی ریاست کی بنیاد پڑ گئی۔ ریاست اور صحابہ کی جانوں کی حفاظت کے لیے میدان جنگ میں اترنا پڑا۔ تمام قبائل مخالف ہو گئے۔ مدینہ میں یہود ریشہ دوانیوں میں مصروف ہو گئے۔ منافقوں کی ایک جماعت بن گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان پرُخطر حالات میں اسلام کی کشتی کو سلامتی کے ساتھ پار اتارنے کے لیے کوشاں رہے۔ آخر وہ وقت آ گیا۔ مخالفت کے بادل چھٹ گئے۔ دشمن مغلوب ہوئے۔

کیا کوئی انسان یہ بات ذہن میں لاسکتا ہے کہ اس قسم کے مختلف حالات میں انسان ایک ہی حالت پر قائم رہے اور جو وہ کلام پیش کرے اس میں اختلاف نہ ہو۔ یہ انسانی طاقت سے تو باہر ہے۔ ہاں، اختلاف سے پاک کلام وہی ہوسکتا ہے جو ایک علیم وخبیر ہستی کی طرف سے نازل ہو۔ قرآن مجید میں بھی منافقوں اور مخالفوں کو مخاطب کر کے کہا ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (نساء۴:۸۲)

پھر کیا وہ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں ضرور اختلاف پاتے۔

غیب کی خبروں کا اعلان کرنے کے لحاظ سے معجزہ

قرآن مجید غیب کی خبروں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ یہ کتاب ایک ایسی ہستی کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو علیم وخبیر ہے۔ بعض وہ خبریں ہیں جو ماضی سے تعلق رکھتی ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان خبروں کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ بعض وہ خبریں ہیں جو مستقبل سے تعلق رکھتی ہیں۔

بائبل کی تحریف

قرآن مجید نے بائبل میں تحریف وتغیر کا دعویٰ اس وقت کیا جب دنیا اس علمی حقیقت سے ناآشنا تھی۔ آج دنیا کے تمام محققین نے اس امر کا اعتراف کر لیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (بقرہ۲:۷۵) پس کیا تم امید رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے اور ان میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اللہ کے کلام کو سنتا ہے پھر سمجھ لینے کے بعد اس کو بدل دیتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے۔

پادری ویری اخبار نور افشاں لدھیانہ جلد ۲ نمبر ۲۸ صفحہ ۱۲۳ کالم ۳ مورخہ ۶ جولائی ۱۸۷۴ء میں

لکھتا ہے۔

''جعلی انجیلوں کے موجود ہونے سے ہم ناواقف نہیں ہیں، بلکہ جن جعلی انجیلوں کا ہارن صاحب نے اپنی تصنیف میں حوالہ دیا ہے۔ وہ ہمارے پاس بھی موجود ہیں۔ ان کو بعض بدعتی عیسائیوں نے مروج کرنا چاہا تھا، مگر وہ اپنے فاسد ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔''

پادری موشیم اپنی تاریخ کلیسا مطبوعہ ۱۸۶۰ء جلد دوم ص ۳۶ پر لکھتا ہے:

''متعدد وجوہ ایسے تھے جن کے باعث ضرورت محسوس ہوئی کہ پہلی صدی عیسوی میں مروجہ انجیلوں کو ایک نسخہ میں جمع کر دیا جائے۔ دنیا میں بہت سی ایسی تحریریں پھیل گئی تھیں جن پر پاک پیغمبروں کے نام بطور مصنفین درج کر دیے گئے تھے۔''

رومن تواریخ کلیسا مطبوعہ مرزا پور ۱۸۵۶ء صفحہ ۱۰ لکھا ہے۔

''بہت سے مسیحی کتابیں خود لکھ کر کسی حواری مسیح یا حواری مسیح کے کسی خادم یا کسی بڑے اسقف کے نام سے مشہور کر دیتے تھے۔ ایسی جعلی کارروائیاں تیسری صدی عیسوی سے شروع ہوئیں اور کئی سو برس تک جاری رہیں۔ یہ نہایت ہی خلاف حق اور قابل شرم حرکت تھی۔''

ہارن صاحب اپنی تفسیر بائبل مطبوعہ لندن ۱۸۲۲ء جلد دوم صفحہ ۳۳۱ پر لکھتا ہے۔

''بلاشبہ بعض تحریفیں جان بوجھ کر ان لوگوں نے کی ہیں جو دین دار، پرہیز گار اور راہب تھے۔ غضب یہ ہے کہ بعد میں انہی تحریفات کے سچا ہونے پر اصرار کیا جاتا تھا، تاکہ اپنے مطلب کو قوت دیں یا اپنے پر کوئی اعتراض نہ آنے دیں۔''

فرعون کی لاش کے متعلق خبر

قرآن مجید نے فرعون موسیٰ علیہ السلام کی لاش کے متعلق یہ خبر دی تھی کہ وہ موجود ہے۔ یہ اس زمانہ کی خبر ہے جب کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ فرعون کی لاش محفوظ و مصئون ہوگی۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا لَغَافِلُونَ (یونس ۱۰:۹۲) ہم تیری لاش کو باہر نکال دیں گے تاکہ تو ان کے لیے جو تیرے پیچھے ہیں نشان رہے اور بہت سے لوگ ہمارے نشانوں سے بے خبر ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابل پر جو فرعون تھا اس کا نام رعمیسس ثانی تھا۔ انسائیکلو پیڈیا آف برٹینیکا میں مضمون ممی کے تحت لکھا ہوا ہے کہ رعمیسس ثانی کی لاش مصالح کے ذریعہ محفوظ ہے۔

قوت دلائل کے لحاظ سے معجزہ

قرآن مجید کا نام بینہ ہے، جس کے معنی ہیں واضح اور کھلی دلیل۔ ارشاد الٰہی ہے: فَقَدْ جَاءَكُمْ

بِهِبَيِّنَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ (الانعام ۶: ۱۵۷) یقیناً تمھارے پاس تمھارے خدا کی دلیل آ چکی ہے۔

قرآن کا قاری آسانی سے یہ جان سکتا ہے کہ قرآن مجید ہر دعویٰ کو دلائل و براہین قاطعہ کے ساتھ منواتا ہے اور تمام دعاوی دلائل سے واضح کیے ہیں۔ مخالف ایک بھی ایسا دعویٰ دکھا نہیں سکتا۔ جس کو دلیل سے واضح نہ کیا ہو۔

۲۔ نسل انسانی کی وحدت کا پیغام

قرآن مجید ہی ایک ایسی آسمانی کتاب ہے جو نسل انسانی کی وحدت کا پیغام دیتی ہے۔ قرآن میں آتا ہے: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس ۱۰: ۱۹) سب لوگ ایک ہی امت ہیں لیکن وہ آپس میں جھگڑتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: اِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (المومنون ۲۳: ۵۲) یہ تمہاری قوم ایک ہی قوم ہے اور میں تمہارا رب ہوں، سو مجھ سے ہی ڈرو۔

۳۔ اکمل ہونے کا دعویٰ

سماوی کتب میں سے قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جس نے مکمل ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ ۵: ۳) آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے تمہارا دین اسلام ٹھہرا کر راضی ہوا ہوں۔

مکمل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کتاب کی تعلیم زندگی کے ہر شعبہ کی راہنمائی کرتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: مَافَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ. (الانعام ۶: ۳۸) ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی۔ یعنی نوع انسانی کی ضرورت کی کوئی ایسی چیز نہیں جو اس میں بیان نہ ہوئی ہو۔

دوسری جگہ آتا ہے: فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۹۸: ۳) اس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔ یعنی اس قرآن میں بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے علوم اولین و آخرین درج ہیں۔

۴۔ تکریم انسانیت

جو بلند مقام قرآن مجید نے انسان کو دیا ہے، کسی دوسری کتاب نے نہیں دیا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ. اور ہم نے نوع انسان کو قابل تکریم بنایا ہے۔

اس کے برعکس ہندو اچھوتوں کو انسانیت کا درجہ دینے کو تیار نہیں۔ یہود غیر یہود کو بے دین کافر کہتے ہیں۔ انجیل غیر بنی اسرائیلیوں کو کتا اور سور کا نام دیتی ہے۔ غرض کہ ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک غیر اقوام بے دین، ملیچھ، سور اور کتے ہیں۔ قرآن مجید کا دنیا پر یہ ایک بڑا احسان ہے کہ اس نے تمام

انسانوں کو انسانیت کے دائرہ میں داخل کر سب کو قابل تکریم قرار دیا ہے۔

۵۔ قرآن پہلی کتب کا مصدق ہے

قرآن مجید ہی ایک ایسی آسمانی کتاب ہے جو پہلی آسمانی کتب کی تصدیق کرتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (بقرہ ۲:۴۱) یعنی ایمان لاؤ جو میں نے اتارا اس کی تصدیق کرتا ہے جو تمھارے پاس ہے۔ اس آیت کریمہ میں بنی اسرائیل کی کتب کی تصدیق ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ (المائدہ ۵:۴۸) قرآن مجید اس سے قبل تمام کتب منزلہ کی تصدیق کرتا ہے۔

۶۔ قرآن پہلی شرائع کو منسوخ کرتا ہے

قرآن مجید میں آتا ہے: مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا (البقرہ ۲:۱۰۶) یعنی جو پیغام ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں۔ تو اس سے بہتر یا اس جیسا لے آتے ہیں۔

اس آیت کے سیاق و سباق سے ظاہر ہے کہ یہاں یہود یا شرائع سابقہ کے متبعین مخاطب ہیں۔

اس وجہ سے آیت سے مراد شرائع سابقہ ہیں۔

آیت کا لفظ رسالت اور پیغام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

۷۔ عالمگیر ہونے کا دعویٰ

کسی آسمانی کتاب نے عالمگیر ہونے کا دعویٰ نہیں۔ ایک تو وجہ یہ ہے کہ تمام سابقہ کتب کسی ایک قوم کی راہنمائی کے لیے آتی تھیں، دوم جس زمانہ میں وہ کتب نازل ہوئی تھیں وہ عالمگیر دعویٰ کا مقتضی نہیں تھا۔ جب قرآن نازل ہوا۔ ایک تو اس نے عالمگیر ہونے کا دعویٰ کیا، دوم وقت بھی اس کا تقاضا کرتا تھا کہ کوئی ایسی کتاب نوع انسانی کی ہدایت کے لیے نازل ہو جو عالمگیر ہوتا کہ تمام نوع انسانی کو ایک قوم کی طرح بنا دے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِيْنَ (یوسف ۱۲:۱۰۴) یہ کتاب تمام جہانوں کے لیے نصیحت ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا (سبا ۳۴:۲۸) اے رسول ہم نے تجھے تمام لوگوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

۸۔ قرآن میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے

قرآن مجید اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ فاتحہ میں راہ اعتدال پر چلنے

کی دعا سکھائی ہے: اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ (۶۔۷) اے خدا ہمیں سیدھا راستہ دکھا ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرے انعام ہوئے ان لوگوں کا راستہ نہ دکھانا جن پر تیرا غضب ہوا اور گمراہ ہوئے۔

غیر المغضوب علیھم سے مراد بخوائے حدیث یہود ہیں۔ انھوں نے ایک نبی کا انکار کر کے تفریط کی راہ اختیار کی۔ ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں۔ جنھوں نے معصوم بندہ کو خدا کا رتبہ دے دیا اور افراط کا راستہ اختیار کیا۔ ایک مسلمان کو افراط اور تفریط کے راستہ سے بچ کر صراط مستقیم یعنی درمیانی راستہ پر چلنے کی دعا سکھائی ہے۔ اسی وجہ سے امت مسلمہ کو امت وسطیٰ کہا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا (البقرہ ۲:۱۴۳) اور اس طرح ہم نے تم کو امت وسطیٰ بنایا ہے۔ امت وسطیٰ سے مراد ایسی جماعت ہے جو افراط اور تفریط سے پاک ہونے کی وجہ سے ارفع سے ارفع مقام پر پہنچی ہو۔

۹۔ پہلی کتب کے اجمال کو کھولتا ہے

پہلی کتب سماوی میں جو اجمال اور ابہام رہ گیا تھا قرآن مجید ان کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَا کَانَ ھٰذَا الْقُرْآنُ اَنْ یُّفْتَرٰی مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلٰکِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْہِ وَتَفْصِیْلَ الْکِتَابِ لَا رَیْبَ فِیْہِ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِیْنَ. (یونس ۱۰:۳۷) اور یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے سوا اوروں کا افترا ہو اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے ہے اور کتاب کی تفصیل ہے جس میں کوئی شک نہیں جہانوں کے رب کی طرف سے ہے۔

اس آیت میں قرآن مجید کی دو شانیں بیان ہوئی ہیں۔

۱۔ تصدیق بین یدیہ　　　　۲۔ تفصیل کتاب

دوسری جگہ آتا ہے: الٓرٰ تِلْکَ آیٰتُ الْکِتَابِ وَقُرْآنٍ مُّبِیْنٍ (الحجر ۱۵:۱) میں اللہ دیکھنے والا ہوں یہ کتاب کی آیات ہیں اور قرآن کی جو کھول کر بیان کرنے والا ہے۔

قرآن کے ساتھ مبین کی صفت لا کر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ ان تمام باتوں کو کھول کر بیان کرنے والا ہے جو پہلی کتب میں اجمال کے طور پر بیان ہوئی تھیں۔ مثلاً مسئلہ معاد، صفات الٰہیہ، رویت باری تعالیٰ وغیرہ۔

۱۰۔ دعویٰ کے ساتھ دلیل

قرآن مجید کسی دعویٰ کو بغیر دلیل کے نہیں منواتا۔ اس وجہ سے شروع میں ہی قرآن مجید نے "لاریب" کہہ کر قارئین کی توجہ اس طرف پھیر دی ہے کہ دعویٰ کے ساتھ دلائل و براہین ہوں گے، جس کی وجہ سے شک و ابہام کی گنجائش نہیں رہے گی۔ یہ کتاب انسانی فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر قسم کے دلائل دیتی ہے تاکہ شک و شبہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ مثلاً قرآن مجید نے اللہ کی ہستی منوانی ہے، تو انسانی

فطرت کو مدِنظر رکھ کر تین قسم کے دلائل پیش کرتا ہے۔

۱۔ مادی دلیل کائنات سے اخذ کی گئی ہے۔

۲۔ داخلی دلیل نسلِ انسانی کا داخلی تجربہ ہے۔ کیونکہ ہر انسان کے اندر ایک روشنی ہے جو اس کو بتاتی ہے کہ اس سے اوپر ایک غالب ہستی ہے۔

۳۔ روحانی دلیل وحی الٰہیہ سے اخذ ہوتی ہے۔ جب انسان نیک راہوں پر چل کر خدا سے مشرف بکلام ہوتا ہے۔

دوسری مذاہب کتب اپنے پیش کردہ دعاوی کے ثبوت کے لیے انسانوں کی محتاج ہوتی ہیں۔

۱۱۔ عقائد باطلہ کی تردید

قرآن مجید میں آتا ہے: مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ (النحل ۱۶:۶۴) ہم نے اس کتاب کو تجھ پر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ جو عقائد باطلہ عقول ناقصہ کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں ان سب کا رد کیا جائے، ایمان داروں کے لیے ہدایت اور رحمت کا موجب ہے۔

تمام مذاہب عالم کے عقائد باطلہ کی فہرست تیار کرنا، پھر ان کا روازروئے قرآن بیان کرنا طویل کام ہے اور نہ یہاں گنجائش ہے۔ یہاں صرف چند ایک مشہور مذاہب کے بڑے بڑے عقائد باطلہ کا رد بیان کیا جاتا ہے۔

کفارہ کا رد

عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ رحم بلا بدل نہیں کرسکتا، اس لیے بیٹا (عیسیٰ) انسانوں کے گناہوں کے معاوضہ کے طور پر صلیب پر چڑھ گیا۔ اب جو بھی کفارہ پر ایمان لے آئے گا وہ نجات کا مستحق ہو جائے گا۔

قرآن مجید میں کفارہ کے رد میں آتا ہے: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (الزمر ۳۹:۷) کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ پھر تم نے اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے پس وہ تمھیں اس کی خبر دے گا جو تم کرتے ہو وہ سینوں کی بات جاننے والا ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ کوئی بھی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، تمام انسان خود اپنے گناہوں کے ذمہ دار ہوں گے۔

عقیدہ تثلیث کا رد

یہ بھی عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔ اس عقیدہ کی رو میں قرآن مجید میں آتا ہے: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ

وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (النساء ۴:۱۷۱) پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو۔ خدا تین ہیں اس سے رک جاؤ تمھارے لیے بہتر ہے اللہ صرف ایک ہی معبود ہے۔

عقیدہ ابنیت کا رد

یہ یہود اور عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔ یہود نے عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنا لیا تھا اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔ اس کے رد میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا (مریم ۱۹:۹۲) خدائے رحمان کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ بیٹا بنائے۔

عقیدہ ثنویت کا رد

یہ عقیدہ زرتشت مذہب کا ہے۔ وہ دو خدا اہرمن اور یزدان کے قائل ہیں۔ اس کے رد میں قرآن مجید فرماتا ہے: وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (النحل ۱۶:۵۱) اور اللہ نے کہا کہ دو معبود مت بناؤ وہ صرف اکیلا ہی معبود ہے۔

عقیدہ تناسخ

یہ عقیدہ ہندوؤں کا ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے خدا گناہ معاف نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے ایک انسان کو اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے مختلف جونوں میں تبدیل ہونا پڑتا ہے۔ قرآن مجید نے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (جزا کے وقت کا مالک) میں اس عقیدہ کا رد کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مالک کا لفظ بجائے ملک کے اس لیے اختیار کیا ہے کہ ملک محدود اختیارات کا حاکم ہوتا ہے، وہ کسی مجرم کو چھوڑ نہیں سکتا۔ مالک کے اختیارات وسیع ہیں، جسے چاہے، معاف کر دے۔ پس خدا تعالیٰ جزا و سزا کے دن جسے چاہے معاف کر سکتا ہے۔ پھر قرآن مجید میں آتا ہے: غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ (۴۰:۳) یعنی اللہ گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔

روح و مادہ کی ابدیت کا عقیدہ

یہ عقیدہ ہندو مذہب کا ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے خدا کی صفات میں شرک لازم آتا ہے۔ قرآن مجید نے ایک جگہ نہیں بے شمار جگہوں پر ہر قسم کے شرک کا رد کیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران ۳:۶۴) یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کو رب العالمین کہا ہے۔ رب کا لفظ استعمال کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ

تعالیٰ کی ذات اور صفات میں کوئی شریک نہیں، وہ مادہ اور روح کا بھی رب ہے۔ اس وجہ سے یہ خدا کی کسی صفت میں شریک نہیں ہو سکتے۔

سنت اور حدیث

اسلامی تعلیمات کا دوسرا ماخذ سنت اور حدیث ہے۔ سنت کے معنی لغت میں طریقہ، قاعدہ یا کسی کا ڈھب یا زندگی کا اسلوب ہے۔ قرآن مجید اور حدیث میں یہ لفظ انہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: سُنَّةَ الْاَوَّلِيْن یعنی لوگوں کا طریقہ۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ (سورۃ الاحزاب ۶۲:۳۳) یہ اللہ کا طریقہ ہے ان لوگوں کے بارے میں جو گزر چکے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي یعنی تم پر یہ لازم ہے کہ میرے طریقہ زندگی کو اختیار کرو۔

عرب لوگ لفظ سنت کو ظہور اسلام سے قبل بھی اسی معنی میں استعمال کرتے تھے۔

اصطلاحی معنی

سنت سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فعلی روش ہے، جو اپنے اندر تواتر کا رنگ رکھتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احکام الٰہی پر خود عمل کیا۔ پھر صحابہؓ نے دیکھ کر وہ کام کیا۔ اس کے بعد نسلاً بعد نسلٍ تواتر کے ساتھ وہ عمل ہم تک پہنچا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نماز کا حکم دیا، تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے اس حکم کو اپنے عمل سے بیان کیا کہ فجر کی نماز کیسے پڑھنی چاہیے، ظہر کی نماز کیسے پڑھنی چاہیے، عصر کی نماز کیسے پڑھنی چاہیے، مغرب اور عشاء کی نمازیں کس طرح پڑھنی چاہئیں۔ پس وہ عملی نمونہ جو اب تک اس امت میں جاری ہے اسی کا نام سنت ہے۔

حدیث

حدیث کا لفظ تحدیث سے اسم ہے۔ تحدیث کے معنی خبر دینا ہے۔ ظہور اسلام سے پہلے بھی عرب حدیث کے لفظ کو اخبار کے معنی میں استعمال کرتے تھے۔ مثلاً وہ اپنے مشہور ایام کو احادیث کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ عربی محاورہ ہے: صَارَ حَدِيْثًا یعنی فلاں چیز ضرب المثل بن گئی۔

قرآن مجید نے بھی اسی مفہوم میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: فَلْيَاتُوْا بِحَدِيْثٍ مِثْلِهٖ (سورۃ الطور ۳۴:۵۲) تو اس جیسی کوئی بات لائیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (سورۃ زمر ۲۳:۳۹) اللہ نے بہترین کلام اتارا (یعنی) کتاب جس کی باتیں ملتی جلتی دہرائی گئی ہیں۔

اصطلاحی معنی

حدیث سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ اقوال ہیں۔ جو راویوں کے ذریعہ ہم

تک پہنچے ہیں۔

تدوین وحفاظت حدیث

تدوین اور حفاظت حدیث مختلف پانچ ادوار میں سے گزری ہے۔

پہلا دور

حدیث کی حفاظت اور تدوین کی اساس رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ابلاغ (دوسروں تک زبانی پہنچانا) اور کتابت پر رکھ دی گئی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **الا لیبلغ الشاھد الغائب فلعل من یبلغه ان یکون اوعی له من بعض سمعه** (بخاری شریف جلد۲ ص ۵۳) حاضر غائب کو میری باتیں پہنچا دے۔ بعض وہ لوگ جن تک میرا کلام پہنچایا جائے ہو سکتا ہے۔ وہ ان لوگوں سے زیادہ یاد محفوظ رکھنے والے ہوں جنھوں نے مجھ سے سنا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں وفد عبدالقیس آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے سامنے نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بیان فرمائے اور فرمایا: **احفظو واخبروا من وراء کم** یعنی اسے یاد کرو اور جنھیں تم نے پیچھے چھوڑا ہے۔ ان کو اس کی خبر دو۔

ایک اور موقع پر ابلاغِ حدیث کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: **نضر الله عبداً سمع مقالتی فحفظها و وعا ها و اداها کما سمع** (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۸) اللہ تعالیٰ اس بندے کو خوش وخرم رکھے جس نے میری باتوں کو سنا اور یاد کر کے محفوظ رکھا، جس طرح سنا اسی طرح دوسروں تک پہنچا دیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث کی نشر واشاعت کے لیے لکھنے کا بھی حکم دیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ علم کو مقید کر لو۔ حضرت عبداللہ نے عرض کیا: یارسول اللہ مقید کرنے کا کیا مطلب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لکھنا (مجمع الزوائد ص ۱۵۲)

سنن ابی داؤد میں حضرت عبداللہؓ بن عمرو کی روایت ہے کہ میں جو کچھ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنتا تھا لکھ لیتا تھا تاکہ میں اس کو یاد رکھ سکوں۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ مجھ سے زیادہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کو کوئی محفوظ نہیں رکھتا تھا۔ سوائے عبداللہ بن عمروؓ کے، کیونکہ وہ لکھ لیا کرتا تھا اور میں نہیں لکھتا تھا۔ (بخاری ۳:۳۹)

عہد نبوی کا تحریری سرمایہ

عہد نبوی میں حدیث کے تحریری سرمایہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ احادیث کا وہ ذخیرہ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے احاطہ تحریر میں لایا گیا۔
۲۔ وہ ذخیرہ جو صحابہ کرام نے قلمبند کیا، پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں تصحیح کی غرض سے پیش کیا۔
۳۔ وہ ذخیرہ جو صحابہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے سن کر یا صحابہ کرام سے پوچھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی لکھ لیا۔ تینوں قسم کے تحریری سرمایہ کے متعلق مختصراً لکھا جاتا ہے۔

عبداللہ بن حکیم سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک تحریر ہمارے قبیلہ جہینہ کے پاس پہنچی۔ جس میں مختلف احادیث تھیں، اور ان میں یہ حدیث بھی تھی کہ مردہ جانوروں کی کھال اور پٹھے بغیر دباغت کے کام میں نہ لاؤ۔ (ترمذی جلد ا ص ۲۰۶)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک تحریر لکھوا کر عمرؓ بن حزم کے ذریعہ اہل یمن کے پاس بھیجی۔ اس میں فرائض سنن اور خوں بہا کے متعلق مسائل تھے۔ (شرح معانی الآ ثار طحاوی جلد ۲ ص ۴۱۷)

فتح مکہ کے دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس کے متعلق حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ابوشاہؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ یہ خطبہ میرے لیے لکھوا دیا جائے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ یہ خطبہ ان کو لکھ کر دیا جائے۔ (ابو داؤد جلد ۳ باب کتابت العلم ص ۳۵۷)

حضرت وائلؓ ابن حجر مدینہ حاضر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور کچھ عرصہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہے۔ جب گھر واپس جانے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحیفہ لکھوا کر دیا۔ جس میں نماز، روزہ، شراب، سود کے احکام تھے۔ (طبرانی صغیر ص ۲۴۱، ۲۴۲)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اپنے عاملوں کے پاس بھیجنے کے لیے کتاب الصدقہ تحریر کروائی تھی۔ لیکن وہ ابھی بھیجی نہیں گئی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے وہ کتاب عاملوں کے پاس بھیجی تھی۔ اس کتاب میں جانوروں کی زکوٰۃ کے متعلق مسائل تھے۔ (ترمذی جلد ا ص ۷۹)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرب وعجم کے بادشاہوں اور امراء کو تبلیغی خطوط لکھے، جن کا ذکر احادیث میں موجود ہے۔ ایک خط مقوقس شاہ مصر کو لکھوا کر بھیجا گیا تھا۔ یہ خط مصر کے آثار قدیمہ کی کھدائی میں برآمد ہوا تھا۔ وہ آج بھی مصر میں موجود ہے۔ اس کی عبارت کتب احادیث کی روایت سے حیرت انگیز مطابقت رکھتی ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ کے پاس ایک لکھا ہوا احادیث کا مجموعہ تھا۔ حضرت معبد بن ہلال کی

روایت ہے کہ جب احادیث کے متعلق ہم لوگ حضرت انسؓ سے زیادہ استفسار کرتے تو حضرت انسؓ ایک چونگا نکال لاتے اور فرماتے: یہ وہ احادیث ہیں جنھیں میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سن کر لکھا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں تصدیق اور توثیق کے لیے پیش کی تھیں۔

صحابہ کرامؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں بیٹھ جاتے اور حدیثیں لکھ لیتے تھے۔ حضرت عبداللہ بنؓ عمرو کی روایت ہے: **بینما نحن حول رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم نکتب** (دارمی ص ۶۸) ہم سب لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد بیٹھ جاتے اور حدیث لکھ لیتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ جو کچھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنتا تھا لکھ لیا کرتا تھا۔ (ابوداؤد جلد ۳ ص ۳۵۶)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے اسی تحریری مجموعہ احادیث کا نام صادقہ رکھا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے: **فاما الصادقة صحیفة کتبتُها من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم** یعنی صادقہ وہ مجموعہ احادیث ہے جس کو میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سن کر لکھا تھا۔

مایرغبني في الحیٰوة الا الصادقه. یعنی مجھے دنیا میں صادقہ سب چیزوں سے زیادہ محبوب ہے۔

حضرت رافع بنؓ خدیج سے روایت ہے کہ ہم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا، یارسول اللہ! ہم لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت سی باتیں سنتے ہیں اور ان کو لکھ لیتے ہیں، اس کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا ارشاد ہے؟ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا، لکھا کرو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (کنز العمال جلد ۵ ص ۲۲۳۔ مجمع الزوائد جلد ا ص ۶۰)

حضرت علیؓ کے پاس ایک لکھا ہوا صحیفہ تھا۔ اس میں خون بہا، اسیروں کی رہائی، زکوٰۃ اور دوسرے موضوع سے متعلق احادیث تھیں۔ (بخاری شریف باب کتابت العلم ص ۳۳) اور حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے: **ماکتبنا عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم الاالقرآن وما فی هذه الصحیفة** یعنی ہم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی چیز نہیں لکھی مگر قرآن کریم اور جو کچھ اس صحیفہ میں ہے۔

حضرت حسن بن عمر کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابوہریرہؓ کے سامنے ایک حدیث بیان کی۔ انھوں نے اس کا انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ یہ حدیث تو میں نے آپ سے سنی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے جواب دیا اگر تم نے مجھ سے سنی ہوگی تو وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور مجھ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کی بہت سے کتابیں دکھائیں تلاش سے میری بیان کردہ حدیث ان کتابوں میں مل گئی تو حضرت ابوہریرہؓ نے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اگر وہ حدیث میں نے روایت کی ہوگی۔ تو میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی۔ (فتح الباری جلد ا ص ۱۴۸)

ان تاریخی شواہد سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال کی حفاظت

تحریری صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں ہی شروع ہو گئی تھی۔

دوسرا دور

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں احادیث کی کتابت اور عام شہرت شروع ہوگئی۔ صحابہ کرام کے تحریری مجموعوں سے دوسرے لوگوں نے لکھنا شروع کر دیا اور خلفاء نے جو بھی کوئی فیصلہ کرنا ہوتا تھا وہ قرآن اور فرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس طرح حدیث ایک ہاتھ سے نکل کر عوام کا سرمایہ بن جاتی تھی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے متعلق بشیر بن نہیک کا بیان ہے کہ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث کی کتابیں مانگ کر نقل کر لیا کرتا تھا۔ پھر انھیں سناتا تھا اور عرض کرتا کہ ان حدیثوں کو آپ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے؟ جواب دیتے ہاں۔ (دارمی ص ۶۸)

حضرت عکرمہؒ روایت کرتے ہیں کہ جس زمانہ میں حضرت عبداللہ بنؓ عباس کی بینائی کمزور ہوگئی تھی اور وہ خود پڑھ نہیں سکتے تھے، اس زمانہ میں طائف کے کچھ لوگ حضرت ابن عباس کے پاس لکھے ہوئے حدیث کے چند نسخے لے کر پہنچے، تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تم لوگ خود سناؤ اور تمہارا سنانا اور میرا پڑھنا جواز روایت کے لیے دونوں یکساں ہیں۔ (ترمذی جلد۲ ص ۳۳۸ طحاوی جلد۲ ص ۳۸۴)

اسی خیال کی تائید دارمی کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ سعیدؒ بن جبیر ابن عباسؓ کے پاس بیٹھ کر صحیفوں میں حدیثیں لکھتے تھے۔ (دارمی ص ۶۹)

حضرت انسؓ نے اپنے بچوں کو مخاطب کر کے فرمایا: یَابُنَیَّ قَیِّدُوْا ھٰذَا الْعِلْمَ. اے میرے بچو! اس علم کو لکھ لو۔ (دارمی ص ۶۸)

خلفاء راشدین کے پاس ہر روز مختلف قسم کے مقدمے آتے تو خلفاء راشدین فیصلہ کرنے کے لیے قرآن اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کرتے۔ اس طرح حدیث ایک سینہ سے نکل کر منظر عام پر آ کر شہرت پکڑ جاتی۔

قبیصہؓ کی روایت ہے کہ ایک فوت شدہ شخص کی دادی حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئی اور ورثہ سے حق کا دعویٰ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ نہ اللہ کی کتاب سے اور نہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپ کو حق ملتا ہے۔ لیکن جب دوسروں سے پوچھا تو مغیرہؓ نے گواہی دی کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصہ دیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان سے گواہ طلب کیا۔ محمد بن مسلمہؓ نے مغیرہؓ کے بیان کی تصدیق کی۔ اس بناء پر حضرت ابوبکرؓ نے دادی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔

حدیث کے درس و تدریس کا سلسلہ بڑے بڑے صحابہ کے گھروں پر جاری ہو گیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے آٹھ ہزار شاگرد تھے۔ حضرت عبداللہ بنؓ عباس، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ،

حضرت انس بن مالکؓ کے گھر درسگاہیں بنی ہوئی تھیں۔

صحابہ کرام نے ایک ایک حدیث کے سننے کے لیے سینکڑوں میل سفر اختیار کیے۔ جابرؓ بن عبداللہ نے مدینہ سے شام تک محض ایک حدیث سننے کے لیے سفر اختیار کیا۔ (فتح الباری ابوالفضل شہاب الدین جلد ا ص ۱۵۸)

تیسرا دور

تیسرا دور تابعین کا دور ہے۔ اکابر تابعین نے احادیث کی تدریس کے لیے درس گاہیں قائم کر دیں۔ تمام لوگ درس گاہوں کی طرف رجوع کرتے۔ حدیث کے جواہر پاروں سے جھولیاں بھر بھر کر واپس وطنوں کو لوٹتے تھے۔

اس دور میں لکھنے کا عام رواج ہو چکا تھا۔ لوگ درس گاہوں میں جاتے اور حدیثوں کو لکھ لیتے تھے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مدینہ کے گورنر ابوبکرؓ بن محمد بن عمر بن حزم کو لکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو حدیث ملے اس کو لکھ لیا کرے، میں ڈرتا ہوں کہ کہیں علم مٹ نہ جائے اور علماء فنا نہ ہو جائیں۔ مجالس قائم کریں، تاکہ جو شخص نہیں جانتا وہ بھی جانے۔ (بخاری کتاب العلم کیف یقبض العلم)

چوتھا دور

اس دور میں احادیث کے تحریری مجموعے منظر عام پر آنا شروع ہو گئے۔ سب سے پہلی جس شخص نے حدیث کی کتاب لکھی وہ امام عبدالملکؒ بن عبدالعزیز ابن جریج (م ۱۵۰ھ) ہیں۔ بعض کے نزدیک ربیع بن صبیح (م ۱۶۰ھ) نے سب سے پہلے حدیث کی کتاب لکھی۔ ایک اور روایت کی رو سے سعیدؒ بن ابی عروبہ (م ۱۵۶ھ) نے۔

ان محدثین کے سن وفات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ احادیث کا کتابی صورت میں لکھا جانا دوسری صدی کے نصف کے قریب ہو چکا تھا۔

ان محدثین کے علاوہ حسب ذیل محدثین نے علم حدیث کی خدمت سرانجام دی۔ مدینہ میں محمد بن اسحاقؒ (م ۱۵۱ھ) امام مالکؒ بن انس (م ۱۷۹ھ) کوفہ میں سفیان ثوریؒ (م ۱۶۱ھ) شام میں امام اوزاعیؒ (م ۱۵۶ھ) یمن میں معمرؒ (م ۱۵۳ھ) خراسان میں عبداللہ بن المبارکؒ (م ۱۸۱ھ) مصر میں لیث بن ثابتؒ (م ۱۷۵ھ)

پانچواں دور

پانچواں دور علم حدیث کا سنہری دور کہلاتا ہے جس میں احادیث کی کتابی صورت میں تدوین کی تکمیل ہوتی۔ اہل سنت والجماعت کی چھ معتبر کتب حدیث اسی دور میں مرتب ہوئیں، جن کا ذکر آگے آئے گا۔

صحاح ستہ

الجامع الصحیح

اس کتاب کا اصل نام ہے۔ الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ وسننہ وایامہ. اس کے جامع محمد ابن اسمٰعیل بخاری ہیں۔ امام بخاری کی ولادت بخارا میں ۱۹۴ھ میں ہوئی۔ بچپن میں ہی والد کا انتقال ہو گیا اور ماں نے تربیت کی۔ دس سال کی عمر میں حدیث یاد کرنا شروع کی اور بچپن میں ہی عبداللہ بن مبارک کی تصانیف حفظ یاد کر لیں۔ بخارا میں محمد بن سلام سے، بلخ میں مکی بن ابراہیم سے، بغداد میں عفان سے، مکہ میں المقری سے، بصرہ میں ابو عاصم سے، کوفہ میں عبداللہ بن موسیٰ سے، شام میں ابی المغیرہ سے، عسقلان میں آدم سے، حمص میں ابوالیمان سے، دمشق میں ابو سہر سے حدیث کا علم حاصل کیا۔

حضرت امام بخاری کا حافظہ بلا کا تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ مجھ کو ستر ہزار سے زیادہ حدیثیں یاد ہیں۔ صحابہ اور تابعین جن کی میں نے حدیث قبول کی ہے ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے کہ مجھ کو ان کی تاریخ ولادت، جائے پیدائش، وفات اور وطن کا علم نہ ہو۔ اور جس کسی صحابی یا تابعی کی کوئی حدیث بیان کرتا ہوں میرے پاس اس کی اصل موجود ہوتی ہے۔ (تاریخ خطیب بغدادی ج ۲ ص ۲۸)

ستر ہزار سے زیادہ طلبہ نے صحیح بخاری آپ سے سنی۔ سولہ سال کے عرصہ میں اس کتاب کو تالیف کیا۔ کتاب میں ہر حدیث کو درج کرنے سے پہلے غسل کرتے، دو رکعت نماز پڑھتے، اس کتاب کے مسودہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر اور منبر کے درمیان بیٹھ کر صاف کیا۔

صحیح بخاری میں مکرر احادیث کی تعداد سات ہزار دو سو پچھتر ہے۔ اگر مکررات کو حذف کر دیا جائے تو تعداد چار ہزار رہ جاتی ہے۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ''کتاب اللہ کے بعد بخاری اور مسلم صحیح ترین کتب ہیں۔'' (فتاویٰ ابن تیمیہ مصر ج ۲ ص ۱۹۴)

شرائط بخاری

۱۔ راوی مسلم ہو، صادق ہو، مدلس نہ ہو، مختلط نہ ہو، صفت عدالت سے متصف ہو، ضابط ہو، سلیم الذہن ہو، قلیل الوہم ہو، صحیح الاعتقاد ہو۔

۲۔ امام بخاری نے دوسرے محدثین کی طرح کسی ایسے راوی کی حدیث قبول نہیں کی جس کی اپنے شیخ سے ملاقات ثابت نہ ہو۔ امام صاحب صرف ہم عمر ہونا ہی کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ دونوں کی ملاقات ضروری خیال کرتے تھے۔

صاحب کشف الظنون نے بخاری کی ۸۲ شرحوں کا ذکر کیا ہے۔ سب سے زیادہ مشہور ابن حجر کی

فتح الباری ہے۔

امام صاحب کی دیگر تصانیف تاریخ کبیر، تاریخ اوسط، تاریخ صغیر، کتاب الکنی، کتاب الادب المفرد، کتاب الضعفاء ہیں۔

آپ کی وفات ۲۵۶ء خرتنگ میں ہوئی۔

صحیح مسلم

صحیح مسلم حافظ مسلم بن الحجاج القشیری کی تصنیف ہے۔ آپ کی کنیت ابوالحسین ہے۔ امام صاحب کی پیدائش ۲۰۴ھ میں ہو۔ علم حدیث کی تحصیل کے لیے حجاز، عراق، شام، مصر، بغداد اور دوسرے بلاد اسلامیہ کا سفر اختیار کیا۔ یحییٰ بن یحییٰ نیشاپوری اور امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ جیسے جلیل القدر آئمہ حدیث سے استفادہ کیا۔

صحیح مسلم میں مکرر احادیث سمیت کل احادیث کی تعداد ۷۲۷۵ اور مکررات کے بغیر تقریباً چار ہزار ہیں۔

امام صاحب نے اپنی تالیف میں انہی احادیث کو درج کیا جس کے راوی امام مسلم سے لے کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ہر دور اور ہر طبقہ میں کم از کم دو اشخاص ہوں۔ اس کے علاوہ امام صاحب نے راوی کے لیے صرف عادل ہونا ہی ضروری قرار نہیں دیا، بلکہ شرط شہادت کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔

اسی وجہ سے حافظ ابوعلی نیشاپوری صحیح مسلم کے متعلق لکھتے ہیں: ماتحت ادیم السماء اصح من کتاب مسلم. یعنی روئے زمین پر مسلم سے بڑھ کر کوئی کتاب زیادہ صحیح نہیں۔

صحیح مسلم کی صحت اور مقبولیت پر ابوعلی زاغونی کا ایک کشف بھی ہے۔ ابوعلی کو ایک شخص نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ کونسی چیز آپ کی نجات کا ذریعہ بنی ہے۔ زاغونی نے جواب دیا کہ مجھ کو ان اوراق کے ذریعہ نجات ملی ہے جو میرے ہاتھ میں ہیں۔ وہ اوراق صحیح مسلم کے تھے......

صحیح مسلم کی مشہور شرحیں اکمال المعلم قاضی عیاض، منہاج المحدثین فی شرح مسلم بن الحجاج امام نووی اور الدیباج علی صحیح مسلم بن الحجاج امام سیوطی کی ہیں۔

امام صاحب نے صحیح مسلم کے علاوہ کتاب العلل، کتاب اوہام المحدثین، کتاب من لیس لہ الاراد واحد، طبقات التابعین، کتاب المخضرمین، کتاب المسند الکبیر تصنیف کی ہیں۔

امام صاحب کی وفات ۲۶۱ھ میں نیشاپور میں ہوئی۔

سنن ابی داؤد

سنن ابی داؤد کے مولف ابوداؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی ہیں۔ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے۔ علم

حدیث کی تحصیل میں عراق، خراسان، شام، مصر، الجزیرہ، حجاز اور دوسرے اسلامی بلاد کا سفر اختیار کیا۔ امام بخاری اور امام مسلم کے شیوخ و اساتذہ مثلاً امام احمد بن حنبل، عثمان بن ابی شیبہ اور قطبہ بن سعید سے حدیث کی سماعت کی۔

حافظ موسیٰ بن ہارون محدث نے فرمایا: **خلق ابو داؤد في الدنيا للحديث وفي الآخرة للجنة** یعنی ابوداؤد دنیا میں حدیث کے لیے اور آخرت میں جنت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔

ابراہیم حربی نے سنن ابی داؤد کے متعلق فرمایا کہ ابوداؤد کے لیے علم حدیث اللہ تعالیٰ نے ایسا نرم کر دیا ہے جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے لوہا نرم ہوا تھا۔

امام صاحب نے امام احمد بن حنبل کی خدمت میں سنن پیش کی تو انھوں نے بہت پسند فرمایا۔

امام صاحب کو پانچ لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔ انہی میں سے انتخاب کر کے سنن کو مرتب کیا اور اس میں چار ہزار آٹھ سو حدیثیں درج کیں۔

سنن ابی داؤد کی مشہور شرحیں معالم السنن مصنفہ ابوسلیمان احمد بن ابراہیم الخطابی۔ (م ۳۸۸ھ) اور المنہل العذب المورود فی شرح سنن ابی داؤد مصنفہ شیخ محمود محمد الخطاب السبکی مصری (م ۱۳۵۲ھ) ہیں۔

امام صاحب کی وفات ۱۶ شوال ۲۷۵ھ میں ہوئی۔

جامع ترمذی

جامع ترمذی کے مولف حافظ ابوعیسیٰ محمد بن موسیٰ ہیں۔ ۲۰۹ھ میں ترمذ میں پیدا ہوئے۔ علم حدیث کی تحصیل کے لیے حجاز، خراسان، بصرہ، کوفہ، رے اور واسط کا سفر اختیار کیا۔ حضرت امام بخاری کے شاگرد ہیں۔ امام ابوداؤد سے بھی سماعت حدیث کی ہے۔ امام صاحب کا قوت حافظہ بلا کا تھا۔ چالیس چالیس حدیثیں ایک دفعہ سن کر یاد کر لیتے تھے۔ زہد و تقویٰ میں بے نظیر تھے۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے جامع ترمذی کو چار خصوصیات کی وجہ سے دوسری کتب پر فوقیت دی ہے۔

اوّل: اس کی ترتیب عمدہ ہے اور تکرار نہیں۔

دوم: اس میں فقہاء کا مسلک اور اس کے ساتھ ساتھ ہر ایک کا استدلال بھی بیان کیا گیا ہے۔

سوم: اس میں حدیث کے انواع مثلاً صحیح، حسن، ضعیف، غریب، معلل بعلل وغیرہ بیان کیے گئے ہیں۔

چہارم: اس میں راویوں کے نام، ان کے القاب اور کنیت کے علاوہ ان امور کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ جن کا علم الرجال سے تعلق ہے۔

امام صاحب کا بیان ہے کہ جب وہ اپنی جامع تالیف کرنے سے فارغ ہوئے تو پہلے علماء حجاز کے سامنے پیش کی گئی۔ انھوں نے بہت پسند کیا۔ پھر علماء عراق کے سامنے پیش کی گئی تو انھوں نے بہت تعریف کی۔ پھر علماء خراسان کے سامنے پیش کی گئی تو انھوں نے خوب مدح کی۔ اس کے بعد میں نے اس کی تشہیر کی۔

اس کی مشہور شرحیں، عارضۃ الاحوذی فی شرح الترمذی' مصنفہ حافظ قاضی ابوبکر بن العربی مغربی اندلسی اور المختذی جامع الترمذی مصنفہ علامہ جلال الدین سیوطی ہیں۔

امام ترمذی نے ۲۷۹ھ میں ترمذ کے مقام پر وفات پائی۔

سنن ابن ماجہ

سنن ابن ماجہ کے مولف حافظ ابوعبداللہ محمد بن یزید قزوینی ہیں۔ ابن ماجہ کے عرف سے مشہور ہیں۔ ماجہ کے بارہ میں علماء اور محققین کا اختلاف ہے۔ بعض اسے حضرت امام صاحب کا باپ قرار دیتے ہیں۔ بعض دادا اور بعض کے نزدیک ان کی والدہ کا نام ہے۔

حضرت امام صاحب ۲۰۹ھ میں بمقام قزوین پیدا ہوئے۔ اکیس سال کی عمر تک اپنے وطن میں ہی علم حاصل کرتے رہے۔ آپ نے مشہور اساتذہ ابوالحسن طنافسی، ابوبکر قزوینی، ہارون بن موسیٰ بن حیان تمیمی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ۲۳۰ھ کے قریب بلاد عربیہ کی طرف سفر اختیار کیا۔ امام صاحب نے علم حدیث کی تحصیل کے لیے بصرہ، کوفہ، بغداد، دمشق کا سفر اختیار کیا۔

سنن ابن ماجہ بعض علماء حدیث کے نزدیک دو حیثیتوں سے صحاح ستہ میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

۱۔ حسن ترتیب: اس کتاب میں تمام احادیث کو باب وار اور بلا تکرار درج کیا گیا ہے۔ یہ حسن ترتیب دوسری صحاح میں نہیں پائی جاتی۔

۲۔ حضرت امام صاحب نے اپنی سنن میں ایسی احادیث کو درج کیا ہے جو دوسری صحاح میں نہیں ملتیں۔

۳۔ بعض صحابہ ایسے بھی تھے جو ایسی روایات بیان کرتے تھے جو دوسروں کو معلوم نہ ہوتی تھیں۔ حضرت معاذ بن جبل کا یہی طریقہ تھا۔

سنن ابن ماجہ میں چار ہزار احادیث ہیں۔

سب سے پہلے ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسی نے ''اطراف الکتب الستہ'' میں ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شامل کیا ہے۔ سنن ابن ماجہ کی مشہور شروح ''ماتمس الیہ الحاجۃ علی سنن ابن ماجہ'' مولفہ ابن ملقن، ''مصباح الزجاجۃ علی سنن ابن ماجہ'' مصنفہ جلال الدین سیوطی اور ''انجاح الحاجۃ'' مصنفہ شیخ عبدالغنی بن سعید مجددی کی ہیں۔

حضرت امام صاحب نے ۲۲ رمضان ۲۷۳ھ میں وفات پائی۔

نسائی

صحیح نسائی کے مولف ابوعبدالرحمٰن بن شعیب ہیں۔ امام صاحب کی ولادت ۲۱۴ھ میں مقام نساء خراسان کے ایک مشہور شہر میں ہوئی۔ خراسان، حجاز، عراق، شام اور مصر میں طلب علم کے لیے سفر اختیار کیے۔ سب سے پہلے قتیبہ بن سعید کی خدمت میں حاضر ہوکر علم حدیث حاصل کیا۔

امام نسائی نے سنن کبیر کے نام سے احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا، تو امیر وقت نے ان سے دریافت کیا، کیا اس مجموعہ میں تمام احادیث صحیح ہیں؟ آپ نے جواب دیا، نہیں اس میں صحیح اور حسن دونوں درج ہیں۔ اس امیر نے کہا، ان تمام احادیث میں سے جن کی صحت اعلیٰ درجہ پر ہے میرے لیے وہ احادیث منتخب کر دیجئے۔ تب حضرت امام صاحب نے صحیح احادیث کو الگ کر کے سنن مجتبیٰ مرتب کی۔ اس کا دوسرا نام سنن صغیر بھی ہے۔ بخاری اور مسلم کے بعد نسائی میں سب سے کم ضعیف حدیثیں پائی جاتی ہیں۔

نسائی کی مشہور شروح ''شرح ابن ملقن'' اور ''زہر الربی'' مصنفہ علامہ جلال الدین سیوطی کی ہیں۔

امام صاحب ۳۰۳ھ میں فوت ہوئے۔

مقام حدیث

اسلامی شریعت کے دو بڑے ماخذ ہیں۔ قرآن اور حدیث۔ قرآن مجید دو قسم کی آیات پر مشتمل ہے۔ محکمات اور متشابہات۔ محکمات آیات سے مراد وہ آیات ہیں۔ جن کی تشریح و توضیح کی ضرورت نہیں، اور متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن کی تشریح کی ضرورت ہے۔ حدیث انہی متشابہات آیات کی تفسیر ہے۔ نماز کی ہیئت، اس کی رکعات اور اس کے اوقات وغیرہ۔ اسی طرح زکوٰۃ کے نصاب وغیرہ جاننے کے لیے حدیث ضروری ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْهِمْ (النحل ۱۶:۴۴) اور ہم نے تیری طرف قرآن نازل کیا ہے تاکہ تو اس کی تعلیم کی تشریح کر دے جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود فرماتے ہیں: اِنِّی اوتِیتُ الْکِتَابَ ومثله. یعنی مجھے کتاب اور اس کی مثل بھی دی گئی ہے۔ کتاب سے مراد وحی متلو یعنی قرآن مجید ہے اور مثل سے مراد وحی غیر متلو یعنی حدیث۔

حدیث بخاری میں روایت ہے: اِنِّی ترکتُ فِیکُمْ اَمْرَیْنِ اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوا کِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّتِی. یعنی میں نے تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک تم انھیں پکڑے رکھو گے گمراہ نہیں ہو گے، وہ اللہ کی کتاب اور میری سنت ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر ۵۹:۷) یعنی جو کچھ تمھیں ۔ ے اس کو لے لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ۔

دوسری جگہ آتا ہے: لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِی رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۳۳:۲۱) یعنی تمھارے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں عمدہ نمونہ ہے۔ یعنی رسول کے نقش قدم پر چلو۔

ایک غلطی کا ازالہ

بعض نادان مسلمان حدیث کو قرآن مجید پر مقدم کرتے ہیں۔ یہ غلط بات ہے۔ قرآن شریف

مقدم اور قاضی ہے، اور حدیث قرآن کی تشریح و تفسیر۔ قرآن مجید ایک یقینی مرتبہ رکھتا ہے۔ اور حدیث کا مرتبہ ظنی ہے۔ حدیث وہی قابل قبول اور عمل ہوگی۔ جو قرآن کے مطابق ہو، جو قرآن کے مخالف حدیث ہوگی وہ مردود قول ہے۔

فقہ اور اس کے ماخذ

فقہ کے لغوی معنی شق اور فتح کے ہیں۔ جیسا کہ علامہ زمخشری لکھتے ہیں: الفقه حقيقة الشق والفتح. یعنی فقہ کی حقیقت تحقیق کرنا اور مشکل مسائل کی گرہ کو کھولنا ہے۔

علم فقہ کی تعریف

فقہ سے مراد وہ ضمنی قواعد ہیں جو ایک مجتہد قوم کی طبعی خصوصیات کے مطابق قرآن مجید اور سنت کی روشنی میں مرتب کرتا ہے۔

فقہ کی بنیاد

قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ. (التوبة ۹:۱۲۲) اور مومنوں کو یہ مناسب نہیں ہے کہ سب کے سب نکل پڑیں تو کیوں نہ ان کی ہر ایک جماعت میں سے ایک گروہ نکلے تا کہ وہ دین میں سمجھ حاصل کریں اور اپنی قوم کو ڈرائیں جب وہ ان کی طرف واپس جائیں تا کہ وہ بھی بچیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: من يرد الله خيراً يفقهه في الدين. (بخاری و مسلم) جس کے ساتھ اللہ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین میں بصیرت عطا کرتا ہے۔

ترمذی، ابوداؤد نے روایت کی ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو گورنر بنا کر بھیجا تو ان سے پوچھا کہ اگر تمھارے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہو تو کیسے فیصلہ کرو گے؟ انھوں نے جواب دیا کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ پوچھا اگر کتاب اللہ میں اس کا ذکر نہ ہو تو؟ حضرت معاذ نے جواب دیا۔ پھر میں سنت رسول کی روشنی میں فیصلہ کروں گا۔ پوچھا اگر سنت میں نہ پاؤ تو؟ انھوں نے جواب دیا تو فاجتهد رای ولا الوجهداً. اگر کتاب اور سنت میں مقدمہ کا فیصلہ نہ ہوا تو میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے ان کا سینہ ٹھونکا اور فرمایا: تعریف ہے اس خدا کے لیے جس نے اللہ کے رسول کے فرستادہ کی رائے کو اللہ کے رسول کی مرضی کے موافق کر دیا۔

قرآن کی آیت اور یہ حدیث ظاہر کرتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک

ہی میں ضمنی قواعد قرآن اور سنت کی روشنی میں مرتب کرنے کا رواج ہو گیا تھا۔

فقہ کے ماخذ

فقہ کے دو بنیادی ماخذوں (قرآن، سنت رسول اللہ) کا ذکر ہو چکا ہے۔ بقیہ تین مصادر کا ذکر حسب ذیل ہے:

فقہ اسلامی کا تیسرا ماخذ اجتہاد ہے۔ یہ لفظ جہد سے مشتق ہے، جس کے معنی انتہائی کوشش کے ہیں۔ لیکن شرعی اصطلاح میں اجتہاد اس انتہائی کوشش کا نام ہے جو ایک مقنن کتاب اور سنت کی روشنی میں شرعی حکم معلوم کرنے کے لیے کرتا ہے۔

اجتہاد کی بنیاد قرآن مجید اور حدیث ہے۔ قرآن مجید نے بار بار مذہبی اور دنیاوی امور میں عقل اور تدبر سے کام لینے کی ترغیب دی ہے۔ یہ الفاظ بار بار دہراتے ہیں: افلا تعقلون، افلا یتدبرون افلا تشعرون.

حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی حاکم فیصلہ دینے میں صحیح اجتہاد کرے تو اس کے لیے دو اجر ہیں۔ اگر اس نے اجتہاد میں خطا کی تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ والی یمن کی مشہور حدیث گزر چکی ہے، جس میں حضرت معاذ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے استفسار پر یہ جواب دیا کہ اگر قرآن اور سنت میں کسی مقدمہ کا حل نہ ہوا تو میں اجتہاد سے کام لوں گا۔

علامہ سیوطی نے اپنی تصنیف تاریخ الخلفاء (صفحہ ۴۰) میں لکھا ہے کہ جب کوئی مسئلہ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے پیش ہوتا تو پہلے قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے۔ اگر وہاں مسئلہ کا حل نہ ملتا تو سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کرتے اگر وہاں سے نہ ملتا تو صحابہ کو جمع کرتے۔ اگر کسی کو سنت رسول کا علم ہوتا تو وہ بتا دیتا۔ آپ خدا کا شکر بجا لاتے۔ اگر صحابہ میں سے کسی کو بھی سنت کا علم نہ ہوتا تو پھر صاحب الرائے اور عالم دین کا انتخاب کرتے اور ان سے رائے لیتے، اور کثرت رائے پر فیصلہ صادر فرما دیتے۔

مجتہد کے اوصاف

۱۔ قرآن اور حدیث پر گہری نظر رکھتا ہو۔

۲۔ پیش آمدہ حالات و مسائل کے مالہ اور ماعلیہ کو اچھی طرح جاننے والا ہو۔

۳۔ عربی زبان سے واقف ہو۔

۴۔ متقی ہو، تاکہ لوگ دین کے معاملہ میں اس پر اعتماد کر سکیں۔

۵۔ صحابہ، تابعین اور فقہاء سلف کے اقوال اور آراء کا علم رکھتا ہو۔

اجتہاد کی شرعی حیثیت

اجتہاد ایک عالم دین کی رائے ہے جو کتاب، سنت نظائر اور قیاسات پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کی حیثیت نص کی نہیں ہے۔ اس میں غلطی کا بھی امکان ہوتا ہے۔ کسی ایک عالم کی اجتہادی رائے کی بناء پر دوسروں کی تکفیر اور تفسیق کرنا درست نہیں۔ ائمہ اور فقہاء نے ان کی رائے سے اختلاف کرنے والوں کو کبھی بھی کافر اور فاسق قرار نہیں دیا۔

اجماع

اجماع جمع سے مشتق ہے، جس کے معنی اکٹھا کرنا یا اکٹھا ہونا ہے۔ لیکن اسلامی اصطلاح میں مجتہدین امت کا کسی مسئلہ پر اتفاق اور اتحاد کر لینے کا نام اجماع ہے۔

اجماع کے واجب ہونے کے دلائل

قرآن مجید میں آتا ہے: **يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ** (النساء۴:۵۹) اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اور اپنے میں سے صاحبان امر کی اطاعت کرو۔

دوسری جگہ آتا ہے: **مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا** (النساء۴:۱۱۵) اور جو شخص رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ اس کے لیے حق کھل چکا اور مومنوں کے رستے کے سوائے اور راستہ کی پیروی کرے ہم اسے پھیر دیں گے جدھر وہ پھرتا ہے اور اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔

مشہور حدیث ہے: **لا تجتمع امتی علی الخطاء او علی الضلالة** یعنی میری امت غلط بات پر یا گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔

ابن مسعودؓ کا قول ہے: **ماراہ المسلمون حسنا هو عند الله حسن.** جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔

اجماع کی وسعت

اجماع کے دائرہ وسعت کے متعلق اختلاف ہے۔ حضرت امام مالکؒ صرف اہل مدینہ کی رائے کو ہی حجت تسلیم کرتے تھے۔ حضرت امام حنبلؒ اور داؤد ظاہری صحابہ کے اجماع کو معتبر خیال کرتے تھے۔ جمہور علماء کا یہ مسلک ہے کہ اجماع کے لیے حد بندی درست نہیں ہے، بلکہ کسی زمانہ میں تمام مجتہدین کا کسی فیصلہ کے متعلق اتفاق کر لینا ہی اجماع ہے۔

اس بارہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا اجماع مجتہدین کی اکثریت سے وقوع میں آتا ہے یا کل مجتہدین کے اتفاق سے۔ فقہاء کی اکثریت یہ کہتی ہے کہ ایک زمانہ کے تمام مجتہدین کا ایک رائے پر اتفاق کر لینا ہی اجماع ہے۔ مگر بعض جید فقہاء یہ کہتے ہیں کہ اکثریت کی رائے سے بھی اجماع واقع ہو جاتا ہے، جیسا کہ حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں: انه ينعقد مع مخالفة الاقل. یعنی اجماع اقلیت کے اختلاف کے باوجود بھی واقع ہو جاتا ہے۔

اجماع کی شرعی حیثیت کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ علماء کا ایک طبقہ اجماع کو شرعی حجت قرار دیتا ہے اور اس سے اختلاف کرنا معصیت۔ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ اجماع سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ علماء کی دوسری جماعت پہلے فیصلہ کے خلاف فیصلہ دے سکتی ہے۔ ان کے نقلی اور عقلی دلائل یہ ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیانت دارانہ اختلاف رائے کو امت کے لیے باعث رحمت قرار دیا ہے۔

عقلی دلیل یہ ہے کہ اجماع کا فیصلہ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ حالات اور تقاضوں کے بدلنے کے ساتھ اجماع کے فیصلوں میں تبدیلی لازمی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو اسلامی شریعت انسانوں کے لیے زحمت بن جائے گی۔

صحابہ کرام کا اجماع مستثنیٰ ہے، جو بعد کے کسی اجماع سے منسوخ نہیں ہو سکتا۔

معروف

اسلامی قانون کا چوتھا ماخذ معروف ہے۔ معروف سے مراد رواج اور دستور ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (بقرہ ۲۳۳:۲) اور بچہ کے باپ پر دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری دستور کے مطابق ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ (نساء ۶:۴) اور جو غریب ہو تو دستور کے مطابق اپنا خرچ لے لے۔

معروف (دستور) کو شرعی حجت ہونے کے لیے دو شرائط کا حامل ہونا ضروری ہے۔

۱۔ اس معروف (دستور) کو عقل سلیم قبول کرتی ہو اور وہ اچھے لوگوں میں رائج ہو۔

۲۔ وہ معروف (دستور) عدل وانصاف پر مبنی ہو۔

قیاس

قیاس کے لغوی معنی ناپنا یا کسی چیز سے مقابلہ کر کے موازنہ کرنا ہے۔ فقہ کی اصطلاح میں دو مسئلوں میں اتحاد علت کی وجہ سے ایک کا حکم دوسرے پر لگا دینے کا نام ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں شراب حرام ہے۔ حرمت کی وجہ نشہ ہے، اب جو بھی نشہ آور اشیاء ہوں کی ان سب پر شراب کا حکم لگا کر حرام قرار دے دیا جائے گا۔

قیاس کے جواز کے بارہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (سورہ عنکبوت ۲۹:۴۳) اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور انھیں سوائے علم والوں کے اور کوئی نہیں سمجھتا۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھا: اعرف الامثال والاشباه وقس الامور عندك. یعنی امثال اور نظائر کو پہنچا تو اور سمجھو پھر مسائل کو ان پر قیاس کرو۔

شرائط قیاس

۱۔ جس نص سے قیاس کیا جاتا ہو۔ اس کا حکم خاص واقعات اور حالات پر مبنی نہیں ہونا چاہیے۔ مثلاً حدیث میں آتا ہے: ''خزیمہؓ جس کے حق میں گواہی دے دیں وہ اس کے لیے کافی ہے۔'' اس سے یہ قانون نہیں بنایا جا سکتا کہ دعویٰ کے ثبوت کے لیے صرف ایک ہی شہادت کافی ہے۔ یہ حکم صرف خزیمہؓ کی ذات کے لیے ہے۔

۲۔ علت ایسا وصف ہو جو شرعاً قابل اعتبار ہو اور بالکل صریح واقع ہو۔

۳۔ اصل اور فرع میں ایک ہی وصف موجود ہو۔

۴۔ جو حکم قیاس سے استنباط کیا جائے۔ اس کی وجہ سے نص کے حکم میں تبدیلی نہ واقع ہونی چاہیے۔

۵۔ جو حکم قیاس سے استخراج کیا جائے اس کی نوعیت نص کے احکام کے ماحصل کی ہونی چاہیے۔ کسی نص کے محض الفاظ پر قیاس کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔

مصلحت

مصلحت سے مراد زمانہ کے حالات اور تقاضوں کی وجہ سے اجتماعی مفاد کے لیے قانون سازی کرنا ہے۔

اسلام نے اجازت دی ہے کہ جس امر میں اسلام نے نہ تو نفی کا حکم دیا ہو اور نہ اثبات کا، بلکہ انتم اعلم بامور دنیا کم فرما کر ہمیں آزاد چھوڑ دیا ہو، اس بارہ میں مسلمانوں کی بھلائی دیکھ کر قانون کا استخراج کر لیا جائے۔ لیکن یہ شرط ضروری ہے کہ وہ قانون اسلام کی روح کے منافی نہ ہو۔

اسی اصول کو مالکی استصلاح اور حنفی استحسان قرار دیتے ہیں۔

فقہ اسلامی کا تدریجی ارتقاء

اسلامی قانون سازی مختلف ادوار میں سے گزری ہے۔ ہر دور میں نئے نئے ملکی، سیاسی اور دینی مسائل ابھرے۔ مجتہدین نے ان مسائل کو قرآن و حدیث کی روشنی میں حل کیا۔ فقہ اسلامی کی تدوین اور ارتقاء کے حسب ذیل ادوار تھے:

پہلا دور، عہد نبوت

یہ دور ابتداء رسالت یعنی ۶۱۰ء سے لے کر وفات یعنی ۶۳۲ء تک ممتد ہے۔ اس دور میں قانون سازی کا ماخذ صرف قرآن مجید ہی تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام مسائل کو قرآن مجید کی روشنی میں حل کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام ارشادات اور اقوال وحی خفی کے حکم میں ہیں۔ صحابہ کرام بلا چون و چرا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات اور اعمال کی پیروی کرتے تھے۔ کسی صحابی کو کوئی مسئلہ پیش آتا تو وہ آپ کی خدمت اقدس میں کرتا۔ صحابہ کرام خود شاذ ہی اجتہاد سے کام لیتے۔

دوسرا دور، عہد صحابہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد قانون سازی، فتاویٰ اور اجتہاد کا کام ان صحابہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشکوٰۃ نبوت سے فیض پا کر اپنے تبحر علمی کی وجہ سے مشہور تھے۔

خلفاء راشدین کا مسائل کے حل کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی مسئلہ پیش آتا تو پہلے اس کو حل کرنے کے لیے قرآن کی طرف رجوع کرتے، اگر وہاں سے واضح حکم نہ ملتا تو سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کرتے، اگر وہاں بھی حکم نہ ملتا تو خلفاء راشدین صاحب علم اور صاحب رائے حضرات کو اکٹھا کرتے اور ان کے سامنے مسئلہ پیش کرتے تو وہ اسلام کی روح کے مطابق اس مسئلہ کا حل ڈھونڈتے۔ وہ مجتہدین صحابہ جن کے فتاویٰ محفوظ ہیں ایک سو انچاس ہیں۔

اس دور کے مشہور فقہاء اور مجتہدین خلفاء راشدینؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ ہیں۔

اس دور میں قانون سازی کے ماخذ قرآن مجید، سنت اور اجتہاد تھے۔

تیسرا دور، عہد تابعین

یہ دور دوسری صدی ہجری کے وسط تک جاتا ہے۔ خلافت راشدہ اور اس کے بعد اسلامی فتوحات کی کثرت ہوگئی۔ بڑی بڑی حکومتیں مسلمان فاتحین کے سامنے گرتی چلی گئیں۔ اسلامی حکومت کی وسعت کی وجہ سے افتاء کے مختلف مراکز قائم ہو گئے ہیں۔ جن میں اہم سات مرکز ہیں: مدینہ، مکہ، کوفہ، بصرہ، شام، مصر۔

چوتھا دور، دورِ تدوین

یہ دور دوسری صدی کے ربع دوم سے شروع ہو کر تیسری صدی کے آخر تک ممتد ہے۔ یہ دور تدوین فقہ کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ جلیل القدر فقہاء اسی دور میں پیدا ہوئے اور امت نے ان فقہاء کی سیادت

کو تسلیم کیا اور ان کی مدون فقہ کی پیروی شروع کر دی۔ قاضی ان کی فقہ کے مطابق فیصلے کرنے لگے۔ ان فقہاء اور ان کے مسلک کا ذکر بعد میں آئے گا۔ اس دور کے مصادر اور منابع قرآن، سنت، اجماع، قیاس، استصلاح، استحسان، معروف اور استدلال تھے۔

پانچواں دور، دور تکمیل وتقلید

یہ دور چوتھی صدی سے شروع ہو کر ساتویں صدی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور میں تقلید شروع ہو گئی۔ فقہاء اور آئمہ کی فقہ پر بڑی بڑی کتب مدون ہونے لگیں۔ فقہی مسائل کی تخریج کی گئی۔ مختلف فقہی مسالک کے مقلد اکابر علماء پیدا ہوئے۔ جنھوں نے اپنے اپنے امام کے فقہ کی ترویج اور تقلید کی۔ مسائل کی تحقیق وتائید میں جدل کی خوب گرم بازاری رہی۔

چھٹا دور، دور تقلید محض

اس دور میں اجتہاد کا دروازہ بالکل مسدود کر دیا گیا۔ عوام اور خواص سب ائمہ فقہاء کے مقلد تھے۔ علم فقہ کی ترقی رک گئی۔ علماء کے اجتہادی قوتوں کے سوتے خشک ہو گئے۔ مفصل کی مختصرات اور مختصرات کی شروح لکھنا شروع کر دیں۔

فقہی مدرسہ ہائے فکر

فقہ حنفی

حنفی مسلک کوفہ میں پیدا ہوا۔ کوفہ ملک عراق میں فقہاء کا مرکز تھا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (م ۳۲ھ) کو معلم اور قاضی بنا کر کوفہ بھیجا تھا۔ تقریباً دس سال وہاں اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے اور مسند درس وتدریس پر بیٹھ کر حدیث اور فقہ کی تعلیم دی۔ حضرت علیؓ نے ۳۵ھ سے ۴۰ھ تک کوفہ کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور لوگوں نے آپ کے علم سے فیض پایا۔ ان دونوں بزرگوں کے بے شمار شاگرد پیدا ہوئے جنھوں نے حدیث اور فقہ کی اشاعت کی۔

مذہب حنفی کے بانی حضرت امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت ہیں۔ حضرت امام صاحب ولادت (۸۰ھ) (۶۹۹ء) میں اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہد ہوئی۔ امام صاحب تقریباً بارہ یا تیرہ سال کے تھے۔ جب حضرت انس خادم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، مگر ان سے حدیث نہیں سنی۔ سترہ سال کی عمر میں حصول علم کی طرف راغب ہوئے پہلے علم کلام کی طرف مائل ہوئے، پھر قومی ضرورتوں اور نئے اُبھرتے ہوئے مسائل کی وجہ سے علم فقہ کی طرف توجہ کی۔ حضرت امام صاحب غالباً (۱۰۰ھ) میں امام حماد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور علوم فقہ پڑھنا شروع کیے۔ کم وبیش بیس سال تک اپنے

استاد کے چشمہ علم سے سیراب ہوتے رہے۔

امام صاحب نے فقہ کی مجتہدانہ تحقیق کے لیے علم حدیث کی طرف توجہ کی۔ ابوالمحاسن نے امام ابو حنیفہ کے ترانوے مشاہیر مشائخ حدیث کے نام بیان کیے ہیں۔

امام صاحب نے علم حدیث کی تحصیل کے ساتھ دوسرے علوم بھی پڑھے۔ آپ خود فرماتے ہیں۔

''میں نے جب علم (حدیث) حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو تمام (بقیہ) علوم کو پڑھنے کا نصب العین قرار دیا اور ہر فن کو پڑھا۔''

امام حماد نے (۱۲۰ھ) میں وفات پائی اور حضرت امام صاحب اپنے استاد کی مسند درس وتدریس و افتاء پر متمکن ہوئے۔

حضرت امام صاحب نے فقہ کے اصول اور ضوابط معین کیے۔ مسائل حل کرتے وقت عقل رائے، قیاس اور استحسان سے کام لیتے۔ اس وجہ سے آپ کے مسلک کا نام اہل الرائے مشہور ہو گیا۔

جعفر بن ربیع فرماتے ہیں۔

''میں امام ابوحنیفہ کے یہاں پانچ سال تک رہا۔ میں نے ان سے زیادہ خاموش آدمی نہیں دیکھا۔ لیکن جب ان سے فقہ کے متعلق سوال کیا جاتا تو نالے کی طرح بہنے لگتے۔ غلغلہ انگیز گفتگو کرتے۔ وہ قیاس ورائے کے امام تھے۔''

حضرت امام شافعی فرماتے ہیں:

''لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہ کے محتاج ہیں۔''

مشہور محدث حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں۔

''میں نے ابوحنیفہ سے زیادہ پرہیز گار آدمی نہیں دیکھا۔ اس شخص کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ جس کے سامنے دنیا اور اس کی دولت پیش کی گئی اور اس نے ٹھکرا دیا۔ کوڑوں سے پیٹا گیا۔ لیکن ان کے پاؤں میں ذرہ بھر بھی لغزش نہ آئی۔ وہ مناصب جلیلہ جن کے پیچھے لوگ دوڑتے پھرتے ہیں کبھی قبول نہ کیے۔''[1]

امام صاحب نے ۱۵۰ھ (۷۶۷ء) میں وفات پائی۔

حنفی مذہب خلفاء عباسیہ کا سرکاری مذہب رہا ہے۔ اس طرح سلطنت عثمانیہ اور مصر، شام، لبنان میں حنفی مسلک چلا آ رہا ہے۔ حکومت تیونس، اہل افغانستان، ترکستان، ہندو پاک اور چین کا یہی مذہب غالب ہے۔

ملا علی قاری (۱۰۱۴ھ) لکھتے ہیں۔

''حنفیہ کل مسلمانوں کے دو تہائی ہیں۔''[2]

---

[1] الذہبی مناقب الامام ابی حنیفہ وصاحبیہ ص ۱۱۵۔ [2] مرقات ص ۳۴ ج ۲۔

فقہ حنفی کی مقبولیت کی وجوہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ اس کے مسائل و حکم مصالح پر مبنی اور رعایت روایت کے ساتھ اصول درایت کے عین مطابق ہیں۔

۲۔ فقہ حنفی آسان اور یسیر العمل ہے۔

۳۔ فقہ حنفی میں معاملات کے حصہ میں وسعت اور استحکام، جو تہذیب و تمدن کے لیے بہت ضروری ہے، دوسری تمام فقہوں سے زیادہ ہے۔

۴۔ فقہ حنفی نے غیر مسلم رعایا کو فیاضی سے حقوق بخشے۔ جس سے نظم مملکت میں بڑی آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

۵۔ احکام منصوصہ میں امام ابوحنیفہ کا پہلو مدلل ہوتا ہے۔

ان خصوصیات کی تفصیل سیرۃ النعمان حصہ دوم مصنفہ مولانا شبلی نعمانی میں ملاحظہ فرمائیے۔

مشہور کتب

جامع صغیر، جامع کبیر، مبسوط، زیادات، السیر الصغیر، السیر الکبیر، امالی محمد کتاب الخراج۔

مذہب مالکی

مذہب مالکی کا مولد مدینہ ہے۔ یہ شہر عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت عثمانؓ کی شہادت تک بلاد اسلامیہ کا علمی گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کے مشہور مربی خلفاء راشدین، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ تھے۔ انہی بزرگوں کے جاری کردہ چشمہ علم سے حضرت امام مالکؒ نے تشنگی علم بجھائی۔

حضرت امام مالکؒ ۹۵ھ (۷۱۳ء) میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام حضرت انس بن مالکؒ ہے اور سلسلہ نسب یمنی قبیلہ ذی اصبح تک پہنچتا ہے۔

امام صاحب نے عبدالرحمٰن بن ہرمز، امام زہری، ابن ذکوان، امام جعفر صادق، محمد بن منکدر، یحییٰ بن سعید انصاری، ابو حازم، عبداللہ بن دینار، ربیعہ بن عبدالرحمٰن، محمد بن یحییٰ سے علم حاصل کیا۔

امام مالکؒ کو جب ان کے شیوخ نے روایت حدیث اور افتاء کی اجازت دے دی تب مسند روایت و افتاء پر بیٹھے۔ مسجد نبوی میں درس و تدریس اور افتاء کا سلسلہ قائم کیا۔ لوگ سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے ان کے پاس آئے اور ان سے حدیث اور فقہ پڑھ کر جاتے۔ تقریباً پچاس سال تک امام صاحب مسند افتاء پر متمکن رہے۔

امام صاحب اپنے فتاویٰ کی بنیاد قرآن مجید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان حدیثوں پر جو ان کے نزدیک صحیح تھیں رکھتے۔ اہل مدینہ کے تعامل کو نہایت اہمیت دیتے تھے اس کے بعد یہ قیاس، مصالح

مرسلہ (استصلاح) پر عمل کرتے۔ فتویٰ دیتے وقت بہت ہی احتیاط وعزم سے کام لیتے، ذرا بھی شک پڑ جاتا تو فرما دیتے: ''لا ادری'' میں نہیں جانتا۔

امام صاحب نے ۱۱ ربیع الاول ۱۷۹ھ (۷۹۵ء) میں وفات پائی۔

امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ ''امام زہری کے شاگردوں میں سب سے زیادہ ثقہ اور قابل اعتماد امام مالک ہیں۔''

حضرت امام شافعی فرماتے ہیں:

''تابعین کے بعد امام مالکؒ بندوں کے لیے اللہ کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ امام مالکؒ میرے استاد ہیں۔ جب کوئی حدیث مالک کی روایت سے تم کو پہنچے تو اسے مضبوطی سے پکڑو، کیونکہ وہ علم حدیث کا ایک درخشاں ستارہ ہے۔'' (الانتقاد لابن البرص ۴۹)

حضرت امام مالکؒ نے کتاب موطا تصنیف کی ہے۔ حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ''کتاب اللہ کے بعد امام مالکؒ کی کتاب سے زیادہ صحیح کوئی دوسری کتاب روئے زمین پر موجود نہیں۔'' (تنویر الحوالک ص ۶)

مالکی مذہب حجاز، مغرب اقصیٰ، اندلس، الجزائر، تیونس، طرابلس، بالائی مصر، سوڈان، بحرین اور کویت میں پھیلا ہے۔

مشہور کتب

سب سے پہلے مسائل مالک اسد بن فرات نے مدون کیے۔ ان سے سحنون نے حاصل کیے اور اسد یہ نام رکھا۔ ۱۸۸ھ میں سحنون اس کو لے کر ابن قاسم کے پاس پہنچے۔ ابن قاسم نے چند مسائل کی اصلاح کی۔ سحنون نے مدونہ ابن فرات کو از سر نو ترتیب دیا اور بعض مسائل پر آثار کا اضافہ کیا۔ مدونہ سحنون کے مسائل کی تعداد ۳۶ ہزار ہے۔ مالکیہ کے نزدیک یہ مدونہ اساس فقہ مالکی ہے۔

مدونہ کے علاوہ مشہور کتب حسب ذیل ہیں:

مختصر کبیر، مختصر اوسط، مختصر صغیر، کتاب المبسوط علی مذہب المالکیہ۔

مذہب شافعی

شافعی مذہب کے بانی امام محمد بن ادریس شافعی ۱۵۰ھ (۷۶۷ء) میں صوبہ عسقلان میں بمقام غزہ پیدا ہوئے۔ دو برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ماں کی آغوش محبت میں پرورش پائی۔ دس برس کی عمر میں قرآن مجید اور موطا حفظ کر لیا۔ پھر مکہ آئے تو مسلم بن خالد زنجی امام مکہ سے تحصیل فقہ کیا۔ تیرہ سال کی عمر میں حضرت امام مالکؒ کے درس میں شامل ہوئے۔ ان کو موطا سنائی اور فقہ پڑھی۔ پھر یمن تشریف لے گئے۔ وہاں کے علماء اور فقہاء سے علم حاصل کیا۔ یمن سے عراق پہنچے۔ امام محمد بن حسن شاگرد حضرت امام

اعظم سے فقہ حنفی استفادہ کرنے لگے۔ اس طرح امام شافعیؒ طریقہ اہل حجاز بواسطہ امام مالک، طریقہ اہل عراق بواسطہ امام محمد اور طریقہ علماء حدیث کے جامع ہو گئے۔ ان مختلف مدرسہ ہائے فکر سے ملا جلا ایک مسلک مدون کیا، اس پر کتب لکھیں۔

حضرت امام شافعیؒ نے کتاب، سنت، اجماع اور قیاس چاروں مصادر سے فقہی مسائل کو حل کیا اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کے استحسان اور حضرت امام مالکؒ کے مصالح مرسلہ کی شدت سے مخالفت کی ہے، البتہ وہ استدلال پر عمل کرتے ہیں۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص علم دین کے متعلق قلم اٹھاتا ہے اس کی گردن امام شافعیؒ کے احسان کے نیچے ہے۔"

حضرت امام صاحب نے ۲۰۴ھ (۸۱۹ء) میں مصر میں وفات پائی۔

یہ مذہب سب سے پہلے مصر میں پھیلا، پھر عراق میں، پھر بغداد اور خراسان میں اس مذہب کے مقلدین شام، لبنان، انڈونیشیا، حجاز، ایران اور پاکستان میں پائے جاتے ہیں۔

کتب

ائمہ اربعہ میں سے حضرت امام شافعیؒ ہی ایسے امام ہیں جنھوں نے خود کتب تصنیف کیں، جن میں سے چند اہم کتب یہ ہیں۔

رسالہ فی ادلّہ الاحکام، کتاب الام، فقہ شافعی میں حرملہ بن یحییٰ کی کتاب، بویطی کی مختصر کبیر، مختصر صغیر، کتاب الفرائض، مزنی کی مختصر صغیر، جامع کبیر، جامع صغیر، ابوبکر محمد بن عبداللہ کی کتب کتاب البیان فی الدلائل، الاعلام فی اصول الاحکام، شرح رسالہ شافعی اور کتاب الفرائض مشہور ہیں۔

فقہ حنبلی

امام ابوعبداللہ احمد بن حنبل حنبلی مذہب کے بانی ہیں۔ ۱۶۴ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ دو برس کے تھے جب کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ماں نے پرورش کی۔ سب سے پہلے قرآن حفظ کیا۔ پھر لغت کا علم حاصل کیا۔ اس کے بعد کتابت کے فن کی طرف توجہ دی۔ پھر علم حدیث کی طرف توجہ کی۔ حضرت امام ابو یوسف کی مجلس میں جانا شروع کیا۔ اس کے بعد بغداد میں ہشیم بن بشیر بن ابی حازم کی خدمت میں چار سال تک رہے۔ پھر ہشیم کی وفات کے بعد ابی عینیہ سے حدیثیں سنیں۔ ۱۸۷ھ میں پہلی بار مکہ گئے۔ وہاں کے علماء سے حدیث سنی۔ ۱۹۶ھ میں دوبارہ مکہ پہنچے۔ تین برس وہاں رہے۔ پھر یمن گئے اور عبدالرزاق بن ہمام سے کسب علم کیا۔ اس طرح تمام علمی مراکز کے مشہور علماء سے علم حاصل کیا۔

ابوداؤد سجستانی فرماتے ہیں کہ میں نے دو سو مشائخ حدیث کو دیکھا ہے۔ ان سب میں امام احمد بن حنبل کی مانند کسی کو نہیں پایا۔

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ بغداد میں احمد بن حنبلؒ سے بڑھ کر تقویٰ اور فقہ میں اور کوئی نہیں۔

امام صاحب فقہی مسائل کا استنباط قرآن، حدیث، اقوال و افتاء صحابہ کرام اور قیاس سے کرتے تھے۔

امام صاحب کی فکر پر حدیث کا رنگ غالب تھا۔ اس وجہ سے بعض علماء نے آپ کو زمرہ محدثین میں شامل کیا ہے۔

آپ کی مشہور تصنیف المسند ہے۔ اس میں چالیس ہزار سے زائد احادیث ہیں۔ آپ نے ۱۶ سال کی محنت شاقہ کے بعد المسند تیار کی تھی۔ ترتیب و تہذیب سے قبل ہی ۲۴۱ھ میں وفات پا گئے۔ بعد میں آپ کے لڑکے عبداللہ نے صحابہ کے نام پر کتاب کو مرتب کیا۔ یعنی ہر صحابی کے نام کے تحت اس کی روایت کردہ حدیثیں بیان کر دیں۔ مرسل احادیث کو تابعین کی ترتیب پر جمع کر دیا۔

امام صاحب کا مسلک بہت سادہ اور آسان ہے۔ اس پر حدیث کا رنگ غالب ہے۔ درایت اور عقل و جدل سے بہت کم کام لیا گیا ہے۔ قیاس سے وہ بوقت ضرورت اور بدرجہ مجبوری کام لیتے ہیں۔

فقہ حنبلی کی کتب

اثرم نے کتاب السنن لکھی ہے جس میں مسائل میں شواہد حدیث کا التزام ہے۔

ابن راہویہ نے بھی فقہ میں کتاب السنن تالیف کی ہے۔

مذاہب شیعہ

اہل تشیع کے تین فقہی مدرسہ ہائے فکر مشہور ہیں:

ا۔ شیعہ امامیہ

یہ فرقہ بارہ اماموں کا قائل ہے، جس کی وجہ سے اثناء عشریہ کہلاتا ہے۔ اثناء عشری فرقہ کے سب زیادہ مشہور مجتہد اور فقیہ حضرت امام جعفر صادقؒ ہیں۔ ان کی فقہ ان کی طرف منسوب ہے۔ زرارہ بن اعین (م ۱۵۱ھ) ابوالنصر محمد بن مسعود، ابوعلی محمد بن الجنید نے نئی فقہ حضرت امام جعفرؒ کی طرف منسوب کی ہے اور اسے شائع کیا ہے۔

فرقہ اثناء عشریہ کے فقہ کے چار اصول ہیں، قرآن، سنت، اجماع اور عقل۔

ان کے نزدیک حدیثیں وہی معتبر اور ثقہ ہیں جو اہل بیت اور ان کے خاص متبعین سے مروی ہوں۔ وہ اقوال اہل بیت کو قرآن مجید کی طرح حجت شرعی تسلیم کرتے ہیں۔

اس فرقہ کے نزدیک کسی جماعت کا کسی مسئلہ پر اتفاق کر لینے کا نام اجماع ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ اتفاق امام معصوم کی رائے سے ہم آہنگ ہو۔ اگر غیر امامیہ کسی مسئلہ پر اتفاق کر جائیں تو ان کے

نزدیک یہ اجماع نہیں ہے۔ حضرت امام جعفر کا یہ مسلک ہے کہ جو مسئلہ قرآن، سنت اور اجماع سے حل نہ ہو تو عقل سے کام لے کر اس مسئلہ کو حل کر لینا چاہیے۔

اس فرقہ کی مشہور کتب حسب ذیل ہیں۔

۱۔ کتاب شرائع الاسلام مصنفہ جعفر بن حسن علی عرف محقق۔

۲۔ اور اس کی شرح جواہر الکلام مصنفہ محمد حسن نجفی۔

۳۔ تذکرہ الفقہاء مصنفہ محسن بن یوسف علی۔

۴۔ کتاب مفتاح الکرامہ شرح قواعد العلامہ تصنیف محمد ہواد بن محمد حسینی عاملی۔

۵۔ کتاب وسائل الشیعہ الی سائل الشریعہ تصنیف محمد بن حسن بن علی۔

فرقہ اثناء عشریہ کے پیروکار ایران، ہندوستان، پاکستان، لبنان اور شام میں پائے جاتے ہیں۔

۲۔ شیعہ زیدیہ

یہ مذہب امام زید بن علی بن حسین بن علیؓ کی طرف منسوب ہے، جو ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں علَم مخالفت بلند کرنے کی وجہ سے شہید کر دیے گئے۔

اس مذہب کے سب سے بڑے داعی اور مصنف حسن بن علی بن الحسن بن زید بن عمر بن علی بن الحسن بن علی ہوئے ہیں۔

مشہور کتب حسب ذیل ہیں۔

۱۔ الجموع: یہ کتاب ان احادیث اور فتاوی پر مشتمل ہے جو امام زید بن علی سے روایت کیے گئے ہیں۔

۲۔ الروض النفیر شرح مجموع الفقہ الکبیر مصنفہ شرف الدین حسن بن علی احمد۔ شیعہ زیدیہ کا مرکز یمن ہے۔

۳۔ شیعہ اسماعیلیہ

یہ فرقہ چوتھی صدی میں مصر میں ظاہر ہوا، اور امام جعفر صادق کے بیٹے امام اسماعیل کی طرف منسوب ہے۔ معزلدین اللہ فاطمی مصری حکمران نے اس کو مصر میں رائج کیا۔ چھٹی صدی میں یہ مذہب وہاں سے ختم ہو گیا۔

اس فرقہ کی دو شاخیں ہیں: ۱۔ اسماعیلیہ شرقیہ۔ ۲۔ اسماعیلیہ غربیہ۔

اسماعیلیہ شرقیہ کا مرکز ہندوستان ہے۔ اس کے معتقد ایران اور وسط ایشیا میں پائے جاتے ہیں۔

اسماعیلیہ غربیہ۔ جنوبی عرب کے علاقہ میں خلیج فارس کے اردگرد اور شام میں حماۃ اور لاذقیہ کے پہاڑی علاقوں میں آباد ہیں۔

اس فرقہ کی مشہور کتاب دعائم الاسلام تصنیف قاضی نعمان بن محمد تمیمی مغربی ہے۔

اسلامی تعلیمات

عقائد

اسلام کے تعلیم کے لحاظ سے دو بڑے حصے ہیں: ایک اعتقادی اور دوسرا عملی۔ اعتقادی حصہ کو اصول ایمان یا اجزائے ایمان کہا جاتا ہے۔ عملی حصے سے مراد وہ تعلیم ہے جس کے مطابق ایک مسلمان زندگی بسر کرے۔

اصول ایمان یا اجزائے ایمان چھ ہیں: اللہ پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، کتب سماوی پر ایمان، انبیاء علیہم السلام پر ایمان، بعث بعد الموت پر ایمان، تقدیر الٰہی پر ایمان۔

اللہ پر ایمان

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس کے اردگرد تمام اسلامی تعلیم گھومتی ہے۔ اور قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے پر بہت زور دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (نساء ۴: ۱۳۶) اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ پر ایمان لاؤ۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ (الحدید ۵۷: ۱۹) اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے یہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (الحدید ۵۷: ۸) اور تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لائے۔

دلائل ہستی باری تعالیٰ

قرآن مجید نے ہستی باری تعالیٰ پر بے شمار دلائل دیے ہیں، ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

کائنات کی گواہی

(الف) اللہ تعالیٰ کی ہستی پر کائنات کی تخلیق ایک بین دلیل ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات پر گہری نظر ڈالنے کی ترغیب دی ہے، کیونکہ اس نظام کائنات میں اللہ تعالیٰ کی ہستی کے دلائل و براہین پنہاں ہیں۔ دنیا و مافیہا کی تخلیق خود اس بات پر شاہد ہے کہ اس کائنات کا کوئی نہ کوئی خالق ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ

فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (البقرہ۲:۲۹) وہی ذات ہے جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے تمھارے فائدہ کے لیے پیدا کیا۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو ٹھیک سات آسمان بنائے اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (ابراہیم۱۴:۱۰) کیا خدا کی نسبت کوئی شک ہوسکتا ہے جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے۔

ہمارا مشاہدہ اور تجربہ بتا رہا ہے کہ کوئی مصنوع بغیر صانع کے نہیں۔ ڈاکٹر آئنسٹائن کہتا ہے:

''میرا مذہب کیا ہے؟ اس نہایت ہی اعلیٰ ہستی کے آگے عاجزانہ تعریف جس کے بے شمار کرشموں میں سے چند ایک ہم اپنے کمزور اور محدود حواس سے معلوم کر سکتے ہیں۔ جب میں عالم کائنات کے حیران کن نظاروں اور لاانتہا وسعت کو دیکھتا ہوں تو دل گواہی دیتا ہے کہ اس کا بانی خدا ہے۔''

(ب) تمام کائنات ایک ضابطہ اور قانون کے تحت چل رہی ہے، کہیں بھی کوئی رخنہ نہیں۔ کائنات کا یہ نظم اور اس کی ترتیب خود اس امر کی شاہد ہے کہ اس کے پیچھے ایک مدبر ہستی ہے۔ جو اس کائنات کو ایک نظام، ترتیب اور ضابطہ کے ساتھ چلا رہی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً (البقرہ۲:۲۲) وہی ذات ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو فرش بنایا اور آسمان کو عمارت...... عمارت کہنے سے مراد یہ ہے کہ سب کچھ ایک نظام کے ماتحت ہے۔ جیسے ایک عمارت میں ترتیب ہوتی ہے۔ اگر اینٹیں، چونا، لوہا اور دوسرا سامان عمارت بغیر ترتیب کے ادھر ادھر پڑا ہوا ہو اس کو عمارت نہیں کہہ سکتے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آسمان اور زمین کو بنانے والی ایک مدبر اور بالا رادہ ہستی ہے، اور اس وجہ سے اس کائنات میں ایک نظام اور ترتیب پائی جاتی ہے۔

دوسری جگہ اس مضمون کو اور واضح الفاظ میں بیان کیا ہے: اَلَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَاتَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (الملک ۶۷:۳،۴) جس نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر پیدا کیا ہے، تو رحمان کی پیدائش میں کوئی اختلاف نہیں پائے گا، پھر نظر کو لوٹا کیا کوئی خلل اور بگاڑ دیکھتا ہے، پھر نظر کو بار بار لوٹا۔ نظر تیری طرف حسرت، سے تھک کر واپس آ جائے گی۔

(ج) کائنات میں ہر چیز جوڑا تخلیق کی گئی ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا (الزخرف۴۳:۱۲) وہ جس نے سب چیزوں میں جوڑے پیدا کیے۔

سائنس کی تحقیق نے یہ امر ثابت کر دیا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کا جوڑا ہے۔ اگر ایک چیز اثر انداز ہوتی ہے تو دوسری اثر پذیر۔ کائنات کی اشیاء میں بعض میں قوت موثرہ رکھنا اور بعض میں قوت متاثرہ محض اتفاق نہیں بلکہ ایک منصوبہ اور منشاء کے مطابق ہے جو ایک مدبر حکیم اور علیم ہستی کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔

دوسری دلیل: فطرتِ انسانی کی گواہی

انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ کی ہستی کا شعور موجود ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا (الاعراف ۷:۱۷۲) اور جب تیرے رب نے بنی آدم یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی نسل نکالی اور ان کو اپنے وجود پر گواہ کے طور پر ٹھہرایا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، انھوں نے کہا ہم گواہ ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت ۲۹:۶۱) اور اگر تو ان سے پوچھے کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور سورج اور چاند کو کام میں لگایا ہے تو وہ ضرور ضرور کہیں گے اللہ نے۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ اللہ کی ہستی کا احساس انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ اقوام عالم اس امر پر متفق ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے۔ یہ اتفاق فطری شہادت ہے۔

انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ کی ہستی کے احساس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب کوئی انسان مصائب اور آلام کے گرداب میں پھنس جاتا ہے اور اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں پاتا، ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے تو اس کا احساس بیدار ہو جاتا ہے اور آستانہ الوہیت پر گر جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے اس گرداب سے نکلنے کے لیے دعا کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاِذَا اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰبِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ (حٰمٓ السجدہ ۴۱:۵۱) اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں تو وہ منہ پھیر لیتا ہے اور پہلو پھیر لیتا ہے اور جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو وہ لمبی چوڑی دعا میں لگ جاتا ہے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ سکھ آرام انسان کی فطرت پر غفلت وارد کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور جب مصیبت اس پر وارد ہوتی ہے تو اس کا فطری نور چمک اٹھتا ہے اور اپنے حقیقی مولا اور پروردگار کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مصائب میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ انسان کی فطرت میں عبادت اور اطاعت الٰہی کا جذبہ ودیعت شدہ ہے۔

تیسری دلیل: وحی الٰہی کی شہادت

اللہ تعالیٰ کے وجود پر سب سے روشن اور واضح دلیل وحی الٰہی ہے جس سے یقین کے افق سے شک وشبہ کے تمام بادل چھٹ جاتے ہیں اور حقیقت پردہ مکنون سے ظاہر ہو جاتی ہے۔

وحی ایک عالمگیر تجربہ ہے۔ تمام اقوام عالم کی طرف انبیاء علیہم السلام آئے جنھوں نے وحی کے ذریعہ خداوند کے وجود کا اقرار کیا ہے۔ پھر اس صداقت پر اس مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہوئے کہ مصائب اور

تکالیف کے سخت طوفان بھی ان کے پاؤں میں لغزش پیدا نہ کر سکے۔

وحی الٰہی میں تین ایسی خوبیاں ہوتی ہیں جو بین طور پر وجود باری تعالیٰ پر دلالت کرتی ہیں۔ ایک ظاہری خوبی، دوسری باطنی خوبی، تیسری پیشگوئیاں۔

وحی الٰہی کی ظاہری خوبی اس کی عبارت میں فصاحت و بلاغت، نزاکت، لطافت و ملائمت، شیرینی اور حسن ترتیب پائی جاتی ہے۔ اس کی مثل کوئی دوسرا آدمی بنانے کی قدرت نہیں رکھتا۔

باطنی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایسی روحانی تاثیر ہوتی ہے جو ہر سننے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ گناہوں کی آگ کو سرد کرتی ہے اور ساتھ ہی نیکی کے کرنے کی زبردست قوت پیدا کرتی ہے۔

تیسری خوبی کلام الٰہی کی یہ ہوتی ہے کہ اس میں دن سے زیادہ روشن پیش گوئیاں ہوتی ہیں۔

یہ تینوں خوبیاں قرآن مجید میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ وہ اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے یکتا ہے۔ روحانی تاثیرات کے لحاظ سے بے مثل اور اس میں لامحدود پیش گوئیاں موجود ہیں جو ہر دور میں پوری ہوتی رہیں گی۔

توحید باری تعالیٰ

قرآن مجید کی رو سے اللہ تعالیٰ کی توحید کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات صفات اور افعال میں بے مثل ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (النحل ۱۶:۶۰) اللہ کی صفت نہایت بلند ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (الاعراف ۷:۱۸۰) اور اللہ کے سب نام اچھے ہیں اور ان کے ساتھ اس کو پکارو۔

توحید کو نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ جامع اور مانع الفاظ میں سورۃ اخلاص میں بیان کر دیا گیا ہے: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ o اَللّٰهُ الصَّمَدُ o لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ o وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ o (الاخلاص ۱۱۲:۱۔۴) کہہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اس کا بیٹا ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔

قرآن مجید نے جہاں توحید الٰہی کے ہر گوشہ کی وضاحت کی، وہاں ہر قسم کے شرک کی بھی تردید کی ہے کیونکہ شرک تمام بدیوں کا سرچشمہ ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (۳۱:۱۳) یعنی شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران ۳:۶۴) کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

اس آیت میں تین قسم کے شرک کی نفی کی گئی ہے۔ اوّل، خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ دوم،

اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ سوم۔ کسی دوسرے آدمی کو رب تسلیم نہ کیا جائے۔

شرک کی چوتھی قسم سورۃ فرقان میں بیان ہوئی ہے۔ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ (الفرقان ۲۵:۴۳)

یعنی کیا تو نے اسے دیکھا جو اپنی خواہش کو معبود بناتا ہے۔

غرض کہ شرک کی ممانعت سے قرآن مجید بھرا پڑا ہے۔ کیونکہ شرک سے نہ صرف انسان کی روحانی موت ہوتی ہے بلکہ مادی ترقی کے راستہ میں بھی سنگ گراں ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے وحدانیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ننانوے مزید صفات بھی بیان کیے ہیں، تاکہ ان سے انسان کے دل پر اللہ کے حسن واحسان اور جلال کی تصویر مرتسم ہو جائے۔

ملائکہ پر ایمان

ملائکہ ملک کی جمع ہے جس کے معنی فرشتہ کے ہیں۔ اس کا مادہ الک یا الوکہ ہے، جس کے معنی رسالت یا پیغامبری ہے۔

ملائکہ وہ خارجی ہستیاں ہیں جو ہماری جسمانی اور روحانی ربوبیت کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ کائنات میں سورج، چاند، ستارے، ہوائیں، بادل وغیرہ تمام عناصر جو انسان کے لیے کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں در پردہ یہ ملائکہ کے کام ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا (الذاریات ۵۱:۱-۴) یعنی ان ہواؤں کی قسم جو سمندروں سے بخارات کو جدا کرتی ہیں پھر ان ہواؤں کی قسم جو ان بوجھل بخارات کو اپنے اندر لے لیتی ہیں۔ پھر ان ہواؤں کی قسم جو ان بادلوں کو منزل مقصود تک پہنچانے کے لیے چلتی ہیں۔ پھر ان فرشتوں کی قسم جو در پردہ ان تمام امور کو سرانجام دینے والے ہیں۔

ان آیات میں اوّلاً بادلوں کو برسنے کا سبب بیان کیا ہے، پھر آخر میں فَالْمُقَسِّمٰتِ امراً لا کر تمام حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ ان جسمانی سلسلہ کو چلانے والا ایک روحانی سلسلہ ہے۔ جو ملائکہ کے نام موسوم ہے۔ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (النزعت ۷۹:۵) کہا ہے، یعنی معاملہ کی تدبیر کرنے والے۔

قرآن مجید کی رو سے ملائکہ پر ایمان لانے کی غرض یہ ہے کہ ملائکہ کی طرف سے جو نیکی کی تحریک ہو اس پر عمل کرنے سے سستی نہ کی جائے۔

ملائکہ کے کام

۱۔ فرشتہ انبیاء علیہم السلام پر وحی لاتا تھا۔ (۴:۱۶۳)

۲۔ انبیاء علیہم السلام کی نصرت اور تائید کرتا ہے۔ (۲:۷۷)

۳۔ مومنین کی نصرت کرتا ہے۔ (۵۸:۲۲)

۴۔ مومنین کے دشمنوں کو تباہ کرتے ہیں۔ (۳:۱۲۳،۱۲۴)

۵۔ لوگوں کے اعمال لکھتے ہیں۔ (۲۸:۱۰۔۱۲)

۶۔ جان قبض کرتے ہیں۔ (۱۶:۲۳)

۷۔ قیامت کے دن لوگوں کی شفاعت کریں گے۔

۸۔ اعمال صالحہ کے لیے تحریکات پیدا کرتے ہیں۔

شیطان

قرآن مجید نے ایک اور مخفی خارجی ہستی کا ذکر کیا ہے۔ اس کی مختلف صفات کی وجہ سے اس کے مختلف نام رکھے ہیں۔ کہیں اس ہستی کا نام شیطان بیان کیا ہے، کہیں ابلیس اور کہیں جن۔ یہ ہستی انسان کے دل میں برائی کی تحریکات پیدا کرتی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (الناس ۱۱۴:۵،۶) یعنی جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے جنوں اور انسانوں میں سے۔

کتب سماوی پر ایمان

قرآن مجید میں کتب سماوی کو تین ناموں سے پکارا ہے۔

۱۔ صحیفہ۔ ۲۔ زبور۔ ۳۔ کتاب۔

قرآن مجید نے کتب سماوی پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (نساء ۴:۱۳۶) اے لوگو جو ایمان لائے ہو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (۲:۴) اور جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا۔

تمام کتب سماوی کی تعلیم ایک تھی

قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ یُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَتَفْصِیْلَ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ (یونس ۱۰:۳۷) اور یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اللہ کے سوا اوروں کا افتراء ہو بلکہ یہ اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے ہے اور آسمانی تعلیم کی تفصیل ہے اس میں ذرا شک نہیں ہے جہانوں کے رب کی طرف سے ہے۔

کتب سماوی پر ایمان لانا اس وجہ سے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور فرامین کا مجموعہ ہوتی ہیں جن پر چل کر انسان فلاح حاصل کرسکتا ہے۔

کتب سماوی کی تکمیل قرآن مجید کی شکل میں ہوئی ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵:۳) آج میں نے تمھارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کیا ہے اور اسلام کو بطور دین پسند کیا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینۃ ۹۸:۳) اس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔ یعنی قرآن مجید پہلی کتب سماوی کی تعلیمات کا نچوڑ اور عطر ہے۔

کتب سابقہ میں تحریف

تمام کتب سماوی میں تحریف ہو چکی ہے، جس کا اعلان آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے قرآن مجید نے کیا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ...... فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (البقرہ ۲:۷۵،۷۹) ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اللہ کے کلام کو سنتے پھر اس میں تحریف کرتے بعد اس کے کہ اسے سمجھ لیا اور وہ جانتے ہیں...... سو ان کے لیے حسرت ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے عوض تھوڑی قیمت لے لیں۔

قرآن ایک محفوظ کتاب ہے

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید محفوظ اور غیر محرف کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق قیامت تک یہ کتاب محفوظ رہے گی۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ (الحجر ۹:۱۵) یقیناً ہم نے ہی قرآن مجید کو اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔

قرآن تمام عالم کے لیے ہدایت

دوسری تمام کتب سماوی ایک قوم کی ہدایت کے لیے مختص تھیں۔ لیکن قرآن مجید دنیا کی تمام اقوام کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے نازل ہوا ہے ارشاد ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ (البقرہ ۲:۱۸۵) رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا جو لوگوں کے لیے ہدایت کا موجب ہے۔

انبیاء علیہم السلام پر ایمان

انبیاء علیہم السلام وہ مطہر اور مقدس ہستیاں ہیں جن کے قلوب پر حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر اترا تھا۔ رسول خدا کا ترجمان اور نمائندہ ہوتا ہے جو وحی کے ذریعے احکام الٰہی کو بندوں تک پہنچاتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم ۵۳:۳،۴) اور وہ خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا اور وہ جو کچھ کہتا ہے وہی ہوتا ہے جو اسکی طرف وحی کی جاتی ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: مَاقُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَا اَمَرْتَنِي بِهٖ (المائدہ ۵:۱۱۷) میں نے ان سے اس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے مجھے حکم دیا۔

رسالت وہبی چیز ہے

رسالت اور نبوت وہبی چیز ہے۔ یہ کسی کے اعمال کے نتیجہ میں نہیں ملتی۔ جس طرح جسمانی ربوبیت کے لیے سورج، چاند، ہوا، زمین، پانی وغیرہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کا نتیجہ ہیں۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ اشیاء اس کے کسی عمل کے نتیجہ میں پیدا کی گئی ہیں۔ اسی طرح نبوت کا انعام ہے جو کسی کے عمل کے نتیجہ میں نہیں ملتا یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نبوت کا ذکر صفت رحمانیت کے تحت آتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (الانعام ۶:۱۲۴) اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ منصب رسالت کس کو بخشے پس رسالت اللہ تعالیٰ کا خصوصی عطیہ اور انعام ہے۔

رسول انسان ہوتے ہیں

قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل ۱۶:۴۳) اور ہم نے آپ سے پہلے تمام رسول آدمی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے اہل کتاب سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔

انسان کو رسول بنانے کی حکمت بالغہ

ارشاد الٰہی ہے: وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (النحل ۱۶:۴۴) اور ہم نے آپ کی طرف یہ قرآن نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو وہ تعلیم کھول کھول کر بیان کر دیں جو ان کے لیے نازل کی گئی ہے تاکہ وہ لوگ غور وفکر کریں۔

ہر قوم کی طرف رسول آئے

اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر قوم کی طرف ہدایت کے لیے رسول بھیجے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس ۱۰:۴۷) یعنی ہر امت کے لیے رسول بھیجا گیا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (الفاطر ۳۵:۲۴) یعنی ہر امت میں ڈرانے والا گزر چکا ہے۔

تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی گروہ ہیں

تمام انبیاء علیہم السلام چشمہ الوہیت سے سیراب ہو کر تمام لوگوں کے دلوں کی کھیتیوں کو سرسبز

کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ایک ہی مشن اور کام ہونے کی وجہ سے تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی گروہ ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء ۲۱:۹۲) یہ تمہاری امت ایک جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں سو میری عبادت کرو۔

رسولوں کے درمیان تفریق کفر ہے

جبکہ اسلام نے تمام رسولوں کو ایک ہی امت قرار دیا ہے تو ان کے درمیان تفریق کرنا ناروا اور کفر ہے۔ ارشاد ہے: لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ ۲:۲۸۵) ہم رسولوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق نہیں کرتے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ ''وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں اس کے درمیان راہ نکالیں وہ پکے کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔'' (النساء ۱۵:۱۵۱)

رسولوں کی بعثت کا مقصد

قرآن مجید نے رسولوں کی بعثت کا مقصد اس آیت کریمہ میں بیان کر دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (البقرہ ۲:۱۵۱) جیسا کہ ہم نے تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر ہماری آیات پڑھتا ہے اور تم کو پاک کرتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

ختم نبوت

قرآن مجید نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین قرار دیا ہے۔ اور اب آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (الاحزاب ۳۳:۴۰) یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کو ختم کرنے والے ہیں اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

ختم نبوت پر نسل انسانی کا اتحاد ہے

جیسا کہ پہلے یہ ذکر گزر چکا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قوم کی طرف آتے تھے، اور ان کا دائرہ تبلیغ صرف اپنی قوم تک محدود ہوتا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کی بعثت نے قومی نبوت کا زمانہ ختم کر دیا اور اس کی جگہ عالمگیر نبوت نے لے لی۔ جس سے تمام قومی امتیازات مٹ گئے اور نسل انسانی کے اتحاد کی بنیاد پڑ گئی۔

قیامت کے دن پر ایمان

قرآن مجید نے قیامت کے دن پر ایمان لانے کو بہت ہی اہمیت دی ہے۔ جہاں اللہ پر ایمان لانے کا ذکر ہے۔ وہیں یوم آخرت پر ایمان لانے کا ذکر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (البقرہ ۲:۶۲) یعنی جو ایمان لایا اللہ پر اور آخری دن (قیامت کے دن پر) اور نیک کام کیے پس ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔

ایک اور جگہ پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (البقرہ ۲:۴) اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

یوم قیامت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے متعلق قرآن مجید کہتا ہے: اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُنْكِرَةٌ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُوْنَ (النحل ۱۶:۲۱) تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے سو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل انکاری ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیں۔

ایک اور جگہ پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنَاكِبُوْنَ (المومنون ۲۳:۷۴) اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔ وہ سیدھی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔

قیامت کے دن پر ایمان لانے کا فائدہ

قیامت کے دن پر ایمان لانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان کے دل میں نیک کاموں کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ جب ایک انسان کو یہ کامل یقین ہو کہ وہ ایک دن ایک علیم وخبیر ہستی کے سامنے اعمال کا جواب دہ ہوگا تو وہ لازمی طور پر برے کاموں سے اجتناب کرے گا اور نیک کاموں کی طرف رغبت کرے گا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرہ ۲:۴۵،۴۶) یقیناً یہ بڑی مشکل ہے مگر عاجزی کرنے والوں کے لیے نہیں جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور کہ وہ اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

جنت اور دوزخ کا آغاز

جنت اور دوزخ اسی دنیا سے شروع ہو جاتے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (الرحمٰن ۵۵:۴۶) اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے کی فکر رکھتا ہے اس کے لیے دو جنت ہے۔

ایک جنت تو اس دنیا میں مل جاتی ہے کیونکہ خوف الٰہی بدیوں اور برائیوں سے روکتا ہے، نیکی کے

راستہ پر چلنے کی ترغیب دیتا ہے۔ نیکی ہی انسان کے دل میں ایک لذت اور سرور پیدا کرتی ہے۔ یہی بہشتی زندگی کی علامت ہے۔

حشر اجساد کی ایک دلیل

منکرین قیامت نے یہ اعتراض کیا۔ أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذَٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ (سورۃ ق ۵۰:۳) کیا جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو پھر ہمارا حشر اجساد ہوگا؟ یہ تو بعید از عقل بات ہے۔

اس اعتراض کا جواب حکیمانہ انداز میں اگلی آیات میں دیا ہے، فرمایا: وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُبَارَكًا فَأَنبَتْنَا بِهِ جَنَّاتٍ وَحَبَّ الْحَصِيدِ وَالنَّخْلَ بَاسِقَاتٍ لَهَا طَلْعٌ نَضِيدٌ رِزْقًا لِلْعِبَادِ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَيْتًا كَذَٰلِكَ الْخُرُوجُ (ق ۵۰:۹۔۱۱) اور ہم نے بادل سے برکت والا پانی اتارا پھر ہم نے اس کے ساتھ باغ اگائے اور دانہ جو کاٹا جاتا ہے اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گابھا تہ بہ تہ ہے بندوں کے لیے رزق ہے اور اس کے ساتھ ہم مردہ بستی کو زندہ کرتے ہیں۔ اسی طرح نکلنا ہوگا۔

یہ آیت اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر دلالت کرتی ہے کہ وہ اپنی قدرت سے اشیاء کائنات کو نیستی سے ہستی میں لایا، تو وہ اسی قدرت سے مرنے کے بعد نئی پیدائش کیوں نہیں کر سکتا۔

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے: أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (یٰسین ۳۶:۸۱،۸۲) کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان انسانوں کی مثل بنا سکے۔ ہاں وہ بڑا پیدا کرنے والا جاننے والا ہے اس کا حکم جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے صرف یہ کہتا ہے ہو جا وہ ہو جاتی ہے۔

دوسری دلیل

عقل اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انسان جس قسم کے اعمال بجالائے اس کے مطابق اس کو جزا و سزا ملے۔ نیک کام کرنے والے کو انعام اور برے کام کرنے والے کو سزا۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (الدہر ۷۶:۳۱) وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کیا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ (آل عمران ۳:۱۹۵) میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو۔

قیامت کے مناظر

قرآن مجید نے اس دنیا کی عام تباہی کا نام قیامت رکھا ہے۔ قرآن مجید نے اس عام تباہی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ وَّ حُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (الحاقہ ۶۹:۱۳۔۱۵) پس جب صور میں ایک پھونک سے پھونکا جائے گا اور زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے پھر ایک ہی مرتبہ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے سو اس دن ہو جانے والی بات ہو جائے گی۔

جنت اور دوزخ کی حقیقت

قرآن مجید نے جنت و دوزخ کا فلسفہ نہایت ہی عمدہ رنگ میں بیان کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:
وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ (البقرہ ۲:۲۵)
اور ان لوگوں کو خوشخبری دے دو جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں کہ ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو باغ کے ساتھ اور نہروں کو اعمال کے ساتھ مشابہت دی ہے۔ اس آیت میں حکیمانہ انداز میں یہ بیان کیا ہے کہ جو رشتہ اور تعلق نہروں کا باغ کے ساتھ ہے وہی تعلق اعمال کا ایمان کے ساتھ ہے۔ جس طرح کوئی باغ بغیر پانی کے سرسبز نہیں رہ سکتا اسی طرح ایمان بغیر عمل صالح کے زندہ نہیں کہلا سکتا۔ اگر ایمان ہو اور اعمال صالح نہ ہوں تو ایمان، ہیچ، اگر ایمان نہ ہو تو اعمال اچھا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتے۔

پس اسلامی جنت کی حقیقت ہی یہی ہے کہ وہ اس دنیا کے ایمان اور اعمال کا ایک ظل ہے۔
انسان کی بہشت اور دوزخ انسان کے اندر سے ہی نکلتی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ (الہمزہ ۱۰۴:۶۔۷) اللہ کی جلائی ہوئی آگ جو دلوں پر جھانکتی ہے۔

عقیدہ آخرت کا اثر

عقیدہ آخرت پر ایمان لانے سے انسان ہر وقت ڈرتا رہتا ہے کہ اس کو ایک دن علیم و خبیر ہستی کے سامنے اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ جب انسان کے دل میں خوف الٰہی پیدا ہو جاتا ہے تو وہ ہر قسم کی برائی سے اجتناب کرتا ہے اور ہر نیکی کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْءَ الْحِسَابِ (رعد ۱۳:۲۱) اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور برے حساب کا خوف رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: إِنَّا نَخَافُ مِنْ رَبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا (الدہر ۷۶:۱۰) ہم اپنے رب سے تنگی اور سختی کے دن کا خوف رکھتے ہیں۔

تقدیر پر ایمان

تقدیر کے معنی اندازہ کے ہیں۔ جب یہ لفظ اللہ کی طرف منسوب ہوتا ہے، یعنی تقدیر الٰہی، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز اور ہر فرد کو کسی خاص مقصد حاصل کرنے کے لیے ایک خاص اندازہ کے تحت پیدا کیا ہے۔ اس اندازہ کا نام تقدیر ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى (الاعلیٰ ۸۷:۱۔۳) یعنی اپنے رب کے نام کی تسبیح بیان کر جو سب سے بلند و برتر ہے جس نے پیدا کیا پھر ٹھیک ٹھاک بنایا اور جس نے اندازہ کیا پھر ہر چیز کو اس کی پیدائش کی غرض حاصل کرنے کے لیے ایک خاص راستہ پر چلایا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی تقدیر دنیا کی ہر چیز میں کام کر رہی ہے۔ یہ تقدیر دو قسم کی ہے: تقدیر مبرم اور تقدیر معلق۔

تقدیر مبرم

وہ تقدیر ہے جسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔ نہ اس میں کوئی کمی بیشی کی جا سکتی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے آگ کو پیدا کیا ہے۔ اس میں یہ تقدیر کام کر رہی ہے کہ وہ جلائے۔ پانی پیدا کیا ہے، اس میں یہ تقدیر کام کر رہی ہے کہ وہ پیاس بجھائے، حیوانات اور نباتات کے لیے باعث زندگی ہے۔ سورج پیدا کیا ہے۔ اس میں یہ تقدیر کام کر رہی ہے کہ وہ روشنی دے اور گرمی پہنچائے۔ غرض کہ دنیا کی ہر چیز میں اللہ کی تقدیر کام کر رہی ہے۔ یہ وہ تقدیر ہے جس کو تقدیر مبرم کہتے ہیں، یعنی اٹل قانون۔ اگر یہ قانون اٹل نہ ہوتے تو دنیا کا نظام ہی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ مثلاً کبھی آگ جلاتی اور کبھی نہ جلاتی۔ کبھی پانی پیاس بجھاتا اور کبھی نہ بجھاتا۔ کبھی سورج گرمی دیتا اور کبھی نہ دیتا۔ تو اس طرح دنیا کا نظام ہی ختم ہو جاتا۔ یہ ایک عالمگیر تقدیر یا قانون الٰہی ہے جو دنیا کی تمام اشیاء میں جاری و ساری ہے۔

تقدیر معلق

تقدیر معلق سے مراد وہ تقدیر ہے جو ٹل سکے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے سے یہ اندازہ اور قاعدہ بنا دیا ہے کہ انسان جب کبھی صحیح اسباب استعمال کرے گا تو نتیجہ صحیح نکلے گا۔ اگر غلط اسباب سے کام لے گا تو نتیجہ غلط نکلے گا۔ اس اندازہ کا نام تقدیر معلق ہے۔ اسی تقدیر کے تحت تمام سعی و عمل و ترقیات کا ظہور ہے۔ اس تقدیر کو معلق اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا ٹل جانا انسان کی سعی اور اسباب کی کیفیات پر مبنی ہے۔ مثلاً ایک بیمار ہے، اس کا علاج غلط ہو رہا ہے، تو وہ موت کے منہ میں چلا جائے گا۔ اگر اس کا صحیح علاج ہو رہا ہے تو وہ صحت یاب ہو جائے گا۔ یہ ایک تقدیر تھی جو اسباب کے ساتھ وابستہ تھی۔ جب صحیح اسباب مل گئے تو یہ ٹل گئی اگر اسباب غلط ملے تو نہ ٹلی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختار پیدا کیا ہے اور مجبور بھی۔ مثلاً انسان کے جسم میں مختلف اعضاء کام کر رہے ہیں۔ دل حرکت کر رہا ہے۔ خون رگوں میں گردش کر رہا ہے۔

ان چیزوں میں انسان کا کوئی دخل نہیں۔ لیکن بعض اعضاء ایسے دیے ہیں جن کے افعال انسان کی طاقت کے اندر ہیں۔ مثلاً آنکھ سے دیکھنا یا نہ دیکھنا، کان سے سننا یا نہ سننا، ہاتھ سے کام لینا یا نہ لینا۔

انسان اللہ کے سامنے صرف انہی اعمال کا جواب دہ ہے جن میں وہ مختار ہے۔ دراصل انسان کی برتری تمام دوسری کائنات پر اس مختاری میں ہے۔

جیسا کہ فرقہ جبریہ والے کہتے ہیں کہ انسان مجبور محض ہے، وہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے گراتے ہیں۔ اس فرقہ کا عقیدہ ہے کہ انسان مجبور محض ہے، اس کو اپنے کسی فعل میں اختیار نہیں۔ یہ عقیدہ قیامت کے دن جزا و سزا کے بھی مخالف ہے۔ اگر انسان مجبور محض ہے تو اس کو سزا کیسی اور جزا کیسی؟ کیونکہ اس نے کوئی عمل اپنے اختیار سے کیا ہی نہیں۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دو تقدیریں اس دنیا میں کام کر رہی ہیں۔ ایک تقدیر مبرم یعنی وہ قاعدہ جو عالمگیر قانون کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں۔ دوسری تقدیر معلق جو انسان کی سعی صحیحہ اور ناقصہ سے وابستہ ہے۔ اگر انسان صحیح اسباب اور صحیح راستہ پر چل کر کام کرے گا تو نتیجہ انسان کے حق میں نکلے گا، اگر انسان غلط اسباب اور غلط راستہ اختیار کرے گا تو نتیجہ اس کے خلاف نکلے گا۔ یہ تقدیر انسان کی راہنمائی کرتی ہے کہ انسان کو ان راستوں پر چلنا چاہیے اور ان اسباب کو اپنے استعمال میں لانا چاہیے جو صحیح ہوں۔

ایک اور بات یاد رکھنی چاہیے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان صحیح اسباب اختیار کرتا ہے لیکن نتائج حسب منشا نہیں نکلتے۔ اس میں یہ حکمت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزمانا چاہتا ہے۔ آیا اس کا بندہ اللہ کی رضا کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے یا کہ نہیں۔ یہ بھی اللہ کی تقدیر ہے۔ اس سے انسان کی روحانی ترقی وابستہ ہے۔

تقدیر الٰہی پر ایمان لانے کا یہ مطلب ہے کہ ان تمام اسباب کو استعمال میں لایا جائے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی ترقی کے لیے پیدا کیے ہیں۔

اسلام کا نظام عبادت

عبادات جمع ہے عبادت کی۔ امام راغب نے عبادت کے معنی انتہائی درجہ تذلل اور انکساری کے کیے ہیں۔ لسان العرب میں عبادت کے معنی اطاعت کے ہیں۔

انسان کی پیدائش کی غرض

قرآن مجید نے بنی نوع انسان کی پیدائش کی غرض و غایت ہی عبادت قرار دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذاریات ۵۱:۵۶) کہ میں نے جن وانس اس لیے پیدا کیے ہیں تاکہ وہ میری عبادت کریں۔

دوسری جگہ آتا ہے: یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ ۲:۲۱) اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا اور انھیں جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم متقی بنو۔

اسلام میں عبادت کا مفہوم

دین اسلام میں عبادت چند الفاظ اور حرکات کا نام نہیں ہے، بلکہ لفظ عبادت اپنے اندر ایک وسیع مفہوم لیے ہوئے ہے۔ اللہ ہمارے چند تعریفی کلمات کا محتاج نہیں۔ وہ غنی اور صمد ہے۔ اسلام میں اللہ کی عبادت کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے عنایت کیے ہوئے نظریات کا جوا اپنی گردن پر رکھ لے اور اس کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے۔

نماز

قرآن مجید میں جہاں مدح یا تحریص کے مقام پر نماز کا ذکر آیا ہے۔ وہاں لفظ اقام یا اس کے مشتقات کو استعمال کیا ہے جیسے یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ، اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ، مُقِیْمَ الصَّلٰوۃَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اقام کا مادہ قوم ہے۔ اقام الامر کے معنی ہیں کام کو درست اور صحیح حالت میں رکھنا۔ اللہ تعالیٰ کا لفظ اقام یا اس کے مشتقات لفظ صلوٰۃ کے ساتھ ذکر کرنے سے یہ مطلب ہے کہ نماز اس کے آداب اور شرائط کے ساتھ ادا کی جائے۔

نماز کے آداب و شرائط

۱۔ طہارت (جسم کپڑا اور جگہ) قرآن مجید میں آتا ہے: یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ

وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (المدثر۷۴:۵) اے چادر اوڑھنے والے اٹھ اور ڈرا اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر اور اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھ اور ناپاکی سے دور رہ۔

۲۔ باجماعت ادا کرنا: قرآن مجید میں آتا ہے: وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (البقرہ۲:۴۳) یعنی جھکنے والوں کے ساتھ جھکو۔

۳۔ خشوع وخضوع: ارشاد الٰہی ہے: اَلَّذِيْنَ هُمْ فِي صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُونَ (مومنون۲۳:۲) وہ لوگ جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں۔

اس کے برعکس نماز کی روح سے غافل نمازیوں کے متعلق آتا ہے: فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاۗءُوْنَ (الماعون ۱۰۷:۴۔۶) پس ان نمازیوں کے لیے ہلاکت ہو جو اپنی نماز سے غافل ہیں اور جو ریاکاری سے پڑھتے ہیں۔

۴۔ نماز برائیوں سے رک جائے:۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (عنکبوت ۲۹:۴۵) اور نماز کو قائم رکھو نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔

۵۔ باقاعدہ التزام اور دوام سے پڑھنا:۔ اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ (معارج ۷۰:۲۳) جو اپنی نماز کو دوام اور باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (معارج ۷۰:۳۴) جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔

۶۔ استقبال قبلہ: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (بقرہ۲:۱۴۴) تو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیرا اور جہاں کہیں بھی تم ہو مونہوں کو اس طرف پھیرو۔

۷۔ فہم وتدبر: نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے معنوں کی طرف دل متوجہ ہو۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَاتَقُوْلُوْنَ (النساء۴:۴۳) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم نشہ میں ہو یہاں تک کہ جو تم کہو اس کو سمجھو۔

۸۔ قنوت: لغت میں قنوت کے معنی ہیں۔ اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری (۲) خاموش رہنا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (بقرہ۲:۲۳۸) اور اللہ کے سامنے عجز اور خاموشی سے کھڑے ہو جاؤ۔

اس آیت کے نزول سے قبل نماز میں باتیں کرلیا کرتے تھے، جب یہ آیت اتری تو رسول کریم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باتیں کرنے سے منع فرمایا۔

۹۔ اوقات مقررہ پر ادا کرنا: اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (النساء۴:۱۰۳) مومنوں پر نماز وقت مقررہ پر فرض ہے۔

۱۰۔ ستر عورت: ارشادِ الٰہی ہے: یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف ۷:۳۱) اے آدم کی اولاد ہر نماز کے وقت اپنی زینت سے آراستہ ہو جایا کرو۔

نماز کی حقیقت اور اہمیت

الصلوٰۃ کا مادہ صَلیٰ ہے۔ جس کے معنی آگ میں جلانا اور آگ میں داخل ہونا ہیں: جیسے یَصْلَی النَّارَ الْکُبْرٰی (الاعلیٰ ۸۷:۱۲) سَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا (النساء۴:۱۰) صَلوٰۃ کے معنی دعا اور برکت کے بھی ہیں: جیسے ارشادِ الٰہی ہے: اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ (الاحزاب۳۳:۵۶) اور اللہ اور اس کے فرشتے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔ وَصَلِّ عَلَیْہِمْ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّہُمْ (توبہ۹:۱۰۳) تو ان لوگوں کے لیے دعا کر کیونکہ تیری دعا ان کے لیے باعث سکون ہے۔ قرآن مجید میں صَلوٰۃ کا لفظ عبادت گاہ پر بھی بولا گیا ہے۔ لَّہُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْہَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا (الحج ۲۲:۴۰) راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے گرا دی جائیں۔

اسلامی اصطلاح

اسلام میں صلوٰۃ سے مراد وہ عبادت ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عمل سے مخصوص ہیت کے ساتھ سکھائی، جو ہم تک مسلمانوں کے متواتر عمل کے ساتھ پہنچی۔

صلوٰۃ کا لفظ اپنے مادہ کے لحاظ سے اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وہ نماز قبول ہے جس کے ساتھ دل کی سوزش اور جلن ہے۔ قلبی جلن اور حرقت ہی انسان کو گناہوں سے پاک صاف کرتی ہے اور خدا کے بڑے بڑے فضلوں کا وارث بناتی ہے۔ معراج انسانیت تک پہنچاتی ہے۔ اخلاق فاضلہ کے زیور سے آراستہ کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے حقیقی ارتباط قائم کرتی ہے۔

اہمیت

دنیا میں جتنے انبیاء علیہم السلام ہو گزرے ہیں اُنہوں نے اپنی اپنی امتوں کو نماز کا حکم دیا ہے۔

قرآن مجید اور احادیث میں بھی اس فریضہ کی بجا آوری کے لئے بہت تاکید پائی جاتی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اور نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ نماز کا ادا نہ کرنا شرک کی ایک قسم ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاْمُرْ اَہْلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْہَا. اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دے

اس پر دوام اختیار کر۔

حدیث میں ہے: مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ (ترمذی جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کی وہ کافر ہو گیا۔

پھر آپ نے فرمایا: اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ فَمَنْ تَرَکَهَا فَقَدْ هَدَمَ الدِّیْنَ نماز دین کا ستون ہے پس جس نے اس کو چھوڑا اس نے دین کو گرا دیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جن دو باتوں کی تاکید فرمائی تھی، ان میں سے ایک نماز تھی۔ آپ نے فرمایا: مسلمانو! الصَّلٰوۃَ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ میری وفات کے بعد نماز کو قائم رکھنا اور غلاموں کے حقوق کی حفاظت کرنا۔

نماز کی غرض و غایت

قرآن مجید نماز کی غرض و غایت تزکیہ نفس بیان کرتا ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ (عنکبوت ۲۹:۴۵) یعنی نماز ہر قسم کی بے حیائیوں اور بے شرمی کی باتوں سے روکتی ہے۔

ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بتاؤ تو سہی کہ اگر کسی کے دروازے کے سامنے نہر گزرتی ہو، اور وہ دن میں پانچ دفعہ اس میں نہائے تو اس کے بدن پر کسی قسم کی میل رہ جاتی ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہی حالت پانچ نمازوں کی ہے کہ وہ انسان کے گناہوں کے دھبوں کو صاف کر دیتی ہیں۔

ارکان نماز

نماز کی ابتداء قیام سے ہوتی ہے۔ نمازی اللہ اکبر کہہ کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر ادب کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے اور تکبیر تحریمہ کے بعد حسب ذیل الفاظ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہیں:

سُبْحَانَکَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَا اِلٰهَ غَیْرُکَ[1] یعنی پاک ہے تو اے اللہ اور تیری ہی تعریف ہے اور تیرا نام برکت والا ہے تیری شان بلند ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔

مندرجہ بالا دعا پڑھنے کے بعد یہ الفاظ پڑھے جاتے ہیں:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ. یعنی میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ اس کے بعد سورۃ فاتحہ پڑھی جاتی ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مَالِکِ یَوْمِ

---

[1] ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب ۲۰ من رای الاستفتاح بسبحانک۔

الدِّیْنِ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ. آمین۔

اللہ بے انتہا رحم کرنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں (تمام) جہانوں کا رب بے انتہا رحم والا بار بار رحم کرنے والا ہے۔ وہ جزا و سزا کے دن کا مالک ہے۔ ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت کر راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام کیا۔ نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا۔

سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد قرآن مجید سے کم از کم تین آیات پر مشتمل سورت پڑھی جاتی ہے۔ یہاں صرف سورۃ اخلاص جس کا مضمون خالص توحید پر مشتمل ہے۔ درج کی جاتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم. قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ اَللّٰہُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ۝ میں اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں جو بے انتہا رحم کرنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ کہہ وہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ وہ جنتا ہے اور نہ جنا گیا اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔

رکوع

اللہ اکبر کہہ کر نمازی رکوع میں جاتا ہے۔ اس حالت میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم (پاک ہے میرا رب جو بہت بڑا ہے) تین مرتبہ پڑھا جاتا ہے۔

رکوع کے بعد قیام

نمازی رکوع کی حالت سے قیام کی حالت میں آتا ہے اور دونوں ہاتھ کھلے رہتے ہیں اور سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ (خدا اس کی سنتا ہے جو اس کی تعریف کرتا ہے) کے الفاظ پڑھے جاتے ہیں اور ساتھ ہی رَبَّنَا لَکَ الْحَمْد (اے ہمارے رب سب تعریف تیرے لیے ہے) کے الفاظ کہے جاتے ہیں۔

سجدہ

اس کے بعد نمازی اللہ اکبر کہہ کر سجدہ میں گر جاتا ہے اور اس حالت عاجزی میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی (پاک ہے میرا رب جو بہت بلند ہے) کے الفاظ تین بار دہرائے جاتے ہیں۔ یہ ہیت دو دفعہ اختیار کی جاتی ہے۔

مصلی تکبیر کہہ کر سجدہ سے سر اٹھاتا ہے اور جلسہ کی ہیت میں بیٹھ جاتا ہے۔ اس وقت یہ دعا پڑھی جاتی ہے: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِی وَارْحَمْنِی وَاھْدِنِیْ وَعَافِنِیْ وَارْزُقْنِی وَاجْبُرْنِی وَارْفَعْنِی[1] اے خدا مجھے بخش دے مجھ پر رحم فرما اور میری راہنمائی فرما کر منزل مقصود تک پہنچا اور مجھے رزق عطا فرما، میرے معاملات کو درست کر دے اور مجھے بلندی عطا کر۔

[1] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب الدعا بین السجدتین۔

قعدہ

دو رکعت ختم ہونے پر قعدہ میں حسب ذیل دعا پڑھی جاتی ہے:

اَلتَّحِيَاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلٰوتُ وَالطَّيِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ. تمام قولی، بدنی اور مالی عبادتیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تجھ پر سلام ہو اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکات ہوں۔ سلام ہو ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

نماز کے آخری قعدہ میں تشہد کے بعد درود پڑھا جاتا ہے:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ. اے خدا! درود بھیج محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جس طرح تو نے درود بھیجا ابراہیم علیہ السلام پر اور آل ابراہیم علیہ السلام پر، بے شک تو تعریف کیا گیا ہے اور بزرگی والا ہے۔ اے اللہ! تو برکت بھیج محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جس طرح تو نے برکت بھیجی ابراہیم علیہ السلام پر اور آل ابراہیم علیہ السلام پر بے شک تو تعریف کیا گیا اور بزرگی والا ہے۔

اس کے بعد احادیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دعائیں مروی ہیں۔ وہ پڑھی جاتی ہیں۔

ایک دعا یہ ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ظُلْمًا كَثِيْرًا وَّلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِيْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ. ''اے اللہ! بے شک میں نے اپنی جان پر بہت ظلم کیا ہے اور تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخش نہیں سکتا، پس مجھے بخش دے اپنی خاص مغفرت سے اور مجھ پر رحم فرما، بے شک تو ہی بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اس کے بعد دائیں بائیں سلام پھیرا جاتا ہے۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ. سلام ہو تم پر اور اللہ کی رحمت۔

نماز وتر میں تیسری رکعت کے بعد یہ دعا پڑھی جاتی ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَعِيْنُكَ وَنَسْتَغْفِرُكَ وَنُؤْمِنُ بِكَ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْكَ وَنُثْنِيْ عَلَيْكَ الْخَيْرَ وَنَشْكُرُكَ وَلَا نَكْفُرُكَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ اَللّٰهُمَّ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَلَكَ

نُصَلِّي وَنَسْجُدُ وَإِلَيْكَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ وَنَرْجُوْا رَحْمَتَكَ وَنَخْشٰى عَذَابَكَ اِنَّ عَذَابَكَ بِالْكُفَّارِ مُلْحِقٌ. اے اللہ! ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں اور تیری بخشش چاہتے ہیں اور تجھ پر ایمان لاتے ہیں اور تجھ پر توکل کرتے ہیں اور تیری تعریف کرتے ہیں اور تیرا شکر کرتے ہیں اور تیری ناشکری نہیں کرتے۔ ہم علیحدہ ہو جاتے ہیں اور چھوڑتے ہیں اس کو جو تیری نافرمانی کرتا ہے۔ اے اللہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی نماز پڑھتے ہیں اور تیرے آگے سجدہ کرتے ہیں اور تیری طرف دوڑتے ہیں اور تیری خدمت میں حاضر رہتے ہیں اور ہم تیری رحمت کے امیدوار ہیں اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں بے شک تیرا عذاب کفار کو پہنچنے والا ہے۔

اگر نمازی غلطی کر جائے تو نماز کے اختتام پر سلام سے پہلے سجدہ سہو کرنا ضروری ہے۔ سجدہ سہو دو سجدوں پر مشتمل ہے۔ اگر امام سے غلطی سرزد ہو جائے تو وہ بھی مقتدیوں کے ساتھ سجدہ سہو کرے۔

فلسفہ نماز

نماز انفرادی اور اجتماعی ترقی کے دروازے کھولتی ہے۔ قرآن مجید نے نماز کو ذریعہ فلاح قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ. (مومنون ۲۳:۲۴) مومن یقیناً کامیاب ہو گئے جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔

فلاح کا تعلق دنیا اور آخرت دونوں سے ہے۔ دنیا میں فلاح اچھی اور قابل قدر چیزوں کے حصول پر بولا جاتا ہے اور آخرت میں فلاح بقاء الٰہی سے تعبیر ہوتی ہے۔ چونکہ فرد کی ترقی قوم کی ترقی پر مقدم ہے اس لیے پہلے فرد کی ترقی پر بحث کی جاتی ہے۔

فرد کی ترقی کے اسباب

۱۔ اخلاق حسنہ: انسان کی ترقی کا پہلا ذریعہ اخلاق حسنہ ہے۔ نماز انسان کے اخلاق سنوارنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (عنکبوت ۲۹:۴۵) یعنی نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔

۲۔ فرض شناسی: فرد کی ترقی کا دوسرا سبب فرض شناسی ہے۔ نماز انسان کو فرض شناسی اور احسن طریق سے کام سرانجام دینے کا سبق دیتی ہے۔ جس طرح سپاہیوں میں فرض شناسی پیدا کرنے کے لیے دن رات کئی دفعہ بگل بجا کر مقررہ جگہ پر اکٹھا کیا جاتا ہے۔ ان سے پریڈ کرائی جاتی ہے۔ یہ صرف فرض شناسی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے ایک سطح بین شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اجتماعی قواعد کا جنگ سے کیا تعلق۔ لیکن تجربے اور مشاہدہ نے یہ بات پایۂ یقین تک پہنچا دی ہے کہ سپاہیوں کی اجتماعی پریڈ لڑائی کی تیاری کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو دن

میں پانچ دفعہ مسجد میں آنے کے لیے اذان دی جاتی ہے کہ وہ تمام کام چھوڑ کر اللہ کے حضور کھڑے ہو جائیں۔ اللہ کے حضور پانچ دفعہ حاضری انسان کے اندر فرض شناسی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔

۳۔ ضبطِ نفس: فرد کی ترقی کا تیسرا سبب ضبطِ نفس ہے۔ نماز میں اوقات کی پابندی، طہارت کی قید جسمانی حرکات، خاص دعاؤں اور تسبیحوں کا پڑھنا، امام کے ہر فعل کی پوری پوری اطاعت کرنا۔ یہ سب امور انسان کو ضبطِ نفس کی تعلیم دیتے ہیں اور یہ سب پابندیاں اور قیود انسان کی اپنی رائے اور خواہشات کو دفن کر دیتی ہیں۔

۴۔ پابندیِ وقت: فرد کی ترقی کا چوتھا سبب وقت کی پابندی ہے۔ نماز کے اوقات مقرر ہیں، جن میں نماز ادا کرنا فرض ہے۔ اوقات کا تعین انسان کو پابندیٔ وقت کا عادی بنا دیتا ہے۔

۵۔ صحت: فرد کی ترقی کا پانچواں سبب صحت ہے۔ ضابطہ نماز میں انسان کے لیے حفظانِ صحت کے اصول مقرر کر دیے گئے ہیں۔ نماز پڑھنے سے پہلے جسم اور اعضاء کا پاک صاف کرنا ضروری ہے، جو انسان کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح حفظانِ صحت کے اصول سے صبح خیزی بھی بہت ضروری ہے، صبح کی نماز اس اصول کو نہایت خوبی سے پورا کرتی ہے۔

۶۔ قوتِ عملیہ کو کام میں لانا: فرد کی ترقی کا چھٹا سبب قوتِ عملیہ کو فعل میں لانا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى (نجم ۵۳:۲۹) اور انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہی جو وہ کوشش کرتا ہے۔ اسلامی نماز انسان کی قوتِ عملیہ کو جلا دینے اور حرکت اور فعل میں لانے کا بہترین سبب ہے۔ سستی اور کاہلی کو نماز کے آداب اور شرائط کے منافی قرار دیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَ لَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى (توبہ ۹:۵۴) یعنی منافق لوگ نماز میں سستی اور کاہلی کی حالت میں آتے ہیں۔

۷۔ کام میں مواظبت: کسی فرد کی ترقی کا ساتواں سبب کام میں مواظبت اور دوام اختیار کرنے میں ہے۔ نماز مسلمان کو مواظبت اور دوام اختیار کرنے کا سبق دیتی ہے۔ قرآن مجید میں اقامت صلوٰۃ کی ایک شرط یہ بیان کی ہے۔ اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ (معارج ۷۰:۲۳) جو اپنی نمازوں کو مداومت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: احبُّ الْعَمَلِ اِلَى اللّٰهِ اَدْوَمه وَاِنْ قَلَّ[1] اللہ کے نزدیک محبوب ترین عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے خواہ وہ کم ہی ہو۔

اجتماعی ترقی کے اسباب

۱۔ اتحاد: اجتماعی ترقی کا پہلا سبب اتحاد ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آلِ عمران ۳:۱۰۳) اور سب کے سب اللہ کی رسی کو پکڑے رکھو اور تفرقہ نہ کرو۔

---

[1] ابوداؤد باب مایومر بہ من القصد فی الصلوٰۃ۔

اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے نماز بہترین ذریعہ ہے۔

۲۔ مساوات: قومی ترقی کا دوسرا سبب مساوات ہے۔ جس قوم میں طبقاتی تقسیم ہو جیسا کہ ہندوؤں میں چار ذاتیں ہیں تو وہ قوم پستی کے گڑھے میں جا گرتی ہے۔ اسلام اس قسم کی طبقاتی تقسیم کو نہ صرف ختم کرتا ہے بلکہ تمام دنیا کی اقوام کو ایک برادری کے دائرہ میں داخل کرتا ہے: يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (سورہ نساء ۱:۴) اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا۔

مساوات کا کامل نمونہ مسجد میں باجماعت نماز سے ملتا ہے۔ جب ایک امیر قیمتی لباس پہنے ہوئے ایک غریب کے دوش بدوش کھڑا ہوتا ہے۔ پھر ایک امیر دوسری یا تیسری صف میں کھڑا ہوتا ہے تو اس کا سر سجدہ کرتے وقت کسی غریب کے پاؤں کے قریب ہوتا ہے۔

۳۔ اخوت: قومی ترقی کا تیسرا سبب جذبہ ہمدردی اور اخوت ہے۔ نماز مسلمانوں کے اندر ایک دوسرے سے ہمدردی اور بھائی چارہ کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ سورۃ فاتحہ نماز کی اہم شق ہے، جس کے پڑھے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی۔ اس کا آغاز ہی الحمد للّٰہ ربّ العالمین سے ہوتا ہے۔ یعنی سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ جب ایک نمازی اللہ تعالیٰ کو رب العالمین کہہ کر پکارتا ہے۔ تو اس کا دل روئے زمین کے تمام انسانوں کی ہمدردی سے بھر جاتا ہے اور نمازی صفت ربوبیت کے تحت تمام غرباء کی اعانت کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

۴۔ اطاعت امیر: قوم کی ترقی کا چوتھا سبب اطاعت امیر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ (نساء ۵۹:۴) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے صاحب امر کی اطاعت کرو۔

نماز مسلمانوں کو اپنے امیر کی اطاعت کرنے کا سبق دیتی ہے۔ مقتدیوں کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنے امام کے ہر فعل کی پیروی کریں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مقتدی امام سے پہلے رکوع میں چلا جاتا ہے یا رکوع سے پہلے سر اٹھا لیتا ہے یا سجدہ میں پہلے چلا جاتا ہے یا سجدہ سے پہلے سر اٹھا لیتا ہے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے شخص کے متعلق فرمایا کہ قیامت کے روز وہ گدھے کی صورت میں اٹھایا جائے گا۔

۵۔ مرکز سے وابستگی: قوم کی ترقی کا پانچواں سبب ایک مرکز سے وابستگی ہے۔ جس قوم کا ایک مرکز نہ ہو یا کوئی قوم اپنے مرکز سے علیحدگی اختیار کرے، وہ قوم تنزل کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جاتی ہے۔ نماز میں تمام مسلمانوں کو قبلہ رخ کھڑا ہونے کا حکم ہے، جس میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ ان کی ترقی ایک مرکز سے وابستگی میں ہے۔

زکوٰۃ

زکوٰۃ کے معنی

زکوٰۃ کا لفظ زکا سے مشتق ہے، کھیتی میں نمو آنے یا اس کے بڑھنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اسے زکوٰۃ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ اس سے قومی مال بڑھتا ہے یا اس سے تزکیہ نفس ہوتا ہے۔ اسلامی اصطلاح میں زکوٰۃ وہ مال ہے جو نصاب کے تحت امراء سے لیا جاتا ہے اور سورۃ توبہ کی آیت ۶۰ کی رو سے تقسیم کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں زکوٰۃ کے لیے دو اور الفاظ استعمال ہوئے ہیں: صدقہ اور انفاق فی سبیل اللہ۔

صدقہ صدق سے مشتق ہے، جس کے معنی سچائی اور خلوص کے ہیں۔ گویا زکوٰۃ کو صدقہ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ معطی کے ایمان میں سچائی اور خلوص کی چمک پیدا کرتی ہے۔ جس سے اس کا باطن روشن ہو جاتا ہے۔ دوم، صدقہ کا لفظ معطی کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ اپنا مال خلوص اور صدق دل سے دے۔

انفاق فی سبیل اللہ کے الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ غرباء اور محتاجوں کو دینا گویا اللہ تعالیٰ کو دینا ہے۔

حقیقت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے اور اس کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان گنت صفات میں سے ایک صفت ربوبیت ہے۔ یہ صفت انسان سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق صفت ربوبیت کا اظہار کرے۔ اسلام نے وہ اظہار زکوٰۃ، خیرات اور صدقات کی صورت میں بیان کیا ہے۔ زکوٰۃ دراصل اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا مجازی طور پر اظہار ہے۔

اہمیت

قرآن مجید نے اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا ذکر کیا ہے۔ جس میں یہ حکمت بالغہ ہے کہ انسان اس وقت تک صحیح تربیت یافتہ نہیں کہلا سکتا۔ جب تک وہ اللہ کے حضور جھکنے کے ساتھ ساتھ مخلوق الٰہی کی خدمت بجا نہیں لاتا کیونکہ یہ دونوں پہلو ہی تکمیل انسانیت کے لیے ضروری ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ یعنی نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ (توبہ ۹:۱۱) اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں۔

تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْحَکِیْمِ ھُدًی وَّ رَحْمَۃً لِّلْمُحْسِنِیْنَ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ (سورۃ لقمان ۳۱:۲۔۴) یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں

نیکی کرنے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال سے خرچ نہ کرنے والوں کے لیے قرآن مجید اور احادیث میں سخت تہدید آئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (توبہ ۹:۳۴) یعنی وہ لوگ جو سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زکوٰۃ نادہندگان کے متعلق فرماتے ہیں۔

مُثِّلَ لَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ شُجَاعًا اَقْرَعَ لَهُ زَبِيبَتَانِ يَطْلُبُهُ حَتّٰى يُمْكِنَهُ يَقُوْلُ اَنَا كَنْزُكَ

(موطا امام مالک کتاب الزکوٰۃ) یعنی جس شخص کے پاس مال ہو اور اس نے اس کی زکوٰۃ نہیں نکالی قیامت کے دن اس کے مال کو ایک گنجے سانپ کی صورت دے دی جائے گی اور اس کے منہ میں زہر کی دو تھیلیاں ہوں گی اور وہ اس آدمی کی تلاش میں نکلے گا۔ یہاں تک کہ اس پر قابو پالے گا اور اس سے کہے گا کہ میں تیرا خزانہ ہوں۔

زکوٰۃ کن اموال پر فرض ہے

سونا، چاندی، نقدی خواہ سکے کی شکل میں ہو یا نوٹ ہوں، مال تجارت پر اور ان جانوروں پر جو سال کا اکثر حصہ چر کر اپنا پیٹ پالیتے ہیں، اور زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ فرض ہے۔ زمین اور سکنی مکان، استعمال کی جانے والی چیزیں، جواہرات، ترکاری سبزیاں، پھل وغیرہ پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

اسلام نے نہایت ہی حکمت بالغہ سے ان اشیاء پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو کچھ عرصہ تک محفوظ رہ سکتی ہیں اور ان میں ترقی ونشوونما کی صلاحیت موجود ہو۔ جو اشیاء زیادہ عرصہ تک محفوظ نہ رہ سکتی ہوں اور ان میں ترقی اور نشوونما کی صلاحیت بھی موجود نہ ہو، ان پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

نصاب زکوٰۃ

مختلف مالوں کا نصاب زکوٰۃ مختلف ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

چاندی کی صورت میں دوسو درہم یا ساڑھے باون تولے، تقریباً ۲۱ اونس۔

سونے کی صورت میں بیس مثقال یا ساڑھے سات تولے، تقریباً ۳ اونس۔

نقدی اور مال تجارت کی صورت میں قیمت کا شمار اور نصاب چاندی کے معیار پر ہوگا۔

زیورات اگر چاندی کے ہیں تو چاندی کا نصاب، اگر سونے کے زیور ہیں تو سونے کا نصاب ہوگا۔

حیوانات کی صورت میں نصاب اونٹوں کے لیے پانچ بیلوں اور گائیوں کے لیے تیس اور بکریوں

کے لیے چالیس ہے۔

اناج کی صورت میں نصاب پانچ وسق۔

زکوۃ کی شرح

جب کسی مال پر ایک سال گزر جائے تو اس پر حسب ذیل شرح سے زکوۃ واجب ہوگی۔

جمع شدہ مال پر اڑھائی فیصد اور حیوانات کی شرح کا نقشہ حسب ذیل ہے:

اونٹ

تعداد	شرح زکوۃ
۵.....۹	ایک بکری
۱۰.....۱۴	دو بکریاں
۱۵.....۱۹	تین بکریاں
۲۰.....۲۴	چار بکریاں
۲۵.....۳۵	اونٹ کا ایک سال کا بچہ
۳۶.....۴۵	اونٹ کا دو سالہ بچہ
۴۶.....۶۰	تین سال کا اونٹ کا بچہ
۶۱.....۷۵	چار سال کا اونٹ
۷۶.....۹۰	دو سال کے دو بچے
۹۱.....۱۲۰	تین سال کے دو بچے

۱۲۰ کے بعد ہر چالیس پر دو سال کا ایک بچہ اور ہر پچاس پر تین سال کا ایک بچہ۔

بکری

ایک سے ۳۹ تک کی تعداد پر کوئی زکوۃ نہیں۔

تعداد	شرح زکوۃ
۴۰.....۱۲۰	ایک بکری
۱۲۱.....۲۰۰	دو بکریاں
۲۰۱.....۳۰۰	تین بکریاں

پھر ہر سو پر ایک ایک بکری۔

گائے، بیل، بھینس

ایک سے انتیس تک کی تعداد پر زکوۃ نہیں۔

تعداد	شرح زکوۃ
۳۰ پر	ایک دو سالہ بچھڑا
۴۰ پر	تین سالہ بچھڑا
۶۰ پر	دو سال کے دو بچھڑے
۷۰ پر	ایک تین سال کا اور ایک سال کا
۸۰ پر	تین سال کے دو
۹۰ پر	دو سال کے تین
۱۰۰ پر	دو سال کے دو اور تین سال کا ایک

زمین

زمین کی دو قسمیں ہیں: وہ زمین جو بارش یا قدرتی چشموں سے سیراب ہوتی ہے تو حکومت اس کی پیداوار کا دسواں حصہ لے گی۔ جب زمین کنووں یا مصنوعی ذرائع سے سیراب ہوتی ہو تو اس سے پیداوار کا بیسواں حصہ لیا جاتا ہے۔

رکاز (دفینہ)

اسلامی تعلیم کی رو سے اگر کسی کو دفینہ مل جائے تو حکومت اس کے پانچویں حصہ کی مالک ہوگی۔ حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت ہے: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ..... فی الرکاز الخمس. کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دفینہ میں اسلامی حکومت کا پانچواں حصہ ہے۔

مصارف زکوۃ

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں زکوۃ کے آٹھ مصارف بیان کیے ہیں، ارشاد الٰہی ہے: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (توبہ ۹: ۶۰) زکوۃ صرف فقراء کے لیے ہے مساکین اور اس صیغہ میں کام کرنے والوں اور ان لوگوں کے لیے ہے جن کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہے اور غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے اور قرض داروں کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافر کے لیے یہ اللہ کی طرف سے ضروری ٹھہرایا گیا ہے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

۱۔ فقراء: یہ وہ لوگ ہیں جو کسی جسمانی معذوری کی وجہ سے روزی کمانے کے اہل نہ ہوں یا جن پر کوئی سخت مصیبت آن پڑی ہو، وہ اس قابل نہ ہوں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکیں۔

۲۔ مساکین: مسکین سے مراد شخص ہے جو کمانے کے لائق ہو، مگر غربت یا عدم ذرائع کی وجہ سے کچھ کما نہ سکتا ہو۔

۳۔ عاملین علیھا (کارندے) یہ وہ کارکن ہیں جو صدقات اور زکوٰۃ جمع کرتے اور بیت المال میں پہنچاتے ہیں۔

۴۔ المولفة قلوبھم (تالیف قلوب) یہ دو قسم کے لوگ ہیں: اوّل ایسے لوگ جو دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے اور ان کو اسلام کے قریب لانے کی ضرورت ہے۔

دوم: وہ نومسلم جن کے قلوب میں اسلام ابھی پورے طور پر راسخ نہیں ہوا۔ ان کی امداد اور ان کو تعلیم اسلام سے واقف کرانے کے لیے زکوٰۃ کے فنڈ سے خرچ کیا جائے۔

تالیف قلوب اتنا اعلیٰ اصول ہے۔ لیکن اس اصول کو مسلمانوں نے نسیا منسیا کر دیا ہے، جس وجہ سے کوئی بھی اپنے ہم قوم اور اعزہ و اقارب سے بگاڑ کر اسلام کو قبول کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس عیسائیوں نے اس اصول کو اپنا لیا ہے اور تالیف قلوب کی مد سے کروڑوں روپے خرچ کر رہے ہیں۔ اس احسان اور امداد کو دیکھ کر لوگ دھڑا دھڑ آغوش نصرانیت میں جا رہے ہیں۔

۵۔ فی الرقاب (یعنی غلاموں کو آزاد کرنا) سلام کے علاوہ کوئی ایسا مذہب نہیں۔ جس نے غلاموں کے لیے باضابطہ طور پر بیت المال سے ایک حصہ مقرر کیا ہو۔ یہ آزادی تین طرح سے ہو سکتی ہے:

۱۔ حکومت مالکوں سے غلام خرید کر آزاد کر دے۔

۲۔ اسیران جنگ کا فدیہ دیا جائے۔

۳۔ ان غلاموں کی مدد کی جائے جو مالک سے مکاتبہ کر کے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔

۶۔ الغارمین (مقروض) قرض داروں کا قرضہ اتارنے کے لیے زکوٰۃ فنڈ سے خرچ کیا جائے گا۔

۷۔ فی سبیل اللّٰہ یعنی اللہ کے راستہ میں۔ اس سے مراد جہاد ہے۔ جہاد تین قسم کا ہے: جہاد سیفی، جہاد قلمی اور جہاد لسانی۔

تینوں جہاد مسلمانوں کی زندگی کے لیے ضروری ہیں اور اس کے لیے روپے کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو زکوٰۃ فنڈ سے پورا کیا جائے گا۔

۸۔ ابن السبیل یعنی مسافر۔ زکوٰۃ فنڈ سے مسافروں کی امداد کرنے کا حکم ہے۔ بعض اوقات سفر میں

ایسے مرحلے بھی آ جاتے ہیں کہ مسافر بیمار ہو جاتا ہے، اس کی رقم گر جاتی ہے تو وہ بالکل تہی دست ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ مالی امداد کا بہت محتاج ہوتا ہے۔

زکوٰۃ کے آداب و شرائط

۱۔ زکوٰۃ دینے والے کے سامنے صرف رضاء الٰہی ہو۔ ذاتی شہرت اور منفعت مقصود نہ ہو۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: وَمَا تُنفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ (سورۃ بقرہ ۲:۲۷۲) اور تم خرچ کرتے ہو سوائے اس کے اللہ کی رضا حاصل ہو۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا (الدہر ۷۶:۹) ہم تم کو خدا کی رضا حاصل کرنے کے لیے کھلاتے ہیں ہم تم سے کوئی بدلہ اور شکریہ نہیں چاہتے۔

۲۔ جسے خیرات دی جائے اس پر احسان نہ جتایا جائے اور نہ اس کی دل آزاری کی جائے۔ ارشاد الٰہی ہے: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاءَ النَّاسِ (سورۃ بقرہ ۲:۲۶۴) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور تکلیف دے کر باطل نہ کرو اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے۔

۳۔ خیرات اچھی اور طیب کمائی سے کرنی چاہیے۔

قرآن مجید میں آتا ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ (بقرہ ۲:۲۶۷) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ان اچھی چیزوں سے خرچ کرو جو تم کماتے ہو اور اس سے جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے پیدا کیا اور ردی چیز دینے کا قصد نہ کرو کہ اس میں سے تم خرچ کرنے لگو۔

اس آیت میں دو باتیں بیان ہوئی ہیں:

۱۔ زکوٰۃ کسب حلال سے دینی چاہیے۔

۲۔ مال ردی نہ ہو۔

دوسری جگہ قرآن مجید میں آتا ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران ۳:۹۲) تم نیکی ہرگز حاصل نہیں کر سکو گے یہاں تک کہ اس مال سے خرچ کرو جس سے تمھیں محبت ہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ اِلَّا طَيِّبًا اے لوگو! اللہ پاک ہے، وہ پاک مال سے صدقہ

زکوۃ قبول کرتا ہے۔

۴۔ خیرات اعلانیہ بھی دینی چاہیے اور خفیہ بھی۔

ارشاد الٰہی ہے: اِنْ تُبْدُوْا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (سورۃ بقرہ ۲:۲۷۱) اگر تم خیرات کھلے طور پر دو تو کیا ہی اچھا ہے اور اگر تم اسے چھپا کر دو اور فقراء کو دو تو وہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

علماء نے اس آیت سے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ زکوۃ اعلانیہ اور اختیاری خیرات چھپا کر دینی چاہیئے۔

۵۔ خیرات کرتے وقت قلبی مسرت ہونی چاہیئے۔ قرآن مجید نے منافقین کی ایک علامت یہ بیان کی ہے کہ وہ انفاق فی سبیل اللہ کو چٹی سمجھتے ہیں اور حتی الامکان بخل سے کام لیتے ہیں۔ قرآن مجید میں آیا ہے۔ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا (توبہ ۹:۹۸)

ان اعراب میں سے بعض وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو چٹی سمجھتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ هٰاَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَنْ يَّبْخَلُ وَمَنْ يَّبْخَلْ عَنْ نَفْسِهٖ (محمد ۴۷:۳۸) سن لو! تم لوگ ایسے ہو کہ تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو کہا جاتا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ بخل کرتے ہیں اور جو کوئی اس کام میں بخل کرتا ہے وہ خود اپنے لیے ہی بخل کرتا ہے۔

۶۔ زکوۃ قومی بیت المال میں جمع ہونی چاہیے۔ جیسا کہ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا (کارکناں زکوۃ) کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔ اگر زکوۃ انفرادی طور پر خرچ کرنا جائز ہوتی تو یہ الفاظ بیان نہ ہوتے۔

۷۔ خیرات میں میانہ روی ہونی چاہیے۔

اسلام انسانی طبائع اور فطرت کے عین مطابق ہے۔ وہ عیسائیت کی طرح یہ تعلیم نہیں دیتا کہ اللہ کی بادشاہت میں داخل ہونے کے لیے سب کچھ خیرات کر دیا جائے۔ اگر کوئی حاجت مند کرتا مانگے تو پاجامہ بھی اتار کر دے دیا جائے۔ اس قسم کی تعلیم پر عمل کرنا انسانی طبائع پر دوبھر ہے۔

اسلام میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے، ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (سورۃ بنی اسرائیل ۱۷:۲۹) اور اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اسے حد سے زیادہ کھول دے ورنہ تو ملامت کیا ہوا اور درماندہ ہو کر بیٹھ جائے گا۔ حدیث میں آتا ہے: مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ جو شخص خرچ میں میانہ روی اختیار کرتا ہے وہ تنگ دست نہیں ہوتا۔

۸۔ صدقہ و زکوۃ صرف مستحقین کو دی جانی چاہیے، تاکہ غریب طبقہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے اور قوم اور ملک کے لیے تقویت کا باعث بن سکے۔

فلسفہ زکوۃ

انفرادی فوائد

زکوۃ تزکیہ نفس کا موجب ہے۔قرآن مجید میں آتا ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ۹:۱۰۳) یعنی ان کے مالوں سے زکوۃ لے تاکہ اس سے انھیں پاک اور صاف کرے۔

انسان کو سب سے زیادہ عزیز اور محبوب چیز مال ہے۔اسی وجہ سے قرآن مجید نے مال کو فتنہ قرار دیا ہے کیونکہ بعض اوقات محبوب چیز کی وجہ سے انسان احکام الٰہی کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔زکوۃ انسان کے دل سے مال کی محبت کم کرتی ہے۔ مال کی محبت کی کمی کی وجہ سے انسان بے شمار برائیوں سے بچ جاتا ہے اور بے شمار نیکیوں کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ایک تو ناجائز طریقہ سے روپیہ کما کر اپنے پیٹ کے دوزخ کو نہیں بھرتا۔دوم، بخل کی قبیح عادت سے نجات مل جاتی ہے۔قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (سورۃ الحشر ۵۹:۹) اور جو اپنے دل کو حرص اور لالچ سے بچائے گا وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔سوم انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے جو تمام نیکیوں کی جڑ ہے اور انسان کی زندگی کا منتہائے مقصود اور جوہر مطلوب ہے۔قرآن مجید میں آتا ہے: مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ (سورہ بقرہ۲:۲۶۵) اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو رضا الٰہی کے حصول کے لیے خرچ کرتے ہیں اور کچھ اپنے آپ کو مضبوط کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں اس باغ کی مثال کی طرح ہے جو اونچی جگہ پر ہو۔

اس آیت کریمہ میں زکوۃ کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ جو لوگ رضاء الٰہی کے لیے صدقات دیتے ہیں وہ ایمان کی ایک مستحکم چٹان پر کھڑے ہو جاتے ہیں، ان کے دل اللہ کی محبت سے بھر جاتے ہیں اور ان کی طبیعت خود بخود نیکی کی طرف بہہ نکلتی ہے اور اپنے آپ کو حصن حصین میں پاتے ہیں جہاں شیطان کا گزر نہیں ہوتا۔

اجتماعی فوائد

ا۔اقتصادی اور معاشی ترقی

زکوۃ قوم کی اقتصادی اور معاشی ترقی کا بہترین ذریعہ ہے۔قرآن مجید میں آتا ہے: يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ (البقرہ۲:۲۷۶) اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (بقرہ۲:۲۶۱) ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایک دانہ کی مثال ہے جو سات بالیں اگائے ہر ایک بالی میں

سود انے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے کئی گنا کر دیتا ہے اور اللہ بہت دینے والا اور جاننے والا ہے۔

زکوٰۃ کا لفظ بھی قوم کی معاشی اور اقتصادی ترقی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ زکوٰۃ کا مفہوم ہی بڑھوتی ہے۔

کسی قوم کی اقتصادی اور معاشی ترقی کا انحصار چند اشخاص کے ہاتھوں میں دولت کے جمع ہونے پر نہیں ہے بلکہ ساری قوم کی مجموعی خوشحالی سے وابستہ ہے۔ جب غرباء میں زکوٰۃ تقسیم ہو گی تو روپیہ چند ہاتھوں سے نکل کر قوم کے بے شمار دوسرے افراد میں تقسیم ہو جائے گا۔ دوم، وہ اس مالی امداد سے اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ اپنی روزی کما سکیں۔ اس طرح ملک کی اقتصادی اور معاشی حالت مستحکم بنیادوں پر قائم ہو جائے گی۔

۲۔ زکوٰۃ قوم کی ترقی کا ذریعہ ہے

قرآن مجید نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو قوم کی ترقی کا ذریعہ بیان کیا ہے۔ سورۃ بقرہ میں حضرت حزقیل کا ایک رویاء بیان ہوا ہے کہ وہ ایک تباہ حال بستی (یروشلم) پر سے گزرے۔ اس کو دیکھ کر حضرت حزقیل نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ یہ بستی کب آباد ہوگی، کب اس کے رہنے والے ترقی کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو رویاء میں بتایا کہ یہ بستی سو سال کی تباہی کے بعد آباد ہوگی۔ اسی رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے احیاء موتی کی کیفیت کا سوال کرتے ہیں۔ معاً اس رکوع کے بعد انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر آ جاتا ہے۔ تباہ حال بستی اور احیاء موتی کے ذکر کے معاً بعد اللہ کی راہ میں خرچ کا بیان یہ ظاہر کرتا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کا تباہ حال بستی کی آبادی اور احیاء موتی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ وہی قوم دنیا کے نقشہ پر ترقی کے ساتھ ابھرتی ہے جو قومی، ملی مفاد کی خاطر خرچ کرنا جانتی ہے۔ آغاز اسلام میں مسلمان کسمپرسی اور غربت کی حالت میں تھے۔ انھوں نے اس حالت میں بھی ملی اور قومی مفاد کے لیے خرچ کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی ضرورت کے لیے چندہ کی اپیل کرتے ہیں تو صحابہؓ اپنے گھر کا اثاثہ لا کر پیش کر دیتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس کچھ نہیں تو وہ مزدوری کر کے چند ٹکے کما کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیتا ہے۔ آخر اس قربانی کے نتیجہ میں یہ قوم اللہ کے فضلوں کی وارث بنی اور بڑی بڑی حکومتیں ان کے قدموں پر آن پڑیں۔

۳۔ غرباء کی ربوبیت

زکوٰۃ قوم کے غرباء کی ربوبیت اور کفالت کا بہترین ذریعہ ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اِنَّ اللّٰہَ افْتَرَضَ عَلَیْھِمْ صَدَقَۃً تُوْخَذُ مِنْ اَغْنِیَائِھِمْ فَتُرَدُّ فِیْ فُقَرَائِھِمْ (مسلم جلد ۱ کتاب الایمان) یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر (مسلمانوں پر) زکوٰۃ فرض کی ہے کہ وہ امراء سے لے کر حاجت

مندوں میں تقسیم کی جائے۔

۴۔ زکوٰۃ قوم کی اخلاقی حالت درست رکھنے کا ذریعہ ہے

بھوک، غربت اور افلاس ہمیشہ جرائم کے ارتکاب کا سبب بنتے ہیں۔ جس قوم کے افراد غربت اور افلاس کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں اس قوم میں جرائم کی کثرت ہو جاتی ہے۔ روزمرہ کے واقعات اس پر کافی گواہ ہیں کہ بعض لوگ مالی عسرت کی وجہ سے چوری، قزاقی اور لوگوں کی جیبیں کاٹنی شروع کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات جب یہ عسرت اور افلاس اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو یہ لوگ دن دہاڑے امراء کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا شروع کر دیتے ہیں اور ملک کا امن تہس نہس ہو جاتا ہے۔

غربت کی وجہ سے انسان جرائم کا ہی ارتکاب نہیں کرتا، بلکہ اس میں اور بھی بے شمار اخلاقی کمزوریاں آ جاتی ہیں۔ فقر اور مسکنت انسان کو دنی اور خسیس بنا دیتے ہیں، ایمان باللہ دل سے نکل جاتا ہے۔ وہ امراء کو ہی انداداً من دون اللہ (اللہ کے سوا دوسرے کو معبود بنالینا) تصور کرنا شروع کر دیتا ہے۔ انہی کو اپنا پالن ہار اور مربی خیال کرتا ہے، ان کا خوف خدا کے خوف سے بڑھ کر دل پر مستولی ہوتا ہے۔ یہی وہ اخلاقی بیماریاں ہیں جن کی وجہ سے انسان کی طبعی استعدادیں دب جاتی ہیں اور وہ قردۃ خاسئین کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔

زکوٰۃ کا معاشی نظام میں مقام

اس وقت دنیا میں دو معاشی نظام چل رہے ہیں: ایک سرمایہ داری نظام ہے اور دوسرا کمیونزم۔ سرمایہ داری نظام کا مزاج اس قسم کا ہے کہ اس سے چند ہاتھوں میں ہی دولت جمع ہو جاتی ہے اور دوسری تمام قوم افلاس کے دیو کے منہ میں چلی جاتی ہے۔ اسی نظام کے ردعمل سے دوسرا نظام معاشی نظام اشتراکیت ظاہر ہوا۔ جس کا اصول یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے کمائے ہوئے مال کا مالک نہیں ہے، سب دولت حکومت کی ہے، وہ تمام لوگوں کو ضروریات کے مطابق دے گی۔

یہ دونوں نظریات افراط اور تفریط کے شکار ہیں۔ اگر سرمایہ داری نظام مزدور طبقہ کے افلاس کا سبب بنتا ہے اور ان کی محنت کی بے وقری ہوتی ہے تو دوسری طرف اشتراکی نظام نے بھی محنت کی بے وقری کی ہے کیونکہ اشتراکی نظام میں مزدور محنت سے کمائی ہوئی چیز کا خود مالک نہیں بن سکتا۔ اس سے زیادہ محنت اور کوشش کرنے کی تحریک اور جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔

اسلام نے دونوں نظاموں کے برعکس محنت کی توقیر اور عزت کی ہے۔ ملکیت کو بھی جائز قرار دیا ہے تاکہ محنت کرنے کا جذبہ زندہ رہے۔ دوسری طرف تقسیم دولت کے لیے زکوٰۃ جیسا حکمت بالغہ پر مبنی قانون بنا دیا ہے تاکہ دولت چند ہاتھوں میں جمع نہ ہونے پائے، بلکہ ساری قوم میں گردش کرتی رہے کیونکہ زکوٰۃ کا

یہ اصول ہے کہ ہر سال جمع شدہ سرمایہ کا چالیسواں حصہ غرباء کے لیے قومی بیت المال میں داخل کیا جائے۔ ایک تو اس لازمی خیرات کی وجہ سے سرمایہ دار ہمیشہ اپنے سرمایہ کو کاروبار میں لگائے رکھے گا تاکہ زکوٰۃ ہی تمام سرمایہ کو نہ کھا جائے۔ کاروبار میں سرمایہ لگانے سے روپیہ لوگوں کے ہاتھوں میں گردش کرتا رہتا ہے اور مزدور طبقہ بھی اپنی محنت کا پھل حاصل کرتا رہتا ہے۔ دوسرے امراء اور غرباء کے تعلقات خوشگوار رہتے ہیں۔ امراء غرباء کو اپنا بھائی خیال کرتے ہیں اور ان کے بارہ میں ہمدردی اور مواسات کے جذبات اپنے دل میں لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف امراء کے جذبہ ہمدردی کی وجہ سے غرباء کے دلوں میں محبت کے جذبات موجزن رہتے ہیں۔ دونوں طبقوں کے باہمی اتحاد اور اتفاق اور مواخات کی وجہ سے ملک اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے محفوظ رہتا ہے۔

روزہ (صوم)

صوم کے لغوی اور اصطلاحی معنی

صوم کے لغوی معنی رکنے کے ہیں لیکن شریعت کی اصطلاح میں صبح صادق سے غروب آفتاب تک ارادۃً کھانے پینے اور مباشرت سے رکے رہنے کا نام ہے۔

روزہ عالمگیر عبادت ہے

روزہ سب مذاہب میں بطور عبادت کے فرض ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (سورہ بقرہ ۲:۱۸۳) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح ان لوگوں پر فرض کیے گئے تھے جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں لکھا ہے:

اس کے طریقے اور اس کی اغراض آب و ہوا، قوم و نسل اور تہذیب و تمدن اور دوسرے حالات کے پیش نظر سب کچھ مختلف ہیں۔ لیکن کسی ایسے قابل ذکر مذہبی سلسلے کا نام لینا مشکل ہے جس میں روزہ سے کلیتہً انکار کیا گیا ہو اور اسے تسلیم نہ کیا گیا ہو" (انسائیکلو پیڈیا برٹینکا از مضمون روزہ (Fasting)

روزہ کی اہمیت

قرآن مجید میں آتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (۲:۱۸۳) اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلی امتوں پر فرض کیے گئے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

وَالَّذِیْ نَفْسِی بِیَدِہٖ لَخُلُوْفُ فَمِ الصَّائِمِ اَطْیَبُ عِنْدَ اللّٰہِ مِنْ رِیْحِ الْمِسْکِ اِنَّمَا یَذَرُ شَھْوَتَہٗ وَطَعَامَہٗ وَشَرَابَہٗ مِنْ اَجْلِی فَالصِّیَامُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ کُلُّ حَسَنَۃٍ بِعَشْرِ اَمْثَالِھَا اِلٰی سَبْعِ مِائَۃِ ضِعْفٍ اِلَّا الصِّیَامَ فَھُوَ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ. (موطا امام مالک کتاب الصیام) یہ حدیث مسلم اور بخاری میں تھوڑے سے الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ آتی ہے یعنی قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کو مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے کیونکہ روزہ دار اپنی شہوت اور اپنا کھانا اور پینا میری خاطر ترک کرتا ہے پس وہ میرے لیے ہی روزہ رکھتا ہے اور میں ہی اس کو بدلہ دوں گا۔ دوسری تمام نیکیوں کا بدلہ میرے ہاں دس گنا سے سات سو گنا تک دیا جاتا ہے سوائے روزہ کے کیونکہ روزہ دار روزہ صرف میرے لیے ہی رکھتا ہے اس لیے میں ہی اس کا بدلہ ہوں۔

اسلامی عبادات میں روزہ کو اتنی اہمیت دو وجہ سے ہے: ایک تو اس وجہ سے کہ تمام عبادات ظاہری ارکان پر مشتمل ہیں جن کو ادا کرنے سے وہ عبادت تمام ہوتی ہے۔ ظاہری ارکان کی ادائیگی کی وجہ سے عابد کو ہر کوئی دیکھ سکتا ہے لیکن روزہ کا تعلق انسان کے باطن سے ہے، سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ دوسرے روزہ سے انسان کے بہیمی جذبات دب جاتے ہیں۔ بہیمی جذبات کے محرکات حواس خمسہ ہیں۔ روزہ میں ان حواس خمسہ کو قابو میں رکھا جاتا ہے، جس وجہ سے بہیمی جذبات دب جاتے ہیں۔

روزہ کی حقیقت

روزہ کی حقیقت قرآن مجید نے ایک لفظ ''تقویٰ'' سے تعبیر کی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ. اے مسلمانو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلی امتوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔

اسلامی اصطلاح میں تقویٰ اپنے آپ کو گناہوں کی آلودگیوں سے بچانے اور اللہ کی صفات میں اپنے آپ کو رنگین کرنے کا نام ہے۔

روزہ کے آداب

ا۔ ذکر الٰہی اور صدقات

احادیث صحیحہ سے یہ ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مہینہ میں تلاوت قرآن مجید، ذکر الٰہی اور صدقات وخیرات کثرت سے کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رمضان کے مہینے کو شھر المواساۃ (ہمدردی کا مہینہ) فرمایا ہے۔ (مشکوۃ کتاب الصوم) جب رمضان کا مہینہ آتا تو کسی قیدی کو پابند قید نہ رکھتے۔ ہر سائل کی حاجت کو پورا کرتے۔ اِذَا دَخَلَ شَھْرُ رَمَضَانَ اَطْلَقَ کُلَّ اَسِیْرٍ

وَاَعْطٰی کُلَّ سَائِلٍ (مشکوٰۃ کتاب الصوم) جب رمضان کا مہینہ شروع ہوتا تو ہر قیدی کو چھوڑ دیتے اور ہر سائل کی ضرورت کو پورا کرتے۔

بخاری میں آتا ہے: کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَجْوَدَ النَّاسِ وَکَانَ اَجْوَدَ مَایَکُوْنَ فِی رَمَضَانَ (بخاری ۱:۱) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام لوگوں سے زیادہ فیاض تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فیاضی رمضان میں اور بڑھ جاتی۔

۲۔ حرام اور ممنوع چیزوں سے اجتناب

ویسے تو اسلام نے ہر حالت میں حرام اور ممنوع چیزوں سے مجتنب رہنے کی تعلیم دی ہے لیکن روزے کی حالت میں خاص تاکید کی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اِذَا صُمْتَ فَلْیَصُمْ سَمْعُکَ وَبَصَرُکَ وَلِسَانُکَ وَیَدُکَ وَکُلُّ عُضْوٍ مِنْکَ. یعنی تو روزہ رکھے تو تیرے کان تیری آنکھ تیری زبان تیرے ہاتھ اور تیرے تمام اعضاء ناپسندیدہ اور حرام باتوں سے رکے رہیں۔

وَمَنْ لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِہٖ فَلَیْسَ لِلّٰہِ حَاجَۃٌ فِیْ اَنْ یَدَعَ طَعَامَہٗ وَشَرَابَہٗ (بخاری ۸:۳۰) جس کسی نے روزے کی حالت میں جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا ترک نہ کیا تو اللہ تعالیٰ کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ بھوکا رہے۔

روزہ کے احکام

۱۔ روزہ کی حالت میں صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور مباشرت سے منع کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَۃَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ فَتَابَ عَلَیْکُمْ وَعَفَا عَنْکُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْھُنَّ وَابْتَغُوْا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ وَکُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ (۲:۱۸۷) یعنی تمھارے لیے روزوں کی رات میں اپنی عورتوں سے مباشرت کرنا حلال کیا گیا ہے۔ وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ جانتا ہے کہ تم اپنی جانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے سو وہ تم پر رجوع برحمت ہوا اور تم کو معاف کیا پس اب ان سے میل جول کرو جو اللہ نے تمھارے لیے فرض کیا ہے جو چاہو کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمھارے لیے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ ہو جائے پھر روزہ کو رات تک پورا کرو۔

۲۔ روزے بالغ، مقیم اور تندرست پر فرض ہیں۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر، حیض والی عورت دوسرے رمضان کی آمد سے پہلے پوری کریں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: فَمَنْ

شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (بقرہ ۱۸۵:۲) یعنی جو کوئی اس مہینے کو پائے تو چاہیے کہ اس کے روزے رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں سے روزوں کی گنتی پوری کرے۔

شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ سے ان تمام مقامات کو خارج کر دیا ہے جہاں دن رات بہت لمبے ہونے کی وجہ سے مہینوں کی تقسیم نہیں ہوتی۔ کئی کئی دن تک یا کئی کئی مہینوں تک سورج نہیں نکلتا یا غروب نہیں ہوتا، کیونکہ وہاں مہینہ ہی نہیں۔

۳۔ بوڑھے مرد اور عورتیں، مرضعہ عورتیں، معذور اور اپاہج لوگ، دائم المریض لوگ جن کی بیماری بڑھ جانے کا اندیشہ ہو، مزدور طبقہ جو سخت مشقت سے معاش حاصل کرتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے اسلام نے آسانی کے طور پر روزہ کے بدلہ صرف ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ مقرر کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (البقرہ ۱۸۴:۲) اور جو روزہ رکھنے میں مشقت پاتے ہیں وہ ایک مسکین کا فدیہ دیں۔

فلسفہ روزہ

انفرادی فوائد

۱۔ روحانی قوت تیز ہوتی ہے

ماہ رمضان میں صائم کی روحانی قوت تیز ہوتی ہے اس وجہ سے صوفیاء کرام ماہ رمضان کو تنویر قلب کا مہینہ کہتے ہیں۔ اس ماہ میں سچی رویاء اور مکاشفات کا دروازہ کھلتا ہے۔ خدا کی محبت اور قدرت کا کرشمہ دیکھتا ہے۔ اسرار اور رموز پر اطلاع پاتا ہے۔ قرآن مجید نے روزہ رکھنے والے کو بھی اسی وجہ سے سائح کہا ہے۔ سائح کے معنی ہیں: روحانی منازل طے کرنے والا ہے۔

۲۔ تعمیر سیرت

روزہ صرف کھانے پینے اور مباشرت کے ترک کرنے کا ہی نام نہیں، بلکہ ہر قسم کی برائیوں سے اجتناب کرنے کا نام ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ برائیوں سے اجتناب نہیں کرتے اور صرف بھوک پیاس کی مصیبتیں جھیلتے ہیں ان کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ صِيَامِهٖ اِلَّا الظَّمَاءُ (مشکوٰۃ ص ۱۷۷) یعنی کتنے روزہ دار ہیں جن کو روزہ سے بھوک پیاس کے سوا کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔

۳۔ ضبط نفس

روزہ ضبط نفس کی تعلیم دیتا ہے۔ صائم صبح صادق سے قبل سحری کھالیتا ہے اور غروب آفتاب تک

کسی کھانے پینے والی چیز کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا سکتا۔ یہ روک ضبط نفس کے لیے عمدہ تعلیم اور مشق ہے۔

۴۔ روزہ اللہ کی ہستی کا تصور زیادہ راسخ کرتا ہے

اسلام کی تمام عبادات کا مقصد وحید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا تصور انسان کے دل میں جاگزین ہو جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا تصور ہی انسان کو بدیوں سے بچاتا ہے۔

جب انسان روزہ رکھتا ہے۔ بھوک پیاس کے باوجود پوشیدگی میں کھانے پینے سے اجتناب کرتا ہے۔ اس کا یہ اجتناب صرف اللہ تعالیٰ کو علیم وخبیر جاننے کی وجہ سے ہے کیونکہ صائم جانتا ہے کہ کھا پی کر لوگوں کو دھوکا دیا جا سکتا ہے لیکن علیم وخبیر کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ سو ایک ماہ روزہ رکھنے سے اللہ تعالیٰ کی ہستی کا تصور انسان کے دل میں زیادہ راسخ ہو جاتا ہے۔

۵۔ اطاعت امر الٰہی

روزہ اطاعت الٰہی کی مشق کراتا ہے۔ صائم اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک ماہ تک معینہ وقت کے دوران حلال چیزوں سے اجتناب کرتا ہے۔ ایک ماہ کی مشق سے جذبہ اطاعت انسان کی طبیعت میں راسخ ہو جاتا ہے۔

۶۔ قوت صبر کی نمو

روزہ صائم کو صابر بناتا ہے۔

۷۔ طبی فائدہ

روزہ سے انسان کے بدن سے رطوبات ردیہ اور مواد غلیظہ تحلیل ہو جاتے ہیں۔ معدہ اور جگر کو ایک ماہ تک آرام مل جانے کی وجہ سے مضبوط ہو جاتے ہیں۔

اجتماعی فوائد

۱۔ انسانی ہمدردی اور مواسات

روزے انسانی ہمدردی اور مواسات کا پیغام لے کر آتے ہیں، اس وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رمضان کے مہینے کو شہر المواساۃ فرمایا ہے۔

انسانی فطرت ہے کہ جب کسی چیز کا عملی احساس نہ ہو، اس وقت تک اس چیز کی طرف توجہ پیدا نہیں ہوتی۔ اسلام نے امراء کو بھوک اور پیاس کا عملی احساس دلانے کے لیے روزوں کی تعلیم دی ہے تاکہ ان کو غرباء کی بھوک اور پیاس کا احساس ہو جائے اور ان کے دل میں غرباء کی ہمدردی اور مواسات کا جذبہ پیدا ہو۔

۲۔ مساوات اور اتحاد کا ذریعہ ہے

جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو مسلمانوں کے اندر مساوات کی ہمہ گیر لہر دوڑ جاتی ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان حکم خداوندی کے تحت پو پھٹنے سے لے کر غروب آفتاب تک اکل وشرب سے رک جاتے ہیں اور ایک ہی حالت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ماہ رمضان دنیا کے تمام مسلمانوں کو اتحاد اور مساوات کی لڑی میں منسلک کر دیتا ہے۔

حج

لغوی اور اصطلاحی معنی

حج کے لغوی معنی ہیں زیارت کا قصد کرنا۔ لیکن اصطلاح شریعت میں اس کے معنی ہیں ضروری عبادات کی بجا آوری کے لیے بیت اللہ کا قصد کرنا۔ (راغب)

حج کی اہمیت

حج بعض شرائط کے ساتھ ہر مسلمان عاقل بالغ پر فرض ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰالَمِيْنَ (آل عمران ۳:۹۰) اور لوگوں پر اللہ کے لیے اس گھر کا حج کرنا فرض ہے اس پر جو اس تک راہ پا سکے اور جس نے انکار کیا تو اللہ جہانوں سے بے نیاز ہے۔

استطاعت سے مراد یہ ہے کہ

۱۔ حج کرنے والا آزاد ہو۔

۲۔ صحت ایسی ہو کہ وہ سفر کی صعوبتیں برداشت کر سکے۔

۳۔ راستہ میں جان کا کوئی خطرہ نہ ہو، یعنی راستہ پُر امن ہو۔

۴۔ اتنا روپیہ ہو جس سے وہ اپنا زادِ راہ بھی لے سکے اور اپنے اہل وعیال کے لیے بھی پیچھے چھوڑ جائے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

يَااَيُّهَا النَّاسُ قَدْ فُرِضَ عَلَيْكُمُ الْحَجُّ فَحُجُّوْا. (مسلم کتاب الحج) اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا گیا ہے لہٰذا حج کرو۔

مسلم میں آتا ہے: اَلْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ اِلَّا الْجَنَّةُ (کتاب الحج) مقبول حج کا بدلہ جنت ہے۔

حج کی حقیقت

حج کی رسوم کی ادائیگی کی تہ میں ایک سر اور بھید ہے، وہ یہ کہ انسان انقطاع نفس کر کے اللہ کی محبت کے اتھاہ سمندر میں غرق ہو جائے اور اللہ کی ذات سے ایسا رابطہ اور توسل قائم کرے کہ انسان کی اپنی مرضی ہی نہ رہے بلکہ اس کی مرضی اللہ کی مشیت کے تحت آ جائے۔ یہ رابطہ اور توسل سخت آزمائش میں بھی ٹوٹنے نہ پائے۔

حج کے اقسام

حج کے تین اقسام ہیں: حج افراد، حج قِران، حج تمتع۔

۱۔ حج افراد یہ ہے کہ حاجی احرام صرف حج کی نیت سے باندھے۔

۲۔ حج قِران یہ ہے کہ حاجی حج اور عمرہ دونوں کی نیت سے احرام باندھے پھر مکہ پہنچ کر احرام نہ کھولے جب تک کہ مناسک حج سے فارغ نہ ہو جائے۔

۳۔ حج تمتع حج کے مہینوں میں صرف عمرہ کی نیت سے احرام باندھا جائے۔ مکہ پہنچ کر عمرہ کے ارکان پورے کر کے احرام کھول دیا جائے۔ پھر ایام حج میں حج کے لیے احرام باندھے۔

حج کے مہینے

حج کے مہینے یہ ہیں: شوال، ذی قعدہ اور ذی الحجہ کے ابتدائی دس دن۔

مناسک حج

احرام

جب حاجی میقات پر پہنچے تو وہ احرام باندھے۔ احرام کا لباس صرف دو اَن سلی چادروں کا ہوتا ہے۔ ایک چادر بطور تہ بند کے باندھی جائے۔ دوسری چادر جسم کے اوپر کے حصہ کے لیے ہوتی ہے۔ یہ چادر اس طرح اوڑھی جاتی ہے کہ اس کا ایک سرا دائیں بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر اور دوسرا بائیں بغل سے نکال کر دائیں کندھے پر لٹکایا جاتا ہے۔

طواف

جب حاجی مکہ پہنچے تو سب سے پہلے وہ بیت اللہ کا طواف کرے، اس طواف کو طواف قدوم کہا جاتا ہے۔ یہ طواف مسنون ہے، فرض نہیں۔

مناسک حج ادا کرنے کے بعد گھر واپس آنے سے قبل طواف کیا جاتا ہے، اس کو طواف دواع کہا جاتا ہے۔ یہ طواف حنفی مذہب میں واجب ہے۔

جو طواف ایام النحر (دسویں، گیارھویں اور بارھویں تاریخ) کو بعد قربانی اور حلق کیا جاتا ہے، اس کو طواف زیارت کہا جاتا ہے۔ یہ طواف حج کی ضروری عبادات میں سے ہے۔

سعی صفا و مروہ

قرآن مجید میں آتا ہے: فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ (البقرہ ۲:۱۵۸) پس جو شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے اور جو کوئی شوق سے نیکی کرتا ہے تو یقیناً اللہ بڑا قدردان اور جاننے والا ہے۔

عرفات میں وقوف

ارشاد الٰہی ہے: ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (البقرہ ۲:۱۹۹) پھر تم وہاں سے پلٹو جہاں سے لوگ پلٹتے ہیں اور اللہ کی حفاظت مانگو بے شک اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

مزدلفہ میں قیام

فَاِذَا اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ (البقرہ ۲:۱۹۸) پھر جب تم عرفات سے واپس لوٹو تو مشعر الحرام (مزدلفہ) کے پاس اللہ کا ذکر کرو اور اسے یاد کرو اور ایسے یاد کرو جیسے اس نے تمہیں ہدایت دی اور گو اس سے پہلے تم یقیناً ناواقفوں میں سے تھے۔

منیٰ میں قربانی

حاجی ۱۰ ذی الحجہ کی صبح کو منیٰ میں پہنچ جائے۔ جمرۃ العقبہ کو سات بار کنکریاں مارے۔ ہر کنکری مارتے وقت اللہ اکبر کہے۔ پہلی کنکری کے ساتھ ہی تلبیہ ختم کر دے۔ کنکریاں مارنے کے بعد قربانی کی جائے۔ پھر سر منڈا لیا جائے۔ پھر حاجی حالت احرام سے نکل آتا ہے۔ قربانی سے پہلے حجامت بنوانا جائز نہیں ہے ارشاد الٰہی ہے: حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ (البقرہ ۲:۱۹۶) اور اپنے سروں کو نہ منڈواؤ یہاں تک کہ قربانی اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائے۔

معذور فدیہ دے

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ (البقرہ ۲:۱۹۶) پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو اس کا فدیہ روزوں سے یا

صدقہ سے یا قربانی سے دے۔

حالت احرام میں شکار

حالت احرام میں شکار حرام ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ (المائدہ ۵:۹۵) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو شکار نہ مارو جب تم حالت احرام میں ہو۔

آدابِ حج

ظاہری آداب

۱۔ زادِ راہ حلال اور طیب کمائی سے ہو۔

۲۔ حج کرنے والے کی مالی حالت اچھی ہو کہ جب وہ حج کے لیے نکلے تو اپنے پیچھے اہل وعیال کے لیے اتنا چھوڑ جائے کہ وہ اس کی عدم موجودگی میں آسانی سے گزارا کر سکیں۔

۳۔ ایام حج میں لڑائی جھگڑا، فسق وفجور سے اجتناب کرنا چاہیے۔

۴۔ گھر سے جب حاجی حج کے لیے نکلے تو سادہ لباس میں نکلے۔

۵۔ حج کے سفر میں نیک آدمی کی مصاحبت اختیار کی جائے، تا کہ نیک آدمی کی صحبت سے روحانی قوتوں میں جلا پیدا ہو۔

باطنی آداب

۱۔ ایام حج میں کثرت سے دعائیں کی جائیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کیا جائے کہ جس طرح حاجی کسی جانور کی قربانی دے رہا ہے اسی طرح وہ اپنے نفس امارہ کی سرکش اونٹنی کو ذبح کر دے گا۔

۳۔ حج دنیاوی اغراض ومقاصد سے نہ ہو، بلکہ جذبہ عشق کے تحت ہو۔

۴۔ حج خالص توحید کا سبق دیتا ہے۔ اس وجہ سے حاجی کو اپنے دل سے تمام دنیاوی سہاروں کو بت توڑ دینے چاہئیں اور حاجی کی روح ہمیشہ آستانہ الوہیت پر گری رہے اور اسی سے اعانت طلب کرے۔

فلسفۂ حج

حج عشق الٰہی کا عملی اظہار ہے

عشق اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ محب اپنے محبوب کی رضا کی خاطر جان ومال، آرام اور اعزہ واقارب اور گھر بار قربان کرنے کے لیے تیار کھڑا رہے۔ جتنا عشق کامل ہوگا اتنا ہی قربانی کا ولولہ اور جذبہ زیادہ

ہوگا۔ پھر جتنا محبوب کامل ہوگا اتنا ہی عشق کامل ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کے عشق کے عملی اظہار کے لیے چند ایک عبادات مقرر کردی ہیں۔ان میں سے ایک عبادت حج کی ہے۔

حج کے ایام میں ایک فرمانبردار بندہ گھربار، اعزہ واقارب کو الوداع کہتا ہے، اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی ہوئی پونجی سے زادراہ لے کر مکہ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ جب میقات پر پہنچتا ہے تو تمام حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام قرار دیتے ہوئے دو چادریں پہن لیتا ہے۔ لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کی صدائیں بلند کرنا شروع کر دیتا ہے مکہ پہنچ کر والہانہ عشق میں بیت اللہ کا طواف کرتا ہے، کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں سچے عشق والوں کو دیدار الٰہی ہوا تھا۔ حجر اسود کو بوسہ دیتا ہے۔ صفا مروہ پہاڑیوں کے درمیان دوڑتا پھرتا ہے اور حضرت ہاجرہ کی قربانی کی یاد دل میں تازہ کرتا ہے۔ منیٰ، عرفات اور مزدلفہ کے میدانوں میں دیدار الٰہی کے لیے عبادت میں مشغول رہتا ہے۔

حج شفقت مخلوق کی تعلیم دیتا ہے

عشق الٰہی اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک اس کی مخلوق سے محبت نہ کی جائے۔ حج مخلوق الٰہی سے محبت کرنے کا سبق دیتا ہے احرام باندھنے کے بعد حاجی کسی سے لڑ نہیں سکتا۔ نہ کسی کو گالی دے سکتا ہے۔ نہ کسی کی طرف بدنظر سے دیکھ سکتا ہے نہ کسی کی گری ہوئی چیز اٹھا سکتا ہے۔ یہ تمام باتیں مخلوق الٰہی سے شفقت اور محبت کرنے کا سبق دیتی ہیں۔

حج سادگی سے زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے

حج میں میقات پر حاجی کو احرام باندھنے کا حکم ہے۔ احرام صرف بغیر سلی دو چادریں ہوتی ہیں۔ اس احرام کی جہاں اور بے شمار حکمتیں ہیں۔ وہاں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان کو سادہ زندگی بسر کرنا چاہیے۔ جب ایک صاحب ثروت اس فلسفہ پر عمل کرتے ہوئے سادگی اختیار کر لیتا ہے تو معاشرہ میں طبقاتی تفریق ختم ہو جاتی ہے اور جذبہ اخوت اجاگر ہوتا ہے۔

حج کسب حلال کی تعلیم دیتا ہے

حج بنی نوع انسان کو کسب حلال اور حکم الٰہی کے تحت خرچ کرنے کی تعلیم دیتا ہے کیونکہ حج کے مصارف کسب حلال سے پورے کرنے ضروری ہیں۔

حج عالمگیر اتحاد ملی کا ذریعہ ہے

حج تمام مسلمانوں کو اتحاد اور اخوت کی لڑی میں پرونے کا بہترین ذریعہ ہے، جس سے مسلمانوں کی سیاسی قوت بڑھ سکتی ہے۔ ایک دوسرے کے مسائل سمجھنے اور ان کو حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دیا ہے۔ اگر حج کے ایام میں اتحاد

ملی کے لیے کانفرنس منعقد کی جائیں تو حج کی غرض و غایت پوری ہو جائے گی اور تمام اسلامی ممالک اتحاد و اخوت کی سلک میں منسلک ہو جائیں گے اور اپنے دشمنوں کے مقابل بنیان مرصوص بن جائیں گے۔

حج مساوات کی تعلیم دیتا ہے

حج مساوات کا بہترین عملی سبق ہے دنیا کے چاروں کونوں سے مسلمان ایک لباس میں ملبوس ہو کر مکہ میں جمع ہوتے ہیں۔ گورے کالے کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ غریب اور امیر کی تقسیم ختم ہو جاتی ہے۔ ہر طبقہ کے لوگ بغیر کسی امتیاز کے مناسک حج ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حج کے موقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اخوت اور مساوات کا مشہور خطبہ دیا تھا کہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں، نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت ہے، نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کسی کالے کو گورے پر فضیلت ہے۔ ہاں اگر کسی کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہے تو وہ صرف تقویٰ کی وجہ سے ہے۔

حج اقتصادی ترقی کا ذریعہ ہے

اسلام نے ایام حج میں تجارت کرنے سے منع نہیں کیا بلکہ قرآن مجید میں آیا ہے: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِنْ رَبِّكُمْ (سورۃ البقرہ ۲:۱۹۸) تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے رب سے فضل کی تلاش کرو۔

مکہ ایام حج میں عالمگیر تجارتی منڈی بن جاتا ہے۔ ہر ملک کی صنعت اور تجارتی سامان منیٰ کی منڈی میں پہنچ جاتا ہے۔ حج کی ادائیگی کے بعد لوگ منیٰ جاتے ہیں، خرید و فروخت کرتے ہیں۔ اس تجارت سے صرف اہل مکہ کو ہی فائدہ نہیں بلکہ تمام اسلامی ممالک کو بھی ہے، کیونکہ ہر ملک کی صنعت سے لوگ روشناس ہو جاتے ہیں۔

جہاد

جہاد کے معنی

لفظ جہاد جَہد یا جُہد سے مشتق ہے۔ جَهَدَ یا جَاهَدَ کے معنی ہیں: ایک شخص نے کوشش کی، محنت کی، یا لیاقت خرچ کی جاهد فی الامر کے معنی ہیں: اس نے خوب سعی کی، اپنی لیاقت اور طاقت سے پورا کام کیا۔ جہاداً حاصل مصدر ہے، یعنی مشقت محنت، تکلیف:

جوہری اپنی صحاح میں لکھتا ہے: جَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ تَجْهَادَةً وَجِهَادًا اور نیز اجتهد اور جَاهَدَ کے معنی ہیں: اس نے خوب زور لگایا اور جفاکشی کی۔

امام راغب جہاد اور مجاہدہ کے معنی دشمن اور دفاع کے لیے طاقت خرچ کرنا لکھتا ہے۔ پھر بیان

کرتا ہے، جہاد تین قسم پر مشتمل ہے۔ ۱۔ کھلے دشمن کے خلاف ۔۲۔ شیطان کے خلاف ۔۳۔ نفس کے خلاف۔

قرآن مجید اور احادیث میں بھی انہی معنی میں لفظ جہاد استعمال ہوا ہے۔

جہاد کا لفظ جنگ کے مترادف نہیں

مستشرقین اور بعض مسلمان علماء جہاد کے معنی صرف کفار کے ساتھ جنگ کرنے کے لیتے ہیں۔ جیسا کہ جہاد کی لغوی بحث سے یہ واضح ہوتا ہے۔ جہاد کا لفظ نہ قرآن مجید میں، نہ حدیث میں اور نہ لغت میں صرف جنگ کے معنی میں استعمال ہوا ہے بلکہ جنگ کے لیے عربی زبان میں حرب وقتال کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

عرب استعارہ اور تشبیہ کے طور پر یہ الفاظ روع (فزع وخوف) شر (اصل معنی بدی کے ہیں) ھیاج (برانگیختگی) مغضبة (غصہ و ناراضی) لڑائی کے معنی میں استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح جنگ کو چکی سے بھی تشبیہ دی ہے۔ اذا ادارت رحی الحرب الزبون جب جنگ کی چکی چلتی ہے۔

اسلام نے کب جنگ کی اجازت دی

پہلا داعیہ: مدافعت

اسلام صرف مدافعت اور حفاظت خود اختیاری کے لیے لڑائی کی اجازت دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ (الحج ۲۲:۳۹) ان لوگوں کو اجازت دی گئی ہے جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا۔

دوسری جگہ قرآن مجید میں آتا ہے: وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (بقرہ ۲:۱۹۰) اور اللہ کے راستہ میں جنگ کرو ان لوگوں سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔

دوسرا داعیہ: نقض عہد

اسلام نے ان لوگوں سے جنگ کرنے کی اجازت دی ہے جو نقض عہد کرتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نقض عہد خرمن امن کو بھسم کر دیتی ہے اور دنیا میں اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک معاہدات کی پابندی نہ کی جائے۔ اس لیے اسلام نے معاہدات کی پابندی پر بہت زور دیا ہے اور اس قوم سے لڑنے کی اجازت دی ہے جو معاہدات کرنے کے بعد بار بار توڑتی ہے، پھر مسلمانوں کی بقاء کے لیے خطرہ کا موجب بنتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَلَّذِیْنَ عَاھَدْتَّ مِنْھُمْ ثُمَّ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَھُمْ فِیْ کُلِّ مَرَّۃٍ وَّھُمْ لَا یَتَّقُوْنَ (الانفال ۸:۵۶) وہ جن سے تو عہد کرتا ہے پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ عہد کے توڑنے

کے جرم سے نہیں بچتے۔

پھر فرمایا: فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْبِهِمْ مَنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّكُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (الانفال ۸:۵۷) سو اگر تو ان کو جنگ میں پائے تو ان کو عبرت ناک سزا دے کر منتشر کر دے تا کہ ان کی آنے والی نسلیں نصیحت حاصل کریں۔

تیسرا داعیہ: احترام انسانیت اور مظلوموں کی دست گیری

قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (نساء۴:۷۵) تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستہ میں جنگ نہیں کرتے اور کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کے لیے جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی دوست بنا اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی مددگار اور معاون بنا۔

چوتھا داعیہ: استعمار پسند حکومت کے خلاف جنگ

اگر کوئی حکومت ملک گیری کی ہوس میں امن کو خراب کرنے کی کوشش کرے تو اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اس استعماریت کے خلاف جنگ کرے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظَّالِمِيْنَ (بقرہ۲:۱۹۳) تم ان سے لڑتے رہو جہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے پھر اگر وہ باز آ جائیں تو ظالموں کے سوا دست درازی سے رک جاؤ۔

اسلامی جنگوں میں اخلاقی قدریں

اسلام سے قبل جنگوں میں انسانیت سوز افعال کا ارتکاب کیا جاتا تھا۔ اسلام نے ان تمام افعال کو یکسر موقوف کر دیا اور جنگی اصلاحات کی تعلیم دی۔

پہلی اصلاح

اسلام نے صرف مدافعت اور انسانیت کے احترام اور مظلوم کی حمایت میں جنگ کی اجازت دی۔

دوسری اصلاح

اسلام نے غیر مقاتلین کو قتل کرنے کی ممانعت کی ہے۔ چنانچہ ابوداؤد میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک فوج کو روانہ کرتے وقت فرمایا: اللہ کا نام لے کر اللہ کی مدد

سے اور اللہ کے رسول کی ملت پر قائم رہتے ہوئے چل پڑو۔ کسی بوڑھے ضعیف، چھوٹے بچے اور عورت کو قتل نہ کرنا، مالِ غنیمت میں سے چوری نہ کرنا، جنگ میں جو کچھ ہاتھ آئے ایک جگہ جمع کرنا، صلح کی روش اختیار کرنا، احسان کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والے کو پسند کرتا ہے۔

تیسری اصلاح

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غفلت یا نیند کی حالت میں حملہ کرنے سے احتراز فرماتے تھے۔
حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیبر پر چڑھائی کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کے وقت وہاں پہنچے اور آپ کا یہ دستور تھا کہ جب کسی محارب قوم پر رات کے وقت پہنچتے تو آپ حملہ نہ کرتے جب تک صبح نہ ہو جاتی۔
لیکن اگر دشمن قوم کے ساتھ جنگ جاری ہے تو ایسی صورت میں رات کے وقت حملہ کرنا جائز ہے۔

چوتھی اصلاح

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غصب ونہب کی ممانعت فرمائی ہے۔ حضرت عبداللہ بن زید انصاریؓ سے روایت ہے: نهى النبى صلى الله عليه وسلم عن النهبى و المثلة (بخاری) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوٹ مار اور مثلہ سے منع فرمایا ہے۔

پانچویں اصلاح

اسلام نے تباہ کاری اور فساد برپا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَاداً وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (قصص ۲۸:۸۳) ہم آخرت کا گھر جنت میں ان لوگوں کے لیے مخصوص کریں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں نیک انجام متقیوں کے لیے ہے۔

چھٹی اصلاح

اسلام نے مال غنیمت میں سے خیانت کی ممانعت کی ہے قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَنْ يَغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (آل عمران ۳:۱۶۱) اور جو کوئی مالِ غنیمت میں خیانت کا مرتکب ہوگا وہ جو کچھ اس نے خیانت کی ہے قیامت کے دن لائے گا۔

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَغُلُّوْا فَاِنَّ الْغُلُوْلَ نَارٌ وَعَارٌ عَلٰى اَصْحَابِهٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (احمد) یعنی مال غنیمت میں خیانت نہ کرو کیونکہ خیانت دنیا کے اندر اور آخرت میں مرتکبین کے لیے عذاب اور شرمندگی کا باعث ہے۔

ساتویں اصلاح

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفراء اور قاصدوں کے قتل سے منع فرمایا چنانچہ مسیلمہ کذاب کے دو قاصد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا:

اما واللّٰه لولا ان الرُّسُلَ لا تُقتَلُ لَضَرَبْتُ اعناقكما (ابو داؤد۔ احمد) اللہ کی قسم اگر قاصدوں کا قتل ممنوع نہ ہوتا تو میں تمہاری گردن الگ کر دیتا۔

آٹھویں اصلاح

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سپاہیوں کو ہر قسم کی بدنظمی اور سرکشی کی ممانعت فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: من ضيق منزلا او قطع طريقا فلا جهاد له یعنی جو کوئی راستے کے لوگوں کو تنگ کرے یا راستے میں لوٹ مار کرے تو اس کا کوئی جہاد نہیں۔

نویں اصلاح

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاہدات کو دنیاوی منفعت کے لیے توڑنے سے منع فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: من كان بينه و بين قوم عهد فلا يحلن عقده حتى ينقض امرة او ينبذ اليهم على سواء (ابوداؤد۔ ترمذی) کہ جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو وہ اس وقت تک معاہدے کا بندھن نہ کھولے جب تک اس کی مدت نہ گزر جائے یا وہ برابر کا لحاظ کر کے اس قوم کی طرف پھینک دے۔

مطلب یہ ہے کہ معاہد قوم کو صاف طور پر اطلاع دے دی جائے کہ ان کے معاندانہ رویہ اور امن سوز حرکات کی وجہ سے معاہدہ کو فسخ کیا جاتا ہے۔

دسویں اصلاح

اسلام نے اسیروں سے حسن سلوک کی تعلیم دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فَاِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰى اِذَا اَثْخَنْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (محمد ۴:۴۷) پس جب کافروں سے مٹھ بھیڑ ہو تو پہلے گردنیں مارنا ہے یہاں تک کہ تم ان پر غالب آ جاؤ پھر قید کے بندھن مضبوط کرو اس کے بعد تمہیں اختیار ہے یا تو احسان کے طور پر یا فدیہ لے کر چھوڑ دو یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔

جنگ مریسیع میں بنی مصطلق کے ایک سو خاندان پکڑے گئے، ان سب کو فدیہ لیے بغیر رہا کر دیا گیا۔

جہاد بالقول (تبلیغ)

جہاد بالسیف کے علاوہ جہاد کی اور بھی اقسام ہیں۔ ان میں سے تبلیغ جہاد کی ایک اعلیٰ قسم ہے۔ مسلم

ہتھیاروں کے ذریعہ اگر دشمن کے حملوں کا دفاع کیا جاتا ہے اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت کی جاتی ہے تو تبلیغ کے ذریعہ اسلام کی سچائی اور حقانیت واضح کی جاتی ہے اور معترضین کے اعتراضات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ جتنا جہاد بالسیف ضروری ہے اتنی ہی تبلیغ ضروری ہے۔

تبلیغ کی اہمیت از روئے قرآن مجید

قرآن مجید میں آتا ہے: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (یوسف ۱۲:۱۰۸) یعنی کہہ دے یہ میرا راستہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر میں اور جو میری پیروی کرتے ہیں اور اللہ پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ دعوت الی اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا راستہ ہے جو شخص اس کام کو فرض منصبی نہیں سمجھتا۔ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستہ سے ہٹا ہوا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران ۳:۱۱۰) تم سب سے اچھی امت ہو جو لوگوں کی بھلائی اور بہبودی کے لیے پیدا کی گئی ہو تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۳:۱۰۴) اور چاہیے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو جو بھلائی کی طرف بلائے اور نیکی کے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
جب میری امت دنیا کی عظمت میں کھو جائے گی تو اسلام کی ہیبت ان کے قلوب سے نکل جائے گی اور جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کر دے گی تو وحی کی برکات سے محروم ہو جائے گی۔ جب ایک دوسرے کو سب وشتم کرنا شروع کر دے گی تو اللہ کی نگاہ سے گر جائے گی۔

جہاد بالمال

مالی جہاد قوم کی ترقی، استحکام اور عزت کا باعث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے انفاق سبیل اللہ پر بہت زور دیا ہے۔ جہاں نماز، جو روحانی ترقی کا زینہ ہے، کا ذکر کیا ہے، وہاں انفاق کا ذکر کیا ہے جو قوم کی بہبودی اور ملک کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ صلوٰۃ (نماز) اور انفاق فی سبیل اللہ کو اکٹھا لا کر مسلمانوں کو یہ سبق دیا ہے کہ روح کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ مادی ترقی کی طرف قدم بڑھانا بھی ضروری ہے۔ قرآن مجید میں مالی جہاد کے متعلق ارشاد الٰہی ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحجرات ۴۹:۱۵) حقیقت میں وہی لوگ

مومن ہیں جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لاتے ہیں۔ پھر وہ شک نہیں کرتے بلکہ اس کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں یہی لوگ اپنے دعویٰ میں سچے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں ایمان کی عملی صورت مال اور جان سے جہاد کرنا بتایا ہے اور مالی جہاد کو جانی جہاد پر مقدم کیا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران ۳:۹۲) یعنی تم ہرگز نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک تم اپنی محبوب ترین چیز خرچ نہ کرو۔

پھر ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے: فَضَّلَ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (النساء ۴:۹۵) یعنی اللہ نے مال اور جان سے جہاد کرنے والوں کو گھر میں بیٹھے رہنے والوں پر درجات میں فضیلت دی ہے اور اللہ نے سب سے نیکی کا وعدہ کیا ہے۔

پھر ارشاد الٰہی ہے: وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الحدید ۵۷:۱۰) یعنی تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ آسمان اور زمین اللہ کی میراث ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے: عَنْ خُرَيْمِ بْنِ فَاتِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَنْفَقَ نَفَقَةً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كُتِبَ لَهٗ بِسَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ (ترمذی۔نسائی) خریم بن فاتک سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ کی راہ میں کچھ مال خرچ کرتا ہے تو اللہ کی طرف سے اس کے لیے سات سو گنا اجر لکھا ہوا ہے۔

جہاد بالنفس

جہاد بالنفس سے مراد نفس امارہ کی سرکوبی اور شیطانی قوتوں کو دبانا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ. (العنکبوت ۲۹:۶) اور جو کوئی جہاد کرتا ہے وہ اپنے نفس کے لیے جہاد کرتا ہے اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاد بالنفس کو جہاد اکبر قرار دیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ صحابہ جب لڑائی سے آ رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تمہارا آنا مبارک۔ تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو، کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہوائے نفس سے لڑنا ہے۔[1]

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کے لیے اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرو۔''

ایک اور حدیث ہے: ''مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔'' (ترمذی)

[1] تاریخ خطیب بغدادی بحوالہ سیرۃ النبی از مولانا سلیمان ندوی۔

اسلام کا نظام اخلاق

اخلاق خُلق کی جمع ہے۔ عربی زبان میں ''الفاظ خَلق'' خُلق ہیں۔ دونوں کے معنی پیدائش کے ہیں، لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ خَلق ظاہری پیدائش پر بولا جاتا ہے اور خُلق باطنی پیدائش پر۔

علماء نے خُلق کی بے شمار تعریفیں کی ہیں۔ سب سے عمدہ تعریف یہ ہے کہ اخلاق فاضلہ وہ اعمال ہیں جو خدا کی صفات مختلفہ کی مقتضیات ہوں اور جو افعال صفات الٰہیہ کی مقتضیات کے برعکس ہوں گے ان کو اخلاق رذیلہ یا سیئات کہا جائے گا جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے:

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (البقرہ ۱۳۸) یعنی اللہ کا رنگ اختیار کرو اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا رنگ اس کی صفات حسنیٰ ہیں۔ اس آیت کریمہ میں یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات مختلفہ کی مقتضیات کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے۔

ایمان اور اخلاق فاضلہ

قرآن مجید نے بے شمار مقامات پر ایمان اور عمل صالح (اخلاق فاضلہ یا حسنات) کو اکٹھا بیان کیا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ ۲:۶۲) جو اللہ اور آخری دن پر ایمان لائیں اور نیک کام بجالائیں پس ان کے لیے ان کے پاس اجر ہے ان کو نہ کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (البقرہ ۲:۸۲) اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ بجالائے وہی لوگ جنت کے وارث ہوں گے اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ ایمان اور اعمال صالح (اخلاق فاضلہ) لازم وملزوم ہیں۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے سے ہی انسان کے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے جو انسان کو برائیوں سے روکتا اور نیکی کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

عبادات اور اخلاقِ فاضلہ

قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی عبادات بجالانے کا ذکر آتا ہے۔ وہاں ان عبادات کی غرض و غایت ہی اخلاق بیان فرمائی ہے۔ نماز کا فلسفہ یہ بیان کیا ہے کہ بری باتوں سے روکتی ہے۔ روزہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے اور زکوٰۃ کا مقصد بنی نوع انسان سے شفقت اور ہمدردی کرنا ہے۔ حج کے بے شمار مقاصد میں سے ایک مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی سرکش اونٹنی کو رضاء الٰہی کے حصول کے لیے ذبح کر دے۔ جو انسان اپنے سرکش نفس پر قابو پالیتا ہے وہ سالکوں کے راستہ پر تیزی سے گامزن ہو جاتا ہے اور خدا کا قرب حاصل کر لیتا ہے۔

اخلاقِ فاضلہ کی اہمیت از روئے قرآن مجید وحدیث

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی غرض بیان کرتے ہوئے فرمایا: هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ (سورۃ جمعہ ۶۲:۲) اللہ وہ ذات ہے جس نے اَن پڑھ لوگوں میں اپنا رسول بھیجا جو انہی میں سے ہے وہ ان کے سامنے اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو گناہوں کی میل سے پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب کی تعلیم دیتا ہے اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰهَا وَقَدْخَابَ مَنْ دَسّٰهَا (سورۃ الشمس ۹۱:۹،۱۰) کامیاب ہو گیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو پاک کیا اور ناکام و نامراد ہو گیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو گناہوں کی میل سے ملوث کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اخلاق حسنہ پر بہت زور دیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

۱۔ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ (کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۵) میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کروں۔

۲۔ اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا (ترمذی) مومنوں میں سے ایمان کے لحاظ سے کامل وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔

۳۔ اِنَّ مِنْ خِیَارِکُمْ اَحْسَنَکُمْ اَخْلَاقًا (بخاری) تم میں سے سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔

۴۔ مَامِنْ شَیْءٍ یُوْضَعُ فِی الْمِیْزَانِ اَثْقَلُ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ (ابوداؤد و ترمذی) قیامت کے دن عدل کے ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی۔

۵۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَحَبِّکُمْ اَحْسَنُکُمْ اَخْلَاقًا (بخاری) اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

اخلاق فاضلہ کی اقسام

اخلاق حسنہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اخلاق قلب ۲۔ اخلاق جوارح

اخلاق جوارح کی پھر دو قسمیں ہیں: ۱۔ اخلاق حسنہ ۲۔ اخلاق شنیعہ۔

اخلاق قلب

اسلام کے نزدیک اخلاق صرف ظاہری اعمال سے ہی تعلق نہیں رکھتے بلکہ ان کا تعلق دل سے شروع ہوتا ہے کیونکہ اعمال کا سرچشمہ دل ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (الانعام ۶:۱۵۱) اور بے حیائی کی باتوں کے قریب مت جاؤ جو ان میں سے ظاہر ہوں اور جو چھپی ہوئی ہوں۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اخلاق کا تعلق صرف ظاہری اعمال سے ہی نہیں بلکہ ان اعمال سے بھی ہے جن کا مرتکب دل ہوتا ہے، گو ان کو معلوم کرنے کا طریقہ لوگوں کے پاس نہیں ہے چونکہ اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہستی ہے جو دلوں کے بھیدوں کو جانتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ انسان کے دل میں کیا کیا خیالات موجزن ہیں اور وہ کیا کیا برائیاں اپنے دل کے پردوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔

دوسری جگہ اس مضمون کو اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ (بقرہ ۲:۲۸۴) اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے یا اسے چھپاؤ اللہ اس کا تم سے حساب لے گا۔

پھر ارشاد الٰہی ہے: وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ (۲:۲۲۵) اور لیکن اللہ تعالیٰ مواخذہ کرے گا جو تمھارے دلوں نے کمایا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ یعنی اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

اگر ایک انسان عمدہ کام کرتا ہے، لیکن اس کی نیت خراب ہے تو وہ اس عمل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل مواخذہ ہے۔ یہ حدیث ظاہر کرتی ہے کہ کسی عمل کی اچھائی یا برائی کا فتویٰ دل کے خیال پر مبنی ہے۔ اگر خیال اچھا ہے اور عمل بھی اچھا ہے تو اس عمل پر اجر مرتب ہو جائے گا۔ اگر خیال برا ہے، خواہ عمل اچھا ہی ہو تو اس پر اجر مرتب نہیں ہوگا بلکہ وہ عمل قابل مواخذہ ہوگا۔

ایک اور حدیث ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ (بخاری ومسلم) یقیناً جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے خبردار وہ دل ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی (سورۃ الاعلیٰ ۸۷:۱۴) جس نے نفس و دل کو پاک کیا وہ کامیاب ہو گیا۔

اسی مضمون کو دوسری جگہ بیان کیا: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا (سورہ شمس ۹۱:۹) یقیناً بامراد ہوا وہ شخص جس نے اپنے دل کو پاک کیا۔

جو لوگ دل کی پاکیزگی کی طرف توجہ نہیں دیتے ان کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یقیناً ناکام ہو گئے، وہ لوگ جنھوں نے اپنے دل کو گناہوں کی میل سے ناپاک کیا۔ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا اس بارہ میں ایک استثناء بھی ہے، وہ یہ کہ اگر کسی کے دل میں ایک آن برا خیال آتا ہے لیکن وہ اس کو دبا جاتا ہے، وہ خیال قابل مواخذہ نہیں ہوگا بلکہ قابل تعریف ہوگا اور وہ شخص اجر کا مستحق ہوگا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: مَنْ ھَمَّ بِسَیِّئَۃٍ فَلَمْ یَعْمَلْھَا کَتَبَ اللّٰہُ عِنْدَہٗ حَسَنَۃً کَامِلَۃً (بخاری) اگر کسی شخص کے دل میں برا خیال پیدا ہوتا ہے اور اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہناتا بلکہ دل میں ہی دبا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک پوری نیکی لکھ دے گا۔

برے خیالات اس وقت قابل مواخذہ ہوتے ہیں جب انسان ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا راستہ تلاش کرتا رہتا ہے۔ گو وہ برا خیال عمل کے لباس میں ظاہر نہ ہی ہوا ہو، لیکن اللہ کے نزدیک وہ برا خیال بداخلاقی میں شمار ہوگا۔

تصوف کا زیادہ دار و مدار قلب کی طہارت پر ہے وہ دل کی پاکیزگی کو دوسرے اخلاق جوارح کی بنیاد گردانتے ہیں۔

اخلاق حسنہ

اخلاق حسنہ میں وہ تمام اعمال شامل ہیں جن کے ذریعے انسان کوشش کرتا ہے کہ اس کے بھائی بندوں کو فائدہ پہنچے اور معاشرہ صحیح خطوط پر ترقی کرے۔

ا۔ صدق

صدق سب نیکیوں کی جڑ اور تمام بھلائیوں کی اصل ہے۔ اس وجہ سے قرآن مجید اور احادیث میں صدق پر بہت زور دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

ھٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُھُمْ (مائدہ ۵:۱۱۹) یہ دن (قیامت) ہے کہ سچے بندوں کو ان کا سچ کام آئے گا۔

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ (احزاب ۳۳:۲۴) تاکہ اللہ سچا اترنے والوں کو ان کی سچائی کا بدلہ دے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (توبہ ۹:۱۱۹) اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کا خوف رکھو اور سچوں کے ساتھ رہو۔

حدیث شریف میں آتا ہے: ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھ میں چار بری خصلتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بدکار ہوں، دوسری یہ کہ چوری کرتا ہوں، تیسری یہ کہ شراب پیتا ہوں، چوتھی یہ کہ جھوٹ بولتا ہوں۔ ان میں سے جس ایک کو فرمایئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاطر چھوڑ دوں۔ ارشاد ہوا کہ جھوٹ نہ بولا کرو۔ چنانچہ اس نے عہد کیا۔ اب جب رات ہوئی تو شراب پینے کو اس کا جی چاہا اور پھر بدکاری کے لیے آمادہ ہوا تو اس کو خیال گزرا کہ صبح کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پوچھیں گے کہ رات تم نے شراب پی اور بدکاری کی؟ تو کیا جواب دوں گا۔ اگر ہاں کہوں تو شراب اور زنا کی سزا دی جائے گی، اگر نہیں کہوں تو عہد کے خلاف ہوگا۔ یہ سوچ کر ان دونوں سے باز رہا۔ جب رات گزری اور اندھیرا خوب چھا گیا تو چوری کے لیے گھر سے نکلنا چاہا، لیکن پھر اسی خیال نے اس کا دامن تھام لیا کہ کل پوچھ گچھ ہوئی تو کیا کہوں گا۔ ہاں کروں گا تو ہاتھ کٹے گا اور نہیں کرتا تو بدعہدی ہوتی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس جرم سے بھی باز آیا۔ صبح ہوئی تو وہ دوڑ کر خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جھوٹ نہ بولنے سے میری چاروں بری خصلتیں مجھ سے چھوٹ گئیں۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسرور ہوئے[1]۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سچائی کو اپنے اوپر لازم کرو کیونکہ سچائی نیکی کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی ہمیشہ سچ بولتا اور سچ بولنے کی کوشش کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ خدا کے نزدیک صدیق لکھا جاتا ہے اور جھوٹ سے بچو، کیونکہ جھوٹ فسق و فجور کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور فسق و فجور جہنم کی طرف لے جاتا ہے اور انسان ہمیشہ جھوٹ بولتا اور جھوٹ بولنے کی کوشش کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ خدا کے نزدیک کذاب لکھا جاتا ہے۔ (صحیحین)

۲۔ صبر

صبر کے لغوی معنی ہیں رکنا۔ اصطلاح میں صبر کو اس لیے صبر کہا جاتا ہے کہ انسان دل کو گریہ وزاری سے، زبان کو شکوہ وگلا سے اور جوارح کو بے قراری اور اضطراب سے روک لیتا ہے۔

محقق دوانی لکھتے ہیں کہ صبر کے معنی ہیں خواہشات سے مقابلہ کرنا تاکہ ان کو رفع کر کے لذات

[1] بحوالہ سیرۃ النبی حصہ ششم ۲۶۱، ۲۶۲ مصنفہ سلیمان ندوی۔

قبیحہ کے استعمال سے باز رہے۔

قرآن مجید میں نوے مقامات پر صبر کا ذکر ہوا ہے۔ صبر کی توصیف میں چند ایک آیات درج کی جاتی ہیں:

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ۲:۴۵) صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔

اصْبِرُوا وَصَابِرُوا (آل عمران۳:۲۰۰) صبر رکھو اور آپس میں صبر کی تعلیم دو۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ (احقاف۴۶:۳۵) صبر کیجیے جیسا کہ صاحب عزم رسولوں نے صبر کیا اور ان کے لیے جلدی نہ کیجیے۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِينَ (آل عمران۳:۱۴۶) اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ محبت کرتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبر کی توصیف میں فرماتے ہیں:

۱۔ اَلصَّبْرُ رِدَائِی صبر میرا لباس ہے۔

۲۔ حضرت امام بخاری کتاب الادب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایمان کیا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَلصَّبْرُ مِفْتَاحُ الْفَرَجِ یعنی صبر اور سرچشمی۔

۳۔ اَلصَّبْرُ اَلسَّمَاحَةُ یعنی صبر کشائش کی چابی ہے۔

۴۔ اَلنَّصْرُ مَعَ الصَّبْرِ یعنی فتح صبر کے ساتھ ہے۔

صبر کی تین اقسام ہیں:

۱۔ طاعت الٰہی پر صبر۔

۲۔ معصیت الٰہی سے صبر۔

۳۔ امتحان الٰہی پر صبر۔

طاعت الٰہی پر صبر سے مراد یہ ہے کہ طاعت الٰہی پر دوام اختیار کیا جائے۔ معصیت الٰہی سے صبر سے مراد یہ ہے کہ اپنے نفس کو احکام ربانی کے توڑنے سے روکا جائے۔ امتحان الٰہی پر صبر سے مراد یہ ہے کہ تنگی، مصیبت اور لڑائیوں میں اپنے جوارح کو جزع وفزع کرنے سے روکا جائے۔

صبر کی تین حالتیں ہیں:

۱۔ صبر باللہ ۲۔ صبر لِلّٰہِ ۳۔ صبر مع اللہ۔

صبر باللہ سے مراد یہ ہے کہ صبر اللہ کے لیے ہو، جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللّٰهِ (نحل۱۶:۱۲۷) صبر کیجیے اور آپ کا صبر اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے ہو۔

صبر للہ سے مراد یہ ہے کہ صبر رضاء الٰہی اور تقرب الٰہی کے لیے ہو نہ کہ شہرت حاصل کرنے اور

قوت نفس کا اظہار کرنے کے لیے۔

صبر مع اللہ سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو احکام الٰہی کا مکمل طور پر مطیع و منقاد بنا دے۔

۳۔ حیاء

حیا وہ ملکہ اور قوت ہے جو انسان کو بھلائی کی طرف لے جاتی ہے اور برائیوں سے روکتی ہے۔ پس جس قدر انسان میں یہ ملکہ زیادہ ہوگا اتنا ہی اس سے زیادہ نیکیوں اور بھلائیوں کا صدور ہوگا۔ جتنا یہ ملکہ کمزور اور کم ہوگا اتنے ہی زیادہ اس سے اعمال قبیحہ سرزد ہوں گے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ ذَالِکُم كَانَ يُؤْذِی النَّبِیَّ فَيَسْتَحْیِ مِنْكُمْ (الاحزاب ۵۳:۳۳) یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف دیتی ہے مگر وہ تم سے حیاء کرتا ہے۔

ام المومنین حضرت زینبؓ کے نکاح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ لوگوں کو دعوت ولیمہ میں بلایا۔ دعوت کھانے کے بعد لوگ آپس میں باتوں میں مصروف ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تھے کہ لوگ اٹھ کر چلے جائیں، لیکن وہ وہیں بیٹھے رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حرکت ناگوار گزری، لیکن آپ شرم و مروت کی وجہ سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہ کر سکے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

۱۔ اَلْحَیاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْاِیْمَان حیاء ایمان کی شاخ ہے۔

۲۔ اَلْحَیاءُ لَایَاتِی اِلَّا بِخَیْرٍ حیاء نیکی کے علاوہ دوسری کوئی چیز نہیں لاتی۔

۳۔ عن ابن مسعود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال استحیوا من اللہ عزوجل حق الحیاء فقیل یارسول اللہ فکیف نستحی من اللہ عزوجل حق الحیاء قال من حفظ الراس وما حوی والبطن وما وعی و ترک زینة الحیوة الدنیا و ذکر الموت والبلی فقد استحیا من اللہ عزوجل حق الحیاء (ترمذی، احمد) ابن مسعود سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ سے حیاء کرو اس درجہ کا جو حیاء کا حق ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ہم اللہ سے حیاء کا حق کس طرح ادا کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا سر اور جو اس میں محفوظ ہے اور پیٹ اور جو اس میں محفوظ ہے۔ ان کی حفاظت کے ذریعہ، دنیاوی زینت کے ترک کرنے اور موت اور بدن کے گل سڑ جانے کی یاد کے ذریعہ سے حیاء کا پورا حق اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں ادا ہوتا ہے۔

عملی اعتبار سے حیاء کے تین شعبے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ سے حیاء۔

۲۔ لوگوں سے حیاء۔

۳۔ اپنے نفس سے حیاء۔

اللہ تعالیٰ سے حیاء کا مطلب یہ ہے کہ احکام ربانی کو نہ توڑے۔ لوگوں سے حیاء کا یہ مطلب ہے کہ حقوق العباد کو ادا کرے۔ اور اپنے نفس سے حیاء کا یہ مطلب ہے کہ حقوق النفس ادا کرے۔

۴۔ احسان

احسان حسن سے مشتق ہے جس کے معنی خوبی اور رعنائی کے ہیں۔ اسلام میں لفظ احسان حقوق اللہ اور حقوق العباد کو نہایت ہی خوبصورتی اور رعنائی کے ساتھ ادا کرنے پر بولا گیا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احسان کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا: اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ (مسلم) احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت کرے گویا تو اسے دیکھتا ہے، اگر تو نہیں اسے دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

اس حدیث میں عبادت کے معنی ہیں احسان کو استعمال کیا گیا۔ اسلام میں عبادت صرف نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ادا کرنے کا نام ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے کامل فرمانبرداری کرنے کا نام ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ (النساء ۴:۱۲۵) اس سے زیادہ خوبصورت دین کس کا ہوگا جس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا اور وہی محسن ہے۔

اس آیت میں اسلام کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے والے کو محسن کہا گیا ہے۔

جب یہ لفظ انسانوں کے لیے استعمال ہوگا تو اس سے مراد ہر وہ نیکی ہے جو ایک انسان کرتا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى (نحل ۱۶:۹۰) اللہ انصاف کا اور احسان کرنے کا اور قریبی رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

۲۔ وَاَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (قصص ۲۸:۷۷) اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی دوسروں کے ساتھ احسان کر۔

۳۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (توبہ ۹:۱۲۰) بے شک خدا احسان کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

احادیث میں احسان کی توصیف میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات بے شمار ہیں، چند ایک حدیثیں رقم کی جاتی ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شے پر احسان کرنا فرض کیا ہے۔ اگر تمھیں کسی کو (شرعی حکم کے سبب سے) جان سے مارنا بھی پڑے تو اس کو بھی اچھائی کے ساتھ مارو۔ کسی جانور کو ذبح کرنا چاہو تو بھی اچھائی اور

خوبی کے ساتھ ذبح کرو۔ چھری کو خوب تیز کر لیا کرو اور اپنے ذبیحہ کو راحت پہنچاؤ۔[1]

۲۔ ایسے نہ ہو کہ خود تمہاری گرہ میں عقل نہ ہو، صرف دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرو۔ کہتے ہو کہ اگر لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں تو ہم بھی کریں گے۔ بلکہ اپنے آپ کو اس پر مطمئن کر لو کہ اگر دوسرے احسان کریں تو تم احسان کرو گے ہی اور اگر وہ برائی بھی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔[2]

احسان کے تقاضے

بعض لوگوں کی یہ عادت ہے کہ جب کسی پر احسان کرتے ہیں تو بعد میں اس کو جتاتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو سخت ناپسندیدگی سے دیکھا ہے۔ اسلام کا یہ منشاء ہے کہ انسان دوسروں کے ساتھ نیکی محض رضائے الٰہی کے لیے کرے۔

۱۔ احسان جتانا نہیں چاہیے

قرآن مجید میں آتا ہے: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (بقرہ ۲:۲۶۴) اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر باطل نہ کرو اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتا سو اس کی مثال اس صاف چٹان کی سی ہے جس پر مٹی ہو پھر اس پر زور کا مینہ برسے اور اسے بالکل صاف کر کے چھوڑ دے اس میں سے کچھ بھی نہ پا سکیں گے جو کمایا تھا اور اللہ کافر لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔ اس آیت میں احسان کے تین تقاضے بیان کیے ہیں:

۱۔ احسان جتانا نہیں چاہیے۔ ۲۔ تکلیف نہیں دینی چاہیے۔ ۳۔ احسان دکھاوے کے لیے نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس سے مقصود محض رضائے الٰہی ہو۔

۲۔ زیادہ معاوضہ کی نیت سے احسان نہیں کرنا چاہیے

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (المدثر ۷۴:۶) اور کسی کو اس غرض سے مت دو کہ دوسرے وقت زیادہ معاوضہ چاہو۔

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ احسان زیادہ معاوضہ کی نیت سے نہیں کرنا چاہیے بلکہ نیکی اور بھلائی خلوص نیت اور رضائے الٰہی کے واسطے ہو۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب الصید والذبائح۔ [2] جامع ترمذی باب ماجاء فی الاحسان والعفو۔

۳۔ بلا درخواست احسان کرنا چاہیے

قرآن مجید میں آتا ہے: وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ (طٰہٰ ۲۰: ۳۶،۳۷) اور یقیناً ہم نے تجھ پر ایک بار (پہلے بھی) احسان کیا جب ہم نے تیری ماں کی طرف وحی کی جو (اب) وحی کی جاتی ہے۔

اس آیت کریمہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس پر اس کی خواہش اور درخواست کے بغیر احسان کیا گیا ہے۔ اس میں بنی نوع انسان کو یہ تعلیم دی ہے احسان بلا درخواست ہی کرنا چاہیے۔

۴۔ احسان صرف اپنوں اور دوستوں پر نہیں ہونا چاہیے بلکہ بے مروت اور دشمنوں کے ساتھ بھی ہونا چاہیے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک شخص نے کہا: "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایک شخص کے پاس سے گزرتا ہوں تو وہ میری مہمانی نہیں کرتا، جب وہ میرے پاس آئے تو میں بھی اس کی کج خلقی کا بدلہ یہی دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "نہیں، تم اس کی مہمانی کرو۔" (جامع ترمذی)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنا ایک نمونہ ہے کہ فتح مکہ کے دن ان تمام مخالفین کو معاف کر دیا جن کے ظلم وستم سے بے کس و بے بس اور نہتے مسلمانوں کا خون زمین پر گرا۔ اس سے بڑھ کر احسان کرنے کی مثال دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اسلام نے اگر احسان کرنے والوں پر کچھ اخلاقی پابندیاں عائد کی ہیں جن کا پورا کرنا ضروری ہے تو دوسری طرف ان لوگوں پر بھی کچھ پابندیاں عائد کر دی ہیں جن پر احسان کیا جاتا ہے۔

ا۔ احسان یاد رکھنے کا حکم

قرآن مجید میں آتا ہے: يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ (البقرہ ۲: ۴۰) اے بنی اسرائیل میری نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمھیں عطا کی اور میرے عہد کو پورا کرو میں تمھارے عہد کو پورا کروں گا اور مجھ سے ہی ڈرو۔

۲۔ محسن کا احسان ماننا

قرآن مجید میں آتا ہے: وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ (یوسف ۱۲: ۲۳) (حضرت یوسف علیہ السلام) جس کے گھر میں تھا اس نے اسے اپنے ارادہ سے پھیرنا چاہا اور دروازے بند کر

لیے اور کہا ادھر آؤ اس نے کہا اللہ کی پناہ چاہتا ہوں وہ تیرا خاوند) میرا مربی اور محسن ہے اس نے مجھے کیسی اچھی طرح رکھا۔ ایسا حق فراموش کامیاب نہیں ہوتا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کا احسان مانتے ہوئے فرمایا کہ ابوبکرؓ کے احسان کا بدلہ اللہ ہی قیامت کو دے گا۔

۴۔ احسان کا بدلہ احسان

احسان کا یہ تقاضا ہے کہ اگر کوئی احسان کرے تو اس کے ساتھ بھی نیکی کرنا چاہیے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

احسان کا بدلہ احسان ہے۔ هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت تھی کہ اگر کسی سے قرضہ لیتے تو واپسی کے وقت اس کی اصل رقم سے کچھ زیادہ دیتے۔ اگر کوئی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدیہ دیتا تو اس سے بہتر تحفہ دیتے۔ (الرحمٰن ۵۵:۶۰)

۵۔ احصان (پاک دامنی)

احصان سے مراد پاک دامنی ہے، جو مرد اور عورت کی قوت شہوت سے تعلق رکھتی ہے۔ محصن یا محصنہ اس مرد یا عورت کو کہا جاتا ہے جو بدکاری اور اس کے مقدمات سے اجتناب کر کے پاک بازی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

قرآن مجید اور احادیث میں احصان (پاک دامنی) پر بہت زور دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

۱۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ (المومنون ۲۳:۵) اور وہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

۲۔ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا (نور ۲۴:۳۳) چاہیے کہ وہ لوگ جن کو نکاح کا موقع میسر نہیں آتا وہ اپنے آپ کو (بدکاری سے) بچائے رکھیں۔

۳۔ وَالَّذِيْنَ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (معارج ۷۰:۲۹) اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہیں۔

۴۔ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ (احزاب ۳۳:۳۵) اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

زانی جس وقت زنا کرتا ہے، شرابی جس وقت شراب پیتا ہے، چور جس وقت چوری کرتا ہے اور لوٹنے والا جس وقت سب کی آنکھوں کے سامنے لوٹتا ہے تو مسلمان نہیں رہتا۔ (بخاری کتاب الحدود باب الزنا وشراب الخمر)

پاک دامن رہنے کے لیے پانچ علاج

i- غضِ بصر

یعنی اپنی نظر کو نامحرم پر ڈالنے سے بچانا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذَالِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (النور۲۴:۳۰) مومنوں کو کہہ دے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے اللہ اس سے باخبر ہے جو وہ کرتے ہیں۔

وَقُلْ لِلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (النور۲۴:۳۱) اور مومن عورتوں کو کہہ دے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔

ii- پردہ

قرآن مجید میں آتا ہے: وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ (نور۲۴:۳۱) اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو عادتاً کھلا رہتا ہے اور چاہیے کہ وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال رکھیں۔

iii- نکاح

ارشادِ الٰہی ہے:

(الف) وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلاً اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (النساء۴:۲۵) اور جو شخص تم میں سے یہ طاقت نہیں رکھتا کہ آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرے تو تمہاری ان مومن لونڈیوں سے نکاح کرے جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے۔

(ب) وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (النور۲۴:۳۲) اور جو تم میں سے مجرد ہیں ان کے نکاح کر دو اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بھی جو صلاحیت رکھتے ہیں اگر وہ محتاج ہوں گے تو اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا اور اللہ فراخی والا علم والا ہے۔

اگر نکاح نہ ہو تو حدیث میں آتا ہے کہ مرد روزہ رکھیں، کیونکہ روزہ شہوانی جذبات کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔

iv- کسی کے گھر جانا ہو تو اجازت سے پہلے پردہ اٹھا کر اس کے اندر جھانکنا نہیں چاہیے (ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت)

۷۔ عورت تیز خوشبو لگا کر باہر نہ نکلے

جب کوئی عورت خوشبو لگا کر باہر نکلے گی تو وہ خوشبو کی وجہ سے لوگوں کی نظر کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ تیز خوشبو لگا کر باہر نکلنا پردہ کی روح کے منافی ہے۔ اس لیے اسلام نے عورت کو تیز خوشبو لگا کر باہر نکلنے سے منع کیا ہے۔

بعض مذاہب نے پاک دامنی کا علاج رہبانیت (ترک دنیا) قرار دیا ہے۔ یہ علاج غیر فطری ہے۔ اسلام نے رہبانیت سے منع فرمایا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (حدید ۵۷:۲۷) (بعض مذاہب) نے رہبانیت کا طریقہ خود ایجاد کیا ہے ہم نے اسے ان پر لازم نہیں کیا مگر اللہ کی رضا کو حاصل کرنے کے لیے (نکالی) پر اس کی وہ نگہداشت نہ کر سکے جو اس کی نگہداشت کا حق ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ یعنی اسلام میں ترک دنیا ناجائز ہے۔

۶۔ امانت داری، دیانت داری

امانت کا لفظ جامع ہے۔ ان تمام امانتوں کے لیے جو خدا تعالیٰ نے یا معاشرے نے یا افراد نے کسی شخص کو سپرد کی ہوں۔

قرآن مجید اور احادیث میں امانت اور دیانت کو اختیار کرنے کی بہت تاکید ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

۱۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ (مومنون ۲۳:۸) اور جو اپنی امانتوں اور وعدہ کا پاس رکھتے ہیں۔

۲۔ فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ (بقرہ ۲:۲۸۲) پس جو امین بنایا گیا ہے اس کو چاہیے کہ اپنی امانت ادا کر دے اور چاہیے کہ اپنے پروردگار رب سے ڈرے۔

۳۔ وَتَخُوْنُوْا أَمٰنٰتِكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (انفال ۸:۲۷) اور اپنی امانتوں میں خیانت (نہ) کرو حالانکہ تم جانتے ہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

۱۔ جو امانت دار نہیں اس کا ایمان نہیں، جسے اپنے عہد کا پاس نہیں اس کا دین نہیں۔ (مشکوٰۃ)

۲۔ منافق کی تین علامتیں ہیں۔ اگرچہ وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے اور اپنے تئیں مسلمان سمجھے۔ (۱) جب بات کہے جھوٹ بولے۔ (۲) جب وعدہ کرے خلاف کرے۔ (۳) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

۳۔ جو تیرے پاس امانت رکھے اس کی امانت ادا کر دے اور جس نے تیری خیانت کی تو اس کی

خیانت نہ کر۔

۴۔ میری امت اس وقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوۃ کو جرمانہ نہیں سمجھے گی۔ یعنی جو امانت ان کے سپرد کی جائے گی اور اس کو ادا کرے گی اور زکوۃ کو بطیب خاطر ادا کرے گی۔

۷۔ وفائے عہد

وفائے عہد زبان اور عمل کی سچائی کا نام ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ اَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۴) اپنے عہد کو پورا کرو اس لیے کہ قیامت کے دن عہد کے متعلق پوچھا جائے گا۔

۲۔ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ (مومن ۲۳:۸) وہ ہیں جو اپنی امانتوں اور عہدوں کے محافظ ہیں۔

۳۔ اُذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ اِسۡمٰعِيۡلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الۡوَعۡدِ وَكَانَ رَسُوۡلًا نَّبِيًّا (مریم ۱۹:۵۴) اور یاد کر کتاب (قرآن) میں (حضرت) اسماعیل علیہ السلام کا ذکر یقیناً وہ وعدہ کا سچا تھا اور خدا کا رسول اور نبی تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

۱۔ ''اپنے بھائی سے جھگڑا مت کرو۔ اور نہ اس سے ٹھٹھا کرو اور نہ اس سے کوئی ایسا وعدہ کرو جس کو پورا نہ کر سکو۔'' (ترمذی)

۲۔ لَا دِيۡنَ لِمَنۡ لَا عَهۡدَ لَهٗ (احمد، طبرانی، ابن حبان) یعنی جس میں عہد کا پاس نہیں اس کا دین نہیں۔

۸۔ شکر

شکر کے لغوی معنی یہ ہیں کہ جانور میں تھوڑا سا چارہ ملنے پر بھی تر و تازگی پوری موجود ہو، دودھ زیادہ دے۔

اسلامی اصطلاح میں شکر سے مراد یہ ہے کہ کسی کی نیکی پر دل، زبان اور عمل سے پورا پورا اجر دیا جائے۔

عربی زبان میں شکر کے مقابل پر کفر کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنی ڈھانپنا اور چھپانا ہیں۔ لیکن عام مفہوم میں کسی کی نیکی یا نعمت کی ناشکری پر بولا جاتا ہے۔ کفران نعمت کا لفظ اردو میں عام مستعمل ہوتا ہے۔

قرآن مجید نے بھی شکر کے مقابل میں کفر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاشۡكُرُوۡا لِىۡ وَلَا تَكۡفُرُوۡنِ (تم میرا شکریہ ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔

شکر کی دو قسمیں ہیں: اللہ کا شکر۔ ۲۔ بندوں کا شکر۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

۱۔ تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِیْھَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّکَّرَ اَوْ اَرَادَ شُکُوْرًا (فرقان ۲۵:۶۱،۶۲)
بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور اجالا کرنے والا چاند بنایا اور اسی نے رات اور دن بنائے جو یکے بعد دیگرے آتے ہیں یہ سب نعمتیں ان لوگوں کے لیے ہیں جو نصیحت حاصل کریں یا شکر گزاری کا ارادہ کرتے ہیں۔

۲۔ وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (نحل ۱۶:۷۸) اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے باہر نکالا جب کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور تمھارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تا کہ تم اس کا شکر ادا کرو۔

۳۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ وَاشْکُرُوْا لِلّٰہِ (بقرہ ۲:۱۷۲) اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمھیں پاک چیزیں بطور رزق کے دی ہیں انھیں کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔

شکر کی دوسری قسم

بندوں کا شکر ادا کرنا ہے۔

انسان مدنی الطبع ہے۔ اس کو ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہے۔ اس باہمی تعاون سے ہی معاشرہ صحیح خطوط پر چل سکتا ہے۔ اس وجہ سے اس دنیا میں ہر انسان کی گردن کسی نہ کسی دوسرے انسان کے احسان کے جواب کے نیچے ہے۔ اس لیے یہ اس پر واجب ہے کہ وہ اپنے محسن کے احسانات کا شکر ادا کرے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

۱۔ مَنْ لَّا یَشْکُرِ النَّاسَ لَا یَشْکُرِ اللّٰہَ (ترمذی) جو انسانوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ خدا کا شکر ادا نہیں کرتا۔

۲۔ حضرت عمرؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم کونسا مال جمع کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ذکر کرنے والی زبان اور شکر کرنے والا دل۔''[1]

شکر کے طریقے

اظہار شکر کے تین طریقے ہیں: (الف) قلبی (ب) قولی (ج) عملی

قلبی شکر کا یہ مطلب ہے کہ محسن کی محبت انسان کے دل میں ہو۔ قولی شکر سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے محسن کی نعمت کا زبان سے اقرار اور اس کی تعریف کرے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ تو اپنے پروردگار کی نعمتوں کا ذکر کر۔

[1] احیاء العلوم للغزالی کتاب الشکر ص ۷۰۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوۂ حسنہ موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر لحظہ اور ہر آن خدا تعالیٰ کی تعریف کرتے رہتے تھے۔ رات کو عبادت الٰہی میں اتنا لمبا قیام کرتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاؤں متورم ہو جاتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس حالت کو دیکھ کر ایک دن میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنی محنت اور مشقت کیوں برداشت کرتے ہیں؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَفَلَا اَكُوْنَ عَبْدًا شَكُوْرًا کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

ایک اور حدیث ہے کہ جس نے اللہ کی ثناء کی اس نے شکر ادا کیا، جس نے نعمت کو چھپایا اس نے کفر کیا۔

عملی شکر سے مراد یہ ہے کہ محسن نے جو نعمتیں انسان کو دی ہیں وہ اسی کی ہدایت اور رضا کے لیے استعمال کرے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آنکھ، کان، ہاتھ پاؤں وغیرہ دیے ہیں تو وہ ان اعضاء کو غلط رنگ میں استعمال نہ کرے۔ اگر کسی کو دولت سے نوازا اپنے تو وہ اپنی دولت کو احکام الٰہی کے مطابق خرچ کرے۔

علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے شکر کو پانچ قواعد پر مبنی قرار دیا ہے:

۱۔ محسن کے لیے فروتنی وانکساری۔
۲۔ محسن سے محبت کرنا۔
۳۔ نعمت کا اعتراف کرنا۔
۴۔ نعمت کی بناء پر محسن کی تعریف۔
۵۔ اس نعمت کو محسن کی مرضی کے مطابق استعمال کرنا۔

یہ پانچ باتیں شکر کی بنیاد ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی ضائع ہو جائے تو شکر کے قواعد میں سے ایک قاعدہ ضائع ہو گیا۔

۹۔ عفو

عفو سے مراد دوسرے کی خطا اور غلطی کو معاف کر دینا ہے لیکن عیسائیوں کے معاف کرنے کی طرح نہیں کہ اگر کوئی آدمی ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی اس کے سامنے کر دیا جائے بلکہ اسلام میں عفو اس صورت میں مناسب ہے۔ جب خاطی اپنی خطا اور غلطی پر نادم ہو اور اس کو معاف کر دینا اس کے لیے اصلاح کا موجب ہو۔

عام طور پر عفو صلح اور مغفرت کے معنوں میں بھی استعمال ہو جاتا ہے۔

اسلامی اخلاق میں عفو کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا (نساء۴:۱۴۹) یا کسی برائی کو معاف کر دو تو یقیناً اللہ معاف کرنے والا قدرت والا ہے۔

۲۔ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (نور۲۴:۲۲) اور چاہیے کہ وہ معاف کریں اور درگزر کریں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تم کو معاف کر دے اور اللہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

۳۔ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (شوریٰ ۴۲:۳۷) اور جب انھیں (مومنوں کو) غصہ آئے تو معاف کرتے ہیں۔

۴۔ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ جو غصہ کو دبا جاتے ہیں اور جو لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں ایسے نیکوکار لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔ (آل عمران ۳:۱۳۴)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

۱۔ وَمَا زَادَ اللّٰهُ رَجُلاً بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا (ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی التواضع) اور اللہ اس شخص کی جو عفو سے کام لیتا ہے عزت بڑھا دیتا ہے۔

۲۔ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آ کر پوچھا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں اپنے خادم کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے تھوڑی دیر خاموش رہے۔ اس نے پھر پوچھا۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر روز ستر دفعہ (ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی ادب الخادم)

۱۰۔ عدل وانصاف

عدل وانصاف سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کا حق ٹھیک ٹھیک دینا اور کسی پر زیادتی نہ کرنا۔ عدل کے مقابلے میں عربی زبان میں لفظ ظلم ہے، جس کے معنی یہ ہیں: وضع الشيء في غير محلہٖ یعنی کسی چیز کو اس کے مناسب مقام پر نہ رکھنا۔

عدل وانصاف کی قرآن اور حدیث میں بہت اہمیت ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

۱۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (سورۃ نحل ۱۶:۹۰) یقیناً اللہ عدل اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔

۲۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (نساء۴:۳) اگر تمھیں ڈر ہو کہ کئی بیویوں میں انصاف نہیں کر سکو گے تو ایک ہی بیوی کرنا۔

۳۔ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (سورۃ انعام ۶:۱۵۲) اور جب کوئی بات کہو تو انصاف کا پاس کرو خواہ کسی رشتہ دار کے خلاف ہی کیوں نہ کہنا پڑے۔

۴۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى

اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (سورۃ مائدہ ۸:۵) اے لوگو جو ایمان لائے ہو خدا کی رضا کے واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کو آمادہ رہو اور لوگوں کی عداوت تم کو اس جرم پر نہ اکسائے کہ معاملات میں انصاف نہ کرو انصاف کرو کہ انصاف تقویٰ سے قریب تر ہے۔

۵۔ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (نساء ۴:۵۸) اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا سات شخصوں کو خدا اپنے سایہ میں لے گا، جن میں ایک شخص امام عادل ہوگا۔ (بخاری کتاب المحاربین باب فضل من ترک الفواحش)

۱۱۔ تواضع وخاکساری

خدا کی رضا اور مخلوق پر رحم وکرم کی وجہ سے اپنے اصل مقام سے کم راضی ہو جانا اور خود کو پست کر دینے کا نام تواضع ہے۔

وضع اور تواضع میں بڑا فرق ہے۔ وضع سے انسان کی خودداری اور عزت نفس مجروح ہوتی ہے اور تواضع سے کبر نفس کی سرکش اونٹنی ذبح ہوتی ہے۔ اول الذکر رذیلہ ہے اور موخر الذکر فضیلت۔

علامہ زبیدی وضع اور تواضع میں فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تواضع اور وضع (ذلت) میں یہ فرق ہے کہ تواضع خدا کی ذات وصفات کی معرفت اس کے جلال و جبرت اور محبت کے علم اور اپنے نفس کے عیوب ونقائص کے علم سے پیدا ہوتی ہے۔ جو در حقیقت اللہ تعالیٰ کی جناب میں انکسار قلب اور مخلوق کے حق میں رحم اور نیاز مندی کے ساتھ جھک جانے کا نام ہے۔

اور جو پستی اور اہانت حظوظِ نفس کی خاطر خودداری اور عزت نفس کو مٹا کر اختیار کی جاتی ہے اس کا نام وضع (ذلت) ہے اس لیے پہلی صفت فضیلت ہے اور دوسری رذیلہ ہے (اتحاف السادہ شرح احیاء العلوم جلد ۸ ص ۲۵)

قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (الفرقان ۲۵:۶۳) اور خدا کے بندے زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔

۲۔ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا (لقمن ۳۱، ۱۸) اور تکبر میں لوگوں سے اپنے گال نہ پھلا اور نہ زمین پر اکڑ کر چل۔

۳۔ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (شعراء ۲۶:۲۱۵) اور اپنے بازو کو اس کے لیے جھکا جو مومنوں میں سے تیری پیروی کرتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

۱۔ طوبی لمن تواضع فی غیر مسکنة یعنی اس شخص کے لیے بشارت ہے جو نفس کو ذلیل کیے بغیر تواضع کرتا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ وحی بھیجی ہے کہ خاکساری اختیار کرو تا کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور کوئی کسی کے مقابل میں فخر نہ کرے۔ (ابوداؤد کتاب الادب باب فی المواخاۃ)

۳۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ وہ منبر پر کھڑے ہوئے اور کہا: اے لوگو! خاکساری اختیار کرو کیونکہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جو شخص صرف خدا کے لیے تواضع اور خاکساری اختیار کرتا ہے خدا اس کو بلند کرتا ہے اور وہ شخص اپنے نفس میں حقیر ہے مگر لوگوں کی آنکھوں میں بڑا ہے اور جو شخص تکبر کرتا ہے خدا اس کو پست کرتا ہے تو وہ لوگوں کی نظروں میں حقیر اور اپنی آنکھ میں بزرگ ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ لوگوں کے نزدیک کتے اور سور سے بھی زیادہ ذلیل ہوتا ہے۔ (مشکوٰۃ)

۴۔ جو شخص خدا کے لیے فروتنی اختیار کرتا ہے خدا اس کو بلند کر دیتا ہے۔ (ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی التواضع)

۱۲۔ حلم و بردباری

ہیجانِ غضب کے وقت ضبطِ نفس سے کام لینے کا نام حلم و بردباری ہے۔ حلیم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اس صفت سے اس خلق کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (اسرائیل ۱۷:۴۴) بے شک وہ (اللہ) بے حد بردبار اور بخشنے والا ہے۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق آتا ہے:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ (ہود ۱۱:۷۵) بے شک ابراہیم علیہ السلام بردبار، نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

۱۔ مَنْ حَلَمَ سَادَ وَمَنْ تَفَهَّمَ ازْدَادَ (ادب الدنیا والدین ص ۱۶۳) جو حلم سے کام لے وہ سردار ہے اور جس میں سمجھ حاصل کرنے کا شوق ہے اس میں سمجھ بڑھنے کے لیے راہ کھل جاتی ہے۔

۲۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کے متعلق فرمایا کہ تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جنھیں خدا اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پسند کرتے ہیں، ایک بردباری ہے اور دوسری آہستگی۔ (ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی التانی والعجلۃ)

۳۔ جو شخص باوجود قدرت کے غصہ کو دبا جائے گا اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلا

کر انعام خاص کا مستحق ٹھہرائے گا۔ (ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی کثرۃ الغضب)

۱۳۔ رحم

مکارم اخلاق میں رحم کو بلند مقام حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی دو صفات رحمان اور رحیم لفظ رحم سے ہی مشتق ہیں۔ قرآن مجید کی ہر سورۃ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ خُلق رحم اور شفقت اللہ تعالیٰ کو کتنا عزیز اور پیارا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا (مومن ۴۰:۷) اے ہمارے رب! تیری رحمت اور علم ہر چیز پر پھیلا ہوا ہے۔

۲۔ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ (مومنون ۲۳:۱۰۹) اور تو سب رحم کرنے والوں میں سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔

۳۔ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَرَحْمَةً (حدید ۵۷:۲۷) اور جو لوگ ان کے پیرو ہوئے ان کے دلوں میں مہربانی اور رحم ڈالا۔

۴۔ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ. (الفتح ۴۸:۲۹) اور جو اس کے (رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں قوی اور آپس میں رحم کرنے والے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

۱۔ اَلرَّحِمُ شَجْنَةٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ (بخاری کتاب الادب) رحم ایمان کی جڑ سے نکلی ہوئی شاخ ہے۔

۲۔ مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ (صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم) جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا۔

۳۔ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ لَا يَرْحَمُهُ اللّٰهُ تَعَالٰى (مسلم و بخاری) جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔

۴۔ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ فِي تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَكٰى عُضْوٌ تَدَاعٰى لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى (بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم) تو دیکھے گا کہ مسلمان ایک دوسرے پر مہربانی کرنے اور ایک دوسرے کو دوست رکھنے اور باہم شفقت کرنے میں ایک جسم کی طرح ہیں کہ جب ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو جسم کے باقی اعضاء بیداری اور بخار میں موافقت کرتے ہیں۔

۱۴۔ سخاوت

اسلام میں سخاوت کے معنی اپنے کسی حق کو بطیب خاطر کسی دوسرے کے حوالہ کر دینے کے ہیں۔

سخاوت کے مفہوم میں صرف مال کو خرچ کرنا ہی شامل نہیں، بلکہ جسمانی اور ذہنی قوتوں کو بھی دوسروں کی بھلائی اور بہبودی کے لیے خرچ کرنے پر استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (بقرہ۲:۳) اور جو ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ خرچ کرتے ہیں۔

۲۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (بقرہ۲:۲۵۴) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اس میں سے جو ہم نے تم کو دیا ہے خرچ کرو اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی نہ کوئی دوستی ہے نہ کوئی سفارش ہے اور کافر ہی ظالم ہیں۔

۳۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (آل عمران۳:۹۲) تم نیکی ہرگز حاصل نہ کرو گے، یہاں تک کہ اس سے خرچ کرو جس سے تم محبت رکھتے ہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ رشک دو ہی پر جائز ہے۔ ایک اس پر جس کو اللہ نے دولت دی ہے تو وہ اس کو صحیح مصرف میں خرچ کرتا ہے، دوسرے اس پر جس کو اللہ نے علم دیا ہو تو وہ اس کے مطابق بتا رہا ہے اور سکھا رہا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب العلم)

۲۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ حسین، سب سے زیادہ سخی اور سب سے زیادہ بہادر تھے۔ (بخاری)

۳۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ مانگا گیا ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہو میں نہیں دیتا۔ (بخاری۔ مسلم)

۴۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کل کے لیے کوئی چیز بھی ذخیرہ نہ کر رکھتے تھے۔ (ترمذی) اَلْجَنَّةُ دَارُ الْاَسْخِيَاءِ یعنی جنت سخیوں کا گھر ہے۔

۱۵۔ شجاعت

شجاعت کے لغوی معنی بہادری کے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں باطل قوتوں کے مقابلہ کے وقت مصائب اور خطرات کا خندہ پیشانی اور ثابت قدمی کے ساتھ سامنا کرنے کا نام شجاعت ہے۔

شجاعت کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم تو وہ ہے جس کا ذکر تعریف میں کیا گیا ہے۔ دوسری قسم، غصہ کے وقت ضبط نفس کا نام بھی بجوائے حدیث شجاعت ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ليس الشديد بالصرعة انما الشديد الذی يملك نفسه عندالغضب یعنی کشتی میں کسی کو پچھاڑ دینا اصل بہادری نہیں ہے بلکہ حقیقی معنوں میں بہادر

وہ ہے جو غضب کے وقت اپنے نفس پر قابو پالیتا ہے۔

۱۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْ اٰمَنُوْا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْھُمُ الْاَدْبَارَ (انفال ۸:۱۵) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم ان سے جو کافر ہیں جنگ کی حالت میں ملو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرو۔

۲۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَۃً فَاثْبُتُوْا (انفال:۴۵) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم کسی دستہ سے ملو تو ثابت قدم رہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ کفار مکہ ابو طالب کے پاس گئے اور کہا کہ اپنے بھتیجے کو سمجھاؤ کہ وہ ہمارے بتوں کو برا بھلا نہ کہے، ہمارے آباء واجداد کی تذلیل نہ کرے، ہمیں گمراہ اور وقود النار نہ کہے۔ اگر آپ کا بھتیجا ان باتوں سے باز نہ آیا تو ہم آپ سے جنگ کریں گے۔

ابو طالب نے اپنے بھتیجے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلا کر قوم کا ایک ایک حرف کہہ سنایا اور کہا کہ ہم اس قابل نہیں کہ قوم کا مقابلہ کر سکیں، اس وجہ سے مجھے اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالیے۔

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ ابو طالب کے دل پر قوم کی دھمکی کا بہت اثر ہوا ہے تو آپ نے فرمایا: ''اے چچا! اگر آپ قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو بے شک معاونت سے دست کش ہو جائیں۔ پھر فرمایا: ''اے مہربان چچا! قسم بخدا اگر کفار مکہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند رکھ دیں اور کہیں کہ اس کے عوض میں تبلیغ الاسلام کو ترک کر دوں تو مجھے منظور نہ ہوگا۔ اگر مجھے اس راہ میں ہلاکت نظر آئے تو میں پیچھے نہیں لوٹوں گا۔''

حضرت براء کہتے ہیں کہ جب لڑائی نہایت خون ریز اور سخت ہوتی تو ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پناہ ڈھونڈا کرتے تھے۔ اور ہم میں سے بڑا دلیر وہ شخص ہوتا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں کھڑا ہوتا تھا۔ (بخاری و مسلم)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے زیادہ خوبصورت تھے اور سب سے زیادہ سخی اور سب سے بڑھ کر شجاع تھے۔ (بخاری و مسلم)

غزوہ حنین میں جب مشرکین نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چاروں طرف سے گھیر لیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثابت قدم رہے اور فرمایا:

میں جھوٹا نبی نہیں میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

۱۱۔ ایثار

ایثار کا معنی یہ ہے کہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ذاتی ضرورت پر مقدم رکھا جائے۔ قرآن مجید [میں] آتا ہے: وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ [الْمُفْلِحُ]وْنَ (الحشر ۵۹:۹) اور وہ اپنے آپ پر انھیں مقدم رکھتے ہیں گو انھیں تنگی ہی ہو اور جو شخص اپنے نفس

کے بخل سے بچ جائے تو وہی کامیاب ہوں گے۔

اس آیت میں انصار کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ باوجود تنگی کے مہاجرین اپنی ذات اور اہل و عیال پر ترجیح دیتے تھے۔

اس آیت کی تفسیر میں بخاری میں ایک صحابی کا واقعہ لکھا ہے جس کے سپرد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مہمان کو کیا۔ اس کے گھر میں سوائے بچوں کے کھانے کے کچھ نہ تھا۔ میاں بیوی نے بچوں کو بھوکا ہی سلا دیا اور چراغ بجھا کر جو کچھ کھانے کو تھا وہ مہمان کو کھلا دیا اور خود بھوکے رہے اور کھانے کو ہاتھ تک نہ لگایا۔

۱۷۔ حق گوئی

حق گوئی سے مراد یہ ہے کہ سچی بات کا بغیر کسی کے ڈر کے برملا اظہار کر دینا۔ حق گوئی بہت بڑا انسانی وصف ہے۔ اس کا تعلق شجاعت سے ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ یہ حکم دیتے ہیں۔ **فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ** (الحجر ۱۵:۹۴) پس تم کو جو حکم دیا جاتا ہے اس کو کھول کر بیان کر دو اور مشرکین کی کچھ پرواہ نہ کرو۔

دوسری جگہ آتا ہے: **وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ** (مائدہ ۵:۵۴) اور یہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جابر (یعنی بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کہنا ہے۔

ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”جب کسی کو کوئی حق بات معلوم ہو تو اس کے کہنے سے انسانوں کا خوف مانع نہ ہو۔“

حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بار ایک لمبا خطبہ دیا جس میں فرمایا: ”ہوشیار رہنا کہ کسی کی ہیبت تم کو حق گوئی سے باز نہ رکھے۔“ (ترغیب وترہیب منذری ۲ باب الترہیب من الغضب بحوالہ ترمذی)

۱۸۔ اعتدال

امت مسلمہ کو امت وسطاً (درمیانی امت) کہا گیا ہے۔ جس میں یہی سِرّ مضمر ہے کہ امت مسلمہ کا راستہ افراط اور تفریط سے پاک ہے۔ قرآن مجید نے مسلمانوں کو نماز میں دعا ہی یہ سکھائی ہے: **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** (اے اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا) صراط مستقیم وہی راستہ ہوتا ہے جو افراط اور تفریط کے

درمیان ہو۔ پھر اس کے بعد۔ غَيْرَ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ. نہ ان لوگوں کا راستہ جو گمراہ ہوئے۔ المغضوب سے مراد یہودی ہیں اور الضالین سے مراد عیسائی۔

عیسائی اور یہودی دونوں نے افراط اور تفریط کا راستہ اختیار کیا۔ سورۃ فاتحہ میں صراط مستقیم کی دعا کے بعد یہ بھی دعا سکھائی کہ اللہ تعالیٰ یہودی اور عیسائیوں کے راستہ پر نہ چلائے جنھوں نے افراط اور تفریط کا راستہ اختیار کیا۔

اسلام زندگی کے ہر شعبہ میں اعتدال پسندی کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ (لقمان ۱۹:۳۱) اور اپنی رفتار میں اعتدال اختیار کر۔

۲۔ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَحْسُوْرًا (بنی اسرائیل ۲۹:۱۷) اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھ اور نہ اسے بالکل کھلا چھوڑ دے کہ ملامت زدہ اور عاجز ہو کر رہ جائے۔

۳۔ وَالَّذِيْنَ إِذَا أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (الفرقان ۶۷:۲۵) اور جو لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ درمیانی راستہ اختیار کرتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

مااحسن القصد فی الغنی وما احسن القصد فی الفقر وما احسن القصد فی العبادۃ یعنی دولت مندی میں اعتدال کتنا اچھا ہے، محتاجی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے اور عبادت میں میانہ روی کتنی اچھی ہے۔ (بروایت کنز العمال جلد دوم ص ۷ حدیث آباد دکن)

۱۹۔ رفق ونرمی

رفق کے معنی کلام اور معاملات وغیرہ میں نرمی اور سہولت سے کام لینے کے ہیں۔ ویسے تو یہ خلق ہر آدمی کے لیے زیور ہے، لیکن خاص طور پر مبلغ کے لیے یہ خلق نہایت ہی ضروری ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کو پیغام حق پہنچانے کے لیے حکم دیا تو ارشاد فرمایا:

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ ۴۴:۲۰) سو تم دونوں اس سے نرم بات کہنا شاید وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈرے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ خطاب کر کے فرماتا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (آل عمران ۱۵۹:۳) سو اللہ کی رحمت سے تو ان کے لیے نرم ہے اور اگر تو سخت کلام سخت دل ہوتا تو تیرے ارد گرد سے تتر بتر ہو جاتے پس تو ان کو معاف کر اور ان کے لیے بخشش مانگ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

۱۔ مَنْ يُحْرَمُ الرِّفْقَ يُحْرَمُ الْخَيْرَ (مسلم کتاب البر والصلۃ باب فی فضل الرفق) جو نرمی سے محروم رہا وہ بھلائی سے محروم ہو رہا۔

۲۔ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِمَنْ يَحْرُمُ عَلَى النَّارِ وَتَحْرُمُ عَلَيْهِ النَّارُ عَلٰى كُلِّ هَيِّنٍ لَيِّنٍ قَرِيْبٍ سَهْلٍ (ابوداؤد ترمذی ابواب الزہد) کیا میں تم لوگوں کو بتاؤں کہ کون شخص آگ پر حرام ہے اور کس پر آگ حرام ہے ہر اس شخص پر جو نرم مزاج، نرم، لوگوں سے قریب ہونے والا ہو اور نرم خو ہو۔

۳۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: عَلَيْكَ بِالرِّفْقِ وَاِيَّاكَ وَالْعُنْفَ وَالْفُحْشَ اِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُوْنُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا زَانَهٗ وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا شَانَهٗ (مشکوٰۃ) تم نرمی کو اپنے اوپر لازم کرو اور سختی اور گالی گلوچ سے بچو کیونکہ نرمی جس چیز میں ہوتی ہے اس کے لیے زینت کا باعث ہے اور جس چیز سے نرمی کھینچ لی جاتی ہے وہ اس کو عیب دار کر دیتی ہے۔

اخلاق شنیعہ

جو افعال صفات الٰہیہ کی مقتضیات کے خلاف ہوں وہ رذائل اخلاق کہلاتے ہیں۔ اگر اخلاق فاضلہ معاشرہ کی بہبود اور بھلائی کے ضامن ہیں تو اخلاق سیئہ معاشرہ کے بگاڑ اور فساد کا موجب ہیں۔

۱۔ کذب (جھوٹ)

امر واقع کے خلاف کسی قول یا فعل کو کذب کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث میں کذب سے اجتناب کی بہت تاکید کی ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (الحج ۲۲:۳۰) اور ہر جھوٹی بات سے بچو۔

۲۔ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ (النور ۲۴:۷) اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو۔

لعنت کے معنی ہیں اللہ کی رحمت سے محروم اور عذاب الٰہی کا مستحق۔ اس آیت کریمہ میں کاذب کو لعنتی قرار دیا ہے۔ یعنی کاذب اللہ کی رحمت سے محروم ہے اور عذاب الٰہی کا مستحق ہوتا ہے۔

۳۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ (زمر ۳۹:۳) بے شک اللہ تعالیٰ اس شخص کو راہ نہیں دکھاتا جو جھوٹا ناشکر گزار ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ جھوٹ گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ دوزخ کی طرف اور جھوٹ بولتے بولتے آدمی خدا کے ہاں جھوٹا لکھا جاتا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الادب باب قولہ تعالیٰ وکونوا مع الصادقین)

۲۔ جو شخص لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے اس پر افسوس اس پر افسوس۔ (سنن ابی داؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب)

۲۔ وعدہ خلافی

وعدہ خلافی بھی دراصل ایک جھوٹ ہے یعنی ایک شخص کسی سے وعدہ کرے اور نیت یہ ہو کہ وہ پورا نہ کرے گا تو یہ جھوٹ ہی ہے۔

۱۔ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۴) بے شک وعدہ کی باز پرس ہوگی۔

۲۔ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَا اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (التوبہ ۹:۷۷) سو اس نے انھیں بدلہ دیا کہ ان کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا اس دن تک کہ وہ اس سے ملیں اس لیے کہ انھوں نے اللہ سے اس کے خلاف کیا جو اس سے وعدہ کیا تھا اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔

صحیحین میں ہے کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بولے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے خلاف کرے، جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔

۳۔ خیانت

اللہ اور بندوں کے حقوق کو باحسن طریق ادا نہ کرنا خیانت ہے۔ اگر کسی کے پاس کوئی امانت رکھی گئی ہے اس میں بے جا تصرف کرنا اور طلب پر واپس نہ کرنا یا واپس کرنے سے انکار کر دینا یہ بھی خیانت ہے۔ اسلام نے خیانت کو نہایت ہی مذموم فعل قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (انفال ۸:۲۷) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خیانت نہ کرو اور نہ آپس کی امانتوں میں خیانت کرو اور تم جانتے ہو کہ خیانت کرنے سے معاشرہ میں کیا بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔

اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خیانت کرنے سے مراد اسلامی حقوق کو ادا نہ کرنا ہے۔

۲۔ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (آل عمران ۳:۱۶۱) جو کوئی خیانت کرے جو کچھ کسی نے خیانت کی ہے قیامت کے دن وہ لائے گا پھر ہر شخص کو جو اس نے کمایا پورا دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ يَعلَمُ خائنة الاعيُن وما تخفي الصُدُورُ (مومن ۴۰:۱۹) اللہ آنکھوں کی خیانت کاری کو جانتا ہے اور جو سینے چھپائے ہوئے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: منافق کی تین علامتیں ہیں ان میں سے ایک علامت یہ ہے کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو وہ اس میں خیانت کرتا ہے۔ (صحیحین)

۴۔ کبر (غرور)

دوسروں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور باقیوں کو کم تر اور حقیر جاننے کا نام کبر ہے۔ غرور بدترین اخلاقی مرض ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام رذائل اخلاق کی اساس ہی کبر ہے۔ یہی وہ مرض ہے جس کی وجہ سے شیطان راندہ درگاہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ (اعراف ۷:۱۳) پھر اس حالت سے اتر جا تیرے لیے یہ زیبا نہیں کہ تو اس پر تکبر کرے سو نکل جا تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (لقمان ۳۱:۱۸) تو غرور میں لوگوں سے بے رخی نہ کر اور نہ زمین میں اکڑتا ہوا چل اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اترانے والے اور شیخی خورہ ہیں۔

۲۔ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۷) اور زمین میں اکڑتا ہوا نہ چل کیونکہ نہ تو زمین کو پھاڑ ڈالے گا اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکے گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

۱۔ ان العجب لياكل الحسنات كما تاكل النار الحطب یقیناً غرور نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو۔

۲۔ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (ابوداؤد باب ماجاء فی الکبر)

۳۔ دوزخ اور جنت میں باہم دلیل بازی ہوئی۔ دوزخ نے کہا مجھ میں جبار اور متکبر لوگ داخل ہوئے ہیں اور جنت نے کہا کہ مجھ میں کمزور اور مسکین لوگ۔ (مسلم صفات المنافقین واحکام باب النار یدخلھا الجبارون)

۴۔ کیا میں تم کو بتاؤں کہ جنتی کون ہے؟ ہر وہ شخص جو کمزور ہے اور لوگ اس کو کمزور سمجھیں۔ کیا میں تم

کو بتاؤں کہ دوزخی کون ہے؟ ہر اکھڑ، بدخو، متکبر شخص۔ (بخاری کتاب الادب باب الکبر)
تکبر کا علاج ذکر الٰہی اور خدمت خلق ہے۔

۵۔ حسد

کسی آدمی کے فضل اور کمالات کو دیکھ کر رنجیدہ خاطر ہونا، پھر اس کے کمالات کی تباہی کا آرزو مند ہونا حسد کہلاتا ہے۔

یہ بھی ان اخلاقی امراض میں سے ایک مرض ہے جس کی آگ کی تپش سے انسان کی عقل اور دل کی تمام استعدادیں بھسم ہو جاتی ہیں۔

قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَا اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ (النساء۴:۵۴) وہ لوگوں سے اس بات پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا۔

۲۔ وَدَّ کَثِیْرٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ لَوْ یَرُدُّوْنَکُمْ مِنْ بَعْدِ اِیْمَانِکُمْ کُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِھِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْحَقُّ (بقرہ۲:۱۰۹) اہل کتاب میں سے بہت سے چاہتے ہیں کہ تمھارے ایمان کے بعد تمھیں کافر بنادیں اپنے حسد کی وجہ سے اس کے بعد کہ ان پر حق کھل گیا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے حاسد کے شر سے بچنے کے لیے دعا سکھائی ہے: وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (فلق ۱۱۳:۵) میں تیری پناہ چاہتا ہوں حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

۱۔ بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے۔ نہ لوگوں کے عیوب کو ٹٹولو۔ نہ بے سود خبروں کی تجسس کرو۔ نہ باہم حسد کرو۔ نہ ایک دوسرے سے روگردانی کرو۔ نہ باہم بغض رکھو بلکہ اے خدا کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ۔ (بخاری کتاب الادب باب ما ینہی عن التحاسد والتدابر)

۲۔ اے لوگو! پہلی امتوں کا مرض تمہاری طرف آہستہ آہستہ آ رہا ہے، اور وہ ایک حسد اور بغض ہے۔ یہ مرض بالوں کو نہیں بلکہ دین کو مونڈنے والا ہے۔ (ترمذی)

۳۔ اِیَّاکُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ (ابوداؤد و کتاب الادب باب فی الحسد) تم لوگ حسد سے بچو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

۶۔ خودستائی

خودستائی سے مراد اپنے نفس سے غیر معمولی محبت ہے۔ اس مرض کے دو نقصان ہیں۔ ایک

نقصان تو یہ ہے کہ خود بین اور خودنما شخص دوسروں کو حقیر جاننا شروع کر دیتا ہے۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ تمام خوبیوں اور کمالات کا اپنے نفس کو مصدر اور منبع تصور کرتا ہے، اور خدا کی ذات سے بھروسہ ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خودستائی اور خودنمائی کو برا سمجھا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَا اَتَوا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (آل عمران ۳:۱۸۸) ہرگز خیال نہ کرو کہ جو لوگ اس پر خوش ہوتے ہیں جو انھوں نے کیا اور پسند کرتے ہیں کہ اس کے لیے ان کی تعریف کی جائے جو انھوں نے نہیں کیا یہ ہرگز خیال نہ کرو کہ وہ عذاب سے بچ جائیں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

۲۔ فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (النجم ۳۲) سو اپنے نفسوں کو پاک نہ ٹھیراؤ اللہ خوب جانتا ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے۔

۳۔ جنگ حنین میں اسلامی فوج اپنی کثرت پر اترانے لگی تو آغاز جنگ میں سوائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور چند صحابہ کے تمام اسلامی فوج میدان جنگ سے منہ پھیر گئی۔ بعد ازاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز پر منتشر فوج جمع ہوئی اور دشمن کو شکست دی۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا (توبہ ۹:۲۵) اور حنین کے دن جب تمہاری کثرت تعداد نے تم میں خودستائی پیدا کر دی تھی تو عددی کثرت تمھارے کچھ کام نہ آئی۔

۴۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاءَ النَّاسِ (انفال ۸:۴۷) اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھاتے نکلے۔

۵۔ لَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ (حدید ۵۷:۲۳) خدا نے جو دیا ہے اس پر مت اتراؤ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسروں کی تعریف کرنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس طرح انسان میں خودستائی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص کسی کی مبالغہ آمیز طریقہ پر تعریف کر رہا تھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم نے اس کو ہلاک کر دیا ہے۔ (بخاری کتاب الادب باب ما یکرہ من التمادح)

۷۔ غیبت

کسی شخص کی عدم موجودگی میں ایسی بات کرنا جس سے اس کی پردہ دری یا تحقیر ہوتی ہو۔ قرآن اور حدیث میں اس فعل کو مذموم قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: لَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ

یَاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ (الحجرات ۴۹:۱۲) ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہو، کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تو تم اس سے کراہت کرتے، اور اللہ سے ڈرو یقیناً اللہ تعالیٰ رجوع پر رحمت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ شب معراج کو میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ ان سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔ میں نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جبرائیل علیہ السلام نے جواب دیا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے اور ان کی عزت وآبرو لیتے تھے۔ (ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لوگو! تمھیں معلوم ہے کہ غیبت کیا چیز ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تمہارا اپنے بھائی کو ایسی بات سے یاد کرنا جو اسے اچھی نہ لگے۔ کسی نے عرض کیا! اگر میرے بھائی میں وہ بات موجود ہو جو میں کہتا ہوں تو پھر آپ کیا فرماتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا: اگر اس میں وہ بات پائی جاتی ہے جو تو کہتا ہے تو تو نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ بات اس میں نہیں جو تو کہتا ہے تو تو نے اس پر بہتان طرازی کی۔ (مسلم)

حضرت ابوسعیدؓ اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: غیبت زنا سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ آدمی زنا کر کے توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ زانی توبہ کرتا ہے تو خدا اس کو بخش دیتا ہے اور غیبت کرنے والے کو نہیں بخشتا جب تک وہ شخص نہ بخشے۔ اور حضرت انسؓ کی روایت میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ زانی توبہ کرتا ہے اور غیبت کرنے والے کے لیے توبہ نہیں۔

۸۔ تمسخر

تمسخر کے معنی ہیں ٹھٹھا مخول کرنا یعنی کسی آدمی کو دوسروں کی نظروں میں گرانے کے لیے نشانہ تضحیک بنا لینے کا نام تمسخر ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ (الحجرات ۴۹:۱۱) اے لوگو! جو ایمان لائے ہوئے تم میں سے کوئی قوم دوسری قوم سے تمسخر نہ کرے ممکن ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔

۹۔ بدظنی

کسی دوسرے شخص کے متعلق جھوٹا وہم کرنا یا اس کی طرف ان ہونی بات منسوب کر دینے کا نام

بدظنی ہے۔ اس سے باہمی نفرت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدظنی سے باز رہنے کی تاکید کی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (الحجرات ۴۹:۱۲) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ بہت بدگمانی سے بچا کرو۔ بیشک بعض بدگمانی گناہ ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

تم بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔ (بخاری و مسلم)

۱۰۔ بخل

کسی انسان کا ضرورت کے مطابق اپنی جان، اہل و عیال، رشتے دار یا معاشرہ کے مستحقین پر خرچ نہ کرنے کا نام بخل ہے۔ اس عادت سے بے شمار بداخلاقیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بے مروتی، تنگ نظری، حرص، دنائت قسم کی بداخلاقیاں بخل کے بطن سے ہی جنم لیتی ہیں اور معاشرہ میں فساد پیدا کر دیتی ہیں۔ بخل کے علاج کے لیے اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اور صدقات ادا کرنے کی تعلیم دی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس عادت کو نہایت ہی ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (آل عمران ۳:۱۸۰) جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت دی ہے اور پھر وہ بخل کرتے ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ یہ بخیلی ان کے لیے بہتر ہے بلکہ یہ ان کے لیے انتہائی بری ہے۔ جو کچھ وہ جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے دن ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔

۲۔ اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (حدید ۵۷:۲۴) یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بخل کی ترغیب دیتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

۱۔ سچے مومنوں میں دو خصلتیں جمع نہیں ہوتیں۔ ۱۔ بخل۔ ۲۔ بدخلقی۔ (ترمذی)

۲۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

اے خدایا! میں بخل، سستی، کبرسنی، قبر کے عذاب، زندگی اور موت کی آزمائش سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ (صحیح مسلم)

۱۱۔ بہتان

بہتان یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی کی طرف ناکردہ گناہ منسوب کر دیا جائے۔

قرآن مجید اور حدیث میں اس فعل کی بہت مذمت بیان ہوئی ہے۔قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا (نساء ۱۱۲:۴) اور جو کوئی گناہ کرے پھر وہ اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگا دے یقیناً وہ اپنے اوپر بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ لیتا ہے۔

۲۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (النور۲۴:۲۳) جو لوگ پاک دامن بے خبر عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
جو کوئی اپنے غلام پر تہمت لگائے حالانکہ اس نے وہ گناہ نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس مالک کی پیٹھ پر کوڑے مارے گا۔ (سنن ابی داؤد کتاب الادب)
ایک اور حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس میں جو برائی نہیں اس کی نسبت اس کی طرف کرنا بہتان ہے۔ (سنن ابی داؤد کتاب الادب)

۱۲۔ چغل خوری

چغل خوری دو آدمیوں کے درمیان پھوٹ اور جھگڑا ڈالنے کے لیے جھوٹی سچی باتیں بیان کرنے کا نام ہے۔ یہ فعل معاشرہ میں فساد اور ایک دوسرے سے نفرت پیدا کرنے کا موجب ہے۔ اس وجہ سے قرآن مجید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چغل خوری کی بہت مذمت کی ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ (قلم ۶۸:۱۱) عیب لگانے والا چغلیاں لگانے والا۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا میں تمھیں بتاؤں کہ سب سے برے لوگ کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی بتایا۔

۱۔ المشاون بالنميمة المفسدون بين الاحبة (مسند احمد جلد ۶ ص ۴۵۹ عن اسماء بنت یزید)
جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوستوں کے آپس کے تعلقات میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔

۲۔ عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ (بخاری) حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ چغل خور جنت میں نہیں جائے گا۔

۳۔ عبدالرحمٰن بن غنم اور اسماء بنت یزید سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خدا کے بہترین بندے وہ ہوتے ہیں کہ جب ان کو دیکھا جائے تو خدا یاد آ جائے اور خدا کے برے بندے وہ ہیں جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوستوں میں جدائی ڈلواتے اور پاک

لوگوں پر تہمت لگاتے ہیں۔

۱۳۔ ظلم

ظلم کے معنی ہیں۔ وضع الشی فی غیر محله یعنی ظلم کسی چیز کو غیر مناسب جگہ پر رکھنے کا نام ہے۔ اسی وجہ سے قرآن میں ظلم شرک کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے: اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (لقمان ۳۱:۱۳) یعنی شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ یہاں صرف ایک بندے کا دوسرے پر زیادتی کرنا مراد ہے۔ یہ لفظ بغی اور عدوان کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ. وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَى الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (شوریٰ ۴۲:۴۰......۴۲) اور برائی کا بدلہ اس کی مثل برائی ہے پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ پر ہے۔ وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا، اور جس پر ظلم ہوا ہے اور وہ اس کے بعد بدلہ لے یہ وہ لوگ ہیں جن پر کوئی الزام نہیں، الزام انہی لوگوں پر ہے جو ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتی کرتے پھرتے ہیں انہی لوگوں کے لیے دردناک دکھ ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ حدیث قدسی بیان کرتے ہوئے فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے فرماتا ہے کہ اے میرے بندو! میں نے اپنے لیے اور تمھارے لیے آپس میں ظلم کو حرام کیا ہے، تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو۔ (صحیح مسلم باب تحریم الظلم)

دوسری حدیث ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ظلم سے بچو کہ ظلم قیامت کے دن ظلمات بن جائے گا۔ (صحیح مسلم باب تحریم الظلم)

ایک اور حدیث ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ظالم کو خدا مہلت دیتا ہے، پھر جب اس کو پکڑتا ہے تو پھر نہیں چھوڑتا۔ (صحیح مسلم باب تحریم الظلم)

۱۴۔ منافقت (دورخا پن)

منافقت صرف زبان سے اقرار کرنے اور خلوص قلب سے کسی سے وابستگی پیدا نہ کرنے کا نام ہے۔ اسلام نے دوغلے پن کو نہایت ہی برے الفاظ سے بیان کیا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَیٰطِیْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (البقرہ ۲:۱۴) اور جب یہ لوگ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں اور جب علیحدگی میں اپنے سرداروں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو تمھارے ساتھ ہیں

اوران سے تو ہم محض مذاق کررہے تھے۔

ان لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا (النساء۴:۱۴۵) بے شک منافق دوزخ کے سب سے نچلے حصے میں ہوں گے اور تم وہاں کسی کو بھی ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

۱۔ مَنْ کَانَ ذَا وَجْهَیْنِ فِی الدُّنْیَا کَانَ لَهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ لِسَانَانِ مِنْ نَارٍ (دارمی) دنیا میں جس کے دورُخ ہوں ہوں گے قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی دوزبانیں ہوں گی۔

۲۔ تَجِدُوْنَ شَرَّ النَّاسِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ ذَا الْوَجْهَیْنِ الَّذِیْ یَاْتِیْ هٰٓؤُلَاءِ بِوَجْهٍ وَهٰٓؤُلَاءِ بِوَجْهٍ (بخاری) قیامت کے دن تم دورُخ کو سب لوگوں سے بدتر حالت میں پاؤ گے جو کچھ لوگوں کے پاس تو ایک طریق سے جاتا ہے دوسرے لوگوں کے پاس دوسرے طریق سے جاتا ہے۔

ایک طریق اور دوسرے طریق سے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس جاتا ہے۔ ان کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے اور دکھاوے کے لیے انھی کی راہ اختیار کرتا ہے۔

۱۵۔ خوشامد

کسی آدمی کو محض خوش کرنے کے لیے اس کی جھوٹی تعریف کرنا خوشامد کہلاتا ہے۔ اسلام میں یہ فعل نہایت مذموم ہے۔ حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ کسی کی سچی تعریف بھی اس کے منہ پر نہیں کرنی چاہیے مبادا کہ اس کے دل میں تکبر اور خودستائی پیدا ہو جائے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَا اَتَوْا وَّ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَالَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (آل عمران۳:۱۸۸) تم مت خیال کرو کہ جو لوگ اس پر خوش ہوتے ہیں جو انھوں نے کیا اور اس پر تعریف کیے جانے کو پسند کرتے ہیں جو انھوں نے نہیں کیا یہ ہرگز خیال نہ کرو کہ وہ عذاب سے بچ جائیں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت عثمانؓ کے منہ پر ان کی تعریف کی تو حضرت مقدادؓ نے اس کے منہ پر خاک پھینک دی اور فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: خوشامد اور تعریف کرنے والوں سے ملو تو ان کے منہ میں خاک جھونک دو۔ (صحیح مسلم وابوداؤد کراھیۃ التمادح)

۱۶۔ فحش گوئی

فحش گوئی سے مراد ہر وہ کلام ہے جو تہذیب وشائستگی سے گری ہوئی ہو۔ قرآن مجید نے فحش گوئی کو رفث کہا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

فَلا رَفَثَ وَلا فُسُوقَ وَلا جِدَالَ فِي الْحَجِ (بقرہ۲:۱۹۷) یعنی حج کے ایام میں نہ فحش گوئی کرو نہ گناہ کی بات اور نہ لڑائی کی۔

دوسری جگہ آتا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (نور۲۴:۱۹) جو لوگ چاہتے ہیں کہ بے حیائی کی باتیں ان لوگوں میں پھیلیں جو ایمان لائے ہیں ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے ایک غلام کو ماں کی گالی دی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے۔ (بخاری کتاب الادب باب ماینہی من السباب واللعن)

۱۷۔ ریاء

ریاء کے معنی دکھاوا اور نمائش کے ہیں، لیکن اصطلاح میں ان انسانی اعمال پر بولا جاتا ہے جن کے ساتھ خلوص نیت شامل نہ ہو۔ اسلام میں تمام اعمال کا دارومدار حسن نیت پر ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَاءَ النَّاسِ (انفال ۸:۴۷) اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اتراتے ہوئے اور لوگوں کے دکھاوے کے لیے اپنے گھروں سے نکلے۔

۲۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (بقرہ۲:۲۶۴) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور تکلیف دے کر باطل نہ کرو اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتا۔

قرآن مجید نے منافق کی نشانی دکھاوا بیان کی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آتا ہے:

۳۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا (نساء۴:۱۴۲) منافق اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور وہ ان کو دھوکا بازی کی سزا دے گا اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر بہت ہی کم۔

۴۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (ماعون ۱۰۷:۴۔۶) پس ان نمازیوں کے لیے ہلاکت ہو جو اپنی نماز سے غافل ہیں جو دکھاوا کرتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کیا میں تم کو وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمھارے لیے مسیح دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے؟ صحابہؓ نے کہا ہاں فرمائیے۔ آپ نے فرمایا:

شرک خفی اور یہ کہ آدمی نماز کے لیے کھڑا ہو اور اس کو زیب و زینت کے ساتھ ادا کرے اس لیے کہ وہ دیکھ رہا ہے کہ اس کو دوسرا شخص دیکھتا ہے۔ (ابن ماجہ باب الریاء والسمعۃ)

۱۸۔ حرص وطمع

اپنے مال اور دولت کو ناجائز طریقہ سے بڑھانے کے لیے ہر وقت تگ و دو کرتے رہنے کا نام حرص ہے۔ اس سے انسان کے اندر دنائت، بخل، تنگ ظرفی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حرص اور طمع سے منع فرمایا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ وَأُحْضِرَتِ الْأَنفُسُ الشُّحَّ وَإِن تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (نساء ۴:۱۲۸) دلوں میں بخل ہوتا ہے اور اگر تم احسان کرو اور تقویٰ کرو تو اللہ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔

۲۔ وَأَنفِقُوا خَيْرًا لِّأَنفُسِكُمْ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (تغابن ۶۴:۱۶) اور خرچ کرو یہ تمھارے نفسوں کے لیے بہتر ہے اور جو اپنے نفس کے بخل سے بچ جائے تو وہی کامیاب ہیں۔

۳۔ يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (حشر ۵۹:۹) وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں گو انھیں تنگی ہی ہو اور جو شخص اپنے نفس کے بخل سے بچ جائے تو وہی کامیاب ہوں گے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ حرص وطمع سے بچو کہ اسی نے تم سے پہلوں کو تباہ و برباد کیا، اسی نے ان کو آمادہ کیا کہ وہ خون بہائیں اور حرام کو حلال سمجھیں۔ (صحیح مسلم باب تحریم الظلم)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایمان اور حرص ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ (نسائی)

۱۹۔ غیظ وغضب

جذبات بہیمیہ میں اشتعال کا نام غیظ وغضب ہے۔ چونکہ اس اشتعال سے ظلم و تعدی کے راستے کھلتے ہیں۔ اس وجہ سے قرآن اور حدیث نے جذبات پر قابو رکھنے کی تعلیم دی ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے:

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ (آل عمران ۳:۱۳۴) یعنی سچے مسلمان وہ ہیں جو غصے کو دبا جاتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ (شوریٰ ۴۲:۳۷) اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''پہلوان وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کو دبا جاتا ہے۔'' (صحیح مسلم باب من یملک نفسہ عند الغضب)

ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: غصہ نہ کیا کرو۔ اس کو یہ معمولی بات معلوم ہوئی تو اس نے دوبارہ عرض کی آپ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ ''غصہ نہ کیا کرو۔'' (صحیح بخاری مسند احمد ابن حبان وطبرانی باب الترہیب من الغضب)

۲۰۔ عیب لگانا

قرآن مجید میں آتا ہے: وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ (۴۹:۱۱) ایک دوسرے کے خلاف عیب نہ لگاؤ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ عَيَّرَ اَخَاهُ بِذَنْبٍ لَمْ يَمُتْ حَتّٰى يَعْمَلَهُ (ترمذی) جو شخص اپنے کسی بھائی پر گناہ کا عیب لگائے تو جب تک وہ خود اس گناہ میں مبتلا نہ ہوگا نہیں مرے گا۔

اسلام کا نظام معاشرت

معاشرہ کا مفہوم

معاشرہ کا لفظ عشر سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں زندگی بسر کرنا، معاشرہ باہمی زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ اسلام نے معاشرہ کو ترقی کے راستہ پر چلانے اور امن کی فضا قائم کرنے کے لیے چند بنیادی اصول مقرر کیے ہیں۔

اسلامی معاشرہ کے چند بنیادی اصول

ا۔ مساوات

قرآن مجید میں آتا ہے: يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (الحجرات ۴۹: ۱۳) اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے اللہ جاننے والا خبردار ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب ہے۔ (مسند احمد)

۲۔ اخوت

ارشاد الٰہی ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات ۴۹: ۱۰) سب مومن بھائی بھائی ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (المومنون: ۵۲) اور تم سب ایک ہی جماعت ہو۔

حدیث میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان کل مسلم اخو المسلم، ان المسلمین اخوۃ (مستدرک حاکم، طبری، ابن اسحاق) ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔

كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا (بخاری) تم اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ۔

۳۔ اتحاد اور اتفاق

ارشاد الٰہی ہے: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران ۳:۱۰۳) اور سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ نہ کرو۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَاجَآءَ هُمُ الْبَيِّنٰتُ (آل عمران ۳:۱۰۴) اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے تفرقہ کیا اور اختلاف کیا اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی دلیلیں آ چکی ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک عمارت۔ ایک جز و دوسرے جز کو قوت دیتا ہے۔ پھر اپنی انگلیوں کو ملا کر مثال بتائی، اس طرح ایک دوسرے سے مل کر قوت دیتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص سائل آیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے اس شخص کی مجھ سے سفارش کرو تم کو ثواب ہوگا اور اللہ اپنے نبی کی زبان پر جو چاہتا ہے پورا کرتا ہے۔ (بخاری کتاب الادب)

ایک اور حدیث ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تو مومنوں کو ایک دوسرے سے رحم اور محبت اور مہربانی میں ایسا دیکھے گا جیسا کہ بدن میں ایک عضو بیمار ہو جائے تو سارے اعضاء بخار اور بیداری میں اس کے شریک ہو جاتے ہیں۔ (بخاری کتاب الادب)

۴۔ انصاف

قرآن مجید میں آتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (المائدہ ۵:۸) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے انصاف کی گواہی دینے والے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو انصاف کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے اللہ کا تقویٰ کرو اور اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔

۵۔ جان، مال اور آبرو کی حرمت

قرآن مجید میں ارشاد ہے: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل ۱۷:۳۳) اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے سوائے اس کے کہ انصاف چاہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''تمہاری جانیں اور تمھارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسے آج کے دن

کی حرمت ہے۔" (بخاری کتاب الحج)

۶۔ مذہبی آزادی

ارشاد الٰہی ہے: لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْتَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ۲:۲۵۶) دین میں کوئی جبر نہیں ہے ہدایت کی راہ گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔

۷۔ ملکیت میں دوسروں کا حق

ارشاد الٰہی ہے: وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرہ۲:۳) متقی وہ لوگ ہیں کہ جو ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَفِي اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (والذاریت ۱۵:۱۹) اور ان کے مالوں میں سوالی اور نہ مانگنے والے محتاج کا حق ہے۔

۸۔ کسی کو غلام نہ بنایا جائے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ان من شرار الناس الذین یبیعون الناس (بخاری) بہت برے وہ لوگ ہیں جو آدمیوں کو فروخت کرتے ہیں۔

۹۔ ذمہ داری کا احساس

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ (بخاری) تم میں سے ہر ایک نگران اور ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں باز پرس ہوگی۔

۱۰۔ تکریم انسانیت

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو قابل احترام بنایا ہے۔ اس وجہ سے اسلامی معاشرہ میں ہر انسان کا احترام ضروری ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ (بنی اسرائیل ۱۷:۷۰) اور یقیناً ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی ہے۔

ہمارا معاشرہ وحدت کے باوجود کئی حصوں اور اکائیوں میں بٹا ہوا ہے۔ اسلام نے ہر اکائی کے متعلق تعلیم دی ہے۔ اختصار کے ساتھ تمام اکائیوں سے متعلق اسلامی تعلیم کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

عائلی زندگی

نکاح کے فوائد

قرآن مجید سے یہ امر واضح ہے کہ شادی کے پانچ فوائد ہیں: ایک عفت، دوسرا سکون قلب، تیسرا

محبت، چوتھا بقائے نسل، پانچواں حفظ صحت۔

ا۔ عفت

عفت اور پرہیزگاری انسانیت کا ایک قیمتی جوہر ہے اور یہ جوہر شادی سے حاصل ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ (نور ۲۴: ۳۳) اور جو شادی کا سامان نہیں پاتے اپنے تئیں بچائے رکھیں یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے انھیں غنی کر دے۔

صحیح مسلم اور بخاری میں حدیث ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

من استطاع منکم الباءة فلیتزوج فانه اغض للبصر واحصن للفروج ومن لم یستطع فعلیه بالصوم فانه وجاء (بخاری ۳۰:۱) جو کوئی تم میں سے نکاح کی طاقت رکھتا ہو تو چاہیے کہ وہ نکاح کرے کیونکہ نکاح آنکھوں کو نیچے رکھنے اور شرمگاہوں کی حفاظت کا ذریعہ ہے اور جو نکاح کی قدرت نہیں رکھتا تو وہ روزہ رکھے کہ وہ خصی کر دیتا ہے۔

دوسری جگہ قرآن میں آتا ہے: هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عورتیں تمھارے لیے لباس ہیں اور تم عورتوں کے لیے لباس ہو۔ جس طرح لباس ظاہری عریانی کو ڈھانپتا ہے اس طرح شادی شہوت رانی پر پردہ ڈالتی ہے۔

۲۔ سکون قلب

شادی سکون قلب کا ذریعہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا (الاعراف ۷: ۱۸۹) وہ خدا ہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا کہ اس سے سکون حاصل کرے۔

۳۔ نکاح محبت اور رحمت کا ذریعہ ہے

قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (الروم ۳۰: ۲۱) اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ ایک نشانی ہے کہ اس نے تمھارے نفسوں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ ان سے تسکین پاؤ، تمھارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا۔

۴۔ بقائے نسل

قرآن مجید میں آتا ہے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (النساء ۴: ۱) اے لوگو اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا ہے اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

۵۔ حفظ صحت

بعض اوقات غیر شادی شدہ خلاف فطرت ضبط اور بعض اوقات غلط کاریوں کا شکار ہو جانے کی وجہ سے خطرناک قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ شادی خلاف فطرت ضبط اور غلط کاریوں سے بچاتی ہے اور انسان کی صحت برقرار رہتی ہے۔

نکاح کی اہمیت

اسلام نے نکاح کو ایک متبرک اور مقدس معاہدہ قرار دیا ہے، جس میں ہر مسلمان کو شامل ہونا ضروری اور لابدی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (نور۲۴:۳۲) اور جو تم میں سے مجرد ہیں ان کے نکاح کر دو اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بھی جو صلاحیت رکھتے ہوں اگر وہ ضرورت مند ہوں گے تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا اور اللہ فراخی والا جاننے والا ہے۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا (الفرقان ۲۵:۵۴) اللہ وہی ہے جس نے انسان کو پانی سے پیدا کیا پھر اسے نسب اور سسرال والا بنایا۔

خاوند اور بیوی کے حقوق و فرائض

اسلام میں عورت کی حیثیت

اسلام سے قبل ہر قوم اور ہر مذہب میں عورت کو کنیز اور حقیر سمجھا جاتا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے عورتوں کے حقوق متعین کیے اور ان کے مقام کو بلند کیا، وہ بھی انسانی معاشرے کا ایک فرد سمجھی جانے لگیں۔

روحانی نقطہ نگاہ سے عورت کی حیثیت کو مرد کی حیثیت کے برابر قرار دیا گیا۔ ارشاد الٰہی ہے: اَنِّىْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ (سورۃ آل عمران ۳:۱۹۵) میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ (سورۃ المومن ۴۰:۴۰) اور جو نیک عمل کرتا ہے مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو وہ جنت میں داخل ہوں گے۔

مادی لحاظ سے بھی عورت کے حقوق کو مرد کے برابر قرار دیا ہے۔ وہ مرد کی طرح روپیہ کما سکتی ہیں اور جائیداد کی مالک ہو سکتی ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (سورۃ نساء ۴:۳۲) مردوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں۔

عورتوں کو مردوں کی طرح ورثہ کا حق دار ٹھہرایا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ (نساء۴:۷) مردوں کے لیے اس سے ایک حصہ ہے جو ان کے والدین اور قریبی رشتے داروں نے چھوڑا اور عورتوں کے لیے اس سے ایک حصہ ہے جو ان کے ماں باپ اور قریبی رشتہ دار چھوڑیں۔

ایک مستشرق اسلام میں عورت کے رتبہ کے بارہ میں لکھتا ہے۔ آپ نے عورت کو مملوکیت کے درجہ سے نکال کر مالکیت کا درجہ بخشا اور اس کو پہلا ''شرعی'' وارث قرار دیا جس کے اغراض کی حفاظت قانون اسلام پر واجب ہے۔

بیوی کے حقوق

اسلام نے ایک مرد کے لیے ایک عورت کو اپنے حلقہ زوجیت میں لانے کے لیے ایک معاہدہ کا پابند ٹھہرایا ہے، جس کو اسلامی اصطلاح میں نکاح کہا جاتا ہے ارشاد الٰہی ہے:

فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا (نساء۴:۳) ایسی عورتوں سے نکاح کرو جو تمھیں پسند ہوں۔ دو دو اور تین تین اور چار چار اگر تمھیں خوف ہو کہ عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی یا جس کے تمھارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے یہ زیادہ نزدیک ہے تاکہ تم ناانصافی نہ کرو۔

نکاح کے لیے حق مہر اور ولی کا ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فَانْكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (نساء۴:۲۵) سو انہیں ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح میں لاؤ اور ان کو دستور کے موافق ان کے مہر دے دیا کرو۔

اسلام نے عائلی زندگی کو خوش گوار بنانے اور نظم و نسق درست رکھنے کے لیے شوہر اور بیوی دونوں کے لیے فرائض مقرر کر دیے ہیں جن کی بجا آوری سے گھریلو زندگی نمونہ جنت بن جاتی ہے۔

عورتوں کے ساتھ حسن سلوک

قرآن مجید میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق ارشاد ہے: وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (نساء۴:۱۹) اور عورتوں کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي (ترمذی) تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنے اہل کے حق میں بہتر ہو اور میں اپنے اہل کے حق میں تم سے بہتر ہوں۔

أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا وَأَلْطَفُهُمْ لِأَهْلِهِ (ترمذی) سب سے کامل ایمان

والا مومن وہ ہے جو خلق میں سب سے اچھا ہو اور اپنے اہل وعیال سے نرم سلوک کرے۔

نفقہ وسکنیٰ

شوہر کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کے گزارے کے لیے انتظام کرے۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النساء۴:۳۴) مرد عورتوں کے گزارہ کے ذمہ دار ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس لیے کہ انھوں نے اپنے مالوں سے کچھ خرچ کیا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: "چاہیے کہ وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس پر اس کی روزی تنگ ہے تو چاہیے کہ وہ اس سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا۔ اللہ کسی شخص پر کچھ لازم نہیں کرتا مگر اسی کے مطابق جو اسے دیا ہے۔" (سورۃ الطلاق)

باہمی مصالحت

اگر خاوند اور بیوی کے درمیان اختلاف اور بخش پیدا ہو جائے تو دونوں میں مصالحت کرانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (النساء۴:۱۲۸) اور اگر ایک عورت کو اپنے خاوند کی زیادتی یا بے رغبتی کا خوف ہو تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ آپس میں صلح کر لیں اور صلح اچھی چیز ہے۔

حق مہر کی ادائیگی

قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: وَاٰتُوا النِّسَاءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (النساء۴:۴) اور عورتوں کو ان کے مہر بلا بدل دو۔

دوسری جگہ آتا ہے: فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ (النساء۴:۲۵) پس عورتوں کے مقرر شدہ مہر دو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: جن شرطوں کو تم پورا کرتے ہو ان سب میں زیادہ ضروری اس شرط کو پورا کرنا ہے جس کی وجہ سے تم نے عورتوں کے ناموس کو اپنے لیے حلال کیا ہے۔" (بخاری ومسلم)

بیویوں میں عدل

اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَلَّا تَعْدِلُوْا (النساء ۴:۳) پس اگر تمھیں خوف ہو کہ عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی یا جس کے تمھارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے یہ

زیادہ نزدیک ہے تا کہ تم ناانصافی نہ کرو۔

خلع کا حق

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (البقرہ ۲:۲۲۹) اور تمھارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم اس مال سے کچھ لو جو تم نے انھیں دیا ہے سوائے اس کے کہ دونوں کو ڈر ہو کہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے پس اگر تمھیں یہ ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں کر سکیں گے تو پھر ان پر اس کے بارے میں کچھ گناہ نہیں جو عورت فدیہ تو نے دے۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں پس ان سے آگے نہ بڑھو اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھتے ہیں وہی ظالم ہیں۔

باعصمت عورتوں کی عزت کی حفاظت

إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (النور ۲۴:۲۳) جو لوگ پاک دامن بے خبر مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

شوہر کے حقوق

قرآن اور سنت میں ازدواجی زندگی کو استوار رکھنے کے لیے بیوی کے چند فرائض متعین کیے ہیں۔ ان کا بجالانا عورت کے لیے بہت ضروری ہے۔ وہ فرائض حسب ذیل ہیں۔

۱۔ رویہ درست رکھنا۔ ۲۔ اطاعت۔ ۳۔ حفظ غیب۔ ۴۔ گھر کی دیکھ بھال۔

قرآن مجید میں آتا ہے: فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ (النساء ۴:۳۴) نیک عورتیں اپنے خاوندوں کی اطاعت گزار ہوتی ہیں اور ان کی عدم موجودگی میں مال اور آبرو کی حفاظت کرتی ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: المراۃ اذا صلت خمسها وصامت شهرها واحصنت فرجها واطاعت بعلها فتدخل من ای باب الجنة (صحیحین) عورت جب پانچوں وقت نماز ادا کرے اور ماہ رمضان کے روزے رکھے اور اپنی آبرو کی حفاظت کرے اور اپنے خاوند کی اطاعت کرے تو جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔ لو كنت امرا احدا ان يسجد لا حد لامرت المراة ان تسجد لزوجها (مشکوٰۃ المصابیح باب عشرۃ النساء صفحہ ۲۸۳) اگر میں کسی کو کسی کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔

گھر کی دیکھ بھال کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: المرأة راعية على بيت زوجها وهي مسئولة یعنی عورت اپنے خاوند کے گھر نگران ہے اور جواب دہ ہے۔

والدین کے حقوق

نیک سلوک

قرآن اور حدیث میں والدین پر بہت زور دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (النساء ۴:۳۶) اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے: وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا (العنکبوت ۲۹:۸) اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔

شکر گزاری

اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ (لقمان ۳۱:۱۴) ہم نے انسان کو وصیت کی کہ وہ میرا شکر ادا کرے اور اپنے والدین کا۔

ادب اور نرمی سے گفتگو کرنا

فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (بنی اسرائیل ۱۷:۲۳) تو ان کو اُف تک نہ کہہ اور نہ ان کو جھڑک اور ان سے ادب کے ساتھ گفتگو کر۔

عاجزی سے پیش آنا

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (بنی اسرائیل ۱۷:۲۴) اور ان دونوں کے آگے رحم کے ساتھ عاجزی کا بازو جھکا۔

اطاعت بالمعروف

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (العنکبوت ۲۹:۸) اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ سے نیکی کرنے کا تاکیدی حکم دیا ہے اور اگر وہ تجھ پر زور دیں کہ میرے ساتھ دوسروں کو شریک کرے جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی بات نہ مان تمھیں میری طرف لوٹ کر آنا ہے۔ پس میں تمھیں بتاؤں گا جو تم کرتے ہو۔"

دوسری جگہ آیا ہے: ''اور اگر وہ تجھ پر زور دیں کہ میرے ساتھ اسے شریک کرے جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی بات نہ مان اور دنیا میں ان کا اچھی طرح ساتھ دے اور اس کے راستہ کی پیروی کر جو میری طرف رجوع کرتا ہے پھر میری طرف تمہارا لوٹ کر آنا ہے سو میں تمھیں بتاؤں گا جو تم کرتے ہو۔'' (لقمان ۳۱:۱)

والدین کی اندھی تقلید جہالت ہے

ارشاد الٰہی ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَآ أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (البقرہ ۲:۱۷۰) اور جب انھیں کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے اتارا ہے کہتے ہیں بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا اگرچہ ان کے بڑے نہ کچھ عقل سے کام لیتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں۔

دعا

وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۲۴) اور کہہ میرے رب تو ان پر رحم کر جس طرح انھوں نے مجھے چھوٹے ہوتے پالا۔

والدین کے لیے خرچ کرنا

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ مَآ أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ (البقرہ ۲:۲۱۵) تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ جو کچھ بھی اچھے مال سے خرچ کرو پس وہ والدین کے لیے ہے۔

اولاد کے حقوق

افلاس کے خوف سے قتل نہ کرو

قرآن مجید میں آتا ہے: وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۱) اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے نہ مار ڈالو ہم ہی انھیں رزق دیتے ہیں اور تمھیں بھی ان کا مار ڈالنا بڑی غلطی ہے۔

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے: قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام ۶:۱۴۱) بے شک وہ گھاٹے میں ہیں جنھوں نے اپنی اولاد کو بے وقوفی سے لاعلمی میں قتل کر دیا۔

اولاد کی صحت اور تعلیم وغیرہ سے غفلت بھی قتل اولاد میں شامل ہے۔

اولاد کی تربیت

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (تحریم ۶۶:۶) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو

اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایک آدمی کا اپنی اولاد کو ادب دینا ایک صاع خیرات کرنے سے بہتر ہے۔'' (ترمذی)

''کسی باپ نے اپنی اولاد کو نیک ادب سے افضل کوئی عطیہ نہیں دیا۔'' (ترمذی)

شفقت ومہربانی

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک اعرابی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: کیا تم بچوں کو چومتے ہو، ہم تو انھیں نہیں چومتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تیرے لیے میرے اختیار میں ہے جب کہ اللہ نے تیرے دل سے رحمت کا جذبہ ہی کھینچ لیا ہے۔

عفو اور درگزر کرنا

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (التغابن۶۴:۱۴) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمھارے دشمن بھی ہیں سو ان سے بچتے رہو اور اگر تم معاف کرو اور درگزر کرو اور بخش دو تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اصلاح کرنا

وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ (احقاف۴۶:۱۵) میرے لیے میری اولاد کی اصلاح کر۔

میراث

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فَاِنْ كُنَّ نِسَاۗءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ (نساء۴:۱۱) اللہ تمہاری اولاد کے متعلق تمھیں تاکیدی حکم دیتا ہے مرد کے لیے دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہو پھر اگر اولاد میں دو یا اس سے اوپر عورتیں ہوں تو ان کے لیے اس کی دو تہائی ہے اور اگر اکیلی ہو تو اس کے لیے نصف ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ''جب بچہ پیدا ہو کر روئے تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے اور وارث قرار دیا جائے۔

نکاح

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ (النور۲۴:۳۲) اور جو تم میں سے مجرد ہیں ان کے نکاح کردو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے اس کا اچھا نام رکھنا چاہیے اور جب بالغ ہو جائے تو اس کی شادی کرنی چاہیے۔ اگر وہ بالغ ہو اور اس کی شادی نہ ہو اور اس نے

گناہ کیا تو اس کا گناہ باپ کے سر ہے۔

رشتہ داروں کے حقوق

اسلام نے اقرباء کے بارہ میں تفصیلی ہدایات دی ہیں اور ان کے حقوق بیان کیے ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں۔

حسن سلوک

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِي الْقُرْبٰى (البقرہ ۲:۸۳) اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک اور دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ بھی۔

صلہ رحمی

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ (النساء ۴:۱) اللہ کے حقوق کی جس کے ذریعہ سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رحموں کی نگہداشت کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ''جس کو یہ پسند ہو کہ اس کے رزق میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو اسے صلہ رحمی کرنا چاہیے۔'' (بخاری)

مالی امداد

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ (الروم ۳۰:۳۸) پس تو قرابت دار کو اس کا حق ادا کرو۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (بنی اسرائیل ۱۷:۲۶) اور رشتہ داروں کا حق ادا کرو۔

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى (البقرہ ۲:۱۷۶) حقیقی نیکی یہ ہے کہ مال کی محبت کے باوجود اقرباء کو دے۔

یتامیٰ کے حقوق

انسانی سوسائٹی میں یتامیٰ کمزور لیکن اہم جزو ہیں۔ اسلام نے ان کے حقوق متعین کر دیے ہیں اور مسلمانوں کو پابند بنایا ہے کہ وہ ان کی نگہداشت کریں۔

نیک سلوک

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى (النساء ۴:۳۶) اور ماں باپ رشتہ دار اور رشتوں کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو کسی یتیم لڑکی یا یتیم لڑکے کے ساتھ نیک سلوک

کرے گا جو اس کے پاس ہے تو میں اور وہ جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح اکٹھے ہوں گے۔" اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انگلیوں کو ملا کر دکھایا۔

یتیموں کی عزت

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ (الفجر ۸۹:۱۷) ہرگز نہیں بلکہ یتیم کی عزت نہیں کرتے۔

فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ (الضحیٰ ۹۳:۹) یتیم کو کبھی نہ جھڑکو۔

کھانے کی امداد

يُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا (الدھر ۷۶:۸) اور اس کی محبت کی وجہ سے مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

یتیم کی جائیداد کی حفاظت

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ (الانعام ۶:۱۵۲) اور یتیم کے مال کے قریب نہ پھٹکو مگر ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو یہاں تک کہ وہ سن بلوغت کو پہنچ جائے۔

سدھارنا

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ (۲:۲۲۰) اور لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یتیموں کے متعلق پوچھتے ہیں ان کو کہہ دیجئے کہ ان کے اخلاق کو سدھارنا بہتر ہے۔

انصاف

وَأَن تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ (نساء ۴:۱۲۰) اور یہ کہ یتیموں کے بارہ میں انصاف کے ساتھ قائم رہو۔

پڑوسی اور ساتھی کے حقوق

حسن سلوک

وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا (نساء ۴:۳۶) اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور قریبیوں کے ساتھ بھی اور یتیموں اور مسکینوں اور قریبی پڑوسی اور دور کے پڑوسی اور پاس والے ساتھی اور مسافر اور ان کے ساتھ بھی جن کے تمھارے داہنے

ہاتھ مالک ہوئے اللہ اسے پسند نہیں کرتا جو تکبر والا اور فخر کرنے والا ہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جبرائیل مجھے ہمسایہ کی نسبت ہمیشہ تاکید کرتے رہے یہاں تک کہ مجھے گمان ہوا کہ وہ ہمسایہ کو وارث بنا دیں گے۔ (بخاری ومسلم)

''وہ شخص کامل ایمان والا نہیں ہے جو خود تو سیر ہو کر کھانا کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔''

مسافروں اور مہمانوں کے حقوق

وَابْنِ السَّبِيْلِ (النساء۴:۳۶) اور نیک سلوک کرو مسافر کے ساتھ۔

اسلام نے باضابطہ طور پر مسافروں کا حصہ مال غنیمت میں رکھ دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (سورہ الانفال ۸:۴۱) اور جان لو کہ جو چیز تم فتح پا کر حاصل کرو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور قریبیوں کے لیے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے۔

مہمانوں کی تکریم کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان لایا اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔

محتاجوں کے حقوق

وَالْمَسٰكِيْنِ (النساء۴:۳۶) اور مسکینوں کے ساتھ نیکی کرو۔

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے: وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا (الدھر ۷۶:۸) اور اس کی محبت کی وجہ سے مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ عام طور سے کسی مسکین کے بغیر کھانا نہ کھاتے تھے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کوئی محتاج اور سوالی آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ سے فرماتے کہ تم سفارش کرو تو تمھیں بھی ثواب ملے گا۔

بیمار کے حقوق

ارشاد الٰہی ہے: وَلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ (النور۲۴:۶۱) اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ''جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اس کی معافی کی دعا مانگتے ہیں اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی معافی مانگتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں، جس میں سے ایک یہ ہے کہ جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کی جائے۔

ملازم کے حقوق

ارشاد الٰہی ہے: وبالوالدین احسانا ...... وما ملکت ایمانکم (نساء۴:۳۶) اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو...... اور ان سے جن کے تمھارے اپنے ہاتھ مالک ہوئے۔

حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں: لونڈی، غلام تمھارے بھائی بہن ہیں، خدا نے ان کو تمھارے ماتحت کر دیا ہے تو جس کے بھائی بہن کو اللہ تعالیٰ اس کے ماتحت کر دے اس کو چاہیے کہ جیسا وہ خود کھاتا ہے ویسا ہی ان کو کھلائے اور جیسا خود پہنتا ہے ویسا ہی ان کو پہنائے۔ ان کو ایسے کام کی تکلیف نہ دے جو ان کی طاقت سے باہر ہو۔ اگر کبھی ایسا کام پیش آ جائے تو خود اس کام میں اس کی مدد کرے۔ (بخاری)

حضرت امّ سلمہؓ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس میں تین خصلتیں ہوں خدا اس کی موت کو آسان کر دیتا ہے اور اسے جنت میں داخل کرے گا: ۱۔ ناتواں اور کمزوروں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنا۔ ۲۔ والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔ ۳۔ غلام سے احسان کرنا۔

مسلمانوں کے باہمی حقوق

اخوت

اسلام نے مسلمانوں کو وحدت اور اخوت کی ایک لڑی میں منسلک کر دیا ہے اور وہ جسم کے مختلف اعضاء کی طرح ہیں کہ اگر کسی ایک عضو کو کلیف پہنچے تو تمام جسم اس تکلیف اور درد میں شریک ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖۤ اِخْوَانًا (آل عمران ۲:۱:۳:۱) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے اور تم نہ مرو مگر اس حالت میں کہ تم حقیقی فرمانبردار ہو اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو اور اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو تم آپس میں دشمن تھے اس نے تمھارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اللہ کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے ایک دوسرے سے محبت کرنے، رحم کرنے اور شفقت کرنے کی مثال ایک جسم کی طرح ہے کہ جب ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ (مسلم)

ایک روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط کرتا ہے۔ (مسلم)

جان کی حرمت

قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا اَلِيْمًا (النساء۴:۹۳) اور جو کوئی کسی مسلمان کو عمداً قتل کرتا ہے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اللہ کا غضب اور اس کی لعنت اس پر ہے اور اس نے اس کے لیے درد ناک عذاب تیار کیا ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: لاترجعوا بعدی کفار یضرب بعضکم رقاب بعض. یعنی میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔

ایک اور حدیث ہے: سباب المومن فسوق و قتال کفر (مسلم) کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے۔

تکفیر بازی سے اجتناب

مسلمانوں کے زوال کی ایک وجہ تکفیر بازی ہے۔ فروعی اور معمولی اختلاف کی وجہ سے علماء نے ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگائے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید میں آتا ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (النساء۴:۹۴) اور جو شخص تیرے سامنے اسلام کا اظہار کرے تو اس سے تم یہ نہ کہو کہ تم مسلمان نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو کافر کہتا ہے تو کفر ان دونوں میں سے کسی ایک پر لوٹ آتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کے باہمی حقوق و فرائض نہایت عمدگی کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا مال، اس کی عزت اور اس کا خون حرام ہے۔ کسی مسلمان کے لیے یہ برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو بنظر حقارت دیکھے۔ (مسلم)

دشمن کے حقوق

عدل وانصاف

اسلام دشمنوں کے ساتھ عدل و انصاف کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ

امنوا کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط ولا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون (المائدہ ۸:۵) اے ایمان والو! اللہ کے حقوق کی حفاظت کرنے والے انصاف کی گواہی دینے والے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو یہ تقوی سے قریب تر ہے اور اللہ کا تقوی کرو بے شک اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔

ظلم سے گریز

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین (البقرہ ۲:۱۹۰) جو لوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی ان کے ساتھ اللہ کے راستہ میں لڑو لیکن زیادتی نہ کرو کیونکہ زیادتی کرنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔

دغابازی سے بچنا

واما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیھم علی سواء ان اللہ لا یحب الخآئنین (الانفال ۸:۵۸) اگر تم کو کسی قوم کی طرف سے دغابازی کا خوف ہو تو مساوات کو ملحوظ رکھ کر ان کے عہد کو ان کی طرف پھینک دو یقیناً اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

صلح کی طرف مائل ہونا

وان جنحوا للسلم فاجنح لھا وتوکل علی اللہ انہ ھو السمیع العلیم (الانفال ۸:۶۱) اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

دین کے بارہ میں زبردستی

لا اکراہ فی الدین (البقرہ ۲:۲۵۶) دین میں کسی قسم کی زبردستی نہیں۔

غیر مسلموں کے حقوق

اس عنوان پر بحث ''اسلامی حکومت'' کے ضمن میں آئے گی۔

جانوروں کے حقوق

اللہ تعالیٰ نے انسان کے منافع اور فائدہ کے لیے جانوروں کو پیدا کیا ہے جبکہ انسان جانوروں سے فوائد حاصل کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر کچھ فرائض متعین کیے ہیں۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّا اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ (الانعام ۶:۳۸) اور زمین میں کوئی جاندار نہیں اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے دو پروں سے اڑتا ہے مگر وہ بھی تمہاری طرح جماعتیں ہیں۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ جس طرح تم اپنی جماعتوں کے آرام اور آسائش کا خیال رکھتے ہو اسی طرح تم کو جانوروں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرنا چاہیے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین آدمیوں کو بہت گناہگار قرار دیا ہے۔ ایک جس نے کسی عورت سے شادی کی اور اس سے لطف اندوز ہوا، پھر بعد میں اس کو طلاق دے دی اور مہر ادا نہ کیا۔ دوسرے جس نے کسی مزدور سے کام لیا اور اجرت نہ دی۔ تیسرے جس نے کسی جانور کو بیکار ہلاک کر دیا۔ (مستدرک حاکم جلد۲)

ایک مرتبہ جہاد کے ایک سفر میں صحابہ کرام ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے۔ چڑیا بچوں کی محبت کی وجہ سے صحابہ کے اردگرد بے قراری میں منڈلانے لگی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا تو پوچھا کہ اس کے بچوں کو پکڑ کر کس نے بے قرار کیا ہے؟ ان کو فوراً چھوڑ دو۔

بعض صحابہؓ نے چیونٹیوں کے گھر جلا دیے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہوا تو فرمایا: آگ کی سزا دینا صرف خدا کے لیے سزاوار ہے۔ (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی کراہۃ احتراق العدو فی النار)

ایک عورت کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہ صرف اس وجہ سے عذاب الٰہی میں مبتلا ہے کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا تھا اور اس کو کھانا نہ دیا تھا۔ آخر وہ بھوک سے مرگئی۔

اسلام کا نظام سیاست

اسلام کا یہ اساسی اور بنیادی عقیدہ ہے کہ حقیقی حاکمیت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور انسان اس کا نائب ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف ۱۲:۴۰) یعنی اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔

فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (المومن ۴۰:۱۲) پس حکم اللہ کا ہی ہے جو سب سے بلند اور سب سے بڑا ہے۔

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ (الاعراف ۷:۲۸) درحقیقت زمین اللہ کی ہے۔ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔

خلیفہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نائب ہے

اسلام کی رو سے خلافت کی دو قسمیں ہیں: خلافت خاصہ اور خلافت عامہ۔

خلافت خاصہ سے مراد وہ خلافت ہے جب اللہ تعالیٰ کسی انسان کو لوگوں کی ہدایت کے لیے مامور کرتا ہے۔ تو تمام مامورین خلافت خاصہ کے حامل ہوتے ہیں۔

خلافت عامہ جب کوئی مامور وفات پا جائے تو اس کے مشن کو چلانے کے لیے اس کا نائب خلافت عامہ کا حامل ہوتا ہے۔

کسی مامور کے جانشین کو اللہ کا خلیفہ بنانا سخت غلطی اور علمی لغزش ہے۔ اسی وجہ سے جب حضرت ابوبکرؓ کو بعض لوگوں نے خلیفۃ اللہ کہنا شروع کیا تو آپ نے ایسا کہنے سے منع فرما دیا اور کہا: لست خليفة الله ولكني خليفة رسول الله صلى الله عليه وسلم میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں میں تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلیفہ ہوں۔

خلیفہ یا امیر کی ضرورت

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: الوالي من الرعية كالروح من الجسد (کنوز الحقائق حدیث۱۰۲) حاکم رعیت میں ایسا ہے جیسے روح جسم میں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا: اسلام بغیر جماعت کے نہیں اور جماعت امارت کے بغیر نہیں۔

خلیفہ کا انتخاب

اسلام موروثی خلافت اور امارت کو جائز قرار نہیں دیتا۔ اسلام انعقاد خلافت کے لیے انتخاب کو لازمی قرار دیتا ہے اور انتخاب عوام یا ارباب حل وعقد کے ذریعہ ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے: وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (الشوریٰ ۴۲:۳۸) مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ آپس میں باہمی مشاورت سے کاروبار چلائیں۔

خلیفہ کا معزولی

اگر خلیفہ یا رئیس مملکت پاگل ہو جائے یا اور کسی وجہ سے معذور ہو جائے یا قرآن اور حدیث کے بتائے ہوئے رستہ سے ہٹ جائے تو اس کو مسلمانوں کی قیادت وسیادت سے الگ کر دیا جائے گا۔

خلیفہ کے اوصاف

۱۔ متقی

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات ۴۹:۱۳) اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تم کو کنبوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو البتہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم ومحترم وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

۲۔ علم وحواس اور اعضاء کی سلامتی

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰہُ عَلَیْکُمْ وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (البقرہ ۲:۲۴۷) یقیناً اللہ نے اسے تمھارے مقابلہ میں اس کو چن لیا ہے اور اسے علم اور جسم میں کشادگی دی ہے۔

یہ آیت خلیفہ کے لیے علم اور حواس اور اعضاء کی سلامتی کو ضروری قرار دیتی ہے۔

علم سے مراد صرف لکھنا پڑھنا ہی نہیں بلکہ وہ علم مراد ہے کہ جس سے انسان کے اندر معاملہ فہمی، ژرف نگاہی اور مسائل کے حل کرنے کا ملکہ پیدا ہو جائے۔

حواس اور اعضاء کی سلامتی اس وجہ سے ضروری ہے کہ نقص سے ایک تو کارکردگی پر اثر پڑتا ہے۔ دوم، دل میں نفرت پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ کفایت

کفایت سے مراد سیاست حاضرہ اور زمانے کے تقاضوں کو اچھی طرح جاننا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (ص ۳۸:۲۰) یعنی ہم نے داؤد علیہ السلام کو حکمت اور فیصلہ کن بات کرنے کی صلاحیت دی۔

۴۔ امین

قَالَ اجْعَلْنِي عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّي حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ (یوسف ۱۲:۵۵) یوسف نے کہا کہ مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کیجیے میں حفاظت کرنے والا اور باخبر ہوں۔

خلیفہ کے اختیارات

اسلام جمہوریت کا حامی ہے۔ اس وجہ سے خلیفہ یا رئیس مملکت ہر معاملہ میں عوام کے سامنے جواب دہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (نساء ۴:۵۴) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے میں سے حاکم کی اگر تمہارا حاکم سے کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کے مطابق کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: **لاطاعة في معصية انما الطاعة في المعروف** (بخاری) معصیت میں کوئی فرمانبرداری نہیں اطاعت صرف نیکی میں ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے مسند خلافت پر بیٹھتے ہوئے سب سے پہلے یہ خطبہ دیا:

اے لوگو! میں تمہارا ولی بنایا گیا ہوں حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا کام کروں تو میری مدد کرو۔ اگر میں بھٹکوں تو مجھے راہ راست پر لانا۔

خطبہ کے آخر میں فرمایا:

"میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ اور اس کے احکام کی تابعداری کروں۔ اگر میں ذرہ بھر بھی راہ مستقیم سے ہٹوں تو مجھے سیدھا کرنا۔"

صحابہؓ کے قول نے اور بھی واضح کر دیا کہ خلیفہ عوام کے سامنے جواب دہ ہے۔ صحابہؓ نے فرمایا:

"اگر تو ٹیڑھا چلے گا تو ہم اپنے تیزوں کی اینوں سے آپ کو سیدھا کریں گے۔"

شہریت کے حقوق

جان و مال اور عزت کی حفاظت

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل ۱۷:۳۳) کسی جان کو جسے اللہ

نے حرام کیا ہے حق کے بغیر قتل نہ کرو۔

لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (البقرہ۲: ۱۸۸) اپنے مال آپس میں ناجائز طریقوں سے مت کھاؤ۔

لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ (الحجرات ۴۹: ۱۱) کوئی قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: كل المسلم على المسلم حرام دمه وماله وعرضه (مسلم) مسلمان کی ہر چیز مسلمان پر حرام ہے اس کا خون بھی اس کا مال بھی اور اس کی آبرو بھی۔

شخصی آزادی

اسلامی ریاست میں ہر شخص کی آزادی محفوظ ہوگی جب تک کہ وہ اسے دوسروں کے مفاد کو نقصان پہنچانے میں استعمال نہیں کرتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لايوسر رجل في الاسلام بغير عدل (موطا) اسلام میں کوئی شخص بغیر عدل کے قید نہیں کیا جاسکتا۔

مذہبی آزادی

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ۲: ۲۵۶) دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (۱۰۹: ۶) یعنی تمھارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔

قانونی مساوات

اسلامی ریاست کا ہر شہری خواہ وہ امیر ہو یا غریب، قانون کی نظر میں برابر ہوتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (البقرہ۲: ۲۸۵) رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اللہ کی طرف سے اتاری گئی اور مومنین بھی۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدہ: ۴۸) پس تم لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کرو اور اس قانون حق کو چھوڑ کر جو تمھارے پاس آیا لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (المائدہ ۵: ۴۴) اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے پس وہ لوگ کافر ہیں۔

معاشرتی مساوات

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ

اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (الحجرات ۴۹:۱۳) اے لوگو! ہم نے تمھیں مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف شاخوں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو اللہ کے نزدیک وہی عزت والا ہے جو زیادہ متقی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: "لوگو! ہاں بیشک تمہارا رب ایک ہے۔ یادرکھو عربی کو عجمی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔ (مسند احمد)

عدل وانصاف

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (النحل ۱۶:۹۰) اللہ تعالیٰ تمھیں عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء ۴:۵۸) اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (المائدہ ۵:۸) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے انصاف کی گواہی دینے والے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ سے ڈرو اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔

تعلیم کا انتظام

قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (زمر ۳۹:۹) کہہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

خذالحکمۃ و لا یضرک من ای وعاءٍ خرجت تو علم و حکمت حاصل کر۔ وہ جس برتن سے بھی نکلے تجھے نقصان نہیں ہوگا۔

فرمایا۔ الکلمۃ الحکمۃ ضالۃُ المومن فحیث وجدھا فھو احق بھا (۳۹:۱۹) حکمت کی بات مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے پس جہاں وہ پائے وہ اس کو لینے کا زیادہ حق دار ہے۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ جس عبادت میں علم شامل نہ ہو اس میں کوئی خیر نہیں اور جس علم میں فہم نہیں اس میں بھی کوئی بھلائی نہیں اور جس قرأت میں تدبر نہ ہو اس میں بھی کوئی خیر نہیں (دارمی کتاب العلم)

آزادی اجتماع کا حق

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران ۳:۱۰۴) اور چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو بھلائی کی طرف بلائے اور نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

نجی زندگی کی حفاظت

وَلَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا (النور ۲۴:۲۷) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ اجازت نہ لے لو۔

ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (النساء ۴:۱۴۸) اللہ بری بات کے مشہور کرنے کو پسند نہیں کرتا سوائے اس کے جس پر ظلم کیا گیا ہو۔

مذہبی دل آزاری سے تحفظ

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (الانعام ۶:۱۰۸) ان بتوں کو برا بھلا نہ کہو جنھیں یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں۔

آزادی سکونت

سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ (العنکبوت ۲۹:۲۰) زمین میں چلو پھرو پھر دیکھو کس طرح اس نے پہلی بار پیدا کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کونوا حیث شئتم و بیننا و بینکم ان لاتفسکوا دما ولا تقطعوا سبیلا ولاتظلموا احداً (نیل الاوطار) تم جہاں چاہو رہو اور ہمارے اور تمھارے درمیان صرف یہ شرائط ہیں کہ نہ تم خون ریزی کرو اور نہ تم راہ زنی کرو اور نہ کسی پر ظلم کرو۔

کسی کو غلام نہ بنایا جائے

ان من شرار الناس الذین یبیعون الناس (بخاری) بہت برے وہ لوگ ہیں جو آدمیوں کو فروخت کرتے ہیں۔

اشرار الناس الذین یشترون الناس و یبیعونھم (ترمذی) برے لوگ وہ ہیں جو انسانوں کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔

ملکیت کا حق

وَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ۶۲:۱۰) خدا کے فضل کی تلاش کے لیے زمین میں پھیل جاؤ۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (النجم۵۳:۳۹) کہ انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہی جو وہ کوشش کرتا ہے۔

کُلُّ امْرِیءٍ بِمَا کَسَبَ رَهِیْنٌ (الطور۵۲:۲۱) ہر آدمی اپنے کیے کا پھل پانے کا حق دار ہے۔

اسلام ذاتی ملکیت کو جائز قرار دیتا ہے لیکن محدود اور چند اخلاقی، معاشرتی اور قانونی پابندیوں کے ساتھ۔ اگر کمانے والا ان پابندیوں پر کاربند نہیں رہتا تو حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ مفاد عامہ کے لیے اس کو ملکیت سے دست بردار کر دے۔

بیرونی خطرات سے حفاظت

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا (ال عمران ۳:۲۰۰) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو صبر کرو اور مقابلہ میں بڑھ کر صبر دکھاؤ اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کرو۔

حکومت کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ ملک کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے سرحدوں کی حفاظت کرے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّکُمْ وَاٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اللّٰهُ یَعْلَمُهُمْ (الانفال ۸:۶۰) اور تم ان کے لیے تیار کرو جو کچھ کر سکتے ہو قوت اور سرحدوں پر گھوڑے باندھنے سے تم اس کے ذریعہ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو ڈراؤ گے اور ان کے علاوہ دوسروں کو بھی جن کو تم نہیں جانتے اللہ ان کو جانتا ہے۔

غیر مسلم رعایا کے حقوق

غیر مسلم رعایا کی دو قسمیں ہیں: ایک معاہد جو کسی صلح نامے یا معاہدے کے ذریعہ اسلامی حکومت کے زیر اثر آئے ہوں۔ دوسرے اہل العنوہ یعنی لڑائی میں شکست کھا کر مغلوب ہوئے ہوں۔

معاہدین کے متعلق تعلیم

اہل نجران کے عیسائیوں کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک تحریری معاہدہ کیا، اس میں معاہدین کے حقوق بیان ہوئے ہیں۔ اسکا اردو ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

"نجران اور اس کے اطراف کے باشندوں کی جانیں، ان کا مذہب، ان کی زمینیں، ان کا مال، ان کے حاضر و غائب، ان کے قافلے، ان کے قاصد، ان کی مورتیں اللہ کی امان اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ضمانت میں ہیں۔ ان کی موجودہ حالت میں کوئی تغیر نہ کیا جائے گا اور نہ ان کے حقوق میں سے کسی

حق میں دست اندازی کی جائے گی اور نہ مورتیں بگاڑی جائیں گی۔ نہ کوئی اسقف اپنی اسقفیت سے، کوئی راہب اپنی رہبانیت سے، کنیسہ کا کوئی منتظم اپنے عہدہ سے نہ ہٹایا جائے گا اور جو بھی کم یا زیادہ ان کے قبضہ میں ہے اسی طرح رہے گا۔ ان کے زمانہ جاہلیت کے کسی جرم یا خون کا بدلہ نہ لیا جائے گا۔ نہ ان سے فوجی خدمت لی جائے گی اور نہ ان پر عشر لگایا جائے گا اور نہ اسلامی فوج ان کی سرزمین کو پامال کرے گی۔ ان میں سے جو شخص اپنے کسی حق میں مطالبہ کرے گا تو اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا وہ میری ضمانت سے بری ہے۔ اس صحیفہ میں جو لکھا گیا ہے اس کے ایفا کے بارہ میں اللہ کی امان اور محمد النبی کی ذمہ داری ہے یہاں تک کہ اس بارہ میں خدا کا کوئی دوسرا حکم نازل نہ ہو۔ جب تک وہ لوگ مسلمانوں کے خیر خواہ رہیں گے ان کے ساتھ جو شرائط کیے گئے ہیں ان کی پابندی کریں گے۔ ان کو ظلم سے کسی بات پر مجبور نہ کیا جائے گا۔[1]

ایک اور حدیث ہے:

''خبردار جو شخص کسی معاہدہ پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالے گا یا اس سے اس کی مرضی کے خلاف کوئی چیز حاصل کرے گا اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث بنوں گا۔''

مفتوحین کے حقوق

ا۔ روزی اور کفاف کا ذمہ

اہل ذمہ اپنی روزی کمانے سے عاجز آ جائے تو اس کے گزارہ کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا جائے گا۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اپنے عامل عدی بن ارطاۃ کو حکم بھیجا کہ اپنے علاقہ کے ذمیوں کے حالات معلوم کرو جو بوڑھے ہو چکے ہوں اور روزی کمانے کے قابل نہیں ہیں تو ان کے گزران کے لیے بیت المال سے وظیفے مقرر کیے جائیں۔

حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے ذمی کو دیکھا کہ در در بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ آپ نے اس سے فرمایا: ہم نے تمھارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، جب تم جوان تھے اور کماتے تھے تو ہم نے تم سے جزیہ وصول کیا۔ اب جب تم کمانے کے قابل نہیں رہے اب ہم نے تم کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اس کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔[2]

اگر ذمی دشمن کے قبضہ میں آ جائے اور فدیہ دے کر چھڑانے کی ضرورت پیش آئے تو اس کا فدیہ بیت المال سے دیا جائے گا۔[3]

---

1. فتوح البلدان بلاذری ص ۶۷ مطبوعہ مصر و کتاب الخراج امام یوسف بحوالہ دین رحمت مصنفہ شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۲۳۸۔
2. کتاب الاموال ابو عبیدہ صفحہ ۴۶۔ 3. کتاب الاموال ابو عبیدہ ص ۱۲۷۔

۲۔ جان کی حفاظت

اسلامی حکومت میں ذمیوں کی جان مسلمانوں کی جان کے برابر ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کرے گا تو قاتل کو مقتول کے قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ اگر مقتول کے ورثاء قصاص لینے کی بجائے خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں تو قاتل کو خون بہا دینا پڑے گا۔

بیہقی نے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ایک مسلمان نے ایک ذمی اہل کتاب کو قتل کر دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے مقدمہ پیش ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ پر ذمی کے عہد کو پورا کرنے کی زیادہ ذمہ داری ہے اور مسلمان کو قصاص میں قتل کر دیا۔[1]

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے کسی ذمی کو قتل کر دیا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا۔ حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی دوری سے محسوس ہوگی۔

(بخاری، احمد)

۳۔ مال کی حفاظت

ذمی کی جان کی حفاظت کی طرح اس کے مال کی حفاظت بھی اسلامی حکومت کے ذمہ ہے۔ صعصہؓ سے روایت ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے پوچھا کہ ہم لوگ جب ذمیوں کی بستیوں سے گزرتے ہیں تو ان کی چیزوں میں سے کوئی چیز لے لیتے ہیں۔ انھوں نے پوچھا بلا قیمت؟ میں نے عرض کیا ہاں بلا قیمت۔ ابن عباسؓ نے فرمایا: آخر تم لوگ اس بارے میں کہتے کیا ہو کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ انھوں نے فرمایا تم لوگ وہی بات کہتے ہو جو اہل کتاب کہتے ہیں کہ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ[2]

حضرت عمرؓ جابیہ میں تھے کہ ایک ذمی نے آ کر ان سے شکایت کی کہ لوگوں نے اس کا انگوروں کا باغ تباہ کر دیا ہے۔ حضرت عمرؓ تحقیق کے لیے خود وہاں گئے دیکھا کہ ان کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب ڈھال میں انگور لیے جا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اچھا آپ بھی ہیں۔ انھوں نے جواب دیا: یا امیرالمومنین بھوک شدت سے لگی ہوئی تھی، اس وجہ سے یہ حرکت کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ باغ کے مالک کو اس کے انگوروں کی قیمت ادا کر دی جائے۔[3]

مذہبی حقوق

ذمی اپنی بستیوں میں مذہبی فرائض بجالانے میں آزاد ہیں اور ان کے مذہبی حقوق پر کسی قسم کی

۱۔ سنن بیہقی ج ۸ ص ۳۰، ۳۱۔ ۲۔ کتاب الاموال ابوعبیدہ ص ۱۴۹۔

۳۔ کتاب الاموال ابوعبیدہ ص ۱۵۱۔

پابندی عائد کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ ابوعبیدہؒ نے تلوار کے ذریعے فتح کیے ہوئے مقامات کی ایک فہرست دینے کے بعد لکھا ہے:

''یہ سارے مقامات بزور شمشیر فتح ہوئے ہیں اور ان میں ان کے باشندوں کو ان کے مذہب و شریعت کی پوری آزادی کے ساتھ بسنے کی اجازت دی گئی ہے۔''[1]

۱۔ تحفظ عزت

ذمی کو تکلیف دینا ویسا ہی ناجائز ہے جیسے ایک مسلمان کو۔ چنانچہ درالمختار میں لکھا ہے: ''اس کو تکلیف دینے سے باز رہنا واجب ہے اور اس کی غیبت اسی طرح حرام ہے جیسی مسلم کی غیبت حرام ہے۔''[2]

۲۔ شخصی معاملات

ذمیوں کے اپنے مذہب کے قانون میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ اسلامی عدالت میں ان کے قانون کے مطابق ہی فیصلے ہوں گے۔ خلفاء راشدین کے دور میں اسی پر عمل ہوتا رہا۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے حسن بصریؒ سے پوچھا: کیا وجہ ہے کہ خلفاء راشدین نے ذمیوں کے محرمات کے ساتھ نکاح اور شراب اور سور کے معاملہ میں آزاد چھوڑ دیا؟''

حسن بصریؒ نے جواب دیا:

''انھوں نے جزیہ دینا اسی وجہ سے قبول کیا ہے کہ انھیں ان کے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی دی جائے۔ آپ کا کام انہی کے نقش قدم کی پیروی کرنا ہے اور اپنی طرف سے کوئی نئی بات ایجاد نہیں کرنی چاہیے۔''[3]

تاریخ سپین کا مصنف لکھتا ہے:

''جن عیسائیوں نے مفتوحہ ملک میں رہنا پسند کیا ان کے جان و مال کی پوری حفاظت کی گئی۔ انھیں پورا حق حاصل تھا کہ اپنے طور پر اپنی عبادت کریں۔ معینہ حدود میں انہی کے قوانین رائج تھے۔ بعض ملکی اور قومی عہدوں پر ان کا تقرر کیا گیا۔ ان کی عورتوں کو اجازت تھی کہ وہ فاتحوں کے ساتھ شادی بیاہ کریں۔ غرض از روئے قانون ان کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہیں کیا جاتا تھا جس سے مفتوح یا غلام معلوم ہوں۔''[4]

۳۔ جزیہ اور خراج وصول کرنے میں نرمی

جزیہ اور خراج کی وصولی میں سختی سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے شام کے گورنر حضرت ابوعبیدہؓ کو لکھا: مسلمانوں کو ان پر ظلم کرنے اور انھیں ستانے اور ناجائز طریقہ سے ان کے مال کھانے سے

۱۔ کتاب الاموال ابوعبیدہ ص ۱۵۰۔ ۲۔ درمختار جلد ۳ ص ۲۷۳، ۲۷۴۔

۳۔ کتاب الاموال ابوعبیدہ ص ۳۶۔ ۴۔ الهارون ص ۲۸۴۔

منع کرو۔[1]

شہریوں کے فرائض اور اسلامی ریاست کے حقوق

ا۔ سمع وطاعت

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (النساء۴:۵۹) اطاعت کرو اللہ کی اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر کوئی حبشی غلام مقرر کر دیا جائے جس کا سر کشمش کی طرح ہو۔ (بخاری ۱۰:۵۴)

"(ہر مسلم پر) سمع وطاعت لازم ہے تاوقتیکہ کہ اس کو گناہ کا حکم نہ دیا جائے۔ پھر اگر گناہ کا حکم دیا جائے تو نہ سمع ہے نہ طاعت۔" (بخاری ۵۶:۱۰۸)

۲۔ قانون کی پابندی

لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (الاعراف ۷:۸۵) زمین میں اس کی اصلاح ہو جانے کے بعد فساد نہ کرو۔ فساد ہمیشہ قانون شکنی سے ہوتا ہے۔

۳۔ تعاون

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (المائدہ ۵:۲) نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو۔

۴۔ مالی قربانی

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ ۲:۲۱۹) وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں کہہ جو ان کی ضرورت سے بچ جائے وہ سب خرچ کرو۔

۵۔ جانی قربانی

مَالَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ (توبہ ۹:۳۸) تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم کو خدا کی راہ میں نکلنے کے لیے کہا جاتا ہے تو تم زمین پر جم جاتے ہو۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (البقرہ ۲:۱۹۰) اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

---

[1] کتاب الخراج ص ۸۲۔

اسلامی حکومت کی خارجہ پالیسی

خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول

۱۔ اسلامی حکومت اس بات کا خیال رکھے کہ غیر مسلم حکومت سے اس قسم کے معاہدات نہ کرے جس سے کسی دوسری اسلامی حکومت کے مفادات مجروح ہوتے ہوں۔

ارشاد الٰہی ہے: لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکَافِرِیْنَ اَوْلِیَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ (آل عمران ۳:۲۸) مومن اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا ہمدرد اور دوست نہ بنائیں۔

اگر کوئی غیر مسلم حکومت کسی اسلامی حکومت پر حملہ کرے تو دنیا کے تمام اسلامی ممالک کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اسلامی حکومت کی مدد کریں۔

۲۔ دوسرا اصول یہ ہونا چاہیے کہ اسلامی حکومت کے تمام معاملات صلح اور امن پر مبنی ہونے چاہئیں کیونکہ اسلام سلامتی، صلح اور امن کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اسلامی حکومت کی خارجہ پالیسی میں ہر رنگ میں امن کی روح قائم رہنی چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (الانفال ۶۱) اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ (بقرہ ۲:۱۹۳) اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو پھر اگر وہ رک جائیں تو سزا ظالموں کے سوائے اور کسی کے لیے نہیں۔

۳۔ تیسرا اصول یہ ہونا چاہیے کہ اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی ایک عالمی انسانی برادری قائم کرنے والی ہو اور تمام اقوام عالم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے والی ہو کیونکہ اسلام وحدتِ نسلی انسانی کا پیغام لے کر آیا ہے ارشاد الٰہی ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس ۱۰:۱۹) سب لوگ ایک ہی امت ہیں لیکن وہ آپس میں جھگڑتے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الخلق عیال الله فاحب الخلق الی الله من احسن الی عیاله (بیہقی کتاب الایمان) ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو اللہ کے عیال سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے۔

۴۔ چوتھا اصول یہ ہونا چاہیے کہ اسلامی حکومت عہد و پیمان کا احترام کرنے والی ہو۔ ارشاد الٰہی ہے: اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۴) عہد پورا کرو یقیناً عہد کے متعلق پوچھا جائے گا۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (مائدہ ۵:۱) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے معاہدے پورے کرو۔

۵۔ پانچواں اصول یہ ہے کہ خارجہ پالیسی بین الاقوامی عدل پر مبنی ہو۔ ارشاد الٰہی ہے: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (مائدہ ۵:۸) اے ایمان والو! اللہ کے نام پر انصاف کے ساتھ گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جاؤ کسی قوم کی دشمنی تم کو اس امر پر نہ اکسائے کہ عدل کا دامن چھوڑ دو تم بہرحال انصاف کا معاملہ کرو یہ بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

۶۔ چھٹا اصول جنگ کے متعلق یہ ہے کہ جارح قوم کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (بقرہ ۲:۱۹۰) اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تمھارے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور حد سے آگے نہ بڑھو۔

ظلم کو مٹانے کے لیے جنگ کرنا ناگزیر ہے لیکن اسلام جنگ میں بھی تعدی سے منع کرتا ہے اور بدلہ اتنا ہی لینا چاہیے جتنا حق ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا (الشوریٰ ۴۲:۴۰) اور بدی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے۔

شعبہ بیت المال

اسلامی ریاست کے خزانہ مرکزی (بیت المال) کے ذرائع آمدن حسب ذیل ہیں:

ا۔ زکوٰۃ

وہ خدائی ٹیکس ہے جو ایک سال کے گزرنے کے بعد جمع شدہ مال پر مسلمان سے لیا جاتا ہے۔

ا۔ سونا چاندی: سونا بیس مثقال اور چاندی دو سو درہم ہو، ان پر ایک سال گزر جائے تو ۴۰/ا دینا پڑتا ہے۔

۲۔ مویشی: ان میں اونٹ گائے بیل اور بھیڑ بکریاں داخل ہیں۔

۳۔ سامان تجارت: تجارت کا سامان اگر سونے چاندی کے نصاب تک پہنچ جائے تو ایک سال گزرنے کے بعد ۴۰/ا دینا پڑتا ہے۔

۴۔ غلہ اور پھل: اگر قدرتی وسائل سے زمین سیراب ہوتی ہو تو اس کی پیداوار کا ۱۰/ا لیا جاتا ہے۔ اگر سیراب کرنے میں محنت اٹھانی پڑتی ہے تو اس کا ۲۰/ا حصہ لیا جاتا ہے۔

۲۔ صدقات

یہ وہ مال ہے جو امراء مجموعی طور پر غرباء کی امداد کے لیے بیت المال کو دیتے ہیں۔

۳۔ خمس

مال غنیمت کا پانچواں حصہ مال رکاز، دفینوں اور کانوں سے نکلی ہوئی معدنیات کا پانچواں حصہ۔

۴۔ فیئ

وہ مال جو دشمن سے بغیر جنگ کے حاصل ہوتا ہے۔

۵۔ خراج

وہ سرکاری لگان ہے جو غیر مسلم کاشت کاروں کی مقبوضہ اراضیات پر سالانہ لگایا جاتا ہے۔ خراج کی مقدار زمین کی پیداوار، زرخیزی اور وسائل آب پاشی کی آسانیوں کو ملحوظ رکھ کر مقرر کی جاتی ہے۔

۶۔ عُشر

مسلمان کاشت کاروں پر عائد شدہ لگان کو عشر کہا جاتا ہے۔ بارانی زمین پر ۱/۱۰ اور چاہی زمین پر ۱/۲۰۔

۷۔ جزیہ

یہ وہ ٹیکس ہے جو ان غیر مسلم افراد پر عائد کیا جاتا ہے جو اسلامی ریاست کے باشندے ہوتے ہیں۔ یہ ٹیکس ان کے مال، جائیداد، جان اور عزت کی حفاظت کے لیے وصول کیا جاتا ہے۔ جزیہ کی مقدار حسب ذیل ہے:

۱۔	دولت مندوں سے	۴۸ درہم سالانہ	(بارہ روپے)
۲۔	متوسط طبقہ سے	۲۴ درہم سالانہ	(چھ روپے)
۳۔	ادنیٰ طبقہ سے	۱۲ درہم سالانہ	(تین روپے)

غرباء، اپاہج، اندھوں اور معذور افراد سے جزیہ ساقط ہو جاتا ہے بلکہ ان کی کفالت اسلامی حکومت کے ذمہ ہوتی ہے۔

۸۔ عشور

وہ تجارتی ٹیکس ہے جو اس مال پر عائد کیا جاتا ہے جو غیر مسلم تاجر اسلامی ریاست میں بغرض تجارت لے کر داخل ہوتے ہیں۔

۹۔ کراء الارض

اسلامی ریاست کی اراضیات کا مقررہ لگان جو کاشت کاروں کی باہمی رضامندی سے وصول کیا

جاتا ہے۔

۱۰۔ وقف

وہ سرمایہ یا جائیداد جو اُمراء مفاد عامہ کے لیے اجتماعی ملکیت میں دے دیتے ہیں۔

۱۱۔ ضرائب

وہ ٹیکس ہے جو امراء پر اس وقت عائد کیا جاتا ہے جب وہ اسلامی معاشی قوانین پر عمل نہیں کرتے اور عوام کی غربت اور افلاس کا سبب بنتے ہیں۔ معاشی توازن قائم رکھنے کے لیے یہ ٹیکس جبراً وصول کیا جائے گا۔

۱۲۔ اموال فاضلہ

وہ سرمایہ جس کا کوئی وارث نہ ہو۔

مذکورہ حکومتی ذرائع آمدن کے علاوہ حکومت کو ہنگامی حالات یا عوام کی حالت درست کرنے کے لیے مزید ٹیکس لگانے پڑ جائیں تو اسلام اس کی بھی اجازت دیتا ہے۔

مصارف

اسلام نے بیت المال سے خرچ کرنے کی بعض مدات صراحتہً بیان کر دی ہیں اور بعض کی وضاحت نہیں کی، بلکہ وہ عام قوانین کے ذیل میں آتی ہیں۔ زکوٰۃ کا مال خرچ کرنے کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (التوبہ ۹:۶۰) اس آیت کی رو سے حسب ذیل اشخاص زکوٰۃ کے مستحق ہیں۔

۱۔ فقراء ۲۔ عاملین زکوٰۃ (کارکن) ۳۔ مولف القلوب ۴۔ فی الرقاب (غلاموں کی رہائی کے لیے) ۵۔ غارمین ۶۔ فی سبیل اللہ (جہاد، تبلیغ) ۷۔ ابن السبیل (مسافر) [1]

عشر کے مصارف بھی وہی ہیں جو زکوٰۃ کے ہیں۔

عشور جو غیر مسلمانوں سے لیا جائے اس کے مصارف بھی یہی ہیں۔

مال غنیمت کی تقسیم

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (الانفال ۸:۴۱) مال غنیمت کے پانچ حصے کیے جاتے ہیں جن میں سے چار حصے تو مجاہدین میں تقسیم کر دیے جاتے ہیں اور پانچواں حصہ بیت المال میں جمع ہوتا ہے، جن کے مصارف کے متعلق مندرجہ بالا آیت میں وضاحت کی گئی ہے۔

---

[1] تخریج پیچھے گزر چکی ہے۔

اسلامی قانون کے ماخذ

قرآن

اسلامی قانون کا پہلا ماخذ قرآن مجید ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حضرت روح الامین علیہ السلام کے ذریعے تقریباً تئیس سال تک نازل ہوتی رہی۔ قرآن کا نام خود اس کتاب میں کئی بار آیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ (البقرہ ۲:۱۸۵) رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا ہے لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ ہے اور ہدایت کی کھلی دلیلیں ہیں اور حق اور باطل کو الگ الگ کرنے والے دلائل ہیں۔

قرآن کو اس وجہ سے قرآن کہا گیا ہے کہ یہ سارے اولین اور آخرین کے علوم کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: نَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (النحل ۱۶:۸۹) یعنی ہم نے تجھ پر ایک ایسی کتاب اتاری ہے جو تمام چیزوں کو واضح کرنے والی ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (الانعام ۶:۵۹) یعنی اصول دین کے لیے کوئی خشک یا تر بات ایسی نہیں جو اس واضح کتاب میں نہ ہو۔

اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر ۱۵:۹) یعنی ہم نے ہی اس ذکر (قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔

ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے: لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (حٰمٓ السجدہ ۴۰:۴۲) یعنی باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ پیچھے سے۔

سنت اور حدیث

اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ سنت اور حدیث ہے۔ اسلامی اصطلاح میں سنت سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعمال ہیں اور حدیث سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال، سنت اور حدیث قرآن مجید کی تشریح و توضیح ہیں حدیث اور سنت کی حفاظت اور جمع و تدوین کی بنیاد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں ہی پڑ گئی تھی اور اس کی تدوین اور جمع ہونے پر کئی ادوار گزرے۔ حتیٰ کہ تقریباً دو سو سال بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال اور اعمال کے مجموعے کتب کی صورت میں لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچے۔

قرآن مجید نے سنت اور حدیث کو واجب الاتباع ٹھہرایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۳۳:۲۱) یعنی تمھارے لیے اللہ کے رسول میں عمدہ نمونہ ہے۔ یعنی رسول کے نقش قدم پر چلو۔

دوسری جگہ آتا ہے: قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (النور ۲۴:۵۴) کہہ اللہ کی اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: انی ترکت فیکم امرین ان تمسکتم بہ لن تضلوا کتاب اللّٰہ و سنتی یعنی میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں جب تک انھیں تھامے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ اللہ کی کتاب اور میری سنت ہے۔

تعامل صحابہ

اسلامی قانون کا تیسرا ماخذ تعامل صحابہ ہے۔ اسلامی قوانین کا ایک بڑا حصہ اسی ماخذ سے ماخوذ ہے۔ صحابہ کرام رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت مقدسہ میں تربیت یافتہ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کامل اتباع کرنے والے تھے۔ اس لیے ان کا کوئی ایسا فعل نہیں ہو سکتا جو دین اسلام کی روح کے منافی ہو۔ اسلام انہی کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے، اس وجہ سے اس پہلی اور مضبوط کڑی کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ تعامل صحابہ کی حجت کے بارہ میں حدیث شریف میں آتا ہے:

اصحابی کالنجوم بایھم اقدیتم اھتدیتم یعنی میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جن کا بھی اتباع کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔

علیکم بسنتی و سنة الخلفآءِ الراشدین المھدیین تم پر لازم ہے کہ تم میری سنت اور میرے برحق اور ہدایت یافتہ جانشینوں کی سنت کو تھامے رکھو۔

تعامل صحابہ کے مختلف مدارج ہیں۔ طوالت کے خوف سے ان پر بحث نہیں کی جاتی۔ فقہ کی کتب کی طرف رجوع کیا جائے۔

اجماع

اسلامی قانون کا چوتھا ماخذ اجماع ہے۔ اجماع سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے اہل حل وعقد کا کسی معاملہ میں اتفاق اور اتحاد کر لینا ہے۔ اجماع کا واجب ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ. (النساء ۴:۵۹) اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرو اور جو تم میں سے صاحب امر ہے اس کی اطاعت کرو۔ اگر تمہارا کسی معاملہ میں جھگڑا (اختلاف) ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا (النساء ۴:۱۱۵) اور جو شخص اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرے گا جب کہ ہدایت ظاہر ہو گئی ہو اور مومنوں کی راہ ترک کر کے دوسرا رستہ اختیار

کرے گا تو ہم اس کا رخ ادھر پھیر دیں گے جدھر وہ ہے اور اسے جہنم میں ڈالیں گے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ مومنوں کے راستے کے علاوہ دوسرا راستہ گمراہی ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے: امتی لاتجمع علی الخطاء اوعلی الضلالۃ یعنی میری امت غلط بات پر یا گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔

ابن مسعودؓ کا قول ہے: ماراہ المسلمون حسنًا ھو عنداللّٰہ حسن جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔

قیاس

اسلامی قانون کا پانچواں ماخذ قیاس ہے۔ قیاس کی تعریف یہ ہے کہ قیاس اصل سے فرع کی جانب حکم کے متعدی ہونے کو کہتے ہیں جبکہ یہ تعدیہ کسی ایسی علت کی بناء پر ہو جو اصل وفرع دونوں میں پائی جاتی ہے اور جس کا علم محض لغت سے نہیں ہوسکتا۔ مثلاً قرآن مجید میں شراب حرام ہے، حرمت کی وجہ نشہ ہے، اب جو بھی نشہ آور اشیاء ہوں گی ان سب پر شراب کا حکم عائد کر کے حرام قرار دیا جائے گا۔

قیاس کا جواز قرآن سے ثابت ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُھَا لِلنَّاسِ وَمَا یَعْقِلُھَآ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ (العنکبوت ۲۹:۴۳) یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور انھیں سوائے علم والوں کے اور کوئی نہیں سمجھتا۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھا: اعرف الامثال والاشباہ وقس الامور عندک یعنی امثال اور نظائر کو پہچانو اور سمجھو پھر مسائل کو ان پر قیاس کرو۔

شرائط قیاس

۱۔ مقیس علیہ نص (جس نص سے قیاس کیا جاتا ہے) کا حکم خاص واقعات اور حالات پر مبنی نہیں ہونا چاہیے۔

۲۔ علت ایسا وصف ہو جو شرعاً قابل اعتبار ہو اور بالکل صریح واضح اور معین ہو۔

۳۔ اصل وفرع میں ایک ہی وصف موجود ہو۔

۴۔ جو حکم قیاس سے استنباط کیا جائے، اس کی وجہ سے نص کے حکم میں تبدیلی نہ واقع ہوتی ہو۔

۵۔ جو حکم قیاس سے استخراج کیا جائے، اس کی نوعیت نص کے احکام کے ماحصل کی ہونی چاہیے۔ کسی نص کے محض الفاظ پر قیاس کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔

اسلامی ریاست کی خصوصیات

۱۔ حاکمیت اللہ کی ہے

اسلام کی رو سے حقیقی فرماں روا حاکم اللہ تعالیٰ ہے ارشاد الٰہی ہے: اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (یوسف

۱۲:۴۰) یعنی حقیقی فرماں روائی صرف اللہ کی ہے۔

۲۔ قانون کی حکمت

اسلامی ریاست میں قانون کو بالادستی حاصل ہوتی ہے، رئیس مملکت اور تمام شہری قانون کی نظر میں برابر ہوتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ (مائدہ ۴۸:۵) پس لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کر اور قانون کو چھوڑ کر جو تمھارے پاس آ چلا ہے۔ لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔

۳۔ شورائی نظام

اسلامی ریاست میں تمام ملکی مسائل عوام یا صاحب رائے کے مشوروں سے انجام پائے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ ۱۵۸:۳) یعنی مسلمانوں کے اجتماعی امور باہم مشورہ سے انجام پاتے ہیں۔

ان سے باتوں (کاموں) میں مشورہ لیتے رہا کیجیے۔

۴۔ انتخاب

اسلام سے قبل بادشاہت کا دور دورہ تھا۔ اسلام نے بادشاہت کو ختم کر کے رئیس مملکت کا انتخاب عوام یا ارباب حل وعقد کے ہاتھ میں دے دیا۔ اسلام کے دور اول میں جب خلفاء راشدین کے انتخاب پر نظر دوڑائیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ خلفاء راشدین کا انتخاب براہ راست شوریٰ کے ذریعہ ہوا۔

۵۔ بیت المال کو عوام کا مال سمجھنا

شخصی حکومت میں خزانہ رئیس مملکت کا ذاتی مال سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے جس قدر چاہتا خزانہ سے خرچ کر سکتا تھا کوئی شخص حرف گیری کرنے کا مجاز نہ تھا لیکن اسلامی حکومت میں بیت المال کو عوام کی امانت قرار دیا جاتا ہے۔ خلیفہ صرف گزارہ الاونس لینے کا مجاز ہے۔

۶۔ حکومت اور انسانیت

اسلامی حکومت کی اساس انسانیت پر ہوتی ہے۔ خلافت راشدہ دنیا کی پہلی حکومت ہے۔ جس کی اس ارفع اور پاکیزہ تصور پر بنیاد تھی۔ اسلامی حکومت نہ تو قومیت پر مبنی ہوتی ہے اور نہ بین الاقوامیت پر بلکہ اس کی بنیاد انسانیت پر مبنی ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت اپنے کاموں میں مرضی عامہ مساوات حقوق انسانی کا بڑا خیال رکھتی ہے۔ جب تک ایک شخص بھی غریب ہے ضروریات زندگی کا محتاج ہے تو رئیس مملکت جوابدہ ہے۔

۷۔ اسلامی حکومت

قبائلی عصبیتوں سے پاک ہوتی ہے۔ تمام رعایا اتحاد اور مساوات کی لڑی میں منسلک ہوتی ہے۔ تمام فیصلے گروہ بندی سے بالاتر ہو کر کیے جاتے ہیں۔

۸۔ اصلاح معاشرہ

اسلامی حکومت ان تمام معاشرتی، اقتصادی، تمدنی اور سیاسی برائیوں کا قلع قمع کر دیتی ہے جو سوسائٹی کے بگاڑ کا موجب ہوتی ہیں۔ مثلاً زنا، قمار بازی، سود خوری، چوری رشوت خوری، اقربا پروری سرمایہ داری، جاگیرداری، ڈاکہ زنی، کم تولنا، جھوٹ فریب وغیرہ۔

۹۔ قیام عدل

عدل وانصاف ہی کسی حکومت کے استحکام کا ذریعہ ہوتا ہے اسلامی حکومت عدل وانصاف کو زندگی کے ہر شعبہ میں نافذ کرتی ہے۔ عدل کی تین صورتیں ہیں۔ سماجی عدل، قانونی عدل، اقتصادی عدل۔ اسلامی حکومت ہر صورتوں کو کما حقہ نافذ کرتی ہے۔

۱۰۔ عوام کی فلاح و بہبودی

زمینی حکومتیں جب کسی علاقے کو فتح کرتی ہیں تو اپنی قاہرانہ سفاکانہ شان دکھانے کے لئے ہر قسم کا ظلم اور سفا کی کرتی ہیں۔ لیکن اسلامی حکومت امن کا پیغام لے کر آتی ہے۔ ملک میں امن وسلامتی قائم رکھنا اور عوام کی خیر خواہی کرنا اور انہیں ترقی کے بام عروج تک لے جانے کی کوشش کرنا اس کے فرائض میں شامل ہے۔

۱۱۔ ہمسایہ ممالک سے برادرانہ تعلقات

دنیاوی حکومتیں حرص وہوس گیری کے نشہ میں کمزور حکومتوں پر بلاوجہ جارحانہ حملے کرتی ہیں۔ اس کے بالمقابل اسلامی حکومت اپنے ہمسایہ ممالک کے ساتھ دوستانہ برادرانہ تعلقات رکھتے ہوئے ان کی بہبود کا خیال رکھتی ہے۔

اسلام کا نظام اقتصاد

ابتدائے آفرینش سے ''روٹی کے مسئلہ'' کو بہت ہی اہمیت حاصل رہی ہے لیکن اس دور میں اس مسئلہ پر دو سیاسی نظام چل رہے ہیں: ایک سرمایہ داری نظام ہے اور دوسرا اشتراکیت۔ سرمایہ داری نظام بے قید ذاتی ملکیت کا حامی ہے۔ اکتساب دولت اور صرف پر کسی قسم کی قدغن اور پابندی عائد نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے برعکس اشتراکیت حقوق ملکیت حکومت کو سونپتی ہے۔

ان دونوں انتہا پسند نظاموں کے برعکس اسلام نے اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ نہ تو وہ سرمایہ داری نظام کی طرح بے قید ذاتی ملکیت کا حامی ہے اور نہ اشتراکیت کی طرح تمام حقوق ملکیت حکومت کے حوالے کرتا ہے۔ اسلام کائنات کی ہر چیز کو اللہ کی ملکیت قرار دیتا ہے اور اس میں تمام انسانوں کو برابر کا حصہ دار قرار دیتا ہے۔ ہر شخص خدا کی پیدا کردہ اشیاء کو حاصل کرنے اور ان سے فائدہ لینے کا مجاز ہے۔ گویا کائنات کی کوئی شے فی حد ذاتہ کسی کی ملکیت نہیں ہے بلکہ ہر شے لوگوں کے درمیان مشترکہ مملوکہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: قَدَّرَ فِيهَا اَقْوَاتَهَا (حٰمٓ السجدہ ۴۱:۱۰) یعنی ہم نے زمین میں سے سب انسانوں کے لیے کھانے پینے کے سامان پیدا کر دیے ہیں۔

تمام انسان جو حاجت مند ہیں ان میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ سَوَاءً لِّلسَّائِلِيْنَ (حٰمٓ السجدہ ۴۱:۱۰) اسلام چونکہ ایک فطری اور امن کا دین ہے اس لیے اس نے رفع نزع اور حصول انتفاع کے لیے پابندیوں کے ساتھ ذاتی ملکیت کو تسلیم کیا ہے۔ اصول اشتراکیت کے بیان کرتے میں اسلام نے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ تمام اشیاء کا حقیقی مالک تو اللہ تعالیٰ کو ہی سمجھو لیکن چند پابندیوں کے ساتھ جو حقوق ملکیت اللہ تعالیٰ نے تمھیں بخشے ہیں۔ ان کو پورا کرو۔ اگر تم نے ان پابندیوں کو پورا نہ کیا تو وہ ذاتی ملکیت زمین میں فساد کا موجب بنے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کہیں اس ذاتی ملکیت کو فضل[1]، کہیں حسنہ[2]، کہیں طیبہ[3]، کہیں زینتہ[4]، کہیں ذریعہ قیام[5] فرمایا۔ اور اس کے برعکس اس ذاتی ملکیت کو متاع الغرور[6] اور

---

[1] لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۴۱:۱۲)

[2] رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۲:۲۰۱)

[3] يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۲:۱۷۲)

[4] يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف ۷:۳۱)

[5] الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا (۴:۵)

[6] وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (۳:۱۸۵)

کہیں فتنہ[1] کے الفاظ سے پکارا ہے۔

انفرادی ملکیت اور پابندیاں

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء۴:۳۲) مردوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں۔

وَاِنْ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا (النساء۴:۲۰) اور تم اسے سونے کا ڈھیر دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ نہ لو۔

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ (البقرہ۲:۲۷۹) اور اگر تم توبہ کر لو تو تمھارے لیے تمھارے اصل مال ہیں۔

وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ (النور۲۴:۳۳) اور ان کو اللہ کے مال سے جو اس نے تمھیں دیا کچھ دو۔

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا (الاحزاب۳۳:۲۷) اور تمھیں ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا وارث بنایا اور ایسی زمین کا بھی جس پر تم نے قدم نہیں رکھا۔

یہ قرآنی آیات اشتراکیت کے خلاف انفرادی ملکیت کو جائز تسلیم کرتی ہیں۔

اکتساب مال پر شرعی پابندیاں

(الف) سودی کاروبار خواہ کسی شکل میں ہو حرام قرار دیا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا (بقرہ۲:۲۷۵) اور اللہ تعالیٰ نے خرید و فروخت کو جائز قرار دیا ہے اور سود کو حرام۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

ان کل ربا موضوع ولکن لکم روس اموالکم.[2] یعنی ہر قسم کا سود ساقط ہے مگر اصل رقم تمہاری ہے۔

مسلم میں حدیث ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربٰو و موکلہ و شاھدیہ و کاتبہٗ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سود کھانے والے پر کھلانے والے پر گواہوں پر اور اس کے کاتب پر لعنت فرمائی ہے۔

(ب) جوا کے ذریعہ مال و دولت کمانا حرام ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

---

[1] وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۸:۲۸)

[2] سیرۃ ابن ہشام ج ۲۔

اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (مائدہ ۵:۹۰) شراب اور جوا اور بت اور پاسے ناپاک کام صرف شیطان کے عمل سے ہیں سو ان سے بچو تا کہ تم کامیاب ہو۔

(ج) جن چیزوں کا کھانا پینا حرام ہے ان کی خرید و فروخت بھی ناجائز ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (البقرہ ۲:۲۱۹) تجھ سے شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑی برائی ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں اور ان کی برائی ان کے فائدے سے بڑھ کر ہے۔

لا يحل ثمن شيء لا يحل اكله و شربه[1] یعنی کسی ایسی چیز کی قیمت لینا جس کا کھانا اور پینا حرام ہے جائز نہیں ہے۔

سوء الكسب اجرة الزمارة و ثمن الكلب.[2] یعنی گانے بجانے اور کتے کی قیمت سب سے برا کسب ہے۔

(د) دولت کمانے کے لیے وہ تمام طریقے ناجائز اور حرام ہیں جن سے دوسرے افراد یا سماج کو نقصان پہنچتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (النساء ۴:۲۹) اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ ہاں اگر آپس کی رضا مندی سے تجارت ہو تو اس میں کھا سکتے ہو۔ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّ اِنِّيْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ (ہود ۱۱:۸۴) اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو میں دیکھ رہا ہوں کہ بددیانتی کی وجہ سے تم خوش حال ہو میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایسا دن نہ آ جائے جو سب پر چھا جائے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ناپنے اور تولنے والوں سے فرمایا کہ تم لوگوں کے متعلق ایسی دو چیزیں کی گئی ہیں جن کی وجہ سے پہلی امتیں ہلاک ہو گئی تھیں۔ (ترمذی ابواب البیوع)

بڑی خیانت والا وہ حاکم ہے جو اپنی رعایا میں تجارت کرے۔ (کنوز الحقائق طبرانی)

دولت جمع رکھنے کے متعلق پابندی

اکتناز (دولت جمع کرنا) احتکار (ذخیرہ) ممنوع ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ. (التوبہ ۹:۳۴) اور وہ لوگ جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خبر دو۔

---

[1] اخرجه الدار قطني عن تميم الداري۔

[2] ابوبکر بن مقسم عن ابی ہریرۃ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَلْمُحتکر مَلْعُون (ابن ماجہ) احتکار کرنے والا ملعون ہے۔

"جو شخص چالیس دن تک غلہ اس نیت سے ذخیرہ کر کے رکھے تاکہ نرخ بڑھ جائے تو وہ شخص گویا خدا سے بیزار ہو گیا اور خدا نے بھی اس سے اپنا تعلق منقطع کر لیا۔" (تیسیر الوصول ج ۱)

دولت کے ناجائز استعمال اور تصرف پر پابندیاں

اسلام نے دولت کے ناجائز استعمال پر پابندیاں عائد کی ہیں۔

اسراف اور تبذیر کی ممانعت

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (الاعراف ۷:۳۱) کھاؤ پیو اور اسراف نہ کرو کیونکہ بے شک اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ (۱۷:۲۶:۲۷) فضول خرچی نہ کرو کیونکہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کھاؤ پیو اور صدقہ کرو مگر اس میں اسراف یا گھمنڈ نہ ہو۔"

اور ابن عباسؓ نے کہا: اسراف اور غرور سے اجتناب کرتے ہوئے جو دل چاہے کھاؤ اور جو چاہو پہنو۔[1]

مغیرہؓ بن شعبہ نے کہا ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ نے تمھارے لیے تین چیزوں کو ناپسند فرمایا ہے۔ قیل وقال کرنا، مال ضائع کرنا اور کثرت سے سوال کرنا۔[2]

اسراف اور تبذیر کا لازمی نتیجہ لذت اندوزی، تنعم اور عیش کوشی ہے۔ اسلام نے عیش کوشی سے منع فرمایا ہے کیونکہ عیش کوشی معاشرہ میں فساد اور خلل ڈالتی ہے۔ حضرت معاذؓ بن جبل روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب انھیں یمن بھیجا تو فرمایا: خبردار! عیش کوشی سے اجتناب کرنا کیونکہ اللہ کے بندے عیش کوش نہیں ہوتے۔[3]

تقسیم دولت کے شرعی مدات

اب تک یہ بحث کی گئی ہے کہ دولت کس طرح کمائی جائے اور کس طرح خرچ کی جائے اب اختصار کے ساتھ یہ بحث کی جائے گی کہ جائز طریقے سے جو دولت جمع کی جائے اس کو بھی تقسیم کرنے کے لیے اسلام نے کیا تعلیم دی ہے۔ تقسیم دولت ہی کی وجہ سے اسلام کا بتایا ہوا نظام اقتصاد دوسرے نظاموں سے افضل ہے کیونکہ اس اصول سے معاشرہ میں عادلانہ معاشی نظام قائم ہوتا ہے۔

---

۱ بخاری کتاب اللباس۔ ۲ بخاری کتاب الزکوۃ باب قولہ تعالیٰ لایسئلون الناس الحافا۔

۳ مشکوۃ المصابیح باب فضل الفقراء۔

صدقات

اسلام میں صدقات دو قسم کے ہیں۔ ایک لازمی خیرات ہے جس کا نام اسلامی اصطلاح میں زکوٰۃ ہے جو ہر سال ادا کی جاتی ہے۔ اس کا نصاب حدیث اور فقہ کی کتب میں تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔

دوسری قسم کی خیرات طوعی ہے، یعنی ایک دولت مند جتنا چاہے غرباء اور مساکین کو دے۔ قسم اول کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (التوبہ۹:۱۰۳) کہ ان کے مالوں سے زکوٰۃ لو تا کہ توانھیں پاک صاف کرے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (حٰمٓ سجدہ آیت ۶، ۷) اور ہلاکت ہے ان مشرکوں کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرہ۲:۴۳) اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

طوعی خیرات کے متعلق ارشاد الٰہی ہے: وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً (فاطر ۳۵:۲۹) اور اس سے جو ہم نے انھیں دیا چھپ کر اور علانیہ خرچ کرتے ہیں۔

ورثہ

قرآن مجید نے متوفی کے سب سے قریبی ورثاء میں حصص مقرر کر دیے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:
وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا (النساء۴:۳۳) جو کچھ ترکہ ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جائیں تو ان میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے حق دار ٹھہرا دیے ہیں اور جن عورتوں سے تمہارا نکاح ہو چکا ہے۔ پس چاہیے کہ جو کچھ جس کا حصہ ہے اس کو دے دیا جائے اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مَّفْرُوْضًا (النساء ۴:۷) مردوں کے لیے اس سے ایک حصہ ہے جو ان کے والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑیں اور عورتوں کا ایک حصہ ہے جو ان کے ماں باپ اور قریبی رشتہ دار چھوڑیں خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت ایک مقررہ حصہ۔

وراثت کی حکمت اللہ تعالیٰ خود بیان فرماتا ہے: كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (الحشر ۵۹:۷) یعنی ایسا نہ ہو کہ دولت صرف امراء میں ہی محدود ہو کر رہ جائے۔

کفارات

غرباء تک دولت کے پہنچانے کا ایک ذریعہ کفارات ہیں۔ کوئی شخص بلا عمداً کسی مسلمان کو قتل کر دے۔ یا قسم کھا کر اسے توڑ دے۔ رمضان کے مہینے میں روزہ رکھ کر توڑ دے۔ یا اپنی بیوی سے اظہار کرے تو ان صورتوں میں مال کا ایک حصہ غرباء کے لیے خرچ کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔

صدقۃ الفطر

عیدالفطر کے موقع پر صاحب نصاب لوگوں پر محتاجوں کے لیے صدقۃ الفطر دینا لازم کیا گیا ہے۔

خراج و جزیہ

خراج ایک قسم کا لگان ہے جو اسلامی حکومت اپنی مملوکہ زمین پر وصول کرتی ہے۔

جزیہ وہ ٹیکس ہے جو ذمیوں سے ان کی جان و مال کی حفاظت کے لیے وصول کیا جاتا ہے۔

نفقات

اسلام نے ہر انسان پر یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کی کفالت کرے۔

عشر

ان اراضیات کی پیداوار پر واجب ہے جو بارش سے سیراب ہوں۔ اور اگر وہ زمین اپنی محنت سے ہوتی ہو تو کل پیداوار کا بیسواں حصہ وصول کیا جائے گا۔

وصیت

اسلام مالک جائیداد کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ جائز ورثاء کے علاوہ خیراتی کاموں کے لیے بھی وصیت کرے۔ ارشاد الٰہی ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۨالْوَصِيَّةُ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (البقرہ ۲: ۱۸۰) تم پر جب تم میں سے کسی پر موت آ جائے عمدگی کے ساتھ وصیت کرنا لازمی ٹھہرایا گیا ہے اگر وہ بہت مال و دولت ماں باپ کے لیے اور قریبی رشتہ داروں کے لیے چھوڑے یہ پرہیز گاروں پر فرض ہے۔

وقف

اسلام میں وقف کے یہ معنی ہیں کہ دائمی طور پر کسی جائیداد کو مذہبی یا خیراتی کاموں کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔

ضروریات سے زائد مال خرچ کرنے کی تعلیم

مندرجہ بالا مدات میں خرچ کرنے کے بعد بھی اگر کسی کے پاس دولت بچ جائے تو اس کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ ۲: ۲۱۹) وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ دیجئے جو کچھ ضروریات اور حاجات سے زیادہ ہو۔

یہ وہ مذہب جس سے تمام معاشی مسائل حل ہو جاتے ہیں اور دولت کے ارتکاز کو روکتی ہے۔

اجتماعی ملکیت

ایسی اشیاء جو افادہ عام کے لیے ضروری ہوں اور جن پر انفرادی ملکیت ہو جانے کی وجہ سے افراد تنگی اور تکالیف محسوس کریں، ان کو اجتماعی ملکیت قرار دیا جائے گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصولی ہدایت دیتے ہوئے فرمایا:

المسلمون شرکاء فی ثلث فی الماء الکلاء والنار یعنی تمام مسلمان تین چیزوں میں شریک ہیں: پانی، گھاس اور آگ۔ (بحوالہ حجۃ اللہ البالغہ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصولی طور پر صرف تین امور کا ذکر کیا ہے۔ درحقیقت اس حدیث کا منشاء یہی ہے کہ قدرتی وسائل پیدائش جن پر انسان کی محنت نہ لگی ہو اور وہ ہوں افادہ عام کے لیے تو وہ قدرتی وسائل حکومت کی تحویل میں ہوں گے۔ ہمارے فقہاء نے بھی صرف مذکورہ اشیاء کو ہی اجتماعی ملکیت قرار نہیں دیا بلکہ اس حدیث کو اصول تقسیم کر کے مزید قدرتی وسائل پر انفرادی ملکیت کو ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ نے نمک، گندھک، مومیائی اور مٹی کے تیل کے متعلق لکھا ہے:

لاتملک بالاحیاء ولایجوز اقطاعها من الناس ولا احتجارها دون المسلمین لان فیه ضرر للمسلمین و تضیقا علیهم. نہ آباد کرنے اور نہ حکومت سے جاگیر ملنے کی صورت میں ان کا نہ کوئی مالک بن سکتا ہے اور نہ یہ امر جائز ہے کہ عام مسلمانوں کو ان اشیاء سے فائدہ حاصل کرنے سے روک دیا جائے کیونکہ اس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا اور ان پر تنگی ہوگی۔

اسلام اور سرمایہ داری

اکتساب مال، تقسیم دولت کے لیے شرعی مدات ضروریات سے زائد مال کو خرچ کرنے کی تعلیم اور اجتماعی ملکیت سے متعلق گزشتہ بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام سرمایہ داری کو جائز نہیں سمجھتا۔

اسلام اور جاگیرداری

بعض علماء نے جاگیرداری نظام کو جائز قرار دیا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ حضرت امام یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فتح عراق کے بعد کسریٰ اور اس کے خاندان اور ان لوگوں کی اراضیات جو جنگ میں مارے گئے تھے ان مجاہدین کو دے دیں جو خدمات اسلامی میں ممتاز اور ارفع مقام رکھتے تھے۔

اگر یہ علماء قطیعہ (جاگیرداری) کی تعریف، زمین کے آباد کرنے اور اس کو کرایہ پر دینے کے متعلق اسلامی تعلیم کو پیش نظر رکھتے تو وہ موجودہ جاگیردارانہ نظام کو کبھی جائز قرار نہ دیتے۔

علماء سلف نے ''القطیعہ'' کی یہ تعریف کی ہے: قطیعہ وہ زمین ہے جو امام عادل کی طرف سے اس شخص کو دی جاتی ہے جو اسلامی خدمات سرانجام دینے میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔

اس تعریف کی رو سے جاگیر وہ جائز ہوگی جو امام عادل نے دی ہو۔ دوم جس کو عطا کی جارہی ہے اس نے اسلامی خدمات سرانجام دی ہوں۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے بنی امیہ کے امراء اور شاہی خاندان کے افراد سے وہ تمام جاگیریں واپس لے لی تھیں جو انھوں نے غیر مسلموں کی زمینیں آپس میں تقسیم کر لی تھیں۔

اس سے یہ امر بھی کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ جو تقسیم عدل کی بناء پر نہ ہوئی ہو اس جاگیر کو حکومت واپس لینے کی مجاز ہے بلکہ اسلامی ریاست کے سربراہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس قسم کی تمام جاگیروں کو حکومت کی تحویل میں لے لے۔

جب ہم موجودہ نظام جاگیرداری کو دیکھتے ہیں تو یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ نظام جاگیرداری کی بنیاد غیر عادلانہ اور مفسدانہ ہے کیونکہ یہ جاگیر ان سب لوگوں کو کسی اسلامی خدمت کے بدلہ میں نہیں ملی بلکہ خدمات کفر کے صلہ میں ملی ہے۔

کاشت کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ واضح حکم ہے کہ جس شخص کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ زمین ہو اسے وہ خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو عطا کر دے یا اپنی زمین کو یونہی پڑا رہنے دے۔ آخری جملہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنبیہ کے رنگ میں فرمایا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں یہ قانون تھا کہ جو شخص تین سال تک اپنی زمین بیکار چھوڑے رکھے تو حکومت اس زمین کو اپنی تحویل میں لے لے۔ چنانچہ ابن عبیدہ اپنی کتاب ''کتاب الاموال'' میں لکھتا ہے:

''ایک صحابی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زمین عطا کی۔ لیکن وہ اس کو آباد نہ کر سکا۔ حضرت عمرؓ نے ان سے وہ زمین لے لی اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دی۔''

موجودہ جاگیردار کتنے ہیں جو خود کاشت کرتے ہیں۔ خود کاشت کرنا تو ایک طرف رہا، ان لوگوں کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی زمین کتنی ہے اور زمین کا اکثر حصہ غیر آباد پڑا رہتا ہے۔ اور موجودہ جاگیرداری نظام اخوت، مساوات اور عدل اجتماعی اور مصالح عامہ کے خلاف ہے۔

اسلام اور بڑی صنعت کاری

• اسلام کے اقتصادی نظام کا بنیادی اصول اجتماعی مصالح ہے۔ اگر کوئی کاروبار افادہ عامہ اور

اجتماعی مصالح کو مجروح کرنے والا ہوگا تو اسلامی فقہ کے اصول ''استحسان'' کی رو سے اسلامی حکومت پر فرض عائد ہو جاتا ہے کہ وہ اصلاح حال کے لیے اس صنعت یا کاروبار کو انفرادی ملکیت سے نکال کر اپنی تحویل میں لے لے۔

جب اس بنیادی اصول کو سامنے رکھ کر پاکستان کے صنعتی کاروبار کو دیکھتے ہیں تو یہ بات سورج کی طرح روشن ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ ہمارا صنعتی کاروبار افادہ عامہ اور اجتماعی مصالح کو تباہ و برباد کر رہا ہے۔ بڑے بڑے صنعت کار اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ملکی سیاست پر چھائے ہوئے ہیں۔ گویا ملک کے وہی حاکم اور وہی صنعت کار اور تاجر۔ اب پاکستان کی نہ تو ملکی سیاست پاک ہو سکتی ہے اور نہ اجتماعی مصالح محفوظ رہ سکتے ہیں جب تک حکومت تمام بڑی بڑی صنعتوں کو قومیاتی نہیں یا ان کے لیے سیاست شجر ممنوعہ قرار نہیں دیتی۔ اب ملکی حالات کا یہ تقاضا ہے کہ حکومت کا سربراہ اس امر کی طرف سنجیدگی سے غور کرے تاکہ ملک امن اور ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ موجودہ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام فاشزم کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے۔ مسلمانوں کے تنزل کی ایک وجہ غیر عادلانہ اقتصادی نظام ہے۔

اسلام اور مذہبی گدیاں

مذہبی گدیاں صرف سرمایہ داری کا منبع ہی نہیں بلکہ اخلاق سوزی اور بے حیائی کے بھی اڈے ہیں۔
قرآن مجید میں مذہبی گدیوں کی مذمت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (توبہ ۹:۳۴) اے لوگو جو ایمان لائے ہو یقیناً بہت سے علماء اور راہب لوگوں کے مال ناجائز رنگ میں کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

یہ گدیاں اجتماعی مصالح اور مفاد عامہ کے خلاف اور جرائم اور فحاشی ختم کرنے کے لیے جرائم اور فحاشی کے اڈے ہیں۔

اس لیے ملک میں اقتصادی عادلانہ نظام قائم کرنے اور جرائم اور فحاشی کو ختم کرنے کے لیے ان مذہبی گدیوں کو قانوناً ممنوع قرار دیا جانا چاہیے۔

اشاعت اسلام

متعصب عیسائی مشنریوں نے اسلام کی طرف یہ غلط الزام منسوب کیا ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں جہاد کے عنوان کے تحت لکھا ہے: ''اسلام کی اشاعت بزور شمشیر عام طور پر مسلمانوں کا ایک مذہبی فریضہ ہے۔ بالفاظ دیگر جہاد صرف جنگ ہی نہیں بلکہ اسلام پھیلانے کی غرض سے تلوار اٹھانے کا نام ہے۔''

کلین نے ریلیجن آف اسلام میں لکھا ہے:

''جہاد یعنی منکرین اسلام کے خلاف اس مقصد کے لیے جنگ کرنا کہ یا تو انھیں اسلام کے اندر جذب کرلیا جائے یا اگر وہ قبول اسلام سے انکار کردیں تو انھیں مطیع ومنقاد بنالیا جائے اور ان کی بیخ کنی کردی جائے۔ اور یہ کہ اسلام کی اشاعت اور اس کو تمام مذاہب پر غالب کرنا مسلمان قوم کا ایک مقدس فریضہ سمجھا جاتا ہے۔''

یہ اعتراض اسلام کی تعلیم اور تاریخی واقعات کے سراسر خلاف ہے۔ نہ قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت ملتی ہے اور نہ کوئی ایسی حدیث صحیحہ ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دائرہ اسلام میں داخل کرنے کے لیے جبر کی تعلیم دی ہو۔ اس کے برعکس اسلام محبت اور الفت کے ساتھ پیغام حق پہنچانے کی تلقین کرتا ہے۔

اشاعت اسلام کے متعلق قرآنی اصول

قرآن مجید میں آتا ہے: اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (النحل ۱۶:۱۲۵) اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور لوگوں سے اچھے طریقہ سے مجادلہ کرو۔

قُلْ لِعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (بنی اسرائیل ۱۷:۵۳) اور تو میرے بندوں کو کہہ دے کہ ان کو چاہیے کہ وہ بڑی عمدگی اور اچھے طریقہ سے گفتگو کریں۔

لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (الانعام ۶:۱۰۵) ان کو گالیاں مت دو جو اللہ کو چھوڑ کر دوسرے بتوں کو پکارتے ہیں۔

لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (البقرہ ۲:۲۵۶) یعنی دین میں کوئی جبر نہیں

ہے کیونکہ ہدایت کی راہ گمراہی کے مقابلہ میں واضح ہو چکی ہے۔

یہ آیات واضح طور پر بتا رہی ہیں کہ قرآن مجید نے اسلام کی اشاعت کے لیے نرمی اور محبت کی تعلیم دی اور سخت کلمات اور جبر سے روکا ہے۔

اصولی تعلیم بیان کرنے کے بعد قرآن مجید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے متبعین کو یہ ہدایت دی ہے کہ وہ لوگوں کی مرضی پر اسلام کی قبولیت کو چھوڑ دیں۔

قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (سورۃ المزمل ۱۹:۷۳) یعنی یہ نصیحت ہے پس جو چاہے اپنے رب کا راستہ اختیار کرے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ. (سورہ کہف ۲۹:۱۸)

یعنی تو کہہ دے یہ حق تمھارے رب کی طرف سے ہے پس جو چاہے اس کو قبول کرے اور جو چاہے اس کا انکار کر دے۔

وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَا اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (سورۃ النمل ۹۳:۲۷) اور میں حکم دیا گیا ہوں کہ میں قرآن پڑھ کر سناؤں پس جو ہدایت پا گیا اس کا فائدہ اس کے نفس کو ہی پہنچے گا اور جو گمراہ ہو گیا پس کہہ دے میں تو ڈرانے والا ہوں۔

قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ (سورۃ یونس ۱۰۸:۱۰) کہہ اے لوگو! تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس حق آ گیا پس جو ہدایت پاتا ہے پس اس کا فائدہ اس کی جان کو پہنچتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے اس کا نقصان اسی کو پہنچتا ہے اور میں تم پر کارساز نہیں ہوں۔

یہ آیات صاف الفاظ میں بیان کرتی ہیں کہ انسان کو یہ کامل اختیار ہے کہ وہ چاہے اسلام کے پیغام حق کو قبول کر لے چاہے وہ رد کر دے، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صرف یہ کام ہے کہ وہ اس پیغام کو لوگوں تک پہنچا دے۔ ارشاد الٰہی ہے: مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ (سورہ المائدہ ۹۹:۵) یعنی رسول پر صرف پیغام کا پہنچا دینا ہے۔

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس الزام کا کھوکھلا پن اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی تو مصائب وآلام سے پُر تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور صحابہ کو ہجرت کرنا پڑی۔ مدنی زندگی اقتدار کی زندگی تھی۔ اس زندگی میں ایک مثال بھی نہیں ملتی جس کا معترضین سہارا لے کر اپنے الزام کو مضبوط بنا سکیں۔ مدینہ پر کفار نے بار بار حملے کیے۔ ہر جنگ میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا۔ دشمنوں کے قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فدیہ لے کر یا احسان کے طور پر رہا کر دیا۔ ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی

قیدی کو جبر و کراہ کے ساتھ اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کی ہو۔

اسلام کیسے پھیلا

اسلام قرآن مجید کی روحانی تاثیر اور اس کی مقدس تعلیم کی کشش سے پھیلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد نبوی میں مخالفین لوگوں کو قرآن مجید کے سننے سے روکتے تھے۔ اسی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے:
وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (حٰمٓ السجدہ ۴۱:۲۶) کفار کہتے ہیں اس قرآن کو مت سنو جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو اس وقت شور کرو تا کہ تم غالب آ جاؤ۔

تاریخ اسلام میں ایک مثال نہیں سینکڑوں مثالیں ہیں کہ اشد مخالفین قرآن مجید کی چند آیات سن کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ حضرت عمرؓ انہی لوگوں میں سے ہیں جو قرآن مجید کی چند آیات سن کر مسلمان ہوئے تھے۔

خالد بن عتبہ قرآن مجید سن کر بے اختیار بول اٹھا: وَاللّٰهِ ان له لحلاوة وان عليه لطراوة وان اسلفه لمغدق وان اعلاه لمثمر وما يقول هذا البشر بخدا اس میں عجیب شیرینی ہے اس میں عجیب تر و تازگی ہے اس کی جڑیں سیراب ہیں اور اس کی شاخیں پھل سے لدی ہوئی ہیں۔ بشر تو ایسا کہہ نہیں سکتا۔

چنانچہ جان ریسک جرمنی فلاسفر کہتا ہے:
”جب کہ قرآن پیغمبر کی زبان سے منکر سنتے تھے تو بے تاب ہو کر سجدے میں گر پڑتے تھے اور مسلمان ہو جاتے تھے۔

اسلام یا جزیہ یا جنگ کا مفہوم

اسلام نے جنگ کی کب اجازت دی ہے۔ اس کا ذکر جہاد کے عنوان کے تحت ہو چکا ہے۔ یہاں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ خلفاء راشدین کے عہد کی لڑائیوں کے سلسلہ میں یہ الفاظ بکثرت سامنے آتے ہیں کہ مسلمان سفراء جنگ سے قبل دشمن فوج کے سامنے تین چیزیں پیش کرتے تھے: یا اسلام قبول کر دیا جزیہ دو یا جنگ کے لئے تیار ہو جائیے۔ ان الفاظ سے مستشرقین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسلامی لڑائیاں محض اشاعت اسلام کے لئے تھیں۔

بعض مسلمان علماء نے بھی مستشرقین کی ہم نوائی کی ہے۔ یہ الفاظ عہد خلافت کی جنگوں میں ان سفراء کے ہیں جو دشمن قوم کے پاس خیر سگالی کا پیغام لے کر جاتے تھے۔ اگر خلفاء راشدین کے ان خطبات کا مطالعہ کیا جائے جو انہوں نے سریر خلافت پر بیٹھتے ہی دیئے تھے تو واضح ہوتا ہے کہ وہ قرآن کریم اور سنتِ نبویؐ کی پیروی کو اپنے لئے کتنا ضروری قرار دیتے تھے۔ جب کہ قرآن مجید کی تعلیم اور سنتِ نبویؐ جارحانہ

لڑائیوں کے خلاف ہے۔ پھر وہ ایسے راستہ پر کیوں کر چل سکتے تھے جس پر چلنے سے قرآن مجید اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت ہو۔

اس کے علاوہ اگر تاریخی واقعات کو بھی سامنے رکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ خلافت اسلامیہ کی جنگیں جارحانہ نہ تھیں۔ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جب عرب میں بغاوت کی آگ پھیل گئی تو حضرت ابوبکرؓ اس آگ کے بجھانے میں مصروف تھے۔ ایران اور روم کی حکومتوں نے روپے اور آدمیوں کے ذریعے باغیوں کی کھلم کھلا امداد کی۔ چنانچہ میور لکھتا ہے:

"چالڈیا اور جنوبی سیریا فی الحقیقت عرب میں شامل تھے۔ جو اقوام اس علاقہ میں آباد تھیں۔ ان میں کچھ تو بت پرست اور زیادہ تر (گو برائے نام ہی سہی) عیسائی تھے۔ وہ عرب نسل کا ایک جزو لاینفک تھے اور اس وجہ سے بلاواسطہ نئے مذہب کے حلقہ اثر میں تھے۔ لیکن جب سرحد پر مسلمانوں سے یہ قومیں متصادم ہوئیں تو ان کے اپنے اپنے ہم مذہب حاکموں نے ان کی امداد کی۔ مغربی علاقہ میں رہنے والوں کی قیصر نے مدد کی اور مشرقی علاقہ میں رہنے والوں کی خسرو نے مدد کی۔ اس طرح یہ کشمکش زیادہ بڑھ گئی۔"[1]

ایران اور روم دونوں نے ہی مسلمانوں پر حملہ کرنے میں سبقت کی۔ اس کا آغاز رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں ہو چکا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود رومیوں کے حملہ کی خبر سن کر رجب ۹ھ ہجری کو تیس ہزار کا لشکر لے کر مدینہ سے تبوک کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن مسلمانوں کا لشکر جرار دیکھ کر رومی مقابلہ پر نہ آئے۔ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارادہ جبراً مسلمان بنانا ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روم کی سرحد میں داخل ہو جاتے اور تلوار کے زور سے دشمن قوم کو مسلمان بنا لیتے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد صرف سرحدوں کا دفاع تھا۔ اس وجہ سے جب دیکھا کہ دشمن مقابلہ پر نہیں آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بغیر جنگ کے واپس آ گئے۔

عہد خلافت میں جب بھی ان بڑی سلطنتوں کے جرار لشکر کا مسلمانوں کے قلیل لشکر کے ساتھ مقابلہ ہوا، تو ہر میدان میں ان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر شکست ان کے جوش انتقام کو اور بڑھا دیتی اور زیادہ تیاری کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہوتے۔

چونکہ مسلمانوں کی زندگی خطرے میں تھی۔ مزید برآں مسلمانوں کا امن اور سکون ان سلطنتوں کے بار بار حملہ آور ہونے کی وجہ سے برباد ہو چکا تھا۔ اس وجہ سے بین الاقوامی اصول کے تحت اب کوئی اور چارہ نہ تھا کہ ان بڑی سلطنتوں کے غرور کو خاک میں ملایا جاتا اور ان کی طاقتوں کو پاش پاش کیا جاتا، تاکہ وہ دوبارہ اسلامی علاقہ پر حملہ آور نہ ہو سکیں اور مسلمان امن کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ قرآن مجید اس حد تک لڑائی کی اجازت دیتا ہے کہ فتنہ باقی نہ رہے۔[2]

---

1. دی خلیفت ص ۶۱۔

2. وقٰتلوهم حتّٰى لا تكون فتنة ويكون الدّين لله (۲:۱۹۳) اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو۔

کتنی پیاری تعلیم ہے کہ اسلام اس وقت تک جنگ لڑنے کی اجازت دیتا ہے جب تک امن سوز محرکات ختم نہیں ہو جاتے۔ امن سوز محرکات کو ختم کرنا بین الاقوامی اصول کے تحت ضروری ہے۔

اسلامی جنگوں میں عیسائیوں کا شریک ہونا

اسلامی جنگوں میں صرف مسلمان ہی شریک نہیں ہوتے تھے بلکہ عیسائی فوجیں بھی اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کے دوش بدوش لڑتی تھیں۔ اگر جنگوں کی غرض صرف جبراً مسلمان بنانا ہوتا تو وہ اپنے لشکر میں عیسائیوں کو کیسے شریک کرتے۔

بعض مفتوحہ علاقوں نے نہ اسلام قبول کیا نہ جزیہ دیا، بلکہ اس شرط پر صلح کی کہ وہ بھی مسلمانوں کے ساتھ مل کر دشمن کے خلاف لڑائی لڑیں گے۔ مثلاً فتوحات شام میں اہل جرمومہ اور فتوحات ایران میں رئیس جرجان اور باب کے رئیس نے جزیہ کی بجائے فوجی امداد پر صلح کر لی۔

یہ تمام تاریخی حقائق اسلام یا جزیہ یا تلوار کے اس غلط مفہوم کو باطل کرتے ہیں جو معترضین نے سمجھ رکھا ہے۔

صحیح مفہوم

گزشتہ بحث سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ نہ تو اسلام جبراً منوایا گیا ہے اور نہ عہد خلافت میں سفراء نے جنگ کرنے سے پہلے مخالفوں کو یہ پیغام اس رنگ میں دیا تھا کہ یا تو اسلام قبول کرو یا جزیہ دو یا جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اسلام یا جزیہ جنگ کا مفہوم ان آیات کے تابع متعین کرنا ہوگا:

وَقَاتِلُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (بقرہ ۲:۱۹۰) یعنی اے مسلمانو! اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے لڑائی لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (حج ۲۲:۳۹) ان لوگوں کو لڑائی کی اجازت دی گئی ہے جن پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے گئے ہیں۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (توبہ ۹:۱۱) اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمھارے بھائی ہیں۔

اسلام جنگ میں بنی نوع انسان کے لیے رحمت بن جاتا ہے اور مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ زیادتی کرنے والے دشمن کے خلاف جوابی کارروائی کرنے کی بجائے اسلام کی تعلیم پیش کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم سفرا دشمن کے سامنے پہلے اپنی پستی اور بداخلاقیوں کا ذکر کرتے تھے، پھر اس روحانی انقلاب کا ذکر کرتے تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معرفت ظہور پذیر ہوا تھا۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو دشمن کی تمام زیادتیوں اور ظلم وستم کے افعال کو نسیاً منسیاً کر دیا جائے اور ان کو اپنے حلقہ اخوت میں شامل کر لیا

جائے۔ اگر وہ دائرہ اسلام میں داخل نہ ہوں تو پھر ان کے سامنے جزیہ پیش کیا جائے۔ اگر وہ جزیہ دینے سے بھی انکار کر دیں تو پھر اپنے دشمن کی زیادتیوں سے بچنے کے لیے اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لیے جنگ کی جائے لیکن جنگ میں یہ بات سامنے رہنے چاہیے کہ ان پر جوش غضب کی وجہ سے زیادتی نہ ہو۔

پس اسلام یا جزیہ یا جنگ کا وہ مفہوم نہیں ہے جو معترضین نے سمجھا ہے بلکہ اس کی صرف یہ حقیقت ہے کہ جنگ سے حتی الامکان بچا جائے تاکہ انسان کے مقدس خون سے زمین سرخ نہ ہو۔ جنگ سے بچاؤ کی بہترین تدبیر یہی ہے کہ دشمن بھی دین رحمت کو مان لے تاکہ ایک دوسرے سے کامل اطمینان حاصل ہو جائے۔ اگر اسلام قبول نہ کریں تو جزیہ دیں، اس سے بھی دشمن کی طرف سے اطمینان ہو جاتا ہے۔ جب دونوں شرائط مسترد ہو جائیں تب دشمن کی طاقت کو توڑنے کے لیے جنگ کی جائے۔ اگر آخری مرحلہ پر جنگ نہ کی جائے تو دنیا سے امن وامان بالکل اٹھ جائے گا۔ اس مرحلہ پر جنگ کرنا بقا اور امن کے لیے ضروری ہے۔

اسلامی فرقے

شیعہ

شیعہ مذہب کی ابتداء اور مصادر کے متعلق مورخین اور علماء میں اختلاف ہے۔ پروفیسر ڈوزی کے نظریہ کے مطابق شیعیت ایران اور فارس کی پیداوار ہے۔ جس طرح اہل ایران خاندانی بادشاہت کے معتقد تھے اسی طرح اہل تشیع خاندانی امامت وخلافت کے قائل ہیں۔

بعض مستشرقین کا یہ خیال ہے کہ مسلک یہودیت سے ماخوذ ہے کیونکہ عبداللہ بن سباء یہودی تھا۔ امام شعبیؒ اور امام ابن حزمؒ نے شیعہ مذہب کو اس امت کے یہود قرار دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شیعہ مسلک نہ تو ایرانی پیداوار ہے اور نہ یہودیت سے ماخوذ بلکہ شیعیت کا تخم وہ صحابہ کی جماعت ہے جو حضرت علیؓ کو خلافت کی زیادہ حق دار سمجھتی تھی۔ ان میں سے مشہور حضرت عباسؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت مقدادؓ بن اسود، حضرت عمارؓ بن یاسر اور حضرت سلمان فارسیؓ جابر بن عبداللہ، ابی بن کعب، حذیفہ اور دیگر بہت سے صحابہ تھے۔ اس جماعت کا حضرت علیؓ کو کسی پہلو میں افضل جاننے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نعوذ باللہ خلفاء ثلاثہ کو غاصب تصور کرتے تھے بلکہ تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ سب صحابہ نے خلفاء ثلاثہ کی بیعت کا جوا اپنی گردن پر رکھ لیا تھا اور حضرت علیؓ نے تینوں خلفاء کی برضا ورغبت بیعت کی اور ان کے ممد ومعاون رہے۔

اس دور کے بعد حضرت علیؓ کے افضل ہونے کے تصور نے بہت ہی اہمیت حاصل کر لی۔ اس تصور پر ایک فرقہ کی عمارت کھڑی ہوئی۔ چنانچہ شیعان علی کہتے ہیں کہ "امامت ان مصالح عامہ میں سے نہیں ہے جسے امت کی فکر ونظر کے سپرد کر دیا جائے اور جو امت کے متعین کر دینے سے متعین ہو جائے بلکہ یہ تو دین

کا رکن اور اسلام کی بنیاد ہے نبی کے لیے جائز ہی نہیں کہ وہ اسے یونہی چھوڑ جائے اور امت کے حوالے کر جائے بلکہ نبی کا فریضہ ہے کہ وہ امت کے لیے ایک امام کو مقرر کر کے جائے وہ امام کبائر وصغائر سے معصوم ہونا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ کو امامت کے لیے متعین فرما دیا تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ چند نصوص بھی نقل کرتے ہیں اور ان کی تاویلیں اپنے مذہب کے مطابق کرتے ہیں مگر یہ نصوص ایسی ہیں جن کو نہ علمائے حدیث پہچانتے ہیں اور نہ ناقلین شریعت۔ ان میں سے زیادہ تر موضوع اور سندات کے اعتبار سے مطعون یا اُن کی فاسد تاویلات سے بہت ہی بعید ہیں۔[1]

شیعیت کا آغاز

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں عبداللہ بن سباء یہودی نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اس خیال کو ہوا دینی شروع کی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد حضرت علیؓ کی خلافت کی وصیت کی تھی۔ ساتھ ہی حضرت عثمانؓ اور ان کے عمال کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کیا۔ آخر سبائی تحریک حضرت عثمانؓ کی شہادت کا سبب بنی اور ان کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کو خلیفہ بنالیا گیا۔ امت نے حضرت علیؓ کو خلیفہ اس وجہ سے منتخب نہیں کیا تھا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصی تھے بلکہ اس وجہ سے منتخب کیا تھا کہ زندہ صحابہ میں خلافت کے سب سے زیادہ اہل تھے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ساتھ ہی امت مسلمہ میں اختلاف اور انتشار اور خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس نازک دور میں حضرت علیؓ نے نہایت ہی تدبر اور ہوشمندی سے کام لیا۔ افتراق اور انتشار کو ختم کرنے کی سعی کی۔ چونکہ شہادت نے مسلمانوں میں غلط فہمیاں اور رنجشیں پیدا کر دی تھیں اور قبائلی جذبات بھڑک اٹھے تھے، اس وجہ سے اسلامی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ کے امیر حضرت معاویہؓ ہو گئے اور دوسرے کے امیر اور خلیفہ حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ کے طرفدار شیعان معاویہ کہلانے لگے اور حضرت علیؓ کے طرف دار شیعانِ علیؓ، مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ شیعان علی پر مذہبی رنگ چڑھنا شروع ہو گیا، اور کچھ اصول اور عقائد مرتب کر لیے۔

اصولِ شیعہ

ا۔ امامت: امامت وہ امتیازی اصول ہے، جو شیعہ فرقہ اور دوسرے اسلامی فرقوں کے درمیان حد فاصل ہے۔ محمد حسین آل کاشف الغطاء ابن حسن نجفی امامت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امامت وہ منصب الٰہی ہے جو نبوت کی طرح پروردگار عالم کی جانب سے ہدایت خلق کے لیے عطا ہوتا ہے۔''[2]

1۔ مقدمہ ابن خلدون۔ 2۔ اصل و اصول شیعہ ص ۷۲۔

۲۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ امام معصوم عن الخطا ہوتا ہے۔

۳۔ تیسرا اصول یہ ہے کہ امام کی معرفت جزو ایمان ہے۔

۴۔ چوتھا اصول یہ ہے کہ امامت کے حق دار صرف حضرت علیؓ اور ان کی اولاد ہے۔

۵۔ پانچواں اصول یہ ہے کہ امام کا انتخاب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

امامت کیا ہے

اہل تشیع کا اصل الاصول اور مرکزی نقطہ ''امام'' ہے۔ امام کا کیا مقام ہے۔ اس کے متعلق شیعوں کی مشہور کتاب اصول کافی مرتبہ محمد بن یعقوب کلینی سے وضاحت کی جاتی ہے۔

رسول اور امام میں یہ فرق ہے کہ رسول کے پاس جبریل امین وحی لے کر آتے ہیں تو وہ انھیں دیکھتے ہیں ان سے بات چیت کرتے ہیں لیکن امام کے پاس فرشتے وحی لے کر آتے ہیں وہ ان سے باتیں کرتا ہے مگر انھیں دیکھ نہیں سکتا۔

ابوحمزہ سے مروی ہے کہ امام جعفر نے فرمایا کہ اللہ کی اطاعت وہی کرتا ہے جو اس کی معرفت رکھتا ہے اور جو معرفت نہیں رکھتا وہ یونہی گمراہی سے اس کا پرستار بنا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا معرفت سے آپ کی مراد کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ اللہ عزوجل کی تصدیق۔ حضرت علیؓ کی موالات اور ان کی پیروی۔ آئمہ کی پیروی اور ان کے دشمنوں سے اللہ کے سامنے برأت ان چیزوں کا نام ہے اللہ کی معرفت۔

امام جعفر نے فرمایا کہ ہم علم الٰہی کے خزانہ دار ہیں اور وحی الٰہی کے ترجمان۔ جو لوگ زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے ہیں ان سب پر ہم اللہ کی حجت ہیں۔

امام گناہوں سے معصوم اور عیبوں سے بری ہوتا ہے۔ لوگوں نے سخت غلطی کی اور جھوٹ گھڑا کہ جان بوجھ کر اہل بیت کو چھوڑا اور اللہ و رسول کے انتخاب سے منہ موڑا۔ امام جعفر نے فرمایا کہ ہم شجر نبوت اور رحمت کا گھر ہیں اور علم کا معدن، رسالت کا مقام اور ملائکہ کی آمد و رفت کا موقعہ ہیں۔ اللہ کے بندوں کے پاس ہم اللہ کی امانت ہیں ہم اس کے حرم اکبر ہیں اور ہم اس کا ذمہ دار عہد ہیں جس نے ہمارا عہد پورا کیا۔ اس نے اللہ کا عہد پورا کیا اور جس نے ہمارا عہد توڑا اس نے اللہ کا عہد توڑا۔ آئمہ کے پاس وہ ساری کتابیں ہیں جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئیں اور وہ ان سب کو باوجود زبانوں کے اختلاف کے سمجھتے ہیں پھر اللہ نے آئمہ کو اس کتاب کا وارث بنایا جس میں ہر شے کی تصریح ہے۔ مکمل قرآن سوائے آئمہ کے کسی کے پاس نہیں ہے اور وہی اس کا پورا علم رکھتے ہیں۔ جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس نے پورا قرآن جمع کر لیا ہے وہ جھوٹا ہے۔ کسی نے اس کو جس طرح پر وہ نازل ہوا نہ جمع کیا نہ حفظ کیا سوائے علی ابن طالب اور ان آئمہ کے جو ان کے بعد ہیں آئمہ کے پاس اسم اعظم ہے۔ اور وہ جفر بھی رکھتے ہیں جو چمڑے کا ایک تھیلا ہے۔ جس میں انبیاء کرام و اولیاء عظام نیز گزشتہ انبیاء و علماء بنی اسرائیل کے تمام علوم ہیں۔ ان کے پاس مصحف فاطمہ ہے اور اس

میں تمھارے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں ہے۔
آئمہ جب کسی شے کا علم چاہتے تو اللہ ان کو بتا دیتا ہے وہ جانتے ہیں کہ کب مریں گے اور جب مرتے ہیں تو اپنے اختیار سے مرتے ہیں۔
جو کچھ پیدا ہوا۔ یا ہونے والا ہے آئمہ سب کا علم رکھتے ہیں اور ان کے سامنے کوئی چیز مخفی نہیں رہتی۔ اللہ نے اپنے رسول کو کوئی علم نہیں سکھایا مگر یہ کہ ان کو حکم دیا کہ امیر المومنین علیؓ کو سکھلا دیں۔ اس لیے وہ علم میں نبی کے شریک تھے۔ پھر یہ تمام علوم آئمہ کو ملے۔
اللہ نے آئمہ کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور ان کی نافرمانی سے منع کیا ہے وہ بمنزلہ رسولوں کے ہیں بجز اس کے نبی نہیں ہیں۔
اللہ، رسول نے ہر ایک امام کی یکے بعد دیگرے تصریح کر دی ہے ہر امام اپنے بعد کے امام کو امامت سپرد کر دیتا ہے اور اس کے لیے ایک ملفوف کتاب اور پاک وصیت نامہ چھوڑ دیتا ہے۔ جس میں آدم کی تخلیق سے لے کر فنائے عالم تک جو ضرورتیں پیش آنے والی ہیں۔ سب کا حل ہے۔ امام کے لیے غیبت بھی ہے جب اس کی غیبت کی خبر سنو تو انکار نہ کرو اور بارہویں امام غائب ہیں۔ وہی مہدی ہیں جو روئے زمین کو جب وہ ظلم وستم سے بھر جائے گی عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔

فرقہ امامیہ اثناء عشریہ

اس فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ کے متعلق خلافت کی وصیت کی تھی۔ پھر ان کے بعد امامت فاطمی اولاد میں ہی محصور ہے اور آئمہ کو معصوم عن الخطا اور ان کی معرفت اصول ایمان مانتے ہیں۔ یہ فرقہ بارہ آئمہ کا قائل ہے۔ ان کا سلسلہ امام غائب تک پہنچتا ہے۔ شیعہ اثناء عشریہ کے نزدیک سب سے زیادہ مشہور مجتہد حضرت امام جعفر صادق ہیں اس فرقہ کی فقہ ان ہی کی طرف منسوب ہے۔ اس فرقہ کے بارہ امام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت علی بن طالب (م ۲۰ رمضان ۴۰ھ)
۲۔ حضرت امام حسن (م ۵۰ھ)
۳۔ حضرت امام حسین (م ۶۱ھ)
۴۔ حضرت علی زین العابدین (م ۹۴ھ)
۵۔ امام ابوجعفر محمد باقر (م ۱۱۳ھ)
۶۔ امام ابوعبداللہ جعفر صادق (م ۱۴۸ھ)
۷۔ امام موسیٰ کاظم (م ۱۸۳ھ)
۸۔ امام ابوالحسن علی رضا (م ۲۰۲ھ)

۹۔ امام ابوجعفر محمد جواد (م ۲۲۰ھ)

۱۰۔ امام علی ہادی (م ۲۵۴ھ)

۱۱۔ امام ابومحمد حسن عسکری (م ۲۶۰ھ)

۱۲۔ امام محمد (مہدی منتظر) ۲۶۰ھ میں غائب ہوئے۔

شیعہ زیدیہ

یہ فرقہ پانچویں امام حضرت زید بن علی کی امامت کے قائل ہیں۔ یہ گروہ اہل سنت والجماعت کے قریب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام زید واصل بن عطا کے شاگرد تھے اور ان پر ان کی تعلیم کا اثر تھا۔ یہ فرقہ خلفاء ثلاثہ کی امارت کا قائل ہے۔ ان کے نزدیک افضل کے ہوتے ہوئے مفضول کی امامت جائز ہے۔

اس فرقہ کے نزدیک ایک ہی وقت میں دو مختلف علاقوں میں الگ الگ دو امام ہو سکتے ہیں۔ زیدیہ کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب ابدی جہنمی ہے تاوقتیکہ وہ توبۃ النصوح نہ کرے۔

شیعہ اسماعیلیہ

یہ فرقہ اسماعیلؒ کی امامت کا قائل ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ امام جعفر صادق کے بیٹوں میں سے امامت موسیٰؒ کاظم کی طرف منتقل نہیں ہوئی، بلکہ اسماعیل امام ہوئے۔ ان کی نسبت کی وجہ سے یہ فرقہ اسماعیلیہ کہلاتا ہے۔ اس فرقہ کو باطنیہ بھی کہا جاتا ہے۔

اس فرقہ کے نزدیک امام کسی کے سامنے جوابدہ نہیں۔ خواہ وہ کیسے ہی افعال کرے، کوئی انگشت نمائی نہیں کر سکتا۔

ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ امام کا ظاہر ہونا ضروری نہیں، وہ غائب اور مستور بھی ہوتا ہے۔ لیکن ہر حالت میں اس کی پیروی لازمی ہے۔

شیعیت کے عناصر

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ شیعیت کی ابتداء چند صحابہ کے اس نقطہ نظر سے ہوئی جو حضرت علیؓ کو ان کی بعض صفات کی وجہ سے خلافت کا زیادہ اہل تصور کرتے تھے۔ وہ لوگ واقعی خلوص اور نیک نیتی سے یہ نظریہ رکھتے تھے اور وہ حضرت علیؓ کے ساتھ خلوص اور محبت رکھتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد وہ لوگ بھی اس فرقہ میں شامل ہو گئے تھے جو اموی اور عباسی حکومتوں سے خوش نہ تھے قبائل عرب کا وہ طبقہ بھی شیعوں کے ساتھ مل گیا جو قدیم سے بنوامیہ کے خلاف تھا۔ اسی طرح موالی بھی اس فرقہ کے حامی بن گئے۔ اس فرقہ کو سب سے زیادہ تقویت اہل ایران نے دی تھی کیونکہ بنوامیہ کے دور میں اہل ایران کے ساتھ عربوں کے مساوی برتاؤ نہیں کیا جاتا تھا۔

شیعیت کی روح

شیعیت کی روح حب آل بیت ہے جیسا کہ پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ کچھ صحابہ حضرت علیؓ کو خلافت کا زیادہ حق دار سمجھتے تھے۔ آغاز میں یہ ایک سادہ سا نقطہ نگاہ تھا۔ حضرت عثمانؓ کے دور میں اس خیال نے زیادہ شدت اختیار کر لی۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد جب بنوامیہ برسر اقتدار آ گئے تو انھوں نے آل بیت پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھانے شروع کرائے اور سانحہ کربلا کے بعد حب آل بیت پر ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوئی جس کو عوام کی زبردست تائید حاصل ہوگئی۔ بنوامیہ کے دور میں حب آل بیت پر کئی آدمی اٹھے اور انھوں نے حکومت سے ٹکر لی اور آخر یہی روح بنوامیہ کے زوال کا باعث بنی۔ اسی روح پر شیعہ فرقہ کے عقائد اور فلسفہ کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اسی روح نے بعض غلط عقائد کو بھی جنم دیا مثلاً حضرت علیؓ کی الوہیت کا عقیدہ۔ عقیدہ رجعت (حضرت علیؓ دوبارہ اس دنیا میں آئیں گے اور اس دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے) اسی سے آئمہ کے غائب اور مخفی ہونے کا عقیدہ بھی پیدا ہوا۔

علم غیب (حضرت علیؓ کو ہر چیز کا علم تھا) وغیرہ گو یہ عقائد غلو پسند شیعیوں کے ہیں اور شیعہ کے بڑے بڑے علماء ان غلوانہ عقائد کی تائید نہیں کرتے۔ یہ تحریک اپنے دور کی ایک طبعی اور قدرتی تحریک تھی۔ اس تحریک نے مصائب وآلام کے طوفانوں میں آل بیت کے تقدس کی مقدس امانت کو بعد کی نسلوں تک پہنچایا۔ اگر یہ تحریک پیدا نہ ہوتی تو نامعلوم آل بیت کی تاریخ ہم تک کن کن الفاظ میں پہنچتی۔ اس تحریک کو نہ صرف مذہبی اہمیت حاصل ہے بلکہ اس تحریک نے تاریخ کے ان اوراق کو بھی محفوظ رکھا۔ جس کو بنوامیہ اور بنو عباس نے ختم کرنے کی ہر ممکن سعی کی۔

خوارج

خوارج وہی گروہ ہے جنھوں نے حضرت عثمانؓ کو شہید کیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد بظاہر حضرت علیؓ کی بیعت کر لی تھی اور خلیفہ وقت کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ ایک الگ جماعت کا آغاز جنگ صفین میں واقعہ تحکیم سے ہوا۔ حضرت امیر معاویہؓ کا لشکر جب شکست کھانے لگا تو شامیوں نے قرآن نیزوں پر بلند کیے اور حضرت علیؓ کی فوج سے کہا کہ ہمارے اور تمھارے درمیان کتاب اللہ حکم ہے۔ حضرت علیؓ کی فوج کے عراقی گروہ نے یہ دیکھ کر لڑائی بند کر دی اور کہا کہ ہمیں قرآن کا فیصلہ منظور ہے۔ حضرت علیؓ نے ہر چند سمجھایا کہ یہ شامیوں کی چال ہے لیکن عراقی گروہ نہ مانا۔ مسعر بن فدکی اور اس کے ساتھیوں نے کہہ دیا کہ اگر آپ نے قرآن کو منظور نہ کیا تو ہم ساتھ چھوڑ دیں گے۔ مجبوراً حضرت علیؓ کو تحکیم پر راضی ہونا پڑا۔

جب حضرت علیؓ عراقیوں کے اسرار پر تحکیم پر راضی ہوئے تو ان میں سے ایک گروہ اٹھ کھڑا ہوا اور کہا: حکم الٰہی میں تم نے انسانوں کو ثالث کیوں بنایا ہے؟ حضرت علیؓ نے ہر چند یہی کہا کہ تمھارے اصرار پر

میں نے یہ کام کیا ہے تو انھوں نے جواب دیا ہم نے کفر کیا ہے۔ ہم اقرار کرتے ہیں، تم بھی اقرار کرو کہ تم نے کفر کیا ہے۔ حضرت علیؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو سمجھانے کے لیے بھیجا۔ قرآنی اور عقلی دلائل سننے کے بعد بھی وہ نہ مانے۔ دراصل اس گروہ کا مقصد اسلام کا شیرازہ منتشر کرنا تھا۔

جب حضرت علیؓ نے ثالثی کے لیے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو چار سو آدمیوں کے ساتھ دومۃ الجندل کی طرف روانہ کیا تو باغی گروہ اٹھ کھڑا ہوا اور عبداللہ بن وہب کے مکان پر جمع ہوئے اور ان کے خطیب نے یہ خطبہ فرمایا:

''امابعد! ان لوگوں کے لیے یہ ہرگز ہرگز زیبا نہیں جو خدائے رحمٰن پر ایمان رکھتے ہوں اور قرآن کے فیصلوں کی طرف رجوع کرتے ہوں کہ دنیا کے مفادات عامہ ان کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور حق بات کا اعلان کرنے سے کسی طرح راجح قرار پا جائیں۔ خواہ اس پر کتنے ہی احسانات کیوں نہ کیے جائیں اور خواہ ان کو کتنی ہی ایذائیں کیوں نہ پہنچائی جائیں جن لوگوں پر اس دنیا میں احسان جتائے جاتے اور ایذائیں دی جاتی ہیں تو قیامت کے دن ان کا ثواب ان لوگوں کو رضائے الٰہی کی شکل میں حاصل ہوگا اور وہ جنت میں ہمیشہ ہمیشہ آرام اور چین کریں گے۔

بھائیو! آؤ اس آبادی سے نکل چلیں جس کے باشندے ظالم ہیں اور آؤ کسی پہاڑ کی کھوہ کی طرف چل دیں۔ یا کسی دوسرے شہر کی طرف ہجرت کر جائیں اور جہاں جا کر ہم ان بدعات کا انکار کر دیں۔''[1]

عبداللہ بن وہب کو اپنا قائد بنالیا۔

حضرت علیؓ سے خوارج کی علیحدگی

اس کے بعد یہ گروہ کوفہ کے قریب ایک حرورا نامی بستی کی طرف نکل گئے۔ اس بستی کی نسبت سے ان کا نام حروریہ بھی پڑ گیا ان کا ایک نام محکمۃ بھی تھا۔ یعنی وہ لوگ جو ''لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ'' کے قائل ہیں۔ ان کو خارجی اس لیے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے حضرت علیؓ سے خروج کیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خوارج لفظ ''خروج فی سبیل اللہ'' سے ماخوذ ہے۔ جو اس آیت سے لیا گیا ہے۔ وَمَنْ یَخْرُجْ مِنْ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ یُدْرِکْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ (النساء۴:۱۰۰) جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کر کے نکلتا ہے اور پھر اسے موت آلیتی ہے۔ تو اس کا اجر خدا کے ذمہ واجب ہے۔ ان لوگوں کا ایک نام شُرَاۃ بھی ہے یعنی وہ لوگ جنھوں نے اپنی جانوں کو فروخت کر دیا ہے جو قرآن کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (۲:۲۰۷) ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی جانیں خدا کی رضا کی طلب میں فروخت کر دیتے ہیں۔

---

[1] طلوع اسلام اپریل مئی ۱۹۵۸ء جلد ۱۱۔

حضرت علیؓ نے خوارجیوں کو جنگ نہروان میں شکست دی۔ اس جنگ میں خوارج کے کئی سردار مارے گئے۔ اس شکست کے بعد عبدالرحمٰن بن ملجم نے حضرت علیؓ کو قتل کرنے کی سازش کی۔ عبدالرحمٰن بن ملجم ایک ایسی عورت کا خاوند تھا جس کے قبیلے کے بہت سے اشخاص جنگ نہروان میں مارے گئے تھے۔

خوارج کے عقائد

۱۔ خلیفہ کا انتخاب بغیر کسی حسب نسب اور قوم کے آزادانہ اور منصفانہ ہونا چاہیے جس میں تمام مسلمان حصہ لیں۔

۲۔ جب تک خلیفہ عدل و انصاف اور تنفیذ شریعت کا کام کرے اس وقت تک وہ منصب خلافت پر قائم رہ سکتا ہے۔

۳۔ یہ گروہ ہر خاطی اور گناہگار کو کافر سمجھتا تھا۔

۴۔ خوارج کا بنیادی اصول "لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ" ہے۔ یعنی اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔

خوارج کے فرقے

۱۔ فرقہ ازارقہ

یہ فرقہ نافع بن ازرق کی طرف منسوب ہے۔ یہ ان کا بہت بڑا فقیہہ اور عالم تھا۔ اس نے اپنی جماعت کے سوا تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا اور کہا اگر اس کے ساتھیوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی غیر خارجی کے ساتھ نماز پڑھے۔ اور نہ ہی یہ جائز ہے کہ وہ غیر خارجی کے ہاتھ کا ذبیحہ کھائے۔ یا ان میں شادی بیاہ کرے۔ خارجی غیر خارجی کا وارث نہیں ہو سکتا اور اسی کے نام کی نسبت سے ازارقہ مشہور ہوا۔ یہ لوگ نماز، روزہ، صدقہ وغیرہ شرعی اعمال کو جزو ایمان سمجھتے تھے۔ گناہ کبیرہ کے ارتکاب کرنے والے کو کافر سمجھتے تھے۔ غیر خارجی لوگوں کو وہ کفار اور مشرکین عرب کی طرح سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کا یہ نظریہ تھا۔ ان سے بجز اسلام یا تلوار کے کوئی دوسری چیز قبول نہیں کی جا سکتی۔ ان کا ملک دارالحرب ہے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا جائز ہے۔ تقیہ کرنے کو حرام سمجھتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً (النساء۴:۷۷) "ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو انسانوں سے اس طرح ڈرتے ہیں جیسے کوئی خدا سے ڈرتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ لوگوں سے عہد شکنی کو ناجائز سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک قدرت رکھنے والا شخص ... باد میں شریک نہ ہو وہ کافر ہے۔

۲۔ فرقہ نجدات

اس گروہ کا قائد نجدہ بن عامر تھا۔ اس فرقہ کی اہم ترین تعلیمات میں سے ایک چیز یہ ہے کہ

گناہگار کوشش کر لینے کے بعد معذور ہے نیز یہ کہ دین دو چیزوں کا نام ہے خدا کی معرفت اور رسول کی معرفت۔ یہ لوگ جھوٹ بولنے کے جرم کو زنا کرنے اور شراب پینے کے جرم سے زیادہ سنگین خیال کرتے تھے۔ یہ فرقہ جہالت کو عذر قرار دیتا تھا۔ یعنی جو شخص اجتہاد سے کسی حرام چیز کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے دیتا تھا۔ وہ معذور ہے۔

۳۔ فرقہ رباضیہ

اس فرقہ کا قائد عبداللہ بن رباض تمیمی تھا۔ اس کی نسبت سے یہ فرقہ رباضیہ کہلاتا تھا۔ یہ گروہ فرقہ ازارقہ کی نسبت اپنے نظریات میں غلو سے کام نہیں لیتا تھا۔ یہ غیر خارجیوں سے شادی بیاہ کرنا اور خارجی مسلمان کا غیر خارجی مسلمان کا وارث ہونے کو جائز سمجھتے تھے۔ غیر خارجیوں پر دھوکہ اور چھپ کر حملہ کر دینا اور ان کو گرفتار کر لینا ناجائز خیال کرتے تھے۔ اور غیر خارجیوں سے اس وقت تک جنگ کرنا جائز نہیں سمجھتا تھا۔ جب تک ان کو دعوت نہ دی جائے۔ اس فرقہ کے لوگ بلاد مغرب میں پائے جاتے تھے جو آج تک موجود ہیں۔

۴۔ فرقہ صفریہ

چوتھا گروہ صفریہ کہلاتا تھا۔ یہ لوگ زیاد بن اصفر کے پیرو تھے۔ یہ لوگ اپنے افکار اور نظریات میں ازارقہ سے کم درجہ متشدد تھے۔ کبائر کا ارتکاب کرنے والوں کو مشرک نہیں سمجھتے تھے۔

۵۔ فرقہ عجاردہ

پانچواں فرقہ عجاردہ تھا۔ یہ لوگ عبدالکریم بن عجرد کے پیرو تھے۔ یہ فرقہ اپنے نظریات اور افکار کے اعتبار سے نجدات کے قریب تھا۔

۶۔ فرقہ یزیدیہ

یہ فرقہ یزید بن ابی انیہ کے پیرو تھے۔ اس گروہ کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ عجمیوں میں سے ایک رسول مبعوث فرمائے گا جو شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منسوخ کرے گا۔

۷۔ فرقہ میمونیہ

یہ لوگ میمون عجردی کے پیرو تھے۔ اس فرقہ کے نزدیک بنات اولاد اور بھائی بہنوں کی اولاد کی بیٹیوں سے نکاح جائز ہے۔ علماء اسلام فرقہ یزیدیہ اور میمونیہ کو خارج از اسلام سمجھتے ہیں۔

خوارج کی بدنظمی

خوارج پر عربیت اور بدویت کا رنگ غالب تھا۔ ان میں وحدت اور اتحاد مفقود تھا اور وہ کبھی بھی

ایک ہاتھ پر جمع نہیں ہوئے۔ اگر یہ فرقہ اپنے عقائد میں حد درجہ متشدد نہ ہوتا اور ان میں اتحاد قائم رہتا تو جس طرح یہ لوگ جان پر کھیل جاتے تھے۔ اس قسم کے لوگوں کا مقابلہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بنو امیہ کے لیے آغاز میں ہی انتہائی خطرہ کا باعث بن جاتے اور ان کی قوت کو دبانا حکمران کے لیے آسان نہ ہوتا۔

خوارج کے عناصر

خلافت کے بارہ میں خوارج کے جمہوری نظریہ کی وجہ سے عرب بدوؤں اور موالیوں نے اس مذہب کو زیادہ قبول کیا۔ خلافت کے بارے میں خوارج کا یہ عقیدہ تھا کہ خلیفہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ قریشی ہی ہو یا عربی۔ وہ اپنی ذاتی صلاحیت کی وجہ سے کسی نسل کا بھی ہو سکتا ہے۔

خوارج کی خصوصیات

یہ لوگ روزہ اور نماز کے سختی سے پابند ہوتے تھے۔ طویل طویل سجدوں کی وجہ سے ان کی پیشانیاں زخمی ہو جاتیں اور ان کے ہاتھوں اور ٹخنوں پر گٹے پڑے ہوتے تھے۔ ابو حمزہ خارجی اپنے ساتھیوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''وہ لوگ نوجوان ہیں مگر اپنی جوانی میں شب بیداریاں کرنے والے۔ برائی سے حیا اتنی کہ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی۔ باطل سے ان کے پاؤں بوجھل رہتے ہیں۔ عبادت میں ہر دم مشغول رہنے والے اور شب بیداری میں شیر خدا آدھی رات کے وقت جب بھی ان کو دیکھتا ہے۔ تو قرآن کے اجزاء کی تلاوت کرتے ہوئے ان کے پہلوؤں کو بستروں سے علیحدہ دیکھتا ہے۔ جب ان میں سے کوئی آدمی کسی ایسی آیت کی تلاوت کرتا ہے۔ جس میں جہنم جنت کا تذکرہ ہوتا ہے تو غلبہ اشتیاق سے آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور جب کسی ایسی آیت سے گزرتا ہے جس میں جہنم کی آگ کا تذکرہ ہوتا ہے تو وہ یوں بلک بلک کر روتا ہے کہ شاید جہنم کی آگ کی گونج اس کے کانوں میں آ رہی ہے۔ مسلسل جفاکشی کی زندگی بسر کرنے والے ان کے دن کی جفاکشی، رات کی جفاکشی سے پیوست ہو جاتی ہے۔ زمین نے ان کے گھٹنوں، ہاتھوں، ناکوں اور پیشانیوں کو کثرت سجود کی وجہ سے کھا لیا ہے۔ خدا کے حقوق و واجبات کے مقابلہ میں وہ اپنی عبادتوں اور ریاضتوں کو ہیچ سمجھتے ہیں اور جب میدان جنگ میں وہ دیکھتے ہیں کہ ہر طرف تیروں کی بارش ہو رہی ہے۔ سامنے تیر تنے ہوئے ہیں، تلواریں سونت لی گئی ہیں اور مقابل فوج موت کی کڑک اور گرج کے ساتھ چمکتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے تو وہ خدا کی وعید کے مقابلہ میں مقابل فوج کی دھمکیوں کا مضحکہ اڑاتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ ان سب کا ہر نوجوان آگے بڑھتا ہے حتیٰ کہ اس کے پاؤں اپنے گھوڑے کی گردن پر ادھر سے ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے چہرہ کے محاسن پر خون کا خضاب لگا کر زمین پر گر پڑتا ہے۔''[1]

---

[1] طلوع اسلام اپریل مئی ۱۹۵۸ء جلد ۱۱۔

فرقہ جبریہ

جبر اور قدر کا مفہوم متعین کرنے میں علماء نے افراط اور تفریط کی راہ اختیار کی ہے۔ اور اس سے دو فرقے پیدا ہوئے ایک فرقہ جبریہ کہلایا اور دوسرا قدریہ۔

فرقہ جبریہ کا بانی

اس فرقہ کا بانی اور موسس معلوم کرنا مشکل ہے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ عقیدہ جبریہ اموی دور کے آغاز میں پیدا ہوا اور آخری دور میں ایک مسلک کی صورت اختیار کر لی۔

مرتضی نے اپنی کتاب المنیۃ والامل میں عبداللہ بن عباسؓ اور حسن بصریؒ کے خطوط کا ذکر کیا ہے۔ جس میں اہل جبریہ کو مخاطب کرتے ہوئے عقیدہ جبریہ سے منع فرمایا ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ لکھتے ہیں: اما بعد تم دوسروں کو تقوی کا حکم دیتے ہو، حالانکہ صاحب تقوی تمہاری وجہ سے گمراہ ہو گئے اور گناہگار تمہاری وجہ سے رونما ہوئے۔ اے اولاد منافقین! اور اے ظالموں کی پشت پناہی کرنے والو! تمھارے دم سے بدکاری کی مسجدیں آباد ہیں۔ تم سب خدا پر جھوٹ باندھنے والے ہو اور اپنے جرم اعلانیہ اس پر تھوپ دیتے ہو۔[1]

علی بن عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے والد کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی آیا اور کہنے لگا: ابن عباس! یہاں ایک قوم ہے جس کا دعویٰ ہے کہ ہر چیز خدا کے یہاں سے آتی ہے اور خدا نے انھیں جبراً گناہوں پر لگا رکھا ہے۔ فرمایا: اگر مجھے پتہ چل گیا کہ ایسا کوئی آدمی یہاں موجود ہے تو میں اس کا گلا ایسا دبوچوں گا کہ اس کی روح نکل جائے۔ یہ نہ کہو کہ خدا نے گناہوں کے ارتکاب پر مجبور کیا ہے یہ کہنا بھی زیبا نہیں کہ خدا اس بات سے قطعی طور پر بے خبر ہے کہ کیا کچھ کر رہے ہیں۔''[2]

مسلمانوں نے یہ عقیدہ کہاں سے اخذ کیا؟ مورخین کا اس بارہ میں اختلاف ہے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ یہ عقیدہ مسلمانوں نے یہودیوں سے سیکھا اور بعض کا یہ خیال ہے کہ یہ نظریہ اہل فارس کا تھا۔ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ یہود اور اہل فارس دونوں نظریہ جبریہ کے قائل تھے۔

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ عقیدہ یہودی ذہن کی پیداوار ہے وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں جعد بن درہم یہ نظریہ پھیلانے والا ہے، جو مسلمان تھا۔ اس نے یہ نظریہ ابان بن سمعان سے اور اس نے طالوت بن اعصم یہودی سے سیکھا۔ طالوت نامی یہودی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہم عصر تھا۔

جو مورخ اہل فارس کے ذہن کی پیداوار قرار دیتے ہیں وہ اس روایت پر بنیاد رکھتے ہیں:

''حضرت حسنؓ سے مروی ہے کہ فارس کا ایک شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں

---

1. المنیۃ والامل بحوالہ اسلامی مذاہب مصنفہ ابوزہرہ مصری ص ۱۴۴۔
2. المنیۃ والامل بحوالہ اسلامی مذاہب مصنفہ ابوزہرہ مصری ص ۱۴۵۔

حاضر ہو کر عرض پرداز ہوا۔ "میں نے دیکھا ہے کہ اہل فارس اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو اپنے نکاح میں لاتے ہیں اور جب ان سے وجہ پوچھی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ خدا کی تقدیر یونہی تھی۔" یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں ایک فرقہ ایسا پیدا ہوگا جو اس کا قائل ہوگا۔ یہ میری امت کے مجوس ہوں گے۔"[1]

عقیدہ جبریہ پر ایک مسلک اور فرقہ کی عمارت استوار کرنے والا جہم بن صفوان ہے اسی وجہ سے اس فرقہ کو جہمیہ بھی کہا جاتا ہے۔

عقیدہ جبریہ کا مفہوم

اس نظریہ کا یہ مفہوم ہے کہ انسان کو اپنے اعمال پر کوئی اختیار نہیں۔ تمام اعمال کا مصدر اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں مجبور محض ہے۔

تنقید

یہ مفہوم صرف اسلامی تعلیم کے ہی خلاف نہیں بلکہ روز جزا و سزا کو بھی باطل قرار دیتا ہے۔ اگر انسان اللہ کے ہاتھ میں مجبور محض ہے اور انسان تمام اعمال اللہ تعالیٰ کے حکم اور مشیت سے ہی کرتا ہے تو جزا و سزا کیسی ہے؟ صحیح مسلک یہ ہے کہ انسان ایسے اعمال پر مختار کل ہے جن پر جزا و سزا مرتب ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی۔ پھر عقل کی راہنمائی کے لیے رسول بھیجے اور ان کے ذریعہ احکام سکھائے۔ پھر انسان کو یہ اختیار دیا کہ وہ راہ مستقیم پر چلے یا کج روی اختیار کرے۔ اگر راہ مستقیم پر چلے گا تو جزا پائے گا۔ اگر کج روی اختیار کرے گا تو سزا پائے گا۔

جہم بن صفوان کے دیگر عقائد

۱۔ جنت اور دوزخ فنا ہونے والے ہیں۔ قرآن مجید میں جس خلود کا ذکر ہے اس سے مراد طویل مدت ہے۔

۲۔ وہ خدا کے کلام کو حادث خیال کرتا تھا۔ اس وجہ سے وہ خلق قرآن کا قائل تھا۔

۳۔ وہ خدا کو اشیاء میں داخل خیال نہیں کرتا تھا۔

۴۔ وہ قیامت کے روز دیدار الٰہی کا منکر تھا۔

۵۔ وہ ایمان کو صرف معرفت کا نام دیتا تھا۔ اس عقیدہ کے مطابق اس کے نزدیک جو یہود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف سے باخبر تھے مومن تھے۔

۶۔ وہ خدا کی صفات کی نفی کرتا تھا جہم کہا کرتا تھا کہ خدا کی ایسی صفات نہیں ہوسکتیں۔ جو اس کی ذات سے الگ ہوں۔ قرآن میں جو سمیع، بصیر وغیرہ صفات بیان ہوئی ہیں وہ ظاہری معنی پر محمول نہیں ان کی تاویل ضروری ہے۔ اگر ظاہری معنی پر محمول کیا جائے تو تشبیہ بالمخلوق کو مستلزم ہے۔ جو خدا

[1] الملیۃ والامل بحوالہ اسلامی مذاہب مصنفہ ابوزہرہ مصری ص ۱۴۵۔

کے لیے جائز نہیں۔

ان عقائد کے خلاف علماء اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ عقیدہ جبریہ کے دو بھاری نقصان تھے۔ ایک عقیدہ جبر پر بھروسہ کر کے انسان عمل سے عاری ہو جاتا۔ دوم خدا کی صفات کی نفی کرنے سے قرآن کے معنی اور مطالب میں خطرہ لاحق ہوتا تھا۔

فرقہ قدریہ

عقیدہ جبریہ کے ردعمل میں عقیدہ قدریہ ظہور میں آیا۔ فرقہ قدریہ کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنے اعمال میں مختار کل ہے۔ سب کام اپنے اختیار اور ارادہ سے کرتا ہے۔ اس عقیدہ کے حامی اسی حد تک نہیں ٹھہرے بلکہ وہ تقدیر الٰہی کی نفی کرنے لگ پڑے اور کہنے لگے کہ جب امور وقوع میں آتے ہیں تب اللہ تعالیٰ کو ان کا علم ہوتا ہے۔

فرقہ قدریہ کا بانی

جس طرح فرقہ جبریہ کے موسس اول کے بارہ میں اختلاف ہے اسی طرح فرقہ قدریہ کے بانی اول کے بارہ میں اختلاف ہے۔ بعض مصنفین کا یہ خیال ہے کہ فرقہ قدریہ اس وقت بصرہ میں ظہور میں آیا جب وہاں عقائد کے بارہ میں موشگافیاں ہو رہی تھیں اور نظری معرکہ آرائیاں زوروں پر تھیں۔

ابن نہایہ نے شرح العیون میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس شخص نے پہلے پہل تقدیر کے مسئلہ پر گفتگو کی وہ پہلے نصرانی تھا، پھر اسلام لایا اور بعد ازاں پھر نصرانی مذہب اختیار کر لیا۔ اس سے معبد جہنی اور غیلاں دمشقی نے یہ عقیدہ اخذ کیا۔[1]

عقیدہ قدریہ کے داعی معبد جہنی نے عراق میں دعوت دینا شروع کی اور غیلاں دمشقی نے شام میں اپنے خیالات کا پرچار کرنا شروع کر دیا۔

عقیدہ قدریہ پر تنقید

عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کو وقوع امور کا علم حوادث کے وقت ہوتا ہے، پہلے نہیں ہوتا، خدا کی صفت علیم کو ناقص گرداننے کے مترادف ہے۔ قرآن مجید کی رو سے اللہ تعالیٰ کا علم ہر شے پر حاوی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت الباطن ہے، جس کے معنی ہیں چھپی ہوئی خبروں اور امور کا جاننے والا۔

فرقہ معتزلہ

فرقہ معتزلہ کے ظہور میں مورخین میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ معتزلہ وہ لوگ ہیں

[1] بحوالہ اسلامی مذاہب مصنفہ ابوزہرہ مصری ص ۱۵۵۔

کہ جب حضرت حسنؓ نے امیر معاویہؓ کے ہاتھ میں زمام خلافت دے دی تو ان کے حامیوں کی ایک جماعت سیاست سے الگ ہو کر علم و عبادت میں مصروف ہو گئی۔ چنانچہ ابوالحسن الطرائفی اپنی کتاب ''اصل الاھواء والبدع'' میں لکھتے ہیں۔

''انھوں نے اپنا نام معتزلہ رکھا۔ اس لیے کہ جب حضرت حسنؓ بن علیؓ نے حضرت معاویہؓ کی بیعت کی اور خلافت انھیں تفویض کر دی تو ان لوگوں نے حسنؓ اور معاویہؓ دونوں سے کنارہ کشی کر لی۔ بلکہ سب سے الگ ہو گئے۔ یہ لوگ اصحاب علیؓ تھے۔ اب ان کی سرگرمیوں کا مرکز و محور گھر رہ گیا یا مسجد۔ یہ کہا کرتے تھے ہمیں صرف علم اور عبادت سے سروکار ہے۔[1]

ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس فرقہ کا بانی واصل بن عطا تھا۔ یہ حضرت حسن بصریؒ کے شاگرد تھا۔ ایک مرتبہ ان کے حلقہ درس میں یہ سوال اٹھا کہ آیا گناہ کبیرہ کا مرتکب مسلمان ہے یا نہیں۔

واصل بن عطا نے حضرت حسن بصریؒ کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب علی الاطلاق مسلمان نہیں بلکہ کفر اور ایمان کے بین بین ہے۔

واصل نے حسن بصریؒ کے حلقہ درس سے علیحدگی اختیار کر لی اور الگ حلقہ درس قائم کر لیا۔

معتزلہ کے علماء نے خود اس امر کا اقرار کیا ہے کہ یہ فرقہ واصل بن عطا سے پہلے کا تھا۔

واصل بن عطا کو بانی صرف اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اس نے اس فرقہ کے عقائد اور نظریات کی اشاعت شروع کی تھی۔

ڈاکٹر احمد امین نے اپنی کتاب فجر الاسلام میں اس فرقہ کا سرچشمہ یہودی فرقہ فروشیم کو قرار دیا ہے جس کے معنی ہیں معتزلہ۔

مشہور علماء

اس فرقہ کے مشہور علماء حسب ذیل ہیں۔

عمرو بن عبید اللہ (۶۹۹ء۔۷۶۱ء) یہ خواجہ حسن بصری کا شاگرد تھا۔ واصل نے انھیں اپنا ہم خیال بنا لیا۔ قدریہ عقیدہ رکھتے تھے۔ معتزلہ کی شاخ عمریہ انھیں سے منسوب ہے۔ واصل کا گروہ بغداد اور عمرو کا گروہ بصرہ سے تعلق رکھتا تھا۔

ابوالہذیل (ولادت ۵۳۔۷۵۲ء۔ وفات ۵۰۔۸۴۹ء یا ۴۱۔۸۴۰ء) مامون کے استاد اور بصرہ کے علماء اعتزال کے امام تھے۔ ہذیلیہ کی شاخ انھیں سے منسوب ہے۔ اس کے خاص خاص عقائد یہ تھے۔

۱۔ خدا کا علم، اس کی قدرت، اس کا وجود عین ذات ہیں۔

۲۔ خدا کے بعض ارادے ایسے ہیں جن کا کوئی محل نہیں جیسے خدا کا قول کن اور بعض ارادوں کا محل ہے

1۔ بحوالہ اسلامی مذاہب مصنفہ ابوزہرہ ص ۱۷۳۔

جیسے اوامر نواہی۔

۳۔ خدا کے مقدرات محدود ہیں۔ کسی چیز کو وجود میں لانا، فنا کرنا اور مارنا اس کے دائرہ قدرت سے باہر ہے۔

۴۔ احکام شرع کے واجب ہونے سے پہلے عقل کے ذریعہ خدا کا پہچاننا واجب ہے۔

۵۔ خدا کا ارادہ اور وہ ہر چیز کا ارادہ کرتا ہے دونوں ایک ہیں۔[1]

نظام

(ولادت ۸۰۱، وفات ۸۳۵ء اور ۸۴۵ء کے درمیان) بصرہ میں نشو ونما ہوا اور عمر کا آخری حصہ بغداد میں گزارا۔ ان کے خاص نظریات یہ تھے۔

۱۔ بدی اور گناہ خدا کی قدرت سے خارج ہیں۔

۲۔ احکام شرح کے وارد ہونے سے پہلے عقلی دلائل سے خدا کی معرفت حاصل کرنا چاہیے۔

الجاحظ

(متوفی ۸۶۵ء یا ۸۶۹ء) نظام کا شاگرد تھا۔ اور معتزلہ کا بڑا مقبول اور مشہور عالم تھا۔ ان کے خاص نظریات یہ تھے۔

۱۔ کوئی مادی جسم معدوم نہیں ہوتا۔

۲۔ خدا گناہوں کا ارادہ نہیں کرتا۔

۳۔ خدا کی رویت ناممکن ہے۔ شاخ جاحظیہ انھیں کی طرف منسوب ہے۔

الجبائی

(متوفی ۹۱۵ء) صفات باری کو عین ذات قرار دیتا تھا۔

اصول خمسہ

اس فرقہ کے اصول خمسہ ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ توحید ۲۔ عدل ۳۔ وعدہ و وعید ۴۔ بین بین ۵۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ۶۔ عقل کا غلبہ

۱۔ توحید

توحید اسلامی تعلیمات کا بنیادی پتھر ہے اور اصول ایمانیات میں سے ہے۔ ہر مسلمان توحید کا اقرار کرتا ہے۔ اس فرقہ نے توحید کی تشریح دوسرے علماء سے مختلف کی ہے۔ یعنی ذات الٰہی کو صفات سے منزہ

[1] سالنامہ نگار د د، صفحہ ۷۹۔

و پاک قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک صفات بذات خود قائم نہیں بلکہ عین ذات الٰہی ہیں۔
اس تشریح کے پیش نظر قیامت کے دن رویت باری تعالیٰ کو محال سمجھتے ہیں کیونکہ رویت سے خدا کی جسمانیت لازم آتی ہے۔ قرآن کو مخلوق سمجھتے ہیں کیونکہ وہ صفت تکلم کو خدا کی صفت قرار نہیں دیتے۔

۲۔ عدل

ہر مسلمان اللہ تعالیٰ کو عادل سمجھتا ہے۔ لیکن معتزلہ نے عدل کی تشریح اس رنگ میں کی ہے جس سے جبریہ کے اس نظریہ کی تردید ہو جائے کہ بندہ مجبور محض ہے اور وہ اپنے افعال میں مختار نہیں۔
فرقہ معتزلہ کہتا ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے۔ اس وجہ سے اس کے افعال پر جزا و سزا مرتب ہوتی ہے۔ اگر بندہ اپنے افعال میں مختار نہ ہو تو سزا اور جزا کیسی؟

۳۔ وعدہ و وعید

وعدہ و وعید سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن افعال پر ثواب کا وعدہ کیا ہے اور جن جن پر وعید اور دھمکی دی ہے وہ لامحالہ پوری ہو کر رہے گی۔ کبار گناہ توبہ کیے بغیر معاف نہیں ہوتے۔ توبہ کی قبولیت کا جو وعدہ ہے وہ بھی پورا ہوگا۔ ایمان عرف قلبی تصدیق کا ہی نام نہیں بلکہ اعمال حسنہ کرنا بھی اس کا جزو ہے۔
اس اصول سے فرقہ مرجیہ کے اس نظریہ کی تردید مقصود ہے کہ ایمان کی موجودگی میں گناہ سے کوئی نقصان اور ضرر نہیں پہنچتا، جس طرح کفر کی موجودگی میں عبادت کا کوئی فائدہ نہیں۔

۴۔ بین بین

گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا نہ مومن اور نہ کافر بلکہ فاسق ہے۔

۵۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر

معتزلہ کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے تاکہ زمین میں فساد ختم ہو اور حق کا بول بالا ہو۔ ان کے نزدیک اگر کامیابی کی امید قوی ہو تو تلوار کے ساتھ خروج بھی جائز ہے۔ اسی اصول کی بناء پر عہد عباسی میں محدثین اور فقہاء پر ظلم کیے گئے اور ان کو تلوار اور قوت سے اپنا ہم نوا بنانا چاہا۔

۶۔ عقل کا غلبہ

معتزلین عقل کے تسلط کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ عقل خود ہی کسی چیز کی حسن و قبح کی معرفت حاصل کر سکتی ہے۔
عقائد: معتزلہ نہ تو قیامت کے دن رویت باری تعالیٰ بالابصار کے قائل ہیں، نہ شفاعت نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے، نہ عذاب قبر کو تسلیم کرتے ہیں۔ قرآن مجید کو مخلوق سمجھتے ہیں۔ احادیث کا انکار کرتے ہیں۔

مرجبۂ

مرجبۂ کی وجہ تسمیہ

مرجبۂ کا لفظ ''اَرْجاۃ'' سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ''مہلت دینا'' اور ''موخر کرنا'' ہوتے ہیں۔ انھیں مرجبۂ اس لیے کہا جاتا تھا کہ انھوں نے ان لوگوں کے معاملات کو جنھوں نے ایک دوسرے کا خون بہایا۔ قیامت کے دن پر موخر کرتے ہیں۔

بعض علماء نے مرجبۂ کے لفظ کو اس ''اَرْجاۃ'' سے ماخوذ مانا ہے جس کے معنی ہیں رجا اور امید۔ کیونکہ ان لوگوں کا یہ نظریہ تھا کہ ایمان کے ساتھ گناہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتا اور ہر گناہگار مومن نجات کا امیدوار ہے۔

صدر اول کے صحابہ کی ایک ایسی جماعت تھی۔ جنھوں نے اس نزاع اور جھگڑے سے بالکل الگ تھلگ رہے جو حضرت عثمانؓ کے عہد کے آخر میں نمودار ہوا۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عمران بن حصین، حضرت اسامہ بن زید وغیرہ۔

انھوں نے اپنی علیحدگی کی بنیاد اس حدیث پر رکھی جو حضرت ابو بکرؓ سے مروی ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ ایسے فتنے آنے والے ہیں جن میں بیٹھ جانے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا جب یہ فتنے پیدا ہو جائیں تو یاد رکھو جس کے پاس اونٹ ہوں وہ اپنے اونٹوں کو لے کر کہیں نکل جائے جس کے پاس بکریاں ہوں وہ اپنی بکریاں لے کر کہیں چلا جائے، جس کے پاس زمین کا کوئی ٹکڑا ہو وہ اپنی زمین میں لگ جائے۔ اس پر کسی نے عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جس کے پاس نہ اونٹ ہوں نہ بکریاں ہوں اور نہ زمین تو وہ کیا کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اسے چاہیے کہ اپنی تلوار لے کر پتھروں پر مار مار کر اسے توڑ ڈالے اور اس کے بعد کسی طرف سے بھی ان فتنوں میں حصہ نہ لے اور جس طرح بھی نجات حاصل کر سکتا ہو ان فتنوں سے نجات حاصل کرے یہ وہ بنیاد ہے جس پر آگے چل کر فرقہ مرجبۂ کی عمارت استوار ہوئی۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد دو فرقے پیدا ہو گئے تھے ایک فرقہ خوارج کا تھا اور دوسرا فرقہ شیعہ تھا۔ ان فرقوں کی پیدائش سے لاہوتی مسائل کی تحقیق اور بحث و مناظر کے دروازے وا ہو گئے۔ ان میں سے ایمان، کفر، مومن کفر کے مسائل خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

خارجیوں نے گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہا۔ اہل تشیع نے امام کی معرفت کو جزو ایمان بنا دیا اور کہا آئمہ پر ایمان لائے بغیر کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اس غلو کے ردعمل میں ایک گروہ ظہور میں آیا، جس نے ایمان کی بنیاد صرف لا الٰہ الا اللّٰہ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہِ پر رکھی۔ اعمال کو اس سے خارج کر دیا۔ ان کے

نزدیک ہر وہ شخص مسلمان ہے جو کلمہ توحید کا اقرار کرتا ہے۔ نیک اور بد اعمال کی جزا و سزا قیامت کے دن ہوگی۔

مرجیہ کے دو گروہ ہیں: ایک گروہ صرف تصدیق بالجنان کو ایمان قرار دیتا ہے۔ دوسرا تصدیق باللسان کو بھی، مگر اعمال دونوں کے نزدیک خارج از امکان ہیں۔

کہتے ہیں امام ابوالحسن اشعریؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ مرجیہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن یہ بات بالکل خلاف واقع ہے۔

نظریات

۱۔ ہر وہ شخص جو کلمہ توحید پڑھتا ہے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہے۔

۲۔ کسی گناہگار کلمہ گو کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۳۔ کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں۔

۴۔ جب امور مشتبہ ہوں ایک فرقہ دوسرے فرقے کو کافر بنا رہا ہو تو ان کا معاملہ خدا کے سپرد کر دینا چاہیے کہ خدا ہی قیامت کے دن ان کے باہمی اختلافات میں فیصلہ دے گا۔

۵۔ خوارج نے غلطی کی کہ وہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو کافر قرار دیتے ہیں وہ دونوں خدا کے بندے تھے۔ جنھوں نے خدا کی معرفت حاصل ہو جانے کے بعد کبھی شرک نہیں کیا۔

فرقہ کا خاتمہ

چونکہ یہ فرقہ نہ بنوامیہ کو کافر کہتا تھا نہ خوارج کو اور نہ شیعوں کو۔ اس لیے سلطنت عباسیہ نے اس فرقہ کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کو ختم کر دیا۔ یہ فرقہ دوسرے فرقوں میں مدغم ہو گیا اس طرح اس فرقہ کی انفرادی حیثیت ختم ہو گئی۔

اشاعرہ

فرقہ اشاعرہ امام ابوالحسن اشعریؒ کی نسبت سے مشہور ہے۔ امام ابوالحسنؒ ۲۶۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے اور ۳۳۰ھ کے قریب وفات پائی۔ امام صاحب کے استاد ابوعلی جبائی تھے، جو فرقہ معتزلہ سے تعلق رکھتے تھے۔

نظریات

فرقہ اشاعرہ معتزلہ کے برعکس رویت باری تعالیٰ، شفاعت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عذاب قبر کے قائل ہیں۔ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا ہی لفظاً کلام خیال کرتے ہیں۔ صلحاء اور اولیاء امت سے کرامت کا صدور تسلیم کرتے ہیں۔ میت کی طرف سے صدقہ کرنا اور اس کے حق میں دعا کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ احادیث

سے حجت پکڑتے ہیں۔ گناہوں کی وجہ سے اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک شرک کے علاوہ اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ دوزخ کا عذاب دائمی نہیں، بلکہ دوزخ پر ایک ایسا وقت آئے گا جب اس سے تمام دوزخیوں کو نکال لیا جائے گا۔ افعال خدا کے پیدا کردہ ہیں۔ بندے سے کسب کا صدور ہوتا ہے، اسی وجہ سے اسے مکلف بالا حکام کہا جاتا ہے اور جزاوسزا کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

اشاعرہ صفات خداوندی کا اثبات کرتے ہیں اور انھیں غیر ذات قرار دیتے ہیں۔

ماتریدیہ

یہ فرقہ ابومنصورؒ ماتریدی کی نسبت سے مشہور ہے۔ ابومنصور کا نام محمد بن محمد بن محمود ہے۔ سمرقند محلہ ماتریدیہ میں تیسری صدی ہجری کے نصف میں پیدا ہوئے اور ۳۳۳ھ میں وفات پائی۔

آپ نے حنفی فقہ اور علم الکلام نصر بن یحییٰ بلخی سے سیکھا۔ آپ نے حسب ذیل کتب تصنیف کیں:

کتاب تاویل القرآن، کتاب ماخذ الشرائع، کتاب الجدل، کتاب المقالات فی الکلام، کتاب التوحید، رد کتاب الامامۃ بعض الروافض الرو علی القرامطہ۔

نظریات

۱۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت عقل وفکر سے کی جاسکتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نظام کائنات میں غور وفکر کرنے کے لیے قرآن مجید میں بار بار تاکید کی ہے۔ اس وجہ سے عقل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ممکن ہے۔

۲۔ اشیاء کا حسن وقبح ذاتی ہے۔ عقل اس کا ادراک کرسکتی ہے۔ ان کے نزدیک اشیاء کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ وہ اشیاء جن کے حسن وقبح کا ادراک عقل انسانی کرسکتی ہے۔

۲۔ وہ اشیاء جن کے حسن وقبح کا ادراک شارع سے کیا جاتا ہے۔

۳۔ ماتریدیہ کے نزدیک افعال خداوندی حکمت ومصلحت کے تحت ہوتے ہیں کیونکہ وہ حکیم وعلیم ہستی ہے۔ نیکوں کو جزا اور گناہگاروں کو سزا خدا کی حکمت کے تحت ہے۔

۴۔ بندوں کے افعال خدا کے پیدا کردہ ہیں اور اس کی عنایت کردہ قوت سے ظہور میں آتے ہیں۔ بندہ افعال کرنے اور نہ کرنے پر قادر ہے۔ گویا وہ آزاد اور خودمختار ہے، چاہے وہ کسی فعل کو کرے چاہے وہ ترک کر دے، اسی پر جزاوسزا کا مستحق ہے۔

۵۔ ماتریدی صفات الٰہیہ کا اثبات کرتے ہیں، لیکن ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ صفات عین ذات ہیں قائم بذات نہیں، اور نہ ذات سے الگ ان کا کوئی وجود ہے۔

۶۔ قرآن قدیم ہے اور اللہ تعالیٰ کی کلام ہے، کیونکہ تکلم خدا کی ایک صفت ہے جو قائم بالذات ہے۔

۷۔ ماتریدی قیامت کے دن رویت باری تعالیٰ کے قائل ہیں۔

۸۔ اعمال جزو ایمان نہیں ہیں۔ گناہ کا ارتکاب کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ کبائر کا ارتکاب کرنے والا ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا۔ امام ماتریدی قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (یعنی جو برے اعمال لائے گا ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (الانعام ۶:۱۶۰)

۹۔ مادہ مخلوق ہے اور کائنات عدم محض سے پیدا ہوئی ہے۔

اشراقین

اس فرقہ کا بانی شہاب الدین سہروردی (۱۱۵۳ء۔۱۱۹۱ء) تھے وہ فلسفہ میں ارسطو اور ابن سینا کے متبع تھے۔ انھوں نے فلسفہ، مذہب اور تصوف تینوں کو ملا کر ایک نیا نظریہ مذہب اور اخلاق کا پیش کیا۔ جسے حکمت اشراق کہتے ہیں[۱] شہاب الدین سہروردی حکمائے ایران کے معتقد تھے اور ان کے نظریات کو زندہ کرنا چاہتے تھے۔ اور اپنی مشہور کتاب حکمۃ الاشراق میں مختلف مقامات پر زردشت وغیرہ کا نام بڑے احترام کے ساتھ لیا ہے اور ان کے فلسفیانہ نظریات کی تائید کی ہے۔ ان پر فقہاء نے کفر والحاد کا فتویٰ لگایا اور ۳۶ سال کی عمر میں سلطان صلاح الدین کے حکم سے قتل کر دیے گئے۔

سلفیہ

سلفیہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو اسلاف کے عقائد اور افکار کے متبع سمجھتے ہیں اور اہل حدیث، اہل اثر، اہل سنت کے ناموں سے بھی پکارے جاتے ہیں۔ یہ لوگ حنابلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے تمام عقائد اور افکار کا ماخذ حضرت احمد بن حنبلؒ (۱۶۴ھ۔۲۶۳ء) کے اقوال اور آراء ہیں۔ ساتویں صدی ہجری میں امام ابن تیمیہؒ (۱۲۲۸ء۔۱۲۶۳ء) نے اس جماعت کو حیاتِ نو بخشی۔ بارھویں صدی میں امام محمد بن عبدالوہابؒ نے ان عقائد کی نشر و اشاعت کی۔

عقائد و نظریات

۱۔ توحید کو تعلیمات اسلام کا عمود اور اساس قرار دیتے ہوئے چند امور کو توحید کے منافی سمجھا ہے۔

(۱) فوت شدگان سے توسل کرنا اور ان سے فریاد رسی چاہنا۔

(۲) روضہ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اردگرد طواف بجالانا۔

(۳) کسی بزرگ کی قبر پر برکت حاصل کرنے کے لیے جانا۔

(۴) اولیاء کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل کرنا۔

---

[۱] تاریخ فلسفہ اسلام صفحہ ۳۵۔

۲۔ سلفیہ کتاب اور سنت میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں ان سب کو بلا تاویل مانتے ہیں۔ صرف اتنا کہتے ہیں کہ یہ صفات مخلوقات جیسی نہیں۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

''جادۂ مستقیم یہی ہے جس پر آئمہ ہدایت گامزن تھے، اور وہ یہ ہے کہ خدا کی وہی صفات ذکر کی جائیں جو کتاب وسنت میں وارد ہوئی ہیں۔ نہ کتاب وسنت سے تجاوز کیا جائے اور نہ گزشتہ اہل علم وایمان کی پیروی کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے پائے۔''[1]

۳۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو وحی کے ذریعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔ امام تیمیہؒ کے نزدیک قرآن مجید غیر مخلوق ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کائنات کی تخلیق اور اوامر ونواہی کی بنیاد حکمت اور مصالح پر رکھی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت حکیم ہے۔

۵۔ تقدیر پر ایمان لانا، خیر ہو یا شر، جزو ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور ارادہ ہر چیز پر محیط ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے اور اس کی قوتوں کا خالق ہے۔ بندہ جو کچھ کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے ارادہ سے کرتا ہے۔

۶۔ قرآن مجید کے ساتھ حدیث اور سنت کو اسلامی شریعت کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔

۷۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیز دیگر انبیاء علیہم السلام کی عصمت، عبودیت اور بشریت کے قائل ہیں۔ اللہ کے سوا کسی کو عالم الغیب نہیں مانتے۔

مولانا سیّد سلیمان ندویؒ تحریک اہل حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس تحریک کا یہ فائدہ ہوا کہ مدتوں کا زنگ طبیعتوں سے دور ہوا اور جو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب تحقیق کا دروازہ بند اور نئے اجتہاد کا راستہ مسدود ہو چکا ہے رفع ہو گیا اور لوگ از سرنو تحقیق وکاوش کے عادی ہونے لگے۔ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ سے دلائل کی خو پیدا ہوئی اور قیل وقال کے مکدر گڑھوں کی بجائے ہدایت کے اصل سرچشمہ مصفا کی طرف واپسی ہوئی۔''[2]

علمی کارنامے

تفاسیر

تفسیر ابن کثیر، فارسی ترجمہ فتح الرحمٰن مصنفہ شاہ ولی اللہ، فتح البیان مصنفہ نواب صدیق حسن، تفسیر

[1] اسلامی مذاہب ص ۲۶۳۔

[2] تراجم علمائے حدیث ہند مقدمہ ص ۲۷۔

القرآن بکلام الرحمان مصنفہ مولانا ثناء اللہ امرتسری، تفسیر وحیدی مصنفہ وحید الزمان، تفسیر احسن التفاسیر مصنفہ مولانا سید احمد حسن دہلوی۔

کتب حدیث کی شرحیں

فتح الباری حافظ ابن حجر، عون المعبود شرح سنن ابی داؤد، التعلیق المغنی علی کتاب السنن للدارقطنی مصنفہ مولانا شمس الحق عظیم آبادی، فتح العلام شرح بلوغ المرام، عون الباری فی حل اولۃ البخاری (شرح تجرید البخاری) السراج الوہاج شرح صحیح مسلم مصنفہ نواب صدیق حسن خاں، تحفۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی مع مقدمہ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری، امام احمد کی تبویب از حافظ عبدالحکیم نصیر آبادی، المصفی اور المسوی شرح موطا امام مالک از حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔

سیرت

زاد المعاد فی ھدی خیر العباد مصنفہ ابن قیم رحمتہ للعالمین مصنفہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم از مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی۔

علم کلام

حجۃ اللہ البالغہ مصنفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔

تصوف

لفظ صوفی کے مشتقات اور معنی

صوفی کے ماخذ کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔

۱۔ بعض اسے صفا سے مشتق مانتے ہیں کیونکہ صوفیوں کے لیے صفائے قلب ضروری چیز ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں وہ صفوی ہوتا نہ کہ صوفی۔

۲۔ بعض نے صف سے مشتق قرار دیا ہے کیونکہ خدا سے تعلق رکھنے والوں میں وہ پہلی صف میں آتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں اسے صفی ہونا چاہیے تھا۔

۳۔ بعض اس کا استخراج صفہ قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ لفظ صفہ سے ماخوذ ہوتا تو اسے صفی ہونا چاہیے تھا۔

۴۔ بعض کے نزدیک لفظ صوفی یونانی لفظ سوف سے لیا گیا ہے جس کے معنی حکمت کے ہیں اور ایرانیوں نے سین کو صاد سے بدل دیا۔

۵۔ بعض کہتے ہیں کہ لفظ صوفی صوف سے نکلا ہے جس کے معنی اُون کے ہیں۔ گویا صوفی کے معنی ہیں ''پشمینہ پوش'' (آخری نام پشمینہ پوش) فارسی زبان میں تارک الدنیا فقراء کا لقب تھا۔ اس

رائے کو سب سے پہلے ابونصر السراج (۳۷۸ھ) نے اپنی کتاب ''اللمعہ'' میں بیان کیا ہے۔
تصوف کا مادہ صوف ہے، جس کے معنی میلان، استواری اور کثرت کے ہیں۔ صاف عن کذا، مال، صاف یصوف، صوفا، عدل، صاف الکبش، کثر صُوْفُہٗ (اقرب الموارد۔ المنجد)
باب تفعل میں استعمال ہونے پر اس کے یہ معنی لکھے ہیں: تصوف الرجل، صار صوفیا، تخلق باخلاق الصوفیۃ فھو متصوف۔

تعریف

تصوف دل کو مخلوقات کی موافقت سے پاک کرنے، طبعی ابتدائی اخلاق سے ترقی کرنے، بشری خواہشات کو بجھانے، نفسانی دعاوی سے اجتناب کرنے، صفات روحانیہ سے ہم کنار ہونے اور علوم حقیقت سے تعلق پیدا کرنے کا نام ہے۔[1]

الشیخ علی الہجویریؒ لکھتے ہیں:

''اس نام (صوفی) کی تحقیق میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں اور بہت سے اقوال ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک چونکہ یہ لوگ جامہ صوف پہنتے تھے، اس لیے صوفی کہلائے۔ بعض کا خیال ہے کہ لفظ صوفی کا ماخذ صف اول ہے۔ یہ لوگ چونکہ صف اول میں رہتے تھے۔ اس لیے ان کا نام صوفی پڑ گیا۔ ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ چونکہ ان لوگوں کو اصحاب صفہ سے خاص محبت تھی۔ اس لیے یہ صوفی کے نام سے موسوم ہوئے۔ ایک اور جماعت اس لفظ کا اشتقاق لفظ صفا سے بیان کرتی ہے اور ہر گروہ اپنی تائید میں عجیب وغریب نکات پیدا کرتا ہے۔ لیکن لغت سے کسی قول کی بھی تائید نہیں ہوتی۔''[2]

امام عبدالکریم قشیریؒ فرماتے ہیں: ''جو کہتے ہیں کہ صوفی صَفَا یا صَفت سے مشتق ہے تو قیاس لغوی کے پیش نظر ان کا خیال بھی بعید از حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کہا جائے کہ صوفیا صوف (اُون) پوش تھے اور یوں ان کو صوفیا کہا جاتا تھا تو یہ بات بھی اپنے اندر واقعیت نہیں رکھتی، کیونکہ اُون صوفیا ہی نہیں پہنا کرتے تھے کہ یہ ان کی صفت امتیازی ٹھہرتی۔ مگر میرا جہاں تک خیال ہے اگر اس لفظ کو صوف (اُون) سے مشتق مانا جائے تو اس کا اس طرف اشارہ ہوگا کہ صوفیائے دنیاداروں کی طرح زرق برق لباس سے اجتناب کر کے ان کے مقابلہ میں اپنا مخصوص لباس صوف یا موٹا جھوٹا لباس اختیار کیا تھا اور یہی لباس ان کے لیے امر فارق ہو گیا اور طرۂ امتیاز۔''[3]

---

1. اقرب الموارد۔
2. کشف المحجوب ص ۲۲۔
3. ترجمہ مقدمہ ابن خلدون فصل گیارہ ص ۴۸۶ مطبوعہ کراچی۔

تصوف کے ماخذ

فان کریمر اور ڈوزی نے اسلامی تصوف کو ہندی ویدانت سے ماخوذ قرار دیا ہے۔ مرکس اور نکلسن نے نوافلاطونیت اور عیسائیت کی طرف منسوب کیا ہے۔ براؤن نے اسے سامی مذہب کے خلاف اریائی ردعمل قرار دیا ہے۔

علماء اسلام کا یہ کہنا ہے کہ قرآن اور حدیث میں صوفیانہ نظریہ کی طرف اشارات موجود ہیں۔ قرآن مجید کی سورت واقعہ میں تین قسم کے انسانوں کا ذکر ہے۔ اصحاب المیمنہ (داہنے ہاتھ والے) اصحاب المشئمہ (بائیں ہاتھ والے) مقربین۔

ارشاد الٰہی ہے:

فَاَصۡحٰبُ الۡمَيۡمَنَةِ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡمَيۡمَنَةِ وَاَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَةِ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَةِ وَالسّٰبِقُوۡنَ السّٰبِقُوۡنَ اُولٰٓئِكَ الۡمُقَرَّبُوۡنَ (الواقعہ ۵۶:۸......۱۱) داہنے ہاتھ والے، داہنے ہاتھ والوں کی اچھی حالت ہے اور بائیں ہاتھ والے (بدبخت) بائیں ہاتھ والوں کی کیا بری حالت ہے اور آگے بڑھنے والے سب سے آگے ہی ہیں۔ وہی مقرب ہیں۔ شیخ شہاب الدین سہروردی عوارف المعارف (باب اول) میں رقمطراز ہیں کہ اگرچہ لفظ صوفی قرآن مجید میں نہیں استعمال ہوا لیکن اس کے مفہوم کو لفظ مقرب سے ظاہر کیا۔

تصوف کا آغاز

تصوف کا آغاز دوسری تیسری صدی میں ہوا، جب مسلمان روحانی دولت کو چھوڑ کر حرص، طمع اور جلب زر کا شکار ہو چکے تھے۔ لوگوں کو حرص اور طمع کے دیو کے چنگل سے نجات دلانے اور تبلیغ اسلام کے لیے صلحاء اور اتقیاء میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ محبت مال سے اجتناب کر کے ان کے لیے اسوہ حسنہ قائم کیا جائے اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسوہ صحابہ پر چلایا جائے۔ اس قسم کے لوگوں کو صوفی کے لفظ سے پکارا جانے لگا۔

مولانا جامی (۱۴۱۴ـ۱۴۹۲ء) کے تذکرہ صوفیہ (نفحات الانس) سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا شخص جس نے تصوف کی تعلیم دی۔ ذوالنون مصری (۲۴۶ـ۲۴۵) تھے۔ وہ مالک بن انس کے شاگرد تھے ذوالنون کی تعلیمات کو جنید بغدادی (م ۲۹۷) احاطہ تحریر میں لائے۔ جنید کے اصولوں کی تبلیغ ابوبکر شبلی خراسانی (م ۳۳۵) نے کی۔ ان کی تعلیمات ابونصر سراج (م ۳۷۸) نے اپنی کتاب اللمعہ میں اور ابوالقاسم القشیری (م ۴۳۷) نے اپنے رسائل میں قلمبند کیا۔ حضرت امام غزالی نے اس کو فلسفہ کا رنگ دیا۔

صوفیاء کے طبقات

حضرت الشیخ الہجویریؒ نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں اہل تصوف کے تین طبقات، صوفی، متصوف اور مستصوف بیان فرمائے ہیں یہ لکھتے ہیں:

"صوفی وہ ہے جو اپنے نفس سے فانی ہو کر حق میں زندہ اور باقی ہو اور مادیت سے گزر کر حقیقت تک رسائی حاصل کر چکا ہو متصوف وہ ہے جو مجاہدے کر کے یہ راہ طے کر رہا ہو۔ اور اس منزل تک رسائی کی کوشش میں ہو۔ مستصوف وہ ہے جو محض جاہ و مال کے لیے دنیا طلبی کی خاطر اپنے کو صوفیہ و متصوفہ کے مشابہ بنا دے اور حقیقتاً ان دونوں سے بے بہرہ ہو کسی نے خوب کہا ہے کہ مستصوف صوفی کی نظر میں مکھی کی طرح حقیر ہوتا ہے اور دوسروں کی نظر میں بھیڑیے کی مانند جس کی غذا ہی گوشت اور خون ہے۔ (کشف المحجوب بحوالہ تصوف اسلام ص ۶۴)

امام عبدالکریم القشیری نے بھی جعلی صوفیوں کو مکھی اور بھیڑیے قرار دیا ہے اپنی تصنیف رسالۃ القشیریۃ میں ان کی شدید مذمت کی ہے۔

درجے

اہل تصوف کے دو درجے ہیں: صوفی اور صافی۔ ان کو تصوف کی اصطلاح میں صاحب الحال اور صاحب المقام کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ صوفی اس سالک کا نام ہے جو اپنی تمام عقل، تمام اطاعت اور تمام انہماک اور مجاہدہ سے روحانی منازل طے کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنا چاہتا ہے۔ یہ اس مسافر کی طرح ہے جو منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے درمیانی منازل طے کرتا ہے۔ اگر مقصود تک پہنچنے سے قبل ہی بیٹھ جائے تو وہ اپنے ٹھکانہ تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اس سالک کو صاحب الحال بھی کہا جاتا ہے۔

صافی وہ سالک ہے جو سلوک کی تمام منازل طے کرنے کے بعد قرب الٰہی میں جا بیٹھتا ہے اور وصال سے بہرہ یاب ہو جاتا ہے۔ حفاظت کے ایسے مقام پر جا پہنچتا ہے کہ جہاں شیطان کا گزر نہیں ہوتا۔ شرعی اعمال کے بجالانے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ اسی کا دوسرا نام صاحب المقام ہے۔

مقاصد

علامہ ابن خلدون نے تصوف کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تصوف کے مقاصد اصلیہ یہ ہیں کہ انسان عبادت الٰہی میں جان کھپائے۔ پوری طرح اللہ کا ہو لے اور دنیا اور دنیا کی لغویات و خرافات سے بالکل منہ موڑ لے اور عام دنیادار جن چیزوں پر مٹے پڑتے ہیں یعنی لذات دنیویہ اور مال و جاہ وہ ان سے قطعی کنارہ کش ہو جائے۔ عبادت کے لیے عزلت نشینی اور گوشہ نشینی کو پسند کرے۔"[1]

صوفی خانوادے

۱۔	زیدیہ	بانی	عبدالوحید بن زید (م ۱۷۷ھ)

[1] مقدمہ ابن خلدون اردو ترجمہ مطبوعہ کراچی ص ۴۸۶۔

۲۔	عیادیہ	بانی	فضل بن عیاد (م ۱۸۷ھ)
۳۔	ادہمیہ	بانی	ابراہیم بن ادھم (م ۱۶۱ھ)
۴۔	عجمیہ	بانی	حبیب عجمی (م ۱۵۶ھ)
۵۔	کرخیہ	بانی	معروف کرخی (م ۲۰۰ھ)
۶۔	سقطیہ	بانی	سری سقطی (م ۲۵۳ھ)
۷۔	طیفوریہ	بانی	بایزید بسطامی (م ۲۶۰ھ)
۸۔	جنیدیہ	بانی	جنید بغدادی (م ۲۹۷ھ)
۹۔	جیریہ	بانی	جیرہ البصری (م ۲۸۷ھ)
۱۰۔	چشتیہ	بانی	خواجہ علو دیناوری (م ۲۹۹ھ)
۱۱۔	غزررونیہ	بانی	ابواسحٰق غزررونی (م ۴۲۶ھ)
۱۲۔	طوسیہ	بانی	علاء الدین طوسی (م ۴۲۶ھ)
۱۳۔	سہروردیہ	بانی	ابونجیب سہروردی (۵۶۳ھ)
۱۴۔	فردوسیہ	بانی	نجم الدین کبری (م ۶۱۸ھ)
۱۵۔	خزازیہ	بانی	ابوسعید الخزاز
۱۶۔	نوریہ	بانی	حضرت ابوحسین النوری
۱۷۔	ملامتیہ	بانی	حمدون القصار
۱۸۔	رفاعیہ	بانی	احمد بن ابی الحسین الرفاعی (م ۵۷۰ھ)
۱۹۔	شاذلیہ	بانی	ابوالحسن علی بن عبداللہ بن عبدالجبار الشاذلی (۶۵۶ھ)

۲۰۔ فارسیہ (جو طریقہ مولویہ کے نام سے بھی معروف ہے) بانی، جلال الدین رومی (م ۶۷۲ھ)

۲۱۔ عربیہ (یہ طریقہ بدوی بھی کہلاتا ہے) بانی ابوالعباس احمد البدوی (م ۶۷۵ھ)

ہندوستان میں صوفیہ کے چار سلسلے پائے جاتے ہیں۔

۱۔	قادریہ	بانی	شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ھ)
۲۔	سہروردیہ	بانی	شیخ ابوالنجیب سہروردیؒ (م ۵۶۳ھ)
۳۔	چشتیہ	بانی	خواجہ معین الدین چشتی (۶۳۳ھ)
۴۔	نقشبندیہ	بانی	خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی (۱۳۳۹ء)

نظریات

مختلف صوفیاء کرام کے مختلف نظریات ہیں، جن پر بحث کرنا طوالت سے خالی نہیں۔ لیکن بعض

ایسے نظریات ہیں جو سب صوفیاء کرام کے مشترکہ نظر آتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ وحی اور الہام ہی علم کا ماخذ ہے۔ تزکیہ نفس پر زیادہ زور دیتے تھے۔ تزکیہ نفس عبادات، مراقبہ، مجاہدہ، عشق اور ترک ماسوا کے ذریعے ہوتا ہے۔

خدا کا تخیل

تصور باری تعالیٰ کے اعتبار سے صوفیہ کے تین گروہ ہیں۔

ایجادیہ، وجودیہ اور شہودیہ

ا۔ ایجادیہ

اس مسلک کو ماننے والوں کے مطابق کائنات کی تخلیق لاشے سے ہوئی ہے۔

اور خالق کا جوہر مخلوقات سے جدا ہے۔ یہ نظریہ ہمہ از اوست (سب اسی نے بنایا) کے قائل ہیں اور ان کا کلمہ "لامعبود الاّ ھُوَ" ہے۔ اس نظریہ کے مطابق خدا اور انسان کا تعلق خالق اور مخلوق، حاکم اور محکوم کا سا ہے۔

۲۔ وجودیہ

اس مسلک کے ماننے والوں کے مطابق کائنات میں بجز خدا کے اور کچھ نہیں ہے خالق اور مخلوق کا جوہر ایک ہے۔ یہ نظریہ "ہمہ اوست" (سب وہی ہے) کے قائل ہیں۔ ان کا کلمہ **لا موجودَ الاھو** ہے۔ یہ لوگ کائنات کی ہر چیز میں خدا کا ظہور دیکھتے ہیں۔ بایزید بسطامی (م ۸۷۴) ابو سعید خراسانی (۹۶۷ء۔۱۰۴۹ء) اور محی الدین ابن عربی (۱۱۶۵۔۱۲۴۰ء) اس فلسفہ کے مبلغ تھے۔

شہودیہ

شہود کے معنی دیکھنے یا مشاہدہ کرنے کے ہیں اور اہل تصوف کی اصطلاح میں یہ ایک مقام ہے جس کے حاصل ہو جانے کے بعد سالک کو تمام موجودات میں جلوۂ حق نظر آتا ہے۔ اس مسلک کو ماننے والے شہودی کہلاتے ہیں۔ اس مسلک کے بانی شیخ رکن الدین علاء الدولہ تھے۔

فنا فی اللہ

جب انسان کا نفس اور قلب کثرت عبادات و مجاہدات سے آلائشوں سے پاک صاف اور منزہ ہو جاتا ہے اور خدائی صفات اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے۔ اور خدا کے رنگ میں کلی طور پر رنگ جاتا ہے تو صوفیاء اس حالت کو فنا فی اللہ کہتے ہیں۔ حسین بن منصور حلاج نے اسی کیفیت میں انا الحق کا نعرہ بلند کیا تھا۔

فنافی الرسول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ پر چل کر حضور کے اوصاف کو اپنے اندر پیدا کر لینے کا نام صوفیاء نے ''فنافی الرسول'' رکھا ہے۔ بعض صوفیاء (ابن عربی) نے ظل رسول۔

تخلیق عالم

تخلیق عالم کو صوفیا کی اصطلاح میں تنزل کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی تائید میں حدیث قدسی بیان کی جاتی ہے یعنی میں (خدا) ایک مخفی خزانہ تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں پس میں نے مخلوقات کو پیدا کیا۔

صوفیاء کے نزدیک ساری کائنات دو حصوں میں منقسم ہے۔ عالم امر، عالم خلق، عالم امر سے مراد وہ لطیف اشیاء ہیں جو لفظ کن سے پیدا ہوگئیں اور یہ غیر فانی ہیں اور عالم خلق سے مراد وہ اشیاء ہیں جو مادے سے تخلیق کی گئیں۔ یہ فانی ہیں ان دو عالموں کو ملا کر عالم کبیر کہتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں انسان کو عالم صغیر کہا جاتا ہے۔ جو عالم امر کے پانچ عناصر (قلب، روح، سر، خفی، اخفاء) اور عالم خلق کے پانچ عناصر (نفس، خاک، باد، آتش، آب) کی ترکیب سے بنا ہے۔

طریقہ تصوف

تصوف کی اصطلاح میں روحانی زندگی کو ''سفر'' کہتے ہیں۔ طالب حق روح کو سالک کہا جاتا ہے اس کی منزل مقصود ''معرفت ہے راستہ طریق، اور مختلف مقامات اور احوال سے گزر کر منزل تک پہنچ کر ''فنافی الحقیقت یا فنافی اللہ'' ہونا چاہتی ہے فنافی الحقیقت ہونے کے لیے روح سات منازل سے گزرتی ہے۔ ہفت منازل کے بارے میں صوفیاء میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک وہ ہفت منازل یہ ہیں۔ ۱۔ عبودیت۔ ۲۔ عشق۔ ۳۔ زہد۔ ۴۔ معرفت۔ ۵۔ وجد۔ ۶۔ حقیقت۔ ۷۔ وصل، بعض چار منازل تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی شریعت طریقت، معرفت حقیقت۔

کشف

تصوف کی اصطلاح میں خواب یا بیداری کی حالت میں بعض اسرار کی حقیقت کے انکشاف کا نام کشف ہے۔ صوفیاء کشف کے قائل ہیں اور اس نعمت سے وہ شخص متمتع ہوتا ہے جو دنیاوی آلائشوں سے اپنے آپ کو صاف کر کے خدا کے رنگ میں رنگین ہو جاتا ہے۔

جذب

صوفیاء کی اصطلاح میں حقیقت میں مدغم ہو جانے کا نام جذب ہے۔ جب کسی صوفی پر جذب کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس کی زبان سے ایسے فقرے نکلتے ہیں۔ جو قشر اور ظاہر پرست کی نظر میں غیر شرعی

معلوم ہوتے ہیں۔ درحقیقت وہ روحانیت کے کوچے سے نابلد ہوتے ہیں۔ یہی وہ علماء ہیں جنھوں نے حسین بن منصور حلاج کو انا الحق کا نعرہ بلند کرنے کی وجہ سے قتل کرنے کا فتویٰ جاری کیا۔ انا الحق کا نعرہ حلاج نے ہی بلند نہیں کیا تھا بلکہ بایزید بسطامی نے بھی اس قسم کے فقرے کہے تھے۔ مثلاً ''میرے جبہ میں خدا کے سوا کوئی نہیں'' میری شان کیسی عالی ہے، فی الحقیقت میں خدا ہوں۔ میرے سوا کوئی خدا نہیں اس لیے میری پرستش کرو، وہ خواب میں ''معراج'' حاصل ہونے کے بھی مدعی ہیں انھیں کا قول ہے کہ عشق، عاشق اور معشوق تینوں ایک ہیں۔ میں اور تو (خدا) کی تفریق سے خدا کی توحید میں فرق پڑتا ہے۔

انہی فقرات کی وجہ سے فقہاء متکلمین نے تصوف کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ ابن تیمیہ نے ابن العربی پر کفر کا فتویٰ صادر کیا۔ جب مشہور صوفیاء کے سوانح حیات اور تعلیمات پر نظر دوڑائیں تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ہر صوفی نے شریعت کو ہی واجب الاطاعت قرار دیا ہے اور شریعت کی پیروی کو ہی منزل مقصود تک پہنچنے کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ جس راستہ سے ایک صوفی حقیقت کو پاتا ہے۔ اس راستہ کے خلاف وہ کیسے کلام کر سکتا ہے۔ درحقیقت اس قسم کے فقرے توحید الٰہی کا اقرار ہوتے ہیں۔ ایک ظاہر بین شخص اسے دعویٰ الوہیت سمجھ لیتا ہے جب ایک سالک سلوک کی منازل طے کر کے تمام دنیاوی آلائشوں سے اپنا دل صاف کر لیتا ہے تو اس وقت اس کا دل مہبط انوارِ الٰہیہ بن جاتا ہے۔ وہ سالک انا الحق کا نعرہ بلند کرتا ہے کیونکہ اس صوفی کا وجود ہستی باری تعالیٰ پر ایک بین دلیل ہوتا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ جب لوہے کو آگ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ تو کچھ عرصہ کے بعد اس لوہے پر آگ غلبہ حاصل کر لیتی ہے تو وہ لوہا آگ بن جاتا ہے۔ جب وہ لوہا آگ کے اوصاف اپنے اندر لے لیتا ہے تو اس کو آگ بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ حقیقت میں وہ لوہا ہی ہوتا ہے۔ یہی ایک سالک اور باخدا صوفی کی مثال ہے جب وہ خدا کی صفات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ تو وہ جذب کی حالت میں بے اختیار انا الحق کہہ اٹھتا ہے۔ درحقیقت اس وقت صفات الٰہیہ کا ظہور اس سالک کے ذریعہ ہو رہا ہوتا ہے کیونکہ صوفی کا نصب العین ہی اپنے ترکیبی عناصر کو منزہ کر کے خدا کا عرفان حاصل کرنا اور اپنے آپ کو اس کی صفات میں رنگین کرنا ہے۔

تصوف کا دورِ انحطاط

اس صافی چشمے کا منبع قرآن اور سنت تھا مگر آہستہ آہستہ دوسری اقوام کے اختلاط سے ان کے عقائد کا رنگ چڑھنا شروع ہوا۔ تصوف میں بدعات اور غیر شرعی امور داخل ہونے شروع ہوئے متصوفین نے شریعت سے انحراف شروع کر دیا۔ اس طرح حقیقی نظام تصوف ایک جامد اور زنگ خوردہ حیثیت اختیار کر گیا۔ اس سلسلہ میں کسی نے خوب نقشہ کھینچا ہے۔

''تصوف حال تھا لیکن اپنے دور انحطاط میں برا حال بن گیا۔ وہ اجتناب تھا لیکن اس نے نقاب کی صورت اختیار کر لی۔ وہ استتار تھا مگر اب وہ اشتہار نظر آنے لگا۔ وہ سلف کا دوسرا نام تھا لیکن اب وہ

خودسری اور بے عملی بن گیا پہلے وہ صدور کی عمارت تھا اب غرور کا مرکز بن گیا۔ پہلے وہ تقشف تھا اب تکلف کا جامہ اس نے پہن لیا۔ پہلے وہ تخلق تھا اب تملق بن گیا۔ پہلے وہ قناعت تھا اب اس نے مجاعت کا روپ بھر لیا۔"

اسلام میں فرقہ بندی کی حقیقت

اسلام میں جتنے بھی فرقے پائے جاتے ہیں ان کے بیشتر اختلافات فروعی قسم کے ہیں۔ اسلام کا بطن اتنا پاکیزہ اور صاف ہے کہ اس میں کوئی غیر قرآنی نظریہ دیر پا قائم نہیں رہ سکتا۔ عہد عباسیہ میں خلق قرآن کا نظریہ پیدا ہوا، باوجود حکومت کی سرپرستی کے یہ عقیدہ نشوونما نہ پا سکا۔ انکار حدیث کا فتنہ اٹھا۔ لیکن خود ہی اپنی موت مر گیا۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو اسلام کو دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتی ہے۔ دوسرے تمام مذاہب کے فرقوں میں اختلافات اصولی ہیں۔ اگر کسی مذہب کا ایک فرقہ، بانی مذہب کو انسان تسلیم کرتا ہے تو دوسرا اس کو خدا بنائے ہوئے ہے۔ لیکن اسلام کے فرقوں میں ایسا نہیں ہے۔ فروعی اختلافات کی وجہ سے ہر فرقہ کا الگ الگ نام ہے۔ اس سے صرف اس فرقہ کی خصوصیتوں کا اظہار مقصود ہے۔ مثلاً خلافت کے متعلق مختلف الخیال تین فرقے ہیں۔ ان کے تعارف کے لیے ان کا نام سنی، شیعہ اور خوارج رکھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ تینوں مسلمان نہیں۔ تینوں دائرہ اسلام میں داخل ہیں۔ اسی طرح اسلام کے دوسرے فرقوں کے نام ان کی خصوصیات کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسلام کے تقریباً تمام فرقے فروعی اختلافات کی پیداوار ہیں، کسی فرقہ میں اصولی اور اعتقادی اختلاف بہت کم تھے۔

اسلام کے اکثر فرقوں کی مثال ایسی ہے جس طرح دنیا میں نوع انسان میں سے کسی کو افغان کہہ دیتے ہیں، کسی کو سیّد اور کسی کو مغل کے نام سے پکار دیا جاتا ہے۔ یہ نام صرف تعارف اور ایک دوسرے کی خصوصیات کو ظاہر کرنے کے لیے بولے جاتے ہیں۔ قرآن مجید نے بھی اس ضرورت کو محسوس کیا ہے، ارشاد الٰہی ہے: وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (الحجرات ۴۹: ۱۳) اور ہم نے تمھیں شاخیں اور قبیلے بنایا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔

دنیا کے تمام انسانوں کا مختلف نسلوں اور قبائل میں تقسیم ہونا نسل انسانی میں تفرقہ اور اختلاف نہیں ہے بلکہ صرف ان کی خصوصیات جتانے کے لیے مختلف نام رکھے گئے ہیں۔ حالانکہ سب قبائل اور نسلیں دائرہ انسانی میں شامل ہیں۔ اسی طرح اسلام کے تمام فرقے فروعی اختلاف کی وجہ سے مختلف خصوصیات رکھتے ہیں، ان خصوصیات کو ظاہر کرنے کے لیے ان کے نام الگ الگ ہیں۔

امت مسلمہ کے فرقوں میں بنیادی عقائد اور اصولوں میں اختلاف نہیں ہے۔ اس وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں کوئی فرقہ نہیں ہے۔ فروع میں اختلاف طبعی امر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کے مزاج اور خیالات میں اختلافات، فروعات انہی خیالات کے ماتحت مستنبط ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے اختلاف ضروری ہے۔ یہ اختلافات انسانی ترقی کا ذریعہ ہیں۔

اسلام اور عصر حاضر

اسلام کے فلسفہ حیات کو عصر حاضر میں دو نظامہائے زندگی سے مقابلہ ہے: ایک نظام سرمایہ داری ہے اور دوسرا نظام اشتراکیت۔ ان دونوں نظاموں کے پیچھے مضبوط حکومتیں ہیں اور یہ دونوں نظام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ سرمایہ داری نظام بے لگام انفرادی ملکیت کو جائز قرار دیتا ہے اور اصحاب ثروت کو کھلی چھٹی دیتا ہے کہ وہ جس طرح چاہیں دولت جمع کر کے اپنی تجوریاں بھرتے چلے جائیں۔ اس کے برعکس اشتراکیت انفرادی ملکیت کو ناجائز قرار دیتی ہے۔ دنیا کے مفکرین ہر سہ نظامہائے زندگی کے فلسفوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا فلسفہ حیات ہے جو اعلیٰ ہے، نوع انسان کا نجات دہندہ ہے۔ چنانچہ مشہور فلسفی برنارڈ شا کہتا ہے:

''میں نہایت ہی وثوق کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ بشریت اور انسانیت کا نجات دہندہ اگر کوئی دین ہوسکتا ہے تو وہ اسلام ہے۔'' (مقالات برنارڈ شا)

عصر حاضر کے مسائل

عصر حاضر میں تمام دنیا گوناگوں مسائل میں الجھی ہوئی ہے۔ ان میں سے اہم مسائل اخلاقی، معاشرتی، سیاسی، اقتصادی۔ حقوق انسانی، قیام امن اور قومیت ہیں۔

اخلاقی مسئلہ

دنیا میں فساد اور بگاڑ کی وجہ اخلاق باختگی ہے۔ جب تک فرد اور اقوام عالم اخلاق حسنہ کے زیور سے آراستہ نہیں ہوتیں۔ دنیا کا کوئی مسئلہ بھی حل نہیں ہوگا کیونکہ تمام مسائل اخلاق حمیدہ کے اردگرد گھومتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مسئلہ کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں:

بعثتُ لاتمم حسن الاخلاق (موطا مالک حسن اخلاق) میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

مسند احمد، بیہقی اور ابن سعد وغیرہ میں یہ الفاظ ہیں۔ **انما بعثت لا تمم مکارم الاخلاق** میں تو اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کروں۔

گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی غرض ہی اخلاق حسنہ کی عمارت کی تکمیل ہے۔

اکمل المومنین ایمانًا احسنهم خلقا یعنی مومنوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس اخلاق

سب سے اچھے ہیں۔ حدیث ترمذی، ابن حنبل، ابوداؤد اور حاکم میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایمان کے کمال کا معیار حسن اخلاق ہے۔ اخلاق حسنہ کو پانچ بڑے بڑے عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اخلاق عمومیہ

وہ اخلاق ہیں جن کا عملی پہلو صرف بنی نوع انسان سے ہی مخصوص نہیں بلکہ تمام چرند، پرند کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ قرآن مجید میں اخلاق عمومیہ کی تبلیغ مختلف پیرایہ میں کی گئی ہے لیکن طوالت کے خوف سے صرف قرآن مجید کی ایک جامع مانع آیت درج کی جاتی ہے۔ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (بقرہ ۱۹۵:۲) نیکی کرو بے شک اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اخلاق خصوصیہ

وہ اخلاق ہیں جن کا عملی پہلو مخصوص طبقہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن کسی حد تک اس شعبہ کا عمومیہ کے ساتھ بھی وابستگی ہے قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (الشعراء ۲۱۵:۲۶) یعنی اپنے بازو ایمان والوں کے لیے جھکاؤ۔

۲۔ اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَاءُ بَیْنَهُمْ (فتح ۲۹:۴۸) یعنی مومنوں کی شان یہ ہے کہ وہ کفار پر سخت گیر ہوتے ہیں اور آپس میں محبت اور پیار سے رہتے ہیں۔

۳۔ وَلَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِکُمْ (ال عمران ۱۱۸:۳) اپنوں کے سوا کسی اور کو اپنا راز دار دوست نہ بناؤ۔

اخلاق تمدنیہ

اس شعبہ سے وہ اخلاق مراد ہیں جن میں فلسفہ تمدن کو اجاگر کیا گیا ہے۔

۱۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (ال عمران ۱۰۳:۳) سب کے سب خدا کی رسی کو پکڑے رکھو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو۔

۲۔ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ (۶۰:۲) زمین میں فساد نہ کرتے پھرو۔

۳۔ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (۱:۵) عہد کو پورا کرو۔

۴۔ لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوا (۱۳۰:۳) سود مت کھاؤ۔

۵۔ وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَةَ اِمْلَاقٍ اپنی اولاد کو غربت کے ڈر سے قتل نہ کرو۔

۶۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی انسان کے واسطے وہی ہے جو اس نے کوشش کی۔

۷۔ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۱۹:۴) عورتوں سے نیک سلوک کرو۔

۸۔ لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ (۲:۲۸۲) گواہی مت چھپاؤ۔

اخلاق حقوقیہ

ایک انسان کی زندگی کسی نہ کسی طرح دوسرے لوگوں کی زندگی سے وابستہ ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ ایک دوسرے کے کچھ حقوق ہوں جن کی ادائیگی انسان کی زندگی کو خوشگوار بنائے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ہر طبقے کے افراد کے حقوق متعین کروائے ہیں۔ ان کی ادائیگی ہی قیام امن کی ضامن ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

۱۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اور قرابت والوں، یتامی اور مساکین، ہمسایہ، قرابت والوں، ہمسایہ اجنبی، ساتھ والے ساتھی، مسافر اور خادموں کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ (۴:۳۶)

۲۔ وَأَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ (۲:۲۵۴) اور جو ہم نے تمھیں دیا اس سے بنی نوع انسان کی بہبودی کے لیے خرچ کرو۔

۳۔ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (۱۶:۹۰) اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

اخلاق ادبیہ

اس شعبہ سے مراد وہ اخلاق ہیں جو دوسری حکومتوں اور مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

۱۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ (۲:۲۸۵) یعنی ہم کسی رسول کے ماننے میں تفریق نہیں کرتے۔

۲۔ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (۳:۶۴) تفرقہ چھوڑ کر آؤ ہم ایک مشترکہ بات پر اکٹھ کرلیں۔

۳۔ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ ۵:۸) نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

معاشرتی مسئلہ

اسلام نے معاشرتی مسائل کو حل کرنے کے لیے چند اصول مقرر کیے ہیں۔

۱۔ وحدت نسل انسانی

اسلام وحدت نسل انسانی کا داعی ہے تفریق بین الناس کا شدید مخالف ہے۔ قومی، لونی، لسانی اور

نسلی امتیازات کو جڑ سے کاٹتا ہے۔ نسل انسانی کی وحدت کا نظریہ وہ نظریہ ہے جس کی نظیر دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں نہیں ملتی۔ یہی وہ نظریہ ہے جس پر امن کی عمارت کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً (نساء ۴:۱) ''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا ہے اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

حج کی عبادت کا بھی ایک عظیم مقصد جاہلیت کے امتیازات کو مٹانا ہے حجۃ الوداع کے موقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحدت نسل انسانی کے پیغام کو دہراتے ہوئے فرمایا:

ایها الناس الا ان ربکم واحد و ان اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی الحمر الا بالتقوی (احمد، ابوداؤد)

لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے، اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

۲۔ احترام انسانیت

صحت مند معاشرہ کی تشکیل کا دوسرا اصول احترام انسانیت ہے۔ معاشرہ میں انسان ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ نہ تو امارت کسی کے لیے وجہ تکریم ہے اور نہ غربت وجہ ذلت اور نہ کوئی نسل کے لحاظ سے مسند صدارت پر بیٹھنے کا زیادہ مستحق ہو سکتا ہے۔ معاشرے کا ہر فرد انسان ہونے کے لحاظ سے احترام کا مستحق ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْٓ اٰدَمَ ہم نے آدم علیہ السلام کے بیٹوں کو عزت کے قابل بنایا ہے۔ اب رہا یہ کہ معاشرہ میں لوگوں کی عزت اور ذلت کا معیار کیا ہے۔ سو اس کے لیے قرآن مجید نے اچھے اعمال اور تقویٰ کو معیار مقرر کیا ہے۔

۳۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اسلام معاشرہ کے لیے ایک ایسا ضابطہ اخلاق مقرر کرتا ہے جس سے کسی کو بھی سر مو تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ صرف اس ضابطہ اخلاق کو خود اپنانا ہی لازمی قرار نہیں دیتا بلکہ یہ بھی حکم دیتا ہے کہ جو شخص اس سے انحراف کرنے کی طرف مائل ہو اسے روکا جائے۔ اسی ضابطہ اخلاق سے ہی معاشرہ میں حسن اور نظم پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کے بغیر معاشرہ میں فساد اور بگاڑ ہو جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ [1] نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو۔

---

[1] المائدہ ۵:۲۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ[1] تم سب سے اچھی جماعت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: من رای منکم منکراً فلیغیّر بیدہٖ فان لم یستطع فبلسانہٖ فان لم یستطع فبقلبہٖ و ذالک اضعف الایمان۔[2] تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو اس کو ہاتھ سے درست کر دے اور اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل میں برا بنائے اور یہ کمزور ترین ایمان ہوگا۔

۴۔ مساوات

قرآن مجید نے مساوات کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ تمام انسان ایک ہی اصل سے پیدا ہوئے۔ ارشاد الٰہی ہے: يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَنِسَاءً۔[3] اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر اپنے مشہور خطبہ میں فرمایا:

ایھا الناس الا ان ربکم واحد و ان اباکم واحد الا لافضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقویٰ۔ اے لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

۵۔ آزادی

اسلام سوائے خدا اور قانون الٰہی کی غلامی کے ہر قسم کی غلامی سے آزادی دلاتا ہے۔ آزادی کا مقصد شتر بے مہار ہونا نہیں ہے فیثا غورث سے ایک بار دریافت کیا گیا کہ آزاد آدمی کون ہے۔ اس نے جواب دیا جو نیکی کے لیے وقف ہو جائے۔ اسلام ہر فرد کو شریعت کی حدود کے اندر رہ کر اپنے حقوق سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیتا ہے قرآن مجید میں آتا ہے: لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (الکٰفرون ۱۰۹:۶) یعنی تمہارے لیے تمہارا دین میرے لیے میرا دین۔

---

[1] آل عمران ۳:۱۱۰۔

[2] مشکوٰۃ المصابیح کتاب الآداب باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر۔

[3] النساء ۴:۱۔

۶۔ رواداری

معاشرہ میں بگاڑ کی وجہ تنگ نظری اور تعصب ہوتا ہے۔ اسلام نے تنگ نظری اور تعصب کو ختم کر کے معاشرہ کی تشکیل رواداری کے اصول پر کرتا ہے۔ قرآن اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ توحید کا پیغام بنی نوع انسان کے ہر طبقہ تک پہنچایا گیا ہے اور ہر مذہبی کتاب اور ہر پیغمبر کو تسلیم کیا جائے اور ان میں کسی قسم کی تفریق نہ کی جائے۔ یہی وہ سنہری اصول ہے جس سے محبت اور آشتی کی فضا معاشرہ میں پیدا ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر: ۱۰) کوئی گروہ ایسا نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گزرا ہو۔ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس آیت ۴۷) ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (بقرہ۲:۲۸۵) رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب سے اس کی طرف اتارا گیا اور مومن بھی سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں ہم اس کے رسولوں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔

رواداری کو فروغ دینے کے لیے دوسرا اصول یہ مقرر کیا ہے کہ معاشرہ مذہبی سیاسی اور اقتصادی جبر سے پاک ہو قرآن مجید میں آتا ہے: لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ۲:۲۵۶) دین کے بارے میں کسی طرح جبر نہیں۔ اسلام نے اصول متعین کرنے کے بعد ان تمام افراد اور اجزاء کے جن سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ حقوق و فرائض مقرر کر دیے ہیں تاکہ وہ اپنی حدود کے اندر رہ کر زندگی بسر کریں۔ معاشرہ کے اہم اجزاء والدین، زوجین، رشتہ دار، یتامیٰ، ہمسائے، حاجت مند، مزدور، خادم آقا وغیرہ ہیں۔ ان کے حقوق و فرائض پر بحث پہلے گزر چکی ہے۔

سیاسی مسئلہ

اسلام نے اس وقت حکومتی اور سیاسی مسئلہ کو حل کیا جب دنیا میں بادشاہت کا دور دورہ تھا۔ اور بادشاہ کا حکم ہی قانون سمجھا جاتا تھا۔ عوام کا حکومتی امور میں کوئی دخل نہ ہوتا تھا۔ اسلام نے اس وقت چند ایسے اصول مقرر کیے۔ جن سے سیاسی مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو گیا۔ اس دور میں بھی جو سیاسی مسائل الجھے ہوئے ہیں وہ انہی اصولوں کی روشنی میں حل ہو سکتے ہیں۔

پہلا اصول

اسلام منتظمین کی جماعت کے لیے ایک عالمگیر اصول پیش کرتا ہے۔ وہ ہے مشاورت۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ۴۲:۳۸) (اور منتظمین کی جماعت کا فریضہ ہے کہ باہمی مشاورت سے حکومتی کاروبار چلائیں۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (آل عمران۳:۱۵۰) ان سے (حکومتی کاموں میں) مشورہ لیتے رہا کیجئے۔

دوسرا اصول

منتظمین اور عوام سب قانون کی نظر میں برابر ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (المائدہ ۵:۴۵) اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں پس وہ ظالم ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (مائدہ ۵:۴۴) اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا تو وہی کافر ہیں۔

تیسرا اصول

اسلام تمام انسانوں کو آزادی کی نعمت سے نوازتا ہے اور قرآن مجید انسان کی گردن ہر قسم کی غلامی سے آزاد کی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف ۷:۱۵۷) ان سے ان کا (غلامی) کا بوجھ اتارتا ہے اور (غلامی) کا طوق بھی جو ان پر ہے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ (البلد ۹۰:۱۱۔۱۳) سو وہ اونچے گھاٹی پر چڑھنے کی ہمت نہیں کرتا اور تجھے کیا خبر اونچی گھاٹی کیا ہے کسی گردن کا آزاد کرنا۔

اسلام ہی وہ دین ہے جس نے ہر رنگ کی غلامی سے مخلوق کی نجات دی ہے۔

چوتھا اصول

اسلام حکمرانی کے لیے انسانوں میں باہمی مساوات کا سبق دیتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا (النساء۴:۱) اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں اور اللہ کے (حقوق کی) جس کے ذریعہ سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے رہو اور رحموں کی نگہداشت کرو اور اللہ تم پر نگہبان ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ان العباد کلھم اخوۃ (احمد، ابوداؤد) انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا "لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

اس دور کا سب سے اہم مسئلہ ہی قومی، لونی، نسلی تفریق کا مسئلہ ہے۔ جس نے دنیا کو جہنم کے

گڑھے کے کنارہ پر لاکھڑا کیا ہے۔ دنیا کی تمام اقوام لونی، قومی اور نسلی تفاخر اور تفریق کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہیں۔ ہر قوم دوسری قوم سے اپنے آپ کو افضل اور بہتر سمجھتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک سلطنت میں رہنے والے تفاخر کے مرض میں مبتلا ہیں۔ بھارت میں ہندو اچھوت کو مساوی درجہ نہیں دیتے امریکہ میں گورا کالے کو ہم رتبہ نہیں دیتا۔

پانچواں اصول

اسلام حکومت کے تمام امور میں عدل و انصاف کو مرکزی حیثیت دیتا ہے۔ اس وجہ سے قرآن مجید میں عدل پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (النحل ١٦:٩٠) اللہ تعالیٰ تمھیں عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء ٤:٥٨) اور جب لوگوں میں فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔

چھٹا اصول

اسلام جنگ اور صلح میں معاہدوں کی پابندی لازمی قرار دیتا ہے اور ان میں کسی قسم کی بدعہدی کرنا حرام ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا (النحل ١٦:٩١) اور اللہ کے عہد کو پورا کرو جب تم عہد کرلو اور قسموں کو ان کے پکا کرنے کے بعد مت توڑو۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل ١٧:٣٤) اور عہد کو پورا کرو کیونکہ ہر عہد کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

ساتواں اصول

اسلام معاشرہ میں استوار حالات پیدا کرنے کے لیے یہ بات ضروری قرار دیتا ہے کہ انتظام سلطنت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جس کا ذہن اور عمل صالح اور متوازن ہو تا کہ عوام میں بھی صالح اور متوازن ذہن پیدا کریں اور ان کے سپرد کی ہوئی امانت کو احسن طور پر ادا کرسکیں۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (٤:٥٨) بے شک اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں (جملہ حقوق کی امانتیں) اس کے اہل کے سپرد کرو۔

اقتصادی مسئلہ

عصر جدید میں معاشی مسئلہ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مختلف قسم کی تحریکیں اٹھی ہیں۔ ان میں سے کمیونزم اور سرمایہ داری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ اس کا حل صرف اسلام کی تعلیم میں ہی مضمر ہے۔

اسلام اقتصادی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے چند اصول وضع کرتا ہے۔

پہلا اصول

انسان کی ملکیت اصالتاً نہیں ہوگی بلکہ نیابۃً ہوگی۔ گویا جو دولت کسی انسان کی ملکیت میں ہے۔ وہ خدا کی طرف سے اس پر وکیل ہے اصیل نہیں ہوگا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّستَخلَفِينَ فِيهِ (الحدید ۵۷:۷) اور اس سے خرچ کرو جس میں اس نے تمھیں اپنا نائب بنایا ہے۔

دوسرا اصول

حصول دولت اور تصرف دولت پر ایسی قیود اور پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ جن کی وجہ سے انسانی معاشرہ میں کسی قسم کی بدنظمی اور اضطراب پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ معاشرہ اتحاد اور اخوت کی سلک میں منسلک ہو جاتا ہے۔ اسلام حصول دولت کے متعلق اصولی طور پر یہ حکم دیتا ہے: يٰاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَاكُلُوا اَموَالَكُم بَينَكُم بِالبَاطِلِ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے مالوں کو آپس میں ناحق کے ساتھ مت کھاؤ۔

اسلام نے حسب ذیل حصول دولت کے ناجائز ذرائع کو حرام قرار دیا ہے۔ یہی وہ ذرائع ہیں جن کو اختیار کرنے سے معاشی توازن میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

۱۔ سود۔ ۲۔ احتکار۔ ۳۔ اکتناز۔ ۴۔ قمار، لاٹری، سٹہ وغیرہ۔ ۵۔ بیع و شرا کی وہ تمام صورتیں جن سے کسی ایک فریق کو نقصان پہنچتا ہو۔ ۶۔ حرام چیزوں کی خرید و فروخت۔

ان ناجائز ذرائع کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

تصرف دولت کے متعلق ارشاد الٰہی ہے: وَالَّذِينَ اِذَا اَنفَقُوا لَم يُسرِفُوا وَلَم يَقتُرُوا وَكَانَ بَينَ ذٰلِكَ قَوَامًا (الفرقان ۲۵:۶۷) اور وہ جو جب خرچ کرتے ہیں نہ بے جا خرچ کرتے ہیں اور نہ موقع پر تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ ان دو حالتوں کے درمیان اعتدال پر ہے۔

تیسرا اصول

اسلام نے تقسیم دولت کے لیے حسب ذیل احکام صادر کیے ہیں۔

(الف) زکوٰۃ

یعنی ہر سال اپنے سرمایہ کا کچھ مقررہ حصہ ضرورت مندوں پر خرچ کیا جائے۔

(ب) انفاق یا خیرات

یہ عمل زکوٰۃ کے علاوہ ہے کہ صاحب ثروت زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی اپنی خوشی سے غرباء مساکین کی بہبود پر خرچ کریں۔

(ج) سرمایہ کو کار آمد بنانا

اسلام سرمایہ کو دبا کر رکھنے اور حصول دولت میں اس سے کام نہ لینے کو ناجائز قرار دیتا ہے اور سرمایہ روکنے والوں کو سخت تہدید کی خبر دیتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (التوبہ ۹:۳۴) اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اَلْمُحْتَكِرُ مَلْعُوْنٌ (موطا امام مالک کتاب البیوع) قیمتوں میں گرانی کے لیے ذخیرہ کرنے والا ملعون ہے۔

(د) نفقات

اسلام نے صاحب ثروت اشخاص پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ اپنے غریب رشتہ داروں کی کفالت کرے ارشاد الٰہی ہے: فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ (الروم ۳۰:۳۸) پس تو عزیز و اقارب محتاج اور مسافر کو ان کا حق دے۔

(ر) وصیت

مالک جائیداد، جائز ورثاء کے علاوہ خیراتی کاموں کے لیے وصیت کرے۔ ارشاد الٰہی ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۨ الْوَصِيَّةُ (البقرہ ۲:۱۸۰) تم پر جب تم میں سے کسی کے لیے موت آ موجود ہو عمدگی کے ساتھ وصیت کرنا ضروری ٹھہرایا گیا ہے۔

(ہ) ورثہ

اسلام نے متوفی کے مال میں سب قریبی ورثاء کو شریک قرار دیا ہے تاکہ دولت کئی ہاتھوں میں تقسیم ہو جائے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ (النساء ۴:۳۳) اور سب کے لیے اس میں جو وہ (متوفی) چھوڑے ہم نے ماں باپ اور قریبی وارث بنائے ہیں۔

(ی) وقف

اسلام میں وقف کے یہ معنی ہیں کہ دائمی طور پر کسی جائیداد کو مذہبی اور خیراتی کاموں کے لیے مخصوص کر دی جائے۔ اسلامی تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں صحابہ نے اپنی دولت کو خیراتی کاموں کے لیے وقف کیا تھا۔

چوتھا اصول

مندرجہ بالا احکام ادا کرنے کے بعد اگر کسی کے پاس دولت بچ جائے تو اس کو افادہ عامہ کے لیے خرچ کر دینا چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ ۲۱۹) وہ تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ دیجئے جو کچھ ضروریات اور حاجات سے زائد ہو۔

پانچواں اصول

اسلام ایسی اشیاء کو جو افادہ عامہ کے لیے ضروری ہوں اور جن پر انفرادی ملکیت ہو جانے کی وجہ سے افراد تنگی اور تکلیف محسوس کریں۔ اجتماعی ملکیت قرار دیتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصولی ہدایت دیتے ہوئے فرمایا ''تمام مسلمان تین چیزوں میں شریک ہیں۔ پانی، گھاس اور آگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصولی طور پر صرف تین چیزوں کا ذکر کیا ہے۔

درحقیقت حدیث کا منشاء یہ ہے کہ قدرتی وسائل پیدائش افادہ عامہ کے لیے حکومت کی تحویل میں ہوں گے۔

یہ دور صنعتی دور ہے۔ ملک کی معیشت کا زیادہ دارومدار بڑی بڑی صنعتوں پر ہے۔ اگر یہ صنعتیں افراد کے ہاتھوں میں ہوں گی تو سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان طبقاتی جنگ کا چھڑ جانا ضروری ہے جو ملک کی معاشی اور سیاسی زندگی کے لیے مہلک ہے، اس لیے تمام کلیدی صنعتیں حکومت کی تحویل میں ہونی چاہئیں۔

چھٹا اصول

اگر کوئی صاحب نصاب اور صاحب ثروت شخص مذکورہ بالا اصولوں کو نظر انداز کرتا ہے۔ فقہاء کے اصول استحسان کے تحت حکومت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ایسے شخص کی جائیداد ضبط کرے کیونکہ پہلے اصول میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی ملکیت اصالتاً نہیں ہوتی بلکہ نیابۃً ہوتی ہے۔ جب ایک شخص نیابتی کے فرائض ادا نہیں کرتا کہ حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اس کو نیابت کو ختم کر دے۔

مسئلہ حقوق انسانی

سترھویں صدی سے قبل اہل مغرب میں حقوق انسانی کا کوئی تصور نہ تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں امریکہ اور فرانس کے دساتیر میں ملتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ نے حقوق انسانی کا اعلان کیا لیکن ان اعلانات کے باوجود ہر جگہ انسانی حقوق کو پامال کیا جا رہا ہے۔ آج سے چودہ سو سال قبل اسلام نے جو حقوق انسانی کا چارٹر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ وہ دور حاضر کے تمام مدبرین مل کر بھی اس سے بہتر تیار نہیں کر سکے۔

اسلامی چارٹر کی خوبی یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منشور کی ہر دفعہ پر خود عملی نمونہ پیش کیا۔

۱۔ انسانی مساوات

اسلام میں بغیر امتیاز رنگ و نسل تمام انسان مساوی ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات۴۹:۱۳) اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک معزز اور مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ دل میں خدا خوفی رکھتا ہے۔

۲۔ حفاظت جان

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِی حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل۳۳) اور بغیر حق کے کسی کی جان نہ لی جائے۔

۳۔ آزادی

اسلام میں کسی آزاد انسان کو پکڑ کر غلام بنانا حرام ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ (۸:۶۷) ایک نبی کے لیے شایاں نہیں کہ اس کے قبضہ میں قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں جنگ کر کے غالب نہ آئے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ان من شرار الناس الذین یبیعون الناس. بہت برے وہ لوگ ہیں جو آدمیوں کو فروخت کرتے ہیں۔

۴۔ محنت کا پورا پورا حق

ہر فرد اپنی محنت اور کسب کا ثمرہ پانے کا مستحق ہے۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (النجم۳۹) انسان قانون کی حدود میں رہ کر جو کسب معاش کے لیے جدوجہد کرتا ہے اس کا ثمرہ پانے کا وہ مستحق ہے۔

کُلُّ امْرِیءٍ بِمَا کَسَبَ رَھِیْنٌ (الطور۲۱) ہر آدم یا پنے کیے کا پھل پانے کا حق دار ہے۔

۵۔ ملکیت میں دوسروں کا حق

ارشاد الٰہی ہے: وَفِی اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذریت ۱۹) ان کے اموال میں سائل اور مفلس افراد کا بھی حصہ ہے۔

۶۔ مذہبی آزادی کا حق

ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ جس مذہب کو چاہے اختیار کرے اور جسے چاہے ترک کر دے۔

ارشادالٰہی ہے: لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (البقرہ ۲:۲۵۶) دین کے معاملہ میں کوئی جبر و کراہ نہیں۔

۷۔ عزت نفس کا تحفظ

انسان کی ذہنی نشو ونما اور ترقی عزت نفس سے ہی وابستہ ہے۔ اس وجہ سے اسلام عزت نفس کے تحفظ کا پورا پورا حق دیا ہے۔

قرآن مجید میں اس حق کی پوری تفصیل سورۃ حجرات میں بیان کی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْراً مِّنْھُمْ (الحجرات ۴۹:۱۱) اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ایک قوم دوسری قوم پر ہنسی نہ کرے شاید وہ ان سے بہتر ہوں۔"

۸۔ مزدور کا حق

اس دور میں مزدور کا حق ہر طرف پامال ہو رہا ہے۔ اور مزدور اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے کوشاں ہیں جس سے مزدور اور مالک کے درمیان تصادم ہو جاتا ہے اور ملک کی معیشت اور سیاست پر ناخوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اسلام نے محنت کا معاوضہ اور ثمرہ پورا ادا کرنے کی تعلیم دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: کُلُّ امْرِیءٍ بِمَا کَسَبَ رَھِیْنٌ (الطور ۵۲:۲۱) ہر شخص اپنی کمائی کا ثمرہ پانے کا حق دار ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ (ابن ماجہ باب الجارہ) مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔

فرمایا: تین قسم کے انسان ایسے ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑا کروں گا اور جس سے میں جھگڑا کروں گا اس کو مغلوب و مقہور کر کے چھوڑوں گا ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو مزدور سے کام تو پوری طرح لیتا ہے اور اس کے تناسب اس کی اجرت نہیں دیتا۔

۹۔ مظلوم کو فریاد کا حق

اسلام مظلوم کو فریاد کرنے اور ظالم سے بدلہ لینے کا حق دیتا ہے۔ اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ مظلوم خواہ کسی قوم و ملت کا ہو۔ اس کی دادرسی کرے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِہٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیْھِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (الشوریٰ ۴۲:۴۱،۴۲) اور جو کوئی اپنے اوپر ظلم کے بعد بدلہ لیتا ہے تو ان لوگوں پر الزام کا راستہ نہیں۔ الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتی کرتے ہیں انہی کے لیے دردناک عذاب ہے۔

۱۰۔ آزادی سکونت

قرآن مجید میں آتا ہے: سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَا الْخَلْقَ (العنکبوت۲۹:۲۰) کہ زمین میں چلو پھرو۔ پھر دیکھو کس طرح اس نے پہلی بار پیدا کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

تم جہاں چاہو رہو۔ كُوْنُوْا حَيْثُ شِئْتُمْ (نیل الاوطار جلد ۷ ص ۱۳۹)

۱۱۔ ہجرت کا حق

اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا (نساء۴:۹۷) اللہ کی زمین وسیع ہے تم اس میں منتقل ہو سکتے ہو۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا (المومن ۴۰:۶۴) اللہ وہ ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا۔

۱۲۔ حق زرق

ہر شخص کو ضروریات زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (طٰہٰ ۲۰:۱۱۸، ۱۱۹) تیرے لیے یہ ہے کہ تو اس میں نہ بھوکا رہے اور نہ ننگا رہے اور یہ کہ تو اس میں نہ پیاسا رہے اور نہ دھوپ میں رہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ ابن آدم کا حق سوائے ان تین چیزوں کے اور کسی شے سے وابستہ نہیں گھر جس میں وہ رہے کپڑا جس سے وہ تن ڈھانپے اور خشک روٹی اور پانی۔ (ترمذی)

۱۳۔ عصمت کی حفاظت کا حق

اسلام بلا امتیاز رنگ و نسل و مذہب و ملت عورت کی عصمت کو قابل احترام سمجھتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى (۱۷:۳۲) زنا کے قریب نہ پھٹکو۔ اگر کوئی شخص عورت کی عصمت کے ساتھ کھیلتا ہے تو اسلام نے اس شخص کے اس فعل کی سزا مقرر کر دی ہے۔ عورت کی عصمت کے احترام کا یہ ارفع تصور اسلام کے سوا اور کہیں نہیں ملتا۔ تاریخ عالم اس بات پر شاہد ہے کہ جب کوئی فاتح قوم کسی غیر قوم کے ملک پر قبضہ کر لیتی ہے تو اس ملک کی عورتوں کا جو حشر ہوتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں صرف اسلام ہی کی تاریخ اس بدنما دھبے سے پاک ہے۔ مسلمانوں نے بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر کیا لیکن عورتوں کی عصمت پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ مفتوحہ علاقہ کی عورتوں کی عصمت کو قابل احترام سمجھا۔

۱۴۔ تکریم انسانیت

اسلام میں تمام روئے زمین کے انسان قابل تکریم ہیں۔ یہ وہ انسانی حق ہے جو اسلام کے علاوہ کسی دستور اور کسی مذہب نے نہیں دیا ہندو اچھوتوں کو انسانیت کا درجہ دینے کو تیار نہیں۔ یہود غیر یہود کو بے دین کافر کہتے ہیں۔ امریکہ میں گورے کالوں کو قابل احترام نہیں سمجھتے اور ان کو اپنے مدارس میں داخلہ دینے کو تیار نہیں۔ یہ اسلام ہی کی خصوصیت ہے جس نے دنیا کے تمام انسانوں کو بلا امتیاز رنگ و نسل قابل احترام ٹھہرایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (بنی اسرائیل ۱۷:۷۰) ہم نے نوع انسان کو قابل تعظیم بنایا ہے۔

۱۵۔ عدل و انصاف

یہ وہ بڑا اہم حق ہے جو اسلام نے تمام انسانوں کو دیا ہے۔ جس کی پامالی سے دنیا میں فساد رونما ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (المائدہ ۵:۹) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے انصاف کی گواہی دینے والے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو انصاف کرو یہ تقویٰ کے قریب تر ہے۔

۱۶۔ مذہبی دلآزاری سے تحفظ

اسلام اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ دوسرے مذہب کے لوگوں کے مذہبی پیشواؤں کو برا بھلا کہا جائے۔ اسلام ہر مذہب کے پیشوا کی عزت کرنے کی تعلیم دیتا ہے بلکہ یہاں تک کہتا ہے کہ دوسروں کے بتوں کو بھی برا بھلا نہ کہو۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ (الانعام ۶:۱۰۸) اور ان کو گالی نہ دو۔ جن کو یہ اللہ کے سوائے پکارتے ہیں۔

۱۷۔ ایذا رسانی سے تحفظ

اسلام اذیت کو خواہ جسمانی ہو خواہ ذہنی قول، قلبی جرم قرار دیتا ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ (البروج ۸۵:۱۰) وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دکھ دیتے ہیں پھر توبہ نہیں کرتے تو ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلنے کا عذاب ہے۔

۱۸۔ نجی زندگی کا تحفظ

انسان کے بنیادی حقوق میں سے اہم حق اس کی نجی زندگی کا تحفظ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا (النور ۲۴:۲۷) اے لوگو جو ایمان لائے ہو

اپنے گھروں کے سوائے (دوسرے) گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ اجازت نہ لے لو۔

۱۹۔ مدارج کا تعین افراد کے ذاتی جوہر اور کردار کی رو سے

یہ انسانی حق سوائے اسلام کے دنیا کے کسی دستور میں نہیں۔ صرف اسلام نے ہی مدارج کا تعین افراد کے ذاتی جوہر اور کردار کی بناء پر کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات ۴۹:۱۳) تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے شریف وہ ہے۔ جو سب سے پرہیزگار ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: "لوگو! ہاں تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔ (مسند احمد)

۲۰۔ ہر شخص اپنے افعال کا ذمہ دار ہے

ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام ۶:۱۶۴) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

۲۱۔ حصول علم کا حق

علم ہی شرف انسانیت کا ذریعہ ہے اور علم کی وجہ سے آدم مسجود ملائکہ بنا۔ اسلام نے ہر انسان کو حصول علم کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (العلق ۹۶:۴،۵) جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ (سنن ابن ماجہ باب فضل العلماء) علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

۲۲۔ مقاتلین و غیر مقاتلین حقوق

مقاتلین کے حقوق سے متعلق مغربی دنیا پہلی مرتبہ سترھویں صدی کے مفکر گروشیوس قوانین کے ذریعہ آشنا ہوئی مگر عملی طور پر بین الاقوامی جنگ کی تدوین انیسویں صدی کے وسط میں ہوئی۔ مگر کوئی قوم بھی ان قوانین پر عمل نہیں کرتی۔ جب کسی فاتح قوم کے ہاتھوں میں مفتوحہ قوم کے مقاتلین اسیر ہو جاتے ہیں تو ان پر ہر قسم کے مظالم ڈھائے جاتے ہیں اور ملک میں عام غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوتا ہے۔ اسلام نے مقاتلین اور غیر مقاتلین کے حقوق مقرر کر دیے ہیں۔

غیر مقاتلین کے حقوق

ا۔ کسی بوڑھے، کسی بچے اور کسی عورت خانقاہ نشین راہبوں کو قتل نہ کیا جائے۔ غنیم کے ملک میں

غارت گری اور لوٹ مار نہ کی جائے۔ مفتوحہ علاقے کے لوگوں سے کوئی چیز مفت یا بلا اجازت نہ لی جائے۔

مقاتلین کے حقوق

۱۔ آگ کا عذاب نہ دیا جائے۔ ۲۔ زخمی پر حملہ نہ کیا جائے۔ ۳۔ قیدی کو قتل نہ کیا جائے۔ ۴۔ باندھ کر قتل نہ کیا جائے۔ ۵۔ دشمن کی لاشوں کی بے حرمتی نہ کی جائے۔ ۶۔ قیدیوں سے حسن سلوک کیا جائے۔ ۷۔ معاہدات کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔

۲۳۔ شہریوں کے حقوق

ریاست کے زیر عنوان شہریوں کے حقوق پر بحث کی جا چکی ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

مسئلہ قیام امن

پہلی جنگ عظیم کی ہولناک تباہیوں کو دیکھ کر دنیا میں امن قائم کرنے کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا گیا۔ چنانچہ اس عالمی ضرورت کے پیش نظر لیگ آف نیشنز وجود میں آئی، تاکہ دنیا کو جنگوں کی تباہی سے نجات دلائے۔ لیکن یہ انجمن بھی اقوام عالم کو جنگ کی بربادیوں سے نجات نہ دلا سکی۔ اس کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ انجمن کی وہ ناانصافیاں ہیں جو اس نے پہلی جنگ عظیم میں شکست خوردہ اقوام سے کی تھیں۔ اس انجمن کی اساس معاہدہ ورسیلز تھی، جو محض ہاری ہوئی اقوام کو ذلیل وخوار کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔

اس معاہدہ کی رو سے جرمن پر ایک بھاری جنگی تاوان ڈالا گیا۔ اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ اسی طرح ترکی کی طاقت کمزور کرنے کے لیے عرب ممالک کو کئی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ شکست خوردہ اقوام نے مجبوری کے تحت معاہدہ پر دستخط کر دیے تھے لیکن اندرونی طور پر کوشش ان کی یہی تھی کہ وہ اپنی کھوئی ساکھ کو قائم کریں۔ چنانچہ ہٹلر کی قیادت میں جرمنی نے زبردست فوجی طاقت حاصل کر لی، جو دنیا کے امن کے لیے خطرہ بنی اور دوسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد دوبارہ خواہش پیدا ہوئی کہ اقوام عالم پھر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں اور امن قائم کرنے کے لیے کوشش کریں۔ چنانچہ انجمن اقوام متحدہ وجود میں آئی۔ اب آثار نظر آ رہے ہیں کہ اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو لیگ آف نیشنز کا ہوا تھا۔ کیونکہ انجمن اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر صرف ایک کردار یعنی امریکہ رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جس ملک پر چاہے چڑھ دوڑے کوئی اس کو روکنے والا نہیں۔ جس مقصد کے لیے یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ اس کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔

اسلام نے امن قائم کرنے کے لیے حسب ذیل اصول مقرر کیے ہیں۔

۱۔ دنیا میں تمام لڑائیاں صرف اس وجہ سے ہوتی ہیں کہ طاقتور ملک نے کمزور پر قبضہ کرنے اور اس کی دولت چھیننے کے لیے حملہ کر دیا۔ اسلام اس قسم کے حملوں کو نہایت ہی ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَوٰةِ

الدُّنیَا لِنَفۡتِنَهُمۡ فِیۡهِ وَرِزۡقُ رَبِّکَ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی (طٰہٰ ۲۰:۱۳۱) اور اپنی نگاہیں اس کے پیچھے لمبی نہ کر جو ہم نے ان میں سے قسم قسم کے لوگوں کو دنیا کی زندگی کی آرائش کے لیے سامان دیا ہے تا کہ ہم ان کو اس کے ذریعہ سے آزمائیں اور تیرے رب کا رزق بہتر اور زیادہ دیرپا ہے۔

ہر دور میں کمزور ریاستوں کی دولت لوٹنے کے لیے طاقتور ریاستوں نے الگ الگ طریقے اختیار کیے ہیں۔ کبھی یہ طریقہ ہوتا تھا کہ کمزور ریاست پر حملہ کیا اور اس کو محکوم بنالیا۔ عصر حاضر میں حملہ کر کے دولت لوٹنے کا طریقہ ختم ہو گیا ہے۔ اب ترقی یافتہ ممالک ترقی پذیر اور کمزور ممالک کی دولت گھر بیٹھے لوٹ رہے ہیں اور ترقی پذیر ممالک کو اپنا اقتصادی غلام بنا رکھا ہے۔

یہ آیت ہر قسم کے استحصال دولت کو ناجائز قرار دیتی ہے خواہ حملہ کر کے دولت لوٹی جائے خواہ اقتصادی غلام بنا کر۔

۲۔ دنیا میں امن کی بربادی کا ایک بڑا سبب معاہدات کی خلاف ورزی ہے۔ اسلام معاہدات کی پابندی پر بہت زور دیتا ہے تا کہ دنیا کا امن تہ و بالا نہ ہو۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدۡتُّمۡ وَلَا تَنۡقُضُوا الۡاَیۡمَانَ بَعۡدَ تَوۡکِیۡدِهَا (۱۶:۹۱) یعنی عہد پورا کرو جب تم خدا سے عہد کر چکو اور قسموں کو پختہ کرنے کے بعد نہ توڑو۔

وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّتِیۡ نَقَضَتۡ غَزۡلَهَا مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّةٍ اَنۡکَاثًا تَتَّخِذُوۡنَ اَیۡمَانَکُمۡ دَخَلًۢا بَیۡنَکُمۡ اَنۡ تَکُوۡنَ اُمَّةٌ هِیَ اَرۡبٰی مِنۡ اُمَّةٍ (النحل ۱۶:۹۲) اور اس عورت کی طرح نہ بن جاؤ جو سوت کاتنے کے بعد اس کو خود ہی توڑ ڈالتی ہے اپنی قسموں (معاہدات) کو باہمی دھوکے کا ذریعہ نہ بناؤ اس خیال سے کہ ایک جماعت دوسری جماعت سے زیادہ فائدہ میں رہے۔

ایک اور جگہ ایمانداروں کی تعریف میں ارشاد ہے: وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا (۲:۱۷۷) اور اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوتے ہیں جب وہ عہد باندھ لیتے ہیں۔

۳۔ دو متحارب قوموں کے درمیان صلح کرانا: وَاِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَهُمَا فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰهُمَا عَلَی الۡاُخۡرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیۡ تَبۡغِیۡ حَتّٰی تَفِیۡٓءَ اِلٰۤی اَمۡرِ اللّٰهِ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ وَاَقۡسِطُوۡا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ (الحجرات ۴۹:۹) اور اگر مومنوں میں سے دو گروہ جنگ کریں تو ان میں صلح کرا دو پس اگر ایک دوسرے پر زیادتی کرتا ہے تو اس سے جنگ کرو جو زیادتی پر ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے پس اگر وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان عدل سے صلح کرا دو اور انصاف کرو کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں بین الاقوامی امن و صلح کے حسب ذیل اصول بیان کیے ہیں:

اوّل: جب دو قوموں کے درمیان لڑائی چھڑنے کا اندیشہ ہو تو دوسری قومیں ایک دوسرے کی طرف

داری کرنے کی بجائے متحارب قوموں کو نوٹس دے دیں کہ وہ قوموں کی انجمن میں اپنے تنازعہ کا تصفیہ کرائیں۔

دوم: اگر کوئی قوم انجمن اقوام کے نوٹس کی پرواہ نہ کرے تو سب قومیں مل کر باغی قوم کے خلاف لڑائی لڑیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک قوم دنیا کی تمام اقوام کا مقابلہ نہیں کر سکتی، وہ لازمی طور پر صلح کی طرف مائل ہو جائے گی۔

سوم: جب باغی قوم صلح کی طرف مائل ہو جائے تو متحارب فریقین کے درمیان انصاف اور عدل کے ساتھ صلح کرا دیں۔ سرکش قوم پر ظلم و تعدی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ ظلم و تعدی سے آپس میں تباغض اور تحاسد ترقی کرتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (المائدہ ۵:۸) اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو انصاف کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ کا تقویٰ کرو اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔

۴۔ حق میں تعاون اور باطل میں عدم تعاون

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (المائدہ ۵:۸) اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ کا تقویٰ کرو اللہ بدی کی سزا دینے میں سخت ہے۔

اگر اقوام متحدہ قرآن مجید کے اس اصول پر عمل کریں کہ حق میں تعاون کریں، تعدی اور باطل میں عدم تعاون تو دنیا سے فساد مٹ سکتا ہے۔ دنیا میں فساد کی سب سے بڑی وجہ ہی یہ ہے کہ قومیں باطل کی طرفداری شروع کر دیتی ہیں جس سے باطل قوتیں مضبوط جڑ پکڑ جاتی ہیں اور دنیا میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔

۵۔ شہادت حق اور قیام عدل

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ (البقرہ ۲:۲۸۳) اور گواہی نہ چھپاؤ اور جو شخص اسے چھپاتا ہے تو اس کا دل ضرور گناہگار ہوتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ (المائدہ ۵:۸) اے لوگو جو ایمان لائے ہو انصاف پر قائم رہو۔ اللہ کے لیے سچی سچی گواہی دو۔

دنیا میں فساد کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ بڑی بڑی حکومتیں اپنے سیاسی مفادات کے پیش نظر شہادت حق کو چھپاتی ہیں اور عدل و انصاف کو قائم نہیں کرتیں۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ باطل قوتیں مضبوط جڑیں پکڑتی جا رہی ہیں اور امن کا پودا مرجھاتا چلا جا رہا ہے۔ ایک وقت آئے گا جب دنیا تیسری عالمگیر جنگ

کی لپیٹ میں آ جائے گی۔

یہ آیت حکومتوں کو یہ سبق سکھاتی ہے کہ تمام سیاسی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر عدل وانصاف کے بلند مینار پر کھڑی ہو جائیں۔ اگر کوئی حکومت فساد کرتی ہے تو اس کے خلاف سچی سچی گواہی دیں اور اس کو تخریبی کارروائیوں سے روکیں۔

قومی مساوات

دنیا میں امن کی بربادی کا ایک سبب قومی برتری کا خیال ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ جرمن قوم یہ خیال کرتی تھی کہ وہ سب سے اعلیٰ قوم ہے اور وہ دنیا میں حکومت کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اس لیے اس نے اپنا دائرہ حکومت بڑھانے کے لیے اردگرد کی حکومتوں پر حملے کرنا شروع کر دیے۔ قرآن مجید کہتا ہے: **لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسٰى اَنْ يَكُوْنُوْا خَيْرًا مِنْهُمْ** (الحجرات ۴۹:۱۱) ایک قوم دوسری قوم پر ہنسی نہ کرے شاید وہ ان سے بہتر ہوں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: **یاَیُّھَا النَّاسُ الا ان ربکم واحد و ان اباکم واحد الا لافضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی الاسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقویٰ** (مسند احمد) اے لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔

یہ ہے مختصر سا خاکہ اسلامی عالمگیر برادری کے تصور اور دنیا میں امن قائم کرنے کے اصولوں کا، جو اسلام دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ انھوں اصولوں پر عمل کر کے دنیا حقیقی امن سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔

مسئلہ قومیت

قومیت کی تعریف بھی مختلف مفکرین نے مختلف کی ہے۔

قومیت ایک روحانی جذبہ یا اصول ہے جو لوگوں کی ایک ایسی تعداد کے اندر پیدا ہو جاتا ہے جو ایک خاص خطۂ زمین میں رہتے ہوں اور جن میں ایک ہی زبان، ایک ہی مذہب یکساں تاریخ و روایات، مشترک اغراض و مقاصد اور مشترک سیاسی میل جول اور مطمح نظر موجود ہو۔"[1]

برائس قومیت کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے:

"ایک قومیت ایک ایسی آبادی ہے جو بعض رشتوں سے مربوط ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر زبان وادب، خیالات، مراسم اور طور طریقے اور اپنے میں ایسے مکمل اتحاد کا احساس کرے جس کے ذریعے وہ ایسی غیر آبادی سے متفرق ہو جائے جو اپنے طریقے پر اسی طرح مربوط ہوتی ہے۔"

[1] نظری سیاسیات مصنفہ فرید الحق ص ۲۳۷۔

''قومیت سے مراد وہ مضبوط جذبہ ہے جو عموماً ایک ہی قسم کی روایات وثقافت کے حامل انسانوں اور ایک مخصوص علاقے میں بسنے والے افراد اور واحد منتہائے مقصود رکھنے والے اشخاص کو آپس میں متحد رکھنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ جذبہ قوموں اور ریاستوں کی تخلیق میں اصول اور سرچشمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو افراد کو اپنے وطن، اپنی قوم اور اپنی تہذیب وثقافت کی خدمت اور اس کے تحفظ و بقا کے لیے عظیم سے عظیم قربانی دینے پر ابھارتا ہے۔'' (رسالہ ثانوی تعلیم مقالہ قومیت اور اسلام از پروفیسر امان اللہ)

قومیت یا قوم پرستی کے نقصانات

قومیت دنیا میں جنگ، نفرت اور تعصب کے جذبات کو فروغ دیتی ہے اور رواداری کے اصولوں کو پامال کرتی ہے۔ اس دور میں باہمی منافرت اور امن کی بربادی کی وجہ محض قومیت ہے۔ پروفیسر کوبن لکھتا ہے: ''قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت سے پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبہ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جوں ہی کوئی قوم اپنے حق استقلال وخودمختاری کو مسلط کر لیتی ہے تو ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے۔ جو اپنے لیے خودمختاری کی مدعی ہوں...... ان تمام وجوہات کی بناء پر اس نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ کسی نظام حکومت کے لیے قومیت پرستی کی بنیاد بڑی ہی خطرناک ہے۔''[1]

پلسبرگ (Pillsburg) لکھتا ہے:

''قومیت کی تشکیل اور جامعیت میں سب سے موثر جذبہ نفرت کا ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ قریب قریب تمام قومیں بڑی بڑی لڑائیوں یا دوسری قوموں سے طول وطویل مخاصمت کی پیدا کردہ ہیں۔''[2]

میسن لکھتا ہے:

''جنگ کی بنیاد نیشنلزم ہے۔ جس طرح افراد میں باہمی تنازع کی بنیاد جذبہ انانیت ہوتا ہے۔ ارتقائے جنگ کی ساری تاریخ کا سراغ اسی بنیاد سے لگ سکتا ہے۔''[3]

پروفیسر ولیم برنڈ (William Brend) اپنی کتاب (Foundations of human conflicts) کے مقدمہ میں رقمطراز ہے:

''اغلب یہی ہے کہ موجودہ جنگ کے بعد اقوام یورپ چند سال تک عملی نبرد آزمائی میں نہ الجھیں گی۔ کیونکہ ان میں سے بعض تو بہت تھکی ہوئی ہوں گی اور بعض کو ان کے فاتحین دبا کر رکھیں گے۔ لیکن قومیت پرستی (Nationalism) یعنی وہ جذبہ جو جنگ کا اصلی ذمہ دار ہے۔ باقی رہے گا۔ اس لیے

1۔ بحوالہ انسان نے کیا سوچا از پرویز ص ۲۳۷۔

2۔ بحوالہ انسان نے کیا سوچا از پرویز ص ۲۳۷۔

3۔ Creative Freedom۔

مستقبل میں جنگ (کے امکانات) کو ختم کرنے کے لیے آج کی سیاست دانی کی پرکھ اس سے ہوگی کہ موجودہ جنگ کے بعد قومیت پرستی کے اس جذبہ کے متعلق کیا تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔''[1]

عظیم مورخ ٹون بی نے ۱۹۵۴ء میں شکا گو میں کہا۔''بنی نوع انسان کو ایک کنبہ بن جانا چاہیے یا اپنے آپ کو ختم کر دینا چاہیے۔ عالمی قوم کے انسانی شعور کی نشوونما ہی بقا کی کلید ہے قوم پرستی آج دنیا کو فنا کی طرف لے جاسکتی ہے۔''[2]

۲۔ ''نیشنلزم نے انسانیت میں غیر فطری تقسیم کر دی ہے۔ ہر قوم دوسری قوم کو ہیچ اور کمتر سمجھتی ہے۔

پروفیسر ولیم برنڈ (William Brend) لکھتا ہے:

''آج ایک براعظم کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک زرخیز کھیت ہے، جس میں انسانوں نے نہایت نامعقولیت سے دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں، یعنی وادیوں کی اطراف و جوانب سڑکیں، دریا وغیرہ جن کا مصرف اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انھوں نے ایک گروہ کو دوسرے سے الگ کر رکھا ہے، اور جذبہ وطنیت وہ سیمنٹ ہے جو ان زندہ اینٹوں کو باہم گرمربوط کیے ہوئے ہے جس سے انسان خود ساختہ جیل خانوں میں محبوس ہیں۔''[3]

آگے چل کر یہی پروفیسر لکھتا ہے:

''وطنیت کا جذبہ اتحاد انسانی کے راستہ میں سب سے بڑا پتھر ہے...... انسان کے سامنے دو ہی راستے ہیں: یا تو یہ کہ وہ اپنی قومیت کو قائم رکھے اور اس طرح دنیا میں جنگ کا سلسلہ جاری رہے اور یا کسی قسم کے بین الاقوامی اتحاد کا راستہ اختیار کرے۔''[4]

۳۔ نیشنلزم اخلاق کی تباہی کا باعث ہے۔ ہکسلے (Aldous huxley) اپنی کتاب (Science liberty and peace) میں رقمطراز ہے:

نیشنلزم اخلاق کی تباہی کا باعث اس طرح بنتی ہے کہ اس کی رو سے عالمگیر انسانیت خدائے واحد اور احترام آدمیت کے تمام عقائد باطل قرار پا جاتے ہیں اور ان کی بجائے علیحدگی تکبر، انانیت، خود اکتفائیت کے عقائد پیدا ہو جاتے ہیں۔

۴۔ نیشنلزم قوموں میں جاہلانہ عصبیت پیدا کرتی ہے۔ گورے کالے، مشرقی مغربی اور عربی و عجمی کا مسئلہ قومیت کا پیدا کردہ ہے۔ قومیت کے اس پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے سیّد ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

۱۔ بحوالہ انسان نے کیا سوچا از پرویز ص ۲۳۸۔

۲۔ مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے مصنفہ مولوی نور احمد ص ۲۳۲۔

۳۔ بحوالہ انسان نے کیا سوچا از پرویز ص ۲۳۸۔ ۴۔ ایضاً ص ۲۳۸۔

''کیا انسان کے لیے اس سے زیادہ غیر معقول ذہنیت اور کوئی ہو سکتی ہے کہ وہ نالائق، بدکار اور شریر آدمی کو ایک لائق، صالح اور نیک نفس پر صرف اس لیے ترجیح دے کہ پہلا ایک نسل میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا کسی اور نسل میں؟ پہلا سفید ہے اور دوسرا سیاہ؟ پہلا ایک پہاڑ کے مغرب میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا اس کے مشرق میں؟ پہلا ایک زبان بولتا ہے اور دوسرا کوئی اور زبان؟ پہلا ایک سلطنت کی رعایا ہے اور دوسرا کسی اور سلطنت کی؟ کیا جلد کے رنگ کو روح کی صفائی و کدورت میں کوئی دخل ہے؟ کیا عقل اس کو باور کرتی ہے کہ اخلاق واوصاف انسان کے صلاح و فساد سے پہاڑوں اور دریاؤں کا کوئی تعلق ہے؟ کیا کوئی صحیح الدماغ انسان یہ تسلیم کرتا ہے کہ مشرق میں جو چیز حق ہو وہ مغرب میں باطل ہو جائے؟ کیا کسی قلب سلیم میں اس تصور کی گنجائش نکل سکتی ہے کہ نیکی، شرافت اور جوہر انسانیت کو رگوں کے خون، زبان کی بولی، مولد و مسکن کی خاک کے معیار پر جانچا جائے؟ یقیناً عقل ان سوالات کا جواب نفی میں دے گی۔ مگر نسلیت، وطنیت اور اس کے بہن بھائی نہایت بے باکی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہاں ایسا ہی ہے۔''[1]

۵۔ نیشنلزم ایک خالص لادینی تحریک ہے اور مذہب کی جڑ پر تبر رکھتی ہے اور دلوں سے مذہب کا اثر زائل کرتی ہے۔ امریکی پروفیسر ہیتز کوہن اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''اور اب میں اپنی بات کو غلط فہمی سے مبرا رکھنے کے لیے واضح کرتا ہوں کہ قومیت بنیادی طور پر ایک لادینی تحریک ہے۔ میرے نقطہ نظر سے قومیت کی تحریک ایک لادین معاشرے میں ہی پنپ سکتی ہے۔''[2]

ہکسلے اپنی کتاب (Ends and Means) میں لکھتا ہے:

''ہر نیشنلزم ایک بت پرستانہ مذہب ہے جس میں مملکت نے خدا کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔''

جے ایم مرے اپنی کتاب (Adam and Eve) میں رقمطراز ہے:

''چونکہ انسانوں کے دل سے خدا کا عقیدہ نکل گیا ہے اس لیے اس خالی مکان پر نیشنلزم کے شیطان نے قبضہ کر لیا ہے اب انسانوں کو ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو نیشنلزم کے جذبہ پر غالب آسکے۔''[3]

عالمگیر برادری کا تصور

اسلام قومیت اور عوامل قومیت کے برعکس ایک عالمگیر برادری کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ اس نے انسان اور انسان کے درمیان کسی مادی اور حسی تفریق کو تسلیم نہیں کیا۔ جو بھی انسان اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔

---

1. اسلامی ریاست از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔
2. Nationalism in the middle east P.64.
3. بحوالہ انسان نے کیا سوچا ص ۲۴۳۔

وہ ایک ہی اصل کی فرع ہے اور لونی، نسلی، وطنی، لسانی، اقتصادی اور سیاسی تمام غیر عقلی تفریقات ہیں اور بنی نوع انسان کی ہلاکت اور بربادی کا سبب ہیں۔

اسلام کہتا ہے کہ سب انسان ایک ہی اصل سے ہیں، ارشاد الٰہی ہے: یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّ نِسَآءً (النساء ۴:۱) اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

اللھم ربنا و رب کل شیءٍ انی اشھد ان العباد کلھم اخوة (احمد، ابو داؤد) اے ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار میں گواہی دیتا ہوں کہ انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اس اسلامی نظریہ کے حسب ذیل فوائد ہیں۔

۱۔ گروہ بندی اور انسانی تفریق کا خاتمہ

قرآن مجید میں آتا ہے: وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَاجَآءَ ھُمُ الْبَیِّنٰتُ وَ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (آل عمران ۳:۱۰۵) اور ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے تفرقہ کیا اور اختلاف کیا اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی باتیں آ چکی تھیں اور انہی کے لیے بڑا عذاب ہے۔

۲۔ تعصب کا خاتمہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عصبیت جاہلیہ کا رد کرتے ہوئے فرمایا: لیس منامن دعا الی عصبیة ولیس منامن قاتل فی عصبیة ولیس منامن مات علی عصبیة (ابوداؤد) وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی دعوت دے اور وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت پر جنگ کرے اور وہ بھی ہم سے نہیں ہے جس کی موت عصبیت پر واقع ہو۔

عصبیت کی وضاحت خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی۔ واثلہؓ بن الاسقع کہتے ہیں کہ میں نے دریافت کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عصبیت کیا ہے۔ فرمایا: ان تعین قومک علی الظلم (مشکوٰۃ باب المفاخر) عصبیت اس کا نام ہے کہ تم ظلم پر اپنی قوم کی ناجائز مدد کرو۔

اے قوم قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسبت کا فخر خدا نے مٹا دیا ہے تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ خدا کا فرمان ہے لوگو میں نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمھارے قبیلے اور خاندان بنائے کہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لیے جاؤ۔ لیکن خدا کے نزدیک شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔"

۳۔ نسل، وطن، زبان اور رنگ کی تفریق کا خاتمہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے مشہور خطبہ میں فرمایا:

ایھا الناس الا ان ربکم واحد فان اباکم واحد الا لافضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقوی۔[1] لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

ارشاد الٰہی ہے: **یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔**[2] اے لوگو! ہم نے تمھیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے شریف وہ ہے جو سب سے پرہیز گار ہے اللہ جاننے والا خبر دار ہے۔

یہ آیت نسلی تفریق کا خاتمہ کرتی ہے۔ اس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ روئے زمین کے تمام انسانوں کی اصل ایک ہے۔ نسل کے بڑھ جانے کی وجہ سے جو مختلف قبیلے بن گئے ہیں وہ صرف پہچان کا ذریعہ ہیں کہ فلاں شخص فلاں قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور فلاں شخص فلاں قبیلے سے۔ کسی خاص قبیلے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس کو عزت حاصل نہیں ہو جاتی۔ ہاں عزت کا ذریعہ صرف خدا خوفی ہے جو شخص بھی متقی ہوگا خواہ کسی قبیلے یا نسل یا علاقے سے تعلق رکھتا ہو وہ مکرم و محترم ہوگا۔

اسلام مساوات کا حامی ہے۔ تمام روئے زمین کے لوگوں کو ایک ہی اصل کی شاخیں قرار دیتا ہے۔ کسی شخص کو رنگ، نسب، وطن وغیرہ کی وجہ سے دوسرے پر فضیلت حاصل نہیں ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ امت اسلامیہ کے ایک فرد تھے ان کو اہل بیت میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس میں حضرت بلال حبشیؓ تھے جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ بلال ہمارا آقا ہے۔ اس میں حضرت صہیب رومیؓ تھے جنھیں حضرت عمرؓ نے اپنی جگہ نماز میں امامت کے لیے کھڑا کیا۔ اس میں حضرت حذیفہؓ کے غلام سالمؓ تھے جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے انتقال کے وقت کہا تھا کہ اگر آج سالمؓ مولی حذیفہؓ زندہ ہوتے تو خلافت کے لیے ان کو نامزد کرتا۔ اس میں حضرت زید بن حارثہؓ تھے۔ جن کے نکاح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنی پھوپھی زاد بہن زینبؓ دے دی۔ اس میں حضرت اسامہؓ تھے جن کو ایک ایسے لشکر کا قائد مقرر کر دیا جس میں بڑے بڑے صحابی تھے۔

مسئلہ دہشت گردی

دہشت گردی سے مراد وہ خون خرابا اور قتل و فساد ہے جو ایک انسان یا گروہ اپنی ذاتی اغراض اور

[1] مسند احمد۔ [2] الحجرات ۴۹:۱۳۔

خواہشات کی تکمیل کے لیے کرتا ہے۔ دور حاضر میں جو خون خرابا اور قتل و فساد کی لہر اس وقت دنیا میں چل رہی ہے اس کے متعلق دانشور دو طبقوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک طبقہ اس لہر کو دہشت گردی کے نام سے موسوم کرتا ہے اور دوسرا طبقہ حریت پسندی کا نام دیتا ہے۔ جب تک اس قتل و غارت کے اسباب معلوم نہ کیے جائیں صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہمارے قریب ہی زمانہ میں اس قتل و غارت کی بنیاد امریکہ نے جاپان پر دوسری جنگ عظیم میں ایٹمی بم باری سے ڈالی تھی۔ پھر اپنی قوت کے بل بوتے پر دنیا میں مختلف قسم کی دہشت گردی کرتا رہا۔ یہ ایک لمبی فہرست ہے۔ جس کا ذکر کرنا باعث طوالت ہے۔ قریب زمانہ میں امریکہ کی دہشت گردی کی مثالیں افغانستان اور عراق پر حملے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں لاکھوں انسان لقمہ اجل بن چکے ہیں اور اب بھی ان ممالک کے مظلوم انسان دہشت گردی کا شکار ہیں۔ امریکہ نے یہ جرم تیل کے چشموں پر قبضہ کرنے دوم اپنے حریف ممالک کے گرد گھیرا ڈالنے کے لیے کیا ہے۔

جو لوگ قتل و غارت کی لہر کو حریت پسندی کا نام دیتے ہیں۔ وہ یہ وجہ بیان کرتے ہیں اب مظلوم لوگوں کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ یہ دانشور خودکشی حملوں کو حریت انسانی کی جنگ قرار دے کر جائز قرار دیتے ہیں۔ جو طبقہ اس کو ناجائز قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے۔ خودکش حملوں کا نشانہ بے گناہ لوگ ہیں اس وجہ سے یہ ناجائز ہے۔

اسلام کی تعلیم

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ وہ کسی ناحق قتل کو انسانیت کا قتل قرار دیتا ہے۔ خودکش حملہ کرنے والے اپنے حریف مسلمانوں کے ممالک پر ناجائز قبضہ کرنے والوں کے خلاف کاروائیاں کریں تو اضطراری حالت میں ان حملوں کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَالَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا (النساء ۴:۷۵) تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستہ میں جنگ نہیں کرتے اور کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کے لیے جو کہتے ہیں۔ اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی دوست بنا۔

یہ حملے گویا کمزور اور مظلوم لوگوں کی مدد کے لیے ہیں تاکہ دشمن کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ استعماریت سے باز آ جائیں اور مسلم ممالک سے ناجائز قبضہ چھوڑ دیں۔ مذکورہ قرآنی اصول دنیا میں امن قائم کرنے کا ذریعہ ہے اور کوئی ملک کسی ملک پر ناجائز قبضہ کر کے وہاں کے رہنے والوں پر ظلم و ستم نہ کرے۔ اسلام کی تمام لڑائیاں جور و ستم کے خاتمے کے لیے لڑی گئی تھی۔ جہاں تک کسی مظلوم کی مدد کرنے کا سوال ہے وہ تو صحیح

ہے۔ لیکن سوال بے گناہ انسانوں کے قتل کا ہے۔ وہ اسلام کی نظر میں قطعاً حرام ہے۔ وہ تمام قوتیں جو مظلوموں کی مدد کے لیے برسر پیکار ہیں ان کے لیے یہ سوچنے کا موقع ہے کہ وہ ایسی کارروائیوں سے باز رہیں جن سے ناحق خون بہنے کا امکان ہو۔ ایک تو یہ قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ دوم مخالف قوتیں اس عمل کو اسلام کے خلاف استعمال کریں گی۔ استعمار پسند قوتوں کے متعلق اسلام نے واضح یہ تعلیم دی ہے کہ ان کے خلاف بین الاقوامی طور پر اتحاد کر کے ان کو ظلم سے روکا جائے۔ اب بین الاقوامی امن قائم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر ناجائز قبضہ کرنے والی طاقت کے خلاف کارروائی کی جائے۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو کم از کم مسلمان ممالک ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر استعماریت کے خلاف صف آراء ہو جائیں اور امریکہ کو مجبور کریں۔ وہ عراق اور افغانستان پر ناجائز قبضہ اور دیگر خود مختار ممالک میں مداخلت چھوڑ دے۔ اگر دنیا کی قوموں نے امریکہ کو نہ روکا تو بین الاقوامی طور پر اس کے نہایت ہی بھیانک نتائج نکلیں گے۔ جس سے ایک دفعہ پھر تمام دنیا کا امن درہم برہم ہو جائے گا اور خون کی ندیاں بہنا شروع ہو جائیں گی۔

خصائص اسلام

۱۔ محفوظیت

اسلام کی پہلی خصوصیت تعلیمات اسلامیہ کی بے نظیر محفوظیت ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس دنیا سے رحلت کیے ہوئے چودہ سو سال گزر گئے ہیں۔ اس وقت سے لے کر اب تک دنیا میں ہزارہا انقلابات آئے ہیں۔ لیکن اسلام کی وہ کتاب جس پر اس کی اساس ہے ہر قسم کے تغیر وتبدل سے محفوظ ہے۔ قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود لی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ (حجر ۱۵:۹) یقیناً ہم نے ہی قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔

مستشرقین نے بھی قرآن مجید کی محفوظیت کا اقرار کیا ہے۔ سر ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمد کے دیباچہ میں لکھتے ہیں، ''جہاں تک ہماری معلومات ہیں دنیا بھر ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو اس (قرآن مجید) کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کے تحریف سے پاک رہی ہو۔

۲۔ تکمیل تعلیم

اسلام کی تعلیم ہر پہلو سے کامل ہے۔ زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس کے متعلق اسلام راہنمائی نہ کرتا ہو خواہ وہ اعتقادی ہو یا سیاسی معاشی ہو یا مبادی، دنیوی ہو یا اخروی۔ کتب سماوی میں قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے۔ جس نے اکمل ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَـكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَرَضِيۡتُ لَـكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا (مائدہ ۵،۳) یعنی آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے اور تمہارا دین اسلام ٹھہرا کر راضی ہوں۔

۳۔ وحدانیت

دنیا کے تمام مذاہب کی بنیاد وحدانیت پر ہے۔ لیکن ایک مذہب بھی ایسا نہیں جس نے اپنی اساس کو برقرار رکھا ہو۔ تقریباً تمام مذاہب توحید سے ہٹ کر دو تین یا کثیر التعداد خداؤں کو پوجنے لگ گئے ہیں اس پر تفصیلی بحث مذاہب عالم پر گفتگو کرتے ہوئے گزر چکی ہے۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی اساس برقرار ہے اور شرک کو اپنے اندر داخل ہونے نہیں دیا۔ قرآن مجید میں توحید پر ایک مکمل جامع الفاظ میں سورت ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (الاخلاص ۱۱۲: ۱۔۴)
کہہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے نہ اس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔

۴۔ اتحاد انسانی

اسلام کا نسل انسانی کی وحدت کا نظریہ انسانی تہذیب پر بہت بڑا احسان ہے جس کی نظیر دوسری کتب سماوی میں نہیں ملتی۔ قرآن مجید میں آتا ہے: يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (نساء ۴: ۱) اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک اصل سے پیدا کیا۔ دوسری جگہ آتا ہے: وما كان النّاس الّا اُمّة وّاحدة فاختلفوا (یونس ۱۰: ۹) انسانوں کی ایک ہی امت تھی پھر الگ الگ ہو گئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ ان العباد کلھم اخوۃ (احمد، ابوداؤد) انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اسلام کے اس پیغام نے تفریق بین الناس کے تمام محرکات اور تعصبات کو جڑ سے کاٹ کر رکھ دیا ہے۔

۵۔ رواداری

عصر حاضر میں رواداری پر بہت زور دیا جا رہا ہے کیونکہ رواداری کے فقدان کی وجہ سے دنیا آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑی ہے۔ مذاہب عالم اور عالمی تحریکات میں اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو رنگ، نسل، عقیدہ اور مجلسی مقام سے بالاتر ہو کر بین الانسانی محبت اور رواداری کی تعلیم دیتا ہے۔ اسی تعلیم پر کاربند ہو کر انسان سلامتی اور امن سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ ۲: ۲۵۶) دین کے بارے میں کوئی جبر نہیں۔ دوسری جگہ آتا ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (الانعام ۶: ۱۰۹) اور ان لوگوں کو گالی نہ دو جو غیر اللہ کو پکارتے ہیں۔

بین الاقوامی قانون دان پروفیسر رافیل کیمکن جس نے نسل کشی کے ضمن میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کا مسودہ تیار کیا۔ وہ قرارداد کی اصل شرائط کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے۔ "مسلمانوں کے لیے مزید کہوں گا کہ میں نے جس قرارداد کا مسودہ تیار کیا ہے۔ وہ پوری طرح قرآن کے مطابق ہے کیونکہ انسانی علم کے مطابق اس میں سب سے زیادہ رواداری اور بین الاقوامی شعور والا مذہب مذکور ہے۔ یہودیت نصرانیت کے پیغمبروں کو قبول کرنا اور دوسرے لوگوں کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی سے منع کرنا اس دین اسلام کی انسان دوستی اور جذبہ رواداری کی مثالیں ہیں۔" (مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے مصنفہ مولوی نور احمد ص ۲۳۵)

۶۔ حریت انسانی

اسلام سے قبل انسان طرح طرح کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اسلام نے حریت انسانی کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ سوئی ہوئی دنیا جاگ اٹھی۔ معاشرہ کے ہر طبقہ نے یہ جان لیا کہ اس کے

بھی حقوق ہیں اور اس کی بھی دنیا میں کوئی ہستی ہے۔ قرآن میں آتا ہے: وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ان سے ان کا (غلامی) کا بوجھ اتارتا ہے اور (غلامی) کا طوق بھی جوان پر ہے۔

۷۔ قوی التاثیر اور سریع التاثیر

اسلام کی تعلیم قوی التاثیر اور سریع التاثیر ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (۲۱:۵۹) اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو تو اسے اللہ کے خوف سے گرا ہوا پھٹا ہوا دیکھتا۔ اس آیت میں قوت تاثیر کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا (نصر ۲:۱۱۰) اور تو نے لوگوں کو اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے دیکھ لیا۔

اس آیت میں سرعت تاثیر کا بیان ہے کہ کس قدر جلد اسلام اکناف عالم میں پھیل گیا۔ مسٹر سیل قرآن مجید کے اپنے انگریزی ترجمہ کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں۔

''دنیا میں اسی دین کو وہ قبولیت حاصل ہوئی جس کی مثال اور نظیر نہیں ملتی۔''

۸۔ تیسیر تعلیم

اسلامی تعلیمات کو ہر طبقہ، ہر ملک اور ہر عمر کا انسان مرد ہو یا عورت آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور اس پر آسانی سے عمل کر سکتا ہے کیونکہ اسلامی تعلیمات معتدل اور فطرت انسانی کے مناسب ہے۔ مثلاً ہر مسلمان مرد اور عورت پر ماہ رمضان میں فرض ہے لیکن مجبور، معذور اور مسافر وغیرہ کے لیے آسانی رکھ دی گئی ہے۔ نماز کے لیے شرط طہارت ہے یعنی نمازی کو وضو اور غسل کی ضرورت ہو تو وہ وضو اور غسل کرے۔ لیکن اگر پانی نہ ملے یا پانی کا استعمال نقصان دے تو وضو اور غسل کی بجائے پاک مٹی سے تیمم کر لیا جائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرٰى (لیل ۷:۹۲) ہم اسے آسانی کی طرف لے جائیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: بُعِثْتُ بِالْمِلَّةِ الْحَنِيفِيَّةِ السَّمْحَةِ السَّهْلَةِ الْبَيْضَاءِ میں ایک ایسے دین کے ساتھ بھیجا گیا ہوں جو ایک اللہ کے ساتھ تعلق پیدا کرتا ہے اس میں تنگی نہیں اور سہل ہے اور روشن ہے۔

۹۔ اسلام عالمگیر دین ہے

ابتدائے آفرینش میں اقوام عالم مختلف ممالک میں الگ الگ پڑی ہوئی تھیں۔ میل جول کے ذرائع اور رسائل مفقود تھے اور ان کی استعدادیں بھی اس قابل نہ تھیں کہ وہ ایک مکمل ضابطہ حیات اور ہدایت حاصل ہو سکیں۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ ہر قوم کی رشد و ہدایت کے لیے الگ الگ نبی آتے اور ان کی ضرورت کے مطابق ہی احکام لاتے۔ اگر دنیا کے تمام مذاہب کا بنظر تعمق مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر

سامنے آجاتی ہے کہ قرآن مجید کے نزول سے قبل تمام انبیا علیہم السلام کے پیغام اپنے اندر عالمگیر حیثیت نہیں رکھتے تھے قرآن مجید میں آتا ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ (۷:۵۹) ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ حضرت ہود علیہ السلام کے متعلق آتا ہے: وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا (۷:۶۵) قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ حضرت صالح علیہ السلام کے متعلق فرمایا۔

اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا (۷:۷۳) ثمود قوم کی طرف ان کا بھائی صالح نبی بن کر آیا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کے متعلق فرمایا: وَاِلٰی مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا یعنی مدین کی طرف ان کا بھائی شعیب علیہ السلام آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴:۵) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنی کی طرف لائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْ اِسْرَاۗءِيْلَ وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول تھا۔

مذاہب عالم کی کتب بھی یہی ظاہر کرتی ہیں کہ ان کی تعلیم خاص خاص قوموں کے لیے تھی۔

توریت میں آتا ہے: ''موسیٰ نے ہم کو ایک شریعت دی جو بنی اسرائیل کی میراث ہو'' (استثناء ۳۳:۴)

پس اب تو جا میں تجھے فرعون کے پاس بھیجتا ہوں میرے لوگوں کو جو بنی اسرائیل کی ہیں مصر سے نکال۔'' (کتاب خروج باب سوم آیت ۱۰)

ایک اور آیت ہے۔ بنی اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پلوٹھا ہے۔ (خروج ۴:۲۲)

ان تمام آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت صرف بنی اسرائیل کی طرف ہوئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق انجیل میں آتا ہے: ''میں بنی اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے علاوہ اور کسی کے لیے نہیں بھیجا گیا۔ مناسب نہیں کہ لڑکوں (بنی اسرائیل) کی روٹی کتوں کے لیے پھینک دوں۔'' (انجیل متی ۱۵:۱۰)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بارہ حواریوں کو تبلیغ کے لیے روانہ کیا اور فرمایا: غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔'' (متی ۱۰:۵)

ہندومت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے ہندو جاتی کے سوا کبھی اپنے عروج کے زمانہ میں کسی قوم تک اپنے مذہب کی تعلیم نہیں دی، اور کسی غیر مذہب کے پیرو کو اپنے مذہب میں داخل نہیں کیا۔ ان کی مقدس کتب میں صاف لکھا ہے کہ وید صرف برہمن ہی پڑھ سکتے ہیں۔ عبادت گاہوں میں شودروں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مذہب قومی مذہب ہے۔

صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے عالمگیر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ...... (سباء ۲۸:۲۴) اور ہم

نے تجھے تمام قوموں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

دوسری جگہ آتا ہے: قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اعراف ۷:۱۵۸) کہہ اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، وہ جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء ۲۱:۱۰۷) اور ہم نے تجھے تمام لوگوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: كان كل نبي يبعث الى قومه خاصة وبعثت الى كل احمر و اسود (مسلم باب المساجد) ہر نبی اپنی خاص قوم کی طرف بھیجا گیا تھا اور میں تمام سرخ اور سیاہ قوموں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

دلائل

اکمل تعلیم

قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ کامل ترین کتاب ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵:۳) یعنی آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے اور تمہارا دین اسلام ٹھہرا کر راضی ہوا ہوں۔

قرآن مجید کے مکمل ہونے کی یہ دلیل ہے کہ انسان کی زندگی کے ہر شعبہ میں راہنمائی کرتا ہے۔ خواہ اعتقادی شعبہ ہو یا اخلاقی، معاشرتی ہو یا سیاسی، معاشی ہو، دنیوی ہو یا اخروی۔ قرن مجید میں آتا ہے: مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (۶:۳۸) ہم نے کتاب (قرآن) میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی یعنی اس کتاب میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے لیے جس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے وہ اس میں بیان کر دی گئی ہے۔

بین الاقوامی اتحاد

ہر قوم کی ہدایت کے لیے قومی نبی آنے کی وجہ سے انسانوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ وہی قوم خدا کی محبوب ہے اور وہی قوم اللہ کی تمام نعمتوں کی وارث ہے۔ دوسری اقوام عالم ہیچ ہیں۔ اس تنگ نظری سے قومیت کا نظریہ پیدا ہوا، جو امن عالم کے لیے نہایت ہی خطرناک ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت ازلی یہ تھی کہ دنیا کی تمام اقوام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرے۔ اس مشیت کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عالمگیر شریعت دے کر بھیجا تاکہ دنیا کی تمام قوموں کو اتحاد کی لڑی میں منسلک کرے۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے۔ جو نسل انسانی کی وحدت کا نظریہ پیش کرتا ہے اور کہتا ہے: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰:۹) سب لوگ ایک ہی امت ہیں وہ آپس میں جھگڑتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا (نساء۴:۱) اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا پھر ان دو سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا۔

اس پیغام وحدت کے ساتھ یہ بھی اعلان کیا کہ ہر قوم کا نبی ایک ہی چشمہ ہدایت سے سیراب ہوتا تھا اور سب ایک ہی دین کے رسول تھے۔ اور تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا مغز اور نچوڑ قرآن مجید کی شکل میں نازل کیا گیا ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابوں کو سچا قرار دے کر ایک مسلمان کے لیے یہ لازمی قرار دے دیا کہ وہ سب انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتب پر ایمان لائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ. (۲:۱۳۶) ہم کسی رسول کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَالْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ (۲:۲۸۵) مومن سب اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔

ایک اور جگہ فرمایا: شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ (الشوریٰ ۴۲:۱۳) اے لوگو! اللہ نے تمھارے لیے دین وہی مقرر کیا ہے جس کی وصیت حضرت نوح علیہ السلام کو کی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اسی دین کی وصیت کی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی یہی حکم دیا تھا کہ وہ اسی دین کو قائم رکھیں اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی دین چلا آ رہا ہے اور ایک ہی راستہ پر لوگوں کو چلنے کی تلقین کرتے چلے آ رہے ہیں۔

گویا اسلام کو تسلیم کرنا تمام مذاہب کو بنیادی طور پر سچا قرار دینا ہے اور تمام اقوام عالم کو متحد کرنے کا یہی موثر طریقہ ہے جس کو اسلام نے اختیار کیا ہے۔ اس طریقہ سے ہی مذہبی، قومی، نسلی اور لسانی تعصبات ختم ہو سکتے ہیں اور یہی تعصبات اتحاد کے راستہ میں حائل ہوتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ہر قسم کے تعصبات کو ختم کرتے ہوئے یہ اعلان فرمایا: لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لابیض علی اسود ولا لاسود علی ابیض الا بتقوی (زادالمعاد جلد۴ ص۲۲) یعنی اہل عرب کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں نہ کسی عجمی کو عربی پر فضیلت ہے، نہ کسی گورے کو کالے پر فضیلت ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر تفوق حاصل ہے ہاں اگر ہے تو صرف تقویٰ کی وجہ سے ہے۔

آج دنیا کے تمام مفکر اس بات کو برملا کہتے ہیں کہ قومیت ہی تباہی کا موجب ہے۔ چنانچہ بلیکلے نے ۱۹۴۷ء میں لکھا تھا:

''قومیت پرستی اخلاقی تباہی کا موجب ہے کیونکہ یہ عالمگیریت کے تصور کے منافی اور ایک خدا کے انکار پر مبنی ہے اور انسانوں کی قیمت بحیثیت انسان کچھ نہیں سمجھتی۔ دوسری طرف یہ تفرقہ انگیزی کا موجب ہے۔ انانیت اور تکبر پیدا کرتی ہے۔ باہمی نفرت بڑھاتی ہے اور جنگ کو نہ صرف ضروری قرار دیتی ہے بلکہ مقدس بھی ٹھہراتی ہے۔''

اسلام کے بین الاقوامی اتحاد کے نظریہ کو عملی طور پر حج کی شکل میں ظاہر کیا گیا ہے۔ جب اکناف عالم سے حج کا فریضہ ادا کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔

بین الاقوامی عدل وانصاف

اسلام نے وحدت نسل انسانی کا پیغام دینے کے ساتھ بین الاقوامی عدل وانصاف کی بھی تعلیم دی ہے، اور اسلام کے عالمگیر ہونے کی یہ ایک بڑی دلیل ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (۵:۹) اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

العصبية هي ان يعين الرجل قومه على الظالم (مسند امام احمد کنوز الحقائق حدیث ۲۰۸)

عصبیت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنی قوم کی امداد ظلم پر کرے۔

جب دنیا کے دوسرے مذاہب اور دنیاوی تحریکوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ کسی مذہب کی موجودہ تعلیم بین الاقوامی عدل وانصاف کی علمبردار نہیں، نہ کسی تحریک کی۔

یہود کہتے ہیں کہ صرف یعقوب کی اولاد ہی اللہ کو پیاری ہے، باقی سب اس کی غلامی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اسی طرح تورات کا ایک یہ حکم ہے: تو اپنے بھائی سے سود نہ لے۔ (استثناء ۲۳:۱۹۔۲۰ واحبار ۲۵۔۳۷)

اگر سود لینا برا ہے تو غیر یہودیوں سے لینا کیوں کر اچھا ٹھہرا۔ یہ تعلیم عدل وانصاف کے بنیادی اصولوں کے ہی خلاف ہے۔

ہندو مذہب میں چار ذاتوں کا نظریہ ہی بین الاقوامی عدل وانصاف کے سراسر منافی ہے۔ پھر ہر ذات کے متعلق ایسے اصول مقرر کر دیے ہیں جو تفریق اور عداوت پر مبنی ہیں۔ ان اصولوں پر بین الاقوامی عدل وانصاف کی عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی۔

منو کہتا ہے: ''اگر شودر دھن جمع کرے تو راجہ کا فرض ہے کہ وہ اس سے چھین لے کیونکہ شودر مال دار برہمنوں کو دکھ دیتا ہے۔'' (منو ادھیائے ۹ شلوک ۶۷)

اسی طرح لکھا ہے: ''اگر برہمن ایک پنچ سے قرض لیتا ہے، لیکن وہ ادا نہیں کر سکتا تو شودر کا فرض

ہے کہ وہ برہمن سے کوئی روپیہ نہ لے۔لیکن اگر شودر نے برہمن کا روپیہ دینا ہے اور شودر غریب ہے تو اونچی ذات والوں کی مزدوری کر کے برہمن کے قرض کو ادا کرے۔'' (منوادھیائے ۱۰ اشلوک ۵۳)

پھر لکھتا ہے: ''برہمن شودر سے دولت لے لے اس میں کوئی وچار نہ کرے کیونکہ وہ دولت جو اس نے جمع کی ہے وہ اس کی نہیں بلکہ برہمن کی ہے۔'' (منوادھیائے ۸ شلوک ۴۱۷)

عیسائیت کا پیغام ہی یہ ہے کہ شریعت ایک لعنت ہے۔ (گلتیوں باب ۲)

جب شریعت ہی لعنت ہوئی تو پھر اس کا ہر حکم اور پیغام لعنت ہی ہوگا۔ اس لعنتی پیغام اور حکم سے دنیا میں عدل و انصاف قائم نہیں ہو سکتا۔ پھر عیسائیت جس قسم کی محبت کی تعلیم دیتی ہے عیسائی خود اس پر عمل نہیں کر سکتے۔

مذاہب کے علاوہ دنیا کی دو بڑی تحریکیں ہیں: سرمایہ داری اور مارکسیت، سرمایہ داری تحریک امراء کے حقوق کی نگہداشت کرتی ہے۔ مارکسیت صرف غرباء کے حقوق کو محفوظ کر کے امراء کو فنا کے گڑھے میں اتارتی ہے۔

تمام مذاہب اور تحریکوں میں صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو ٹھوس بنیادوں پر بین الاقوامی عدل و انصاف کی عمارت کھڑی کرتا ہے۔

بین الاقوامی امن

عدل و انصاف خود امن کا ضامن ہے۔ جب دنیا میں عدل و انصاف کی حکمرانی ہوگی امن خود بخود قائم ہو جائے گا۔ لیکن اسلام نے دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے ایک ہی عمدہ اصول مقرر کر دیا ہے، وہ یہ ہے: تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۵:۸) اے دنیا کی قومو! نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

کیا ہی عمدہ اصول ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کے ساتھ نیکی اور بھلائی کی بنیادوں پر تعاون کرے۔ جب کوئی قوم ظلم کا راستہ اختیار کر رہی ہو تو اقوام عالم قوم کا ساتھ دیں تا کہ دنیا سے ظلم ہٹ جائے۔ دوسری جگہ آتا ہے: وَاِنْ طَائِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۴۹:۹) اگر مومنوں میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو اگر کوئی قوم دوسری قوم پر زیادتی کرتی ہے تو اس سے جو زیادتی کرتی ہے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف لوٹ آئیں پس اگر وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں بین الاقوامی امن اور انصاف کے تین اصول مقرر کیے ہیں:

۱۔ جب دو قومیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دینی چاہیے۔

۲۔ اگر کوئی قوم صلح پر رضا مند نہ ہو بلکہ زیادتی اور ظلم کا راستہ اختیار کرے تو دنیا کی تمام اقوام ظالم قوم کے ظلم کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں اور ظالم قوم کو ظلم اور عدوان سے روک دیں۔

۳۔ جب ظالم قوم دوبارہ صلح پر رضا مند ہو جائے تو عدل و انصاف کے ساتھ دونوں متحارب قوموں کے درمیان صلح کرا دی جائے۔

قوۃ اصلاح

عالمگیر مذہب کی ایک شان یہ ہے کہ وہ اپنے اندر قوت اصلاح رکھتا ہو۔ یعنی ہر دور کے مسائل کو حل رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ شان سوائے دین اسلام کے اور کسی مذہب میں نہیں۔ دین اسلام نے ہر دور کے تقاضوں کو پورا کیا ہے اور ہر دور کے مسائل کو حل کیا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ ہمارے عصر جدید میں بے شمار مسائل ابھرے ہیں۔ ان کو حل کرنے کے لیے مختلف تحریکات نے جنم لیا ہے اور بے شمار حکماء اور فلاسفہ نے ان مسائل کے حل لکھے ہیں۔ لیکن مسائل سلجھنے کے الجھ کے رہ گئے ہیں۔ صرف اسلام ہی ایک دین ہے جس کی تعلیم کی روشنی میں ان مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔

دوام اور محفوظیت

عالمگیر مذہب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ محفوظ ہو۔ جب اس اصول کے تحت دنیا کے مذہب کا مطالعہ کرتے ہیں تو سوائے اسلام کے اور کوئی مذہب بھی اس کسوٹی اور اصول پر پورا نہیں اترتا۔ دنیا کے کسی مذاہب کی کتاب محفوظ نہیں اور اس کا اقرار خود اس مذہب کے ماننے والوں نے کیا ہے۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے۔ جس کی کتاب محفوظ ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۹:۱۵) قرآن مجید کو ہم نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔ قرآن مجید کے محفوظ ہونے کے متعلق شہادتیں یورپین فضلاء نے بھی دی ہیں۔ سر ولیم میور لائف آف محمد صفحہ ۲۸ پر لکھتا ہے۔

"گویا ممکن ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن خود ہی بنایا ہو مگر جو قرآن ہمارے پاس موجود ہے وہی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔"

توحید خالص

دنیا کے تمام مذاہب کی اساس توحید ہے۔ گویا تصور توحید، انسانیت کا عالمگیر بین الاقوامی عقیدہ ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (۲۵:۲۱) ہم نے آپ سے پہلے کوئی نبی نہیں بھیجا مگر ہم نے اس کو وحی کے ذریعہ بتایا کہ کوئی معبود نہیں مگر میری عبادت کرو

جب مذاہب عالم کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ تمام مذاہب خالص توحید کے تصور سے خالی ہو چکے ہیں۔ اگر کوئی مذہب خالص توحید کا حامل ہے تو وہ صرف اسلام ہی ہے۔ خالص توحید انسانی عقل کا فطری اور مرکزی نقطہ ہے اور فطرت کائنات کے مطابق ہے کیونکہ نظم کائنات اور قوانین فطرت میں وحدت پائی جاتی ہے۔ جو سائنس کے قوانین کی بنیاد ہے نظم کائنات اور قوانین فطرت میں وحدت اس بات کی دلیل ہے کہ خالق کائنات بھی واحد ہے۔ اس لیے کوئی ایسا دین عالمگیر کہلانے کا مستحق نہیں۔ جو توحید سے خالی ہو۔ اسلام نے صرف خالص توحید ہی کی تعلیم نہیں دی بلکہ شرک کی ہر قسم کی نفی کی ہے۔ قرآن مجید نے توحید کو نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ جامع اور مانع الفاظ میں سورۃ اخلاص میں بیان کیا ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔ (۱۱۲: ۱-۴) کہہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ شرک کی نفی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (۳۱: ۱۳)

نجات (فلاح)

اسلام نے دنیا و آخرت میں کامیابی اور سرخروئی کو نجات یا فلاح کا نام دیا ہے۔ نجات کا مادہ نجو ہے اور نجوۃ بلند زمین کو کہتے ہیں نجات کے معنی ہیں الارتفاع من الھلاک یعنی ہلاکت سے بلند ہو جانا (تاج العروس) یا جس چیز میں خوف ہو اس سے مخلصی پالینا۔ راغب کہتے ہیں۔ نجاء کے اصل معنی کسی چیز سے الگ ہو جانا ہیں پس نجات کے معنی اسلام میں گناہ سے جو ہلاکت پیدا کرتا ہے بلند ہو جانا یا اس سے بالکل الگ ہو جانا اور مخلصی پالینا ہے۔

فلاح۔ فلح کے اصل معنی شق یعنی پھاڑنا ہیں۔ زمین میں ہل چلانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اسی لیے کسان کو فلاح کہتے ہیں اور فلاح کے معنی ہیں ظفر وادراک بغیۃ (امام راغب) یعنی کامیابی اور مطلوب کو پا لینا کیونکہ جس طرح ہل چلانے سے زمین کی مخفی طاقتیں اور جوہر ظاہر ہو جاتا ہے اسی طرح انسانی استعدادوں اور قواء کا ہے ان کے پوشیدہ جوہروں کا ظاہر ہونا ہی کامیابی ہے۔ پس فلاح سے مراد صرف دنیوی کامیابی مراد نہیں بلکہ انسان کے مخفی استعدادوں اور قواء کا ظہور پذیر ہونا ہے۔ پس عربی زبان میں فلاح کا لفظ دنیوی اور دینی دونوں کامیابیوں پر شامل ہے۔ تمام ائمہ لسان اس بات پر متفق ہیں کہ عربی زبان میں فلاح کے لفظ سے بڑھ کر دنیوی اور دینی بھلائیوں پر حاوی اور کوئی لفظ نہیں۔ تاکہ اسلام کا نظریہ نجات نکھر کر قاری کے سامنے آ جائے۔

ہندومت کا عقیدہ ہے۔ فطرت انسانی بدیوں کا گہوارہ[1] ہے۔ انسان اپنے گناہوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے مختلف جونوں میں اس دنیا میں آتا ہے۔ کتے۔ بلے سور اور دیگر جانور انسان کے پچھلے جنم کے گناہوں کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہ ابدی تناسخ چکر گناہوں کو دور کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مکتی اور نجات حاصل کرنے کے بعد بھی گناہوں کا طوق[2] [3] کے گلے میں رہتا ہے

دوبارہ اس دار المحن میں لا کر اس کو مقید کر دیا جاتا ہے۔مزید براں ہندومت میں حصول نجات کا ذریعہ تمام انسانی افراد کے لیے یکساں نہیں برہمن کو نجات دلانے والے اعمال اور ہیں چھتری کے اور دیش کے اور شودر کے اور عورت کے اور برہمن کی نجات حصول علم میں ہے۔چھتری کی برہمنوں کو خیرات دینے اور جنگ میں بہادری کے کارنامے انجام دینے میں، دیش کی نجات زراعت اور مال مویشی پالنے سے ہے اور شودر کی نجات مذکورہ تینوں ذاتوں کی خدمت بجالانے میں ہے۔چنانچہ وید میں لکھا ہے کہ وید کے لیے برہمن حکومت کے لیے چھتری مال مویشی پالنے کے لیے دیش اور دکھ اٹھانے اور خدمت کرنے کے لیے شودر پیدا کیا گیا ہے (یجر ۳۰:۵) منو کہتا ہے وید پڑھنے والے برہمنوں کی خدمت ہی شودروں کے لیے نجات دلانے والا عمل ہے شودر کے لیے برہمنوں کی خدمت ہی نیکی کا کام ہے یہ شاستروں کے بنانے والوں فاضلوں نے کہا ہے۔اس کے علاوہ جو کچھ بھی وہ اور کرتا ہے وہ اس کے لیے بے سود ہے۔(منو ادھیاء ۹ شلوک ۲۳۴......۲۳۵ اور ادھیاء اشلوک ۱۲۲......۱۲۳)

بدھ مت کی تعلیم کا مرکزی نقطہ نروان کا حصول ہے۔گوتم بدھ کے نزدیک ہر برائی کی جڑ نفسیاتی خواہش ہے جب انسان اپنی نفسانی خواہشات کی اونٹنی کو ذبح کر دیتا ہے تو وہ نروان حاصل کر لیتا ہے۔جین مت میں مہاویر کے نزدیک نروان کے حصول کا ایجابی طریقہ یہ ہے کہ انسان کے عقائد علم اور عمل صحیح اور درست ہوں انھیں تین رتن کہا جاتا ہے اور اعمال کی درستگی کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے۔

ا۔اہمہ (کسی ذی روح کو تکلیف نہ دینا) ۲۔ستیام (ہمیشہ راستی شعار بنانا اور دوسروں کے اموال کو ناجائز طریقے سے حاصل کرنے سے پرہیز کرنا) ۳۔استیام (حلال روزی کمانا) ۴۔برہمچاریام (پاک دامنی) اپری گراہہ (حواس خمسہ پر غلبہ پانا)

جینی ہندوؤں کی طرح اواگون اور مکتی میں اعتقاد رکھتے ہیں لیکن مکتی کے بارے میں ان کا عقیدہ ہندوؤں سے مختلف ہے۔ان کے نظریہ کی رو سے جب کوئی روح گناہ کرتی ہے تو وہ بوجھل ہو کر نیچے کی طرف ڈوبنے لگتی ہے۔حتی کہ وہ اس قدر بوجھل ہو جاتی ہے کہ ساتویں دوزخ میں جا گرتی ہے۔جو روح مطہر ہو جاتی ہے وہ ہلکی پھلکی ہو کر اوپر کو صعود کرتی ہے اور چھبیس بہشتوں میں سے کسی ایک میں قرار کرتی ہے جب وہ بہت ہی لطیف اور تمام آلائشوں سے پاک ہو جاتی ہے تو چھبیسویں بہشت میں پہنچ جاتی ہے تب اسے نروان حاصل ہوتا ہے۔

کنفیوشیت میں نجات اخلاق کی درستگی اور معاشی فرائض کی بجا آوری میں ہے کنفیوشیس نے ان ہر دو امور پر زیادہ زور دیا ہے۔

---

[1] ہندومت میں جیوآتما (روح) کی سرشت میں بدی کا تخم موجود ہے چنانچہ ستیارتھ پرکاش سملاس ۹۔ سوال و جواب نمبر ۷ میں روح کی ۲۴ صفات کا ذکر ہے۔جن میں بیجا محبت، دشمنی اور خوف (راگ، دویش، ابھنویش) کو بھی روح کی صفات قرار دیا ہے۔رح کے اندران صفات کا ہونا ماننا روح کو گنہگار قرار دینا ہے۔

تاؤ مذہب میں قدرت کے اصول کے مطابق زندگی گزارنے سے نجات حاصل ہوتی ہے۔
قدرت کے اصول توڑنے کا نام بدعملی اور گناہ ہے۔ یہی بدعملی اس پر مصائب لاتی ہے۔

زرتشت کے نزدیک نجات قوت خیر کا ساتھ دینے اور قوت شر کے استیصال کا نام ہے اس نے بتایا ہے یزداں کی پیروی کرنے سے جنت حاصل ہوگی اور اہرمن کا اتباع کرنے سے جہنم، یزداں کی پیروی کے تین اصول ہیں۔ نیک خیالات (ہمت) نیک اقوال (محنت) افعال (ہورشت)

عیسائیت میں کفارہ نجات کا موجب ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک ہر انسان پیدائشی گناہگار ہے آدم اور حوا نے جو گناہ کیا وہ وراثتاً ہر شخص کی فطرت میں چلا آ رہا ہے۔ جس کی وجہ سے ہر شخص گناہگار ہے عیسائیوں کے نزدیک نیک اعمال نجات کا موجب نہیں ہو سکتے اگر اللہ تعالیٰ بندے کے گناہ توبہ اور استغفار سے معاف کر دے تو اس کا رحم اس کے عدل کے خلاف ہے خدا رحیم ہے اس کا رحم چاہتا ہے کہ انسان سزا سے بچ جائے۔ پھر وہ عادل بھی ہے عدل کا یہ تقاضا ہے کہ سزا ضرور دی جائے اب رحم اور عدل ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے بندے کی نجات کا ہونا ضروری ہے عیسائیوں نے بندوں کی نجات دلانے کے لیے ایک صورت نکالی کہ خدا کا بیٹا یسوع مسیح جو تمام گناہوں سے پاک اور معصوم ہے لوگوں کے تمام گناہوں کو اپنے اوپر لے کر جان کی قربانی دے اور سارے لوگوں کے لیے نجات کا ذریعہ ہے۔ یہودیت میں احکام عشرہ پر عمل کرنے سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ لیکن مرور زمانہ سے احکام عشرہ پر عمل کرنے کے ساتھ حضرت عزیر کو ابن اللہ قرار دینا بھی نجات کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ احکام عشرہ توحید اور حقوق العباد پر مشتمل ہیں۔ تو اپنے ماں باپ کی عزت دے تا کہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز کرے تو خون مت کر، تو زنا مت کر، تو چوری مت کر، تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی نہ دے، تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر، تو اپنے پڑوسی کی جورو اس کے غلام، اس کی لونڈی اس کے بیل، اس کے گدھے اور اس کی کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ مت کر۔ (خروج ۲۰: ۱۲......۱۷)

اسلام اور نجات

اسلام نے فلاح دینی اور دنیوی کے لیے تین حقیقی اور چار ثانوی اصول مقرر کیے ہیں۔

ا۔ حقیقی اصول

(عقائد) عقائد سے مراد اللہ پر، فرشتوں پر، نبیوں پر، کتب سماوی پر اور آخرت پر ایمان ہے۔
قرآن مجید میں اللہ پر ایمان لانے پر بہت زور دیا ہے یہی وہ کونے کا پتھر ہے جس سے فلاح دارین وابستہ ہے۔ سورہ بقرہ کے آغاز میں ہی متقیوں کی ایک علامت یہ بیان کی ہے۔ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (البقرہ ۲: ۳) متقی یعنی نجات یافتہ وہ لوگ ہیں جو غیب (ہستی) پر ایمان لاتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ پر ایمان لاؤ۔ ایک اور مقام پر آتا ہے۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ

وَرُسُلِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ (الحدید ۵۷:۹) اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے یہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (الحدید ۵۷:۸) اور تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے اللہ کی ہستی پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کی جائے اور اللہ کے اسمائے حسنیٰ میں اپنے آپ کو رنگین کیا جائے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (البقرہ ۲:۱۳۸) یعنی اللہ کا رنگ اختیار کرو اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہے۔

اس آیت کریمہ میں صبغۃ سے مراد اسمائے حسنیٰ ہے۔ جب ایک شخص خدا کی ذات میں فنا ہو کر اس کی صفات میں اپنے آپ کو رنگ لیتا ہے تو اسی حالت فنا سے بقا اور لقا باللہ کی حالت ظاہر ہوتی ہے۔ بقا اور لقا ہی نجات کا دوسرا نام ہے۔ یعنی اللہ کی ذات میں فنا ہونے کے بعد ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی میسر ہو جاتی ہے۔ اس زندگی میں ہی کشوف ورویاء کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ضمنی عقائد فرشتوں، نبیوں، کتب سماوی اور یوم آخرت پر ایمان لانا ہے۔ یہ عقائد بھی تعمیر سیرت کا کام دیتے ہیں۔ فرشتے انسان کے دل میں نیکی کی تحریک کرتے ہیں۔ انسان پر یہ لازم ہے ان نیک کاموں کو بجالائے۔ انبیاء علیہم السلام انسانوں کی بھلائی کے لیے خدا کی طرف سے ضابطہ حیات لاتے ہیں جس کو وحی نبوت یا کتاب کہا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا وجود اور آسمانی ضابطہ حیات لوگوں کی ہدایت کا موجب ہے۔ اسی میں فلاح اور نجات مضمر ہے اسی طرح یوم آخرت پر ایمان انسان کے اندر محاسبے کا شعور پیدا کرتا ہے کہ ایک دن مرنے کے بعد اللہ کے سامنے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ اس لیے اس کو خدا کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے۔ محاسبہ کے خوف سے انسان نیکی کے رستہ پر گامزن ہو جاتا ہے اور برائی کے رستہ پر چلنے سے گریز کرتا ہے۔ گویا اسلامی عقائد خمسہ میں فلاح دارین مضمر ہے۔ جو شخص عقائد کی حقیقی روح کو جان جاتا ہے۔ وہ فلاح پا جاتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ بقرہ کے آغاز میں "يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" کے الفاظ بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۲:۵) یہی لوگ فلاح پانے والے لوگ ہیں۔

۲۔ عبادت

اسلام میں عبادت سے مراد چند رسمی کلمات اور حرکات کا نام نہیں بلکہ لفظ عبادت اپنے اندر ایک وسیع مفہوم لیے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے چند تعریفی کلمات کا محتاج نہیں۔ وہ تو غنی اور صمد ہے۔ اسلام میں اللہ کی عبادت کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے عنایت کیے ہوئے ضابطہ حیات کا جوا اپنی گردن پر رکھ لے اور اسی کے مطابق زندگی بسر کرے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض و غایت ہی عبادت قرار دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات ۵۱:۵۶) کہ میں نے جن وانس اس لیے پیدا کیے ہیں کہ میری عبادت کریں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ ۲:۲۱) اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا اور انھیں بھی جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم متقی بنو۔

چار عبادتیں

آسمانی ضابطہ حیات کے مطابق زندگی گزارنا عمومی عبادت میں شامل ہے لیکن اسلام نے چار مخصوص عبادتیں مقرر کی ہیں۔ جو عمومی عبادت کے قائم مقام ہیں وہ ہیں نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج۔ ان چاروں عبادات کا ایک ہی ہدف ہے وہ ہے تقویٰ۔ اسلام میں تقویٰ وہ وصف ہے جو تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔ اور اسی جڑ سے تمام نیکیاں نمو پاتی ہیں۔ وہی نیکیاں انسانی فلاح کا ذریعہ ہیں۔ ان نیکیوں کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے اسی دائرہ میں سماجی، سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی اوصاف شامل ہیں۔ جو تمام زندگی پر محیط ہیں گویا یہ چاروں عبادات زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہیں۔ اسی لیے ان چار عبادات کو عمومی عبادت کے قائم مقام مقرر کیا ہے۔

۱۔ نماز نماز دین کا ستون ہے۔ قرآن مجید اور حدیث میں نماز کے قائم کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں سورہ بقرہ کے آغاز میں ہی جہاں انسانی فلاح کا ذکر ہے وہاں اس فلاح کا ایک ذریعہ نماز قرار دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ وَیُقِیْمُوْنَ الصلوٰۃ یعنی فلاح پانے والے وہ لوگ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں۔

نماز کو فلاح کا ذریعہ اس وجہ سے قرار دیا ہے۔ یہ ان تمام اصولوں کی آب یاری کرتی ہے جو انسانی فلاح و نجات کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً تزکیہ نفس، اخوت، مساوات، رواداری، ہمدردی، پابندی اوقات، اطاعت امیر، نماز کو ہی سورہ المومنون میں مومنوں کی فلاح کا ذریعہ قرار دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ **قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلٰوتِھِمْ خٰشِعُوْنَ (۲:۲۳) مومن یقیناً کامیاب ہیں جو اپنی نماز میں** عاجزی کرنے والے ہیں۔

زکوٰۃ قرآن مجید نے اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا ذکر کیا ہے جس میں یہ حکمت بالغہ ہے کہ انسان اس وقت تک صحیح تربیت یافتہ نہیں کہلا سکتا جب تک وہ اللہ کے حضور جھکنے کے ساتھ ساتھ مخلوق الٰہی کی خدمت بجا نہیں لاتا کیونکہ یہ دونوں پہلو ہی تکمیل انسانیت اور فلاح کے لیے ضروری ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

سورۃ بقرہ کے آغاز میں بھی فلاح کا ایک ذریعہ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ (۲:۳) بیان کیا ہے اسی طرح سورہ مومنون میں بھی زکوٰۃ کو مومنین کی فلاح کا سبب قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ (۲۳:۴) (کامیاب وہ مومن ہیں) جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں۔

زکوٰۃ جہاں حرص لالچ خود غرضی جیسی اخلاقی امراض کا علاج ہے وہاں غرباء کی ربوبیت، معاشی

۴۔ استقامت

استقامت نزول ملائکہ کا ذریعہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (حم السجدہ ۴۱: ۳۰) یعنی وہ لوگ جنھوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر استقامت اختیار کی۔ ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم مت ڈرو اور مت غمگین ہو جنت اور دائمی خوشی کی بشارت پاؤ۔ جس کا تمھیں وعدہ دیا گیا ہے ہم دنیا اور آخرت کی زندگی میں تمھارے دوست ہیں۔

ولایت

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے اسلام میں نجات کا تعلق صرف آخرت کے ساتھ ہی نہیں بلکہ دنیوی زندگی سے ہی اس کا آغاز ہو جاتا ہے۔ انسان اس دنیا میں ہی جادۂ نجات پر چل کر درجہ ولایت تک پہنچ جاتا ہے۔ اسلامی اصطلاح میں ولایت کا مطلب ''اللہ کے ساتھ دوستی'' ہے۔ قرآن مجید میں درجہ ولایت پر فائز ہونے والے کی چند نشانیاں بیان کی ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (یونس ۱۰: ۶۲......۶۴) سنو! اللہ کے دوستوں پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں جو ایمان لائے اور تقوی کرتے ہیں ان کے لیے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بشارات ہیں۔

مذکورہ آیات میں ولی کی پہلی نشانی یہ بیان کی ہے۔ ولی خوف وحزن سے نجات پا جاتا ہے۔ دوسری نشانی یہ بیان کی ہے کہ اس کو دنیا میں ہی بشریٰ دی جاتی ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کی رو سے بشریٰ سے مراد رویائے صالحہ صادقہ اور کشوف ہیں جو ایک مسلمان دیکھتا ہے ایک ثقہ حدیث کی رو سے بشریٰ اور مبشرات دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتِ (بخاری ۷: ۹۱) نبوت میں سے سوائے مبشرات کے کچھ باقی نہیں رہا۔ صحابہ نے آپ سے دریافت کیا یارسول اللہ! مبشرات کیا ہیں آپ نے جواب دیا رویاء صالحہ (بخاری) ابوسعید سے روایت ہے الرويا الصالحة جزءٌ مِنْ ستة واربعين جزء اً من النبوة (بخاری) رویا صالحہ نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔

یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی پیروی سے انسان نجات کا آخری مقام یعنی درجہ ولایت حاصل کرسکتا ہے۔

مصنف کی دیگر کتب
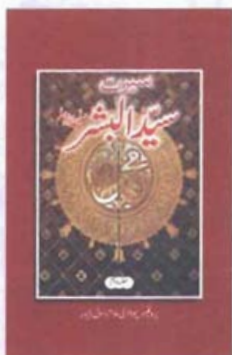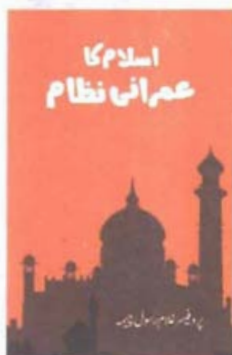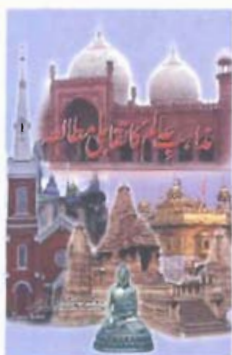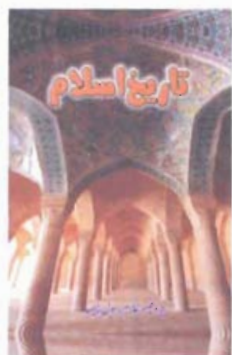
ISBN 978-969-582-049-0

چودھری غلام رسول اینڈ سنز

الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور 042-37233909, 37243055

Email: mails@cgras.com Web: www.cgras.com